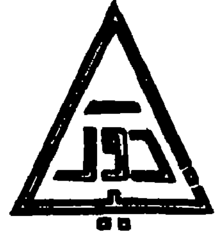


نیا دور

۵۰
نئے پیسے

۱۸
۶۱



جلد ۱۷ نمبر ۱

چیتر ۱۸۸۴
اپریل سنہ ۱۹۶۲ء

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: ۵۰ نئے پیسے

اسسٹنٹ ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
امیہ بھوشن ملک
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ ہاج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ
گورنمنٹ پریس عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

عنوانات

سرورق: رہانہ بند کی تعمیر کے زمانے میں ایک بازار کا منظر

اپنی بات

"میری دلی تمنا ہے کہ ریہانڈ بند، موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک بڑی یادگار بن جائے"۔ یہ الفاظ پنڈت جواہر لال نہرو نے جولائی ۱۹۵۴ء میں کہے تھے جب وہ ریہانڈ پروجیکٹ دیکھنے گئے تھے۔ وزیر اعظم کی یہ تمنا پوری ہو گئی اور ریہانڈ بند اور اس کے بجلی گھر کی تعمیر اب مکمل ہو گئی ہے۔ یہ بند اور بجلی گھر ریہانڈ ندی پر پپری میں جو اتر پردیش کے ایک شہر مرزاپور سے تقریباً سو میل پر واقع ہے بنایا گیا ہے۔ بند کنکریٹ کا بنا ہوا ہے اور اندازہ ہے کہ اہرام مصر کی تعمیر میں جتنی کنکریٹ لگ سکتی ہے اتنی ہی کنکریٹ اس بند اور بجلی گھر میں صرف ہوئی ہے۔ یہ ساری کنکریٹ، چرک سیمنٹ فیکٹری (مرزاپور) سے دست یاب ہوئی ہے۔ ریہانڈ بند، اپنی بنیاد سے ۳۰۰ فٹ اونچا ہے۔ اس کی لمبائی ۳۰۶۴ فٹ اور نچلے حصے میں اس کی چوڑائی ۲۲۰ فٹ ہے۔ بند کے نیچے کے حصے میں جو بجلی گھر تعمیر کیا گیا ہے اس کی لمبائی ۴۲۰ فٹ اور چوڑائی ½۵۰ فٹ ہے۔ بند کی پشت پر بجلی کے لیے پانی حاصل کرنے کے واسطے جو ذخیرۂ آب بنایا گیا ہے اسے اتر پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ اور حکومتِ ہند کے سابق وزیر داخلہ کے نام پر "گووند بلبھ پنت ذخیرۂ آب" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس مصنوعی جھیل کا کل رقبہ تقریباً ۱۸۰ مربع میل ہے۔ اس وقت اس جھیل میں ۲ء۶ ملین ایکڑ فٹ پانی جمع ہے لیکن ضرورت پڑنے پر اس میں ۶ء۸ ملین ایکڑ فٹ تک پانی جمع کیا جا سکتا ہے۔ بجلی پیدا کرنے کے لیے جھیل کے پانی کا استعمال جلد ہی شروع ہو جائے گا اور جو بجلی گھر تیار کیا گیا ہے اُس سے ڈھائی لاکھ کیلوواٹ بجلی فراہم ہو سکے گی۔ اس وقت بجلی گھر میں پچاس پچاس ہزار کے پانچ واحدے قائم ہیں۔ بعد میں ایک اور چھوٹا واحدہ قائم ہو سکتا ہے۔ ریہانڈ منصوبے کا خاص مقصد بڑی، درمیانی اور چھوٹی صنعتوں کے لیے بجلی فراہم کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بجلی کی ٹرین، آب پاشی اور شہری و دیہی علاقوں کے لیے بھی اس منصوبے سے بجلی حاصل ہو سکے گی۔ مختلف مدوں میں بجلی جس طرح تقسیم کی جائے گی اُس کا تناسب یہ رہے گا: بڑی اور بھاری صنعتوں کے لیے —— ۶۰ فی صد، چھوٹی صنعتوں کے لیے —— ۱۱ فی صد، بجلی کی ٹرین کے لیے —— ۱۵ فی صد، آب پاشی کے لیے —— ۶ فی صد، شہری اور دیہی علاقوں کے لیے —— ۸ فی صد۔ بجلی کے حصول میں آسانی ہو جانے کی وجہ سے مرزاپور کی چرک سیمنٹ فیکٹری، المونیم فیکٹری، وارانسی کی سوڈا ایش فیکٹری اور امونیم کلورائڈ فیکٹری کی پیداوار میں کافی اضافہ ہو جائے گا۔ ریہانڈ منصوبے سے ان کارخانوں کی پیداواری صلاحیت تو بڑھے گی ہی، بعض دوسرے کارخانے قائم کرنے کے امکانات بھی بڑھ گئے ہیں۔ مثلاً گورکھپور میں کیمیاوی کھاد کا ایک کارخانہ، نینی (الہ آباد) میں تار ترتیب کا کارخانہ، مرزاپور میں ایک کاسٹک فیکٹری اور برقی کنڈکٹر، کاغذ اور دفتی کا کارخانہ نیز دوسرے مقامات پر دوسرے کارخانے قائم کرنے کی بھی تجویزیں ہیں۔ ریہانڈ منصوبے سے اتر پردیش کے پس ماندہ علاقے یعنی مشرقی اضلاع کو جن کی مجموعی آبادی تقریباً تین کروڑ ہے ایک اور بڑا فائدہ پہنچے گا۔ اس علاقے میں ابھی تک آب پاشی کی سہولتیں فراہم نہ تھیں۔ یہاں کی فصلوں کا انحصار بارش پر رہا کرتا تھا۔ اگر بارش ہو جائے تو فصلیں اچھی ہوں اور اگر بارش نہ ہو تو خراب۔ ریہانڈ منصوبے کی وجہ سے صنعتی کارخانوں کا جو قیام عمل میں آئے گا اور موجودہ کارخانوں کی جو توسیع ہو گی اُس سے ایک طرف تو ان اضلاع کے باشندوں کو روزگار کے مواقع فراہم ہوں گے دوسرے اب ان ضلعوں میں آب پاشی کی کافی سہولتیں بھی مہیا ہو جائیں گی اور اس علاقے کے کسانوں کو بارش کا دست نگر نہ رہنا پڑے گا۔ ریہانڈ منصوبے سے اتر پردیش کے مشرقی علاقے کو ہی نہیں بلکہ بہار کی ریاست کو بھی بعض سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔ مغل سرائے سے پٹنے تک بجلی کی ٹرینیں چلانے کی ایک اسکیم ہے۔ ان ٹرینوں کو ریہانڈ منصوبے کی بجلی دست یاب ہو سکے گی۔ اس طرح سے کچے مال اور دیگر ضروری اشیا کا نقل و حمل تیزی سے ہو سکے گا۔ ریہانڈ بند سے جو پانی چھوڑا جائے گا اُس سے بہار کی سون ندی کی توسیع ہو سکے گی اور اس توسیع کی وجہ سے بہار کی تقریباً ۱۰لاکھ ایکڑ زمین کو آب پاشی کی آسانیاں فراہم ہو جائیں گی۔ سون ندی میں جہاز رانی کی بھی سہولتیں پیدا ہو جائیں گی اور سون میں جو سیلاب آیا کرتا ہے اُس کی بھی روک تھام ہو سکے گی۔ اُس علاقے میں جہاں اب ریہانڈ بند اور بجلی گھر واقع ہیں ایک زمانے میں جنگل ہی جنگل تھا لیکن عزم انسانی کی بدولت اب وہاں کروڑوں انسانوں کو ایک نئی زندگی بخشنے والے بند اور بجلی گھر ہی نہیں تیار ہو گئے ہیں بلکہ حقیقی معنوں میں "جنگل میں منگل" کا سامان مہیا ہو گیا ہے۔ بند اور بجلی گھر کی تعمیر کے دوران میں ہزاروں مزدوروں وغیرہ کی موجودگی اور کام کی کثرت کی وجہ سے ایک نوآبادی اور چہل پہل تو پہلے ہی نظر آنے لگی تھی، اب وہاں پختہ سڑکیں، بنگلے، ورک شاپ، کلب اور بازار بھی قائم ہو گئے ہیں۔ گووند بلبھ پنت ساگر میں چھوٹے چھوٹے خوب صورت جزیرے بنا دیے گئے ہیں جو سیر و تفریح کا بہترین مرکز ہیں۔ گرد و پیش کے علاقے میں ہر طرح کی مچھلیاں اور آبی چڑیاں ملتی ہیں۔ قریب کے جنگلات میں دوسرے شکار بھی پائے جاتے ہیں۔ غرض اب یہ علاقہ ہر معنی میں ایک نئی زندگی کا پیغامبر بن گیا ہے۔

ایڈیٹر

پریم چند کے ایک دوسرے دوست منشی پیارے لال شاکر لکھتے ہیں :

" میرے کان پور آنے سے برس ڈیڑھ برس قبل ان کا پہلا ناول ہم خرما و ہم ثواب شائع ہوا تھا۔ میں نے اس کو ۱۹۰۸ء میں بنوں ہی میں پڑھا تھا۔" (واضح ہو کہ پیارے لال شاکر جون ۱۹۰۸ء میں کان پور آئے تھے) ۔

پریم چند کے ایک اور رفیق بابو لال کرشن جو ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء میں الہ آباد ٹریننگ کالج میں پریم چند کے ہم جماعت تھے، ان کا پہلا ناول کشنا قرار دیتے ہیں جو ان کے قول کے مطابق ٹریننگ کے زمانے میں ہی شائع ہوا تھا۔[1]

خود پریم چند نے اپنی تصنیفی زندگی کے آغاز کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ متضاد بیانات پر مشتمل ہے اور بے حد گمراہ کن ہے۔ ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

"۱۹۰۱ء سے لٹریری زندگی شروع کی ... کئی سال تک متفرق مضامین لکھے۔
۱۹۰۲ء میں ایک ہندی ناول پریما لکھ کر انڈین پریس الہ آباد سے شائع کرایا۔
۱۹۱۲ء میں جلوۂ ایثار لکھا اور ۱۹۱۸ء میں بازارِ حسن۔"[2]

ایک دوسرے مضمون میں لکھتے ہیں :

"... پہلا ناول میں نے ۱۹۰۱ء ہی میں لکھنا شروع کیا۔ میرا ایک ناول ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا اور دوسرا ۱۹۰۴ء میں لیکن کہانیاں سب سے پہلے ۱۹۰۷ء ہی میں لکھیں۔ میری پہلی کہانی کا نام دُنیا کا سب سے انمول رتن تھا جو ۱۹۰۷ء میں رسالہ زمانہ میں چھپی۔ اس کے بعد میں نے زمانہ میں چار پانچ کہانیاں اور لکھیں۔ ۱۹۰۹ء میں چار پانچ کہانیوں کا مجموعہ سوزِ وطن کے نام سے زمانہ پریس سے شائع ہوا۔"[3]

منشی پریم چند اور ان کے احباب کے یہ تمام بیانات محض قیاسات پر مبنی ہیں اور بیشتر غلط ہیں۔ ہندی اور اردو کے اکثر ناقدین نے قیاس اور واہمہ کی اسی بنیاد پر پریم چند کی ابتدائی تصنیفی زندگی کی روداد مرتب کی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔[4]

اب ان بیانات کو الگ الگ جانچنے اور تفصیلات سے بحث کرنے کے بجائے مناسب ہوگا کہ پریم چند کے پہلے ناول کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ عرض کیا جائے۔

پریم چند کا پہلا ناول اسرارِ معابد ہے جو اکتوبر ۱۹۰۳ء سے فروری ۱۹۰۵ء تک بنارس کے ایک ہفتہ وار اخبار آوازِ خلق میں بالاقساط شائع ہوا۔ اس ہفتہ وار اخبار کے مدیر بنارس کے ایک کہنہ مشق ادیب منشی گلاب چند تھے۔ اس اخبار کی مکمل فائل حال ہی میں دستیاب ہو سکی ہے[5] اور اس طرح پریم چند کا پہلا ناول پہلی بار تاریکی سے روشنی میں آیا ہے۔ یہ ناول کتابی صورت میں کبھی شائع نہیں ہو سکا۔ آوازِ خلق میں اس کی پہلی قسط ۸ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوئی اور آخری قسط یکم فروری ۱۹۰۵ء کے شمارے میں۔ درمیان میں یکم ستمبر ۱۹۰۴ء کی ایک قسط فائل سے غائب ہے۔ یا تو یہ شمارہ شائع نہیں ہوا اور یا پھر فائل میں شامل نہیں ہو سکا۔ ناول کی پہلی قسط پر مصنف کا نام اس طرح لکھا ہے :-

منشی دھنپت رائے عرف نواب رائے الہ آبادی

الہ آبادی شاید اس سبب سے لکھا ہے کہ اس زمانے میں پریم چند الہ آباد ہی میں مقیم تھے۔ وہ ۱۹۰۱ء میں ڈسٹرکٹ اسکول پرتاپ گڑھ میں ٹیچر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور وہیں سے انھیں ۵ جولائی ۱۹۰۲ء کو سنٹرل ٹریننگ کالج الہ آباد میں دو سال کی ٹریننگ کے لئے بھیج دیا گیا۔ ٹریننگ ۳۰ اپریل ۱۹۰۴ء کو مکمل کر کے انھوں نے پھر پرتاپ گڑھ کے اسکول میں اپنے فرائض سنبھال لئے۔ لیکن چوں کہ ٹریننگ کالج کا پرنسپل ان سے خوش تھا اس لئے نو ماہ کے بعد ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کو اس نے ماڈل اسکول کے صدر مدرس کی حیثیت سے پریم چند کو دوبارہ الہ آباد بلا لیا۔

پریم چند کا یہ پہلا ناول ـــ جو اب تک دستیاب ہونے والی ان کی پہلی مطبوعہ تصنیف ہے ـــ اسی دور میں تکمیل پا کر (ایک اخبار میں) شائع ہوا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ۸ اکتوبر پریم چند کی تصنیفی زندگی کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور روزِ انجام بھی، یعنی ۸ اکتوبر (۱۹۳۶ء) ہی کو ان کی وفات ہوئی۔

اس ناول کا محرک ادبی حیثیت سے سرشار کی تصانیف کا مطالعہ، ان سے عقیدت اور ان کے رنگ میں لکھنے کی خواہش ہے اور سماجی اعتبار سے اس کا محرک آریہ سماجی عقائد سے وابستگی اور ہندو مذہب و معاشرت میں اصلاح کا جذبہ کہا جا سکتا ہے۔

فنی اعتبار سے اس ناول میں نومشقی کی خامیاں کثرت سے نظر آتی ہیں

---

[1] زمانہ۔ پریم چند نمبر ص ۲۲ [2] زمانہ۔ پریم چند نمبر ص ۱ [3] زمانہ۔ پریم چند نمبر ص ۳
[4] راقم الحروف نے بھی اپنی کتاب پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، میں ہم خرما و ہم ثواب ہی کو پہلا ناول قرار دیا ہے جو صحیح نہیں۔
[5] اس سلسلے میں پریم چند کے نامور صاحبزادے جناب امرت رائے کا شکر گزار ہوں جن کے تعاون اور توسط سے ہی میں یہ ناول دیکھ سکا ہوں۔

اس کے باوجود پریم چند کی اس اولیں کوشش کا مطالعہ بہت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہوگا۔ فکر و فن کے وہ تمام میلانات جو ان کی بعد کی تصنیفوں میں ارتقا پذیر شکل میں ملتے ہیں، اس ناول میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ بے روح، فرسودہ رسم و رواج اور مذہب کے نام پر غریب اور سیدھے سادے انسانوں کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف ان کا جوش جہاد اس ناول کی روح ہے۔ اسی طرح فنی اعتبار سے انھوں نے بعد میں جن روایات کو پروان چڑھایا ان کا خمیر اس ناول میں نظر آتا ہے۔ اپنے کرداروں کی تعمیر میں وہ سماجی اسباب و علل کو ایک پل کے لئے نظر انداز نہیں کرتے۔ قصے کو دلچسپ اور چست بنانے کے بجائے وہ اس کی معنویت اور اس میں سماجی حقائق کی تصویر کشی پر زور دیتے ہیں۔ طنز و ظرافت سے بھی کام لیتے ہیں اور کہیں کہیں بڑی صفائی اور بے تکلفی سے اچھوتی اور دلکش تشبیہیں بھی استعمال کرتے ہیں۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ اس ناول میں انھوں نے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے رنگ میں لکھنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ فسانہ آزاد کی طرح اس کی کہانی کا بھی کوئی رخ نہیں۔ واقعات میں کوئی نظم و ضبط نہیں۔ کوئی ایسا رشتہ اتحاد یا ہم آہنگی نہیں جسے پلاٹ کہا جا سکے۔

اس کا موضوع جیسا کہ نام سے ظاہر ہے عبادت گاہوں یا مندروں کے اندر کی پراسرار زندگی ہے۔ پریم چند نے اپنے اس ناول میں یہ دکھایا ہے کہ بہت سے مہنت اور پجاری خلوت میں جا کر کیا کار دیگر کرتے ہیں۔ لیکن وہ اکثر بہک بھی جاتے ہیں اور سرشار کی طرح اپنے قارئین کو کبھی شیوراتری کے میلے میں گھماتے ہیں، کبھی کسی تالاب کے کنارے بھنگ گھوٹنے والوں کے مجمع میں لے جاتے ہیں۔ کبھی کسی شاعر جوہر کا مرصع اور منشور کلام سناتے ہیں، کہیں دو نوجوانوں میں عورتوں کی آزادی کے مسئلے پر بحث چھڑ جاتی ہے تو وہیں ٹھہر جاتے ہیں۔ کہیں چلتے چلتے قصہ رتن پال و قمر النسا یاد آ گیا تو بیس بائیس صفحوں میں وہی سنا ڈالا۔ کبھی کسی طوائف بی بی جان کے گھر لے جاتے ہیں اور وہاں اس کے ساجیوں کی اڑن گھائیاں سناتے اور دکھاتے ہیں۔ اور یہ تمام مناظر اپنی فضا، رنگینی، ظرافت اور لکھنؤ کی رچی ہوئی محاوراتی زبان کی وجہ سے فسانہ آزاد کی یاد دلاتے ہیں۔ یہاں اس طرف یہ بھی اشارہ مناسب ہوگا کہ مندر کے مہنتوں کی سیاہ کاری کے راز فاش کرتے ہوئے پریم چند کا قلم شاید پہلی اور آخری بار عریاں نگاری سے بھی آلودہ ہو گیا۔ بعض مناظر تو ایسے ہیں کہ سرشار کو بھی حیا آ جاتی۔ شاید اس سبب سے بھی پریم چند اپنے اس ناول کے ذکر سے گریز کرتے تھے۔ اپنی کسی تحریر میں انھوں نے کبھی اس ناول کا سراغ نہیں دیا۔

فسانہ آزاد کی طرح پریم چند کے اس قصے کے ابتدائی صفحات بھی مقفیٰ اور مسجع عبارت میں ہیں۔ آغاز اس طرح ہوتا ہے:

محفل عیش و طرب و ارباب نشاط کا جمگھٹ
رنگیلے بلم کا ہے کرو جیسترا ئی
رنگیلے بلم کا ہے . . . . .

"رات کا وقت ابھی اس کالی بلا کی پہلی ہی منزل ہے۔ دور سے میٹھے سروں کی آواز مسمتع ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی معشوقہ خوش گلو ہمیں بلبل و گل رو خوب بل توڑ توڑ کر گا رہی ہے۔ ناظرین کو بھاؤ بتا بتا کر لبھا رہی ہے۔ تعریفوں کی بوچھار ہو رہی ہے، بھنوؤں کی بھرمار ہو رہی ہے۔ واہ واہ کی صدا بلند ہے۔ ہر شخص کا دل خورسند ہے۔ اہل محفل بادہ عیش و طرب سے مخمور ہیں۔ خصوصاً جلسے ناب سے چور ہیں۔ چراغ محفل اپنی سوزی کے مارے بے قرار ہے۔ پروانہ اس پر جان سے نثار ہے۔ تمام مجمع مدہوش ہے۔ دیوار بھی ہمہ تن گوش ہے . . . "

اس کے بعد پریم چند قارئین کو اس محفل کے قریب لے جاتے ہیں۔ ایک مسند پر مندر کے مہنت یشودھانند اور ان کے رفیق خاص سوامی ترلوکی ناتھ براجمان ہیں۔ سامنے ایک سراپا ناز، جنت نگاہ، اور فردوس گوش ہے۔ شراب کا دور چل رہا ہے۔ اس دوران میں سوامی جی کی پیش دستی اور شوخی طلب پر وہ سراپا ناز دھول دھپے سے بھی باز نہیں آتی اور بڑھ کر ان کی چاند پر ایک ٹیپ جڑ دیتی ہے۔ پریم چند یہ واقعہ بڑے لطف سے اور بچوں کی طرح مزے لے کر بیان کرتے ہیں اور جب سوامی جی افسوس کرتے ہیں کہ دست نازک میں کہیں چوٹ نہ آ گئی ہو تو پریم چند بھی سرشار کی طرح راوی کے روپ میں سامنے آ کر فقرہ کسنے سے نہیں چوکتے:

راوی: "کیا خوب! جس ہاتھ کی ٹیپ سے تمام کمرہ گونج اٹھے اسے نازک کہنا آپ ہی کا حصہ ہے"

پھر اس رہزن تمکین و ہوش کے لئے مہنت جی اور سوامی جی میں کشاکش اور تکرار شروع ہوتی ہے اور جب گتھم گتھا ہونے لگتی ہے تو رقاصہ راہ فرار اختیار کرتی ہے۔ یہاں یہ باب ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرے باب میں شیوراتری کے میلے کی گہما گہمی کا منظر ہے جو دریائے سرجو کے کنارے اسی مندر کے آغوش میں ہو رہا ہے۔ اس میلے میں سوامی یشودھانند کی ایک محبوبہ رام کلی ان سے تنہائی میں ملتی ہے۔ وہ اپنی سسرال سے ایک مدت کے بعد واپس آئی ہے۔ یہاں پریم چند بڑی جرأت بیباکی اور بے دردی کے ساتھ مہنت جی کو کام دیو کا بھگت دکھاتے ہیں اور قارئین کو معلوم ہوتا ہے کہ رام کلی باوجود شادی شدہ ہونے کے مہنت جی کی محبوبہ نہیں بلکہ داشتہ کی

حیثیت سے رکھتی ہے۔

تیسرا باب مندر، مہنت یا رام کلی کے قصے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اور جیسا کہ عرض کیا گیا یہاں پریم چند ادھر ادھر کے پُرمزاح، دلچسپ اور عبرت آموز مناظر دکھا کر قارئین کو محو رکھتے ہیں۔ اس طرح کچھ وقت گزر جاتا ہے۔ چوتھے باب میں معلوم ہوتا ہے کہ رام کلی کا شوہر للو اُسے وداع کرانے آیا ہے۔ رام کلی رات گئے مندر سے واپس آتی ہے تو نشہ میں لڑکھڑاتی اور جھومتی ہوئی۔ لیکن شوہر کی آمد کی اطلاع پا کر وہ درد سر کا بہانہ کر کے خاموشی سے سو رہتی ہے۔ رات میں جب اس کا شوہر للو اس کے قریب جاتا ہے تو اس کی سانسوں کی مہک سے قے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن صبح کو رام کلی اپنے زیورات چھپا کر چوری کا بہانہ کر دیتی ہے اور شوہر کے انتہائی اصرار کے باوجود اس کے ساتھ نہیں جاتی۔

پانچویں باب میں ناظرین کی ملاقات اس طوائف سے ہوتی ہے جو مہنت جی کی خلوت خاص سے فرار ہو کر آئی تھی۔ اسے وہ کہیں بی بی جان کا نام دیتے ہیں اور کہیں سرسوتی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہاں پریم چند سرشار کا چربہ اتارنے کی امکانی کوشش کرتے ہیں۔ اس منظر کا آغاز انھیں کی زبان سے سنیے:

"سرسوتی ہماری مہنت جی کی معشوقہ بے مثال، حور تمثال بلکہ ثانی حور در جمال جو اس بے نوائی سے گھر پہنچی تو ساجیوں نے گھبرا کر کہا:

"کیوں بی۔ اس طرح بدحواس و مضطرب کیوں نظر پڑتی ہو۔ ہانپ رہی ہو۔ چہرہ پسینے پسینے ہو رہا ہے یہ ماجرا کیا ہے"۔

سرسوتی: کیا کہوں اس نگوڑے سوامی نے ہتے پر ٹوک دیا۔ نہیں تو آج پالا مار لیا تھا۔ برسوں کی محنت کا صلہ آج ضرور مل گیا ہوتا مگر افسوس...

ساجی: مگر مٹھی تو کچھ نہ کچھ ضرور ہی گرم ہوئی ہوگی۔ بیچارے میاں خیراتی کو افیون کی پڑی ہے۔ خالی ڈبیہ لئے ہوئے رو رہے ہیں۔ میں اب تک کچھ نہیں تو چرس کے بیسوں ہی دم لگا چکا ہوتا۔ مگر آج ایک دم کی بھی قسم کھاتا ہوں۔ عجیب طبیعت اچاٹ ہو رہی ہے۔

سرسوتی: ابھی تم لوگوں کو تو ہمیشہ کی یہی عادت ہے کہ رو دیا کرتے ہو۔ تم کو چرس کی سوجھ رہی ہے۔ خیراتی افیون افیون چلا رہے ہیں۔ بھلا کسی کو بھی خبر ہے کہ باورچی خانے میں آگ جلی یا نہیں۔ میرا تو مارے بھوک کے برا حال ہے۔ بند ہی ایں انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھنے لگی تھیں۔ کیا کہوں کن کن مشکلات سے اس بھوک نگوڑی کو میں نے روکا ہے... کچھ رکھا ہو تو لاؤ ذرا جان میں جان پڑے۔

جمعراتی: رکھا کیا ہے۔ صبح جو کی روٹی اور مسور کی دال بچی تھی وہ خیراتی، بھگیلو بھکوس لے گئے۔ نہ جانے پیٹ ہے کہ خندق۔ جب سے ابھی تک تڑپ رہے ہیں۔ ہاں دوپہر کو چھدام کے خستہ چنے بھنوا کر کھائے تھے مگر اونٹ کے منہ میں زیرا۔ کہیں اس سے بھلا بھوک جاتی ہے۔

سرسوتی: اور جو میں نے اپنے لئے بیسنی روٹیاں پکوانے کے لئے بیسن اور تیل منگایا تھا وہ کیا ہوا۔

جمعراتی: ہوا کیا۔ کیا میں پی گیا؟ انھیں میاں خیراتی کو غسل کی سوجھی تھی۔ بیسن تو انھوں نے تھوپ لیا۔ بھگیلو کے بال کئی دن سے سوکھے پڑے تھے۔ انھوں نے تمام تیل سر میں ڈال لیا"۔

اس گفتگو میں جب خیراتی اور بھگیلو بھی شریک ہو جاتے ہیں تو باتیں اور بھی دلچسپ، بامزہ اور طویل ہو جاتی ہیں۔ اور سرسوتی کے گھر کا سارا نقشہ نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مہنت جی بڑے گھاگ ہیں۔ وہ سرسوتی جیسی رنڈی کو بھی برسوں سے محض وعدہ فردا پہ بہلا رہے ہیں، یہاں تک کہ نوبت فاقوں تک پہنچ گئی ہے۔ آخر یہ طے ہوتا ہے کہ تینوں ساجی بگڑے رئیسوں کا روپ بھریں اور سرسوتی کا نقلی سونے کا کنٹھا لے کر بازار میں اصلی سونا بتا کر بیچ آئیں۔ اس پروگرام پر عمل ہوتا ہے اور سوامی ترلوکی ناتھ کی مدد سے ایک نوجوان جوہری کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

چھٹے اور آخری باب میں رام کلی پھر مہنت جی کے دربار میں حاضر ہوتی ہے۔ مہنت جی بڑی ہوشیاری اور عیاری کے ساتھ پہلے اس کے سامنے اظہار محبت کرتے ہیں اور پھر اپنی مالی پریشانیوں کا رونا رو کر اس سے امداد کے طالب ہوتے ہیں۔ وہ ان کے فریب میں آ جاتی ہے اور اپنے سارے زیور اُن کے حوالے کر دیتی ہے۔ اس طرح پریم چند یہ دکھاتے ہیں کہ اس طرح کے رنگے سیار کس طرح اپنی خباثت سے ہندو سماج میں عفونت اور زہر پھیلاتے ہیں اور رام کلی جیسی کتنی ہی بھولی بھالی عورتوں کی گھریلو عافیت، عصمت اور دولت پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔

یہ ناول یہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔ بعد کے شماروں میں پریم چند کے مضامین شایع ہوئے ہیں۔ خاتمے سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول تشنہ اور نا تمام ہے۔ لیکن ایسا نہیں۔ دراصل سرشار کے ناولوں فسانۂ آزاد اور سیر کہسار کی طرح یہ ناول لکھا ہی کچھ ایسے ڈھنگ سے گیا ہے کہ اسے کہیں پر بھی ختم کیا

(بقیہ مضمون صفحہ ۷۱ پر)

چیمبرم ۱۸۸۸

حشرِ جذبات

ثاقب کان پوری

اب میری دعاؤں میں نہیں کوئی اثر کیا
ہوگی نہ کبھی آہ! شبِ غم کی سحر کیا

بے تابیِ فرقت کا جو عالم تھا وہی ہے
گردش میں نہیں ہیں یہ مرے شمس و قمر کیا

مانا کہ حجابات ہیں اُس رُخ پہ ہزاروں
ناکامِ تجلی ہو تو پھر ایسی نظر کیا

یاد آنے لگیں عشق کی بھولی ہوئی باتیں
پھر اُٹھنے لگی میری طرف اُن کی نظر کیا

کیوں دیکھتے ہیں مجھ کو وہ بیگانہ وشی سے
سمجھی نہیں جاتی ہے محبت کی نظر کیا

بے تاب ہیں کچھ اور اسیرانِ قفس آج
یہ موجِ ہوا لائی ہے گلشن کی خبر کیا

ہر گام پہ دیتے ہیں مجھے دعوتِ سجدہ
ہیں نقشِ قدم تیرے سرِ راہ گزر کیا

محفوظ ہے دل میں مرے عکسِ رخِ رنگیں
نظروں میں ہو تابانیِ خورشید و قمر کیا

کچھ آج سلوک ایسا ہے اربابِ چمن کا
کرنا ہے کسی دن ہمیں گلشن سے سفر کیا

جان اپنی جو دینا ہے تو دے دو گلی میں ثاقب
سُنتا ہے تو مخصوص وہی راہ گزر کیا

غزل

منوہر لال شارب

یہ شکوہ اور ان کی بے رخی کا
سلیقہ چاہیے کچھ عاشقی کا

خبر بھی ہے ارے او گل کے شیدا
ہوا کیا حال کھلنے میں کلی کا

فریبِ زندگی ہی زندگی ہے
بھرم کھل جائے ورنہ زندگی کا

جسے کہتے ہیں حسن اک پاک شے ہے
محبت نام ہے شائستگی ہے

حرم اور دیر میں اب کیا رکھا ہے
یہاں سے جا چکا انساں کبھی کا

شکایت ہے تجھے ذوقِ نظر کی
مجھے شکوہ ہے جلووں کی کمی کا

گلستاں میں ہر اک غنچہ چٹک کر
فسانہ کہہ رہا ہے زندگی کا

زمانہ جس کو کہتا ہے جوانی
بس اک عالم ہے دل کی بے خودی کا

مجھے ڈر ہے کہ اس دورِ ہوس میں
نہ جانے حشر کیا ہو آدمی کا

تجھے تو زہر بھی پچتا ہے شارب
مداوا کیا ہو تیری زندگی کا

اونچے آدمی

وجاہت علی سندیلوی

اونچے آدمی سے میری مراد ایسے آدمی نہیں ہیں جنھیں دیکھ کر ناڑیا شیشم کے درختوں کے متحرک ہو جانے کا شبہ پیدا ہونے لگتا ہے یا جیسے میرے قصبے میں محکمۂ آبکاری کے ایک انسپکٹر تھے جنھیں محض اس وجہ سے ایک مکان خالی کرنا پڑا تھا کہ جب وہ اس کے بہت تنگ اور چھوٹی دیواروں والے صحن میں نکلتے تو ہمسایہ عورتوں کی چیخ پکار شروع ہو جاتی: "وہ دیکھو! وہ خدائی بیٹا مردوا منڈیر پر کھڑا بے چھپے جھانک رہا ہے۔" اونچے آدمی سے میری مراد ایسے آدمی ہیں جو بزعم خود اپنے آپ کو عام سطح انسانیت سے بالاتر سمجھتے ہیں، جن کی آنکھیں اپنے آپ میں کوئی سرخاب کا پر لگا دیکھتی ہیں، جنھیں عام انسانوں میں اپنی گنتی کئے جانے میں اپنی آبروریزی نظر آتی ہے، جو اخلاق کو ایک کمی اور ہمدردی کو ایک بیماری جانتے ہیں، جن کی رائے میں انھیں جینے کا اور زندگی سے لطف اٹھانے کا دوسرے انسانوں سے کچھ زیادہ حق ہوتا ہے، جو تلخ کلامی کو بڑائی کا نشان اور بدتمیزی کو ایک ہنر سمجھتے ہیں، جن کے لئے مجبور سے نفرت اور جابر کی عزت کرنا دوراندیشی اور عافیت کوشی کا دوسرا نام ہے، جنھیں اپنے حقوق سے پوری انسانیت بوجھل نظر آتی ہے لیکن جو خود اپنے نازک کاندھوں پر اپنے فرائض کے نام سے ایک تنکا بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری مراد کس قسم کے لوگوں سے ہے۔ اور آپ خود بھی ایسے عجیب الخلقت انسانوں یا مہذب وحشیوں سے بارہا مل چکے ہوں گے، خصوصاً ریل کے ڈبوں میں جب کوئی اونچا آدمی پوری ایک بنچ پر لیٹا اپنی سگرٹ سے دھوئیں کے مرغولے چھوڑ رہا ہوگا اور کوئی غریب عورت بچے کو گود میں لئے جگہ نہ ملنے کی وجہ سے بڑی تکلیف میں کھڑی ہوگی یا جب کوئی نوجوان کسی بوڑھے کو دھکا دے کر اور اپنی اس کارگزاری پر ہنستا ہوا بس میں داخل ہو جاتا ہوگا یا جب ہم فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر سنتے ہیں کہ کچھ مسلح غنڈوں نے گھر میں گھس کر بڑی بہادری سے کچھ نہتی عورتوں اور بچوں کو مار ڈالا وغیرہ وغیرہ۔ ممکن ہے کہ کوئی صاحب کہہ اٹھیں کہ میں اونچے آدمی کے بجائے ایسے آدمیوں کو بڑے آدمی کیوں نہیں کہتا جو ایک بہت عام فہم اصطلاح ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اونچے اور بڑے آدمی میں یہ نازک فرق ہے کہ ہر اونچا آدمی اپنی نظر میں ایک بڑا آدمی ہوتا ہے، لیکن ہر بڑا آدمی لازمی طور سے اونچا آدمی نہیں ہوتا۔ میں اس وقت اپنے ذہنی البم سے آپ کے سامنے چار پانچ اونچے آدمیوں کی تصویریں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

پنڈت رام آسرے میرے ہمسایہ اور بڑے بے تکلف دوست تھے۔ وہ اکثر ملک و قوم کی اصلاح کے لئے مختلف تجاویز پیش کیا کرتے لیکن مجھے ان کی باتوں سے یہ شبہ گزرتا کہ انھوں نے اپنے دماغ میں پوری انسانی برادری کو مختلف قسموں یا خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور ان کے درمیان بغیر کھڑکی یا دروازے کے ایک ایسی اونچی اور آہنی دیوار کھڑی کر دی ہے کہ ایک طرف کا آدمی دوسری طرف جا ہی نہیں سکتا ہے۔ ایک دن کرسی پر پالتھی مار کر بیٹھے ہوئے اور دستی حقے کا کش کھینچ کر دھوئیں کا ایک فوارہ چھوڑتے ہوئے بولے: "یہ آپ اپنے مکان کی ایک کوٹھری کشنو کو کیوں دیئے ہوئے ہیں؟" میں نے اس نام پر اظہار تعجب کیا تو میری جہالت پر افسوس کرتے ہوئے بولے: "ارے وہی جو پہلے شتو تھا پھر کشنو بنا اور اب اپنے آپ کو کشن دیال کہتا ہے۔"

"وہ ایک زمانے سے اس کوٹھری کا کرایہ دار ہے اور ہمیشہ وقت پر کرایہ

پہنچا دیتا ہے" میں نے کہا۔

"اجی وہ بڑا بدتمیز ہے۔ پیچ ہے نا!"

"کیوں کیا ہوا؟"

"دیکھتے نہیں کس طرح بوسکی کی قمیص پہن کر اس پر سرخ واسکٹ پہنتا ہے، جیسے لاٹ صاحب کا رشتہ دار ہو!"

"کپڑوں کا تو وہ ہمیشہ سے شوقین ہے۔ بہت صاف ستھرا رہتا ہے" میں نے کہا۔

خفا ہو کر بولے: "صاف ستھرے رہنے کی بھی آپ نے ایک ہی کہی! ارے ان کمینوں کے پاس جہاں پیسے کے دو پیسے ہوئے پھلپھلا اٹھتے ہیں اور اپنی اوقات کو بالکل ہی بھول بیٹھتے ہیں۔"

"کیوں آج کشن دیال غریب پر کیوں غصہ اتارا جا رہا ہے۔ آپ سے کوئی بدتمیزی کی ہو تو خبر نہیں میں اس کی ورنہ دیکھنے میں تو بڑا شریف معلوم ہوتا ہے۔ ہمیشہ جھک کر ملتا ہے۔"

میری بات سنتے ہی آپے سے باہر ہو گئے: "بس! بس! وہ اور شریف! کمال ہی تو کر دیا آپ نے۔ آپ کو وقت پر کرایہ کیا پہنچا دیتا ہے گویا مول لے لیا ہے آپ کو۔ کیا آپ کے خیال میں شرافت پیسے سے خریدی جاتی ہے۔ بوسکی کی قمیص اور سرخ واسکٹ ہی نہیں، پتلے کنارے کی مہین دھوتی۔ پمپ جوتا اور اس پر ترچھی دوپلی۔ ایسے کمینوں کو جو اپنی ذات اور اوقات بھول جائیں، دیکھ کر میری آنکھوں میں تو خون ہی اتر آتا ہے۔"

میں نے بھی جھنجھلا کر کہا: "تو کیا اسے اپنی پسند کے صاف کپڑے پہننے کا بھی حق نہیں ہے؟ جوتے کے کارخانے میں ڈیڑھ دو سو کماتا ہے۔ صرف میاں بیوی اور ایک بچہ ہے لہذا فراغت سے بسر ہوتی ہے۔"

کہنے لگے: "یہ کچھ نہیں۔ وہ اپنے کو نیچ سے اونچ بنانا چاہتا ہے۔ میری مانیے تو اس سے اپنی کوٹھری فوراً خالی کروا لیجئے۔ پرسوں ہی بنواری کی دوکان پر کھڑا ایک ریڈیو خریدنے کی بھی بات چیت کر رہا تھا۔ اب اس کا ریڈیو بجے گا تو رہ چکے ہم محلے میں۔"

اور جب میں نے یاد دلایا کہ محلے میں پچاسوں ریڈیو بجتے رہتے ہیں تو پنڈت جی نے ایک دوسری طرف سے حملہ کر دیا: "آپ اس کی عورت کے تیور نہیں دیکھتے؟ یقین مانیے گا کہ وہ محلے بھر کے لئے ایک خطرہ ہے۔ روز ایک نئی ساری پہن کر اس چمک مٹک سے نکلتی ہے جیسے سارا محلہ اس نے خرید رکھا ہو۔"

میں نے عرض کیا: "یہ بھی کوئی بات نہیں ہوئی پنڈت جی۔ اس کے خلاف آج تک کوئی شکایت نہیں سنی گئی۔ میاں بیوی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ اور پھر اگر اس سے خطرہ ہے تو محلے کی کسی عورت سے بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔"

تلملا کر بولے: "آپ کی سمجھ میں تو کوئی بات آتی ہی نہیں! جانتے ہیں وہ کون لوگ ہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں۔"

"تو پھر!" پنڈت جی نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے بڑی محنت کے بعد آخر میں انھوں نے مجھے قائل ہی کر دیا ہو۔

"تو پھر؟" تعجب سے میں نے پوچھا۔

مجبوراً پنڈت جی کھل کر سامنے آ گئے: "آپ جانتے ہیں پہلے کشنو کا بچہ مجھے کیا کہا کرتا تھا؟ پاؤں لاگیں پنڈت جی، اور ایک آدھ دفعہ میرے پاؤں چھونے کے لئے ہاتھ بھی بڑھایا تو میں نے اس سے چھو جانے کے خوف سے اپنے پیر سمیٹ لئے تھے۔ لیکن اب مجھ سے وہ بدتمیز، کمینہ کیا کہتا ہے؟"

"کیا؟" میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"جے ہند!"

اور پھر میرے استعجاب کو بالکل ہی نظر انداز کرتے ہوئے گرجے: "میں نے بھی سوچ رکھا ہے کہ میں کسی دن اس شُہدے کو اس جے ہند کا مزہ چکھا دوں گا۔ بڑا دیش بھگت بن رہا ہے کمیں کا! گویا وہ میرے برابر کا ہے۔ میرا کوئی بے تکلف دوست ہے! توقع کرتا ہے کہ میں بھی جے ہند کہوں اس کمین کے بچے کو" پنڈت جی نے غصے میں آ کر چلم ٹھیک کرتے ہوئے حقے کا کوئی ایسا کش کھینچا کہ "اخ تھو" کہتے ہوئے سامنے برآمدے کی طرف بھاگے۔ شاید وہ حقے کا پانی پی گئے تھے۔

سامنے سڑک پر کشن دیال کا لڑکا محلے کے کچھ لڑکوں کے ساتھ اپنے اسکول کی قواعد کی نقل میں بیرٹ پٹخ کر چیخ رہا تھا: "ہم ہیں اس دھرتی کے لعل" اور کشن دیال اور اس کی عورت پاس ہی کھڑے خوش ہو رہے تھے۔

میں ایک غ صاحب کو جانتا تھا۔ اچھی خاصی حیثیت کے انسان تھے۔ وثیقہ پانے کے علاوہ مکانوں اور دکانوں سے بھی کافی کرایہ وصول ہو جاتا۔ وہ ہمیشہ اپنا سلسلۂ نسب کسی فتح ندیم یا طرم خاں سے ملاتے رہتے اور جب بھی ملتے اپنے کسی دادا کے ہاتھی یا پردادا کے بٹیر کے کارناموں کی داستانیں سناتے رہتے۔ خود تو انتہائی کنجوس واقع ہوئے تھے لیکن اپنے خاندان کی فیاضیوں اور شاہ خرچیوں کے قصے لیے چٹخارے بھر بھر کر دہراتے جیسے ان میں خود ان کا بھی کوئی ہاتھ تھا۔ حسب نسب میں کسی کو اپنے برابر کا نہ سمجھتے بلکہ ہمیشہ دوسروں کے حسب نسب کا مذاق اڑاتے

رہتے: "اجی وہ! اس کا دادا تو میرے پردادا کا باورچی تھا!" "اجی وہ! اس کی خالہ کو میری نانی نے قحط کے زمانے میں دو من گیہوں میں مول لیا تھا" وغیرہ وغیرہ۔ ان کے دو لڑکے اور ایک لڑکی ق تھی۔ بڑے لڑکے کی شادی تو کہیں خاندان ہی میں ہو گئی تھی۔ لیکن دوسرے لڑکے اور لڑکی ق کے لئے اگرچہ ان کی عمریں پچیس سال سے بھی آگے بڑھ چکی تھیں، بقول غ صاحب "مناسب ذات پات اور ہڈیوں" کا رشتہ نہیں ملتا تھا۔ ذات پات کے مقابلے میں روپیہ، ملازمت، صورت، سیرت اور پوزیشن وغیرہ ان کے سامنے سب ہیچ تھا۔ لڑکی اچھی صورت شکل کی تھی۔ اس کے لئے دو چار بہت اچھے پیغام آئے لیکن غ صاحب کے ذات پات کے معیار پر کوئی پورا نہ اترا اور انھوں نے پیغام رد کرنے کے ساتھ بقول اپنے پیغام دینے والوں کی قلعی بھی کھول کر رکھ دی تھی۔ دوسرے لڑکے کو کہیں باہر ملازمت مل گئی اور وہ چلا گیا۔ دوسری جگہ پہنچ کر اس نے کہیں من مانی شادی کر لی۔ غ صاحب اپنی زندگی بھر اس شادی سے بے خبر ہی رہے بلکہ بے خبر ہی رہنا انھوں نے بہتر سمجھا۔

لڑکی پنجڑے کی چڑیا تھی، وہ بیچاری کیا کرتی؟ اتفاق سے غ صاحب کے ایک حصہ مکان میں ایک کنوارے کرایہ دار ج آگئے۔ کچھ عرصے بعد ق کی مرضی سے ج نے غ صاحب کو اس کا پیغام دیا۔ ج ایک ذمہ دار سرکاری عہدے پر تعینات بہت شریف اور صالح نوجوان تھا۔ لیکن غ صاحب اس کی اس "گستاخی" سے اس قدر برافروختہ ہوئے کہ اسے کھڑے کھڑے اپنے گھر سے نکال دیا۔ اس واقعہ کا ق پر جذباتی حیثیت سے بہت برا اثر پڑا اور اس نے محلے ہی میں تاک جھانک کر کے اپنے لیے ایک ناگفتہ بہ صورت حال پیدا کر لی۔ غ صاحب کی آنکھیں کھلیں تو پیروں تلے زمین نہ تھی۔ بہت پریشان ہوئے اور جب خود زہر کھا لینے اور لڑکی کو مار ڈالنے کی دھمکیوں سے افاقہ ہوا تو معاملے کو بڑے لڑکے کے سپرد کر کے خود شہر سے باہر چلے گئے۔ اس بیچارے نے الٹے سیدھے رشتے تلاش کرنا شروع کیے لیکن چونکہ راز کھل چکا تھا اور لوگ غ صاحب کی پچھلی لن ترانیوں کو بھولے نہ تھے لہٰذا کوئی ان کی رسوائی کے بوجھ کا شریک دار بننے کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔

جب پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو مجبوراً ق نے اپنی حالت زار سے ج کو مطلع کیا۔ اُس کا سال بھر ہوا دوسری جگہ تبادلہ ہو چکا تھا۔ وہ بیچارا خط پاتے ہی دوڑا ہوا آیا اور ایک ناکردہ گناہ کا اتہام اپنے اوپر اوڑھتے ہوئے ق کے ساتھ شادی کر کے اسے اپنے ساتھ لیتا گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ج نے ہمیشہ ق کے ساتھ انتہائی شرافت اور محبت کا سلوک کیا اور دونوں کا رشتہ غیر معمولی طور سے کامیاب رہا۔

غ صاحب واپس شہر آئے تو ج کے ساتھ شادی پر اپنا سر پیٹ لیے۔ ان کی رائے میں اس رشتے سے ان کی عزت میں بٹہ لگ گیا تھا۔ انھوں نے کبھی بھولے سے ج کے احسانات کا کوئی اعتراف نہیں کیا۔ انھیں ق کی لغزش سے کہیں زیادہ ہمیشہ اس بات کا قلق اور غم رہا کہ ایک کم ذات ان کی لڑکی لے گیا۔ ان کی مخصوص رائے میں لڑکی سے جو غلطی سرزد ہوئی تھی وہ لاکھ قابل گردن زدنی سہی لیکن بہرحال اکثر ہوتی ہی رہتی ہے مگر کسی نیچ ذات کو اپنا داماد بنا لینا گویا مکھی کھا لینے سے بھی زیادہ کراہیت انگیز تھا۔ اپنے ایک بہت قریبی دوست سے انھوں نے کہا: "اجی لڑکی بدچلن ہو گئی تو برا ہوا بہت برا ہوا لیکن میرے خاندان میں اکثر ایسے ناخوشگوار واقعات پیش آ چکے ہیں مگر یہ ستم پہلے پہل مجھ ہی پر ہوا ہے کہ میں ایک ذلیل خاندان کے فرد کا سسر کہلایا۔ کپڑا پھٹ جائے تو اتنا قابل افسوس نہیں جتنا کہ اس میں کسی گھٹیا کپڑے کا پیوند لگا لینا ناقابل معافی ہے۔"

چیشتر ۱۸۸۴

ایک صاحب ش کو بڑی نفاست اور فیشن سے اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ خیر اس شوق کو کون برا کہہ سکتا ہے لیکن مصیبت یہ آ پڑی تھی کہ وہ محض اپنے اس شوق کی بدولت اپنے آپ کو ایک مخصوص شخصیت کا مالک سمجھتے اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو جو لباس کے معاملے میں ان کے ایسے شوقین نہیں تھے نفرت اور حقارت سے دیکھتے اور اکثر ان کا مذاق اڑاتے رہتے۔ ش کی ان حرکات پر جل بلا کر بعض لوگ تعجب کرتے کہ ایسی قلیل آمدنی میں وہ اپنا ایسا ٹھاٹ باٹ کیسے بنائے رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ اتفاق سے ش کے مکان پر جانا ہوا تو یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ جتنے زیادہ اس کے کپڑے شاندار تھے اتنے ہی زیادہ اس کی بیوی، بچوں حتیٰ کہ باپ کے کپڑے بوسیدہ اور میلے تھے۔ غالباً اس کی شخصیت مینار اس کے متعلقین کی شخصیت کی ہڈیوں ہی سے تعمیر ہوا تھا۔

ایک مرتبہ ش کے ساتھ سفر کا اتفاق ہوا۔ رات کا وقت تھا۔ درجہ میں چار برتھ تھیں۔ میں ایک اوپر والی برتھ پر تھا۔ ش اس کے نیچے والی برتھ پر تھے اور دو مسافر ایک بستر بند سنبھالے درجے میں گھس آیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ صورت سے بہت شریف معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک کونے میں اپنا بستر بند رکھ کر اس پر بیٹھ گیا لیکن اس کی موجودگی ش کو جو نہایت اطمینان سے لیٹے ہوئے تھے سخت ناگوار گذری۔ پہلے تو انھوں نے اس کو بے ٹکٹ بتلایا پھر اس پر چلتی ہوئی ٹرین کے ڈاکو ہونے کا شبہ ظاہر کیا۔ اس طرح اس کو کافی سخت سست کہنے کے بعد بھی جب

ان کی تسلی نہ ہوئی تو اگلے اسٹیشن پر ڈبے سے اتر کر ٹکٹ چیکر کو جا کر بلا لائے۔ ٹکٹ چیکر آیا تو بڈھے نے اپنا ٹکٹ دکھا دیا جو ٹھیک تھا۔ ٹکٹ چیکر نے رسماً دوسرے مسافروں کے ٹکٹ بھی دیکھنا شروع کر دیے تو سُش کے پاس تیسرے درجے کا ٹکٹ نکلا حالاں کہ وہ دوسرے درجے میں سفر کر رہے تھے۔ اب انھوں نے ٹکٹ بدلوانہ پانے کی طرح طرح سے تاویلات پیش کرنا شروع کر دیں۔ بڈھے نے انتہائی سادہ لوحی سے سُش کی برتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "کیا میں اب اس پر بیٹھ سکتا ہوں؟" اور ٹکٹ چیکر نے فوراً سُش کا بستر گول کروا کر اس بڈھے کو ان کی برتھ پر بٹھا دیا۔ سُش نے بہت بھنا کر اپنا ٹکٹ بدلوانا چاہا۔ ٹکٹ چیکر نے جواب دیا کہ وہ کچھ جرمانے کر ٹکٹ بدل سکتے ہیں لیکن چوں کہ یہ ڈبا دو سو میل سے اوپر کے مسافروں کے لیے ہے لہٰذا اس میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ سُش کی سراسیگی دیکھ کر بڈھے نے بڑی فراخ دلی سے ان کی سفارش کی "صاحب! یہ میری آدھی برتھ پر بیٹھ سکتے ہیں۔ مجھے ان کے بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے"۔ اس طرح سُش آدھی رات کو ڈبے سے نکالے جانے سے بچ گئے اور وہ بھی اس بڈھے کی عنایت سے جس سے وہ ابھی ابھی انتہائی تلخ کلامی سے پیش آ چکے تھے اور جسے ڈبے سے نکلوا دینے میں انھوں نے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی تھی۔ لیکن انھوں نے اس سے معافی مانگنے یا اس کا شکریہ ادا کرنے یا اس کی فراخ دلی سے ناجائز فائدہ اٹھانے سے گریز کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔

انھیں سُش کا ایک قصہ دفتر میں بہت مشہور تھا۔ ایک روز دفتر کے برآمدے میں کھڑے وہ سگریٹ سلگا رہے تھے۔ ایک چپراسی نے آکر ان سے دیا سلائی مانگنا چاہی۔ وہ ضرورت سے زیادہ برہم ہو گئے اور اپنے سرج کے بہت عمدہ سلے ہوئے کوٹ پر سے قیاسی دھول جھاڑتے ہوئے بولے: "آدمی دیکھ کر بات کیا کرو"۔ کچھ عرصے بعد ایک خاص ضرورت کے لیے انھیں ایک لوٹے پانی کی ضرورت تھی۔ وہ گھبرائے ہوئے دفتر کے برآمدوں میں بڑی بے بسی سے گھوم رہے تھے۔ دفعتاً انھوں نے ایک شخص کو ایک بھرا ہوا لوٹا لیے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑی بدحواسی سے اس کے پاس پہنچے اور اس کے ہاتھ سے بغیر کچھ کہے ہوئے لوٹا لے لیا اور منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔ لوٹ کر آئے تو انھیں پتہ چلا کہ اس نازک وقت پر انھیں بھرا ہوا لوٹا دینے والا وہی چپراسی تھا جسے انھوں نے دیا سلائی نہ دے کر جھڑک دیا تھا۔

قصبے کے ایک پرانے زمیندار آنجہانی انگریزی سرکار کے بڑے مداح اور جاں نثار تھے۔ انگریزی حکام کو ڈالیاں بھیجنا ان کی مزاج پرسی کے لیے خطوط لکھنا اور وقتاً فوقتاً ان کے سلام کے لیے حاضری دینا وہ اپنے فرائض منصبی سمجھتے بلکہ ان لوگوں کی بدبختی پر وہ تعجب اور افسوس کرتے جو ایسا نہ سمجھتے۔ محلے میں اپنے سے کم تر حیثیت والوں سے ملنا جلنا یا ان کے یہاں شادی اور موت وغیرہ کے موقعوں پر بھی شریک ہونا ان کی شان ریاست کے خلاف تھا لیکن انگریزی سرکار کے چھوٹے سے چھوٹے حاکم کے سامنے جا کر ریشہ خطمی بن جانے میں وہ بڑا فخر محسوس کرتے۔ ان زمیندار صاحب کا بڑے سے بڑا وفادار یا بوڑھا کاشتکار بھی ان کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جاتا تو وہ فلک کو سر پر اٹھا لیتے مگر کسی پٹواری یا کانسٹبل کو اپنے دروازے کے سامنے سے گزرتے بھی دیکھ پاتے تو وہ اس کو بلا کر ناشتے اور پان وغیرہ کے لیے ضرور پوچھ لیتے اور اس کے توسل سے اس کے حکام بالا کی خیریت دریافت کر لینے کے بعد ان کے لیے اپنی خیر خواہی کے جذبات کا ضرور اظہار کر دیتے۔ اور ان سب ریاضتوں کے صلہ میں وہ نئے سال کے خطابات کی فہرست تنہائی میں جا کر ضرور دیکھ لیتے جو بہت برس امید و بیم میں رہنے کے بعد انھیں ایک چھوٹا سا خطاب اور آنریری مجسٹریٹی مل گئی تھی اور ان "اعزازات" کی بدولت اپنے خیال میں انھوں نے اپنے باپ دادا کا نام کچھ ایسا روشن کر دیا تھا کہ اس کی روشنی میں ان کی آئندہ نسلوں کو بھی راہ بھٹکنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

ایک روز زمیندار صاحب کسی حاکم کو سلام کرنے باہر گئے ہوئے تھے۔ شاید وہ اس بات پر بہت خوش خوش لوٹے کہ حاکم نے ان کے بھیجے ہوئے آموں کی بڑی تعریف کی تھی بلکہ از راہ بے تکلفی "ونس مور" تک کہہ دیا تھا لیکن گھر پہنچ کر جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کا ایک ملازم گھاسی نہ صرف کاشتکاروں کے ایک جلوس میں شریک ہوا تھا بلکہ پولس کی لاٹھی چارج کی زد میں آکر اپنا سر پھوڑ لایا تھا تو ان پر انتہائی غیض و غضب کا دورہ پڑ گیا۔ انھوں نے اس کو گالیاں دیتے ہوئے پوچھا کہ جب وہ رہتا شہر میں ہے تو اس کو دیہات کے کاشتکاروں سے کیوں ہمدردی ہے؟ اور اس کے اس قسم کے ٹوٹے پھوٹے جواب پر کہ وہ کہیں بھی رہے وہ ایک کاشتکار کا بیٹا ہے اور اس کا مرنا جینا انھیں کاشتکاروں کے ساتھ ہے، وہ اور بھی زیادہ برافروختہ ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنی سنہری مثال پیش کرتے ہوئے "میرا بھی تو مرنا جینا انھیں کم بخت کاشتکاروں کے ساتھ ہے لیکن میں کبھی ان کے معاملات میں حصہ نہیں لیتا ہوں"۔ کہہ کر انھوں نے بیچارے سر پھٹے اور کراہتے ہوئے گھاسی کو اسی وقت رات میں اپنے مکان سے نکال دیا تھا۔ ان کی بیوی

نے کچھ سفارش کی کہ اس وقت رات میں وہ کہاں جا سکتا ہے، سویرا ہوتے نکل جائے گا" تو گرج کر بولے: "تم یہ راج کاج کی باتیں کیا جانو۔ اس گھاسی کے بچے نے یوں ہی میری ناک کٹا دینے میں کیا کسر رکھ چھوڑی ہے۔ اب اگر میرے کسی مخالف نے ضلع مجسٹریٹ کو یہ خبر پہنچا دی کہ میں نے اس باغی کو اس کی بغاوت کے بعد بھی اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے تو میری اب تک کی ساری کارگزاریوں پر ایک دم پانی پھر جائے گا۔"

گھاسی نے اس رات رات زمیندار صاحب کے مکان کے سامنے جمن گھوسی کے گھر میں پناہ لی۔ بلکہ اس واقعہ کے بعد مہینوں جمن کے گھر پر رہا۔ ایک دفعہ بچوں کو دیکھنے وہ ان کے گھر آ گیا تو انھوں نے یہ کہہ کر نکال دیا: "تو جمن کے ساتھ رہ کر بے دھرم ہو گیا ہے لہٰذا تیرے ایسے لوگوں کی صورت تک دیکھنا مجھے گوارا نہیں ہے۔"

کچھ عرصے بعد زمیندار صاحب ایک الکشن میں کھڑے ہوئے یہاں کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے بولے: "ہم سب ایک مذہب والے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔" یہ سنتے ہی گھاسی جو پاس ہی بیٹھا تھا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا: "حضور ایسی غلط بات اپنے منھ سے کیوں نکالتے ہیں۔ میں آپ کا بھائی ہوتا تو اس روز رات کو آپ مجھ گھائل کو اپنے گھر سے کیوں نکال دیتے۔ میرا بھائی تو وہ جمن ہے جس نے مجھے پناہ دی اور اپنی روکھی سوکھی میں برابر کا حصہ دار بنایا۔"

اس غیر متوقع جواب سے زمیندار صاحب بالکل ہی بوکھلا گئے اور مجمع میں کچھ ایسی ہڑبونگ مچی کہ انھوں نے فوراً یہ اعلان کر دیا: "میں صرف یہ کہنے کے لیے کھڑا ہوا تھا کہ میں نے الکشن لڑنے کا خیال ترک کر دیا ہے۔"

رحیم بیگ سات سال ولایت میں رہنے کے بعد واپس گھر آئے تو وہ ہندستان کی ہر چیز کو اس غصے اور نفرت سے دیکھتے جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے ہوں۔ باپ کو ڈیڈی اور ماں کو ممی کہنے کے بجائے ابا جان اور اماں جان کہنے میں انھیں اپنی بڑی آبرو ریزی نظر آتی۔ بڑے بھائی کو بھائی جان کہنے کے بجائے انھوں نے صرف نعیم کہہ کر پکارا اور اس بد تہذیبی پر گھر والوں نے ناک بھویں چڑھائیں تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ پڑوس کے پنڈت جی کو انھوں نے گڈ مارننگ کہا اور انھوں نے اس کا جواب "خوش رہو بیٹا" دیا تو انھوں نے پنڈت جی کی جہالت پر اس زور سے قہقہہ لگایا کہ حاضرین نفرت سے منھ پھیر لینے پر مجبور ہو گئے۔ وہ اپنے گھر والوں کو گنوار سمجھتے لیکن خود بغیر کلی کیے "بیڈ ٹی" پی لینے میں یا اپنے کتے کو گود میں اٹھا کر پیار کر لینے میں وہ کوئی تکلف نہ کرتے۔ ان کی رائے میں دہی کی لسی پینا "رذالت اور کافی پینا شرافت تھا۔ مسواک "رجعت پسندی" اور ٹوتھ برش ترقی پسندی کا علم تھا۔ تخت پر لیٹنا حماقت اور صوفے پر ٹانگیں پھیلا دینا عین سعادت تھا۔ حقہ معتوب لیکن پائپ حد درجہ محبوب تھا۔ عورتوں کا اونچی اسکرٹ پہننا نوید مسرت لیکن مردوں کا دھوتی باندھنا حد درجہ شرم ناک تھا۔ دہی بڑے دیکھ کر ناک بھویں سکڑنے لگتیں لیکن کھٹے میٹھے سوپ پر رال ٹپکتی۔ کبوتر بازی بے وقوفی اور تضیع اوقات لیکن گھوڑ دوڑ ایک قابل فخر "ہابی" اور پیشہ تھا وغیرہ وغیرہ۔ غرض کہ دیس کی ہر بات جہالت نشان اور پردیس کی ہر بات بصیرت افروز تھی۔ چند ہی دنوں میں رحیم بیگ غیروں کے لیے تو کیا خود اپنے گھر والوں کے لیے وبال جان بن گئے۔

ایک روز رحیم بیگ ایک انگریز کمشنر سے جو کبھی آکسفورڈ میں ان کا ہم جماعت تھا ملنے جا رہے تھے۔ ملاقات کا وقت پہلے سے مقرر تھا۔ اتفاق سے اسی روز ان کے خالو کا انتقال ہو گیا۔ جنازہ قبرستان جا رہا تھا لیکن رحیم بیگ یہ کہتے ہوئے کہ ملاقات کے وقت کی پابندی نہ کرنا ایک شدید اخلاقی جرم ہے اس میں نہیں شریک ہوئے بلکہ کمشنر کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر کی موٹر خراب تھی لہٰذا رکشے پر بیٹھ گئے۔ رکشے والے کو وہ بار بار تیز چلنے کی ہدایت کر رہے تھے اور اگرچہ وہ بیچارا انتہائی زور لگا رہا تھا لیکن رکشا ہوائی جہاز تو بن نہیں سکتا تھا! رحیم بیگ غصے کے مارے تلملائے جا رہے تھے اور پھر جب ایک چڑھائی پر رکشے کی زنجیر اتر گئی تو ان کے ہاتھ سے بھی صبر کا دامن چھوٹ گیا اور انھوں نے کچھ انگریزی گالیاں دیتے ہوئے رکشے والے کو تین چار ٹھوکریں لگا دیں اور ہانپتے کانپتے کمشنر کے بنگلے پر پہنچے۔ ملاقاتی کارڈ بھجوایا لیکن ایک گھنٹے تک کوئی جواب نہیں ملا۔ یہ بڑی بے چینی سے ٹہل رہے تھے کہ سکریٹری نے آ کر اطلاع دی: "صاحب نے آج کی سب ملاقاتیں منسوخ کر دی ہیں۔ ان کے وطن کا ایک ٹیکسی ڈرائیور آ گیا ہے اور وہ اس سے باتیں کرنے میں مصروف ہیں۔"

رحیم بیگ کچھ بڑبڑاتے ہوئے بنگلے سے باہر نکلے تو ان کی نظر اپنے رکشے والے پر پڑی جو اپنی چوٹیں سہلاتا ہوا ان کا منتظر تھا۔ نہیں معلوم اس وقت رحیم بیگ کا دل کیوں چاہا کہ وہ اپنے وطن کے اس رکشے والے کے گلے میں باہیں ڈال کر اس سے اپنی ٹھوکروں کی معافی مانگ لیں لیکن انھوں نے اس "رکیک" خیال کو فوراً اپنے دل سے نکال دیا اور بڑی حقارت سے پانچ روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف پھینک

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۰ پر)

عہدِ گل

سلام مچھلی شہری

ــــ آگ کا ذکر ہی کیا، جلتی ہے بجھ جاتی ہے
پھول مرجھائے تو خوشبو نہیں جانے پاتی ـــ!

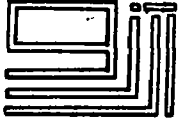
تم کھِلو، تم بھی ہنسو، تم بھی مچل کر مہکو
اپنا یہ عہد ہے دھرتی کے حسیں دامن پر
اب جہاں تک بھی نظر جائے، گلستاں ہوگا
یا گل ولالہ کے مفہوم بدل جائیں گے
یا ہمیشہ کے لیے دَورِ بہاراں ہوگا
آسماں پھول چڑھائے گا، جلائے گا کنول
نکہت و نور کا معبود اب انساں ہوگا ـــ!

ــــ آگ کی بات پہ دھرتی کو ہنسی آتی ہے
آگ خود اپنی ہی فطرت کی سزا پاتی ہے
آگ کا ذکر ہی کیا، جلتی ہے بجھ جاتی ہے
فصلِ گل، موسمِ پُرنور کی باتیں چھیڑو
ذکرِ فردوس کرو، حور کی باتیں چھیڑو ـــ!

ــــ تم کھِلو، تم بھی ہنسو، تم بھی مچل کر مہکو
عہدِ حاضر کے خلیلوں کا ارادہ یہ ہے
اب نہ بادل ہی کہیں ہوں، نہ کہیں آتش و دود
اس طرح مہکو کہ طوفانِ بہاراں بن جاؤ
وادیِ گل میں نظر آئے نہ کوئی نمرود ـــ!

ــــ تم کھِلو، تم بھی ہنسو، تم بھی مچل کر مہکو
تم اُٹھو، تم اُٹھو، تم سب ہی ملے ساتھ اُٹھو
ہمیں خوشبو ہیں، ہمیں نور، ہمیں نغمہ ہیں ـــ!

ــــ آؤ اب تیز کریں قافلۂ صبحِ بہار
آؤ اب تیز کریں قافلۂ صبحِ بہار
آؤ اب تیز کریں قافلۂ صبحِ بہار ـــــ!!!



نصیر پرواز

کوئی اُمید، کوئی شوق، کوئی آس نہیں
آج سب دور ہیں کوئی بھی مرے پاس نہیں
دلِ مایوس ہے غم کوش، نگاہیں ویراں

ایک سنّاٹا سا تا حدِ نظر بکھرا ہے
کارواں جیسے خموشی کا ابھی گزرا ہے
بن گیا گردِ رہِ شوق ہر اک وہم و گماں

تیرگی جال بچھاتی ہے مری راہوں میں
دل کی دھڑکن بھی نہیں آج مری بانہوں میں
ہر تمنّا ہے خیالات کی بے نام و نشاں

سوچتا ہوں کہ کوئی آکے مجھے گیت سنائے
کوئی غالبؔ کی غزل میرؔ کے اشعار ہی گائے
کاش تنہائی کے آغوش میں مل جائے اماں

تاکہ ہر جذبۂ ناکام سے پاکر تسکیں
اپنی ہر سعیِ بد انجام سے پاکر تسکیں
ایک لمحے کے لیے چین سے سو جاؤں میں
خواب کی وادیِ پُر کیف میں کھو جاؤں میں

ہشت چمن ـــــ لکھنؤ کی ایک قدیم نثری داستان

کتب خانہ نواب سالار جنگ (حیدرآباد) میں ایک قلمی نثری داستان ہشت چمن سے موسوم محفوظ ہے۔ اس کی تصنیف امجد علی شاہ (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء) والیٔ اودھ کے زمانہ میں ہوئی ہے۔ امجد علی شاہ اپنے خاندان کے دوسرے فرمانرواؤں کی طرح علم وفن کے سرپرست تھے اور مصنفین اور شعراء کو ان کی کاوشوں کا صلہ دے کر نہال کرتے تھے۔ اس داستان کے مصنف لالہ گنگا پرشاد ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر گیان چند صاحب کی کتاب اردو کی نثری داستانیں میں اس کا تذکرہ نہیں ہے اس لیے یہاں اس پر مختصر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

لالہ گنگا پرشاد، لالہ روشن لال کے فرزند تھے اور لالہ روشن لال امجد علی شاہ کے دیوان تھے۔ گنگا پرشاد کو داستان گوئی کا شوق تھا۔ اسی شوق کے بہ نظر اس کتاب کی تصنیف ہوئی۔ یہ کتاب ۱/۲ ۱۱×۷ سائز کے ۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے دیباچہ سے کئی امور واضح ہوتے ہیں اس لیے اس کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

" اب کیفیت قلم اور پر شاخسار وصف شہریار گردوں وقار کی مترنم اور شور افگن ہے اور قمری زبان نیچ مدح ابوالظفر مصلح الدین ثریا جاہ سلطان عادل خاقان زماں محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی کی کوکو زن۔ سبحان اللہ کیا بادشاہ جم جاہ ہے کہ نگاہ اس کی فیض دستگاہ ہے اور وہ خلائق کا پشت و پناہ۔ کسی بشر کو عہد دولت میں اوس کے محتاج نہیں پایا...... اما بعد راقم ژولیدہ بیان ضعیف البنیان احقر العباد بندہ گنگا پرشاد واسطے دلچسپی کے عالم بے شغلی میں ساتھ شغل تحریر اس قصۂ عجیب کے مشغول ہوتا ہے اور رنگین خیالان چمن زار نکتہ دانی سے آرزو مند قبول گلگشت نصیبان بہار ریز طبع بہارستان معانی سے امید یہ ہے کہ اس بہارستان دلکش گلہائے فرد زدین کو کہ ساتھ نام ہشت چمن کے موسوم ہے بنظر...... عیوب بینی سے پامال نہ فرمائیں اور افواج اختراں یعنی سہو و خطا سے برگ ریزاں نہ کریں۔"

دیباچہ کے بعد ترقیمہ کی عبارت ملاحظہ ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گنگا پرشاد روشن لال کے فرزند تھے۔

" الحمد للہ والمنۃ کہ کتاب مستطاب المسمی بہ ہشت چمن بزبان اردو من تصنیف ابلغ البلغا افصح الفصحا لالہ گنگا پرشاد صاحب خلف دیوان روشن لال ...... (اس کے بعد آدھی سطر کی عبارت پڑھی نہیں جاتی) تمام شد۔ فقیر حقیر خاکپائے اہل قلم از فرمائش جمعدار محمد یوسف صاحب ید اللہ ظلالہ ...... باتمام رسید بتاریخ بست وپنجم بروز جمعہ از دست غوث میاں عاصی وکثیف تحریر نمود۔ باللہ التوفیق۔

......تحریر شہر محرم الحرام ۱۲۶۵ھ۔"

یہ داستان آٹھ باب یعنی آٹھ چمن پر منقسم ہے۔ اس لیے اس کو ہشت چمن سے موسوم کیا گیا ہے۔ پہلے چمن کے افسانہ کا خلاصہ یہ ہے۔

ایک بادشاہ تھا جو عدل اور انصاف میں مشہور تھا۔ اس کے پاس

ملک مال بے حساب تھا مگر اولاد نہیں تھی۔ شب و روز دعا کرتا۔ آخر اس کی دعا قبول ہوئی اور سفر زند تولد ہوا فرزند کی پرورش اور تعلیم ہوتی رہی۔ جب جوان ہوا تو ملک دکن کی ایک شہزادی کے حسن کی تعریف سن کر نادیدہ عاشق ہو گیا اور اپنی معشوقہ کو حاصل کرنے کے لیے سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ ماں باپ نے بہت کچھ فہمائش کی مگر نصیحت کارگر نہ ہوئی۔ فہمائش کا اثر نہ ہوا اور وزیر زادے کو ساتھ لے کر معشوقہ کی جستجو میں چل پڑا۔ راستہ میں کئی مصیبتیں پیش آئیں۔ اولاً ایک ناگ نے شہزادہ کو ڈس لیا۔ وزیر زادہ تمام دن اور ساری رات خدا کی درگاہ میں عاجزی سے دعا کرتا رہا۔ آخر دعا قبول ہوئی۔ ایک درویش اُدھر سے گزرا اور واقعات سُن کر شہزادے کی لاش کو ایک ٹھوکر ماری۔ ٹھوکر کھاتے ہی شہزادہ زندہ ہو گیا۔ وزیر زادے سے کل واقعات سُن کر اس کی دوستی اور رفاقت کا معترف ہوا اور پھر سفر پر روانہ ہو گیا۔ ایک شہر میں پہنچ کر ایک مکان میں دونوں مقیم ہوئے۔ رات کو شہزادہ نے مکان کی چھت پر آرام کیا۔ اتفاقاً ایک پری کا تخت ادھر سے گزرا۔ پری شہزادہ کا جلوہ دیکھتے ہی اُس پر ہزار جان سے عاشق ہو گئی اور شہزادہ کے پلنگ کو اپنے تخت پر رکھ کر لے اُڑی۔ صبح جب بیدار ہو کر شہزادہ نے وزیر زادے کو نہ پایا اور اپنے آپ کو ایک نئی جگہ دیکھا تو بہت پریشان ہوا۔ آخر پری نے جو ماہ رُخ کے نام سے موسوم ہے سارا راز کھولا اور شہزادے سے وصل کی طلب گار ہوئی۔ شہزادہ داد عیش دینے پر راضی نہیں ہوا اور کہنے لگا کہ جب تک میں اپنی محبوبہ سے نہ مل لوں گا مجھے دنیا کی کوئی خوشی اور مسرت شاد نہیں کر سکتی۔ ماہ رُخ یہ سن کر خفا ہو گئی اور شہزادہ کو ایک گھنے جنگل کے ایک کنوئیں کے اندر قید کر دیا۔ ادھر وزیر زادہ نے جب شاہزادہ کو نہ پایا تو بہت حیران ہوا۔ چاروں طرف شاہزادے کو ڈھونڈتا رہا مگر پتہ نہ چلا۔ آخر پریشان ہو کر خدا کی درگاہ میں دعا کرنے لگا۔ ایک بار دعا پھر قبول ہوئی اور وہ جب سو گیا تو خواب میں دیکھا شہزادہ ایک جنگل میں قید ہے۔ خواب سے بیدار ہو کر وزیر زادہ شہزادہ کی تلاش میں روانہ ہوا۔ چلتے چلتے ایک ایسے جنگل میں پہنچا جو جنگلی جانوروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر رات کے وقت درندوں سے محفوظ رہنے کے لیے اُس نے ایک درخت کے اوپر پناہ لی۔ تھوڑی دیر بعد ایک مینا اور طوطے نے اُس درخت پر اپنا بسیرا کیا اور آپس میں کہنے لگے کہ میں جس شاخ پر بیٹھا ہوا ہوں اگر کوئی اس کو اپنے پاس رکھے تو وہ لوگوں کی نظر سے پوشیدہ ہو جائے گا۔ طوطے نے کہا جس شاخ پر میں بیٹھا ہوں اس کو اپنے پاس رکھ کر کوئی خواہش کی جائے تو وہ پوری ہو گی۔ وزیر زادہ نے یہ سُن لیا اور صبح جب طوطا مینا اُڑ گئے تو درخت کی دونوں شاخیں تراش کر اپنے پاس رکھ لیں اور جنگل سے روانہ ہوا۔ چلتے چلتے ایک ایسے شہر پہنچا جہاں کوئی آدم زاد نہیں تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ وزیر زادہ کو ایک وسیع محل دکھائی پڑا اور وہ اُس کے اندر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ ایک حسینہ کی لاش پلنگ پر رکھی ہوئی ہے۔ وزیر زادہ چار دن اُس محل میں رہا اور درختوں کے میوے کھا کر رات کو سوتا رہا۔ آخر پانچویں دن ساتھ لائی ہوئی درخت کی شاخ کو آزمانے کا ارادہ کیا اور لاش کے پاس جا کر اس حسینہ کے زندہ ہونے کی خواہش کی۔ اس خواہش کے ساتھ ہی حسینہ زندہ ہو گئی اور وزیر زادے سے بتایا کہ میں ایک بادشاہ کی لڑکی ہوں اور مجھے ایک دیو نے یہاں قید کر رکھا ہے۔ جب دیو محل سے جاتا ہے تو جادو سے مجھے مُردہ کر دیتا ہے اور جب آتا ہے تو زندہ کر لیتا ہے۔ شہزادی باتیں کر رہی تھی کہ ہوا چلنے لگی اور دیو آ گیا یہاں وزیر زادہ کے پاس درخت کی شاخ تھی اس کو دیو نے دیکھا نہیں اور وزیر زادہ نے دیو کو ضرب شمشیر سے دو ٹکڑے کر دیا۔ اس کے بعد شہزادی اور وزیر زادہ دونوں کچھ عرصہ تک اس محل میں اقامت گزیں رہے۔ پھر شہزادی نے وزیر زادہ کو ایک گھوڑا دے کر کہا کہ اس پر سوار ہو کر راستہ طے کیا جائے مگر گھوڑے کو چابک نہ ماری جائے۔ کئی میل راستہ طے کرنے پر وزیر زادہ نے بھولے سے گھوڑے کو ایک چابک ماری۔ چابک کا لگنا تھا کہ گھوڑا وزیر زادہ کو لے کر ہوا میں اُڑ گیا اور ایک سمندر میں اُسے گرا کر غائب ہو گیا۔

جب وزیر زادہ سمندر کی لہروں میں غوطے کھانے لگا تو بارگاہ رب العزت میں دعا کی۔ دعا قبول ہوئی اور ایک کشتی وزیر زادہ کو مل گئی۔ اس کے ذریعہ وہ کنارے پر پہنچا اور کئی دن کی مسافت طے کرنے کے بعد ایک فقیر کی قیام گاہ ملی۔ فقیر نے وزیر زادہ کو ایک دعا بتائی اور کہا اسے پڑھ کر تمھاری مشکل آسان ہو جائے گی اور تم اپنے آقا زادہ سے ملاقات کرو گے۔ فقیر نے یہ بھی کہا کہ یہاں سے تین منزل کے بعد ایک دوراہا ملے گا۔ اس دوراہے کے سیدھے طرف جانا، بائیں طرف قدم بھی نہ رکھنا۔ وزیر زادہ

جب بیس منزل طے کر کے دو راہے پر پہنچا تو فقیر کی راہنمائی یاد نہ رہی۔ بجائے سیدھے طرف جانے کے بائیں طرف چلنے لگا۔ دس بیس کوس چلا ہوگا کہ ایک دیو کوہ پیکر نمودار ہوا اور وزیر زادہ کو اپنا لقمہ بنانا چاہا۔ وزیر زادہ دعا پڑھ کر دیو سے کشتی لڑنے لگا اور اُسے ہرا دیا۔ اُس پر دیو بہت حیران ہوا اور اس واقعہ کی اطلاع اپنے بادشاہ کو دی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ آدم زاد (وزیر زادے) کو گلستان ارم میں رکھو۔ گلستان ارم بادشاہ کی عشرت گاہ تھا۔ بیسیوں پریاں یہاں رہا کرتی تھیں۔ ایک پری جس کا نام سبز پری تھا وہ وزیر زادے پر عاشق ہو گئی لیکن اپنی ایک عزیز اور راز دار سہیلی کے مشورہ سے اس نے اپنے عشق کو پوشیدہ رکھا۔ اس کے بعد رازدار سہیلی نے مشورہ دیا کہ جب بادشاہ مصروف عیش و نشاط ہو، شراب اور کباب کا شغل ہو تو رقص کر کے بادشاہ کو خوش کرے اور اس سے انعام میں آدم زادے کو مانگ لے۔ سبز پری نے اُس کے کہنے کے مطابق عمل کیا۔ بادشاہ اس کے رقص سے بہت خوش ہوا اور کہا "مانگ کیا مانگتی ہے؟" اس پر سبز پری نے وزیر زادے کو انعام میں مانگا۔ بادشاہ یہ سن کر بے حد غضب ناک ہوا مگر کہا کہ میں زبان دے چکا ہوں اس لیے وزیر زادہ تجھے عنایت کیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ بادشاہ نے یہ بھی حکم دیا کہ سبز پری اور اس کے عاشق وزیر زادہ کو شمال کے جانب پھینک دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور دونوں غلطاں و پیچاں اس دو راہے پر گرے جہاں سے وزیر زادہ نے غلطی کی تھی۔ یہاں ایک حوض مصفّا پانی کا نظر آیا۔ وزیر زادہ حوض میں نہایا اور نماز پڑھی۔ اب پری نے اس سے بتایا کہ میں گلستان ارم کی مشہور سبز پری ہوں اور تجھ پر عاشق ہو کر میں نے یہ دن دیکھا ہے۔ وزیر زادہ نے بھی اپنا سارا حال بیان کیا۔ سبز پری نے کہا کہ تمام پریاں اور دیو، تہور شاہ بادشاہ اجنّہ کے زیر حکم ہیں۔ اگر تہور شاہ چاہے تو شاہزادہ کو رہائی مل سکتی ہے مگر بادشاہ کے چوکیدار آدم خوار دیو ہیں اس لیے اُس تک پہنچنا دشوار ہے۔ وزیر زادہ نے کہا مجھے ایک اسم اعظم یاد ہے جس کے باعث مجھے دیو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ غرض وزیر زادہ اسم اعظم کے زور سے تہور شاہ کے دربار میں پہنچا اور بادشاہ اجنّہ کی نظر اُس پر پڑی۔ بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ اس تازہ وارد کو میرے سامنے لایا جائے۔ وزیر زادہ بادشاہ کے حضور میں پہنچا اور شروع سے آخر تک اپنا حال بیان کیا۔ بادشاہ نے حکم کو ماہ رُخ پری کو حاضر کیا جائے۔ چنانچہ وہ حاضر ہوئی۔ بادشاہ زادہ بھی طلب کیا گیا اور وزیر زادہ سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وزیر زادے کی وفاداری کا حال سُن کر وہ بہت خوش ہوا۔

اس نوبت پر پہلا چمن ختم ہوتا ہے اور دوسرے چمن شروع ہوتے ہیں۔ اُن کا خلاصہ یہ ہے۔

شہزادہ، وزیر زادہ اور سبز پری منزل مقصود کی طرف رو ہوتے ہیں اور پھر مختلف نہج کے واقعات پیش آتے ہیں۔ بیچ بیچ میں دیو اور پریوں کے کئی اور قصّے آتے ہیں۔ شہزادہ اور وزیر زادہ متعدد آ[فتوں] سے دوچار ہوتے ہیں۔ کبھی جادو کے زور سے پرند بنا دیے جاتے ہیں اور کبھی رہائی پاتے ہیں۔ آخر شہزادہ اپنی محبوبہ کو حاصل کر کے خوش [و خرم] اپنے ملک کو واپس ہوتا ہے۔

داستان کے اسلوب بیان اور زبان کے اندازہ کے لیے مخ[تصر] طور پر داستان کی عبارت کا کچھ نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

"بلبلان شیفتہ گلہائے چمنستان قصص رنگینی اور قمریان فر[یفتہ] سرو ستان حکایات دل نشینی کی یوں بیان کیا ہے کہ بیچ شہر مینو فردوس آباد کے ایک شہریار تھا مشہور خاص و عام میں..... رضوان، نام گلستان سلطنت نسیم عنبر شمیم اقبال لایزال اوسکے سے شگفتہ و خند[ا]ں تھا اور بوستان خلافت آبیاری سحاب جاہ جلال اوسکے سے سر[سبز] تھا......"

"بے اختیار ہو کر تخت کو اوتار لائی اور دو گھڑی تک اوسکے پلنگ کے نیچے بیٹھی صورت اوس کی دیکھتی رہی۔ آخر ش استیلائے اشـ[ـتیاق] میں پلنگ شاہزادے کو تخت پر رکھ کر اپنے مکان میں لے گئی۔ چار گھڑی شاہزادہ کی آنکھ کھلی۔ کیا دیکھتا ہے کہ نہ وہ مکان ہے نہ وہ سامان۔ یہاں نقشہ اور ہے۔ مانند نقش دیوار متحیر ہوا۔ ما[ہ رخ] نے دیکھا کہ شہزادہ حیران ہے۔ دوری یار و دیار سے اس کو پریشا[نی] ہے۔ اب بغیر افشائے راز کوئی تدبیر اطمینان اس نوجوان کی نظر [نہ] آئی۔ آخر کار حال تعشق اپنا مفصل بیان کیا۔ شہزادہ نے مطلق جواب نہ دیا۔ پری نے سمجھا کہ ابھی تازہ وارد ہے، اسے زیادہ چھیڑنا مناسب

نہیں: دو تین روز تک جمیع نعمتیں دنیا کی واسطے شہزادہ کے موجود ہوتی رہیں لیکن کسی چیز سے ملتفت نہ ہوا۔"

آخری چمن کے آخری حصہ کا اقتباس یہ ہے:

"آخوش شہزادہ، وزیر زادہ و سبز پری کو باچشم اشکبار رخصت کیا۔ لشکر شاہزادہ کا بعد چند روز کے خانۂ خسراول میں پہنچا۔ بادشاہ نے تمام لشکر کی دعوت کی اور شاہزادہ اور وزیر زادہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ سوائے ملکہ ماہ رُخ اور سبز پری کے محل میں حسب الحکم بادشاہ کے اتارے اور ملاقات ملکہ ماہ رُخ کی محل اول سے ہوئی۔ اس طرف بھی شرائط ظاہرداری جو مناسب تھے ادا ہوئے اور طرف ثانی سے بھی جو قواعد محبت و جہاں داری کے چاہیے ظہور میں آئے۔"

اس داستان کے افسانہ پر نظر ڈالی جائے تو کوئی نئی چیز ظاہر نہیں ہوتی۔ جیسے اور جس طرز اور جس نہج کے افسانوں کا اس زمانہ میں رواج تھا ہشت چمن میں اسی طرز اور نہج کا افسانہ ہے۔ ما فوق الفطرت واقعات ہیں۔ افسانے کے آغاز میں رنگینی اور فصاحت و بلاغت ہے مگر جیسے جیسے افسانہ آگے بڑھتا جاتا ہے صاف سادہ اور آسان ہوتا جاتا ہے۔ عبارت عام فہم اور سلیس ہو جاتی ہے۔ داستان میں کوئی بات نئی نہیں ملتی۔ داستان کو ابواب کے ماتحت منقسم کیا گیا ہے اور ہر باب کو چمن سے موسوم کیا گیا ہے۔

شاہان اودھ کے زمانہ میں نثری داستانوں کو خصوصیت حاصل تھی۔ پچاس ساٹھ سال کے عرصہ میں کئی داستانیں لکھی گئیں مگر ان میں کوئی جدت نہیں۔ ایک ہی داستان کے طرز پر دوسری داستانیں لکھی گئی ہیں جن میں دیوؤں اور طلسمات کے واقعات ملتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ عام طور سے اس زمانہ میں لوگوں کا کیا مذاق تھا اور کس قسم کی داستانوں سے دلچسپی لی جاتی تھی۔

دوسری داستانوں کی طرح ہشت چمن سے بھی اُس زمانہ کے رسم و رواج تمدن اور تہذیب و کلچر کا پتہ چلتا ہے اور ہندو مسلمانوں کے اتحاد اور اتفاق یگانگت اور یک جہتی کا انکشاف ہوتا ہے۔

ہشت چمن کا مصنف ہندو ہے مگر داستان کے ہیرو مسلمان ہیں جنھیں مذہب سے کافی شغف ہے اور اُن کی دعاؤں کے قبولیت کا بار بار اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، مصنف کہیں ہندو دیومالا کا اظہار نہیں کرتا بلکہ مسلمانوں کے کلچر کی تشریح کرتا ہے۔ پریوں، دیوؤں، طلسمات، قالب کے تبدیل کرنے، پریوں کا تخت رواں پر سفر کے علاوہ اندر سبھا کے پرستان اور اس کی پریوں کی طرح نہ صرف نام دیے گئے ہیں بلکہ راجہ اندر کی طرح بادشاہ کو رقص سے خوش کر کے انعام حاصل کرنے کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ داستان امانت کی اندر سبھا سے پہلے لکھی گئی ہوگی اس لیے اسے اندر سبھا کا پیشرو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک میرے معلومات ہیں یہ داستان طبع ہو کر شائع نہیں ہوئی ہے۔ سخاوت مرزا صاحب نے اردو کی نثری داستانوں کی تنقید میں اس داستان کا نام تو لیا ہے مگر غالباً کتاب ان کی نظر سے نہیں گزری۔ اس لیے اس کو منظوم داستان قرار دیا ہے حالانکہ یہ نثری داستان ہے۔ اس کے کسی اور نسخہ کا اب تک پتہ نہیں چلا ہے اس لیے نایاب کہنا چاہیے۔



منشی پریم چند کا پہلا ناول

(بسلسلہ صفحہ ۶)

جا سکتا تھا اور انہیں سے بھی نئے واقعات کا سلسلہ جوڑ کر اسے طول دیا جا سکتا تھا۔

ہاں اتنا ضرور ہے کہ سرشار کے قصوں کے برعکس یہ ایک مقصدی ناول ہے۔ پریم چند نے اس کے بہانے کچھ کہنا چاہا ہے اور اس کے ہر صفحے میں ہندو سماج کی اصلاح کا جوش و جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ پریم چند گرد و پیش کی زندگی کو کڑی تنقید کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ناول کی فنی قدر و قیمت کے بارے میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ پریم چند کی نوجوانی اور نو مشقی کے دور کی اولین تخلیق ہے۔ اس میں فنی ہم آہنگی، تناسب اور اس نظم و ضبط کی تلاش بے سود ہے جو ناول کی جان ہوتا ہے۔ واقعات، اشخاص اور مکالمے دل چسپ اور جاندار ہیں لیکن ان کی ترتیب میں کسی خاص سلیقے یا فنی مہارت کو دخل نہیں۔ اس کے باوجود پریم چند کے مطالعے کے سلسلے میں یہ ایک اہم دستاویز ہے۔ یہ وہ ثمر اولیں ہے جو ہندوستانی ادبیات میں نئی بہاروں اور نئے برگ و بار کی بشارت تھا۔



کنول پرشاد کنول

میری ہر سانس، نئی لَے میں ترا ہی سنگیت
میرا ہر شعر، نئے روپ میں صورت تیری
میری ہر فکر، ترا دھیان، تری ہی پوجا
میرا ایمان، بہ ہر رنگ عبادت تیری

شاعری حسن کی تفسیر ہوئی جاتی ہے
زندگی درد کی تصویر ہوئی جاتی ہے
تیرے قدموں نے چھوا جس کو بصد ناز اے دوست!
اب وہی خاک دل اکسیر ہوئی جاتی ہے

زندگی کی اُداس راتوں میں
اس طرح تیری یاد آتی ہے
ظلمتِ شب کو جس طرح بجلی
کوند کر آئینہ دکھاتی ہے

چھوا جب ترے نرم تارِ نظر نے
لگا، جیسے ہر چاکِ دل سل گیا ہے
کہو تشنگی سے کہیں ڈوب جائے
مجھے ساغرِ زندگی مل گیا ہے



کیلاش ماہر

کچھ ہو ساقی، ترا ہر جام عنایت تو نہیں
دل میں حسرت ہے مگر ہاتھ میں طاقت تو نہیں

شامِ ہجراں میں کبھی پہلے اُجالا نہ ہوا
شاملِ درد کوئی چشمِ عنایت تو نہیں

دردِ پنہاں بھی سہی، چشمِ گریاں بھی سہی
اپنے ہونٹوں پہ مگر حرفِ شکایت تو نہیں

اہلِ دل جس کو ترا پیار سمجھ بیٹھے ہیں
وہ تبسم کوئی در پردہ شرارت تو نہیں

کم نگاہی بھی تری بزم میں مائل نہ ہوئی
اہلِ غم کو تری نظروں سے عداوت تو نہیں

بخششِ عام سہی تیری نگاہوں میں مگر
اپنا دامن کبھی پھیلاؤں یہ عادت تو نہیں

سُن تو لو، سُن کے مگر ضبط نہ ہوگا ماہر
دل کی روداد ہے یہ کوئی حکایت تو نہیں

شمالی ہند میں اُردو شاعری کا ابتدائی دور

محمد انصار اللہ نظر

اُردو کی ابتدا کے متعلق مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے :

" زبان اُردو کے ظہور پر خیال کریں اور اس کی تصانیف پر نگاہ کریں تو اس میں نثر سے پہلے نظم نظر آئے گی اور یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کہے اور پھر باتیں کرنی سیکھے، ہاں نظم جوشِ طبع تھا اس لیے پہلے نکل پڑا ...... امیر خسرو نے کہ جن کی طبیعت اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی ملک سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے ایک طلسم خانہ انشا پردازی کا کھولا ...... اس میں فارسی کی بحروں نے اول اثر کیا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کون کون سے الفاظ مستعمل تھے جواب متروک ہیں[1]"

خواجہ ابوالحسن امیر خسرو ۶۵۱ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ گو یہ صحیح ہے کہ ان ی تصانیف میں ایک حصہ الحاقی ہے۔ مگر یہ تو ماننا ہی پڑے گا اُنھوں بتہ میں شعر کہے۔ اُن کی اکثر پہیلیوں اور مکرنیوں وغیرہ کی قدامت تو بہرطور ہے۔ اسی لیے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُردو شاعری کی بنا اُنھوں نے ڈالی۔ مرو کے کلام کی ایک لسانی اہمیت بھی ہے۔ اس میں کھڑی بولی کے خصوصیات ہیں جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اُردو برج بھاشا سے نہیں بلکہ ی بولی سے نکلی اور یہ ابتدائی شکل میں زبان دہلوی کے نام سے منسوب ہوئی تھی۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ خواجہ امیر خسرو کے بعد بھی شاید چلتا لیکن حکومت کی منتقلی کے ساتھ ساتھ زبان کا مرکز بھی دہلی سے ہٹ کر دیوگیر (دولت آباد) ہوا۔ سلطنت بہمنی کے قیام کے بعد گلبرگہ نے مرکزی اہمیت حاصل کرلی اور دہلی کے صاحب قلم بھی وہیں جا بسے۔ عہد بہمنی میں خواجہ گیسو دراز اور ان کے بیٹے پوتے اور شیخ عین الدین گنج العلم وغیرہ بزرگ نامور صاحب قلم ہوئے۔ یہ سب دہلی الاصل تھے۔ خواجہ گیسو دراز دکن میں اُردو نثر کے پہلے مصنف تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن ان بزرگ کے یہاں اُردو میں شعر بھی ملتے ہیں۔ بہرحال ان حضرات کی بدولت دکن میں اُردو نظم و نثر میں تالیف و تصنیف کا کام شروع ہوا۔ البتہ دہلی میں اس لحاظ سے عرصۂ دراز تک سناٹا رہا۔ پھر بھی لالہ سری رام نے اکبری نورتن ملا عبدالمومن دو پیازہ کے متعدد مزاحیہ اشعار اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں[2]۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے دربار شاہ جہانی کے ملک الشعرا پنڈت چندر بھان برہمن کے نام سے ایک اردو غزل پیش کی ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے فائز دہلوی کا دیوان تلاش کیا ہے جو دہلی میں دلی کی آمد سے پہلے ۱۷۰۰ء کا مرتب کردہ ہے۔ عالمگیر اورنگ زیب کا یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاہ جہاں نے خود اُردو کو مکتوب نگاری کے لیے استعمال کیا تھا" آں فرمانِ عالی کہ در زبان ہندی از دستخطِ خاص رقم فرمودہ شاہد ایں معانی ست[3]"۔ خود عالمگیر نے اپنے رقعات میں جابجا اُردو الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ان میں اگرچہ کئی باتیں ابھی تحقیق طلب ہیں پھر بھی اتنی بات تو ثابت ہی ہو جاتی ہے کہ دکن میں اُردو کا مرکز ہو جانے کے باوجود دہلی میں مقامی زبان کی ترقی ختم نہیں

---

[1] آبِ حیات ص۔۔

[2] خمخانۂ جاوید جلد۲ [3] اُردوئے قدیم ص۱۱۲

نہیں ہوگئی تھی البتہ تصنیف و تالیف کا کام متوقع درجے تک نہ ہو سکا۔ حیرت اس بات پر ضرور ہوتی ہے کہ عالمگیر اور نگ زیب کے زمانے سے اُردو نے اس قدر تیزی سے ترقی کیوں کر کی کہ فارسی جیسی علمی اور اَدبی زبان کو ہٹا کر خود دربار دل میں چھا گئی۔ اس کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ اورنگ زیب کے عہد میں مذہب کی تبلیغ کی طرف توجہ کی گئی۔ اس مقصد کے لیے علمی زبان کی جگہ عوامی بولی زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ نور جہاں کے اثر سے قلعۂ معلّٰی میں ایرانی اثرات کو کافی تقویت پہنچی تھی۔ اورنگ زیب کے اورنگ نشیں ہوتے ہی ایرانیت کے اثرات کمزور پڑ گئے۔ بادشاہ کے مسلک نے بھی فارسی کے زور پر ضرب ضرور کی ہوگی۔ دکن کی حکومتیں ختم ہوئیں اور وہاں بھی مغلوں کا جھنڈا لہرانے لگا۔ دکن میں اُردو کا رواج علمی اور ادبی زبان کی حیثیت سے ایک مدّت سے تھا۔ اہلِ دکن سے دہلی والوں کے اختلاط نے بھی اُردو کی شمالی ہند میں ترقی کو مہمیز کیا ہوگا۔

شمالی ہند کے قدما میں ہمیں میر جعفر زٹلی کے یہاں اُردو شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ شاہزادۂ محمد عظیم کے متعلق اُن کا ایک شعر ہجو کا یہ ملتا ہے ؎

چہارم پسر ڈومنی کا جنا ۔ برج میں رہے جوں ۔۔۔۔[1]

اس سے زٹلی کے زمانے کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی شاعری کے متعلق اگرچہ آزاد نے التفات نہیں برتا اور صرف اتنا کہا کہ "میر جعفر زٹلی کے کلام کو محمد شاہی بلکہ اس سے پہلے زمانے کا نمونہ کہتا مگر زٹلی کا اعتبار کیا؟[2]" لیکن صحیح ہے کہ سنجیدہ اور عالمانہ گفتگو سے کہیں زیادہ شگفتگی اور ظرافت دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ زٹلی کی اسی مزاحیہ شاعری نے لوگوں کو اُردو شاعری کی طرف متوجہ کیا ہو۔ زٹلی کے قریب العہد شعرا میں محمد افضل افضلؔ پہلے شخص معلوم ہوتے ہیں جو اُردو میں شعر کہتے تھے، اُن کے متعلق میر حسن فرماتے ہیں:

"افضل: محمد افضل افضلؔ تخلص از قدیم است ۔۔ ۔۔ ۔ نصفے فارسی و نصفے ہندی دارد لیکن قبولیت داد الٰہی ست بر لبہا ترمی کند از آں جملہ است:

مسافر سے جنھوں نے دل لگایا
اُنھوں نے سب جنم روتے گنوایا" (تذکرۂ میر حسن ص۳)

ان کی شاعری میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ شگفتگی بھی پائی جاتی ہے جیسا کہ شعر مذکور سے اندازہ ہوتا ہے۔

افضلؔ کے علاوہ اس عہد کے بزرگوں میں بیدلؔ، فطرتؔ اور اُمیدؔ

۱؎ نکات الشعرا ص۳۰، شعرائے اُردو از میر حسن ۲؎ آب حیات ص۲۴

نامور ہوئے۔ یہ اپنے زمانے میں فارسی کے شعرا کی حیثیت سے نمایاں درجہ رکھتے تھے لیکن اُردو میں کبھی کبھی ایک دو شعر کہہ لیتے تھے۔ شاید تفریحاً تبدیل ذائقہ کے لیے۔ باقاعدہ طور پر اُردو شاعری سے ان کو علاقہ نہ تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اُردو کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ اس موقع پر تذکرہ نویسوں کے یہ جملے اہمیت سے خالی نہیں:

بیدلؔ: "شاعر پر زور فارسی ۔۔ ۔۔ دو شعر ریختہ بنام او شنیدہ می شود، شاید بہ تقریبے گفتہ باشد" (نکات الشعرا ص۱۷)

اُمیدؔ: "۔۔ ۔۔ شاعر غرائے فارسی ۔۔ ۔۔ او ہم تشریف می داشت، چون مرا از دور دید گفت کہ خوش باشد کہ من ہم دریں ایام دو شعر ریختہ موزوں کردم بشنوید" (نکات الشعرا ص۲)

لگے ہاتھوں نمونۂ کلام بھی دیکھتے چلیے:

[3] با نازِ حور و حُسنِ ملک، جلوۂ پری
با من کی بیٹی ایک مری آنکھ موں پڑی (کھڑی)
رفتم بہ پیش و گفتم جانم فدائے تست
غصّہ کیا و گالی دیا اور دگر لڑی (اُمید)

[4] از زلفِ سیاہِ تو بدل دھوم پڑی ہے
در گلشنِ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے (فطرت)

۳؎ گلشن ہند ص۲۰ تعجب ہے کہ آزاد نے اس کے بجائے صرف ایک شعر لکھا ہے وہ بھی اس طرح ؎ با من کی بیٹی آج مری آنکھ موں پری
غصہ کیا و گالی دیا اور دگر لری (آب حیات ص۹۵)

۴؎ مخزن نکات ص۱۲، نکات الشعرا ص۴۲، شعرائے اردو میر حسن ص۱۳۵: تعجب ہے کہ آزاد اس مطلع کو ایک بار قزلباش خاں اُمید کے نام سے اس طرح لکھتے ہیں:

از زلفِ سیاہِ تو بہ دل دھوم پڑی ہے ۔ در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

پھر حاشیہ پر خود ہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ "سودا نے اپنے تذکرے میں اسی شعر کو خان آرزو کے نام سے اس طرح لکھا ہے اور میر انشاء اللہ خاں نے اپنے دریائے لطافت میں قزلباش خاں امید کے نام پر اسی شعر کو اس طرح لکھا ہے اور بعض تذکروں میں اس شعر کو میر معز اور فطرت کے نام سے لکھا ہے واللہ اعلم (آب حیات ص۱۲۹) یہی نہیں بلکہ ایک دوسرے موقع پر سراج الدین علی خاں کے نام سے لکھا ہے اور اس طرح:

۵؎ از زلفِ سیاہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے ۔ آئینے کے گلشن میں گھٹا جھوم پڑی ہے (ص۱۴۹)

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کا لب و لہجہ وہی فارسی کا ہے۔
ں پر فارسی الفاظ اور محاورات چڑھے ہوئے تھے انھیں کو نظم کر گئے۔ پھر بھی
ی اور شگفتگی کا امتزاج داد طلب ہے۔ بہر حال ان بزرگوں نے شروعات
ی تھی۔ ان کے بعد شوخ طبع، شگفتہ مزاج اور ظریف شعرا کا ایک گروہ پیدا
ں نے اُردو کی طرف زیادہ توجہ کی۔ ان میں محمد شاکر ناجی، مصطفیٰ خاں
گ، احسن اللہ، نجم الدین شاہ مبارک آبرو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تذکرہ
، میں سے بیش تر حضرات کو ظریف اور شوخ طبع کہا گیا ہے۔ اس لیے یہ
اجا سکتا ہے کہ ان حضرات نے اُردو شاعری تفریحاً شروع کی تھی۔ ذیل
ہے دو شاعروں کے متعلق تذکرہ نویسوں کے بیانات پیش کیے جاتے ہیں:

"آبرو: شاعر نادرہ گوی ریختہ، می گویند کہ طبعی بخوشی داشت۔ غرض مستغنی
وقت خود بود کہ عہد محمد شاہ باشد۔" (نکات الشعرا ص۹)

"غنچۂ گلزار گفتگو ۔۔ ۔۔ شاعر خوش گوئے در وقت خود بود۔"
(تذکرۂ میر حسن ص۲)

"ناجی: جوانے البدرو ۔۔ ۔۔ مزاجش بیش تر مائل بہ ہزل بود ۔۔ ۔۔
شعر ہزل خود می داند و مردماں را بہ خندہ می آرد و خود نہ می خندید مگر گاہے
تبسمے می کرد۔" (نکات الشعرا ص۲۳)

ت معمولی فرق کے ساتھ میر حسن نے بھی اپنے تذکرے میں کہی ہے۔ اور تذکرۂ
یزی میں ہے:

"طبعش اکثر مائل بہ اہاجی بود۔" (ص۱۴۱)

اس دور کی شاعری مقصدی طور پر بھی تفریحی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت
بان میں اتنی وسعت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ اعلیٰ مضامین اور بلند خیالات
یے جا سکتے۔ ان شاعروں کے سامنے زٹلی کا نمونہ موجود تھا جو اپنی مزاحیہ
ی کے لیے مشہور اور زندہ جاوید ہوئے۔ ان شعرا کی طبیعت بھی شگفتہ
ر کی طرف مائل تھی۔ انھوں نے برج بھاشا کی طرف بھی توجہ کی۔ برج بھاشا
ہروں میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اکثر ایک ہی لفظ کو ایک سے زیادہ معنوں
م کیا جاتا تھا۔ اُردو کے ان شعرا کے ذہن اس طرف بھی مائل ہوئے اور اس
ردو شاعری میں ایہام گوئی شروع ہو گئی۔ ان شعرا کے متعلق آزاد نے بڑی
بات کہی ہے:

"خوش مزاجی کا یہ عالم ہے کہ ان کے بڑھاپے کی زندہ دلی سے آج

نوجوانوں کی جوانی پانی پانی ہوتی ہے، ان شوخیوں سے انھیں کچھ اور مطلب
نہیں ہو مگر یہ کہ اپنے اوپر ہنسیں اور دل کو خوش کریں۔" (آبِ حیات ص۱۰۶)

ان شعرا کی اَدبی نشستیں بھی ہوتی رہتی تھیں جن کے لیے شاید میر کے زمانے میں
یا اس سے کچھ قبل مشاعرہ کے وزن پر لفظ "مراختہ" بولتے تھے (نکات الشعرا ص۱۴۷)
ان نشستوں میں یہ ایک دوسرے پر چوٹیں بھی کرتے تھے۔ آپس میں تعریفیں بھی ہوتی
تھیں، اور خود ستائی سے بھی کام لیتے تھے۔ اس سلسلے کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

سخن سنجاں میں ہے گا آبرو آج
نہیں شیریں زباں شاکر سری کا (آبرو)

یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت ولے
مظہر کا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں (یکرنگ)

غزل اس طرح سے کہنی بھی احسن تجھ سے بن آوے
جواب آبرو کب کہہ سکے مضمون بہتر سوں[1] (احسن اللہ)

پانی پت آج چھوڑ جو گنّور تم چلے
تو راہ بیچ جا یو جاناں سنبھال کے (آبرو)

اس تفریحی شاعری پر تنقیدیں بھی کی جاتی تھیں لیکن وہ بھی زیادہ تر ظریفانہ
ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر شاہ آبرو نے جو یک چشم بھی تھے ایک شعر کہا ؎

تمھاری لوگ کہتے ہیں کمر ہے[2] کہاں ہے، کس طرح کی ہے، کدھر ہے؟

قائم کہتے ہیں کہ کسی شخص نے اس شعر پر لطیفہ کہا: "کانا چہ خوب شعر اندھا گفتہ"
(مخزنِ نکات) ظاہراً ان تنقیدوں یا اس قسم کی جملہ بازیوں کی اہمیت معلوم
نہیں ہوتی مگر غور کیجیے تو یہی اُردو کی اس قدر سُرعت سے ترقی کا سبب ہے۔ اس
قسم کی تنقیدوں نے عوام میں اُردو سے دل چسپی پیدا کی۔ چنانچہ بہت لوگ ایسے
ہوں گے جو محض اس "بیٹھک" میں دل چسپی لینے کے لیے اُردو میں شعر کہنے
لگے ہوں گے۔ یہاں میں مثالاً ایک دو شاعروں کا حال نقل کرتا ہوں:

---

[1] آبِ حیات ص۱۲۹۔ لیکن گلشنِ گفتار میں یہی مقطع اس طرح تحریر ہے ؎
غزل اب احسن اللہ اس طرح تجھ سے بن آئی ہے
جواب اب آبرو کب لا سکے مضمون بہتر سوں

[2] پہلا مصرع بعض تذکروں میں اس طرح بھی لکھا ہے:
میاں کے لوگ کہتے ہیں کمر ہے

قبولؔ : "چوں دید کہ ہنگامۂ ریختہ گرم است خود ہم بطور خود می گفت ۔"
(تذکرۂ میر حسن ص۱۲۵)

مرزا گرامی : "۔۔۔ چوں دید کہ ہنگامۂ ریختہ گرم شد خودش نیز شعر ریختہ گفت ،
بطور سے کرداشت ۔" (نکات الشعرا ص۹)

ایسے بزرگ شاعر بھی ہوں گے تو محض ان ریختہ گویوں کی خاطر سے اس طرف کبھی کبھی ملتفت ہو جاتے ہوں گے ۔ تذکروں میں اس کا حوالہ بھی ملتا ہے مثلاً

ساماںؔ : "میر ناصر ساماں متاعِ سخن گوئی از بازار تربیت میرزا مظہر اندوختہ
۔۔۔ احیاناً خیال ریختہ ہم بہ خاطرش می ریخت ۔" (تذکرۂ گردیزی ص۹۵)

بے تابؔ : "۔۔۔ از برائے خاطر ریختہ گویاں گاہ گاہے دو سہ بیت
می گوید ۔" (تذکرۂ میر حسن ص۳۱)

مصیبؔ : "۔۔۔ گاہ گاہے برائے خاطر ریختہ گویانِ آں دیار ریختہ ہم
می فرمود ۔" (تذکرہ میر حسن ص۱۵۵)

ایک اور چیز جو ذہن کو متوجہ کرتی ہے یہ ہے کہ تذکروں میں جا بجا "گپ زدن" اور "فکر شعر کردن" کو ایک ساتھ لکھا ہے ۔ اس سلسلے میں تذکروں کے چند اقتباسات پیش ہیں :

پیامؔ : "شاعر قرارداد شاعران فارسی عہد خود بود ، وصاحب دیوان ریختہ نیز
۔۔۔ ہمیشہ اتفاق باہم نشستن و فکر شعر کردن و گپ زدن می افتد ۔"
(نکات الشعرا ص۲۶)

حشمتؔ : "۔۔۔ در شعر ریختہ کہ بسیار پاجیانہ می گفت گپ ہا دارد ۔"
(نکات الشعرا ص۱۰۵)

سلامؔ : "۔۔۔ اکثر اوقات اتفاق باہم فکر شعر کردن و گپ زدن و مزاح
نمودن می اُفتد ۔" (نکات الشعرا ص۱۳۲)

ان اقتباسات سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاعری کا مزاج اس وقت تک بھی تفریحی ہی تھا ۔

شمالی ہند کی اُردو شاعری کے ارتقا میں دربار کو بھی بہت دخل رہا ہے ۔ چنانچہ آبرو ، احسن اللہ وغیرہ کے عہد میں ہی اُس نے قلعہ معلّیٰ میں بار پا لیا تھا ۔ زٹلی نے تو شاہزادے ہی کی ہجو کی تھی اور اس کے لیے اسی زبان ریختہ کو کام میں لائے تھے ۔ پھر مضمونؔ کی ایک غزل کا مقطع بھی اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ محمد شاہی دور تک اُردو سے بادشاہوں کو دلچسپی ہو چلی تھی ۔ یہ صحیح ہے کہ مضمونؔ نے صرف اشارہ کیا ہے لیکن یہ اشارہ ہی کیا کم ہے :

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سوں[1]

شاعری کے اس پس منظر سے گزر لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس عہد کی شاعری کا نمونہ بھی دیکھ لیا جائے :

حشر میں پاک باز سے ناجی
بد عمل جائیں گے سقر کی طرف   (ناجیؔ)

یک رنگ پاس اور سخن کچھ نہیں بساط
رکھتا ہوں میں دو نین کہو نذر کروں
اس کو مت جانو میاں اوروں کی طرح
مصطفیٰ خاں آشنا یک رنگ ہے   (یک رنگؔ)

یہی مضمونِ خط ہے احسن اللہ
کہ حسن خوب رویاں عارضی ہے   (احسن اللہ)

یہ اشعار اُس عہد کی تفریحی شاعری کا پرتو دکھاتے ہیں ۔ جو خیال ذہن میں آ جاتا ہے اُسے بلا تکلف اور بلا تصنّع نظم کر دیتے ہیں ۔ ان کے متعلق آزاد کی رائے دیکھیے

"ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے دل میں جو خیالات گزرتے ہیں وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں ۔ ایچ پیچ کے خیال ، دور دور کی تشبیہیں ، نازک استعارات نہیں بولتے ۔ اسی واسطے اشعار بھی صاف اور بے تکلف ہیں اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ہر ایک زبان اور اس کی شاعری جب تک عالم طفولیت میں ہوتی ہے تب تک بے تکلف ، عام فہم اور اکثر حسب حال ہوتی ہے ۔ اسی واسطے لطف بخش ہوتی ہے ۔" (آب حیات ص۱۰۶)

---

[1] گلشن گفتار ص۱۹ ۔ اس زمین میں مضمونؔ کی پوری غزل موجود ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ آزاد نے اس شعر کو ولیؔ کے نام سے منسوب کیا ہے اور اس پر عجیب و غریب قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں (آب حیات ص۱۱۳) آزاد کا اس سلسلے میں ماخذ کیا ہے اس کا علم نہیں کو ہوگا مگر اُس عہد کے تذکرہ نویس مثلاً میر ، قائم ، علی لطف ، علی ابراہیم ، حمید ، گردیزی ، میر حسن ، حتیٰ کہ فائق تک کے تذکروں میں یہ شعر ولیؔ کے کلام کے ساتھ تحریر نہیں ہے ۔ آزاد نے شعر کو اس طرح لکھا ہے :

دل ولیؔ کا لے لیا دلّی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

سا کہ عرض کیا جا چکا ہے، شعرا ایہام گوئی کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ رفتہ رفتہ
بقت لے جانے کے جذبے نے اس صنعت کو ترقی دی اور شاعری کے لیے زبان
دو سے نہ صرف دل چسپی لی جانے لگی بلکہ اب ہمیں ایسے شعرا بھی ملنے لگتے ہیں جو
رف اُردو میں کاوش کرتے تھے اور ایہام گوئی کو ترقی دیتے تھے۔ احسن اللہ کا یہ
عر اسی کمال کا ایک نمونہ ہے :

یہی مضمونِ خط ہے احسن اللہ　　کہ حُسنِ خوب رویاں عارضی ہے

س مقطعے کے ہر لفظ میں کم و بیش ایہام کی صنعت پائی جاتی ہے۔ عارضی اگرچہ
یر مستقل کے معنی میں آتا ہے لیکن یہاں حرف "یا" کو اگر یائے نسبتی سمجھ لیں تو
س سے عارض کی طرف مناسبت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ خط بہ معنی مکتوب یا تحریر
ستعمل ہے لیکن یہاں اس سے موے عارض بھی مراد لے سکتے ہیں۔ خوب رویاں
ں الاصل "خوب رو" کی جمع کی حیثیت سے نظم کیا گیا ہے مگر شعر میں لطف یہ ہے کہ
خوب رو" اور "یاں" (یہاں) دونوں کو الگ الگ لفظوں کی حیثیت سے دیکھیں تو
ھی شعر بامعنی ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ اس شعر میں تخلص میں بھی ایہام کا شائبہ ملتا ہے۔
س قسم کی شاعری جہاں تک بیان کا تعلق ہے تصنع سے خالی نہیں اور
یا عجب ہے اگر یہ روش کچھ عرصے اور قائم رہ جاتی تو اُردو شاعری کی ترقیاں ختم
ہ جاتیں یا اگر اس روش کو کچھ عرصے اور چلنے دیا جاتا تو اُردو شاعری میں تصنع ہی
صنع، آورد ہی آورد ملتا اور وہ بے کیفی اور بے اثری ہوتی کہ خدا کی پناہ لیکن
س سے ایک فائدہ بھی پہنچا۔ ایک تو یہ کہ زبان کے لغات تیار ہو گئے۔ دوسرے
ھی ہوا کہ زبان میں صفائی اور شستگی کی طرف رجحان پیدا ہوا۔ بہتر شعر اور بہتر
مضامین کی تلاش کا جذبہ شعوری طور پر اُبھر آیا اور اس طرح اُردو شاعری میں ترقی
ی صلاحیتیں پیدا ہو گئیں۔

ولی اورنگ آبادی نے شعرائے دکن کو دیکھا تھا۔ نصرتی جیسے زبردست
شاعر کا کلام اُن کے سامنے تھا۔ دکن میں اُردو برسہا برس سے ترقی کے منازل طے
رتی ہوئی نکھر چلی تھی۔ ولی نے اُس نکھری ہوئی زبان میں شعر کہے تھے۔ وہ اُردو
میں محض تفریحاً شعر نہ کہتے تھے بلکہ اس کو ادبی اور علمی کارنامے کی حیثیت سے اختیار
یے ہوئے تھے۔ ان کے یہاں نکھرے چھنے خیالات اور سنورے ہوئے جذبات
لتے تھے۔ شعرائے دہلی میں ان سے استفادے کی صلاحیتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ چنانچہ
لی کا دیوان آتے ہی شعرا اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ آزاد دہلوی لکھتے ہیں :

"غرض جب اُن کا دیوان دلی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر
لیا۔ قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت نے زبان سے پڑھا۔ گیت
موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں انھیں کی غزلیں گانے بجانے لگے۔
ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے اور جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انھیں دیوان
بنانے کا شوق ہوا۔" (آبِ حیات ص۱۱۳)

یہاں ہم ایک لسانیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کریں گے۔ دہلی کا علاقہ وہ ہے
جسے لسانی اعتبار سے مدھیہ دیش میں شمار کیا جاتا ہے۔ دہلی والے ہر زمانے
میں اپنی زبان کو دوسروں کی زبان سے زیادہ مستند اور لائق تقلید سمجھتے تھے۔
چنانچہ عہد پراکرت میں بھی یہ پورب کی زبانوں کو اپنی زبان سے کم تر سمجھتے تھے۔ اسی
مدھیہ دیش سے شورسینی پراکرت اور اپ بھرنش زبانیں پیدا ہوئیں جو شمالی ہند کی عام
بولی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہیں کھڑی بولی نے بھی سر اُٹھایا جو دور دور تک رائج ہوئی۔
یہی زبانِ دہلوی دکن میں جا کر پروان چڑھی اور زبانِ دکھنی یا دکنی کہلائی۔ اب
غور طلب یہ ہے کہ ان دہلویوں پر ولی کے دیوان کا کیا اثر ہوا ہوگا؟ انھوں نے
اپنی ہی زبان میں ایک غیر دہلوی کی شاعری سُنی۔ کیا اُن کو اپنی کوتاہی بلکہ فروگزاشت
کا شدت سے احساس نہ ہوا ہوگا؟ کیا اُن کو یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ ہمیں بھی جس قدر
جلد ممکن ہو اس زبان کو علمی حیثیت دے دینی چاہیے؟ انھیں یہ احساس یقیناً
ہوا ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی زمانے میں اصلاحِ زبان کی ایک تحریک سی
پیدا ہوتی ہے جس میں حاتم اور خانِ آرزو سب سے پیش پیش رہتے ہیں۔ خانِ آرزو
اکبر آباد کے رہنے والے تھے جو برج کا علاقہ تھا۔ انھوں نے ملا عبدالواسع کی لغت
کی اصلاح کی تو سند "افصح زبانہا" یعنی برج بھاشا سے لی اور ملا صاحب کی لغت
کو کاٹ چھانٹ کر رکھ دیا۔ نوادر الالفاظ اُن کا کارنامہ ہے۔ لیکن شاہ حاتم دہلی کے
رہنے والے تھے۔ وہ کھڑی بولی کے محاورات اور روزمرہ سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں
نے زبان کو روزمرۂ دہلی کے مطابق ڈھال دینے کی کوشش کی۔ خود لکھتے ہیں :

"اکثر الفاظ را از نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر
الاستعمال باشند و روزمرۂ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیحانِ رند در محاورہ دارند
منظور دارد۔"

آزاد اس دور سے پہلے کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اُن کی زبان ایک ہی سمجھنا چاہیے مگر ولی نے اپنے کلام میں ایہام
اور الفاظ ذو معنی سے اتنا کام نہیں لیا۔ خدا جانے ان کے قریب العہد
بزرگوں کو پھر اس کا شوق اس قدر کیوں کر ہو گیا۔ شاید دوہروں کا انداز ہو

ہندستان کی زبان کا سبزۂ خودرَو تھا اُس نے اپنا رنگ دِیا۔" (آبِ حیات ص۱۰۶)

لیکن آزاد نے شاہ حاتم کے دَور پر رائے دیتے ہوئے ایک جملہ اور بہت اہم لکھا ہے:

" اُن کی اصلاح نے بہت سے لفظ ولی کے عہد کے نکال ڈالے۔"

(آبِ حیات ص۱۲۷)

ممکن ہے کہ پہلے دکنیوں کے اختلاط سے کچھ دکنی الفاظ زبانوں پر چڑھ گئے ہوں لیکن بطورِ مجموعی ولی کا رنگ شاعری شعرائے دہلی نے قبول نہیں کیا۔ اگر شمالی ہند میں اردو شاعری کا رواج ولی کے اثر سے ہوتا تو اوّلیں دَور میں زیادہ سے زیادہ وہی خصوصیات ہو سکتے تھے جو ولی کے کلام میں موجود تھے، لیکن شمالی ہند کی شاعری میں ایہام گوئی کا رواج خود اس نظریے کے ابطال کے لیے کافی ہے۔ شاہ حاتم وغیرہ کے عہد میں روزمرۂ دہلی کے مطابق زبان کی اصلاح کی تحریک ولی کے مابعد کے زمانے میں اُن کی تقلید کے نظریے کو رد کرتی ہے۔ پھر بھی ولی کا بڑا احسان یہ ہے کہ اُن کے دیوان کو دیکھ کر شعرائے دہلی نے سبق لیا اور زبان کو آگے بڑھانے کی طرف شعوری طور پر قدم اُٹھایا۔ اس طرح جناب نصیر الدین ہاشمی کے اس خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے:

" اگرچہ یہ امر صحیح نہیں ہے کہ ولی اُردو کا پہلا شاعر تھا مگر یہ بات بالکل صحیح ہے کہ شمالی ہند میں ولی کے بعد ہی اُردو شاعری کا عام طور پر آغاز ہوا"

(دکن میں اردو ص۴۲)

شعرائے دہلی حسنات کے دل دادہ تھے۔ خوبیاں ان کو جہاں بھی مل سکتی تھیں اخذ کر لیتے تھے چنانچہ بیشتر حضرات نے ولی کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ خود حاتم ان کے شاگرد تھے۔ لیکن شمالی ہند کے اس دَور کے شعرا نے اردو شاعری کو ایک مقصد کے تحت اپنایا۔ اُن کا ایک جوشِ طبع تھا جس نے اُن کو اُردو شاعری کی طرف متوجہ کیا تھا۔ چنانچہ اُن کے اشعار میں سادگی کے باوجود ایک اثر اور ایک کیفیت ملتی ہے لیکن تفریحی خیالات سے یہ دَور بھی خالی نہ تھا۔ خود خانِ آرزو کے متعلق میر لکھتے ہیں:

آرزو: " ہمہ اُستادانِ مضبوط فنِ ریختہ ہم شاگردانِ آں بزرگوار اند گاہے برائے تفننِ طبع دو سہ شعرِ ریختہ فرمودہ ایں فن بے اعتبار را کہ ما اختیار کردہ ایم اعتبار دادہ اند۔" (نکات الشعرا ص۲)

میر حسن بھی یہی بات اس طرح کہتے ہیں:

آرزو: " اُستادانِ ریختہ نیز شاگردِ او اند برائے تفننِ طبع دو سہ ریختہ خود ہم فرمودہ۔" (تذکرۂ شعرائے اردو ص۵)

بہار: " ٹیک چند بہار ۔ ۔ ۔ گاہے بہ تفننِ طبع ریختہ ہم می گوید۔"

(تذکرۂ گردیزی ص۱۱)

اس دَور کے شعرا فارسی میں بھی اپنی اُستادی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ زبان کی اصلاح کے خیال نے بھی انھیں فارسی ادب ہی سے استفادے پر مجبور کیا۔

برج بھاشا یا سنسکرت کے بگڑے ہوئے الفاظ جو آبرو وغیرہ کے یہاں ملتے ہیں اِس دَور میں ترک ہو گئے اور فارسی سے استفادے کا مذاق بلکہ رجحان عام ہوا۔ فارسی کی نئی نئی تراکیب، تشبیہات، استعارات اُردو میں رفتہ رفتہ داخل ہونے لگے۔ رام بابو سکسینہ نے اس دور کے بزرگوں کی خدمات کو ان لفظوں میں سراہا ہے:

" شاعری کے واسطے کوئی طرز اب تک خاص نہیں تھی اور نہ اغراض شاعری کے واسطے کوئی خاص مناسبت زبان میں پیدا ہوئی تھی۔ بہت سے بھدے دکنی الفاظ و محاورات جو دیوانِ ولی کی بدولت زبان میں داخل ہو گئے تھے چھانٹنا اور نکالنا پڑے۔ اسی وجہ سے ان حضرات کے خدمات تصفیۂ زبان کے متعلق بہت لائقِ تحسین ہیں۔" (تاریخ ادب اردو ص۵۹)

فارسی کے اثر سے اُردو شاعری میں تصوّف کا اثر بھی پیدا ہوا۔ آزاد نے اس سلسلے میں اچھی بات کہی ہے:

" قاعدہ ہے کہ جب دولت کی بہتات اور عیش و نشاط میں کچھ نیکی کے خیالات آتے ہیں تو صوفیانہ لباس میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت محمد شاہی دَور نے در و دیوار کو دولت سے مست کر رکھا تھا جس سے تصوّف کے خیالات عام ہو رہے تھے ۔ ۔ ۔ زبانِ اُردو کے والدین یعنی بھاشا اور فارسی دونوں صوفی تھے۔" (آبِ حیات ص۱۱۲)

اس دَور کی شاعری میں ظرافت کے ساتھ ساتھ تصوّف نے مل کر عجیب دل چسپ رنگ پیدا کر دیا تھا۔ زبان صاف اور روزمرّہ کے مطابق ہوتی تھی۔ بے تکلفی اور برجستگی اس کی ایک خصوصیت تھی جس کے سبب سے اثر اور کیفیت کا پیدا ہو جانا بھی لازمی تھا چنانچہ آزاد کہتے ہیں:

" نہ استعاروں کے پیچ نہ تشبیہوں کی رنگارنگی۔ اپنے خیالات کو کیسی صاف زبان اور سیدھے سیدھے محاورے میں کہہ گئے کہ آج تک جو سنتا ہے سر دھنتا ہے۔ ان کا کلام قال نہ تھا حال تھا۔ جو خیال شعر میں باندھتے تھے اس کا عالم اُن کے دل و جان پر چھا جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ جس شعر کو دیکھو تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔" (آبِ حیات ص۱۵۱)

حقیقت تو یہ ہے کہ اس دور میں اردو شاعری میں وہ سب کچھ کسی نہ کسی درجے میں پیش کر دیا گیا جو بعد کو ترقی کر کے نوع نوع کے انداز دکھلانے لگا۔ نئے نئے طرز، نئے نئے موضوعات انھیں بنیادوں پر بعد میں پیش کیے گئے۔ تصوف کے ساتھ ساتھ اخلاقیہ اور عشقیہ موضوعات کی بھی بنیاد اسی دور میں پڑی۔ تلاشِ مضامین کا مذاق بھی اپنی ابتدائی شکل میں ان بزرگوں کے یہاں مل جاتا ہے۔ اسی مذاق نے بعد میں بلند خیالی مضمون آفرینی وغیرہ کی شکل اختیار کی۔ محاورہ بندی کا شوق جو ایک عرصے تک اساتذۂ اردو کی دلچسپیوں کا مرکز بنا رہا ہے اسی دور کی ایک خصوصیت ہے۔ بندشِ الفاظ جس کو ناسخ و آتش اصل شاعری سمجھتے رہے اس کی ابتدا بھی اسی دور میں ہوئی۔ غرض اردو شاعری کے یہ اولیں صناع بڑے مبارک تھے کہ انھوں نے اردو شاعری کی بنیاد ایسی متنوع اور وسیع قدروں پر رکھی کہ آج تک ہم انھیں بنیادوں پر ایک سے ایک بہتر عمارت تعمیر کرتے جا رہے ہیں۔ اب اس عہد کے بھی کچھ اشعار تبرکاً نقل کیے جاتے ہیں:

مثالِ بحر موجیں مارتا ہے ۔۔۔ کیا ہے جس نے اس جگ سے کنارا
حاتم بے کس کا تجھ بن کون ہے ۔۔۔ کون ہوگا جو نہ ہوگا تو مرا
کوئی دیتا نہیں ہے داد بیداد! ۔۔۔ کوئی سنتا نہیں فریاد، فریاد!
(حاتم)

صنم بنا تو خدائی میں تجھ کو کیا نہ ہوا ۔۔۔ ہزار شکر کہ تو بت ہوا خدا نہ ہوا
زخمِ دل تو سیا نہیں جاتا ۔۔۔ بن سیے بھی جیا نہیں جاتا
دل بستگی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے ۔۔۔ گویا کبھی چمن میں مرا آشیاں نہ تھا
(فغاں)

کہے ہے دار بھی کامل کو سرتاج ۔۔۔ ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج
(مضمون)

یار اگر منظور ہے دنیا و عقبیٰ سے گزر ۔۔۔ منزلِ مقصود ہے دونوں جہانوں سے پرے
اب جو اڑ بیٹھیں قفس کے بام پر معذور ہیں ۔۔۔ حیف آ گئے ہم نہ بوجھے اپنے بال و پر کی قدر
چمن میں مجھ سے دیوانے کے رہ جانے کا کیا حاصل؟ ۔۔۔ دکھا کر گل جنوں کو شور پر لانے کا کیا حاصل؟
(یقین)

اس عہد میں ایک اور کام یہ ہوا کہ فارسی اشعار کا اردو میں ترجمہ کیا گیا مثلاً مخلص کاشی کا ایک شعر ہے: در فراقِ تو چہا لے بتِ محبوب کنم ۔۔۔ صبرِ ایوب کنم، گریۂ یعقوب کنم

مضمون نے اسی چیز کو اردو میں اس طرح کہا ہے

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا ۔۔۔ صبرِ ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

اسی طرح کسی فارسی شاعر کا ایک شعر ہے:

ناخن تمام گشت معطر چو برگِ گل ۔۔۔ بندِ قبائے کیست کہ وا می کنیم ما

یقین نے اس کا اردو چربہ اس شعر میں اتارا ہے:

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کا بند ۔۔۔ برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

بہرحال ان اساتذہ نے اردو کو علمی و ادبی زبان کی حیثیت دے دی۔ وہی خانِ آرزو جو تفننِ طبع کے طور پر اردو میں دو تین شعر کہہ لینا کافی سمجھتے تھے اب تیز طبع نوجوانوں کو فارسی کے بجائے اردو میں شعر کہنے کا مشورہ دینے لگے۔ اس سلسلے میں آزاد دہلوی کے یہ بیانات اہم ہیں:

"سودا خانِ آرزو کے شاگرد نہ تھے مگر ان کی صحبت سے بہت فائدے حاصل کیے تھے۔ چناں چہ پہلے فارسی شعر کہا کرتے تھے۔ خانِ آرزو نے کہا مرزا فارسی اب تمھاری مادری زبان نہیں، اس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمھارا کلام اہلِ زبان کے مقابل میں قابلِ تعریف ہو۔ . . . تم اردو کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہوگے۔" (آبِ حیات ص ۱۴۱)

حاتم اور فغاں کے بعد شمالی ہند میں اردو کا وہ زریں عہد آتا ہے جس میں میر، سودا، درد، مظہر، سوز وغیرہ نے دادِ سخن وری دی۔ ان کے زمانے تک اردو نے ایک علمی اور ادبی حیثیت حاصل کر لی تھی جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قصیدہ نگاری کو اسی زمانے میں فروغ حاصل ہوا۔ حالاں کہ اس سے پہلے بھی دربار موجود تھے بلکہ ان درباروں کی حالت بہتر تھی، شعرا کی دربار تک رسائی بھی تھی اور وہ تمام مواقع مہیا تھے جو قصیدہ نگاری کے لیے ضروری سمجھے جا سکتے ہیں مگر زبانِ اردو میں وسعت نہ تھی اور وہ قصیدہ جیسی صنعتِ سخن کی گراں باری کی متحمل نہ ہو سکتی تھی لیکن اب وہ دور آ گیا تھا جب سودا نے قصیدے لکھے اور دھوم دھام سے لکھے۔ اس دور کی شاعری پر بحث کرنا یہاں مقصود نہیں۔ ایک بات البتہ اور کہنی ہے، وہ یہ کہ اس عہد تک چوں کہ اردو کو علمی زبان سمجھ لیا گیا تھا اس لیے شعرا کے تذکرے بھی لکھے جانے لگے تھے۔ اس سلسلے میں اولیت کا شرف شیخ قیام الدین قائم کو ہے جنھوں نے اپنا تذکرہ پہلے بیاض کی صورت میں مرتب کیا بعد میں اسے باقاعدہ تذکرے کی شکل دی۔ اس کے علاوہ میر تقی میر، میر حسن، سید فتح علی گردیزی وغیرہ نے بھی اردو شعرا کے تذکرے لکھے۔ اس کے بعد اردو شعر و ادب اور بھی ترقی کرتا گیا۔ شاعری میں نئے نئے اصناف کا اضافہ ہوتا گیا اور نئے نئے ایجادات و اختراعات سامنے آتے گئے۔

میرا محبوب

دانش فرازی

وہ جس کے عارضِ گلگوں سے پھول شرمائے
وہ جس کی جنبشِ لب پر سکوت للچائے
وہ جس کے پاؤں کی آہٹ سے ساز چھڑ جائے
وہ جس کی موجِ تبسّم، سحر کو چونکائے
وہ میرے دل کی شباب دھڑکنوں کو سنتا ہے
وہ میری فکر کی وادی میں پھول چنتا ہے

نگاہِ مست میں افسونِ کیف و جام و سبو
خرامِ ناز میں کیفیتِ رمِ آہو
وہ ایک شعلۂ لرزاں، وہ پھول پھول کی بو
گہر طراز، گہر رنگ، گل رخ و گل رو
وہ دھندلے دھندلے افق پر لرزتی پہلی کرن
متاعِ ذوقِ نظر، خاطرِ حزیں کی لگن

وہ جس نے موجِ شفق کا بھی روپ دھارا ہی
وہ جس نے صبح کی بستی میں دن گزارا ہی
سوادِ ظلمتِ شب بھی جسے گوارا ہی
وہ جس کو میں نے ہر اک نام سے پکارا ہی
میں اس کو ڈھونڈنے نکلوں تو پا نہیں سکتا
مگر وہ مجھ سے بچھڑ کر بھی جا نہیں سکتا

وہ روٹھ جائے تو نغموں کی آنکھ ہو پُرنم
نشاط ریز بہاروں کے لڑکھڑائیں قدم
پسینہ صبح کو آجائے، رو پڑے شبنم
کہ سرنگوں ہو شعاعوں کا نقرئی پرچم
گہر صدف میں، شفق بادلوں میں چھپ جائے
کہ جگمگاتے کناروں کا رنگ سنولائے

کبھی تو میں نے اُسے بدحواس دیکھا ہے
کبھی ملول و فسردہ، اُداس دیکھا ہے
خزاں کی شام کبھی محوِ یاس دیکھا ہے
مہکتی شاخِ نشیمن کے پاس دیکھا ہے
وہ نوکِ خار اُٹھالے تو ساز بن جائے
چلے تو شاہدِ ایام وجد میں آئے

ازل سے وہ بھی مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے
کبھی وہ میری طرح کروٹیں بدلتا ہے
سُبک روی سے چمن میں کبھی ٹہلتا ہے
کبھی ٹھہر کے ہواؤں کا رخ بدلتا ہے
میں اُس کو دیکھ کے عالم کو دیکھ لیتا ہوں
مزاجِ شعلہ و شبنم کو دیکھ لیتا ہوں

چتیز ۱۸۸۴

اپریل ۱۹۶۲ء

انتہا

حسن شہیر

(۱)

دامنِ شب میں وہ لہراتی ہوئی ندی کا شور
خاموشی میں چاند کی کرنوں کا سازِ دل نشیں
گنگنایا ہوگا تم نے اے مری صبحِ یقیں

(۲)

خامشی کے ساز پہ گایا کیے تھے ہم وہ گیت
جو ابھی تک میری دُنیائے حسیں کو خوش نما
تہنیت کے احمریں پھولوں سے مہکایا کیے

(۳)

توڑ ڈالا ہنس کے ہم نے وہ طلسمِ رنگ و بو
جس کی ہر ساعت میں اشکوں کا دیا روشن ہوا
آ رہی ہے صبح کے پھولوں کے ہنسنے کی صدا

غزل

نزہت زہرا نزہت

منزل ہے بہت دور مری راہ گزر سے
دُنیا کو گزرنا ہے ابھی شمس و قمر سے

ساقی ! مرے ساقی !! ترے دیدار کا ارماں
چھلکا ہے لہو بن کے مرے دیدۂ تر سے

رندوں پہ ہے رحمت کی نظر سب سے زیادہ
کیوں ورنہ گھٹا جھوم کے مے خانے پہ برسے

اک شام جو روزانہ گزر جاتی ہے آ کر
اُس شام کی اُمید ہے آغازِ سحر سے

اُٹھیں گی تمھیں دیکھ کے دُنیا کی نگاہیں
اللہ بچائے تمھیں دُنیا کی نظر سے

مہکا ہوا گلشن کی طرح کیوں ہو بیاباں
کیا بادِ صبا لائی ہے خوشبو ترے در سے

کانٹوں سے تو بچنا بہت آسان ہے لیکن
دل بچ نہ سکا پھولوں کے اندازِ نظر سے

مانگا ہے بڑے شوق سے دُنیا نے اُجالا
اور وہ بھی ترے عشق کی تاریک سحر سے

بے حوصلہ ملتی نہیں منزل کبھی نزہت
یہ بات کہے کون رفیقانِ سفر سے

ریہاند بند

ریہاند بند جواب پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اترپردیش کا مایۂ ناز بند ہے۔

یہ بند پانچ نمایاں خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں ایشیا کا سب سے بڑا ذخیرہ آب ہے اور اس بند کی تعمیر میں ساتوں اہرام مصر کے مجموعی حجم سے زائد مقدار میں سیمنٹ کنکریٹ استعمال کی گئی ہے۔ بند کو پتھر کی کانوں سے جو کیبل ویز (کیبل کے راستے) اور روپ ویز (رسی کے راستے) ملاتے ہیں، وہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ لمبے ہیں۔ اس کے علاوہ چوپن میں سون ندی پر جو پل پروجکٹ کے پہلے دور میں تیار کیا گیا ہے وہ ایشیا میں کنکریٹ کے پلوں میں سب سے بڑا پل ہے۔

ریہاند پروجکٹ مقررہ پروگرام سے قبل ہی مکمل کیا جا چکا ہے اس پروجکٹ کو جن نشیب و فراز سے گزرنا پڑا ہے ان سے ملک کے کسی بھی پروجکٹ کو گزرنا نہیں پڑا ہے۔ یہ سن ۱۹۳۶-۴۷ء کی بات ہے جب انڈین انجینیرز سروس کے مسٹر ڈائل نے اس کا خاکہ تیار کیا تھا لیکن دوسری جنگ عظیم شروع ہو جانے کے سبب یہ اسکیم معرض التوا میں پڑ گئی۔ مسٹر ڈائل کی کوششوں سے سن ۱۹۴۳ء میں اس پر دوبارہ نظرثانی کی گئی لیکن اس وقت تک یہ ایک خاکے کی ہی صورت میں رہی جب تک کہ پہلا پنجسالہ منصوبہ نہیں شروع کیا گیا۔ سن ۱۹۵۲ء میں اس پر تعمیر کا ابتدائی کام شروع کیا گیا لیکن اس مرتبہ بھی غیر ملکی زر مبادلہ کی دقتیں درپیش ہو گئیں اور اس وقت تک کوئی خاص کام نہیں ہوا جب تک کہ ٹکنیکل کواپریشن مشن کی امداد حاصل نہیں ہو گئی۔

ریہاند جھیل۔ ریہاند جھیل تقریباً ۱۸۰ مربع میل کے علاقہ میں پھیلی ہوئی ہے جس میں ۵۰ ہزار ایکڑ رقبہ اترپردیش میں ہے اور بقیہ رقبہ مدھیہ پردیش میں ہے۔ حکومت ہند نے اس ذخیرہ آب کو پنڈت گوبند بلبھ پنت مرحوم کے نام سے موسوم کیا ہے۔ تین طرف سے پہاڑ کی کھڑی چٹانوں سے گھرے ہوئے اس گوبند ساگر کے چوتھی طرف ۳۰۲۴ فٹ لمبا اور ۳۰۶ فٹ اونچا ایک بند ہے جس کی چوڑائی نچلے حصہ میں ۲۲۵ فٹ اور بلندی پر ۲۴ فٹ ہے۔ اس بند کی تعمیر میں ساڑھے تین لاکھ ٹن سیمنٹ کنکریٹ استعمال کی گئی ہے اور اس کو ۶۰ بلاکوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ زائد پانی نکالنے کے لیے اس میں ۱۳ راستے بنائے گئے ہیں۔

ریہاند کا بجلی گھر پانی کے دھلتی حالے میں بلاک نمبر ۲۷ اور ۳۳ کے درمیان نچلے حصہ میں واقع ہے۔ ذخیرہ آب کا پانی گیٹ کھلنے پر نیچے گر کر بکٹ سے ٹکرا کر ۸۰ فٹ اونچا اچھلتا ہے۔

اس بند کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مختلف حصوں کے معائنہ اور صفائی کے لیے چار سرنگیں بنی ہوئی ہیں۔ یہ سرنگیں مختلف بلندیوں پر تعمیر کی گئی ہیں اور ان کی لمبائی ۴۵۰-۶۰۰-۶۵۰ اور ۳۰۶۰ فٹ ہے۔ سب سے لمبی سرنگ کے دوسری طرف ۲۰۰ فٹ کی اونچائی تک پانی ہے۔ اس سرنگ سے گزرتے وقت دل میں جوش اور ہیجان کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔

اس علاقہ کو جہاں پہلے چاروں طرف جنگل تھے ایک جدید بستی میں تبدیل کر دیا گیا ہے جس میں ورک شاپ۔ بنگلے۔ کلب اور پختہ سڑکیں تعمیر کی گئی ہیں۔ اور بند کے ساگر میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت جزیرے ہیں جو سیر و تفریح کے بہترین مرکز بن سکتے ہیں۔ اس کے قرب و جوار کے علاقہ میں مختلف قسم کی مچھلیاں اور آبی چڑیاں بہ کثرت موجود ہیں اور اس سے متصل جنگلات میں شکار کی سہولتیں ہیں۔

بجلی کی فراہمی۔ ریہاند بجلی گھر کے ذریعہ تقریباً ڈھائی لاکھ کیلوواٹ بجلی پیدا کی جا سکے گی۔ اس بجلی گھر میں بجلی پیدا کرنے کی پانچ مشینیں ہیں جن میں سے ہر ایک کی پیداواری صلاحیت ۵۰ ہزار کیلوواٹ ہے۔ اس بجلی گھر سے اترپردیش کے مشرقی ضلعوں کو جو ملک کا سب سے زیادہ پس ماندہ علاقہ ہے خاص طور پر فائدہ پہنچے گا۔ ریاست کے مشرقی اضلاع کا رقبہ تقریباً ۳۲ ہزار مربع میل اور اس کی آبادی تقریباً تین کروڑ ہے۔ مرکزی اور ریاستی دونوں حکومتوں کو یہ زبردست مسئلہ درپیش رہا ہے کہ اس علاقہ کو کس طرح ترقی دی جائے۔ ریہاند بند بجلی گھر سے جو بجلی پیدا کی جائے گی اس کی بڑی مقدار چرک سیمنٹ فیکٹری



یہاند بند
کی
کہانی

بند کی تعمیر سے پہلے

بند کی بنیاد

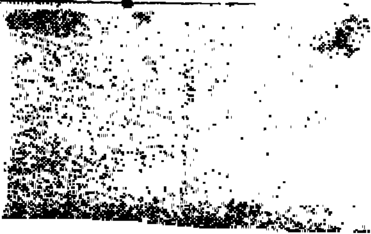


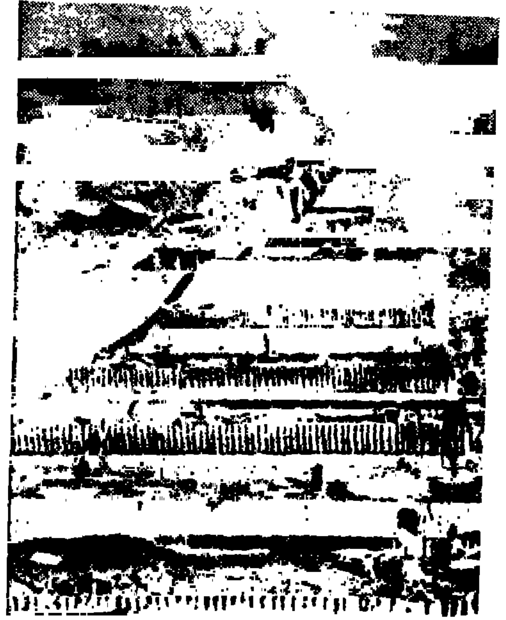
تصویروں
کی
زبانی



ریہانڈ بند

ریہانڈ ر







تعمیر کی منزل میں

بند کے قریب پہاڑوں کو ... سے اڑا دیا گیا
تاکہ ان کا چونا بند کی تعمیر کے کام آسکے







بجلی گھر زیر تعمیر

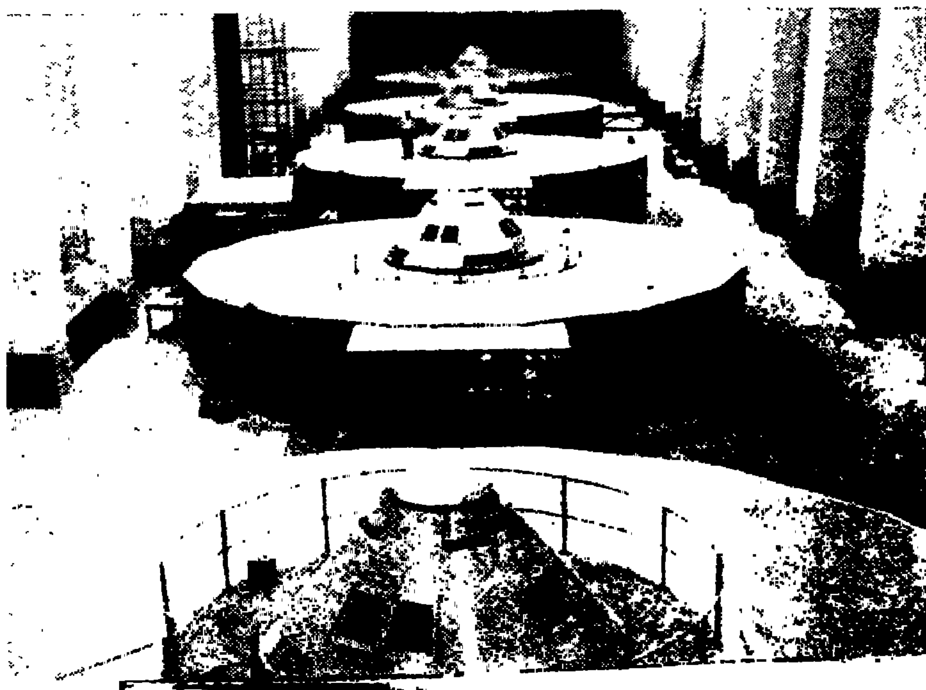






بند کی پشت کا ایک منظر

ریہاند بند کی کہانی تصویروں کی زبانی



پاور اسٹیشن کے پانچ جنریٹر

المونیم فیکٹری اور وارانسی کی سوڈا ایش فیکٹری اور کوچ فیکٹری استعمال کرے گی۔ مغل سرائے سے پٹنہ تک جو بجلی کی ٹرینیں چلانے کی اسکیم ہے اسکے لیے بھی بجلی ریہاند بجلی گھر سے سپلائی کی جائے گی۔

صنعتی ترقی ۔ ریہاند بند کی تکمیل سے صنعتی ترقی کے لیے بہت سے راستے کھل گئے ہیں۔ ریہاند کے علاقہ میں نیشنل کول ڈولپمنٹ کارپوریشن کے ذریعہ ترقی دی جانے والی سنگرولی کی کوئلہ کی کان کے سبب بھی صنعتوں کی ترقی میں کافی مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ اوبرا اسٹیشن میں بھی مزید بجلی پیدا کرنے کے سلسلہ میں اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے ضلع مرزاپور میں بجلی کی پیداوار بڑھ کر تقریباً چھ لاکھ کیلو واٹ ہو جائے گی۔ ریاست میں تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے دوران تقریباً ساڑھے آٹھ لاکھ کیلو واٹ بجلی پیدا کرنے کی تجویز ہے جس میں تقریباً ۵ سے چھ لاکھ تک کیلو واٹ بجلی صرف ریہاند کے علاقہ میں ہی پیدا کی جائے گی۔

معدنیاتی وسائل ۔ اتر پردیش کے جنوبی حصہ میں جس میں جھانسی۔ باندہ اور ہمیرپور اور مرزاپور کے اضلاع شامل ہیں کوئلہ، کورنڈم، اچھے قسم کی مٹی اور سلیمینائٹ اور اس قسم کی دیگر معدنیات کے ذخیرے پائے جاتے ہیں۔ اس امر کا امکان ہے کہ ارضیاتی سروے کے ذریعہ اس علاقہ میں اور زیادہ معدنیات کا پتہ چلے۔ ریہاند کے علاقہ میں کثیر مقدار میں بجلی، کوئلہ، معدنیات، زراعتی اور جنگلاتی پیداوار کی دستیابی ریاست کے جنوب مشرقی حصہ کے صنعتی فروغ کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔

نقل وحمل ۔ سنگرولی کی کوئلہ کی کانیں تقریباً ۲۳۴ مربع کیلومیل کے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چرک سے گرہار روڈ کے درمیان ریلوے لائن بچھانے کا کام جاری ہے۔ یہ ریلوے لائن اس علاقہ کی صنعتی ترقی میں مزید ممد و معاون ہوگی۔ امید کی جاتی ہے کہ سنہ ۱۹۶۳ء کے آخر تک اس کی تعمیر مکمل ہو جائے گی اور یہ ریلوے لائن اس علاقہ کو براہ راست کلکتہ سے ملا دے گی جس سے مغل سرائے میں نقل وحمل کی دشواریاں بھی کافی حد تک دور ہو جائیں گی۔ سنگرولی کی کوئلہ کی کانوں اور اوبرا کے درمیان ریلوے لائن بچھانے کے سلسلہ میں کافی کام ہو چکا ہے۔

کوئلہ مٹی اور کورنڈم کے علاوہ سلیمینائٹ اور چونے کے پتھر کے بڑے ذخیرے بھی دستیاب ہو سکیں گے۔ اس طرح ریہاند سے کثیر مقدار میں بجلی کی سپلائی سے کوئلہ کے علاوہ ایسے خام مال بھی دسترس کے اندر ہوں گے جن سے صنعتی ترقی ہوگی۔

بڑے کارخانے ۔ المونیم کے سب سے بڑے کارخانہ میں جو ۲۰۰۰۰ ٹن سالانہ المونیم پیدا کرے گا جلد ہی کام شروع ہو جائے گا۔ اس کارخانہ کی سالانہ پیداواری صلاحیت کو بڑھا کر ۴۰ ہزار ٹن کر دینے کے قوی امکانات ہیں۔

اس سے قبل چرک میں سیمنٹ کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا تھا جس کا مقصد بند کی تعمیر کے لیے سیمنٹ سپلائی کرنا تھا۔ اب اس کارخانہ کی پیداوار دگنی کرنے کی تجویز ہے اور بھٹی کی اینٹیں تیار کرنے کا پلانٹ نصب کرنے کے سلسلہ میں کافی کام ہو چکا ہے۔

ساہوپوری وارانسی کی ساہو کیمیکلس میں سوڈا ایش اور امونیم کلورائیڈ تیار کرنے کے لیے ضروری توسیع کی جا رہی ہے۔ اور جلد ہی گورکھپور میں کیمیاوی کھاد کا ایک کارخانہ قائم کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں کچھ اور دوسرے منصوبے جن کے شروع کیے جانے کے امکانات ہیں، یہ ہیں۔ نینی (الہ آباد) میں ٹائر ٹیوب فیکٹری، مرزاپور میں ایک کاسٹک فیکٹری اور برقی کنڈکٹر کا غذ اور دفتی تیار کرنے کا کارخانہ۔

دوسری صنعتیں ۔ علاوہ ازیں کئی دوسری ضمنی صنعتوں کے ساتھ کاربن بنانے کے کارخانے اور کیمیاوی کھاد کی ایک اور فیکٹری کے قیام کی گنجائش ہے۔ صنعتوں سے متعلق قانون کے تحت اس علاقہ میں مختلف صنعتوں کے قیام کے لیے بڑی تعداد میں لائسنس جاری کیے جا چکے ہیں۔ ان صنعتوں کو ریہاند سے بجلی فراہم کی جائے گی۔ ان میں سے الہ آباد، مرزاپور و وارانسی کے اضلاع میں ۶۸ لائسنس منظور کیے گئے ہیں۔

اس علاقہ میں خام دھات کو صاف کرنے کے لیے بجلی سے چلنے والے کارخانوں کے قیام کے کافی مواقع حاصل ہیں۔ یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ علاقہ لوہے کے کارخانوں کی ترقی میں بھی معاون ہوگا۔

سرکاری امداد ۔ ریاستی حکومت اپنے محدود وسائل کے باوجود صنعتی پروگرام پر تیزی سے عملدرآمد کر رہی ہے۔ صنعتی ریاستوں کے قیام، صنعت کاروں کو قرض اور مالی امداد کی فیاضانہ منظوری، خام مواد سے یہ امر ممکن ہو گیا ہے کہ ریہاند بند کے علاقہ میں قلیل مدت میں خوشحالی اور فراوانی کا دور دورہ ہو جائے۔

(افسانہ)

خیالوں کی ڈگر

رفعت نواز

کمرہ میں داخل ہوتے ہی میں نے میز کی طرف دیکھا ہمیشہ باہر سے آتے ہی میں میز کی طرف ہی دیکھتا ہوں۔ یہ کوئی ایسا پراسرار راز تو نہیں کہ آپ پر ظاہر نہ کروں۔ بات صرف اتنی ہے کہ میز پر نوکر ڈاک رکھ دیتا ہے، ور باہر سے آتے ہی میں ڈاک دیکھتا ہوں جو میری روحانی تسکین کا باعث ہوتی ہے۔

آج کی ڈاک میں صرف ایک نیلا لفافہ تھا' بڑا خوبصورت چھوٹا سا' میں نے پہلے نہ جانے کس جذبہ کے ماتحت اُسے سونگھ لیا۔ بھینی بھینی سی گلاب کی مہک تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے اُسے چاک کیا۔ اندر سے ہلکا نیلا کاغذ کھلا جس پر باریک باریک نسوانی تحریر تھی اور مجھے 'پیارے' کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ میں تحریر پہچان گیا' وہی تحریر تھی' چھوٹے چھوٹے گول گول حروف' انتہائی روشن اور صاف' اور بلیو بلیک روشنائی یہ تحریر سنیتا ہی کی تھی۔

پیارے روی!

نمستے! تمھیں خط پڑھ کر حیرت تو ہو گی اور ہونی بھی چاہیے۔ کوئی پانچ سال بعد تمھیں خط جو لکھ رہی ہوں۔ میں اپنی تعلیم اور اس کے بعد دیگر گھریلو مصروفیات میں ایسی اُلجھی رہی کہ بہت چاہنے کے باوجود بھی تمھیں چار لفظ نہ لکھ سکی۔ (ہاں' اس میں میری کاہلی کو بھی دخل ہے) یقین ہے تم میری اس غلطی کو معاف کر دو گے۔ آج صبح سے تم بہت یاد آ رہے ہو اور تمھاری مختلف تصویریں نظروں میں ناچ رہی ہیں' نہ جانے کیوں؟ (کبھی کبھی ایسا ہوتا ضرور ہے۔ ہے نا؟) - لو اصل بات تو میں کہنا بھول رہی ہوں۔ میں ایک ضروری کام کے سلسلہ میں رات کی ٹرین سے پربھنی جا رہی ہوں اور یقیناً تمھارے شہر سے بھی گزروں گی۔ کیا تم اسٹیشن پر ملنے آؤ گے؟ ملاقات ہو گی تو بہت سی باتیں ہوں گی کیونکہ ٹرین وہاں بیس منٹ ٹھہرتی ہے۔ اور باتوں سے زیادہ اہمیت کی بات یہ ہے کہ میں تمھیں دیکھ لوں گی پانچ سال بعد۔ اب باقی باتیں ملاقات پر۔

مخلص، سنیتا۔

میں خط پڑھ کر خوشی سے پاگل ہو گیا۔ میں جو پچھلے تین سال سے ایک دفتر میں بابوگیری کر رہا ہوں اور جس کے خیالات پست ہو چکے ہیں' ارادے دم توڑ چکے ہیں اور امیدیں راکھ ہو چکی ہیں' جیسے زندگی سے صرف اتنا پیار رہ گیا ہے وہ اُسے کسی طرح گذار رہا ہے۔ جو اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہے' ذہنی طور پر جو شکوک ہے اور جیسے دوسروں کی بات پر کم ہی یقین آتا ہے۔ یہ خط پڑھ کر میں جھوم اُٹھا اور میں آج کو بالکل بھول گیا۔ ایک ہی لمحہ میں وہ دن' وہ شامیں وہ راتیں میرے تصور کی گرفت میں آ گئیں جنھیں میں بھول تو نہیں گیا تھا مگر جن پر دقت کی' ایک ایسے وقت کی جو بڑی تکلیف میں گزرا تھا' گرد جم گئی تھی۔ عرفان کے اس ایک لمحہ میں وہ تمام باتیں مجھے یاد آ گئیں جنھیں پچھلے تین چار سال میں میں نے بہت کم یاد کیا تھا۔

ابتدائے جولائی کی بات تھی۔ کالج میں الکشن کا ہنگامہ تھا۔ میں سکریٹری شپ کے لیے کھڑا تو نہیں ہوا تھا مگر رویندر کی طرف سے کنویسنگ

ضرور کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں کالج کی تمام لڑکیوں سے بات چیت کا موقع ملا تھا اور خصوصیت سے فرسٹ ایر کی لڑکیوں سے زیادہ۔ یوں بھی فرسٹ ایر کے طلبا اپنے سے سینیر طلبا کی بڑی عزت کرتے ہیں پھر بھی سنیتا کی بات نرالی تھی۔ میں نے جب اس سے پہلی بار روندر کو ووٹ دینے کی درخواست کی تو وہ بڑی شوخی سے بولی۔

"مگر کیوں؟ مرضی کا معاملہ ہے یہ تو ہم جسے چاہیں ووٹ دیں۔ ہاں جب آپ کہتے ہیں تو میں غور ضرور کروں گی۔"

پھر دو چار بار الکشن کے ہنگاموں کے دوران سنیتا سے بات چیت ہوئی، کبھی کامن روم میں، کبھی لائبریری میں ہوئی، کبھی کینٹین میں اور کبھی کالج کے پیچھے جانب کے سنسان پورچ میں۔ وہی بات میں شوخی اور آخر میں "آپ کہتے ہیں تو" کی گردان۔ مگر الکشن میں اس نے روندر کا بہت ساتھ دیا۔ گھنٹوں وہ لڑکیوں لڑکوں میں کنویسنگ کرتی پھری۔ اس نے بڑی محنت سے پوسٹر لکھے اور کنویسنگ کے نئے نئے طریقے نکالے۔ میں نے جب بھی اس سے اس غیر معمولی دلچسپی کے بارے میں پوچھا اس نے یہ کہہ ٹال دیا کہ "یہ سب آپ کے لیے۔ آپ کی خاطر کر رہی ہوں۔" میں اس کی شوخی، اس کی بیباکی پر حیران ہو جاتا۔ مگر راز تو روندر کے انتخاب کے بعد خیر مقدمی پارٹی میں کھلا کہ وہ روندر کی پھوپھی زاد بہن تھی اور روندر کے ساتھ ہی رہتی تھی۔

پھر ہم اکثر ملنے لگے۔ کبھی کافی ہاؤس میں، کبھی گرانڈ ہوٹل میں، کبھی سنیما میں، کبھی کلب میں اور اکثر کالج میں۔ مگر کالج میں وہ بات بہت کم کرتی اور جب بات کرتی بہت مختصر لفظوں، شوخ اور چبھتے ہوئے لہجے میں۔ ہاں دوسری جگہوں پر وہ بڑی سنجیدگی سے میری باتیں سنتی اور بڑے شیریں لہجے میں خود بھی باتیں کرتی۔

اور اس دن ہم گیارہ بجے رات تک گرانڈ ہوٹل میں باتیں کرتے بیٹھے رہے تھے۔ وہ بہت محویت سے میری باتیں سن رہی تھی اور خود بھی کچھ بول اٹھتی تھی۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور ہم چائے پر چائے چڑھا رہے تھے۔ جب بارش ذرا تھمی تو ہم باہر نکلے مگر سنیتا کے گھر پہنچنے تک بارش اور بھی بڑھ گئی۔ مجھے ابھی تھوڑی دور جانا تھا۔ سنیتا نے مجھ سے کہا تھا:۔

"روی تم میری چھتری لے جاؤ۔ میں ابھی گھر سے لے آتی ہوں۔ ہاں تم اس دوکان کے شیڈ میں کھڑے رہو کیونکہ اب رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں اور اس وقت تمہارا گھر آنا مناسب نہیں۔" تھوڑی دیر میں وہ چھتری لے آئی تھی اور میرے قریب آ کر کہا تھا۔ "بری تو نہیں لگی تمہیں میری بات۔" کتنا خلوص، کتنی اپنائیت تھی اس کے لہجے میں۔ اس نے چھتری میری طرف بڑھائی اور میں نے چھتری لیتے وقت اس کا ہاتھ دبا دیا۔ وہ مسکرائی اور ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔ میں نے چھتری کھولی تو خوشبو کا ایک جھونکا سا آیا۔ اور راستے بھر اس کی ننھی منی چھتری کی خوشبو سے محظوظ ہوتا رہا۔

پھر اکثر ایسا ہوتا کہ ہم رات کے بارہ بجے تک بھی ساتھ رہتے۔ جاتے وقت اسے وہی گھبراہٹ ہوتی۔ ان دنوں ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ ہم دونوں کی پسند ایک سی ہو گئی تھی۔ ہم ایک جیسی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور ان پر گھنٹوں باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کی پسند کی چیزیں خریدتے اور ایک دوسرے کو تحفہ دیتے۔

گرمیوں کی طویل چھٹیاں شروع ہو گئی تھیں۔ روزانہ شام کے چھ بجے وہ اپنے گھر کے برآمدے میں میرا انتظار کرتی، بڑی بنی سنوری ہوئی۔ کپڑوں کا انتخاب بھی وہ خوب کرتی تھی۔ شام کو نہا دھو کر وہ ہلکا پھلکا سفید لباس پہنتی، تھوڑا اسینٹ کپڑوں پر لگا لیتی اور ایک مست کر دینے والی خوشبو اس کے جسم سے پھوٹا کرتی۔ جب وہ بنی سنوری ایک وقار کے ساتھ آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلتی تو میرا سر غرور سے اٹھ جاتا اور میں دیکھتا کہ راہ گیر رک رک کر اسے ضرور دیکھتے اور کچھ لوگ تو مڑ مڑ کر کئی بار دیکھتے۔ مگر وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز تھی۔

ایک دن میں ہمیشہ کی طرح سنیتا کے گھر ساڑھے چھ بجے پہنچا۔ روندر کی چھوٹی بہن منی نے کہا کہ "دیدی تو راہل کے ساتھ باہر گئی ہوئی ہیں۔" مجھے منی کی بات پر یقین نہیں آیا۔ راہل سنیتا کا ہم جماعت تھا۔ اور چھٹیوں میں وہ اپنے گھر چلا گیا تھا مگر آج نہ جانے کمبخت کیوں آ گیا تھا۔ مجھے بہت برا لگا۔ غصہ بھی آیا۔ میں اس جھلاہٹ میں چوک کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں سنیتا اور راہل مل گئے۔ راہل نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا اور خیریت پوچھی۔ سنیتا نے رک رک کر میرے چہرے کے تاثرات کو بھانپتے ہوئے کہا۔ "راہل آ گیا تھا۔ ہم پروفیسر منجریکر کے گھر تک چلے گئے تھے۔"

میں ساڑھے چھ بجے سے پہلے پہنچ جاتی مگر۔ اہل نے اصرار کیا کہ چائے پی لی جائے اس لیے دیر ہو گئی ذرا۔" اس نے اہل کو رخصت کیا اور میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ ہم دونوں خاموشی سے کافی ہاؤس میں جا کر بیٹھ گئے۔ انتہائی خاموشی سے ہم نے کافی پی۔ پھر سنیتا نے آہستہ آہستہ کہا۔

"معمولی سی بات ہے تم یوں منہ پھلائے کیوں بیٹھے ہو۔"

میں تو بھرا بیٹھا تھا، کہہ اٹھا! "ہاں غلطی تو میری ہی ہے۔ مجھے تمھارے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔ میں تو بیوقوف ہوں ہر ایک سے خلوص کی امید رکھتا ہوں۔"

"تم ایسا سوچتے ہی کیوں ہو۔ ہر شخص کو اُس کے اپنے ذاتی معاملات میں پوری پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اور ہاں تم منہ سے یہ کیوں کہلوانا چاہتے ہو کہ کوئی تم سے کتنا خلوص رکھتا ہے۔"

"ہاں ہاں کہہ دیا نا بابا کہ غلطی میری ہی ہے۔" میں نے جھلاہٹ میں کہا تھا اور غصہ سے اُٹھ آیا تھا۔

رات بھر میں بے چین رہا۔ بے کلی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اور سنیتا کی کئی تصویریں میری نگاہوں میں گھومتی رہیں۔ دوسرے دن بھی میں گھر سے نہ نکلا۔ اُس دن شام کے قریب مجھے اپنے رویہ پر ندامت ہونے لگی۔ "آخر اُس کا قصور ہی کیا ہے؟ اپنے ہم جماعت کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے کہیں چلی گئی تو کیا ہوا؟" یہ سوچ کر میں سنیتا سے معافی مانگنے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ میں تھوڑی ہی دور گیا ہوں گا کہ اتفاق سے سنیتا نظر آ گئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی سامنے سے آ رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو دونوں خاموش تھے۔ اس کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا شاید وہ بھی جاگی تھی اور روئی تھی۔ مگر ہم بغیر کچھ کہے بازار کی طرف ایک ساتھ چلنے لگے۔ ایک سنسان سے ہوٹل میں ہم نے چائے پی۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر میں نے کہا "معاف کرنا سنیتا! کل میں نے تمھیں سخت سست کہہ دیا۔ میں کل رات اور آج دن بھر بے چین رہا اور اپنے کیے پر پچھتاتا رہا۔"

اُس نے جھکی جھکی نگاہیں اُٹھائیں اور میرے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی: "تم سمجھتے ہو کیا میں چین سے رہی؟ میں بھی بہت پریشان رہی۔"

میں نے اُس کا ہاتھ نرمی سے دبا دیا۔ وہ خاموش رہی۔ میں نے دباؤ زیادہ ڈالا تو اُس نے پھر ایک بار میری طرف دیکھا اور بولی "کیا تم سب ساتھیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں۔"

"پھر تم میرے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہو۔ بولو ردی؟" اور وہ رونے لگی۔

میں نے کہا "پگلی اتنی معمولی سی بات پر تم روتی ہو۔ چلو آنسو پونچھ ڈالو۔ آج ہم ایک عہد کریں کہ ایک دوسرے کو پریشان نہیں کریں گے۔ اور اس عہد کی استواری کے لیے ایک ایک کپ چائے پی لیں۔"

پھر ہم ایک دوسرے سے خفا نہیں ہوئے۔ وہ دن، وہ شامیں، وہ راتیں، پورے ملاپ کی تھیں۔ ان میں جدائی اور فراق کا تذکرہ تک نہ تھا۔ نہ کوئی رقیب تھا، نہ کوئی بندش۔

مگر نومبر کا وہ سرد سا، ابر آلود دن مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ روزنہ کے ملازم نے ایک نیلا لفافہ لا کر دیا تھا جس میں سنیتا کی خوبصورت اور واضح تحریر تھی۔ چمکیلی بلو بلیک روشنائی سے لکھی ہوئی۔ "میرے پتا جی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ ان کے پاس ابھی جا رہی ہوں۔ وقت بہت کم ہے اس لیے تم سے مل نہ سکی۔ پھر کبھی ہم ضرور مل لیں گے۔ ویسے میں تمھیں خطوط پابندی سے لکھا کروں گی۔"

اور جدائی کا وہ ابتدائی زمانہ میں نے کس طرح گزارا اس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ آج بھی جب ان دنوں کا خیال کرتا ہوں تڑپ اٹھتا ہوں۔ وہ بے مصرف دن، وہ بیکار شامیں اور بے مقصد راتیں، وہ کچھوے کی چال چلتا، رینگتا ہوا ظالم وقت۔ سنیتا کی جدائی نے مجھ سے زندگی تو نہیں چھینی، زندگی کی رنگینی اور زندہ رہنے کی امنگ ضرور چھین لی تھی۔ میں آگے نہ پڑھ سکا۔ دو سال تک یوں ہی آوارہ گردی کرنے کے بعد ایک دفتر میں ملازم ہو گیا اور کسی طرح دن گزارنے لگا۔ ماں باپ، بھائی، بہنوں، اور دوستوں سے دور، ایک شہر میں اجنبیوں کی طرح میں زندگی گزار رہا تھا۔

اور آج جب سنیتا کا خط ملا تو میں پھر جاگ اُٹھا ہوں، وہ دن پھر مجھے یاد آ گئے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ اُسے میرا پتہ کس طرح معلوم ہوا، یقیناً اُس نے کسی سے میرے متعلق پوچھا ہوگا۔ وہ میرا اب بھی کتنا خیال رکھتی ہے — میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ بڑا بے رونق لگ رہا تھا۔ میں نے بڑی محنت سے داڑھی بنائی جسم رگڑ رگڑ کر نہایا۔ اپنے سب سے اچھے کپڑے پہنے اور پھر آئینہ دیکھا۔ بالکل بدلا ہوا چہرہ اور

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۱ پر)

ہندوستانی موسیقی کا ایک جائزہ

رشید احمد

موسیقی کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی اور اُسے کس نے ایجاد کیا یہ ہنوز ایک معمہ ہے۔ دنیا کی مختلف اقوام میں اُس کی ابتدا اور ایجاد سے متعلق عجیب دلچسپ دعوے اور نظریے پیش کیے گئے ہیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ سنگیت کو دیوتاؤں نے جنم دیا۔ عربوں کا کہنا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ایکبار اپنا عصا ایک پتھر پر مارا جس کی ضرب سے سات چشمے یا بارہ نہریں پھوٹ نکلیں اور اُن کے تموج سے جو آوازیں پیدا ہوئیں وہی سات یا بارہ سُر موسیقی کی بنیاد ہیں۔ یہودی اپنی مقدس کتاب تورات کی رو سے جوبل کو اُس کا موجد قرار دیتے ہیں جو حضرت آدم کی ساتویں پشت میں تھا۔ اِسی طرح مصری و یونانی اپنے صحائف کی بنا پر موسیقی کو اپنے دیوتاؤں کی تخلیق بتاتے ہیں۔ اہل ایران حکیم فیثاغورث کو علم موسیقی کا موجد مانتے ہیں جو حضرت سلیمان کا شاگرد تھا۔ فلکیات کے ماہر بعض علمائے قدیم کا کہنا ہے کہ موسیقی کے مختلف سُروں کی بنیاد نظام فلکی کے مختلف بروج و سیارگان کی کشش و رفتار سے وابستہ ہے۔ بعض لوگ کوہ قاف میں ایک پرند موسیقار کا وجود بتاتے ہیں جس کی چونچ میں چھوٹے بڑے سات سوراخ ہوتے ہیں جن سے وہ مختلف سُر نکالتا ہے۔ اِن سُروں کی آمیزش سے نغمے پیدا ہوتے ہیں اور موسیقار جب اپنی عمر طبعی کو پہنچ جاتا ہے تو جنگل میں خس و خاشاک جمع کر کے اس کے گرد مست و بے خود ہو کر ایسا والہانہ چہکتا اور ناچتا ہے کہ اُس کی پیہم وارفتگی اور روح فرسا آتش نوائی کے نقطۂ عروج پر اُس گھاس پھوس میں شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں اور یہ پرند اُس آگ میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے اور قدرت خداوندی سے پھر اُسی راکھ کے ڈھیر سے وہ دوبارہ جنم لیتا ہے۔ اس پرند کو دیپک لاٹ سنسکرت میں ققنس عربی میں اور آتش زن فارسی میں کہتے ہیں۔ بعض لوگ موسیقی کے سات سُروں کو مختلف جانوروں اور پرندوں کی آواز سے تشبیہ دے کر انھیں اس کا موجد گردانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مور نے کھرج، پپیہے نے رکھب، بکری نے گندھار، کلنگ نے مدھم، کوئل نے پنچم، مینڈھک نے دھیوت اور ہاتھی نے نکھاد دے کر موسیقی کی بنیاد ڈالی۔ غرض کہ یہ اور ایسی بہت سی روایات موسیقی کی ایجاد و ابتدا سے متعلق عام طور پر مشہور ہیں لیکن ان کی صحت کا فیصلہ ہر شخص اپنی فکر و نظر کی وسعت اپنے ذاتی عقائد و رجحانات اور مذہبی اعتقادات و روایات کی بنا پر کرتا ہے۔ ان سے قطع نظر غور کیجیے تو اس حقیقت سے مشکل سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ خود فطرت انسانی موسیقی کی اصل موجد ہے۔

قدرت نے جب انسان کی تخلیق کی تو قوت گویائی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ جذبے بھی اُسے ودیعت کیے۔ خوشی اور غم اُن میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ خوشی میں انسان ہنستا اور چہکتا ہے اور غم میں روتا اور چیختا چلاتا ہے۔ انھیں جذبوں کے امتزاج نے درحقیقت سنگیت کو جنم دیا۔ موسیقی کی بنیادی خصوصیات آواز کا ہلکا یا بھاری ہونا اور اُس کا نیچا اونچا ہونا ہے۔ یہی آوازیں جن سے موسیقی کی تشکیل ہوتی ہے سُر کہلاتی ہیں اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے راگ پیدا ہوتے ہیں۔

موسیقی کی ارتقا اور نشو و نما بتدریج ہوتی رہی۔ پہلے صرف دو تین سُروں کا سرگم تھا اور سُروں کے اُتار چڑھاؤ میں کوئی خاص فرق و امتیاز نہ تھا۔ اس کے بعد بتدریج ترقی ہو کر موجودہ سات سُروں کا سرگم وجود میں آیا جن کی مختلف ترتیب و ترکیب سے بیشمار راگ راگنیاں ظہور میں آئیں۔ ماہرین فن نے بعض آوازوں کو مختلف موسموں اور مختلف اوقات سے ہم آہنگ پا کر راگوں کو موسم اور وقت سے

مخصوص کردیا۔ چناں چہ وقت اور موسم کی پابندی سے ہی وہ راگ اپنی پوری تاثیر اور بہار دکھاتے ہیں۔

موسیقی کی روحانی اہمیت

ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے سنگیت کا ایک وسیع نظام موجود تھا اور گانے والوں اور سنگیت دو دیا جاننے والوں کی کثرت تھی۔ یہاں شروع میں موسیقی زیادہ تر مندروں اور معبدوں سے وابستہ تھی اور اس کا استعمال دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے لئے مخصوص تھا۔ وہ انسانی زندگی کے مذہبی پہلو سے اس قدر ہم آمیز تھی کہ اُس کے جداگانہ وجود کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مذہبی حسیات، عقائد اور جذباتی کشش کی بنا پر سنگیت کا بڑا احترام ہوتا تھا اور اس کی تعلیم کو ایک سعادت اور اس فن کو ایک ذریعہ شفاعت و بخشش تصور کیا جاتا تھا۔ اُس وقت تک ہندوستان کی راجی موسیقی صرف دھرپد پر مشتمل تھی اور اُس کے موضوعات میں خدا اور دیوی اور دیوتاؤں سے دعائیں اور مناجاتیں شامل تھیں۔ اس کے علاوہ اس میں ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے اکثر قصے اور واقعات بھی بیان کئے جاتے تھے۔

ہندوستانی موسیقی پر پہلی کتاب ناٹیہ شاستر چھٹی صدی عیسوی میں بھرت نامی ایک رشی نے لکھی تھی جس میں راگوں کے اُصول کو واضح اور بسیط طور پر ظاہر کیا گیا تھا۔ اس وقت سے موسیقی نے رفتہ رفتہ مختلف ارتقائی منزلیں طے کیں اور دسویں صدی عیسوی میں ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل کرلی۔ تیرھویں صدی کے آغاز میں جے دیو نے ایک کتاب گیت گوبندا کے نام سے تحریر کی جو بھارتیہ سنگیت میں پہلی کتاب ہے جس کو تاریخی کہا جاسکتا ہے اور جو کرشن اور رادھا کے امر پریم گیتوں سے بھری پڑی ہے اور جس کا ترجمہ انگریزی میں بھی سانگ آف سانگس کے نام سے ہوچکا ہے۔ اس کے بعد اسی صدی میں [سارنگ دیو نے] ایک کتاب سنگت رتناکر تصنیف کی جسکو تمام اہل فن نے مستند اور مبسوط تسلیم کرلیا تھا۔

وقت اور زمانہ جہاں معاشرے اور تہذیب و تمدن اور نظام فکر و عمل میں تغیر و تبدل کرتا رہا وہاں سنگیت میں بھی نئے نئے راستے اور اسلوب پیدا ہوتے رہے۔ شمالی ہند میں دھرپد صدیوں تک بلا شرکت غیرے خراج تحسین و عقیدت وصول کرتا رہا تا آں کہ مسلمانوں نے تیرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان آکر سلطنت کی بنا ڈالی اور یہاں کی سنگیت میں بھی ایک انقلاب عظیم برپا کردیا۔

مسلمانوں کی آمد

مسلمان جب برِ اعظم ہند میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ ایک خاصا ترقی یافتہ نظام موسیقی بھی لائے تھے جس میں گانا بجانا دونوں شامل تھے۔ مذہبی لوگ ان دونوں پر ناک بھوں چڑھاتے تھے لیکن عرب حکمران ابتدا ہی سے موسیقی کی سرپرستی کرتے تھے اور عام لوگ بھی اُن کی پیروی میں موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ابن سینا، فارابی اور کندی جیسے سنجیدہ خیال حکما اور مفکرین بھی موسیقی سے میلان رکھتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے موسیقی کے بارہ میں بڑی فاضلانہ کتابیں لکھی ہیں۔ ہندوستان آنے والے مسلمان موسیقی میں صرف عربوں ہی کے شاندار ترکہ کے وارث نہ تھے بلکہ انھیں ایرانی اور وسط ایشیائی موسیقی کی تمام ترقیات سے بہرہ مند اور مستفید ہونے کا موقع ملا تھا۔ اس لئے وہ جب ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ مختلف قسم کے عربی ایرانی ساز بھی لے کر آئے۔ ان میں رباب، چنگ، طنبورہ، شہرود، قانون، عود، نے، دف وغیرہ شامل تھے۔ ہندوستان میں ان نو واردوں کی محبوب ترین غنائی اور ادبی صنف غزل ہی تھی۔ چنانچہ سالہا سال غزلیں ایرانی رواجی طرز میں گائی جاتی رہیں۔ سازوں میں بھی سب سے زیادہ مقبولیت ایران اور وسطِ ایشیا کے سازوں کو حاصل رہی۔

مسلمان بادشاہوں اور امیروں نے سنگیت کی قدردانی اور سرپرستی ایسی دل کھول کے کی کہ سنگیت کار اُن کے درباروں کی رونق اور محفل کی زینت بن گئے۔ اب موسیقی مندروں سے نکل کر شاہی درباروں میں آگئی اور نئے نئے گیت اور نئے نئے نغمے وقت اور ماحول کی مناسبت سے ترتیب دیئے جانے لگے۔

امیر خسرو

سلطان علاء الدین خلجی کا عہد وہ عہد ہے جس کو دنیائے موسیقی کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ حضرت امیر خسروؒ نے اسے لافانی بنا دیا ہے۔ صدیوں کے بعد بطن گیتی سے ایسا فرزند جلیل پیدا ہوتا ہے کہ در اصل جامع کمالات ہوتا ہے لیکن اتفاق سے زمانہ اُسے کسی خاص فن سے موسوم کردیتا ہے۔ جن لوگوں پر یہ حادثہ گذرا ہے اُن میں بوعلی سینا، خیام اور امیر خسرو بہت نمایاں ہیں۔ امیر کے شعری اجتہادات کا مقام اتنا بلند ہے کہ انھوں نے جو چار چاند کلاسکی موسیقی کو لگائے ہیں اُس کی کرنیں بہت سے لوگوں تک نہیں پہنچیں اور وہ بالعموم صرف اس قدر جانتے ہیں کہ موسیقی میں بھی امیر کو مہارت حاصل تھی۔

امیر خسرو کو جیسا کمال ایرانی موسیقی میں حاصل تھا ویسا ہی کمال ہندوستانی موسیقی میں بھی تھا۔ وہ اگر عربی اور فارسی کے ایک زبردست عالم تھے تو

سنسکرت اور برج بھاشا پر بھی ان کو پورا عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نہایت سلیقہ اور خوش مذاقی کے ساتھ ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کی ایسی آمیزش کی کہ ہندوستانی موسیقی میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ اس وقت تک ہندوستان میں صرف دُھرپد گانے کا رواج تھا۔ انھوں نے قول، قلبانہ، نقش گل، بسیط، ہوا، مجاز، سوہلہ، ترانہ اور منڈھا بنایا۔ پرانے قوالوں کو بہت سی شکلیں یاد ہیں۔ ترانہ ہماری کلاسکی موسیقی میں ایک مستقل حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ سوہلہ اور منڈھا لڑکی کی رخصتی پر گایا جاتا ہے۔

چشتیہ بہشتیہ موسیقی پر ایک قدیم فارسی کتاب کا نام ہے جو ۱۶۵۸ء میں لکھی گئی۔ اُس کے مؤلف نے امیر خسرو کے فنی اختراعات اور اجتہادات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ "جس طرح زرد اور نیلے رنگ کے ملنے سے ایک نیا رنگ سبز پیدا ہوتا ہے اسی طرح امیر خسرو نے اپنے خداداد جوہر سے موسیقی کی مختلف ہیئتوں کو ترکیب دے کر ایک اور چیز پیدا کر دی جو نئی بھی تھی اور خوبصورت بھی۔" غرض، کلاسکی سنگیت کے رمز شناسوں میں امیر کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس کا اعتراف اُس زمانہ کے ہندوستانی ماہرین موسیقی نے بھی کیا ہے۔

امیر خسرو کی جدت طرازی اور موزونیٔ طبع کا یہ عالم تھا کہ جس آواز کو چاہتے نظم کر دیتے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:—

ڈھول کی آواز:—

ڈھل زن، ڈھل زد، بہ بحین اُو۔
کہ دیں، دین اُو، دین اُو، دین اُو۔

نوبت کی آواز:—

نان کہ خوردی خانہ برو، نان کہ خوردی خانہ برو، خانہ برو، خانہ برو۔
نان کہ خوردی خانہ برو، نہ کہ بدست تو گروم خانہ گرو، خانہ برو، خانہ برو۔

ڈھنکی کی آواز:—

در پے جاناں جاں ہم رفت، جاں ہم رفت، جاں ہم رفت، رفت، رفت، جاں ہم رفت۔
ایں ہم رفت و آں ہم رفت۔ آں ہم رفت۔ آں ہم رفت۔
ایں ہم آں ہم۔ ایں ہم آں ہم۔
آں ہم رفت۔ رفتن، رفتن، رفتن۔ دہ، دہ، دہ، رفتن دہ۔ رفت،
رفت۔ رفتن دہ۔ رفتن دہ۔

امیر خسرو نے موسیقی میں جو انقلاب برپا کیا ہے اُس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر رانا ڈے لکھتے ہیں کہ سارنگ دیو کے ٹھیک بعد (یعنی تیرھویں صدی کے خاتمہ پر) مسلمانوں نے دکن پر حملہ کیا اور دیوگری کے یادو خاندان کو شکست دی۔ دوسرے معاشرتی معاملات کی طرح اس واقعہ کا اثر ہندوستانی موسیقی پر بھی پڑا۔ جہاں جہاں اس میں فارسی نمونے بھی دخل پانے لگے اور موسیقی کے شمالی اور جنوبی مسلکوں میں جو خلیج حائل تھی وہ وسیع تر ہونے لگی۔ شمالی مسلک نے بعد میں راگ کا ایک نیا پیمانہ "شدھ سپتک" بطور معیار اختیار کر لیا۔ لیکن جنوبی مسلک اپنے رواجی سپتک پر قائم رہا۔ موسیقی کے ماہروں کا خیال ہے کہ شمالی مسلک میں تبدیلی محض اس اثر سے پیدا ہوئی جو ہم نے ایرانی فن سے قبول کیا جس کے اولین رہنما امیر خسرو تھے۔

کتاب راگ درپن کے مطابق حضرت امیر خسرو ۱۸ نئے راگوں کے موجد تھے۔ ہندی موسیقی میں امیر نے قول، قلبانہ، نقش گل اور ترانہ کا جو اسکول قائم کیا۔ اس لحاظ سے وہ اس کے پہلے نائک کہے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سات نائک مشہور گذرے ہیں جن میں امیر کے بعد دوسرا نمبر سلطان حسین شرقی کا ہے۔ تیسرا بخشو بیجو چوتھا باز بہادر فرمانروائے مالوہ کا، پانچواں سورج خاں کا، چھٹا چاند خاں کبیر کا اور ساتواں غلام علی لکھنوی کا ہے۔ تمام اہل فن کے نزدیک مسلم ہے کہ امیر خسرو کے بعد سلطان حسین شرقی ایسا نائک قوال نہیں ہوا۔ حضرت امیر خسرو کے معاصرین میں گوپال، لونہگ اور بھنو سنگیت کے نائک تھے۔

امیر خسرو، سلطان حسین شرقی والیٔ جون پور اور اس قسم کے دوسرے فن کاروں کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ شمالی ہندوستان میں موسیقی کا ایک نیا مسلک پیدا ہو گیا جس کی موسیقی ہندوستانی یا شمالی ہندوستان کی موسیقی کہلاتی ہے۔ سلطان حسین شرقی نے دھرپد کے کینڈے پر خیال ایجاد کیا۔ دھرپد میں صرف گمک ہوتی ہے۔ خیال میں تانوں کی بیشمار قسمیں شامل کی گئیں۔ خیال اتنا مقبول ہوا کہ ہماری کلاسکی موسیقی کا اب دارومدار ہی خیال پر ہے۔ اُنیسویں صدی کے آغاز میں جب بنگال کے ہندو فن کاروں نے بھی اُسے اختیار کر لیا اور بھٹ کھانڈے اور دوسرے ماہرین نے اُسے صوبہ بمبئی میں بھی رواج دے دیا تو عملاً یہی ہندوستان کی قومی موسیقی بن گئی۔ یہ بہت سی

باتوں میں جنوبی ہند کی موسیقی سے مختلف ہے۔ جنوبی ہند کی موسیقی زیادہ تر مدراس اور میسور تک محدود ہے اور عام لوگ اُسے کرناٹکی گائکی کہتے ہیں۔

موسیقی مغلیہ عہد میں

شمالی ہندوستان میں قدیم موسیقی کا سب سے زیادہ بااثر مرکز گوالیار تھا۔ گوالیار کے راجہ موسیقی کے بڑے سرپرست تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور راجہ مان سنگھ تھا جس نے ۱۴۸۶ء سے ۱۵۱۷ء تک حکومت کی۔ مان سنگھ نے کچھ ماہرین کو اپنے عہد کی سنگیت کا جائزہ لینے کے کام پر متعین کیا تاکہ چھان بین کے بعد سنگیت کا ایک معیار قائم ہو جائے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی موسیقی کے خلط ملط ہو جانے سے جو فنی بے ضابطگیاں راہ پاگئی تھیں اُن سے سنگیت کو پاک کیا جاسکے۔ فن کاروں کی اس جماعت کا ایک رکن نائک محمود بھی تھا۔ ان لوگوں کے غور و فکر کا نتیجہ ان کی متفقہ تالیف مان کتوھل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں راگ راگنیوں کی تقسیم کے بعد ان کے معیار مقرر کئے گئے ہیں۔ راجہ مان سنگھ نے موسیقی کی ایک اور بڑی خدمت بھی انجام دی۔ اس وقت تک دُھرپد صرف سنسکرت میں گایا جاتا تھا۔ مان سنگھ نے سنسکرت کی جگہ ہندی کو عطا کی اور اس طرح دُھرپد کی عام مقبولیت میں مدد معاون ہوا۔ گوالیار کے راجاؤں کو اس کام میں مشہور صوفی شیخ محمد غوث گوالیاری کی خانقاہ کے قیام سے بڑی مدد ملی۔ بدایونی کہتا ہے کہ شیخ محمد غوث خود ایک صاحب ایجاد نغمہ طراز تھے اور اپنے مریدوں کو بھی نئے نئے نغموں کی ایجاد کا شوق دلاتے رہتے تھے۔

مغلوں کا دورِ حکومت موسیقی کی قدر دانی کے سلسلہ میں مشہور ہے۔ اکبر کی دلچسپی اور قدر شناسی کا ذکر ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں یوں کیا ہے: "شہنشاہ موسیقی پر بہت توجہ فرماتے ہیں۔ دربار میں لاتعداد گانے والے اور گانے والیاں موجود ہیں جن میں ہر قوم و ہر مذہب کے ماہرین فن ہیں۔ گانے والے گروہ کو سات جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ہفتے کے سات دن وہ سات جماعتیں اپنا پروگرام حضور شاہ میں پیش کرتی ہیں۔ میاں تان سین گوالیاری، بابا رام داس، سبحان خاں گوالیاری، بیر منڈل خاں، باز بہادر حاکم مالوہ، شہاب خاں بین کار، تان ترنگ خاں (تان سین کا بیٹا) استاد دوست مشہدی بنسری بجانے والا، نائک برجو۔ سور داس (بابا رام داس کا بیٹا)، بیراگ سین استاد یوسف میراثی طنبورہ بجانے والا، تاش بیگ اور میر اکبر قانون بجانے والے کے نام قابل ذکر ہیں۔

اکبری عہد کا مشہور ترین سنگیت کار تان سین تھا بعض مسلمان تذکرہ نویسوں کے بیان کے مطابق تان سین کے فن کی نشوونما شیخ محمد غوث گوالیاری کی خانقاہ میں ہوئی تھی وہ مکرند پانڈے کا بیٹا اور ہری داس کا چیلہ تھا۔ تان سین بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ بعض کتابوں میں اس کا نام علی حسن بتایا گیا ہے۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ "ہندوستان میں گذشتہ دو ہزار سال سے اس جیسا گویا پیدا نہیں ہوا۔"

تان سین کا شمار اگرچہ بالعموم برعظیم ہندوستان کے عظیم ترین گویوں میں ہوتا ہے، مگر وہ بعض سنگیت کاروں میں زیادہ مقبول نہیں ہے انھیں یہ اعتراض ہے کہ اُس نے راگوں کی صحیح ہیئت بدل دی ہے اور چھ اصلی راگوں میں سے دو 'ہنڈول اور میگھ' تو اس کے زمانہ سے غائب ہی ہو گئے ہیں۔"

درحقیقت تان سین کے زمانہ تک ہندوستانی موسیقی کافی ترقی کرچکی تھی مگر اُس میں غلط عناصر بھی بہت داخل ہو گئے تھے۔ تان سین نے اس کا جائزہ لے کر اسے رطب و یابس سے پاک کیا۔ گر نتھوں کی موسیقی ناقابل عمل ثابت ہو چکی تھی۔ تان سین نے راگ راگنیوں، بھارجاؤں اور پتروں کو از سر نو ترتیب دیا اور کم و بیش یکصد تالوں کا انتخاب کیا۔ اس اجتہاد کی وجہ سے قدامت پسندوں میں اس کی مخالفت ہوئی۔ مگر راگوں کی ہیئت کسی کے بدلے بدل ہی نہیں سکتی اور ہنڈول اور میگھ آج بھی گائے جاتے ہیں۔

جہانگیر کے دربار میں موسیقی کی سرپرستی جاری رہی۔ چناں چہ بلاس خانی لوڑی کے موجد بلاس خاں، کو اپنے باپ تان سین کا منصب حاصل ہوا۔ لیکن جہانگیر کو زیادہ دل چسپی مصوری سے تھی۔ موسیقی کی زیادہ حوصلہ افزائی اس کے جانشین شاہجہاں کے عہد میں ہوئی۔ تزک جہانگیری میں جہاں داد خاں، چتر خاں، پرویز خاں، خرم داد خاں اور ماکھو کا ذکر آیا ہے جو جہانگیر کے زمانہ کے مشہور موسیقار تھے۔ جہانگیر کی راجپوت بیوی (شاہجہاں کی ماں) کو سنگیت سے بڑا لگاؤ تھا۔ خود جہانگیر کو علم موسیقی میں کافی دخل تھا۔ شاہجہاں کو بھی موسیقی سے کافی ذوق رہا۔ اس کے دربار میں لال خاں جو تان سین کے لڑکے تان ترنگ خاں کا داماد تھا۔ بڑے اونچے درجے پر ملازم تھا اور اس کو شاہجہاں نے گُن سمندر خاں کا خطاب دیا تھا۔ اس کے علاوہ شاہجہاں نے شاہی

قلعے کے گرد کنچنیوں کو بسا رکھا تھا اور ہر بدھ کی رات کو دربار میں محفل رقص و سرود جمتی تھی۔

دھرپد

مسلمانوں کی آمد اور ان کے ساتھ میل جول سے شمالی ہند کی موسیقی پر اثر پڑنا قدرتی بات تھی۔ مندروں کی دھرپد سے دربار یعنی شاہی درباروں کی دھرپد کی تخلیق ہوئی۔ دھرپد سنسکرت لفظ ہے۔ "دھر" کے معنی ٹھہرا ہوا اور "پد" کے معنی مرتبہ کے ہیں۔ یعنی دھرپد کا بڑا ٹھہرا ہوا مزاج ہے۔ اس میں محض راگ اور تال کی مخصوص ضروریات کے لحاظ سے بول کی ترتیب ہوتی ہے۔ دیوتاؤں کے صفات بیان کئے جاتے ہیں اور یہ زیادہ تر ہندی و سنسکرت میں گایا جاتا ہے۔ اس کا درجہ عام گانوں سے بہت ارفع اور بلند ہے۔

ایک ماہر فن نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ دھرپد ایک قسم کی گائکی کی صورت میں ایک راستہ ہے انسان کے ترقی کرنے اور اپنی منزل تک پہنچنے کا۔ دھرپد ہندوؤں کے فلسفہ کا واحد چیز ہے جس میں تصور کی پرواز اور خیالات کی گہرائی کی اتنی ہی صاف جھلک ملتی ہے جتنی فلسفہ کی کتابوں میں۔ یہ بات لوگ اکثر بھول جاتے ہیں۔ آج کل جتنی بھی قسم کا گانا سننے میں آتا ہے ان سب کے پیچھے زندگی کا کوئی باقاعدہ فلسفہ نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گانا علیحدہ رہتا ہے اور زندگی اور انسانیت الگ۔ اگر کسی آج کل کے گوئیے سے پوچھا جائے گانے کے ذریعے سے انسانی شخصیت کی ترقی کس طرح ہو سکتی ہے اور کس طرح گانے سے انسان روحانی زندگی کا مرکز بن سکتا ہے تو وہ کوئی معقول جواب نہ دے پائے گا۔ دھرپد کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر اس گائکی کو باقاعدہ اپنایا جائے تو انسان کے لئے اور کسی بات کا سیکھنا ضروری نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ مذہب کے وعظ و پند کی ضرورت بھی نہیں رہتی کیونکہ یہ گانا خود ہی ایشور بھگتی ہے۔

اکبر کا عہد دھرپد کے انتہائی عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ سوامی ہری داس اور تان سین جیسے زندہ جاوید استاد بنیادی طور پر دھرپد ہی کے سنگیت کار تھے۔ چونکہ وقت کے فرماں روا عام طور پر سنسکرت سے نابلد اور ہندو دیومالا کی روایات، علامات اور تخیل سے ناواقف تھے اس لئے سنگیت کاروں میں رفتہ رفتہ موسیقی کے دھارمک خصائص سے بے توجہی اور رادلی 'دسے' ملاقطیت بڑھتی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھرپد اپنی قوت و تاثیر سے محروم ہو گئی اور ایک یک رنگ سی رسمی چیز بننے لگی۔ مزید ترقی کی گنجائش صرف تان پلٹوں یا علمی و اصولی موسیقی میں رہ گئی جس میں بول اور الفاظ کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔

خیال

اس عمل سے دھرپد میں سے خیال کی تخلیق ہوئی جس کی ایجاد کا سہرا سلطان حسین شرقی والئ جونپور کے سر ہے۔ صورت شکل کے اعتبار سے خیال کا ڈھانچہ اپنے عظیم اور پرشکوہ پیش رو یعنی دھرپد کے مقابلے میں بہت کمزور اور نازک تھا۔ خیال میں ایک مخصوص ہیئت کے اندر برجستہ تان پلٹوں کے ذریعے تزئین و آرائش کی بہت گنجائش تھی کسی بول کی آرائش و زیبائش کے لئے کئی قسم کے مختلف لنکاروں سے کام لیا جا سکتا تھا اور سنگیت کار کے تخیل کی خلاقی کو اپنے جوہر دکھانے کا پورا پورا موقع ملتا تھا۔ اس گائکی کے دو استادوں سدا رنگ اور ادا رنگ نے بے شمار خیال تصنیف کرکے اپنے شاگردوں کو سکھائے جن کی بدولت دونوں استادوں کو شہرت جاودانی نصیب ہوئی۔ درحقیقت خیال ایک حسین تصوراتی تخلیق ہے۔ اس کے مضامین زیادہ تر عشقیہ ہوتے ہیں۔ جیسے فرقت اور جدائی کا بیان۔ اس کے تمام خیالات ہندی شاعری کے مثل عورتوں کی طرف ہوتے ہیں۔ اس کی ارتقائی منزلیں دو قرار دی گئی ہیں۔ ولمبت (سست روی) اور درت (تیز روی) اس کے برخلاف دھرپد میں راگ الاپ سے تمہید ہی کا کام لیا جاتا تھا کیونکہ اس کی ہیئت نسبتاً زیادہ معین اور واضح تھی اور اس میں راگ کی اٹھان اور اتار چڑھاؤ کی زیادہ گنجائش نہ تھی۔ بہرحال ہندوؤں اور مسلمانوں کے تخلیقی تخیل کے اس امتزاج کی بدولت ہندوستانی موسیقی میں خوش اسلوب تان پلٹوں اور استوار و ہموار سروں کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہونے لگا۔

ٹھمری اور دادرا

دھرپد اور خیال کے لئے بے حد ذہنی محنت اور کاوش و ریاضت درکار ہے۔ چنانچہ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے دربار میں دو ہلکے پھلکے قسم کی اور نسبتاً زیادہ جذباتی چیزیں ٹھمری اور دادرا کو قبولیت حاصل ہوئی۔ ٹھمری میں لچک بہت ہے اور جذبات و محسوسات کے مختلف مدارج کے اظہار کی بھی بے حد گنجائش ہے۔ اسی لیے اسے بجا طور پر کلاسکی موسیقی کی غزل قرار دیا جا سکتا ہے۔ لکھنؤ اور بنارس کو ٹھمری کے

مرکزوں کی حیثیت میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ٹھمری پورب کا گانا ہے۔ اس کی زبان برج بھاشا ہوتی ہے۔ مضمون عاشقانہ ہوتا ہے اور انداز بیان میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ دادرا بھی ٹھمری ہی کی ایک قسم ہے جس میں صرف تال کا فرق ہوتا ہے۔ اس کا مضمون بھی عاشقانہ ہوتا ہے۔ آسان اور عام فہم ہونے کے باعث عوام میں بھی ان کو بہت قبولیت حاصل ہوئی اور شاہ وقت کی سرپرستی نے ان کو اور چار چاند لگا دئے۔

ٹپہ

پنجاب کے ایک صاحب طرز فن کار غلام نبی نے جو بعد میں میاں شوری کے نام سے مشہور ہوئے ٹھمری کی ایک نرم و نازک علاقائی شکل میں ٹپہ کی ایجاد کی۔ یہ پنجاب کا پسندیدہ گانا ہے جو وہاں کے ساربانوں کے گیتوں سے مشابہت رکھتا تھا۔ یہ ہندوستانی موسیقی کا ایک نادر اور نفیس نمونہ ہے۔ اس کا گانا بہت دشوار خیال کیا جاتا ہے اور اس کے گانے والے اسوقت سارے ملک میں چند ہی بتائے جاتے ہیں۔ پنڈت وشنو ڈگمبر پلوسکر نے اپنی عمر کے آخری دور میں نصف درجن ٹپہ کے گانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔ اسی طرح گوالیار کے پنڈت راجہ بھیا پونچھ والا نے بھی ایک چھوٹا سا رسالہ جس میں چار چھ ٹپے تھے شائع کیا تھا۔

گھرانے

مغل عہد میں ایک ایسی چیز دنیائے موسیقی میں پیدا ہو گئی جس کے تاثرات آج تک موجود ہیں۔ وہ یہ کہ جو فن کار موسیقی دربار شاہی سے وابستہ تھے وہ قدرتی طور پر اپنے تئیں دوسروں سے افضل سمجھتے تھے اور گائکی کے نئے نئے ڈھنگ اور اسلوب پیدا کرتے تھے تاکہ وہ دوسرے فن کاروں سے افضل و بہتر سمجھے جائیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ سامعین یہ سمجھیں کہ کمال انھیں کو حاصل ہے اور اس سے دوسرے فن کار ناواقف ہیں۔ ان کوششوں میں بادشاہوں اور دیگر امرا کا بھی حصہ تھا جو موسیقی میں دخل اور دلچسپی رکھتے تھے۔ ادھر وہ ماہرین فن جنھیں شاہی سرپرستی حاصل نہ تھی شاہی گویّوں کو منہ توڑ جواب دینے کی کوشش کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف راگوں کے پیش کرنے کے الگ الگ ڈھنگ نکل آئے۔ رفتہ رفتہ ان کے گانے والوں کے مختلف "دبستان" یا "گھرانے" بن گئے اور یہ سب ایک دوسرے سے برابر بڑھتے گئے۔

ہر گھرانا اپنے مخصوص انداز موسیقی کو برقرار رکھنے کے جوش میں ہر ایسے طریق کو جو اُس کے اپنے انداز سے ذرا بھی مختلف ہو نفرت و حقارت سے دیکھتا تھا۔ اس طرح ہر گھرانے کا انداز گویا ایک بیش قیمت سربستہ راز اور علم سینہ بن گیا۔ جسے پوشیدہ رکھنے میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا اور صرف ان لوگوں کو بتایا جاتا تھا جنھیں اس کا موروثی حق پہنچتا ہو۔ کسی شاگرد کو اپنے استاد کے علم و کمال کا قابل ذکر حصہ شاذ و نادر اور وہ بھی ہزار مشکل سے حاصل ہوتا تھا۔ گھرانا داروں میں باہمی چشمک اور مخاصمت بھی پیدا ہو گئی اور وہ ایک دوسرے سے بغض و حسد کرنے لگے۔

اکبر کے عہد میں دُھرپد کا عروج تھا اور خیال گائکی کا کوئی ذکر نہ تھا۔ مگر اس وقت بھی دھرپد کے کئی علیحدہ علیحدہ گھرانے بن گئے تھے جو اپنے آپ کو اپنی اپنی گائکی پیش کرنے کے ڈھنگ کا "بانی" کہتے تھے۔ ان کے نام ہیں کھنڈاری بانی۔ نوہاری بانی۔ گوراری بانی اور رڈاگر بانی۔ دُھرپد کے بعد خیال گائکی کے گھرانوں کا اضافہ ہوا۔ آج کل بھارت میں خیال گائکی کے چند مشہور گھرانے یہ ہیں:- آگرہ۔ کیرانہ۔ پٹیالہ اور گوالیار۔ ان میں سے گوالیار گھرانے کی کئی شاخیں بن گئیں جیسے سہسوان والے، پٹیالے والے، تلونڈی والے، اترولی والے، بھنڈی بازار والے، گندھرو مہاودیالہ والے۔

آگرہ کا گھرانا

آگرے کا گھرانا ہندوستانی موسیقی کا مشہور گھرانا ہے۔ اس گھرانے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زمانۂ سلف سے آج تک اس میں ایسے لوگ ہوتے رہے ہیں جو خاندانی روایات کو اب تک قائم رکھے ہوئے ہیں ورنہ ایسے بہت سے خاندان ہندوستان میں ہوئے جنھوں نے فن موسیقی میں ایک وقت میں اپنے جھنڈے گاڑ دئے لیکن کچھ عرصے بعد ہی ان کے وہ تمام خصوصیات ختم ہو گئے۔ آگرے کو یوں بھی ایک خصوصیت و امتیاز حاصل ہے کہ فنون لطیفہ سے متعلق آگرے سے ایسی عظیم شخصیتیں اُبھریں اور رہیں، جنھیں تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ اُس کی خاک سے جہاں خان آرزو، میاں مظہر جان جاناں، میر تقی میر، میاں نظیر اکبرآبادی مرزا غالب جیسے عظیم شاعر اور اردو، فارسی کے بہترین نثر نگار پیدا ہوئے ہیں سبحان خاں، میاں گھگّے خدابخش، شیر خاں، غلام عباس خاں، کلن خاں، نثار حسین عرف نتھن خاں، آفتاب موسیقی فیاض خاں، اور عبداللہ خاں

جیسے موسیقاروں نے جنم لیا۔ آگرے کے خاندان میں موسیقی کی ابتدا ر دور اکبری سے ہوتی ہے۔ اکبر نے ملک کے گوشے گوشے سے موسیقاروں کو بلاکر اپنے دربار کی رونق بڑھائی تھی۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ میاں تان سین کے ہم عصر و ہم پلہ اور بھی بہت سے فن کار تھے جن کا پورا حال بدقسمتی سے نہیں لکھا گیا۔ صرف آئینِ اکبری میں چند نام مذکور ہیں۔ اس سلسلہ کے بعد کے افراد میں شام رنگ خاں، سرس رنگ خاں، گھگے خدا بخش، نتھن خاں (المعروف بہ حسینی) شیر خاں، غلام عباس خاں، کلن خاں خاص طور پر ممتاز گزرے ہیں۔ نتھن خاں نے جب وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ بمبئی میں رہتے تھے، مبارک علی خاں اور بعض دوسرے بزرگوں کو سن کر تان میں ایک نیا رنگ پیدا کیا جو "بول تان" کے نام سے مشہور ہوا اور یہی آگرے کی گائکی کی خصوصیت ہے۔ "بول تان" کی خصوصیت یہ ہے کہ تان کو لے میں پھرانے کے ساتھ ساتھ استھائی یا خیال کے بول بھی اس میں شامل کئے جائیں اور راس میں مختلف لے کی شکلیں بنتی چلی جائیں اور سم پر بول اچانک طریقے سے آجائے۔ نتھن خاں کے بیٹے ہمیشہ بمبئی میں رہے اور کئی شاگرد تیار کئے۔ ان کے چھوٹے بھائی عبداللہ خاں بھی فرد زمانہ اور اپنے باپ کا مکمل نمونہ تھے۔ یہ ریاست میسور کی ملازمت میں تھے اور وہیں انتقال کیا۔

غلام عباس خاں کے کوئی لڑکا نہیں ہوا۔ اس لئے انھوں نے اپنی بڑی لڑکی کے بچے کو جو بیوہ ہوگئی تھی گود لے لیا تھا۔ غلام عباس کی ساری توجہ اسی بچے پر مرکوز ہوگئی تھی اور یہی وہ بچہ تھا جو فیاض خاں کے نام سے آفتاب موسیقی بن کر دنیائے موسیقی پر چمکا۔ ہندوستان کا یہ عظیم فن کار کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ ان کے فن کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ دھرپد، دھمار، استھائی، خیال، ترانہ، سرگم، ٹھمری، دادرا، غزل، سوز، سلام، غرض تمام اصناف موسیقی پر انھیں کامل عبور تھا۔ وہ جو چیز بھی گاتے یہ معلوم ہوتا کہ اسی پر سارا ریاض ختم کر دیا ہے۔ اُن کے الاپ نے تو وہ قبولیت حاصل کی کہ ہندوستان کے اسّی فی صدی خیال گانے والے گانا شروع ہی الاپ سے کرتے ہیں۔ آفتاب موسیقی کا خطاب ان کو مہاراجہ میسور نے عطا کیا تھا۔ یہ آفتاب موسیقی نومبر ۱۹۵۰ء میں بڑودہ میں غروب ہوگیا۔ انھوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ جس سڑک پر ان کا مکان تھا بڑودہ میونسپلٹی نے ان کے اعزاز میں اس سڑک کا نام فیاض خاں روڈ رکھ دیا ہے۔

کیرانہ کا گھرانہ

کیرانہ گھرانے کی ابتدا اس طرح بتائی جاتی ہے کہ ضلع میرٹھ میں جمنا کے کنارے دوتاہی نام کا ایک قصبہ تھا جس میں گوپال نائک کے جودو برہمن تھے، شاگرد آباد تھے۔ جہانگیر کے زمانہ میں قصبہ دوتاہی جمنا کی طغیانی کی نذر ہوگیا اور حکومت نے باشندگان دوتاہی کو جمنا ہی کے کنارے قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر میں آباد کیا۔ کچھ مدت کے بعد فن کاران دوتاہی نے جو اَب کیرانہ میں رہتے تھے اسلام قبول کر لیا۔ ان میں ایک مشہور بین کار صادق علی خاں تھے جو ۱۸۷۰ء کے قریب ہوئے۔ ان کے صاحبزادے بندے علی خاں ہندوستان بھر میں استاد بے بدل، اپنی وضع کے پابند، اور بین میں یکتا ہوئے ہیں۔ وہ علاوہ بین کے ایک ماہر فن موسیقار بھی تھے۔ وہ ۱۸۹۶ء سے مہاراجہ اندور کے ملازم ہوکر وہاں چلے گئے۔ بڑے نازک مزاج، نیک دل اور فیاض تھے۔ ہر دربار میں بندے علی خاں کو علاوہ خلعت ایک ہزار روپیہ کی تھیلی انعام میں ملا کرتی تھی اور سواری کے لئے ہمیشہ ہاتھی ملا کرتا تھا۔ وہ دربار کے بعد ہاتھی پر سوار ہوکر روپوں کی تھیلی بغل میں رکھ لیا کرتے تھے اور ساتھ ہی تھیلی میں چھید کر دیا کرتے تھے۔ راستہ بھر بغل بجاتے جاتے اور روپے آہستہ آہستہ تھیلی سے نکل کر بیچ سڑک پر گرتے جاتے جو غریب اُٹھا لیتے۔ اس طرح اُن کے گھر پہنچنے تک تھیلی خالی ہوجاتی۔ اس گھرانے کے بہت سے فن کاروں نے ریاستوں میں ملازمت کی لیکن اپنی نازک مزاجی کی وجہ سے زیادہ دیر نہیں رہ سکے۔ مثال کے طور پر حیدر خاں ریاست کولھاپور میں رہے۔ اسی زمانہ میں اللہ دیا خاں بھی تھے۔ مراد خاں بین کار ریاست دیواس میں، عبدالکریم خاں ریاست بڑودہ اور میسور میں اور عبدالوحید خاں ریاست کولھاپور میں۔ آج کل اس گھرانے کے چند فن کار یہ ہیں؛ گنیش رام چندر۔ بہرے بوا۔ (شاگرد عبدالکریم خاں) سوائی گندھرو مرحوم شاگرد عبدالکریم خاں۔ اور سوائی گندھرو کے شاگرد راج گورو بسوراج۔ بھیم سین جوشی گنگو بائی۔ فیروز دستور وغیرہ۔ ہیرا بائی بڑودکر۔ سرسوتی بائی۔ شکور خاں سارنگی نواز۔ فیروز نظامی (پاکستان) ماڈھور مٹو۔ بیگم اختر۔

گوالیار کا گھرانا

راجہ مان سنگھ ۱۴۸۶ء میں گوالیار کا فرماں روا ہوا۔ یہ موسیقی کا نہ صرف بہت بڑا قدرداں تھا بلکہ خود بھی اس فن کے کاملوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ نائک بیجو جو اپنے زمانہ کا بے نظیر اور مشہور موسیقار ہے اس کا درباری گویا تھا اور نائک بخشو اس کا ترتیب دیا ہوا تھا۔ اکبری دربار کے ۳۶ نامی گویوں میں سے ۱۶ گوالیار کے رہنے والے تھے۔ نائک گوپال نائک بیجو کا خادم اور شاگرد تھا۔ بابا رام داس اکبر و جہانگیر کے دربار کا موسیقار تھا۔ تان سین پہلے شیر شاہ کے لڑکے دولت خاں کے ساتھ تھا۔ اس کے مرنے کے بعد رام چند بگھیلا کے پاس چلا گیا۔ اس نے اتنی قدر و منزلت کی کہ بیان سے باہر ہے چنانچہ ایک دن میں ایک کروڑ روپے اسے عطا کئے۔ جب اس کا شہرہ اکبر نے سنا تو اس نے راجہ سے تان سین کو مانگ لیا۔ چاند خاں، سورج خاں اکبر کے عہد میں تان سین کے ساتھ سُر ملاتے تھے۔ میاں تان سین کے تین بیٹے تھے۔ بلاس خاں۔ صورت سین اور تان ترنگ خاں۔ تان ترنگ سب میں ممتاز تھا۔ لعل کلاونت۔ نائک چرجو۔ سبحان خاں۔ بچتر خاں اکبری دربار کے مقبول موسیقار تھے۔ لعل خاں کلاونت ثانی۔ خوشحال خاں (گن سمندر خاں کا بیٹا) بسرام خاں کلاونت برادر خوشحال خاں عہد شاہجہاں کا موسیقار، حافظ علی خاں وغیرہ۔

دیگر گھرانوں کی تفصیل سے بخوف طوالت قطع نظر کی جاتی ہے۔

راگوں کے اوقات

ہندوستانی راگوں کے گانے کا ایک سرسری خاکہ بہ لحاظ وقت ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

صبح: پہلا پہر۔ راگ بلاول۔ راگ بھیروں۔ راگ مالکوس (گرنتھوں کے بموجب) مگر آج کل شام کو گایا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرا پہر:۔ آساوری۔ ٹوری۔

۳۔ تیسرا پہر:۔ بھیم پلاسی۔ پیلو۔

۴۔ شام:۔ ایمن کلیان۔ پوروی۔ مارو۔ مالکوس۔

۵۔ رات: پہلا پہر:۔ بھوپالی۔ ہمیر۔ کیدارا۔ شری

۶۔ دوسرا پہر:۔ بہاگ۔ تلک کامود۔ کھماج

۷۔ آدھی رات:۔ کانی (گرنتھوں کے بموجب) مگر آج کل ہر وقت گا لیتے ہیں۔ باگیسری

۸۔ تیسرا پہر:۔ کا لنگڑا۔ جوگیا۔

۹۔ آخری حصہ:۔ سوہنی

دور جدید

شمالی ہند میں موسیقی نے شاہی سرپرستی میں ترقی کی اور یہ بڑی حد تک حکمرانوں کے درباروں کا اجارہ بن گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام الناس کو اس سے برائے نام سا تعلق رہ گیا۔ اپنے سرپرستوں کی تفریح و خوشنودی کے لئے گانے والیوں کی سوقیانہ اور غیر سنجیدہ حرکات نے موسیقی کو بدنام کر دیا۔ چناں چہ پڑھے لکھے اور شایستہ و مہذب لوگوں میں موسیقی کا شوق ممنوع قرار پا گیا۔ شمالی ہند کے خلاف جنوبی ہند میں سنگیت نے دھارمک کاریہ کرم سے کبھی رشتہ منقطع نہیں کیا۔ چناں چہ وہاں کے گیت کار سب کے سب بلند پایہ سنت اور ساہتیہ کار تھے۔ مثلاً پورندا سر، تیاگ راج، شام شاستری اور رسوالی پروناال صرف اعلیٰ پایہ کے گویے اور گیت کار ہی نہیں تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ برگزیدہ سنت تھے۔

ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کے بعد بعض والیان ریاست نے جن کے حکمرانوں کو موسیقی سے شغف اور لگاؤ تھا اعلیٰ پایہ کے سنگیت کاروں کو اپنے درباروں میں جمع کر لیا۔ لیکن بحیثیت مجموعی شاہی سرپرستی روز بروز کم ہونے لگی اور سنگیت کار پبلک کی سرپرستی کا زیادہ سے زیادہ سہارا لینے پر مجبور ہو گئے۔ یہ بات کئی پہلوؤں سے ہماری موسیقی کے لئے رحمت ثابت ہوئی۔ اب سنگیت کار صرف ایک سرپرست کے بجائے جو اس کا واحد سہارا ہوتا تھا بہت سے سرپرستوں کی امداد کی طرف متوجہ ہوا۔ اس طرح کئی بے تکلف اور بے ضابطہ گروہ اور جماعتیں معرض وجود میں آگئیں۔ جو لوگ گانا سننے کے خواہش مند ہوتے وہ مل جلکر سنگیت کار کو معاوضہ ادا کر دیتے۔ اس تبدیلی سے جن مسائل اور مشکلات کا سامنا ہوا اُن میں سے دو مسئلے بہت پیچیدہ تھے اور انھیں حل کر لینا قریب قریب ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ موسیقی کو ابھی تک ایک غیر پسندیدہ شغل سمجھا جاتا تھا۔ یہ گویا اخلاقی پستی کی علامت اور کسی ہونہار نوجوان کے مستقبل کے لئے تباہ کن چیز تھی اس پر طرہ یہ سنگیت کار کے نئے سامعین یعنی متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ اور مہذب

لوگوں میں موسیقی کا ذوق اور سوجھ بوجھ نہ ہونے کے برابر تھی۔ موسیقی کی تعلیم و تربیت نہایت پستی کی حالت میں تھی اور یہ زمانہ سنگیت اور سنگیت کار دونوں کے لئے بہت سختی اور آزمائش کا تھا۔ عین اس نازک وقت پر موسیقی کے احیائے ثانی کے لئے دو نامور ہستیاں سنگیت کی دنیا میں نمودار ہوئیں جنھوں نے اپنی ان تھک کوششوں سے موسیقی کو معدوم ہونے سے بچا لیا۔ یہ تھے پنڈت پلوسکر اور بھات کھنڈے۔ پنڈت وشنو ڈگمبر نے موسیقی کے دامن سے کلنگ کا داغ اور اس کے خلاف عوام کا تعصب دور کرنے کے لئے اپنی انتہائی قوتیں صرف کر دیں اور آخرکار لوگوں کو موسیقی کی پاکیزگی بخش اور روحانی صلاحیتوں کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے۔ پنڈت بھات کھنڈے نے اپنی تمام تر توجہ اور کوششیں ایک زیادہ ٹھوس اور دشوار ترین کام پر مرکوز کر دیں۔ انھوں نے موسیقی کو سائنٹفک بنیادوں پر استوار کرنے اور اس کے خالص شہ پاروں یعنی مختلف مسلمہ گھرانوں کے استادوں کی تصنیفوں کو جمع کر کے ایک نظام کے تحت منضبط کرنے اور پھر " علامت کاری " کے ذریعے سے ضبط تحریر میں ایسے تمام لوگوں تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا جو سنگیت کو بطور پیشہ یا شغل اختیار کرنے کے خواہشمند ہوں۔ انھوں نے اپنی زندگی موسیقی کے لئے وقف کر دی اور اس بے حد مشکل کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے وہ سالہا سال بڑے صبر اور حوصلے سے مصروفِ عمل رہے۔

بنگال کو ٹیگور نے اپنی جدت طرازیوں اور جدید موسیقی سے روشناس کرایا۔ مدراس کا علاقہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سنگیت کا شیدائی ہے۔ برٹش دورِ حکومت ختم ہو چکا ہے اب قومی حکومت قائم ہے۔ اس حکومت نے جہاں عوامی زندگی کے ہر شعبہ کو سنوارنے پر توجہ دی ہے وہاں فنِ موسیقی کی سرپرستی بھی قبول کر کے اپنی ذمہ داری کا پورا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ اب بھارتیہ سنگیت اکیڈمی اور آل انڈیا ریڈیو جیسے سرکاری اداروں سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اکاڈمیوں کے قیام اور مستحق لوگوں کو وظائف کے عطیات، خطابات اور انعامات کی بخشش سے ظاہر ہے کہ حکومت بھی سنگیت کاروں کی سرپرستی پر آمادہ ہو گئی ہے۔ اور اس کا مستقبل درخشاں ہے۔

خیالوں کی ڈگر

بسم نظر آیا۔ میں نے ایک پیالی چائے پی کر دل ہی دل میں سارے پروگرام طے کیے۔ نوکر سے گھر کو اچھی طرح صاف کر لینے اور دو آدمیوں کے لیے اچھا کھانا پکانے کے لیے کہا۔ میں طے کر چکا تھا کہ سنیتا کو کچھ دیر کے لیے ضرور روک لوں گا اور اگلی ٹرین سے ہی واپس کر دوں گا۔ پھر میں نے اور بھی کچھ سوچا۔ کئی بار اپنی تنخواہ کا حساب لگایا۔ سب ملا کر دو سو روپے کے قریب ہوتی تھی اور یقیناً یہ تنخواہ ایک جوڑے کے لیے مطمئن زندگی بسر کرنے کے لیے کافی تھی۔ "پھر وہ کتنی سلیقہ مند ہے۔ وہ میرے ساتھ ہنسی خوشی رہیگی۔"

میں آدھ گھنٹہ پہلے ہی اسٹیشن پہنچ گیا اور پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ بار بار میں نے نوٹس بورڈ دیکھا۔ گاڑی وقت پر آنے والی تھی۔ لیٹ نہیں تھی۔ بک اسٹال سے میں نے سنیتا کے پسندیدہ مصنفین کی کچھ کتابیں خریدیں۔ دور سے ٹرین دھواں اگلتی آ رہی تھی اور میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ "کیسی لگتی ہوگی اب وہ؟ میں اُس سے کیا بات کروں گا؟" اتنے میں ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ میں ڈبوں میں اُسے تلاش

(بسلسلہ صفحہ ۳۲)

کرنے لگا۔ سکنڈ کلاس کی کھڑکی سے ایک عورت باہر جھانک رہی تھی۔ مجھ سے نگاہیں ملتے ہی وہ مسکرائی اور نمستے کیا۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا۔ سنیتا ہی تھی۔ وہ ذرا موٹی ہو گئی تھی اور اُس کی آنکھوں پر سنہری فریم والی ایک عینک چڑھی تھی۔ میں دوڑتا ہوا ڈبے تک گیا اور ایک ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔ وہ مسکراتی رہی۔ وہی مجوب سی مسکراہٹ۔ اُس نے میری صحت خراب ہو جانے پر افسوس ظاہر کیا اور آہستہ آہستہ دوسری باتیں پوچھتی رہی۔ وہی لہجہ تھا، وہی آواز تھی۔ ذرا بھی تو تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

" سنیتا چلو اترو! تم اگلی ٹرین سے جاؤ گی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم بغیر کچھ کھائے پیئے چلی جاؤ۔"

سنیتا کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک بچہ ڈبہ میں چلانے لگا۔ اور سنیتا "معاف کرنا روی" کہہ کر پلٹی۔ پھر وہ ایک سہ سالہ خوبصورت بچہ کو گود میں لیے آ گئی اور بچہ کے دو تین بوسے لے کر بڑے پیار سے کہا۔

"بیٹے یہ تمھارے روی چاچا ہیں۔ انھیں نمستے کرو۔"



حکومت اُتر پردیش کے وہ اراکین جنھوں نے ۱۴ رمارچ ۱۹۶۲ء کو گورنر اُتر پردیش کے سامنے حلفِ وفاداری اُٹھایا

اتر پردیش کی نئی حکومت

اتر پردیش کی نئی حکومت نے جس کے وزیر اعلیٰ شری چندر بھان گپتا ہیں ۱۴ رمارچ ۱۹۶۲ء کو راج بھون لکھنؤ میں اتر پردیش کے گورنر ڈاکٹر بی. رام کرشن راؤ کے سامنے حلف وفاداری اٹھایا۔ حلف وفاداری کی رسم ادا کرنے کے بعد گورنر نے وزیروں کو مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ "مجھے تیسرے عام انتخابات کے بعد اتر پردیش کی نئی حکومت کے قیام اور اپنی کابینہ کے ممبران کی حیثیت سے آپ سب کا خیرمقدم کرنے میں بہت مسرت حاصل ہوتی ہے"۔

وزیر اعلیٰ کو خطاب کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ آپ کو یاد ہوگا کہ ۷ ردسمبر سنہ ۱۹۶۰ء کو غیر معمولی حالات کے تحت اس عہدے کو قبول کرنے کے لئے مجھے آپ کو دعوت دینے میں بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس قلیل مدت میں ریاست نے آپ کی قیادت سیاسی سوجھ بوجھ اور انتظامی صلاحیت کی بدولت بہت ترقی کی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اسے اور زیادہ ترقی اور خوش حالی کی منزلوں پر پہنچانے کی ذمہ داری آپ کو سونپی گئی ہے۔ اس کے لئے میں آپ کو اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

گورنر موصوف نے کہا کہ وزرا کو بھی جنھوں نے آج حلف وفاداری لیا ہے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور میری دلی تمنا ہے کہ وہ ریاست کی ترقی کے سلسلے میں اپنی اہم خدمات کی دنجام دہی میں کامیاب ہوں۔ آپ سب لوگ عوام کے معتمد خادم ہیں اور آپ میں سے بیشتر لوگوں کو نظم ونسق کے کسی نہ کسی شعبہ کا تجربہ بھی حاصل ہے۔ یہ کسی بھی ریاست کے لئے خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس کے وزرا کی جماعت میں ہم آہنگی باہمی اعتماد اور اتحاد ہو اور وہ ریاست کی ترقی کے سلسلے میں ذمہ داری سنبھالنے کے لئے مستعد ہوں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ریاست کے استحکام اور عوام کی خوش حالی کا انحصار تمام تر کابینہ کے ممبران کے آپس کے باہمی اعتماد پر ہوتا ہے کیوں کہ وہی لوگ ریاست کے مستقبل کو سنوارنے والے ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی جماعت جس کو وسیع پیمانے پر نمائندگی حاصل ہے عوام کے ہر طبقے کے اندر اعتماد پیدا کرے گی جس کی بنا پر آپ اتر پردیش کے مستقبل کو روشن بنانے کے لئے یکسوئی کے ساتھ توجہ دے سکیں گے۔

تیسرے پنج سالہ منصوبے پر کام شروع کر دیا گیا ہے۔ اتر پردیش آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑی اور کئی باتوں میں سب سے بہتر ریاست ہے۔ بہت سی مشکلات ہمارے سامنے ہیں اور ترقی کے بہت سے شعبوں میں ہم کو کافی جدوجہد کرنا ہے۔ ہمارا ملک جو دنیا کی سب سے بڑی آبادی والی جمہوریہ ہے اس میں تیسرے عام انتخابات ابھی حال میں ختم ہوئے ہیں۔ اتنے بڑے عام انتخابات کے کامیاب تجربے کی بہت تعریف بھی ہوئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کامیابی کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔ ملک کی ترقی کے لئے ہمیں پورے عزم اور کامیابی حاصل کرنے کے واسطے پورے جذبے کے ساتھ دوگنی طاقت سے سرگرم عمل ہونا پڑے گا۔

میری تمنا ہے کہ آپ کو اپنی اس بڑی ذمہ داری کو انجام دینے میں مکمل طور پر کامیابی حاصل ہو۔

وزیر اعلیٰ کا براڈ کاسٹ

وزیر اعلیٰ اتر پردیش، شری چندر بھان گپتا نے اتر پردیش کی نئی حکومت کی تشکیل کے بعد ۱۴ رمارچ ۱۹۶۲ء کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے اتر پردیش کے عوام کے نام حسب ذیل پیغام نشر کیا:

" حالیہ عام انتخابات کے نتیجے میں گورنر نے مجھے ایک نئی وزارت کی تشکیل کی دعوت دی اور چند گھنٹہ قبل ہی میں نے اور میرے ساتھیوں نے حلف وفاداری اٹھایا ہے۔ لیکن رسمی کارروائیوں کے علاوہ جن کی اپنی الگ اہمیت ہے میں ایک انتہائی اہم معاملے کے سلسلے میں آپ سے کچھ باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

" اپنی خامیوں سے پورے طور پر آگاہ ہوتے ہوئے میں آپ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی خدمت کرنے کا ایک اور موقع دیا ہے۔ میں نہایت عاجزی کے ساتھ آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ میرے اس کہنے پر یقین رکھیں کہ آج پھر میں نے ملک اور اس کے عوام کی خدمت کرنے کے لئے اپنے کو کلی طور سے دوبارہ وقف کر دیا ہے۔ یہ کام میں اپنی تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ بخوبی انجام دوں گا۔

" جمہوری تصور سے سیاسی جماعتوں اور پارلیمنٹ اور ریاستی مجالس قانون ساز میں اکثریت کی حامل سیاسی جماعت کے ذریعے قائم ہونے والی حکومت کے نظم و نسق کو الگ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے میں نے جو حکومت بنائی ہے وہ کانگریس جماعت کی نمائندگی تو کرتی ہی ہے لیکن زیادہ وسیع مفہوم میں یہ ان تمام لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے جن کی خدمت کرنا میرا اور میرے تمام ساتھیوں کا اولین مقصد ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے کیوں کہ ہر حکومت خواہ وہ عوام کی ہو اور عوام کے ذریعے قائم ہو یا نہ ہو لازمی طور پر عوام کے لئے ہی ہوتی ہے۔ چناں چہ عوام کی خدمت کے پیش نظر تمام جماعتی تفریق و امتیاز کو بھلا دینا چاہیے اور یہی وہ مقصد ہے جس کے حصول کے لئے میں اور میرے تمام ساتھی اس وقت تک کوشاں رہیں گے جب تک ان کو عوام کا اعتماد حاصل رہے گا۔

" یہ بالکل ٹھیک ہی کہا گیا ہے کہ عوام کے نمائندے کے لئے یہ اطمینان اور فخر کی بات ہوتی ہے کہ وہ اپنے حلقۂ انتخاب کے افراد سے قریبی رابطہ قائم کرے، ان کے خیالات کو اچھی طرح سمجھے اور ان سے بے تکلفانہ تعلقات رکھے۔ نمائندہ کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ عوام کے مفاد کی خاطر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح نہ دے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کو سبھی معاملوں میں اور سبھی حالات میں عوام کے مفاد میں ان کے نمائندے کی حیثیت سے اپنے مفاد کا ایثار کرنے میں ہمیشہ آمادہ رہنا چاہیے۔ یہی اصول ہمارے قول و عمل کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا۔

" میں اس اصول پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ نیکی اور دانشمندانہ فعل کی مانند جمہوری طرز حکومت کا انحصار بھی باہمی سمجھوتے اور رضامندی پر ہوتا ہے۔

" وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام شہری کی حیثیت سے میری دلی تمنا ہے کہ اپنے ملک کو عظیم اور اس کے رہنے والوں کو خوش و خرم اور خوشحال بنانے کے اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے میں مجھے تمام لوگوں کا تعاون حاصل رہے۔ مجھے اپنے ملک کے خوشحال مستقبل اور جمہوریت کی روز افزوں قوت پر یقین ہے۔ ہمارے پاس خیالات کی کبھی کمی نہیں رہی اور نہ ہمارے ملک میں بڑی شخصیتوں کا فقدان رہا ہے۔ ہم سب کو مجموعی طور سے اپنے آدرشوں کو حاصل کرنے کے لئے انتھک جد و جہد کرنا ہے۔ ان آدرشوں کو ہمیں دوسرے ممالک سے مستعار نہیں لینا ہے بلکہ یہ آدرش تو ہم میں اور ہماری تہذیب و تمدن میں جس کی ہم نمائندگی کرتے ہیں پنہاں ہیں۔

" میری دلی خواہش ہے کہ سب لوگ سیاسی اور سماجی امتیازات سے بالاتر ہو کر میری اس تمنا میں شریک ہوں کہ میرے ساتھیوں اور بذات خود مجھ میں ان اصولوں کے مطابق کام کرنے کے لئے استقلال اور قوت حاصل ہو تاکہ ہم خود کو آپ کے اعتماد کے قابل ثابت کر سکیں اور ایسی خدمات انجام دے سکیں جس سے شان و شوکت والی ہماری اس قدیم سرزمین میں جمہوریت کی بنیادیں مستحکم تر ہو سکیں۔"

وزیروں کے نام اور ان کے محکمے

نئی حکومت کے وزیر اور جو محکمے ان کے سپرد ہوئے ہیں ان کی فہرست حسب ذیل ہے :-

نام	قلمدان وزارت	محکمہ
شری چندر بھان گپتا	وزیر اعلیٰ جنرل ایڈمنسٹریشن پلاننگ۔ داخلہ صنعت اور میڈیکل	(۱) جنرل ایڈمنسٹریشن (۲) پلاننگ (علاوہ اجتماعی منصوبہ)۔ (۳) صنعتیں (علاوہ دیہی اور چھوٹی پیمانے کی صنعتیں) (۴) داخلہ (علاوہ جیل اور نوعمروں کے جرائم) (۵) میڈیکل (۶) بجلی۔ مندرجۂ ذیل امور وزرائے ریاست وزیر اعلیٰ کی نگرانی میں انجام دیں گے (۱) گنے کی مارکٹنگ اور گڑ کی ترقی (۲) گنے کی ترقی (۳) پارلیمانی امور (۴) اطلاعات
شری حکم سنگھ وسین	مال	(۱) مال (۲) قلت
شری گردھاری لال	تعمیرات عامہ	تعمیرات عامہ
شریمتی سوچیتا کرپلانی	محنت اور اجتماعی ترقی	(۱) اجتماعی ترقی (۲) پنچایتی راج (جس میں دیہی پنچایتیں ضلع پریشد اور چھیتر سمیتیاں شامل ہیں) (۳) وزیر محنت

نام	قلمدانِ وزارت	محکمہ
شری چرن سنگھ	زراعت	(۱) زراعت (۲) پشو پالن (۳) مچھلی
شری سید علی ظہیر	انصاف	(۱) انصاف (۲) لیجسلیٹو (۳) مسلم اوقاف
شری کملاپتی ترپاٹھی	مالیات	(۱) مالیات (۲) بکری ٹیکس (۳) رجسٹریشن (۴) اسٹامپ اور کورٹ فیس
آچاریہ جگل کشور	تعلیم	تعلیم
شری وچتر نرائن شرما	لوکل سلف گورنمنٹ	(۱) لوکل سلف گورنمنٹ (علاوہ پنچایتی راج) (۲) میونسپل (۳) ہاؤسنگ (میونسپل بورڈوں اور امپرومنٹ ٹرسٹوں کی اسکیمیں اور مرکز کی امداد سے متعلق مراسلت)
شری مظفر حسن	نقل و حمل	(۱) نقل و حمل (۲) سیاسی پنشنیں
شری رام مورتی	آب پاشی	(۱) آب پاشی (۲) گورنمنٹ اسٹیٹ ایس
شری الگو رائے شاستری	جنگلات	(۱) جنگلات (۲) اقتصادیات اور اعداد و شمار
شری چترنبھج شرما	امداد باہمی	امداد باہمی
شری جگ موہن سنگھ نیگی	رسد	غذا اور سول سپلائز
شری پھول سنگھ	دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتیں	دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتیں
شری مہابیر پرشاد سری واستوا	صحت اور سماجی فلاح	(۱) سماجی فلاح اور ہریجن فلاح (۲) امور خیر کے اوقاف اور شری بدری ناتھ منڈ (۳) صحت عامہ

وزرائے ریاست

نام	قلمدانِ وزارت	محکمہ
ڈاکٹر سیتا رام	آب کاری	(۱) آب کاری (۲) ثقافتی اُمور (عجائب گھروں اور آرٹس کالج کے علاوہ) اور سائنسی تحقیقات
شری گوند سہائے	جیل اور امداد و بحالی	(۱) جیل (۲) نوعمر دن کے جرائم (۳) امداد و بحالی (۴) پرانتیہ رکشک دل اور نوجوانوں کے پروگرام
شری اوڈیال کھنا	گنے کی ترقی	(۱) گنے کی مارکیٹنگ و رگرم ترقی (۲) گنے کی ترقی
شری بنارسی داس	اطلاعات	(۱) اطلاعات (۲) پارلیمانی امور

نام	قلمدانِ وزارت	محکمہ

نائب وزرا میں تقسیم کار

نام	قلمدانِ وزارت	وزرا جن سے یہ متعلق ہوں گے
شریمتی پرکاش وتی سود	سماجی فلاح اور ہریجن فلاح	وزیر صحت و سماجی فلاح
شری شانتی پرپن شرما	بجلی اور پلاننگ	وزیر اعلیٰ
شری بلدیو سنگھ آریہ	غذا	وزیر رسد
شری دھرم سنگھ	صحت عامہ و میڈیکل	وزیر صحت و سماجی فلاح اور وزیر اعلیٰ
شری ہیم وتی نندن بہوگنہ	محنت	وزیر محنت و اجتماعی ترقی
شری نول کشور	داخلہ (پولیس)	وزیر اعلیٰ
شری جے رام ورما	مالیات	وزیر مالیات
ڈاکٹر رام نرائن پانڈے	آب پاشی	وزیر آب پاشی
شری شیو پرشاد گپتا	دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتیں	وزیر دیہی صنعت و چھوٹے پیمانے کی صنعت
شری شیوراج سنگھ	زراعت	وزیر زراعت
شری کیش بھان	تعلیم	وزیر تعلیم

اعزازی پارلیمنٹری سکریٹری

نام	قلمدانِ وزارت	وزرا جن سے یہ متعلق ہوں گے
شری برج بہاری مسرا	مال	وزیر مال
شری نند کمار دیو وششٹ	اجتماعی ترقی	وزیر محنت و اجتماعی ترقی
شری گنیشی لال	نقل و حمل	وزیر نقل و حمل
شری متی تارا اگروال	لوکل سلف گورنمنٹ	وزیر لوکل سلف گورنمنٹ
شری محمد شاہد فاخری	اوقاف	وزیر انصاف
شری ہری دت	جنگلات	وزیر جنگلات
شری چندر سنگھ راوت	امداد باہمی و انصاف	وزیر امداد باہمی و وزیر انصاف
شری ابے کمار باسو	تعمیرات عامہ	وزیر تعمیرات عامہ
شری عزیز امام	تعلیم	وزیر تعلیم
شری دھرم دت وید	جیل	وزیر جیل و امداد بحالی
شری نشی دھر پانڈے	پنچایتی راج	وزیر محنت و اجتماعی ترقی
شری دویندر پرتاپ سنگھ	اجتماعی ترقی	وزیر محنت و اجتماعی ترقی
شری ویرسین	چھوٹے پیمانے کی صنعتیں	چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے وزیر

اتر پردیش شاہ راہ ترقی پر

للت کلا اکاڈمی کا افتتاح ـــــ ریڈیولاجی اور کینسر کا تحقیقی ادارہ ـــــ دفینہ ملنے کے سلسلے میں احکام ـــــ نانک ساگر ـــــ گھوڑے سے سونا ـــــ قوت بخش غذا کی فراہمی ـــــ متفرقات

شری مہدی نواز جنگ گورنر گجرات نے لکھنؤ میں ۱۵ مارچ کو یہاں ملک کے مختلف حصوں میں فنون لطیفہ کو فروغ دینے پر زور دیا۔ گورنر صاحب جو یہاں ریاستی للت کلا اکاڈمی واقع گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ کرافٹس کا افتتاح کر رہے تھے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ ایسے مقصد کا حصول ذرا مشکل ہے جب تک کہ سماجی تحریک کو غیر مرکزی نہ بنا دیا جائے۔ محض ایک مرکزی روایتی ادارہ اس مقصد کو حل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے ریاستی اداروں کی ضرورت ہے۔ ریاستی اکاڈمیوں کو یہ فائدہ رہے گا کہ انھیں ریاستی حکومت کی جانب سے حوصلہ افزائی اور مالی امداد ملتی رہے گی۔

گجرات کے گورنر نے کہا کہ اس اکاڈمی کا افتتاح اس موقع پر ہو رہا ہے جب کہ ریاست کی نئی حکومت کا اجرا ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اتر پردیش کے گورنر شری رام کرشن راؤ اور وزیر اعلیٰ شری چندر بھان گپتا نے اس اکاڈمی میں جو دلچسپی کا اظہار کیا ہے وہ اسے ہندوستان کی بہترین اکاڈمیوں میں اعلیٰ رتبہ دلائیں گے۔ اس سلسلہ میں شری گپتا نے مجھے شروع سے ہی خط و کتابت کے ذریعہ للت کلا اکاڈمی کے قیام کے بارے میں متوجہ کیا تھا اور مجھے امید ہے کہ فن کاروں کا سندر جلد ہی قائم ہو جائے گا۔

انھوں نے مزید کہا کہ مجھے یقین ہے کہ اس اکاڈمی کو مرکزی اکاڈمی کی جانب سے تعاون اور امداد ملتی رہے گی۔

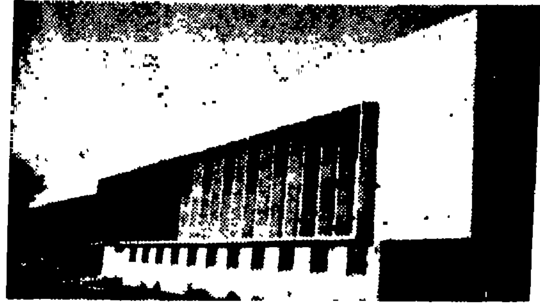
اس سے پیشتر شری مہدی نواز جنگ نے یاد دلایا کہ مولانا آزاد مرحوم نے نیشنل آرٹ اکاڈمی کا افتتاح کرتے وقت کہا تھا کہ سماجی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ فن کے فروغ کے ذرائع بھی تبدیل ہو گئے ہیں لہٰذا نئی قسم کی سرپرستی کی ضرورت ہے۔ لیکن انھوں نے اس بات سے متنبہ کیا تھا کہ اس شعبہ کو حکومت کے ماتحت نہ ہونا چاہیے۔ انھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ شعبہ حکومت کے زیر اہتمام تو ہو لیکن نظم و نسق کے سلسلہ میں خود مختار ہو۔

انھوں نے مزید کہا کہ مسرت کی بات ہے کہ یہاں بھی مرکزی اکاڈمی کے نقش قدم پر کام ہوتا ہے۔ جب سے میں نے مرکزی للت کلا اکاڈمی کے صدر کا عہدہ سنبھالا ہے میری خواہش رہی ہے کہ تمام ریاستوں میں ایسی اکاڈمیاں قائم کی جائیں۔

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ شری چندر بھان گپتا نے ریاستی للت کلا اکاڈمی کے افتتاح کے موقع پر فن کاروں کو یقین دلایا کہ ریاستی حکومت فن کاروں کو ہر قسم کی امداد دے گی جس سے فن لطیف کو فروغ ہو سکے۔ سوشلسٹ سماج میں قدیم فن ختم ہو رہا ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ سماج میں ایسے حالات پیدا کرے کہ فن کار زندہ جاوید رہیں اور فن ترقی کرے۔

وزیر اعلیٰ نے ڈاکٹر سمپورنانند کو خراج عقیدت پیش کیا جنھوں نے ریاستی للت کلا اکاڈمی کا صدر بننا منظور کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ڈاکٹر سمپورنانند خود بھی فن اور ادب کے میدان میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ کونسل ہاؤس کو بھی انھوں نے مجسموں اور تصاویر سے مرصع کیا۔ نئی ریاستی حکومت ان کے نقش قدم پر چل کر فن و ادب کی سرپرستی کرتی رہے گی۔ ممکن ہے کہ ماضی میں فن کاروں کو کچھ مایوسی ہوئی ہو لیکن امید ہے کہ اکاڈمی کے قیام کے بعد انھیں ایسی صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔

ریڈیولاجی اور کینسر ریسرچ سے متعلق جے۔ کے۔ انسٹی ٹیوٹ جو گنیش شنکر ودیارتھی میموریل میڈیکل کالج کانپور سے ملحق ہے پورے طور پر مکمل ہو گیا ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ کینسر کے علاج کے جدید ترین پلانٹ (جو کوبالٹ ۶۰ کے نام سے موسوم ہے) کے علاوہ دوسرے قیمتی اور جدید ترین آلات اور سہولتوں سے ہے۔ افتتاح کی رسم کے بعد ہی اس میں کام شروع ہو جائے گا۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد



کینسر انسٹی ٹیوٹ کانپور

نے ۲۴ اپریل ۱۹۵۶ء کو اس انسٹی ٹیوٹ کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔

اس انسٹی ٹیوٹ میں کوبالٹ کے علاوہ ریڈیم اور اکسرے کے ذریعہ بھی کینسر کے علاج کا معقول انتظام ہے۔ علاوہ ازیں کینسر کی تشخیص کی ایک کلینک بھی قائم کی گئی ہے اور آپریشن کے ذریعہ ہر قسم کی پرانی بیماریوں کو علاج کا بندوبست کیا گیا ہے۔ جہاں ایک طرف اس انسٹی ٹیوٹ کے ذریعہ کینسر کی تشخیص اور علاج کی وہی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی جو اس وقت صرف بمبئی، مدراس اور کلکتہ جیسے دور افتادہ مقامات میں دستیاب ہیں وہاں دوسری طرف ڈاکٹری سیکھنے والے طلبا کے لیے کینسر سے متعلق مزید ریسرچ کی سہولتیں بھی بہم پہنچائے گا۔

انسٹی ٹیوٹ کی عمارت جس کی تعمیر پر سات لاکھ روپیہ خرچ ہوا ہے۔ جے۔ کے۔ ٹرسٹ کا عطیہ ہے۔ کوبالٹ ۶۰ کو نصب کرنے اور ریڈیم یونٹوں کے قیام کو مدنظر رکھتے ہوئے اس انسٹی ٹیوٹ کی عمارت کا نقشہ اور ڈیزائن کناڈا کے آٹمی طاقت کمیشن کے ذریعہ دی گئی تفصیلی صراحتوں کے مطابق تیار کیا گیا تھا۔ حکومت کناڈا نے کولمبو پلان کے تحت کوبالٹ پلانٹ تحفے کے طور پر دیا ہے۔ ریڈیم یونٹ چلانے کے لیے حال ہی میں تقریباً ایک گرام ریڈیم خریدی گئی ہے جس کی قیمت تخمیناً ۵ء ۱ لاکھ روپیہ ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے مختلف شعبے ماہرین کی زیر نگرانی کام کریں گے۔

ریاست میں اب تک میڈیکل کالج آگرہ۔ لیوٹ اسپتال رام نگر اور کملا نہرو اسپتال الہ آباد میں صرف ریڈیم کے ذریعہ کینسر کے علاج کی محدود سہولتیں بہم پہنچائی جاتی تھیں لیکن کینسر کی تشخیص کی کوئی سہولت دستیاب نہیں تھی جس کا اس انسٹی ٹیوٹ میں معقول انتظام کیا گیا ہے۔

کینسر کی بیماری جو کبھی ناقابل علاج سمجھی جاتی تھی اب تاب کار عناصر کے ذریعہ اس کا علاج ممکن ہو گیا ہے۔ اس طریقہ علاج کے تحت ریڈیم کی شعاعیں جو لاکھوں وولٹ برقی قوت کے برابر ہوتی ہیں ورم پر ڈالی جاتی ہیں اور مریض کو اس کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوتا۔ ریڈیم اور کوبالٹ کی شعاعوں کے ذریعہ اندرونی کینسر کا علاج اوپر کی جلد کو جلائے بغیر کیا جاتا ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف ہندوستان میں ہر سال تقریباً ۲ لاکھ افراد کینسر کا شکار ہوتے ہیں جن میں سے دو لاکھ اشخاص ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ماہرین طب کی یہ رائے ہے کہ اگر شروع میں کینسر کی تشخیص ہو جائے اور جدید ترین اکسرے کے آلات ریڈیم یا سرجری کے ذریعہ اس کا علاج کیا جائے تو ان میں سے نصف مریضوں کو بچایا جا سکتا ہے۔

آغاز اور نوعیت کے اعتبار سے کینسر کی بیماری دوسری عام بیماریوں سے کافی مختلف ہوتی ہے۔ اور شروع شروع میں اس کی تشخیص بہت مشکل ہوتی ہے کیوں کہ شروع میں اعضا پر اس بیماری کے اثرات بالکل نمایاں نہیں ہوتے اور بیماری کے بڑھ جانے کے بعد ہی اس کی ظاہری علامات نمودار ہونے لگتی ہیں۔ اور جب یہ بیماری بڑھ جاتی ہے تو صد درجہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے اور قریب قریب تمام معاملوں میں لاعلاج ہو جاتی ہے۔ اگر شروع میں ہی کینسر کی تشخیص ہو جائے تو مریض پورے طور پر شفایاب ہو سکتا ہے۔ اس کی تشخیص کے لیے نازک آلات۔ اکسرے مشینوں اور پورے ساز و سامان سے آراستہ ایک تجربہ گاہ کی ضرورت ہوتی ہے اول ان کراشیا کے ذریعہ جسم کے اندرونی اعضا میں کینسر کا پتہ لگایا جاتا ہے اور تجربہ گاہ تشخیص میں معاون ہوتی ہے۔

پینتالیس یا پچاس سال سے زیادہ عمر کے لوگوں کو اپنی باقاعدہ طبی جانچ کرانا چاہیے۔

ماہرین طب نے کینسر کی سات امکانی علامات بتائی ہیں جن میں سے کسی ایک کو خاص طور پر معمر لوگوں کو خطرہ کی علامت سمجھنا چاہیے۔ ان علامات میں ناسور۔ چھاتی یا جسم کے دوسرے حصہ میں گٹھل پڑ جانا۔ معقد۔ رحم یا حلق سے خون بہنا یا دوسرے اخراج۔ مسا یا تل سے خون بہنا یا ناسور ہو جانا۔ بدہضمی کی مستقل شکایت یا کھانا نگلنے میں تکلیف ہونا۔ اور گلو گرفتگی یا کھانسی کی مستقل شکایت شامل ہیں۔ ان علامات میں سے اگر کوئی علامت ظاہر ہو تو پورے طور پر طبی جانچ کرانا اشد ضروری ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں منھ کے کینسر کی بیماری بہت عام ہے۔ عام طور پر اس کی وجہ کھینی (چونا ملا ہوا تمباکو) کے استعمال کی عادت بتائی جاتی ہے۔

کینسر کے علاج کی جانب پہلا اقدام بمبئی میں کیا گیا تھا جہاں ۱۹۴۱ء میں ٹاٹا میموریل اسپتال قائم کیا گیا۔ کینسر کے علاج کے سلسلہ میں شروع میں بیرونی ممالک کے کارکنوں خاص طور پر نیویارک کے میموریل اسپتال کے کارکنوں سے امداد اور مشورے حاصل کیے گئے تھے۔

ریاستی محکمہ ثقافتی امور اور سائنس کے ذریعہ جاری کیے گئے ایک پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ جس شخص کو دفینہ ملے یا جو قانوناً اپنا استحقاق ثابت کردے وہ دفینہ کا مالک ہوگا۔ اس لیے دفینہ پانے والے کے لیے یہ امر مناسب نہیں ہے کہ وہ اس کو چھپائے یا قدیم سکوں کو گلا کر سونا یا چاندی میں تبدیل کردے۔

پریس نوٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ لوگ عام طور پر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جب کبھی بھی کسی دفینہ کا پتہ لگتا ہے تو حکومت اسے ضبط کر لیتی ہے۔ حکومت اسی صورت میں خزانہ کو حاصل کرے گی جبکہ وہ پائی گئی اشیا کی مالیت کے برابر رقم نیز اس مالیت کے پانچویں حصہ کے برابر رقم ادا کرے۔ اس سلسلہ میں دفینہ سے متعلق قانون مجریہ ۱۸۷۸ء کے تحت پوزیشن یہ ہے کہ جب کبھی کسی کو دس روپیہ سے زیادہ کی مالیت کا خزانہ ملے تو پانے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کی نوعیت۔ رقم بمقام اور اس کے ملنے کی تاریخ کے بارے میں کلکٹر کو مطلع کرے اور اس کے بعد خزانہ کو سب سے قریبی خزانہ میں جمع کردے یا اس سے متعلق کلکٹر کو معقول ضمانت دے۔ اگر کلکٹر جانچ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ خزانہ ملنے کی تاریخ سے سو برسوں کے اندر چھپایا گیا ہے۔ اور اس کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے تو وہ سماعت کو ملتوی کردے گا اور استحقاق سے متعلق دعویٰ دائر کرنے کا موقع دے گا۔ اس کے برخلاف اگر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خزانہ کو کسی نے اس طرح نہیں چھپایا ہے یا اس کے متعلق کوئی دعویٰ دائر نہیں کیا جاتا یا دعویٰ کا فیصلہ دعویدار کے خلاف ہوتا ہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ خزانہ کا کوئی مالک نہیں ہے۔ ایسی صورت میں خزانہ اس شخص کے حوالہ کردیا جائے گا جس نے یہ خزانہ پایا ہوگا۔ لیکن ایسی صورت میں کہ خزانہ پانے والے کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس کا دعویدار ہوگا اور دعویٰ ثابت ہو جائے گا تو دونوں کی رضامندی سے خزانہ ان میں تقسیم کردیا جائے گا اور اگر باہمی سمجھوتہ ممکن نہ ہو تو تین چوتھائی خزانہ پانے والے اور بقیہ دعویدار کو دیا جائیگا۔

تاہم کلکٹر یہ حکم جاری کرسکتا ہے کہ حکومت پورے خزانہ یا اس کے مخصوص جزو کو حقدار شخص کو خزانہ کی مالیت کے برابر رقم نیز اس کے پانچویں حصہ کے برابر رقم ادا کرکے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اگر کلکٹر کے ذریعہ اس قسم کا حکم جاری کیا جاتا ہے تو حکومت خزانہ کی مالک ہو جائے گی۔ قواعد کے مطابق کلکٹر پر یہ لازم ہے کہ وہ خزانہ کی مکمل تفصیلات کے بارے میں حکومت کو مطلع کرے۔ اگر اس کے خیال میں تاریخ۔ آثار قدیمہ یا کسی دوسری بنیاد پر خزانہ کو حاصل کرنا مناسب ہے تو وہ اس امر کا ذکر بھی کرسکتا ہے کہ اس خزانہ کو حاصل کرنے کے لیے کتنی رقم ادا کی جائے۔ اس اثنا میں کلکٹر دفینہ کو سرکاری خزانہ میں جمع رکھے گا۔ ان قواعد کا اطلاق ایسے معاملوں پر نہیں ہوگا جن میں محض چند سکے پائے گئے ہوں۔ اگر کسی شخص کو خود اس کے مکان میں روپیہ۔ مجسمہ یا دیگر قدیم اشیا ملیں تو اس سلسلہ میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ سکوں کی صورت میں قواعد کے تحت کلکٹر کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ حکومت کو یہ رپورٹ پیش کرے کہ سکے حکومت ہند یا برطانوی ٹکسال کے ڈھلے ہوئے یا اس کے پہلے کے ڈھلے ہوئے ہیں۔ کلکٹر اپنی رپورٹ کی نقل سکریٹری سکہ کمیٹی (ڈائرکٹر یا سٹی میوزیم لکھنؤ) کو بھی بھیجے گا۔ اگر سکریٹری ضروری سمجھے گا تو بقیہ سکوں کو بھی طلب کرے گا اور ان سکوں کے بارے میں حکومت کو اپنی رپورٹ پیش کرے گا۔ حکومت ان کارروائیوں کے بعد ہی ان کے حصول سے متعلق احکام جاری کرے گی۔

تکنیکی ترقی اور قدیم روایات کے باہمی امتزاج کا نادر نمونہ ہم کو نانک ساگر میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

نانک متا ضلع نینی تال میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو کھٹیما ریلوے اسٹیشن سے تقریباً ۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ سکھوں کا ایک مشہور تیرتھ استھان ہے۔ ہر سال ہزاروں سکھ ملک کے کونے کونے سے یہاں آتے ہیں کہا جاتا ہے کہ سکھ مذہب کے بانی گرونانک کبھی یہاں تشریف لائے تھے۔

اس قصبہ کے قریب ہی ایک چھوٹی سی ندی پھاوڑی بہتی ہے جس کو

نانک ساگر

سکھ عام طور پر پہاڑی گنگا کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جب گرو نانک کا اس مقام پر گزر ہوا تب انھوں نے اس ندی میں اشنان بھی کیا تھا۔ وہ جگہ جہاں گرو نانک نے اشنان کیا تھا سکھوں کا تیرتھ استھان بن گئی ہے۔

یہ مقام ہمالیہ کی ترائی میں واقع ہے۔ برسات کے زمانہ میں چھوٹی چھوٹی ندیوں اور نالوں کا پانی میدانی علاقہ کی جانب بہہ جاتا ہے جس کے سبب سیلاب میں مزید تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ چناں چہ سیلاب کی تیزی کو ختم کرنے اور آبپاشی کے لیے پانی کو جمع کرنے کے پیش نظر سن ۱۹۵۹ء میں اس علاقہ میں نانک ساگر تعمیر کرنے کی اسکیم شروع کی گئی تھی۔

ایک ہزار سے زاید مزدور کام پر لگائے گئے۔ اس کے علاوہ قریب میں واقع سمپورنانند کیمپ کے دو ہزار قیدیوں سے بھی کام لیا گیا اور ۱۰۰۰ جانوروں سے مال ڈھلوایا گیا۔

نانک ساگر کا گرد و پیش انتہائی دل فریب ہے۔ ایک طرف ہمالیہ کا سلسلہ چلا گیا ہے جو ایک قدرتی دیوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ بارہ میل لمبا ایک باندھ بنا کر ۱۰ مربع میل میں پانی جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے باندھ کی اوپری سطح اتنی کشادہ ہے کہ موٹر گاڑیاں اس پر سے بآسانی گزر سکتی ہیں۔

حکومت کو اس امر کا یقین تھا کہ دو کروڑ روپیے کی لاگت سے تعمیر ہونے والے اس ذخیرہ آب میں ۱۱٫۷ لاکھ ایکڑ فیٹ پانی جمع ہو سکے گا جس میں سے ایک لاکھ ایکڑ فیٹ پانی سینچائی کے لیے دستیاب ہو سکے گا۔ اسکیم کے مطابق پانی کے اس ذخیرہ کو ۱۳ میل لمبی نہر کے ذریعہ دونی کے ذخیرہ آب تک پہنچایا جائے گا۔ پھر اس ذخیرہ آب کی موجودہ نہروں کی لمبائی کو ۵۰۳ میل اور بڑھا کر سیتاپور۔ شاہ جہاں پور۔ اناؤ۔ رائے بریلی۔ سلطانپور۔ پرتاپ گڑھ۔ بارہ بنکی فیض آباد اور جونپور کے اضلاع کی ۱،۳۱،۷۲۰ ایکڑ مزروعہ زمین میں آبپاشی کی مزید سہولتیں فراہم کی جا سکیں گی۔

ابتدائی اسکیم کے تحت پہاڑی گنگا پر واقع سکھوں کا متبرک مقام نانک ساگر کے حدود میں آ جاتا تھا جس کے سبب سکھوں میں بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ چناں چہ سکھوں کی بے اطمینانی دور کرنے اور روایت اور تکنیک کے امتزاج کے پیش نظر اس اسکیم کو معرض وجود میں لایا گیا اور ۴۰ فیٹ گہرے کنوئیں کی تعمیر کے اقدامات کیے گئے کنواں بن کر تیار ہو چکا ہے اور ذخیرہ آب بھی جس کے آئندہ بارش تک لبریز ہو جانے کی امید ہے، مکمل ہو جانے کے قریب ہے۔ آبپاشی کی سہولتوں کی توسیع سے غذائی پیداوار میں ۳۳۰۰۰ ٹن تک اضافہ کی امید کی جاتی ہے۔

لکھنؤ سے ۱۵ میل دور بخشی کا تالاب میں واقع مویشیوں کی لاشوں کو کام میں لانے سے متعلق مرکز بیکار چیزوں سے دولت پیدا کرنے کا کام انجام دے رہا ہے۔ اس مرکز میں جو ہندوستان اور نیدرلینڈ کے مشترکہ اقدام کا نتیجہ ہے کھال اتارنے چمڑہ کمانے اور جوتا بنانے جس میں سلائی پالش کرنا اور تکمیلی عمل شامل ہے۔ کی جدید ترین مشینیں موجود ہیں۔ یہ سارا کام چھوٹی چھوٹی ٹریڈل قسم کی مشینوں سے کیا جاتا ہے جن کو نیدرلینڈ نے بہم پہنچایا ہے۔

اس مرکز کے ذریعہ دیہی دست کاروں کو کھال اتارنے اور کھال اور چمڑہ سکھانے کے جدید طریقوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ گزشتہ سال جنوری تک اس مرکز سے تقریباً ۴۰۰ دست کاروں نے جن میں تقریباً ۳۰ ہریجن طلبا شامل ہیں تربیتی کورس پاس کیا۔ تربیت پانے والوں کو خود اپنا کاروبار شروع کرنے میں مدد دینے کے لیے حکومت کی امداد سے ریاست کے مختلف حصوں میں کھال اتارنے اور مویشیوں کی لاش کو کام میں لانے سے متعلق ۴۵ امداد باہمی انجمنوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔

اس مرکز میں ملک بھر سے طلبا تربیت حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں۔

مداس، آسام، مدھیہ پردیش، راجستھان اور بہار سے اب تک ۵۰ طلبا اس مرکز میں تربیت حاصل کرنے کے لیے آچکے ہیں۔ اور شمالی نائجیریا کے ایک شخص مسٹر کلیمنٹ کیگھا نے بھی اس مرکز میں معدنیات اور نباتات کے ذریعہ چمڑہ کمانے کی تربیت حاصل کی۔ تربیت پانے والوں کو مفت رہائش کے علاوہ ۴۰ روپیہ ماہانہ کا وظیفہ دیا جاتا ہے۔

ملک میں سب سے زیادہ مویشی اتر پردیش میں پائے جاتے ہیں۔ زراعت سے متعلق انڈین کونسل کے ذریعہ لیے گئے ایک جائزہ کے مطابق اتر پردیش میں مویشیوں کی تعداد تقریباً ۴۰۲ کروڑ ہے۔ اور ان کی طبعی موت کی شرح تقریباً آٹھ فی صدی ہے یعنی ہر سال ۲۵ء۲۶ لاکھ مویشی مرجاتے ہیں۔ مویشیوں کی بیشتر لاشیں دیہات کے تالابوں یا ندیوں کے کنارے بیکار پڑی رہتی ہیں جن سے ماحول اور پانی کی سپلائی کا ذریعہ آلودہ ہوجاتا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان لاشوں کے ضائع ہوجانے سے ملک کو تقریباً ۲۶ کروڑ روپیہ سالانہ کا نقصان ہوتا ہے کیوں کہ اگر ایک لاش کا کم سے کم دام بھی لگایا جائے تو یہ دس روپیہ سے کم نہیں ہوگا۔

ریاستی حکومت نے اس مقصد کے پیش نظر مویشیوں کی لاشوں سے کچھ فائدہ اٹھایا جائے ۱۹۵۲ء میں بخشی کا تالاب میں یہ مرکز قائم کیا تھا۔ اور اس مرکز کو ہر ممکن طریقے سے ترقی دینے کے لیے بھی اقدامات کیے گئے تھے۔ اس مرکز میں تربیت پانے والوں کے ذریعہ سکھائے اور کمائے گئے چمڑہ کی فروخت سے حکومت کو گزشتہ دس برسوں میں تقریباً ایک لاکھ روپیہ کی آمدنی ہوئی۔ گزشتہ ایک سال کے دوران میں اس مرکز میں تخمیناً ۱۵۰۸۴ روپیہ کی مالیت کا چمڑہ اور چمڑہ کا سامان تیار کیا گیا۔

ان حوصلہ بخش نتائج کے پیش نظر ۱۹۶۰ء میں اس مرکز میں چمڑہ کمانے اور جوتا بنانے کے دو نئے شعبے قائم کیے گئے۔ مرکزی حکومت نے اس مرکز کو ۲۰۰۵ لاکھ روپیہ کی مالی امداد دی جس میں سے ۱۲۰۵ لاکھ روپیہ حکومت نیدرلینڈ نے دیا۔ یہ مرکز اپنی کامیابی کے لیے بڑی حد تک ادارہ زراعت اور غذا کے ماہر مسٹر ایف۔ ایچ۔ ہاک کی کوششوں کی مرہون منت ہے۔

اس مرکز میں تین شعبے ہیں یعنی لاشوں کو کام میں لانا، چمڑہ کمانا اور جوتا بنانا اور چمڑہ کو کام میں لانا۔ ابتدا میں حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے جدید طریقوں کے مطابق کھال اتاری جاتی ہے اس کے بعد کھال چمڑہ کمانے کے سیکشن میں بھیج دی جاتی ہے جہاں کھال سے چمڑہ بنایا جاتا ہے اور لاش کے بقیہ حصوں سے بڑی بڑی مشینوں کے ذریعہ ہڈی کی کھاد تیار کی جاتی ہے۔ آخیر میں سکھایا اور کمایا ہوا چمڑہ جوتا بنانے کے شعبہ میں بھیج دیا جاتا ہے۔

ریاستی ادارہ منصوبہ بندی تحقیق اور عمل قوت بخش غذا کی فراہمی کے ۲۴ لاکھ روپیہ کی لاگت کے پروگرام کی سریع اور موثر تکمیل کے لیے جلد ہی گورکھپور اور بستی کے ضلعوں میں غذائی پیداوار اور اس کی کھپت کے علاوہ اس امر کا سروے کرنے جارہا ہے کہ وہاں لوگ کیسی غذا استعمال کرتے ہیں اور اس میں کتنی غذائیت ہوتی ہے۔

یہ فیصلہ گزشتہ جمعرات کو یونیسیف کے نمایندوں اور ادارہ منصوبہ بندی کے تکنیکی ماہرین کے ایک جلسہ میں کیا گیا جو ادارہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رام داس کی زیر صدارت منعقد ہوا۔

ڈاکٹر داس نے پروگرام شروع کرنے سے پہلے سروے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مذکورہ ضلعوں میں قوت بخش غذا کی پیداوار۔ آبپاشی کی سہولتوں۔ فصلوں کی نوعیت اور غذائی عادتوں سے متعلق صورت حال کا اندازہ لگانے کے لیے ایک بارہ نکاتی اسکیم پیش کی۔

قوت بخش غذا کی فراہمی سے متعلق تین سال کا پروگرام یونیسیف عالمی ادارہ صحت اور ریاستی حکومت کی جانب سے شروع کیا جارہا ہے اس کا مقصد قوت بخش کی پیداوار اور استعمال کے صحیح طریقے رائج کرنا اور عوام کو اس سلسلہ میں اپنی مدد آپ کرنے کے لیے تیار اور آمادہ کرنا ہے۔

کسانوں اور ان کے کنبوں کو متوازن غذا کی اہمیت کے بارے میں آگاہ کرنے کے لیے مذکورہ ادارہ کے ذریعہ بھی ایک تعلیمی پروگرام شروع کیا جائیگا۔

اس پروگرام کے تحت غذائیت بخش کھانے جیسے انڈا۔ پولٹری۔ مچھلی سبزی پھل اور دودھ کی پیداوار کے علاوہ پروگرام پر عملدرآمد کے سلسلہ میں مختلف سرکاری محکموں اور مواضعات کے عملہ کو تربیت بھی دی جائے گی۔

اس پروگرام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تحت قوت بخش غذا کی مزید پیداوار کا کچھ حصہ پرائمری اور اس سے قبل کے مرحلہ تعلیم کے منتخب ضرورت مند بچوں کے علاوہ حاملہ عورتوں کو مفت فراہم کیا جائیگا۔

یہ اسکیم ابتدا میں ہر ضلع میں اس مقصد کے لیے چنے گئے ۲۰ اجتماعی بلاکوں کے ۲۰ مواضعات میں شروع کی جائے گی۔ اور تین سال کی مدت میں یہ اسکیم ۸۰۰ مواضعات میں نافذ ہو جائے گی جس سے چھ لاکھ اشخاص اس کے دائرۂ اثر میں آجائیں گے۔

یونیسیف کے نمائندہ شری جی۔ بی۔ سیاراؤ نے کہا کہ مجوزہ سروے کے مالی مضمرات پر ہمدردانہ طور پر غور کیا جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اترپردیش میں جو سروے کیے جائیں گے وہ اڑیسہ۔ اندھرا اور مدراس کی ریاستوں کے لیے حد درجہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں جہاں یہ اسکیم شروع کی جا چکی ہے۔ علاوہ ازیں بہار اور بنگال بھی ان سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ جہاں اس پروگرام کے شروع کیے جانے کا امکان ہے۔

متفرقات

حج اور پیرا ماؤنٹ ٹریول سروس۔ ریاستی حج کمیٹی کے سکریٹری کے ذریعہ جاری کیے گئے ایک پریس نوٹ میں حج کے تمام زائرین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ پیراماؤنٹ ٹریول سروس دہلی کی خدمات کو کام میں نہ لائیں جس نے موجودہ حج کے موقعہ پر اپنے پروگرام میں بعض دلکش شرائط کی پیش کش کی ہے۔

پیراماؤنٹ ٹریول سروس نام کی اس فرم نے گزشتہ عرصہ میں عراق۔ ایران کے زائرین کے ساتھ جو بے قاعدگیاں کی تھیں اس کے سبب حکومت ہند اور ہندوستانی سفارت خانہ جدہ اور پورٹ حج کمیٹی اور بمبئی تینوں کے پاس اس کے خلاف شکایات موصول ہوئی تھیں۔ چنانچہ ان امور کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کسی بھی شخص کو جو پیراماؤنٹ سروس کے توسط سے سفر کرے گا اس کو زائر پاس نہیں دیا جائے گا۔

اس کے علاوہ حکومت نے ان اشخاص کو بھی زائر پاس نہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو عراق کے راستے سے حجاز جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ناپ تول کے میٹری پیمانوں کا نفاذ۔ اترپردیش کے ناپ و تول کے کنٹرولر نے میرٹھ۔ آگرہ۔ جھانسی۔ الہ آباد۔ وارانسی۔ گورکھپور۔ لکھنؤ کانپور۔ بریلی اور مراد آباد کے ایسے بیوپاریوں کو جو ابھی تک مصدقہ اور مہر شدہ میٹری باٹوں کا استعمال نہیں کر رہے ہیں یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ان باٹوں کو فوری طور پر استعمال کرنا شروع کر دیں۔

اس سلسلہ میں محکمہ غذا اور رسد کے ذریعہ جاری کیے گئے ایک پریس نوٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ یہ بات حکومت کے علم میں لائی گئی ہے کہ ان شہروں میں جہاں یکم اکتوبر ۱۹۶۰ء سے میٹری باٹوں کا استعمال لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ کچھ بیوپاری ابھی تک غیر مصدقہ اور غیر مہر شدہ باٹوں کا استعمال کر رہے ہیں جو قانون کی سراسر خلاف ورزی ہے جس کی جرمانہ یا قید یا دونوں کی سزا دی جا سکتی ہے۔ ریاستی حکومت نے افسروں کو یہ ہدایات جاری کر دی ہیں کہ وہ اپنے شہروں میں بیوپاریوں کی تمام انجمنوں کو یہ نوٹس جاری کر دیں کہ وہ اپنے ممبروں کو فوری طور پر مصدقہ اور غیر مہر شدہ باٹوں کا استعمال شروع کرنے کی ہدایت کریں اور نوٹس کے اجرا کے ایک مہینہ کے اندر اگر انھوں نے میٹری باٹوں کو استعمال کرنا نہیں شروع کیا تو ان کے غیر مصدقہ باٹ ضبط کر لیے جائیں گے۔

اردو کتاب "ٹھنڈی آگ" ضبط۔ حکومت پنجاب نے اردو کتاب "ٹھنڈی آگ" مصنفہ نعیم صدیقی ضبط کر لی ہے۔ اس کتاب کا ناشر مکتبہ چراغ راہ کراچی ہے اور یہ انجمن پریس کراچی میں طبع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ایسا مواد موجود ہے جو سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان دشمنی اور نفرت کے جذبات کو پروان چڑھاتا ہے۔

اس کتاب کا ہر ایک نسخہ طبع ثانی اور اس کے اقتباسات بحق حکومت ضبط کر لیے گئے۔

اونچے آدمی

(بسلسلہ صفحہ ۱۲)

کر وہ پیدل ہی قبرستان کی طرف چل پڑے!

اونچے آدمیوں کی تصویریں دکھانے کے متعلق اب مجھے اپنا ذہن الیم زیادہ نہیں کھولنا چاہیے کیوں کہ ایسی ہی بہت سی تصویریں خود آپ کے ذہن میں بھی ابھر رہی ہوں گی جن میں سے اکثر میری پیش کردہ تصویروں سے بھی زیادہ دل چسپ ہو سکتی ہیں۔

مراسلہ

حضرت اثر لکھنوی نے میرے ایک مضمون پر جو آتش کے بارے میں ہے اور میری کتاب سبع سیارہ میں شامل ہے نیا دور (اگست ۱۹۶۱ء) میں اپنے گراں بہا خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ در اصل یہ ایک بہت پرانا مضمون ہے جو ۱۹۱۶ء میں میں نے لکھا تھا۔ اس وقت میرا عنفوان شباب تھا اور میں عجلت و لاپروائی کے ساتھ لکھنے کا عادی تھا۔ مضمون لکھنے کا سبب یہ ہوا تھا کہ یاس یگانہ چنگیزی اُس وقت مرزا انوشہ کے خلاف بہت کچھ لکھ رہے تھے۔ اُن کا جواب لکھنے پر مجھے مجبور کیا گیا۔ جب میری کتاب سبع سیارہ شایع ہونے لگی تو میں مضامین پر دوبارہ نگاہ نہ کر سکا جس کی وجہ سے کتاب میں ایسی کئی باتیں شایع ہو گئیں جس کا مجھے افسوس ہے۔ بہر حال جی تو نہیں چاہتا کہ آپکے ارشادات کا جواب پیش کروں لیکن کچھ عرض کئے دیتا ہوں ؎

(۱) چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں — کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

آتش کے اس شعر کے متعلق جو کچھ میں نے لکھ دیا تھا وہ اس وقت کی سُنی سُنائی بات تھی۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے غلط معلوم ہوا ہو۔ اس کے بعد جو آنجناب نے مصحفی کی نگارشات کو آتش کے متعلق پیش کیا ہے، یہ بھی درست سہی مگر کون نہیں جانتا کہ آتش مصحفی ہی کے ایک بڑھتے ہوئے شاگرد تھے۔ اگر اُستاد نے اپنے شاگرد کے متعلق ایسا لکھ دیا تو معاف کیجے میں اسے سند ماننے کیلئے تیار نہیں۔ اس کے بعد آپ کا یہ ارشاد کہ "آزاد کا بیان کردہ لطیفہ آتش کے فطرتِ معصوم اور متصوفانہ مسلک پر روشنی ڈالتا ہے۔" یہ تو ہو سکتا ہے کہ اسے آتش کی فطرتِ معصوم سمجھا جائے مگر یہ فطرتِ معصوم صرف فقدانِ علم کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ متصوفانہ مسلک اس میں کہاں سے آجائیگا۔ اس سے تو آتش مرحوم کی اپنے مذہب سے بھی ناواقفیت معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ مذہبِ امامی سے واقف ہوتے تو ضرور دیکھتے کہ حنفی شاگرد نے جو نماز اُنھیں بتائی تھی اسے کبھی قبول نہ کرتے۔ مذہبِ امامی کی نماز اُن کے سامنے آجاتی اور اگر نماز شروع ہی کرنا تھا تو اپنے مسلک پر چلتے۔ میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ یہ جاہلیت کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ مضمون کتاب چھپنے کے پہلے میرے سامنے آیا ہوتا تو میں لفظ جاہل یقیناً نکال دیتا۔

اس کے بعد جو آپنے ارشاد فرمایا ہے کہ آتش نے بہت سے تصوف کے اشعار بھی لکھے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ آپ کو ان کے دیوان میں ایسے اشعار نظر آتے ہوں مگر یاس یگانہ نے جتنے شعر نقل کئے ہیں اُن میں کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ آپکے اور یگانہ صاحب کے اندازِ فکر میں تصوف کا تخیل جدا جدا ہو۔ آنجناب نے جو حضرتِ آتش کے دو شعر پیش کئے ہیں یہ اُسی بحث کے تحت آجاتے ہیں جو مضامین تصوف کے متعلق میں نے سبع سیارہ کے دوسرے مضمون بعنوان "کلیل میں خلیل" میں کی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں نے آتش کے دس شعروں پر اصلاح دی تو بندہ پرور یہ ارشاد درست نہیں۔ آپ دوبارہ ملاحظہ فرمایئے یہ بات نظر نہ آئیگی۔ آپنے ان شعروں سے بحث بھی فرمائی ہے جن پر میں نے کچھ عرض کیا ہے۔

(۲) شعرِ آتش ؎

سوا تیرے کسی کا دھیان آتا ہو تو کافر ہے — دلی جس دل میں ہو وہ دل نہیں ہے چشمِ احول ہے

اگر آپکے مضمون میں "کافر ہے" کی کتابت درست ہے تو اس چوتھے شعر نے اور بھی شعر کو غارت کر دیا اور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ مصرعہ اولیٰ میں خیال کہاں سے آگیا۔ خیال تو دوسرے ہی مصرعہ میں ہوا کرتا ہے۔ اگر آپ یہ فرمانے کے لئے بھی تیار ہیں کہ اس شعر میں آتش مرحوم نے پہلے مصرعہ ہی کو بنیادِ خیال قرار دیکر اُسی کو پہلے لکھا تو آتش پر مبتدی ہونے کا الزام آجائیگا۔ اس کے علاوہ آپنے اس بات پر خیال نہیں فرمایا کہ پہلے مصرعہ کی کتابت میں آپنے ردیفین کا عیب بھی آتش کے سر منڈھ دیا ہے۔

میں تو یہ سمجھتا تھا کہ یہ شعر مجازی کا ہے لیکن آپنے جدت فرمائی کہ عبد اور معبود میں راز و نیاز پیدا کر دیا۔ اس طرح تو بیانِ تصوف ایسا عام ہو جاتا ہے جو قریب قریب ہر شعر پر منڈھ دیا جائے۔ میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ "تیں" "ہے" آنے سے شعر کی روانی میں کوئی فرق پڑتا۔ میری عرض صرف اتنی تھی کہ یہ تکرار بُری معلوم ہوتی ہے۔ اگر آپ اس سے اتفاق نہیں فرماتے تو یہ وجدان کا فرق ہے۔ میں نے جو ایک "ہے" کو "ہو" سے بدلا اس پر آپ کا یہ ارشاد کہ دوئی مشروط ہو جاتی ہے تو بندہ پرور اس طرزِ بیان میں مشروط نہیں ہوگی۔

(۳) شعرِ آتش ؎

یہ مجھ دیوانے کی زنجیر سے آواز آتی ہے — وہ کیچڑ میں پھنسا ہے جو ہوا آبِ گل کے زنداں میں

اس شعر پر جو آنجناب نے فرمایا ہے وہ میری فہم سے بالا ہے۔ یہ سمجھ میں آنیکی بات نہیں کہ کیچڑ میں پھنسی ہوئی زنجیر کی آواز کہاں آجائیگی۔ یہ بات آپکے ارشاد سے نئی معلوم ہوئی کہ "پابندی وہ قید ہے جو اپنے اوپر عاید کی جائے نہ کہ بالجبر کسی کے سر منڈھی جائے جس سے گلو خلاصی اپنے اختیار میں نہ ہو۔" پھر آپ کا یہ ارشاد کہ "یہ کیا ضروری ہے کہ جو قیدِ ہستی میں ہو وہ پابندِ رنج و الم بھی ہو۔" کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ آج دنیا میں کونسا شخص ایسا ہے جسے کبھی ناکامی سے واسطہ نہ پڑا ہو یا جسے کبھی رنج و مصیبت نہ پہنچی ہو؟

(۴) شعرِ آتش ؎

غرورِ عشق زیادہ غرورِ حسن سے ہے — اُدھر تو آنکھ پھری دم اِدھر روانہ ہوا

آتش کے اس شعر کی امداد میں آپنے جو دو شعر میر کے پیش کئے ہیں غور تو فرمایئے کہ اُن میں اور آتش کے شعر میں کیا مناسبت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ کہا ہے کہ دوسرے مصرع میں کچھ الفاظ کی کمی رہ گئی ہے تو بندہ پرور آتش نے جو لکھا ہے کہ "اُدھر تو آنکھ پھری" وہاں میرے نزدیک غرورِ عشق کو غرورِ حُسن سے زیادہ بتانے کے لئے "اُدھر تو آنکھ پھری" کی جگہ "اُدھر تو آنکھ ہی پھری" لکھنے کی ضرورت تھی۔

(۵) شعرِ آتش ؎

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشک صحرا ہوں — لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

اس کے متعلق جو آپنے ارشاد فرمایا ہے وہ درست۔ اب میرا یہ خیال ہے کہ "نہ پوچھ حال مرا" ابتدائے کلام میں بھی آنا کچھ زیادہ قابلِ اعتراض نہیں، اگرچہ کلام کے وسط ہی میں لانے کو میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ غالباً اس سے آنجناب کو بھی انکار نہ ہوگا کہ آتش نے اس شعر میں "نہ پوچھ حال مرا" کا جملہ حشو کی جگہ بھرنے کے لئے لکھا ہے۔ آپنے جو میری اصلاح کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ اس سے شعر ہوا میں معلق ہو گیا تو بندہ پرور ایسا بیان شعر میں کون نہیں لکھتا۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۶ پر)

نقد و تبصرہ

اردو ادب کی جھلکیاں

از پروفیسر این ایس گورے کر۔ ناشر: جیکو پبلشنگ ہاؤس ۱۲۵ مہاتما گاندھی روڈ بمبئی (۱)، قیمت: دس روپیہ

پروفیسر این ایس گورے کر سینٹ ایگزیویر کالج بمبئی میں اردو، فارسی اور اسلامی کلچر کے پروفیسر اور بمبئی یونی ورسٹی کے فارسی، عربی، اسلامی کلچر، عبرانی اور اوستا۔ پہلوی کے بورڈ آف اسٹڈیز کے چیرمین ہیں۔ زیر نظر کتاب اُن کے چند انگریزی لیکچروں کی تلخیص ہے اور بڑے اچھے کاغذ پر بڑی دیدہ زیبی سے چھپی ہے۔ یہ لیکچر بمبئی یونی ورسٹی کی درخواست پر دیے گئے تھے۔ کتاب اگرچہ ضخامت کے لحاظ سے مختصر ہے لیکن اس لحاظ سے بڑی اہم اور مفید ہے کہ انگریزی میں یہ تازہ ترین کتاب ہے جو اردو ادب پر شایع ہوئی ہے اور مختصر ہوتے ہوئے بھی اس نے اردو ادب کے ہر گوشے اور ہر پہلو کا احاطہ کرلیا ہے۔ پروفیسر گورے کر نے اپنے ان مختصر لیکچروں میں اردو زبان کی ابتدا، اس کے پس منظر، اس کے ارتقا، اس کے مختلف ادوار، ان ادوار کی خصوصیات، جنگ عظیم کے بعد اردو ادب کے نئے رجحانات اور آزادی کے بعد سے اب تک کے اردو ادب پر بڑے فاضلانہ دل نشین اور غیر شخصی انداز میں روشنی ڈالی ہے اور اس مختصر کتاب میں اردو کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا ہے جس کے لئے عام طور سے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت پڑتی۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر رفیق ذکریا کا جامع و مانع پیش لفظ اور پروفیسر نجیب اشرف کا تعارف ہے۔

فرہنگِ اثر

مرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی۔ ملنے کا پتہ: مرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی۔ کشمیری محلہ۔ لکھنؤ۔ قیمت: اٹھارہ روپے

اردو شعر و ادب کی دنیا میں اساتذۂ لکھنؤ کو ایک ممتاز مقام ہمیشہ حاصل رہا۔ انھوں نے زبان و ادب کی جو خدمت کی اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اساتذہ ہر دور میں پائے جاتے رہے۔ موجودہ دور میں نواب مرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی اپنے تبحر علمی، مغربی اور مشرقی زبانوں پر یکساں عبور، وسیع مطالعہ، زبان اور شاعری کی باریکیوں سے گہری واقفیت اور ادراک کے باعث ایک طرف ان قدیم اساتذہ کے لئے باعث فخر ہیں اور دوسری طرف خود زبان اردو کو ان پر ناز ہے۔ آثر لکھنوی غزل گو ہیں، نظم گو ہیں۔ لکھنؤ کی زبان اور محاوروں کے متعلق "مستند ہے" ان کا فرمایا ہوا"۔ انھوں نے مغربی زبانوں کی نظموں، ڈراموں وغیرہ کے منظوم ترجمے کئے، علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین لکھے۔ نثر و نظم دونوں میں ان کی تقریباً چوبیس کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔

فرہنگ اثر ان کی تازہ ترین اور بڑی گراں قدر اور اہم ادبی خدمت ہے۔ یہ کتاب دراصل ضمیمہ ہے اردو کی دو مشہور کتب لغات سرمایۂ زبان اردو (تالیف حضرت جلال لکھنوی) اور نور اللغات (تالیف حضرت نور الحسن نیر کاکوروی) کا۔ موخر الذکر کتابیں اردو لغات کی حیثیت سے بڑی اہم اور مفید کتابیں ہیں خاص طور سے اس لئے کہ دونوں انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہیں لیکن ان میں اغلاط بھی پائے جاتے ہیں۔ بعض جگہ الفاظ کے صحیح معنی درج نہیں، بعض جگہ غلط محاورے لکھ دیے گئے ہیں کہیں غلط مثالیں پیش کردی گئی ہیں۔ بہت سے محاورے اور الفاظ درج ہی نہیں کئے گئے ہیں۔ حضرت اثر لکھنوی نے فرہنگ آثر پیش کر کے ان تمام اغلاط کی تصحیح کردی، اور لکھنؤ میں مستعمل ہونے والے صحیح الفاظ و محاورات سے روشناس کرایا۔ اس لحاظ سے اردو زبان و ادب کے طالب علموں اور اردو سے دل چسپی رکھنے والوں پر حضرت آثر کا یہ ایک احسان ہے جو کبھی اتارا نہیں جا سکتا اور جس کی وجہ سے نہ صرف موجودہ بلکہ آیندہ نسلیں متمتع ہوتی اور فائدہ اٹھاتی رہیں گی۔ کتاب کی طباعت میں البتہ بعض خفیف سی فروگزاشتیں ہو گئی ہیں مثلاً کتابت میں کئی جگہ کتابت کی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض محاورے یا الفاظ دو مرتبہ درج ہو گئے ہیں دو ایک جگہ غیر ضروری عبارت درج ہو گئی ہے۔ مثال کے طور پر نور اللغات کے مندرجہ متروکات پر حضرت آثر نے جو کچھ لکھا ہے وہ فرہنگِ آثر کی طباعت سے قبل نیا دور (؟) میں ایک مضمون کی شکل میں شایع ہو چکا تھا۔ اس مضمون میں تمہید کے طور پر جو عبارت تھی اس کا ایک جملہ یہ تھا کہ یہاں صرف متروکات نور اللغات پر بحث کی جاتی ہے، الفاظ و محاورات کے سلسلے میں میں نے جہاں اختلاف کیا ہے اس نے ایک علاحدہ کتابی صورت اختیار کرلی ہے۔ اب کہ یہ کتاب فرہنگِ اثر کے نام سے الگ شایع ہو چکی ہے اس میں اس تمہید اور اس جملے کی ضرورت تھی۔ دو ایک جگہ نور اللغات کا حوالہ ہے مگر حضرت آثر کی رائے درج نہیں (مثلاً "گھر کھاتے دانت ٹوٹنا" کے تحت) نور اللغات پر حضرت آثر کی نظر ثانی کا سلسلہ جاری ہے اور اس کی ایک قسط نیا دور (۲۶ر جنوری سنہ ۶۲ء) میں شایع بھی ہو چکی ہے۔ ہمیں پوری امید ہے کہ مزید نظر ثانی کے بعد جو تیار ہوگا وہ فرہنگِ اثر کی ایک اور جلد کی حیثیت سے جلد طبع بھی ہو جائے گا لیکن ہم حضرت آثر سے یہ عرض کریں گے کہ اس دوسری جلد کی اشاعت کے وقت چند باتوں کو (جن کا زیر نظر کتاب میں خیال نہیں رکھا گیا ہے) ضرور پیش نظر رکھنے کی زحمت فرمائی جائے مثلاً (۱) فرہنگ میں متعدد جگہ فیلن، پلیٹس وغیرہ کا حوالہ آیا ہے۔ یہ مستشرقین، اردو لغتوں کے مرتب ہیں لیکن عام پڑھنے والوں اور طالب علموں کو اس کی آگاہی نہ ہوگی اس لئے ایسے تشریح طلب حوالوں کی وضاحت کردی جائے (۲) فرہنگِ آثر میں حضرت آثر نے بعض جگہ (مثلاً "آنکھ پھوٹنا" اور "خدا کا سچ" کے) ماتحت کسی پرانے شاعر کے کسی شعر کے سلسلے میں لکھ دیا کہ شعر دستیاب نہ معلوم کیا ہے آخذ شعر پورا لکھ دیا ہے

تاکہ فرہنگ غالب سے استفادہ کرنے والے طالب علموں کی الجھن رہ جائے (۳) بعض الفاظ کے ہندی معنی کے سلسلے میں لکھا گیا ہے کہ ہندی میں جو معنی بھی ہوں۔ ہمارے خیال میں اگر ہندی الفاظ کا حوالہ دیا جا رہا ہے تو ہندی یا سنسکرت کے پورے معنی بھی دے دیے جائیں۔ ایک اور چیز جس کی طرف توجہ دینا ضروری ہے یہ ہے کہ انگریزی ڈکشنریوں کی طرح اردو لغتوں میں جواب تیار کی جائیں ہر لفظ کو اعراب کے ساتھ درج کرنا لازمی سمجھ لیا جائے۔ تاکہ اردو پڑھنے والوں کو ہر لفظ کا صحیح تلفظ معلوم رہے۔ امید ہے کہ فرہنگ غالب کی دوسری جلد کی اشاعت میں اس کا خیال ضرور رکھا جائے گا۔ فرہنگ غالب بجائے خود مکمل لغت نہیں ہے۔ کاش حضرت اثر کا ہاتھ بٹانے والے کچھ لوگ مل جاتے کہ وہ مکمل لغت تیار کر دیتے۔

غالب

(از: ڈاکٹر) خورشید الاسلام ناشر: انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ

قیمت: چھ روپے

مرزا غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ارباب نظر اب بھی غالب کی زندگی اور کلام میں ایسے گوشے ڈھونڈھ لیتے ہیں جن پر تحقیق و تنقید کی روشنی نہ پڑی ہو۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے جو تنقید اور شاعری کی دنیا میں ایک مقام پیدا کر چکے ہیں اس کتاب میں غالب کے ایسے ہی ایک پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے جس کی طرف اب سے پہلے یا تو توجہ نہیں کی گئی تھی یا اگر کی بھی گئی تھی تو بہت کم۔ یہ پہلو ہے غالب کا ابتدائی دور اور اس پر دوسرے شعرا بالخصوص فارسی گو شعرا کے اثرات۔ غالب نے اپنے ابتدائی دور میں جن انداز کی شاعری کی اس پر بعض فارسی گو شعرا مثلاً بیدل، شوکت بخاری، جلال اسیر، غنی، ناصر علی صائب کا بہت اثر ہے۔ ان شعرا کی خصوصیات اور رنگ کیا تھا، غالب ان میں سے ہر شاعر سے فرداً فرداً کہاں تک متاثر ہوئے، غالب کے کن اشعار میں کس کا رنگ جھلکتا ہے اور وہ کون محرکات تھے جنھوں نے غالب کو ایک انفرادیت عطا کر دی، یہ وہ باتیں ہیں جن پر غور اور تحقیق کرنا ضروری تو تھا مگر اس کے لئے بڑی عرق ریزی، وسیع مطالعہ، محنت اور کاوش بھی درکار تھی۔ اس موضوع پر لکھنے والے کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ خود ان فارسی شعرا، اُن کے عہد، ان کی شاعری اور ان کے رجحانات سے بخوبی واقف ہو۔ اس کتاب سے نہ صرف ڈاکٹر خورشید الاسلام کی وسعت معلومات کا ثبوت ملتا ہے بلکہ اس میں غالب کی ابتدائی شاعری اور جن فارسی گو شعرا سے غالب متاثر ہوئے ہیں اُن کے فکری میلانات و رجحانات کا پورا جائزہ بھی مل جاتا ہے جس سے غالب کی شاعری کی بنیادیں سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ کتاب کے آخر میں دو ضمیمے ہیں۔ پہلے ضمیمے میں غالب کے ان فارسی اور اردو اشعار کے کچھ نمونے پیش کئے گئے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب مذکورۂ بالا شاعروں کے علاوہ دوسروں سے کہاں تک متاثر ہوئے۔ دوسرے ضمیمے میں وہ الفاظ اور تلازمے پیش کئے گئے ہیں جو غالب کی ابتدائی شاعری میں اکثر و بیشتر آئے ہیں۔

ماسٹر رام چندر

(از: (ڈاکٹر) سیدہ جعفر ناشر: ابوالکلام آزاد اورینٹل انسٹی ٹیوٹ۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد (۴) قیمت درج نہیں

ماسٹر رام چندر غالب کے ہم عصروں میں تھے اور نہ صرف دہلی کی بلکہ ہندوستان کی ممتاز ہستیوں میں ان کا شمار تھا۔ ریاضی کے ایک ماہر کی حیثیت سے ان کا نام ان کی زندگی ہی میں بلاد غرب تک پہنچ چکا تھا اور ریاضی پر اُن کی ایک کتاب کے لئے کمپنی کی طرف سے انھیں انعام بھی ملا تھا لیکن ریاضی داں کے علاوہ ماسٹر رام چندر اردو کے ایک ممتاز صحافی، مضمون نگار اور سماجی مصلح بھی تھے۔ انھیں مشرقی زبانوں کے علاوہ انگریزی پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ اپنی اس انگریزی دانی کی وجہ سے انھوں نے اردو میں ایسے ایسے عنوانات پر مضامین لکھے تھے جو اس عہد کے لئے نئے تھے اور اس طرح انھوں نے اردو نثر کے لئے ایک نئی راہ کھول دی تھی۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر (لکچرار۔ نظام کالج۔ حیدرآباد) نے انھیں ماسٹر رام چندر کے حالات اور علمی و ادبی کارناموں پر یہ تحقیقی کتاب لکھی ہے جس کا پورا نام ہے ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ ایک میں ماسٹر رام چندر کے حالات زندگی اور ان کی تصنیفوں اور اخبارات کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں ان کے چند تاریخی، سوانحی، علمی، اخلاقی، اصلاحی اور سماجی مضامین درج کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ماسٹر رام چندر کے حالات لکھنے اور اُن کے علمی و ادبی کارناموں کا تجزیہ کرنے میں بڑی چھان بین، جستجو، کاوش اور تحقیق سے کام لیا ہے اور ان کی تصنیفوں اور مضامین کی روشنی میں ان کی ہمہ صفت شخصیت کے ہر گوشے کو اجاگر کیا ہے۔ مولفہ نے کتاب میں ایسے پہلوؤں پر بھی بحث کی ہے جن کے متعلق ابھی تک کوئی غلط فہمی پائی جاتی تھی۔ مثلاً انھوں نے یہ بتلاتے ہوئے کہ اردو کے ممتاز ناقدین نے سرسید کو اردو کا اولین مضمون نگار قرار دیا ہے دکھلایا ہے کہ اردو کے پہلے مضمون نگار درحقیقت ماسٹر رام چندر ہیں اور سرسید کے مضامین اس ابتدا کا زیادہ نکھرا ہوا اور ترقی یافتہ روپ ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ماسٹر رام چندر کی کئی ایسی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی بابت کسی دوسری کتاب میں کوئی حوالہ نہیں ملتا تھا یا جن کے بارے میں کسی کو علم ہی نہ تھا۔ ماسٹر رام چندر کی تحریریں ادب کا کوئی شاہکار نہ تھیں اور نہ ادبی قدروں پر انھیں جانچنا چاہیئے۔ خود مولفہ بھی ماسٹر رام چندر کو بلند مرتبہ انشا پردازوں کی صف میں نہیں لائی ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ماسٹر صاحب کے علمی، تاریخی، سائنسی اور اصلاحی مضامین اور کتابوں پر سیر حاصل بحث

بقیہ ص ۱۰۸

مر کے ان کے صحیح مقام کا تعین ضرور کیا ہو اور سچ بھی یہ ہے کہ ماسٹر رام چندر کو اپنے ان مضامین اور تصنیفوں کی بنا پر اردو نثر کے ارتقا میں ایک بلند مقام ضرور حاصل ہے۔

ہندوستان کا دستور اور اس کی مختصر تشریح

از: پروفیسر ہارون خاں شروانی ناشر: تلنگو۔ اردو اکاڈمی برائے سائنس و تاریخ حیدرآباد۔ قیمت: دس روپے

ہندوستان میں جمہوری نظام حکومت کے قیام اور جمہوریہ ہند کے دستور کی تشکیل کے بعد اس بات کی بڑی ضرورت تھی کہ اردو میں بھی آئین ہند کا ترجمہ مع تشریح کے شایع کیا جائے۔ جمہوریہ ہند کا دستور اساسی جب تیار ہوا تو اس کے سودے کا ایک ترجمہ اردو میں بھی تیار ہوا تھا لیکن اسے کئی برس ہو گئے اور اس مدت میں دستور کی کئی دفعات میں ترمیمیں بھی ہو گئیں نیز عدالتوں نے دستور کی متعدد دفعات کے بارے میں اپنے فیصلے بھی شایع کئے۔ گویا اب اردو میں آئین ہند کے با تشریح ترجمے کی ضرورت اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ تلنگو۔ اردو اکاڈمی برائے سائنس و تاریخ (حیدرآباد) اس لحاظ سے مبارک باد کے قابل ہے کہ اس نے اس ضروری کام کو ہاتھ میں لیا اور اسے سرانجام دینے کے لئے ایک بہت موزوں ہستی کا انتخاب کیا۔ کتاب کے مولف، پروفیسر ہارون خاں شروانی تاریخ و سیاسیات کے پروفیسر رہ چکے ہیں اور ان کا شمار ملک کے ماہرین تاریخ و سیاسیات میں ہے۔ انھوں نے تاریخ و سیاسیات پر متعدد اہم کتابیں انگریزی اور اردو میں لکھی ہیں اور اب آندھرا پردیش کونسل کے ممبر ہیں۔ پروفیسر شروانی اس کمیٹی کے ایک رکن بھی رہ چکے ہیں جو ہندوستان کے آئین کے مسودہ کا اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ اس طرح اس کتاب کی تیاری کا کام ان کے لئے نیا نہ تھا۔ پھر بھی، انھیں دستور کے ترجمے کا کام از سر نو کرنا پڑا، کیوں کہ دستور کے مسودہ اور ترمیم شدہ دستور میں بہت فرق ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ تشریح کے لئے انھیں عدالتی نظیروں کا بھی حوالہ دینا تھا جس کے لئے انھیں دستور کی متعدد انگریزی شرحوں کا مطالعہ کرنا ضروری تھا۔ بہر حال، زیر نظر کتاب ان تمام مرحلوں کو طے کرنے کے بعد تیار ہوئی اور اس میں جس سلاست اور شرح و بسط کے ساتھ آئین ہند کی ہر دفعہ کا ترجمہ اور تشریح کی گئی ہے اس کی بدولت سیاسیات کے موضوع پر اردو میں ایک گراں قدر کتاب کا اضافہ ہو گیا ہے۔ کتاب اچھے ٹائپ میں، اچھے کاغذ پر تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں انگریزی اصطلاحات کا اردو ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے جو بہت مفید ہے۔

رگ جاں

از: ڈاکٹر خورشید الاسلام۔ ناشر: انجمن ترقی اردو علی گڑھ
قیمت: دو روپے پچاس نئے پیسے۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام ایک بلند پایہ ناقد کے علاوہ ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر بھی ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی تنقیدی صلاحیتوں نے ان کی شاعری میں بھی ایک جلا پیدا کر دی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں نئی منزلوں کا پتہ دیتے ہیں مگر ان منزلوں کی تلاش میں شاعری کے پرانے روایات کو یکسر نظر انداز نہیں کر دیتے بلکہ ان روایات پر قائم رہتے ہوئے فن کے نئے چراغ روشن کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تنقیدوں کی طرح ان کے اشعار میں بھی ایک انفرادیت نظر آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ان کے یہاں قدیم و جدید کا ایک بڑا حسین امتزاج ملتا ہے۔ غزل ہو یا نظم، انھوں نے اپنے اشعار میں مسائل حاضرہ کی تلخیوں اور زندگی کی بوقلمونیوں کو سمو دیا ہے اور ان کی ہر نظم اور ہر غزل میں ایک نئی لطافت اور نیا آہنگ ملتا ہے۔ مثلاً ان کی غزلوں کے چند شعر پیش ہیں:

ہمارے آنسوؤں سے گلہ ہے گلہ ہے — ترا دامن بھی نم ہونے لگا ہے
کرم کی یہ نگاہیں میری جانب — کرم والو! ستم ہونے لگا ہے
وجود آدمی سے بیشتر ہی — سر آدم قلم ہونے لگا ہے

وہ سادہ دل ہیں کہ غیروں کو راز داں جانا — وہ بدگماں ہیں کہ ہر راز داں سے روٹھ گئے
اسی کا نام ازل ہو، اسی کا نام ابد — وہ ایک رات جو پھولوں کے درمیاں گزری
کبھی کبھی تو غم دل کی لے بڑھی اتنی — دل حیات کی دھڑکن بھی کچھ گراں گزری
ترا پھیکا سا تبسم بھی ہے یگانۂ بخشش — میری آنکھوں کا لہو بھی کس قدر بے رنگ ہے
کچھ تو ہو جس کے فیض سے دل کو ہو تاب تب ہم — کوئی خیال، کوئی خواب، کوئی خدا، کوئی صنم

کتاب اچھے ٹائپ میں اچھے کاغذ پر چھپی ہے اور سرورق دل کش ہے۔

حیوانی زندگی کی دل چسپ باتیں

از: محشر عابدی ناشر: تلنگو۔ اردو اکاڈمی برائے سائنس و تاریخ حیدرآباد۔ قیمت: چار روپے

(ڈاکٹر) سید محمد محسن (محشر عابدی) بہ یک وقت سائنس داں بھی ہیں، شاعر بھی، افسانہ نویس بھی اور ڈرامہ نگار بھی۔ ان کے افسانے، ڈرامے اور ان کا کلام کتابی صورتوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ سائنسی موضوعات پر بھی کچھ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی ان کی سائنسی کتابوں میں ایک ہے جس میں حیوانوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بڑے عام فہم اور دل چسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو میں سائنسی اور دوسرے معلوماتی موضوعات پر بہت کم لکھا جا رہا ہے اور یہ کچھ مناسب نہیں۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر محشر عابدی کی یہ کتاب اردو زبان میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ انھوں نے اس میں حیوانی زندگی کے وہ سارے پہلو پیش کر دیے ہیں جن سے عام آدمی واقف نہیں ہوتے مثلاً حیوانوں کے مسکن، حیوانوں کے جذبات، حیوانوں کی ذہانت، حیوانوں کا سماج، حیوانوں کی مامتا وغیرہ۔ یہ اس کتاب کے چند عنوانات بھی ہیں۔ ان عنوانات کے پڑھنے ہی سے

کتاب کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب سائنس دانوں اور غیر سائنس دانوں، طالب علموں اور غیر طالب علموں، سب کے لیے نہ صرف دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے بلکہ اس کے پڑھنے سے عام معلومات میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ کتاب میں ۴۲ جانوروں، پرندوں اور کیڑوں کی تصویریں بھی ہیں جنھوں نے کتاب کی اہمیت اور دلچسپی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ آخر میں انگریزی اصطلاحات اور ناموں کا اردو میں ترجمہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔

بُستانِ حرم

از : حمید صدیقی ناشر: ادارۂ فروغ اردو

قیمت : ڈیڑھ روپیہ

اب سے تقریباً چار سو برس پہلے سورداس اور راجستھان کی ایک راجکماری میرا بائی نے کرشن جی کے عشق میں اور تلسی داس نے رام چندر جی کی محبت میں سرشار ہو کر ہندی میں ایسے نغمے سنائے جنھیں سن کر نہ صرف سورداس، میرا اور تلسی داس کی والہانہ عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ سننے والے پر بھی ایک کیف طاری ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ شہنشاہ اکبر نے (جو سورداس کا معاصر تھا) سورداس سے فرمائش کی کہ میری تعریف میں بھی کچھ کہو۔ اس پر سورداس نے فی البدیہہ یہ جواب دیا: "مَن میں رہیو نا ہِن ٹھَور۔ نند نندن اچھت اب کَن کیسے آور" (دل میں جگہ نہیں رہ گئی ہے کہ نند کے لڑکے (کرشن جی) کو چھوڑ کر کسی اور کے صفات بیان کروں) میرا کے پدوں کا یہ ٹکڑا تو سبھی نے سنا ہوگا: "میرے تو گردھر گوپال، دوسرا نہ کوئی" اسی طرح تلسی داس نے رام چندر جی کی محبت میں فنا ہو کر ان کی ثنا و صفت میں اشعار کہے۔ اردو کے مشہور نعت گو، حمید صدیقی لکھنوی (مصنف گلبانگِ حرم و بُستانِ حرم) نے اسی طرح اپنی ساری زندگی اور اپنی ساری شاعری نذرِ پیغمبرِ اسلام کر دی ہے۔ اردو شاعر عام طور سے (کسی فرضی محبوب کے تصور میں) ہجر و فراق کے صدمے اور اپنی حالتِ زار بیان کرتا ہے۔ حمید صدیقی کا بھی ایک محبوب ہے مگر فرضی اور خیالی نہیں۔ ان کے محبوب رسولِ عربی ہیں جن سے انھیں ایسا والہانہ عشق ہے کہ وہ دن رات، سوتے جاگتے انھیں کے تصور میں غرق رہتے ہیں۔ دیارِ نبی کی بات کرنا ان کے نزدیک زندگی کی بات کرنا ہے۔ دوسروں کی طرح چاندنی ان کے لئے بھی کیف انگیز ہے مگر وہی چاندنی "جو برستی ہے زیرِ قبۂ نور"۔ اس عشق اور والہانہ عشق کے باوجود "بیگانۂ آدابِ محبت" ہو جانا انھیں منظور نہیں ہے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ بے خودی میں بھی "بات بہوش و فرزانگی" کی کی جائے۔ وہ جب دیارِ نبی کی طرف رخ کرتے ہیں تو یہ حالت ہو جاتی ہے۔

کبھی کمالِ ادب سے قدم اٹھا نہ سکے کبھی دفورِ محبت میں تیز گام چلے

ان کی جنت، مدینے کی گلیاں ہیں جن کی وہ ایک بار نہیں کئی بار زیارت کر چکے ہیں۔
جنت کا ذکر کرتے ہیں واعظ بہت، مگر جنت کو دیکھ آئے ہیں اپنی نظر سے ہم
اور جب کبھی وہ وہاں پہنچ نہیں پاتے تو اپنی بے چینی اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

وہ خاکِ پاک ان آنکھوں میں ہم لگا نہ سکے جبینِ شوق کے سجدوں کو جگمگا نہ سکے

انھیں مدینے کے در و دیوار، گلی کوچوں، شجر و حجر، شب و روز غرض ہر چیز میں کسی معشوق کا جلوہ نظر آتا ہے۔

چاندنی شب میں کھجوروں کے درختوں کا وہ عکس جیسے عارض پر کسی کی زلف لہرانے لگے

یہ اور دوسرے اشعار (جو اپنی جگہ شعریت سے بھی بھرپور ہیں) "زائرِ حرم" حمید صدیقی کی ایک خاص کیفیت ظاہر کرتے ہیں۔ نعت کے اشعار بہت لوگ کہتے ہیں مگر جو سوز و گداز، جو تڑپ اور کسک، جو کیف و سرمستی، جو خلوص اور جذبہ حمید صدیقی کے نعتیہ اشعار میں ملتا ہے وہ دوسری جگہ مشکل سے نظر آتا ہے اور اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ حمید صدیقی "فنا فی الرسول" ہو چکے ہیں اور ان کا رواں رواں عشقِ نبی میں سرشار ہے۔

میں ہار گیا

از : ہری کرشن ناشر: کتابی دنیا لکھنؤ

قیمت :

یہ ایک ناول ہے جس کا پلاٹ دلچسپ ضرور ہے مگر اس کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سماج کے تاریک پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ناول نگار نے ایسے کردار بھی پیش کئے ہیں جو اپنی عسرت اور ناداری میں بھی انسانی عظمت اور خودداری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے لیکن بحیثیت مجموعی سماج پر طنز کرنے میں مصنف نے حد سے زیادہ تلخی اور شدت سے کام لیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے تلخ تجربات کا ردِ عمل ہوں جیسا کہ خود دیباچہ میں لکھا ہے، لیکن کتاب کا جو انداز ہے اس سے ایک شکست خوردہ ذہنیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ "پریسیڈنٹ" "پرائم منسٹر" اور بعض سرکاری اداروں کے سلسلے میں جو طنز کیا گیا ہے وہ ایک جمہوریت پسند شہری کو زیب نہیں دیتا اور حقیقت میں بھی غلط ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے موقعوں پر بھی قلم میں شوخی زیادہ پیدا ہو گئی ہے۔ ناول کے مطالعے سے ناول نگار کی صلاحیتوں کا ضرور اندازہ ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ مصنف میں ایک اچھے ناول نگار بننے کی تمام اہلیتیں موجود ہیں۔ امید ہے کہ وہ آئندہ اپنی تصنیفوں میں افراط و تفریط سے احتراز کریں گے اور لوگوں میں صالح شعور اور صحت مند ذہنیت پیدا کرنے کے لئے قلم اٹھائیں گے جو ایک اچھے ناول نگار اور کامیاب مصنف کا فریضہ ہے۔ کتاب میں کتابت کی غلطیاں بکثرت موجود ہیں جو تھوڑی سی توجہ سے بڑی حد تک کم کی جا سکتی تھیں۔ طباعت بھی خوب ہے۔

انجم کدہ

(از: عزیز لکھنوی۔ ناشر: انجمن ترقی اردو، علی گڑھ

قیمت: تین روپے

اساتذہ لکھنؤ میں مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کو بہت بلند مقام حاصل رہا ہے۔ اثر لکھنوی، جوش ملیح آبادی، جگت موہن لال رواں، شیام موہن لال جگر بریلوی ایسے شاعر اور ادیب ان کے شاگردوں میں ہیں۔ خود عزیز لکھنوی مرحوم اپنے علم و فضل اپنی شعری صلاحیتوں اور استادانہ رنگ سخن کی وجہ سے اپنی زندگی ہی میں شہرت کی ان منزلوں تک پہنچ گئے تھے کہ اب وہ یا ان کی شاعری محتاج تعریف و تعارف نہیں رہ گئی ہے۔ نیا دور کے اسپشل نمبر (۲۶ر جنوری ۱۹۶۲ء) میں ان پر ایک تفصیلی مضمون بھی شایع ہو چکا ہے۔ حضرت عزیز مرحوم نے ہر صنف سخن میں اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے تھے۔ ان کے قصائد کا ایک مجموعہ صحیفۂ ولا کے نام سے اور ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ گل کدہ کے نام سے ان کی زندگی میں شایع ہو چکا تھا۔ انجم کدہ ان کے صاحبزادے جناب حیات لکھنوی نے حال میں ترتیب دیا ہے اور یہ صرف غزلیات کا دوسرا مجموعہ ہے جسے انجمن ترقی اردو نے شایع کیا ہے۔ حضرت عزیز لکھنوی مرحوم کا ابھی بہت سا کلام طبع نہیں ہو سکا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ بھی جلد طبع ہو کر اردو ادب کے خزانے میں اضافے کا باعث ہوگا۔

دھڑکنیں

(از: ذکی کاکوروی: ذکی کاکوروی ۱۸۔ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

قیمت: دو روپے پچاس نئے پیسے۔

ذکی کاکوروی ایک نوجوان شاعر ہیں اور دھڑکنیں ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ ذکی کے اشعار ان کے بہ قول ان کے "جذبات و احساسات اور رجحانات کے آئینہ دار ہیں" اور یہ مجموعہ ان کی صلاحیتوں کا پتہ دیتا ہے۔ آئندہ ان سے بہت کچھ امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ مجموعہ کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ذکی میں رومانیت پسندی کا عنصر زیادہ ہے اس میں انھیں ذرا اعتدال سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ بعض جگہ الفاظ اور بحروں کا استعمال بھی محل نظر ہے مثلاً صفحہ ۵۹ پر "کبھی منہ سے لگائی" یا "اور ہم سے نبھائی" میں لگائی اور نبھائی کی ترکیب اسی طرح صفحہ ۱۲۹ پر آخر میں جو رباعی دی گئی ہے اس کے تیسرے مصرعے کی بحر بھی محل نظر ہے۔

مراسلہ

(۶) شعر آتش ؎

روزہ ہو یہ لطف عیش و نشاط دنیا — بوئے شب عروسی مہماں ہے پیرہن میں

آپ نے جواب میں جو کچھ ارقام فرمایا ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

(۷) شعر آتش ؎

بغض و حسد سے خالی صحرا کو بھی نہ پایا — کیا کیا جلا ہے ساکھو، ہے ڈھاک بن میں

جناب اثر نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ "ساکھو کے بن میں کبھی کبھی خود بخود آگ لگ جاتی ہے" بندہ بہرو زاس تھیوری کو تو میں بھی جانتا ہوں کہ بن میں آگ لگتی ہے لیکن ساکھو کے بن میں شاخوں کی رگڑ سے آگ لگنا یہ آپ کی تحقیق ہوگی۔ ساکھو کو جنوبی ہند میں ساگون بولتے ہیں جنگل میں جب آگ لگتی ہے تو یقیناً ساگون کے درخت بھی جھلستے ہیں لیکن ساکھو سے کبھی آگ پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی ٹہنیاں بھی ایسی نہیں ہوتیں جو آپس میں رگڑ کھائیں۔ جنگلوں میں جو آگ لگتی ہے وہ بانس کے درختوں کے باہم رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔ غالباً اور کسی درخت کی رگڑ سے آگ پیدا نہیں ہوتی۔

پھر آپ کا یہ فرمانا کہ آتش کا مندرجہ بالا شعر ضرب المثل ہو گیا میرے لیے ایک بالکل نئی بات ہے۔ میں تو بار بار لکھنؤ بھی آیا ہوں لیکن کبھی میں نے کسی شخص کو یہ شعر تمثیلاً پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ازراہِ عنایت بغرضِ افادہ آپ مجھے بتائیں کہ کیسے محلِ کلام میں آپ کے یہاں یہ شعر تمثیلاً پڑھا جاتا ہے۔

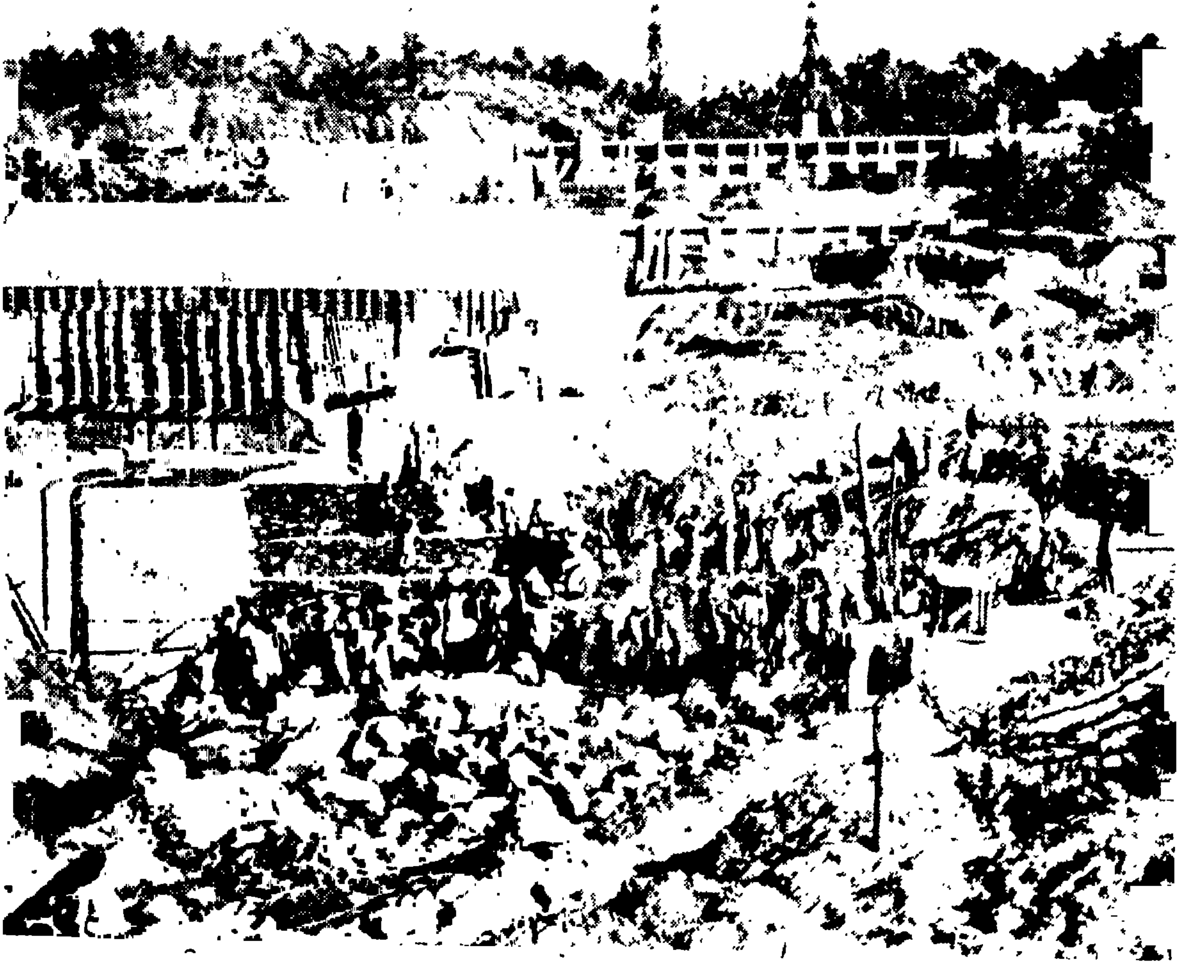
(۸) شعر آتش ؎

قید عفت میں ہے وہ معشوق عاشق جاں طلب — نزع میں بیمار عیسیٰ دامنِ مریم میں ہے

اس شعر پر جو کچھ مجھے لکھنا تھا وہ میں نے لکھ دیا تھا۔ مجھے "قید عفت" کو لکھنے کی ضرورت نہ تھی اس لئے جو الفاظ مجھے موزوں معلوم ہوئے لکھ دیئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ناطق نے قید اور پابندی کا نازک فرق نظر انداز کر دیا مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ لفظ پابندی سے قید آپ کے نزدیک والے نازک فرق میں کس طرح بہتر ہو جاتا ہے۔ ازراہِ عنایت "نزع میں بیمار عیسیٰ دامنِ مریم میں ہے" کے ساتھ "قید عفت میں ہے وہ معشوق عاشق جاں طلب" اور "وہ ادھر پابند عفت اور ادھر میں جاں بلب" دونوں کو الگ الگ ملا کر پھر ذرا انظر انصاف سے غور فرمایئے کہ دوسرے مصرعہ کی ضروریات کو کونسا مصرعہ بدرجہ اتم پورا کر رہا ہے — ناطق گلاؤ ٹھوی

(بہ سلسلہ صفحہ ۵۱)

REGD. NO. A-3

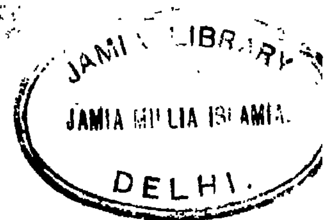


[illegible] مکمل ہو چکا ہے تصویر میں اس کی بنیاد پر کام کرتے ہوئے مزدور دکھائی دے رہے ہیں

نیا دور







17 (3)



جیٹھ ۱۸۸۴
جون ۱۹۶۲

۵۰



جلد ۱۷ نمبر ۳

جیٹھ ۱۸۸۴
جون ۱۹۶۲ء

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: ۵۰ نئے پیسے

اڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
امیر بھوشن ملک
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اُترپردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ ہالج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ۔ لکھنؤ

شایع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُترپردیش

عنوان

اپنی بات

ڈاکٹر راجندر پرساد، صدر جمہوریہ ہند کے اہم اور ذمہ دارانہ عہدے سے ریٹائر ہو گئے ہیں اور اُن کے ریٹائر ہونے کے بعد ہندوستان کی دو ممتاز ہستیاں، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ڈاکٹر ذاکر حسین، صدر اور نائب صدر کی حیثیت سے منتخب ہوئی ہیں۔ ان دونوں ہستیوں کے نام محتاج تعارف نہیں۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن اپنے علم و فضل کی بدولت پہلے ہی سے ایک بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔ نائب صدر جمہوریۂ ہند کی حیثیت سے انھوں نے اپنی سیاست دانی کا بھی ہر حلقے سے اعتراف کرا لیا۔ اس طرح ہندوستان کے موجودہ صدر دنیا کے ایک مشہور فلسفی بھی ہیں اور سیاست داں بھی، ماہر تعلیم بھی ہیں اور روحانی اقدار کے بہت بڑے مبلغ بھی۔ ڈاکٹر سَروَپلی رادھا کرشنن ۵ ستمبر ۱۸۸۸ء کو ترتانی ضلع



چتّور (آندھرا پردیش) میں پیدا ہوئے اور ویلور اور مدراس میں تعلیم حاصل کی۔ مدراس یونیورسٹی سے ۱۹۰۹ء میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ مدراس یونیورسٹی ہی میں فلسفے کے لکچرر مقرر ہوئے اور ایک ماہر فلسفہ داں کی حیثیت سے اس قدر جلد مشہور ہو گئے کہ ۱۹۱۸ء میں میسور یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر مقرر کر دیے گئے۔ تین برس کے بعد وہ کلکتہ یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر کی اہم جگہ پر مامور کیے گئے۔ اُن کی کتابوں اور مضامین کی جلد ہی اتنی شہرت پھیلی کہ انھیں ۱۹۲۶ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں، پھر اسی سال شکاگو یونیورسٹی میں اور تین سال کے بعد لندن یونیورسٹی میں لکچر دینے کی دعوت دی گئی۔ چند برس بعد وہ آندھرا یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنا دیے گئے اور اس عہدے پر وہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۶ء تک فائز رہے۔ اُسی سال آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی فلسفے کے پروفیسر کی جگہ پر اُن کا تقرر ہوا۔ تین برس بعد یعنی ۱۹۳۹ء میں وہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر کیے گئے اور دو برس تک انھوں نے اس حیثیت سے کام کیا۔ حکومت چین نے انھیں ۱۹۴۴ء میں اپنے یہاں بارہ لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔ چین کے بعد امریکہ نے انھیں ۱۹۴۶ء میں امریکہ کی چودہ یونیورسٹیوں میں لکچر دینے کی دعوت دی۔ اسی زمانے میں انھوں نے "یونیسکو" میں ہندوستانی وفد کی قیادت کی اور ۱۹۴۸ء میں "یونیسکو" کی مجلس انتظامیہ کے چیرمین منتخب ہوئے۔ حکومت ہند نے ۱۹۴۸ء میں جب یونیورسٹی کمیشن مقرر کیا تو اُس کا چیرمین ڈاکٹر رادھا کرشنن کو بنایا گیا۔ پھر ۱۹۴۹ء میں انھیں روس میں ہندوستان کا سفیر مقرر کیا گیا اور ۱۹۵۲ء میں وہ نائب صدر جمہوریۂ ہند منتخب ہوئے۔ اس وقت سے اب تک وہ نائب صدر جمہوریۂ ہند رہے۔ نائب صدر ہند کی حیثیت سے ڈاکٹر رادھا کرشنن نے متعدد مغربی ملکوں کا دورۂ خیرسگالی کیا۔ سب سے پہلے ۱۹۵۳ء میں وہ مغربی یورپ اور امریکہ گئے۔ پھر ۱۹۵۶ء میں وہ مشرقی یورپ کے ممالک اور روس گئے۔ دو برس بعد ۱۹۵۸ء میں وہ فرانس، جرمنی، انگلستان اور امریکہ گئے۔ سوئڈن، فن لینڈ اور ڈنمارک کا ۱۹۶۰ء میں دورہ کیا۔ سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد نے ۱۹۵۴ء میں انھیں ہندوستان کا سب سے بڑا اعزاز "بھارت رتن" عطا کیا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن متعدد اہم کتابوں کے مصنف ہیں جن میں فلسفہ بالخصوص ہندوستانی فلسفے کے اہم نکات کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپنی ان کتابوں اور لکچروں کے ذریعے صرف ہندوستانی فلسفے ہی کی وضاحت نہیں کی بلکہ مشرقی اور مغربی فلسفے کا تقابل کیا اور روحانی اقدار کی عظمت بتائی۔ اُن کی یہ کتابیں اور لکچر دراصل ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور زندگی کے بارے میں ہندوستان کی فکر و نظر کے صحیح معنوں میں ترجمان ہیں اور ڈاکٹر رادھا کرشنن، مغرب میں ہندوستانی روایات کے پیغام بر!

نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کا وطن قائم گنج ضلع فرخ آباد ہے مگر وہ ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے حیدرآباد (دکن) میں۔ اُس زمانے میں ان کے والد فدا حسین خاں حیدرآباد میں وکالت کرتے تھے۔ ذاکر صاحب ابھی بچہ ہی تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے انتقال پر ذاکر صاحب کی والدہ اپنے سب بچوں کے ساتھ قائم گنج چلی آئیں اور اٹاوہ مسلم ہائی اسکول میں ذاکر صاحب کو داخل کرا دیا گیا۔ اسکول کی تعلیم کے بعد ذاکر صاحب کا نام مسلم یونیورسٹی میں لکھوایا گیا۔ مہاتما گاندھی نے جب ۱۹۲۰ء میں اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم ترک کر دینے کی تحریک شروع کی تو اس وقت ذاکر صاحب ایم اے پاس کر چکے تھے لیکن وکالت کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مہاتما گاندھی کی اپیل پر انھوں نے مسلم یونیورسٹی کو چھوڑ دیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) چلے گئے۔ وہاں سے وہ جرمنی گئے اور جرمنی ہی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے بعد وہ پھر جامعہ ملیہ چلے آئے اور ۱۹۲۶ء میں جامعہ کے وائس چانسلر بنا دیے گئے۔ اُس وقت سے ۲۶ برس تک مسلسل وہ جامعہ کے وائس چانسلر رہے۔



ذاکر صاحب جامعہ ہی میں تھے کہ مہاتما گاندھی نے اپنی بنیادی تعلیم کی اسکیم تیار کی۔ ذاکر صاحب نے اس اسکیم کی خامیوں کی طرف توجہ دلائی۔ گاندھی جی اُن کی تنقید پر اس قدر خوش ہوئے کہ اسکیم کو چلانے اور کامیاب بنانے کی ذمہ داری انھیں کے سپرد کر دی۔ اس کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی تعلیمی کمیشن کے ممبر بنا دیے گئے۔ اسی سال یعنی ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین، علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور اس عہدے پر وہ ۱۹۵۶ء تک فائز رہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۹۵۲ء میں راجیہ سبھا (مرکزی کونسل) کے ممبر بنا دیے گئے اور ۱۹۵۶ء تک اس کے ممبر بھی رہے۔ اس کے بعد انھیں بہار کا گورنر بنا دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کئی اہم کتابوں کے مصنف بھی ہیں جن میں سرمایہ داری پر اُن کا مقالہ اور افلاطون کی "ریاست" کا اردو ترجمہ خاص کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین "یونیسکو" کے تعلیمی اور ثقافتی شعبہ میں بھی ہندوستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جب ۱۹۱۷ء میں مسلم یونیورسٹی یونین کے نائب صدر منتخب ہوئے تھے تو اقبال سہیل مرحوم نے ایک نظم کہی تھی جس کا ایک شعر تھا: "نگار یونین را ساعتِ صد زیب و زین آمد ٭ کہ اکنوں سرو گلزار ہنر ذاکر حسین آمد" آج جب کہ وہ انڈین یونین کے نائب صدر ہیں یہی شعر بے ساختہ زبان پر پھر آتا ہے ——— اسلام [illegible]

بھولا ہوا راستہ

شمیم کرہانی

اگرچہ میں زندگی کے عہد جواں کا مستانہ راہرد ہوں
حیاتِ فردا کے آفتابِ سحر کی ضو ہوں
سُناتا رہتا ہوں آنے والی سحر کی رعنائیوں کی باتیں
نکھرتے چہروں کی داستانیں، ابھرتی پرچھائیوں کی باتیں
میں زندگی کے دھڑکنے والے دلوں کے جذبے ابھارتا ہوں
میں راہرو کو نہیں بلاتا میں کارواں کو پکارتا ہوں
مگر تصوّر نہ جانے کیوں آج شامِ ماضی کی رہگزاروں میں چل رہا ہے
سہانی یادوں کی وادیوں میں ٹہل رہا ہے
نگاہ اٹھی ہے جس طرف بھی دیار، دل کے اُتر رہے ہیں
قدم قدم پر حیاتِ الفت کے سیکڑوں کے کھنڈر ملے ہیں
کھنڈر کی کالی اجاڑ منزل کے اک کنارے
حسین ناگن سی ایک ندی
نہ جانے کتنے ہزار سالوں سے بہہ رہی ہے
کوئی کہانی سی کہہ رہی ہے
کہ میرے ساحل پہ آریائی مسافروں نے خرد کے دلکش محل بنائے
نئے تمدن کے بیل بوٹوں سے ان کے محراب و در سجائے
چراغِ روحانیت جلائے
دراوڑوں کے سیاہ قدموں سے اپنے پہلے قدم ملائے
ملا کے مہر و وفا کی راہوں میں چل پڑے مشعلیں جلائے
اداس ساحل کی سمت دیکھو
بجھی بجھی سی وہ مشعلیں آج تک ملیں گی

کہ جن کی مدھم سی روشنی میں
پڑے ہیں ٹوٹے ہوئے ستارے
عظیم ارجن کے دل کے ٹکڑے، مہان دسرتھ کے ماہ پارے
پوتر سیتا کا پاک آنچل
جبین ساوتری کا صندل
شکنتلا کے سہاگ کی گم شدہ انگوٹھی
شیام کی دلنواز بنسی
یہ ایک جادو کا راگ بن کر دلوں کے مدھوبن میں گونجتی تھی
صدا نے جس کی حیات رادھا میں پیار کی چاندنی کھلا دی
اُبل پڑے زندگی کی پیاسی زمین پر معرفت کے چشمے
سروں نے جس کے یہ راز کھولا کہ روح مرتی نہیں کبھی بھی
کہ روح اک لازوال شے ہے
بدن کو آتی ہے موت بیشک بدن کو نذرِ شرار کر دو
جو حق و باطل میں جنگ ٹھہرے تو حق پہ تن کو نثار کر دو
وہ رازدارِ حیات بنسی
کھنڈر کی چھاتی پہ یوں پڑی تلملا رہی ہے
کہ جیسے عرفاں کی یہ امانت
فضول ہے کام کی نہیں ہے
مرے ہی ساحل کے سرد دامن میں مصر و ایراں کا ہر تھکا کارواں سویا
دیارِ روما کے راہگیروں نے اپنی گردِ سفر کو دھویا
عرب کی دھرتی کے باسیوں کو ہوا مرے تٹ کی راس آئی

جون ۱۹۶۲ء

مری محبت کی گود میں ان بہادروں نے خلوص کی چھاؤنی بسائی
یہ آئے رحمت کے میکدے کا بڑا ہی انمول جام لے کر
زمین مکہ کے اک پیامی کا روح پرور پیام لے کر
پیام کیا تھا
پیام سُن لو
کہ ساری دنیائے نسل آدم، بہت بڑی اک برادری ہے
برادری کی اس انجمن میں نہ کمتری ہے نہ برتری ہے
عظیم وحدت کے زیر پرچم ہر اک کو حاصل برابری ہے
سبھی کو بڑھ کر گلے لگاؤ
ہر ایک کو شادماں بناؤ

پڑوس میں جب دیا جلاؤ تو اپنے گھر میں دیا جلاؤ
کوئی اچھالے جو تم پہ کوڑا تو کچھ نہ بولو
کہ راستے کا غبار ہے یہ
جو آئے ملنے کو تم سے دشمن تو اپنے دامن کو تم بچھا دو
کوئی تمھیں پتھروں سے مارے تو پھول کی طرح تم مسکرا دو
کوئی ضروری نہیں ہے بدلہ، غبار سے دل کو صاف کر لو

اگر ندامت کا سر جھکا دیں تو دشمنوں کو معاف کر دو

کھلو بیاباں میں پھول بن کر، چلو چمن میں نسیم ہو کر
بڑھو تمدن کی رہگزر پر، امینِ خُلقِ عظیم ہو کر
پیام رحمت کی وہ نشانی
کھنڈر کی چھاتی پہ یوں پڑی تلملا رہی ہے
کہ جیسے عرفاں کی یہ امانت
فضول ہے کام کی نہیں ہے
اسی کنارے پڑے ہوئے تھرتھرا رہے ہیں
حیات گوتم کے شاہ پارے
اشوک کی شانتی کے کتبے
وہ ہار سنجوگتا نے ڈالا جو پرتھوی راج کے گلے میں
وہ زرم کہ اکھڑا جو طوفان میں سہارا تھا سوہنی کا
جو رے کے مہوال کی خوشی کو ندی میں غرقاب ہو گیا تھا
وہ ٹوٹا پھوٹا ستار جس پر غریب میرا نے اپنے گردھر کے گیت گائے
وہ بین جس پر مہان تلسی نے اپنے رگھوپت کے راگ چھیڑے
کبیر کا عارفانہ بربط
جو ہم کو دیتا تھا یہ سندیسہ کہ رام و رحمان ایک ہی ہیں
سب ایک اللہ کے ہیں بندے یہ سارے انسان ایک ہی ہیں
یہی کنارا ہے وہ کنارا
کہ جس پہ تاریخ زندگی کے حسیں نظارے چمک چکے ہیں
عظیم اکبر کے آسمان وفا کے تارے چمک چکے ہیں
جمالِ ممتاز کے پجاری کا مرمریں خواب جلوہ گر ہے
یہ تاج محلوں کی رہگزر ہے
ہر ایک پیاسے کو میرے ساحل نے ساغر زنگ دبو دیا ہے
مرے ہی پاکیزہ جل میں اکثر نمازیوں نے وضو کیا ہے
مرے کنارے ہر ایک مسجد ہر ایک مندر کی نقرئی بتیاں جلی ہیں
مری رواداریوں کی لہروں میں مختلف کشتیاں چلی ہیں
ادھر سے گزرا ہے عارفوں کا گروہ اکثر
سنبھالے اپنے عمل کے ہاتھوں میں اپنی ہستی کا سبز پرچم
وہ سبز پرچم کہ جس کے آنچل میں چاند تارے مچل رہے تھے
خدائے واحد کے پاک نغمے ہوا میں کروٹ بدل رہے تھے
نوائے شنکر سے دل کے شیشوں میں شعلۂ عشق ڈھل رہے تھے
فقیر نانک کے سوزِ دل سے چراغ راہوں میں جل رہے تھے
پیامِ چشتی کی روشنی میں ملے جلے پاؤں چل رہے تھے
یہ متحد پاؤں کے نشاں ہیں
ہوا کے ناسازگار ہاتھوں نے خاک سی ڈال دی ہے لیکن
یہ سارے نقش دوام الفت ابھی حسیں ہیں ابھی جواں ہیں
چلے چلیں اس ڈگر پہ ہم تم تو یہ ڈگر حاصل سفر ہے
اسی ڈگر کی اندھیری وادی کے پار ہی منزل سحر ہے

نواب محمد یار خاں امیر

راز یزدانی

نواب محمد یار خاں امیر کون تھے، یہ جاننے کے لیے افغانستان روہیلکھنڈ میں دولت افغانیہ کی ابتدائی تاریخ کے چند اوراق پارینہ کی ورق گردانی ضروری ہے:

افغانستان کے ایک گاؤں تورشہامت میں دو بھائی تھے جن کے نام تھے شاہ عالم خاں اور حسن خاں۔ یہ دونوں بھائی شہاب الدین خاں کٹّے بابا کی نسل سے تھے جن پر اکثر مورخوں نے مشہور صوفی شہاب الدین سہروردی کا دھوکا کھایا ہے۔ شاہ عالم خاں شادی کے بعد ایک مدت تک لاولد رہے۔ آخر اولاد کی طرف سے مایوس ہو کر انھوں نے اللہ داد خاں غلزئی کے بیٹے داؤد خاں کو اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ داؤد خاں سن تمیز کو پہنچ کر کاروبار میں اس قدر ہوشیار ثابت ہوا کہ باپ نے بیٹے کے سپرد اپنا تمام کاروبار کر دیا جو گھوڑوں کی تجارت پر مشتمل تھا۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ داؤد خاں کو بیٹا بنا لینے کے بعد شاہ عالم خاں کے حقیقی بچے بیٹے ہوئے اور گھر کے اندر یہ چپقلش پیدا ہوئی کہ صلبی اولاد ہوتے ہوئے کاروبار متبنیٰ کے کیوں سپرد ہے۔ شاہ عالم خاں کی بیوی اور جوان ہوتی ہوئی اولاد سب نے مل کر داؤد خاں کے خلاف ایک سخت قسم کا محاذ بنا لیا اور حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ داؤد خاں نے ہندوستان سے گھوڑے لانے کا بہانہ کر کے افغانستان چھوڑ دیا اور سنہ ۱۱۲۰ھ مطابق سنہ ۱۷۰۸ء میں وہ ہندوستان چلے آئے۔

ادھر ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ بڑے بڑے صوبے تو عملاً آزاد ہو ہی چکے تھے چھوٹے چھوٹے زمیں دار اور راجے بھی مرکز سے خوف زدہ نہ تھے اور اپنے اپنے علاقوں میں من مانی کرتے تھے۔ داؤد خاں جو اپنے وطن کو واپس نہ جانے کے خیال سے آیا تھا ایک حوصلہ مند قوم کا بیٹا تھا۔ اُسے یہ حالات اپنے اُبھرنے کی کوشش کے لیے سازگار محسوس ہوئے اور کٹھیر میں معدودے چند ساتھیوں کے بل پر اُس نے قسمت آزمائی شروع کر دی۔ کٹھیر کو اُس نے اپنی سرگرمیوں کے لیے یوں پسند کیا کہ یہ جگہ مرکز سے کافی دور تھی اور بدایوں کمایوں وغیرہ کے پہاڑی مقامات تھے جہاں گھنے جنگلوں اور اونچے اونچے پہاڑی علاقوں میں اُسے وقت آنے پر پناہ مل سکتی تھی۔ رفتہ رفتہ داؤد خاں کی اہمیت بڑھتی گئی اور جلد ہی اُس حصے میں وہ ایک خاص اہمیت کا مالک بن بیٹھا۔ لیکن بدقسمتی سے اُس کو بھی صلبی اولاد نہ ہونے کا رونا تھا۔ اس لیے اُس نے بھی ایک ہفت سالہ لڑکے سید محمد علی کو اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ سید محمد علی، سید دلاور علی کا بیٹا تھا۔ سید دلاور علی مرہٹوں کے ایک حملے میں مقتول ہو چکے تھے اور اُن کی بیوہ اپنے بچے کو گود میں لے کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ داؤد خاں نے انھیں اس حالت میں پایا کہ ماں بھاگ دوڑ کی صعوبتوں سے غش کھا کے گر پڑی تھی۔ وہ اسی وقت مر بھی گئی اور داؤد خاں کو لڑکے نے اپنا نام خود بتایا۔ یہ محمد علی وہی لڑکا ہے جسے کٹھیر کی تاریخ نواب سید علی محمد خاں کے نام سے جانتی ہے، وہی نواب علی محمد خاں جو آج آنولہ میں آرام و ہمیشگی کی نیند سو رہے ہیں۔ یہ سنہ ۱۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے جو سنہ ۱۷۰۶ء کے مطابق ہے۔ سید علی محمد خاں کی تربیت جن ہنگامی حالات میں ہوئی ان حالات نے اُن کو ابتدا ہی سے بھاگ دوڑ، جفاکشی اور سپہ گری کا خوگر بنا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ہونہار لڑکا داؤد خاں کے قتل پر جو سنہ ۱۱۳۵ھ (مطابق سنہ ۲۳-۱۷۲۲ء) میں کمایوں کے راجہ کے ہاتھ سے ہوا، سترہ اٹھارہ برس کا تھا لیکن بڑے بڑے جیالے اور سرد و گرم عالم دیکھے افغان سرداروں نے اسی کو اپنا سردار چنا۔

بڑے بڑے جیالے افغان سرداروں سے مطلب یہ ہے کہ ۱۱۶۱ھ میں اور بقول رہیلکھنڈ گزیٹیر ۱۱۲۰ھ میں حافظ رحمت خاں ابن شاہ عالم خاں اور اُن کے چچا کے بیٹے دوندے خاں ابن حسن خاں بھی کھیڑا آکر داؤد خاں کی سرگروہی میں قسمت آزمائی کر رہے تھے۔ داؤد خاں کے معاملے میں تاریخ نے اپنے سبق کو پورے طور پر دہرایا تھا یعنی جس طرح داؤد خاں کو بیٹا بنا لینے کے بعد شاہ عالم خاں کی صلبی اولاد ہو گئی تھی داؤد خاں کے بھی ایک صلبی لڑکا خان محمد خاں ہو گئی تھی جو ۱۱۸۹ھ کے ایک معرکہ میں مقتول ہوا۔ اس کے بعد کے واقعات سے اس مقالے کو کوئی ربط نہیں۔ اس کے سوا کہ یہ سید محمد علی اپنے انتقال تک جو تین شوال ۱۱۶۲ھ مطابق ۱۴ ستمبر ۱۷۴۹ء کو واقع ہوا نواب سید علی محمد خاں بہادر والی کٹھیر بن چکا تھا اور مرکز یعنی دہلی سے ماہی مراتب، خطاب نوابی اور جاگیر سب عطا ہو چکے تھے۔

نواب سید علی محمد خاں نے چھ بیٹے اور کئی لڑکیاں چھوڑیں۔ اولادِ نرینہ کی تفصیل ترتیب وار یوں ہے: سید عبداللہ خاں، سید فیض اللہ خاں، سید سعداللہ خاں، سید محمد یار خاں، سید اللہ یار خاں اور سید محمد مرتضیٰ خاں۔ گویا نواب محمد یار خاں امیر نواب سید علی محمد خاں کے چوتھے بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے عبداللہ خاں اور اُن سے چھوٹے بیٹے فیض اللہ ہم بطن تھے اور باقی سب مختلف البطن۔ اپنے انتقال کے وقت نواب سید علی محمد خاں نے اپنی پگڑی حافظ رحمت خاں کے سر پر رکھ دی مگر انھوں نے اپنے سر سے اُتار کر عبداللہ خاں کے سر پر رکھ دی۔ پھر بھی نواب علی محمد خاں نے حافظ الملک کو اپنی اولاد کا محافظ اور نگراں بنا دیا اور خود نواب علی محمد خاں ۴۳ برس کی عمر پا کر دارالآخرت کو سدھار گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نواب علی محمد خاں کے مرتے وقت ان کی زیادہ تر اولاد صغیر سن تھی۔

نواب عبداللہ خاں نہ خاندان پرور تھے نہ اپنے سرداروں سے سلوک زیادہ بہتر تھا۔ جب شکایت حد سے زیادہ بڑھ گئی تو معمر افغان سرداروں نے یہ بہتر سمجھا کہ ملک کی تقسیم ہو جائے۔ چھ بھائیوں میں تین بھائی محمد یار خاں، اللہ یار خاں اور مرتضیٰ خاں کم عمر تھے اور تین بھائی عبداللہ خاں، فیض اللہ خاں اور سعداللہ خاں ملک کا کاروبار چلانے کے قابل تھے لہٰذا پورے ملک کو افغان سرداروں نے تین برابر کے حصوں میں تقسیم کر کے ایک ایک چھوٹا بھائی ایک ایک بڑے بھائی کے سپرد کر دیا۔ اس طرح کہ (۱) اونلہ، بداؤں، اُدیسیت اور رکوٹ وغیرہ اور اُن کے ملحقہ پرگنے نواب عبداللہ کو ملے اور مرتضیٰ خاں اُن کی تربیت میں دیے گئے۔ (۲) بریلی اور اہرات وغیرہ نواب فیض اللہ خاں کے حصے میں آئے اور نواب محمد یار خاں اُن کے سپرد ہوئے۔ (۳) مراد آباد وغیرہ سید سعداللہ خاں کو دیے گئے اور اللہ یار خاں اُن کے حصے میں آئے۔ یہ تقسیم ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) میں ہوئی۔ گویا یہ سب بھائی ۱۱۶۲ھ (۴۹-۱۷۴۸ء) سے ۱۱۶۷ھ یعنی پانچ سال بھی متحد نہ رہ سکے لیکن تقسیم کے بعد اس پر بھی ایک سال عمل نہ ہو سکا۔ غلطی یہ ہوئی کہ عبداللہ خاں اور فیض اللہ خاں چوں کہ ہم بطن تھے اس لیے آنولہ کے قلعے میں دونوں بھائی مقیم ہوئے۔ یہاں عبداللہ خاں کے متعلقین اور مصاحبین اور فیض اللہ خاں کے متعلقین اور مصاحبین میں فساد اور جھگڑے شروع ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ عبداللہ خاں ناراض ہو کر فرخ آباد، نواب احمد خاں بنگش کے پاس چلے گئے اور اس سفر میں نواب محمد یار خاں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

نواب احمد خاں کے درمیان پڑنے سے پہلی تقسیم منسوخ ہو کر علاقہ دوبارہ تقسیم ہوا۔ مگر اس وقت تک افغان سردار عبداللہ خاں اور محمد یار خاں وغیرہ کی سیرت کو بخوبی پرکھ چکے تھے اور کٹھیر میں ان کو اپنے مستقبل کی فکر دامن گیر ہو چکی تھی۔ لہٰذا یہ دوسری تقسیم جو ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۴ء) میں ہوئی اس طرح کی گئی کہ (۱) نواب سید عبداللہ خاں کو پورے علاقے کا حاکم تجویز کیا گیا اور اُن کے مصارف کے لیے آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ مقرر ہوئے۔ (۲) نواب فیض اللہ خاں کو شاہ آباد، رام پور اور چھاچھٹ ضلع بریلی کا علاقہ ملا۔ (۳) نواب سعداللہ خاں کو غالباً دھیانی، سہسوان اور شہداد پور وغیرہ ملے۔

نواب عبداللہ خاں کو آٹھ لاکھ سالانہ ادا کرنے کی صورت یہ ٹھہری کہ حافظ رحمت خاں نے تین لاکھ کا، دوندے خاں نے تین لاکھ کا اور دو لاکھ سالانہ کا نتیجہ زاں خانساماں نے ذمہ لیا اور اس کے عوض دوندے خاں کو بسولی، شاہی سنگر، مراد آباد، بجنور، کاشی، ٹھاکردوارہ، سورج پور اور اسلام نگر وغیرہ کا علاقہ ملا۔ فتح خاں خانساماں کو ادیسیت، بداؤں اور آنولہ وغیرہ ملے۔ اہرات وغیرہ کا علاقہ بخشی سردار خاں کو دیا گیا۔ باقی تمام ملک حافظ رحمت خاں نے اپنی نگرانی اور اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس طرح جو علاقہ عبداللہ خاں کے قبضے سے نکلا وہ آٹھ لاکھ سالانہ کی آمدنی سے کہیں زیادہ کا تھا۔ اس تقسیم میں نواب علی محمد خاں کے بیٹوں سے انصاف نہیں ہوا بلکہ افغان سرداروں اور خصوصاً حافظ الملک اور اُن کے چچیرے بھائی دوندے خاں زیادہ فائدے میں رہے تھے۔ اس کے بعد ان سرداروں نے اس طرح سکونت اختیار کی کہ دوندے خاں بسولی میں، فتح خاں

اوسیت میں حافظ رحمت خاں پیلی بھیت میں (جس کا نام انھوں نے حافظ آباد رکھا) بخشی سردار خاں آنولہ میں اور فیض اللہ خاں بریلی میں اقامت پذیر رہے جہاں حافظ رحمت خاں کے اہل و عیال تھے اور جہاں کا نگراں یا منتظم حافظ رحمت خاں کا بیٹا عنایت خاں تھا۔ اُس نے ایک دن دیکھا کہ بریلی کی جس حویلی میں فیض اللہ خاں رہتے ہیں وہاں اُن کی نوبت بج رہی ہے۔ اِس پر اُس نے نوبت رکوا دی اور نقارے پھاڑ ڈالے۔ یہ صورت دیکھ کر فیض اللہ خاں شاہ آباد چلے آئے اور حافظ الملک نے اُن کے چلے جانے پر کوئی توجہ نہیں کی۔ تاریخ اس دوسری تقسیم میں علی محمد خاں کے تین چھوٹے بھائیوں کے متعلق خاموش ہے لیکن خیال ہے کہ ان تینوں بھائیوں کا خاطر خواہ انتظام ہوا تھا۔ اس کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہمیں غرض ہے نواب محمد یار خاں سے۔

نواب محمد یار خاں کے متعلق ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ اول تو وہ آنولہ میں رہے پھر جب مُلک پر مرہٹوں کی یلغار عام ہو گئی تو آنولہ سے ایک قریب کی بستی ٹانڈے میں آ گئے۔ بہرحال وہ شاہ آباد اور رام پور نہیں آئے، اور جس طرح عبداللہ خاں کے ساتھ فرخ آباد چلے گئے تھے اسی طرح دوبارہ تقسیم کے بعد بھی فیض اللہ خاں سے دور رہے۔ تاریخ میں نواب محمد یار خاں کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے۔ ایک جگہ تو نواب احمد خاں بنگش کی حمایت میں دو ہزار سواروں سے دادِ شجاعت دیتے نظر آتے ہیں۔ دوسری بار ان کا مفصل ذکر ۱۷۷۴ء کے اس حملے کے سلسلے میں ملتا ہے جو شجاع الدولہ (نواب وزیر اودھ ولد صفدر جنگ) اور انگریزوں نے متحد ہو کر افغانی علاقوں پر کیا لیکن اس ذکر سے قبل کچھ باتیں اور قابلِ ذکر ہیں جن سے نواب محمد یار خاں کی مالی پوزیشن واضح ہوتی ہے۔ حافظ رحمت خاں نے احمد خاں بخشی سے نواب محمد یار خاں کو دو لاکھ روپے سالانہ دلانا چاہے فیض اللہ خاں کی مداخلت سے یہ معاملہ طے ہوا لیکن احمد خاں نے آنولہ پہنچ کر اس کی تعمیل نہیں کی اور سات ہزار روپے سالانہ جو دیتے تھے وہ بھی بند کر دیے۔ فتح خاں خانساماں سے نواب محمد یار خاں کو باسٹھ ہزار روپے سالانہ ملتے تھے۔ اُن پر ۱۱۸۷ھ (۱۷۷۳ء) میں فالج گرا۔ آخر اُن کا ملک بھی بیٹوں پر تقسیم ہوا اور نواب محمد یار خاں کے باسٹھ ہزار روپیہ سالانہ خانساماں کے بیٹے اعظم خاں کے حصے میں آ گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری تقسیم کے موقع پر نواب علی محمد خاں کے باقی تینوں بیٹے بھی محروم نہ رہے تھے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ نواب محمد یار خاں امیر کبھی مالی طور پر پریشان نہ رہے۔ وہ صاحبِ فوج بھی تھے لیکن فیض اللہ خاں سے اُن کے تعلقات کسی وقت خوش گوار نہیں رہے۔

انگریزوں نے شجاع الدولہ سے مل کر افغانوں سے جو لڑائی لڑی اس میں نہ انگریز حق بہ جانب تھے نہ شجاع الدولہ۔ بات یہ تھی کہ روہیلہ ممالک پر آئے دن مرہٹے تگ و تاز کرتے رہتے تھے۔ تنگ آ کر حافظ رحمت خاں اور دوسرے سرداروں نے شجاع الدولہ سے یہ طے کیا کہ افغانوں کے ملک پر مرہٹوں کے حملوں کو روک دیں تو سب مل کر اُن کو چالیس لاکھ روپیہ ادا کریں گے۔ مرہٹوں نے اس حملے میں گنگا اور جمنا کے درمیان حافظ صاحب کا جو علاقہ تھا اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب شجاع الدولہ کی مداخلت سے مرہٹے واپس جانے لگے تو اس پر شجاع الدولہ نے اپنا قبضہ کر لیا۔ یہ علاقہ چالیس لاکھ سے زیادہ کی قیمت کا تھا۔ حافظ رحمت خاں اپنی جگہ یہ سمجھتے رہے کہ یہ علاقہ چالیس لاکھ کی وجہ سے گیا۔ لہٰذا جب نواب وزیر نے ان پر چالیس لاکھ کا تقاضا کیا تو انھوں نے جواب میں لکھ دیا کہ میرا جو علاقہ مرہٹوں سے نواب کے قبضے میں آیا ہے اسے واپس کیا جائے تو میں یہ رقم ادا کر دوں۔ اس پر شجاع الدولہ نے بائیس لاکھ روپیہ انگریز گورنر جنرل ہیسٹنگز کو دے کر ان سے افغانی علاقہ فتح کرا دینے کا عہد لے لیا بکسر کی لڑائی کے بعد (جس میں شجاع الدولہ انگریزوں کے خلاف شاہ دہلی کے ساتھ ہو کر لڑے تھے) شجاع الدولہ انگریزوں کی حمایت میں آ گئے تھے اور کمپنی سے ان کا عہد نامہ ہو چکا تھا کہ کوئی حریف ان پر حملہ آور ہوگا تو انگریز اس سے ان کو بچائیں گے۔ لیکن یہ معاہدہ حریف حملہ آور کی حد تک تھا۔ اس میں اس کا ذکر نہ تھا کہ شجاع الدولہ کسی پر حملہ کریں گے تو بھی انگریز ان کا ساتھ دیں گے۔ لیکن روپیہ کی طاقت ناکردنی کو کردنی اور ناگفتنی کو گفتنی بنا دیتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کشمیر میں شجاع الدولہ اور انگریز دونوں روہیلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو اندیشے کی نظر سے دیکھتے تھے اور دونوں کا خیال تھا کہ اس ابھرتی ہوئی طاقت کو نہ دبایا گیا تو وہ ایک دن انگریزوں کے تسلط کے خلاف بھی آہنی دیوار کی طرح کھڑے ہو جائیں گے۔ اس لئے نواب شجاع الدولہ کی پیش کش اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گئی۔

شجاع الدولہ نے صرف انگریزی امداد پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ انگریزی فوج کے کپتان سے مشورہ کر کے افغان سرداروں کو توڑنا بھی شروع کیا۔ احمد خاں و محمد خاں پسران بخشی سردار خاں، احمد خاں و محمد اعظم خاں پسران فتح خاں کو ہموار کیا گیا۔ محب اللہ خاں اور فتح اللہ خاں اولاد دوندے خاں سے قرآن درمیان

میں لاکے یہ اقرار ہوا کہ فتح کے بعد حسب مرضی تمھارے ساتھ سلوک ہوگا۔ ان تمام پیش بندیوں سے تیار ہو کر شجاع الدولہ نے ۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو لاہی کھیڑے کے میدان میں روہیلوں سے معرکہ آرا ہوئے۔ احمد خاں پسر بخشی سردار خاں بھاگنے کا غلغلہ کرتا ہوا بھاگ نکلا۔ روہیلوں میں اس سے ہلچل پڑ گئی۔ حافظ رحمت خاں شہید ہوئے اور شجاع الدولہ اور انگریزوں کی فتح ہوئی جس کے بعد لاہی کھیڑے کا نام فتح گنج رکھا گیا۔ اس لڑائی میں نواب محمد یار خاں کا دل سینے۔ جب فیض اللہ خاں اور باقی ماندہ افغان فوجیں بھاگ کر لال ڈانگ کے پہاڑی علاقے میں جمع ہوئیں تو نواب محمد یار خاں ٹانڈے سے نکلے اور بسولی اور سنبھل ہوتے ہوئے ڈال ڈانگ کو چلے۔ فیروز پور میں ان کا سالا محمد علی خاں ولد پائندہ خاں ملا اور کہا کہ لال ڈانگ کا راستہ فدوش ہے آپ کا فیض اللہ خاں کے پاس پہنچنا آسان کام نہیں۔ غرض نواب محمد یار خاں فیروز پور سے واپس ہو کر آنولہ میں مقیم ہوگئے اور اپنے اعزا سے شورہ کے بعد شجاع الدولہ کے پاس سنونہ کیمپ میں چلے گئے۔ مرزا آغا اور مرزا رمضانی مصاحبان شجاع الدولہ کی معرفت شجاع الدولہ کے سامنے پیش ہوئے۔ دو ہزار روپیہ نقد اور جیغہ و سرپیچ نذر میں دیے۔ شجاع الدولہ بڑے اخلاق اور دلجوئی سے پیش آئے۔ اپنے کیمپ میں قیام کا حکم دیا بلکہ شیدی محمد بشیر کو آنولہ کی ضبطی اور لوٹ کا حکم دیتے وقت محمد یار خاں کی حویلی کو لوٹ اور ضبطی سے مستثنیٰ قرار دیا۔ چنانچہ آنولہ کی لوٹ میں بہتوں نے یہاں پناہ لی۔

آخر ۷ اکتوبر ۱۷۷۴ء کو انگریز کمانڈر درمیان میں پڑا اور شجاع الدولہ اور روہیلوں میں صلح ہوگئی۔ اس وقت محمد یار خاں شجاع الدولہ کے کیمپ میں تھے اور صاحب فراش تھے۔ فیض اللہ خاں نے ان کو بھی اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت لے لی۔ یہ خبر پاکے محمد یار خاں نے شجاع الدولہ کو عرضی بھیجی کہ میں بے جائداد لئے آپ کے پاس سے جدا نہ ہوں گا۔ اس پر شجاع الدولہ نے حکم لکھا کہ :

"فی الحال درمیان ما و نواب فیض اللہ خاں ہیچ تفاوت نماندہ۔ شمارا بخواہش آرزوئے تمامی می برند البتہ یک چیزے جائداد مقرر خواہد نمود۔ بعد چندے در فیض آباد پیش ایں جانب بہ پایند، از فضل الٰہی جائداد مقرر خواہد شد۔"

نواب محمد یار خاں پہاڑی علاقے میں دو مہینے سے بیمار تھے۔ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت تک نہیں تھی۔ حکیم فیض محمد اور حکیم کبیر سنبھلی معالج تھے۔ جب ان کو پالکی میں ڈال کے لے چلے تو ہر منزل میں شیو پرشاد اپنے دیوان پر بگڑتے تھے کہ مجھے رام پور کیوں لئے جاتے ہو۔ حروف مغائرت زبان سے ادا کرتے تھے۔ غرض اسی حالت میں رام پور لائے گئے اور انھیں کرم خاں رزر کی حویلی میں رکھا گیا۔ پچاس ہزار روپیہ سالانہ فیض اللہ خاں نے ان کا وظیفہ مقرر کیا لیکن محمد یار خاں کا دل ان سے صاف نہ ہوا۔ چنانچہ مواجہ میں بھی کچھ سخت کلامی کی۔ شعبان رمضان اور شوال میں علیل رہے۔ جس شام کو ذیقعد کا چاند رونما ہوا یعنی غرہ ماہ ذیقعد [illegible] کو مطابق ۲۰ جنوری [illegible] کے سل اور استسقا کے مرض میں رحلت کی اور نواب محمد علی خاں کے مقبرے میں جو محلہ مدرسہ کہنہ میں ہے اور شاہ بی بی کا مقبرہ کہلاتا ہے دفن کئے گئے۔ ان کے برابر ان کے بیٹے احمد یار خاں افسر کی قبر ہے چھوٹے چھوٹے بچوں کی دو قبریں اور ہیں۔ مقبرے کی مغربی دیوار کے پاس باہر کی جانب ان کے استاد قائمؔ کی قبر ہے۔

یہ تھے ہمارے نواب محمد یار خاں جو فیض اللہ خاں سے اتنے ناراض ہوگئے تھے کہ جس طرح محبت خاں وغیرہ پسر حافظ رحمت خاں اپنے والد کے مقبوضہ علاقے کی امیدواری میں شجاع الدولہ کے اختیار میں آگئے تھے یہ بھی فیض اللہ خاں کی گدی کے امیدوار ہو کر شجاع الدولہ کے دامن میں پناہ گیر ہوئے۔ اب ایک شاعر کی حیثیت سے ان کا کردار دیکھئے۔ مصحفی اپنے تذکرہ ہندی گویاں ([illegible]) میں ان کے متعلق لکھتے ہیں :

"امیرے بود از قوم افاغنہ۔ در علم موسیقی و ستار زدن یگانۂ روزگار بود۔ در رعنائی و زیبائی جوانے بود باغ و بہار۔ ہزارہا دریں کار برباد کردہ استادان ایں فن از داد و دہش بسیار چہ منتہا۔۔ نہادہ در ایامیکہ بہ ترغیب حکیم کبیر سنبھلی شوق شعر ہندی دامن دلش را بسوئے خود می کشید خطے بہ طلب میر سوز و مرزا سودا نوشتہ روانہ کرد۔ چوں دریں ایام ایں ہر دو بزرگ در سرکار مہربان خاں رند تخلص بہ صیغہ شاعری عز امتیاز داشتہ از فرخ آباد آمدن ایشان بہ ٹانڈہ کہ موضع بود و باش نواب بود اتفاق نیفتاد۔ آخر کار میاں محمد قائم کہ در آں ایام بسولی بود حسب الارشاد آمدہ بشرف ملازمت آں والا جناب رسیدند و بدرماہہ یک صد روپیہ عز امتیازش دادہ باستادی برداشت۔ علی ہذا القیاس دیگر سخن سنجان مثل قدرتی لاہوری و میاں محمد نعیم نعیم تخلص و علی شاہ پروانہ مرادآبادی و میاں عشرت نڈال و حکیم کبیر صاحب کہ از قدیم در سرکارش بود حقیر فقیر مصحفی از حاضران مجلس او بود و ہر وقت کہ غزل طرح می نمود بسرانجام می رسانید ...... نواب موصوف بعد از شکست حافظ رحمت خاں با جل

طبعی در گزشت ہ[1]

اب دیکھنا یہ ہے کہ دوسرے تذکرے نواب محمد یار خاں امیر کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ مجموعۂ نغز (ص۴۴) میں درج ہے:

" نواب محمد یار خاں بہادر فرزند علی محمد خاں روہیلہ۔ گویند کہ اصلش از قوم جٹ (جاٹ) است۔ داؤد خاں افغان فوج دار مرادآباد (داؤد خاں کبھی مرادآباد کا فوج دار نہیں ہوا) کہ لاولد بود بحلیۂ اسلام محلّی ساختہ (مراد علی محمد خاں سے ہے) بپسر خواندگی برداشت و بعضے گویند کہ وے (داؤد سے مراد ہے) از غلامان سید حافظ الملک رحمت خاں شہید مرحوم و مغفور بود۔ .... مختصر کلام نواب محمد یار خاں امیر شاگرد قیام الدین علی قائم بودند و بیش تر از شعرائے آں وقت بہ ملازمی سرکار حشمت مدار ایں نواب کام گار نعمت بار بودند و مجلس مشاعرہ بدولت سرائے خود منعقد می ساخت۔ بخیلے نیک ذاتے و ستودہ صفاتے نرد محبت بہر کس می باخت۔ بہر حال در عہد خود داد مردمی و بزرگ منشی دادہ . . . . "

طبقات الشعرا (ص۱۹۵) پر مجموعۂ نغز کا ہو بہو ترجمہ ہے۔ سخن الشعرا (ص۴۷) پر ایک قدم اور غلطی کی طرف بڑھایا گیا ہے:—

" امیر تخلص نواب علی محمد خاں، قوم افغان، باشندہ دہلی شاگرد قیام الدین علی قائم، موسیقی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے ان کے فرزند نواب محمد یار خاں کا امیر تخلص لکھا ہے۔"

قلمی تذکرۂ شعرائے رام پور میں بھی امیر کے متعلق صفحہ ۶ پر یہی ذکر ملتا ہے۔ یہی حال یادگار الشعرا (ص۱۴۲) اور انتخاب یادگار (ص۴۲) کا ہے کہ ان سے کوئی نئی روشنی نہیں ملتی۔ گلشن بے خار (ص۲۷) پر لکھا ہے:

" امیر تخلص نواب علی محمد خاں از طائفۂ جلیلۂ افغان است۔ نسبت تلمذ از قیام الدین علی قائم دارد۔ بیش تر از اہل سخن زلہ ربائے خوان نوالش بودند و بزم شاعری می آراست . . . . "

گویا کئی اہلِ تذکرہ نے امیر کو نواب علی محمد خاں لکھا ہے جو غلط ہے۔ خمخانۂ جاوید (جلد اول ص۲۱۴) پر امیر کا مفصل ذکر ملتا ہے:—

" جوان مرزا منش، نازک طبع صاحب مروّت و خوش سلیقہ، جرأت و سخاوت میں اپنے اماثل میں ممتاز و عالی حوصلہ و فیض رسانی میں زبدۂ روزگار تھے۔ فن موسیقی میں یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے۔ نکتہ فہم و نکتہ سنج و قدر دانِ اہلِ کمال تھے۔ تھوڑی مشق میں ریختہ میں بھی اچھا ملکہ حاصل کر لیا تھا۔ بڑے خوش تلاش اور مضمون آفرین تھے ...."

اس کے بعد وہی مصحفی اور قائم کی صحبتوں کا ذکر ہے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ

---

[1] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے مصحفی کے مندرجۂ بالا بیان میں جن اہم شخصیتوں کا ذکر آیا ہے کچھ لکھ دیا جائے۔ میر سوز، مرزا سودا، قائم وغیرہ تو بہت اہم ہیں ان کے متعلق ہر شخص کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔ فدوی پر ایک جداگانہ مقالہ لکھا جائے گا۔ میاں محمد نعیم نعیم تخلص کے حالات تو نہیں مل سکے البتہ نواب زادہ کریم اللہ خاں ابن نواب فیض اللہ خاں کی قلمی بیاض میں اُن کا کچھ کلام ملا ہے جو درج ذیل ہے۔ یہ بیاض ۱۲۴۳ھ سے ۱۲۴۶ھ تک مرتب ہوئی۔

دشتر کہ بے شک ہے اس دہر میں خرابی — دل دادہ پشیماں کوئی مجھ سا نہ ہوا ہوگا
از بس کہ جنوں کی میں دیکھا ہے بہت عالم — لیکن کوئی ہم سا بھی رُسوا نہ ہوا ہوگا
جیسا کہ میں دیوانہ دیکھا ہے نعیم اپنا — ایسا تو کسی کے تیں رسوا نہ ہوا ہوگا

گئے تھے کل ہم جو سیر کے تیں عجب طرح کی بہار دیکھی — مثال آتش کے کوہ و صحرا گلوں سے سارا دمک رہا تھا
کھلا تھا نرگس کشادہ نینن دِکھن کو تیرے چمن کے اندر — کہ تعریفِ حسن کر زُلفُ کی تیری تمام سنبل جھک رہا تھا
نعیم کل تو نہ تھا یہاں تو نہیں تو زور ہی تو دید کرتا — کہ یار تیرا شراب پی کر نشے میں اپنے بہک رہا تھا

کیوں کر کوئی سلامت کوئے بتاں سے نکلے — جب نخل ہو دریدہ تب گلستاں سے نکلے
عاری تھا قافلہ سب فریاد سے ہماری — بے تابیوں کے مارے ہم کارواں سے نکلے

(سنہ دِکھن = دیکھنے کو۔ زُلفُ نظم ہوا ہے۔ زور خوب سی کے معنی میں)

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

نواب محمد یار خاں امیر کو مشق شعر و سخن کے لئے کتنا وقت ملا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ شعر کہنے کا چسکا ان کو حکیم کبیر سنبھلی کے ان کی ملازمت میں آنے سے پڑا جس کی کوئی صحیح تاریخ ہمارے سامنے نہیں لیکن ۱۱۸۵ھ میں ضابطہ خاں کو سکرتال پر شکست ہوئی۔ اس کے بعد مرہٹوں کی دار و گیر کے خوف سے انھوں نے آنولہ چھوڑا کیوں کہ آنولہ میں ان کی حویلی جو نوابوں کی حویلی کہلاتی تھی مرجع خاص و عام تھی اور اس جگہ ان کا مال و متاع محفوظ نہیں تھا۔ آنولہ چھوڑ کر وہ ٹانڈے میں جا بسے جو ایک گاؤں تھا اور اس جگہ وہ نسبتاً محفوظ اور گمنام زندگی بسر کر سکتے تھے۔ یہیں مصحفی گاؤں میں رہنے سے گھبرائے اور انھوں نے لکھنؤ جانے کا خیال ظاہر کیا۔ بس یہی وقت تھا کہ امیر نے سودا کو بلایا اور سودا نے جواب میں وہ مشہور قطعہ لکھ کر بھیجا کہ "سودا پے دنیا تو بہر سو کب تک" (شمخانۂ جاوید) عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ قطعہ سودا نے شجاع الدولہ کو بھیجا تھا مگر ایسا نہیں اگر سودا یہ قطعہ شجاع الدولہ کو لکھتے تو نواب احمد خاں بنگش کی موت اور مہربان خاں کے زوال پر لکھنؤ جانے کا خیال کیوں کرتے۔ ان کو محسوس ہوتا کہ وہ نواب شجاع الدولہ کو ایسا سخت جواب دے چکے ہیں۔ نواب احمد خاں کا انتقال ہی ۱۱۸۵ھ کا واقعہ ہے۔ مصحفی اور سودا کا لکھنؤ جانا بھی غالباً اسی سن کا واقعہ ہے۔ سودا کے قطعہ سے جو قناعت پسندی ظاہر ہوتی ہے وہ بہت کچھ بناوٹی ہے کیوں کہ وہ فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رند کے زوال کے بعد ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ اصل یہ ہے کہ روہیلکھنڈ میں مرہٹوں کی دار و گیر کے خوف نے ان کو امیر کے پاس نہ آنے دیا۔ بہرحال ۱۱۸۵ھ میں مصحفی لکھنؤ چلے گئے اور ۱۱۸۸ھ میں امیر کا انتقال ہوگیا۔ گویا قائم کچھ کم تین سال ان کے استاد رہے۔ اگر یہ قیاس کر لیا جائے کہ حکیم کبیر سے بھی امیر کو کوئی فیض پہنچا تو بھی اصل شوق کی ابتدا وہیں سے مانی جائے گی جہاں سے مصحفی بطور استاد کے ان کی صحبت میں داخل ہوئے۔ اس کی تاریخ زیادہ سے زیادہ ۱۱۸۰ھ سمجھ لیجئے۔ تو نتیجہ نکلتا ہے کہ کل آٹھ سال امیر کو مشق سخن کے لئے ملے۔

امیر کا دیوان کہیں نہیں پایا جاتا حالاں کہ ۱۸۵۷ء میں جو انقلاب ہوا اس میں ان کا ٹانڈے کا گھر بھی محفوظ رہا اور آنولہ کی حویلی بھی۔ اس لئے میرا قیاس ہے کہ امیر کا دیوان جو کچھ بھی تھا اور جتنا بھی تھا ٹانڈے سے آنولہ آنولے سے مونہ مونہ سے لال ڈانگ اور لال ڈانگ سے رام پور کے پُر آشوب اور خطرناک سفر میں کہیں انقلاب کی نذر ہو کر تلف ہو گیا اور اب ان کا جس قدر کلام پایا جاتا ہے تذکروں میں ہی پایا جاتا ہے۔

امیر کس درجہ کے شاعر تھے اس کا اندازہ کرنے کے لئے میں یہاں امیر کے صرف پانچ شعروں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنے کی کوشش کروں گا۔

(حاشیہ بہ سلسلہ صفحہ گزشتہ) اُس دے سے کوئی رُوتا نکلا تو کچھ سمجھ کر پوچھا نہ میں کہ کیوں تم گریہ کناں سے نکلے

علی شاہ پروانہ مراد آبادی کے متعلق مصحفی کے تذکرۂ ہندی گویان میں ص۴۳ پر یہ الفاظ ملتے ہیں: "علی شاہ پروانہ مراد آبادی کہ پروانہ تخلص می کرد، جوان شوریدہ سر و قلندر وضع بود۔ بنگ و شراب بہ شدت می زد و بہ کسب شغل نفی و اثبات وغیرہ راہے می داشت۔ گاہے از او کشف کہ اہل کمال را باشد مشاہدہ می کردم۔ معرفت میاں محمد قائم در سرکار نواب محمد یار خاں کہ ذکر ایشاں گزشت او ہم سلسلہ شعر اجارے می داشت و چیزے کہ موزوں می کرد از نظر ایشاں می گزرانید۔" یادگار شعرا (میں مردانہ کا نام پروانہ علی لکھا ہے جو غلط ہے۔ اس تذکرے میں یہ بھی لکھا ہے کہ حال ہی میں دُنیا سے کنارہ کش ہو گیا ہے (ص۳۱)۔ طبقات الشعرا صفحہ ۱۴۲ پر ہے: "پروانہ تخلص علی شاہ مراد آبادی جو کہ اک جوان تھا قلندر مشرب وارستہ مزاج بے نوایانہ ایام بسر کرتا تھا اور استعمال مسکرات سے کچھ پروا نہیں رکھتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص دلوں کے بھید جانتا تھا۔ شاگرد ہے ... قائم کا"۔ خمخانۂ جاوید میں بھی پروانہ علی نام لکھا ہے جو غلط ہے (ص۳ جلد چہارم) البتہ خمخانۂ جاوید سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں یہ مراد علی حسرت کا شاگرد تھا اور آخر کار دیوانہ ہو گیا تھا۔ ممکن ہے شراب اور بھنگ کی کثرت سے عالم دیوانگی تک پہنچا ہو۔ اس کے یہ چار شعر تذکروں میں ملتے ہیں:-

آج ثابت نہ رہے دل نہ کوئی جان درست — اُس کے مژگاں نے کیے پھر یہ دو پیکان درست

کیوں کہ پیغام مجھے اس کا زبانی آوے — نام سنتے ہی مرا جس کو گرانی آوے

جھوٹ کہتا ہے تو قاصد یہ زبانی پیغام — مجھ کو باور نہیں جب تک نہ نشانی آوے

ہمت حضرت قائم سے اگر ہو امداد — چند ایام میں کر لیجیے دیوان درست

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

تھرتھراتا ہے آج تک خورشید   سامنے تیرے آگیا ہوگا

یہ شعر مجموعۂ نغز نے دیا ہے اور ظاہر ہے کہ مجموعۂ نغز کا رویہ امیر کے خاندان سے تعلق اچھا نہیں۔ گویا اس شعر نے مخالفین کے حلقے سے داد پائی ہے۔ سورج کے حرکت کرنے کی یہ شاعرانہ تاویل واقعی اپنا جواب آپ ہے۔

سب خبر رکھ پر ایسی کر باتیں   جیسی کرتے ہوں بے خبر باتیں

اس شعر کو اردو کے ایک بڑے شاعر (غالباً حسرت موہانی) جب بھی پڑھتے اُدبیہ دجایا کرتے۔ فلسفۂ در حلمت پر ایک طعن اور بھی سن لیجیے۔

ماہیت خلق خوب سمجھے   پر آپ سے بے خبر گئے ہم

درحقیقت بھی یہ ہے کہ اس موقع پر بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے۔ ایک شعر ربش ہے ؎

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن   مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

غلطی سے یہ شعر میر سے منسوب کرکے اس طرح پڑھا جاتا ہے ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر   مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

لیکن حقیقت میں یہ شعر نہ میر تقی میر کا ہے نہ امیر مینائی کا (جیسا کہ بعض حضرات کو شبہ ہوا ہے) بلکہ نواب محمد یار خاں امیر کا ہے۔

اب نواب محمد یار خاں امیر کے کچھ ایسے اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو مختلف تذکروں میں درج ہیں ؎

بیٹھے بٹھائے کوچۂ قاتل میں لے گیا   یارب برا ہو اس دل خانہ خراب کا
ساقی گزک کی کچھ نہیں حاجت شراب سے   ہم دل جلوں میں آپ مزہ ہو کباب کا
جنس طاعت سے تو کچھ پاس نہیں اپنے امیر   مگر احمد کا ہوں میں اور ہے احمد میرا
تھرتھراتا ہے آج تک خورشید   سامنے تیرے آگیا ہوگا
کیا تو نے دیا تھا ہم کو ساقی   شیشے میں تو آہ کچھ نہ نکلا
اس منہ سے الہ کچھ نہ نکلا   جز نالہ و آہ کچھ نہ نکلا
جس سر میں ہو جوں حباب جوشی   واں زیر کلاہ کچھ نہ نکلا
کوئی گزر ترے کوچے میں کر گیا ہوگا   جو گزرا ہوگا تو جی سے گزر گیا ہوگا
نہ جانے شور ہے دریا میں کس تابندہ گوہر کا   نہ آب صدف میں کو تبدہ سر ہی گوہر کا
شکست و فتح میاں اتفاق ہو لیکن   مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا
یاد کرنا ہی مرا آپ کو منظور نہ تھا   گو کہ شب ... تو تمھ ... تھا
شوخیاں اپنے لڑکپن کی نہ کچھ پوچھ میاں   کونسا دل تھا کہ ہاتھوں سے ترے چور نہ تھا
اٹکی ہے آج صبح سے در پر مری نگاہ   کیا جانے منتظر ہوں میں کس کے قدم کا

(حاشیہ بسلسلہ صفحۂ گزشتہ)

میاں عشرت نزال چوں کہ غزال نہیں نزال تھے اس لیے ان سے بھی تذکرہ نویسوں نے تغافل برتا۔ حکیم کبیر سنبھلی کا ذکر کئی تذکروں میں ہے۔ مصحفی کہتے ہیں: "شیخ انصاری بود، کبیر تخلص می داشت۔" انھیں کی کوشش سے ٹانڈے کی بزم سخن قائم ہوئی۔ قائم ٹانڈے میں آئے۔ نواب محمد یار خاں کو انھوں نے ہی اردو شاعری کی طرف مائل کیا اور آخر تک نواب موصوف کا ساتھ دیا۔ چناں چہ جب شجاعت الدولہ کے کیمپ میں نواب محمد یار خاں کی حیثیت ایک سیاسی نظربندکی سی تھی اور وہ بیمار تھے تو یہی حکیم ان کے معالج تھے۔ یہاں دو قیاس پیدا ہوتے ہیں، اول تو یہ کہ جس طرح قائم نواب محمد یار خاں کے بعد ان کے بیٹے نواب احمد یار خاں اکبر کے یہاں اپنے مشاہرۂ سابق پر بحال رہے اور یہیں آخر کو خاک میں مل گئے اسی طرح حکیم صاحب رام پور کے کسی گوشے میں گم نامی کی خاک کے اندر دبے ہوئے پڑے آرام و سکون کی نیند سوتے ہوں۔ یہ قیاس قائم کی مثال سامنے ہوتے ہوئے غالب [illegible] ہے۔
دوسرا قیاس یہ ہے کہ امیر کے بعد حکیم صاحب اپنے وطن سنبھل چلے گئے ہوں۔ ان کا ایک شعر اہل تذکرہ نے دیا ہے:

ایک ہی یار سے دم ناک میں آیا ہے کبیر   زیست معلوم اگر ایسے ہی دو چار سے ملے

لیکن نواب زادہ کریم اللہ خاں کی قلمی بیاض جس کا ذکر اسی نوٹ میں آچکا ہے۔ ان کی کئی غزلیں ملتی ہیں جن کا انتخاب درج ذیل ہے:

سب سے جگت میں کر چکا اخلاص   کوئی پایا نہ یار با اخلاص
نا کفر سے غرض ہے نہ اسلام سے غرض   رکھتا ہوں اس کی زلف سیاہ فام سے غرض
دے جام جم فلک جسے چاہے تو شوق سے   اپنے تیش تو مے سے ہے اور جام سے غرض
جنوں میں آتش غم میں شب دلز   کہیں چھوٹے ہے اے ظالم ترا ربط

(بقیہ حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

سایہ ترا میں چھوڑ کے جاؤں کہاں امیر
کہاں کی عمر۔ کس کی زیست یہ رب
کیوں سروکس کی پامال میں دیکھی بو کیسی
اس زیست پہ مانند حباب اتنی ہوس آج
دیتا تو ہے تو مجھ پہ ستم نیک یہ ڈر ہے
پستی طلب کر۔ آپ کو چاہت ہے گر بلند
یوسف دل نہ جان کی خاطر
جی بچی سے کوئی۔ یہ ہم نے دیا
داغ دل سے چلے گلی سے تری
ہم نے کیا امید وفا ہے مری تیغ
ہے فردا کا یہ وعدہ کیا قیامت
کیوں کسل کچھ خبر ہے تجھے بھی کہ مشکل ہو رحج
ما بہت خلق خوب سمجھے
سب خبر رکھو یہ اپنی کر باہیں
آپ کچھ غیروں کو عجب سمجھے۔ تم کہتے ہیں
آج کیوں دیتے ہو۔ ہونٹوں میں چبا کر گالی
اپنی ہستی یہ ہیں موقوف جہاں کے جھگڑے

ہوتے بھلا کے کون ہو مشتاق دم کا
حباب آتا ہے مجھ کو دیا نفس کا
جاتا ہے جس ادا سے مرا خوش خرام آج
ہوتا ہے ہوا گل کو۔ جیسے تن میں نفس آج
یہ آہ مری کرتی ہے کمبخت اثر جلد
جب تخم زیر خاک ہو تب ہو شجر بلند
مر مرتے ہیں آن کی خاطر
کیا کریں اس جوان کی خاطر
چاہیے کچھ نشان کی خاطر
بولا تباں سے شیوۂ مہر و وفا غلط
نہیں عاشق کو تیرے آج ہی کل
جائیں گے کس دل سے کہ ہیں آئے کہاں سے ہم
پر آپ سے بے خبر گئے ہم
نصیحت کرتے ہیں بے خبر باتیں
یہ اگر جھوٹ ہو۔ ہم ہاتھ تسلیم کہتے ہیں
آپ تو بندے پہ یہ روز کرم کہتے ہیں
مٹ گئے آپ ہی جس وقت تو پھر نام کہاں

مثل حباب گو کہ یک سر ہوں پر امیر
تاب کیا آئینہ کو ہووے مقابل تیرے
تیرے گھر جانے سے یاں اپنا تو گھر جاتا ہے
ہائے سرخی تیرے رخسار کی ہنگام عتاب
کن حسرتوں سے چھوڑ کے ہم ہیاں چلے
گر وقت ذبح نالہ کیا میں تو کیا ہوا
بھول کر بھی نہ کبھی عشق کا لونگا پھر نام
دعوت ایذا ہمیں ہے شور حشر
جوں نقش قدم ہم کو بستی ہے ہماری
سچ کہیو امیر آج ملا کیا نہیں وہ شوخ
جاہ دنیا پہ اعتماد ہے کیا
لے وہ مجرا ترا گر آج امیر
سرخ چشم اتنی کہیں ہوتی ہے بیداری سے
وقت رخصت کی ترے اومرے جی کے دشمن
بس میں آیا جو تمہارے سے چاہو جو کرو

ہے حل عقدہ و مہر مجھے دم قدم کے ساتھ
سامنے ہو کے ترے شمس و قمر دیکھیں تو
او مری جان کے دشمن تو کدھر جاتا ہے
جتنا بگڑے ہے تو اتنا ہی سنور جاتا ہے
آئے تو ہم سبک تھے پہ کتنے گراں چلے
پیارے کسی کا ہاتھ۔ کسی کی زباں چلے
اب کے گر جان سے چھوٹے ہے تری یاد مجھے
خوش پڑے ہیں اپنے اکرام سے
اک بادشے تجھ کے میں ہم بین نشاں سے
کچھ تو نظر آتے ہو ہمیں یار خفا سے
مہر بعد از عروج ڈھلتا ہے
تو یہ بندہ تجھے سلام کرے
لہو اترا ہے تری آنکھ میں خونخواری سے
تھام تھام آج رکھا دل کو میں کس خواری سے
کیا ستم آدمی سہتا نہیں لاچاری سے

کیا کروں دلولۂ شوق کو میں تیرے امیر
شرم سے بنتے ہیں پرائے تو خبر داری سے



(حاشیہ بسلسلہ صفحہ گزشتہ)

میاں اور بھی جی زمانے میں ہنے — بھلا کیا ہے میرے ستانے میں حظ
چلو بلبلو قید صیاد میں — کیا بس بہت آشیانے میں حظ
بہت جی اس عالم میں آیا ہے تنگ — کبیر اب تو ہے مر ہی جانے میں حظ

ان اشعار کو دیکھتے ہوئے جو یقیناً کسی ردیف وار دیوان کی غزلوں کے معلوم ہوتے ہیں۔ طبقات الشعرا (صفحہ ۱۱) کے یہ الفاظ صحیح معلوم ہوتے ہیں کہ یہ ایک مشہور حکیم تھا جو ریختہ بھی کہتا تھا۔ دیوان فورٹ ولیم مدرسے کے کتاب خانے کی قلمی فہرست میں دیوان کبیر ہے جو اسی کا معلوم ہوتا ہے۔

مصحفی کے تذکرے میں "بسر انجام می رسانید" کا مطلب یہ ہے کہ شعرائے دربار نواب محمد یار خاں کی غزل کہہ دیا کرتے تھے تو قائم کے ذکر میں خود مصحفی لکھتے ہیں "کاغذ مسودہ اشعار نواب را کہ برائے اصلاح پیش او می آمد از کم دماغی در ست مشورۂ فقیر می آورد" (ہندی گویاں صفحہ ۱۹۴، ۱۹۸)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب محمد یار خاں خود کہتے تھے۔ قائم کی کم دماغی بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی بلکہ مصحفی سے نواب محمد یار خاں کی اصلاح میں مشورہ کرنا اس کی بڑی مصلحت بینی کی دلیل ہے کیوں کہ مصحفی قائم سے پہلے نواب کو اصلاح دیتے تھے۔ اس لئے قائم نے نواب کی پسندیدہ اصلاح کو خوب سمجھ لینے کے لئے یہ اقدام کیا ہوگا۔



محوی صدیقی لکھنوی

یہ عجب معرکۂ حُسنِ نظر ہوتا ہے
آنکھیں لڑتی ہیں مگر خونِ جگر ہوتا ہے

امتحانِ تپشِ اہلِ نظر ہوتا ہے
جلوہ ہر بار بہ اندازِ دگر ہوتا ہے

ایک ایسا بھی رہِ عشق میں آتا ہے مقام
خشک کانٹا بھی جہاں کا گُلِ تر ہوتا ہے

دھڑکنیں دل کی بتا دیتی ہیں مجھ کو شبِ غم
کہ رُخِ خوابگہِ ناز کدھر ہوتا ہے

میرے نالے ہیں جگر دوز، یہ مانے تسلیم
یہ بتاؤ کبھی تم پر بھی اثر ہوتا ہے

ہائے وہ قافلۂ اشکِ رواں اور یہ خاک
رہگزر جس کی مرا دیدۂ تر ہوتا ہے

ہائے وہ رات کہ جس رات ہجومِ غم سے
ایک نشترکدہ ہر زخمِ جگر ہوتا ہے

بڑھتے بڑھتے کبھی بن جاتا ہے شعلہ غمِ عشق
ابتدا میں تو یہ ننّھا سا شرر ہوتا ہے

تو بھی اے بے کسیِ عشق چلی، یہ تو بتا!
دل میں رہ کر بھی کہیں عزمِ سفر ہوتا ہے

زیبِ دامن ہو کہ وہ زینتِ خاکِ مدفن
غم زدہ آنکھ کا ہر اشک گُہر ہوتا ہے

شورِ ماتم نہ جنازے پہ ہجومِ احباب
کتنا خاموش غریبوں کا سفر ہوتا ہے

نظر آتا ہے وہی جلوۂ رعنا مجھ کو
اُن کا آئینہ مرا زخمِ جگر ہوتا ہے

یوں تو بالیں پہ نظر آتے ہیں اکثر آنسو
کبھی پلکوں پہ بھی اک لختِ جگر ہوتا ہے

ہو اجازت تو کھلا دوں ابھی دامن پہ چمن
دیدۂ تر کا ہر آنسو گُلِ تر ہوتا ہے

ہیں جو نازک تن و گُل پیرہن و غنچہ دہن
اُن کے سینے میں بھی پتھر کا جگر ہوتا ہے

منزلِ عشق ہی معراجِ بشر ہے محوی
کون کہتا ہے یہاں دل کا ضرر ہوتا ہے

راکٹ

محمد اسحاق صدیقی

راکٹ کے بارے میں ہم اخباروں میں آئے دن خبریں پڑھا کرتے ہیں. راکٹ کیا ہے؟ اس کی تاریخ کیا ہے؟ یہ کیسے بنایا جاتا ہے؟ اور اس سے کیا کام لیا جا سکتا ہے یہ سب جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا.

راکٹ کی معمولی صورت آتش بازی کی ہوائی ہے. آگ لگانے پر وہ سنناتی ہوئی آسمان پر چلی جاتی ہے. آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہوائی میں جو تیلی لگی ہوتی ہے وہ اسے سیدھے ایک خط میں لے جاتی ہے. ہوائی کی نلکی میں اوپر کی طرف ایک مسالہ بھرا ہوتا ہے جس میں آگ لگنے سے رنگ برنگ کے ستارے گرتے ہیں. اس مسالے کے نیچے بارود ہوتی ہے. جب بارود میں آگ لگتی ہے تو گیس پیدا ہوتی ہے. یہ گیس چاروں طرف پھیلنے کی کوشش کرتی ہے. چوں کہ نلکی کا اگلا حصہ بند ہوتا ہے اس لیے وہ پیچھے کی طرف سے نکلتی ہے لیکن گیس کی طاقت کا "ردعمل" یہ ہوتا ہے کہ ہوائی آگے کی طرف بڑھ جاتی ہے. یہ "ردعمل" کیا ہے؟

سر آئزک نیوٹن نے سنہ ۱۶۸۷ء میں حرکت کے بارے میں تین قانون معلوم کیے تھے. ان میں تیسرا قانون تھا کہ "ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے قوت میں برابر لیکن سمت میں مخالف". ردعمل کا اصول ہمیں اس وقت نظر آتا ہے جب غبارے سے ہوا نکلتی ہے اور وہ آگے کی طرف بھاگتا ہے یا جب ہم بندوق چلاتے ہیں تو ہمیں جھٹکا لگتا ہے. ردعمل کا یہی قانون ہوائی پر نافذ ہوتا ہے.

بارود کی طرح ہوائی بھی چین والوں کی ایجاد ہے. حضرت عیسیٰ سے ۳۰۰ سال پہلے ان میں ہوائی کی وہ صورت پائی جاتی تھی جو آج بھی آپ شادی بیاہ کے موقعوں پر دیکھتے ہیں. ہاں اتنی ترقی ضرور ہو گئی ہے کہ اب ان میں ایسے مسالے بھرے جاتے ہیں جن کے جلنے سے رنگ برنگ کے ستارے گرتے ہیں. چینیوں نے سنہ ۱۲۳۲ء میں کائی فنگ فو شہر کو منگولوں سے بچانے کے لیے ان پر ہوائیاں برسائیں جس سے ان کے گھوڑے بھڑک اٹھے اور انھیں میدان جنگ سے بھاگنا پڑا. تاریخ عالم میں ہوائی کا جنگی استعمال سب سے پہلے شاید اسی موقع پر ہوا تھا.

چین کے بعد ہندوستان نے ہوائی کو ترقی دی. قدیم ہندوستان میں بھی اس سے ملتی جلتی کوئی چیز تیار کی گئی تھی جسے "اگنی بان" (آگ کا تیر) کہا جاتا تھا. بہرحال یہ تو تاریخی واقعہ ہے کہ حیدر علی نے سنہ ۱۷۸۰ء میں میسور کی دوسری لڑائی میں ہوائی کو انگریزوں کے خلاف استعمال کیا. حیدر علی کی ہوائیوں میں بجائے تیلیوں کے دس دس فٹ لمبے بانس لگے تھے. دفتی کی نلکیوں کی جگہ لوہے کے خول تھے. ایک ایک ہوائی چھ چھ سیر وزنی تھی اور آدھ میل سے زیادہ دور جاتی تھی. جب یہ ہوائیاں انگریزی فوج پر گریں تو اسے سخت نقصان پہنچا

ہندوستانی فوج کے اس انوکھے ہتھیار کی کامیابی سے متاثر ہو کر انگریزوں نے کچھ تجربے شروع کیے اور ۲۰ سال کے بعد سر ولیم کانگریو (SIR WILLI-AM CONGREVE) نے جو برٹش توپ خانے میں کرنل تھے. ہوائی کی ایک بہتر صورت پیش کی اور یہ چیز وہاں "راکٹ" کے نام سے مشہور ہوئی. نپولین کے خلاف جنگ میں برطانوی سپاہیوں نے سنہ ۱۸۰۷ء میں کوپن ہیگن پر ۲۵۰۰۰ راکٹ برسائے اور شہر کا بیشتر حصہ تباہ ہو گیا. لیکن راکٹ میں اس وقت تک یہ خرابی تھی کہ کبھی تو وہ اٹھنے سے پہلے پھٹ جاتا اور کبھی غلط سمت میں چلا جاتا. اس کے

بعد جیسے جیسے توپیں بنانے میں ترقی ہوتی گئی۔ راکٹ کا استعمال جنگ کے لیے کم ہونے لگا۔

امریکی سائنسداں ڈاکٹر رابرٹ گوڈارڈ (DR. ROBERT GODDARD) نے سنہ ۱۹ء کے شروع میں راکٹ میں مزید اصلاح کی اور اس ترقی یافتہ راکٹ کی مدد سے سائنسی آلات کو آسمان پر موسم کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ ان کے آلات اس بلندی تک پہنچ گئے جہاں غباروں کی رسائی نہ ہوتی تھی۔ ابھی تک ہوائیاں یا راکٹ خشک ایندھن یعنی بارود سے چلتے تھے۔ لیکن گوڈارڈ نے سنہ ۱۹۲۶ء میں دنیا کا پہلا سیال ایندھن (گیسولین اور آکسیجن) سے چلنے والا راکٹ کامیابی سے چھوڑا۔ وہ اپنی ایجاد میں سدھار کرتے رہے تاکہ راکٹ مقررہ منزل پر جاسکے اور آلات کو پیراشوٹ (ہوائی چھتری) کی مدد سے واپس لاسکے۔

روسی سائنسداں تسیولکوفسکی سنہ ۱۸۵۷ء تا سنہ ۱۹۳۵ء پہلے شخص تھے جنھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ انسان راکٹ کی مدد سے چاند اور سیاروں تک پہنچ سکتا ہے۔ انھوں نے سنہ ۱۹۰۳ء میں اس موضوع پر ایک کتاب لکھی۔

سیاروں کا سفر ہوائی جہاز پر نہیں کیا جاسکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ دس میل کی اونچائی کے بعد ہوا اس قدر ہلکی ہوجاتی ہے کہ اس میں ہوائی جہاز نہیں اڑ سکتا۔ اس کے لیے ایک ایسے جہاز کی ضرورت ہے جو اڑنے کے لیے ہوا کا محتاج نہ ہو۔ ہوا کئی گیسوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ایک آکسیجن ہے۔ آکسیجن چیزوں کے جلنے میں مدد کرتی ہے۔ اگر آکسیجن نہ ہو تو آگ نہ جل سکے۔ راکٹ میں ایندھن کو جلانے کے لیے سیال آکسیجن رہتی ہے۔ جب آکسیجن کو بہت ٹھنڈا کیا جاتا ہے تو وہ پانی کی طرح بہنے لگتی ہے۔ اس طرح راکٹ میں بارود جیسے خشک ایندھن کے بجائے سیال ایندھن کو ترجیح دی جاتی ہے جیسے پٹرول۔ جب یہ دونوں راکٹ کے اندر ملتے ہیں تو ان میں آگ لگ جاتی ہے۔ ان کے جلنے اور گیس کے باہر نکلنے سے راکٹ آگے بڑھتا ہے

رومانیہ کے عالم پروفیسر آبرتھ (PROF. OBERTH) نے سنہ ۱۹۲۳ء میں جرمن زبان میں ایک کتابچہ شایع کیا جس کا نام تھا "راکٹ خلا میں" اور پھر اسے ایک مکمل کتاب کی صورت دی جس کا نام رکھا "خلائی سفر کا طریقہ" انھوں نے ریاضی کی مدد سے ثابت کیا تھا کہ خلا کا سفر راکٹ کی مدد سے کیا جاسکتا ہے۔ ان کے خیالات سے متاثر ہوکر جرمنی میں "سیاروں کے سفر" کے لیے ایک انجمن قایم ہوئی جو ایک ماہنامہ "راکٹ" کے نام سے شایع کرتی تھی۔ اس کے ممبر سیال ایندھن والے راکٹ بناکر تجربے بھی کرتے تھے۔ مگر ان تجربات میں سے بیشتر ناکام ثابت ہوئے لیکن سنہ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے یہ معلوم کرلیا کہ الکحل اور سیال آکسیجن راکٹ کا بہترین ایندھن ہیں۔ جب ہٹلر کا عروج ہوا تو اس نے راکٹ کی اس انجمن پر قبضہ کرلیا اور بالٹک کے ساحل پر راکٹ کو بطور ہتھیار ترقی دینے کے لیے ایک مرکز بنایا۔ اس انجمن کے ایک ممتاز ممبر ڈاکٹر فان بران (DR. VON BRAUN) کو اس کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔

ڈاکٹر فان بران کی نگرانی میں نازیوں نے سنہ ۱۹۴۴ء میں وی ٹو (V-2) راکٹ بنایا۔ اس کی تیاری میں گوڈارڈ کی دریافتوں سے فائدہ اٹھایا گیا تھا۔ اس کی ایک ٹنکی میں سیال آکسیجن رہتی اور دوسری میں الکحل۔ دونوں الگ الگ پمپ کے ذریعہ ایک خانے میں پہنچتے جہاں ان میں بجلی کی چنگاری کے ذریعہ سے آگ لگائی جاتی آگ کے لوکے اور دھواں ایک تنگ راستے سے لپکتے ہوئے باہر نکلتے جن کے ردعمل سے راکٹ آگے بڑھتا۔ اس کی رفتار ایک میل فی سکنڈ تھی اور اس کا نشانہ ۲۰۰ میل کی دوری تک چار میل کے حلقے میں صحیح ہوتا تھا۔ اس کے اگلے حصے میں بم رہتا تھا۔

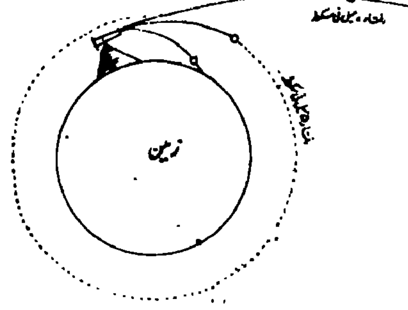
وی ٹو کو لندن پر گرایا گیا اور اس نے ایک تہلکہ مچا دیا لیکن دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر راکٹ سازی کا جرمن اڈا تباہ کردیا گیا۔ بہت سے راکٹ اور ان کے بنانے والے روس اور امریکہ والوں کے ہاتھ لگے۔ اس کے بعد روس اور امریکہ میں راکٹ بنانے کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ دونوں اس بات کی کوشش کرنے لگے کہ وہ بھاری سے بھاری راکٹ کو زیادہ سے زیادہ اونچائی پر بھیج سکیں۔

زمین سے بلند ہوتے وقت راکٹ کو دو چیزوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے زمین کی قوت کشش اور ہوا کی رکاوٹ۔ یوں تو ہوا زمین سے ہزار میل کی اونچائی تک پائی جاتی ہے لیکن زمین سے فاصلہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہلکی ہوتی جاتی ہے اس لیے راکٹ کی اڑان میں اونچائی بڑھنے کے ساتھ ساتھ رکاوٹ کم ہوتی جاتی ہے اور جب ہوا بالکل ختم ہوجاتی ہے تو ہوا کی رکاوٹ بھی ختم ہوجاتی ہے۔

قدرت کا ایک اصول ہے کہ جب کسی چیز کو ایک خاص رفتار سے چالو کردیا جاتا ہے تو وہ اس وقت تک چلتی رہتی ہے جب تک کوئی دوسری چیز اسے روک دے مثلاً سائیکل کی رفتار میں ہوا اور زمین کی رگڑ کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ ہوائی جہاز اور راکٹ کی رفتار بھی ہوا سے کم ہوجاتی ہے لیکن خلا میں جہاں ہوا نہیں ہے راکٹ کی رفتار جو ایک بار قائم ہوجاتی ہے وہ عرصے تک قائم رہتی ہے۔

جیسے چمبک پتھر لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے ویسے ہی زمین بھی ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس کو قوت کشش کہتے ہیں۔ زمین سے فاصلہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ کشش کم ہوتی جاتی ہے۔ جب راکٹ زمین سے بلند ہوتا ہے تو زمین کی قوت کشش اسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جیسے جیسے وہ زمین سے دور ہوتا جاتا ہے اسے زمین کی کشش کا کم مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

فرض کیجیے ہم ایک توپ کو اتنی اونچی جگہ نصب کریں جہاں ہوا رکاوٹ نہ پیدا کرے اور پھر اسے چلائیں تو گولا کافی دور جائے گا۔ گولے کی طاقت کو ہم جتنا بڑھائیں گے وہ اتنا ہی دور جائے گا۔ حساب لگانے سے پتہ چلا ہے کہ اگر ہم اس کی رفتار ۵ میل فی سکنڈ (۱۸۰۰۰ میل فی گھنٹہ) کر دیں تو وہ زمین پر گرے گا نہیں بلکہ چاند کی طرح زمین کے چاروں طرف گھومنے لگے گا۔ گویا "مصنوعی چاند" بن جائے گا۔ اور اگر ہم اس کی رفتار ۷ میل فی سکنڈ (۲۵۰۰۰ میل فی گھنٹہ) کر دیں تو وہ زمین کی پکڑ سے باہر ہو جائے گا اور خلا میں نہ جانے کہاں چلا جائے۔ سیاروں کے سفر کے لیے راکٹ کا ۷ میل فی سکنڈ کی رفتار حاصل کرنا ضروری ہے۔



جسے ہم وزن کہتے ہیں وہ دراصل زمین کی کشش ہے۔ جو چیز جتنی بڑی اور ٹھوس ہوتی ہے۔ اس پر زمین کی کشش بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے اسی لیے وہ زیادہ بھاری معلوم ہوتی ہے۔ راکٹ جتنا وزنی ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کا زمین کی کشش کو توڑ کر باہر نکلنا مشکل ہوگا۔ زمین کی کشش اتنی زیادہ ہے کہ ایک پونڈ وزن کو خلا میں بھیجنے کے لیے ۴۰۲ پونڈ ایندھن کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک جو راکٹ بنائے گئے ہیں ان کا بڑا حصہ ایندھن سے گھر جاتا ہے۔ خلا کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والے آلات یا مسافر کے لیے جگہ بہت کم بچتی ہے۔

راکٹ کی رفتار ایندھن پر منحصر ہے۔ اچھا ایندھن وہ ہے جو بہت تیزی سے جلے اور اس کی گیس بہت تیزی سے باہر آئے۔ جتنی تیزی سے گیس باہر آئے گی اتنی ہی تیزی سے راکٹ آگے بڑھے گا۔ راکٹ سازی کے مقابلے میں روس امریکہ سے آگے نکل گیا ہے اس کی وجہ ایک خاص ایندھن کی دریافت ہے جس کی مدد سے وہ بھاری سے بھاری راکٹ کو خلا میں بھیج سکتے ہیں۔

راکٹ میں ایندھن کے جلنے سے ۵۰۰۰ درجہ فارن ہائٹ تک گرمی پیدا ہوتی ہے جب کہ ۲۲۰۰ درجہ فارن ہائٹ پر فولاد پگھل جاتا ہے۔ اس لیے راکٹ کے جس حصے میں ایندھن جلتا ہے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے خاص انتظام کرنا پڑتا ہے۔

راکٹ میں دو طرح کے ایندھن کام میں لائے جاتے ہیں ٹھوس اور سیال۔ ٹھوس ایندھن والے راکٹ میں ایندھن اور آکسیجن کو جلنے کی کوٹھری میں لے جانے کے لیے پمپ اور والو (VALVE) کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے اس کا وزن کم ہوتا ہے۔ اس کی تیاری میں لاگت کم آتی ہے اور وہ جلد چالو ہو سکتا ہے لیکن ایسے راکٹ میں بڑی خرابی یہ ہے کہ جب اس کا مسالہ جلنا شروع ہو جاتا ہے تو جب تک ختم نہ ہو بجھنے کا نام نہیں لیتا۔ برخلاف اس کے سیال ایندھن والے راکٹ کے مسالے کو کسی وقت بھی جلنے سے روکا جا سکتا ہے۔ اس کی اڑان بھی قابو میں رہتی ہے۔

راکٹ کی رفتار بڑھانے کے لیے ایک انوکھی ترکیب نکالی گئی ہے۔ وہ ترکیب یہ ہے کہ بجائے ایک کے کئی راکٹوں کو جوڑ کر کئی منزلہ راکٹ بنائے جاتے ہیں۔ یہ ترکیب بھی سب سے پہلے پروفیسر رابرٹ گوڈارڈ نے بتائی تھی۔ لیکن اس ترکیب پر ان کی زندگی میں عمل نہ ہو سکا بلکہ ان کے مرنے کے چار سال بعد یعنی ۲۴ فروری ۱۹۴۹ء کو ایک دو منزلہ راکٹ (یعنی دو لے ہوئے راکٹ) چھوڑا گیا۔ اس دو منزلہ راکٹ کا نام ویک کارپورل (WAC CORPORAL) تھا۔ اس میں ایک چھوٹا راکٹ بڑے راکٹ وی۔ ٹو (V-2) کے سر پر سوار تھا پہلے حصے یعنی بڑے راکٹ کی لمبائی ۴۶ فٹ اور وزن ۱۴ ٹن تھا جب راکٹ ۲۰ میل کی بلندی پر پہنچ گیا تو پہلے حصہ یعنی بڑے راکٹ کا ایندھن ختم ہو گیا اور وہ چھوٹے راکٹ سے کٹ کر گر گیا۔ لیکن اس کے گرتے گرتے دوسرے حصے یعنی چھوٹے راکٹ کے انجن چالو ہو گئے۔ (یہ انجن ابھی تک چالو نہ تھے کیوں کہ بڑے راکٹ کے انجنوں سے ابھی تک سارا کام چل رہا تھا۔) چوں کہ دوسرا حصہ پہلے ہی حرکت میں تھا اس لیے جب اس کے انجن بھی خود کام کرنے لگے تو اس کی رفتار پہلے حصے سے کہیں تیز ہو گئی۔ دراصل اس کی رفتار دوہری تھی۔ اس کے انجن چالو ہوتے وقت اس کی جو رفتار ہو گئی تھی وہ اور پہلے حصے سے علاحدگی کے وقت جو رفتار تھی وہ۔ چوں کہ دوسرا حصہ یعنی چھوٹا راکٹ زیادہ بلندی سے

نہ ہوا تھا اس لیے اسے زمین کی قوت کشش اور ہوا کا بھی کم مقابلہ کرنا پڑا
راکٹ کا وزن گھٹنے' ہوا اور کشش کم ہونے کی وجہ سے اس کی رفتار بڑھ
..۵۲۰ میل فی گھنٹہ ہوگئی اور وہ ۲۵۰۰ میل کی بلندی پر پہنچ گیا۔

اس وقت سے لے کر اب تک راکٹ بنانے کے معاملے میں روس اور امریکہ
نوں نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ دونوں ایسا راکٹ بنانے میں کامیاب ہوگئے
جس کی رفتار ۷ میل فی سکنڈ (۲۵۰۰۰ میل فی گھنٹہ) ہے۔ روس کے راکٹ
ے ہوتے ہیں یہ صرف روس کے چوٹی کے سائنسداں ہی جانتے ہیں کیوں کہ وہ
ہر بات کو بہت راز میں رکھتے ہیں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کی خبریں تو
ردں میں آجاتی ہیں لیکن وہ اسے کس طرح سرانجام دیتے ہیں یہ نہیں
وم ہونے پاتا۔ امریکہ چوں کہ اپنے راکٹوں کے بارے میں تفصیل سے بتادیتا
اسی لیے ہمیں امریکہ کے راکٹوں کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہیں۔

امریکہ کے راکٹ ۲ سے لے کر ۵ منزل تک کے ہوتے ہیں۔ ان کی اونچائی
ٹ سے لے کر ۲۵۰ فٹ تک ہوتی ہے ان کی مختلف قسمیں ہیں۔ سب سے کامیاب
راکٹ ہے جس کا قطر ۱۰ فٹ اور اونچائی ۷۰ فٹ تک رہتی ہے۔ یہ مٹی کے
(کیروسین) اور آکسیجن سے چلتا ہے۔

راکٹ پنسل کی طرح نوک دار چکنا اور چمک دار ہوتا ہے اور مختلف دھاتوں
یزش سے تیار کیا جاتا ہے۔ اسے چھوڑنے کے لیے خاص طرح کے اڈے
ے جاتے ہیں۔ امریکہ میں اس طرح کا اڈا کیپ کیناویرل (فلوریڈا) میں ہے۔
ٹ کے مختلف حصے ایک خاص طرح کے تیار کیے ہوئے چبوترے پر لا کر جوڑے
تے ہیں۔ چبوترے کے بیچ میں راکٹ سے نکلنے والے دھوئیں اور آگ کی نکاسی
لیے راستہ ہوتا ہے۔ راکٹ کی مختلف منزلوں تک پہنچنے کے لیے چبوترے کے
ب ہی فولاد کا بنا ہوا ایک کئی منزلہ مچان ہوتا ہے جس میں لفٹ لگا ہوتا ہے۔
سب تیاری مکمل ہو جاتی ہے تو راکٹ میں ایندھن اور آکسیجن بھر دیتے
۔ سیال آکسیجن اتنی ٹھنڈی ہوتی ہے کہ اگر اسے کیتلی میں بند کر کے برف پر
دیا جائے تو وہ ابلنے لگتی ہے۔ اسی لیے جب اسے راکٹ میں بھرتے ہیں تو وہ
پ کی شکل میں باہر نکلنے لگتی ہے۔ اشارہ پاکر راکٹ کے قریب سے مچان ہٹا
جاتا ہے اور اس کے بعد دور سے بجلی کے ذریعہ راکٹ میں آگ لگادی جاتی
۔ اس کا ایندھن جل اٹھتا ہے اور راکٹ دھوئیں کے بادلوں اور شعلوں کے بیچ
سیدھا اٹھتا ہے اور آسمان میں غائب ہو جاتا ہے۔

تین منزلہ راکٹ

راکٹ چھوڑنے سے پہلے اس کا راستہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اس کی اڑان پر
برابر نگاہ رکھی جاتی ہے۔ اسی غرض سے زمین پر رصدگاہوں کا جال بچھا دیا گیا
ہے جہاں اس کا پتہ چلانے کے لیے طرح طرح کے آلات ہوتے ہیں۔ جب تک وہ نظر آتا
ہے اسے آسمانی دوربینوں کی مدد سے دیکھا جاتا ہے۔ "ریڈیائی دوربینوں" (RE-
DIO TELESCOPE) سے اس کی آوازیں سنی جاتی ہیں اور راڈار آلہ
کی مدد سے ریڈیائی لہریں بھیج کر اسے "ٹٹولا" جاتا ہے۔ راڈار ایک آلہ ہے جس کی مدد
سے ریڈیائی لہریں آسمان پر مختلف سمتوں میں بھیجی جاتی ہیں۔ اگر یہ لہریں راستہ

میں کہیں راکٹ سے ٹکرا جاتی ہیں تو ان کے راستہ میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور زمین والوں کو جنھوں نے یہ ریڈیائی لہریں بھیجی ہیں اس رکاوٹ کا پتہ چل جاتا ہے اور اس طرح راکٹ کی جگہ معلوم ہوتی رہتی ہے۔ ایسی ترکیبیں بھی نکالی گئی ہیں کہ زمین پر بیٹھے بیٹھے راکٹ کے راستہ کو درست کر سکتے ہیں۔ یعنی اگر وہ مقرر کیے ہوئے راستے سے ذرا بھی ادھر اُدھر بھٹکتا ہے تو زمین سے ریڈیائی اشارہ پاکر صحیح راستے پر آجاتا ہے۔

راکٹ کے راستہ کے ساتھ اس کی منزل کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے یعنی وہ ایک مقررہ بلندی پر پہنچ کر زمین کے گرد چکر لگائے گا یا چاند تک جائے گا وغیرہ۔ ہر صورت میں راکٹ کا صرف آخری حصہ منزل تک پہنچتا ہے۔ باقی حصے مسالہ جلنے پر باری باری گرتے جاتے ہیں۔ اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ یہ حصے جو بہت بھاری ہوتے ہیں کٹ کر سمندر یا ویران جگہ پر گریں تاکہ آبادی کو نقصان نہ پہنچے۔ اگر راکٹ کا کٹا ہوا حصہ بہت تیزی سے زمین کی طرف آتا ہے تو ہوا کی رگڑ سے جل اٹھتا ہے اور زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی راکھ ہو جاتا ہے۔ چوں کہ یہ حصے نہایت قیمتی ہوتے ہیں اس لیے اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ انھیں ضایع ہونے سے بچا لیا جائے۔ جہاں یہ ہر گرنے والے حصے میں پیراشوٹ لگا دیا جاتا ہے۔ یہ مضبوط کپڑے کی بنی ہوئی چھتری ہوتی ہے۔ جب وہ کھل جاتی ہے تو اس میں ہوا بھر جاتی ہے۔ اس طرح راکٹ کا یہ کٹا ہوا حصہ آہستہ آہستہ منڈلاتا ہوا زمین پر گرتا ہے اور اسے ڈھونڈ نکالا جاتا ہے۔ اگر سمندر میں اس کے گرنے کا امکان ہوتا ہے تو وہاں سمندری جہاز اور ہیلی کاپٹر اسے بچانے کے لیے پہلے سے تعینات کر دیے جاتے ہیں۔

تیسری منزل کے انجن چالو ہو جاتے ہیں
دوسری منزل کٹ کر گر جاتی ہے
دوسری منزل کے انجن چالو ہو جاتے ہیں
پہلی منزل کٹ کر گر جاتی ہے

راکٹ کے آخری حصے کو (جس میں مسافر یا سائنسی آلات ہوتے ہیں) زمین پر واپس لانے کے لیے اس کی رفتار آہستہ آہستہ کم کی جاتی ہے۔ وہ ایک دم سے زمین پر نہیں اترتا بلکہ ہوا میں زمین کے گرد کئی چکر لگاتا ہے۔ وہ ہر چکر میں زمین سے قریب ہوتا جاتا ہے اس لیے اس کا ہر چکر پہلے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وہ زمین سے قریب آتا جاتا ہے اس کی رفتار کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ زمین پر بہ حفاظت پھسلتا ہوا آجاتا ہے۔ اگر راکٹ کو بہت تیزی کے ساتھ زمین پر واپس لایا جائے تو وہ ہوا کی رگڑ سے گرم ہو کر جل اٹھے۔

راکٹ کی رفتار کو کم کرنے کے لیے اس میں ریٹرو راکٹ (RETRO ROCKET) لگائے جاتے ہیں۔ ان کا دھواں اصل راکٹ کی اڑان کی سمت کے مخالف طرف نکلتا ہے۔ یعنی یہ ریٹرو راکٹ اصل راکٹ کو مخالف سمت میں لے جانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح اصل راکٹ کی پرواز میں ایک رکاوٹ پڑتی ہے اور اس کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ ریٹرو راکٹ کے انجن اس وقت چالو ہوتے ہیں جب اصل راکٹ کی رفتار کو کم کرنا اور اسے واپس لانا مقصود ہوتا ہے۔

راکٹ کے سب سے اوپر والے حصے میں تین چیزیں ہو سکتی ہیں: ۱۔ کسی خاص مقام پر جاکر پھٹ پڑنے والا بم۔ ۲۔ خلا کے بارے میں معلومات جمع کرنے والے آلات۔ ۳۔ کمرہ جس میں خلائی مسافر رہ سکے۔ ان میں سے پہلی صورت میں راکٹ جنگی راکٹ بن جاتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ "مصنوعی چاند" بن جانے والا راکٹ ہوتا ہے اور تیسری صورت میں خلائی جہاز کا کام دیتا ہے۔

خلائی جہاز کی بناوٹ میں خلا کے خطروں سے بچنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ انسان کے منھ یا ناک سے جو ہوا نکلتی ہے وہ زہریلی ہوتی ہے۔ زمین پر یہ ہوا فضا میں مل جاتی ہے اور اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچنے پاتا۔ لیکن خلائی جہاز میں اس کے مسافر کی اس زہریلی ہوا کو باہر نکلنے کا موقع نہیں۔ لہٰذا اس لیے خلائی جہاز میں اس ہوا کو صاف کرنے اور تازہ ہوا پیدا کرنے کا انتظام ہوتا ہے۔ خلائی جہاز میں ہوا کے دباؤ، نمی اور درجۂ حرارت کی بالکل وہی صورت پیدا کی جاتی ہے جو زمین پر ہے۔ مسافر کے لیے کھانے پینے کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ روس اور امریکہ دونوں خلائی جہاز بنانے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ امریکہ اور روس کے خلائی مسافر زمین کے چکر لگا کر واپس آگئے ہیں۔ چاند اور زہرہ تک راکٹ بھیجے جا چکے ہیں اور اب اس دن کا انتظار ہے جب خود انسان چاند، زہرہ اور مریخ سیارے پر جائے گا اور جاکر واپس آئے گا۔

کہانوی ادب

سید محمد حسنین

کہانی سننا اور سنانا ہمارے لئے اتنا ہی لازمی ہے جس قدر پیاس میں پانی اور تھکاوٹ میں آرام۔ زندگی کی ہر منزل پر انسان کو اس کی حاجت رہتی ہے اور ہمیشہ رہے گی جس طرح "آؤ، کہانی سنو" سنتے ہی چھوٹے چھوٹے بچے ہمارے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں اور ہمہ تن گوش ہو کر ان دلچسپ اور انجانی باتیں سننے لگتے ہیں، اسی طرح اور بالکل اسی عالم میں سیانے جوان اور بوڑھے بھی کہانی کی دل کشی میں کھو جاتے ہیں۔ بچے پریوں اور بادشاہوں والی جادو بھری کہانیوں میں محو ہو جاتے ہیں اور سیانے کسی افسانے یا ناول میں جذب ہو جاتے ہیں۔ کہانی کی یہ چاٹ بچوں اور بوڑھوں میں بالکل ایک قسم کی ہے۔ اور یہ چاٹ کچھ نئی بھی نہیں، بہت پرانی ہے۔ ہماری تہذیب سے بھی زیادہ بڑی عمر ہے اس کی۔ اپنے بزرگوں سے یہ ہمیں بطور میراث ملی ہے۔ جب ہم میں تہذیب و تمدن کی بو باس بھی نہ تھی اور جب ہم علم و ادب کی روشنی سے بے خبر تھے، ان دنوں بھی ہم میں کہانی سننے اور سنانے کی چاہ موجود تھی۔ دنیا کی پہلی کہانی آدم اور حوا کا جنت سے نکالے جانے کا واقعہ تھی۔ یہ ایک بڑا دردانگیز واقعہ تھا جسے آدم اور حوا نے ایک دوسرے کو سنایا ہوگا۔ سنایا ہوگا اور قصے کے انجام پر انھوں نے آٹھ آٹھ آنسو بھی بہائے ہوں گے۔

پھر ہماری یہ سنسان اور ویران دنیا آدم اور حوا کے بیٹے اور بیٹیوں سے دھیرے دھیرے آباد ہونے لگی۔ ان کی اولاد نئے اور نیرنگ حالات سے دوچار ہوئی۔ اس عجیب اور اجنبی جگہ میں انھوں نے کبھی جانا بوجھا قدم اٹھایا اور کبھی انجانا اور یوں طرح طرح کے چھوٹے بڑے، اچھے برے حرکات اور واقعات کے یہ مرتکب ہوتے گئے۔ دیکھتے دیکھتے پھر یہ نئی اور ویران دنیا متنوع اور متضاد قصص و حکایات سے بھر گئی اور دیہات میں الاؤ کے گرد بیٹھ کر یا پنگھٹ کے آس پاس جمع ہو کر آدم اور حوا کی اولاد یہ کہانیاں سنتی اور سناتی رہی۔ غرض کہانی سننے اور سنانے کی چاہ ہماری فطرت کا ایک خاصہ بن گئی ہے۔ اس خاصہ کی تسکین کے لئے ہم "کہانوی ادب"[1] کے رہین منت ہیں۔ کہانوی ادب میں ہم تمثیلیہ (allegory) داستان، ناول، ڈرامہ اور مثنوی[2] کو شامل کر سکتے ہیں۔ ان کا مطالعہ ہمارے اسی فطری خاصے کا نتیجہ ہے۔ ہر پڑھا لکھا فرد خواہ وہ کسی طبقہ یا عمر کا ہو، اپنی روزانہ زندگی کی چند گھڑیاں کسی ناول یا افسانے کے لئے ضرور نذر کر دیتا ہے۔ ایسے صاحب ذوق افراد کا ذکر ہی کیا جو اپنا کوئی محبوب مصنف، بھی رکھتے ہیں اور جس کی کہانیوں کا مکمل سٹ ان کے کتبخانہ کی زینت بھی ہوتا ہے۔

ہماری روزمرہ کی زندگی سے کہانوی ادب کا رشتہ بڑا گہرا ہے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی انواع و اقسام کی باتوں سے بھری ہے۔ صبح آنکھ کھلنے اور رات میں آنکھ بند ہونے کے محدود عرصے میں ہر روز نہ معلوم کتنے طرح کے واقعات سے ہم دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ واقعات ہماری ذات، شخصیت اور انفرادیت کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کی تعمیر و ترتیب میں صرف ہم اور آپ ہی نہیں دوسرے افراد کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ آپ غور کریں کہ اگر آپ کسی واقعہ کے مرتکب ہوتے ہیں تو تنہا آپ اس کے ذمہ دار نہیں ہوتے۔ اس کے تانے بانے چند دیگر افراد کے عمل اور ردعمل سے منسلک ہو کر طول و طویل ہو جاتے ہیں! اس ذاتی واقعہ کی نوعیت پھر اجتماعی ہو جاتی ہے۔ کہانوی ادب انسان کی اسی اجتماعی زندگی کا مرقع ہوتا ہے۔ یہ ہمارے کل حرکات و اعمال کا آئینہ ہے جو پیش نگاہ بھی ہوتے ہیں اور پس پردہ بھی، جو مقامی بھی ہوتے ہیں اور غیر مقامی بھی۔

---

[1] افسانوی ادب کے بجائے کہانوی ادب کی ترکیب یقیناً وسعت ہیں، گر یہ دانستہ ہے۔ لفظ "کہانی" میں جو وسعت ہے وہ افسانے میں موجود نہیں۔

[2] اس دائرے میں صرف وہ مثنویاں داخل ہیں جن میں کوئی کہانی یا قصہ پیش کیا گیا ہے۔

کہانی کی ادبی صورتیں ایک دوسرے سے بڑی مختلف ہوتی ہیں کیونکہ ان کی وضع وساخت مختلف ہوتی ہے، ان کی تشکیل، تعمیر کا ڈھنگ بھی مختلف ہوتا ہے۔ لیکن ان میں ایک عنصر بہت نمایاں اور مشترک ہوتا ہے۔ یہ عنصر کہانی ہے جسے انگریزی میں (FICTION) کہتے ہیں۔ آپ کے زیر مطالعہ ملا وجہی کی سب رس ہو یا میرامن کی باغ وبہار، نذیر احمد کی توبۃ النصوح ہو یا آغا حشر کی سہراب و رستم، پریم چند کی آخری تحفہ ہو یا میر حسن کی سحرالبیان، ان مختلف تصنیفات میں بنیادی طور پر آپ کسی قصے یا کہانی سے دوچار ہوتے ہیں۔ کہانی کی نوعیت مختلف ہوگی۔ اس کا مزاج اور صورت مختلف ہوگی۔ اس کے اثرات بھی مختلف ہوں گے۔ مگر مجموعی طور پر ہر بار آپ سے دوچار ہوں گے وہ کوئی قصہ یا واقعہ ہے۔

یہ تمام تصنیفات کہانوی ادب میں شامل ہیں۔ مگر محض خام، کھردری، ناتراشیدہ اور چلتی پھرتی کہانیاں ادب میں کوئی مرتبہ یا مقام نہیں رکھتیں۔ دوسرے الفاظ میں محض کسی قصے یا واقعہ کو تحریری لباس پہنا دینا تخلیق ادب ہے اور نہ قلم کاری۔ تمثیلیہ، داستان، ناول، ڈراما، افسانہ اور مثنوی، کہانی کی مختلف و مخصوص ادبی صورتیں ہیں۔ ان کی صورت گری یا صنفی تشکیل کے لئے کچھ اصول و ضابطے مقرر ہیں۔ کسی کہانی کو ادب میں ایک مناسب، مستحکم، مکمل اور دلکش صورت دینے کے لئے چند اجزا کا استعمال، متناسب و متوازن استعمال، لازمی ہے۔ یہ اجزا تین ہیں اور ادبی اصطلاح میں انھیں اجزائے ترکیبی کہتے ہیں۔ یہ پلاٹ (PLOT) کردار (CHARACTERS) اور مکان و زمان (SPACE AND TIME) ہیں۔ پلاٹ کا تعلق قصے سے ہوتا ہے۔ یہ وہ خاکہ ہے جس پر تمثیلیہ، داستان، ناول، ڈراما، افسانہ اور مثنوی کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ وہ اشخاص یا افراد جو قصے میں کام کرتے نظر آتے ہیں، کردار کہے جاتے ہیں۔ مکان وہ جگہ یا مقام ہے جہاں قصہ رونما ہوتا یا انجام پاتا ہے۔

پلاٹ سے پھر واقعہ نگاری (PLOT CONSTRUCTION) کی بات آجاتی ہے، یعنی کہانی کے چھوٹے چھوٹے بڑے متعدد ٹکڑوں کے قطع برید اور تراش خراش سے ایک تراشیدہ واقعہ کی تعمیر۔ نہایت ہی چھوٹے سے قصے کو کھینچ تان کر ایک واقعہ بنا دینا یا کسی واحد اتفاقی کڑی کو کئی کڑیوں سے منسلک کرکے ایک پوری زنجیر بنا دینا، واقعہ نگاری کی مثال ہے۔ کبھی ایک ننھا سا قصہ کئی چھوٹے چھوٹے قصوں کے ربط و وصل سے ایک پرشکوہ واقعہ بن جاتا ہے۔ کبھی چھوٹا سا واقعہ مختلف سانحات، جاذبات اور اتفاقات سے مربوط ہوکر ایک عظیم، سنگین اور جسیم واقعہ کی وضع اختیار کرلیتا ہے۔

کردار سے سیرت نگاری (CHARACTERISATION) کی جاتی ہے یعنی ہر فرد واقعہ کی جان پہچان کرائی جاتی ہے۔ انسان، انسان ہوکر بھی ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہوتا ہے۔ کسی دو انسانوں میں صورت کے علاوہ سیرت کا فرق ـــــ اہم اور نمایاں فرق ـــــ لابدی ہے۔ سیرت نگاری میں ان ظاہری اور داخلی خصوصیات کا بیان ہوتا ہے جو افراد کی ذات، ان کی شخصیت اور ان کی انفرادیت کا جوہر ہوتی ہیں۔ کردار دو قسم کے ہوتے ہیں، مرکزی اور ذیلی (CENTRAL AND SIDE)۔ مرکزی کردار کہانی کے اہم ترین افراد ہوتے ہیں۔ پلاٹ میں ان کا وجود اس محور جیسا ہوتا ہے جس پر کل واقعات گھومتے رہتے ہیں۔ یہ کردار عموماً اور بیشتر تین قسم کے ہوتے ہیں اور ان کے اپنے اصطلاحی نام ہیں، ہیرو، ہیروئن اور بدمعاش (HERO, HEROINE AND VILLAIN)۔ ذیلی کردار کی تعداد مقرر نہیں ہوتی۔ یہ دس سے درجنوں اور درجنوں سے سینکڑوں تک تجاوز کرسکتے ہیں۔ ان کا ورود پلاٹ کی وسعت اور طول و عرض کے بموجب ہوتا ہے۔ یہ واقعہ کی مختلف منزلوں پر لائے اور ہٹائے جاتے ہیں۔ مرکزی کردار کی طرح پلاٹ میں تموج و تلاطم یا مدوجزر پیدا ہوجاتا ہے اور کبھی ان سے مرکزی کردار کی سیرت و انفرادیت کی تشریح میں مدد لی جاتی ہے۔

نہ کوئی قصہ ہوا میں معلق ہوتا ہے اور نہ افراد قصہ۔ ہر واقعہ کے ساتھ چند افراد کے علاوہ کسی مخصوص جگہ کا تصور بھی لازمی ہے۔ مکان اور خطۂ ارض اس منظر و پس منظر اور اس معاشرت کو سامنے لے آتا ہے جو افراد قصے کے رہن سہن اور رسم و رواج سے متعلق ہوتے ہیں۔ جگہ کے ساتھ وقت کا تعلق چولی اور دامن والی بات ہے۔ مکان سے محض جگہ یا مقام ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ زمان بھی متصور ہوجاتا ہے۔ کہانی کے مناظر اور ماحول، فضا، کل ارضی و سماوی کیفیتیں مکان سے رابطہ رکھتی ہیں۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ ادیب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ یہ بات سو فی صدی درست ہے۔ اگر آپ کسی قوم کے کسی خاص دور کی معاشرت دیکھنی چاہتے ہوں تو اس عہد کی تصنیفات کا مطالعہ کریں۔ کہانوی ادب اس سعی میں سب سے مفید ثابت ہوتا ہے۔ کہانوی ادب میں تاریخ اپنی ثقافتی و تمدنی خصوصیات کے ساتھ بے نقاب ہوجاتی ہے۔

غرض کہانوی ادب کا سب سے نمایاں عنصر 'کہانی' ہے۔ کہانی کی نوعیت سے ہمیں کوئی مطلب نہیں۔ یہ تخیلی ہو یا تحقیقی، طویل ہو یا مختصر، دردناک ہو یا طربیہ، مزاحیہ ہو یا ہجویہ، ہر کہانی میں ایک پلاٹ، متعلقہ افراد اور ان کی سیرتیں اور مکان و زماں اور ان کے نقوش کا وجود شرط ہے۔ یہ کہانی کے اجزائے ثلاثہ ہیں۔ کہانوی ادب کی تخلیق میں ان اجزائے ثلاثہ کا استعمال ناگزیر ہے۔

کہانوی ادب نثری حصے کے پانچ اصناف اور شعری حصے کی ایک صنف پر مشتمل ہے۔ یہ چھ اصناف ادب کے وہ پیمانے ہیں جو قصہ یا واقعہ کی شکل میں کوائف حیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر صنف کا ادب میں اپنا مقام اور مرتبہ ہوتا ہے۔ اسی لئے ان اجزائے ثلاثہ کا استعمال بھی ان اصناف میں ایک انداز کا نہیں ہوتا۔ ان کے استعمال میں قلم کار کو ان اصناف کے اصول، ضوابط اور فنی لوازمات پر پوری توجہ دینی پڑتی ہے۔

یہ کہا جا چکا ہے کہ کہانوی ادب کا رشتہ ہماری زندگی سے بڑا قریبی اور گہرا ہے۔ ہماری زندگی بھانت بھانت کی نت نئی کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ ہر ہر لمحہ دنیا میں واقعات رونما ہوتے ہیں اور انواع و اقسام کی کہانیاں عالم وجود میں آتی رہتی ہیں۔ قلم کار کی باریک بین نگاہیں ان کہانیوں کے قلب تک اتر جاتی ہیں۔ وہ اس تہ یا گرہ کا کھوج لگا لیتی ہیں جو قصے کی اصل یا بنیاد ہے۔ قسم قسم کے واقعات سے ہم بھی دوچار ہوتے رہتے ہیں لیکن ہمارا دیکھنا اور قلم کار کا دیکھنا مختلف ہوتا ہے۔ ہم صرف ظاہر دیکھتے ہیں باطن نہیں دیکھتے۔ قصے کی جڑ یا واقعے کی اصل ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔ یہی اصل، کہانیوں کی روح، جان یا مغز ہے۔ اس مغز کو اصطلاح میں بنیادی خیال (THEME) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کہانوی ادب میں بنیادی خیال کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ وہ روغن ہے جو چراغ میں روشنی اور بزم میں رونق کی دلیل ہے۔

بنیادی خیال کی نوعیت ایک خیال کی ہوتی ہے۔ یہ محض مختصر سی بات ہوتی ہے جو صفحۂ تحریر میں آنے پر دو چار الفاظ یا ایک آدھ فقرے سے زیادہ جگہ نہیں لیتی۔ مگر خیال اور بنیادی خیال (THEME) کے مابین بڑا فاصلہ ہے۔ غالب کہتے ہیں: "عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے" یہ ایک فلسفیانہ بات ہے جو (ABSTRACT) اور (CONCRETE) جیسے گہرے مسائل کو سامنے لے آتی ہے۔ ہمیں اس جگہ فلسفے سے کوئی مطلب نہیں۔ اپنی آسانی کے لئے ہم خیال کو کائنات (SPACE) کے رواں دواں ننھے ننھے ریزے قرار دے سکتے ہیں جو سائنس کی زبان میں (COSMOS) کہلاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ خلا ان لاتعداد سماوی ریزوں سے بھری رہتی ہے۔ یہ ہر جگہ رقص کرتے پھرتے ہیں۔ ان کی جنبش و حرکت بے معنی نہیں کہا جاتا ہے کہ یہ سماوی ریزے فلکی اجسام (HEAVENLY BODIES) کی آفرینش کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ہماری دنیا اور ہماری اپنی زندگی میں بھی خیالات کے بے شمار ذرات گردش کرتے رہتے ہیں اور ان کی گردش سے ہر ساعت نوع بنوع واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ خیال اور واقعہ کا تعلق بطنی ہوتا ہے جیسے بیج اور پودا۔ یعنی خیال سے کسی واقعہ کا اور واقعہ سے کسی خیال کا پھوٹنا لازمی ہے۔

خیالات کے بگولے ہر جگہ پھیلے ہوتے ہیں۔ یہ بے شکل ہوتے ہیں اور منتشر پارچہ ہائے ابر جیسے۔ یہ بے وضع ٹکڑے فضائے دماغ میں بھی آتے رہتے ہیں اور گزرتے رہتے ہیں۔ ان کا آنا اور گزرنا کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن بنیادی خیال بے وضع بے معنی اور مبہم نہیں ہوتا۔ یہ روشن، واضح، پر اثر اور پر قوت ہوتا ہے۔ اس کی آمد آمد ناگہاں ہوتی ہے اور نہایت ہیجان خیز۔ غالب کے بقول:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

قلم کاری میں ہم اس آمد کے لئے لفظ کشف استعمال کرتے ہیں۔ یہ کشف یا وجدان ادب پاروں کی حیات ہے اور قلم کاری کی آبرو۔ یہ اسی بنیادی خیال کا ایک پرتو ہے۔ قلم کار کی شخصیت جب عالم وجد سے گزرتی ہے اور اس کے دماغ میں یہ بنیادی خیال جنم لیتا ہے تو اس کا صبر و قرار رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ قلم کار کو اس وقت تک چین نہیں لینے دیتا جب تک وہ اسے کسی مناسب صنف کے قالب میں سمو نہیں دیتا۔

خیالات متنوع و متضاد خیالات سے کوئی دماغ خالی نہیں۔ ہر دماغ میں خیال کی رسائی ہے اور ہر دماغ پر خیال کا تسلط ممکن ہے۔ لیکن بنیادی خیال کے لئے ہر دماغ میں جگہ دشوار ہے۔ یہ وہ بادہ نہیں جو ہر ظرف میں رہ سکے۔ دماغ دماغ میں فرق ہوتا ہے اور بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک پکے ہوئے سیب کا ڈال سے خود بخود علیحدہ ہو کر زمین پر گر جانا عام نگاہوں کے لئے کچھ بھی نہ ہو لیکن نیوٹن کی چشم وا کے سامنے یہ ایک معمولی بات نہ تھی۔ اس کے بیدار دماغ میں اس پیش نگاہ افتادہ واقعہ نے ایک پختہ اور واضح خیال کی بنیاد رکھ دی اور ایک عظیم مستحکم اور مجرد خیال کی جو دنیا کی ایک ٹھوس حقیقت ثابت ہوئی۔

بنیادی خیال کا تعلق کہانی لکھنے والے سے ہوتا ہے کہانی پڑھنے والے

سے نہیں ہوتا۔ قلم کار اس سے باخبر رہتا ہے مگر قارئین اس سے بے خبر ہوتے ہیں۔ کہانوی ادب میں اس کی مثال اس زندہ بیج جیسی ہے جو قلم کار کی دنیائے مشاہدات میں جنم لیتا ہے، جس کے پودے کی نمو اور بالیدگی کہانی کے قالب میں ہوتی ہے۔ کہانی کے اجزائے ثلاثہ اس پودے کے لئے حیاتین کا کام کرتے ہیں۔ ان کے بل بوتے پر یہ پروان چڑھتا ہے۔ کہانی پڑھنے والے کے دل دماغ میں اس پودے کے پھول کھلتے ہیں اور اس کے ذہن کو یہ معطر کر دیتے ہیں۔ کہانوی ادب میں اس طرح بنیادی خیال کی دو حیثیتیں نظر آتی ہیں۔ کہانی کے عالم وجود میں آنے سے پہلے یہ نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے اور کہانی کے آخر میں یہ حاصل قصہ بن جاتا ہے۔ شروع میں یہ ایک مخصوص خیال، واضح اور پختہ خیال کی شکل میں قلم کار کے سامنے آتا ہے اور اس کی قلم کاری کا محرک بن جاتا ہے۔ پلاٹ کے تانے بانے اور واقعے کے اتار چڑھاؤ میں یہ مختلف انداز و اطوار سے جنبش کرتا رہتا ہے۔ کرداروں کے قول و فعل اور عمل اور برتاؤ میں یہ عملاً حصہ لیتا رہتا ہے۔ منظر و پس منظر میں یہ محو خرام ہوتا ہے اور مجموعی طور پر کہانی کا انگ انگ بنیادی خیال کے ننھے ریشوں سے گتھا رہتا ہے۔ بنیادی خیال کی یہ پہلی نوعیت ہے اور قلم کار سے اس کا تعلق بالکل ذاتی ہوتا ہے۔

جب ہم کہانی پڑھتے ہیں، قصہ یا واقعہ کے خد و خال سے جب ہم آشنا ہو جاتے ہیں، کرداروں کی سیرت اور انفرادیت سے جب ہم اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں تو اس پرسکون و پرلطف ساعت میں ہم حاصل قصہ سے باخبر ہوتے ہیں۔ یہ باخبری دراصل ایک اہم نکتہ کا انکشاف ہے۔ اس واضح اور پختہ خیال کا انکشاف جو قصہ کی جان اور واقعہ کی روح تھا۔ یہ بنیادی خیال کی ثانوی حیثیت ہے۔ یہ قارئین سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا اس کا رشتہ کہانی پڑھنے والے سے اپنا اور ذاتی ہوتا ہے۔

غرض بنیادی خیال کہانوی ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تمثیلیہ، داستان، ناول، ڈراما، افسانہ اور مثنوی میں یہ قوت حیات کا کام کرتا ہے۔ اس کی توانائی اور پختگی سے ان اصناف کا دم خم اور کس بل برقرار رہتا ہے۔ مگر ہر صنف میں بنیادی خیال کی قوت عمل یا جوش ایک انداز یا درجہ کا نہیں ہوتا۔ ہر صنف ایک مخصوص ادبی پیمانہ ہے جو اپنے موضوع اور اسلوب کے موجب ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل بتایا گیا ہے، ان اصناف کا ایک جزو مشترک "کہانی" ہے، مگر کہانی کی جسامت اس کا قد و قامت، اس کے مزاج اور صورت میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اصناف میں بنیادی خیال کے درجہ توانائی میں بھی یکسانی نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر صنف تمثیلیہ اور داستان میں بنیادی خیال کی قوت عمل کمزور ہوتی ہے۔ اس صنف میں اسلوب کی کشادگی و وسعت اور قالب کی لچک اور ناہمواری سے بنیادی خیال کی توانائی مدھم ہو جاتی ہے۔ صنف ناول اور ڈراما میں بنیادی خیال نظام عصبی کی مثال رکھتا ہے۔ یہ زیادہ قوی اور زیادہ پرجوش ہوتا ہے۔ اس کی برق روی اور حرارت کی وجہ سے ان اصناف کے اجزائے ثلاثہ میں زیادہ پیوستگی و استحکام اور زیادہ نظم و ترتیب قائم رہتا ہے۔ صنف افسانہ میں بنیادی خیال کی توانائی بہت شدید ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ صنف، کہانوی ادب کا سب سے چھوٹا سانچہ ہے۔ یہاں ایک مختصر سی کہانی ایک چھوٹے سے قالب میں پیش کی جاتی ہے۔ لیکن صورت یہ ہوتی ہے کہ "آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے"۔ یہ تندی اور تیزی بنیادی خیال کی قوت عمل کو بہت تیز اور قوی بنا دیتی ہے۔ صنفی لحاظ سے افسانے کی یہ بڑی بڑی منفرد خصوصیت ہے۔ اس کی یہ نمایاں خصوصیت اور انفرادیت اسی بنیادی خیال کے جوش و خروش کا نتیجہ ہے۔ صنف افسانہ میں بنیادی خیال کی ثانوی حیثیت جسے ہم نے حاصل قصہ کہا تھا، بدل جاتی ہے۔ اسے ہم "وحدت اثر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کہانی کا پلاٹ اور پلاٹ کے عناصر، کہانی کے کردار اور کرداروں کی سیرتیں، کہانی کا منظر و پس منظر، اس کا ماحول و فضا، غرض اجزائے ثلاثہ کا ہر جز اور ہر جز کا شیرازہ بنیادی خیال کے شدید درجۂ توانائی سے بالکل تحلیل ہو جاتا ہے۔ بنیادی خیال کی شدت و تیزی کی وجہ سے کہانی کے مختلف حصوں میں ایک عضویاتی اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا اتحاد جس سے قارئین کے تاثرات میں یکتائی و اتفاق واقع ہو جاتا ہے۔ اسی اتحاد اور اسی وحدت کی وجہ سے کہانی پڑھنے کے بعد ہم کسی قسم کے ذہنی انتشار سے دوچار نہیں ہوتے۔

کہانوی اصناف میں بنیادی خیال کی مجموعی حیثیت ہمیشہ مرکزی ہوتی ہے۔ ہر کہانی، خواہ وہ مختصر ہو یا طویل، چند گوناگوں اثرات اور رنگا رنگ کوائف کا ایک دلکش مجموعہ ہوتی ہے۔ بنیادی خیال کہانی کی اس نیرنگی اور بوقلمونی میں ایک ربط و نظم اور یکتائی کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ قصہ یا واقعہ کے مختلف اثرات و کوائف کو ایک داخلی مرکز سے وابستہ رکھتا ہے۔ یہ کہانی کے اجزائے پریشاں میں عدل و اتفاق قائم رکھتا ہے

سوالِ منزل

عفت بانو زیبا کاکوروی

تھکے ہوئے ہیں قدم اور ابھی ہے منزل دور
مدد! مدد! مری نوخیز آرزو کے غرور!

یہ کیا غضب ہے قدم ڈگمگا رہے ہیں کیوں
سفر کے حوصلے اب منہ چھپا رہے ہیں کیوں

یہ کیا ہے آج مرے دل میں کپکپی کیسی!
یہ مجھ کو دوریٔ منزل پہ برہمی کیسی!

صعوبتوں نے یہ کیا کہہ دیا ہے ہمت سے!
کہ اس کا رنگ اُڑا جا رہا ہے وحشت سے!

ذرا سنبھل تو! ذرا دم تو لے دلِ محزون!
ابھی ملا ہی کہاں ہے خرد کو رنگِ جنوں

ابھی تو سرحدِ ادراک سے گزرنا ہے!
ابھی تو وسعتِ افلاک سے گزرنا ہے!

ابھی تو دامنِ ہستی میں تار باقی ہے!
ابھی تو مجھ پہ بہاروں کا وار باقی ہے!

ابھی تو خارِ مغیلاں پہ بھی عبور نہیں
ابھی تو آبلہ پائی کو بھی شعور نہیں

ابھی تو عشق کے شعلوں سے بچ کے چلنا ہے
ابھی تو روح کی پاکیزگی میں ڈھلنا ہے

ابھی ملا ہے کہاں تشنگی کو اوجِ کمال
ابھی تو زیست نے دیکھا ہی کب ہے اپنا مآل

ابھی بلند ارادے بلا رہے ہیں مجھے
ابھی حیات کے وعدے بلا رہے ہیں مجھے

نظر نظر ہے ابھی گردِ کارواں کی تلاش
نفس نفس ہے ابھی سوزِ جاوداں کی تلاش

غزل

متین مچھلی شہری

راہِ الفت میں ملا ہے جذبۂ کامل مجھے
مجھ سے پہلے ڈھونڈھنے نکلی تھی خود منزل مجھے

وجہ آسانی ہیں راہِ شوق کی دشواریاں
لے چلی ہے سوئے منزل دوریٔ منزل مجھے

ڈوبنے دے بحرِ الفت میں کہ بیڑا پار ہو
کس لیے برباد تو کرتا ہے او ساحل مجھے

اضطرابِ شوق کی اللہ ری بے تابیاں
لے گیا منزل سے بھی آگے کئی منزل مجھے

میں وہ مجنوں ہوں جو دیکھے جذبۂ اُلفت مرا
اپنی آنکھوں میں بٹھائے صاحبِ محمل مجھے

ایک دن وہ تھا کہ ہوتی تھی تمنا پر خوشی
اب رُلا دیتی ہے اکثر آرزوئے دل مجھے

میری جانب ہو تو کچھ اُن کی نگاہِ التفات
کشتنی سمجھیں، وہ سمجھیں تو کسی قابل مجھے

طورِ سینا کا کبھی منظر، کبھی ہے عرش کا،
خوب ہی جلوے دکھاتی ہے فضائے دل مجھے

یاس بھی ہے، آس بھی ہے اُن کے ملنے کی متین
زندگی دشوار ہے، مرنا بھی ہے مشکل مجھے

قدیم ہندی تجارت میں مختلف قوموں کا حصّہ

جلالی شاہ جہاں پوری

ہندوستان سے براہ راست تجارت کی کوشش دنیا کی تقریباً تمام قابل ذکر قوموں نے کی ہے۔ اگر ایک طرف عربوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تو دوسری طرف مصر، روم، یونان و فارس، روس، چین اور خیر عرب یہودیوں نے اس سلسلہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مغل دور کے آخر میں تو سارا یورپ ہندی تجارت پر قابو پانے کے لیے دست و گریباں۔ دیکھئے۔

مصر و ہندوستان کے مابین تجارتی تعلقات کی بنیاد دھات کے ابتدائی دور سے ہندی لوہے کی برآمد سے قائم ہوئی۔ حجریاتی دور کے ختم پر لوہا سب سے پہلے جنوبی ہند میں دریافت ہوا تھا اور سندھ کے راستہ بیرون ہند منتقل بھی ہونے لگا تھا۔ چنانچہ اسی راستے سے وہ ایران و عراق اور شام ہوتا ہوا مصر اور افریقہ کے دوسرے حصوں میں پہنچا۔ تورات کی شہادت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیح سے ڈھائی ہزار سال پہلے ہندی فولاد کی تلواریں مصر پہنچتی تھیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی تحقیق کے بموجب اس تجارتی قافلے کے پاس جس نے حضرت یوسف کو کنوئیں سے نکالا تھا خوشبودار چیزوں کے علاوہ ہندی فولاد کی تلواریں بھی تھیں۔ لوہے کی برآمد کے بعد مصر میں ہندی کپاس اور سوتی کپڑے کی درآمد کا نمبر آتا ہے۔ اس درآمد کے زمانہ کا تعین وثوق سے نہیں کیا جا سکتا لیکن ہندوستان میں تین ہزار سال قبل مسیح کپاس کی کاشت کی جاتی تھی اور غالباً فینیقیوں کے تجارتی توسل سے ہندی کپاس کا بیج مصر پہنچا تھا۔ مصر کے بادشاہ اماسس نے سات سو قبل مسیح ایک شخص کو ہندی کپاس سے ڈھلے ہوئے تیار کی ہوئی دو خلعتیں خاص انعام کے طور پر دی تھیں۔ ہندی کپڑے کی درآمدی قدامت کا سرسری اندازہ ڈھائی ہزار سال قبل مسیح کے فراعنۂ مصر کی ان لاشوں سے لگایا جا سکتا ہے جو ہندی ساخت کی نفیس ترین ململوں میں لپٹی ہوئی پائی گئی ہیں[2]۔ کیوں کہ ہندوستان اس وقت اپنے باریک کپڑوں، زرتار کپڑوں، دھاتوں، قیمتی پتھروں، عطریات اور دیگر چیزوں کے لحاظ سے مشہور عالم ہو چکا تھا[3]۔ ایک انگریز مصنف تھارنٹن نے اپنی تصنیف ہندوستان قدیم کی حالت میں تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ جس وقت اہرام مصر عالم وجود میں بھی نہ آئے تھے ہند میں ایسے لائق اور تجربہ کار صناع موجود تھے جو ملکی کپاس سے ایسا نفیس کپڑا تیار کرتے تھے کہ اہل مصر اسے سر اور آنکھوں سے لگاتے تھے[4]۔

تقریباً سولہ سو سال قبل مسیح میں بعہد تھطمس سوم Thutmos III ہندی سامان کی تجارت سے جس میں آبنوس، عود، ہاتھی دانت کی خوشنما مصنوعات، قیمتی پتھر، آبدار موتی، خوشبودار گوند، عطریات، منقش ظروف و زیورات، سوتی ریشمی کپڑے اور تلواریں وغیرہ شامل تھیں مصر میں کافی دولت جمع ہو گئی تھی۔ اس تجارتی

---

[1] انڈیا ہسٹری از اودھ بہاری۔ عہد قدیم مشرق و مغرب از سید سراج الاسلام۔ [2] عرب و ہند کے تعلقات از علامہ سید سلیمان ندوی۔ ہندوستان کی پولیٹیکل اکانومی از امرناتھ بالی۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب از گوری شنکر ہیرا چند اوجھا۔ [3] غریب ہندوستان از مولوی ولی حسن۔ [4] بحوالہ ہندوستان کی صنعت و تجارت از عبدالاحد بہاری۔

لت کی وجہ سے تو طمس کا دار الحکومت عروس البلاد بن گیا تھا۔ مصری حکمرانوں کے
سویں خاندان کے سب سے پہلے فرعون رعمیسس اول (متوفی تیرہ سو سال قبل مسیح) کے
دمیں یہ سلسلہ اور آگے بڑھا اور مصری تاجروں نے ہندی سامان کی تجارت سے
ب دولت کمائی رعمیسس نے دریائے نیل سے بحر قلزم تک ایک کشادہ نہر بھی تجارتی
سلسلہ کو ترقی دینے کے لیے تعمیر کرائی تھی۔[۱] غرض کہ شہنشاہیت مصر کے آخری دور
نی پندرہ سے گیارہ سو صدی قبل مسیح تک مصر و ہند کی تجارت میں مسلسل ترقی نظر
تی ہے اور مصر و ہندی سامان تجارت کی بھی ایک بڑی منڈی دکھائی دیتا ہے
زیٹ مصری تاجروں کو بیرونی تجارت کا خاص مرکز تھا اور یہیں سے ہندی سامان
رپ کے ساحلوں تک پہنچا کرتا تھا۔

مصریوں کے تہذیبی اور تجارتی زوال کے بعد بابل کے تجارت پیشہ قبائل
کا ہندوستان سے تجارتی رابطہ قائم ہوا۔ بابلی مصریوں کی نسبت تجارت کی طرف
زیادہ رجحان رکھتے تھے۔ جو تحریری دستاویزیں ان کے متعلق اب تک ملی ہیں وہ
زیادہ تر کاروباری قسم کی ہیں جن میں تجارتی قرضوں، تبادلۂ مال، شراکت اور دیگر
تجارتی معاملات کا ذکر ملتا ہے۔ بابل میں ہندی مصنوعات کے مقابلہ میں ہند
کی خام اشیا زیادہ درآمد کی جاتی تھیں جن میں خام لوہا، فولاد، سیسہ، روئی، توتیہ،
کافور، لوبان، اور مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں وغیرہ شامل تھیں۔ کپاس کی کاشت
کا طریقہ بھی اہل بابل نے ہندوستان ہی سے معلوم کیا تھا۔ چھ سو قبل مسیح بخت نصر نے
جو بابل کا سب سے طاقت ور بادشاہ تھا نقل و حمل کی آسانی کے لیے شاہ راہیں
تعمیر کرائیں جن سے اس تجارت میں ترقی ہوئی۔ بابل سے ہندوستانی تجارت آبی
راستوں کے علاوہ خشکی کے راستے سے بھی ہوتی تھی۔ اور اس تجارت میں ہندی
تاجروں کے قافلے بھی رواں دواں نظر آتے ہیں۔ عہد قدیم مشرق و مغرب
کے مصنف نے افغانستان ہوتے ہوئے ہندی تاجروں کے قافلوں کا بابل کی
سرحد تک پہنچنا ثابت کیا ہے۔ اور قرون وسطی میں ہندوستانی تہذیب
کے مصنف کے نزدیک پانچ پانچ سو بیل گاڑیوں کے قافلے ہندی سامان تجارت
لے کر ایران کے راستہ بابل تک پہنچا کرتے تھے۔

ایران سے ہندوستان کا تہذیبی اور تجارتی تعلق سرحدی قربت کی بنا پر
بغیر کسی واسطے کے عرصہ دراز سے قائم رہا ہے۔ موجودہ بلوچستان کا بڑا حصہ کسی
زمانہ میں ایرانی سلاطین کے زیر اثر رہ چکا ہے۔ شیبی بلوچستان کے علاقے میں ایرانی
نسل کے باشندے کثرت سے آباد تھے۔ سکندر کو ایران پر حملہ کرتے وقت ایرانی
فوج میں شامل ہندوستان سپاہیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔[۲] اور اس حملہ سے
سو برس پہلے بھی یونانیوں کو ان ہندی سپاہیوں سے سابقہ پڑ چکا تھا جو یونانی
مورخ ہیرودوٹس کے بیان کے مطابق ایرانی فوج کا ایک خاص حصہ تھے۔
یہ ہندوستانی سپاہی غالباً بلوچستانی علاقے کے ہو سکتے ہیں۔ ایران و ہند کے ثقافتی
اور تہذیبی روابط کے متعدد واقعات اور مثالیں ملتی ہیں لیکن یہاں اس سے
بحث نہیں۔ جہاں تک تجارتی روابط کا تعلق ہے ایرانی سوسائٹی چوں کہ ابتدا
سے جنگی ماحول کے زیر اثر رہی اس لیے اہل ایران صنعت و تجارت کی طرف خاص توجہ
نہ دے سکے پھر بھی ایرانی تاجر ہندی سامان تجارت کبھی بلوچستان و افغانستان
اور کبھی خلیج فارس کے راستے جاتے رہے۔ ہندی قافلوں کے ذریعہ اس تجارت
کا سلسلہ قبل مسیح سے جاری ہوا اور اورنگ زیبی عہد حکومت تک قائم رہا چنانچہ
سرجدو ناتھ سرکار کی تحقیق کے بموجب چونتیس ہزار اشتران بارکش کے ساتھ ہندی
تاجروں کا ایک زبردست قافلہ اورنگ زیبی دور حکومت میں درۂ بولان کے راستہ
ایران پہنچا تھا۔[۳] ہند کے بعض قدیم راجاؤں نے اندرونی اور بیرونی تجارتی توسیع
کے لیے وسیع و عریض سڑکیں تعمیر کرائی تھیں۔ گو ان کی تعمیر میں فوجی نقطۂ نگاہ
کو بھی بڑا دخل تھا لیکن ان کا استعمال تجارتی مقاصد میں زیادہ رہا ہے۔ سولہ
سو میل کی ایک طویل شاہ راہ ۳۰۰ء میں ساحل کارومنڈل سے راس کماری
تک تعمیر ہوئی تھی اور دوسری اس سے بہت پہلے یعنی موریہ عہد کے خط میں پاٹلی
پتر سے افغانستان تک تعمیر کی گئی تھی۔ ایک بیان کے مطابق ہندی تاجروں کے
قافلے موریہ عہد کی اسی گیارہ سو میل طویل سڑک کے ذریعہ افغانستان ہوتے ہوئے
ایران پہنچا کرتے تھے۔[۴] نویں صدی کے مشہور عرب تاجر اور سیاح ابن حوقل کے
بیان کے بموجب ایران و ہند کے مابین کابل اور غزنی کے راستہ تجارت کا پتہ چلتا
ہے۔ ہندی تاجروں کے لیے کابل اور غزنی میں بڑی بڑی قیام گاہوں کی موجودگی
سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ ایران و ہند کی تجارت میں عربوں کا بھی حصہ رہا

---

[۱] عہد قدیم مشرق و مغرب از سید سراج الاسلام۔ [۲] عرب و ہند کے تعلقات از علامہ سید سلیمان صاحب ندوی۔ [۳] ہندوستان کی پولٹیکل اکانومی از مرناتھ بالی
[۴] ہندی پولٹیکل انسٹی ٹیوشنز اینڈ تھیوریز آف ہندوز۔ از ونے کمار سرکار۔ دنیا کی کہانی۔ از پروفیسر محمد مجیب

ہے۔ ہند میں عربوں کے قیام کے بعد ان کی تجارتی سرگرمیوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ عرب خلیج فارس کے راستے جنوبی ہند کی مختلف اشیا کے علاوہ وادی سندھ میں کاشت کردہ تلہن اور چاول تک ایران لے جاتے تھے اور ایرانی سوداگر اس درآمد شدہ مال کو ایران کے اندرونی علاقوں میں پہنچایا کرتے تھے۔

روس اور ہندی تجارتی تعلقات کے سلسلہ میں کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ملتی لیکن نویں صدی عیسوی کا مشہور عرب سیاح اور جغرافیہ نویس ابن خردازبہ جو خلیفہ معتمد عباسی کے زمانہ میں ایک بڑا افسر بھی تھا اس بارے میں کچھ لکھا ہے۔ اس کی تحقیق کے بموجب روسی تاجر مغربی دنیا کا چکر لگا کر شام، بغداد، بصرہ، اہواز، فارس، کرمان، بلوچستان، سندھ اور ہندوستان خاص ہوتے ہوئے چین تک پہنچا کرتے تھے اور واپسی پر ہندی سامان تجارت مغرب تک پہنچاتے تھے۔ روسی مصنف نوی گوف کے نزدیک ہندی روسی تعلقات کا سلسلہ تیرھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے قائم ہوا جب روسی سیاح اناتاسی نکیتن نے سرزمین ہند پر قدم رکھا تھا۔ کارام زین پہلا شخص ہے جس نے اناتاسی نکیتن کا سفر نامہ ہند دریافت کر کے اس پر ایک تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی۔ کارام زین کے نزدیک بھی ہندی عوام، پرتگالیوں، ڈچوں اور انگریزوں کو جاننے سے پہلے روسیوں سے واقف ہو چکے تھے۔

چین سے ہند کے تجارتی تعلقات میں اگرچہ عربوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن اسرائیلی اور روسی قبائل کی تجارتی سرگرمیاں بھی کچھ کم نہیں رہیں۔ یہ لوگ ہندوستان ہو کر چین تک دھاوا مارا کرتے تھے اور واپسی پر چین کی نفع بخش اشیا لے کر ہند کے مشرقی ساحلوں سے گزرتے ہوئے یمن، فلسطین اور شام و مصر تک چلے جاتے تھے۔ مشرقی بندرگاہوں میں بنگال کی تملک نامی بندرگاہ مشرقی ایشیا کی تجارت کا اہم ذریعہ تھی۔[1] اسرائیلی اور روسی قبائل کے تجارتی جہاز ہند کے مغربی ساحلوں پر لنگر انداز ہونے کے بعد جب مشرقی ساحلوں پر پہنچتے تو یہاں بھی ان کو بہت سی ایسی چیزیں ملتی تھیں جن کی چین میں بہت کھپت تھی۔ مثلاً ہاتھی دانت اور گینڈے کے سینگوں کی چین میں بڑی مانگ رہا کرتی تھی۔ اہل چین ان سینگوں کو تراش کر اپنے اسلاف کی تصاویر ان پر کندہ کیا کرتے تھے اور مختلف سائز کی پیٹیاں بھی بناتے تھے۔ مذکورہ قبائلی تاجروں کے علاوہ خود ہندی تاجر بھی بری اور بحری راستوں سے ہندی سامان تجارت چین تک پہنچاتے تھے۔ چین سے خشکی کے ذریعہ تجارت کے کئی راستے تھے۔ ایک راستہ آسام اور برما کے ذریعہ اور دوسرا خراسان ہو کر تھا۔ مشہور عرب سیاح اور جغرافیہ نویس مسعودی جو تقریباً نویں صدی عیسوی کے وسط میں ہندوستان آتے ہوئے خراسان سے بھی گذرا تھا اپنے چشم دید بیان کے مطابق لکھتا ہے کہ "ہندوستان کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت خراسان تک جاری تھی اور چونکہ خراسانی سرحدوں سے چین خاص کو راستہ جاتا تھا اس لیے اس راستے سے بھی ہندی سامان تجارت چینی سرحدوں تک پہنچا کرتا تھا۔"

بحری تجارت کے سلسلہ میں اہل ہند کے بیرونی سفروں کا ذکر کتابوں میں بہت کم ملتا ہے۔ بیشتر مورخین ہندی جہاز رانوں کی ان کوششوں کے سلسلہ میں کوتاہ قلم نظر آتے ہیں جو انھوں نے بحری راستوں کے ذریعہ ہندی تجارت کو مشرق و مغرب میں فروغ دینے کے لیے کی ہیں۔ لیکن یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے کہ خود اہل ہند اپنے ہی جہازوں کے ذریعہ مشرق و مغرب میں ملکی مال تجارت پہنچاتے رہے ہیں۔[2] قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب کے مصنف کی تحقیق کے بموجب ہندوستان کے تجارتی تعلقات زمانہ قدیم سے عرب و فارس، مصر و یونان، روم و چین اور جاوا سماترا سے قائم تھے۔ اور ہندوستان کے جہاز راں آبی راستوں سے ان ممالک سے تجارتی فرائض انجام دیا کرتے تھے جس کے لیے انھوں نے بڑے بڑے تجارتی جہاز تیار کر لیے تھے۔ ہندی جہاز سازی اور جہاز رانی کی شہرت قرب و جوار ہی میں نہ تھی بلکہ یورپ کے ملکوں تک پہنچ چکی تھی چنانچہ ڈاکٹر مکرجی نے اپنی مشہور تصنیف (ہسٹری آف انڈین شپنگ) میں یونانی مورخ ایرین (Arrean) کے حوالے سے لکھا ہے کہ "دارا اور سکندر نے ہندوستان میں سیکڑوں جہاز تیار کرائے تھے۔" نویں صدی کے مشہور عرب سیاح سلیمان تاجر نے ہندی دماغ کی اختراعی صلاحیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اہل ہند بڑے صناع اور مخترع ہیں اور خصوصاً جہاز سازی کے فن سے بخوبی واقف ہیں اور اعلیٰ درجہ کے جہاز بناتے ہیں۔" اسی سیاح نے جنوبی ہند کی ایک قدیم بندرگاہ کولم ملی میں جہازوں کی تعمیر اور مرمت کے ایک

---

۱ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب از رائے بہادر گوری شنکر ہیرا چند اوجھا: عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی۔ ۲ تاریخ البرامکہ از مولانا عبدالرزاق کانپوری۔

کارخانے کا بھی ذکر کیا ہے۔ ابن بطوطہ کے سفرنامے سے بھی مالابار کے جوپٹن نامی بندرگاہ میں جہاز سازی کے کارخانہ کا پتہ چلتا ہے۔ عرب جہاز راں بھی اپنے جہاز یہاں تیار کراتے تھے۔ چناں چہ عمان کے اسحاق نامی ایک یہودی تاجر نے اپنے جہاز ہندوستان میں تعمیر کرائے تھے۔[1] ان تاریخی حوالوں کی موجودگی میں ہندی تاجروں کا اپنے جہازوں کے ذریعہ ہندی سامان تجارت مشرق بعید کے ساحلوں تک پہنچانا شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

اہل رومہ کا ہندوستان سے تجارتی سلسلہ کب شروع ہوا اس کا تعین بھی خود مشکل ہے لیکن تقریباً چار سو قبل مسیح جو ہندی سامان فنیقیوں کی معرفت فلسطین کی بندرگاہوں میں پہنچتا تھا اس کو رومی تاجر خرید کر روم لے جاتے تھے لیکن رومی اس بالواسطہ تجارت سے مطمئن نہ تھے۔ ان کا ذہنی رجحان براہ راست تجارت کی طرف تھا مگر آبی شاہراہوں پر یونانیوں اور عربوں کے ملے جلے تسلط کی وجہ سے ایک صدی قبل مسیح تک اہل رومہ کو براہ راست تجارت کے موقع فراہم نہ ہو سکے۔ بہرحال انھوں نے پہلی صدی عیسوی کی ابتدا ہی سے عربوں کو مطیع کرنے اور ہندی تجارت سے بے دخل کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ چناں چہ ۲۵ء میں شام وفلسطین سے مصر جانے والے راستے کو اپنے اقتدار میں رکھنے کے لیے رومیوں نے عقبہ میں ایک زبردست فوجی چھاؤنی بھی قائم کر لی تھی۔ لیکن اغسطس کی زمانے میں ان کی یہ کوششیں پورے طور پر بار آور نہ ہوئیں۔ قدیم رومی مورخ سرابو کے بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربوں کو اس تجارت سے پوری طرح بے دخل نہ کر سکے۔ ابھی حال میں آندھرا پردیش کے ناگساجن نامی گاؤں میں کھدائی کے دوران ایک صدی قبل مسیح کے رومی شہنشاہ آگسٹس کے زمانے کے کچھ سکے اور دیگر ایسی چیزیں دستیاب ہوئی ہیں جن سے روم وہند کے مابین براہ راست تجارت پر روشنی پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں دکھنی ہندوستان کے مختلف حصوں سے قیصر اغسطوس[2] (دو سو بارہ سال قبل مسیح) کے عہد کے جو طلائی ونقرئی سکے دستیاب ہوئے ہیں ان سے بھی اہل رومہ کا بحر قلزم کے راستہ اپنی دلی آرزو کو عملی جامہ پہنانے کا ثبوت، ملتا ہے۔ خود اہل ہند کی بھی روم سے براہ راست تجارت کی خواہش کا ثبوت ملتا ہے۔ چناں چہ چندر گپت موریہ کے لڑکے بندوسار نے تقریباً ڈھائی سو قبل مسیح شام کے ایک رومی حاکم اینٹیوکس اول Antiochus I کو کچھ تحائف بھیج کر شامی انجیر، رومی شراب اور یونانی فلسفیوں کو ہند روانہ کرنے کی فرمائش کی تھی۔ رومی مورخ پلوٹارک نے بتایا ہے کہ دکھن کے ایک راجہ پنڈیون نے قیصر روم کو ہند کی مختلف چیزیں جن میں ایک بیش قیمت ہار، ہاتھی دانت اور خوشبو کی چیزیں شامل تھیں بطور سوغات بھیجا تھا بہرحال روم میں ہند کے مختلف سامانوں کی کھپت رہی ہے جس میں شالیں، قالین، ظروف وزیورات، تلواریں، گنا، لوبان، موتی اور ریشمی کپڑے، کالی مرچیں اور مختلف قسم کی خوشبوئیں زیادہ درآمد ہوتی تھیں۔ ہند کی باریک اور خوش رنگ ساریاں رومہ کی فیشن پرست عورتوں کو بہت پسند تھیں۔ عمدہ قسم کی نفیس مرچیں تقریباً پندرہ روپیے سیر کے حساب سے رومی بازاروں میں فروخت ہوا کرتی تھیں۔[3] سوتی کپڑوں میں ڈھاکہ کی باریک ترین ململیں جو کیلیکو کے نام سے رومہ میں مشہور تھیں بہت زیادہ درآمد ہوتی تھیں۔[4] رومی سلاطین وامراء کے ذوق کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی فلسطین کے راستہ ہندی مصنوعات وغیرہ پہنچنے میں تاخیر ہوتی تو وہ ان اشیا کو مصری منڈیوں سے حاصل کرتے تھے۔[5] دوسری صدی عیسوی کے وسط سے رومہ کے مختلف مقامات پر ۱۳ اگست کو سالانہ تجارتی میلے لگا کرتے تھے جن میں لاکھوں کروڑوں کا سامان تجارت فروخت ہوتا تھا اور یورپ کے مختلف حصوں کے تاجر خرید وفروخت کے لیے ان جگہوں پر جمع ہوتے تھے۔ اس طرح ہندی سامان یورپ کے تقریباً ہر حصہ میں آسانی سے پہنچ جاتا تھا۔[6] ہندی سامان کی رومہ میں درآمد اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ رومہ کی دولت تیزی سے ہندوستان کی طرف کھنچنے لگی تھی جس کی بنا پر رومہ کے ایک معاشی مفکر پلینی کو شکوہ کناں انداز میں کہنا پڑا تھا کہ "رومہ کی بہت بڑی دولت ہندوستان کی طرف تیزی سے بہتی چلی جا رہی ہے"۔[7] اسی مفکر نے اپنی تصنیف نیچرل ہسٹری میں لکھا ہے کہ روم سے

---

[1] عرب وہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی۔ [2] اس کا اصل نام آکتاویس Octavius تھا لیکن تخت نشین ہونے کے بعد اس نے اغسطوس Augustus اور امپریر کے لقب اختیار کیے اور اسی امپریر سے لفظ Emperor بہ معنی شہنشاہ وجود میں آیا۔ [3] دروس تہ الکبری از مولانا عبدالحلیم شرر۔ [4] تاریخ البرامکہ از مولانا عبدالرزاق کانپوری۔ [5] ہندوستان کی صنعت وتجارت از عبدالاحد بہاری۔ [6] عہد قدیم مشرق ومغرب از سید سراج الاسلام ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ از ڈاکٹر زین العابدین۔ [7] مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب از جے۔ سی کمارپا۔

نو لاکھ پونڈ ہر سال ہندوستان آیا کرتے تھے۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب کے مصنف نے انسائیکلوپیڈیا برٹینکا کے حوالہ سے لکھا ہے کہ صرف شہر روما میں چالیس لاکھ روپے کا کپڑا ہندوستان سے پہنچا کرتا تھا۔

اہل یونان کا ابتدا میں ہندوستان سے براہ راست تجارتی تعلق قائم نہ تھا بلکہ وہ مصر اور میسوپوٹامیہ میں عربوں کے درآمد کردہ مال تجارت سے ہندی قالین، زیورات و ظروف، ہاتھی دانت کی مورتیاں، قیمتی پتھر، گرم مسالے اور فولادی سامان خرید کر یونان لے جاتے تھے لیکن تقریباً ۳۰۰ سال قبل مسیح میں یونانیوں کے مصر پر قابض و دخیل ہو جانے کے نتیجہ میں اسکندریہ، انطاکیہ اور رہوڈس بحر روم میں تجارت کے جدید مرکز بن گئے[1]۔ ان تجارتی مرکزوں سے ہندوستان کا مال تجارت کثرت سے یونان پہنچنے لگا اور اس درآمدی سامان کو ملک اندرونی علاقوں میں پہنچانے کے لیے سڑکیں اور پل وغیرہ تعمیر کیے گئے[2]۔ یونان میں ڈھاکہ کی ململوں کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ ہندی شکر بھی یونان میں درآمد ہوتی تھی، چونکہ یونانیوں کو اس کا صحیح نام معلوم نہ تھا اس لیے وہ اس کو ہندی نمک اور میٹھا نمک کہتے تھے، روما میں بھی یہ اسی نام سے مشہور تھی۔ یونانیوں نے اس کا ایک اور نام گنے کا شہد بھی رکھ چھوڑا تھا۔ گنے کی بابت ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کا یہ وہ میٹھا درخت ہے جو مکھیوں کے بغیر شہد پیدا کرتا ہے۔ پہلی صدی عیسوی کے شروع میں عرب علاقوں سے بھی کھجور کی بنی ہوئی شکر مصر اور یونان وغیرہ میں درآمد ہونے لگی تھی لیکن وہ رنگ اور ذائقہ میں نسبتاً خراب ہوتی تھی اس لیے دوسری صدی عیسوی کے آخر سے عرب تاجر ہندوستان سے سفید شکر خرید کر بحر روم کے ساحلی مقامات پر فروخت کرنے لگے تھے[3]۔ ہندی سامان تجارت کی یونان میں روز افزوں درآمد کی وجہ سے یونان کی دولت ہندوستان کی طرف منتقل ہوتا دیکھ کر قدیم یونانی مورخ پلونی Pliny کو کہنا پڑا تھا کہ "ملکی محاصل کا ایک معتدبہ حصہ ہر سال ہندوستان کے ساتھ تجارت میں ختم ہو جاتا ہے[4]۔" ابتدا میں اہل یونان نے کاروباری طریقوں میں کوئی جدت پیدا نہ کی بلکہ اس معاملہ میں وہ پورے طور پر فینیقیوں کے نقش قدم پر چلتے رہے پھر بھی وہ بین الاقوامی تاجر بن گئے اور کاروباری اثرات کی بنا پر ان کو دنیا کے سیاسی اور معاشی میدان میں بڑی طاقت حاصل ہو گئی۔ یونانی سمندر کے قریب بے شمار جزیروں کی موجودگی اس کی تجارتی ترقی میں بڑی معاون ثابت ہوئی۔

مصر و یونان وغیرہ کے ہندوستان سے جو تجارتی تعلقات تھے ان کا ذکر تو مختصراً کر دیا گیا ہے لیکن عربوں کو اس معاملہ میں جو تقدیم اور برتری حاصل رہی ہے اس میں ان کا کوئی حریف و مقابل نظر نہیں آتا۔ عرب کے قدیم افسانوی ادب کا بڑا حصہ سفری داستانوں سے بھرا پڑا ہے۔ سفر کی صعوبتیں، راستوں کی مشکلات، عجائبات عالم کی سیر، خطۂ عالم میں بسنے والے انسانوں کے مختلف عادات و خصائل، جغرافیائی و تاریخی حالت، تہذیب و تمدن کے دلچسپ تذکرے، ہمت و جرأت کے اسباق، سیر و سیاحت کے اذکار و لطائف اور تجارت کی صدہا باتیں ان افسانوی سفروں سے معلوم ہوتی ہیں۔ غرض کہ دنیا میں جب سے بین الاقوامی تجارت کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس وقت سے عرب اس کاروباری سلسلہ میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ہندوستان سے عربوں کے ابتدائی تجارتی مرکز حضرموت، یمن، فلسطین اور شام کے علاقے رہے ہیں۔ بعد کو اس سلسلہ میں حجاز بھی شامل نظر آتا ہے۔ جب یہ سلسلۂ تجارت دراز ہوا تو عرب کے تقریباً ہر قبیلہ نے اس میدان میں ایک دوسرے سے مسابقت شروع کر دی۔ اسی بنا پر عرب کبھی فینیقیوں کے نام سے آبی راستوں کو طے کرتے نظر آتے ہیں، کبھی قوم سبا کے نام سے ہندی تجارت کو زندگی کا مشغلہ بنائے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی بابلی، آشوری، حمیری اور اسرائیلی نام سے تجارت کے میدانوں میں تگ و دو کرتے نظر آتے ہیں۔ نام خواہ کچھ ہو لیکن قومیت اور وطنیت کے لحاظ سے یہ سب عربی النسل تھے اور ہندوستان میں ان کی آمد و رفت مسیح سے تقریباً تین ہزار سال پہلے سے جاری تھی۔

زمانۂ قدیم کی تاریخ سے متعلق جو مواد موجود ہے اس سے یہ بات پوری طرح ثابت ہے کہ اُس زمانہ میں چین و ہندوستان، اور اسی طرح مشرقی افریقہ، مصر، شام، ایشیائے کوچک اور یونان و روم کے مابین جتنی بحری تجارت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک عربوں کے واسطے سے ہوتی تھی۔ ہندوستان سے بحری تجارت کے دو راستے

---

[1] انڈین ہسٹری از اودھ بہاری۔ [2] عہد قدیمہ مشرق و مغرب از سید سراج الاسلام۔ [3] دنیا کی صنعت شکر سازی از پروفیسر گیر لنگس۔ [4] تمدن ہندوستان صفحہ ۳۶ از مولوی ولی حسن۔

نا فطرت کے نمونے

وادی گل (چمولی)

کوہستان ہمالہ کے دامن میں
فطرت کے جلال و جمال، دونوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اُتر پردیش کا پہاڑی علاقہ،
نمونے نظر آتے ہیں۔ ان
نع ہے اس لیے وہاں گوشے گوشے میں قدرت کی حُسن کاری اور شکوہ و جلال کے خوب صورت
ان صفحات پر اُتر پردیش
لاتوں میں انسان کو جہاں کہیں اپنا ہنر دکھانے کا موقع مل گیا اُس نے حسین کو حسین تر بنا دیا۔
لطف اندوز ہونے کے لیے ہر سال
ے چند پہاڑی مقامات کے دل کش مناظر پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان مناظر سے
ہزاروں آدمی ان مقامات پر آتے رہتے ہیں

مینی تال جھیل کا نظر نواز اور تسکین بخش کر





، وادیِ گُل کا ایک اور نظارہ

اترپردیش کا



پتھوڑاگڑھ

نینی تال



مسوری





بھیم تال





مات

نیل کنٹھ (بدری ناتھ)



الموڑے کا ایک نظارہ



دل فریب نظارے



بدری ناتھ کے راستے میں ایک حسین منظر

نینی تال کی جھیل کے کنارے کشتیاں جمع ہیں



تھے ایک خلیج فارس کا راستہ جس سے تمام سامان عرب کے مشرقی ساحل پر اُترتا تھا اور دومۃ الجندل یا تدمر (Palmyra) ہوتا ہوا آگے جاتا تھا دوسرا راستہ بحرِ ہند کا تھا جس سے جانے والا مال حضر موت' اور یمن سے گذرتا تھا۔ یہ دونوں راستے وہ تھے جن پر عرب آباد تھے' عرب ایک طرف مال خریدتے تھے اور دوسری طرف اس کو فروخت کرتے تھے۔ یہ لوگ تجارتی نقل وحمل کا کاروبار بھی کرتے تھے' اس کے علاوہ اپنے علاقوں سے گذرنے والے قافلوں سے بھاری ٹیکس لے کر انھیں بہ حفاظت راستہ طے کرانے کا ذمہ بھی لیتے تھے۔ ہندوستان کی مصنوعات کا تجارتی سلسلہ ابتدا میں فنیقی اور سبائی عربوں اور بعد کو حمیری اور آشوری قبائل کے واسطے سے قائم تھا۔ آشوری سلاطین نے اپنا تجارتی تعلق ہندوستان سے مستحکم رکھنے کے لیے ملکی تاجروں کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جس کے نتیجہ میں دجلہ اور فرات کی وادی کے شہر تجارت کا اہم مرکز بن گئے[1]۔ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کے زمانہ سے یمن کے سبائی اور ان کے بعد حمیری قبائل ابتدائے سنِ عیسوی تک تجارتی نقل وحمل کرتے رہے۔ اسرائیلی تاجر بھی اسی عہد کے لگ بھگ ہندوستان کے ساحلی علاقہ کیرالا سے مختلف اشیا کی تجارت کیا کرتے تھے جن میں تلواروں کے علاوہ کالی مرچیں خاص طور سے شامل تھیں اور غالباً یہ علاقہ اسی زمانہ سے عربی حلقوں میں بلاد الفلفل کے نام سے مشہور ہوگیا۔ مشہور مورخ الفنسٹن کی تحقیق سے بھی قوم سبا کا یمنی علاقوں میں آباد ہونا اور اس کی معرفت ہند کی خام اور مصنوعہ اشیا کا یمن بلکہ مصر تک پہونچنا ثابت ہوتا ہے۔

خاص قلب عرب (حجاز) کی تجارت کا سلسلہ بھی بہت قدیم ہے شمالی حجاز میں مدین اور ددان کی تجارت مسیح سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے دنیا کے مختلف سامان تجارت کے ساتھ ہندی مال تجارت پر بہت کچھ منحصر تھی۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے قریب کے زمانہ میں فلسطین کے یہودی یثرب' وادی القریٰ' تیما اور تبوک میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ ان کے مذہبی' ثقافتی اور تجارتی تعلقات شام و فلسطین کے عربی النسل یہودیوں سے قائم ہوئے اور شام و فلسطین کے یہودی دوسرے ملکوں کے سامان کے ساتھ ہندی مال تجارت ان نو آباد شدہ یہودیوں کی معرفت مذکورہ مقامات پر پہنچاتے تھے۔

پانچویں صدی عیسوی میں قبیلہ قریش نے بھی عرب کی بیرونی تجارت میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا اور پیغمبرِ اسلام کے عہد مبارک تک ایک طرف یمن و حبش' دوسری طرف عراق اور تیسری جانب مصر و شام سے اُن کے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ خود پیغمبرِ اسلامؐ نبوت سے قبل جناب خدیجہؓ کا مال تجارت لے کر ملک شام تشریف لے گئے تھے اور چونکہ شام کا علاقہ اُس وقت ہندی مال تجارت کی ایک بڑی منڈی تھا اس لئے بہت ممکن ہے کہ آں حضرت نے کسی ہندی سامان کو پسند فرمایا ہو۔ حجاز کا علاقہ معاشی اور صنعتی اعتبار سے بہت ہی پس ماندہ واقع ہوا تھا حتیٰ کہ اشیاء خوردنی کا بھی بڑا حصہ باہر ہی سے درآمد ہوتا تھا۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے زمانہ میں یہ درآمدی تجارت زیادہ دو گروہوں کے ہاتھ میں تھی۔ ایک قریش و ثقیف کے قبیلے' دوسرے یہود۔ یہ قبائل خاندانی طور سے تجارت پیشہ تھے۔ صحابہ کرامؓ میں بھی بہت سے ایسے نام ملتے ہیں جن کا معاشی پیشہ قبل اور بعد اسلام تجارت ہی نظر آتا ہے بلکہ ان کے تجارتی قافلے حبش' یمن' اور مصر تک آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان تجارتی قافلوں کی رہ نمائی یہ صحابۂ رسول بہ ذاتِ خود بھی کرتے تھے مگر زیادہ تر کاروبار ایسے ملازمین انجام دیتے تھے جن کی دیانت مصدقہ اور کاروباری صلاحیت مسلمہ ہوتی تھی۔ ان کو جس ملک کا سامان بھی ملتا تھا اس کو وہ عرب کے اندرونی علاقوں تک پہنچاتے تھے۔ درآمد شدہ مال کی تھوک فروشی اُن کا خاص کام تھا۔ اندرون ملک کی چھوٹی چھوٹی بستیوں اور قبائلی علاقوں میں یہ کام مقامی خوردہ فروش تاجر کیا کرتے تھے۔ چونکہ شمالی حجاز کی تجارت میں مسیح سے کئی صدی بعد تک ہندی سامان کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ شامل ہوتا تھا اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس عہد میں بھی ہندی سامان کی تجارت سے فائدہ نہ اُٹھایا جاتا ہو۔

ہندوستان سے عربوں کی تجارت کا سارا دار و بست ہمیشہ آبی شاہراہوں کے ذریعہ قائم رہا۔ ابتدا میں یہ ایک قسم کی چلتی پھرتی تجارت تھی۔ لیکن اسلام سے کچھ صدی پہلے عرب کے یہودی اور عیسائی سوداگروں نے سرزمین ہند کو ہیڈ

[1] عہد قدیم مشارق و مغارب از سید سراج الاسلام [2] عرب و ہند کے تعلقات از علامہ سید سلیمان ندوی [3] ثقافت الہند (ہندوستانی ثقافتی کونسل کا عربی رسالہ ۱۹۶۰ء)۔

کو ارٹر بنا کر تجارت کی بنیاد ڈالی اور اسلام سے کچھ صدی بعد مسلمان عربوں نے سندھ، بلوچستان، کچھ، کاٹھیاوار اور جنوبی ہند کے ساحلی مقامات پر مستقل بود و باش اختیار کر لی۔ یہ لوگ یہیں سے درآمدی و برآمدی دونوں قسم کی تجارت کرتے تھے۔ ان کو ان ساحلی علاقوں میں ہر قسم کی مصنوعات اور خام سامان آسانی سے میسر آجاتا تھا۔ کچھ سامان تو ان علاقوں میں خود پیدا اور تیار ہوتا تھا اور کچھ ہندی تاجروں کے قافلوں کے ذریعہ مذکورہ ساحلی علاقوں تک پہنچتا تھا اور وہاں سے یہ سب سامان عربوں کی تجارتی ایجنسیوں کی معرفت دوسرے ملکوں کو چلا جاتا تھا۔ سندھ اور بلوچستان کی بندرگاہیں دیبل، تیز اور وابل خلیج فارس کے ساحلی علاقوں سے قریب تر تھیں۔ ان بندرگاہوں سے بادبانی کشتیوں کے ذریعہ حضرموت، عمان اور عراق کے کنارے تک یہ سامان آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے یہاں عربی تاجروں کی متعدد بستیاں قائم ہوگئی تھیں۔ سندھ میں دیبل عرب سوداگروں کا اہم مرکز تھا۔ سندھ اور پنجاب کی جملہ پیداوار اسی بندرگاہ سے عربی علاقوں میں پہنچ کر دور دراز خطوں تک پہنچتی تھی۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ کی بندرگاہیں تھانہ، سوبارہ کھمبو وغیرہ عربوں کی بود و باش اور تجارت کی وجہ سے تجارتی چہل پہل کا مرکز بن گئی تھیں۔ ابن بطوطہ کی تحقیق کے بموجب یہاں کے اکثر و بیشتر مقامی تاجر بھی عرب ملکوں سے انفرادی طور پر تجارتی تعلق رکھتے تھے اس سے کچھ آگے بڑھ کر مدراس اور مالابار میں بھی عرب سوداگروں کی معقول تعداد آباد تھی جن کے ذریعہ بصرہ اور عمان وغیرہ کو ہندی سامانِ تجارت جایا کرتا تھا۔ جنوبی ہند کی قدیم مشہور بندرگاہ کالی کٹ میں مقیم عربوں کا بہت اچھا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ یہاں سے چین، جاوا، سماترا، سیلون اور فارس وغیرہ کو عرب سوداگروں کے تجارتی جہاز روانہ ہوتے تھے کارومنڈل کا ساحل بھی عرب تاجروں کے قیام کا بڑا مرکز تھا۔ یہاں سے فارس، عراق اور عرب کے دیگر ملکوں کو کثرت سے ہندی سامان برآمد کیا جاتا تھا۔

غیر عرب یہودیوں کے توسل سے بھی ہندی سامان تجارت مشرق و مغرب میں پہنچتا رہا ہے۔ مصر و شام، عراق و ایران، روم و قلزم اور بحر ہند پر مسلمان عربوں کا سیاسی اقتدار ہو جانے کے بعد ہند اور یورپ کی تجارت غیر عرب یہودیوں کی معرفت ہونے لگی تھی۔ یہ لوگ اسلامی ملکوں اور یورپ دونوں جگہ روشناس تھے اور عرب عیسائی ملکوں میں مسلسل آمد و رفت کی بنا پر ان کی زبانوں میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ اس لئے ان کو تجارت میں نسبتاً زیادہ آسانیاں حاصل تھیں۔ اور عرب و عیسائی تاجروں کے مابین یہ درمیانگی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ مشہور مورخ ابن خردازبہ کے بیان کے مطابق یہ بری اور بحری راستوں سے دنیا کے کونے کونے میں تجارتی لین دین بھی کرتے پھرتے تھے اور جس جگہ ان کو نفع بخش سامان ملتا تھا اس کو لے کر دوسری جگہ پہنچاتے تھے۔ ہندوستان میں ان کی تجارتی آمد و رفت دو راستوں سے ہوا کرتی تھی۔ وہ مغرب سے نکل کر بحر روم کے مصری ساحلوں پر اتر کر خرید و فروخت کرتے اور وہاں سے اشتران بارکش کے ذریعہ بحر قلزم تک آتے۔ پھر جہازوں کے ذریعہ جدہ اور یہاں سے ہندوستان پہنچتے اور کچھ عرصہ یہاں قیام کے بعد ہندی مال تجارت جہازوں پر بار کر کے چین تک لے جاتے تھے۔ پھر اسی راستہ سے مشرق بعید کا سامان سرزمین ہند لاتے اور یہاں کی مصنوعات وغیرہ مغربی ممالک تک پہنچاتے تھے۔ ان کا دوسرا راستہ یہ تھا کہ عرب سے نکل کر بحر روم پار کر کے شام پہنچتے اور خشکی کے ذریعہ بغداد آتے۔ پھر اس راستے اس وقت کی مشہور بندرگاہ اُبلہ میں داخل ہوتے اور یہاں سے براہِ عمان ہندوستان آتے اور ہندی سامان جہازوں پر بار کر کے چین تک چلے جاتے۔ ان دونوں سفروں میں ہند کا مصنوعہ سامان ان کی معرفت ایک طرف چینی سواحل اور دوسری جانب مغربی ممالک تک پہنچا کرتا تھا۔

ہند کی برآمدی اشیا میں سب سے زیادہ قدامت لوہے اور فولاد کو حاصل ہے۔ اس کے بعد روئی، قیمتی پتھر، شکر، کپڑے، مسالے اور ہاتھی دانت کا بالترتیب نمبر آتا ہے۔ تدریجاً اس برآمدی فہرست میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ دنیا کی ضرورت کی تقریباً ہر چیز برآمد ہونے لگی۔ ابن خردازبہ کی مرتبہ فہرست میں عود، آبنوس، بید، جائفل، جاوتری، الائچی، تیزپات، کباب چینی، لوبان، مشک اور دیگر خوشبودار چیزوں کے علاوہ خوش رنگ قالین، نظر نواز شالیں، ریشمی کپڑے، باریک ململیں، جنوبی ہند کی چھینٹیں، کنبایت کے اعلیٰ قسم کے جوتے، منقش ظروف و زیورات، سیسہ، توتیا، ناریل اور اس کے ریشوں کی مصنوعات، بانس، شیشے اور کانچ کا مصنوعہ سامان اور مختلف قسم کی ادویہ شامل ہیں۔ بشاری اور ہمدانی نے اپنی مرتبہ فہرستوں میں ان اشیا کا اضافہ کیا ہے۔ گینڈے کے سینگ اور ہاتھی دانت کی مصنوعہ اشیا کے علاوہ کالا نمک، مکھن، رنگ، سنبل، خولنجان، ہڑ بہیڑہ، ساگوان کی

لکڑی، قرنفل، سونٹھ، نیل، ادرک، نیلوفر، تلواریں، نیزے، آلات جراحی، کالی مرچیں، لہسن، چاول، لیموں، آم، کیلا، شہد، مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں سونے چاندی کی مورتیاں اور خوش رنگ و خوش گلو پرندے وغیرہ۔ ان اشیا میں جن چیزوں کی جس ملک میں زیادہ کھپت ہوتی تھی دنیا کے تاجر انھیں چیزوں کو لے کر اُس ملک میں پہنچتے اور خاطر خواہ نفع حاصل کرتے تھے۔
ان تمام برآمدی اشیا میں ہندی کپڑے اور شمشیر ہندی کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔ چنانچہ یہ اسی شہرت قدیم کا صدقہ ہے کہ "سیف ہندی"[1] کی قدر و قیمت اور اس کے جوہر کی تعریف سے قدیم عربی اور فارسی لٹریچر مالامال نظر آتا ہے۔ عرب کا ایک حقیقت نگار کہتا ہے:

سیوفٌ مالها قد استغنت عن الصَّیقل
ومانحر اذا اهتزت بها الجحفل

یعنی ہندی ساخت کی تلواریں دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتیں اور ان کو کبھی صیقل کی بھی حاجت نہیں ہوتی۔ اور نیزے ایسے ہیں کہ جب وہ ہلتے ہیں تو فوج کی فوج اُن سے ہل جاتی ہے۔
فردوسی، رستم و سہراب کی رزم آرائی کی داستان قلمبند کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

شمشیر ہندی در آویختند ہمی زاہن آتش فرو ریختند

عہد قدیم میں یمنی تلواروں کی بھی شہرت رہ چکی ہے لیکن حقیقت میں وہ ہندی تلواریں ہوتی تھیں جو عرب تاجروں کی معرفت یمن پہنچا کرتی تھیں۔ چونکہ وہ یمنی بازاروں سے عرب کے اندرونی علاقوں میں پہنچتی تھیں اس لئے یمنی تلواروں کے نام سے مشہور ہو گئیں۔ اسی طرح حلبی اور دمشقی تلواروں کو بھی معروف شہرت حاصل ہوئی ہے لیکن جو جوہر شمشیر ہندی میں پایا جاتا تھا اس کا عشر عشیر بھی حلبی اور دمشقی تلواروں کو حاصل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی کے تمام قدیم و جدید لٹریچر میں حلبی اور دمشقی تلواروں کی تعریف و توصیف تو کجا ان کا ذکر تک نہیں ملتا۔

غزل

شارق

اب تو اس بزم میں یوں نیش زنی ہوتی ہے
پردۂ لطف میں بھی خاطر شکنی ہوتی ہے

دل کو دے جاتا ہے چپکے سے تسلی کوئی
جب مری شام غریب الوطنی ہوتی ہے

آدمی کے لیے آسان ہے عالم شکنی
سخت دشوار مگر خود شکنی ہوتی ہے

کس طرح کیجیے اب اُن سے تغافل کا گلا
لب ہلاتے ہیں تو خاطر شکنی ہوتی ہے

سامنے آکے ذرا ہم سے ملاؤ نظریں
کہیں پردے سے بھی ناوک فگنی ہوتی ہے

جن پہ گزری ہے وہی اس کو سمجھ سکتے ہیں
دل دہی سے بھی کبھی دل شکنی ہوتی ہے

شام غم آتی ہے اک ایسی گھڑی بھی شارق
آپ خود اپنے پہ جب خندہ زنی ہوتی ہے

---

[1] ہند سپیریلٹی از ہربلاس ساردا۔

مضطر خیرآبادی کا ایک قصیدہ

یونس حسنی

لکھنؤ اور دلی کی تباہی نے ادبی شیرازہ کو جب منتشر کر دیا تو شعر و ادب کے ناخداؤں نے مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں پناہیں ڈھونڈیں۔ ان دنوں شعرا کی سرپرستی کرنے والی ریاستوں میں حیدرآباد، رامپور، ٹونک اور بھوپال خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ریاست ٹونک تو اپنے بانی امیر خاں کے عہد حکومت ہی سے ایک ادبی اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ فقیر محمد خاں گویا، میر تفضل حسین، طالع یار خاں وغیرہ ٹونک ہی سے وابستہ تھے۔ وزیرالدولہ کے زمانہ میں غالب اور مومن کا بھی ٹونک سے تعلق رہا۔ غالب کے دو فارسی قصیدے نواب وزیرالدولہ کی مدح میں موجود ہیں جن کے مطلع مندرجہ ذیل ہیں[1]:

اے ذات تو جامع صفت عدل و کرم را　　اے بر شرف ذاتِ تو اجماعِ امم را

عید اضحیٰ سر آغازِ زمستاں آمد　　وقتِ آراستنِ حجرہ و ایواں آمد

مومن کے ایک قصیدہ کا مطلع ہے:

یاد ایام عشرت فانی　　نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

یہ مومن کے اُن گنتی کے دو قصیدوں میں سے ایک ہے جو انھوں نے ارباب دولت کی مدح میں کہے ہیں۔ یہ قصیدہ ٹونک نہ آنے کی معذرت میں نواب وزیرالدولہ کی شان میں کہا گیا تھا[2]۔

نواب ابراہیم علی خاں خلیل کا دور ٹونک کی ادبی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا مالک ہے۔ یہ زمانہ ٹونک میں ادبی سرگرمیوں کے شباب کا زمانہ تھا۔ ابراہیم علی خاں اٹھارہ سال کی عمر میں ۱۸۶۷ء میں مسند نشین ہوئے اور اکسٹھ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۹۲۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اس طویل عرصہ میں ٹونک میں ایک مخصوص شاعرانہ ماحول پیدا ہو گیا۔ اس زمانہ میں ٹونک کی شاعری پر لکھنویت غالب تھی اور وہاں لکھنؤ اسکول کے شعرا اور ان کے شاگرد بکثرت موجود تھے۔ معاملہ بندی اور ادا نگاری اُن کے شعری خصوصیات تھے۔ سنگلاخ زمینوں، طویل ردیفوں اور مشکل بحروں میں شعر کہنا اور اس میں استادی کے جوہر دکھانا ہی شاعری کا مقصد سمجھا جاتا تھا۔ غرض اس زمانہ میں ٹونک میں مقامی اور بیرونی شعرا کی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس دور میں شریف گھرانوں میں بچوں کا شعر و سخن کی طرف مائل ہونا ذہانت کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ مشہور ہو گیا تھا کہ ٹونک کا ہر چھٹا شخص شاعر ہے۔ اسی کے ساتھ شعر فہمی بھی اس سرزمین کے خمیر میں شامل ہو گئی تھی۔ نواب ابراہیم علی خاں خلیل خود بڑے اچھے اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ حمد، نعت، غزل، مستزاد کے علاوہ ٹھمری اور ترانہ بھی تصنیف کرتے تھے۔ ان کا دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ بسمل خیرآبادی اور مضطر خیرآبادی اُن کے استاد تھے۔ اسد لکھنوی بھی کچھ دنوں اُن کے استاد رہے[3]۔ ان حضرات کے علاوہ جلال لکھنوی، ظہیر دہلوی، سیماب اکبرآبادی وغیرہ کا بھی ٹونک میں قیام رہا اور انھیں

۱؎ غالب کی ایک نادر فیصلہ کن تحریر مطبوعہ ماہنامہ آج کل جون ۵۵ء

۲؎ گل رعنا ص ۳۰۰

۳؎ خم خانہ جاوید۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۹

سرکاری سرپرستیاں حاصل رہیں۔ بیرونی شعراء کے علاوہ ٹونک کے مقامی شعراء میں سید سعید احمد اسعدؔ، اصغر علی آبدؔ، امیر حسن خاں شہاؔ، مجگن ناتھ پرشاد شادؔ، لالہ امراؤ لال تپشؔ، سید عبدالرزاق حسنی کلامیؔ، محمد عالمگیر خاں کیفؔ، محمد عمر جامؔ، صاحبزادہ احسان اللہ خاں احسانؔ اور بھائی جان عاشقؔ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات اپنے اپنے فن میں کامل تھے اور بڑے بڑے اساتذہ سے دادِ سخن پا چکے تھے۔

ان تمام شعرا میں جو آبرو "برادرانِ خیرآباد" یعنی بسملؔ اور مضطرؔ کو حاصل ہوئی وہ کسی کے حصہ میں نہیں آئی۔ سید افتخار حسین مضطرؔ خیرآبادی خیرآباد ضلع سیتاپور میں ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کی ابتدا ٹونک ہی میں کی۔ مختلف عہدوں سے ترقی کرتے ہوئے پرگنہ نیماہیڑہ کے کلکٹر اور مجسٹریٹ کے عہدوں پر فائز رہے۔ امیرؔ مینائی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ ٹونک کی ملازمت سے ۱۹۰۴ء میں مستعفی ہو گئے اور وہاں سے گوالیار چلے گئے۔ یکم دسمبر ۱۹۲۳ء کو گوالیار سے استعفیٰ دے کر بھوپال چلے آئے اور نواب نصر اللہ خاں کی ڈیوڑھی میں جوڈیشیل سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ لیکن چند ماہ بعد ملازمت کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور مضطرؔ اندور چلے گئے۔ زندگی کے آخری ایام تک وہ مہاراجہ کے مصاحب کی حیثیت سے اندور ہی میں قیام پذیر رہے۔ لیکن آخری دنوں میں موت انھیں گوالیار لے گئی جہاں ۱۹۲۷ء میں ان کا انتقال ہوا اور قلعہ گوالیار میں بابا چھنگا شاہ کی درگاہ میں مدفون ہوئے[1]۔

ہماری زبان مورخہ ۸ اپریل ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں بھی جاں نثار اخترؔ صاحب کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے مضطرؔ کے تصنیفات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مراسلہ کے مطابق مضطرؔ کا حمدیہ دیوان نذرِ خدا ۱۹۱۳ء میں مطبع صوفی، آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ ان کا نعتیہ دیوان اُن کے ایک شاگرد کچھ روپیہ لیکر طبع کرنے کے لئے لے گئے مگر سب اُنھیں کی نذر ہو گیا۔ چند نظمیں کتابی شکل میں شائع ہوئیں جن کے نام یہ ہیں: (۱) منھ دیکھی محبت (۲) نیکی کا بدلہ بدی (۳) اللہ بس باقی ہوس۔ یہ تینوں نظمیں ۱۹۰۴ء میں طبع ہوئی تھیں۔ مضطرؔ نے نغانِ مضطر کے نام سے ایک عاشقانہ مثنوی بھی کہی تھی

مگر وہ اب ناپید ہے۔ چند اور نظمیں بھی کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔ نثری تصانیف میں ایک ناول قتیلِ جفا کے نام سے شائع ہوا جو اب نایاب ہے۔

مضطرؔ خیرآبادی بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ مختلف اصنافِ سخن پر اُنھوں نے کامیابی سے طبع آزمائی کی۔ بندشِ الفاظ اور صحتِ زبان کا خاص خیال رکھتے تھے اور اپنے عہد میں ملک کے مشہور شعرا میں تھے۔ صاحب حدیقۂ راجستھان ان کے بارے میں رقمطراز ہیں: "ان کے کلام میں عجب روزمرہ طرفہ چوچلا ہے۔ طبیعت اصنافِ سخن پر حاضر، تناسبِ الفاظ، خوبیٔ مضامین پر فاخر، درستیٔ ترکیب، شستگیٔ الفاظ پر قادر ہے۔"

مضطرؔ یوں تو ٹونک کے علاوہ دوسرے درباروں سے بھی وابستہ رہے لیکن جو سکون اور اطمینان انھیں ٹونک میں میسر ہوا وہ کہیں اور نہ حاصل ہوا۔ نواب ابراہیم علی خاں انھیں بہت مانتے تھے۔ انھیں افتخار الشعرا اور اعتبار الملک کے خطابات سے نوازا تھا۔ مضطرؔ بھی اِن قدردانیوں کے ہمیشہ شکرگزار رہے اور اس کا اعتراف کرتے رہے۔ نواب ابراہیم علی خاں سے انھیں جو محبت تھی اس کی آئینہ دار اُن کی وہ غزل ہے جو انتہائی طویل بحر میں لکھی گئی ہے اور جس میں خلیلؔ کو اپنا محبوب تصور کرتے ہوئے ان کی مدح بھی کر دی ہے۔ اس غزل کے مطلع کا مصرعہ ثانی ملاحظہ ہو:

"جو گیا عالمِ وحشت میں وہاں میں تو یہ دیکھا کہ بڑی دھوم مچی ہے مجھے معلوم ہوا جذبہ الفت کی بدولت کہ وہ آئیں گے مجھے جن سے محبت ہے، تعلق ہے، لگاوٹ ہے، اسی وجہ سے میں بیٹھ رہا ایک طرف جا کے کہ دیکھوں بتِ عیار کا آنا کہ بس اتنے میں نمودار ہوا وہ بتِ رعنا جسے خسرو نے کہا 'تازہ جواں میوۂ میاں، پستہ دہاں، آفتِ جاں، جانِ جہاں، روز رخے زلف شبے، درّ دہن لعل لب یوسف وجہ در زنقے سینہ انارے، گل بے زحمت خارے دل رنج وغارے وسخن جملہ مسیحے وزباں جملہ فصیحے ونظر جلہ فن آہوئے صنم زلف دوتا دونے عشوہ کنے غمزہ زنے چرخ ندیدہ، بصبر در دجہاں، ہمچو بشر گیسوئے مشکیں اگر دست رساندہ بکو درنہ دریں راہ گذر کس نہ رساندہ نہ نظر ہم نہ خزاں دیدہ بہارش نہ چوں بے دانہ انارش میرے نزدیک جو ایسا ہو اسے کیا کہوں کیسا ہے خلیلؔ آکے بصد ناز وہ اترے، لگی بلبل یہ سنانے کہ کیا دن یہ خدا نے جو گئے باغ تم

---

[1] مکتوب جناب جاں نثار اختر۔ بنام راقم۔

آئے گل گلشن، کو ہنسانے۔ میرے سینے کو ترلانے میرے نزدیک نہیں اس میں
چمن میں۔۔ یہ چمن مجسم ہے اس جسم کی تم ہی میری جان جان ہو گویا ۱؎"

نواب صاحب نے جو دو سالہ جواب میں مضطر حسب موقع قصیدے
پیش کرتے رہتے تھے۔ یہاں ان کے دوسرے قصیدوں سے بحث نہیں صرف
اُس قصیدے کو پیش کرنا مقصود ہے جو اُنھوں نے نواب ابراہیم علی خاں
کو ایک سالگرہ کے موقع پر پیش کیا تھا۔ یہ قصیدہ غیر مطبوعہ ہے اور اپنی
سلاست، روانی، تسلسل بیان، تشبیب گریز اور دعا کی خوبیوں کے پیش نظر
اردو کے اچھے قصیدوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

اپنے استاد امیر مینائی کی طرح مضطر نے اس قصیدے کی تشبیب
میں مکالمہ نویسی سے کام لیا ہے۔ تشبیب میں مکالمہ نویسی امیر مینائی کی محبوب
طرز تھی۔ اُنھوں نے دانش و وہم اور شانہ و آئینہ وغیرہ کے مناظروں سے
اپنے قصائد کی ابتدا کی ہے۔ مضطر نے اپنے اس قصیدے کی ابتدا حسن و
عشق کے مناظرے سے کی ہے۔ تشبیب کے چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں:

حسن و عشق آج لڑائی پہ تلے ہیں تیا ٗ   ایک کو ایک سے دعویٰ ہے کہ میں ہوں جرار
عشق سے حسن یہ کہتا ہے کہ سن خانہ خراب   مجھ سے عالم میں نہیں ہے کوئی اچھا زنہار

آگے چل کر حسن کا دعویٰ ہے کہ:

قسمت شمع بھی ہے آج مجھی سے چمکی   مجھ سے روشن شب تیرہ کا ہوا خانہ تار
شہر تیں حضرت یوسف کی ہوئی ہیں مجھ سے   جب کہیں جا کے زلیخا نے کیا تیرا شمار

اور حسن کے ان مدلل دعووں کے جواب میں عشق نے بھی خوب خوب فصاحتیں
دکھائی ہیں۔ عشق کا جواب ملاحظہ ہو:

سن کے یہ بات کہا عشق نے برہم ہو کر   حسن جیسے تو میری جیب میں رہتے ہیں ہزار
میں نہ ہوتا تو حسینوں کو نہ ملتے عاشق   میرے ہی دم سے ہے آباد تعلق کا دیار
اپنے محبوب کو اللہ نے چاہا مجھ سے   کون محبوب کہ ہے جس پہ زمانے کا مدار

حسن و عشق کا یہ طویل مکالمہ بیان کرنے کے بعد مضطر نے چند اشعار کی مدد
سے گریز کی ہے۔ گریز میں مضطر نے بڑی فن کاری اور برجستگی سے کام
لیا ہے۔ اور گریز نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ حسن و عشق کو لڑتے دیکھ کر
یہ وہیں پہنچ جاتے ہیں:

میں نے دیکھا تو کہا ان سے کہ اے نادانو   کیا شرافت ہے کہ لڑتے ہو میان بازار
آج دن لڑنے لڑانے کا نہیں ہے بس بس   آج دن رنجش بیجا کا نہیں ہے ہشیار
صاحب فہم و ذکا ہو کے یہ نادانی کیوں   ہو کے بدنام جہاں، لوگ ہنسیں گے بیکار
اور سوا اس کے بہت پاس ہے ایوان شہی   جلوہ فرما ہیں جہاں میرے تمہارے سرکار

اس لطیف گریز کے بعد مضطر نے مدح سرائی شروع کر دی ہے۔ گو مدح میں
روایتی مضامین ہی بیان کئے گئے ہیں لیکن سلاست اور روانی نے مدح میں
ایک بانکپن کی شان پیدا کر دی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کون سرکار خلیل چمن جود و کرم   بانیِ کعبۂ دل کعبۂ جان دیندار
اے براہیم علی خان بہادر جرار   تو نے خار غم و کلفت کو بنایا گلزار
سر جھکائے ہوئے پھرتا ہے یہ چرخ کج رو   خاک بوس در دولت ہے زمین ہموار
راج میں تیرے کوئی دکھ نہیں آنے پاتا   پڑ گئی صدمہ و اندوہ پہ اللہ کی مار
عیش جاوید مقرر ہے بڑے عہدے پر   جیش جمشید ملازم ہے بکار سرکار

قصیدے کے آخر میں تین شعر دعائیہ شامل کئے ہیں جن میں آخری شعر بڑا ہی
پر لطف ہے۔ غالب نے اپنے ایک مشہور قصیدے "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا
نام" میں ایک شعر میں ممدوح کو دعا دے کر قصیدہ نگاری میں اپنی استادی
تسلیم کرالی ؎

ہے ازل سے روانیِ آغاز   ہو ابد تک رسائیِ انجام

مضطر کا آخری شعر بھی اسی نوعیت کا ہے۔ دعائیہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تجھ کو اللہ اسی جشن شہی میں رکھے   تو اسی عیش میں مصروف رہے لیل و نہار
سر مضطر پہ ترا سایہ افضال رہے   بہ طفیل شہ کونین بحق انصار
قائم الدہر رہے سلسلہ عمر دراز   دائم الدہر رہے سالگرہ کا دربار

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے پورا قصیدہ تسلسل بیان، روانی
اور سادگی کا حامل ہے جس سے اس کے حسن میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ چوں کہ
قصیدہ غیر مطبوعہ ہے اس لئے پورا ہی قصیدہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس
قصیدے کے حصول کے لیے میں محترمہ سعیدہ حسن کا مشکور ہوں جنھوں
نے اپنے والد نواب فاروق حسین صاحب گوپاموی کی بیاض مجھے
عنایت کی۔ نواب صاحب مضطر خیرآبادی کے قریبی احباب میں شامل
تھے اور مضطر کے کلام کا ایک انتخاب اُنھوں نے مرتب کیا تھا۔ یہ قصیدہ

۱؎ مسودہ میں مصرع اسی طرح لکھا ہے لیکن اس میں کئی جگہ غلطیاں معلوم ہوتی ہیں۔
افسوس ہے کہ پروف دیکھتے وقت بھی صحیح مصرع پیش نظر نہ ہو سکا۔ ایڈیٹر

مجھے اسی انتخاب سے حاصل ہوا ہے۔ مکمل قصیدہ حسبِ ذیل ہے:

قصیدہ بہ تقریب سالگرہ نواب ٹونک دام اقبالہٗ

حسن و عشق آج لڑائی پہ تُلے ہیں تیار
ایک کو ایک سے دعویٰ ہے کہ میں ہوں جرار

پیش کرتے ہیں شجاعت کی دلیلیں باہم
کیا مزہ دیتی ہے دونوں کی زبانی تکرار

عشق سے حسن یہ کہتا ہے کہ سُن خانہ خراب
مجھ سے عالم میں نہیں کوئی بھی اچھا زنہار

اچھی صورت کو مری ذات سے حاصل ہے فروغ
جب تو آپ بھی سو جان سے ہوتا ہے نثار

میں حسینوں کو اگر روپ نہ دیتا اپنا
چاہنے والوں میں بڑھتا نہ مرا عزّ و وقار

مجھ سے دنیا کی کوئی چیز نہیں ہے خالی
یوں میں ہر شے میں ہوں جس طرح سے تصویر میں تار

چاند سورج میں چمک میں تو ضیا تاروں میں
دن کو بھی جلوہ مزارات کو بھی میری بہار

قسمت شمع بھی ہے آج مجھی سے جس کی
مجھ سے روشن شبِ تیرہ کا ہوا خانۂ تار

شہرتیں حضرت یوسف کی ہوئی ہیں مجھ سے
تب کہیں جا کے زلیخا نے کیا تیرا شمار

نام تیرا بھی ہے مشہور مرے نام کے ساتھ
میں نہ ہوتا تو نہ ہوتی تیری دنیا میں پکار

کوئی یہ بھی نہ سمجھتا کہ ہے تو کون بلا
دل میں دیتے نہ جگہ تجھ کو کبھی عاشق زار

مرے صدقے میں بڑا کام ترا نام ترا
گر احسان فراموش ہے تو بد کردار

جس سے ملتا ہے اسی شخص کو دیتا ہے دغا
یادِ معشوق میں کرتا ہے اسیرِ افکار

حسرتیں خاک میں لاکھوں کی ملا دیتا ہے
گرم رہتا ہے ترے ظلم و جفا کا بازار

دشمنی دوست سے کرتا ہے یہ شیوہ ہے ترا
بے وفائی کے تجھے یاد ہیں لاکھوں اطوار

جنگ جو، خانہ برانداز جہاں، خود مطلب
بیوفا، عربدہ گر، جان کا میری عیار

مجھ سے لڑتا ہے تجھے شرم نہیں آتی ہے
اپنے آقا سے الجھتا ہے کوئی خدمتگار

تو مرا دست نگر ہے میں ترا والی ہوں
بے ادب تو مرے رتبے کو ذرا سوچ بچار

سُن کے یہ بات کہا عشق نے برہم ہو کر
حسن جیسے تو مری جیب میں رہتے ہیں ہزار

میں نہ ہوتا تو حسینوں کو نہ ملتے عاشق
میرے ہی دم سے ہے آباد تعلق کا دیار

مجھے ارباب تصوف نے پیے یاد خدا
لقب راہ نما دے کے بڑھایا ہے وقار

اپنے محبوب کو اللہ نے چاہا مجھ سے
کون محبوب کہ ہے جس پہ زمانے کا مدار

خلعت قرب خدا بخش دیا نبیوں کو
اولیا میری عنایت سے ہوئے برسرِ کار

تجھ پہ آ جاتا ہے اے حسن بڑھاپے میں زوال
مجھ کو گھٹنا نہیں آتا تیری صورت زنہار

تو فریبی ہے، دغا باز ہے، ہرجائی ہے
ہے تجبّر تیرا شیوہ تو تکبّر ہے شعار

الغرض دونوں کے دونوں ہوئے آمادۂ جنگ
ہاتھا پائی سے مبدل ہوئی لفظی تکرار

میں نے دیکھا تو کہا ان سے کہ اے نادانو!
کیا شرافت ہے کہ لڑتے ہو میاں بازار

آج دن لڑنے لڑانے کا نہیں ہے بس بس
آج دن رنجشِ بے جا کا نہیں ہوشیار

صاحب فہم و ذکا ہو کے یہ نادانی کیوں
ہو گئے بدنام جہاں لوگ ہنسیں گے بیکار

اور سوا اس کے بہت پاس ہے ایوان شہی
جلوہ فرما ہیں جہاں میرے تمہارے سرکار

کون سرکار خلیلِ چمن جود و کرم
بانیٔ کعبۂ دل کعبۂ جانِ دیندار

اس کی تعریف میں اک مطلعِ ثانی لکھوں
ہو سکے مطلعِ خورشید بھی جس سے نہ دوچار

اے براہیم علی خانِ بہادر جرّار
تو نے خارِ غم و کلفت کو بنایا گلزار

سر جھکائے ہوئے پھرتا ہے یہ چرخِ کج مج
خاک بوس درِ دولت ہے زمین ہموار

تیرے اقبال کی کیا بات ہے میرے والی
تیرے اجلال کے کیا کہنے ہیں میرے سرکار

تیرے اکرام کی کیا بات ہے میرے وارث
تیرے افضال کی کیا بات ہے عالی دربار

قطرہ قطرہ کی زبانیں ہیں تری مدح سرا
ذرہ ذرہ کی زبانیں ہیں تری شکر گزار

موسمِ گل سے کوئی باغ نہیں ہے خالی
پھول پتے سے لدے رہتے ہیں سارے اشجار

ہیں ترے عہد میں سوکھے ہوئے چشمے جاری
تشنہ کاموں کی نہ کثرت ہے نہ پانی کی پکار

رنج کا نام نہیں تیری عمل داری میں
مشغلے عیش و طرب کے ہیں یہاں لیل و نہار

راج میں تیرے کوئی دکھ نہیں آنے پاتا
پڑ گئی صدمہ و اندوہ پہ اندر کی مار

عیش جاوید مقرر ہے بڑے عہدے پر
جشن جمشید ملازم ہے بکار سرکار

تجھ کو اللہ اسی جشنِ شہی میں رکھے
تو اسی عیش میں مصروف رہے لیل و نہار

مختصر یہ ترا سایہ یہ افضال رہے
بہ طفیلِ شہِ کونین بہ حق انصار

قایم الدہر رہے سلسلہ عمر دراز
دایم الدہر رہے سالگرہ کا دربار

سنگار

سُمت پرکاش شوق

مانگ کر ننھے ننھے چراغوں سے نور
رات چُپ چاپ مانگ اپنی بھرتی رہی
دے کے دُنیا کو دیر و حرم کا فریب
زندگی آئینے میں سنورتی رہی

قافلے روز و شب کے گزرتے رہے
نت نئے نقشِ پا سے اُبھرتے رہے

میرے احساس کی تال پر روز و شب
تیری یادوں کی پائل جھنکتی رہی
وقت کی آندھیاں لاکھ آئیں مگر
تیرے پیکر کی خوش بو مہکتی رہی

غزل

ایاز جھانسوی

حرم کی لاج شِوالوں کی آبرو رکھ لی
جو تم نے میرے خیالوں کی آبرو رکھ لی
کسی نے اپنا سفینہ ڈبو کے ساحل پر
تمام ڈوبنے والوں کی آبرو رکھ لی
مرے کلام سے بہتر ہے میری خاموشی
نہ جانے کتنے سوالوں کی آبرو رکھ لی
وفا کی راہ میں لُٹ کر ہمیں ملال نہیں
کہ ہم نے چند مثالوں کی آبرو رکھ لی
دعائیں دیجیے بیمار کے تبسّم کو
مزاج پوچھنے والوں کی آبرو رکھ لی
ہزار میرے مقدر کی تیرگی نہ مٹی
مگر تمھارے اُجالوں کی آبرو رکھ لی
ایازؔ اپنی غزل حُسن کی محافظ ہے
ہزاروں زہرہ جمالوں کی آبرو رکھ لی

غزل

سیّد احمد سحرؔ

ذوقِ عمل ہے زیست کا حاصل کہیں جسے
آغوشِ موج ہے لبِ ساحل کہیں جسے
شوخی میں امتزاجِ حیا نے دیا وہ رنگ
آئینہ دارِ کشمکشِ دل کہیں جسے
وہ نقش دل پہ چھوڑ گیا عہدِ آرزو
سرمستیِ شباب کا حاصل کہیں جسے
سرگشتۂ نشاطِ طلب کو کہاں یہ ہوش
ہے وہ بھی کوئی مرحلۂ مشکل کہیں جسے
ایک ایک کرکے ہو گئی رخصت ہر آرزو
اب وہ کہاں ہے انجمنِ دل کہیں جسے
کچھ سوزِ غم کا لطف اب آنے لگا سحرؔ
سینے میں ایک آبلہ ہے دل کہیں جسے

کہاوتیں

یوسف سرمست

کہاوتوں کی اصلیت ابتدا میں کیا تھی اور مختلف کہاوتیں کب وجود میں آئیں یہ معلوم کرنا ناممکن تو نہیں لیکن بڑی حد تک دشوار ضرور ہے۔ بعض یورپین عالموں نے یہ جاننے کے لیے بڑی محنت وکاوش سے کام لیا اور بہت سی باتیں ان سے متعلق دریافت بھی کرلیں۔ جیمس میز نے اپنی کتاب ATHANDBOOK OF PROVERBS میں لکھتا ہے کہ "کہاوتیں قدیم ترین کتابوں سے بھی کہیں زیادہ پرانی ہیں۔" جیمس میز، ڈزریلی کی لکھی ہوئی کتاب کیوریاسٹیز آف لٹریچر- CURIOSITIES OF LITERATURE کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے "ہسپانیہ والے اپنی زنانہ کہاوتوں کی قدامت کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ اس زمانہ کی ہیں جب، کہ لیا تحریر کا کوئی طریقہ بھی رائج نہیں ہوا تھا۔" یہی حال غالباً ہر ملک کی کہاوتوں کا ہے۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ ہر ملک کی کہاوتیں بڑی قدیم ہیں اور ان کی ابتدا بتانا بہت مشکل ہے۔

کہاوت کو انگریزی میں PROVERB کہتے ہیں، عربی میں مثل سارہ اور جب برمحل بولی جاتی ہے تو ضرب المثل کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی اسے مثل ہی کہتے ہیں۔ کہاوت کے لغوی معنے ہیں "ایک ایسا لفظ جو دوسروں کی نسبت پہلے کہا جائے۔" ملک یونانی میں مثل کی جگہ جو لفظ استعمال ہوتا ہے اُس کے معنی "عام مشہور کلمہ" کے ہیں۔ یعنی ایسا کلمہ جو عام پسند اور عام فہم ہو۔ اور یہ دونوں باتیں کہاوت کے لیے بڑی ضروری تصور کی جاتی ہیں۔

یورپ کے علماء نے کہاوت کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ ارسطو ان کی یہ تعریف کرتا ہے: "معانی کے ریزے جو صحت مطالب اور قلت الفاظ کے لحاظ سے فلسفہ قدیم کی شکست وریخت سے باقی بچ گئے۔" ڈاکٹر جانسن نے لکھا ہے "چھوٹے چھوٹے فقرے جو اکثر زباں زد عوام رہتے ہیں۔" بیکن کا قول ہے:- "تقریر کے تیز دھار اوزار جو کام کاج کی گانٹھوں کو کاٹتے اور کھول دیتے ہیں۔" ارسمیس کہتا ہے:- "ایک مسلّم اور مقبول مسئلہ بڑی عجیب طرز سے مرتب کیا ہوا۔" ڈزریلی نے کہاوتوں کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ عقل کے ریزے ہیں۔" سروینٹس کی رائے ہے:- "لمبے لمبے تجربوں سے چھوٹے چھوٹے نتائج مستنبط کیے ہوئے۔" ارل رسل نے لکھا ہے:- "ایک آدمی کی سوجھ بوجھ اور زمانے بھر کی عقل کا مدار۔" پروفیسر مکس ملر نے کہا ہے:- "کہاوتیں میتھالوجی MYTHOLOGY (قصص الاصنام) کے پارے ہوا کرتے ہیں۔" لندن کا ایک اخبار سیٹرڈے ریویو کہاوت کی اس طرح تعریف کرتا ہے:- "کہاوت کی ساخت میں ایک راز مخفی ہوتا ہے جو قدیم ایام سے اسی طرح پوشیدہ چلا آتا ہے اور ان میں سے اکثر کہاوتیں ایسی ہیں کہ اگر کوشش کی جائے تو ان کی ابتدا کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔"

اردو میں نیاز فتحپوری نے کہاوت کی اس طرح تعریف کی ہے:- "کہاوتیں بولی ٹھولی، ضلع جگت، محاورے سب ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں جن کا تعلق تاریخ یا علم وحکمت سے تو یقیناً نہیں ہے لیکن اگر ہم زبان ومحاورات ادب لطیف یا صنائع وبدائع کے ذیل میں ان کا ذکر کریں تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔ کہاوتیں شعر تو قطعاً نہیں ہیں لیکن شعر کا سا لطف واعجاز ضرور اُن میں پایا جاتا

ہے۔ کہاوتیں کسی ادب کے ابتدائی دور کی چیزیں تو نہیں ہو سکیں بلکہ ان کا تعلق اس دور سے ہے جب تمدن کے ساتھ زبان بھی وسعت اختیار کرنے لگتی ہے جب اظہار خیال میں رنگینی و نفسیاتی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے اور جب ہمارے اندر ایک شگفتہ منطقی شعور نشوونما پا جاتا ہے۔ کہاوتیں یوں تو ادب اور ادب کی ہر صنف زندگی سے تعلق رکھتی ہیں لیکن کہاوتوں میں زندگی کو سمجھنے کے لیے جو بلیغ اشارے پائے جاتے ہیں ان میں ایک ایسی ادبی رمز کیفیت بھی ملتی ہے جو اُسے تنقیدی لٹریچر کی طرف لے جاتی ہے۔ ادب کی ترقی زیادہ تر زندگی کے تجربات پر منحصر ہے اور اگر تجربات نام ہیں ہماری حماقتوں کا تو کہاوتیں بھی یقیناً نام ہیں انھیں حماقتوں پر طنزیہ تنقید کا جس سے قدرتاً ہم کو متاثر ہونا چاہیے۔“

لارڈ چیسٹر فیلڈ (جس کے خطوط کافی مشہور رہیں) البتہ کہاوتوں کے استعمال کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے:۔ ”اعلیٰ درجے کے لوگ کہاوتوں کا استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔“

کہاوت کی خوبصورتی اور حسن تین باتوں میں مضمر ہے۔ جس کہاوت پر ان تینوں باتوں کا اطلاق نہیں ہوتا وہ کہاوت نہ تو معیاری سمجھی جائے گی اور نہ اُسے مقبولیت حاصل ہوگی۔ کہاوت معنی خیز ہو، مختصر اتنی کہ ایک سانس میں بولی جا سکے، اور اس میں ملاحت ہو۔ چنانچہ ایک مصنف کہاوتوں کی اس طرح تعریف کرتا ہے کہ ”مختصر یہاں تک ہو کہ ایک سانس میں تمام کہی جائے یا کم از کم اس کا ایک پورا حصہ ایک سانس میں ملفوظ ہو سکے۔ اس میں پورے معنی ہوں نہ یہ کہ گفتگو کا خفیف سا فقرہ ہو ورنہ ایسی مثل پیدا ہوتے ہی ختم ہو جائے گی۔ اس میں ملاحت بھی ہو یعنے علاوہ معانی کی پاکیزگی اور نفاست کے اس کی ظاہری شکل و صورت بھی خوشنما اور دل میں جگہ پیدا کرنے والی ہو۔ ضرب المثل کی نہایت ضروری صفت یہ ہے کہ ہر دلعزیز اور عام پسند ہو کیونکہ اگر اس کو یہ صفت حاصل نہیں ہے تو اس کا ایجاز، دانش، ملاحت اور جملہ حسن صورت و سیرت کوئی کام نہیں آتا۔“

کہاوتیں اپنے اندر کئی تہذیبیں، کئی عہد لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں ان کا رواج نہیں۔ کوئی زبان اور تاریخ کا کوئی عہد ان سے خالی نہیں۔ کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کب سے مروج ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانے تک کہاوتوں کے وجود کا قطعی طور پر سراغ ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک کتاب امثال کی لکھی تھی جو بائیبل کے الہامی صفحوں میں شامل ہے اور اس کا نام ہی کتاب امثال ہے۔

کہاوتوں کی ہر دور اور ہر دورِ حکومت میں وقعت و منزلت رہی۔ اس کا ثبوت ڈزریلی کی کتاب کیوریاسٹیز آف لٹریچر میں ملتا ہے۔ ڈزریلی نے اس کتاب میں ٹاؤنس ہنڈ کی کتاب ہسٹاریکل کلکشن سے بہت سی عمدہ باتیں اخذ کر کے لکھا ہے کہ ”دور کیوں جاتے ہو جن ملکوں میں، جیسے عرب اور یونان، جہاں فصاحت و بلاغت کا زور شور تھا وہاں تو ضرب الامثال کی قدر کی جاتی ہی ہوگی مگر انگلینڈ کی مہذب پارٹیاں بھی مثلوں سے بے اعتنائی نہ برت سکیں۔ ملکہ الزبتھ کے عہد میں ایک قرضہ کے متعلق جب پارلیمنٹ میں بل پیش ہوا تو ایک مقرر نے اپنی ساری تقریر صرف کہاوتوں ہی کا مجموعہ بنا کر کی۔“

ہندوستانی زبانوں کے ادب میں کہاوتوں کی جانب اتنی توجہ نہیں کی گئی جتنی کہ ہونی چاہیئے۔ ان پر بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا یا کم از کم مختلف زبانوں کی ہم معنی مثلوں کو اکٹھا کیا جا سکتا تھا۔ ہاں بعض یورپین ہمارے ملک کی کہاوتوں پر البتہ کام کر چکے ہیں۔ جی لونگ، پادری نالس، کار اور پرسیول نے بنگالی، کشمیری، تامل اور اردو مثلیں بڑی محنت اور جانفشانی سے جمع کی ہیں۔

کہاوتوں کے جاننے سے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ کسی ملک کی کہاوتیں جاننا کیا ہے وہاں کا تھوڑا بہت جغرافیہ جان لینا ہے۔ کہاوتوں کے ذریعے ہم وہاں کے لوگوں کا رکھ رکھاؤ، خیالات و جذبات، ان کی صلاحیتیں غرض بہت سی باتوں کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ یہاں دو ایک ملکوں کی دو ایک کہاوتیں پیش کی جاتی ہیں جن سے ان ملکوں کے خیالات اور تاثرات کا پتہ بآسانی چلتا ہے۔ اٹلی کی ایک کہاوت ہے:۔ ”اعتبار کرنا تو اچھا ہے لیکن اگر کسی کا اعتبار نہ کیا جائے تو اس سے بھی اچھا ہے۔“ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اٹلی والوں کو دوسروں پر بالعموم اعتماد نہیں ہوتا۔ اسکاٹ لینڈ کی ایک مثل ہے:۔ ”جو مجھے ایک مرتبہ دھوکا دیتا ہے اس کو شرم کرنی چاہیے لیکن اگر مجھے دوسری دفعہ بھی دھوکا دیتا ہے تو مجھے شرم کرنی چاہیئے۔“ دوسرے لفظوں میں اسکاٹ لینڈ والوں کا یہ خیال ہے کہ دھوکا کھانا اپنی بیوقوفی کی علامت ہے۔ ہر ملک اور ہر زبان میں عورت کی شرم و حیا کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ عورت کی شرم و حیا کے متعلق عربوں کا خیال ملاحظہ ہو: ”بے شرم عورت اس

کھانے کے مانند ہے جو بے نمک ہو۔" روسی مثل ہے: "مرد عورت کا حاکم ہے لیکن عورت اپنی شرم و حیا سے اس پر حکومت کرتی ہے۔" جاپان والے کہتے ہیں: "جب مرغی بانگ دیتی ہے تو گھر بار برباد ہو جاتا ہے۔" مطلب یہ ہے کہ جب عورت مرد کے فرائض انجام دینے لگتی ہو تو گھر کی تباہی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

اس میں شک نہیں کہ بعض کہاوتوں کے متعلق کچھ قصے ضرور مشہور ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ زیادہ تر کہاوتیں تو ایسی ہیں جن کے متعلق یہ تک کہنا مشکل ہے کہ یہ پہلے کس ملک میں یا کس زبان میں رواج پائیں یعنی ان کا تعلق کس ملک یا زبان سے ہے۔ اگر ہم بغیر تحقیق کے کسی بھی مثل کو کسی بھی زبان یا ملک سے منسوب کر دیں تو یہ ہماری ناانصافی ہو گی اس ملک، اس قوم اور اس زبان کے ساتھ جس کی کہ حقیقت میں یہ کہاوت ملکیت ہے۔

یہاں چند ایسی کہاوتیں پیش کی جاتی ہیں جن کے سلسلہ میں کوئی دلچسپ لطیفہ بھی مشہور ہے، مثلاً "یک نہ شد دو شد۔" اس کہاوت کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ ایک شخص کی ماں کفن چور تھی۔ وہ کسی تازہ مردہ کو سحر پڑھ کر اٹھاتی۔ وہ مردہ اپنا کفن خود اتار کر دے دیتا۔ پھر وہ دوسرا سحر پڑھتی اور مردہ پھر پہلے کی حالت میں لیٹ جاتا۔ جب وہ مرنے لگی تو اس نے اپنے بیٹے کو یہ فن سکھا دیا۔ وہ شخص پہلے ہی دن ایک تازہ قبر پر گیا اور مردے کو اٹھانے کا سحر پڑھا۔ مردہ اٹھا اور اسے کفن دے دیا لیکن وہ شخص مردے کو قبر میں دوبارہ لٹانے کا سحر بھول گیا۔ اب مردہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ شخص گھبرا کر اپنی ماں کی قبر پر گیا تاکہ اس سے قبر میں مردے کو لٹانے کا سحر معلوم کر سکے۔ اس کی ماں مُردہ ہو جانے کی وجہ سے وہ سحر نہ بتا سکی۔ بلکہ خود بھی اسی کے پیچھے لگ گئی تب لڑکے نے گھبرا کر کہا: "یک نہ شد دو شد۔"

یہ ایک ناقابل یقین قصہ اس کہاوت کے لیے گڑھ لیا گیا ہے۔ اس میں قطعاً کوئی صداقت نہیں پائی جاتی لیکن بعض کہاوتوں کے پیچھے چھپی ہوئی کہانی کی سچائی تسلیم کرنے کا جی چاہتا ہے، مثلاً "سوت کی انٹی اور یوسف کی خریداری" "کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی۔" ان کہاوتوں کے بارے میں نیاز فتحپوری لکھتے ہیں کہ "ایک مثل ہے ـــ سوت کی انٹی اور یوسف کی خریداری۔ اس میں اس بڑھیا کی طرف اشارہ ہے جو مصر کے بازار میں سوت کی ایک انٹی دے کر یوسف کو خریدنا چاہتی تھی۔ ایک مثل مشہور ہے کہ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی۔ اس کہاوت میں اشارہ ہے اس روایت کی طرف۔ مالوہ (گجرات) کے راجہ بھوج نے اپنی لڑکی گنگوا تیلی کے سلے پالک لڑکے سے بیاہ دی تھی صرف اس لیے کہ اس نے ایک دیپک راگ گا کر محل کے چراغ روشن کر دیے تھے۔"

اب اردو، فارسی اور انگریزی زبان کی چند ایسی کہاوتیں درج کی جاتی ہیں جو ہم معنی و ہم مطلب ہیں یا قریب قریب ہم معنی ضرور ہیں۔ ان کہاوتوں کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے رکھی گئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ث، ف، سے شروع ہونے والی کہاوتیں نہ جمع کر سکا۔ پیش کردہ کہاوتوں کے الفاظ میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ ان کہاوتوں میں بعض جگہ کچھ ایسے مشہور شعر یا مصرع شامل کر دیے گئے ہیں جو ضرب المثل ہو چکے ہیں۔ بعض کہاوتیں ایسی بھی ہیں جن کی فارسی یا انگریزی کہاوتیں آپس میں زیادہ میل نہیں کھا رہی ہیں مگر تھوڑی بہت مماثلت ہے۔ اس لیے انھیں بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

آگ بن دھواں کہاں ـــ تا نباشد چیزکے مردم نہ گویند چیزہا
اول طعام بعد کلام ـــ اول طعام بعدہ کلام
آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ ـــ برعکس نہند نام زنگی کافور
ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کر دیتی ہے ـــ یک بز گرگیں ہمہ بز ہا ئے گلہ را گرگیں کند
اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہے ـــ عزت ہر کس بدست آنکس است
آج کا کام کل پر نہ چھوڑو ـــ کار امروز بفردا مگذار
اس کی آمدنی ہو اسی کا خرچ ـــ چو دخلت نیست خرچ آہستہ تر کن
اکیلی لکڑی کہاں تک جلے ـــ از یک پر ستو تابستان نمی شود
بلی کے خواب میں چھیچھڑے ہی چھیچھڑے نظر آتے ہیں۔ تشنہ در خواب آب می بیند
بھائی دور پڑوسی نیڑے ـــ سگ حضور بہ از برادر دور

No Smoke without Some fire.
First eat and then speak
A black man being Called Mr. white.
A rotten sheep infects the whole flock.
Every man's honour is in his own Keeping.
Better today than to-morrow.
Let your expenses be according to your income.
One flower makes no Garland.
A Cat always dreams of mice.
A dog at home is better than a brother at a distance.

A good stomach is the best sauce	بھوک میں چنے کشمش کا مزہ دیتے ہیں ۔ کوفتہ را نانِ جویں کوفتہ است
A nod for a wiseman and a rod for a fool	بھلے گھوڑے کو ایک چابک بھلے آدمی کو ایک بات ۔ عاقلے را اشارتے کافی است
His room is better than his company	بری صحبت سے تنہائی بہتر ۔ شتر صالح بہ از مرد طالح
Think before you speak	پہلے بات کو تولو پھر منہ سے بولو ۔ اول اندیش وانگہے گفتار
The belly teaches arts	پیٹ سب کچھ سکھا دیتا ہے ۔ چندیں ہزار شکل برائے اکل
Half a loaf is better than no bread	پھول نہیں تو پنکھڑی سہی ۔ موش زندہ بہ از گربہ مردہ
To have one foot in the grave	پاؤں گور میں لٹکانا ۔ او چراغ سحری است
To live in clover	پانچوں انگلیاں گھی میں ۔ دلا خوش باش کہ نان تا بہ روغن افتاد
Evil got evil spent	پاپی کا مال اکارت جائے ۔ مال مفت دل بے رحم
None can with-stand what is decreed by heaven	تدبیر کے پر جلتے ہیں تقدیر کے آگے ۔ مشیت ایزدی را علاج نیست
Ill wounds may be cured but not ill names	تلوار کا گھاؤ بھرتا ہو پر بات کا نہیں بھرتا ۔ جراحات لساں را نیست ارد ۔ جراحات سناں را ہست ارد
Health is wealth	تندرستی ہزار نعمت ہے ۔ یک تندرستی بہ از ہزار نعمت
A thief knows best how to catch a thief	ٹھگ کو ٹھگ ہی جانے ۔ حریف را حریف می شناسد
Tit for tat	جیسے کو تیسا ۔ ہر فرعونے را موسیٰ
A covetous man does nothing that he should till he dies	جوڑ جوڑ مر جائیں گے مال جنوائی کھائیں گے ۔ نہ خود خورد نہ بہ کس دہد، گندہ شود بہ سگ دہد
A good beginning makes a good ending. Well begun is half done	جس کا شروع اچھا اس کا انجام بھی اچھا ۔ نیک آغاز را نیک انجام
As gods so are the worshippers	جیسی روح ویسے فرشتے ۔ ابلہ گفت و دیوانہ باور کرد
Death's day is Doom's Day	جان ہے تو جہان ہے ۔ من مردہ جہاں مردہ
Every Country has its own custom.	جیسا دیس ویسا بھیس ۔ ہر ملکے و ہر رسمے
A good face needs no paint	چاند نہ چاہیے بندا ۔ حسن خداداد را حاجت مشاطہ نیست
A thief knows a thief	چور کو چور خوب پہچانتا ہے ۔ ولی را ولی خوب می شناسد
Envy is the rock of the soul and the torture of the body	حسد بری بلا ہے ۔ حسود را چہ کنم او ز خود برنج در است
An idle man tempts the devil	خالی بیٹھے شیطان سوجھے ۔ مرد بیکار یا شود دزد یا شود بیمار
Despair is infidelity	خدا کی رحمت کے امیدوار رہو ۔ نومیدی کفر است
Silence is half consent	خاموشی نیم رضا ۔ خاموشی نیم رضا است
A burnt child fears the fire	دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک پیتا ہے ۔ مار گزیدہ از ریسماں می ترسد
A friend in need is a friend indeed	دوست وہ جو آڑے وقت کام آئے ۔ دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست ۔ در پریشاں حالی و درماندگی
A drowning man catches at a straw	ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ۔ غریق دست اندازد بکاہے ہمی جوید سلامت را بہانہ
A man in dishonour is worse than dead	ذلت کی زندگی سے موت اچھی ۔ مردن بعزت بہ از زیستن بہ ذلت
A golden key opens all locks	روپیہ سے سب کام نکل سکتے ہیں ۔ زر سفید برائے روز سیاہ است
Live not to eat but eat to live	راحت جسم طعام کی کمی میں ہے ۔ خوردن برائے زیستن نہ کہ زیستن برائے خوردن

The day is short and the work is much.
Death and life are in power of the tongue
Money is the only monarch
A constant guest is never welcome
A pot that belongs to many is ill stirred and worse boiled
Nothing can overcome the truth
Every one meets with what he deserves
Bitter is patience but its fruit is sweet
Necessity is the mother of invention
Covetousness bursts the bag
One blamed for the fault of his neighbours.
A honey tongue and a heart of gall
A day after the fair
A nod for a wise man and a rod for a fool
Habit is the second nature
Learning is wealth to the poor and an ornament to the rich
A contented mind is a continual feast
A black hen lays a white egg
A pitcher that oft goes to the well is broken at last
Blind men's wives need no paint
Cattle do not die from crows cursing
The cow knows not the value of her tail till she has lost it
A prophet has no praise in his country
Black stones will never turn white
A penny in pocket is a good companion
A bitter jest is the poison of friendship
A good name is better than riches
Love is blind
A gift horse is not to be looked in the mouth
A word spoken is an arrow let flying
Borrowed garments never fit well
Jesting lies bring serious sorrow

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۵ پر ملاحظہ ہو)

رات تھوڑی سوانگ بہت ـــ شب کوتاہ و قصہ بسیار
زبان ہی سر کٹوائے زبان ہی ہاتھی چڑھائے ـــ زبان سبان سر است
زر کو زر کھینچتا ہے ـــ که زر زر کشد در جہاں گنج گنج
سدا کا مہمان وبال جان ـــ مہمان سہ روز مہمان است بعد از آن زکوٰۃ خوار
ساجھے کی ہانڈی چوراہے پر پھوٹی ـــ دیگ شراکت بجوش می آید

سانچ کو آنچ نہیں ـــ راستی را زوال کے باشد
شکر خورے کو خدا شکر دیتا ہے ـــ گوشت خر دندان سگ
صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے ـــ صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد
ضرورت ایجاد کی ماں ہے ـــ گر ضرورت بود روا باشد
طامع کا پیٹ خالی ـــ طمع را سہ حرف است و ہر سہ تہی
طویلہ کی بلا بندر کے سر ـــ بلائے طویلہ بر سر میمون
ظاہر رحمان کا باطن شیطان کا ـــ خضر صورت شیطان صورت
عید کے پیچھے ٹر ـــ مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلہ خود باید زد۔
عقلمند کو اشارہ کافی ـــ عاقلے را اشارتے کافی است
علت دھوئے جائے عادت کیونکر جائے ـــ علت برود عادت نرود
علم غریبوں کی دولت، امیروں کی زینت ہے ـــ اگر منعم بود آرائش اوست۔
اگر درویش باشد دستگیر است۔
قناعت بڑی دولت ہے ـــ قناعت توانگر کند مرد را
کالی مرغی کیا سفید انڈے نہیں دیتی ـــ از آذر سپر چوں ابراہیم می تواند بر آمد
کاغذ کی ناؤ سدا نہیں چلتی ـــ کوزہ ہمیشہ از چاہ درست نمی بر آید

کیا کروں میں سنگار پیا مورا اندھا ـــ شوئے زن زشت روئے نابینا بہ
کمین کووں کے کوسنے سے ڈھور مرتے ہیں ـــ ابر را بانگ سگ مضرت نکند
گئی پیچھے چیز کی قدر ہوتی ہے ـــ قدر نعمت بعد زوال

گھر کی مرغی دال برابر ـــ گوہر در کان بے قدر است و در بازار بقیمت
گدھا پیٹے گھوڑا نہیں ہوتا ـــ خر از جل اطلس بپوشد ہم خر است
گانٹھ ہی کا پیسہ کام آتا ہے ـــ از سے کہ از تست ہمان است کہ در مشت
لڑائی کا گھر ہانسی روگ کا گھر کھانسی ـــ ظرافت آتش افروز جدائی ست
لاکھ جائے پر ساکھ نہ جائے ـــ نام نیک بہ از دولت دنیا
لگن لگی تو پھر لاج کہاں ـــ چوں عشق آمد حیا رفت
مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال ـــ شراب مفت قاضی ہم خورد
منہ سے نکلی بات پرائی ـــ تیر از کمان جستہ و دن از دست رفتہ باز بدست نیاید
مانگے کے کپڑے کبھی ٹھیک نہیں آتے ـــ کس جامہ خویش آراستن بہ از جامہ عاریت خواستن
مذاق فساد کی جڑ ہے ـــ ظرافت آتش افروز جدائی است

(افسانہ)

ایک سوال

اقبال متین

میں کپڑے بدل کر کسی کام سے باہر جانے کے لیے نکلا تو کالونی کے نکڑ پر مجھے زینو مل گئی۔ وہ وقت مل رہے ہوں تو پتہ نہیں کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا کچھ کھو گیا ہے جس کی میں تلاش کر رہا ہوں۔ لیکن یہ احساس چونکہ غیر شعوری طور پر میرے ذہن و دل میں رچ بس گیا ہے اس لیے میں ان وقتی اداسیوں سے کچھ مانوس سا ہو چلا ہوں جن کی شاید کوئی اساس نہیں ہے اور جو دھیرے دھیرے میرا مزاج بن گئی ہیں۔ اس عالم میں زینو مجھے کالونی کے نکڑ پر مل گئی اور یہ انداز دگر ملی۔ پہلے تو میں نے اس کے سلام کا جواب سلام سے دے دیا اور آگے بڑھ گیا۔ چاہتا تو میں اس سے پوچھ بھی سکتا تھا کہ اندھیرے اجالے کے اس سنگم پر۔ پیپل کے گھنے سایوں کے نیچے بھری شام کے وقت جہاں بہتی ہوئی تاریکیوں کو سڑک کی مدھم روشنی اُجالنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ وہ اکیلی کیوں کھڑی ہے۔ اُسے کس کا انتظار ہے؟

زینو نئی نویلی دلہن ہے۔ اس کا شوہر کسی ورک شاپ میں کام کرتا ہے، رات گئے لوٹتا ہے اور میرا دوست ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کے لیے شام ہی سے زینو کے منتظر رہنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ زینو کی انتظار کی گھڑیاں تو دن ڈھلے سوتی ہیں اور رات گئے بیدار ہوتی ہیں۔ لیکن میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ بس چپ چاپ اس کے پاس سے یوں گزر گیا جیسے شادی کی بارات کے برابر سے کوئی جنازے کا جلوس گزر جاتا ہے۔

اس نے خود مجھے پکارا۔ "متین بھائی!" میں نے یہ آواز کچھ اس طرح سنی جیسے کوئی مجھے پکار نہیں رہا ہے بلکہ پکارنے کی تمنا کر رہا ہے۔

میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے کہا: "سجاد ے اب تک نہیں لوٹا۔" اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔ ہمدردی کا ایک لفظ بھی اس کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کا بند توڑ دینے کے لیے کافی تھا۔ مجھے تردد ضرور ہوا لیکن میں نے اسی لیے اپنی پریشانی اس سے چھپائی اور جھوٹ موٹ ہی اس کا مذاق اڑاتا ہوا ہنسنے لگا۔

"تو بھلا اس میں رونے دھونے کی کیا بات ہے؟"

"پھر کیا کروں۔؟"

"خوب۔ تم لڑکیوں کا جواب نہیں، گویا رونا دھونا بھی کچھ کرنے میں داخل ہے۔"

وہ مسکرانے لگی۔ اس کے مسکرانے کا سماں بالکل ایسا تھا جیسے پیپل کے گھنے سایے میں سڑک کی مدھم روشنی کا سماں۔

"بولیے نا ـــ کیا کروں میں؟" ـــ اس کے رندھے ہوئے گلے کا نمایاں درد، اب سوز نہاں بن رہا تھا۔

"دوسری بہنیں کہاں چلی گئیں؟" میں نے تفصیلات جاننے کے لیے پوچھا۔

"سب کی سب اڑوس پڑوس میں اسی کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔"

"اور تم یہاں کھڑی ہوئی آنسو زمین میں بو رہی ہو کہ فصل آگے تو کاٹ سکو۔"

"اللہ متین بھائی ـــ کچھ کیجیے نا۔"

"وہ اسکول گیا تھا آج ؟" میں نے اس طرح جرح کی جیسے منٹ بھر میں اُسے لا کھڑا کردوں گا۔

"جی ہاں گیا تھا لیکن اب تک نہیں لوٹا"— وہ پھر رو پڑنے کو تھی۔

اس کے لیے یہ چھوٹا سا حادثہ یقیناً تشویش کا باعث تھا مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ میں نے اس کے دُکھ کو پوری شدت سے محسوس بھی کیا تھا سجادے اس کا اکلوتا، چھوٹا اور چہیتا بھائی تھا۔ وہ عمر کی اس منزل میں تھا جہاں ایک بھول، ایک غلط قدم، زندگی بھر کا حاصل ہو کر مستقبل کا مقدر بن جاتا ہے۔ سجادے ویسے مجھے بھی پیارا تھا۔ میرے اس تعلق خاطر کے دو سبب تھے ایک تو یہی کہ یہ بارہ تیرہ سالہ سانولا، سلونا لڑکا فطرتاً بڑا نیک تھا۔ اسکے سر سے زمانے کی ہوا کے وہ جھونکے ابھی نہیں گزرے تھے جو اس عمر کے لڑکوں کو اسکول سے اُٹھا کر گلی کوچوں میں لے آتے ہیں۔ پھر بڑی بڑی سڑکیں اور شاہراہیں اُن کی ہمدم و ہمراز بن جاتی ہیں اور گھر میں ان کا جی نہیں لگتا۔ دوسری ایک اور جذباتی وابستگی جس بنا پر وہ مجھے اچھا لگتا تھا، یہ بھی تھی کہ وہ اپنے ہی ہم عمر میرے بچے کا کبھی بڑا گہرا دوست بھی تھا۔ میرا بچہ اس دنیا میں ہوتا تو یہ دوستی آج تک قائم رہتی۔ شاید وہ بھی زینو کے دُکھ درد کا کچھ مداوا کر سکتا اور اپنے دوست کی تلاش میں اپنے ننھے سے دھڑکتے ہوئے دل کو لیے سرگرداں رہتا — لیکن اس کا دل تو بس کھیلتے کھیلتے ہی ٹھہر گیا تھا اور وہ مجھ سے، اپنی امی سے، اپنی بہن اور بھائیوں سے پھر کبھی نہ ملنے کے لیے جُدا ہو گیا تھا — اور اس کے بعد میں آج تک اسے نہیں پکار سکا ہوں کہ "منیرو شام ہو گئی ہے، گھر لوٹ آؤ۔"

آج زینو نے سجادے کے گھر نہ پہنچنے کی بات اس ڈھنگ سے کی کہ میں تڑپ اٹھا۔ جی چاہا، اس سے پوچھوں کہ پگلی، آنسوؤں کی فصل کہیں اُگی ہے جو اُگے گی۔ سجادے تو صبح کا بھولا ہے جو شام کو گھر لوٹے گا ہی — میرا منیرو تو شام کو اس طرح گھر سے چلا گیا کہ پھر نہ اس کی صبح ہوئی نہ میری — زندگی اس کا منھ تکتی رہ گئی اور بت میرا — سنتا ہوں کہ وقت نہیں ٹھہرتا ہے لیکن میں نے منیرو کی جدائی کی وہ ایک شام یا تو پکڑ کر اپنے سینے میں چھپالی ہے یا پھر وقت ٹھہر گیا ہے۔ لیکن میں نے زینو سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ بھلا ہر وہ بات جو دل کے زخموں کو کرید کر رکھ دیتی ہے کسی سے کیسے کہی جا سکتی ہے اور پھر آدمی کا دل دکھا ہوا ہو تو دوسروں کے غم بھی اپنا لیتا ہے لیکن میں تو اپنے دُکھ درد کا موازنہ اُس کے غم سے کرنے چلا تھا۔ یہ کیسی خود غرضی ہے۔ کتنا چھوٹا پن ہے — اس کے باوجود میرا جی یہ چاہ رہا تھا کہ میں بھی زندگی میں ایک بار — صرف ایک بار پکار سکوں کہ "منیرو شام ہو گئی ہے، تم بھی گھر لوٹ آؤ۔"

میں نے زینو کو تسلی دی : "تم گھر چلی جاؤ سجادے آ جائے گا۔ وہ کہیں جا ہی نہیں سکتا۔ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔"

سجادے رات گئے گھر لوٹ آیا۔ زینو کا گھر میرے گھر کے برابر ہی تھا۔ مجھے رات ہی اس کے لوٹنے کی اطلاع مل گئی۔ جی چاہا سجادے سے دل کھول کر باتیں کروں۔ اس سے پوچھوں کہ اس کے چھوٹے سے دل پر اس نئے تجربے سے کیا گزری۔ وہ گیا کیوں تھا اور آ کیوں گیا۔ وہ کیا بات تھی جس نے اس کے دل سے اُس کی اپنی بہنوں کی محبت چھین لی تھی۔ خون کے رشتے اٹوٹ ہوتے ہیں یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں، میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دل کے رشتے ضرور اٹوٹ ہوتے ہیں۔

صبح کو میں اس کے گھر گیا تو چاروں بہنوں میں گھرا ہوا وہ بڑا مسکین سا بیٹھا تھا۔ سب کی سب اُسے نصیحت کر رہی تھیں۔ زینو کی باتوں سے برہمی نمایاں تھی۔ زینو کا شوہر بھی بیچ بیچ میں سجادے کو دھمکا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اب اگر سجادے اسکول سے سیدھے گھر نہیں آئے گا تو پولس میں اس کے خلاف رپورٹ لکھوادی جائے گی۔ سجادے کی دو بہنیں کچھ آبدیدہ سی تھیں۔ پھر مجھے دیکھ کر جیسے ان کے آنسوؤں کو بہہ لینے کا سہارا مل گیا۔ اپنے مرحوم باپ، ماں کو یاد کر کے رو پڑیں۔ زینو نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اچھا ہی ہوا جو ابا، امی، اس دنیا سے اُٹھ گئے، وہ سجادے کے یہ سب کرتوت دیکھتے تو اپنی موت نہ مر جاتے بھلا!

میں نے آپ سے کہا نا کہ سجادے تو بہت پیارا سا لڑکا ہے۔ اس کے سر سے زمانے کی ہوا کے وہ جھونکے ابھی نہیں گزرے ہیں جو اُسے اسکول سے اُٹھا کر گلی کوچوں میں لے آتے۔ لیکن وہ اپنی بہنوں کی اس اُداسی سے، ان کی برہمی سے، غرضکہ اُن کے ہر ردِعمل سے اس طرح بے نیاز تھا جیسے اُس نے کوئی ایسی حرکت ہی نہیں کی جو اس کی اپنی دانست میں اس کا سر جھکا سکتی تھی — مجھے سجادے کی یہ بے نیازی ہی تو کھل گئی۔ کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اس کے سر سے زمانے کی ہوا کے وہ جھونکے گزر گئے ہیں جو اسے اسکول سے اٹھا کر گلی کوچوں میں

لے جا رہے ہیں اور اب سجادے، زینو کے بس کا روگ نہیں رہا ہے۔

زینو اپنی چھوٹی بہنوں اور سجادے کی صرف بہن ہی نہیں تھی۔ وہ ان کی ماں بھی تھی اور باپ بھی۔ اُس نے خود پڑھا، اپنی تعلیم ہی کے دوران میں ٹیوشن کر کے اتنا کمایا کہ سب بہنوں کی کفیل ہوئی۔ سجادے تو اس کا راجہ بھیا تھا۔ راجہ بھیا کو اس نے بڑھ چڑھ کر ہی چاہا۔ راجہ بھیا کے تو بس اللّے تللّے تھے۔ لیکن یہ ساری محبتیں، چادر کی گنجائش میں سمٹی ہوئی تھیں۔ محبت کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ محبت کی دنیا کا اور چھور نہیں ہے۔ لیکن محبت کے امکانات بڑے سکڑے سمٹے ہوئے ہیں۔ محبت کا کومل پودا تو دل کے ٹوٹنے سے لے کر روٹی کے نہ ملنے تک یکساں طور پر مرجھا جاتا ہے۔ زینو کی چادر میں محبت کی وسعتیں تو سمٹ آئی تھیں لیکن زمانے نے جوار اور گیہوں کے خوشے چادر کے دامن سے چرا لیے تھے۔

میں بھانپ گیا تھا کہ زینو کی یہی تہی دامنی پیار کے نرم و نازک پودے کو غیر محسوس طور پر کھلانے کا باعث بن رہی تھی۔ نہ سجادے کا اس میں کوئی دوش تھا، نہ زینو کا۔ دونوں مجبور رہتے، دونوں نردوش۔

میں نے جس طوفان کی آمد آمد کی آہٹ پالی تھی، اب وہ طوفان تو میری نظروں کے سامنے تھا۔

میں سن چکا تھا کہ زینو کے شوہر نے اسکول کی نوکری سے زینو کو منع کر دیا تھا اور اس نے یہ نوکری چھوڑ بھی دی تھی۔ زینو کا شوہر چاہتا تھا کہ زینو جب اس کے گھر کی بہار بن کر آئی ہے تو یہ بہار اُس کے اپنے گھر ہی کو چمن در چمن کر دے۔

زینو کے شوہر کا یہ مطالبہ فطری بھی تھا اور جائز بھی۔ اور زینو نے اپنے گھر کو جنت بنا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اب جبکہ وہ ایک چاہنے والے شوہر کی بیوی بن گئی تھی۔ اب جبکہ وہ ایک گھر کی مالکن بن گئی تھی۔ اب جبکہ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی — تو سجادے اس کا چہیتا ہونے کے باوجود بھی نہ اس کا حاصل زندگی تھا، نہ مرکز نگاہ۔ اب تو زینو محبت ہی محبت بن کر سب میں تقسیم ہوتی پھر رہی تھی۔

ایک دل تھا سو اُس میں اُس کا شوہر، اُس کا گھر، اس کا ہونے والا بچہ، اُس کی بہنیں، اُس کا سجادے، سب کے سب اس طرح بے صبری — داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے جیسے تنگ گلی میں کسی بپھرے ہوئے جلوس کے بلوائی داخل ہوتے ہوں — اور زینو ہر ایک کے آگے اپنا دل کھول کھول کر رکھ رہی تھی۔ اُس نے اپنے دل کا دروازہ بھی کھول دیا تھا، دریچے بھی۔ جو دروازے سے آسکتا تھا، آ رہا تھا۔ جس کے بس میں یہ نہ تھا وہ دریچوں ہی سے پھلانگ رہا تھا۔ لیکن زینو کے شوہر نے جب یہ افراتفری دیکھی تو سارے دریچے بند کر دیے اور دروازے پر پہرے دار کی طرح بیٹھ رہا۔

اس پہرہ بندی کا شدید ردعمل سب سے پہلے سجادے ہی پر ہونا تھا سو ہوا بھی۔

وہ اپنے بستر سے یہ کہہ کر اٹھایا جانے لگا کہ "لاٹ صاحب سو دا سلف لے آئے؟"

وہ اپنے اسکول سے یہ کہہ کر بلایا جانے لگا کہ "آج گھر کا ایک ضروری کام اُس نے ادھورا چھوڑ دیا ہے۔"

غرضکہ گھر کی فضا میں کچھ ایسی پرچھائیاں سی چلنے پھرنے لگیں جنہیں پہلے کبھی سجادے نے نہیں دیکھا تھا۔

"سجادے یہ کام کرو"۔ "سجادے وہ کام کر دو"۔ "اسکول میں پڑھتے ہو تو کوئی احسان نہیں کرتے ہو سجادے"..... "اپنی عمر دیکھو، اس عمر میں تو آدمی اپنا بار خود اٹھا لیتا ہے۔"

سجادے نے کالونی بھر کے لڑکوں میں کسی کو نہیں دیکھا جس نے اس عمر میں اپنا بار آپ اٹھایا ہو۔ سب کے سب اسکول سے لوٹتے تو اطمینان سے غروب آفتاب تک کھیلتے رہتے۔ سجادے ترس ترس کر رہ جاتا۔ صبح اسکول جانے سے پہلے وہ من لگا کر گھر کا کام کاج کر دیتا۔ لیکن شام کو اُس کا جی نہ گھر کے کام ہی میں لگتا نہ کھیلنے میں۔ اُس کا چھوٹا سا دل اپنے گھر میں رینگتی ہوئی ان پرچھائیوں سے خوف سا محسوس کرتا تھا جو اس کی اپنی سب سے چہیتی زینو باجی کو بھی اجنبی اجنبی سا بنا رہی تھیں — دل کی دنیا پر اُداسیاں چھا رہی ہوں تو دکھاوے کی چھوٹی ترنگ اور بے جان قہقہے خود اپنے آپ ہی کھلنے لگتے ہیں خواہ انھیں کوئی پہچانے کہ نہ پہچانے — سجادے بھی اپنے ہم جولیوں کے جھرمٹ میں کھیلتا کھیلتا اُداس ہو جاتا۔

ایک دن اُس کے دل نے اس سے کہا: "سجادے اپنا بار آپ ، اٹھا لو!"

اُس نے دل کی بات مان لینے میں پس و پیش سے کام لیا۔ اب تو دل نے پھر کہا: "سجادے اپنا بار آپ اٹھا لو!"

اور جب سجادے نے اپنا بار آپ اٹھا لیا تو کالونی کی نکڑ پر مجھے زینو

زینو رُک گئی۔ چاہتا تو میں زینو سے یہ پوچھ بھی سکتا تھا کہ اندھیرے اُجالے کے اس سنگم پر ـــ پیپل کے گھنے سایوں کے نیچے، بھری شام کے وقت جہاں بہتی ہوئی تاریکیوں کو سڑک کی مدّھم روشنی اُجالنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے ـ وہ اکیلی کیوں کھڑی ہے۔ اُسے کس کا انتظار ہے۔

لیکن میں نے اُس سے ایسی کوئی بات نہیں پوچھی۔ سجادے لوٹ آیا تو زینو نے مجھے خود بتایا کہ سجادے نے کسی ایرانی کے بڑے سے ہوٹل میں ملازمت کر لی ہے اور اب وہ اسکول سے سیدھے اسی ہوٹل کو جایا کرے گا جہاں رات گئے ایک دو بجے تک اُسے کام کرنا ہے۔

زینو مجھ سے کہنے لگی: "اب آپ ہی سمجھائیے نا تین بھائی' سجادے کو ـــ وہ تو کہتا ہے کہ نوکری چھوڑ دینے کے لیے میں اصرار کروں گی تو وہ گھر ہی سے کہیں چلا جائے گا!"

اور ـــ زینو کی آنکھیں زمین میں آنسو بونے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔

میں نے سجادے کو نظر بھر کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ارادے اور عزم کی سرخیاں تھیں۔ شفق کی ایسی سرخیاں جو نمودِ سحر کا پتہ دیتی ہیں ـــ میں سمجھ گیا کہ سجادے نے اندھیرے کی طرف نہیں اُجالے کی جانب قدم اُٹھایا ہے اور ایسے میں اُسے نہ میں روک سکتا ہوں نہ زینو ـــ اور ہوا بھی یہی ـــ میں اور زینو ہار گئے ـــ سجادے کی جیت ہوئی۔ اور اس نے وہی ملازمت جاری رکھی۔

لیکن اپنی منزل کی جانب بڑھنے والا یہ تنہا اور اکیلا راہی سجادے بھی ایک شام کالونی کے اسی نکڑ پر اُداس اور ملول کھڑا مجھے نظر آیا، جہاں کبھی زینو اسی عالم میں ملی تھی۔

میں اس کے پاس گیا۔ اس سے بہت قریب ہو کر میں نے اس سے پوچھا:

"کیا بات ہے سجادے؟"

سجادے کی چُپ نے مجھے اصرار کرنے پر مائل کیا۔ میں نے بااصرار اس سے پوچھا: "کچھ بتاؤ بھی سجادے! شاید میں کچھ کر سکوں؟"

سجادے نے بتایا کہ آج ہوٹل کے کام سے چھٹی کا دن ہے لیکن کالونی کے لڑکے جن کا وہ کبھی بہت پیارا دوست تھا آج اس کے ساتھ کھیلنے سے گریز کر رہے ہیں۔

اس نے بڑے درد بھرے لہجے میں مجھ سے کہا: "دیکھئے ـــ وہ سب کے سب مجھے ہوٹل کا چھوکرا پکار رہے ہیں۔ میں نے تو اپنا بار آپ اُٹھایا تھا۔ میں نے کوئی برائی تو نہیں کی تھی۔ لیکن وہ میرے ساتھ کھیلنا تک گوارا نہیں کرتے۔ ان کے بڑوں نے انہیں منع کر دیا ہے۔ بتائیے نا اب میں کیا کروں؟ میں کہاں جاؤں؟ کن کے ساتھ کھیلوں؟"

میرے بدن میں جیسے لہو کی ایک بوند بھی اُس وقت نہ تھی۔

میرا ذہن جس پر یکایک بجلی گر پڑی تھی تب سے یہ سوچ رہا ہے کہ میں سجادے کو کوئی جواب دوں ـــ لیکن کوئی جواب مجھے سُجھائی نہیں دے رہا ہے۔

آپ ہی بتائیے میں سجادے کو کیا جواب دوں؟ وہ منتظر ہے۔ میں اس کا غم کس طرح بانٹ لوں؟

کہاوتیں

(بسلسلہ صفحہ ۱۴)

ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا ـــ رقص کردن خود نداند صحن را گوید کج است
نادان دوست سے دشمن بھلا ـــ دشمن دانا بہ از دوست ناداں
نام بھلا کہ دام ـــ نام بلند بہ از بام بلند
وعدہ اگر کرتے ہو تو پورا کرو ـــ وفائے عہد نکو باشد از بیاموزی
ہمت کے آگے سب کچھ آسان ہے ـــ ہمت مرداں مدد خدا
ہر چمکدار چیز سونا نہیں ہوتی ـــ ہر درخشندہ طلا نیست
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ـــ عیاں را چہ بیاں
ہونہار برواکے چکنے چکنے پات ـــ نشان شب پیش از شام
یہ منہ اور مسور کی دال ـــ حلوا خوردن را روئے باید

A bad workman quarrels with his tools
A bitter enemy is better than a foolish friend.
A good fame is better than a good face.
Be slow to promise but quick to perform
A good begining makes a good ending
All that glitters is not gold.
As plain as the nose on one's face.
Coming events cast their shadows before.
Honey is not for the mouth of an ass.

تقابلی مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

آشرم میں ابتدا سے ہی نئے طریقے استعمال میں نہیں لائے جاتے ہیں کیونکہ اس طرح بچوں اور ان کے والدین میں اس کی طرف سے بے پروائی کا جذبہ پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے۔ اس لیے بچوں کو ایک ایسے پُرسکون اور آرام دہ ماحول میں رکھا جاتا ہے کہ وہ خود ہی نئے اور پرانے طرزِ زندگی کی اچھائیوں اور برائیوں کا احساس کر سکیں۔

۱۹۵۹ء میں جن بچوں کا داخلہ کیا گیا تھا وہ آج پوری طرح بدل چکے ہیں۔ وہ بے خوف ہو کر محبت سے معمور ماحول میں رہ رہے ہیں۔ ان میں فرقہ بندی اور رقابت کا جذبہ ختم ہو چکا ہے اور ان کی شخصیت کا ارتقا ہو چکا ہے اور ان میں بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ آشرم میں رہنے والے بچے قوت بخش غذا، تعلیمی سہولتوں اور صاف ستھرے ماحول کی بنا پر یہاں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں شخصیت کے اس ارتقا کی بنا پر اپنے والدین کے متعلق ان کے نظریات بدل گئے ہیں۔ اگرچہ ان میں اپنے والدین کی محبت میں کوئی کمی نہیں پیدا ہوئی ہے تاہم اب وہ ان کی شراب خواری اور دیگر مذموم غیر سماجی حرکات کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ ان میں یہ یقین پیدا ہو چکا ہے کہ عمدہ تعلیم اور مناسب ضبط و نظم سے ہی وہ سماج کے کام آ سکتے ہیں اور سماج میں عزت حاصل کر سکتے ہیں۔

آشرم میں رہنے والوں کی تعداد شروع میں ۵۹ تھی لیکن اب بڑھ کر ۱۰۰ ہو گئی ہے۔

آشرم کی روزانہ زندگی ۶ بجے دعا سے شروع ہوتی ہے۔ تعلیم کے علاوہ آشرم میں موسیقی، بڑھئی کا کام، اور دستکاری کی تربیت کا بھی بندوبست ہے۔ مختلف دستکاریوں کے لیے بچوں کا انتخاب ان کے رجحان کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی انتخاب کے وقت ان کی عمر کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ کھیتی باڑی کی بھی تعلیم دی جاتی اور اپنے استعمال کے لیے خود ہی ترکاریاں بونے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ شام کو بچے فٹ بال، کرکٹ اور والی بال وغیرہ بھی کھیلتے ہیں۔

ہر اتوار کو بچوں کا ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں بچوں سے متعلق موضوعات پر تبادلۂ خیالات کیا جاتا ہے۔ فرصت کے اوقات میں بچے باہر گھومنے اور ٹہلنے جاتے ہیں تعلیم کے ایک جزو کے طور پر ڈراموں کا بھی بندوبست ہے۔ تعطیلات کے دوران بچوں کو اپنے والدین کے پاس جانے کی پوری آزادی ہے۔

آشرم میں ایک کتب خانہ ہے جس میں تقریباً ۱۰۰ کتابیں ہیں۔ علاوہ ازیں سیر و تفریح کے لیے ایک باغ بھی ہے۔

حکومت ہر بچہ کے قیام اور لباس کے سلسلہ میں ۲۵ روپیہ ماہوار خرچ کرتی ہے۔

آشرم کے ٹیچروں مرد اور عورتیں دونوں ہیں ان میں سے ایک توسیعی افسر، دو بی۔ٹی بی اور چار ایچ۔ٹی سی ٹیچر ہیں۔ علاوہ ازیں دستکاری اور موسیقی کے بھی بالترتیب دو اور ایک ٹیچر ہیں۔ بچوں کی صفائی کی نگرانی کے لیے ایک ہاؤس مدر بھی ہے۔ آشرم کی نگراں خاتون دوسرے ٹیچروں کی مدد سے آشرم کے انتظام اور تعلیمی پروگرام کی ذمہ داری ہے۔

اتر پردیش بھر میں یکم اپریل سے میٹری باٹوں کا استعمال لازمی کر دیا گیا ہے اور اگر ناپ و تول کے انسپکٹر اپنے دوروں کے دوران میں دکانوں وغیرہ پر دوسرے باٹ پائیں گے تو وہ ان کو ضبط کر لیں گے۔

ناپ و تول کے ڈائرکٹر کے ذریعہ جاری کیے گئے ایک پریس نوٹ میں مذکورہ اطلاع دی گئی ہے۔

پریس نوٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ جو لوگ میٹری باٹوں کے علاوہ دوسرے باٹ استعمال کریں گے ان کو قانون کے تحت جرمانہ یا قید یا دونوں کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اس لیے بیوپاریوں کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ پرانے باٹوں کو استعمال کرنا ترک کر دیں۔

پریس نوٹ کا متن حسب ذیل ہے —

"مرکزی حکومت نے اتر پردیش میں دس شہروں کو چھوڑ کر جہاں پہلے ہی سے میٹری باٹوں کے استعمال کی اجازت دی گئی تھی۔ یکم اپریل ۱۹۶۰ء سے اختیاری بنیاد پر تجارتی لین دین میں میٹری باٹوں کے استعمال کی اجازت دی تھی۔ علاوہ ازیں مرکزی حکومت نے مذکورہ تاریخ سے دو سال کی

بہوری مدت تک پرانے باٹوں کے استعمال کی بھی اجازت دی تھی۔ اس لیے یکم اپریل ۱۹۶۲ء سے میٹری باٹوں کے علاوہ کسی دوسرے باٹ کا استعمال ناپ اور تول سے متعلق ریاستی قانون مجریہ ۱۹۵۹ء کے تحت غیر قانونی ہے۔

"بیوپاریوں کو کافی وقت دیا جا چکا ہے کہ وہ میٹری باٹوں کے استعمال سے پورے طور پر مانوس ہو جائیں۔ حکومت یہ نہیں چاہتی کہ نئے باٹوں کے استعمال کے سلسلہ میں کسی قسم کے جبر سے کام لے۔ اس لیے حکومت تمام بیوپاریوں سے یہ درخواست کرتی ہے کہ وہ فوراً نئے باٹوں کا استعمال شروع کر دیں اور اس کا انتظار نہ کریں کہ انسپکٹران کے یہاں آکر پرانے باٹوں کو ضبط کریں۔

"میٹری باٹ اب مناسب قیمت پر بہ آسانی دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اس لیے یہ امر بیوپاریوں ہی کے مفاد میں ہوگا کہ وہ صرف نئے باٹوں کو استعمال کریں۔ کیونکہ دوسرے تمام باٹ غیر قانونی ہیں جن کو اگر انسپکٹر اپنے معمول کے دورہ میں دکانوں وغیرہ پر پائیں گے تو فوراً ضبط کر لیں گے۔ ناپ اور تول سے متعلق ریاستی قانون کے تحت خلاف ورزی کرنے والوں پر جرمانہ یا قید یا دونوں کی سزا دی جا سکتی ہے۔ اس لیے تمام متعلقہ افراد کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ پرانے باٹوں کو استعمال کرنا فوراً بند کر دیں اور صرف نئے باٹ استعمال کریں۔

گنگا شاردا گرڈ اور ریہاند کے علاقہ میں واقع ریاست کے ۲۱ ضلعوں میں بجلی کی کمی بڑی حد تک دور کر دی گئی ہے۔ اب اس علاقہ میں چھوٹی صنعتوں کے قیام اور موجودہ صنعتوں کی توسیع کے روشن امکانات ہیں۔

ہردواگنج توسیعی منصوبہ مرحلہ اول کے بجلی گھر اور ریہاند بجلی گھر کے ایک پلانٹ کے چالو ہو جانے سے ان صنعتوں کے لیے ۲۰ ہزار کیلوواٹ بجلی مخصوص کر دی گئی ہے۔ متعلقہ ضلع مجسٹریٹوں کو اس سلسلہ میں ہر ایک ضلع کے لیے بجلی کی مقررہ بالائی حد کے اندر مذکورہ مقصد کے لیے ہر انفرادی معاملہ میں ۲۵ ایچ۔ پی تک بجلی منظور کرنے کے اختیارات دیے گئے ہیں۔

ریاستی حکومت نے اس سے قبل ضلع مجسٹریٹوں سے کہا تھا کہ وہ آٹا چکیوں۔ چارہ کاٹنے کی مشینوں۔ دھان کوٹنے کی مشینوں تیل پیرنے۔ آئس کینڈی اور آئس کریم کی مشینوں اور دال اور آٹا ملوں کو بجلی منظور نہ کریں۔ بجلی کی سپلائی کی صورت حال کے بہتر ہونے کے پیش نظر ان پابندیوں کو ہٹا لیا گیا ہے۔

ایسے صارفین جن کا بجلی کا خرچ ۲۵ ایچ۔ پی کے لگ بھگ ہے اور انھیں کسی موجودہ صنعت کی توسیع یا کسی نئی صنعت کے قیام کے لیے مزید بجلی کی ضرورت ہے ضلع مجسٹریٹ ۲۵ ایچ۔ پی تک مزید بجلی منظور کر سکتے ہیں بشرطیکہ ایکزیکٹیو انجینیر (ہائیڈل) اور ضلع صنعت افسر نے اس کی سفارش کی ہو۔

ہر ایک ضلع کے لیے مقررہ بجلی کی حد حسب ذیل ہے۔

الہ آباد۔ وارانسی۔ مرزا پور۔ میرٹھ۔ بریلی۔ علی گڑھ۔ آگرہ اور مراد آباد — ایک ایک ہزار کیلوواٹ۔ دہرہ دون۔ سہارن پور۔ مظفر نگر۔ بلند شہر۔ متھرا۔ مین پوری۔ ایٹہ۔ بجنور۔ بدایوں۔ رام پور۔ شاہ جہاں پور۔ پیلی بھیت۔ فرخ آباد۔ اٹاوہ۔ الموڑہ۔ ہردوئی۔ لکھیم پور کھیری۔ نینی تال اور سیتا پور ۔۔۔ ۵۰۰ کیلوواٹ۔

الہ آباد اور وارانسی کے ضلعوں میں ایسے علاقوں کو بجلی الاٹ کی جائے گی جہاں مقامی لائسنس داروں کے ذریعہ بجلی سپلائی کی جاتی ہو اور ضلع دہرہ دون میں لائسنس دار کے حلقہ سے باہر کے علاقہ کو یہ سہولت دی جائے گی۔ چونکہ مرزا پور کے لائسنس دار کو روشنی اور پنکھے کے لیے بجلی کے کنکشن دینے کا اختیار حاصل ہے اس لیے ضلع مجسٹریٹ وہاں محض نئے کنکشنوں کی ترجیحات متعین کریں گے۔ آگرہ۔ الموڑہ۔ ہردوئی۔ لکھیم پور کھیری۔ نینی تال اور سیتا پور کے ضلعوں میں گنگا شاردا ہائیڈل گرڈ کے تحت آنے والے علاقوں میں چھوٹی صنعتوں کو بجلی دی جائے گی۔

ضلع مجسٹریٹوں کو یہ بھی ہدایات دی گئی ہیں کہ وہ بجلی کے لیے تمام درخواستوں پر ان کے موصول ہونے کی تاریخ سے ایک ماہ کے اندر فیصلہ کر دیں۔

آگرہ اور دہلی کے درمیان ہندوستان میں بنی ہوئی پہلی آرام دہ ایرکنڈیشنڈ بس سروس یکم مئی سے شروع ہو گئی ہے جس سے اب سیاح دہلی

سے آگرہ کا سفر مکمل آرام اور آسائش کے ساتھ کر سکیں گے۔

شمالی ہندوستان میں اتر پردیش پہلی ریاست ہے جہاں سیاحوں کیلئے آرام دہ ایرکنڈیشنڈ بس سروس شروع کی گئی ہے۔ سفر کے دوران میں سیاح دیہی علاقہ کے دلفریب مناظر سے بھی لطف اندوز ہوں گے۔

اس بس سروس کے ذریعہ جو ایک جیٹ کی طرح جدید اور آرام دہ ہے سیاحوں کے کل اخراجات میں نہ صرف ایک تہائی کی بچت ہوگی بلکہ وہ بہت سی پریشانیوں سے بچ جائیں گے

یہ بس نئی دہلی میں جن پتھ۔ امپیریل اور اشوکا ہوٹل سے سیاحوں کو لیتی ہوئی تقریباً سات بجے صبح روانہ ہوگی اور گیارہ بجے دن کو آگرہ پہنچ جائیگی۔ اور وہاں سے ساڑھے چار بجے سہ پہر کو دہلی کے لئے روانہ ہوکر سیاحوں کو ان کے ہوٹلوں میں تقریباً ۹ بجے رات میں پہنچا دے گی۔

سفر کے دوران میں مسافروں کی مشروبات۔ کافی اور ناشتہ سے خاطر تواضع کی جائے گی۔

آگرہ پہنچنے پر سیاحوں کو بس ہی کے ذریعہ تاج محل۔ آگرہ کے قلعہ اور سکندرہ کی سیر کرائی جائے گی اور ان کو ان مقامات تک جانے کیلئے ٹیکسی یا دوسری سواری کا بندوبست کرنے کی پریشانیوں سے نجات مل جائے گی۔ مسافروں کو ان مقامات کے لئے کوئی داخلہ فیس بھی ادا نہیں کرنا ہوگی کیونکہ یہ کرایہ میں شامل ہے۔ بس میں ایک ماہر رہبر کا بھی انتظام کیا گیا ہے جو مائیکروفون کے ذریعہ راستہ میں جو اہم مقامات پڑیں گے ان کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائیں گے۔

بس میں ایرکرافٹ جیسی ۱۷ آرام دہ نشستوں کے علاوہ ہاتھ منھ دھونے اور سنگار کا ایک کمرہ اور ناشتہ کا کاؤنٹر بھی ہوگا۔

اشوک لے لینڈ کے "کومٹ" ڈھانچہ پر بس کی باڈی فٹ کی گئی ہے اور اس میں ہندوستان میں بنا ہوا لے لینڈ ڈیزل انجن لگایا گیا ہے جس سے بس بے آواز اور بہت ہلکی چلتی ہے۔ بس میں نئے قسم کی کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں جن میں دھرے رنگے شیشے لگے ہوئے ہیں تاکہ مسافروں کو زیادہ سے زیادہ آرام مل سکے۔ بس کی ڈیزائن سادہ لیکن صد درجہ دیدہ زیب ہے۔ اس ایرکنڈیشنڈ بس میں درجہ حرارت اور رطوبت متوازن رہتی ہے۔

بس کا واپسی کرایہ ۳۵ روپیہ ہے۔ حکومت ہند کے سیاحت دفتر واقع جن پتھ اور یوپی گورنمنٹ روڈویز کے بس اسٹیشن واقع اجمیری گیٹ نئی دہلی سے نشستوں کو محفوظ کرایا جا سکتا ہے۔

نینی تال اور دوسرے پہاڑی مقامات کے لئے دہلی اور لکھنؤ سے بیک وقت گزشتہ منگل کو جو ہوائی سروس شروع کی گئی ہے اس کے سبب اس سال بمبئی اور کلکتہ کے سیاحوں کے لئے بھی بالترتیب دہلی اور لکھنؤ سے ان مقامات پر جانے کے لئے فوری ہوائی سروس کی سہولتیں فراہم کر دی گئی ہیں۔

گزشتہ سال دہلی۔ پھول باغ۔ لکھنؤ کے درمیان ہفتہ میں دوبار ہوائی سروس جاری کی گئی تھی اب اس سال یہ سروس ہفتہ میں تین بار یعنی ہر منگل۔ جمعرات۔ اور اتوار کو دستیاب ہوگی۔

لکھنؤ کے اموسی ہوائی اڈا سے پہلا ہوائی جہاز پھول باغ کیلئے ساڑھے چار بجے شام کو روانہ ہوا۔ اس سے قبل وہی جہاز دہلی سے سیاحوں کو لیکر صفدر جنگ ہوائی اڈا سے ایک بجے دوپہر میں روانہ ہوا تھا جو ایک گھنٹہ پانچ منٹ کی اڑان کے بعد پھول باغ میں اُتر گیا۔

اب بمبئی آنے والے سیاح صرف چھ گھنٹہ میں نینی تال بڑے آرام کے ساتھ پہنچ جائیں گے۔ جس میں ان کو چار گھنٹہ ہوائی جہاز میں اور دو گھنٹہ پھول باغ ہوائی اڈا سے نینی تال جانے کے لئے یو۔ پی گورنمنٹ روڈویز کی آرام دہ بس میں سفر کرنے میں لگیں گے۔ پھول باغ ہوائی اڈا سے نینی تال کا فاصلہ ۴۴ میل ہے۔ یہ سیاح اب ناشتہ بمبئی دوپہر کا کھانا دہلی میں اور سہ پہر کی چائے نینی تال میں پی سکتے ہیں۔ بمبئی سے ہوائی جہاز صبح ساڑھے سات بجے روانہ ہوکر دہلی کے پالم ہوائی اڈا پر ساڑھے دس بجے یعنی صرف تین گھنٹے کے اندر پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد ڈکوٹہ ہوائی جہاز صفدر جنگ سے ایک بجے روانہ ہوکر دو بج کر پانچ منٹ پر پھول باغ کے ہوائی اڈا پر پہنچ جائے گا۔

اسی طرح کلکتہ سے آنے والے سیاح نینی تال صرف ۹ گھنٹہ میں پہنچ جائیں گے۔ ان کو اس سروس کے ذریعہ تقریباً ساڑھے پانچ گھنٹہ کلکتہ سے لکھنؤ اور ایک گھنٹہ بیس منٹ لکھنؤ سے پھول باغ تک پہنچنے میں لگیں گے۔ کلکتہ کے سیاح دوپہر کا کھانا کلکتہ میں کھا کر سہ پہر کی چائے لکھنؤ میں اور رات کا

مانا نینی تال میں کھا سکتے ہیں جہاں وہ تقریباً آٹھ گھنٹہ میں پہنچ جائینگے۔

پھول باغ ہوائی اڈا اب درحقیقت نینی تال اور دوسرے پہاڑی مقامات جن میں رانی کھیت الموڑہ کوسانی اور ایشیا میں جنگلی جانوروں کی سب سے بڑی پناہ گاہ کاربٹ نیشنل پارک خاص طور سے قابل ذکر ہیں کا دروازہ بن گیا ہے۔ سیاحوں کے لئے ہوائی اڈہ سے ان مقامات پر جانے کے لئے نقل و حمل کے ساتھ ہی تمام دوسری سہولتیں بھی فراہم کردی گئی ہیں۔

دہلی سے پھول باغ اور لکھنؤ سے پھول باغ تک کا کرایہ بالترتیب ۵ روپیہ اور ۴۶ روپیہ اور تیس دن کا واپسی ٹکٹ بالترتیب ۹۵ روپیہ اور ۱۰۰ روپیہ ہے۔

بمبئی سے دہلی ہوکر پھول باغ اور کلکتہ سے لکھنؤ ہوکر پھول باغ کا کرایہ بالترتیب ۲۴۶ روپیہ اور ۲۲۲ روپیہ ہے اور ۹۰ دن کا واپسی ٹکٹ بالترتیب ۴۷۸ روپیہ اور ۴۲۰ روپیہ ہے۔

درآمد اور برآمد (کنٹرول) ایکٹ ۱۹۴۷ء کے تحت چین کے تبتی علاقہ میں ہندوستان سے مندرجہ ذیل سامان کی برآمد کی اجازت دی گئی ہے۔

ہر طرح کا اناج (چاول۔ گیہوں۔ مکا۔ چنا اور جو کے علاوہ) موم بتیاں۔ سُتلی کی رسیاں۔ تبتی ٹوپیاں اور فلیٹ ہیٹ باورچی کے خانہ کے عام برتن (اسٹین لیس اسٹیل یا چاندی کے بنے ہوئے برتن شامل نہیں) چمڑے کے جوتے (جن میں ربڑ کے تلے یا ایڑی والے چمڑے کے جوتے بھی شامل ہیں) سلائی کی مشینیں۔ گھریلو استعمال کے لئے پلاسٹک سے بنے ہوئے سامان (ان میں دانت کے برش اور کنگھے وغیرہ شامل ہیں) اور کھلونے کپڑا (جس میں خاکی سفید اور نیلے ڈرل اور ان سے بنے لباس زیتونی ہرے اور اونی کپڑے اور سلی ہوئی اونی پوشاکیں اور ریلٹن کپڑے شامل نہیں ہیں لیکن نقلی ریشم جارجٹ اور ایسے کپڑوں سے بنی پوشاکیں شامل ہیں جن پر پابندی نہیں ہے) شراب اور اسپرٹ مصری جیسے (کوزہ وغیرہ) اور گڑ لکھنے کا سامان مرچیں تمباکو نسی اور بغیر بنی بیڑی نسوار ماچس بالوں کا تیل۔ چائے ادرک کاغذ تھوڑی مقدار میں صابن یعنی آٹھ سے زیادہ نہیں۔ جوتہ کے فیتے پھلیاں سلائی کی سوئیاں (سلائی کی مشینوں کی سوئیاں بھی ان میں شامل ہیں۔ سلائی کے مشین کا تیل دھاگہ گھریلو استعمال کے چاقو سوتی دھاگہ کے گولے زعفران ——— (جن میں لیک دائی بھی شامل ہے) مناسب مقدار میں تاجروں کے نجی استعمال کے لئے مکھن نکلے ہوئے دودھ کا پوڈر پان چونا کتھا چھالیہ جوتے کی کیلیں اور دھاگا۔

ریاستی حکومت کے ذریعہ ملازمت سے سبکدوشی کی مراعات سے متعلق جو نئے قواعد نافذ کیے گئے ہیں ان کے تحت پنشن کے لیے مہنگائی بھتہ کی پوری رقم جو اس وقت ملتی ہے شمار کی جائے گی۔

نئے قواعد کے تحت پنشن کی انتہائی حد پانچ ہزار روپیہ یا چھ ہزار روپیہ سالانہ جیسی کہ صورت ہو، سے بڑھا کر ۶۷۵۰ روپیہ کردی گئی ہے۔ اور کوئی خصوصی مزید پنشن نہیں دی جائے گی۔

انتہائی پنشن اور اوسط مشاہرہ کا تناسب ۳۰ : ۴۰ سے گھٹا کر ۳۰ : ۸۰ کردیا گیا ہے۔ لیکن پنشن کے علاوہ وفات یا سبکدوشی گریجوئٹی دی جائے گی۔ علاوہ ازیں ۳۰ : ۸۰ کے تناسب کا اطلاق ایسے ملازمین پر نہیں ہوگا جو قاعدہ ۱۱ کے تحت وفات اور سبکدوشی گریجوئٹی اور فیملی پنشن لینا پسند کریں گے۔ انھیں سول سروس قواعد کے تحت پنشن ملتی رہے گی لیکن وفات اور سبکدوشی کے برابر رقم ان کی پنشن سے وضع کرلی جائے گی۔

یو۔پی کنٹری بیوٹری پراویڈنٹ فنڈ پنشن بیمہ قواعد کے تحت ایسے سرکاری ملازم کے خاندان کو جو ملازمت کے دوران میں فوت ہوجائے اس کے فنڈ میں حکومت کے ذریعہ دی گئی رقم ہی ادا کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ فنڈ میں روپیہ جمع کرتا رہا ہو۔ مذکورہ قواعد کے تحت متوفی سرکاری ملازم کے خاندان کو گریجوئٹی کے طور پر متوفی کے مشاہرہ کی بارہ گنی رقم دی جائے گی۔ گریجوئٹی کی اتنی رقم ایسی صورت میں بھی واجب الادا ہوگی جبکہ سرکاری ملازم کسی قابل پنشن جگہ پر مستقل ہونے کے ایک دن بعد ہی فوت ہوجائے۔ ایسے سرکاری ملازم کے خاندان کو جس نے ۲۰ سال مشروط ملازمت کی ہے مذکورہ گریجوئٹی کے علاوہ فیملی پنشن بھی مل سکے گی۔ مستثنیٰ حالات میں ایسے متوفی سرکاری ملازم کے خاندان کو بھی فیملی پنشن منظور کی جائے گی جس کی مشروط ملازمت کی مدت ۲۰ سال سے کم تو ہے لیکن ۱۰ سال سے کم نہیں

ہے۔ فیملی پنشن زیادہ سے زیادہ ۱۵۰ روپیہ ماہانہ اور کم سے کم ۳۰ روپیہ ماہانہ یا پنشن کی رقم جو بھی کم ہو دی جاتی ہے۔ فیملی پنشن دس سال تک دی جائے گی لیکن کسی صورت میں بھی اس تاریخ کے بعد نہیں دی جائے گی جس تاریخ کو متوفی سرکاری ملازم کی عمر اگر وہ اعلیٰ سروس میں ہوتا تو ۶۰ ہوتی اور ادنیٰ سروس میں ہوتا تو ۶۵ سال کی ہو جاتی۔ ایسی صورت میں جب کوئی پنشن خوار اپنی سبکدوشی کی تاریخ سے پانچ سال کے اندر فوت ہو جائے اور گریجوئٹی کے لیے اس کو دی جانے والی کل رقم اور پنشن کی رقم اس کی سبکدوشی کے وقت کے مشاہرہ کے بارہ گنے سے کم ہو تو ان دونوں کا فرق اس کے خاندان کو دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں خاندان کو فیملی پنشن بھی مل سکتی ہے۔ یہ مراعات ۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء سے نافذ شدہ قواعد کے تحت نہیں آتے ہیں۔

تمام سرکاری ملازمین کو بغیر اس امتیاز کے کہ کون سے قواعد ان پر نافذ ہوتے ہیں سول سروس قواعد میں ترمیم ہو جانے کی بنا پر مندرجہ ذیل مراعات کے حقدار ہوں گے۔

ایسے تمام عارضی ملازمین جو مسلسل ملازمت کے دوران کسی قابل پنشن جگہ پر مستقل کر دیے گئے ہوں جملہ مراعات کے حقدار ہوں گے۔ لیکن ایسے ملازمین ان سے محروم ہوں گے جو (الف) کسی ناقابل پنشن جگہ پر کام کرتے ہوں (ب) کام کے اعتبار سے اجرت پانے والے ہوں (س) اور متفرق فنڈ سے تنخواہ پاتے ہوں۔

کسی بھی سرکاری ملازم کو جو یکم اپریل ۱۹۶۱ء یا اس کے بعد کسی قابل پنشن جگہ پر مستقل ہو کنٹر بیوٹری پراویڈنٹ فنڈ میں جمع کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ایسے سرکاری ملازم کو بھی اس فنڈ میں روپیہ جمع کرنے کی اجازت نہ ہوگی جس کو کسی مستقل قابل پنشن جگہ پر یکم اپریل ۱۹۶۱ء سے قبل مستقل کر دیا گیا ہو بشرطیکہ اس کو مستقل کیے جانے کا حکم یکم اپریل ۱۹۶۱ء کو یا اس کے بعد جاری کیا گیا ہو۔ ایسے سرکاری ملازم کو جو یکم اپریل ۱۹۶۱ء سے پہلے کنٹر بیوٹری پراویڈنٹ فنڈ میں روپیہ جمع کر رہا ہو اور جس نے اپنے لیے ۱۹۴۸ء کے کنٹر بیوٹری پراویڈنٹ فنڈ پنشن انشورنس کے قواعد کا انتخاب نہ کیا ہو لازمی طور پر جنرل پراویڈنٹ فنڈ میں روپیہ جمع کرنا ہوگا۔ اور اس صورت میں اس کی سی۔ پی فنڈ میں جمع شدہ رقم معہ سود جنرل پراویڈنٹ فنڈ میں منتقل کر دی جائے گی۔

اگر کوئی سی۔ پی۔ فنڈ میں روپیہ جمع کرنے والا اتر پردیش کے ۱۹۴۸ء کے کنٹر بیوٹری پراویڈنٹ فنڈ پنشن انشورنس کے قواعد کو منتخب کرتا ہے تو ایسی صورت میں جنرل پراویڈنٹ فنڈ میں جمع شدہ اس کی رقم معہ سود سی۔ پی۔ فنڈ میں منتقل کر دی جائے گی۔ اس طور پر سرکاری ملازم کو اب یہ اختیار ہوگا کہ وہ جنرل پراویڈنٹ فنڈ اور سی۔ پی۔ فنڈ میں سے کسی ایک میں روپیہ جمع کرے دونوں میں نہیں۔

یو۔ پی کنٹر بیوٹری پراویڈنٹ فنڈ پنشن بیمہ قواعد ۱۹۴۸ء کا اطلاق ایسے موجودہ بیمہ شدہ ملازمین پر نہیں ہوگا جنھوں نے یہ قواعد اپنے لیے منتخب نہیں کیے ہیں بیمہ کے لیے ایسے سرکاری ملازمین کی درخواستیں جنھوں نے یہ قواعد منتخب کر لیے ہیں منظور کر لی جائیں گی اور انھیں پالیسیاں جاری کر دی جائیں گی۔

جبری بیمہ شدہ ملازمین کی پالیسیاں اگر وہ یہ قواعد اپنے لئے منتخب نہیں کرتے ہیں ختم ہو جائیں گی اور ان پر وصول شدہ پریمیم کی رقمیں معہ سود کے جنرل پراویڈنٹ فنڈ میں منتقل کر دی جائیں۔

ایسے ملازمین جن کے لئے بیمہ کرانا لازمی ہے اگر اپنے لئے ان قواعد کا انتخاب نہیں کرتے ہیں تو ان کے لئے دو صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ یعنی یا تو انھیں اپنی پالیسیوں کو ادا شدہ کرانا ہوگا یا ان سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ اگر اختیاری طور پر بیمہ شدہ ملازم گزیٹیڈ آفیسر ہے تو اسے خود اکاؤنٹنٹ جنرل یو۔ پی کو اطلاع دینا ہوگی۔ کہ آیا وہ اپنی پالیسیوں کو ادا شدہ کرانا چاہتا ہے یا ان سے دست بردار ہونا چاہتا ہے۔ اگر ایسا بیمہ شدہ ملازم گزیٹیڈ آفیسر نہیں ہے تو یہ اطلاع اس کے دفتر کے افسر اعلیٰ کے ذریعہ اے۔ جی کو دی جائے گی۔

متفرقات

ہندی کی کمیاب کتابوں کی اشاعت ۔ ریاستی ہندی سمیتی نے ہندی کی کمیاب کتابوں کی اشاعت سے متعلق اسکیم کے تحت اب تک ۶۳ کتابیں شایع کی ہیں اور مصنفین کو معاوضہ بھی دیا جا چکا ہے۔ یہ معاوضہ طبع زاد کتابوں کے لئے فی صفحہ ۸ روپیہ سے ۱۰ روپیہ تک اور

زمجوں کے لئے ۵ روپیہ سے ۱۰ روپیہ تک کی شرح سے دیا گیا ہے۔

یہ اطلاع آج ودھان پریشد میں وزیر گنا ترقی شری ڈی۔ ڈی۔ کھنہ نے وزیر اطلاعات کی جانب سے شری ہردے نرائن سنگھ کے ایک سوال کے جواب میں سوالات کے وقفہ میں دی۔

انھوں نے کہا کہ طبع زاد کتابوں کے مصنفین کو معاوضہ کے علاوہ ۸ سے ۱۰ فیصدی تک رائلٹی بھی دی جاتی ہے۔

ممبر مذکور کے ایک ضمنی سوال کے جواب میں وزیر موصوف نے اشاعتی اسکیم کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ سمیتی کے ذریعہ ۱۹۵۶-۵۷ء میں ہندی کی ۳۰۰ اعلیٰ تصانیف جن ۱۰۰ طبع زاد ۱۰۰ عام اور ۱۰۰ ترجمے تھے کو شایع کرنے کا ایک پنجسالہ منصوبہ وضع کیا گیا تھا جن میں اس وقت تک ۴۳ کتابوں کی اشاعت ہو چکی ہے اور بقیہ کتابوں کے لئے کام جاری ہے۔ اس اسکیم کے تحت اس وقت ۲۴ اشخاص مختلف جگہوں پر کام کر رہے ہیں۔

شری کھنہ نے مزید بتایا کہ ہندی سمیتی صرف ان کتابوں کو شایع کرتی ہے جو یا تو ہندی میں دستیاب نہیں ہیں یا اس موضوع پر ہندی میں بہت کم کتابیں موجود ہیں۔

بے گھر اشخاص کے قرضوں کی معافی ۔ مرکزی حکومت نے مغربی پاکستان کے غیر دعویدار بے گھر اشخاص کے شہری اور دیہی قرضوں کی معافی کی درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ ۳۰ جون ۱۹۶۲ء مقرر کی ہے۔

ایسے بے گھر اشخاص کو جنھوں نے ابھی تک درخواست نہیں دی ہے یا جو درخواست دے چکے ہیں لیکن ان کی درخواستیں بیرون میعاد ہونے کی بنا پر خارج ہو چکی ہیں، ان ضلع مجسٹریٹوں کو جنھوں نے ان کو قرضہ دئے تھے۔ اپنی درخواستیں ۳۰ جون ۱۹۶۲ء کو یا اس سے قبل دیدینا چاہئیں۔

ایسے بے گھر اشخاص جنھیں ۳۱ مارچ ۱۹۵۴ء کے بعد امداد باہمی انجمنوں کے ذریعہ شہری۔ دیہی اور تعلیمی قرضے دئے گئے تھے نیز ایسی بے گھر بیوائیں جنھیں ۱۱ فروری ۱۹۵۵ء کے بعد قرضے دئے گئے تھے اس معافی کی رعایت کی مستحق نہیں ہوں گی۔

امینوں کے نظام کا آغاز ۔ ریاست کے ۱۱ اضلاع میں جو ماضی میں اودھ کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے۔ امینوں کے نظام کو رائج کیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں ریاستی عدالتوں کے زیر نگرانی قرقی۔ نیلام اور جائیداد پر قبضہ دلانے کے کام بہتر طور پر انجام دئے جاسکیں گے۔

ان اضلاع میں اس نظام کے نفاذ سے قبل نیلام اور قرقی کا کام ناظر کیا کرتے تھے لیکن وہ بعض اوقات عدیم الفرصتی کی وجہ سے حکمنامہ کی تعمیل کرانے والوں کی جو ان ذمہ دارانہ فرائض کی انجام دہی کے لئے مامور کئے جاتے تھے، خاطر خواہ نگرانی نہیں کرسکتے تھے۔

جن اضلاع میں گزشتہ جون میں اس نظام کو بروئے کار لایا گیا ہے ان کے نام یہ ہیں:۔ اناؤ۔ سیتاپور۔ رائے بریلی۔ سلطانپور۔ ہردوئی۔ بہرائچ۔ لکھنؤ۔ فیض آباد۔ بارہ بنکی۔ کھیری اور گونڈہ۔

اس نظام کی وجہ سے نہ صرف کارکردگی بہتر ہوگئی ہے بلکہ اس سے سالانہ خرچ میں ۱۷ ہزار روپیہ کی بھی کمی ہوگئی۔

ان اضلاع میں اس مقصد کے تحت مقررہ عملہ ۴۲ امینوں ۴۲ چپراسیوں اور ۵۱۸ سمن تعمیل کرنے والوں پر مشتمل ہے۔

بھینس کے ذبیحہ پر پابندی غیر ضروری ۔ حکومت گاؤکشی کی طرح بھینس اور اس کے بچھڑوں کے ذبیحہ پر پابندی لگانا ضروری نہیں سمجھتی ہے۔ یہ اطلاع ودھان سبھا میں سوالات کے وقفہ میں وزیر زراعت شری چرن سنگھ نے دی۔ وزیر زراعت نے جو گنیش چندر کاچھی کے ایک سوال کا جواب دے رہے تھے مزید بتایا کہ ریاست میں ہر سال ۱۷۴۰۰۰ بھینسوں کا ذبیحہ ہوتا ہے اس پر بھی دس سال کے عرصہ میں بھینسوں کی تعداد میں ۱۴ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔

ایک ضمنی سوال کا جواب دیتے ہوئے نائب، وزیر زراعت شری شیوراج سنگھ نے بتایا کہ جہاں تک دودھ دینے والی بھینسوں کا سوال ہے ان کا ذبیحہ یوں بھی نہیں ہوتا کیونکہ مالی نقطہ نظر سے وہ مفید ہوتی ہیں۔

بنگالی اشتہار ضبط ۔ حکومت آسام نے ایک بنگالی اشتہار بعنوان "بنگلا ریتو ہندو سادو دھان" ضبط کرلیا ہے۔ اس اشتہار میں جس کو شری مہیندر کمار گھوش بی۔ ایل نے تحریر کیا ہے ایسا مواد موجود ہے جس کا مقصد ملک کے شہریوں خاص طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کے جذبات کو پروان چڑھانا ہے۔

اس اشتہار کی ہر ایک کاپی۔ اقتباس یا دوبارہ اشاعت بحق حکومت ضبط کرلی گئی ہے۔

نقد و تبصرہ

گل کرسٹ اور اس کا عہد

از : محمد عتیق صدیقی ناشر : انجمن ترقی اردو' علی گڑھ ۔ قیمت : سات روپے

یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے ۔ مگر ہے حقیقت ۔ کہ اردو اور ہندی کی ابتدائی نثری کتابیں ایک انگریز کی اُن تھک کوششوں اور "ہندوستانی" زبان سے اس کی غیر معمولی دلچسپی کی رہین منت ہیں ۔ اس انگریز کا نام جان بارتھوک گل کرسٹ تھا ۔ جان گل کرسٹ ۲۲ سال کی عمر میں ۱۷۸۲ء میں انگلستان سے بمبئی آیا' یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی میں اسسٹنٹ سرجن کی حیثیت سے ملازمت شروع کی' یہیں ہندوستانی زبان اس نے سیکھی اور پھر کمپنی کے ملازمین اور دوسروں کو یہ زبان سکھانے کا اسے اتنا شوق پیدا ہوا کہ اس نے پہلے خود ہندوستانی زبان کی لغت اور قواعد وغیرہ تیار کیں پھر اس کی تحریک پر گورنر جنرل ہند لارڈ ولزلی نے "اورینٹل سمی نیری" نام کا ایک اسکول قائم کیا اور بالآخر لارڈ ولزلی ہی کی کوشش سے وہ مشہور ادارہ قائم ہوا جو فورٹ ولیم کالج کے نام سے مشہور ہوا ۔ گل کرسٹ اس کالج میں ہندوستانی زبان کا پروفیسر تھا ۔ اپنی پروفیسری کے زمانے میں گل کرسٹ نے اردو اور ہندی میں کتابیں لکھنے والے متعدد "منشی" مقرر کیے اور اپنی نگرانی اور ہدایت میں ان سے متعدد کتابیں لکھوائیں اور چھاپیں ۔ گل کرسٹ نے اردو پر اس طرح جو احسان کیا اس کا اعتراف سبھی کو ہے لیکن ہمارے اردو تذکروں میں اس محسن اردو کے صحیح اور مفصل حالات اور قیام ہند کے دوران میں اس کے مشاغل' تگ و دو اور سرگرمیوں کی تفصیل نہیں ملتی ۔ محمد عتیق صدیقی نے اصل ماخذوں (کمپنی کے غیر مطبوعہ ریکارڈوں' مدرسے اور کالج کونسل کی غیر مطبوعہ کارروائیوں' گل کرسٹ کی تصنیفوں اور اس عہد کے اخبارات وغیرہ) کی مدد سے اور بڑی تلاش و جستجو اور تحقیق و تفتیش کے بعد گل کرسٹ کی آمد ہند کے بعد سے اس کی روانگی (۱۸۰۴ء) تک کی اس کی ساری ادبی اور علمی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے ۔ اس جائزہ سے نہ صرف اردو لٹریچر کے ارتقا کے ابتدائی دور کی تاریخ ہمارے پیش نظر ہو گئی ہے بلکہ گل کرسٹ کے متعلق ہمارے معلومات میں کافی اضافہ ہو گیا ہے اور اس سلسلے میں بہت سے غلط قیاسات کی تصحیح بھی ہو گئی ہے ۔ کتاب میں کالج کے ہندوستانی منشیوں اور دوسرے لکھنے والوں کے نام اور بعضوں کے حالات بھی ملتے ہیں ۔ گل کرسٹ کی چھپوائی ہوئی بعض کتابوں وغیرہ کے سرورق یا کسی صفحہ کے بلاک بھی چھاپ دیے گئے ہیں ۔ (ص ۔ ع)

نوائے کفر

از : منور لکھنوی ۔ ناشر : آدرش کتاب گھر' فیض گنج (دریا گنج) دہلی ۔ قیمت : دو روپے پچاس نئے پیسے ۔

یہ نام ہے منشی بشیشر پرشاد منور لکھنوی کی غزلوں کے پہلے مجموعہ کا ۔ اردو شاعری کی دنیا میں منور لکھنوی محتاج تعارف نہیں ۔ ان کی متعدد کتابیں شایع ہو چکی ہیں جن میں ان کی نظموں کے مجموعے کے علاوہ 'گیتا' کا منظوم ترجمہ' حافظ کے اشعار کا منظوم ترجمہ اور کالی داس کے کئی ڈراموں کے منظوم ترجمے شامل ہیں ۔ یہ ساری کتابیں منور لکھنوی کی زبان دانی ہی کا ثبوت نہیں بلکہ ان کی قادر الکلامی اور شاعرانہ پختہ کاری کی آئینہ دار ہیں ۔ مختلف زبانوں پر یہ عبور اور مہارت ہر شاعر کے حصے میں نہیں آتی اور اس لحاظ سے منور لکھنوی ایک انفرادی خصوصیت کے حامل ہیں ۔ منور لکھنوی کی غزلوں کا البتہ ابھی تک کوئی مجموعہ شایع نہیں ہوا تھا ۔ زیر نظر کتاب نے یہ کمی بھی پوری کر دی ہے ۔ منور کے اکثر شعروں میں محرومی و ناکامی کی تلخیوں کا شدید احساس ہمیں ملتا ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ زندگی سے نباہ کرنے کا ایک حوصلہ بھی ان میں موجود ہے ۔ منور کے بہت سے اشعار ان کی وسیع المشربی اور وسیع النظری کا بھی پتہ دیتے ہیں ۔ ان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہندی تلمیحات اور الفاظ کو بڑی خوبصورتی سے اپنے اشعار میں سمو دیتے ہیں ۔ نوائے کفر کے چند اشعار جو ان کی شاعری کے آئینہ دار ہیں پیش کیے جاتے ہیں ۔

جنوں خفا ہے' کشیدہ ہے آگہی مجھ سے — ہر ایک چیز مقدر نے چھین لی مجھ سے
قیاس ہے اس انگارے کا بجھ کر راکھ ہو جانا — دل ناکام کی افسردگی دیکھی نہیں جاتی
بڑی لذت مجھے محسوس ہوتی ہے اذیت میں — شراب شوق کی تلخی شکر آمیز ہوتی ہے
فنا کا کیا اثر مجھ پر' بقا کا کیا اثر مجھ پر — طریق عشق میں ایسے مقام آتے ہی رہتے ہیں
وہ خواہ مینا ہو خواہ ساغر' وہ خواہ قرآں ہو خواہ منبر — لگائیں گے اس کو چشم تر سے جو تیرے ہیں کام کی نکلی
معصومیت جمال کی جن میں بھری سی لے — کیوں ایسے آنسوؤں کو نہ گنگا کا جل کہیں

دیمک کی کہانی

از : عبد البصیر خاں ناشر : انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۔ قیمت : دو روپے ۔

ایسے بہت سے موضوعات ہیں جن پر اردو میں کتابیں شایع نہیں ہو رہی ہیں حالانکہ ایسی مطبوعات کی سخت ضرورت ہے ۔ عام سائنس' فن تعمیر' آثار قدیمہ' رقص و موسیقی' حیوانات وغیرہ ایسے ہی موضوعات ہیں ۔ دیمک کی کہانی اس لحاظ سے اردو میں ایک قابل قدر کتاب ہے اور اس سے ہمارے عام معلومات میں نہ صرف اضافہ ہوتا ہے بلکہ پڑھنے والے کو دلچسپی بھی ہوتی ہے ۔ اس کتاب میں مستند حوالوں کی بنیاد پر ایک سماجی حشرہ' دیمک' کی کہانی دلچسپ انداز میں پیش کی گئی ہے ۔ دیمک کس طرح ایک اجتماعی زندگی بسر کرتی ہے' دیمکوں کی دنیا میں کس طرح تقسیم کار ہوتا ہے' قوت باصرہ سے محروم اور بہت نازک ہونے کے باوجود دیمکیں کس طرح لکڑی یا زمین کے اندر اپنا گھر بناتی ہیں' دیمک کی کتنی ذاتیں ہوتی ہیں' دیمک کی غذا کیا ہوتی ہے' دیمک سے نقصانات پہنچنے کے علاوہ فائدے کیا پہنچتے ہیں اور جو نقصانات وہ پہنچاتی ہیں ان کا کیسے تدارک کیا جا سکتا ہے' وغیرہ' ان سب کے متعلق بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ متعدد تصاویر بھی دی گئی ہیں جن سے کتاب کی دلچسپی اور افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے ۔ (ص ۔ ع)

چین کے مسلمان

از : مترجم : گوپال متل ۔ ناشر : نیشنل اکاڈمی ۔ ۹ ۔ انصاری مارکیٹ ۔ دریا گنج ۔ دہلی قیمت ۲۵ نئے پیسے

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں چین کے مسلمان کی تعداد پانچ کروڑ بتائی جاتی تھی۔ تین کروڑ میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ اب ان کی تعداد ایک کروڑ بتائی جاتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تعداد یکایک اتنی کم کیسے ہو گئی۔ اس کتاب میں اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے اور اخبارات وغیرہ کے حوالوں سے دکھایا گیا ہے کہ چین میں کمیونسٹ حکومت قائم ہونے کے بعد وہاں کے مسلمانوں پر اتنی سختیاں کی گئیں کہ ہزاروں وہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور بہتوں کا معلوم نہیں کیا حشر ہوا۔ کتاب کے مصنف کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ (ص۔ ع)

جوالا مکھی

از: اننت گوپال شیوڑے۔ مترجم: محمد حسن۔ ناشر: پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ، حکومت ہند نئی دہلی۔ قیمت۔ دو روپے پچاس نئے پیسے۔

اننت گوپال شیوڑے ہندی کے ممتاز ناول نگار ہیں۔ زیر تبصرہ ناول ۱۹۴۲ء کے ہندستانی انقلاب کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ ملک میں ۱۹۴۲ء میں جو سیاسی حالات تھے اور عوام میں حصول آزادی کے لئے مر مٹنے کا جو جذبہ بیدار ہو گیا تھا اس کی اس ناول میں بڑی موثر عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی قوم فروشوں کی غلامانہ ذہنیت بھی بے نقاب کی گئی ہے۔ ناول نگار خود اہنسا کے فلسفہ کے زبردست حامی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ ۱۹۴۲ء میں جو واقعات ہوئے وہ انگریزوں کے تشدد کا ردعمل تھے اس لئے ان کو تشدد نہیں کہا جا سکتا۔ ترجمہ سلیس، رواں اور کامیاب ہے۔ ناول پڑھتے وقت یہ بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اصل نہیں بلکہ ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔ (ع۔ ح)

نظر گاہ

از: انقر موہانی۔ ملنے کا پتہ: دفتر "جام جہاں نما" مولوی گنج۔ لکھنؤ۔ قیمت: دو روپیہ

مولانا انقر موہانی (جنھیں اب لکھنوی کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے) بڑے کہنہ مشق اور پختہ کار شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کے تین مجموعے اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں اور یہ چوتھا مجموعہ ہے۔ نظمیں، نعتیہ کلام، رباعیات اور قطعات ان کے علاوہ ہیں۔ انقر موہانی صوفی المسلک ہیں اور ایک مشہور صوفی بزرگ کے مرید۔ اردو شاعری میں یوں بھی تصوف کے رنگ میں بہت کچھ لکھا جاتا ہے پھر جو شاعر خود بھی صوفی ہو اس کے کلام میں یہ رنگ اور بھی رچ بس جائے گا۔ چنانچہ مولانا انقر موہانی کے زیادہ تر اشعار تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے اشعار بھی کہے ہیں اور بڑے دل نشیں انداز میں۔ چند اشعار پیش ہیں۔

وکیوں جانے لگا دیر و حرم کی ٹھوکریں کھانے	ترے انقر کو تیرے میکدے پر ناز ہے ساقی
معاذ اللہ نزاع دیر و کعبہ	بحمد اللہ در میخانہ نہ آیا
سر حشر دیوانہ حسن جاناں	نہ کافر ہی نکلا نہ ٹھہرا مسلماں
متاعِ دو عالم سمجھتے ہیں ہم بھی	مگر، چار تنکوں سے کم جانتے ہیں
اہل جنوں کو مل گئی منزل	رہ گیا جو تھا عقل کا مارا
وحشی کو جیسے پرسش احوال سے ہے ضد	کہہ دے گا سارا حال، اگر کچھ نہ پوچھیے
یہ کہہ کر اٹھایا ستم گر نے مجھ کو	ابھی آپ سے پھر ملاقات ہوگی

امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری

از: ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ایم اے۔ ناشر: انڈین پبلشنگ ہاؤس۔ ۳۰ نے۔ امین آباد پارک لکھنؤ۔ قیمت: ۲ روپے پچاس نئے پیسے

امیر خسرو، ہندستان کی ان برگزیدہ ہستیوں میں ہیں جن کے علم و فضل، ہمہ دانی اور ہندوستان دوستی اور حب وطن کی داستان امر ہو گئی ہے۔ ان کے باپ ترکوں کے ایک قبیلے "لاچین" کے سردار تھے جو ہندوستان چلے آئے تھے۔ یہیں ان کی شادی ہوئی اور یہیں امیر خسرو (۱۲۵۳ء کے قریب) پیدا ہوئے۔ لیکن ترکی النژاد ہونے کے باوجود امیر خسرو کو اپنے ہندوستانی ہونے پر ناز تھا؛ ہندوستان کی ہر چیز سے انھیں عشق تھا۔ ہندوستان کی عظمت کے انھوں نے ترانے گائے اور ہندوستان کی دوسرے ملکوں پر فوقیت جتائی۔ اس زمانے کے ایک ترکی النژاد مسلمان کا ہندوستان سے یہ عشق، ہم سب کو اپنے وطن سے محبت کا ایک نہ فراموش کرنے والا سبق دیتا ہے۔ امیر خسرو نے کئی بادشاہوں کا عہد دیکھا۔ ان کے تبحر علمی اور غیر معمولی فہم و فراست کی وجہ سے ہر بادشاہ نے ان کا بے انتہا احترام کیا۔ امیر خسرو، بادشاہوں کے درباروں میں بھی رہ کر خود ایک صوفی تھے اور ایک بزرگ صوفی کے مرید۔ انھوں نے اس حیثیت سے بھی ہر شخص کو رواداری اور وسیع النظری کی تعلیم دی۔ امیر خسرو فارسی کے ایک عظیم شاعر ہونے کے علاوہ اردو کے بھی پہلے شاعر گنے جاتے ہیں۔ ہندی میں ان کے اشعار، دوہے، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دو سخنے وغیرہ آج تک زبان زد خواص و عوام ہیں۔ اس کتاب میں اس عظیم المرتبت شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مختصر طور سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں وغیرہ بھی درج کر دی گئی ہیں۔ (ص۔ ع)

نیرنگِ نظر

از: روحی علی اصغر۔ مقامِ اشاعت: دیکا جی والا حمایت نگر، حیدر آباد۔ قیمت: دو روپے پچاس نئے پیسے۔

نیرنگ نظر نام ہے تراب النسا بیگم روحی علی اصغر کے مجموعۂ کلام کا۔ اس میں ان کی نظمیں، غزلیں، قطعات اور رباعیات شامل ہیں۔ ان کے دیکھنے سے روحی کی اہلیت اور صلاحیتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ شاعری کے پرانے روایات سے انحراف نہ کرتے ہوئے بھی زندگی کے اعلیٰ اقدار کی دل دادہ ہیں ان کی غزلیں اس کا ثبوت ہیں۔ نظمیں انھوں نے شخصیات پر بھی لکھی ہیں، عرفانیت پر بھی اور نئے ہندوستان پر بھی۔ اسی سے ان کے شوق کی ہمہ گیری اور وسعت نظر کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ (ص۔ ع)

جدید ایرانی ادب

از: آفتاب اختر۔ ناشر: احباب پبلشرز۔ قیمت ۵، نئے پیسے

ہندوستان میں قدیم فارسی ادب پر بہت کچھ لکھا گیا۔ ہندوستان کی سرزمین نے فارسی کے ایسے جلیل القدر شاعر جنم دیے جن پر زبان فارسی کو بجا طور سے ناز ہو سکتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ایران کے معاصرین سے ہندوستان کے فارسی داں بخوبی واقف

ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ فارسی سے عوام کو وہ شغف نہیں رہا جو کبھی تھا اور نوبت یہ پہنچی کہ جدید ایرانی ادب سے لوگ ناواقف رہنے لگے۔ آفتاب اختر کی یہ کوشش قابلِ ستائش ہے کہ انھوں نے اس کتابچہ میں جدید ایرانی ادب کا پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ جدید ایرانی نثر نگاروں اور شاعروں سے ہم کو روشناس کرایا ہے۔ جدید ایرانی ادب سے یہ تعارف اگرچہ مختصر ہے لیکن بہت بروقت اور مفید ہے۔ کتابچہ کی اہمیت اس لئے اور بڑھ جاتی ہے کہ جدید ایرانی ادب پر ہندوستان سے اب آسانی سے مواد بھی نہیں ملتا۔ (ص۔ع)

گلہائے شگفتہ مولفہ: شیلا سہائے سرِوا استوا آزؔ کانپوری۔ ناشر: کتاب گھر علی گڑھ۔ قیمت: دو روپے بارہ آنے

یہ مختلف شعرا کے چیدہ چیدہ اشعار کا انتخاب ہے، جسے شیلا سہائے صاحبہ نے گلہائے شگفتہ کے نام سے یکجا کیا ہے۔ یوں تو اردو میں اس طرح کے انتخابات کا رواج ابتدا ہی سے رہا ہے اور آج بھی مقبول ہے۔ لیکن اس مجموعے کی خصوصیت یہ ہے کہ شیلا سہائے صاحبہ نے نہ دورِ حاضر پر اکتفا کیا ہے اور نہ متقدمین اور متاخرین کے دواوین سامنے رکھ کر ان سے انتخاب کیا ہے بلکہ اس مجموعے میں ایسے اشعار شامل کئے ہیں جو براہِ راست ان کے مطالعے میں آئے ہیں اور جن سے وہ متاثر ہوئے ہیں۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ایسے اشعار پیش کئے گئے ہیں جو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں یا روزمرہ کی بول چال اور ادبی صحبتوں میں بے تکلف استعمال کئے جاتے ہیں اور دلوں میں گرمی اور تاثر پیدا کر دیتے ہیں۔ مجموعے میں غزل کے اشعار کے ساتھ ساتھ بعض شاعروں کی نظموں، قطعوں، مسدس اور مخمس کے بند بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ (خ۔ا)

۱۹۵۸ء کے بہترین افسانے مرتبہ۔ ایم حبیب خاں۔ ناشر: انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ۔

قیمت: دو روپے پچیس نئے پیسے

اس کتاب میں ۱۹۵۸ء کے "بہترین" افسانوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے اگرچہ اس میں اردو کے کئی ممتاز افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہونے سے رہ گئے ہیں تاہم مرتب نے انتخاب میں اپنے پاکیزہ ادبی ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ ان افسانوں کے مطالعے سے اردو کے افسانوی ادب کی رفتارِ ترقی اور اس کے جدید محرکات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ (ع۔ح)

نیل کنول مسکائے از: محمود حسین بدخشی۔ ناشر: ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد۔ حیدرآباد۔ قیمت: دو روپے پچاس نئے پیسے

زیرِ تبصرہ کتاب محمود حسین بدخشی کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ محمود حسین کشمیر کے ایک ابھرتے ہوئے ادیب ہیں۔ اس مجموعے کے بیشتر افسانوں میں رومانی عنصر غالب ہے اور غمِ دوراں سے زیادہ غمِ جاناں کی تفسیر کی گئی ہے۔ ان افسانوں میں کشمیر کی سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بھی عکاسی کی گئی ہے البتہ جو اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے وہ افسانے سے زیادہ انشاپردازی کے لئے موزوں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کئی افسانوں پر مضمون کا گمان ہوتا ہے۔ بہرحال ان کے اندر ایک اچھے افسانہ نگار کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ (ع۔ح)

ٹھنڈی بجلیاں از: بھارت چند کھنّہ۔ ناشر: سب رس کتاب گھر۔ ایوانِ اردو، خیریت آباد۔ حیدرآباد۔ دکن۔ ۴

قیمت: دو روپے

زیرِ تبصرہ کتاب بھارت چند کھنّہ کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین ہلکے پھلکے ہیں اور وقتی دلبستگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ان میں گہرائی اور جذبے کی شدت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ کہیں کہیں مزاح کے ساتھ طنز کی آمیزش بھی ملتی ہے لیکن طنز بھرپور نہیں جس سے پڑھنے والا تلملا اٹھے۔ مضامین کے مطالعہ سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ اگر انھیں اپنے فن پر کچھ اور توجہ کا موقع مل جائے تو وہ ایک کامیاب طنز نگار بن سکتے ہیں۔ کتابت کی غلطیاں بکثرت ہیں۔ (ع۔ح)

آوازیں از: اسرار اکبرآبادی۔ ناشر: فردوس پبلشنگ ہاؤس، ہینگ منڈی، آگرہ۔ قیمت۔ ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

زیرِ تبصرہ کتاب اسرار اکبرآبادی کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے بقول افسانہ نگار اُن کی ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ غالباً اسی لئے ابھی ان کے افسانوں میں کچھ فنی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن توقع ہے کہ ان خامیوں پر جلد قدرت حاصل کر لی جائے گی۔ (ع۔ح)

ڈھائی لاکھ از: کیرگ رائس۔ مترجم: جے، عالم۔ ناشر: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔ قیمت، چار روپے آٹھ آنے

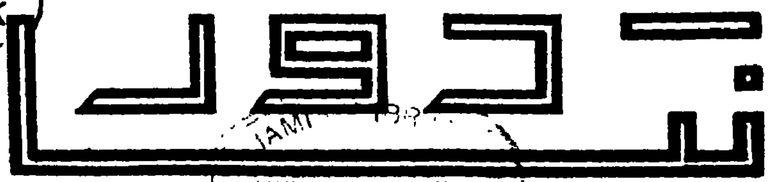
یہ ایک انگریزی جاسوسی ناول کا ترجمہ ہے جس میں شروع سے آخر تک واقعات کی پیچیدگیاں بڑھتی جاتی ہیں اور اسی کے ساتھ پڑھنے والے کی دلچسپی بھی۔ (ص۔ع)

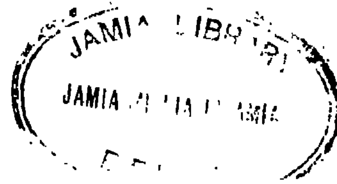
سب رس (محمد قلی قطب شاہ نمبر)۔ قیمت۔ ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: ایوانِ اردو خیریت آباد۔ حیدرآباد

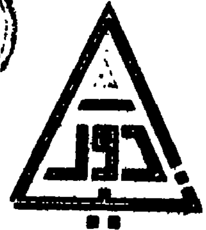
دکن کا سلطان قلی قطب شاہ ایک بڑی عظیم اور دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کا بہت بڑا علم بردار اور رواداری اور وسیع النظری کی ایک زندہ مثال تھا۔ اس کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ اس نے اردو کے علاوہ فارسی اور تلنگی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس کی شاعری میں ہندوستانی زندگی اور معاشرت کی مکمل جھلک پائی جاتی ہے۔ سب رس کے زیرِ نظر شمارے میں محمد قلی کی شخصیت، شاعری اور فن سے متعلق اہم مضامین اور نظمیں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں قطب شاہی سلاطین کے عہد میں اردو ادب کے ارتقا پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ مضامین میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم، ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اور پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی نگارشات قابلِ ذکر ہیں۔ پھر بھی قلی قطب شاہ کے کارناموں اور شاعری پر ایک مبسوط مضمون کی کمی محسوس ہوتی ہے بہرحال سب رس نے یہ نمبر شایع کر کے ایک گراں قدر ادبی خدمت انجام دی ہے۔ شمارے میں سلطان محمد قلی اور ان کی محبوبہ بھاگ متی کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ (ع۔ح) (باقی)











جلد ۱۷ نمبر ۴

اشاعت ۱۸۸۴
جولائی ۱۹۶۲ء

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: ۵۰ نئے پیسے

اسسٹنٹ ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
اَمیہ بھوشن مَلک
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات ۔ اُترپردیش

پرنٹر
جے ۔ ڈبلو ۔ ہاج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اسٹیشنری ۔ یو ۔ پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات ۔ اُترپردیش

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اُترپردیش ان سے بہرحال متفق ہو۔

اپنی بات

کم سن لڑکوں کے جرائم کی روک تھام اور نوعمر مجرموں کی اصلاح، ہر ملک کے سماج کا ایک اہم فریضہ ہے۔ بچے فطرتاً مجرم نہیں ہوتے۔ ان کا ماحول اور بعض دوسرے حالات ان سے جرم کا ارتکاب کراتے ہیں اس لئے ایسے بچوں کو سزا دے دینا مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ سزا دے دینے سے جرم کرنے کے رجحان کو تقویت پہنچتی ہے اور اس کا امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ ملک اپنے ایک ہونہار شہری سے محروم ہو جائے۔ ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مجرم بچوں کے سدھار کے طریقے سوچے جائیں اور ان پر عمل کیا جائے۔ اس امر کا احساس کرتے ہوئے حکومت اتر پردیش، ریاست کے بائیس ضلعوں میں بچوں کا قانون نافذ کرنے والی ہے جس کے تحت سولہ برس سے کم عمر کے مجرموں کی دیکھ بھال ہو سکے گی اور انھیں جرائم سے باز رکھنے کے لئے مناسب اقدامات کئے جائیں گے۔ کانپور، آگرہ، وارانسی، الہ آباد، اور لکھنؤ میں یہ ایکٹ مکمل طور سے نافذ ہو جائے گا اور گورکھپور، غازی پور، مرزاپور، ایٹہ، میرٹھ، سہارنپور، دہرہ دون، ٹہری، پوڑی، نینی تال، الموڑہ، فیض آباد، انّاؤ، اٹاوہ، جھانسی اور متھرا میں ایکٹ کی صرف وہ دفعات نافذ کی جائیں گی جن کا تعلق بچوں کے خلاف جرائم اور ان کے تحفظ سے ہے۔ ایکٹ کا مقصد یہ ہے کہ کم سن مجرموں کی اصلاح، بحالی اور آبادکاری ہو سکے۔ ایسے مجرموں کو سزا دینے کا یہ طریقہ وضع کیا گیا ہے کہ انھیں یا تو بچوں کے ایک اصلاحی اسکول میں رکھا جائے یا تنبیہہ کے بعد انھیں چھوڑ دیا جائے یا "پروبیشن" پر انھیں رہا کر دیا جائے۔ اس ایکٹ کی رو سے سولہ برس سے کم عمر کی لڑکیوں کو اخلاقی گراوٹ کی طرف مائل کرنے والوں کو سزا دی جائے گی اور ایسی لڑکیوں کی نگرانی اور محافظت کی جائے گی۔

بچوں اور کم سن مجرموں کی دیکھ بھال کے لئے کانپور، آگرہ، وارانسی، الہ آباد اور لکھنؤ میں ایک ایک "دیکھ بھال کا گھر" قائم کیا جائے گا جس میں پچاس پچاس بچے رہ سکیں گے۔ بریلی میں بھی اسی طرح کا ایک "گھر" بنایا جائے گا جس میں پندرہ بچے رہ سکیں گے۔ لکھنؤ میں ایک "اسکول" قائم کیا جائے گا جس میں دو سو بچے رہیں گے۔ اس "اسکول" کے لئے عمارت حاصل کر لی گئی ہے اور اس سلسلے میں دوسرے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے کی مدت کے اندر وارانسی میں بھی اسی قسم کا ایک "اسکول" کھولا جائے گا۔ بعض حالات میں ایسے لڑکوں کو ان کے والدین کی نگرانی میں دے دیا جائے گا۔ جن سولہ اضلاع میں یہ ایکٹ جزوی طور سے نافذ کیا جائے گا وہاں مقامی "حفاظت گاہوں" کو لڑکیوں کے لئے حفاظت کی جگہیں متصور کیا جائے گا۔ جن مقامات پر اس قسم کے "گھر" یا یتیم خانے یا کوئی اور ادارے ہیں انھیں "حفاظت گاہوں" کی حیثیت سے تسلیم کرنے کے اقدامات کئے جائیں گے۔ کم سن مجرموں کے مقدموں کی سماعت کے لئے بچوں کی عدالتوں سے کام لیا جائے گا۔ ان عدالتوں کو ایسے بچوں کے مقدموں کی سماعت کا اختیار حاصل ہوگا جو قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ البتہ ایسے بالغوں کے مقدمے سماعت نہیں کر سکتیں جنھوں نے بچوں کے خلاف کوئی جرم کیا ہو۔ کانپور، آگرہ، وارانسی، الہ آباد، لکھنؤ اور بریلی میں ہر دو کم سن مجرموں کے مقدمات کی سماعت کے لئے بچوں کی چھ عدالتیں تشکیل کی جا رہی ہیں۔ اصلاحی افسروں کے تقرر کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا بائیس ضلعوں میں درجہ اول کے مجسٹریٹوں کو ایسے مقدمات کی سماعت کرنے کے اختیارات دیے جانے کے اقدامات کئے جا رہے ہیں جن میں بچوں کے خلاف کسی جرم کا ارتکاب کرنے کے سلسلے میں کسی بالغ کو ملزم قرار دیا گیا ہو۔ بچوں کی فلاح و بہبود اور کم عمروں کے جرائم سے دلچسپی رکھنے والے نجی اداروں کا بھی تعاون حاصل کیا جائے گا اور اس قسم کے ادارے ایسے بچوں کی نگہداشت پر جو اخراجات کریں گے وہ حکومت برداشت کرے گی۔ امید ہے کہ ان اقدامات سے اتر پردیش میں کم سن مجرموں کی نگہداشت و اصلاح اور کم سن لڑکوں کے جرائم کی بہت حد تک روک تھام ہو سکے گی۔ ضرورت ہے کہ اس اہم اور مفید اصلاحی اقدام میں حکومت کو ہر شخص کا تعاون حاصل ہو۔

——— ایڈیٹر

رستوں کے موڑ

فضا ابن فیضی

ایک نغمہ ہوں بہاروں کے کھنکتے ساز پر
کیا کہوں، کیا بات تھی رنگینیِ جذبات میں

مجھ سے کیا آنکھیں ملائے گا زمانے کا شباب
رنگ بن بن کر بکھر جائے گی یہ خوابوں کی دھول

دین ہیں میری یہ لالے، یہ شگوفے، یہ شمیم
میں نے خونِ دل کے چھینٹوں سے سجائے ہیں چمن

میں نے سکھلائے زمانے کو دلداری کے ڈھنگ
درد کی تازگی میرے غموں کا یہ نکھار

سوکھ جاتی ہے پہنچتے ہی جہاں "نہرِ فرات"
میرا سینہ ہے ابھرتے آفتابوں کا وطن

چھو دیا میں نے جنھیں وہ شاہ پارے بن گئے
کیا کہوں اپنے جنوں کی فطرتِ شاداب کو

اک "جہاں گیری" ہے دردِ جاوداں کی جیب میں
سانس رکتے ہیں مری خلوت میں بنتِ ماہ و سال

یہ فسونِ رنگ و بو، یہ سحر کاریِ حیات
یہ شکستِ جام کا نغمہ، یہ پائل کی کھنک

میں جو دوں آواز، آنکھیں کھول دے روحِ شباب
میں نے کھولی جنبشِ لب سے گرہ اسرار کی

یہ مرے "سحرِ تخیل" کا سہانا سلسلہ
ذہن کی شوخی، قلم کی تازگی، فن کا جمال

چل پڑا ہے "کاروانِ گل" مری آواز پر
میں نے کلیوں کو گلستاں دے دیے سوغات میں

میں نے جھولی میں شبوں کی رکھ دیے ہیں آفتاب
مسکراتے ہیں ببولوں پر مری صبحوں کے پھول

گدگداتی ہے کلی کو میرے سانسوں کی نسیم
پتھروں کے چیر کر سینے اگائے ہیں چمن

تھی خزاں میں ورنہ کس کو مسکرانے کی امنگ
میرے آنسو بن گئے ہیں سیپیوں کی جوئبار

میری انگلی سے ٹپکتا ہے وہاں آبِ حیات
پھوٹتی ہے میرے ماتھے سے سویرے کی کرن

ذرّے مجھ تک آ کے پلٹے تو ستارے بن گئے
میں نے دیکھا رقص کرتے خود شرابِ ناب کو

کون یہ مجھ سے ملا "نورجہاں" کے روپ میں
میرے آگے چوکڑی بھولے ہیں شعروں کے غزال

بن کے صہبا میرے خم میں ڈھل نہ جائے کائنات
کہہ رہی ہے کچھ مرے کانوں میں کلیوں کی چٹک

میرے گیتوں سے لپٹ کر سو رہے ہیں انقلاب
بول اٹھی ہیں منھ سے خود ہی مورتیں فنکار کی

اوڑھ کر سوئی ہے دنیا "شعرِ فسوں" کی ردا
کتنے دلکش ہیں مری زندگی کے خط و خال

ہیں مرے جذبوں کے نم سے تازہ شعروں کے کنول
دھڑکنیں ہیں دل کی یا آہٹ نئے رجحان کی

بیچتی ہے نافے میری طبعِ مشکیں کو بہ کو
یہ خیال انگیز موسم یہ جنوں انگیز رُت

میری باتوں میں نہاں تریاق ہے ہر زہر کا
ایک جلوہ ہوں مگر حیراں نگاہوں کی طرح

میری فطرت کا تنوع پھر لگا پر تولنے
میں نے "تہذیبوں" کو بخشا اک جمالِ جاوداں

میں نے ایلورا کو بخشا پیکرِ ذوقِ جمال
دھڑکنیں دل کی سموئیں میں نے نقشِ تاج میں

وقت کے طوفاں میں ثابت ہوں ہمالا کی طرح
یہ مرا شہرِ جنوں یہ دشتِ دور کا بانکپن

یہ زمانہ ایک انگڑائی ہے میرے ساز کی
میں نے نشتر کی ضیافت کی ہے اپنے خون سے

میں نے سکھلائے ہیں قوموں کو سیاست کے اصول
میں نے "جمہوری نظامِ فکر" کو دی زندگی

زندگی کی مختلف اقدار کا یہ میل جول
تجزیہ میرے جنوں کا کوئی کر سکتا نہیں

میرے سر عقل و جنوں کے سیکڑوں الزام ہیں
اک مغنی، ایک رہبر، اک سپاہی کی طرح

آنچ کی لو کھا کے میرے لہجے کی نکھری ہے غزل
میرے سینے میں چٹکتی ہے کلی وجدان کی

اب کسے ہوگی غزالانِ ختن کی جستجو
محفلوں میں پوجے جاتے ہیں مرے نغموں کے بت

بننے والا ہوں کھجوروں کے رسیلے شہد کا
پاک شیوہ ہوں فرشتوں کے گناہوں کی طرح

لی ہے انگڑائی مری آغوش میں ماحول نے
اٹھ کے دی ہے میں نے "بیابانِ تمدن" میں اذاں

پتھروں میں جذب کر دی نکہتِ حسنِ خیال
کی ہے میں نے بھی شہنشاہی جنوں کے راج میں

نقش بن کر مسکراتا ہوں اجنتا کی طرح
غسل کرتے ہیں کناروں پر مرے گنگ و جمن

بازگشتِ شوق ہوں میں اپنی ہی ملہار کی
ہار کب مانی ہے میں نے وقت کے قانون سے

ہیں مری امت میں شامل انقلابوں کے رسول
مجھ سے مستقبل کی قدروں کو ملی تابندگی

مجھ سے کس نے کہا تو پھول کی خوشبو کو تول
شعلہ اپنی شمع کے سر سے گزر سکتا نہیں

مجھ سے یارو! یہ پوچھو میرے کتنے نام ہیں
ہوں میں اپنی راہ پر خوددار راہی کی طرح

اُردو میں بچّوں کا ادب

حامداللہ افسر

بچوں کے ادب سے مراد وہ ادب ہے جو خاص طور پر بچوں کے لئے وجود میں لایا گیا ہو۔ بچوں کے ادب کی تخلیق ایک مخصوص فن ہے جسکی صلاحیت خداداد ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو میں بچوں کے ادب کی طرف بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو ادب ابھی نو عمر ہے لیکن اس قلیل مدت میں بھی ہمارے ادب کے اور شعبوں کی طرح بچوں کا ادب بھی ظہور میں آنا چاہئے تھا۔ یہ ناممکن ہے کہ اس عرصہ میں بچوں کے ادب کی تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والے شاعر اور ادیب موجود نہ رہے ہوں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انکی کوششوں کے نتائج منظر عام پر نہیں آئے؟

بہ ظاہر اس کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں، پہلا سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے یہاں بچوں کے لئے کچھ لکھنا کبھی قابل تعریف بات نہیں سمجھی گئی اور وہ شاعر جو سنجیدہ اور سخن فہم حلقوں میں دادِ سخن حاصل کرنا چاہتے تھے بچوں کے لئے لکھنے کی خداداد صلاحیت کو ہمیشہ چھپاتے رہے۔ اردو کے ایک اچھے خاصے شاعر جو مشاعروں میں اکثر اپنی شاعری کا سکہ جما دیتے تھے میرے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ میں نے ان کے مذاق سخن کا اندازہ کرکے ایک روز ان سے کہا: "آپ بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی نظمیں اور گیت لکھئے۔ اردو میں ان چیزوں کی بہت کمی ہے۔" انھوں نے اس امر کو تسلیم کیا کہ اردو میں بچوں کے ادب کی سخت ضرورت ہے لیکن اسی کے ساتھ اپنی معذوری بھی ظاہر کی اور وجہ یہ بتائی کہ "مجھے بچوں کے لئے کچھ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ان کے لئے تو ایک معمولی قابلیت کا آدمی بھی بہت کچھ لکھ سکتا ہے اور اصل میں یہ ایک معمولی قابلیت رکھنے والے آدمی ہی کا کام ہے۔" میں نے ان سے عرض کیا: "آپ نے بالکل بے سوچے سمجھے اس اہم مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ ہر قسم کے خیالات کو آسان زبان میں اور دلکش انداز میں ظاہر کرنا کسی معمولی قابلیت کے آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ سارے یورپ میں اور خاص طور پر فرانس میں اور اب امریکہ میں بھی، جتنی زیادہ قدر بچوں کے شاعروں اور ادیبوں کی ہوتی ہے اتنی اور کسی فن کار کی نہیں ہوتی۔ کسی زبان میں ادب کی کسی صنف کی تخلیق اتنی [illegible] نہیں ہے جتنی بچوں کے ادب کی تخلیق ہے۔" ان سب باتوں کو صحیح تسلیم کرنے کے باوجود وہ اس "ادبی پستی" کی طرف رجوع ہونے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس "معمولی کام" کو انجام دینے کی ہمت نہ کر سکے۔

دوسرا سبب اردو میں بچوں کے صحیح قسم کے ادب کے ظہور میں نہ آنے کا یہ غلط فہمی ہے کہ بچوں کا ادب صرف نصیحتوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بچوں کے صحیح تخلیقی ادب کو اس ناصحانہ ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کا انبار بچوں کے ادب کے نام سے ہمارے لٹریچر میں ہو گیا ہے اور جسے تربیتی ادب کے نام سے یاد کرنا زیادہ مناسب ہے۔

مندرجہ بالا اسباب کے علاوہ ایک رکاوٹ بچوں کے صحیح ادب کی راہ میں یہ بھی رہی کہ ہمارے ان نوجوان شاعروں کے لیے جو بچوں کے تخلیقی ادب

کو ظہور میں لانے کی صلاحیت رکھتے تھے اردو میں بچوں کے ادب کے نمونے موجود نہیں تھے اور جو نصیحت آمیز نمونے موجود تھے بھی وہ جب بچوں کو کبھی پسند نہیں آئے تو نوجوانوں کو کیا پسند آتے اور وہ کیونکر ان کی تقلید کرتے۔

ان تمام مزاحمتوں کے باوجود اردو ادب کی اس مختصر عمر میں کبھی کوئی دَور آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو بچوں کے "نام نہاد" ادب سے خالی رہا ہو۔ یہاں تک کہ اردو میں نظم کہنے یا نثر لکھنے کی سب سے پہلی کوششیں خاص طور پر بچوں ہی کے لیے مخصوص تھیں۔ اردو میں سب سے پہلے دکن میں کچھ ہلکی ہلکی مذہبی نظمیں موزوں کی گئی تھیں۔ ان کا مقصد خاص طور پر بچوں کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنا اور انھیں مذہبی تعلیم دینا تھا۔ یہ نظمیں اردو کے دکنی روپ میں تھیں اور ان کا شمار اُردو کے ابتدائی ادب میں ہوتا ہے۔ لیکن ان ابتدائی نظموں اور نثری عبارتوں کو بچوں کے صحیح ادب سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ ان سے بچوں کے ادب کو نقصان پہنچا اور وہ غلط راستے پر پڑ گیا یعنی اس ابتدائی دَور کے بعد جتنے دَور آئے ان میں بجائے تنقید کے ادب کے اس ابتدائی دَور کی تقلید کی گئی اور آسان نصیحت آمیز اور اخلاقی نظموں اور تحریروں کو بچوں کا ادب سمجھ لیا گیا۔ گویا اس عمارت کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی گئی اس لیے ساری عمارت ٹیڑھی ہو کر رہ گئی۔ اس ابتدائی دور سے نظیر اکبرآبادی کے زمانے تک بچوں کے لیے اُردو میں اسی قسم کی بے مزہ اور بے ڈھنگی ناصحانہ کوششوں کا سراغ ملتا ہے جن کے ہونے سے نہ ہونا بہتر تھا۔

نظیر کے یہاں بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن کو ہم صحیح معنوں میں بچوں کی شاعری یا بچوں کے لیے شاعری کہہ سکتے ہیں۔ نظیر کا زمانہ اٹھارھویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے ربع اول کا زمانہ تھا۔ نظیر عوام کا شاعر ہے اور اس نے روزمرہ کے مشاہدات و تجربات کو شعر کا موضوع قرار دیا ہے۔ وہ پہلا شاعر ہے جس نے اردو میں روایت سے بغاوت کی اور اپنے لیے ایک بالکل نیا راستہ بنایا۔ نظیر مدرس تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ یہ بات ایک حد تک یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اکثر نظمیں اپنے شاگردوں کے لیے لکھی تھیں۔ نظیر کو روزمرہ کی آسان زبان میں مشاہدات و تجربات و کیفیات کے بیان کرنے میں بڑی مہارت اور قدرت حاصل تھی۔ جن چیزوں کو بچے دیکھتے رہتے ہیں یا جو حالات و واقعات انھیں معلوم ہیں ان کا منظوم بیان انھیں ضرور اچھا معلوم ہونا چاہیے اور ان کو وہ بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور کچھ لفظ اور کچھ مصرعے ان کی زبانوں پر چڑھ بھی جاتے ہیں۔

لیکن نظیر کی نظموں کو بچوں کے ادب کے احاطے میں لاتے وقت ہمیں دو خامیاں نظر آتی ہیں جن پر ہمیں رکنا اور تامّل کرنا پڑتا ہے۔ پہلی خامی تو یہ ہے کہ اُن میں شاعرانہ تخئیل کا عنصر بہت ہی کم ہے اسی لیے تاثیر کی کمی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بچے نظیر کی نظموں سے لطف اندوز نہیں ہوتے اور نہ وہ انھیں گانے اور گنگنانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ انھیں ان نظموں میں سرسری سی دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ ان نظموں کو پڑھتے چلے جاتے ہیں اور کہیں کہیں شاعر کی باتوں پر ہنس پڑتے ہیں۔ دوسری خامی یہ ہے کہ اُن کی اکثر نظموں میں ابتذال اور سوقیانہ پن ہوتا ہے اور وہ بازاری زبان کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتے۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ نظیر کے کلام سے بچپن کی نظمیں منتخب کر کے اگر ان کو اڈٹ کیا جائے اور ان کی باقاعدہ ترتیب و تدوین کی جائے اور ان کے نامناسب حصے خارج کر دیے جائیں تو بچوں کے لیے ایک قابل مطالعہ اور دلچسپ نظموں کا مجموعہ تیار ہو سکتا ہے اور وہ ہمارے بچوں کے روایتی ادب سے کچھ بہتر رہے گا۔

نظیر کے بعد مولوی محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی اور مولوی محمد اسمٰعیل نے قریب قریب ایک ہی زمانے میں بچوں کے لیے نظمیں لکھیں۔ مولوی محمد حسین آزاد، لاہور کے سررشتۂ تعلیم میں ملازم تھے۔ میجر فلر جنھیں السنۂ مشرقیہ سے بہت ذوق تھا ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم تھے۔ انہوں نے آزاد کو اردو اور فارسی کی درسی کتابیں لکھنے پر مامور کیا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں انہوں نے اردو کی تین کتابیں ترتیب دیں ــــ پہلی دوسری اور تیسری۔ اور انھیں کتابوں کے لیے بچوں کی نظمیں لکھیں مثلاً "محنت کرو"، "جیسے چاہو سمجھ لو" اور "جغرافیہ طبعی کی پہیلی" وغیرہ۔ یہ نظمیں بھی تمام تر ناصحانہ ہیں اور انھیں بچوں کی نفسیات سے کوئی واسطہ نہیں۔ بچوں کی دنیا میں بچوں کے ساتھ رہ کر انھیں مخاطب نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک بوڑھا اور نیک کردار اور تجربہ کار آدمی ان کی رہنمائی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی اردو میں طرز جدید کے موجد تسلیم کیے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی مسدس کے کچھ حصے اعلیٰ درجہ کی نظموں میں شمار ہونا چاہئیں۔ لیکن انہوں نے خاص طور پر بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی ہیں وہ بالکل روکھی پھیکی اور بے مزہ ہیں اور بعض تو تک بندی سے زیادہ وقعت

نہیں رکھتیں۔ حالی کی نظمیں کبھی بچوں میں مقبول نہیں رہیں۔ وہ درسی کتابوں میں ان کی نظمیں اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کڑوی دوا پی رہے ہوں۔

مولوی محمد اسمٰعیل نے ۱۸۹۲ء کے قریب جب وہ سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں ہیڈ مولوی تھے اُردو کی ریڈریں لکھیں جو مدتوں یو۔پی' اور دوسرے صوبوں میں داخلِ درس رہیں۔ یہ سب کتابیں بہت دل کش اور بے تکلف انداز بیان میں لکھی گئی تھیں اور بچوں کو اُردو پڑھانے کے لیے بہت مفید ثابت ہوئیں۔ گو اب درسی کتابوں کا انداز زمانے کی ضرورتوں کے مطابق بہت بدل گیا ہے پھر بھی مولوی صاحب موصوف کی ابتدائی کتابیں اب تک مقبول ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل نے بھی بچوں کی نظمیں اپنی درسی کتابوں کے لیے لکھی تھیں۔ ان کی نظموں میں روانی بہت ہے اور زبان کی خوبی اور مضامین کی خوش اسلوبی کے لیے وہ ممتاز ہیں مگر شاعرانہ تخیل سے وہ بھی محروم ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل جو کچھ کہتے ہیں بچوں کی دنیا سے دور رہ کر کہتے ہیں۔ بچے ان کے کلام میں اپنا ماحول اور اپنے جذبات نہیں پاتے بلکہ اپنے بزرگوں کی دنیا کا پرتو پاتے ہیں جس سے ان کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ زبان کی دل کشی اور کلام کی روانی ان پر اثر انداز ہوتی ہے مگر ان کو موہ نہیں سکتی، محو تحسین کر سکتی۔ ان کی نظمیں بچوں کے دل کے تاروں میں جھنکار نہیں پیدا کرتیں۔

مولوی محمد اسمٰعیل کے بعد سے اُردو ادب کا جو دَور چل رہا ہے اُس میں بچوں کے ادب کی طرف بہ نسبت پہلے کے توجہ زیادہ ہے لیکن ابھی بچوں کا کوئی ایسا شاعر ظہور میں نہیں آیا جو سچ مچ اُن کی دنیا کا ایک فرد بن گیا ہو اور جو تصوّر میں ان کے ساتھ رہتا سہتا ہو، کھیلتا کودتا ہو، ہنستا بولتا ہو، انھیں کی طرح غلطیاں کرتا ہو، انھیں کی طرح گرتا ہو اور گر کر سنبھلتا ہو، انھیں کی طرح آنکھ بچا کر پودوں سے پھول توڑ لیتا ہو، چڑیوں کے گھونسلوں سے انڈے نکال لیتا ہو، انھیں کی طرح مٹی کے گھروندے بناتا ہو، انھیں کی طرح کھلونوں سے ایک نیا جہان تیار کر لیتا ہو، انھیں کی طرح بھولی بھولی باتیں کرتا ہو، انھیں کی طرح روٹھتا ہو اور منتا ہو، انھیں کی طرح ہر چیز کو حیرت سے دیکھتا ہو، انھیں کی طرح چاند پر جانے کی نہیں بلکہ چاند کو حاصل کر کے دامن میں چھپا لینے کی ضد کرتا ہو اور انھیں کی طرح زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہو اور نہ سمجھ سکتا ہو۔ بچوں کے ایسے شاعر کا ابھی اُردو زبان کو انتظار ہے۔

ایک اور بات قابلِ توجہ ہے۔ اُردو میں ابتدا سے اس وقت تک جتنی بھی نظمیں اور جیسی بھی نظمیں لکھی گئیں وہ سات آٹھ برس سے اوپر عمر والے بچوں کے لیے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے اُردو میں ہلکے پھلکے گیت یا نرسری گیت بالکل ناپید ہیں۔ لوریوں اور گود کے گیتوں اور جھولنے کے گیتوں کا جہاں تک تعلق ہے ہم ہندی یا پوربی وغیرہ دوسری مقامی زبانوں سے مستعار لے کر کام چلاتے رہے ہیں۔ بچوں کی شاعری کے اس خلا کو پُر کرنے کی مدّت سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ میں نے نرسری گیت لکھنے کی کوشش کی ہے اور یہ گیت یو۔پی کے بعض ضلعوں میں مقبول بھی ہوئے۔ شاید ان کے مقبول ہونے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ ایک ایسی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں جس کے لیے اُردو میں اس قسم کی کوئی دوسری چیز موجود نہیں ہے۔

یہ ذکر تھا بچوں کے ادب کی نظموں اور گیتوں وغیرہ کا۔ جب ہم بچوں کے ادب کی نثر کی طرف نظر کرتے ہیں تو وہاں باوجود تلاش و جستجو کے کچھ نہیں ملتا۔ اُردو کی ابتدائی نثر اُس وقت کی مروجہ فارسی نثر کے انداز پر نہایت رنگین اور پُر تکلف ہوتی تھی۔ ابتدائی نثر کی کوششوں میں زیادہ تر فارسی اور عربی کتابوں یا مقالوں کے ترجمے ملتے ہیں۔ یہ ترجمے عموماً مذہبی کتابوں کے ہیں یا پھر فقرا اور اہلِ دل حضرات کے اقوال و امثال ہیں۔ غرض اُردو نثر کی ابتدائی کوششوں میں کوئی تحریر ایسی نظر سے نہیں گزری جو خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی گئی ہو۔

انیسویں صدی کے ابتدائی چند برسوں میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی نگرانی میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ بے شک درس و تدریس کے لیے لکھی گئیں مگر ان کو نہ بچوں سے کوئی واسطہ ہے نہ بچوں کے ادب سے۔ وہ کتابیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کو ہندوستان کی زبان سکھانے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ سب سے پہلے بچوں کے لیے نثر کے مضامین بھی مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی محمد اسمٰعیل نے اپنی درسی کتابوں کے لیے لکھے۔ یہ مضامین اخلاقی یا معلوماتی ہیں یا پھر ایسی کہانیاں ہیں جن سے کچھ سبق ملتا ہو۔ اسی زمانے میں گلستان اور انوار سہیلی وغیرہ چند فارسی کتابوں کے ترجمے بھی اردو میں کیے گئے مگر وہ مقبول نہ ہوئے۔

مطالعے کی نفسیات

دیویندر اسر

ہم افسانوی ادب کا مطالعہ کیوں کرتے ہیں؟ ماہرین جمالیات اور نفسیات نے اس پر کافی بحث کی ہے۔ درحقیقت یہ سوال اس پرانے مسئلہ کا ہی دوسرا رُخ پیش کرتا ہے کہ مطالعۂ ادب تفنن طبع کے لیے ہے یا جذباتی تسکین کے لیے، جمالیاتی حظ کے لیے یا حصولِ علم کے لیے۔ تحلیل نفسی کی رو سے مطالعہ ایک طرح سے حقیقی تسکین کا ہی بدل ہے۔ اس کے بنیادی عناصر بھی خواب در بیداری کے خواب کے مانند ہی ترتیب پاتے ہیں۔ تخلیق، مطالعہ اور تشکیلِ خواب میں ایک ہی طرح کی نفسیاتی کیفیت موجود رہتی ہے۔ انسان خواب میں اپنی تشنہ خواہشات کی تسکین چاہتا ہے۔ زندگی کی ناکامیاں اور محرومیاں خواب میں ختم ہو جاتی ہیں اور انسان مسرت محسوس کرتا ہے۔ یعنی خواب حقیقی تسکین کا نعم البدل بن جاتے ہیں۔ ماہرین نفسیات کی رائے میں افسانوی ادب کا مطالعہ بھی عام لوگ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اپنی نفسی ضرورتوں کا توازن اس طرح قائم کر سکیں کہ انھیں کم سے کم نفسی قوت صرف کرنی پڑے اور وہ اپنے ذہن میں موجود عدم توازن کو دور کر سکیں۔ وہ مطالعہ سے اس حالت کی تلافی کرتے ہیں جس میں متضاد خواہشیں کسی بھی شکل میں مفاہمت نہیں پا سکتیں جس کے باعث وہ افسردہ اور پریشان رہتے ہیں۔ ارسطو نے المیہ سے لطف اندوز ہونے میں اس اصول کی تشریح کی ہے کہ اس کے باعث ہماری دبی ہوئی خواہشوں کو اخراج کا راستہ مل جاتا ہے یا انسان درد کا خوگر ہو کر درد سے نجات پا لیتا ہے۔ ڈرامے یا افسانے کے کرداروں پر جو ستم ہوا ہے، اُسے ہم براہِ راست محسوس نہیں کرتے بلکہ ان کرداروں کے ذریعہ محسوس کر کے خود اس کے شکار سے بچ جاتے ہیں لیکن اس کا جذباتی احساس کر لیتے ہیں۔ اس نظریے کی رو سے مطالعہ میں بھی تخلیق ادب کی طرح ارتفاع کا عمل کارفرما رہتا ہے۔

افسانوی ادب سے تسکین ذہن کی ہر سطح پر ممکن ہے۔ ابتدائی انا کی سطح پر ہم ان ناولوں کو پڑھنا پسند کریں گے جن میں ہماری بنیادی جبلتوں کو بغیر کسی رکاوٹ کے تسکین پانے کا موقع اور جذبات کا آزادانہ اظہار ملتا ہے۔ کیوں کہ عملی زندگی میں ایسے جذبات کے اظہار پر کئی طرح کی سماجی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ فرائیڈ کے خیال میں ان جبلتوں میں سب سے اہم جبلت جنس ہے جو انسان کی اہم ترین قوت ہے۔ جنس سے متعلق جذبات اور تصورات کے اظہار پر کئی طرح کی پابندیاں ہونے کے باعث اسے آزاد اظہار کے مواقع نہیں ملتے جس کے باعث اسے دبا دیا جاتا ہے اور وہ لاشعور کے تہ خانے میں آزاد ہونے کے لیے تڑپتے رہتے ہیں۔ ادیب انھیں جذبات اور تصورات کو اپنے ادب میں پیش کرتا ہے لیکن اس طرح مستور انداز میں کہ وہ سماجی روایت کی گرفت میں نہ آ سکیں۔ قاری بھی ایسے ادب کے مطالعہ سے اپنی اسی جبلت کی تسکین کرتا ہے اور اس طرح وہ بھی سماجی گرفت سے بچ جاتا ہے۔ فرائیڈ کی رو سے تخلیق ادب اور مطالعہ ادب میں بنیادی طور پر یہی مقصد اور عمل کارفرما ہے۔

لیکن برتر انا کی سطح پر ہم ایسے ناول پڑھنا پسند کرتے ہیں جس میں مجرموں اور سماجی اقدار سے انحراف کرنے والوں کو سخت سزا ملتی ہے۔

یہی تسکین ابتدائی انا کی سطح پر ہمارے خود اذیتی کے رجحان کو عیاں کرتی ہے۔ "تشدد پسند" (Sadomasochist) یعنی دوسروں کو اذیت پہنچا کر مسرت محسوس کرنے والے قاری ایسے ناولوں سے حظ اٹھاتے ہیں جن میں ظلم و تشدد اور مار دھاڑ کا بیان ملتا ہے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ مطالعہ کا باعث یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم ابتدائی انا، انا اور برتر انا میں مخصوص توازن کی خواہش یہ رکھتے ہوں بلکہ کسی مخصوص رویے کو پیش کرنے والی داستان کو پڑھنے کی خواہش رکھتے ہوں۔ بہرحال ماہرین نفسیات کی رائے میں افسانوی ادب کے مطالعہ کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ ہم معین وقت اور مقدار میں جذباتی دباؤ کو کم کر سکیں اور اس طرح ذہنی تناؤ سے چھٹکارا پا سکیں۔ اس حیثیت سے مطالعہ شخصیت کے کئی عناصر کی نہ صرف تسکین کرتا ہے بلکہ ان کو منضبط بھی کرتا ہے۔

جذباتی خواہش "تردد اور احساس گناہ جتنا شدید ہوگا" مطالعہ کی خواہش اتنی ہی زیادہ بڑھ جائے گی۔ کیوں کہ ادب میں تردد اور گناہ کے احساس کو دور کرنے کی قوت ہے اور وہ جذباتی تسکین کا ذریعہ ہے۔ لیکن اگر جبلی ضرورتوں کی پروردہ خواہش یا دباؤ ایک خاص نہج سے بھی بڑھ جاتا ہے تو انسان پڑھنے کی خواہش ہی ترک کر دیتا ہے اور وہ مطالعہ سے کسی طرح کی بھی مسرت محسوس نہیں کرتا اور بعض حالات میں تو وہ کسی طرح کا بھی ادب نہیں پڑھ سکتا۔ مطالعہ کے لیے جبلی ضرورتوں کے دباؤ، تردد اور گناہ کے احساس سے کسی حد تک آزادی ضروری ہے تاکہ قاری مطالعہ کی خواہش کر سکے اور اس سے لطف اندوز ہو سکے۔ اگر کوئی قاری شدید جنسی خواہش کا شکار ہے تو وہ اس کے لیے براہ راست ذرائع تلاش کرے گا۔ جنسی ناولوں کے مطالعہ سے ہلکی سی تسکین ممکن ہے مگر وہ بھی نعم البدل کے روپ میں یا اعلیٰ ناولوں کی صورت میں ارتفاعی عمل کے ذریعہ۔ اگر کتاب میں جنسی تذکرہ کم ہے یا ہیجان انگیز نہیں تو قاری کی توجہ اس جانب مبذول تو ہوگی لیکن اس کی تسکین نہیں ہوگی۔ اگر تذکرہ بہت زیادہ ہیجان انگیز ہے تو اس کی خواہش اور زیادہ تیز ہو جائے گی اور اگر تسکین کے براہ راست ذرائع میسر نہیں ہیں تو قاری نہ صرف "فرسٹریٹ" (مایوس) ہو جائے گا بلکہ جذباتی ہیجان کا شکار بھی ہو جائے گا۔ جنسی تحریک اسی وقت مسرت دے سکتی ہے جب انجام کار اس کی تسکین کا امکان ہو۔ ایسے حالات میں مطالعہ ترک کر دیا جاتا ہے اور عام حالات میں اور زیادہ ہیجان انگیز ناول پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ عمل مستقل طور پر جاری رہتا ہے اور قاری ہمیشہ جذباتی تناؤ کا شکار رہتا ہے۔

فحش ناولوں کے مطالعہ میں یہ بات زیادہ صحیح ہے۔ فحش ناول درحقیقت جنسی تسکین کا نعم البدل ہیں۔ یہی بات تردد اور گناہ کے احساس کے بارے میں صحیح ہے۔ اگر یہ احساسات بہت شدید ہوں گے تو مطالعہ میں حارج ہوں گے۔ تردد اور گناہ کا احساس بڑھتا جائے گا۔ عام طور پر جو لوگ اپنے شدید جذبات کا شکار ہوتے ہیں وہ مطالعہ سے منفی اثر قبول کرتے ہیں۔ وہ جمالیاتی حظ اٹھانے کے بجائے اپنے ان احساسات کا کفارہ کرنے کے لیے مطالعہ کرتے ہیں۔
جو کنٹرول بحیثیت انا کے ذریعے ہوتا ہے وہ بھی مطالعہ میں حارج ہوتا ہے۔ قاری مطالعہ سے مسرت اس لیے حاصل نہیں کر سکتا کہ اسے ڈر رہتا ہے کہ کہیں وہ اپنے جبلی دباؤ کا شکار نہ ہو جائے۔ مطالعہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے انا کے کنٹرول کو کچھ کم کرنا ضروری ہے۔ افسانوی ادب اسی اولیں عمل کی آئینہ داری کرتا ہے جو لاشعوری تصورات پر غالب رہتا ہے اور شعوری خیال کے ثانوی عمل پر بھی حاوی ہوتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ چوکنا انا اس پُر مسرت لاشعوری عمل کے لیے بہت کم گنجائش رہنے دیتا ہے جو کہ مطالعہ کے رد عمل میں پیدا ہوتا ہے۔ "فنتیسی" کا خوف بھی مطالعہ میں حارج ہوتا ہے کیوں کہ انا یا تو بہت کمزور ہوتا ہے یا اس احساس کا شکار ہوتا ہے کہ وہ فنتیسی سے پروردہ جذبات پر کنٹرول کرنے سے قاصر ہے۔
لیکن افسانوی ادب سے انا بھی تسکین اخذ کرتا ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب ادب میں ایسے ذرائع کا استعمال کیا گیا ہو جن کے باعث انا یا برتر انا کے اعتراضات کو دور کیا گیا ہے۔ انا یہ اعتراضات اس لیے کرتا ہے کہ افسانوی ادب ان جبلتوں کی تسکین کرتا ہے جن کو انا رد کرتی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ افسانوی ادب دبی ہوئی جبلتوں کی عکاسی اس طرح کرتا ہے کہ وہ برتر انا کی گرفت میں نہ آئیں اور ان کو اخراج کا راستہ مل جائے۔ اور اس طرح انا اور دبی ہوئی جبلتوں کا تناؤ ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف افسانوی ادب انا کو اس قابل بناتا ہے کہ جو فنتیسی برتر انا کو قبول نہیں اسے برتر انا کی برتری کے احساس کو بحیثیت اخراج پیش کیا جائے۔ اس طرح انا اور برتر انا کے تناؤ کو بھی ختم کیا جاتا ہے۔ افسانوی ادب برتر انا کی تسکین محض اس لیے نہیں کرتا کہ وہ جرم کی سزا دیتا ہے بلکہ جرم کی کیفیت اور کمیت کے مطابق صحیح سزا دیتا ہے۔ قاری بھی افسانوی ادب میں گناہ کے اس احساس کو کم کر کے سزا چاہتا ہے جو وہ عملی زندگی میں حاصل کرنے سے خائف ہے یا نہیں پا سکا۔ اس طرح مطالعہ ادب

اس کے ضمیر کی تسکین کا باعث بنتا ہے۔

جو عمل ادیب کے ذہن میں کار فرما رہتا ہے وہی قاری کے ذہن میں بھی موجود رہتا ہے تخلیق اور مطالعہ دونوں ہی جذباتی تناؤ کو دور کرنے کے ذرائع ہیں ایک ماہر ادیب تمام واقعات کا بیان نہیں کرتا۔ وہ قاری کے تخیل کے لیے بھی کچھ چھوڑ دیتا ہے تاکہ قاری اپنے ذہنی میلانات کے مطابق داستان مکمل کر سکے۔ اس لیے ادب میں ابہام جتنا گہرا ہوگا جذبات کو متاثر کرنے کی قوت اس میں اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ ادب میں بھی تمثیلات کی تشکیل اسی طرح کی جاتی ہے جس طرح کہ خواب میں تمثیلات بنتی ہیں۔ سمبالسٹ ادب (علاماتی ادب) کی گہرائی اور شدت کا بھی راز ہے۔ سمبالسٹ تخلیق کے معانی مختلف قارئین کے لیے مختلف ہوتے ہیں اور ایک ہی قاری کیلیے تہہ در تہہ کئی معانی ہوتے ہیں ایسا ادب خارجی دنیا اور داخلی دنیا کو یکجا کر دیتا ہے۔

مطالعہ کے عمل میں قاری اپنے آپ کو کئی کرداروں سے مماثلت دیتا ہے۔ ان سے ہمدردی جتاتا ہے یا ان کے ساتھ محسوس کرتا ہے یا ان میں شامل رہتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو ایک یا زیادہ کرداروں میں شامل یا داخل کرتا ہے۔ یہ پروجیکشن (شمول یا داخلہ) شعوری یا لاشعوری ہو سکتا ہے۔ افسانوی ادب میں قاری اور کردار کا فاصلہ اسی اصول پر معین کیا جاتا ہے کہ کس حد تک قاری کردار میں اپنی جذباتی ہم آہنگی کر سکتا ہے۔ یہ فاصلہ آرائی اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ قاری کو یہ یاد کراتے رہنا ضروری ہے کہ وہ مطالعہ کر رہا ہے، حقیقی زندگی بسر نہیں کر رہا۔ ورنہ ادب محض نفسیاتی تسکین کا بدل بن جائے گا اور اس کا جمالیاتی پہلو ختم ہو جائے گا۔ نیوراتی (Neurotic) انسان اور خام جذبات کے لوگ ادب کو محض نفسیاتی تسکین کا ذریعہ سمجھ کر اس کا مطالعہ کرتے ہیں نیوراتی قاری یہ بھول جاتا ہے کہ ادب، بے داری کے خواب سے اس حد تک ضرور الگ ہے کہ جہاں ادب تردد اور گناہ کے احساس کو دور کرتا ہے۔ بے داری کے خواب اسے اور تیز کر دیتے ہیں۔ افسانوی ادب میں دبی ہوئی خواہشیں اور دبانے والی قوتیں ایک ہی شے میں منعکس ہوتی ہیں یعنی حصولِ لذت اور حقیقت کے اصول یکجا ہو جاتے ہیں جو کہ روز مرہ کی زندگی میں ممکن نہیں۔ ادب حقیقت کو اس کی ان خامیوں سے مبرا کر کے پیش کرتا ہے جو آدرش اور تصوراتی یا تخیلی میلانات حقیقت میں دب جاتے ہیں افسانوی ادب میں ان کو اظہار کا راستہ ملتا ہے۔ افسانوی ادب کے ذریعہ تجربات کی اہمیت اور معانی کا احساس ملتا ہے۔ مطالعہ نہ صرف نیا تجربہ ہے بلکہ تنقید بھی ہے۔ مطالعہ ایک تخلیقی عمل ہے جس میں ادیب اور قاری کے اشتراک کی ضرورت ہے کسی بھی دور میں کسی تحریر سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے اسی جذبے سے پڑھا جائے جس سے اسے تحریر کیا گیا ہے۔ اس لیے کسی تحریر کو پر معنی بنانے کے لیے ادیب کے ساتھ قاری کی حس کا بھی دخل ہے۔ اس طرح مطالعہ ایک نیا تجربہ بن جاتا ہے۔ حالاں کہ یہ تجربہ مصنف کے تخیل کا کرشمہ ہے، لیکن یہ قاری کے ذہن کا بھی حصہ بن جاتا ہے۔ مارسل پروست مطالعہ کو تخلیق کی ہی ایک قسم تسلیم کرتا ہے۔ دونوں میں عمل کا فرق ہے، مقصد کا نہیں۔ اگر ہم مطالعہ سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو اولین عمل کے بعد استغراق ضروری ہے جس سے کہ وہ ہمارے ذہن میں رچ بس جائے ——— ایسے ہی جیسے کہ ادیب کسی مشاہدے یا تجربے کو صفحۂ قرطاس پر لانے سے پہلے اسے اپنے ذہن میں پوری طرح رچ جانے اور مکمل ہونے کا موقع دیتا ہے۔ اس قول میں شک نہیں کہ ہر دور میں ایسا ہی ادب پیدا ہوتا ہے جس کے کہ وہ قابل ہوتا ہے۔



بولی پہلی کوئل

شہاب سرمدی

ڈالی ڈالی بَور سے بوجھل
ٹپکے رس کی بوند،
نس نس کلیاں، کونپل پھوٹے
چمکیں چکنے پات ـــــ
بھوشن بھاؤ سجے اَمریاں
جیسے سندر نار،
کان میں جھمکا، مانگ پہ جھومر
پہنے جھمک جھمک جائے ـــــ

ہر ہر ہر ہر پھاگن ڈولے
پھاگن پھاگن رُت بھرمائے،
پُھلوا جھونڈ چلے چوبائی
بانچت گھونگھرو، ناچت گوری
گھرگھر گھر گھر سُر چوٹ لگائے
لے سے لے ٹکرائے
جیسے چوگن کی سنگت میں
آڑی تال پہ سَم آجائے

آمن کی ہریالی مہکے
مہکیں بیچے بور
شام سویرے شیاما چہکے
رین بسیرے پہکیں مور
کُنجن کُنج میں بیٹھی کوئل
جیت کی دھوم مچائے
کُہک کُہک ہر ڈال پہ ڈولے
اِٹ بولے اُت جائے
جیسے کوئی نئی نویلی
بات کرت شرمائے
جیسے برہن کا دکھیا دل
دھڑکے دھڑک نہ پائے

آشاڑھ ۱۸۸۴

انتظار

خاموش غازی پوری

کرن کرن سنوار کے، چمن چمن نکھار کے گزر نہ جائیں پھر کہیں یہ قافلے بہار کے
گلوں کو چھیڑ چھیڑ کر لطافتوں کو چوم لوں
محبتوں کی سیج پر
میں بے خودی میں جھوم لوں
یہ رنگ و بو یہ نکہتیں یہ زندگی کا بانکپن
یہ دھڑکنوں کے ساز پر یہ نغمگی کا بانکپن
اُڑا نہ لے کہیں خزاں کلی کلی کا بانکپن
کلی کلی کی انکھڑیوں میں رات کا خمار ہے
تمہارا انتظار ہے

نظر سے پھر نظر ملے تو میں نئی غزل کہوں حسین ہم سفر ملے تو میں نئی غزل کہوں،
گزر گئی جو فصلِ گل تو لوٹ کر نہ آئے گی
اگر برس کے کھل گئی
تو پھر گھٹا نہ چھائے گی
لبوں کی وہ تراوشیں نہ وہ صباحتِ نظر
نہ کوئی شہرِ آرزو نہ کوئی جنتِ نظر
وہ جلوہ ہائے رنگ رنگ اور حسرتِ نظر
صبا کی یہ سُبک روی مزاجِ گل پہ بار ہے
تمہارا انتظار ہے

سُبک سُبک صراحیاں خیال کے یہ مے کدے شفق کی حسن کاریاں جمال کے یہ مے کدے
نشاط و انبساط کا ہزار اہتمام ہے
شراب کم نہیں مگر
سرور ناتمام ہے
اُٹھا کے رنگِ پیرہن صنم کدہ سنوار لوں
بساطِ حسن و عشق پر میں کہکشاں اتار لوں
جو کھو گئی ہے چاندنی ذرا اُسے پکار لوں
ابھی یہ والہانہ پن جنوں کو ناگوار ہے
تمہارا انتظار ہے

جولائی سنہ ۱۹۶۲ء

حضرت گیسو دراز کا شکار نامہ

ثمینہ شوکت

شکار نامہ ایک مثالیہ ہے جو حضرت گیسو دراز[1] کے رسالوں میں اپنے موضوع اور مطالب کی اہمیت کے لحاظ سے ایک معرکہ آرا رسالہ بن گیا ہے۔ حضرت گیسو دراز نے یہ رسالہ فارسی میں بھی لکھا تھا جو برہان العاشقین کے نام سے موسوم ہے اور قصہ چہار برادر کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس رسالے میں ابتدائے آفرینش سے لے کر انجام حیات تک کے مختلف مراحل کی متصوفانہ تشریح اور عارفانہ توضیح کی گئی ہے۔ اس کے مطالب کے ظاہری تضادات نے اپنے اپنے زمانے کے جید عالموں کو اس کی شرح لکھنے پر اکسایا تھا۔ چنانچہ حضرت ابو صالح محمد عرف شیخ حسن محمد چشتی، مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلوی، میر عبدالواحد بلگرامی اور میر سید محمد کالپوی[2] نے اپنی اپنی فکر کے مطابق اس کی شرحیں لکھی تھیں۔

میر سید محمد کالپوی کے لئے جو واقعہ اس کی شرح لکھنے کا محرک بنا تھا وہ اہم اور دلچسپ ہے۔ میر کالپوی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ان کے یہاں دو درویش کاغذ کا ایک پرزہ لئے ہوئے آئے جس پر فارسی زبان میں ان کے خیال کے مطابق ایک معمہ درج تھا۔ کاغذ میر کالپوی کے حوالے کر کے دونوں درویشوں نے کہا کہ یہ حضرت گیسو دراز کے ارشادات ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ آپ ان کے اسرار کو ہم پر واضح فرمائیں۔ اس سے پہلے ہم ان ملفوظات کو بعض علما اور مشائخین کو دکھا چکے ہیں لیکن انھوں نے کہا کہ یہ بے معنی ہیں اور حضرت گیسو دراز کے کلمات ایسے بے معنی نہیں ہو سکتے۔ میر کالپوی نے ان درویشوں سے وہ ملفوظات لے لئے اور ان کو پڑھنے کے بعد انھیں یہ یقین ہو گیا کہ یہ ملفوظات حضرت گیسو دراز ہی کے ہیں کیوں کہ وہ آپ کے انداز فکر و نگارش سے اچھی طرح مانوس تھے۔ چنانچہ میر کالپوی نے درویشوں سے کہا کہ یہ ملفوظات یقیناً حضرت گیسو دراز ہی کے ہیں اور حضرت گیسو دراز بے معنی کلمات نہیں فرما سکتے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ یہ ملفوظات توحید اور عرفان کے رموز اور نکات پر مشتمل ہیں اور اسی لئے ظاہری علوم کے جاننے والوں پر ان کے اسرار کھل نہیں سکتے۔ اس کے بعد میر کالپوی نے درویشوں سے تین دن کی مہلت مانگی تاکہ وہ اس دوران میں ان کے اسرار و رموز پر غور کر سکیں۔ میر کالپوی نے ان کی شرح لکھنے سے پہلے خدا سے توفیق چاہی اور پھر حضرت گیسو دراز کے روحانی فیضان سے مدد طلب کی۔ اس کے بعد قلم اٹھایا اور وہ شرح لکھی جو برہان العاشقین کے ساتھ شایع ہوئی ہے۔

حضرت گیسو دراز کی یہ عادت تھی کہ آپ اپنے ایسے ارادت مندوں کے لئے جو فارسی نہیں جانتے تھے اردو میں بھی ارشادات فرماتے تھے۔ آپ کی اس عادت کی طرف مولوی عبدالحق مرحوم نے بھی اشارہ کیا ہے جن کے

---

[1] حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا شمار اکابر اولیا میں ہوتا ہے۔ آپ کے والد سید یوسف حسینی الملقب شاہ راجو قتال، حضرت نظام الدین اولیا کے ایک خلیفہ تھے۔ سید محمد حسینی کی ولادت دہلی میں ۷۲۱ھ میں ہوئی تھی۔ یہ سلطان محمد تغلق کا عہد تھا جب اس نے دولت آباد کو نیا دارالسلطنت بنایا تو دہلی کے علما اور صوفیائے کرام کو بھی دکن جانے کی ہدایت کی۔ چنانچہ دوسرے صوفیا کے ساتھ سید یوسف حسینی (شاہ راجو قتال) بھی دولت آباد تشریف لے آئے۔ جب ۷۳۱ھ میں حضرت شاہ راجو کا انتقال ہو گیا تو حضرت گیسو دراز کی والدہ بی بی رانی آپ کو لے کر دہلی چلی گئیں۔ اس وقت تک حضرت سلطان المشائخ کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے سید محمد حسینی نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلی سے بیعت کی۔ حضرت نصیر الدین کی وفات کے بعد آپ سجادہ نشین ہوئے۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر میں آپ نے عقد کیا۔ دہلی پر جب تیموری حملوں کا آغاز ہوا اور شہر میں امن و امان مفقود ہو گیا تو آپ نے اپنے معتقدین کو شہر چھوڑ کر چلے جانے کی ہدایت کی اور خود بھی اہل و عیال کے ساتھ دکن تشریف لے گئے۔ دکن میں اس وقت فیروز شاہ بہمنی حکومت کر رہا تھا۔ اس کی درخواست پر آپ گلبرگہ میں فروکش ہو گئے۔ آپ کے اردو رسالوں میں صرف معراج العاشقین شایع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی آٹھ دس اردو رسائل آپ کے مصنفہ مانے جاتے تھے مگر میری تلاش میں ایسے رسالے آپ سے منسوب اور آپ کے مصنفہ دستیاب ہوسکے ہیں جو مختلف کتب خانوں میں مخطوطات کی صورت میں محفوظ ہیں۔ انھیں میں ایک رسالہ شکار نامہ بھی ہے۔

[2] میر سید محمد کالپوی حضرت گیسو دراز کے قریبی زمانے کے ایک عالم اور صوفی بزرگ تھے۔ انھیں حضرت گیسو دراز سے بڑی ارادت تھی۔ ——— (ثمینہ شوکت)

اور کتب خانے میں آپ کے کئی اُردو رسالے موجود تھے۔ حکیم شمس اللہ قادری نے بھی لکھا ہے کہ عربی فارسی سے ناواقف لوگوں کے لیے آپ نے متعدد رسالے دکنی میں تصنیف فرمائے تھے[1]۔

شکارنامہ کی یہی شانِ نزول تھی۔ برہان العاشقین کے مطالب اور موضوعات کو حضرت گیسو دراز نے اُردو میں بھی بیان فرمایا تھا۔ حضرت گیسو دراز کوئی رسالہ یا کتاب خود اپنے قلم سے نہیں لکھتے تھے بلکہ اپنے معتقدین سے لکھوایا کرتے تھے اور کسی کتاب یا رسالے کو املا کروانے کے بعد اس کی نظرِ ثانی نہیں فرماتے تھے۔

شکارنامہ کا موضوع عرفان اور وحدانیت کے اسرار و رموز پر مشتمل ہے۔ حیاتِ انسانی کو جن مراحلِ بشریت سے گزرنا پڑتا ہے اور جن تقاضوں سے اس کو اپنا دامن بچانے کی ضرورت ہے اسی کی تشریح اس رسالے میں کی گئی ہے۔ مثالیہ قصہ چار بھائیوں کا ہے جو سات ماؤں اور نو باپوں کے فرزند ہیں۔ یہ چاروں شکار کے لئے جاتے ہیں۔ بازار سے چار تیر اور چار کمان خرید کر لے جاتے ہیں۔ ان میں سے تین تیر ٹوٹے ہوئے تھے اور ایک کے سوفار نہیں تھا۔ انھوں نے اس تیر کو بے چلّے اور بے گوشہ کمان میں جوڑ کر ہرن پر چلایا۔ وہاں چار ہرن تھے جن میں سے تین مردہ تھے اور ایک کے جان ہی نہیں تھی۔ تیر سے اس ہرن کا شکار کیا جس کے جان نہیں تھی۔ شکار کو باندھنے کے لئے رسی تلاش کی تو چار رسیاں نظر آئیں جن میں تین ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اور ایک کے کنارے کا اور درمیان کا حصہ نہیں تھا۔ اس رسی سے ہرن کو باندھ کر پکانے کے لئے لے جا رہے تھے کہ راستے میں چار گھر نظر پڑے جن میں تین ٹوٹے ہوئے تھے، اور ایک ویران تھا۔ شکار کو لے کر وہ ویران گھر میں داخل ہوئے۔ وہاں ہرن کو پکانے کے لئے کسی برتن کی تلاش ہوئی۔ اتنے میں ایک محراب نظر آئی جس میں ایک ہانڈی رکھی تھی۔ اس ہانڈی کو نکالنے کے لئے انھوں نے ہاتھ بڑھایا تو دیکھا کہ ہاتھ پہنچ نہیں سکتا۔ اب خیال ہوا کہ ایک پتھر رکھیں اور اس پر چڑھ کر ہانڈی نکالیں۔ لیکن پتھر پر چڑھنے کے باوجود ہاتھ ہانڈی تک نہیں پہنچ سکا۔ یہ دیکھ کر انھوں نے پانچ گز زمین کھودی اور اس میں اتر کر ہانڈی نکالنے کی کوشش کی تو ہاتھ ہانڈی تک آسانی سے پہنچ گیا۔ ہانڈی کو محراب سے اتار کر اس میں ہرن کو پکایا۔ پکانے کے بعد چاروں بھائیوں نے کھانا ہی شروع کیا تھا کہ ایک شخص یکایک نمودار ہوا اور اپنے لئے حصہ طلب کیا۔ بھائیوں نے اسے ایک ہڈی دی جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ اس ہڈی سے خربوزے کا بیج پیدا ہوا اور پھر اس بیج سے زرد آلو کی بیل پیدا ہوئی۔ اس بیل کو بیگن لگے جنھیں پکا کر سارے عالم نے کھایا اور اتنا کھایا کہ سب کے پیٹ پھول گئے۔ اس پر وہ خوش تھے کہ توانا ہو رہے ہیں لیکن اس فربہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ گھر کے دروازے سے نکلنے کے قابل نہیں رہ گئے۔

اس مثالیہ قصے کے تضادات، ہر زمانے کے صاحبانِ فکر و نظر کو ان کے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش پر اکساتے رہے۔ ان تضادات کے ماخذوں کی تلاش میں میں نے جو کوششیں کیں اُن سے مجھے یہ پتہ چلا کہ اس طرح کے معمہ نما ملفوظات، اس زمانے میں دکن اور خاص طور پر مہاراشٹرا کے صوفی سنتوں میں عام تھے۔ یہ ملفوظات بھارودھ یا ابھنگ کہلاتے تھے۔ بھارودھ سنسکرت لفظ "بھورودھم" سے مشتق ہے جس کے معنی کٹھن یا لمبی پیچیدہ نظم کے ہیں۔ مرہٹی میں بھارودھ کی اصطلاح معمہ نما نظم کے لئے مستعمل ہے۔ ابھنگ کے معنی لافانی کے ہیں۔ یہ سنسکرت لفظ ہے، جس کے معنی وہی ہیں جو مرہٹی میں رائج ہیں۔ نام دیو، ایکناتھ اور تکارام کے یہاں اسے ایک بحر یا وزن کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ یہ تینوں مہاراشٹر کے مشہور سنت شاعر گزرے ہیں۔ ان سنتوں کی لکھی ہوئی معمہ نما نظموں کو ان کی اہمیت کی وجہ سے ابھنگ کہتے تھے۔ رباعی کی طرح سے یہاں بھی موضوع اور ہیئت دونوں مدغم ہو گئے ہیں۔

گیانیشور، نام دیو، ایکناتھ اور تکارام کے ابھنگ اور بھارودھ بہت ملتے ہیں۔ نمونے کے لئے ذیل میں گیانیشور کا ایک بھارودھ درج کیا جاتا ہے۔ گیانیشور کی زبان قدیم اردو سے بہت ملتی جلتی ہے اس لئے اصل بھارودھ نقل کیا جا رہا ہے اور مقابل میں اس کا اردو ترجمہ درج ہے:

کاٹیاں چیا اُنی ور وسلی تین گاویں	کانٹوں کی انی پر بسے تین گاؤں
دون اساڑ ایک دیسیح نا دیسیح نا	دو اجاڑ، ایک بستا ہی نہیں بستا ہی نہیں
دیسیح نا ستے تھے آلے تین کمبھار	جو بستا ہی نہ تھا، وہاں آئے تین کمہار
دون ٹھوٹے، ایک گھڑیچ نا	دو لولے ایک گھڑتا ہی نہ تھا
گھڑیچ نا تیانے گھڑلی تین مڈکی	جو گھڑتا ہی نہ تھا، اس نے گھڑیں تین مٹکیاں
دو کچی، ایک بھاجیچ نا، بھاجیچ نا	دو کچی ایک پکتی ہی نہ تھی، پکتی ہی نہ تھی،
بھاجیچ نا، تیانت گھاتلے تین مگ	جو پکتی ہی نہ تھی، اس میں ابالیں تین مونگ
دون کچے، ایک شیجیچ نا شیجیچ نا	دو کچی ایک گلتی ہی نہ تھی، گلتی ہی نہ تھی
شیجیچ ناستے تھے آلے تین پاہونے	جو گلتی ہی نہ تھی، اس پر آئے تین مہمان

[1] دیباچہ معراج العاشقین ص ۲۲ ۔ [2] اردو ئے قدیم (دوسرا ایڈیشن) ص ۳۲ ۔ دیباچہ خاتمہ

دون نُسنلے، ایک جینوپچ نا، جیوپچ نا — دو روٹے، ایک کھاتا ہی نہ تھا، کھاتا تھی تھا
جیوپچ نا، تیالا، دیے تین روپے — جو کھاتا ہی نہ تھا، اس کو دیئے تین روپے
دون کھوٹے، ایک دا پچ نا، دا پچ نا — دو کھوٹے، ایک بجا ہی نہ تھا، بجتا ہی نہ تھا
دا پچ نا، تے تھے آنے تین پار کھی — جو بجتا ہی تھا، اس کے لئے آئے تین رکھی
دون اندھرلے، ایکا دیچ نا، دیچ نا — دو اندھے، ایک کو دکھائی نہ دے دکھائی نہ دے
دیچ نا بتا لاد لیا تین بجیا — جسے دکھائی نہ دیتا تھا، اس کو لگائے تین کے
دون چک لیا، ایک بدگیچ نا، لاگیچ نا — دو چوکے، ایک لگتا ہی نہیں، لگتا ہی نہیں
گیان دیو منوے، جانا تبھی کھون — گیان دیو کہتے ہیں، جاننے وہی اشارہ
سدگرو دا اپچوں کوڑیچ نا، کرویچ نا — ست گرو بغیر سمجھے ہی نہیں، سمجھے نہیں

جیسا کہ اس بھر ڈھ کے آخری حصے سے ظاہر ہے، ان نظموں کا مقصد طالبان حق کو گرو یا مرشد کی طرف رجوع کرنا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عام طور پر لوگ مشکل مسائل کی تشریح اور توضیح من مانے طور پر کر لیا کرتے ہیں۔ لیکن عرفان اور وحدانیت کے مسائل بہت نازک ہوتے ہیں اس لئے ان رموز کی تفہیم کسی صاحب نظر کے بغیر صحیح طور پر نہیں ہو سکتی۔ مسلمان صوفیوں کو بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ کئی صوفیائے کرام کے یہاں ہم کو اس طرح کی ترغیب ملتی ہے۔ ابتدائی دور کے ایک صوفی حضرت شیخ فرید گنج شکر سے منسوب ایک نظم میں بھی خدا رسیدگی کے لئے پیر سے رجوع کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور یہ نظم مولوی عبدالحق مرحوم نے اپنی تصنیف اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام میں نقل کی ہے۔ جس کا آخری شعر یہ ہے۔

عشق کا رمز ہی نیارا ہے   بے مدد پیر کے نہ جارا ہے

گیانیشور، نام دیو، اور ایکناتھ کے بھروڈھ اور ابھنگوں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اسی زمانے کے قریب دکن کے اردو دانوں میں بھی عام طور پر یہ معمہ نما مسائل مروج ہو گئے۔ اور ان کی تفہیم اور تشریح بھی کی جانے لگی۔ چنانچہ قدیم اردو کا ایک رسالہ ہم کو دستیاب ہوتا ہے، جو جنونیہ یا جنونیت کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں وہی معمے اردو میں لکھے گئے ہیں، جو گیانیشور کے بھروڈھ میں ہیں۔ ہر معمے کو "معقولہ" کے عنوان کے تحت درج کیا گیا ہے اور فارسی میں ان کی طویل شرح بھی کی گئی ہے۔ جنونیہ کی تدوین کے سلسلے میں یک واقعہ یہ درج کیا گیا ہے کہ ایک شخص سید جنوں نے ان اقوال کو کسی سے سنا تو اس کو اس بات کی ٹوہ ہوئی کہ ان کے رموز معلوم کئے جائیں۔ اس مقصد سے وہ اپنے زمانے کے ایک صاحب دل بزرگ محمد وفا کے یہاں گیا جن سے اسے عقیدت تھی۔ سید جنوں نے اقوال محمد وفا کو سنائے اور ان کے مطالب کی تشریح اور تفہیم کی خواہش کی۔ جنونیہ کا اقتباس حسب ذیل ہے۔ محمد وفا کہتے ہیں:

روزے ایں فقیر نشستہ بود۔ یار موافق و محب صادق سید جنوں ایں کلام ہندی خواندند و تکلیف کردند کہ معنی کلام بگوید۔ بنا بر ضرور ہر چہ در خاطر ایں خام آمد بجامہ بند کردہ جنونیت نام نہادہ"

مجھے جنونیہ کے اب تک صرف دو مخطوطوں کا پتہ چل سکا ہے جن میں سے ایک کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد میں محفوظ ہے، اور دوسرا بیجا پور کے میوزیم کا مخزونہ ہے۔

حضرت گیسو دراز کے اردو شکار نامے کی بھی برہان العاشقین کی طرح کئی شرحیں لکھی گئی تھیں جن میں سے ایک شرح، اصل مخطوطے کے ساتھ مندرج ملتی ہے۔ قیاس یہ ہے کہ یہ شرح حضرت شاہ برہان الدین جانم فرزند حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق نے لکھی تھی، کیوں کہ گلبرگہ کے کتب خانہ روضتین میں شکار نامہ کا جو مخطوطہ محفوظ ہے، وہ حضرت برہان الدین جانم کے ملفوظات کے ساتھ منسلک ہے۔

شکار نامہ کا خلاصہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اس کے رموز اور مطالب کی شرح کی مختلف لوگوں نے کوشش کی تھی۔ چنانچہ نو باپوں سے بعض علما نے نو فلک مراد لیا ہے اور سات ماؤں سے، سات طبق زمین۔ چار فرزند، جمادی، نباتی، حیوانی اور انسانی روح بتائے گئے ہیں۔ تین فرزند ننگے تھے، جس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ اول الذکر تین روحیں، قابل تجلیات الہٰی نہیں۔ چوتھا فرزند جس کے کپڑے نہیں تھے، یعنی روح انسانی جو لطیف ہے قابل تجلیات ربانی ٹھہری۔ چاروں بھائی بازار گئے تھے، جہاں سے تیر و کمان خریدی تھی۔ اور بے چلہ و بے گوشہ کمان سے شکار کیا تھا۔ بے چلہ اور بے گوشہ کمان مادی کا ترک ہے۔ اس تیر و کمان سے ہرن یعنی یزداں یا ذات حق کا شکار کیا اور اسے باندھنے کے لئے جب کمند کی تلاش ہوئی تو چار رسیاں نظر آئیں۔ ان میں سے تین ٹوٹی ہوئی سے مراد عبادت کے تین طریقے، ظاہری، باطنی اور فنائی التوحید ہیں جو ناقص ہیں۔ چوتھی یزداں شکار کمند فنا الفنا ہے، جو عین بقا ہے۔ چار گھر، ذکر کے چار طریقے لسانی، نفسانی، قلبی اور روحی ہیں،

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۸ پر)

افسانہ

جب ہم نہ ہوں گے

بشیشر پردیپ

یہ گرم کوٹ اس کے مرحوم شوہر کا تھا۔ پچھلی سردیوں میں وہ یہ گرم کوٹ پہنا کرتا تھا۔ ویسے یہ گرم کوٹ تقریباً آٹھ سال پرانا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد یہ پہلا اور آخری کوٹ تھا جو اس کے شوہر نے بنوایا تھا۔ اس نے متواتر آٹھ سردیاں اسے پہنا تھا۔ اور اب اس کا نیلا رنگ بھی ہلکا پڑ گیا تھا۔ تین چار جگہ سے سلا ہوا تھا۔ دو تین جگہ سے رفو کیا ہوا تھا۔ اور یہ مرمت گاہے بگاہے وہ خود کرتی رہی تھی۔ اس وقت تین بٹنوں میں سے صرف ایک بٹن تھا اور وہ بھی آدھا ٹوٹا ہوا۔ پچھلے سال وہ سوچتی رہی کہ تینوں نئے بٹن لگا دے، لیکن اسے بٹن ہی نہ ملے۔ اور اب ان سردیوں میں وہ خود یہاں نہیں ہے۔ وہ جو اسے پہنا کرتا تھا؛ اب وہ اسے کبھی نہیں دیکھ سکے گی۔ کبھی نہیں۔!

اس کے بوڑھے سینے کے اندر دھڑکتے دل کو جیسے کسی نے زور سے مسل دیا ہو۔ اس کے سوکھے ہونٹ پھڑپھڑا اٹھے۔ ان سے ایک لمبی سرد آہ نکلی اور اس کی بوڑھی آنکھیں بھیگ گئیں۔ جھریوں سی ان آنکھوں کے کونوں پر آنسوؤں کے دو قطرے نمودار ہوئے اور جب اس نے شدت کرب سے آنکھیں بند کیں تو وہ قطرے وہاں سے نکل کر اس کے جھریوں بھرے گالوں پر بہتے چلے گئے۔

وہ اوپر والے کمرے میں رکھے بڑے ٹرنک میں سے کپڑے نکال رہی تھی۔ اپنے نوزائیدہ پوتے کے لئے کسی اترے ہوئے سویٹر کی تلاش میں کپڑے نکالتے ہوئے اچانک ٹرنک کے ایک کونے میں سے یہ بوسیدہ گرم کوٹ نکل آیا تھا اور اس نے اسے اس کے شوہر کی یاد دلا دی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے اپنے شوہر کا چہرہ گھوم گیا۔ جھریوں بھرا کمزور سا چہرہ بڑھی ہوئی سفید داڑھی، سر پر چاروں طرف چھدرے سے سفید بال۔ بیچ میں تو اس کا سر بالکل خالی تھا۔ جب اس حصے کی زردی مائل کھال تیل لگانے سے چمکنے لگتی تھی۔ پچھلی سردیوں میں وہ پینسٹھ سال کا تھا اور اس کی اپنی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ چالیس سال سے کچھ زیادہ ہی عرصہ ان دونوں نے ساتھ گزارا تھا۔ چالیس سال! کتنا لمبا عرصہ ہوتا ہے چالیس سال! لیکن کتنا کم معلوم ہوتا ہے! اس وقت چالیس سال کا وہ تمام عرصہ یکبارگی اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اتنا لمبا عرصہ سمٹ کر اس ایک لمحے میں سما گیا۔ چالیس سال کی اکٹھی زندگی کی کئی جھانکیاں بڑی تیزی سے بغیر کسی ترتیب کے اس کی نظروں کے سامنے سے گزر گئیں۔ اور پھر اس کے بعد ایک وقفہ آ گیا۔ جیسے اس کے ذہن کا پردہ اچانک خالی ہو گیا ہو — فلم کے انٹرول میں سینما کے پردے کی طرح! وہ کوٹ کو لئے پاس پڑے ایک چھوٹے سے ٹرنک پر بیٹھ گئی — اداس سی، نڈھال سی — کھوئی ہوئی سی — وہی جھانکیاں اسے پھر نظر آنے لگیں۔ لیکن اب کی بار یہ جھانکیاں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے اس کے سامنے سے گزر رہی تھیں — یہ اس کی شادی کا دن تھا۔ وہ دلہن بنی تھی اور وہ اسے بیاہنے آیا تھا — یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ لیکن یہ کل تو گزر گیا تھا — اور "کل" جب گزر جاتا ہے تو پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ چاہے اسے گزرے ہوئے چوبیس ہی گھنٹے کیوں نہ ہوئے ہوں۔ سہیلیوں کی جھرمٹ، 'شادی کا ہنگامہ'، بارات کے آنے کا شور، ماں باپ کے گھر سے اس کی وداعی، نیا گھر، سہاگ رات! سبھی کچھ تو اسے یاد ہے — ایک بات بھی وہ نہیں بھولی! "کل" گزر جاتا ہے لیکن اس کی یاد رہ جاتی ہے۔ جانے کیوں شادی کے بعد وہ اسے کتنا پیار کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا۔

"بمنا — ہم دونوں ساتھ ہی جئیں گے، ساتھ ہی مریں گے"۔ اس سے جدائی کا خیال بھی اسے اداس کر دیتا تھا۔ جب بھی وہ میکے جانے کے لئے تیار ہوتی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر لیتا۔ اور پھر وہ بھی زیادہ عرصے میکے میں نہ رہ سکتی۔ چند ہی روز بعد لوٹ آیا کرتی۔ لیکن ان تھوڑے سے دنوں میں بھی وہ کتنے ہی خط لکھ ڈالتا تھا۔ لمبے لمبے خط! وہ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی۔ کتنی ہی دیر لگ جاتی اسے خط پڑھنے میں۔ اور پھر جواب میں وہ مشکل سے تھوڑا لکھ پاتی۔ صرف ایک ہی دو خط لکھتی تھی وہ — اور وہ اسے ہمیشہ جتایا کرتا۔ "تمہارے دل میں

میرے لئے پیار ہے ہی نہیں ـــ ورنہ ہر خط کا جواب نہ دیتیں"!
اور وہ صرف ہنس کر رہ جاتی تھی۔ کیا دن تھے وہ بھی! اُف! اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی ـــ اور اس نے تکلیف اور درد سے اپنی آنکھیں موند لیں۔ سر کو خفیف سا جھٹکا دیکر اس نے ان گزرے دنوں کو یاد کو ذہن سے پرے رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن یاد تھی کہ دماغ میں گھستی چلی آرہی تھی ـــ اور دوسرے ہی لمحے وہ پھر یادوں کے بس میں تھی۔

شادی کے پورے ڈیڑھ سال بعد ان کا بچہ پیدا ہوا۔ ان کا پہلا بچہ۔ ہو بہو اس کی شکل کا تھا وہ ـــ جب وہ اسے گود میں لے کر بیٹھتی تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ خود چھوٹا سا، ننھا منا سا بچہ بن کر اس کی گود میں آبیٹھا ہو اور اس خیال کے آتے ہی وہ بچے کا منہ چوم لیتی ـــ اسے بے تحاشا چومنے لگتی ـــ اس کو بھی تو بہت پیارا لگتا تھا وہ ـــ جب کبھی بیمار ہوتا تو وہ کھانا پینا بھول جاتا۔ کام پر بھی نہ جاتا ـــ ڈاکٹروں کے ہاں چکر پر چکر لگایا کرتا ـــ رات کو اٹھ اٹھ کر اس کو دیکھتا ـــ وہ بچہ تھا بھی تو بہت پیارا ـــ منا منا سا ـــ پیار سے وہ اسے "بھولا" کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ اس کا نام تو ابھی رکھا ہی نہ تھا ـــ اس کی گود میں پڑا ہوا ٹیاؤں ٹیاؤں کیا کرتا۔ روتا بہت تھا وہ ـــ ارے وہی 'بھولا' جواب ان کا بڑا لڑکا ہے! جو کالج میں پروفیسر ہے۔ پروفیسر دینا ناتھ! جس کا اب اپنا تیسرا بچہ پیدا ہوا ہے ـــ ہاں وہی۔! جو بات بات پر اسے کہتا ہے ـــ "تم تو سمجھتی ہی کچھ نہیں ماں! جو باپ کو بھی کہتا تھا ـــ "تم خواہ مخواہ کی دخل اندازی کرتے ہو باپو ـــ تم چپ چاپ پڑے رہا کرو!" یہ لڑکے جب بڑے ہو جاتے ہیں، پڑھ لکھ جاتے ہیں تو اپنے ماں باپ کو بے وقوف سمجھنے لگتے ہیں ـــ انہہ! اسے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے شوہر نے اپنے لڑکوں کی تعلیم کے لئے اپنی زمین بیچ دی تھی۔ ہر بار جب اسے ان کی تعلیم کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوتی تو وہ زمین کا کوئی ٹکڑا بیچ دیتا۔ اور اسے بتاتا بھی نہ تھا ـــ وہ سوچتا: "یہ بات اسے کیا بتاؤں! لیکن پھر بھی وہ جان جاتی اور جاننے کے بعد دل ہی دل میں خوش ہوتی کہ اپنی اولاد کے مستقبل کے لئے وہ اپنی جائداد کی بھی پروا نہیں کر رہا ہے۔ اس نے تو یہ کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ وہی لڑکے بڑے ہو کر اپنی اپنی جائداد بنانے کی فکر میں ماں باپ کی خوشیوں کی بھی پروا نہ کریں گے!

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بے اختیار سی ہو کر، زانوں پر رکھے کوٹ میں اپنا منہ چھپا لیا۔ کوٹ میں سے اسے ایک جانی پہچانی سی خوشبو آئی۔ اس کے شوہر کے مرنے کے بعد وہ کوٹ دھلوایا نہیں گیا تھا۔ اور اس میں بچی بسی خوشبو اب بھی آرہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر کوٹ میں منہ چھپائے بیٹھی رہی ـــ اسے یوں لگا جیسے اس کا شوہر کوٹ پہن کر کہیں باہر جانے کے لئے تیار ہوا ہے۔ جاتی بار وہ اس کی طرف بازو پھیلا دیتا ہے اور وہ اس کے بازوؤں میں سما جاتی ہے۔ اس کے سینے میں اپنا منہ چھپا لیتی ہے۔ اس کے نتھنوں میں اس کے شوہر کی خوشبو گھس جاتی ہے۔ لیکن ایسا تو اس کوٹ کے سلوانے کے بعد کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ تو اس کوٹ سے پہلے والے کوٹ بلکہ اس سے بھی پہلے والے کوٹوں کے وقت کی بات ہے۔ کوٹ پر کوٹ بدلتے گئے اور یہ سلسلہ بھی ختم ہوتا گیا۔ ان کے بچے جو بڑے ہو گئے تھے!

اس نے ایک لمبی سانس لی۔ اور بے بس سی ہو کر کوٹ پر سے منہ ہٹا لیا۔ اب وہ ہتھیلی پر چہرہ ٹکائے سامنے دیکھ رہی تھی ـــ بدستور یادوں میں ڈوبی ہوئی۔ نیچے سے اس کے پوتے کے رونے کی آواز آئی لیکن وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ اسے یہ آواز کہیں دور سے آتی سنائی دی ـــ ان یادوں کے پس منظر سے ـــ اور اس نے اس ہلکی سی، بے معنی سی آواز کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اگر وہ اس وقت نیچے ہوتی تو اسے اپنے روتے ہوئے پوتے کو گود میں اٹھا لینا پڑتا۔ اس کی بہو اس سے یہی امید کرتی تھی۔ اور اگر اس وقت وہ یادوں میں دکھوئی ہوتی تو پوتے کو اوپر سے پچکار ہی دیتی۔ نیچے ہی چلی جاتی لیکن وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ وہ اس وقت اس کمرے میں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اس کا شوہر اگرچہ دل کا بہت نرم تھا لیکن کبھی کبھی اسے غصہ بھی بہت آتا تھا اور جب اسے غصہ آتا تھا تو وہ آگے پیچھے کچھ نہیں دیکھتا تھا۔ جو لوگ کبھی کبھار غصے میں آتے ہیں ان کا غصہ شاید بہت تیز ہوتا ہے۔ غصہ میں آکر ایک بار تو اس نے روٹی کی تھالی اٹھا کر باہر پھینک دی تھی۔ بات کیا تھی۔ یہی نا کہ ترکاری کچھ مزیدار نہیں بنی تھی۔ اپنے غصہ ہونے کی وجہ بتائی تو وہ کہنے لگی کہ سبزی ہی خراب تھی۔ اس پر وہ چڑھ گیا اور کہنے لگا:

"تم اپنا قصور تو مانتی ہی نہیں ہو۔ اپنی غلطی میرے سر منڈھتی ہو۔ مجھ سے نہیں کھائی جاتی یہ روٹی ـــ کتوں کو ڈال دو!"

اور اس نے تھالی اٹھا کر باہر پھینک دی۔ وہ کچھ نہ بولی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد فضا ٹھیک ہو گئی تھی۔ جب بھی اسے غصہ آتا تھا وہ خاموش ہو جایا کرتی تھی ـــ ورنہ بات بڑھ سکتی تھی۔ جب وہ جانتی تھی کہ اس کا غصہ

عارضی ہے تو وہ بات کا جواب دیکر بات کیوں بڑھاتی؟ اور پھر وہ اس کو چاہتا بھی تو بہت تھا۔ زبردستی اسے پھل کھلاتا تھا۔ جب کبھی وہ بیمار پڑتی وہ بے قرار ہو جاتا۔ ایک دفعہ جب وہ سخت بیمار ہوئی تھی ـــ یہی جب اس کا دوسرا لڑکا پیدا ہوا تھا، جو سکریٹریٹ میں ملازم ہے ـــ تو ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ اس وقت وہ اس کی چارپائی کے پاس بیٹھا چپکے سے آنسو بہایا کرتا۔ اس نے غفلت کے عالم میں اسے اس کی ماں سے یعنی اپنی ساس سے کہتے سُنا تھا:

"اگر جمنا کو کچھ ہو گیا تو میں یہ دنیا ہی چھوڑ دوں گا۔ جنگل میں چلا جاؤں گا۔ ویرانوں میں زندگی گزار دوں گا۔ تم ان بچوں کو سنبھال لینا۔"

لیکن وہ مری نہیں اب اس کے بعد پینتیس سال گزر چکے ہیں اور وہ ابھی تک زندہ ہے۔ اور وہ خود اس سے پہلے چل بسا! کتنی عجیب بات ہے جب وہ اس سے دور چلا جاتا تھا ـــ دفتر کے کسی کام کے سلسلے میں ـــ تو وہ کس بے صبری سے انتظار کیا کرتی تھی! لیکن اب ـــ اب نہ جانے وہ کس کام سے چلا گیا ہے؟ اس کا یہ کام تو کبھی ختم نہ ہو گا۔ کبھی نہیں ـــ وہ کبھی واپس نہ آئے گا ـــ کبھی نہیں!

اور اس کا دل بھر آیا ایک بار پھر اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ایک بار پھر اس کے گالوں پر آنسو بہنے لگے۔ اس نے چند لمحے انھیں بہنے دیا۔ پھر اس نے اپنی سوکھی ہوئی انگلیوں سے گالوں کو پونچھا، ناک کو صاف کیا، آنکھوں کو خشک کیا اور پھر یادوں میں کھو گئی۔

اس نے ہمیشہ اچھے دنوں کے خواب دیکھے تھے۔ لیکن اچھے دن کبھی نہ آئے۔ وہ تمام عمر کلرک ہی رہا۔ حتیٰ کہ پنشن پا گیا۔ پچاس روپے ماہوار پنشن۔ ہاں البتہ اس کے بیٹے ضرور امیر ہیں۔ لیکن انھیں کیا۔ امیر بیٹوں کے والدین ہوتے ہوئے بھی! ان کے پاس رہتے ہوئے بھی وہ خود غریب تھے۔ بیٹوں کے رحم و کرم پر جو تھے۔ یہ دونوں اپنی مرضی کے مطابق کسی کی شادی یا کسی تہوار پر خرچ نہ کر سکتے تھے۔ اب یہی چھوٹی بیٹی کی شادی پر اس کی کتنی چاہ تھی کہ اسے اچھا جہیز دے تاکہ اس کی بیٹی سسرال میں اپنا سر اونچا کر سکے اور فخر سے کہہ سکے کہ وہ بڑے گھر کی بیٹی ہے۔ بڑی بیٹی کی شادی اس نے اپنی حیثیت کے مطابق بہت اچھی طرح کی تھی۔ لیکن اب اس کے بیٹوں نے اپنی مرضی کے مطابق خرچ کیا۔ اور وہ خاموش دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ ریٹائر ہو چکا تھا۔ صرف پنشن ہی اس کی ذاتی آمدنی تھی۔ وہ کرتا بھی کیا؟ اور اب اس کی لڑکی دکھی ہے۔ وہ لوگ اسے طعنے دیتے ہیں ـــ بڑے گھر کی کنجوسی کے طعنے ـــ لیکن اس کے بیٹوں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ جیسے وہ ان کی بہن ہی نہ ہو! ایسی باتوں سے اسے کتنا دکھ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس دکھ سے نڈھال ہو جاتا تھا۔ جب ہی تو اس کی صحت جلد خراب ہو گئی تھی۔ اور وہ چارپائی پر پڑ گیا۔ بیٹوں کے خوشحال ہونے سے اپنی خوشحالی میں فرق پڑے؟ تو کیا فائدہ ایسی اولاد سے!

وہ بیماری میں کہا کرتا تھا:

"میرے مرنے کے بعد یہ پچاس روپیہ کی پنشن بھی بند ہو جائے گی۔ تمھاری تو مٹی خراب ہو جائے گی جمنا!"

اور وہ اس کو دلاسا دیتی: تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔" لیکن وہ ٹھیک نہ ہوا۔ اس کی صحت بگڑتی ہی گئی تین سال متواتر بیمار رہا ـــ بہویں تو جیسے اس کی بیماری سے تنگ آ گئی تھیں۔ اس کی کھانسی کی وجہ سے جب ان لوگوں کی نیند کھل جاتی تھی تو کیسے بڑبڑاتی تھیں وہ! ہے بھگوان، جیسے ان کو تو بڑھاپا آئے گا ہی نہیں ـــ کچھ بیماری کی وجہ سے کچھ بہوؤں کے سلوک کی وجہ سے اور کچھ لڑکوں کی طرف سے خرچ میں کنجوسی کی وجہ سے وہ اکثر بلبلا اٹھتا۔

اب تو بھگوان مجھے اٹھا ہی لے تو اچھا ہے!"

اور اس کی بڑھتی ہوئی تکلیف کو دیکھ کر وہ بھی سوچا کرتی۔

"یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ اس تکلیف سے تو بہتر یہی ہے کہ وہ ختم ہو جائے!"

ہاں وہ بھی یہی سوچا کرتی تھی ـــ وہ جو اس کے بغیر رہ نہیں سکتی تھی! وہ جو دنیا میں صرف اسی کو اپنا ساتھی تصور کرتی تھی: وہ بھی چاہتی تھی کہ وہ مر جائے! اُف! وہ یہ کیا سوچتی تھی! لیکن وہ کرتی بھی کیا؟! اس سے اس کی تکلیف جو نہ دیکھی جاتی تھی۔ وہ اس کی خدمت کرنے سے تھوڑا گھبراتی تھی۔ جب وہ متواتر چار ماہ ہسپتال کے جنرل وارڈ میں پڑا رہا تو وہ کس باقاعدگی سے دونوں وقت اس کے پاس جاتی تھی۔ کسی دن تو پیدل ہی ـــ رکشا کے پیسے بچانے کے لئے ان بچائے ہوئے پیسوں سے اس کے لئے کوئی پھل خریدنے کے لئے! بیماری کے دنوں میں وہ چڑچڑا بھی تو کچھ زیادہ ہو گیا تھا ـــ چڑچڑا اور ضدی! جان بوجھ کر ایسا کام کرتا جس سے تکلیف بڑھ جائے۔ ڈاکٹر نے ٹھنڈی تاثیر کی چیزیں کھانے سے

منع کیا تھا اور اس نے جانے کس طرح گنے کا رس منگوا کر پی لیا۔ اور اس سے اس کی تکلیف بڑھ گئی ۔۔ اس وقت غصے میں اس نے بھی تو اسے برا بھلا کہا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔ بیماری اور دل میں چھپے درد کی وجہ سے وہ اس طرح کے کام کرتا ہے جیسے کسی سے بدلہ لے رہا ہو! اپنے بیٹوں سے۔ اپنی بہوؤں سے، اپنے اردگرد سب سے بدلہ!

اور اب تو اسے یہ دنیا چھوڑے ہوئے بھی ایک سال ہو رہا ہے ۔۔ گھر کے دوسرے افراد کو تو جیسے کچھ فرق ہی معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ تنہا رہ گئی ہو۔! اس گھر میں اس بھرے سنسار میں بیٹے بیٹیوں، پوتے پوتیوں کے ہوتے ہوئے تنہا ۔۔ تنہا اور بے سہارا۔

وہ کہا کرتا تھا :۔

"مرنے کے بعد آدمی دیکھ بھی تو نہیں سکتا کہ پیچھے اسکے عزیزوں کا، اس کے گھر کا، اس کے شہر کا کیا حال ہے۔ شاید مرنے والے دیکھنے آتے ہوں۔ کیوں؟"

لیکن وہ چپ رہتی تھی۔ وہ کیا جانے ۔ یہ تو قدرت کا گورکھ دھندا ہے۔ وہ تو بس اتنا جانتی ہے کہ اسے اس کی بہت یاد آتی ہے۔ اسے اپنی زندگی میں ایک خلا سا معلوم دیتا ہے۔ اس بڑھاپے میں وہی اس کا سہارا تھا!

اس نے کوٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ ایک یاس بھری مسکراہٹ

"دیکھ! میں تجھے کتنا یاد کرتی ہوں!"

لیکن اب کہاں ہے وہ ۔ اب تو اس کا صرف یہ کوٹ رہ گیا ہے ۔۔ اس کے استعمال کی تمام چیزیں ختم ہو گئی تھیں یا ختم کر دی گئی تھیں۔ صرف یہ کوٹ بچا تھا۔۔ اب یہی اس کی نشانی تھی۔ اس کوٹ کو وہ یونہی اس ٹرنک میں پڑا رہنے دے گی۔ اسے دیکھنے سے اس کے سامنے اس کے شوہر کی تصویر ابھر آتی ہے!

اور اس نے کوٹ کو تہہ کر دیا تاکہ پھر اسے ٹرنک میں رکھ دے۔ ابھی وہ اسے ٹرنک میں رکھ ہی رہی تھی کہ اس کی بڑی بہو اوپر کمرے میں آگئی۔

"اماں ۔۔ ملا کوئی سویٹر؟"

اور پھر اس نے اپنے سوال کا جواب پانے سے پہلے ہی ایک اور بات کہہ دی:

"اللہ! یہ کوٹ تو بابوجی کا ہے نا؟ لاؤ تو اس میں سے ننھے کا ایک کوٹ نکل سکتا ہے۔ ابھی تو کپڑا کافی مضبوط ہے۔؟"

بہو نے ہاتھ بڑھا کر وہ کوٹ لے لیا۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی رہی سہی پونجی بھی کسی نے لے لی ہو۔

"نہیں بہو۔۔ اس کپڑے میں سے بنا ہوا کوٹ ننھے کو اچھا نہیں لگے گا"

اس نے اپنے شوہر کی اس نشانی کو بچانے کی کوشش کی۔ بہو سے وہ کیسے کہے کہ یہ اس کے شوہر کی آخری نشانی ہے۔ اسے یونہی پڑا رہنے دو۔

ماں نے حسرت بھری نظروں سے کوٹ کی طرف دیکھا۔ بہو اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ جانے بہو کو اس کی بات سچ معلوم ہوئی یا اسے کوئی اور خیال آگیا۔ وہ اسے کوٹ واپس دیتے ہوئے بولی:

"ہاں رہنے دو۔۔ اس کپڑے سے بنا ہوا کوٹ اسے اچھا نہیں لگے گا"

اور بہو دوسرے ٹرنکوں میں سے کچھ تلاش کرنے چلی گئی ۔ اس نے وہ کوٹ تہہ کر کے ٹرنک میں رکھ دیا۔ اور کچھ مطمئن سی نیچے آگئی۔

اپنے سب سے چھوٹے پوتے کی چارپائی کے پاس سے گزری تو وہ اسے خواب میں ہنستا ہوا دکھائی دیا۔۔ اسی کے لئے وہ سویٹر تلاش کرنے گئی تھی۔ کسی دوسرے پوتے کا اترا ہوا سویٹر!

خواب میں اسے ہنستا دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی ۔۔ اس کے سرہانے کھڑے ہو کر بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی اور پھر جیسے کسی جذبے سے مغلوب ہو گئی۔ اس نے سوتے ہوئے اس بچے کو چوم لیا۔۔ اتنے زور سے چوما کہ بچہ جاگ گیا اور رونے لگا۔۔ لیکن وہ پھر بھی اسے چومے جا رہی تھی!

اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنے پوتے کو گود میں لئے، زمین پر بچھی چٹائی پر بیٹھی، اپنے شوہر کا وہی گرم کوٹ قینچی سے کاٹ رہی تھی ۔۔ اس کوٹ میں سے کپڑا نکالنے کے لئے ۔۔ اس کپڑے سے اپنے اس پوتے کا کوٹ بنانے کے لئے۔ اس کی بہو حیران تھی کہ ساس نے ایک دم اپنی رائے کیوں بدل دی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو کہہ رہی تھی "اس کپڑے سے بنا کوٹ ننھے کو سجے گا نہیں" اور اب؟ بہو کی حیرت بھری نگاہیں وہ پہچان گئی۔ لیکن وہ اسے کیسے بتاتی کہ اسے ننھے کی شکل میں اپنا مرحوم شوہر نظر آگیا تھا!

اُردو کے چند شعرا تذکرۂ سروِ آزاد کی روشنی میں

حنیف نقوی

میر غلام علی آزاد بلگرامی دنیائے علم و ادب کی جانی پہچانی منفرد و ممتاز شخصیت ہیں۔ سروِ آزاد ان کی گراں قدر فارسی تصنیف مآثر الکرام کے دوسرے حصے کا نام ہے۔ تاریخ اختتام کی رو سے اُس کا سال ترتیب ۱۱۶۶ھ قرار پاتا ہے لیکن معصوم (صفحہ ۸۲) اور آرزو (صفحہ ۲۳۱) کے متعلق مصنف کے بعض بیانات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کے بعد بھی کہیں کہیں اضافے کیے گئے ہیں۔ اس تذکرے میں گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کے ایک سو اکیاون شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں آخری آٹھ شعرائے ہندی کے سوا باقی تمام فارسی کے شاعر ہیں۔ ان سرمستانِ بادۂ عجم ہی میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے بطور تفنن طبع گاہے گاہے ریختہ کہنے کے باوجود بھی ہمارے ادب پر اپنی انفرادیت کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں یا جن کا کلام قلیل و کم یاب ہوتے ہوئے بھی زبان اور شاعری کے تدریجی ارتقا کا جائزہ لیتے وقت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بعض دوسرے شعرا کی طرح علامہ آزاد نے ان شاعروں کے حال میں بھی جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ تر اُن کے ذاتی علم اور تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ اس لحاظ سے سروِ آزاد ایک مستند تاریخی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی افادیت و اہمیت کے پیش نظر مضمونِ ہٰذا کے ذریعے چند فن کاروں کی حیات و شخصیت کے بارے میں فاضل مصنف کی فراہم کردہ تفصیلات کو اُردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اُردو کے تذکرہ نگار جب شعرائے متقدمین کے حالات قلم بند کرتے ہیں تو ان کے ذیل میں موسوی خاں فطرت کا ذکر بھی آتا ہے لیکن تذکرہ نگاری کی عام روایات کے مطابق یہ ذکر اس قدر مجمل و مختصر ہوتا ہے کہ اس سے شاعر کے بارے میں نام اور تخلص کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں معلوم ہوتی۔ نکات الشعرا کے اس اقتباس سے اس اختصار پسندی کا اندازہ ہوگا:

"موسوی خاں خطاب است۔ معز و موسوی و فطرت ہر سہ تخلص می کند۔ احوالِ او من وعن در تذکرہ سراج الدین علی خاں صاحب کہ اُستاد و پیر و مرشد بندہ است مسطور۔ ہم چو مسموع است کہ ایں شعر ریختہ شاعر مرقوم گفتہ۔ واللہ اعلم:

از زلف سیاہ تو بہ دل دھوم پڑی ہے

در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے"[1]

اس کے برخلاف سروِ آزاد میں ہمیں ان کے حالات و سوانح کسی قدر تفصیل سے ملتے ہیں اور اس حقیقت کا بھی علم ہو جاتا ہے کہ اُن کا خطاب "موسوی خاں" اور "معز" تخلص کے بجائے نام کا ایک جزو ہے۔ مؤلف تذکرہ کے بیان کے مطابق:

"اُن کا پورا نام میرزا معزالدین محمد تھا۔ قُم کے جلیل القدر سادات میں سے تھے۔ ساتویں امام کے خاندان کے چشم و چراغ اور مشہدِ مقدس کے سر برآوردہ عالم محمد زماں مشہدی کے نواسے تھے۔

"موسوی خاں کو ابتدائے سِن شعور سے تحصیل علم کا شوق تھا۔ ابتدائی کتابیں

---

[1] صفحہ ۴ — اگرچہ اس انتساب میں اختلاف بھی ہے لیکن شعرائے اُردو کی صف میں موسوی خاں کی شمولیت کا انحصار اسی ایک شعر پر ہے۔

اپنے وطن ہی میں پڑھیں۔ عنفوانِ شباب میں اپنے باپ میرزا فطرت سے ناراض ہو کر صفہان چلے گئے۔ وہاں دس سال تک آغا حسین خوانساری کے حلقۂ درس میں شامل رہے اور علوم عقلیہ اور نقلیہ میں اعلیٰ درجے کا کمال بہم پہنچایا۔

"ہندوستان سنہ ۱۰۸۲ھ میں آئے۔ خلد مکاں (اورنگ زیب عالم گیر) نے ذاتی اور خاندانی خوبیوں کی بنا پر مورد الطاف فرمایا اور شاہ نواز خاں صفوی کی صاحب زادی سے ان کی شادی کر کے اپنا ہم زلف بنانے کی عزت بخشی۔ پہلے صوبۂ عظیم آباد کی دیوانی پر مامور ہوئے لیکن امیر الامرا شائستہ خاں کے بیٹے اُمید خاں ناظم پٹنہ کی صحبت راس نہ آئی۔ ادھر اُمید خاں کا دماغ اپنی خاندانی بڑائی کی وجہ سے آسمان پر تھا اُدھر میرزا بادشاہ کے ہم زلف ہونے کے علاوہ اپنے فضل و کمال کی وجہ سے خود کو ناظم (اُمید خاں) سے کم تر سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ آخر کار دونوں کی ناچاقی کا حال بادشاہ کو معلوم ہوا اور انھوں نے میر (موسوی خاں) کو اپنے حضور میں طلب کر لیا۔

"موسوی خاں کے خطاب اور دیوانیِ ذات کے اعزاز سے سنہ ۱۰۹۹ھ میں سرفراز کیے گئے۔ ایک سال بعد ممالکِ دکن کی دیوانی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

"میر مذکور کا سالِ پیدائش سنہ ۱۰۵۰ھ ہے۔ وفات دکن میں سنہ ۱۱۰۱ھ میں ہوئی۔ پہلے فطرت تخلص کرتے تھے اس کے بعد موسوی لکھنے لگے اور خطابِ خانی کی رعایت سے اُس پر لفظ "خان" کا اضافہ کر دیا۔" (صفحات ۱۲۶، ۱۲۷)

موسوی کی طرح میرزا عبدالقادر بیدل کے حال میں بھی میرؔ نے صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کیا ہے کہ

"شاعرِ بزرگ در فارسی، صاحبِ دیوانِ پنجاہ ہزار بیت و مثنویات وغیرہ۔ اوائلِ جوانی نوکرِ شاہ زادہ محمد اعظم شاہ بود۔ بعد از چندے ترکِ روزگار کردہ نزدکش کرد۔ از مذاقِ شعرِ او دریافتہ می شود کہ بہرۂ کلی از عرفان داشت۔ احوالش مفصلاً در تذکرہ ہا مرقوم است۔ دو شعرِ ریختہ بنام او شنیدہ می شود، شاید بہ تقریبے گفتہ باشد از وست۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں ۱؎"

۱؎ نفحات الشعرا ص ۳۴۵

ہمارے ادب میں بیدل کی شہرت و اہمیت ان اشعار کی وجہ سے نہیں بلکہ اُن کے اس منفرد اسلوب کے سبب سے ہے جس کے اتباع پر غالبؔ نے اپنے ایک مقطعے میں اس طرح فخر کا اظہار کیا ہے:

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا ... اسد اللہ خاں قیامت ہے

درحقیقت بیدل کے اس مخصوص طرز کو سمجھے بغیر کلامِ غالبؔ کا مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ غالبؔ کے علاوہ اُردو کے کچھ اور شاعر بھی ان کی اس خصوصیت سے متاثر نظر آتے ہیں لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لیے اسے یہیں ختم کرتے ہوئے ہم بیاذ ادے اُن کی شخصیت اور فن کے بارے میں بلگرامی مرحوم کے اہم ارشادات کا ترجمہ سپردِ قلم کیا جاتا ہے:

"... ... ... اقسامِ نظم میں رتبۂ بلند اور اسالیبِ نثر میں درجۂ امتیاز کے مالک ہیں ... ... قوم برلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ولادت عظیم آباد پٹنہ میں ہوئی لیکن نشو و نما ہندوستان (دلی) میں پائی۔

"ابتداءً شاہ زادہ محمد اعظم کے یہاں ملازم ہو گئے تھے اور کسی منصب خاص پر فائز تھے۔ ایک دن کسی مصاحب نے شاہ زادے کے سامنے میرزا کی تعریف کی جسے سُن کر اُنھوں نے یہ ارشاد فرمایا کہ (بیدل) ہماری مدح میں کوئی قصیدہ کہہ کر لائیں تاکہ اُن کی استعداد کا اندازہ ہو اور اس کے مطابق انھیں اضافۂ منصب و تقرب سے سرفراز کیا جا سکے۔ جب یہ خبر میرزا کے کان تک پہنچی تو ان کا دل نوکری سے اُچاٹ ہو گیا اور احباب کی اس فہمائش کے باوجود کہ قصیدہ (بہ آسانی) کہا جا سکتا ہے ملازمت ترک کر کے خانہ نشین ہو گئے! اور یہاں تک کہ تمام زندگی اسی فقر و توکل کے عالم میں گزار دی۔

"خدائے تعالیٰ نے اُنھیں شہرت و عتبار کی دولت سے نوازا۔ اُمرا اور ارکانِ سلطنت اُن سے ملاقات کے آرزومند رہتے تھے اور بے حد اعزاز و اکرام بجا لاتے تھے۔ خصوصاً نواب شکر اللہ خاں مع اپنے تمام گھر والوں کے ان سے انتہا اعتقاد رکھتے تھے اور میرزا بھی اس خاندان کے مخلص خاص تھے۔

"نواب نظام الملک آصف جاہ شاعری میں اپنے آپ کو بیدل کا شاگرد کہتے تھے۔ میرزا کے بعض رقعات کے مکتوب الیہ چین قلیچ خاں سے یہی آصف جاہ مراد ہیں کیوں کہ یہ اُن کا قدیم خطاب ہے۔ جب میرزا نواب صاحب کے دولت خانے پر حاضر ہوتے تھے تو وہ (از راہ احترام) استقبال و مشایعت کرتے اور اپنی مسند پر بٹھاتے تھے۔

"امیر الامرا سید حسین علی خاں سے بھی میرزا کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ جس زمانے میں امیر الامرا نہ کور ممالک دکن کے انتظام میں مشغول تھے، میرزا نے انھیں دلی سے یہ دو اشعار لکھ کر بھیجے تھے:

لے نشۂ پیمانۂ قدرت بہ چہ کار ست ہستی اثرے یا پئے تاراج نہ الحمہ

مے در قدحے، گل بسرے، جام بدستے رنگ چمنے، موج گلے، جوشِ بہارے

لیکن فرخ سیر کی معزولی کے بعد جب میرزا کی طبع زاد تاریخ ع

سادات بوئے نمک حرامی کردند (سنہ ۱۱۳۱ھ)

مشہور ہوئی تو وہ (ممکن الوقوع خطرات سے متوہم ہو کر لاہور چلے گئے۔ عبد الصمد خاں ناظمِ لاہور نے اُن کی کافی قدر و منزلت کی۔ جب سادات کے اقتدار کا شیرازہ منتشر ہو گیا تو وہ پھر دہلی واپس آ گئے۔

"میرزا معنی آفرینی میں بے نظیر ہیں۔ اُن کا اپنا ایک طرزِ بیان ہے۔ اس کے باوصف انھوں نے عام شعرا کے رنگ میں بھی بہت کچھ کہا ہے۔ اگر ان کے کلیات کا انتخاب کیا جائے تو لطیف و پاکیزہ کلام کا ایک اچھا مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے ......
"کبھی کبھی زورِ طبیعت کی بنا پر سمندِ فکر کی خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں اور ظہوری ترشیزی کی طرح ایک ہی زمین میں مکرر غزلیں کہی ہیں۔ بحرِ کامل انھیں بطورِ خاص مرغوب ہے ......"

اُردو کے قدیم محسنین میں سراج الدین علی خاں آرزو کا مرتبہ کافی بلند ہے۔ میر کے بہ قول ان ہی کی کوششوں کے نتیجے میں ریختہ گوئی جو ایک فن بے اعتبار تصور کی جاتی تھی فن معتبر قرار پائی[۱۲]۔ اُن کے الفاظ میں "ہمہ اوستادان مضبوطِ فنِ ریختہ شاگردانِ آں بزرگ وار اند[۱۳]۔" میر حسن نے بھی معمولی سی لفظی ترمیم کے ساتھ اسی خیال کا اعادہ کیا ہے[۱۳]۔ تذکرہ نگاروں سے قطع نظر ناقدین و مورخین نے بھی اس قسم کی رائیں ظاہر کی ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا محمد حسین آزاد نے ان کے خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے کہ

"خان آرزو کو زبانِ اُردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ و منطق پر ہے۔ جب تک کُل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہلِ اُردو خانِ آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے .... یہ وہی شخص ہیں جن کے دامنِ تربیت میں ایسے شائستہ فرزند تربیت پا کر اُٹھے جو زبانِ اُردو کے اصلاح دینے والے کہلائے اور جس شاعری کی بنیاد جگت اور ذو معنی لفظوں پر تھی اُسے کھینچ کر فارسی کی طرز اور ادائے مطلب پر لے آئے ...... [۱۴]"

آرزو کی اُستادی اور عظمت و وقعت پر اس اجمالی تبصرے کے بعد علامہ آزاد کی زبانی اُن کے سوانح اور کارناموں کا تعارف ملاحظہ فرمائیے۔

"زمانۂ حال کے خوش فکر اور تازہ گو شعرا میں سے ہیں۔ تقریباً پچاس سال سے چمنستانِ سخن اُن کی نواسنجیوں سے معمور ہے ...... مؤلف نے اس کتاب کی تالیف کے زمانے میں ان کے کلام اور حالات کی طلبی کے لیے خط لکھا تھا ...... مشار الیہ نے جواب میں اپنے سوانح اور اشعار ارسال فرما کر مسرور کیا ......

"اُن کا سلسلۂ نسب والد کی جانب سے شیخ کمال الدین خواہر زادۂ نصیر الدین محمود تک اور والدہ کی طرف سے شیخ محمد غوث گوالیاری تک پہنچتا ہے ......

"ولادت سنہ ۱۱۰۱ ہجری کے اواخر میں ہوئی۔ ابتدائے سن شعور سے علوم رسمیہ کی تحصیل کی اور چودہ سال کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ ۲۴ سال کی عمر تک فضلائے عصر کی خدمات میں حاضر رہ کر کتب متداولہ اور مروجہ علوم و فنون میں استعدادِ کامل بہم پہنچائی۔ اس کے بعد منصب داران شاہی میں داخل ہوئے۔

"فرخ سیر کے عہدِ حکومت کی ابتدا میں گوالیار میں کسی خدمت پر مامور ہوئے اور سنہ ۱۱۳۲ھ میں دار الخلافۂ شاہ جہاں آباد واپس آ گئے اور اس وقت سے اب تک اسی شہر میں مقیم ہیں۔ (ان کے یہاں) شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتی ہیں۔ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:—

(۱) موہبتِ عظمیٰ (۲) عطیۂ کبریٰ۔ یہ دونوں رسالے (علی الترتیب) علم معانی اور فنِ بیان کے بارے میں مفتاح اور تلخیص کے نمونے پر فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اس سے پہلے ان موضوعات پر کسی نے اس خوبی کے ساتھ نہیں لکھا۔

(۳) سراج اللغۃ۔ بہ طورِ برہانِ قاطع

(۴) چراغِ ہدایت۔ ان لغات و اصطلاحات کے بیان میں جو شعرائے حال کے یہاں مستعمل ہیں لیکن قدیم کتابوں میں نہیں ملتیں۔

(۵) نوادر الالفاظ۔ یہ کتاب ان ہندوستانی الفاظ پر مشتمل ہے

---

[۱۲] نکات الشعرا [۱۳] تذکرۂ شعرائے اُردو صفحہ ۲۲

[۱۴] آبِ حیات (جدید ایڈیشن) صفحات ۱۲۸، ۱۲۹

جن کے عربی و فارسی مترادفات اہلِ ہند میں غیر معروف ہیں۔

(۶) شرح سکندر نامہ۔

(۷) شرح قصائد عرفی۔

(۸) سراج منیر۔ عرفی وغیرہ کے کلام پر ابوالبرکات منیر کے اعتراضات کا جواب۔

(۹) داد سخن۔ ابوالبرکات منیر کے ایک قصیدے کی شرح جس میں قصیدۂ قدسی سے متعلق شیدا کے اعتراضات پر محاکمہ کیا گیا ہے۔

(۱۰) خیابان۔ گلستانِ سعدی کی شرح۔

(۱۱) تذکرۂ شعرائے متقدمین و متاخرین۔ جس کی تصنیف میں آج کل مصروف ہیں۔

(۱۲) کلیات نثر و نظم۔ جس میں تقریباً تیس ہزار اشعار شامل ہیں۔

سراج اللغات کے اختتام کے بعد آرزو دہلی سے لکھنؤ چلے آئے اور اسحاق خاں کی وساطت سے نواب صفدر جنگ ناظم صوبۂ اودھ تک رسائی حاصل کر کے ان کے عواطف و مراحم سے مستفید ہوئے۔ صفدر جنگ کی وفات کے بعد، ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ کو جب نواب شجاع الدولہ جانشین قرار پائے تو یہ اُن سے وابستہ رہے۔ بالآخر ماہ جمادی الاخریٰ ۱۱۶۹ھ میں لکھنؤ ہی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے[1]۔ مؤلفِ تذکرہ نے مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخ نظم کیا ہے

سراج الدین علی خاں نادرِ عصر
ز مرگِ او سخن را آبرو رفت
اگر جوید کسے سالِ وفاتش
بگو "آں جانِ معنی آرزو رفت" (۱۱۶۹ھ)

آرزو کے ہم عصر شعرا میں میرزا جانِ جاناں مظہر کی شخصیت بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بارھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں جب ایہام گوئی کے خلاف ردِ عمل شروع ہوا تو انھوں نے اس تحریک کے معاونین میں شامل ہو کر اردو شاعری کو ایک نئی توانائی بخشی۔ علاوہ ازیں ہندی الفاظ کے بکثرت استعمال کی اس روایت کے صنم توڑے جو ولی کے زیرِ اثر ریختہ گو شعرا میں کافی مقبولیت حاصل کر چکی تھی اور عریانیت و ابتذال سے کنارہ کشی اختیار کر کے لطافت و پاکیزگی کا علم بردار بنایا۔ لیکن شعرائے اردو کے بیشتر تذکروں میں مظہر کا ذکر ان کے اُن اہم اور ممتاز کارناموں کے باوجود روایتی قسم کے چند جملوں میں محدود نظر آتا ہے۔

اس کے برعکس سرو آزاد کے مصنف نے متناسب شرح و بسط کے ساتھ تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ درجِ ذیل ترجمے سے واضح ہوگا:

"مظہر کے والد ماجد کا نام میرزا جان ہے۔ اسی سے ان کی وجہ تسمیہ ظاہر ہے لیکن یہ نام اور تخلص ترجمان الاسرار مولانائے روم کی عنایت باطنی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے جو کہ اب سے پانچ سو سال قبل مثنوی کے دفترِ ششم میں ارشاد فرما گئے ہیں ......

جانِ اوّل مظہرِ درگاہ شد جانِ جاں خود مظہرِ اللہ شد

"عام طور پر میرزا جانِ جاناں کے نام سے مشہور ہیں ...... مؤلفِ تذکرہ اگرچہ کبھی ملاقاتِ ظاہری سے مشرف نہیں ہوا ہے لیکن غائبانہ عقیدت رکھتا ہے اور مراسلات کی آمد و رفت کے ذریعے ہمیشہ ہم کلامی سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔

"میرزا کی ذات جامع فقر و فضیلت اور کمالِ سخن وری کی آئینہ دار ہے ...... عروسِ شعر و ادب کو ان کے ذہن کی مشاطگی نے ایک نیا روپ بخشا ہے اور تصویرِ خیال ان کی فکر کی شگوفہ کاری سے بے پناہ حُسن کی حامل ہو گئی ہے۔ اُن کی آواز خرمنِ دل کے لیے شعلے کا حکم رکھتی ہے اور اُن کے انداز کی شوخی گرمیِ محفل کا سامان بن جاتی ہے۔

"راقم نے میرزا کو تذکرۂ ہٰذا کے لیے اپنے حالات اور اشعار ارسال فرمانے کی زحمت دی تھی جس کے نتیجے میں مندرجۂ ذیل تفصیلات موصول ہوئی ہیں:

"فقیر جانِ جاں متخلص بہ مظہر پسر میرزا جان جانی تخلص، علوی نسب، ہندی مولد، حنفی مذہب اور نقش بندی مشرب ہے۔ ولادت بارھویں صدی ہجری کے عشرۂ اوّل میں ہوئی۔ ظاہری نشو و نما آگرے میں اور باطنی تربیت دلّی میں حضرت سیّد محمد بدایونی، نقش بندی، مجددی کے سایۂ عاطفت میں پائی۔ سلسلۂ نسب محمد بن حنفیہ کے توسط سے اٹھائیسویں پشت میں شیرِ بیشۂ کبریا حضرت علی مرتضےٰ تک منتہی ہوتا ہے۔

"فقیر کے جدِ اعلیٰ امیر کمال الدین نے نویں صدی ہجری کے اوائل

[1] مولانا محمد حسین آزاد کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "لکھنؤ میں انتقال کیا (لیکن) ہڈیوں کی خاک دلّی میں آ کر زمین کا پیوند ہوئی۔" آب حیات (جدید ایڈیشن) ص ۱۲۹

میں خطۂ عطائف کو خیر باد کہہ کر حدود ترکستان میں سکونت اختیار کی لیکن ہندوستان کے بعض ممالک کی فرماں روائی میں عمر گزاری۔ ان کی اولاد کثیر تعداد میں تھی جن میں سے امیر مجنوں اور امیر بابا عین ہمایوں کی فتح ہندوستان کے وقت اس ملک میں وارد ہوئے۔ اُسی زمانے سے سلاطین مغلیہ کی خدمت و رفاقت اس خاندان کے افراد کا شعار رہی ہے۔

" میرزا جان جو کہ امیر بابا مذکور کی چھٹی پشت میں اور امیر کمال الدین کی بارھویں پشت میں ہیں۔ شہنشاہ عالمگیر علیہ الرحمۃ کے عہد میں ترکِ دُنیا کے منصبِ عالی پر فائز ہوئے۔

" یہ خاکسار بھی ایامِ طفلی ہی سے ہوسِ جاہ و مال سے بیگانہ رہا ہے اور تحصیل ضروریات کے بعد سے اپنی مشتِ خاک کو مردانِ خدا مست کے دامنِ دولت سے وابستہ کر کے اس توقع میں اُن کے آستان پر نقشِ پا کی طرح متمکن ہے کہ شاید یہ آنکھیں کسی دوسرے عالم کے نظارے سے بہرہ ور ہو سکیں۔ دماغ چوں کہ یہ طاقت نہیں رکھتا کہ فراہمی اسباب کے لیے سعی و تدبیر کا متحمل ہو اس لیے رذائل کے خوانِ نعمت سے نذر ربائی کے بجائے شیوہ ترک و تجرید اختیار کیا ہے اور پھول کی طرح تمام عمر ایک ہی خرقے میں گزار دی ہے۔ کبھی کبھی اس شورشِ عشق کی تحریک سے جو اس عاجز کے خمیر میں داخل ہے لبِ فریاد وا کرتا ہے (اور اس طرح) جب کوئی نالہ موزوں ہو جاتا ہے تو احباب اُسے از راہِ جوہر شناسی معیارِ شاعری پر پرکھتے ہیں۔ ورنہ خاکسار اپنی کم مایگی سے اچھی طرح واقف ہے اور اس سے زیادہ نہیں سمجھتا کہ بزرگوں کے فیضانِ نظر سے حُسنِ قبولیت حاصل ہو گیا ہے۔ حق سبحانہٗ تعالےٰ حُسنِ انجام بھی نصیب فرمائے۔"

میرزا کے فیضانِ صحبت و تلمذ سے مستفید شعراء کے صف میں محمد علی تاباںؔ، محمد باقر حزیںؔ، انعام اللہ یقیںؔ اور خواجہ احسن اللہ بیاںؔ کے ساتھ ایک نسبتاً غیر معروف شاعر محمد فقیہ دردمندؔ بھی شامل ہیں۔ اُستاد سے اپنی والہانہ عقیدت مندی کا اظہار اُنھوں نے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے ؎

کوئی آج اس کے برابر نہیں	وہ سب کچھ ہے الّا پیمبر نہیں

معتبر حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ دردمند فارسی کی طرح اُردو میں بھی باقاعدہ طبع آزمائی کرتے تھے۔ تذکروں میں ان کے جو اشعار نقل ہوئے ہیں ان سے سوز و گداز اور دردمندی کی کیفیت نمایاں ہے۔ آزادؔ نے انھیں "فقیہ صاحب" کے نام سے سرورِ آزاد کی محفلِ شعرا میں شریک کرتے ہوئے لکھا ہے:

" او دیگر (ملکِ دکن) کے شرفا اور خوش بیان شعرا میں سے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ پیدائش وطن ہی میں ہوئی لیکن کم عمری ہی میں اپنے والد کے ہم راہ سنہ ۱۱۳۶ھ میں دلّی چلے آئے اور شاہ ولی اللہ نبیرۂ شاہ گل متخلص بہ وحدت سرہندی کے ظلِ عاطفت میں تہذیب اخلاق اور تحصیل حیثیات کے مراحل طے کرنے لگے۔ کچھ دن کے بعد جب اُن کے والد کا انتقال ہو گیا تو میرزا جانِ جاں نے انھیں اپنے سایۂ شفقت میں لے لیا۔ اُن کی عنایتوں کی برکت اور حسنِ تربیت سے درجۂ کمال کو پہنچے اور فنِ شاعری میں رتبۂ شائستہ حاصل کر لیا۔ میرزا نے یہ شعر انھیں کے حق میں کہا ہے ؎

مظہرؔ مباش غافل از احوالِ دردمند	تعلیست ایں کہ در گرو روزگار نیست

" فارسی اور ریختہ دونوں زبانوں میں شعر بہت اچھا کہتے ہیں۔ اُردو میں اُن کا "ساقی نامہ" کافی شہرت و مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ مؤلف ان سے غائبانہ اخلاص رکھتا ہے۔ ہمیشہ باہم خط و کتابت ہوتی رہتی ہے۔ آج کل کسی تقریب سے دلّی کو خیر باد کہہ کر بنگال کی طرف چلے گئے ہیں اور ناظم بنگالہ کے ساتھ مرفہ حالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میر حسن نے عزلت کے نمونۂ کلام کے تحت مذکورہ ساقی نامے کے اکیس اشعار درج کیے ہیں جن میں سے چند شعروں کا یہاں نقل کر دینا بے محل نہ ہوگا ؎

"در اشتیاق"

نپٹ نقش بر آب ہے یہ جہاں	ٹک اک موج میں ہم کہاں تم کہاں
نہ یہ مے نہ یہ باغ رہ جائے گا	نہ ملنے کا اک داغ رہ جائے گا

"حکایت برسبیلِ تمثیل"

لگن میں پڑا ایک پروانہ رات	یہ کہتا تھا اربابِ مجلس کے ساتھ
کہ اس بے پر و بال کی عرض ہے	کہ ابلاغ اس کا تمھیں فرض ہے
مرا شمع سے یہ سندیسا کہو	اُسے خوب سمجھا کے اتنا کہو
یہی تھا لکھا میری قسمت کا جان	قیامت تلک ہجر و وصل ایک آن
جو تجھ کو مرا خوش یہ آیا ہے حال	تو مجھ کو شکایت کی کب ہے مجال
سراپا مرا اگرچہ آتش میں ہے	سعادت مری تیری خواہش میں ہے
وہی کر تو جس میں ترا کام ہو	ولیکن نہ اتنا کہ بدنام ہو
یہ کہہ کر کیا کام اپنا تمام	ہوا زندگانی کا روز اس کی شام

کوئی عشق میں اس ادب سے مرے   خدا تا ابد اُس پہ رحمت کرے[1]

متذکرۂ صدر شعرا کے علاوہ سرو آزاد میں اُردو کے ایک اور قدیم شاعر عبدالولی عزلت کا ذکر بھی ملتا ہے۔ میر نے اُن کے اخلاق و عادات اور کلام کی دل کھول کر تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ

"مشق شعر فارسی ہم کردہ اند لیکن مزاج او شاں میلان ریختہ بسیار دارد۔"[2]

نکات الشعرا کے نصف آخر میں جا بجا اُن کی بیاضِ انتخاب اوّل اور بیانات کے حوالے ملتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب میں اُنھوں نے میر کی کافی مدد کی۔ اتفاق سے اس تذکرے کا وہ نسخہ بھی ۱۱۸۷ھ میں انھیں کی فرمائش پر لکھا گیا تھا جو انجمن ترقی اُردو کی جانب سے مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ شایع ہوا ہے۔

بلگرامی نے سرو آزاد میں ان کے مندرجہ ذیل مختصر مگر اہم حالات تحریر کیے ہیں :

"سید سعد اللہ سلونی سورتی کے فرزند ہیں ... ... کتب درسیہ اپنے والد سے پڑھی ہیں اور معقولات میں اچھی استعداد بہم پہنچائی ہے۔ حج بیت اللہ سے واپسی کے وقت سورت میں ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا تھا۔ نہایت خوش مزاج آدمی ہیں اور ہندستانی موسیقی سے بہ خوبی واقفیت رکھتے ہیں۔

" دارالسلطنت کی سیر و سیاحت کا شوق دامن گیر ہوا تو سورت سے روانہ ہو کر طویل منزلیں طے کرتے ہوئے ۳۰ رجادی الاولیٰ سنہ ۱۱۶۴ ہجری کو اس بلدۂ فاخرہ میں داخل ہوئے اور تا دم تحریر وہیں مقیم ہیں۔"

اس عبارت کا آخری جملہ جس سے عزلت کے دہلی میں ورود کی تاریخ معلوم ہوتی ہے نکات الشعرا کے زمانۂ تالیف کے متعلق مخلص کے سن وفات اور تذکرۂ گردیزی کے سال تصنیف سے ہٹ کر ایک اور شہادت کی فراہمی میں مدد دیتا ہے۔ اس تاریخ کا علم ہو جانے کے بعد میر کا شاعر مذکور کو "تازہ وارد ہندستان کہ عبارت از شاہ جہاں آباد است" لکھنا اس حقیقت کا غماز ہے کہ یہ سنہ ۱۱۶۴ ہجری کے اواخر یا اوائل سنہ ۱۱۶۵ ہجری کی تحریر ہے۔

یہ اور اسی قسم کی کچھ اور مفید اور کار آمد باتیں ہیں جو سرو آزاد کے مطالعے اور خصوصاً تواریخ و سنین کے التزام کی بہ دولت ہمارے علم میں آتی ہیں، نیز جن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سخن وران فارسی کے اس تذکرے کا مصنف جو میر، گردیزی اور قائم کا ہم عصر ہے اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہمارے ان مشہور تذکرہ نگاروں سے کہیں زیادہ کامیاب رہا ہے۔

---

[1] تذکرۂ شعرائے اردو صفحات ۱۵ و ۹۶   [2] نکات الشعرا صفحہ ۹۲

اُردو میں بچّوں کا ادب

حقیقت یہ ہے کہ نثر میں ہمارے یہاں بچوں کے لیے صرف پند و نصائح کا تھوڑا بہت ذخیرہ ہے چاہے وہ مقالوں کی صورت میں ہو یا کہانیوں کی صورت میں، یا پھر کچھ معلوماتی مضامین ہیں جو زیادہ تر انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ بچّوں کے ادب میں اس قسم کے مضامین بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں بہ شرطیکہ اسلوب بیان دلکش اور آسان ہو اور موضوع سخن اس طرح پیش کیا گیا ہو کہ بچّوں کی دلچسپی قائم رہ سکے۔ یہ خصوصیت مشکل سے پانچ فی صدی مضامین کے اندر پائی جاتی ہے۔

آج کل بچّوں کے متعدد رسالے ہند و پاکستان میں نکل رہے ہیں اور چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی مختلف اداروں نے بچّوں کے لیے شائع کی ہیں۔ ان میں کچھ تو بچوں کے اب سے پہلے والے ادب کا اثر ہے جیسا کہ ہونا چاہیئے اور کچھ انگریزی زبان کے بچوں کے ادب کی بے سوچے سمجھے نقالی

(بسلسلہ صفحہ ٦)

ہے۔ بعض بعض مضامین میں بچّوں کی خصوصیات اور ان کے جذبات پر نظر رکھ کر ان کے لیے صحیح قسم کا ادب پیدا کرنے کا رجحان بھی نظر آتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو میں بچوں کے ادب کی طرف آج کل بہ نسبت پہلے کے توجہ زیادہ ہے پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ترقی کر رہا ہے۔ جب تک ہمارے یہاں ایسے نقّاد پیدا نہ ہوں گے جو بچوں کے ادب کو بھی قابلِ توجہ سمجھیں اور اُس کے محاسن و معائب کو اُجاگر کریں اُس وقت تک اس ادب کا ترقی کرنا مشکل ہے۔ تنقید ادبی تخلیق کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کسی انسان کی زندگی کے لیے ہوا ضروری ہے یا ایک باغ کے پھلنے پھولنے کے لیے اس کے درختوں کی شاخوں کا تراشنا اور تھالوں کا بنانا اور درختوں کے آس پاس کی زمین کو گھاس پھوس اور کوڑا کرکٹ سے صاف رکھنا ضروری ہے۔

غزل

محمود سعیدی

حرف بہ حرف جیسے ہو میرے ہی دل کی ترجماں
تیری نظر نے چھیڑ دی آج یہ کیسی داستاں

دل میں یہ کس کے دھیان کی لہر اُٹھی ہے ناگہاں
جیسے فضائے یاد میں تیر گئی ہوں بجلیاں

کھو گئی گردِ راہ میں وادیٔ ماہ و کہکشاں
قافلۂ جنوں رُکے دیکھیے جاکے اب کہاں

کوئی مقامِ عافیت شوق کی راہ میں نہیں
قُرب ترا حریفِ دل، بُعد ترا بلائے جاں

دل کو تھی کس قدر عزیز دولتِ درد کیا کہیں
لوٹ کے لے گئی مگر ایک نگاہِ مہرباں

حُسن ہی حُسن ہر طرف، جلوے ہی جلوے چار سمت
آج قدم قدم پہ ہے اہلِ نظر کا امتحاں

چشمِ طلب کی وسعتیں جلوہ طراز کیا ہوئیں
وہ بھی رہے نہ سامنے، میں بھی رہا نہ درمیاں

ملتا نہیں کہیں کوئی نقشِ قدم سرِ چمن
کتنا سُبک خرام تھا نکہتِ گُل کا کارواں

اُن کی ادائے لُطف نے چھین لیا یقینِ غم
اپنی طرف سے خود ہی ہم ہو گئے آج بدگماں

بے خودیٔ مستیٔ بہار! دیکھ تو آنکھیں کھول کے
ساغرِ گُل ہے خوں چکاں، سایۂ گُل شرر فشاں

ایسے بھی کتنے لوگ آہ زیرِ زمیں نہاں ہوئے
ڈھونڈ رہی ہے آج تک جن کو نگاہِ آسماں

ہم سرِ رہ رواں نہیں، شاملِ کارواں نہیں
ہم پسِ کارواں تو ہیں مثلِ غبارِ کارواں

غزل

وقار خلیل

رات، ہجر، بے چینی اور کربِ جاں یارو
آج سب اُجالے ہیں، ہم پہ مہرباں یارو

بام و دَر سے آتی ہے جسمِ یار کی خوش بو
کون آگیا دیکھو اپنے درمیاں یارو

کوئی چاند چمکاؤ، کوئی پھول مہکاؤ
کس قدر فسردہ ہے بزمِ مہوشاں یارو

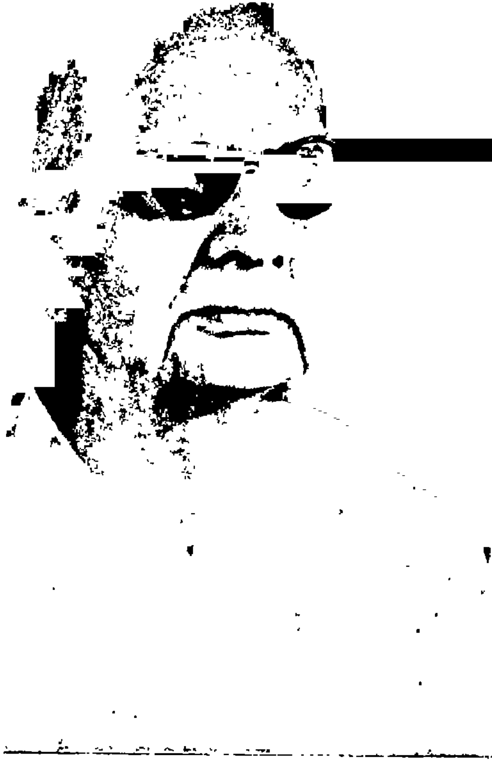
آنسوؤں کی تحریریں زخمِ دل کی مظہر ہیں
جھانکتے ہیں پلکوں سے خوابِ کہکشاں یارو

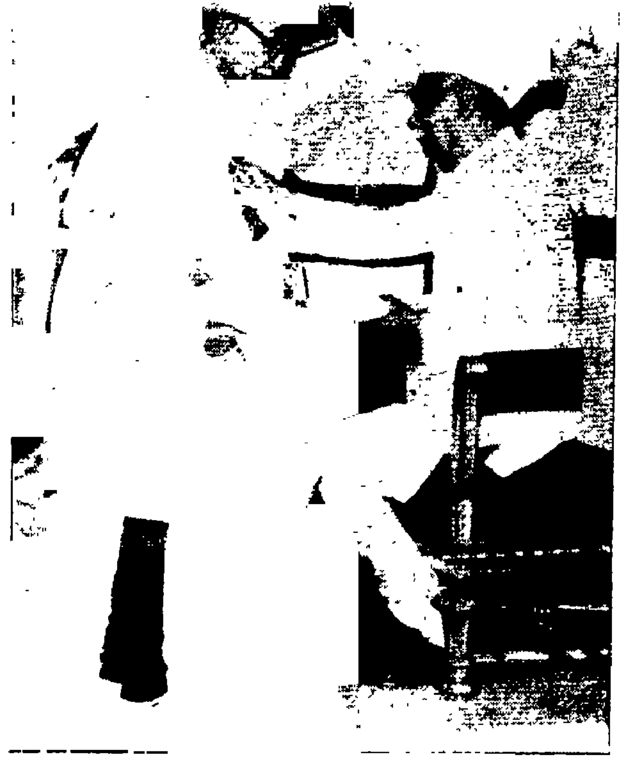
آج غم کے افسانے ہم سے پوچھتے کیا ہو
انگلیاں فگار اپنی، دل ہیں خوں چکاں یارو

رات کو دکھایا تھا صبحِ نَو کا آئینہ
بے سبب ہوئی دُنیا ہم سے بدگماں یارو

کہکشاں کے ماتھے پر اک لکیر اُبھری تھی!
رات کے دھندلکوں میں صبح تھی جواں یارو

کتنے زخم کھائے ہیں یہ وقار سے پوچھو
زندگی کی راہوں میں زندگی کہاں یارو



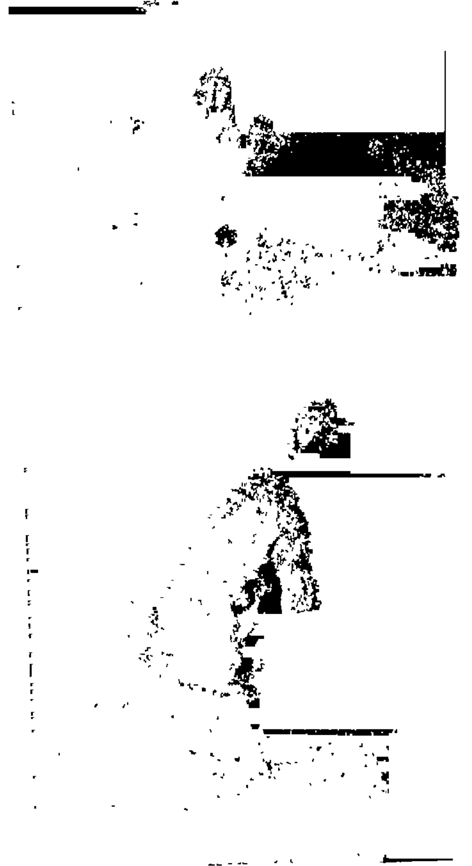


اُردو کے دو ممتاز ادیبوں شری نیاز فتح پوری اور شری جعفر علی خاں اثر لکھنوی کو اُن کے نمایاں ادبی خدمات پر یوم جمہوریہ ۱۹۶۲ء کے موقعے پر حکومت ہند نے پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا تھا۔ اوپر (داہنی طرف) ڈاکٹر راجندر پرشاد جو اُس وقت صدر جمہوریہ تھے مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے تمغہ آویزاں کرتے ہیں۔ (بائیں طرف) شری نیاز فتح پوری۔

اُردو کے کہنہ مشق شاعر پنڈت میلارام وفا کے اعزاز میں لکھنؤ میں "جشن وفا" کی ایک تقریب منائی گئی جس میں اُنھیں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ تصویر میں پنڈت میلارام وفا سپاس نامے کا جواب دے رہے ہیں۔





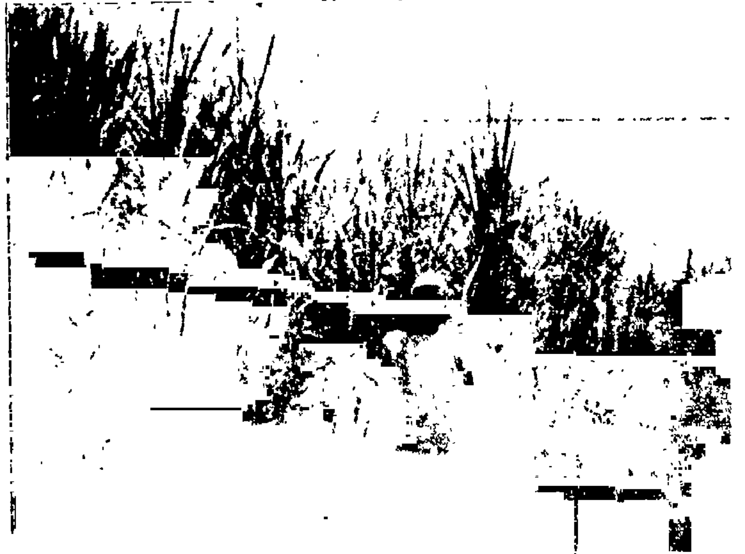


اترپردیش میں

اترپردیش میں کچھ عرصے سے قیدیوں کو کھلی جیل
تجربہ کیا جارہا ہے۔ ان قیدیوں کو ان کی محنت
اُن کی تفریح کے بھی انتظامات کیے جاتے ہیں
کھلی جیل ہے۔ ان صفحات پر جو تصویریں
جو مختلف کام کرتے رہتے ہیں۔

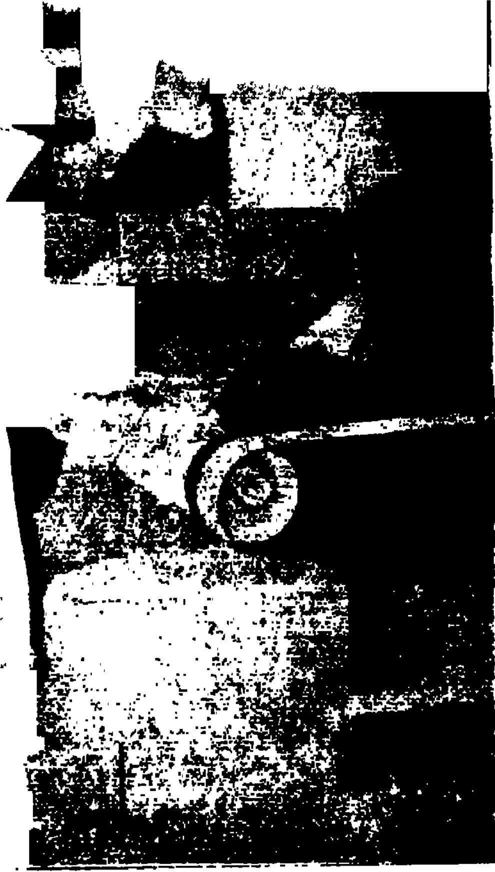
رائی ہو رہی ہے

گنے کی فصل کی حفاظت کی جارہی ہے



ایک پل جسے قیدیوں





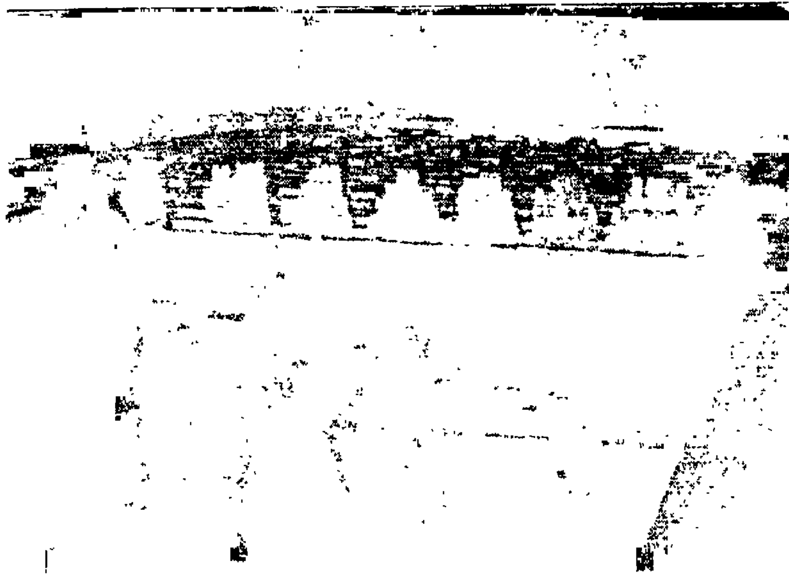


...ا زی

...جیلوں کا تجربہ

...کھنے اور اُن سے منفعت بخش کام لینے کا
...ے صلے میں معاوضہ بھی دیا جاتا ہے اور
...ا، گنج ضلع نینی تال میں بھی اسی قسم کی ایک
...ی ہیں وہ اس جیل کے "قیدیوں" کی ہے

کیمپ کی آمد چکی



اینٹوں کے بھٹے میں کام ہو رہا ہے

...ے تیار کیا ہے



بتھوڑا گڑھ کے چھولیا رقاص جنھوں نے شری
بشوناتھ داس، گورنر اُتر پردیش کا اُن کے دورۂ
بتھوڑا گڑھ کے موقعے پر اپنا رقص پیش کر کے اُن
کا استقبال کیا۔ "چھولیا" ناچ ایک قسم کا جنگی
ناچ ہے جس میں تلوار اور ڈھال ہاتھوں میں
لے کر رقص کیا جاتا ہے۔



تبتی پناہ گزیں، سان دیو کیمپ میں، گورنر
اتر پردیش کے ساتھ



تبتی پناہ گزیں گورنر اُتر پردیش کے اعزاز میں
رقص کر رہے ہیں



البرٹ آئنسٹائن

بدیع الزماں اعظمی

آئنسٹائن کھانے کی میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا: "البرٹ آج بھی لیٹ ہے!" اور پھر اپنی بیوی پالین سے دریافت کیا: "وہ کھانے کے لئے ابھی تک کیوں نہیں آیا؟"

مسز آئنسٹائن، البرٹ کو پکارنے کے لئے باہر گئیں اور چند سکنڈ بعد کالے بالوں اور بھوری آنکھوں والا ایک چھوٹا لڑکا دروازے کے سامنے ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

"البرٹ، باپ نے کہا: "تم پھر لیٹ ہو گئے؟"

"پاپا! مجھے افسوس ہے میں باغ کے اس سرے پر تھا اور گانے میں ایسا محو تھا کہ مجھے کھانے کے وقت کا خیال بھی نہ رہا۔"

البرٹ کے باپ نے اپنی جیب سے سنہری گھڑی نکالتے ہوئے کہا "آؤ ذرا دیکھو تو کتنی دیر ہو گئی ہے۔"

البرٹ نے جب گھڑی کی طرف دیکھا تو اسے وقت کے جاننے میں دلچسپی نہ رہ گئی البتہ گھڑی کی زنجیر سے لٹکتی ہوئی ایک شے اس کے لئے مرکز جذب و کشش بن گئی۔ اس نے یکایک پوچھا "پاپا! آپ کی گھڑی کی زنجیر سے وہ کون سی چیز لٹک رہی ہے؟"

"قطب نما" آئنسٹائن نے کہا: "اگرچہ یہ بہت چھوٹا ہے مگر بڑے کام کا ہے۔ یہ اسی انداز میں کام کرتا ہے جس انداز میں بڑے بڑے قطب نما جہازوں کی رہبری کرتے ہیں۔"

"لیکن ان چار چھوٹے حرفوں کا کیا مطلب ہے؟" البرٹ نے پھر سوال کیا۔

"شمال، جنوب، مشرق اور مغرب۔ درمیانی کالی سوئی ہمیشہ شمال ہی کی سمت رہتی ہے جس کی وجہ سے صحیح سمتوں کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ اگر کسی جنگل میں اپنا راستہ کھو بیٹھو تو اس وقت قطب نما ہی تم کو سمتوں کا پتہ دے کر تمہاری رہبری کر سکتا ہے۔" اس کے باپ نے بتایا۔

"کیا سوئی ہمیشہ اور ہر حال میں شمال ہی کی سمت رہتی ہے؟" البرٹ نے پوچھا۔

"ہاں ہمیشہ"

"کیوں! ایسا کیوں ہوتا ہے"؟

"کیوں کہ سوئی مقناطیس کی بنی ہوتی ہے۔"

کھانے کے دوران میں اور بستر پر جانے سے پہلے البرٹ نے معلوم نہیں کتنے تحقیقی سوالات کر ڈالے۔ وہ قطب نما کی معجز نمائی سے اتنا مسحور ہوا کہ اسے اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہی سو گیا۔ اس کی ادنیٰ متحرک سوئی نے البرٹ کے دماغ میں ایسی قوت سربستہ کی سراغرسانی کا جادو جگا دیا تھا جو سوئی کو ٹھیک شمال کی سمت کر دیتی ہے۔

البرٹ آئنسٹائن جرمنی کے شہر اُلم میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس کی پیدائش کے کچھ ہی عرصے بعد اس کے والدین ایک اور شہر میونک چلے گئے۔ البرٹ نے اپنا لڑکپن وہیں گزارا۔ وہ فطرتاً شرمیلا اور تنہائی پسند تھا البتہ پہروں اپنی ماں کو پیانو بجاتے ضرور سنا کرتا۔ وہ اسکول

میں دوست پیدا کرنے کی خواہش تو ضرور کرتا مگر دوسرے لڑکے اس کی خاموش طبیعت کو دیکھ کر الگ ہی رہتے۔ اس کے ساتھی جب کھیل کے میدان میں مختلف کھیلوں میں مشغول ہوتے تو البرٹ سب سے الگ تھلگ کھڑا ہو کر کسی خیال میں گم رہتا۔ تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ اس کے نزدیک پیانو پر گانے کے لئے گیت نظم کرنا تھا۔ اسکول کے اساتذہ بھی اسے اسکول کے لائق نہ سمجھتے تھے کیوں کہ جن جن اسکولوں میں البرٹ کا داخلہ کرایا گیا وہ ملیٹری اکاڈمی کے انداز کے اسکول تھے۔ سبق کے دوران میں البرٹ کی متجسس طبیعت سوالات کرنے پر اسے مجبور کرتی مگر ان اسکولوں میں کیوں اور کیسے پر طالبعلم استاد کی قہر آلود نگاہوں کا نشانہ بن جاتا تھا۔ ہر طالبعلم کو اپنی کتاب سے سبق حفظ کرنا پڑتا تھا اور اسے لفظ بہ لفظ سنانا پڑتا تھا چاہے وہ اسے سمجھے یا نہ سمجھے۔ لیکن البرٹ کو اس پر تشفی نہ ہوتی۔

ایک دن البرٹ کے کانوں نے لفظ "الجبرا" سنا۔ البرٹ کے لئے یہ عجیب و غریب لفظ تھا۔ اس لئے اس نے اپنے چچا سے جو انجینیر تھے اس لفظ کا مطلب دریافت کیا۔ انھوں نے بتایا کہ الجبرا ذہین انسانوں کی ریاضی کا نام ہے۔ اگر تمھیں کسی چیز کا علم نہ ہو تو اسے "ایکس" x مان لو اور اس طرح عمل کرو گویا تم اس کو جانتے ہو۔ اتنا اشارہ البرٹ کے لئے کافی تھا۔ زیادہ وقت نہیں لگا کہ اس نے الجبرا کی ایک کتاب کے کل سوالات اپنے آپ حل کر ڈالے۔ جس کے ہم جماعت ابھی ابتدائی ریاضی کے سوالات میں الجھے ہوئے تھے مگر البرٹ اعلیٰ ریاضی کا مطالعہ کر رہا تھا۔

جب البرٹ ۱۵ سال کا ہوا اسے اپنے والدین کے ساتھ اٹلی جانا پڑا۔ بعد میں اس کے والدین نے تکمیل تعلیم کے لئے اسے سوئزرلینڈ بھیج دیا۔ وہاں پہنچکر اس نے محسوس کیا کہ جرمنی کی طرح سوئزرلینڈ کے اساتذہ ڈرل ماسٹر نہ تھے بلکہ طلبا اور طالبات کو سوچنے اور سمجھنے میں مدد کرتے تھے۔ اس ہمت افزائی کی وجہ سے البرٹ نے ریاضی اور طبیعیات میں تعجب خیز ذہانت کا ثبوت دیا۔ گریجویٹ ہونے کے بعد البرٹ آئنسٹائن کو کئی جگہوں پر تھوڑے تھوڑے عرصے کے لئے معلمی کا کام ملا۔ اسی دوران میں یوگوسلاویہ کی رہنے والی سائنس کی ایک طالبہ میلوا ماریک سے شادی کرلی اور دو بچے بھی ہوئے۔ اس زمانے میں البرٹ آئنسٹائن کے دن عسرت سے بسر ہو رہے تھے۔ وہ سوئزرلینڈ کے شہر برن کے ایک دفتر میں عارضی طور پر بحیثیت ایک کلرک کام کر رہا تھا۔ یہ سنہ ۱۹۰۵ء کی بات ہے جب اس کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔ وہ برن کی سڑکوں سے ایک چھوٹی گاڑی کو ٹھیلتا ہوا ہر سہ پہر کو دکھائی دیتا تھا۔ لوگ دیکھتے تھے کہ متین چہرے والا یہ نوجوان سڑک کی بھیڑ بھاڑ سے بے نیاز ہو کر اکثر گاڑی کو روک کر ایک نوٹ بک میں کچھ ریاضی کے نوٹ تحریر کرتا اور نوٹ بک کو گاڑی میں رکھ کر پھر آگے بڑھتا۔ البرٹ آئنسٹائن کے ان گھسیٹ کر لکھے ہوئے نوٹوں میں وہ آئینے تھے جو کائنات کے رموز سربستہ کی عقدہ کشائی کرنے میں آگے چل کر اس کے معاون ثابت ہوئے۔

آخر کار البرٹ آئنسٹائن نے ۲۶ سال کی عمر میں علم طبیعیات کے ایک مشہور رسالے کے لئے ایک مقالہ "اضافیت" (Relativity) پر لکھا اور اپنے نظریہ اضافیت (Theory of Relativity) میں اس امر کی تحقیق کی کہ اگر کسی مادہ کی محض نصف پونڈ کی مقدار کو ایٹمی قوت میں تبدیل کیا جائے تو اس کی قوت اتنی ہی ہوگی جتنی کہ TNT کے پچاس لاکھ ٹن کے بم کے دھماکے کی۔ اس نے اس تحقیق کو سائنس کے ایک مشہور فارمولے ($E=mc^2$) کی شکل میں پیش کیا ہے[1]۔

آئنسٹائن نے یہ نظریہ سنہ ۱۹۰۵ء میں پیش کیا تھا۔ یہ آئنسٹائن کا نظریۂ خصوصی (Special Theory) کہلاتا ہے۔ اس کے بعد اس نے اسی سلسلے میں دو اور نظریے پیش کئے۔ دوسرا نظریہ "نظریۂ عمومی" (General Theory) کہا جاتا ہے۔ اسے سنہ ۱۹۱۶ء میں پیش کیا گیا تھا۔ تیسرا نظریہ "متحدہ نظریہ" (Unified Field Theory) کہا جاتا ہے جسے آئنسٹائن نے سنہ ۱۹۵۰ء میں پیش کیا۔

مختصر لفظوں اور عام فہم انداز میں ان نظریات کی تھوڑی بہت تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے۔

پہلا نظریہ اس حالت کے لئے ہے جب دو چیزوں کی رفتار ایک دوسرے کی نسبت ایک ہی رہے۔ یا جب دو چیزیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں کوئی حرکت نہ کر رہی ہوں۔ اس نظریے کی بنیاد دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ ہم ایتھر (Ether) کو کسی مادی ذریعے سے شناخت نہیں کر سکتے۔ دوسرے یہ کہ روشنی کی رفتار ہر سمت اور ہر مشاہد کے لئے ایک ہی ہے۔ اسے واضح طور پر یوں سمجھئے کہ اگر آپ اور آپ کا کوئی

[1] فارمولے کا مطلب ہے :- توانائی = مقدار مادہ × (اوسط رفتار)۲

دوست میں میل فی گھنٹہ چلتی ہوئی ٹرین میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں تو نہ آپ کا دوست آپ کو حرکت کرتا ہوا نظر آئے گا اور نہ آپ دونوں کے درمیان کا فاصلہ بدلے گا۔ کیونکہ آپ دونوں ایک ہی رفتار سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ لیکن اس آدمی کو جو ٹرین کے باہر زمین پر کھڑا ہو آپ کا دوست میں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے بڑھتا ہوا نظر آئے گا۔ ان معنوں کے یہ معنی ہوئے کہ آپ کا دوست آپ کی نسبت سے تو ساکن ہے لیکن اس آدمی کی نسبت سے حرکت کر رہا ہے۔

دوسرا نظریہ ان چیزوں سے متعلق ہے جن کی رفتار ایک دوسرے کی نسبت مختلف ہے۔ یہ اصول (Principle of Equivalence) کے نظریے پر مبنی ہے۔

تیسرے نظریے کے پس پشت بھی کچھ اصول کارفرما تھے۔ نیوٹن کے نظریہ کے مطابق دو بڑے وزن (Masses) ایک دوسرے کو (Repel) کرتے ہیں یا دھکیلتے ہیں۔ ایک چیز یہ بھی ہے کہ اگر ایک ذرے میں "پازیٹو" (Positive) یعنی مثبت یا گرم بجلی اور دوسری میں "نگیٹو" (Negative) یعنی منفی یا ٹھنڈی بجلی ہو تو دونوں ایک دوسرے کو اپنے قریب کھینچیں گے۔ اور اگر دونوں ذروں میں ایک ہی طرح کی بجلی ہے تو دونوں ایک دوسرے کو دھکیلیں گے۔ آئنسٹائن اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کا نظریۂ اضافیت دور دراز کے فاصلے کے لئے ٹھیک تھا۔ ایک اور نظریہ (Quantum Mechanics) کم فاصلوں کے لئے ٹھیک تھا آئنسٹائن کا خیال تھا کہ فطرت میں ایک اتحاد ہے اس لئے کوئی نظریہ ایسا ضرور ہوگا جو کم اور زیادہ دونوں فاصلوں پر صادق آتا ہو۔ چنانچہ اس نظریہ پر اس نے ۲۵ برس تک کام کیا اور ۱۹۵۰ء میں ایک متحدہ نظریہ Unified Theory of Gravitation and Electro-Magnetism پیش کیا۔ اس نظریے کی تشریح کے لئے اس نے چار فارمولے بھی پیش کئے مگر خود آئنسٹائن ان فارمولوں کی اچھی طرح تشریح نہیں کر سکا۔ بعض دوسرے سائنسداں بھی ناکامیاب ثابت ہوئے۔ لیکن کچھ سائنسدانوں نے ان کی تشریحات کی ہیں جن سے یہ نظریہ بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

جب آئنسٹائن نے اپنا پہلا نظریہ پیش کیا تو اس عہد کے بعض سائنسدانوں نے اس کے سلسلے میں تجربات کئے اور اس کے نظریے کی تصدیق کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئنسٹائن کو یکایک عالم گیر شہرت حاصل ہو گئی اور اسے پہلے سوئزرلینڈ کے شہر زورک (Zurich) اور بعد میں چیکوسلاواکیہ کی راجدھانی پراگ (Prague) کی یونیورسٹی میں پروفیسرشپ کی پیش کش کی گئی۔ پھر ۱۹۱۳ء میں اس کے لئے برلن میں خاص طور سے ایک نئی جگہ پیدا کی گئی اور اس کی تقرری بحیثیت ڈائرکٹر آف قیصر ولیم فزیکل انسٹی ٹیوٹ ہوئی جو جرمنی کا سب سے بڑا سائنسی ادارہ تھا۔ اس کی خدمات کے صلے میں کئی سال بعد ۱۹۲۱ء میں اسے علم طبیعیات میں نوبل پرائز بھی ملا۔

جب ہٹلر نے ۱۹۳۳ء میں جرمنی کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے لوگوں سے تحریر و تقریر کی آزادی سلب کی۔ اس کی حکومت نے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کو مجبور کیا کہ وہاں انھیں خیالات کی ترویج کی جائے جنھیں برسر اقتدار جماعت یعنی نازی پارٹی پسند کرتی ہے۔ اس طرح اس نے پورے ملک کو ایک بڑے قید خانے کی حیثیت دے دی جہاں ہر شخص پر پولیس کی کڑی نگرانی رہنے لگی۔ وہ لوگ جو ہٹلر کے طرز عمل سے ذرا بھی بد دلی کا اظہار کرتے تھے انھیں یا تو جیلوں میں بند کر دیا جاتا تھا یا مرکزی کیمپوں میں نظر بند۔ یہودیوں پر تو خاص طور پر بڑی سختیاں ہونے لگیں کیونکہ ہٹلر کے نزدیک یہودی جرمنی کے دشمن تھے۔ البرٹ آئنسٹائن اتفاق سے یہودی النسل تھا۔ جب یہودیوں پر نازی جرمنی میں سختیاں شروع ہوئیں تو وہ ایک تقریری مباحث پر امریکہ میں تھا۔ اس نے نازی حکومت کی پالیسی کی بڑی سخت مذمت کی۔ نازی حکومت اس پر اور مشتعل ہو گئی اور نازیوں کی نگاہ میں آئنسٹائن کی ذات قابل نفرت اور ملامت قرار پائی۔ جرمنی میں اس کے مکان کا قفل توڑا گیا۔ روٹی کاٹنے والی ایک چھری برآمد کر کے اس پر خطرناک اسلحے چھپانے کا الزام لگا کر آئنسٹائن کو حکومت کا دشمن قرار دیا گیا۔ نازیوں نے اس شخص کو ساڑھے چار ہزار پونڈ کا انعام دینے کا بھی اعلان کیا جو آئنسٹائن کے سر کو قلم کر کے اُسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دے۔ آئنسٹائن اس اعلان کو سنکر مسکرایا اور کہا مجھے اس کی مطلق خبر نہ تھی کہ میرے سر کی اتنی بڑی قیمت ہے۔ بہر حال، البرٹ آئنسٹائن نے اس صورت حال کی وجہ سے امریکہ میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا اور ۱۹۴۰ء میں وہ امریکی شہری بھی تسلیم کر لیا گیا۔

آئنسٹائن نے جب اپنا نظریۂ اضافیت پیش کیا تھا تو اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ اس کا فارمولا ایٹم بم بنانے کے کام میں لایا جائے گا۔ گر دوسری جنگ عظیم کے زمانے ہی میں امریکی سائنس دانوں کو اس بات کا علم ہوا کہ نازی اس فارمولے کی مدد سے ایک ایسا بم بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں جو شہر کا شہر تباہ کر دے۔ اس پر انھیں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ وہ خود اس قسم کا بم بنانے میں نازیوں سے سبقت لے جائیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ امریکی حکومت کو ایسے سائنسی دار العمل بنانے میں مہینوں کی مدت درکار ہوگی۔ اس لئے انھوں نے البرٹ آئنسٹائن سے اپیل کی کہ وہ صدر امریکہ روزویلٹ کے نام ایک خط لکھیں اور یہ مشورہ دیں کہ ایٹمی بم بنانے کے لئے ایک خفیہ پروجیکٹ قائم کیا جائے۔ آئنسٹائن نے اپنی شرافت نفسی کی بنا پر ایسا خط لکھنے میں تامل کیا۔ وہ جنگ اور جنگ سے متعلق ہر شے سے نفرت کرتا تھا۔ اس لئے اس کی ذات سے یہ ناممکن تھا کہ وہ ایسے تباہ کن آلے کی ایجاد کے لئے سفارش کرتا۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر جرمنی کو وقت مل گیا تو وہ ایٹمی بم بنانے میں کامیاب ہو جائے گا اور نازی اس کے استعمال سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ اس لئے آئنسٹائن اپنی میز پر بیٹھ گیا اور امریکی تاریخ کے اہم خطوط میں سے ایک تاریخی خط لکھنے لگا۔ اس سفارشی خط کے نتیجے میں تھوڑے ہی عرصے کے اندر امریکی سائنسدانوں کی ایک ٹولی بہت ہی خفیہ طریق پر ایٹم بم بنانے میں لگ گئی۔ امریکی سائنسدانوں کو اپنی تحقیقات میں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن ایٹم بم کی پہلی آزمائش کے قبل ہی ہٹلر کو شکست ہو گئی۔ البتہ جاپان نے اس کے بعد بھی جنگ جاری رکھی۔ آئنسٹائن ان لوگوں میں تھا جو یہ چاہتے تھے کہ جاپان کو ایٹمی بم کی تباہ کاریوں سے مطلع کر دیا جائے۔ لیکن جنگی مصلحتوں کی بنا پر ہیروشیما پر ایک ایٹم بم گرایا گیا، اور جاپان بھی ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گیا۔

ایٹمی قوت کا استعمال اب مفید کاموں کے لئے بھی شروع ہو چکا ہے۔ میڈیکل سائنس میں اس کی مدد سے ان بیماریوں کا علاج بھی ہونے لگا ہے جو اب تک ناقابل علاج تصور کی جاتی تھیں۔ سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ کوئلے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں چھپی ہوئی ایٹمی قوت کو جب بروئے کار لایا جائے گا تو اس قوت سے ایک ریل گاڑی پوری دنیا کا چکر کر سکے گی۔ ان لوگوں کی یہ بھی پیشین گوئی ہے کہ ایٹمی قوت کی مدد سے ریگستانوں کو زرخیز میدانوں اور باغوں میں تبدیل کر کے دنیا سے فاقہ مستی اور غریبی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

البرٹ آئنسٹائن کی تحقیقات اور جستجو کا مقصد بھی یہی تھا۔

البرٹ آئنسٹائن نے ایک بڑی ہستی ہو کر بھی اپنے کو کبھی بڑا نہیں سمجھا۔ پرنسٹن (امریکہ) جیسے بڑے شہر میں رہتے ہوئے بھی اسے اپنے بڑھے ہوئے بالوں اور پھٹے ہوئے پرانے کپڑوں کا احساس تک بھی نہ ہوتا تھا اور نہ شہر والے اس کی اس ہیئت کذائی پر اس کا تمسخر کرتے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا عزت و احترام سے اس کا خیر مقدم کیا جاتا۔ بالخصوص بچے اس سے بہت مانوس رہتے تھے۔

آئنسٹائن پرنسٹن انسٹی ٹیوٹ سے ۱۹۴۵ء میں ریٹائر ہو گیا۔ لیکن نجی طور پر اپنا کام کرتا رہا اور اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اس نے ان نظریات کی کھوج کی جو بجلی، ثقل اور مقناطیسی قوت پر یکساں طور سے نافذ ہو سکیں اور جو ان تینوں طبعی قوتوں کے درمیان تعلق بتا سکیں۔ البرٹ آئنسٹائن کا اپریل ۱۹۵۵ء میں انتقال ہو گیا۔

حضرتِ گیسو دراز کا شکار نامہ

(بسلسلہ صفحہ ۱۳)

جن میں سے تین خدا رسیدگی کی راہ میں ناکارہ ہیں۔ چوتھا طریقہ ذکر روحی ہے جو تمام اذکار کا ست ہے۔ اس میں حرف و صوت کو دخل نہیں۔ محرابِ محراب سعادت ازلی ہے، جس میں عشق حقیقی کی ہنڈیا دھری تھی۔ عشق کے حصول میں سنگِ گرانِ خودی کو جو حائل تھا ہٹا دیا گیا۔ چار گز زمین کھودنے کا استعارہ چار تو باؤں سے ہے۔ ایک توبۃ النصوح، دوسرا صدق و اخلاص، تیسرا عجز و انکسار اور چوتھا نیستی و فنا۔ اس کے بعد ہی طالب یزداں کی رسائی منزل عشق تک ممکن ہے۔ منزل عشق تک پہنچنے سے پہلے نفسانی خطرات کے تقاضے طالب کے پائے ثبات کو ڈگمگا دیتے ہیں۔ لیکن جن کے سینوں میں عشق حقیقی کی آگ روشن ہے وہ اس راہ سے بھی آسانی سے گزر جاتے ہیں اور نفس پرور دی اور دنیوی علایق سے اپنا دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔

مولانا آزاد کا ایک غیر مطبوعہ خط

عابد رضا بیدار

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کے بعد ان کے متعدد غیر مطبوعہ خطوط شائع ہوچکے ہیں۔ ذیل کا خط بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ خط بہت اہم ہے بلکہ ایک لحاظ سے مولانا کے جو دوچار اہم ترین خط ہو سکتے ہیں ان میں سے ہے۔ اس خط میں کئی جگہ مولانا کی مخصوص طرز انشا کے بڑے دل کش نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ شہاب ثاقب کی بحث کے دوران میں جو نکات جس لطیف پیرائے میں بیان کیے ہیں یہ حصہ مولانا کی اہم ترین تحریروں میں سمجھا جانا چاہیے۔ مولانا کے بقول "مختصر لفظوں میں جو کچھ کہہ دیا گیا ہے، اگر آپ غور کریں گے تو نصف قرآن کی تفسیر ہے"۔ یہ خط ۱۹۲۰ء کا لکھا ہوا ہے اور اس لحاظ سے مولانا آزاد کے قدیم ترین خطوں میں بھی ہے۔

یہ خط میرے محترم استاد جناب مولوی ضیاء اللہ خاں صاحب رامپوری کے نام ہے۔ اور ان کے پاس محفوظ ہے۔ مولوی ضیاء اللہ خاں صاحب رام پور صولت پبلک لائبریری کے صدر ہیں۔ (یہ لائبریری اپنی پینتالیس پچاس ہزار کتابوں کے باعث ممتاز ترین مشرقی لائبریریوں میں ایک ہے) مولانا کی عمر نوے کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ فرماتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء میں جامع مسجد رام پور میں تقریر کی تھی۔ اس وقت ان کے داڑھی مونچھیں کچھ نہ تھیں اسی تقریر سے مولانا آزاد سے ان کا تعارف ہوا اور اس کے بعد ہی انھوں نے مولانا آزاد کو وہ خط لکھا جس کا جواب یہ ہے۔

سوالات جن کے جواب میں یہ خط لکھا گیا ہے، پہلے کو چھوڑ کر (جس میں عربی سیکھنے کے لیے ابتدائی کتابوں کے نام پوچھے تھے، جو مولانا کی نظر میں مناسب ہوں) باقی سب سماوی قسم کے ہیں۔ اس خط کی اشاعت کے لیے میں استاذی المحترم قبلہ ضیاء اللہ خاں صاحب کا شکرگزار ہوں۔

۱۱۔ بالی گنج سرکلر روڈ کلکتہ

۲ر اگست ۱۹۲۰ء

حبّی فی اللہ۔ السلام علیکم۔ خط پہنچا۔ جن تعلیمی رسائل کی نسبت میں نے دہلی میں ذکر کیا تھا وہ حسب ذیل ہیں:

القراءۃ الرشیدیۃ	جزو اول سے چہارم تک	مطبوعہ قاہرہ
فوائد الانشاء	اوّل و ثانی	،، ،، ،،
ھدایۃ الطالب فی قواعد العربیۃ	اوّل و ثانی	،، ،، ،،

مبادیات کے لیے یہ سلسلہ مفید ہو گا۔ آپ نے لکھا ہے کہ میں یہ رسائل بھیج دوں۔ اگر میں یہ بھیج سکتا تو تحفۃً بھیج دیتا۔ لیکن میرے کتب خانہ میں اس کا ایک ایک نسخہ ہے۔ ایک سے زیادہ نسخے موجود نہیں۔ آپ مولوی شرف الدین تاجران کتب عربیہ بھنڈی بازار کو لکھیے وہ بھیج دیں گے۔ میں بھی کتابیں آج کل انھیں کے یہاں سے منگواتا ہوں۔

(۲) شہاب ثاقب کے "رجوماً للشیاطین" ہونے کی نسبت دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں:

اولاً کائنات ہستی کے جس قدر حوادث و اعمال ہیں ان کے علل و مقاصد کے بارے میں ہماری معلومات ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتیں یعنی اس حد سے جو ہمارے حواس کے تفحص و تعمق کی آخری حد ہے۔ اس حد سے

آگے جو کچھ ہے وہ ہمارے لیے غیر معلوم و مجہول ہے اور جو کچھ غیر معلوم و مجہول ہے، اس کے لیے ہماری صحیح حیثیت یہی ہو سکتی ہے کہ عدم علم کا اعتراف کریں۔ منع و نفی کے مدعی نہیں ہو سکتے۔ میں امید کرتا ہوں بات آپ پر واضح ہو گئی ہو گی تشریح کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھیے کہ ایک خاص حد تک ہماری نظر و ادراک کے لیے روشنی ہے۔ اس کے بعد تاریکی ہے۔ جہاں سے تاریکی شروع ہوتی ہے ہماری سیر نظری کے قدم رک جاتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہے؟ کیا کچھ ہے اور کیا کچھ نہیں ہے، اس بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اور اس لیے ہماری حیثیت صرف یہ ہے کہ عدم علم کا اعتراف کریں۔ کسی بات کے لیے نہ تو مثبت ہو سکتے ہیں نہ مانع و منکر۔ قدیم و جدید عہد کے تمام اکابر علم و نظر نے صاف لفظوں میں اس کا اقرار کیا ہے۔

اب ایسا ہوتا ہے کہ علم و بیان کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے ایک انسان وحی الٰہی کے ساتھ آتا ہے اور کہتا ہے: جس حد کے بعد سے تمہارے لیے تاریکی ہے، میرے لیے روشنی ہے۔ جس حد کے بعد سے تمہارے لیے عدم علم ہے میرے لیے بصیرت و برہان ہے۔ جس حد کے بعد سے تمہارا سرمایۂ یقین ختم ہو جاتا ہے میری یقینیات شروع ہوتی ہیں۔ ہذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی۔

پس ایسی حالت میں ہمارے لیے علم و راستی کی دو ہی راہیں ہو سکتی ہیں: اگر وہ شخص اپنے تمام اقوال و اعمال میں صادق ہے تو اسے قبول کریں، کاذب ہے تو انکار کر دیں۔ لیکن وہ جو کچھ بیان کرتا ہے اسے جھٹلا نہیں سکتے۔ کیوں کہ وہ جن حدود کے معاملات بیان کرتا ہے ان کے لیے ہمارا موقف عدم علم کا ہے اور اس کا دعویٰ علم و بصیرت کا ہے۔ ہم وہاں کے لیے زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ شک سے زیادہ نہیں ہے۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس کی بنیاد علم و یقین ہے۔ ہم شک کی بنا پر علم و یقین کو جھٹلا نہیں سکتے۔

مختصر لفظوں میں جو کچھ کہا گیا ہے اگر آپ غور کریں گے تو نصف قرآن کی تفسیر ہے۔

ثانیاً، انبیاء کرام اور کتب سماویہ کے تمام بیانات جو ماورائے محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں اسی قسم میں داخل ہیں۔ یہ ایک خطرناک غلطی ہے کہ یہ حقیقت فراموش کر دی جائے اور غلط طریقوں سے تطبیق عقل و نقل کی کوشش کی جائے۔ یہاں تطبیق کی گنجائش ہی نہیں اور عقل اپنی حدود سے باہر سرے سے معلومات رکھتی ہی نہیں کہ معارف نقلیہ کے موافق ہوں یا مخالف ہوں۔ عقل لاعلمی کے سکوت میں ہے نقل علم و یقین کے ساتھ متکلم ہے، پس تعارض کب ہے کہ تطبیق کا سوال پیدا ہو؟

شہاب ثاقب وغیرہ کے متعلق بھی جس قدر امور بطریق صحیح کتاب و سُنت سے ثابت ہیں اسی قسم کے معارف میں داخل ہیں۔ بلاشبہ عقل انسانی نے ایک خاص حد تک پہنچ کر یہ بات معلوم کر لی ہے کہ شہاب ثاقب کس طرح ٹوٹتے ہیں اور فضا میں کیا کیا محرکات ان کے سقوط کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ اس بات کے لیے علم انسانی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد بھی کچھ ہے یا نہیں ہے؟ اور تمام تغیرات و حوادث عالم کی طرح اس حادثہ میں بھی ماورائے نظر علم افعال و خواص معنویہ پوشیدہ ہیں یا نہیں؟ پھر اگر وحی الٰہی نے اس بارے میں کچھ بتلایا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اسے تسلیم کریں کیوں کہ اس کے خلاف ہمارے پاس کوئی علم و یقین موجود ہی نہیں ہے۔

یہ اصل عظیم پیش نظر رکھیے گا تو اس راہ کی تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ یہ علم کلام متکلمین کا علم کلام نہیں ہے۔ کتاب و سُنت کا کلام ہے۔

(۳) باقی رہی یہ بات کہ بعض احادیث میں "نجوم" کی پیدائش کا مقصد بعض خاص امور بیان کیے گئے ہیں اور بقیہ کی نفی کی گئی ہے، تو اس بارے میں بھی ایک اصل پیش نظر رکھنا چاہیے۔ احادیث پر موقوف نہیں خود قرآن میں بھی جا بجا اس طرح کی تصریحات موجود ہیں جن میں بعض اشیاء و مصنوعات کے مقاصد تخلیق بیان کیے گئے ہیں اور اسلوب بیان بہ ظاہر مفید حصر ہے۔ مثلاً یہی تخلیق نجوم، یا مثلاً چاند کا گھٹنا بڑھنا: یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وغیر ذٰلک۔ تو اگرچہ ان مقامات میں حصر پایا جاتا ہے لیکن وہ علی الاطلاق نہیں ہے، خاص حالات سے مقید ہے اور یہ تقیید خود کتاب و سُنت سے معلوم ہو جاتی ہے نزول قرآن کے وقت طرح طرح کے توہمات باطلہ مخالفین میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور اس وقت تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جہل و اصنام پرستی کی وجہ سے لوگ خیال کرتے تھے کہ اجرام سماویہ دیوتا ہیں اور باشندگان کرۂ ارض کے تمام نتائج و تاثرات کا سر رشتہ ان ہی کے ہاتھ ہے۔ بابل، یونان، مصر اور ہندوستان کا فن نجوم (جوتش) ان ہی عقائد باطلہ کا ایک مدوّن مجموعہ ہے۔ عرب جاہلیہ میں بھی یہ اوہام پھیلے ہوئے تھے۔ بس جہاں کہیں اجرام سماویہ کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ان کی تخلیق کا کوئی ایسا مقصد بیان کر دیا گیا ہے جو زیادہ واضح اور اقرب الی العقول ہے۔ اور ساتھ ہی کہہ دیا گیا ہے کہ اس سے

زیادہ جو کچھ سمجھا جاتا ہو بے اصل ہے۔ یعنی جو خرافات لوگوں میں مشہور ہیں ان کی اصلیت نہیں۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ ان کی تخلیق کے حقیقی مقاصد اس سے زیادہ نہیں ہیں اہلّہ کی نسبت فرمایا (ھی مواقیت للناس) کیوں کہ یہ سب سے زیادہ واضح اور اوقع فی النفس بات تھی۔ مقصود یہ تھا کہ تم نے چاند کے گھٹنے بڑھنے اور مہینوں کی چاندرات کی نسبت جس قدر اوہام و خرافات بنا رکھے ہیں ان کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ تو اوقات معلوم کرنے کا ایک سامان ہے اور بس۔

حضرت ابراہیم کی وفات اور کسوف والی حدیث پر نظر ڈالیے صرف اتنی بات پر کسوف کا معاملہ ختم کر دیا گیا کہ یہ آیات اللہ میں سے ایک آیت ہے اور تمام تر زور عوام کے بے اصل خیالات کے ازالہ پر دیا گیا۔ کیوں کہ انبیائے کرام کا مقصود اصلاح عقائد ہوتا ہے نہ کہ خواص و فوائد اجسام کی شرح و تنقیح۔ بہر حال جس حدیث کا آپ نے ذکر کیا ہے اس میں نفی مطلق نہیں مقید

(۴) سماء الدنیا سے مقصود بلندی کا وہ نظارہ ہے جو ہمیں اپنی نگاہوں کے سامنے نظر آتا ہے یعنی فضا۔ جسے یونانی اور اب اس کی وجہ سے انگریزی میں (ایٹماسفیر) کہتے ہیں۔ عربی میں سما کے معنی اوپر کی چیز کے ہیں۔ مثال السائل میں آپ نے پڑھا ہوگا۔

وَاَحْمَرَ كَالدِّيبَاجِ اَمَّا سَمَاؤُهُ

فَرَيَّا وَاَمَّا اَرْضُهُ فَمَحُوْلُ

پس سماء الدنیا کے معنی ہوئے زمین کے اوپر کی فضا۔

مولوی افضال الحق[1] صاحب کو اور اگر ملاقات ہو تو ان کے والد بزرگوار کو میرا سلام شوق پہنچا دیں۔

ابوالکلام

مولوی ضیاء اللہ خاں صاحب کے نام مولانا کا ایک در خط ۱۹۲۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ چھ سات سطروں کا ہے اور بالکل سرسری۔

---

[1] مولوی افضال الحق صاحب اور ان کے والد مولانا فضل حق صاحب رام پور کے رہنے والے تھے فضل حق صاحب رام پور کی ایک زمانہ میں مشہور عالم علوم مشرقی کی درس گاہ اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے اور بعد میں افضال الحق صاحب بھی اسی کالج میں استاد ہو گئے تھے۔ فضل حق صاحب منطق اور فلسفہ کے جید عالم تھے اور اپنے عہد کے ہندوستان میں ان کا نام سند کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔ متعدد اہم کتابیں ان کی تصنیفوں میں سے ہیں۔ مولوی افضال الحق صاحب کے والد مولوی فضل حق صاحب تو ان دیوزاد عالموں کے سلسلہ کی آخری کڑی تھے جس میں عبدالحق خیرآبادی، فضل حق خیرآبادی اور ان سے اوپر شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور شاہ ولی اللہ جیسے لوگ گزر چکے تھے۔

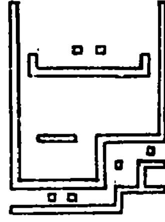
نوروز

حمید الماس

دیارِ رنگ و بو میں اب غزل خوانی کا موسم ہے
نویدِ دل نواز و نور افشانی کا موسم ہے
حیاتِ نو بہ نو کی جلوہ سامانی کا موسم ہے
مسرت آشنا لمحوں کی ارزانی کا موسم ہے

زیادہ دن نہیں بیتے مری آنکھوں نے دیکھا ہے
جہاں کل خاک اڑتی تھی وہاں اب پھول کھلتے ہیں
جہاں کل تھی مسافر کا مقدر آبلہ پائی!
وہاں اب سلسلہ در سلسلہ چھتنار ملتے ہیں
جو ارضِ خار ساماں تھی گرفتِ سنگ میں کل تک
اسی کی کوکھ سے اب خوشۂ گندم نکلتے ہیں
وہ دریا جن کے تیور تھے نشانِ مرگِ انسانی
انھیں کے فیض سے بجلی کے اب فانوس جلتے ہیں
وہ دورِ ارتقا ہے اب ہمارے کارخانوں میں
جو کل تک بن نہیں سکتے تھے وہ اوزار ڈھلتے ہیں
کسانوں کی جبینوں پر ضیائے شادمانی ہے
لبِ مزدور پر سو سو طرح کی نغمہ خوانی ہے

وہ بچے اور وہ گم نام بچے گاؤں گاؤں کے
سدا جو علم و فن کے نور سے محروم رہتے تھے
وہ مریم زادیاں جن کو میسر تھا نہ آنچل بھی
سفینے جن کی امیدوں کے تاریکی میں بہتے تھے
وہ اب علم و ہنر کی روشنی سے فیض پاتے ہیں
بہ ایں خورسندگیِ دل ہمیشہ مسکراتے ہیں
یہ ہے فیضان اپنے ملک میں منصوبہ بندی کا
بہت چرچا ہے جگ میں اس ہماری ہوش مندی کا



سعید اختر نعمانی

جب سے سُنا ہے اُن کو بہاراں کی ہے تلاش
اہلِ جنوں کو تارِ رگِ جاں کی ہے تلاش

طوفاں میں تھا سفینہ تو ساحل کی فکر تھی
ساحل ملا تو موجۂ طوفاں کی ہے تلاش

پھر رُک چلا ہے قافلۂ گردشِ حیات
پھر مجھ کو تیری جنبشِ مژگاں کی ہے تلاش

اے کاش برق ہی کرے اس سمت اپنا رُخ
مدت سے آشیاں کو چراغاں کی ہے تلاش

نکلا ہوں لے کے روشنیِ صبحِ زندگی
میری سحر کو شامِ غریباں کی ہے تلاش

آسودگی نہ دامنِ ساحل سے مل سکی
اب کشتیِ حیات کو طوفاں کی ہے تلاش

بیٹھے بٹھائے آپ کو اختؔر یہ کیا ہوا؟
دیر و حرم میں آپ کو انساں کی ہے تلاش

محسن زیدی

دل کو وہ ربط ہے ترے غم کی ہوا کے ساتھ
جو ہے شگفتِ گُل کو تعلق صبا کے ساتھ

اپنا بھی ایک گُل سے رہا ہے معاملہ
آوارہ گرد ہم بھی رہے ہیں صبا کے ساتھ

اب تک ہے دل کو یاد تری اوّلیں نظر
وہ اِک نگاہِ خاص کا عالم حیا کے ساتھ

دیکھے ہیں گلستاں میں کئی انقلابِ وقت
گزری ہے ایک عمر سموم و صبا کے ساتھ

غم خوار ہم کو چھوڑ کر اس طرح چل دیے
اُڑ جائیں جیسے شاخ سے پتے ہوا کے ساتھ

مثلِ غبار پھرتے رہے راہِ شوق میں
اس نقشِ پا کے ساتھ گہ اس نقشِ پا کے ساتھ

محسنؔ رہِ حیات میں وہ ہم سفر ملے
جو اپنا رُخ بدلتے رہے ہیں ہوا کے ساتھ

مہر جائسی

کون ہوتا شرف اندوزِ بلا میرے بعد
تا بہ محشر رہی خالی مری جا میرے بعد

ڈھونڈھتے پھرتے ہیں نقشِ کفِ پا میرے بعد
نہیں ملتا مری منزل کا پتا میرے بعد

میرے دم تک تو رہی دیکھیے قائم جو رہے
رسمِ سجادگیِ اہلِ وفا میرے بعد

بڑھتے دھارے کو کوئی روکنے والا نہ رہا
بڑھ گئی ہمّتِ سیلابِ بلا میرے بعد

سرپرست ایک میں باقی تھا سو میں بھی نہ رہا
ہائے بے چارگیِ اہلِ بلا میرے بعد

اب کوئی قابلِ گردن زدنی رہ نہ گیا
کس پہ تعمیل ہو فرمانِ قضا میرے بعد

خانہ بربادیِ مہرؔ آ کے جو دیکھے غالبؔ
کہہ اُٹھے اُف یہ ہے سیلابِ بلا میرے بعد

افسانہ

سال گرہ کا تحفہ

راجیندر ناتھ کھنیال

بیکہ جانے سے پہلے شری ستی جی نے وہ سب کام گِنانا شروع کر دیا جو مجھے یہاں رہ کر گرمی کی چھٹیوں میں کرنا تھے۔ دروازوں کی چٹخنیاں ٹھیک کرانا، ٹوٹے ہوئے شیشے بدلوانا، اسٹول کی چوتھی ٹانگ لگوانا، پھاٹک پر روغن کرانا، ٹپکتی چھت کی مرمت کرانا وغیرہ۔ یہاں سوچے ہوئے تھے کہ دوپہر کو ڈٹ کر سونے کے بعد شام کو نہا دھو کر مہندر بابو کے ہاں دو چار ہاتھ تاش کے ہو جایا کریں گے لیکن شری ستی جی نے کاموں کی وہ لمبی فہرست تیار کر دی کہ تاش کی طرف سے دل میں ایک ناامیدی سی پیدا ہونے لگی۔

سونے پر سہاگا یہ ہو کہ روانگی سے ایک دن پہلے شام کو چلتے کے وقت یکایک فرمانے لگیں: "ہاں ایک کام اور یاد آیا۔ چار جولائی کو جولین کی پہلی سالگرہ ہے۔ اس موقع پر کوئی اچھا سا تحفہ دینا لازمی ہے۔" جولین میری سالی کا چوتھا بچہ ہے۔ تین لڑکیوں کے بعد دیوی دیوتاؤں کی منتوں کے صلے میں یہ پیارا سا لڑکا پچھلے سال چار جولائی کو پیدا ہوا تھا۔ جب اس کے نام رکھنے کی تقریب نزدیک آئی تو میرے ہم زلف نے قریبی رشتے داروں کو لکھا کہ کوئی عمدہ سا نام اس کے لیے تجویز کریں۔ تقریب کے دن کوئی ایک درجن نام موجود تھے جن میں سے ایک کا چناؤ ہونا تھا۔ میں نے کہا: "ویسے تو آپ لوگ جو چاہے نام رکھیں لیکن چوں کہ یہ بچہ جولائی کے مہینہ میں پیدا ہوا ہے اس لیے میں تو اسے پیار سے جو لی ین (Julien) ہی کہوں گا۔" ولایتی خیالات میری سالی صاحبہ کو جلد متاثر کر لیتے ہیں حالاں کہ خود وہ جب تک صبح سویرے رامائن کے سندر کانڈ کا پاٹھ نہ کر لیں اس وقت پانی بھی نہیں پیتیں۔ نام چوں کہ ولایتی تھا اس لیے میری تجویز فوراً منظور ہو گئی اور میرا لاڈلا بھانجا اس دن سے جولین کہلانے لگا۔ اب آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ میرے لیے اس کے جنم دن پر کوئی موزوں تحفہ دینا کتنا لازمی تھا!

کچھ دیر سر کھجلانے کے بعد میں نے شری ستی جی سے عرض کیا کہ جاپان سے چلنے والی جاپانی گڑیا کیسی رہے گی؟ جواب ملا "اوں ہوں۔" پھر چند منٹ بعد سوچ کر میں نے کہا "کاؤبوائے سوٹ؟" اس پر شری ستی جی نے اپنی پیشانی میں تین بل ڈالتے ہوئے فرمایا: "آپ نے پھر اپنی ولایتی قابلیت جتانا شروع کی۔ ابھی وہ کچھ بڑا تو ہو لے۔" لیکن میرے دماغ میں جاپانی گڑیا اور امریکی سوٹ نے کچھ اس طرح چکر کاٹنا شروع کر دیا تھا کہ کوئی تیسری چیز وہاں داخل ہی نہیں ہو پاتی تھی۔ اتنے میں شری ستی جی کا فرمان کانوں میں پڑا: "بٹو کے لیے کھانے کی جو کرسی بنوائی گئی تھی کیوں نہ اسی طرح کی ایک کرسی بنوائی جائے کم از کم سات سال کام آئے گی اور پھر یہ کوئی ان کے آخری بچہ تو ہے نہیں۔ پرماتما نے چاہا تو ابھی اس کے ایک دو بھائی اور ہوں گے ان کا بھی کام چل جائے گا۔" اس رائے سے متفق نہ ہونے کا مطلب یہ سمجھا جاتا کہ ہم شاید تحفہ دینا ہی نہیں چاہتے اس لیے شری ستی جی کی پُرجوش تائید کرتے ہوئے میں نے کہا: "بیشک اس سے بڑھ کے موزوں تحفہ جولین کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

چلیے ایک اور کام فہرست میں شامل ہو گیا۔ چار جولائی کو لکھنؤ سے کانپور سالگرہ کا تحفہ پہنچانا۔ ابھی جون کا پورا مہینہ پڑا تھا لیکن مجھے ایک فکر سی ہو گئی کیوں کہ جب بٹو کے لیے ایسی کرسی بنوائی تھی تو پورا ڈیڑھ مہینہ بڑھئی کے

ہاں چکر کاٹنے کے بعد وہ حاصل ہوئی تھی. فکر یہ تھی کہ جولین کی کرسی ایک مہینہ میں تیار ہو سکے گی یا نہیں.

دوسرے دن شری متی جی اور بچوں کو ریل گاڑی سے روانہ کرکے میں سیدھے پلٹو مستری کی دکان پر گیا اور ان سے عرض کی کہ چار سال پہلے جیسی کرسی بچو کے لیے بنائی تھی ٹھیک ویسی ہی ایک اور کرسی دس دن کے اندر اندر بنا دیجیوں کہ گیارھویں دن اسے بہ طور تحفہ دینا ہے. پلٹو مستری نے اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا: "ابی دس دن کیوں؟ کرسی پرسوں تک تیار ہو جائے گی. آ کر لے جائیے گا." میں خوش خوش گھر آیا کہ سالگرہ کے دن سے کافی پہلے یہ کام سرانجام ہو جائے گا. دوسرے روز بڑے اطمینان سے جھنڈا بابو کے ہاں گیا اور بارہ بجے رات کو اپنے گھر واپس آیا. اس کے دوسرے دن شام کو پلٹو کی دکان پر پہنچا. فرمانے لگے: "کرسی آپ کی کارخانے میں پڑی ہے. لونڈا یہاں ہے نہیں. نہیں تو ابھی منگوا دیتا. اب آپ کل پھر تکلیف کریں." ایسی جلدی تو تھی بھی نہیں اس لیے خراماں خراماں واپس چلا آیا. سوچا اب کرسی تو بن ہی گئی ہے. دو دن بعد ہی لے آئیں گے.

تیسرے دن شام کو پلٹو کے یہاں جانے کو میں تیار ہی ہوا تھا کہ جھنڈا بابو دو تین دوستوں کو ساتھ لیے نازل ہو گئے. کہنے لگے "اس دن سے تو آپ آئے ہی نہیں. سوچا چلو سب لوگ آج آپ ہی کے ہاں جمیں." کرسی کی طرف سے کوئی پریشانی تھی نہیں. میں راضی ہو گیا اور رات کے گیارہ بجے بیٹھک ختم ہوئی. اگلے دن دکانیں ہفتہ وار چھٹی کی وجہ سے بند تھیں. اس طرح گویا دو دن اور گزر گئے. لیکن تیسرے دن میں دس ہی بجے پلٹو کی دکان پر پہنچ گیا. مجھے دیکھتے ہی وہ کہنے لگے: "میں کارخانے ہی سے آ رہا ہوں. آپ کی کرسی میں بس پالش باقی رہ گئی ہے." میں نے کہا کہ بھئی جلدی کرا دو تو اچھا ہے. بولے: "بات اصل میں یہ ہے کہ ہمارا پالش مین آج کل ایک شادی میں باہر گیا ہے. تین چار دن میں آ جائے گا. جیسے ہی وہ واپس آیا سب سے پہلے آپ کے کام کا نمبر لگوا دوں گا." تین چار دن بعد ہم پھر گئے لیکن یہی جواب ملا کہ ابھی آدمی شادی سے نہیں لوٹا. اس طرح دو ہفتے گزر گئے اور مجھے کرسی کی شکل تک دیکھنا نصیب نہ ہوئی. اب پلٹو کی دکان کا ایک پھیرا میرے روزانہ پروگرام کا ایک اہم جزو بن گیا. درزی، دھوبی، بڑھئی وغیرہ پیشہ وروں کو شاید خدا کی طرف سے حواس خمسہ کے علاوہ ایک اور حس ملتی ہے جس سے وہ بھانپ لیتے ہیں کہ دراصل آپ کو ایک چیز کی واقعی کب ضرورت ہے وہ اسی حساب سے اپنا وعدہ پورا کرتے ہیں اور اس کے پہلے آپ انہیں لاکھ سمجھائیے وہ فقط ہاں ہاں کہتے رہیں گے لیکن کام کبھی پورا نہ کریں گے. اتنے میں ۲۲ جون کو میرے ہم زلف کی چٹھی ملی کہ بھائی صاحب آپ پہلی جولائی کو کانپور پہنچ جائیے جولین کی پہلی سالگرہ کی دعوت ہوگی. کام بہت ہے اور کئی باتوں میں آپ سے صلاح بھی کرنا ہے. میں نے جواب میں لکھ دیا کہ پہلی تاریخ کو صبح والی گاڑی سے کانپور پہنچ جاؤں گا. اسی دن شری متی جی کی چٹھی بھی آ گئی جس میں کرسی کے سلسلہ میں تاکید کی گئی تھی. اب انہیں کیسے بتاتے کہ ان دنوں اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے میرے دماغ میں صرف ایک کرسی ہی گردش کرتی رہتی ہے.

پلٹو مستری کو کئی طرح سمجھایا. غصہ دکھایا. منت سماجت کی کہ بہت دیر ہو گئی ہے. کرسی دو ایک دن میں بنوا دو. لیکن وہ حضرت کسی نہ کسی بہانے ٹالتے ہی رہے. ۲۷ جون کو انھوں نے اعتراف کیا کہ اس کرسی کا ڈیزائن کھو گیا تھا اور آج ہی ملا ہے، اب اس کے بننے میں دیر نہیں لگے گی. میں نے ان کے ہاتھ جوڑے کہ عزت کا معاملہ ہے، آپ اور کوتاہی نہ کریں. بولے "بے فکر رہیے. ایسا کبھی ہو سکتا ہے. بس ایک درخواست ہے کہ کرسی کے لیے کچھ لکڑی لانا ہے اس لیے اگر برا نہ مانیں تو دس روپیہ پیشگی دے دیجیے. بعد کو حساب میں کاٹ لیجیے گا." روپیہ دے کر ان کو پھر تاکید کی کہ تیس تاریخ کی شام تک کرسی ضرور تیار ہو جائے. پلٹو بولے: "نہیں سرکار، میں تو آپ کا سیوک ہوں. بھلا میرے جیتے جی یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کا کام وقت پر نہ ہو. ابھی رات کو سوؤں گا نہیں دس ہزار کا بھی کام آ جائے تو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا. آپ بالکل اطمینان رکھیں. اب کام ہی کیا رہ گیا ہے."

وقت مقررہ پر جب دکان پہنچے تو پلٹو مستری ندارد. ایک لڑکا بیٹھا تھا کہنے لگا ان کے بھتیجے کو اچانک ہیضہ کا حملہ ہو گیا ہے اس لیے اسے لے کر وہ اسپتال گئے ہیں. اب کل ہی ملاقات ہو سکے گی. ادھر مجھے ایسا لگا جیسے دل کی حرکت بند ہونے لگی ہو. لیکن کرتا کیا، مجبوراً واپس آنا پڑا. پہلی تاریخ کو دس بجے دفتر سے چھٹی لی اور پلٹو کی دکان پہنچ گیا وہاں وہ پھر نہیں ملے. مارے غصہ کے میں دکان پر بیٹھ گیا اور یہ طے کر لیا کہ جب تک پلٹو نہیں آئے گا میں اٹھوں گا نہیں. آخر انتظار کرتے کرتے دو بجے پلٹو

نظر آئے۔ ہمیں اپنے ساتھ اپنے "کارخانے" لے گئے اور کچھ لکڑیاں دکھا کر کہنے لگے: کہ "دیکھیے آپ ہی کا کام بن رہا ہے۔ شام تک تیار ہو جائے گا آپ یقین کیجیے کہ ایک سیٹھ جی اپنی لڑکی کی شادی کے لیے فرنیچر تیار کرانا چاہتے تھے مگر میں نے انکار کر دیا کہ جب تک بابو جی کا کام تیار نہ ہو جائے گا میں دوسرا کام ہاتھ میں نہ لوں گا۔"

کچھ پلٹو کی باتوں سے متاثر ہو کر اور کچھ لکڑیاں دیکھ کر مجھے ذرا سا اطمینان ہوا اور دفتر جا کر تنخواہ لی۔ شام کو دکان پر پھر گیا تو دیکھا کہ کرسی کے ہتھے پائے کی شکل کی کچھ چیزیں نظر آ رہی ہیں۔ میں نے پلٹو سے کہا کہ ابھی تو اس کا ڈھانچہ بھی نہیں بنا ہے، کیلیں ٹھوکنا ہے، بنائی ہونا ہے، پالش ہونا ہے، یہ سب کب ہو گا۔ پلٹو نہایت اطمینان سے بولے: "بابو جی، اب گھبرانے کی کیا بات ہے۔ رات کو کام ہو گا۔ اُوور ٹائم کراؤں گا۔ راتوں ہی کو کرسی بن جائے گی۔ کاری گر کو چار پیسے زیادہ دینا پڑیں گے مگر اس کی پروا نہیں۔ آپ کا کام ہونا چاہیے۔ اب آپ کل صبح آ کر اسے لیتے جائیے گا۔" مرتا کیا نہ کرتا، میں پھر واپس چلا آیا۔ دوسرے دن صبح اٹھا اور پلٹو کی دکان جانے کے لیے تیاری کر ہی رہا تھا کہ یکایک خیال آیا کہ آج تو دکانیں بند رہنے کا دن ہے۔ یہ خیال آتے ہی ایک سناٹا سا چھا گیا لیکن اس آسرے میں کہ شاید پلٹو میرا انتظار دکان پر کر رہے ہوں میں دکان چلا گیا۔ وہ بند تھی۔ وہاں سے پلٹو کے گھر گیا۔ گھر پر پلٹو کا پتہ نہ تھا۔ پوچھنے پر گھر والوں نے یہ بتایا کہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں، کل صبح آئیں گے۔ آخر نامراد اور تھکا ماندہ گھر پہنچا اور کسی طرح دن اور دن کے بعد رات گزاری۔ دیکھا کہ بادامی کاغذ سے منڈھی ہوئی اور رسیوں سے بندھی ہوئی کوئی چیز رکھی ہے۔ میرے دل میں مسرت کی لہر دوڑ گئی کہ چلو، آخر کار کرسی تیار ہو ہی گئی۔ اتنے میں پلٹو مجھے دیکھتے ہی بولے: دیکھیے بابو جی۔ آپ کا سامان ایسی مضبوطی سے پیک کیا گیا ہے کہ اسے اگر مکان کی چوتھی منزل سے بھی پھینک دیجیے تو کیا مجال کہ لکڑی پر خراش تک آ جائے، ٹوٹنا تو درکنار۔ مگر اتنا کیجیے کہ آپ اسے ریل سے نہ لے جائیے، بس سے لیتے جائیے کیوں کہ ریل والے بکھیڑ جھنجھٹ بتائیں گے۔

میں اس کرسی کو پا کر اتنا خوش ہوا کہ ساری کلفتیں جو اس سلسلہ میں برداشت کرنا پڑی تھیں بھول گیا اور اس بندھے ہوئے پیکیج کو ایک رکشا پر بڑی احتیاط سے رکھا کر پہنچا۔ مگر گھر پہنچ کر مہندر بابو سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ بس میں کہاں لے جاؤ گے۔ چھت پر کوئی بڑا بکس اس سے ٹکرا گیا تو کرسی ویسے ہی ٹوٹ جائے گی اور نہیں تو راستے بھر ہلتے ہلتے رگڑ کھا کر اس کا پالش تو ضرور خراب ہو جائے گا۔"

لیجیے ایک نئی مشکل کھڑی ہو گئی۔ اب اس تحفہ کو لے جایا کیسے جائے میں نے سوچا خود اسٹیشن جا کر پوچھ تاچھ کرنا زیادہ بہتر ہو گا۔ وہاں بال بابو نے کہا کرسی لائیے تو دیکھ کر بتلاؤں کہ کیا کرایہ پڑے گا ویسے اس کا وزن، لمبائی چوڑائی، اونچائی ناپ کر کرایہ چارج کیا جائے گا۔ لیکن یہ کرایہ کافی ہو گا اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ اسے بذریعہ بس لے جائیں۔

اسٹیشن سے بس کے اڈے پر پہنچا تو بکنگ کلرک نے بڑی ہمدردی سے کہا کہ ایک تو کرایہ ایک سن کا پڑے گا اور اس پر راستے میں دو تین چنگیوں کا محصول اور اُوپر سے ٹوٹنے کا ڈر۔ اس سبب سے اچھا یہی ہو گا کہ آپ اسے بذریعہ ریل لے جائیں۔ جی میں تو آیا کہ کرسی پلٹو کو لوٹا دیں اور وہاں ہی گڑیا خرید کے کانپور پہنچ جائیں لیکن اسی وقت شری ستی جی کی بات یاد آئی کہ کرسی ہی سب سے زیادہ موزوں تحفہ ہو گا اور ساتھ ہی چٹھی میں لکھی گئی ہدایت یاد آئی کہ کرسی پر بٹھا کر جولین کو بہت سا پیار کرنا۔ فوراً سمجھ میں آیا کہ اگر کرسی ہی نہ ہوئی تو بہت سا پیار کس پر بٹھا کر کیا جائے گا۔

رات بھر اسی ادھیڑ بن میں نکل گئی کہ کرسی کو کانپور کس طرح لے جایا جائے ریل سے یا بس سے۔ مہندر بابو نے ایک اور تجویز پیش کی کہ کرسی کو اگر ایک گدے میں لپیٹ کر بستر بند میں باندھ لیں تو بہ طور بستر وہ آسانی سے لے جائی جا سکتی ہے۔ ترکیب بہت عمدہ تھی لیکن کرسی کی اونچائی بستر بند کی چوڑائی سے قریب ایک فٹ زیادہ نکلی۔ لہذا یہ ترکیب عمل میں نہ لائی جا سکتی تھی۔ شرما جی سے پوچھا۔ انھوں نے کہا آپ بے کار پریشان ہوتے ہیں۔ گنگا کا پُل پار کرنے کے بعد کانپور اسٹیشن سے پہلے جو ریلوے کراسنگ ہے وہاں پر ہر گاڑی کھڑی ہوتی ہے اور نہ بھی کھڑی ہو تو لوگ زنجیر کھینچ کر گاڑی روک لیتے ہیں۔ بلکہ وہاں قلی اور رکشا وغیرہ سب کچھ ملتا ہے۔ آپ بے کھٹکے کرسی ساتھ لے جائیے اور اس کراسنگ پر اتر جائیے۔

یہ ترکیب ہماری سمجھ میں آ گئی۔ صبح گاڑی ساڑھے سات بجے جاتی تھی۔ میں سات ہی بجے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ایسا ڈبہ ڈھونڈا جس میں اندر آڑی اٹھی

لمبی سیٹوں سے چھوٹے چھوٹے خانے بن جاتے ہیں۔ ایک خانہ میں اوپر والے تختہ پر ایک کنارے سے سٹا کر کرسی کو لٹا دیا اور اسی سے ملا کر اپنا ہینڈ بیگ رکھ دیا۔ دور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کاغذ کا ایک ذرا بڑا سا پلندہ ہے اور اس کے برابر بیگ رکھا ہے۔ اس طرح سامان سجا کر دل کو ذرا اطمینان ہوا اور یہ یقین سا ہو گیا کہ شاید اب کسی کو پتہ نہ چلے گا کہ میں ایک عدد کرسی بک کرائے بغیر چوری چوری لیے جا رہا ہوں۔ غرض ایک آنکھ اپنے سامان پر رکھتے ہوئے میں سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دیوان غالب پڑھنے لگا۔ ظاہرا تو بڑی بے فکری کے انداز میں بیٹھا تھا لیکن دل سے منا رہا تھا کہ جلدی گاڑی چلے تاکہ کوئی ٹکٹ چیکر وغیرہ اندر نہ آ جائے۔ خدا خدا کر کے انجن نے سیٹی دی اور گاڑی نے دھیرے دھیرے کھسکنا شروع کیا۔ شامت اعمال اسی وقت ایک ٹی ٹی ای صاحب لپک کر میرے ڈبے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت غالب کا یہ مصرع میرے سامنے تھا: ع مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔

بس نظر اس کے آگے نہ بڑھ سکی اور اسی وقت سے سفید وردی اور خاکی کوٹ پہنے ہوئے اس ریلوے آفیشل کی نقل و حرکت کا پیچھا کرنے لگی۔ جب وہ میرے قریب پہنچے تو میں نے آگے بڑھ کے انھیں ٹکٹ پیش کیا تاکہ وہ اور زیادہ قریب نہ آ سکیں اور آڑی لیٹی ہوئی کرسی کے درشن نہ کر پائیں۔ پاس ہی ایک بابو صاحب بیٹھے تھے جن کے ساتھ بال بچے بھی تھے۔ وہ بڑے اطمینان سے ٹکٹ نکال رہے تھے اور ہمارا دم گھٹا جا رہا تھا۔ ٹی ٹی ای کا خیال بٹانے کی خاطر ہم نے پوچھنا شروع کیا کہ 'ٹرین لیٹ تو نہیں ہو جائیگی' 'کانپور سے باندہ جانے کے لیے کَے بجے گاڑی ملے گی' وغیرہ۔ خیر کسی طرح وہ دوسرے ٹکٹ دیکھ کر وہاں سے ٹلے اور اپنی جان میں جان آئی۔

آخر گنگا کا پل بھی آ ہی گیا۔ لوگوں نے اس میں پیسے پھینکنا شروع کیے۔ کچھ دیہاتیوں نے آواز لگائی "بول گنگا میا کی جے!"۔ میں نے جلدی جلدی کرسی اور بیگ اٹھا کر دروازے کے سامنے رکھا تاکہ جیسے ہی کراسنگ پر گاڑی رکے میں نیچے کود پڑوں۔ دروازے کے پاس ایک پہلوان نما شخص بیٹھا تھا۔ اس سے کہا کہ جیسے ہی میں اتروں میرا سامان نیچے مجھے پکڑا دینا۔ وہ کہنے لگا: "ارے بھیّے تو۔ سامان تو ہم منٹن ماں پکڑائے دئی۔" میں دروازہ کھولے باہر دیکھ رہا تھا۔ ریلوے کراسنگ نظر آیا۔ رکشا بھی کھڑے تھے۔ گاڑی کی رفتار بھی مدھم پڑی۔ دل کو ڈھارس بندھی کہ چلو نجات کا وقت آ گیا لیکن رفتار پھر تیز ہو گئی اور رکشاؤں اور قلیوں کو چھوڑتی ہوئی ریل گاڑی بڑھتی چلی گئی۔ اب کانپور اسٹیشن کے مینار اور پل نظر آنے لگے۔ وہ پل جیسے جیسے نزدیک آ رہے تھے میرا دل ڈوبا جا رہا تھا اور میں رہ رہ کر شرما جی کو کوس رہا تھا کہ انھیں کی وجہ سے میں اس جنجال میں پھنس گیا۔

آخر، گاڑی رکی۔ سامنے ہی ایک قلی موجود تھا میرے حلق سے ایک مری ہوئی آواز نکلی کہ کیا یہ سامان باہر لے چلوگے۔ وہ ہمارے چہرہ سے تاڑ گیا کہ کرسی بک نہیں کرائی گئی ہے۔ بولا: "باہر نکروا دئی۔ بارہ آنے پڑی ہیں۔" میں راضی ہو گیا۔ وہ کہنے لگا: "آپ ہالی ہالی چلو اور ہمری اور نہ دیکھو۔ پل کے اوپار ہم آپ کا کرسی پہنچا دیاب۔" میرے پاس اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ لہٰذا ٹکٹ گیٹ پر دے کر سیڑھیوں سے نیچے چلنے لگے۔ قلی نے کرسی اپنے سر پر اس طرح سے رکھی کہ اس کا منہ بالکل ڈھک گیا اور اس کے بعد بہت تیزی سے ہٹو بچو کرتا ہوا پل سے نیچے اترنے لگا۔ ٹکٹ چیکر نے روکتے ہوئے پوچھا کہ یہ کس کی ہے لیکن وہ یہ کہتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے کی طرف بھاگتا رہا "وہ کا جائے رہے ہیں سیٹھ جی انھیں کیر ہے۔"

پل کے نیچے ہی سامنے سے ایک رکشا آ رہا تھا۔ اس سے پوچھا کہ نواب گنج چلوگے۔ بولا جی ہاں سوا روپیہ پڑے گا۔ پہلے ہی سے جو بارہ آنے ہاتھ میں نکالے رکھے تھے قلی کو دیتے ہوئے میں لپک کر رکشا پر سوار ہو گیا اور اس سے کہا کہ ذرا جلدی چلو تاکہ ریلوے اسٹیشن سے جتنی جلدی ہو سکے دور ہو جائیں۔ وہ بھی میری گھبراہٹ کو سمجھ گیا اور چنگی کے سامنے اور بھی تیزی سے چلاتا ہوا خطرہ کی حد سے نکال لے گیا۔

جب نواب گنج اپنے ہم زلف صاحب کے گھر پہنچا ہوں تو پنڈت جی جنم دن کی پوجا کرانے بیٹھے ہی تھے۔ سالی صاحبہ نے دیکھتے ہی وار کیا: "آپ تو جیجا جی بڑے دھوکے باز نکلے۔ پہلی تاریخ کو آتے آتے آج یہاں پہنچے!"۔ ہم نے منہ پونچھتے ہوئے ان سے تین دن بعد پہنچنے کی معافی مانگی۔ اتنے میں نوکر سامان لے کر اندر آیا تو انھوں نے پوچھا یہ کیا ہے۔ میں نے بتایا کہ تین دن بعد پہنچنے کی وجہ یہی کرسی ہے جسے جولین کے لیے لایا ہوں۔ کرسی

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۸ پر)

اترپردیش شاہ راہ ترقی پر

بڑے صنعتی منصوبوں کا خاکہ —— ریاستی منصوبہ بندی بورڈ —— ایک نیا پل —— تین طرح کی صنعتی ریاستوں کا قیام —— چھ ضلعوں کے لئے زراعتی اور صنعتی اسکیمیں —— فہرست مندرج اقوام کے طلباء کے لئے ہوسٹل —— ترقیاتی بلاکوں میں آب پاشی کے کنوئیں —— جیلوں کے بارے میں چند حقائق —— سیلاب کی روک تھام کے لئے اقدامات —— گاؤں سبھاؤں کے لئے منفعت بخش اثاثہ —— متفرقات

اترپردیش کے وزیر اعلیٰ شری چندر بھان گپتا نے ۲۶ مئی کو لکھنؤ میں بھارت سیوک سماج کی ریاستی شاخ کی کونسل کے جلسہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی حکومت نے ذرائع آمدنی کے پیش نظر بڑی صنعتوں کے قیام کے لیے حوصلہ مندانہ منصوبے وضع کیے ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے بتایا کہ سنٹرل پبلک سکٹر ۱۰۰ کروڑ روپیہ کی لاگت سے ریاست میں چار صنعتوں کے قیام پر غور کر رہا ہے جن میں ہردوار میں بجلی ہیوی الکٹریکلس۔ رشی کیش میں اینٹی بائیوٹکس کا کارخانہ۔ گورکھپور میں کیمیاوی کھاد کی فیکٹری اور وارانسی میں ریل گاڑی کے ڈیزل انجنوں کی فیکٹری ہوگی۔ ان میں آخر الذکر کارخانہ پر ابتدا میں ۱ کروڑ روپیہ لگایا جائے گا لیکن بعد میں اس کی توسیع پر ۱۰۰ لاکھ روپیہ اور لگایا جائے گا۔ اس کے علاوہ ہردوار میں ۱ کروڑ روپیہ سے ایک ڈھلائی کا کارخانہ قائم کیے جانے پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔

ریاستی پیمانے پر حکومت نجی صنعت کاروں کی ایک فہرست تیار کر رہی ہے تاکہ ریاست کو ایک صنعتی دور میں داخل کیا جا سکے۔ المونیم اور ربڑ کی فیکٹریاں مکمل ہونے والی ہیں اور ان میں جلد ہی پیداوار کا کام بھی شروع کر دیا جائے گا۔ الہ آباد میں موٹر ٹائر اور ٹیوب کی فیکٹری اور ہاتھرس میں سائیکل ٹائر ٹیوب کی فیکٹری زیر تکمیل ہیں۔

ریاستی حکومت نے سفارش کی تھی کہ برلا کے ذریعہ متھرا اور آگرہ کے درمیان ۲۵ کروڑ سے ۳۰ کروڑ تک کی لاگت کی کیمیاوی کھاد تیار کرنے کی ایک فیکٹری قائم کی جائے۔ ریاستی حکومت نے اس امر کی بھی سفارش کی تھی کہ کاغذ اور کپڑا تیار کرنے والی مشینوں کی فیکٹریوں کے لیے لائسنس منظور کیے جائیں۔

سات ایسی فیکٹریوں کو لائسنس دیئے جا چکے ہیں جہاں کھوئی سے کاغذ بنایا جاتا ہے۔

ریاست میں کپڑے کی مزید ملوں کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اترپردیش میں کپڑے کی اب بھی قلت ہے اور اگر ریاست کے لیے مزید تکلوں (اسپنڈلس) کے لیے منظوری نہ دی جائے گی تو کپڑے کی قلت اور بڑھ جائے گی۔ انہوں نے مزید بتایا کہ ریاست نے ۲۲۵۰۰۰ تکلوں کے لیے درخواست دی تھی اور اب تک صرف ۵۰۰۰۰ تکلے منظور کیے گئے ہیں جو کپڑے کی تین مخلوط ملوں کے قیام کے لیے کافی ہیں۔ بقیہ تکلوں کے لیے دی گئی درخواستیں اب اجرائے لائسنس کے متعلق کمیٹی کے زیر غور ہیں۔ علاوہ ازیں حکومت نے ریاست میں صنعت کے فروغ کے پیش نظر مزید ایک لاکھ تکلوں کے لیے درخواست دی ہے تاکہ روز افزوں بے روزگاری کا مسئلہ حل ہو سکے۔ انہوں نے بتایا کہ خورجہ میں کپڑے کی ایک مل قائم کرنے اور اس کے علاوہ ایک اور مخلوط مل کے قیام کی بھی تجویز ہے۔

شری گپتا نے ریاست میں بجلی کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہردواگنج جو اب بھی ۳۰۰۰۰ ہزار کلوواٹ بجلی پیدا کر رہا ہے آیندہ

ایک یا دو ماہ میں مزید ....۲۰ ہزار کلوواٹ بجلی پیدا کرسکے گا۔ یہ پلانٹ مکمل ہو چکا ہے۔

وزیر اعلیٰ نے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ ریاست میں سڑکوں اور پلوں کی تعمیر کے لیے ۱۸ کروڑ روپیہ مخصوص کیا گیا تھا لیکن اس میں سے ساڑھے گیارہ کروڑ روپیہ دوسرے پنچ سالہ منصوبہ کے تحت نا تمام اسکیموں کی تکمیل میں لگا دینا پڑا۔ اور اس طرح تیسرے پنچ سالہ منصوبہ کے تحت نئی اسکیمیں شروع کرنے کے لیے مشکل سے ۵ کروڑ روپیہ باقی بچا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس وجہ سے ریاست کے ڈیولپمنٹ کمشنر کو یہ ہدایات جاری کردی گئی ہیں کہ کم اہم اسکیموں پر ہونے والے اخراجات میں کفایت کی جائے اور بچایا ہوا سرمایہ سڑکوں اور پلوں کی تعمیر میں لگا دیا جائے۔

وزیر اعلیٰ نے امید ظاہر کی کہ بھارت سیوک سماج جس کا قیام پنچ سالہ منصوبوں کے سلسلہ میں عوام کا تعاون حاصل کرنے کے پیش نظر عمل میں آیا تھا، لوگوں کو ذہنی طور پر نئے محصولوں کا بار برداشت کرنے کے لیے آمادہ کرے گی جو منصوبہ کی متعدد اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اشد ضروری ہیں۔

مرکزی سرکار سے موصول ہونے والی ایک تجویز کے مطابق ریاستی حکومت صوبہ جاتی پیمانہ پر وزیر اعلیٰ کے زیر صدارت جلد ہی ایک منصوبہ بندی بورڈ کی تشکیل کرنے جا رہی ہے۔

یہ اطلاع نائب وزیر شری شانتی پرپن شرما نے دی جو ودھان سبھا میں شری یادویندر دت دوبے اور شری اودل کے ایک مشترکہ سوال کا جواب دے رہے تھے۔

شری شرما نے کہا کہ ریاستی منصوبہ بندی بورڈ کا دائرہ عمل وہی ہوگا جو کل ہند سطح پر منصوبہ بندی کمیشن کا ہے۔ نائب وزیر نے بتایا کہ وزیر اعلیٰ، وزیر منصوبہ بندی اور وزیر مالیات مجوزہ منصوبہ بندی بورڈ کے ممبر ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے باوجود مجوزہ بورڈ کے ممبروں کی تقرری کا سوال سرکار کے زیر غور ہے۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اس مجوزہ بورڈ کے اخراجات کیا ہوں گے اور اس کے ممبروں اور افسروں کا مشاہرہ کیا ہوگا نائب وزیر نے کہا کہ تمام باتیں ریاستی حکومت کے زیر غور ہیں۔

ضمنی سوالوں کا جواب دیتے ہوئے وزیر اعلیٰ شری چندر بھان گپتا نے کہا کہ یہ ریاستی منصوبہ بندی بورڈ منصوبہ بندی کمیشن اور مرکزی وزیر منصوبہ بندی کی تجویز پر بنایا جا رہا ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن اور مرکزی وزیر منصوبہ بندی کا خیال ہے کہ ایک ایسے ادارہ کی ضرورت ہے جو پلان بناسکے اور جو چوتھے و پانچویں منصوبہ کے لیے مختلف ترقیاتی اسکیموں میں رابطہ قائم کرسکے۔

مجوزہ بورڈ کی ضرورت پر بحث کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ایسا بورڈ کسی خاص ریاست کے وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے ماہرین اور سیاسی جماعتوں وغیرہ کے نمائندوں کے لیے ایسے مشوروں کو جن کا انحصار گذشتہ تجربات پر ہوتا ہے سارے ملک میں اور دوسری ریاستوں میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے یہ بھی کہا کہ چونکہ ہم منصوبہ بندی کے راستے پر آگے بڑھ چکے ہیں ہمیں نئے تجربات سے سابقہ بھی پڑتا ہے اس لیے ہمارے منصوبوں کو ان تجربات کے لحاظ سے نئی شکل دی جانی چاہیے۔

وزیر اعلیٰ نے امید ظاہر کی کہ اس سلسلہ میں پورے سوال پر غور کرنے کے بعد دو ماہ کے اندر قطعی فیصلہ کردیا جائے گا۔

ایک اور ضمنی سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا بورڈ میں حزب مخالف کے ممبر بھی ہوں گے۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اس میں لائق ممبر ہوں گے چاہے وہ حزب مخالف کے ہوں یا نہ ہوں۔

وزیر اعلیٰ نے یہ بھی کہا ریاستی منصوبہ بندی بورڈ ایک مشاورتی بورڈ ہوگا جس کی سفارشات اور تجویزوں پر آخری فیصلہ کابینہ کرے گی۔

آگرہ دہلی قومی شاہراہ کو متھرا میں جمنا پر ایک نئے پل کے ذریعہ گرانڈ ٹرنک روڈ سے ملا دیا گیا۔ وزیر تعمیرات عامہ شری گردھاری لال کے ہاتھوں حال میں افتتاحیہ رسم ادا کی گئی۔

اس پل کی تعمیر سے بریلی اور متھرا کے درمیان ریل اور سڑک والے اس موجودہ پل پر جس کو ریلوے کے ذمہ دار ریل گاڑیوں کی بڑھتی ہوئی آمدورفت کے پیش نظر از سر نو تعمیر کرنے والے ہیں سواریوں کی دن بدن بڑھتی ہوئی آمدورفت میں کمی واقع ہو جائے گی۔

جمنا کا یہ پل متھرا اور علی گڑھ کو براہ راست ملائے گا۔ ریاست میں اس ندی پر چھٹا سڑک پل ہوگا۔ دوسرے پانچ پل کالسی (دہرادون) سہارن پور۔ دہلی، آگرہ اور الہ آباد میں ہیں۔ یہاں جمنا کے اس پل کی وجہ سے علی گڑھ۔ ایٹہ۔ مرادآباد۔ بدایوں اور بریلی اور متھرا کے درمیان ہر موسم میں موٹر گاڑیوں وغیرہ کی آمد و رفت ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ اس پل سے بمبئی سے کمایوں کی پہاڑیوں پر آگرہ اور متھرا ہو کر جانے والے سیاحوں کو سڑکوں کے ذریعہ سفر کرنے کا سیدھا سلسلہ مل جائے گا۔

ریاستی محکمۂ تعمیرات عامہ کے انجینیروں نے ۲۸،۱۵ لاکھ روپیہ کی منظور شدہ رقم کے مدنظر اس کے ڈیزائن میں انقلابی تبدیلیاں کی ہیں۔ جن کی وجہ سے تعمیراتی کام کے مصارف میں منظور شدہ رقم سے ۳ لاکھ روپیہ کم خرچ ہوئے۔

اس تجربہ میں کامیابی حاصل ہونے کے بعد محکمۂ تعمیرات عامہ کے انجینیروں کے لیے ۲۴ فٹ چوڑے پل پر آنے والی منظور شدہ لاگت کے اندر ہی ۲۴ فٹ چوڑا پل تعمیر کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ سیمنٹ اور کنکریٹ سے تعمیر کئے گئے اس پل کی لمبائی ۲۰۳۵ فٹ ہے اور اس میں ۹ محرابیں ہیں۔ اس کی تعمیر پر ۱۵،۲۸ لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ اس کی چوڑائی ۲۲ فٹ ہے۔ جس میں پیدل چلنے والوں کے لیے ۵ فٹ دو طرفہ راستے ہیں سواریوں کی آمد و رفت کے لیے بھی دو راستے قائم کئے گئے ہیں۔ ڈھائی سال کی مدت میں یہ پل بن کر تیار ہوا ہے۔ اور اس پر ۷۰ ٹن وزن تک گاڑیاں بآسانی گذر سکتی ہیں۔

اس کی تعمیر میں ۵۰،۱۴ ٹن سیمنٹ۔ ۹۳۰ ٹن فولاد اور ۶۲ لاکھ اینٹیں اور ۵۰۰۰۰ مربع فٹ بالو استعمال میں لائی گئی ہے۔

اترپردیش کی چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے وزیر شری پھول سنگھ نے یو۔ پی ودھان پریشد میں کہا کہ ریاست میں پنج سالہ منصوبہ کے تحت بڑی درمیانی اور چھوٹی تین قسم کی صنعتی ریاستیں قائم کی جا رہی ہیں۔

وزیر موصوف نے جو شری چرنجی لال پالیوال کے ایک سوال کا جواب دے رہے تھے بتایا کہ ان تین طرح کی صنعتی ریاستوں کے لیے ۲۰ ایکڑ۔ ۱۰ ایکڑ اور ۲،۷۵ ایکڑ رقبہ مقرر کیا گیا ہے۔ جس میں بالترتیب ۳۲۔ ۱۸ اور ۱۲ صنعتی وحدے قائم کئے جائیں گے۔

ان ریاستوں پر مجوزہ مالی اخراجات کا ذکر کرتے ہوئے شری پھول سنگھ نے ممبر موصوف کو بتایا کہ ایک بڑی ریاست پر ۱۳،۲۶ لاکھ روپیہ درمیانی پر ۱۰،۲۵ لاکھ روپیہ اور چھوٹی ریاست پر ۷،۵۰ لاکھ روپیہ کی لاگت آئے گی۔ ان ریاستوں کے ورکشاپ کی عمارتوں پر بالترتیب ۱۱،۵۵ لاکھ روپیہ ۸،۵۸ لاکھ روپیہ اور ۴،۳۲ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ انتظامی بلاکوں سنٹرل ورکشاپ اور مشینری پر بالترتیب ۲،۳۱ لاکھ روپیہ۔ ۲۴،۵۰۰ روپیہ ۵۰۰،۱۹ روپیہ۔ ۳۱،۰۰۰ اور ۳۰۰۰۰ روپیہ صرف ہوں گے۔

ایک ضمنی سوال کا جواب دیتے ہوئے نائب وزیر صنعت نے کہا ان ریاستوں کے لیے ۴۹ قسم کی صنعتوں کو منتخب کر لیا گیا ہے جن کو مقامی وسائل اور خرید و فروخت کی سہولتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خاص خاص جگہوں پر قائم کیا جائے گا۔

ایک دوسرے ضمنی سوال کا جواب دیتے ہوئے شری پھول سنگھ نے کہا کہ مختلف اضلاع میں ان ریاستوں کو قائم کرنے کے سلسلے میں بجلی۔ پانی اور مراسلات وغیرہ کی سہولتوں پر بھی غور کیا گیا ہے۔

منصوبہ بندی ادارۂ تحقیق و عمل کے ذریعہ زراعتی اور صنعتی اسکیمیں چلانے کے لیے اس ماہ کے دوسرے ہفتہ میں ریاست کے چھ ضلعوں میں سروے کا کام شروع کر دیا جائے گا۔

یہ انکشاف ادارہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رام داس نے لکھنؤ میں یکم جون سے ہونے والے پنج روزہ سیمینار میں کیا جس میں کل ہند کھادی اور دیہی صنعتوں کے کمیشن کی ایک جماعت بھی شرکت کر رہی ہے۔

ایک تفصیلی سوال نامہ کو جس میں مقامی وسائل۔ خرید و فروخت کی سہولت وغیرہ سے متعلق دریافت طلب امور شامل ہیں قطعی کر دیا گیا ہے۔ مقررہ صنعتوں کو جن کا انحصار متعلقہ علاقہ کی زراعتی پیداوار پر ہوگا۔ سروے کے بعد فراہم کی جانے والی معلومات کے بعد کیا جائے گا۔

یہ چھ صنعتی اسکیمیں مہداول (بستی)۔ آصف پور (بدایوں) اکھنڈ نگر (سلطان پور) تاری کھیت (الموڑہ) رامپور۔ منی ہارن۔ (سہارن پور) اور دودھی (مرزا پور) میں قائم کی جائیں گی۔ یہ سب ترقیاتی بلاکوں کے

علاقے ہیں۔ ان اسکیموں کو امداد باہمی طرز پر چلایا جائے گا۔

ڈاکٹر رام داس نے سیمینار میں کہا کہ منصوبہ بندی ادارۂ تحقیق و عمل کے ادارہ کے تحت ریاست میں ۱۲ زراعتی اور صنعتی اسکیمیں بھی چل رہی ہیں جن میں سے ۸ شکر کی پیداوار۔ دلدھان پروسیسنگ۔ ایک مونگ پھلی پروسیسنگ ایک غذائی اشیاء کی پروسیسنگ اور ایک گنّا کی کاشت اور اس کو پیرائی سے متعلق ہے۔

حکومت اتر پردیش نے مالی سال رواں کے دوران لوکل باڈیز اور دوسرے امدادی اداروں کو امدادی اسکیم کے تحت مندرج فہرست اقوام کے طلباء کے لیے دیہی علاقوں میں ۱۸ نئے ہوسٹلوں کی تعمیر کے لیے .....۱۸ روپیہ اور ان کے لیے گذشتہ سال شروع کی گئیں اسکیموں کی تکمیل کے لیے .....۵ روپیہ منظور کیا ہے۔ یہ رقم جو تمام ریاست کے لیے ہے انترم ضلع پریشدوں کی تحویل میں دے دی گئی ہے۔

یہ امدادی رقم کسی بھی تسلیم شدہ پرائیوٹ جونیر ہائی اسکول یا انترم ضلع پریشد کے زیر انتظام جونیر ہائی اسکول یا کسی بھی تسلیم شدہ ہائر سکنڈری اسکول کو فی ادارہ .....۱ روپیہ کے حساب سے دی جائے گی۔ علاوہ ازیں ایسے اداروں کو جنھیں گذشتہ سال .....۵ روپیہ کی امداد دی گئی تھی انھیں ان کی اسکیموں کی تکمیل کے لیے .....۵ روپیہ دیا جائے گا۔

اسی امدادی رقم کی قابل ذکر شرطیں یہ ہیں۔ صرف ان اداروں کو امداد دی جائے گی جہاں مندرج فہرست اقوام کے طلباء کی کافی تعداد ہو یا جہاں ایسے ہونہار طلباء ہوں جن کی رہائش کے لیے ہوسٹل کی ضرورت ہو۔ لوکل باڈی یا ادارہ کے ذمہ داران کو تعمیر کی کل لاگت کا کم از کم ۲۵ فی صدی اپنے پاس سے خرچ کرنا پڑے گا۔ حکومت لاگت کا ۷۵ فی صدی یا .....۱ روپیہ دونوں میں سے جو بھی رقم کم ہو اپنے پاس سے خرچ کرے گی۔ مجوزہ ہوسٹل میں کم از کم ۲۵ طلباء کی رہائش کی گنجائش ہونا چاہیئے۔ اور اس میں کھانے کا ایک مشترک کمرہ۔ باورچی خانہ اور پاخانے کا بھی بندوبست ہونا ضروری ہے۔

ہوسٹل کے فرنیچر۔ برتن وغیرہ کے غیر مکرر اخراجات کو کلی یا جزوی طور حکومت برداشت نہ کرے گی۔ اگر فہرست مندرج اقوام کے کافی طلباء دستیاب نہ ہو سکے تو ادارہ میں داخلے کے لیے ۲۵ سے ۴۰ فی صدی تک غیر فہرست مندرج اقوام کے طلباء کا داخلہ کرنا پڑے گا۔

اس امدادی رقم کی ضلع وار تقسیم اس طرح ہے۔ میرٹھ۔ علی گڑھ۔ الہ آباد۔ وارانسی۔ بلیا۔ گورکھپور۔ دیوریا۔ بستی اور اعظم گڈھ کو .....۳ روپیہ فی ضلع سہارنپور۔ مظفر نگر۔ بلند شہر۔ متھرا۔ آگرہ۔ مین پوری۔ بریلی۔ بجنور۔ مراد آباد۔ کانپور۔ اٹاوہ۔ جونپور۔ غازی پور اور اناؤ کو .....۲ روپیہ فی ضلع دہرادون۔ بدایوں۔ رامپور۔ شاہجہانپور۔ پیلی بھیت۔ فرخ آباد۔ فتحپور۔ جھانسی۔ جالون۔ ہمیرپور۔ باندہ۔ مرزاپور۔ نینی تال۔ الموڑا۔ گڑھوال۔ ٹیہری گڑھوال۔ لکھنؤ۔ رائے بریلی۔ سیتاپور۔ ہردوئی۔ کھیری۔ گونڈہ۔ بہرائچ۔ پرتاپگڈھ اور بارہ بنکی کو .....۱ روپیہ فی ضلع۔

اس کے علاوہ فیض آباد میں تین۔ ایٹہ میں دو اور ضلع شاہجہانپور۔ کانپور۔ باندہ۔ رائے بریلی اور گونڈہ میں فی ضلع ایک ایک ہوسٹل کی تکمیل کے لیے ۵-۵ ہزار روپیہ منظور کیا گیا ہے۔

اتر پردیش کے ہر ایک بلاک میں اینٹوں کے ایک ایک بھٹہ کے قیام کا امکان ہے جس کے سبب دیہی علاقوں میں اینٹوں کی فراہمی میں یکسانی پیدا ہو جانے سے وہاں آبپاشی کے چھوٹے ذرائع میں اضافہ ہو جائے گا۔

ڈولپمنٹ کمشنر شری ستیش چندر نے منطقائی ترقیاتی سیمینار میں جو حال میں لکھنؤ میں ہوا تھا اس قدام کی ضرورت پر زور دیا۔ سیمینار میں آبپاشی کے چھوٹے ذرائع سے متعلق ذیلی کمیٹی کی رپورٹ پر بحث و مباحثہ ہو رہا تھا۔

سیمینار میں اس تجویز سے اتفاق کیا گیا کہ آبپاشی کے مقاصد کے لیے کنوؤں کی تعمیر جس کے لیے افراد کو قرضے دیے جاتے ہیں ان کا تجربہ تین طریق کار کے تحت کیا جانا چاہیئے۔ ان کی تعمیر ۴-۵ آدمیوں کی جماعت کے ذریعہ اجتماعی طور پر یا گاؤں پنچایتوں کے ذریعہ یا امداد باہمی انجمنوں کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔ اور جن کو آبپاشی کی بقایا کی صورت میں قرضہ وصول کرنا چاہیئے۔ سیمینار بہر حال اس نظریہ کا حامی ہے کہ اس معاملہ میں انفرادی طور پر حوصلہ افزائی کا طریقہ جاری رکھا جائے۔ اس مقصد کے لیے علاقائی

کمیٹیاں اس وقت سے قرضہ دینا شروع کریں گی جب وہ آئندہ جولائی سے کام شروع کر دیں گی۔ یہ انجمنیں تعمیری کاموں کی رہنمائی بھی کریں گی اور اس کا بھی خیال رکھیں گی کہ اس مقصد کے لیے حاصل کردہ قرضوں کا صحیح مصرف ہو رہا ہے۔

ڈولپمنٹ کمشنر نے گاؤں سبھاؤں کو تعمیری کام سونپ دینے کی خواہش بھی ظاہر کی بشرطیکہ وہ اس کے لیے تیار ہوں۔

انھوں نے اس مشورہ سے بھی اتفاق کیا کہ عمارتی سامان کی دستیابی میں دشواریوں کے پیش نظر قرضوں کو استعمال میں لانے کی مدت اور مکانوں کی تعمیر کی مدت میں ایک سال سے دو سال تک اضافہ کر دیا جائے۔

سیمینار میں اس پر اتفاق رائے تھا کہ تالابوں سے ریت اور کیچڑ نکالنے کے لیے کسی قسم کی امداد نہیں ملنا چاہیئے اور جہاں اس کی ضرورت لاحق ہو یہ کام شرم دان کے ذریعہ انجام دیا جانا چاہیئے۔

اتر پردیش کی جیلوں کی آبادی سنہ ۱۹۶۱ء کے دوران گھٹ گئی۔ قیدیوں کی صحت جیل میں داخل ہونے کے وقت بہتر پائی گئی۔ مدت مذکور میں جیلوں میں ریاست کی روزانہ اوسط آبادی ۳۴۸۹۶ تھی جبکہ سنہ ۱۹۶۰ء میں ان کی آبادی ۳۵۵۱۷ تھی۔ قیدیوں کی صحت کی حالت سنہ ۱۹۶۱ء میں داخلہ کے وقت یوں تھی ــــ اچھی صحت ۳۰٫۹ فی صدی۔ تعدیلی صحت ۹٫۲۹ فی صدی اور خراب صحت ۱۴٫۵ فی صدی تھی جبکہ رہائی کے وقت تفصیل یوں ہے ــــ اچھی صحت ۷٫۳۹ فی صدی۔ تعدیلی صحت ۱٫۶ فی صدی اور خراب صحت ۲ فی صدی۔

وہ جو کبھی ایک قیدی تھا اس وقت اتر پردیش کی جیل میں ویونگ دکٹر (ابتدائی) ماسٹر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ لکھنؤ کی ماڈل جیل ایشیا میں اپنے قسم کی ایک واحد جیل ہے جہاں قیدیوں کو روپیہ پیسہ رکھنے اور بغیر محافظ کے جیل سے باہر جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔

ستار گنج کی کھلی جیل ۵ مربع میل رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے ستار گنج میں قیدی اپنا ڈیری فارم خود چلاتے ہیں۔

عمر قید کے قیدیوں کو بغیر کانٹے دار تاروں اور بغیر محافظ والی جیل میں جیل کی املاک کی حفاظت کرنے کے لیے بلم دیے جاتے ہیں۔

جیل کی صنعتیں سالانہ تیس لاکھ روپیہ سے زائد مصنوعات تیار کرتی ہیں۔

اتر پردیش کے لکھنؤ جیل کے قیدیوں کی فی کس آمدنی ایک عام شہری کی آمدنی سے زیادہ ہے۔ گذشتہ مالی سال میں ۱۲۸ قیدیوں نے فی کس ۳۸۸ روپیہ کمایا۔

ایک عارضی تخمینہ کے مطابق سنہ ۶۲-۱۹۶۱ء میں ریاست میں فی کس آمدنی ۲۶۸٫۱۷ روپیہ تھی جو ماڈل جیل کے قیدی کی ایک سال کی آمدنی سے ۱۲۰ روپیہ کم تھی۔

قیدیوں نے اس ادارے کے متعدد پیشوں مثلاً فیکٹری۔ باغات۔ فارم ڈیری۔ رنگائی کی دوکان اور فرنیچر کی دوکان میں کام کر کے ۴۶۵۶۴ روپیہ کمائے۔

ان قیدیوں نے اپنی اس آمدنی سے ۳۱۷۵۳ روپیہ حکومت کو اپنی نگہداشت اور کفالت کے صلہ میں ادا کیے تاکہ ان کے دل میں یہ احساس پیدا نہ ہو کہ وہ قیدیوں کی طرح اپنی گذر کر رہے ہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف ان کو یہ محسوس ہو کہ وہ عام آزاد شہریوں کی طرح اپنی روزی کما رہے ہیں اور حکومت جو کچھ ان کی گذر اوقات پر خرچ کرتی ہے اس کو وہ ادا کر دیتے ہیں۔

اس خرچ کے بعد ۱۱۰۴۱ روپیہ کی جو رقم بچ گئی وہ ان کے انفرادی اکاؤنٹ میں جمع کر دی گئی۔ قیدیوں نے اس میں سے کچھ روپیہ اپنے بچوں کی تعلیم۔ لڑکیوں کی شادی اور اپنے اہل و عیال کو مالی مشکلات سے نجات دلانے پر صرف کیا۔ انھوں نے گھر چھٹی جاتے وقت ریل گاڑی کے کرایہ اور دوسرے مصارف کے لیے بھی روپیہ لیا۔

ریاستی حکومت نے تمام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو اس امر کی ہدایات جاری کر دی ہیں کہ آئندہ برسات میں سیلاب کی وجہ سے اگر ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں تو امدادی کاموں کو پوری مستعدی کے ساتھ اور جلد سے جلد کیا جانا چاہیئے اور اس سلسلہ میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے برسات شروع ہونے سے پہلے ہی تمام ضروری انتظامات مکمل ہو جانا چاہیئے۔

اس مقصد کے لیے حکومت نے متاثرہ اشخاص، غریبوں ضرورت مندوں اور ناداروں میں امدادی رقم تقسیم کرنے کے لیے

۲۱۸۰۰ روپیہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کی تحویل میں دے دیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے امدادی کاموں سے متعلق متفرق اخراجات مثلاً کشتیاں، گیس بتیاں، خیمہ وغیرہ کرایہ پر حاصل کرنے کے لیے بھی اتنی ہی رقم ان کو دیدی گئی ہے۔ ان کو یہ ہدایات بھی جاری کردی گئی ہیں کہ وہ اس بات کو بھی مدنظر رکھیں کہ فنڈ کی کمی کی وجہ سے سیلاب سے متعلق امدادی اقدامات میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پڑنے پائے۔

ریاستی حکومت نے یہ بھی کہا ہے کہ ضلع مجسٹریٹوں کو سیلاب سے مقابلہ کرنے کے لیے عوام کے اندر مستعدی۔ اجتماعی ذمہ داری اور خودکوشی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ضروری اقدامات کرنا چاہئیے۔ امدادی چوکیوں میں ضروریات زندگی کے تمام ضروری سامان مثلاً چنا۔ گڑ۔ ستو۔ نمک دیاسلائی۔ مٹی کا تیل۔ ضروری دوائیں اور اگر ممکن ہو سکے تو جانوروں کا چارہ بھی کافی مقدار میں رہنا چاہیے۔

ریاست کے ۵۴ ضلعوں میں سے دیہرادون۔ بجنور۔ رام پور۔ فتحپور۔ باندہ۔ نینی تال۔ المورہ۔ گڑھوال۔ ٹیرھی گڑھوال۔ اترکاشی حمولی پیھورا گڑھ کے ۱۲ ضلعوں کو فی ضلع ۱۰۰۰ روپیہ امدادی کاموں کے لیے اور اس کے مساوی رقم متفرق اخراجات کے لیے مخصوص کردی گئی ہے۔ باقی ضلعوں کے لیے ۵۔ ۵ ہزار روپیہ امدادی کاموں اور اتنی ہی رقم متفرق اخراجات کے لیے مخصوص کردی گئی ہے۔

دوسرے پنج سالہ منصوبہ میں آبپاشی کی چھ چھوٹی اسکیموں کے تحت رانی کھیت میں ۱۲۲۵۰ میل کی مجموعی لمبائی کی نالیاں تعمیر کرنے کی تجویز تھی۔ یہ اسکیمیں دوسرے منصوبہ کے دوران نامکمل رہ گئی تھیں لیکن مالی سال رواں میں وہ پایۂ تکمیل تک پہونچ جائیں گی۔ اس سلسلہ میں تقریباً دو تہائی کام ختم ہو چکا ہے۔

ان نالیوں کے مکمل ہو جانے پر ان سے ۸۰۰ ایکڑ زمین میں آبپاشی کی سہولتیں فراہم ہو جائیں گی جس کے سبب ربیع اور خریف دونوں فصلوں میں غلہ کی پیداوار میں ۱۰۰۰ من کا اضافہ ہو جائے گا۔ ان نالیوں کی تعمیر پر تقریباً ۴ لاکھ روپیہ صرف ہونے کا اندازہ ہے اور اس وقت ان کے سبب ۶۰۰ اشخاص روزگار سے لگے ہوئے ہیں۔

اب تک رانی کھیت میں ۲۳۰۰ ایکڑ زمین کی آبپاشی ہو چکی ہے۔ جس میں سے پہلے منصوبہ کے دوران ۱۹۰۰ ایکڑ زمین اور دوسرے منصوبہ کے دوران ۴۰۰ ایکڑ زمین کی آبپاشی کی گئی ہے۔

اس وقت رانی کھیت میں آبپاشی کی نالیوں کی مجموعی لمبائی ۱۷ میل ہے۔ جس میں سے ۶۰ میل لمبی نہر پہلے منصوبہ کے تحت اور ۱۱ میل دوسرے منصوبہ کے تحت تعمیر کی گئی تھی۔

تیسرے منصوبہ میں ۴ لاکھ روپیہ کی تخمینی لاگت سے تین مختلف اسکیموں کے تحت ۱۰ میل لمبی نالیاں بنانے کی تجویز ہے۔ رام گنگا کی وادی میں واقع ۹ مواضعات میں ان نالیوں سے ۶۰۰ ایکڑ قابل کاشت زمین کی آبپاشی کی جاسکے گی۔ جس سے براہ راست ۲۵۰۰ کاشتکار مستفید ہوں گے۔

ان نالیوں کی تعمیر کے سلسلہ میں تقریباً ۵۰۰ غیر ہنرمند اور ۲۰۰ ہنرمند اشخاص کو دو سال کے لیے روزگار کے مواقع فراہم ہو جائیں گے۔

اترپردیش کی گاؤں سبھاؤں کو مالی سال رواں کے دوران منفعت بخش اثاثہ فراہم کرنے سے متعلق اسکیم کے تحت ۱۱٫۷ لاکھ روپیہ کے قرضے دیئے جائیں گے۔ اس میں سے ۵ ضلعوں کی ۵ گاؤں سبھاؤں کو ۳۵۰۰ روپیہ منظور کیا جا چکا ہے۔

پہلے پنج سالہ منصوبہ کے پہلے سال کے دوران اس اسکیم سے جس کا مقصد ۱۰٫۱۱ لاکھ روپیہ کے قرضے مہیا کرنا ہے۔ اترپردیش کے ۲۹ اضلاع کی ۱۷ گاؤں سبھائیں مستفید ہو چکی ہیں ان گاؤں سبھاؤں کو ۲٫۸۶ لاکھ روپیہ کے قرضے دیے گئے جنھوں نے اس کا استعمال ۲۷ منصوبوں پر عمل درآمد کرنے کے سلسلہ میں کر لیا تھا۔

ان گاؤں سبھاؤں کے ذریعہ گذشتہ سال ۱۶ دوکانوں اور مکانوں کی تعمیر۔ چار اجتماعی جنگلات۔ ۱۱ پمپنگ سیٹ۔ ۷ گنا پیرنے والی مشینوں ۱۱ آٹا۔ چاول۔ تیل اور آرا ملوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ علاوہ ازیں باٹ اور بازاروں کو بہتر بنانے۔ کرایہ پر زراعتی آلات کی فراہمی۔ کنوؤں کی تعمیر اور مرمت سے متعلق اسکیمیں بھی ان کے ذریعہ شروع کی گئی تھیں۔ انھوں نے گھریلو اور دیہی صنعتوں کے لیے قرضے بھی دیے۔

اس اسکیم کے تحت گاؤں سبھاؤں کو ان کی مالی حالت بہتر بنانے اور انہیں فلاحی کاموں پر ہونے والے روز افزوں مصارف کا بار اٹھانے کے پیش نظر قرضے دیے جاتے ہیں اور اس سلسلے میں ریاستی حکومت کے متعلقہ محکمہ جات ضروری تکنیکی امداد بہم پہنچاتے ہیں۔

متفرقات

تجارتی اداروں پر پراویڈنٹ فنڈ کا قانون نافذ۔ حکومت ہند نے ملازمین سے متعلق پراویڈنٹ فنڈ ایکٹ ۱۹۵۲ء اور اس کے تحت تشکیل شدہ اسکیم کو تمام ایسے عام کاروباری اور تجارتی اداروں میں گزشتہ ۳۰ اپریل سے نافذ کر دیا ہے۔ جہاں ملازمین کی تعداد ۲۰ یا اس سے زائد ہے۔

مرکزی وزارت صحت و روزگار کے ایک اعلانیہ کے مطابق اس قانون کے دفعات کا اطلاق تمام ایسے کاروباری اداروں پر ہوگا جہاں ۲۰ یا اس سے زائد ملازمین سامان کی خرید و فروخت یا اس کو گوداموں میں جمع کرنے کا کام کرتے ہوں۔ اس کے علاوہ اس میں مال کی درآمد اور برآمد کرنے والے۔ مال کو مشتہر کرنے والے۔ کمیشن ایجنٹ اور آڑھتیوں کے ادارے اور اشیاء اور اسٹاک ایکسچینج کے ادارے بھی شامل ہیں۔ اس قانون کا اطلاق بہرحال ایسے گوداموں اور بینکوں پر نہ ہوگا جو کسی ریاستی یا مرکزی ایکٹ کے تحت قائم کیے گئے ہوں۔

اتر پردیش کے ریجنل پراویڈنٹ فنڈ کمشنر نے اتر پردیش میں اس قانون کے نفاذ کے سلسلہ میں اقدامات شروع کر دیتے ہیں۔ انہوں نے ایک پریس نوٹ کے ذریعہ تمام متعلقہ اشخاص کو ہدایات جاری کر دی ہیں کہ وہ اس سلسلہ میں کسی شک شبہ یا دشواری کی حالت میں ضروری تفصیلات جاننے کے لیے ان کے دفتر واقع ۹/۶۳ آریہ نگر۔ کانپور سے رجوع کریں۔

مہا پالکاؤں کے ملازمین کی ملازمت کے قواعد۔ ودھان سبھا میں سوالات کے وقفہ کے دوران وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ شری دتیہ نرائن ثمرا نے بتایا کہ ریاست کی مہا پالکاؤں کے ملازمین کی ملازمت کے قواعد مرتب کر لیے گئے ہیں اور مستقبل قریب میں نئے قواعد نافذ کر دیے جائیں گے۔

وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ نے جو شری کلیان چندر موہلے کے اصل سوال سے متعلق ضمنی سوالات کا جواب دے رہے تھے کہا کہ اس سلسلہ میں قواعد مرتب کیے جا چکے ہیں۔ اور مہا پالکاؤں کے ذریعہ ان پر کیے گئے اعتراضات بھی حکومت کو موصول ہو چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت موصول شدہ اعتراضات پر غور کر رہی ہے۔ اور جلد ہی آخری فیصلہ کا اعلان کر دیا جائے گا۔

یہ دریافت کیے جانے پر کہ ان قواعد کی تشکیل میں دو سال سے زائد کا عرصہ کیوں لگا۔ وزیر موصوف نے کہا کہ قواعد کی تشکیل سے قبل کئی متعلقہ محکموں سے تبادلۂ خیالات کیا گیا تھا۔

شری موہلے۔ کیا حکومت بتائے گی کہ مہا پالکاؤں اور پالکاؤں کے ملازمین کو وہی سہولتیں دی جاتی ہیں جو سرکاری ملازمین کو دی جاتی ہیں۔

وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ۔ جی نہیں۔ تمام سہولتیں نہیں دی جاتی ہیں۔ کیونکہ مہا پالکاؤں اور نگر پالکاؤں کی شرائط ملازمت ان سرکاری قواعد اور احکامات سے مطابقت نہیں رکھتیں جن کا اطلاق سرکاری ملازمین پر ہوتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مہا پالکاؤں اور نگر پالکاؤں کے ملازمین پر بالترتیب اتر پردیش نگر مہا پالکا ایکٹ ۱۹۵۹ء اور اتر پردیش میونسپلٹیز ایکٹ ۱۹۱۶ء کا اطلاق ہوتا ہے۔

جانوروں کی لاش کی دوگنی قیمت۔ محکمہ نگہداشت مولیشیان کے ذریعہ گائے۔ سانڈ۔ بیل اور بھینس میں سے ہر ایک کی لاش کے لیے اس کے مالک کو جو پانچ روپیہ کی رقم ادا کی جاتی تھی اس کو بڑھا کر ۱۰ روپیہ کر دیا گیا ہے۔

یہ محکمہ لکھنؤ کے اندر جانوروں کی لاشیں اٹھانے کی اسکیم بھی چلا رہا ہے جس کے تحت کوئی بھی شخص جو اس سہولیت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے وہ ۹۸۹۴۷ نمبر پر فون کر کے جانوروں کی لاش اٹھانے والی موٹر حاصل کر سکتا ہے۔

گورکھپور میں کیمیاوی کھاد کا کارخانہ۔ مرکزی حکومت نے قطعی طور پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ کیمیاوی کھاد کا جو کارخانہ قائم کیا جانے والا ہے وہ گورکھپور میں کھولا جائے۔

گورکھپور میں کیمیاوی کھاد کا کارخانہ قائم کرنے کے بارے میں

وزارت دفاع نے جو اعتراضات پہلے کیے تھے وہ واپس لے لیے ہیں۔ یہ اعتراضات وزارت دفاع نے ریاستی حکومت کی اس یقین دہانی پر کہ وہ جگہ کے بارے میں عائد کی گئی تمام شرطوں کو مان لے گی واپس لے لیے ہیں۔ یہ اطلاع وزیر اعلےٰ شری سی۔ بی گپتا نے ودھان سبھا میں شری نرسنگھ نرائن پانڈے کے سوال کا جواب دیتے ہوئے سوال کے وقفہ میں دی۔

چندراول بند اور کیولاری تالاب کی تعمیر سنہ ۶۱-۱۹۶۲ء میں ہمیرپور میں چندراول ذخیرۂ آب اور کیولاری تالاب کی تعمیر سے متعلق اسکیموں پر کام شروع کردیا گیا۔ اور امید ہے کہ سنہ ۱۹۶۳ء میں کیولاری تالاب سے اور سنہ ۱۹۶۵ء میں ذخیرۂ آب سے آبپاشی کا کام شروع ہو جائے گا۔

یہ اطلاع ودھان پریشد میں نائب وزیر ڈاکٹر رام نرائن پانڈے نے شری نولکشور گرودیو کے ایک سوال کے جواب میں دی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ارل ذخیرۂ آب کی اسکیم کو چوتھے پنچ سالہ منصوبہ میں شامل کرنے کے سوال پر بعد میں غور کیا جائے گا۔ ڈاکٹر پانڈے نے جو وزیر آب پاشی کی طرف سے سوال کا جواب دے رہے تھے مزید بتایا کہ مذکورہ اسکیموں پر گذشتہ مالی سال میں ۴ لاکھ روپیہ خرچ کیے جا چکے ہیں۔

جولائی سے تین زبانوں کے اصول پر عملدرآمد ۔ ریاستی حکومت نے ہائر سکنڈری کے مرحلہ پر تین زبانوں کو شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ تجویز قومی یکجہتی کمیٹی نے پیش کی تھی اور اگست سنہ ۱۹۶۱ء میں منعقدہ وزرا اعلیٰ کی کانفرنس نے اس کی سفارش کی تھی۔ آئندہ تعلیمی سال سے تین زبانوں کی تعلیم شروع کرنے کی تجویز ہے۔

اترپردیش ودھان سبھا میں سوالات کے وقفہ کے دوران یہ اطلاع دیتے ہوئے وزیر تعلیم نے بتایا کہ تین زبانوں کے اصول پر جس میں ہندی انگریزی اور دستور میں مندرج ۱۴ زبانوں میں سے ایک زبان شامل ہے چھٹے درجہ سے عملدرآمد کیا جائے گا۔

شری گیندا سنگھ کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر تعلیم نے مزید بتایا کہ منتخب پرائمری اسکولوں میں تیسری جماعت سے صرف ان طلبا کو بحیثیت اختیاری زبان انگریزی پڑھانے کا بندوبست کیا گیا ہے جو آئندہ انگریزی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ انھوں نے پورے وثوق کے ساتھ بتایا کہ تیسری جماعت سے انگریزی کسی طرح سے بھی لازمی مضمون نہیں ہے۔

۲۵ نایاب کتابوں کی اشاعت کی اسکیم ۔ ریاستی محکمۂ اطلاعات کی ہندی سمتی کے ذریعہ ۲۵ نایاب کتابوں کی اشاعت کی ایک اسکیم وضع کی گئی ہے جس کے تحت علم اللسان سے لے کر آسٹروفزکس تک کے مختلف موضوعات پر مشہور مصنفین کی کتابیں شائع کی جائیں گی۔ اس اشاعتی پروگرام کے سلسلہ میں تقریباً ۳ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ جس کا مالی سال رواں میں بندوبست کیا جا چکا ہے۔

سال رواں کے لیے مقرر کردہ کل نشانہ میں سے اب تک نصف درجن کتابیں زیر طباعت ہیں اور آسٹروفزکس پر ڈاکٹر نہال کرن سیٹھی کی تصنیف "تارا بھونکی" شائع ہو چکی ہے۔ جن کتابوں کی طباعت تکمیل کے مرحلہ میں ہے ان کے نام یہ ہیں — تانتر کا ادب (مصنف مہا مہوپادھیائے پنڈت گوپی ناتھ کوی راج) تاریخ عالم (مصنف ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی۔) دھرم شاستر کی تاریخ (مصنف مہامہوپادھیائے شری۔ دی۔ بی کانٹرے۔) آدیائی زبانیں (فرانسیسی مصنف جے بلون شے۔ مترجم شری لکشمی ساگروارشنے) تاریخ ریاضیات (مصنف ڈاکٹر برج موہن۔ بنارس یونیورسٹی۔)

ہندی سمتی نے ہندی کی ترقی کے پیش نظر اپنے سہ مقصدی پروگرام کے تحت سنہ ۵۷-۱۹۵۶ء سے اشاعت کا کام شروع کیا تھا۔ اس پروگرام میں ہندی زبان میں سائنس اور تکنیکی ادب کا اضافہ کرنا۔ ہندی میں تکنیکی موضوعات پر تصانیف کے لیے مصنفین کی حوصلہ افزائی کرنا۔ جس کی ہندی میں بہت مانگ ہے اور ہندی میں اعلےٰ تعلیم کے لیے جدید موضوعات پر مطلوبہ ادب کی فراہمی کرنا شامل تھا۔ ہندی سمتی کی پنچ سالہ مدت قیام میں مجموعی طور پر ۱۴۶ کتابیں شائع کی جا چکی ہیں جو مختلف علوم سے متعلق ہیں۔ جس میں طبیعات۔ کیمیا۔ معدنیات۔ حیاتیات صنعتی کیمیا اور فلکیات وغیرہ شامل ہیں۔ سمتی کی دو مطبوعات کی طباعت دوبارہ ہوئی ہے اور تیسری مطبوعہ ہلایدھ کوش جو ہندی کی لغت ہے دوبارہ زیر طباعت ہے۔ سال رواں کی مجوزہ اسکیم میں مہا پنڈت راہل کی تصنیف پالی ادب کی تاریخ بھی شامل ہے۔

نقد و تبصرہ

آدمی میں چراغ از : خواجہ غلام السیدین ناشر : انڈین اکیڈمی ۲۹. نریندرا پیلس ۔ نئی دہلی ۔

یہ خواجہ غلام السیدین کے مضامین کا مجموعہ ہے ۔ مصنف نے ان مضامین کے تین حصے کیے ہیں ۔ پہلے حصے کا عنوان ہے "ابدی قدریں" ۔ دوسرے کا عنوان ہے "صحبت اہل صفا" اور تیسرے کا "مستقبل کی پرچھائیاں" ۔ پہلے عنوان کے ماتحت بعض بانیان مذاہب کی تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ دوسرے عنوان کے ماتحت بعض شخصیات کی سیرت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور تیسرے عنوان کے ماتحت نئے ہندوستان کے جدید تقاضوں سے بحث کی ہے ۔ خواجہ غلام السیدین ملک کے ایک ممتاز ماہر تعلیم ہی نہیں بلکہ ایک مفکر اور اردو کے ایک بلند پایہ ادیب اور متعدد اہم کتابوں کے مصنف ہیں ۔ چنانچہ زیر نظر کتاب صرف ادبی نقطۂ نگاہ سے بلکہ اپنے فکری عنصر کی وجہ سے اردو میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ یہ مضامین جو بہ ظاہر "بانیان مذہب پر بھی ہیں، سیاسی لیڈروں پر بھی، سماجی مصلحوں پر بھی ادیبوں اور شاعروں پر بھی، مصنف کے بعض عزیزوں پر بھی اور ہندوستان کے مستقبل پر بھی مختلف موقعوں پر لکھے گئے ہیں لیکن ان سب میں ایک قدر مشترک پائی جاتی ہے ۔ یعنی یہ سب کسی نہ کسی شکل میں ان قدروں کی ترجمانی کرتے ہیں " جن کو زندگی کی صحیح اور صالح تشکیل کے لئے" مصنف ضروری سمجھتے ہیں ۔ اور یہ قدریں در اصل وہ اقدار ہیں جو "آدمی" کو "انسان" بناتی ہیں اور جن کی عظمتوں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ۔ مصنف نے ان قدروں پر اپنی "تمہید" میں جو بجائے خود ایک مضمون ہے کافی بحث کی ہے ۔ شخصیات میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر اقبال، سید راس مسعود، خواجہ غلام الثقلین، مجتبائی خاتون اور سیدہ خاتون شامل ہیں ۔ لیکن ان شخصیات پر لکھا گیا ہو یا مذہبی رہنماؤں اور جدید ہندوستان کی قومی تحریکوں پر ۔ ہر مضمون میں مصنف کی انشا پردازی، زور قلم، مفکرانہ انداز، ایک مخصوص اسلوب اور ایک سلاست و شگفتگی جلوہ گر ہے ۔ جا بجا اشعار کے مناسب و برمحل استعمال سے مضامین کی ادبی چاشنی اور بھی بڑھ گئی ہے ۔ کتاب حسن معنوی کے ساتھ حسن ظاہری سے بھی آراستہ ہے اور آفسیٹ کاغذ پر بڑی دیدہ زیبی سے طبع ہوئی ہے ۔ (ص ۔ ع)

تالیف : نواب میر محمد خاں بہادر سرور مرتبہ : ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
عمدۂ منتخبہ ناشر : شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی قیمت : بیس روپے

عمدۂ منتخبہ نام ہے نواب اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں بہادر سرور کے تذکرۂ شعرائے اردو کا۔ نواب اعظم الدولہ سرور امرائے دہلی میں تھے ۔ ان کا انتقال ۳۳-۱۸۳۲ء میں ہوا ۔ شعر و شاعری کا اچھا ذوق پایا تھا ۔ انیسویں صدی کی ابتدا ([illegible]ء) میں انھوں نے "اشعار ریختہ ماضی و حال" کو جمع کرنا شروع کیا اور [illegible]ء میں یہ تذکرہ مکمل ہوا ۔ اس میں اردو کے ۹۹۶ شاعروں کا مختصر حال مع نمونۂ کلام کے پیش کیا گیا ہے ۔ تذکرہ، اس عہد کے عام دستور کے مطابق، فارسی میں لکھا گیا ہے اور شعرا کی ترتیب ابجد کے حساب سے رکھی گئی ہے ۔ صاحب تذکرہ یعنی سرور نے اپنے تذکرے کے سلسلے میں میر، مصحفی، ذکا وغیرہ کے تذکروں کا ذکر کیا ہے جو عمدۂ منتخبہ سے پہلے لکھے گئے تھے اور غالباً ان سے استفادہ بھی کیا ہے ۔ بعد میں دوسرے تذکرہ نویسوں، مثلاً قاسم اور شیفتہ نے اپنے تذکروں کی تیاری میں عمدۂ منتخبہ سے فائدہ اٹھایا ۔ عمدۂ منتخبہ کئی حیثیتوں سے ایک اہم کتاب ہے ۔ وہ اردو کے اصلی ماخذوں میں ہے ۔ اس میں اکثر شعرا کے حالات یا تو ذاتی معلومات کی بنا پر لکھے گئے ہیں یا ان کے حالات فراہم کرنے میں تلاش و جستجو سے کام لیا گیا ہے ۔ پہلے تذکروں کے مقابلے میں اکثر شعرا کے حالات زیادہ تفصیل سے دیئے گئے ہیں ۔ کہیں کہیں شعرا کی سیرت اور ان کے معاصرین کا بھی حوالہ دیا گیا ہے ۔ اس کتاب کے صرف تین قلمی نسخے پائے جاتے ہیں ۔ ایک لندن میں، دوسرا پیرس میں اور تیسرا کراچی میں ۔ اس طرح ہر آدمی کی دست رس اس کتاب تک نہ تھی ۔ لیکن اس کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے اسے اپنے سلسلۂ مخطوطات اردو کی پہلی کتاب کی حیثیت سے بڑی عرق ریزی کے بعد اچھے ٹائپ میں رائل سائز کے تقریباً ۸۵۰ صفحات پر اسے شایع کر دیا ہے ۔ کتاب کے مرتب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ہیں جنھوں نے لندن کے نسخے سے اس کا عکس حاصل کیا ۔ اس کتاب کے مؤلف اور کتاب کے بارے میں شروع میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے ۔ مرتب نے کتاب میں بہ کثرت حواشی دے کر اس کی افادیت میں اور اضافہ کر دیا ہے ۔ مؤلف تذکرہ (سرور) نے جو شعر انتخاب کیے ہیں اگر ان میں سے کوئی شعر دوسرے تذکروں میں کسی دوسری طرح لکھا ہے تو فٹ نوٹ میں ان تذکروں میں مندرج شعر یا مصرع دے دیے گئے ہیں ۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کو اس مشکل کام میں رشید حسن خاں صاحب سے مدد ملی ہے ۔ (ص ۔ ع)

سخن مختصر از : معین احسن جذبی ناشر : انجمن ترقی اردو، علی گڑھ
قیمت : دو روپے ۔

معین احسن جذبی اردو کے ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے اپنی شعر گوئی کے ابتدائی دور ہی میں نیے ذوقِ کلام، جدت تخیل اور بلندی فکر کا ہر خاص و عام سے اعتراف کرا لیا تھا اور آج بھی دور جدید کے اردو شعرا کی صف میں انھیں ممتاز مقام حاصل ہے ۔ وہ اگرچہ کم کہتے ہیں لیکن جتنا کہتے ہیں اس میں ان کی انفرادیت اور

مخصوص رنگ کی گہری چھاپ پائی جاتی ہے۔ "محفلِ عشق" ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے جس میں ۱۹۳۵ء سے اب تک کی نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ دیکھنے میں مختصر ضرور ہے مگر اپنی گہرائی اور گیرائی، معنی و مفہوم، بندش و تراکیب کے لحاظ سے بڑی وسعتوں کا حامل ہے۔ جذبی موجودہ سماج اور حالات سے ناطمئن ہیں اور ان کے اکثر و بیشتر اشعار ان کی اسی بے اطمینانی کا پرتو ہیں۔ وہ خود ایک نظم "میری شاعری اور نقاد" میں کہتے ہیں۔

میں وہ نقاش ہوں کھویا ہوا اپنا نقاش جس کے ہر نقش میں، تخئیل کے ہر پیکر میں
مسکراتی ہو بہانے سے روحِ آلام

اور آخر میں یہ امید ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب "انجمن اور ساز بدلیں گے اور بحر گانے والوں کے بھی انداز بدل جائیں گے"۔ حالات سے اس درجہ بیزاری ان کی شدت پسندی ظاہر کرتی ہے کیونکہ ایسی نگاہیں بھی ملیں گی (اور ان کی تعداد بہت ہے) جو یہ دیکھ رہی ہیں کہ انجمن بھی بدل گئی ہے اور ساز بھی، ایک نئی محفل سجائی جا رہی ہے لیکن ابھی وہ پوری طرح آراستہ نہیں ہوئی۔ اس لئے اس محفل میں بیٹھنے والوں اور حصہ لینے والوں کو ذرا صبر سے کام لینا چاہیے اور اس قدر مایوس نہ ہو جانا چاہیئے۔ بہرحال، جذبی ان قنوطیت پسندوں میں نہیں ہیں جن کے لئے آزادیٔ وطن بھی کوئی پیغام نہیں لائی۔ وہ اپنی "تلخ نوائی" کے باوجود ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی صبح کو ابھرنے والے سورج کے لئے یہ دعا مانگتے ہیں کہ "تری آب میں اور بھی تاب آئے"۔ تقسیمِ وطن پر وہ اس انداز میں نالہ کناں ہوتے ہیں:

اے وہ عقاب جس سے تھی کوہ و دمن کی آبرو آج اسی عقاب کے بال ادھر ہیں پر اُدھر

اور جب ایک خاص ہستی ترکِ وطن کرتی ہے تو ان کی حب الوطنی ان سے بے ساختہ یہ کہلا دیتی ہے۔

محبانِ وطن کی آنکھ نیچی ہو گئی جذبی ہمارے شاعرِ ہندوستاں نے جب وطن بدلا

مجموعہ کی غزلوں کے چند شعر پیش ہیں:

کم بخت دلِ تو صیدِ خود ہو کے رہ گیا زلف و نگاہ کے رم و سبک دام کیا کریں
دلکش ہے یاد زلف و رخِ دلبراں مگر یہ ذکر دلنشیں بھی سحر و شام کیا کریں
یہ کہہ کے چھوڑ دی راہ خود مرے دل نے قدم قدم پہ جو ٹھوکر نہیں تو کچھ بھی نہیں

لیکن یہ کھویا ہوا نقاش جس کے ہر پیکرِ تخئیل میں روحِ آلام مسکراتی ہے کبھی کبھی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو ہی جاتا ہے اور اسے کہنا پڑتا ہے کہ

ابھی پڑی تھی خم و پیچ زندگی پہ نظر کہ ان کی زلفِ شکن در شکن کی یاد آئی

(ص۔ ع)

تنقید و تجزیہ

از: ابو محمد سحر ناشر: کتابستان۔ ۱۷۔ کملا نہرو روڈ۔ الہ آباد۔ قیمت: تین روپے۔

یہ ابو محمد سحر صاحب کے آٹھ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلا مضمون "تنقید اور اصولِ تنقید" ہے جس میں انھوں نے تنقید کے اصولوں پر بحث کی ہے۔ ان اصولوں پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ "نقاد کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ ایک کھلا ہوا ذہن رکھے"۔ (۲) ادب اور ادیب کی عظمت تسلیم کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ نقاد اس کے نظریات سے پوری طرح متفق ہو (۳) ادب اور ادیب کے متعلق مستند معلومات فراہم کرنا ضروری ہے۔ تنقید کے لئے یہ اصول واقعی بڑے اہم ہیں اور سید ابو محمد سحر صاحب نے اپنے مضامین میں ان اصولوں کو پوری طرح نباہا ہے۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی لکھا ہے اس کے تقریباً تمام گوشوں کا احاطہ کر لیا ہے مگر دیانت داری اور صحت مند تنقید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ ان کے مضامین کی ایک اور خصوصیت ہے کہ ان میں غیر متعلق بحث اور طولِ کلامی سے اجتناب کیا گیا ہے، الجھاؤ نہیں پایا جاتا اور اپنے نقطۂ نظر کو بڑی وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ مضامین کی فہرست یہ ہے۔ ۱۔ تنقید اور اصولِ تنقید۔ ۲۔ غبارِ خاطر کا تنقیدی مطالعہ ۳۔ ناسخ۔ معتقدِ میر ۴۔ اقبال کے قومی تصورات اور عقیدہ پرستی ۵۔ حالی بحیثیت قصیدہ گو۔ ۶۔ عزیز لکھنوی کی غزل گوئی ۷۔ غالب اور فلسفہ۔ ۸۔ آزادی کے بعد اردو شاعری۔ ۹۔ میر کی قصیدہ نگاری۔ ۱۰۔ دبستان لکھنؤ کا۔ ریختی پس منظر اور تعیش پسندی۔ مؤخر الذکر مضمون کے متعلق البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جملہ عیوب کے ساتھ کاش ہنر بھی بیان کر دیے جاتے (ص۔ ع)

ایک چادر میلی سی

از: راجیندر سنگھ بیدی۔ ناشر: مکتبہ جامعہ جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت: دو روپے ۵۰ نئے پیسے

راجیندر سنگھ بیدی اردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگار ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ان کا پہلا ناول ہے۔ اس میں پنجاب کے متوسط گھرانوں کی روزمرہ زندگی کی بڑی مؤثر عکاسی کی گئی ہے۔ ناول میں تفصیل کے بجائے بلیغ اور معنی خیز اشاروں سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں مختصر جملوں میں سماج پر بھرپور طنز کیا گیا ہے۔ ناول کا پلاٹ چست ہے۔ کردار اسی دنیا کے جیتے جاگتے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ اندازِ بیان تیکھا، مؤثر اور موضوع سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے۔ البتہ وہ کہیں کہیں زیادہ بے باک ہو گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی "ایک چادر میلی سی" اردو کے افسانوی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ (ع۔ ح)

وکرم اروشی

مترجم ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی۔ ناشر: شورائی روابط فرہنگی ہند (انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز)، نئی دہلی۔ ہند قیمت:

مشہور سنسکرت ڈراما نگار کالی داس کے شہرۂ آفاق ڈرامے وکرم اروشی کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی نے اب اس کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا آسان کام نہیں ہوتا مگر ڈاکٹر عابدی اس مشکل کام سے بڑی اچھی طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ (س۔ ع)

عروسِ تمنا

از: حامدی کاشمیری۔ ناشر: ادارۂ ادب۔ بہوری کدل سری نگر، کشمیر۔ قیمت: دو روپے پچاس نئے پیسے۔

حامدی کاشمیری کے افسانوں کا ایک مجموعہ اور تین ناول شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ انھوں نے اپنے ماحول کا گہرا مطالعہ کیا ہے اس لئے ان کی شاعری محض تخیلی نہیں بلکہ اس میں زندگی اور معاشرے کے تلخ حقائق کا ادراک بھی ملتا ہے۔ قدیم روایات کے ساتھ انھوں نے جدید افکار کو بھی اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔ عروسِ تمنا کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

مجھ کو اور غوطِ تلاطم ہو ید ناممکن ہے — ڈوب کر موجوں میں پایا ہے کنارا میں نے
جانے کس کے لئے ہوں چشم براہ — یوں تو تیرا بھی انتظار نہیں
عینِ منزل پہ بھی مجھے اے دوست — رہگزاروں کی یاد آتی ہے

(ع۔ح)

شہرِ دل

از: محسن زیدی۔ ناشر: مرکزِ ادب۔ نیا محلہ پل بنگش، دہلی (۶)۔ قیمت۔ دو روپے

یہ محسن زیدی کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ ان کی شاعری میں وجدان اور شعور کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اور فکری عنصر کے ساتھ ان کے کلام میں عصری رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔ مجموعے کے چند اشعار پیش کئے ہیں۔

نہ جانے کیا ہوئے پلکوں سے آنسو — نہیں کوئی چراغِ رہگزر بھی
اب کیا بتائیں کیا وہ تقاضے ہیں زیست کے — جینے پہ اہلِ غم کو جو مجبور کر گئے
اہلِ چمن نے یہ بھی کیا ہے کبھی کبھی — خود ہی چمن کو لوٹ لیا ہے کبھی کبھی

بت اور طباعت اور سرورق عمدہ اور جاذبِ نظر ہے۔ (ع۔ح)

ارمغانِ نعت

از: ساجد صدیقی و والی آسی۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ دین و ادب، احاطۂ خام، لکھنؤ۔ قیمت تین روپے۔

نعت نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ایک صنفِ سخن کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ پیغمبرِ اسلام ہی کے عہد سے نعت گوئی کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ آج تک قائم ہے اور آئندہ بھی قائم رہے گا۔ اس عرصے میں ان تینوں زبانوں میں نہ معلوم کتنی نعتیں تصنیف ہوئیں۔ مرتبین نے اس کتاب میں عربی، فارسی اور اردو کی مشہور نعتوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں تمام نعتیہ کلام جمع ہو گیا ہے مگر جتنا بھی جمع کیا گیا ہے اس میں شک نہیں کہ اس کے لئے کافی کاوش کرنا پڑی ہوگی۔ بہرحال، اس سے مرتبین کے خلوص اور حُبِّ رسول کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب کے شروع میں نعت کے ارتقا پر والی آسی کا ایک طویل اور قابلِ ذکر مقدمہ ہے۔ (ص۔ع)

ثری اور ثریا

از: نواز جعفری۔ مطبعہ۔ یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۳۔ نوروجی اسٹریٹ، ممبئی۔ ۲۔ قیمت۔ چار روپے۔

نواز جعفری ایک خوش گو شاعر ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ میں ۹۲ غزلیں، ۴۴ نظمیں، ۶۷ قطعات اور ۱۵ رباعیاں شامل ہیں۔ جس سے ان کے ذوق کی ہمہ گیری کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ ان کی شاعری بنیادی طور پر قدامت پسندانہ معلوم ہوتی ہے ہاں کہیں کہیں جدید رجحانات کا پرتو بھی ملتا ہے۔ غالباً انھوں نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ ہر غزل میں جتنے بھی قافیے ممکن ہو سکتے ہوں نظم ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کے بہت سے اشعار قافیہ پیمائی کے نذر ہو گئے ہیں۔ بہرحال ان سب میں زبان اور فن کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ نظمیں مختلف موضوعات پر کہی گئی ہیں۔ جن کا انداز بیانیہ ہے۔ اشعار میں زبان کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ کتابت کی غلطیاں بے شمار ہیں۔ (ع۔ح)

اسلامی سوانح عمریاں

از: مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم۔ ناشر: مکتبۂ کلیاں، لکھنؤ۔ قیمت: تین روپے

اردو کے مشہور ناول نگار اور مورخ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم نے چند قدیم علمائے اسلام کے مختصر سوانحِ حیات پہلے اپنے رسالۂ "دل گداز" میں پھر کتابی صورت میں شائع کیے تھے کتابی ایڈیشن اب نہیں ملتا تھا۔ مکتبۂ کلیاں نے اب اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں بارہ مشہور علمائے اسلام مثلاً ابو اسحٰق شیرازی، قاضی ابو یوسف، ابنِ صائغ اندلسی، عبداللہ ابنِ مبارک وغیرہ کے مختصر حالات درج ہیں۔ (ص۔ع)

پاکستان کی بساطِ سیاست

از: خواجہ غلام محمد۔ ملنے کا پتہ: کوچہ روح اللہ خاں۔ دہلی (۶)

قیمت: تین روپے پچاس نئے پیسے۔

یہ کتاب قیامِ پاکستان کے بعد سے پاکستانی سیاسیات کا ایک جائزہ ہے جو پاکستانی اخبارات اور بعض پاکستانی حضرات کے بیانات کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اس میں بڑی تفصیل سے یہ بتایا گیا ہے کہ پاکستانی سیاسیات میں کون کون قوتیں برسرِ کار رہیں، مختلف پاکستانی حکومتوں کی کیا حکمتیں رہی ہیں، موجودہ حکومت کے اربابِ حل و عقد کا کیا طریقۂ کار ہے اور پاکستانی عوام کی اس تمام عرصے میں کیا حالت رہی ہے۔ کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے دو ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں اور تیسرا ایڈیشن ہے (ص۔ع)

جوششِ رحمت

از: سی، ایف، رموز۔ مترجم: مظہر الحق علوی۔ ناشر: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔ قیمت: چار روپے

یہ ناول ایک مشہور فرانسیسی ناول نگار رموز کے ایک شاہکار کا ترجمہ ہے۔ کہانی کوہِ الپس کے دامن میں بسے ہوئے ایک چھوٹے سے گاؤں کی ہے جس میں اس گاؤں کے رہنے والے عام آدمیوں کی بود و باش، معاشرت اور سادہ محبت کے واقعات دلچسپ انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ مصنف کو یورپ کی پہاڑی زندگی کا عملی تجربہ ہے۔ اس لیے ان علاقوں میں رہنے والوں کو جن حادثات اور خطرات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے انھیں بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ (م۔ع)

پوسٹ مارٹم

از عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی۔ ناشر: قصرِ ادب پبلیکیشنز، پری گھاٹ بھوپال (ایم۔ پی) قیمت۔ دو روپے ۵۰ نئے پیسے

زیرِ نظر کتاب بھوپال پنچ کے مدیرِ اعلیٰ تخلص بھوپالی کے طنزیہ اور مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں دلچسپ اور منفرد انداز میں کنھیا لال کپور، شعری بھوپالی

شاکر علی خاں، نادم سیتاپوری، کیف بھوپالی اور مصنف کے دیگر احباب اور واقف کاروں کے خاکے پیش کئے گئے ہیں ۔ مخلص بھوپالی کے مزاح میں شگفتگی و تازگی کے ساتھ گہرائی بھی ہے ۔ اور جا بجا بھرپور طنز کے چھینٹے بھی ملتے ہیں ۔ (ع ۔ ص)

اردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ (یگانہ چنگیزی، سکندر علی وجد اور اختر شیرانی) ناشر: انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۔ قیمت: ۵۰ نئے پیسے (فی کتاب)

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے اردو کے مشہور شاعروں کے کلام کے انتخاب کا ایک سلسلہ اس لئے شروع کیا ہے کہ جو لوگ کسی وجہ سے کسی شاعر کا سارا کلام نہیں پڑھ سکتے انھیں اس کے کلام کا ایک انتخاب پڑھنے کا موقع مل جائے تاکہ وہ اس کے رنگ سے متعارف ہو جائیں ۔ زیر تبصرہ کتابچے اردو کے تین مشہور شاعروں یگانہ چنگیزی، وجد اور اختر شیرانی کے کلام کا انتخاب ہیں ۔ یہ تینوں حضرات کسی تعارف کے محتاج نہیں اور انھوں نے اردو شاعری کی دنیا میں اپنی جگہیں الگ نکالی ہیں ۔ (ص ۔ ع)

پنڈت نہرو سے بات چیت از ٹیبر منڈی ۔ مترجم ۔ سعادت علی خاں ناشر: پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ، اولڈ سکریٹریٹ، دہلی ۔ قیمت ۔ دو روپے ۔

مشہور مصنف ٹیبر منڈی اور وزیر اعظم پنڈت نہرو کے درمیان بات چیت کو جو ۳۱ دسمبر ۱۹۵۵ء اور جنوری ۱۹۵۶ء کے درمیان ہوئی تھی، کتابی شکل میں شایع کیا گیا ہے ۔ (ع ۔ ح)

ابوالکلام آزاد ناشر: پبلیکیشنز ڈویژن، منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ اولڈ سکریٹریٹ، دہلی ۔ قیمت ۔ دو روپے ۔

ماہنامہ آج کل، دہلی نے آزاد نمبر شائع کیا تھا۔ جس کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے ۔ اس میں مشاہیر علم و ادب نے مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی حیات اور سیرت پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے ۔ (ع ۔ ح)

کتب موصولہ

کلام بے لگام حصہ چہارم ۔ از ۔ این ۔ بی سین ناشاد ۔ ناشر نیو بک سوسائٹی آف انڈیا ۔ پوسٹ بکس ۲۵، نئی دہلی چاروں حصوں کی قیمت ۔ چھ روپے ۔

انتخاب کلام چکبست از روپ نرائن شیو پوری، شاکر ۔ ملنے کا پتہ ۔ شری پی کے ۔ گرٹو ایڈوکیٹ، ۲۵ ۔ لاٹ ٹن، امین آباد ۔ لکھنؤ ۔ قیمت ۔ ۷۵ نئے پیسے ۔

وہمی مزاحیہ ڈرامہ ۔ ناشر: سب رس کتاب گھر، خیریت آباد حیدرآباد (آندھرا پردیش) قیمت: ایک روپیہ پچاس نئے پیسے ۔

فرانس کے نامور مزاحیہ ڈراما نگار مولی ایر کے شاہکار کو جو ایک صاحب طرز ادیب تھے وزیر حسن نے حیدرآباد کے پس منظر میں اردو کا جامہ پہنایا ہے ۔

جغرافیہ کے متعلق مغربی محققین کی غلطیاں از: محبوب خاں مجنوری ۔ ملنے کا پتہ ۔ مدینہ پریس بجنور ۔ قیمت ۔ ۴۴ نئے پیسے ۔

ادبی تجزیے از: پروفیسر منیشر علی صدیقی ۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ۔ جامعہ نگر دہلی ۔ قیمت: ڈیڑھ روپیہ ۔

جشنِ آزادی از: مسعود اختر جمال ۔ ناشر: کتاب گھر، چھوٹی بازار جہان آباد ۔ رائے بریلی ۔ قیمت: ۷۵ نئے پیسے ۔



سال گرہ کا تحفہ

(بسلسلۂ صفحہ ۳۶)

دیکھ کر وہ کہنے لگیں یہ آپ نے بے کار اتنی تکلیف کی، ہم اتنا قیمتی تحفہ ہرگز نہیں رکھیں گے ۔ اسے آپ اپنے ساتھ واپس لے جائیے گا ۔ میں نے ساری آپ بیتی بتلاتے ہوئے کہا کہ کرسی آپ رکھیں یا نہ رکھیں لیکن اسے واپس لے جانے کی ہمت مجھ میں قطعی نہیں ہے ۔ اگر واپس ہی کرنا ہو تو آپ لوگ خود اپنے ساتھ اسے کبھی لکھنؤ لے آئیے گا ۔

اس کے بعد میں نے سوچا کہ اب شری ستی جی کی ہدایت کے مطابق جو بین کو کرسی پر بٹھا کر پیار بھی کر لینا چاہیے ۔ لہٰذا بڑے فخریہ انداز سے آہستہ آہستہ بندھی ہوئی رسیاں کھولنے لگا ۔ اب سب لوگ کرسی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور دھیرے دھیرے آس پاس آکر کھڑے بھی ہو گئے تھے ۔ رسیاں کھولتے ہی میں نے بڑی پھرتی سے کاغذ ہٹایا تو اپنا یہ حال تھا کہ "کاٹو تو لہو نہیں بدن میں" بلٹو مستری نے بغیر پالش کرائے اور بغیر بنائے کرسی پیک کرا دی تھی!



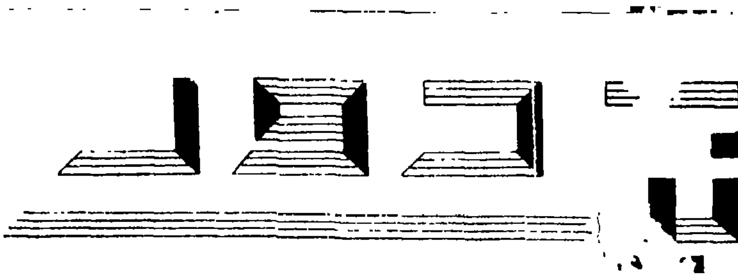
بھادوں ۱۸۸۴

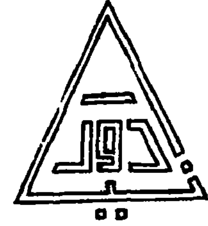
ستمبر ۱۹۶۲ء

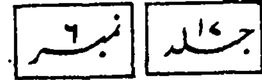
17(6)



۵۰
نئے پیسے







بھادوں ۱۸۸۴

ستمبر ۱۹۶۲ء

چندہ سالانہ : پانچ روپے

فی پرچہ : پچاس نئے پیسے

ایڈیٹر

صباح الدین عمر

پبلشر

امیر بھوشن ملک

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر

جے۔ ڈبلیو۔ ہارلے

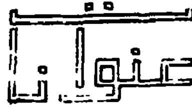
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ

نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش



اپنی بات

آزادی بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہوتی بلکہ حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا مقصد بھی محض آزادی نہیں بلکہ ہندوستان کے رہنے والوں کو اقتصادی حیثیت سے خوش حال بنانا اور ملک میں ایک نئے سماج کی تشکیل کرنا تھا۔ یہ مقصد آزادی ملنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب آزادی حاصل ہو گئی اور ملک میں قومی حکومتیں قائم ہوئیں تو انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے اقدامات شروع کئے۔ ان اقدامات کے نتیجے میں ہندوستان کے ہر حصے میں ایک انقلاب رونما ہو رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے ملک میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ اترپردیش کا ہر شہر اور دیہات بھی اس انقلاب سے متاثر نظر آتا ہے۔ اگر آزادی کے ہر سال کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ آج کے اور اب سے پندرہ سال پہلے کے اترپردیش میں ایک نمایاں فرق ہو گیا ہے۔ پندرہ اگست ۱۹۶۲ء کو ہماری آزادی کی پندرھویں سالگرہ تھی۔ ہر برس کا ذکر نہیں، آزادی کے اس سال یعنی ۱۵ اگست ۱۹۶۱ء سے ۱۵ اگست ۱۹۶۲ء تک اترپردیش میں جو تعمیری اور ترقیاتی کام ہوئے ہیں اگر انھیں پر روشنی ڈالی جائے تو اس کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا۔ مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں ترقی نہ ہوئی ہو۔ اس ترقی سے شہر اور دیہات سبھی مستفید ہو رہے ہیں بلکہ دیہات کی حالت خاص طور پر بدل رہی ہے کیونکہ ہماری آبادی کی اکثریت دیہاتوں ہی میں بستی ہے۔ زیرِ تبصرہ سال میں اس سمت سب سے بڑا قدم یہ اٹھایا گیا کہ علاقائی کمیٹیاں اور ضلع پریشد قائم کئے گئے جن کے تحت گاؤں، بلاک اور ضلع کی سطح پر مختلف ترقیاتی کاموں کے لئے عوام کو سارے اختیار دے دیے گئے۔ اب ضلع پریشد اور علاقائی کمیٹیاں اور پنچایتیں الگ الگ واحدوں کی حیثیت سے سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے ہیں یہاں تک کہ ضلعوں کی سرکاری مشینری پر بھی ان کی نگرانی ہے۔ اصلاحاتِ اراضی کے سلسلے میں آزادی کے پندرھویں سال ۱۲ شہری علاقوں میں زمینداری ختم کر دی گئی اور چکبندی کی اسکیم میں توسیع ہوئی۔ آبپاشی کا ایک پروگرام بنایا گیا جس کے تحت تیسرے پنج سالہ منصوبے کی مدت ختم ہونے سے پہلے کل مزروعہ علاقے کے ۳۱ فی صد حصے میں آبپاشی کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔ آبپاشی کی مختلف اسکیموں پر زیرِ نظر سال میں ۹۲ کروڑ روپیہ بھی خرچ کیا گیا۔ زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کی غرض سے متعدد کامیاب اقدامات کئے گئے۔ دیہی علاقوں میں امداد باہمی انجمنیں قائم کی گئیں۔ اس وقت اترپردیش کے دیہاتوں میں ان انجمنوں سے [illegible] میں صنعتی ترقی کے لئے اس سال ۴۵ کروڑ روپیہ کے سرمایہ سے بڑی اور درمیانی صنعتوں کے لئے ۹۰ لائسنس دیے گئے، ۱۴۰ نئی فیکٹریوں کا رجسٹریشن ہوا [illegible] کو ۵,۹۴ کروڑ روپے کی لاگت کے تین مرکزی صنعتی منصوبے الاٹ ہوئے۔ اسی سال ریہاند بند (جو اترپردیش میں بجلی کا سب سے بڑا منصوبہ ہے) پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کے علاوہ کئی جگہ بجلی گھر قائم کئے گئے۔ مزدوروں کے معاشی حالات بہتر بنانے کے لئے سوتی کپڑے اور شکر کی ملوں میں اجرت بورڈ کی سفارشوں پر عمل کیا گیا۔ مزدوروں کے ۶۰ فلاحی مرکزوں کی مدد سے انھیں علاج معالجہ، تعلیم اور تفریح کی آسانیاں بہم پہنچائی گئیں۔ اپریل ۱۹۶۲ء سے بڑھاپے کی پنشن کے قواعد نرم کر دیے گئے۔ تیسرے منصوبے کے پہلے سال کے دوران ۶۰۰ میل پکی سڑکیں اور ۱۱۱ میل کچی سڑکیں بنائی گئیں۔ ۳۰۰ میل لمبی پکی سڑکیں ازسرِنو تعمیر کی گئیں۔ ۶۰ میل لمبی سڑکوں کو جدید طرز کے مطابق بنایا گیا۔ اسی سال ۱۶ پلوں کی تعمیر مکمل ہوئی۔ تعلیم کے شعبے میں قومی یکجہتی کو تقویت دینے کی غرض سے [illegible] زبانوں کی تعلیم دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ابتدائی تعلیم کی توسیع کے لئے ۶۲۰۰ پرائمری اسکول کھولے گئے اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے بھی خاص [illegible] اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کیا گیا۔ علاج معالجہ کی سہولتوں میں اضافہ کرنے کی غرض سے ۳۰ یونانی، آیورویدک اور ہومیوپیتھک دواخانے کھولے گئے [illegible] ہسپتال قائم کئے گئے۔ الہ آباد میں ایک نیا میڈیکل کالج کھولا گیا۔ سماجی فلاح کے میدان میں شہر اور محلہ سماج کمیٹیوں نے [illegible] شہری زندگی کو ترقی دینے کی غرض سے دیہاتوں میں کلیان سمتیاں قائم کی گئیں۔ فہرست مندرج اقوام کے طلبا کو تعلیمی سہولتیں فراہم کی گئیں [illegible] انسانی تربیت وغیرہ کے لئے [illegible] ۔ پولیس کمیشن نے پولیس میں اصلاحات کے لئے جو سفارشیں کی تھیں وہ سب منظور کر لی گئیں۔ اترا کھنڈ کے علاقے کے باشندوں کو مختلف شعبوں میں آسانیاں بہم پہنچانے کی غرض سے مؤثر اقدامات کئے گئے۔ زیرِ نظر سال میں مزید ۳۰ ضلعوں میں عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کرنے کی اسکیم نافذ کی گئی۔ سائنس اور فنونِ لطیفہ کی ہمت افزائی کے لئے مؤثر کارروائی کی گئی۔ یہ مختصر جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں آزادی کے پندرھویں سال ہر شعبے میں ترقیاتی کاموں کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ [illegible] سرکار کی تعمیری مہم جاری ہے اور اس مہم کو سر کرنے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے عوام کا اشتراک اور تعاون ضروری ہے۔ —— (ادارہ)

غزل

روشؔ صدیقی

خدا کرے کہ گوارا ہو اہلِ دُنیا کو
سکوں ملا ہے مرے دردِ بے مسیحا کو

بہت بلند ہوا آفتابِ عقل مگر
یقیں کی ایک کرن مل سکی نہ دُنیا کو

یہ ایک موجِ غمِ عشق ہی تو ہے جس نے
دیا ہے قطرۂ دریا کا درد دریا کو

تری بلا ہو پشیماں خیالِ فردا سے
بھُلا دیا ہے محبت نے خوابِ فردا کو

یہ سوچتا ہوں کہ اب تجھ سے کیا سوال کروں
ترے خلوص نے شرما دیا تمنا کو

ہے دل شکستۂ دردِ فراق ہر ذرّہ
سمجھ رہا ہوں زبانِ سکوتِ صحرا کو

یہ رندِ توبہ شکن کون ہے کہ ساقی نے
جھجک کے روک دیا دورِ جام و مینا کو

گریزِ عشق بنا، حُسنِ پاکیٔ داماں
نیازِ عشق نے رسوا کیا زلیخا کو

کہاں کہاں سے بہاروں کو کھینچ لائے ہیں
سجا دیا ہے ترے وحشیوں نے صحرا کو

رَوشؔ! کسی نے کیا رازدانِ شکر مجھے
قبول کر کے مرے شکوہ ہائے بے جا کو

غزل

سراجؔ لکھنوی

ہر اشکِ صبر، دستِ شرابِ طہور تھا
پھر ایسے آنسوؤں کا تو پینا ضرور تھا

ساقی خدا گواہ، محبت ہے خود شراب
برسوں رہا ہوں نشے میں جب تجھ سے دور تھا

کام اپنا کرتی ہی رہی بے مہری نگاہ
شیشہ، قبولِ عکس سے پہلے ہی چور تھا

ہم حدِّ ممکنات سے آگے نہ بڑھ سکے
اُتنا سمجھ لیا تجھے جتنا شعور تھا

آنکھیں جھکی جھکی سی، تبسم فروشِ لب
کیا خوب اعترافِ شکستِ غرور تھا

انصاف بھی تو شرط ہے، اے دشمنِ وفا!
اتنی ہی سرزنش بھی ہو جتنا قصور تھا

لو آج اُسے بھی پائے طلب نے کچل دیا
خودداریوں پہ اپنی ہمیں جو غرور تھا

ممکن ہے میرا غم نہ ہو کچھ اور بات ہو
لب پر بُجھا بُجھا سا تبسم ضرور تھا

خود مُڑ کے دیکھ، وقت ابھی شیشہ بہ دست ہے
کل تک ادا میں رنگِ شکستِ غرور تھا

کشتی ڈبو دی تھی اسی پانی نے اے سراجؔ
ان آنسوؤں میں آگ لگانا ضرور تھا

ادب میں ہیئت اور تکنیک کا مسئلہ

اطہر پرویز

ہیئت اور مواد کا ایک دوسرے سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ اس لیے پیش تر اس کے کہ ہم ادب کی ہیئت اور تکنیک پر بحث کریں، اس کے مواد کو سمجھنا ضروری ہے۔

ادبی مواد کے سلسلے میں عام طور پر لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ اسے موضوع اور مرکزی خیال سے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ ایک ہی موضوع کی ادبی تخلیقات کا مواد الگ الگ ہو سکتا ہے۔ مثلاً مہابھارت، راماین، ایلیڈ کا موضوع ایک ہی ہے لیکن ان کے مواد مختلف ہیں۔ جہاں تک مرکزی خیال کا تعلق ہے یہاں ہم کو مواد کا ایک ہلکا سا خاکہ نظر آتا ہے۔ ہر چند اس خاکے میں اس کے موضوع کی نشان دہی مل سکتی ہے لیکن اس کے باوجود اتنی نشان دہی موضوع کے اظہار کے لیے کافی نہیں ہے اس لیے اس مرکزی خیال کے ارد گرد بہت سے موضوعات پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حضرت یوسف کی کہانی کا مرکزی خیال ایک فقرے میں پیش کیا ہے۔ "شخصے بود، پسرے داشت، گم شد، باز یافت۔" اب اسی مرکزی خیال پر مختلف موضوعات کی کہانیاں لکھی جا سکتی ہیں۔ اس لحاظ سے ادب میں مرکزی خیال کی کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں ہے۔ راماین کی کہانی کا مرکزی خیال، ایک معمولی سی کہانی میں پیش کیا جا سکتا ہے لیکن تلسی داس نے اس میں ایسا مواد پیش کیا ہے کہ اس کا شمار دنیا کے بڑے ادب میں ہوتا ہے۔

جہاں تک موضوع کا تعلق ہے سنسکرت ادب میں اس کی تقسیم نو رسوں کی شکل میں کی گئی۔ ان میں انسانی زندگی سے متعلق تمام تر موضوعات کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ یہ نو رس ہیں، ویر (بہادری)، رتی (عشق و محبت)، شانت (سکون و امن)، کرودھ (غصہ)، ہاسیہ (مزاح)، شوک (رحم)، بھے (خوف)، جگپس (نفرت) اور وسمائے (تحیر)۔ سنسکرت کا تمام ادب ان نو رسوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

یہ تو ہوئی مواد کی بات، لیکن اس مواد کے بارے میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اس مواد کو ایک مخصوص شکل اختیار کرنے کے لیے ایک تخلیقی عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس تخلیقی عمل کا ایک حصہ اس کی تکنیک کہلاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ بات تو صاف ہو گئی کہ ادبی تخلیق کسی وجدانی طریقے سے نہیں ہوتی یعنی اس کا تخلیقی عمل اضطراری نہیں ہے بلکہ سوچا سمجھا ہوا ہے۔ حالاں کہ جسے ہم اضطراری عمل کہتے ہیں، ماہرین نفسیات کے نقطۂ نظر سے وہ بھی کسی سوچے سمجھے جذبے کا فوری نتیجہ ہے۔ تاہم اگر یہ مان لی جائے کہ اضطراری عمل ایک قسم کا وجدانی عمل ہے تو یہ طے ہے کہ ادب کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دیوانے کا بول تو ہو سکتا ہے کیوں کہ دیوانے کو اپنے اعصاب پر قابو نہیں ہوتا اور وہ اپنے خیالات کو منظم نہیں کر سکتا مگر یہ کسی ادیب کا تخلیقی عمل نہیں ہو سکتا۔

یہ اصول صرف ادب پر ہی عائد نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے احاطے میں تمام فنون لطیفہ آ جاتے ہیں کیوں کہ ان کا تخلیقی عمل بھی سوچا سمجھا اور شعوری ہوتا ہے۔ کسی فرد کا خواب کبھی فن نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ وہ سماج کی مقرر کی ہوئی ان علامتوں میں منتقل نہ کیا جائے جنھیں سوسائٹی نے اپنے اجتماعی تجربے سے وضع کیے ہیں۔ ان خوابوں کو سماجی لباس سے آراستہ کرنا ضروری ہے۔ اس کی مثال ہم اس طرح دے سکتے ہیں کہ کسی خاص آواز کو ہم اس وقت تک موسیقی کا درجہ نہیں دے سکتے جب تک کہ وہ آواز سماج کے بنائے مقررہ اصول پر پوری نہ اترے۔

یہی اُس کی تکنیک ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہیئت اگر ایک سانچا ہے تو تکنیک وہ گُر ہے جس سے سانچے کے ڈھالنے میں مدد لی جاتی ہے۔

اَدب کا تخلیقی عمل ادیب کے شعور کی پیداوار ہے۔ یہ بنیادی طور پر دو چیزوں سے مل کر بنتا ہے۔ مواد اور ہیئت۔ یہاں ہم نے ہیئت کو ایک وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے جس میں اُس کی تکنیک بھی شامل ہے۔

ہم ایک ناول کا مطالعہ کرتے ہیں اُس میں جو واقعات کرداروں کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں وہ ناول کے مواد کا ایک حصّہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ جس طرح ایک پلاٹ کی شکل میں مرتّب کیے جاتے ہیں وہ اُس کی ہیئت اور تکنیک کا ایک حصّہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم مواد اور ہیئت کو علٰحدہ طور پر محسوس کرتے ہیں، ہر چند کہ انھیں ایک دوسرے سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ ہر ادبی مواد اپنی ہیئت اور ہیئت کی تکنیک خود منتخب کرتا ہے۔ داماٹن کی کہانی کو اگر طربیہ شاعری کا لباس پہنایا جائے تو یہ لباس جگہ جگہ سے چاک ہو جائے گا۔ ایک اچھے ادب کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کا مواد اپنی ہیئت سے اس طرح گھُل مل جائے کہ ہم اُسے علٰحدہ نہ کر سکیں۔ اگر کسی مواد کو مناسب ہیئت نہ ملے تو وہ بھرپور طور پر ظاہر نہیں ہو سکتا۔

کسی اَدبی تخلیق کے لیے ایک مخصوص ہیئت اور تکنیک ضروری ہے۔ اگر مناسب ہیئت مل جائے تو اُس کی اَدبی حیثیت مسلّم ہو جاتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ادیب یا شاعر تکنیک پر پورے طور پر قادر ہو اس لیے کہ یہ ادب کی بنیادی شرط ہے اس کے بغیر کسی اَدبی تخلیق کو ادبی درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ عظیم اَدب کے لیے عظیم خیال کی بھی شرط ہے کیوں کہ اَدبی مواد ہی اس کی قدروں کا تعیّن کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اُردو شاعری میں اگر ہم داغ کے کلام کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ داغ کا موضوع اُردو غزل کی خالص عاشقانہ شاعری ہے اس لیے اس موضوع سے متعلق ہیئت اور اس ہیئت کی تکنیک کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے لیکن اس کے باوجود داغ کی گنتی اُردو کے چوٹی کے شاعروں میں نہیں کیوں کہ اُن کی شاعری کا مواد اعلیٰ اقدار کا حامل نہیں ہے۔ اَدب کی عظمت کا انحصار اس کے مواد پر ہے جس کے اندر قدریں پیش کی جاتی ہیں۔

ہر زبان میں ہیئت کی اپنی اپنی روایتیں ہیں۔ اُردو اور فارسی شاعری میں ان کی نوعیت انگریزی سے مختلف ہے۔ یہ ہیئتیں قصیدہ، غزل، مثنوی، مرثیہ اور جدید نظم کی شکل میں نظر آتی ہیں۔ نثر میں ہمیں اس کی مختلف ہیئتیں ناول، ڈرامے، مختصر افسانے اور انشائیہ وغیرہ کے روپ میں نظر آتی ہیں ہیئتیں کوئی دائمی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ یہ تبدیلی شعوری بھی ہوتی ہے اور غیر شعوری بھی۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ فارم یا ہیئت شاعر کو پابند کر دیتی ہے اور اس کا خیال مجروح کرتا ہے۔ لیکن ہیئت کی یہ پابندی غلامی کی پابندی نہیں بلکہ آزادی کے حدود مقرر کرتی ہے۔ یہ حدود وہ ہیں جن سے نہ صرف شاعر یا ادیب واقف ہوتے ہیں بلکہ عام پڑھنے والے بھی اُن سے آشنا ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھیں بھی مروجہ ہیئت کو سمجھنے میں کوئی دقّت نہیں ہوتی۔

پروفیسر احتشام حسین نے اپنے ایک مضمون "مواد اور ہیئت" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "خیالات کی تبدیلی اور ہیئت کی تبدیلی کے درمیان بڑا فرق ہے۔ ہیئت کا سانچہ بن کر اس طرح دماغ کی تخلیقی صلاحیتوں کو اس میں ڈھال لیتا ہے اور اس طرح دماغ کے کام کرنے والوں کے لیے ایک نیا راستہ بنا لیتا ہے کہ فن کار کے دماغ کو بالعموم وہی پرانا سہارا کافی ہو جاتا ہے اور جب تک اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ اس کے خیالات مروّج سانچے میں ناقص شکل میں ڈھلتے ہیں اس وقت تک ہیئت کی تبدیلی کی طرف نہیں جاتا۔"

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پُرانے مجوزہ اصُول ترک کر دینا چاہیے کیوں کہ اُن کے نزدیک پُرانے اصُول زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ لوگ بغاوت کرتے ہوئے ان اصُولوں کو ترک کر کے انفرادی تجربے کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فن کی شکل بگڑ جاتی ہے اور وہ اپنی قدریں بھی کھونے لگتا ہے۔ ہیئت کے لیے یہ قطعاً ضروری نہیں کہ اصُولی طور پر وہ قدیم ہی ہو۔ ہیئت نئی بھی ہو سکتی ہے مگر وہ من مانے طریقے سے نہیں بنتی۔ زمانے اور ادب کا مواد اپنے لیے خود ہیئت کی تشکیل کرتا ہے۔ ترمیم و تنسیخ کا اصُول یہاں بھی جاری رہتا ہے۔ فرسودہ اور بے جان ہیئتیں پیچھے ہٹتی جاتی ہیں اور ان کی جگہ نئی ہیئتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ اکثر و بیش تر پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس تبدیلی میں کون کون سے عناصر کام کر رہے ہیں لیکن یہ ہوتی رہتی ہیں۔

ہیئتوں میں یہ تبدیلی اُس وقت آتی ہے جب وہ ہیئت، اُس عہد کے خیالات کو ظاہر کرنے سے معذور ہو جاتی ہے۔ مثلاً داستانوں کا فارم ہمارے آج کے کرداروں کے لیے نامناسب ہے۔ اس لیے داستانوں کی ہیئت ہمارے

آج کے تقاضوں کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے ادب کی محفل سے رخصت ہوگئی۔

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ لوگ انفرادی یا جماعتی طور پر کسی ہیئت کو ایجاد کرتے ہیں۔ ناول کا فارم اچانک کسی کے ذہن پر منکشف نہیں ہوا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وقت کے ساتھ اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ایک نئی ہیئت ہمارے سامنے آئی اور پھر اس کے مسائل کو دیکھتے ہوئے اس کی ہیئت بھی مرتب ہوئی۔

جب آدمی کا ذہن ترقی کر لیتا ہے تو اُس کے سوچنے کے ساتھ اظہار کی قوت بھی بڑھ جاتی ہے اور خیالات گہرے ہوتے جاتے ہیں اور ادبی قوانین ہوں کہ ان خیالات کو بہتر طریقے سے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور سامعین کے درمیان ایک ربط قائم کرتے ہیں اس لیے ادیب اُن کو اختیار کر لیتا ہے۔ اُس کا مقصد خود کہنا اور خود سمجھنا نہیں بلکہ دوسروں کے سامنے اپنے خیالات کو پیش کرنا ہے۔

اس طرح ہم نے اس تجزیے کی روشنی میں دو بنیادی نتائج اخذ کیے ایک تو یہ کہ الفاظ خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہیں اور دوسرے یہ کہ الفاظ نے جو ہیئت اختیار کی ہے وہ خیالات کے بالکل مطابق ہے۔ یہاں زبان بڑا اہم فریضہ ادا کرتی ہے کیوں کہ وہ ابلاغ کا ذریعہ ہے۔ اگر کسی شاعر یا ادیب کو اپنی زبان پر اچھی طرح قابو نہ ہو، اسے محاورے پر دسترس نہ ہو تو اُس کو اپنے خیالات کے اظہار میں دقت ہوگی اور پڑھنے والوں اور ادیب، شاعر کے درمیان صحیح ذریعہ ابلاغ قائم نہ ہو سکے گا۔ زبان کا صحیح استعمال اُس کے مقصد میں ہے۔ اگر وہ اپنے مقصد کو پورا نہ کر سکے تو خیالات کی ساری اہمیت رکھی رہ جائے گی۔ ادیب یا شاعر کا کام یہ ہے کہ اُسے الفاظ پر اتنا قابو ہو کہ اُسے اپنی بات کہنے کے لیے الفاظ کے انتخاب میں دقت نہ ہو۔ ادیب کو چاہیے کہ الفاظ کا استعمال ایسا نہ ہو کہ عبارت پیچیدہ ہو جائے۔ اس سے خیال اُلجھ کے رہ جائے گا۔ اسی لیے یہ مطالبہ کرنا غلط نہ ہوگا کہ شاعر یا ادیب کی نظر میں اُس کے پڑھنے والے ضرور رہیں تاکہ اُسے ان کے حدود بھی معلوم ہوں۔ کوئی آدمی محض اپنے اندر ہی زندہ نہیں رہتا۔ وہ دوسروں کی زندگی میں بھی زندہ رہتا ہے اور اس کی روزمرہ زندگی دوسروں کی زندگی اور اُن کے عمل کو متاثر کرتی ہے اس لیے کوئی شخص اپنے آپ کو سماج سے علٰحدہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ جس سماج میں رہتا ہے اُس کا فرض ہے کہ اس سماج کے بارے میں اُسے پورا علم ہو تاکہ وہ جو بات کرے اُسے دوسرے سمجھ سکیں۔ کوئی ادیب یہ نہیں چاہتا کہ لوگ اُسے سمجھنے سے قاصر رہیں اس لیے بات کو زور دینے کے لیے وہ زبان کے مختلف طریقوں سے کام لیتا ہے۔ ایک ہی لفظ ایک جگہ مہمل ہو جاتا ہے اور دوسری جگہ وہ معنی آفرینی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ ہر زبان کے الفاظ کی روایت ہوتی ہے اور وہی اس زبان کا مزاج بننے میں مدد دیتی ہے۔ کسی زبان کے ادیب اور شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُس کے مزاج اور آہنگ سے واقف ہو اور اُسی وقت وہ الفاظ کا صحیح انتخاب کر سکتا ہے۔ میر انیس نے بڑی خوب صورتی سے اپنے ایک بند میں اس کو پیش کیا ہے ؎

ہے کجی عیب مگر حُسن ہو ابرو کے لیے　　تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
سُرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے　　زیب ہے خالِ سیہ عارضِ گُل رو کے لیے

دانا آں کس کہ فصاحت بکلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

اس سلسلے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ شاعر یا ادیب اپنی بات کو بھرپور جذبے کے ساتھ ظاہر کرنے کے لیے تشبیہ اور استعارے کی مدد لیتا ہے تشبیہ اور استعارے بات کو واضح اور اختصار سے کہنے میں مدد دیتے ہیں۔ کالی داس نے شکنتلا میں ایک جگہ راجہ دشینت کی زبان سے کہلایا ہے کہ "راج کاج کا حساب چھاتے کا سا ہے جس کی موٹھ تھام کر آرام کے ساتھ تھکن بھی بڑھ جاتی ہے" یا میر کا شعر ہے ؎

یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانند جام مے
یا تھوڑی دور ساتھ چلو میں نشہ میں ہوں

یہاں اگر تشبیہ کی مدد نہ لی جاتی تو بات پوری کیفیت کے ساتھ ادا بھی نہ ہوتی اور اگر پوری کیفیت کا اظہار بلا تشبیہ کیا جاتا تو طوالت کا اندیشہ تھا چنانچہ تشبیہ نے اس مشکل کو آسان کر دیا۔ جہاں تک استعارے کا تعلق ہے جب کوئی شاعر استعارے کو استعمال کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ الفاظ کو اُن کے لغوی معنوں سے زیادہ توجہ کر استعمال کر رہا ہے: اس کے ذریعے شاعر ایک ذہنی تصویر کو اُبھارنا چاہتا ہے۔ استعارہ ہمیشہ زندگی سے لیا جاتا ہے ایسی زندگی جس سے ہم اور آپ اچھی طرح مانوس ہوں اور جسے سمجھانے کے لیے کسی منطق کی ضرورت نہ پڑے۔ دوسرے لفظوں میں معنی کو استعارے کے ذریعے اُبھارا جاتا ہے اور اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ارسطو استعارے کے استعمال کو بڑے شاعر کی خصوصیت سمجھتا ہے۔ سنسکرت کی شاعری میں تشبیہ اور استعارے کی نہ صرف غیر معمولی فراوانی ہے بلکہ اس میں غیر معمولی حسن بھی ہے۔

زبان کا معرض وجود میں آنا بہ ذاتِ خود ایک استعارہ ہے جہاں ایک جانی پہچانی چیز کو ایک اَن جان لفظ سے منسوب کرتے ہیں۔ کسی بات کو سمجھانے کے لیے یہ طریقہ جس طرح زندگی میں رائج ہے اسی طرح ادب میں بھی مستعمل ہے یعنی ہم جب کسی خیال کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو پڑھنے والے کو کسی جانے پہچانے خیال کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ طریقہ غیر فطری نہیں ہے کیوں کہ روزمرہ زندگی میں ہم اس کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ کہنے کے لیے کہ بخار تیز ہے ہم کہتے ہیں کہ سارا جسم پھنکا جا رہا ہے یا بھُنا جا رہا ہے۔ یہ ادب میں استعارہ کہلاتا ہے۔

اب آئیے ادب کو مجموعی حیثیت سے دیکھیں۔ ادب تخلیق کرتے ہوئے ادیب کے ذہن میں ادب کی تشکیل مواد اور ہیئت کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتی۔ وہ تو اک اکائی کی شکل میں اُس کے ذہن میں جلوہ گر ہوتا ہے جیسے ہڈی اور گوشت۔ اس لیے تخلیقی عمل سے پہلے شاعر یا ادیب کے ذہن میں ہر چیز صاف ہونا چاہیے۔ اگر اُس کے ذہن میں اُس کا خیال جسے وہ پیش کرنا چاہتا ہے صاف نہ ہوگا تو اُس کا اظہار بھی گنجلک ہوگا۔ یہاں مواد اور ہیئت دونوں متاثر ہوں گے۔ اگر جذبے میں صداقت اور خلوص نہیں ہے، اگر خیال پورے طور پر ذہنی گرفت میں نہیں تو ہیئت بھی اپنا کام نہیں کر سکتی۔ صورت کی صحیح تصویر تو صورت گر کے ذہن میں پہلے اُبھرتی ہے۔

ادیب کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ خیال فوراً الفاظ کی شکل میں اس کے ذہن میں منتقل ہو جاتا ہے اور ادیب اُس کے اظہار کے طریقے ڈھونڈھتا ہے۔ یہاں اس خیال کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں لیکن اس خیال کی ادائگی کے لیے ایک ہی ہیئت سب سے زیادہ مناسب ہوگی۔ اس وقت وہ اسی ہیئت کی شکل دے گا جس میں سب سے بہتر اظہار ہو سکے گا۔ شعر پہلے ذہن میں کروٹیں بدلتا ہے اور اس دوران میں خیال اس کے لیے بہترین سانچہ تلاش کرتا ہے۔ یہاں اگر ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ ہیئت کسی مصنوعی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ اس طرح کا اضطراری عمل (واضح رہے کہ یہ اضطراری عمل خود پہلے سے سوچا سمجھا ہے) اور تخلیق کے اوّلین مدارج میں وہ شعور کی ساری منزلیں طے کر چکا ہے اور پھر شاعر کے فکر و نظر سے متاثر ہو کر ہمارے سامنے مکمل شکل میں آتا ہے۔

ادب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُس کا کوئی بھی موضوع ہو لیکن وہ اپنے پیش کرنے کے طریقے اور اپنے اسلوب سے ہمارے ذوقِ جمال کو آسودہ کرتا ہے اور ہمیں لطف و انبساط بہم پہنچاتا ہے۔ یہاں ادب کے فکری، جذباتی اور تخیلی عنصر سے انکار کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ جس طرح ادب میں عقل، جذبے اور تخیل کی کارفرمائی سے ہمارا ذہن لطف لیتا ہے اسی طرح ہم اُس کی ہیئت اور اسلوب سے بھی مزا لیتے ہیں۔ ہیئت اپنی جگہ کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے اس لیے یہ ہیئت ہر لمحہ ادب کو متاثر کرتی رہتی ہے اور ہم کسی مواد کا بغیر اُس کی ہیئت کے تصوّر کر ہی نہیں سکتے۔ اس کا تو مواد سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر کوئی ادب اُن کے درمیان توازن نہ قائم کر سکے تو اس کا ادبی درجہ گر جائے گا۔ پڑھنے والے کا تعلق محض ایک سے نہیں ہوتا بلکہ دونوں سے ہوتا ہے۔ وہ کہانی پڑھتے ہوئے کہانی بھی پڑھتا ہے اور کہانی سے متعلق موضوع سے بھی دلچسپی لیتا ہے۔ یا ہم مثال کے طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ایک درزی کو سوٹ سینے کے لیے بڑا قیمتی کپڑا دیتے ہیں۔ جب یہ سوٹ سِل کر آتا ہے اُس وقت ہم سوٹ کو مجموعی طور پر دیکھتے ہیں۔ اگر درزی اپنے فن سے اچھی طرح واقف نہیں ہے تو وہ اُس کی سلائی بھی اچھی نہ کر سکے گا اور جب ہم اُس کپڑے کو پہنیں گے تو یہ کپڑا قیمتی ہونے کے باوجود ہمیں ایک خاص لطف سے محروم کر دے گا جس کی ذمہ داری محض تکنیک پر ہے۔ یہاں کپڑے کا حسن بھی متاثر ہوگا اور مجموعی طور پر ہماری رائے کو خراب کر دے گا۔ لیکن اگر کپڑا اچھا سلا ہوگا تو ہم ایک طرف تو کپڑے کی اپنی خصوصیت سے لطف اندوز ہوں گے اور دوسری طرف اس کی تکنیک یعنی سلائی سے بھی ہمیں خوشی حاصل ہوگی۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ کپڑا اور اُس کی سلائی کا فن دونوں ہمارے لیے لطف اندوز ہونے کا سبب بنتے ہیں۔ یہی حال ادب کا ہے، جہاں ہم کو ایک طرف تو اُس کے مواد سے خوشی ہوتی ہے وہاں دوسری طرف اس کی تکنیک بھی مسرت بہم پہنچاتی ہے۔

ہیئت اور تکنیک کی اہمیت ادب میں مواد کے مقابلے میں کسی طرح بھی کم نہیں ہے اس لیے کہ ہیئت کی خرابی مواد کو متاثر کرتی ہے۔ گندے برتن میں اچھے سے اچھا کھانا بھی خراب ہو جائے گا اور ہم اس کھانے کے بارے میں اچھی رائے نہ قائم کر سکیں گے چاہے وہ اپنے جنس کے اعتبار سے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ادب میں بھی اگر ہیئت اپنے مواد سے علاحدہ ہو کر بدنما نظر آ رہی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں کے درمیان صحیح رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ ایسے موقعے پر ہم یہی کہیں گے کہ فنی تخلیق ناقص رہ گئی ہے۔ چوں کہ شاعر کے ذہن میں اس کی صحیح تشکیل نہیں ہوئی اسی لیے یہ بات پیدا ہو گئی۔ فنی تخلیق کا عمل صبر آزما ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین نے قدرتی ادب کی وضاحت کرتے ہوئے بڑی خوبصورتی اور سادگی سے اس پر روشنی ڈالی ہے: "قدرتی ادب پیدا ہونے میں دنیا بھر کے بکھیڑے ہیں۔ زرخیز طبیعت کی زمین ہو، ریاضت کے ہل سے جوتی جائے، اس میں خیال کا بیج پڑے، زندگی کے مشاہدے سے کھاد، ہوا اور روشنی پہنچے، آرٹ کے اُبلتے ہوئے سوتوں سے سینچائی ہو، تب جا کر کہیں شعر و ادب کی کھیتی اُپجے اور اُس سے وہ غذا حاصل ہو جس کی ہماری روح کو ضرورت ہے۔"

جب ہم کالی داس، اِبسن، شیکسپیر وغیرہ کے ڈرامے پڑھتے ہیں یا کیٹس، شیلی اور غالب وغیرہ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں یا ڈکنس، ٹالسٹائی، بالزک اور پریم چند وغیرہ کے ناول پڑھتے ہیں تو ہماری نظر اُن کی انسانی خصوصیات، اُن کی قوت فکر، اُن کے حسن اور اُن کے معنوی پہلوؤں پر پڑتی ہے لیکن ایسا وقت آتا ہے جب ہم ڈراما نگار، شاعر، اور افسانہ نگار کی تخلیقات کو اس کے تخلیقی عمل میں دیکھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ادب کا خام مواد اپنی آخری شکل میں آنے سے پہلے کن کن منزلوں سے گزرا اور ادیب یا شاعر کو اس شکل میں پیش کرنے میں کن کن تکنیکی اور فنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور پھر ہم اس پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور اس وقت ہم اُسے ڈراما، شعر اور ناول یا افسانے کی حیثیت سے پرکھتے ہیں۔ ڈراما، موضوع کے اعتبار سے اچھا ہو سکتا ہے لیکن اگر ڈرامے کی حیثیت سے اس میں فنی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں تو یقیناً اس کی قدر اور قیمت ہو گی۔

انگریزی نقاد اسکاٹ جیمس نے ہیئت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ فنون کا خارجی طور پر مطالعہ کیا جائے تو ان کی حیثیت ایک ہیئت کی نظر آتی ہے کیوں کہ اس میں جو زندگی پیش کی گئی ہے وہ کسی نے گزاری نہیں ہے اور جو زندگی محض گزاری گئی ہے وہ فن سے عاری ہے۔ فن تو زندگی کا تجربہ ہوتا ہے جو کسی غور و فکر کا نتیجہ ہے اور لوگوں کو سوچنے پر مائل کرتا ہے۔ چناں چہ فن کے اس خارجی مظہر کی اہمیت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

فن کا تخلیقی عمل فن کار کی شخصیت کو اس کے فن میں پورے طور پر جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شیکسپیر اپنے ڈرامے کے ہر کردار میں اپنی روح پھونکتا ہے اور خود کہیں نظر نہیں آتا۔ یہی اُس کی بڑائی ہے۔ یہاں بات سے زیادہ بات کہنے کے طریقے پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ البتہ اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات کہنے کے ڈھنگ پر نظر جمی رہ جائے اور بات نظر سے اوجھل ہو جائے اور ہم ذریعے کے پیچ میں پھنس کر مقصد کو بھول جائیں۔ شاعر اور ادیب زندگی اور حسن کی تصویر کشی کرتا ہے اور ادب کے مطالعے سے ہمارا مقصد زندگی اور حسن کا مطالعہ ہے۔ ہمیں اس کا خیال ہے کہ ہم اس کے اظہار کے طریقوں میں نہ کھو جائیں اور منزل پر پہنچنے سے پہلے راہ کے پیچ و خم میں نہ اُلجھ جائیں۔

ادب میں خارجی حقیقتوں کا اظہار ہوتا ہے لیکن اُس کا طریق یا تکنیک تاریخ یا دوسرے سماجی علوم سے الگ ہے کیوں کہ ادب انھیں داخلی طریقوں سے پیش کرتا ہے اور ادیب کی اپنی شخصیت، اس کی ہیئت کی تکنیک کو متاثر کرتی ہے۔ کوئی ادیب اپنی قومی تہذیب، قومی کردار، قومی روایات سے منھ نہیں موڑ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دیومالاؤں سے استفادہ کرتا ہے اور روایتوں سے فیض یاب ہوتا ہے۔ یہاں اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کے لیے روایتی علامتوں کا استعمال بھی کرتا ہے۔ لیکن یہ علامتیں جب بے جان ہو جاتی ہیں اور وقت کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے پڑھنے والوں تک ادیب یا شاعر کے مافی الضمیر کو پورے طور پر ادا نہیں کر سکتیں تو پھر انھیں ترک کرنا پڑتا ہے اور نئی علامتوں کی تلاش ہوتی ہے جو وقت کے تقاضوں کے مطابق ہوں۔ ان کی ضرورت ادیبوں اور شاعروں کو ہر عہد میں پڑتی ہے اسی لیے خارجی حقیقتوں کو داخلی طور پر پیش کرنے کے لیے اسے عمومیت کا رنگ دینا پڑتا ہے۔ اسی لیے مروجہ ہیئت بہت کام آتی ہے، کیوں کہ ہیئت تو سانچا ہے جس میں خیال کی تشکیل ہوتی ہے۔ ہیئت ہمیشہ ایسی ہی ہونی چاہیے کہ جس میں خیال یا مضمون کو خوبی سے ڈھالا جا سکے اور جب وہ تیار ہو کر نکلے تو قابلِ قبول ہو۔ یہ ہیئت بھی ماحول کی پیداوار ہوتی ہے اسی لیے اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ادیب جو اس کے نئے تجربے کرتے رہتے ہیں ناکامیاب ہوتے ہیں کیوں کہ اُن میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو دوسرے ملکوں کی پرانی ہیئت کو جوں کا توں اُٹھا لیتے ہیں اور پھر اپنی زبان میں نیا کہہ کر پیش کرتے ہیں لیکن اُن کے متضاد وہ لوگ بھی ہیں جو مردہ ہیئت سے چمٹے رہتے ہیں۔ وہ اپنی ہیئت پرستی میں یہ بھول جاتے ہیں کہ فرسودہ ہیئتیں اپنا تاریخی فریضہ پورا کر چکی ہیں اور اُن کی جگہ نئی ہیئتیں لے رہی ہیں۔ اب ان کا استقبال کرنا ضروری ہے۔ ہرچند یہ منزل کڑی ہوتی ہے لیکن طرز کہن پر اڑنے سے منزل کے اوجھل ہونے کا خطرہ ہے کیوں کہ اگر نیا مواد پرانی ہیئت کے ساتھ گھل مل نہ سکے تو اُس کا حسن بھی ختم

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۵ پر)



سانپ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے برفانی علاقوں کو چھوڑ کر قریب قریب دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ اب تک ان کی ۲۴۵۰ قسموں کا پتہ چلا ہے جن میں تقریباً ۴۰۰ زہریلی ہیں مگر ان میں سے بھی صرف ۵۰ اقسام ایسی ہیں جن کے کاٹنے سے انسان مر سکتا ہے۔ سانپ چھوٹے بڑے سبھی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو اجگر ہے جو ۳۲-۳۳ فٹ تک لمبا ہوتا ہے اور دوسری طرف ایسے سانپ ہیں جو صرف ایک انچ لمبے ہوتے ہیں۔ ان پر اکثر کیچوے کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں انھیں "وَرم اسنیک" (WORM SNAKE) کہتے ہیں۔ یہ شمالی امریکہ کے جنوبی مغربی حصے میں پائے جاتے ہیں۔ سانپوں میں سب سے بڑی عمر اجگر کی ہوتی ہے جو ۴۰ برس تک زندہ رہتا ہے۔

زہریلے سانپوں میں سب سے خطرناک سانپ وہ ہے جسے کِنگ کوبرا (KING COBRA) یا ناگ راج کہتے ہیں۔ اس کی لمبائی ۱۲ فٹ سے لے کر ۱۸ فٹ تک ہوتی ہے۔ یہ جنوبی ایشیا کے گھنوں جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی خوراک دوسرے سانپ ہیں۔ اس کا کاٹا ہوا اکثر ایک گھنٹے کے اندر مر جاتا ہے۔

جو سانپ زہریلے نہیں ہوتے، ان میں سب سے لمبا "جوخانے والا اجگر" ہے۔ اِسے انگریزی میں ریٹی کولیٹڈ پائتھن (RETICULATED PYTHON) کہتے ہیں۔ اس کی زردی مائل کتھئی کھال پر سیاہ چارخانہ بنا ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی ۳۳ فٹ تک ہوتی ہے۔ یہ برما (سابق) ہند چین اور ملایا میں پایا جاتا ہے۔ جنوبی امریکہ کا اجگر، اناکونڈا (ANACONDA) ۳۰ فٹ تک لمبا اور ایک فٹ سے زیادہ موٹا ہوتا ہے۔ یہ امیزن کے علاقے میں پایا جاتا ہے اور عام طور پر پانی کے قریب رہتا ہے۔ اس کی مادہ دوسرے سانپوں کی طرح انڈے نہیں دیتی بلکہ بچے دیتی ہے ہندوستان کا اجگر ۲۵ فٹ تک لمبا ہوتا ہے۔ یہ ہمالہ کی ترائی، آسام، بنگال اور راجپوتانہ میں پایا جاتا ہے۔ افریقہ کا "چٹانی اجگر" جسے انگریزی میں راک پائتھن (ROCK PYTHON) کہتے ہیں، ۲۰ فٹ سے کچھ زیادہ لمبا ہوتا ہے۔ کسی بھی اجگر کے منھ میں زہر کی تھیلی نہیں ہوتی اس لئے اجگر کے کاٹنے سے آدمی مرتا تو نہیں لیکن اُس کی پکڑ میں آنے کے بعد انسان مشکل سے چھوٹتا ہے۔

تقریباً دو سو سال سے انسان سانپوں کے بارے میں چھان بین کر رہا ہے اور اب تک دنیا کی اہم زبانوں میں سانپوں کے بارے میں قریب قریب بیس ہزار کتابیں اور تحقیقی مضامین لکھے جا چکے ہیں، تاہم عوام کو سانپوں کے بارے میں جتنی غلط فہمیاں ہیں، شاید ہی کسی دوسرے جانور کے بارے میں ہوں۔ دراصل سانپ کا نام لیتے ہی ہم میں نفرت، خوف اور دشمنی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ لوگ سانپ کو دیکھتے ہی اُسے مار ڈالتے ہیں اور کوئی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ سانپ زہریلا ہے بھی یا نہیں۔ اگر زہریلے سانپوں کو مارا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن بے زہر والے سانپوں کو مار کر ہم خود اپنا نقصان کرتے ہیں

کیونکہ بیشتر سانپ کیڑے مکوڑے، چوہے اور گلہریاں کھاتے ہیں۔ اس طرح وہ کھیتی کی حفاظت کرتے ہیں۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ جب کسی علاقے میں سانپوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے تو چوہوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے جس سے کھیتی کو نقصان پہونچتا ہے۔ بہر حال، جہاں تک ہماری غلط فہمیوں کا تعلق ہے اُن میں سے چند ملاحظہ ہوں۔

بعض غلط فہمیاں۔ اجگر کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ سانس کھینچتا ہے تو ہر چیز اس کے منھ میں کھنچتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ یہ بات غلط ہے۔ دراصل وہ شکار کو مارنے کے لئے اُس پر جھپٹتا ہے اور اُسے اپنے منھ سے پکڑنے کے بعد اُس کے گرد اپنے جسم کے کئی بل ڈال کر لپٹ جاتا ہے اور پھر اُسے کسنا شروع کرتا ہے جس سے شکار کا دم گھُٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اُسے آہستہ آہستہ نگلتا ہے۔

مشہور ہے کہ سانپ، چڑیا کو پکڑنے کے لئے اُس کی طرف غور سے دیکھتا ہے، اس کی آنکھ کی کشش سے چڑیا اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی اور سانپ اُسے اپنا لقمہ بنا لیتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی سانپ کی آنکھوں میں مسحور کرنے کی طاقت نہیں پائی جاتی۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بعض سانپوں کی سانس زہریلی ہوتی ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے زہر خاص طرح کے دانتوں میں ہوتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر سانپ میں یہ خاص دانت پائے جائیں۔ بعض لوگ سانپ کی دو شاخہ زبان کو ڈسنے کا آلہ سمجھتے ہیں۔ یہ بات بھی غلط ہے۔ عوام کا خیال ہے کہ سانپ کا جسم مینڈک کی طرح لبلبا ہوتا ہے۔ لیکن چھونے سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کا جسم ویسا ہی خشک اور چکنا ہوتا ہے جیسے رندا کی ہوئی لکڑی۔

کہتے ہیں کہ جب سانپ پُرانا ہو جاتا ہے تو اُس کی گردن پر بال نکل آتے ہیں اور وہ اُڑنے لگتا ہے جس پر اِس سانپ کا سایہ پڑتا ہے، اُس پر فالج گر پڑتا ہے۔ یہ بھی گپ ہے لیکن اُڑنے والے سانپ ہوتے ضرور ہیں۔ جاوا اور ملایا کے جنگلوں میں اُڑنے والے سانپ پائے جاتے ہیں مگر اُن کے پَر نہیں ہوتے۔ یہ درختوں پر رہتے ہیں۔ جب ضرورت ہوتی ہے تو وہ اپنے جسم کو فیتے کی طرح چپٹا کر لیتے ہیں اور ہوا میں لہراتے ہوئے ایک درخت سے دوسرے درخت پر چلے جاتے ہیں اور جب زمین پر اُترنا ہوتا ہے تو ہوا میں بل کھاتے ہوئے نیچے اُتر آتے ہیں۔

پُرانے سانپوں کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ اُن کے سر میں ایک چمکدار پتھر ہوتا ہے جسے منڑی یا سانپ کا من کہتے ہیں، رات کو وہ اِسے اُگل کر گھاس پر رکھ دیتے ہیں اور اس کی روشنی میں اوس چاٹتے ہیں، جب پیاس بجھ جاتی ہے تو پھر منڑی نگل لیتے ہیں۔ بعض پُرانے قصوں میں اس کا ذکر ملتا ہے لیکن آج تک یہ منڑی نہ تو کسی کو ملی اور نہ کسی عجائب خانے یا خزانے میں محفوظ ہے۔ ایک مثل ہے کہ "کالے کے آگے چراغ نہیں جلتا"۔ یعنی اگر چراغ جل رہا ہو اور ناگ آجائے تو وہ بجھ جائے گا یا اُس کی روشنی کم ہو جائے گی۔ اِس کا غالباً ابھی تک تجربہ نہیں کیا گیا لیکن اس کی صحت بھی بہت مشکوک ہے۔

کہتے ہیں کہ سانپ کی مادہ اکثر اپنے بچوں کو نگل جاتی ہے۔ یہ بات مشاہدے کے خلاف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خیال اُن بچوں کو دیکھ کر پیدا ہوا ہو جو کسی سانپ کے پیٹ سے برآمد ہوئے ہوں کیوں کہ بعض سانپ انڈوں کے بجائے بچے دیتے ہیں۔

بعض سانپوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ گائے کی پچھلی ٹانگوں میں لپٹ کر اُس کا دودھ پی لیتے ہیں۔ یہ بھی گپ ہے۔ اول تو سانپ کا گائے کی ٹانگوں میں اس طرح لپٹنا کہ وہ بندھ کر رہ جائے ناممکن ہے۔ دوسرے سانپ کے منھ میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ تھن کو دبا کر دودھ نکال سکے۔ اگر وہ تھن کو پکڑ بھی لے تو اُس کے دانت تھن میں چبھ جائیں گے اور گائے تکلیف کی شدت سے بھاگتی پھرے گی۔

دو مُونہے سانپ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ چھ مہینے ایک طرف سے کھاتا ہے اور چھ مہینے دوسری طرف سے اور چھ مہینے ایک طرف سے چلتا ہے اور چھ مہینے دوسری طرف سے۔ دراصل اُس کے دو منھ ہوتے ہی نہیں۔ ایک طرف اُس کے دُم ہوتی ہے اور دوسری طرف منھ، البتہ اُس کی دُم اتنی کُند ہوتی ہے کہ اُس پر منھ کا دھوکا ہوتا ہے۔ سپیرے، دُم پر کبھی کبھی دو آنکھیں اور کبھی بیچ سے کاٹ کر منھ بنا دیتے ہیں۔

سانپ اور بین۔ آپ نے سپیرے کے پاس ناگ دیکھا ہوگا جسے وہ اپنی بین کے بل پر نچاتا ہے۔ یہ محض ہاتھ کی صفائی اور ہمت کا کام ہے ورنہ سانپ پر نہ گانے کا اثر ہوتا ہے نہ کسی منتر کا۔ البتہ یہ خیال کہ سانپ گانے کے رسیا ہوتے ہیں بڑا پرانا ہے۔ پلینی[1] ( ) اور سنیکا[2] (SENECA) نے لکھا ہے کہ گانے کی آواز سن کر سانپ اپنے بل سے باہر آجاتے ہیں۔ اردو کی بعض مثنویوں اور داستانوں میں بھی سانپ اور بین والی عام روایت کا کہیں کہیں حوالہ آجاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سانپ کے باہری کان نہیں ہوتے اس لئے وہ بین کی آواز سنتا ہی نہیں ہے۔ جب سپیرا اپنی بین بجاتا ہے تو وہ برابر ہلتا رہتا ہے۔ سانپ اُس کی حرکتوں کا پیچھا کرتا ہے اور وار کرنے کا موقع ڈھونڈتا ہے اور ہم غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ سانپ گانے سے مست ہوکر جھوم رہا ہے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب کرنل وال (COLONEL WALL) نے یہ تجربہ کیا کہ ایک ناگ کی آنکھوں پر کاغذ چپکا دیا تاکہ وہ کسی طرح کی حرکت نہ دیکھ سکے اور پھر اُس کے نزدیک طرح طرح کی آوازیں پیدا کیں، مگر نہ اُس پر بگل بجانے کا اثر ہوا اور نہ خالی پیپا پیٹنے کا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سانپ آنکھوں سے سنتے ہیں یا قطعاً بہرے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی سانپ کے قریب کرسی گھسیٹے یا اُس کے قریب چلے پھرے تو سانپ فوراً چوکنا ہوجاتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سانپ اُنھیں آوازوں کو سنتا ہے، جو کسی ٹھوس چیز جیسے زمین کو چھوتی ہوئی سفر کریں۔ زمین پر ذرا سی آہٹ پاتے ہی وہ ہوشیار ہوجاتا ہے۔

آپ نے سانپ اور نیولے کی لڑائی دیکھی ہوگی۔ کہتے ہیں کہ جب سانپ نیولے کو کاٹ لیتا ہے تو وہ بھاگ جاتا ہے اور کوئی جڑی بوٹی کھا لیتا ہے جس سے زہر کا اثر زائل ہوجاتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ اگر سانپ واقعی نیولے کو کاٹ لے تو نیولا مرجائے گا لیکن نیولا اتنا چست و چالاک ہوتا ہے کہ سانپ کو کاٹنے کا موقع نہیں دیتا، اچک کر اُس کی گردن دبوچ لیتا ہے اور کاٹ کر مار ڈالتا ہے۔

تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ اگر نیولا بڑا ہو اور سانپ چھوٹا تو نیولے کی جیت ہوگی اور اگر نیولا چھوٹا ہو اور سانپ بڑا تو سانپ کی۔ سانپ کے زہر سے نیولے کی موت یقینی ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ نیولے پر دوسرے جانوروں کے مقابلے میں سانپ کے زہر کا اثر کم ہوتا ہے۔ چنانچہ تجربے کے لئے ایک مرتبہ یہ کیا گیا کہ ایک خرگوش جتنے زہر سے مرجاتا ہے اُس کا آٹھ گنا ایک نیولے کے جسم میں انجکشن کے ذریعہ پہنچا دیا گیا۔ نیولا مر تو گیا مگر اُس کے مرنے میں ۱۲ گھنٹے لگے۔

جسمانی بناوٹ۔ سانپ کا جسم لچکدار لیکن مضبوط ہوتا ہے۔ اُس کے سر کی بناوٹ نازک ہوتی ہے۔ اُس کا مقابلہ ہم انسانی ہاتھ سے کرسکتے ہیں جو کسی چیز کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھ رہا ہو۔ سانپ کبھی اپنے سر کو دھکا نہیں دیتا۔ اگر اُس کا سر شوکیس کے شیشے سے ٹکرا جاتا ہے تو شیشہ نہیں ٹوٹتا اور سانپ جلد ہی یہ سمجھ لیتا ہے کہ شیشہ اُس کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

سانپ کا ڈھانچہ کھوپڑی، ریڑھ اور پسلیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ سانپ کی ریڑھ کی ہڈیاں گردن سے لے کر دم کی نوک تک یکساں ہوتی ہیں اور بعض قسموں میں تین سو سے زیادہ ہوتی ہیں۔ سانپ کے جبڑے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض قسموں میں نیچے کے جبڑے کے دو حصے ہوتے ہیں جو الگ الگ کام کرتے ہیں۔ اسی لئے سانپ کا منھ زیادہ کھلتا ہے اور وہ بڑا شکار بھی آسانی سے نگل جاتا ہے۔ بعض قسموں میں نیچے کے جبڑے کے دونوں حصے سامنے کی طرف جڑے ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں سانپ کا منھ کم کھلتا ہے اور وہ بڑا شکار نہیں نگل سکتا۔

زمین پر رہنے والے سانپوں کا جسم گول اور موٹا ہوتا ہے۔ درختوں پر رہنے والے سانپوں کا جسم پتلا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُنھیں شاخوں پر رینگنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اُن کی دُم میں لپٹنے کی طاقت پائی جاتی ہے اور وہ اُس کی مدد سے شاخوں کے گرد لپٹ جاتے ہیں۔ اُن کا رنگ شاخوں یا پتیوں سے ملتا جلتا ہے اس لئے

---

[1] پلینی (زمانہ ۲۳ - ۷۹ عیسوی) روم کا مشہور عالم جس نے قدرت کا گہرا مشاہدہ کیا تھا۔ اس نے ۳۷ جلدوں میں ایک انسائیکلوپیڈیا لکھی تھی "نیچرل ہسٹری" جو اب تک موجود ہے۔

[2] سنیکا (زمانہ ۳ ق۔م - ۶۵ عیسوی) مشہور فلسفی، روم کے شہنشاہ نیرو کا استاد، جسے اس بد دماغ حکمراں نے خودکشی کرنے پر مجبور کردیا۔

ہونے والے شکار کو اُن کی آمد کا پتہ نہیں چلتا۔

پانی میں رہنے والے سانپوں کا جسم چپٹا ہوتا ہے (عمودی طور پر) جس سے پیرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس وقت اُن کی دُم چپّو کا کام دیتی ہے۔ اُن کے نتھنے اور آنکھیں سر میں ذرا اوپر کی طرف ہوتی ہیں جس سے پانی کے اوپر شکار کو دیکھنے اور سانس لینے میں آسانی ہوتی ہے۔ خشکی کے قریب قریب بھی سانپ پانی میں تیر لیتے ہیں لیکن پانی کے سانپ خشکی پر رینگ نہیں پاتے۔

پیر ۔ دراصل سانپ اس خاندان کا جانور ہے جو رینگتے ہیں۔ اس خاندان میں چھپکلیاں، مگر اور کچھوے وغیرہ شامل ہیں۔ مگر سانپ اور دوسرے رینگنے والے جانوروں میں فرق یہ ہے کہ سانپ کے پیر نہیں ہوتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ بعض قسم کی چھپکلیاں بھی بے پیر کی ہوتی ہیں۔ چھپکلی اور سانپ میں خاص فرق جبڑوں کی بناوٹ کا ہے۔ سانپ شکار کو نگلتے وقت جتنا منھ کھول سکتا ہے، چھپکلی اتنا منھ نہیں کھول سکتی۔

سانپ کے پرانے ڈھانچوں سے پتہ چلتا ہے کہ اب سے بہت پہلے ان کے بھی پیر ہوتے تھے لیکن بہت چھوٹے۔ بل میں گھستے وقت اُنھیں پیروں کو سمیٹنا پڑتا تھا۔ وہ برابر اس رکاوٹ کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ پیر چھوٹے ہوتے ہوتے غائب ہوگئے اور جسم لمبا ہوگیا۔ اگلے پیر پہلے غائب ہوئے اور پچھلے بعد میں۔ پچھلی ٹانگوں اور کولھے کی ہڈی کے نشان اب بھی بعض سانپوں کے جسم میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اجگر کے پاخانے کے مقام کے دونوں طرف جو ایک ایک کانٹا اُبھرا ہوتا ہے وہ پیروں کی باقی ماندہ ہڈیاں ہیں۔

سفنے ۔ سانپ گرگٹ کی طرح رنگ نہیں بدلتے لیکن اُن کے رنگ ہوتے ہیں ماحول کے مطابق، یعنی لال، ہرا، پیلا، نیلا، کتھئی، کالا بعض کے جسم پر خوشنا نقش و نگار ہوتے ہیں جیسے چارخانہ، دھاریاں اور مختلف قسم کے دھبے۔

سانپ کی کھال پر سفنے (SCALES) ہوتے ہیں۔ یہ گویا اس کی پوشاک ہے۔ سفنوں کی صورت، ترتیب اور تعداد ساری زندگی یکساں رہتی ہے۔ ان سے سانپ کی مختلف قسموں کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے۔ پیٹ کے سفنوں کی بناوٹ پیٹھ اور سر کے سفنوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اُنھیں پلیٹ (PLATES) کہتے ہیں۔ ہر پلیٹ کا اگلا حصہ اُس کے آگے والی پلیٹ کے پچھلے حصے کے نیچے چھپا رہتا ہے۔ پلیٹوں کے سرے پسلیوں کے سروں سے جسم کے اندر جڑے رہتے ہیں۔ پسلیوں کے دوسرے سرے ریڑھ کی ہڈیوں سے جڑے ہوتے ہیں۔ پٹھوں کے ایک پیچیدہ نظام سے سانپ اس قابل ہوتا ہے کہ اپنے پیٹ کی پلیٹوں کو حرکت دے سکے۔

رینگتے وقت سانپ کی پسلیاں اس طرح حرکت کرتی ہیں جیسے کن کھجورے کی ٹانگیں۔ سانپ کو رینگتے وقت زمین کے ابھاروں سے مدد ملتی ہے۔ اگر سطح چکنی ہو تو اُسے رینگنے میں دقت ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ لہراتا ہوا چلتا ہے۔ کبھی سیدھا نہیں چلتا۔ ریگستانوں میں رہنے والے سانپ لہراتے ہوئے ٹیڑھے ٹیڑھے چلتے ہیں تاکہ بالو میں دھنس نہ جائیں۔ سانپوں میں سب سے تیز رفتار سانپ افریقہ کے بلیک ممبا (BLACK MAMBA) ہوتے ہیں۔ یہ سانپ ہموار سطح پر سات میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔

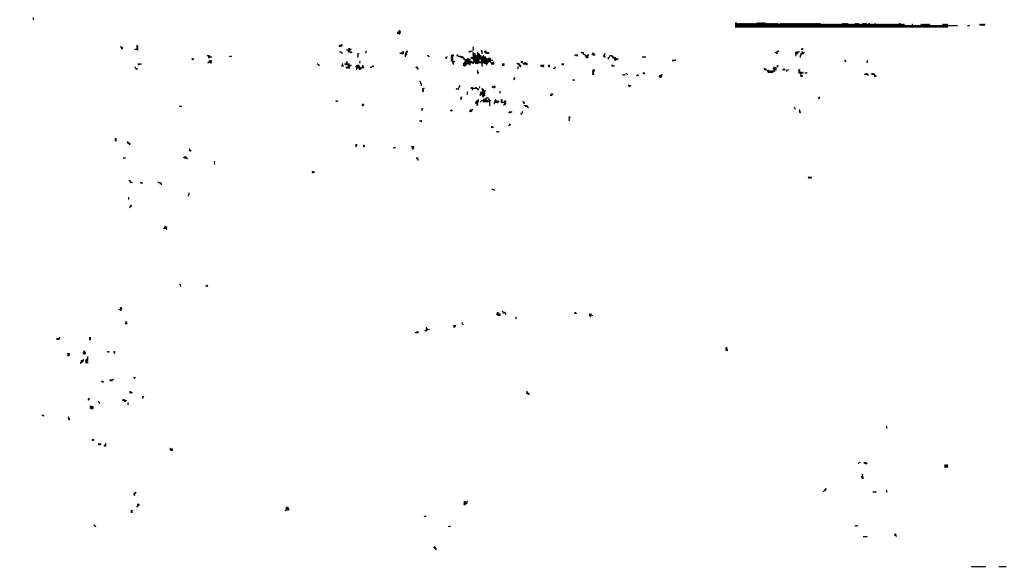
کینچل ۔ سانپ کے جسم پر نیم شفاف جھلی کا ایک خول چڑھا ہوتا ہے جسے کینچل کہتے ہیں۔ کینچل اُتارنے کے لئے سانپ کسی سناٹے کی جگہ چلا جاتا ہے جہاں وہ چند دن بے حس و حرکت پڑا رہتا ہے۔ اس عرصے میں اُس کے جسم میں ایک خاص طرح کا تیل پیدا ہوتا ہے جو کینچل اور کھال کے درمیان دورہ کرتا ہے جس سے کینچل ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد سانپ کسی کھردرے ٹھنٹھ یا پتھر کی تلاش کرتا ہے جس پر وہ اپنے ہونٹ رگڑتا ہے۔ اس طریقہ پر عمل کرنے سے ہونٹ کی کینچل اُتر جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ اُس خول سے نکلتا ہے۔ کینچل آگے سے پیچھے کو اُترتی ہے اور اُترنے پر اُلٹی ہوجاتی ہے، جیسے جب آپ کبھی کبھی موزہ اُتارتے ہیں تو وہ اُلٹا ہوجاتا ہے۔

کینچل اُتارنے میں پورا آدھ گھنٹہ لگ سکتا ہے۔ اُتری ہوئی کینچل میں آنکھ کے صاف نشان ہوتے ہیں۔ کینچل اُتارنے کے بعد سانپ کی کھال ساٹن کی طرح چمکتی اور چمکدار نظر آتی ہے۔ سانپ ہمیشہ پوری کینچل

کوبرا یا ناگ
یہ غلط خیال
وہ بین کی آ
ہو جا



بچھیا (یا لی
جس کی دُم تیر
کام دے



دوئیا یا منڈا
جس کے جسم پر
حلقے بنے ہو





اجگر، جس کی عمر سب سانپوں
سے زیادہ ہوتی ہے



کالے رنگ کا کوڑیالا سانپ
جو بڑا خطرناک ہوتا ہے



دھامن: جس کی خاص
خوراک چوہے ہوتے ہیں



دومونہا سانپ، مگر اس
کے دو منہ نہیں ہوتے۔ ایک
طرف دم ہوتی ہے جس پر
مُنہ کا دھوکا ہوتا ہے

اُتارتا ہے۔ وہ چھپکلی کی کھال کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نہیں اُترتی۔ جب سانپ کیچلی اُتارنے والا ہوتا ہے تو اُس کا رنگ ماند پڑ جاتا ہے اور اُسے کم دکھائی دیتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ بے چین اور کاٹنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

آنکھیں۔ سانپ کی آنکھوں پر پپوٹے نہیں ہوتے۔ عینک کے شیشے کی طرح ابھری ہوئی جھلی ہوتی ہے جس کی وجہ سے آنکھوں میں مٹی نہیں جا سکتی۔ جب آنکھوں پر کی کیچلی موٹی ہو جاتی ہے تو سانپ کو دھندلا دکھائی دیتا ہے اور آنکھیں سفید نظر آتی ہیں۔

ناگ کی ذات کے سانپوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کیچلی تو اتر جاتی ہے لیکن آنکھ پر اس کی پپڑی جمی رہ جاتی ہے۔ سانپ کے پانی میں ہلنے سے پپڑی نرم ہو جاتی ہے اور پھر وہ اسے گھس کر اتار لیتے ہیں۔ جب سانپ پکڑ لیا جاتا ہے اور اسے کسی عجائب خانے وغیرہ میں رکھ دیا جاتا ہے تو اس طرح کی کئی پپڑیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں سانپ دیکھ تو سکتا ہے لیکن اسے بہت دھندلا دکھائی دیتا ہے۔ اس مصیبت سے اسے اس وقت نجات ملتی ہے جب ان پپڑیوں کو موچنے سے اکھاڑ دیا جاتا ہے۔

زبان۔ ہر سانپ کی زبان، چاہے وہ زہریلا ہو یا بے زہر کا، دو شاخہ ہوتی ہے۔ بعض کی پوری زبان سیاہ ہوتی ہے اور بعض کا دو شاخہ سیاہ اور جڑ سرخ ہوتی ہے۔ سانپ کے آرام کرتے وقت یہ زبان منھ کے نچلے حصے میں ایک غلاف کے اندر بند رہتی ہے اور جب سانپ چوکنا ہوتا ہے تو وہ اپنی زبان کو باہر نکال کر لپلپاتا ہے۔ وہ اسے بغیر کسی مقصد اندر باہر نہیں کرتا۔ سانپ میں سونگھنے کی طاقت ناک سے زبان میں منتقل ہو گئی ہے۔ وہ اپنی زبان سے ہوا اور مٹی میں پائی جانے والی مختلف قسم کی بو کا احساس کر لیتا ہے۔

دانت۔ زیادہ تر سانپوں کے اوپر کے جبڑے میں دانتوں کی چار قطاریں ہوتی ہیں۔ دو تالو کے بیچ میں اور دو جبڑے کے کنارے۔ نیچے کے جبڑے میں کنارے کنارے دانتوں کی دو قطاریں ہوتی ہیں۔ بعض قسمیں ایسی بھی ہیں جن کے اوپر کے جبڑے میں اور بعض کے نیچے کے جبڑے میں دانت نہیں ہوتے۔

سبھی سانپ اپنے شکار کو مُسلّم نگلتے ہیں، ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں کھاتے کیوں کہ ان کے دانتوں میں چبانے یا ٹکڑے کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ وہ صرف شکار کو پکڑنے اور اسے حلق کی طرف دھکیلنے میں مدد کرتے ہیں۔ یہ دانت بڑے اور پیچھے کی طرف مڑے ہوتے ہیں جن میں پھنسنے کے بعد شکار اپنے کو چھڑا کر بھاگ نہیں سکتا۔

زہریلے سانپوں کو خاص طرح کے دانتوں سے پہچانا جاتا ہے جنھیں زہریلے دانت (FANGS) کہتے ہیں۔ یہ دانت اوپر کے جبڑے میں ہوتے ہیں اور دوسرے دانتوں کے مقابلے میں بڑے ہوتے ہیں۔ ان میں ہر ایک نلکی سے آملتا ہے جس کا ایک سرا زہریلے دانت کی جڑ سے اور دوسرا زہر کے غدود سے جڑا ہوتا ہے جو سر میں آنکھ سے ذرا پیچھے دونوں طرف ایک ایک کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ بادام کی شکل کے اس غدود کا کام زہر بنا کر جمع کرنا ہے۔ یہ رگوں اور پٹھوں میں کچھ اس طرح چھپا ہوتا ہے کہ اسے آسانی سے نکالا نہیں جا سکتا۔ ان غدود میں زہر کی ایک محدود مقدار رہتی ہے۔ زہر ایک بار نکل جانے پر کم ہو جاتا ہے یا بالکل نہیں رہتا۔ آخری صورت میں سانپ کچھ عرصے کے لیے بے زہر کا ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات سپیرے سانپ کے دانت اکھاڑ ڈالتے ہیں لیکن وہ دو ہفتے میں پھر نکل آتے ہیں۔

زہریلے سانپوں کی قسمیں۔ زہریلے سانپوں کی تین قسمیں ہیں: (۱) جن کے زہریلے دانت منھ میں پیچھے کی طرف ہوتے ہیں۔ (۲) جن کے زہریلے دانت منھ میں آگے کی طرف ہوتے ہیں۔ (۳) جن کے زہریلے دانت تالو سے لگے رہتے ہیں اور کاٹتے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں۔

منھ کے پچھلے حصے میں پائے جانے والے دانتوں میں کھلی ہوئی نالیاں ہوتی ہیں جن سے ہو کر زہر ان سوراخوں میں داخل ہوتا ہے جو دانتوں کے چبھنے سے گوشت میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ معمولی زہریلے سانپ ہوتے ہیں جن کا زہر اسی وقت اثر کرتا ہے جب سانپ اپنے شکار کو آدھا نگل لیتا ہے۔ اس قسم کے سانپ دریاؤں اور تالابوں میں پائے جاتے ہیں۔

منھ کے اگلے حصے میں پائے جانے والے دانتوں میں کھلی ہوئی یا بند نالیاں ہوتی ہیں۔ بند نالیوں والے دانتوں کے سرے پر ایک باریک سا چھید ہوتا ہے جس سے ہو کر زہر زخم میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ دانت جو اندر سے پولے ہوتے ہیں بالکل انجکشن لگانے کی سوئی کی طرح ہوتے ہیں۔ اس طرح کے دانت ناگ کی ذات کے سانپوں میں پائے جاتے ہیں۔

تالو سے لگے رہنے والے دانت دبویا یا منڈلی سانپ (RUSSEL'S VIPER) کے ہوتے ہیں۔ یہ دانت زہریلے دانتوں کی سب

سے ترقی یافتہ صورت ہیں۔ اگر یہ شکل نہ ہوتی تو سانپ اپنا منہ نہ بند کر پاتا کیوں کہ یہ دانت بہت بڑے ہوتے ہیں۔ جب سانپ کسی کو کاٹتا ہے تو یہ دانت کھڑے ہو جاتے ہیں اور زخم میں زہر داخل کرنے کے بعد چاقو کے پھل کی طرح مڑ کر تالو سے لگ جاتے ہیں۔

بے زہر والے سانپوں کے زہر کے غدود نہیں ہوتے اور نہ ان کے دانتوں میں زہر جانے والی کھلی یا بند نالیاں ہوتی ہیں۔ وہ بالکل ٹھوس ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں بے زہر والے سانپوں کی بہت سی قسمیں پائی جاتی ہیں جن میں اجگر، دھامن، دو موہا اور پنھیا بہت مشہور ہیں۔ دھامن ایک خوب صورت سانپ ہے جو ۸ فٹ تک لمبا ہوتا ہے۔ چوہے اس کی خاص خوراک ہیں اس لیے اسے ریٹ اسنیک (RAT SNAKE) کہتے ہیں۔ دو موہا زمین کے اندر رہنے والا سانپ ہے۔ اس کا رنگ مٹیالا، سرخ یا سیاہ ہوتا ہے۔ پنھیا سانپ دریاؤں اور تالابوں میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے زہریلے سانپوں میں سب سے مشہور سانپ ناگ، ناگ راج، دبوئیا، کرائت، پھرسا اور سمندری سانپ ہیں۔

ناگ اپنے پھن کی وجہ سے آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اس کا رنگ گیہواں یا سیاہ ہوتا ہے۔ ناگ راج جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ اسے آپ عجائب گھروں میں دیکھ سکتے ہیں۔ دبوئیا کے جسم پر زنجیر کے ایسے حلقے بنے ہوتے ہیں۔ کرائت ۵ فٹ تک لمبا ہوتا ہے۔ یہ کالے رنگ کا ایک نہایت خطرناک سانپ ہے اسے کوڑیالا بھی کہتے ہیں۔ پھرسا ایک چھوٹا سانپ ہے جو ۱½ فٹ سے لے کر ۲½ فٹ تک لمبا ہوتا ہے۔ جب اسے چھیڑا جاتا ہے تو یہ انگریزی آٹھ کی شکل میں کنڈلی مار کر اپنی پیٹھ کے سفنوں کو اس طرح رگڑتا ہے کہ "پھر" کی سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ سمندر کے سبھی سانپ زہریلے ہوتے ہیں۔ وہ ناگ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ۶ سے لے کر ۸ فٹ تک لمبے ہوتے ہیں۔

سانپ کا زہر ۔ سانپ کا زہر دراصل اس کے منہ کی رال ہے جس سے سانپ کو دو فائدے پہنچتے ہیں۔ کھانے کو ہضم کرنے میں سانپ کی مدد کرنا اور شکار کو سُن یا ہلاک کر دینا تاکہ اسے بغیر لڑے جھگڑے نگلا جا سکے۔ سانپ کے زہر کی تیزی مختلف قسم کے سانپوں میں مختلف ہوتی ہے۔ بعض سانپ ایسے ہوتے ہیں جن کے کاٹنے سے جانور تو مر جاتے ہیں لیکن انسان نہیں مرتا۔

چھوٹے جانور پر سانپ کے زہر کا اثر فوراً ہوتا ہے۔ وہ چند سکنڈ میں مر جاتا ہے۔ اکثر کاٹا ہوا جانور گر کر تھرتھراتا تک نہیں۔ بڑا جانور بھی فوراً بے ہوش ہو جاتا ہے اور سانپ کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ بھاگ نہیں سکتا۔ کسی جانور کو کھانے کے لیے اگر مارنا ہے تو اس سے کم تکلیف دہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہو سکتا۔

گرمی سردی کا اثر ۔ دوسرے رینگنے والے جانوروں کی طرح سانپ بھی ایک ٹھنڈے خون والا جانور ہے۔ اس کا درجۂ حرارت وہی ہوتا ہے جو اس کے ماحول کا ہوتا ہے؎۔ اسی لیے سانپ نہ تو بہت گرمی برداشت کر سکتے ہیں اور نہ بہت سردی۔ ان کے لیے ۸۰ سے لے کر ۹۰ تک درجۂ حرارت موزوں ہے۔ اگر درجۂ حرارت ۹۰ کے اوپر ہو تو وہ ٹھنڈی جگہ تلاش کرنے لگتے ہیں اور اگر ۸۰ کے نیچے ہو تو سست پڑ جاتے ہیں۔ سانپ ۴۲ درجہ فارن ہائٹ (یا صفر سینٹی گریڈ) پر مرنے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے قطب شمالی اور قطب جنوبی پر جہاں ہمیشہ برف جمی رہتی ہے سانپ نہیں پائے جاتے۔

سرد ملکوں میں برف گرنے سے پہلے ہی وہ زمین کے اندر گھس کر بلوں میں سو جاتے ہیں اور مہینوں سوتے رہتے ہیں۔ سونے کے لیے ان کی جگہ مقرر ہوتی ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے وہ راستے کی ہر دشواری کا سامنا کرتے ہیں۔ ندی، نالے، دَل دَل، جنگل، پہاڑ پار کرنے کے بعد وہ وہاں پہنچ کر دم لیتے ہیں۔ اسی لیے یہ سونے کی جگہ پشتوں آباد رہتی ہے۔ جاڑے کی لمبی نیند کے بعد جب وہ جاگتے ہیں تو ان کے وزن اور طاقت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

سانپ جس طرح سردی سے بچنے کے لیے سوتے ہیں اسی طرح گرمی سے بچنے کے لیے بھی سوتے ہیں۔ گرم ملکوں کے سانپ تیز دھوپ سے بچتے ہیں۔ ریگستانوں کے سانپ بھی دن میں اس وقت تک سفر نہیں کرتے جب تک ان کے راستے میں جا بجا نخلستان نہ ہوں تاکہ وہ گرمی سے بچنے کے لیے ان نخلستانوں میں پناہ لے سکیں۔

خوراک ۔ سانپ ایک گوشت خور جانور ہے۔ ابتک کسی سبزی خور قسم کا

؎ گرم خون والے جانوروں کا درجۂ حرارت ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ یہ گرمی ان کے خون سے پیدا ہوتی ہے۔

پتہ نہیں چلتا ہے۔ چھوٹے بڑے سبھی طرح کے جانور سانپ کی خوراک ہیں۔ سانپ کی بعض قسمیں کیڑے کھاتی ہیں۔ بڑے سانپوں کے بچے بھی کیڑوں پر گزارا کرتے ہیں۔ سانپ کی ایک چھوٹی قسم صرف دیمک کھاتی ہے اور اسی لیے دیمک کے ٹیلوں میں رہتی ہے۔ افریقہ میں سانپ کی ایک قسم صرف انڈے کھاتی ہے۔ اس کے گلے میں انڈے کے چھلکے توڑنے کے لیے خاص طرح کی ہڈیاں ہوتی ہیں۔

اژدہا بھیڑ، بکری، سور اور ہرن وغیرہ پر گزارا کرتا ہے۔ درختوں پر چڑھنے والے سانپ گلہریاں، چڑیاں اور ان کے انڈے کھاتے ہیں۔ دنیا کے بیشتر سانپ چوہے کھاتے ہیں۔ مچھلیاں، مینڈک، گرگٹ اور چھپکلیاں بہت سے سانپوں کی خوراک ہیں۔

سانپ کو سانپ کے نگلنے میں جو آسانی ہوتی ہے وہ کسی دوسرے شکار کو نگلنے میں نہیں ہوتی۔ اسی لیے بعض سانپ سانپ ہی کھاتے ہیں۔ ناگ راج کسی دوسرے جانور کے مقابلے میں سانپ کھانا ہی پسند کرتا ہے۔

بعض سانپ صرف گرم خون والے جانور کھاتے ہیں اور بعض سرد خون والے۔ اگر ان کی خوراک میں تبدیلی کی جائے تو وہ فاقہ کر کے مر جاتے ہیں۔ اُن سانپوں کا ہاضمہ قوی ہوتا ہے جو ٹھنڈے خون والے جانور کھاتے ہیں۔ اسی لیے انھیں جلدی جلدی کھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ گرم خون والے جانور کھانے والے سانپوں کو دیر میں کھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ عموماً پانچ دن سے لے کر ایک ہفتہ تک کے وقفہ سے۔ اژدہے تو مہینوں بغیر کھائے پڑے رہتے ہیں۔ اژدہے کے معدے کا رس ایسا ہاضم ہوتا ہے کہ اس میں جانوروں کی ہڈیاں اور دانت تک گل جاتے ہیں لیکن بالوں پر اس رس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ انکی چمک اور رنگ تک قائم رہتے ہیں۔ کھر اور سینگ بھی ہضم نہیں ہوتے۔ وہ فضلے کے ساتھ نکل جاتے ہیں۔ سانپوں میں پیشاب پاخانے کا مقام نیچے کی طرف پیٹ کے خاتمے پر اور دم کے شروع میں ہوتا ہے۔ اس پر ایک خاص طرح کا سفنہ ہوتا ہے۔

انڈے بچے۔ بعض سانپ انڈے دیتے ہیں اور بعض بچے۔ انڈے دینے والے سانپوں کی تعداد بچے دینے والے سانپوں سے زیادہ ہے۔ سانپوں کی مادہ ایک بار میں ایک درجن سے لے کر دو درجن تک انڈے دیتی ہے۔

سانپوں کے انڈے چڑیوں کے انڈوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کا چھلکا مٹیالا سفید، سخت لیکن لچک دار ہوتا ہے گویا وہ چمڑے کے بنے ہوں۔ بعض سانپوں کے انڈے آپس میں ایک لیسدار مادے سے چپکے ہوتے ہیں۔ مادہ کسی چھپی ہوئی جگہ میں انڈے دیتی ہے جیسے پتھر کی آڑ میں کوئی گڈھا۔ اگر وہ کافی گہرا نہیں ہوتا تو وہ اپنے جسم سے مٹی نکال نکال کر اسے گہرا اور گول کر لیتی ہے۔

سڑی ہوئی پتیوں اور کھاد کے ڈھیر بھی انڈے دینے کے لیے چنے جاتے ہیں۔ ان کے سڑنے سے جو گرمی پیدا ہوتی ہے وہ انڈوں کو سینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ انڈوں کو پکنے کے لیے زمین میں کافی نمی اور گرمی کا ہونا ضروری ہے۔ عام طور پر سانپ اپنے انڈوں کو نہیں سیتے لیکن چند قسمیں ایسی بھی ہیں جو انڈوں کے گرد کنڈلی مار کر بیٹھتی ہیں۔ اس زمانے میں ان کا بدن کچھ گرم ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے سانپ عموماً جوڑا بنا کر اس وقت تک ساتھ رہتے ہیں جب تک انڈوں سے بچے نکل نہیں آتے۔

انڈوں سے بچے نکلنے میں دو مہینے تک لگ سکتے ہیں۔ بچے کی ناک پر ایک سخت نوک ہوتی ہے جسے "انڈے کا دانت" کہتے ہیں۔ اس سے بچہ انڈے کے چھلکے کو توڑ کر باہر آجاتا ہے۔ انڈوں سے نکلنے کے بعد بچے دو ایک روز اسی جگہ رہتے ہیں۔ اس کے بعد کیڑوں کی تلاش میں ادھر ادھر رینگ جاتے ہیں۔



درسِ حیات

رشید شاہجہانپوری

ناموسِ قوم مہارانی "لکشمی بائی" کے شوہر مہاراجا گنگادھر راؤ" کے بعد انگریزوں نے مہارانی کے متبنٰی دامودر راؤ کو ولی عہد تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ مہارانی نے "بغاوت کا اعلان کردیا۔ انگریزی فوج شہر میں گھس آئی۔ مہارانی نے قلعے کی چوٹی سے اپنے سپاہیوں کو بے دردی سے قتل ہوتے ہوئے دیکھا تو رونے لگی۔ اس موقعے پر بعض مشیروں نے مشورہ دیا کہ اب بھی اطاعت قبول کرلی جائے تو جاں بخشی ہوسکتی ہے۔ مہارانی نے اُن مشیروں کی طرف سے منھ پھیرلیا اور جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ برقرار رکھا اور نواب باندہ کے ساتھ گوالیار کا رُخ کیا۔ انگریزی فوج قلعے پر قابض ہوئی تو مہارانی گوالیار پہنچ چکی تھی۔ ذیل کی نظم بظاہر خیرخواہ مشیروں کو مہارانی کا جواب پیش کرتی ہے

میں جانتی ہوں فرنگیوں کا مقابلہ سخت کام ہوگا
مگر، جو مانگے گا آج جینے کی بھیک، کل وہ غلام ہوگا

مری نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ ہیں بہت ہی قریب وہ دن
اُڑے گا جھنڈا فرنگیوں کا، اُنھیں کا سکّے پہ نام ہوگا

اُنھوں نے تعلیم کا تو ڈھانچا بدل دیا ہیں[1] سال پہلے
رہے روایاتِ دین و ایماں اب اُن کا قصّہ تمام ہوگا

بگاڑ دیں گے مزاجِ تہذیبِ مشرقی یہ سفید وحشی
خمیر خاکِ وطن کا ہوگا، مگر بدیشی قوام ہوگا

پلے گی تقدیس کے گھروں میں درندگی اور بربریّت
بہن کی عزّت، نہ ماں کی عظمت، نہ باپ کا احترام ہوگا

میں دیکھتی ہوں، رہے گی باقی نہ حق پسندی نہ حق پرستی
نہ مندروں میں کوئی پجاری، نہ مسجدوں میں امام ہوگا

وہ میری مسند سے میرے نورِ نظر کو محروم کر رہے ہیں
جو مان لوں میں یہ شرط اُن کی، تو کل یہ بےننگ و نام ہوگا

مرے وفادار میری آنکھوں کے سامنے قتل ہو رہے ہیں
میں اب اطاعت قبول کرلوں تو ایسا جینا حرام ہوگا

جلادو سامانِ عیش و عشرت، اُٹھاؤ تیغ و سنان و خنجر!
بہت دنوں راج کرلیا ہے، بس اب تو رن میں مقام ہوگا

اگر کبھی وقت کا مؤرّخ لکھے گا تاریخ زندگی کی
حیاتِ جاوید پانے والوں میں ایک اپنا بھی نام ہوگا

وداع، اے تاج و تختِ جھانسی! سلام ذرّاتِ خاکِ جھانسی!
جب اس کا عنوان میں بنوں گی تو یہ فسانہ تمام ہوگا

کبھی غلامی سے تنگ آکر جو خوں تمھاری رگوں میں کھولا
چراغِ راہِ حیات اس مرحلے پہ میرا پیام ہوگا

میں اپنے لختِ جگر کو اپنی کمر سے کس کر چلی ہوں رن کو
کہ بچ رہا تو خدا نہ کردہ یہ دشمنوں کا غلام ہوگا

---

[1] دہلی یونیورسٹی میں پہلی بار ۱۸۳۵ء میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تھا۔

بمبئی کا ایک مرثیہ نگار شاعر ـــــ افسر

رشید موسوی

دکن میں حیدرآباد کے علاوہ دوسرے علاقوں مثلاً بمبئی، مدراس، اورنگ آباد میں بھی مرثیہ نگاری کے روایات ملتے ہیں۔ لیکن بمبئی کے مرثیہ نگاروں کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں کے مرثیہ نگار بوہرہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انیسویں صدی میں زیادہ تر ان ہی کے مرثیے دستیاب ہوتے ہیں۔ جہاں تک بوہرہ فرقے کے ان مرثیہ نگاروں کی زبان کا تعلق ہے، انھوں نے کھڑی بولی سے ملی ہوئی اردو میں مرثیے لکھے ہیں۔ ان مرثیہ نگاروں میں سب سے اہم افسر تھے۔ ان کا نام شیخ خان بھائی تھا۔ ان کے مرثیوں کے سولہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ہر جلد میں سات سے لیکر نو تک مرثیے شامل ہیں۔ اگر ایک ایک جلد میں اوسطاً آٹھ مرثیے بھی شمار کیے جائیں تو ان کے کل مرثیوں کی تعداد تقریباً ایک سو اٹھائیس ہوتی ہے۔ ان مجموعوں کا نام افسر نے گلدستۂ ماتم رکھا تھا۔ یہ تمام مجموعے محمدی پریس بمبئی سے شائع ہوئے تھے اور اب نایاب ہیں۔

افسر کے حالات کہیں بھی تذکرے میں نہیں ملتے جستہ جستہ واقعات مختلف مرثیوں اور رباعیوں سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ ان واقعات اور حالات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ افسر کا خاندان گجرات کا رہنے والا تھا۔ وہ خود شہر سورت میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے سن پیدائش کا کہیں اندراج نہیں ملتا لیکن بعض رباعیوں میں جو مختلف سنین میں چھپے ہوئے مجموعوں میں ہیں انھوں نے اپنی عمر کا اندازہ بتایا ہے۔ چناں چہ چودھویں جلد میں ۱۳۴۲ھ میں طبع ہوئی تھی حسب ذیل رباعی ملتی ہے[1]۔

دنیا کے علائق سے بری ہے افسر اب راہِ عدم کا سفری ہے افسر
پیری کی بھی پیری ہے اکاسی کا ہے سال سن لو کہ چراغ سحری ہے افسر

اس سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کا سن پیدائش ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۴ء تھا۔ ایک اور رباعی میں[2] انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش کی طرف بھی نشان دہی کی ہے:

نہ کیوں جہاں میں عید غدیر کی ہو خوشی ہوئے ہیں آج محمد کے جانشین علی
خدا کے فضل سے میلاد کا ہے دن افسر تمھاری آج اکاسی برس کی عمر ہوئی

مذکورۂ بالا رباعی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ افسر کی پیدائش ۱۸ ذی الحجہ کی ہے۔

سن شعور کو پہنچنے تک افسر سورت ہی میں رہے۔ اسکے بعد وہ بمبئی میں آ گئے تھے۔ ذیل کی رباعی[3] میں اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

حد تک جو بلوغیت کی پہنچا مولا سورت میں نہ ممکن ہوا رہنا مولا
صورت ہوئی پھر بمبئی آنے کی اب تک ہوں یہاں احسن میں یا مولا

بمبئی آنے کے بعد وہ اپنی گزر بسر کے لئے گھڑی سازی کا کام کرتے رہے۔ اس کا بھی تذکرہ انھوں نے ایک رباعی[4] میں کیا ہے جو حسب ذیل ہے ؎

کیوں اب نہ ہو شکر سدا باری کا سیکھا یہاں کام آ کے گھڑی سازی کا
جس کے لئے اب تک ہے وہی شغل معاش پیشہ سحر و شام ہے مزدوری کا

ایک رباعی سے ہم کو اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ انھوں نے مرثیہ نگاری

---

[1] گلدستۂ ماتم جلد ۱۴۔ ص ۱۱۔ رباعی نمبر ۵۶

[2] گلدستۂ ماتم۔ ج۔ ۱۲۔ ص ۱۲ رباعی نمبر ۶۲

[3] گلدستۂ ماتم۔ ج۔ ۹۔ ص ۶۹ رباعی نمبر ۵

[4] گلدستۂ ماتم ج ۹۔ ص ۶۹ رباعی نمبر ۶

بمبئی آنے کے بعد شروع کی۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں مرثیہ نگاری کی صلاحیتیں پہلے سے موجود تھیں لیکن ان صلاحیتوں کی نشو و نما بمبئی کے مرثیہ نگار روشنؔ، خلاقؔ اور رونقؔ وغیرہ کی صحبت میں ہوئی۔

اخترؔ کے زمانے تک عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اردو میں شعر کہنے کے اہلِ صرف وہ لوگ ہیں جو اردو کے خاص خاص مرکزوں کے رہنے والے ہیں۔ اخترؔ کو اس کا احساس تھا کہ وہ ان مقامات میں سے کسی سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود وہ امام حسینؑ کے ثنا خواں ہونے پر فخر و مباہات کا اظہار کرتے ہیں۔

شکرِ صد شکر کہ حضرت کا ثنا خواں ہوں میں   یہ نہ میں اہلِ زباں ہوں نہ زبانِ اہلِ ہیں[1]

اسی جلد میں بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں وہ شاعرانہ تعلّی سے کام لیتے ہیں:

گلشنِ شاعری کا تازہ گلِ تر میں ہوں   بحرِ ذخارِ تلازم کا شناور میں ہوں
جوہری ڈھونڈتے ہیں جس کو وہ جوہر میں ہوں   لشکرِ نظم و نسق کا ہے جو افسر میں ہوں

سامنے فوجِ مضامیں کے پرے رہتے ہیں
نئے مضموں کے رسالے بھی دھرے رہتے ہیں[2]

اخترؔ اپنے بیان کے مطابق شاعری کے مرکزوں سے تعلق نہ رکھتے ہوئے بھی شاعری کے بارے میں کچھ متعین تصورات رکھتے تھے۔ یہ تصورات شعر کی ہیئت اور مواد دونوں پر حاوی ہیں۔ جہاں تک مواد کا تعلق ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ شعر اس وقت تک شعر نہیں کہا جا سکتا جب تک اس میں چست مضمون نہ باندھا گیا ہو۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بعض وقت چست مضمون مصرع کی سستی میں بھی جان ڈال دیتا ہے۔ اخترؔ کی یہ رائے بھی ہے کہ مطلب میں تسلسل رہے، بیان میں کہیں کھانچے نہ پڑیں اور شعر میں کوئی نقص نہ ہو۔ زبان اور اسلوب کے متعلق ان کا خیال ہے کہ شعر کی زبان سلیس اور بامحاورہ ہونی چاہیئے اور ایسے الفاظ کا انتخاب کرنا چاہیئے جو زمانے کے چلن کے مطابق ہوں۔ اخترؔ شعر میں روزمرہ کے ساتھ ساتھ فصاحت کے بھی دلدادہ ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ رعایتِ لفظی شعر کے حسن کو نکھار دیتی ہے۔ یہ تمام لوازمات شعر کی خوبی میں اضافہ کرتے ہیں اور سخن داں بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ذیل میں ان کے مرثیے کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔

ربط مصرعوں میں رہے سلسلے کا دھیان رہے   انتظامات کا ہر بند میں سامان رہے
عیب بے جلوۂ ہنرمند نہ انجان رہے   کاملوں کی نہ نظر میں کوئی نقصان رہے

سکتہ آئے نہ کہیں طبع رسا موزوں ہو
سست مصرع ہو کوئی چست مگر مضموں ہو

روزمرہ بھی ہو مصرعوں میں فصاحت بھی ہو   بندش الفاظ کی ہو چست سلاست بھی ہو
کہیں تجنیس و تلازم ہو، رعایت بھی ہو   کہیں شیرینیِ سخن میں ہو حلاوت بھی ہو

رنگ جدت کا سخن داں کو نظر آنے لگے
مبتدا کا ہو جو مضمون خبر تک آنے لگے[1]

مرثیے کے بارے میں بھی انھوں نے کچھ خیالات ظاہر کیے ہیں۔ مثلاً وہ یہ کہتے ہیں کہ مرثیہ مختصر اور جامع ہو کیوں کہ طویل کلام بعض وقت سامعین کے لئے اکتاہٹ کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ وہ شہادت کے بیان کے علاوہ مرثیے میں رجز اور رزم کا ہونا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں۔

یہ اختصار کا ہر جا ہے ضرور خیال   سبب یہ ہے کہ نہ طولِ سخن سے ہوئے ملال

رجز ہو رزم بھی ہو نظم اور شہادت بھی
یہ اختصار کی موجود ہو شہادت بھی[2]

اخترؔ صرف مرثیہ گوئی کے لئے ہی مشہور نہیں ہوئے بلکہ ان کی شہرت کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود اپنا مرثیہ تحت لفظ منبر پر پڑھ کر سناتے تھے۔ لیکن انھیں نہ تو اپنی مرثیہ نگاری پر ناز تھا اور نہ وہ اپنے پڑھنے کے انداز پر فخر کرتے تھے۔ ایک مقام پر کہتے ہیں۔

پڑھنے پہ بھی کچھ فخر نہ دعویٰ مجھ کو   کہنے پہ بھی ذرا نہیں غرّا مجھ کو[3]

اخترؔ نے ایک اور مرثیہ "کالمۂ آب و آتش" کے عنوان سے لکھا ہے

---

[1] گلدستۂ ماتم۔ ج ۹۔ ص ۳۷۔ رباعی ۵
[2] گلدستۂ ماتم۔ ج ۹۔ مرثیہ ۷۔ ص ۱۰۷

---

[1] گلدستۂ ماتم۔ ج ۱۰۔ ص ۹۹۔ مرثیہ ۴۔
[2] گلدستۂ ماتم۔ ج ۸۔ ص ۳ مرثیہ ۱
[3] گلدستۂ ماتم ج ۲۔ ص ۶۲

جس میں آگ، آب کو امام حسین کی شہادت کا سبب ٹھہرانا چاہتی ہے۔ اسکے جواب میں آب، آگ کو قصوروار ٹھہراتا ہے کہ اس نے خیام مبارک جلائے تھے۔ افسر نے اس مسدس میں شاعرانہ حسن اور خوبی کے ساتھ شہادت اور تاراجیٔ خیام کے واقعات نظم کئے ہیں۔ یہ مسدس ۲۷ بند پر مشتمل ہے۔

ایک اور مرثیہ "تقریر شمع و پروانہ درحال شہادت امام حسین" کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ مسدس ۳۶ بند پر مشتمل ہے۔ اس میں پروانے شمع سے گلہ کرتے ہیں کہ وہ ان کے حال سے بے خبر خود ہی جلی جاتی ہے۔ اس کے جواب میں شمع کہتی ہے کہ حضرت رسول اکرم کا خاندان دین کا چراغ روشن کرنے کے لئے اپنے وطن سے دشت کربلا میں آیا تھا، اس کی روشنی کو شامیوں نے ظلم سے بجھا دیا، اور ایک عالم تاریک ہوگیا، اسی شمع نبی کا مجھے اس قدر غم ہے کہ اس کے سوز میں دن رات جلتی ہوں۔ اس طرح شمع زبانِ حال سے کربلا کے واقعات پروانے کو سناتی ہے اور کہتی ہے کہ تم بھی تو نور شمع فاطمہ کے پروانے ہو، اس سے بڑھ کر فخر کی بات اور تمھارے لئے کیا ہوسکتی ہے!

افسر نے ایک مرثیے میں حضرت قاسم کی شہادت کے واقعات بیان کئے ہیں۔ اس کا عنوان انھوں نے "مرثیہ درحال جناب قاسم در رخصت بنا دبنی ورعایات الفاظ بنا دبنی" رکھا ہے۔ اس کا مطلع ہے:-

کیا خوب خوشگوار تھا لفظ بنا بنا لیکن وہ کربلا میں غضب جانگزا بنا
واحسرتا بنا ہی شہید جفا بنا ہے ہے بنا بنی کا عجب واقعہ بنا

افسر بنا بنی کا تم اب مرثیہ لکھو
لیکن رعایتوں میں یہی باصفا لکھو

افسر نے اپنے اکثر مرثیوں میں مختلف قسم کی روایتیں بیان کی ہیں۔ تقریباً ہر مرثیے کی ابتدا کسی ایک خاص روایت سے ہوتی ہے۔ مثلاً زعفر جن کا مدد کے لئے میدان کربلا میں آنا یا پھر معجزوں کا بیان ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بتایا گیا ہے افسر نے طویل عمر (۱۰۱ برس) پائی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مدت میں انھوں نے مرثیے کی تاریخی نشوونما کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ وہ اپنے پیش رو مرثیہ نگاروں میں سے انیس، دبیر، نفیس، مونس، انس، عشق، جلیس، وحید، وفا، تعلیق، خلق، حسن، فصیح، ذکی، روشن، ضمیر، خشیر، سکین، اوج، بقا، حزیں اور امانت کا تذکرہ کرتے ہیں[1] اور ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اب ان سے دنیا خالی ہوگئی ہے۔

افسر کا کلام جو ہماری دسترس میں ہے وہ ایک تاریخی اور ادبی اہمیت رکھتا ہے۔ اپنے ایک مرثیے میں انھوں نے اپنے ہم عصر مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ یہ مرثیہ نگار وہ ہیں جو ان کے زمرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بند حسب ذیل ہیں۔

نام ان صاحبوں کا کرتا ہوں اظہر جو ہیں کوکب وحید و مقبول و سکندر اختر
قیصر و یوسف و تحسین و مظفر، قنبر حسن و صابر و سجاد و سکندر، اظہر

اہل ایماں ہیں، سخن فہم ہیں سب دانا ہیں
ذاکر شاہ ہیں اور سب کے کرم فرما ہیں

اور بھی دوست ہیں مداح جناب حیدر حیدری، صفدری، برہانی و حسنی گوہر
شاگرد عادل و احسان و سخنور، نیر طاہر و قادر و کیوان و عجیب و ازہر

سب محبان علی ہیں مرے احباب ہیں یہ
قلزم شعر و سخن کے درِ نایاب ہیں یہ

افسر نے جن جن شاعروں کے نام گنائے ہیں ان میں سے سجاد، حیدری اور صابر کے مرثیے مل جاتے ہیں۔ لیکن باقی شاعروں کے نہ مرثیے ملتے ہیں اور نہ حالات۔ ان کے نام افسر ہی کے توسط سے ہم تک پہنچے ہیں۔

افسر کے تین شاگردوں کا پتہ ان ہی جلدوں کے مطالعے سے چلتا ہے۔ آٹھویں جلد کے خاتمہ پر ان کے شاگرد سخنور نے جن کا نام لقمان جی تھا، اس جلد کی طباعت کا قطعہ تاریخ لکھا ہے۔ اسی جلد میں ایک اور شاگرد عنبر کا قطعۂ تاریخ درج ہے۔ عنبر کا نام ملا عنبر ابن نور بھائی تھا۔ افسر کے تیسرے شاگرد کا علم چودھویں جلد سے ہوتا ہے۔ ان کا نام محمد علی ابن عبدالحسین تھا اور واصف تخلص تھا۔ انھوں نے اپنے استاد افسر کے کلام کی چودھویں جلد کی طباعت کے موقع پر تاریخ کہی تھی۔ افسر کے ان شاگردوں کے بارے میں کسی بھی تذکرے میں کچھ حالات نہیں ملتے اور نہ ان کا کلام اب تک دستیاب ہوسکا ہے۔

---

[1] گلدستۂ ماتم ج ۴۔ ص ۱۳۰، نظم بعنوان "حال زمانہ"

انفاس کی لَو

محافظ حیدر

مریض کی پلکیں بس اس قدر وا تھیں کہ ڈھیلوں کی سفیدی دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھوں کی یہ سفیدی اور چہرے کی زردی اور کنپٹیوں کی بے تحاشا ابھری ہوئی ہڈیاں، کھلا ہوا منہ، ناک میں لگی ہوئی آکسیجن سلنڈر کی نلی کے ذریعے تنفس کا عمل، سارے ماحول کو اندوہناک بنا رہا تھا۔ مریض کے سبھی خاندان والے وہاں جمع تھے۔ ان کی شکلوں کا اجتماعی تاثر اور ان کا خموش انتظار زندگی کی شکست کا پس منظر تشکیل دے رہا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ ایک تحیر و تعطل سے معمور تمثیل کے آخری منظر پر پردہ گرنے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ انجام معلوم ہی تھا، آغاز انجام نظر میں تھا، انجام کا پتہ نہ چلتا تھا، اس کیفیت میں تین دن ہو چکے تھے۔

ایک نرس سرہانے کھڑی نلی کو بار بار ٹھیک کرتی رہتی تھی۔

سرہانے کے قریب ہی رکھی ہوئی ایک کرسی پر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون بیٹھی تھیں جو مریض کی بیوی تھیں۔ سوجی ہوئی آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ کتنے ہی روز سے پلک نہیں جھپکی اور آنسو نہیں رکے۔ ان کی نظر مریض کے چہرے پر تھی اور ذہن میں وہ اوراق پیچھے کی طرف خود ہی پلٹے جا رہے تھے جن پر ان کے ماضی کی انمٹ داستان نقش تھی۔

وہ تیرہ یا چودہ سال کی تھیں جب ان سے بیاہی گئی تھیں اور یہ انیس یا بیس سال کے تھے۔ دلہن بن کر سسرال میں جب انھوں نے قدم رکھا تھا تو دو تین مہینوں تک انھوں نے اپنے شوہر یا سسرالی رشتے داروں کے سامنے اپنی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ شوہر تھوڑی تھوڑی دیر بعد پچکار کر پچھوا دیا کرتے تھے اور خوشامدیں کیا کرتے تھے کہ "بیوی آنکھیں کھولو میں تمھارا غلام ہوں، اپنے غلام پر ظلم نہ کرو۔ کھولو، آنکھیں کھولو۔ اور شرم سے پسینہ پسینہ ہو کر وہ بے ساختہ مسکرا دیتیں اور سر جھکا لیتیں۔ یہی خشک، بے جان، خوفناک آنکھیں اس وقت پیار کا سمندر اپنی باہوں میں سمیٹے رہتی تھیں۔ جب کبھی وہ باہر سے لوٹ کر سیدھے اپنے کمرے میں آتے اور ان کو ایک نظر بھر کے دیکھتے تو ان کو اپنا شباب رنگین شعلوں میں لپٹا سراپا پگھل پگھل کر فضا میں گھلتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔

شادی کو نو مہینے ہوئے تھے کہ یہ ماں بھی بن گئیں۔ ماں باپ کی دلی خواہش پوری ہوئی اور دعائیں بیٹے کے روپ میں اثر لے آئیں۔ اس سن میں ماں بن جانا کچھ بھایا نہیں صحت اور جوانی کے بچاؤ کی خاطر بچہ کے لیے انّا رکھ لی گئی مگر انا رکھنے کا مطلب یہ تو نہ ہوا کہ اور بچے نہ ہوں۔ بیس کی بھی نہ ہوئی تھیں کہ چار بچوں کی ماں بن گئیں۔ دیکھنے میں تیس کی لگتی تھیں۔

شوہر نے دوسری شادی کر لی۔

بس جیسے بھیگا کپڑا دھوپ میں سوکھ جائے یوں ان کی شادی کا خمار اتر گیا۔ لگتا تھا شادی ہوئے عمریں گذر گئی ہیں۔ اور عمریں گذر گئیں مگر اس احساس میں تبدیلی نہ ہوئی۔ لاکھ جتن کیے، تعویذ، فلیتوں کو آزمایا، منتوں مرادوں کی سبیل کی، عمل عملیات کا سہارا بھی لے کے دیکھ لیا۔ ڈوبتے سورج نکلتے رہے اور بیتے موسم آتے رہے، مگر شوہر کا نگاؤ پھر نہ لوٹا۔ جب نصیب بدل ہی نہ سکیں تب نصیب پر سب کچھ چھوڑ دیا۔ تھک ہار کر بیٹھ رہیں۔ ساری توجہ اولاد کی تعلیم و تربیت اور گھر کی دیکھ بھال پر مرکوز کر دی۔ شوہر جتنی بھی دیر گھر کو مسافر خانہ سمجھ کے رہتے ان کو ہر قسم کا آرام پہنچا دیتیں۔ گھڑی کی سوئیوں کی طرح مقررہ نشانوں پر اور معینہ رفتار سے ان کی زندگی گذرتی رہی۔

سوت کو دیکھنے اور سوت سے ملنے کی کبھی خواہش نہ ہوئی، اور نہ شوہر ہی نے کبھی یہ مسئلہ چھیڑا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سوت کو بھی ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی ورنہ وہ خود ہی کبھی عید یا تہوار پر سلام کرنے چلی آتی۔ دونوں ایک ہی شوہر رکھتے ہوئے ایک دوسری سے بے خبر بنی رہیں۔ دونوں کا رویہ اپنی اپنی جگہ یوں تھا گویا ان کی کوئی سوت ہی نہیں ہے۔

جب بڑی بیٹی کی شادی کے موقع پر سوت کو مدعو کرنا پڑا اور کیا گیا تو وہ خود ہی نہیں آئی۔ اس نے تحفہ بھجوا دیا تھا اور ناسازئ مزاج کا بہانہ کر دیا،

جس کا کسی نے بُرا نہیں مانا اور دونوں کے آمنے سامنے ہونے کا موقع ٹل گیا۔

بہت عرصے کے بعد ایک دفعہ سنا کہ سَوت کے بیٹا ہوا ہے۔ کلیجہ پکڑ کر رہ گئیں۔ ایک موہوم سی امید جو شوہر کو پھر سے اپنانے کی تھی اس نے بھی سسک سسک کر دَم توڑ دیا۔ اب جینے کا ان کے نزدیک بس ایک ہی مقصد رہ گیا تھا کہ شوہر کے ہاتھوں اپنے دفن ہونے کی دعائیں کرتی رہیں۔ اٹھتے بیٹھتے یہی کہتی رہتیں کہ بس پروردگار اب اُٹھا لے۔

چند روز ہوئے کہ شوہر کو نمونیہ اور پھر ڈبل نمونیہ ہوگیا۔ اسپتال میں داخل کیے گئے۔ اب ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ وہ نزع کے عالم میں ہیں۔ آکسیجن کی مدد سے تارِ نفس کھینچا تو جا رہا ہے پتہ نہیں کب ٹوٹ جائے۔ اب بھی دل ہی دل میں یہ دعا کر رہی ہیں کہ اُن کی آئی کسی طرح ان کو آجائے اور اُن سے پہلے یہ اُٹھ جائیں۔ ویسے جانتی ہیں کہ اب اس بات کا کوئی امکان نہیں مگر جب تک شوہر کی سانس چل رہی ہے ان کی آس باقی ہے۔

اِن کی کرسی کے برابر ذرا پیچھے کی طرف ایک اور کرسی ہے جس پر ایک اور خاتون تشریف فرما ہیں۔ یہ ان کی سَوت ہیں جو ابھی ابھی آئی تھیں۔ کسی کی سَوت بننے سے پہلے یہ کسی کی بلا شرکتِ غیرے مالک تھیں۔ اِن کی ازدواجی زندگی تسکین و اطمینان کی چھاؤں میں گذر رہی تھی۔ یکایک ان کے جی میں کیا آئی کہ یہ خود بھی نہ جان سکیں کہ اپنے شوہر کے گھر سے دوست کی دنیا پر اپنے الطاف و عنایات کی قوسِ قزح سنوار دی۔ اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ زندگی کے دھارے پر اکیلا نہیں بہہ رہا ہے، مع اہل و عیال ہے۔ کم بخت دل پر قابو پانے کی بڑی جدوجہد بھی کی مگر وہ بھی دل ہی تو تھا مچل گیا۔ بے اولاد تھیں شوہر سے خلع لینے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اولین فرصت میں مل گیا اور عدت کا معمولی سا مرحلہ طے کرنے کے بعد دو گھر اُجاڑ دیے اور ایک بسا لیا۔ یہ واقعہ ان کی زندگی میں ایک ایسا سنگم تھا جہاں ان کی خوشیوں کا اُچھلتا کودتا چشمہ ایک پُرسکون دریا میں شامل ہوگیا۔ نئے شوہر کی پُرانی بیوی کے بارے میں جو سنا تھا وہ کافی تھا۔ اپنی سَوت سے ملنے کی انھوں نے کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھی۔ اگر ملاقات ہو بھی جاتی تو "آپ سے مِل کر بڑی خوشی ہوئی" کہنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ اگر یہ کہہ بھی دیتیں تو بڑی بناوٹی بات ہوتی اور بناوٹی باتوں سے انھیں نفرت تھی۔ سوچا وہ اپنے گھر خوش، میں اپنے گھر خوش، اور حقیقت یہی تھی کہ یہ اپنے گھر نہ صرف خوش تھیں بلکہ بہت خوش۔ اور اتنے عرصہ تک خالی رہنے والی گود بھرنے کے جب آثار پیدا ہوئے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ بھی نہ رہا۔ پھر جب گود بھری تو دامن مراد بھی بھر گیا ہوا تھا۔

شوہر بڑی بیگم کے گھر تھے۔ جب سنا کہ انھیں نمونیہ اور پھر ڈبل نمونیہ ہوگیا ہے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ہوش اڑ گئے۔ تڑپنے لگیں۔ کسی طرح اپنے گھر لے آئیں اور ساری جائداد اپنے بیٹے کے نام لکھ دینی چاہی مگر کچھ نہ بن پڑتا تھا۔ اس بارے میں شوہر سے کئی دفعہ گفتگو کی تھی مگر وہ جواب دے دیتے کہ "کردوں گا، جلدی کا ہے کی ہے، میں کوئی مرا تو جا رہا ہوں۔" اس پر کوئی کیسے کہہ دیتا "کیا پتہ آپ کب مر جائیں" چپ ہو کر رہ جاتی تھیں۔

اسپتال کی خبر سنی تو ساتھ ساتھ یہ بھی سنا کہ بڑی بیگم ساتھ ہر وقت وہیں رہتی ہیں۔ پھر جب پتہ چلا کہ سہاگ پر موت منڈلا رہی ہے قدم گھر سے نکالنا ہی پڑا۔ جیسے تیسے سَوت کا سامنا کیا۔ داخل ہوئیں تصنع آمیز ادب سے بڑی بیگم کو سلام کیا۔ اس ماحول میں ایسے وقت ناگہانی ملاقات نے بڑی بیگم کے جذبات پر کوئی منفی ردعمل نہیں پیدا کیا۔ انھوں نے بے ساختہ دعا دی۔ "جیتی رہو۔ اللہ تمہارا سہاگ قائم رکھے" اور برابر کی کرسی پر بٹھا لیا۔

انھوں نے سوچا کہ بڑی بیگم کی دعا محض رسمی اور بناوٹی ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ اب ان دونوں کے مشترکہ سہاگ کی یہ آخری سانس اور آخری گھڑیاں ہیں۔ موت برحق ہے، کسی کو اس سے مفر نہیں، خدا کی مرضی میں کسی کا دخل نہیں۔ مگر...... کسی طرح جائداد ان کے لڑکے کے نام ہو جائے تو مرنے والے کی موت سہل ہو جائے گی۔

وہ چپ چاپ بیٹھی بھیگی آنکھوں سے اپنے شوہر کے نزع کا عالم دیکھ رہی تھیں۔

ان کا نوعمر لڑکا ان کے برابر کرسی سے لگا کھڑا تھا۔ وہ کبھی اپنے باپ کو دیکھتا، کبھی اپنی بڑی اماں کو اور کبھی دوسروں کو۔ کبھی کبھی اپنی ماں کو بھی دیکھ لیتا۔ اُسے یہ سب چہرے اجنبی سے دکھائی دے رہے تھے۔ ما

میں ایسا نیا پن تھا جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

اس نو عمر لڑکے نے اپنی بڑی اماں کو سلام نہیں کیا تھا۔ یہ چیز بڑی اماں کو بڑی کھٹک رہی تھی۔ خود اس کی اپنی ماں کا دھیان کہیں اور تھا اس لیے اس نے اپنے بیٹے کی اس عمداً یا سہواً بدتمیزی کو دیکھا نہ محسوس کیا لیکن جب وہ اپنی ماں کے برابر اس کی کرسی سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور بہت ہی مضطرب اور وحشت سے ایک ایک کی صورت دیکھ رہا تھا تو انکھیوں سے بڑی اماں نے اس کا ایک دو بار غیر ارادی طور پر جائزہ لینے کی کوشش کی۔

"کیا نام ہے بچے کا؟" انھوں نے چھوٹی بیگم سے پوچھا۔

چھوٹی بیگم نے بھرائی ہوئی آواز سے نام بتایا۔

"کون سی جماعت میں پڑھتا ہے۔"

وہ بھی چپکے سے بتا دیا۔

"آؤ بیٹے ادھر آؤ۔" بڑی اماں نے چمکارا۔

لڑکے نے آنکھیں پھاڑ دیں۔ ماں نے اس کی طرف دیکھا۔

"سلام کیا تم نے؟"

لڑکے نے جھک کر بڑے ادب سے آداب کیا۔

بڑی اماں کو اب کہیں جا کے اطمینان ہوا اور وہ دعائیں دینے لگیں۔

"جاؤ بلاتی ہیں۔" ماں نے حکم دیا۔

اور لڑکا بڑی اماں کی کرسی کے اس طرف چلا گیا۔ اب بڑی اماں نے اسے جی بھر کے دیکھا۔ بڑا بھولا بھالا۔ ناک نقشہ ہو بہو اپنے باپ کا۔ آنکھوں میں نوجوانی کی امنگوں کا سیلاب۔ بڑھتے ہوئے جسم میں ارتقا کی توانائی۔ لگتا تھا جیسے انھیں کا بیٹا ہو۔ اگر آخری اولاد کے بعد ان کے اور اولاد ہوتی تو شاید وہ ایسا ہی ہوتا۔ یا کیا پتہ یہی ہوتا۔

اس بیچارے کا کیا قصور جو انھیں اس سے کوئی دشمنی ہوتی۔ دشمنی تو انھیں اپنی سوت سے بھی نہ تھی۔ بس ایک ناگوار سا احساس تھا سوت کے خلاف کیونکہ اس نے ان کی خوشگوار زندگی کی بساط الٹ دی تھی۔ ایک ایسی ہلچل پیدا کر دی تھی جو وقتی نہ تھی دائمی تھی اور ایک کیفیت اور ایک حالت میں ڈھل کر رہ گئی تھی۔

بڑی اماں کی نگاہیں پھر مرنے والے کی طرف ہو گئیں۔

ان تینوں کے مقابل پلنگ کے دوسری طرف بڑی اماں کا بڑا بیٹا کھڑا تھا۔

پہلے اس کی نگاہیں بھی اپنے باپ پر لگی تھیں۔ اسے احساس تھا کہ یہ اس کے باپ کا آخری وقت ہے، نزع کی حالت ہے، زندگی اور موت میں صرف گنی چنی اور وہ بھی مصنوعی سانسوں کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ پھر بھی اسے یقین نہ ہوتا تھا کہ وہ انسان جس کی گھڑکی سے اس کی جان نکل جاتی تھی اور اوسان خطا ہو جاتے تھے اور جب یہ دس گیارہ سال کا تھا تب تک دونوں ہاتھوں سے اس کے بازو پکڑ کر اٹھا کے پھینک دیتا تھا، وہ موت کے آگے اس طرح بے بس پڑا رہ سکتا ہے۔ اب تو وہ خود ایک بچہ لگتا تھا جس کے ہوش و حواس موت کی گھڑکی سے معطل ہو چکے تھے۔ یہ آدمی جو اس وقت سانس مشکل سے لیتا ہے کبھی بے وقت کی بارش کی طرح برس برس کر سارے گھر کا حال خستہ کر دیتا تھا۔ بیوی کونوں کونوں روتی پھرتی تھی اور بچے ادھر ادھر چھپتے پھرتے تھے۔ باپ کو دیکھتے ہی اس کی روح تک لرز جاتی تھی۔ شکر کرتا تھا کہ کوئی اس کی چھوٹی اماں ہے جہاں وہ اکثر رہتے ہیں تو وہ اکثر یہی دعا کرتا تھا کہ وہ وہیں کے ہو رہیں۔ زندگی بھر اس کی اور اس کے باپ کی کبھی نہ بنی۔ اس نے اور باپوں کو بھی دیکھا تھا جو اپنے بچوں کو مارتے پیٹتے مگر یہ نہیں کہ ہر دم اور ہر وقت۔ جب سختی کی ضرورت ہوتی تو سختی ضرور کرتے ورنہ وہ شفقت اور پیار کے بیج بوتے رہتے جن سے اولاد کی صحیح نشو و نما ہوتی۔ اور ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات لانے کا یہی طریقہ ہوتا ہے، نہ یہ کہ ان کے وجود ہی کی بیخ کنی کی جائے۔ یہاں تو ہر وقت یہی فکر رہتی کہ ابا آگئے تو کیا ہوگا۔ کبھی ان سے فیس مانگی تو جوتے پڑے، کپڑوں کے لیے کہا تب بھی جوتے پڑے، اور جوتے مانگے تو جوتے پڑے۔ سیر و تفریح کے لیے کہا تو پٹائی ہوئی۔ گویا باپ کے زبان تھی ہی نہیں۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے بولتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچوں نے ان سے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔ بیوی کو ہر ظلم سہنے کی عادت ہو گئی تھی اس لیے وہی ان بچوں کی نمائندگی بھی کرتیں اور سرپرستی بھی۔

اسی طرح دیکھتے دیکھتے اس نے انجینیرنگ کی ڈگری پاس کی اور ایک ڈیم پر اس کو اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ وہ خوشی خوشی اپنے مستقر پر چلا گیا۔ باپ سے دور ہونے کی اسے بڑی خوشی تھی مگر ماں سے دور ہونے کا اسے غم بھی تھا۔ وہ ضرور اپنی ماں کو اپنے ساتھ لے جاتا مگر اس کے دوسرے بھائی بہنوں کی مشکل ہو جاتی۔ ماں کو بھی اپنے بیٹے کی ان ترقیوں سے بے حد مسرت ہوتی تھی اور

اُسس بڑھیٹی کے لال کی بھولانے کا بڑا ارمان تھا۔ ایک دن دبے لفظوں میں جب اس کے باپ سے اس خواہش کا اظہار کیا تو اس نے کہہ دیا کہ اپنی کمائی سے کچھ جمع کرے اور جہاں چاہے اپنی شادی کرلے۔ یہ سن کر ماں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ یہ نہیں کہ شوہر اس قابل نہ تھے کہ اپنے بیٹے کی شادی نہ کرسکتے تھے۔ روپے پیسے کی افراط تھی۔ کسی کی محتاجی نہ تھی۔ مگر یہ بات انھوں نے ایسے کہہ دی جیسے وہ ان کا بیٹا ہی نہ ہو۔ ان کے اس انداز اور تیور سے دل کو ٹھیس لگی تھی۔ مگر ایسی تو ان گنت ٹھیسیں ان کے دل کی پنہائیوں میں سمو کر رہ گئی تھیں! یہ ایک اور سہی! اور جب خط میں اپنے بیٹے کو اس نے یہ بات لکھی تو بیٹے سے اپنی ماں کی یہ بے بسی اور مظلومی سہی نہ گئی اور وہ ایک بے زبان بچے کی طرح اپنے کوارٹر کی تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اُس روز اُس نے عہد کیا کہ اب اگر اُس کے باپ نے اپنے روپے سے اس کی شادی کرنا بھی چاہی تو وہ صاف انکار کردے گا اور اپنی ہی کمائی سے اپنی شادی کرکے ماں اور باپ دونوں کے آگے سرخرو ہوگا۔

ایک دفعہ رمضان کی عید پر وہ چار روز کی چھٹی لے کر گھر آیا۔ ملازمت پر جانے کے ایک سال کے بعد چھٹی پر پہلی دفعہ آیا تھا۔ اتفاق سے یہ چار روز باپ اپنی چھوٹی بیگم کے پاس تھے۔ عید کے روز وہ بڑی بیگم اور ان کے بچوں سے عید ملنے بھی نہ آئے۔ بیٹے نے اپنی ماں کو تسلی دی: "امی یہ سمجھو کہ بابا مر گئے ہیں، تم بیوہ ہوگئی ہو، تمھاری زندگی کا بس ایک ہی سہارا ہے، اور وہ میں ہوں۔"

اس بات پر ماں نے بگڑ کر عین عید کے روز اپنے اس چہیتے بیٹے کو کوسا تھا: "شرم نہیں آتی اپنے باپ کے مرنے کی بات زبان سے نکالتے ہوئے؟ موئے کالی زبان جل جائے تیری۔"

وہی باپ آج سچ مچ موت کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ اس کے مرنے کا اُسے کوئی افسوس ہے نہ کوئی غم۔ ماں کے مسلسل تار دینے پر تین روز کے لیے وہ چلا آیا۔ تین دن محض انتقال کے انتظار میں گذر گئے۔ اب باپ کا انتقال ہو نہ ہو، اُسے اپنے مستقر پر واپس جانا ہے۔ بہتر تو یہی تھا کہ انتقال ہو جاتا تاکہ ساری رسمیں وہ انجام دے سکتا اور سر سے ایک بوجھ اتر جاتا۔ اب مستقر پر یہی فکر رہے گی کہ جانے مرے بھی کہ نہیں۔

پھر جب اس نے چھوٹی اماں کو وارڈ میں داخل ہوتا دیکھا اور ان کے ساتھ ان کے لڑکے کو بھی تو اس کے خیالات اور منصوبوں کا دھارا ایک بالکل ہی نئے رخ پر بہنے لگا۔ اُسے اپنی چھوٹی اماں اور ان کے بیٹے سے جن کا اس نے آج تک صرف ایک غیر واضح تصور ہی کیا تھا، سخت نفرت تھی۔ انھیں دیکھ کر وہ اپنے من ہی من میں بے قابو ہوگیا اور اس کا جی چاہا کہ وہاں سے بگٹٹ بھاگ جائے۔ لیکن ایسے موقع پر فرار خود اس کے حق میں مضرت رساں ہوتا۔ خوش قسمتی سے اُس کے باپ نے کوئی وصیت نامہ تیار نہیں کروایا تھا ورنہ چھوٹی بیگم کے چکر میں اگر وہ اپنی ساری جائیداد چھوٹی بیگم کے لڑکے کے نام کر دیتے تو بڑی بیگم اور ان کی اولاد کیا کر لیتی۔

بڑی بیگم کے بڑے بیٹے کے برابر ان کی سب سے چھوٹی لڑکی کھڑی تھی۔ کوئی سترہ اٹھارہ کی۔ عجیب منظر تھا۔ موت کے مقابل زندگی تھی۔ ایک طرف سانسوں کی کمی تھی دوسری طرف افراط تھی۔ اس کی خمار آلود آنکھوں کی سطح بڑی پُرسکون لگتی تھی لیکن ان کی تہہ میں طوفان پل رہے تھے۔

وہ اس طرح سے اپنے مرنے والے باپ کو دیکھ رہی تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی بھی شے اور کیفیت ہے جس کا نام موت ہے؟ موت کے بارے میں اس نے پڑھا تھا، سنا تھا لیکن عجیب اتفاق ہے کہ آج تک اُس نے کسی کو مرتے نہ دیکھا تھا۔ موت کے متعلق اُس نے بہت کچھ سوچا تھا لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ اور اب مرنے والے سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑی وہ اس کا مشاہدہ کر رہی تھی جس طرح کسی شعبدے باز کا کوئی محیر العقول شعبدہ دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا کہ ایسا ممکن ہو سکتا ہے اور دل یہی کہتا ہے کہ یہ فریب نظر ہے، اُسی طرح اپنے باپ کو مرتا ہوا دیکھ کر بھی وہ یقین کرنے پر آمادہ نہ تھی کہ اُس کا باپ مر رہا ہے۔

اُسے اپنے باپ سے کوئی خاص ہمدردی تو نہ تھی لیکن وہ اس کی موت بھی نہ چاہتی تھی، محض اس لیے کہ موت اُسے پسند نہ تھی۔ جب سبھی مر سکتے ہیں اور مرتے ہیں تو اُسے بھی مرنا ہوگا۔ پھر موت کا کوئی وقت معین نہیں ہے اور وہ بہت کچھ کرنا چاہتی ہے، بہت کچھ۔ ہاں باپ کے مرنے کا ایک فائدہ ضرور تھا۔ اُسے اپنی پسند کی شادی کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی!

اس لڑکی کے برابر اس کی بڑی بہن کھڑی تھی جو شادی شدہ تھی۔ اس کے دو چھوٹے بچے تھے جن کو وہ گھر چھوڑ آئی تھی اور ایک پیٹ میں تھا۔

ساری اولاد میں سب سے زیادہ اس کو اپنے باپ سے نفرت تھی۔
حالانکہ پہلے اسی کو سب سے زیادہ اپنے باپ سے پیار تھا۔ یہ جب چھوٹی سی تھی تو اپنے باپ کو دیکھتے ہی فوراً اس کی طرف لپکتی تھی اور اس کے سینے سے یوں چمٹ جاتی جیسے وہ اس کا باپ نہیں بلکہ ماں ہے۔ اور ہر روز صبح سویرے جاگنے کے بعد وہ سیدھی اپنے باپ کے پلنگ پر چڑھ جاتی اور اس کے پھیلے ہوئے بازو پر سر رکھ کر اور اس کے پیٹ پر اپنی ننھی سی ٹانگ ڈال کر انگوٹھا چوستی ہوئی پڑی رہتی۔ باپ اُس کو اُٹھا کر اپنے خوب پھیلے ہوئے سینے پر لٹا لیتا اور خوب بھینچ کر پیار کرتا اور گد گدیاں کرنے لگتا۔ یہ انگوٹھا چوستی ہوئی کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ وہ اس کے تتلانے پر محظوظ ہوتا اور اس سے اسی کی زبان میں بات کرتا۔ یہ مینڈک کو "ٹکٹ" کہتی تھی تو باپ بھی مینڈک کو کہیں پھدکتا دیکھ کر اس کو اشارے سے دکھاتا اور بڑی نقلی حیرت اور گھبراہٹ سے کہتا "ٹکٹ!"
'چیونٹی' وہ کہہ نہ پاتی تھی تو جہاں بھی چیونٹی کو دیکھتی اپنے باپ کو اشارہ کر کے فلِٹ مارنے کی اداکاری کرتی اور ساتھ "چھِس چھِس" کہتی جاتی کیونکہ باپ چیونٹیوں کا دشمن تھا اور جیسے ہی کہیں وہ چیونٹیوں کی قطار دیکھتا فلِٹ گن اُٹھا لاتا اور سب کا صفایا کر دیتا تھا۔ جب کبھی ننھی چیونٹیوں کی طرف اشارہ کرتی تو وہ اس کی اداکاری کا پورا لطف اٹھاتا ہوا دوڑ کر جاتا اور فلِٹ گن لا کر چیونٹیوں کی قطار کے پاس اکڑوں بیٹھ جاتا پھر اپنی بانہوں کے حلقے میں ننھی کو لے لیتا اور فلِٹ گن اسی سے پکڑوا کر خود چلاتا رہتا اور دونوں ہنستے ہوئے "چھِس چھِس" کا ڈوئیٹ تشکیل دیتے۔
اس نے اپنی بیٹی کے لیے گھر میں کھلونوں کی باقاعدہ دوکان سی کھول دی تھی۔ ہر نئے قسم کا کھلونا جو بازار میں آتا وہ اپنی چہیتی بیٹی کے لیے فوراً لے آتا۔ خصوصاً گڈا گڑیا، ملکوں ملکوں سے آئے ہوئے اس کے مہمان تھے۔ کوئی جھکانے سے ہنس پڑتی تھی۔ کوئی لٹانے پر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ کوئی ہر وقت کی دلہن تھی۔ کوئی سدا سہاگن، کسی کا سراپا کپڑے کا تھا تو کسی کا چینی کا۔ کوئی چیتھڑوں میں لپٹا رہتا تھا۔ کوئی مہاراجہ بنا رہتا تھا!
اس کی خالہ زاد بہن نے اپنے ایک لمبے تڑنگے خوانٹ گڈے سے جب اس کی من موہنی سیدھی سادی گڑیا بیاہی تھی تو اس کے باپ نے اتنا جہیز دیا تھا کہ سارے خاندان، اڑوس پڑوس اور جان پہچان والوں میں دھوم مچ گئی تھی۔ اس جہیز میں سبھی قسم کے ننھے منے زیور، ملبوس، فرنیچر، کٹلری اور نوادرات شامل تھے۔ ایک ہزار روپے نقد الگ دیے گئے تھے۔ یادگار اجتماع ہوا تھا۔ بہت ہی اعلیٰ پیمانے پر سب کی دعوت کی گئی تھی۔
رفتہ رفتہ اس کے باپ کے رویے میں تبدیلی ہوتی گئی اور گھر کی فضا بدلتی چلی گئی۔ اس کی ماں سے وہ بات بات پر بگڑنے لگا، پھر بچوں پر بھی۔ اب وہ پہلا سا پیار ایک بھولی ہوئی کہانی بن چکی تھی۔ سنا تھا کہ وہ سارا پیار کسی نئی ماں کے گھر چلا گیا تھا جو دور، بہت دور رہتی تھیں۔
چنانچہ اُسے بھی اپنے باپ کی صورت دیکھ کر چڑھ اور غصہ پیدا ہونے لگا۔ اگر کبھی بھولے سے بھی وہ اپنی چہیتی کو بلا لیتا تو یہ کھسکتی پھرتی اور اس کے سامنے نہ جاتی۔
برسوں گذر گئے۔
باپ نے اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ جو کچھ کیا ماں نے ہی کیا۔ جوں جوں وقت بڑھتا گیا، یہ بھی بڑھتی گئی۔ گریجویشن بھی اس نے کر لیا۔ پھر ایک مالدار گھرانے میں اس کی منگنی ہو گئی۔ اس منگنی نے باپ کی مری ہوئی شفقت میں نئی روح پھونک دی۔ مگر بیٹی کے جذبات باپ کے لیے اس قدر خاکستر ہو چکے تھے کہ ان میں اب نئی حرارت پیدا ہی نہ ہو سکتی تھی۔ سمجھ دار اور ہوشمند بیٹی دیکھ رہی تھی کہ داماد کی دولت اور خاندان کی طرف باپ کی طوطا چشمی کا رُخ پھر گیا تھا۔ جس کا کھلا ثبوت اس کی شادی کے بعد اس کے شوہر سے باپ کی چاپلوسی میں مل گیا۔ اتنے کم عرصے میں باپ نے اپنے داماد سے جتنی شفقت، محبت اور خلوص کا اظہار کیا اس کا دسواں حصہ بھی اولاد کی پوری زندگی اور نصیب میں نہ آیا تھا!
باپ کی اس مادیت پرستی نے بیٹی کے دل میں اس کے لیے جو فطری طور پر ذرا سا احترام اور لحاظ رہ گیا تھا وہ بھی نچوڑ لیا۔ وہ کبھی اس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتی تھی اور صرف شوہر کو تجسّس نہ کرنے کے لیے "ہوں۔ ہاں۔ اونہوں" میں باپ کی باتوں کا جواب دیتی۔
باپ کی شدید علالت کی خبر ہونے پر بھی اسپتال جانے کو اس کا جی نہ چاہا۔ اُس نے شوہر سے یہ بہانہ کر دیا کہ باپ کو مرتا ہوا وہ دیکھ نہ سکے گی۔ مگر آخر شوہر کے مجبور کرنے پر اُسے آنا ہی پڑا۔ وہ راستہ بھر دعا کرتی آئی تھی کہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی باپ کا دَم نکل جائے۔ یہاں پہنچی تو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ابھی اس کے بے جان جسم میں آکسیجن مہیا کی جا رہی ہے۔

اس کے پاس ہی اس کا شوہر کھڑا تھا۔ وہ آبدیدہ تھا۔ اپنے شفیق و مہربان
خسر کی حالت اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس کی مہربانیاں وہ کبھی بھلا نہ سکے گا۔
اس کا پیار اُسے ہمیشہ یاد رہے گا۔

اور ایک لڑکا مظفر جو علی گڈھ میں پڑھتا تھا اور جسے باپ کی نازک
حالت کی اطلاع دے دی گئی تھی نہیں آیا۔

یکایک مریض نے سانس کی تکلیف سے تکیے پر سر اونچا کیا اور منہ
کھول کر سانس لینے کی کوشش کی۔ نرس نے نلی تھام لی۔ دو تین لمبی اور
تکلیف دہ سانسوں کے ساتھ دم نکل گیا۔

نرس نے نلی ہٹا کر اُسے سلنڈر کے ساتھ لگا دیا اور لاش پر چادر
اڑھا کر جانے لگی۔

بڑی بیٹی نے منہ دیوار کی طرف کر لیا۔

بڑی بیگم دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ ان کی دعا قبول نہیں ہوئی۔
چھوٹی بیگم نے دانتوں میں پلو دبا کر رونا شروع کیا۔ ان کے بیٹے کو
پوری جائیداد نہیں مل سکی۔

چھوٹی بیگم کا لڑکا دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر "ابا ابا" چلا کر رونے لگا۔
مرحوم کے داماد نے اپنے سالے سے سرگوشی میں پوچھا۔ "کوئی وصیت نامہ؟"
سالے نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی کو وراثت کے
حصے سے محروم رکھنے کے لیے اُسے چھوٹی بیگم کی ناجائز اولاد ثابت کرنے کے
پہلو پر غور کر رہا تھا۔

اور وہ حسینہ، مرحوم کی سب سے چھوٹی لڑکی، خالی خالی آنکھوں سے
سب کچھ ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی ننھا شیر خوار کسی کے بٹن دبانے پر بجھتے
ہوئے برقی قمقمے کو دیر تک دیکھتا رہے۔

نرس داخل ہوئی اور مرحوم کے بڑے بیٹے کو اُس نے بل تھما دیا۔

لاش کو جب گھر لے جانے لگے تو بڑی بیگم نے ایک ہاتھ چھوٹی بیگم کے
کندھے پر اور دوسرا اس کے لڑکے کے کندھے پر رکھا۔ بولیں۔ "چلو۔ آج سے
تم دونوں میرے پاس رہو گے!"



ادب میں ہیئت اور تکنیک کا مسئلہ

(بسلسلہ صفحہ ۸)

ہو جائے گا اور اس میں تاثر بھی باقی نہ رہے گا۔ ہمیں مواد اور ہیئت کی یکساں اہمیت
سے انکار نہیں جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے دونوں کا تعلق جسم و جان کا ہے۔ مگر کہنے کا
مقصد تو یہ ہے کہ جس طرح وقت کے ساتھ ساتھ مواد بدلتا رہتا ہے اسی طرح ہیئت
میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے، اگرچہ ہیئت کی تبدیلی اتنی جلدی اور تیزی کے
ساتھ نہیں ہوتی۔ بعض ادیب، ادب کی تکنیک کو ایک رسمی ہیئت تسلیم کرتے
ہوئے اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ فلابیر نے تو یہاں تک کہا ہے کہ بڑا آدمی اور
ادیب وہ ہے جو مستقل طور پر خالص رسمی اور خارجی صفات کو نظر انداز کرتا ہے لیکن
اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ فنی ہیئت بے کار محض ہے۔ رالف فاکس نے
فن کے اس پہلو کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ فن کے اس اہم پہلو کی
اہمیت کو کم کرنا بڑی زبردست حماقت ہوگی کیونکہ دراصل بڑے ادیب ہیئت
اور انداز بیان پر پورے طور پر قادر ہوتے ہیں جہاں کہیں انھوں نے اس سے
انحراف کیا ہے تو اس لیے کہ "تخلیقی جینیس" نے نئے قوانین مرتب کیے ہیں
تاکہ یہ ہیئت اُن کے تخیل کو پورے طور پر اپنی گرفت میں لے سکے۔ ادبی ہیئت
کے قوانین میں تبدیلی بھی اسی طرح ہوتی ہے

ہندستان کے کلاسیکی ناچ



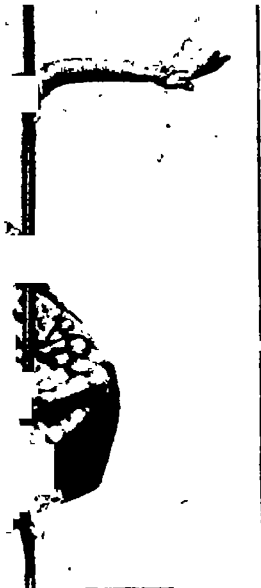
ہندوستان کے کلاسیکی رقص



یامنی کرشنا مورتی بھرت ناٹیم کے ایک انداز میں

کتھا کلی





شریمتی مرنالنی سارا بھا

ہندوستان کے



شمبھو مہراج

کماری شانتا راؤ (بھرت ناٹیم)







(بھرت ناٹیم)

یکی رقص



برجو مہراج

کتھک رقص از کماری روشن







ہندوستان کے کلاسیکی رقص



اندرانی رحمان رقص کے ایک انداز میں

منی پور ڈانس کالج امپھال کے ایک رقص ڈرامے میں "پنگا چولم"



تعزیت نامہ

[illegible]

[illegible] نفس کی [illegible]

[illegible]

[illegible] کے ساتھ رہے [illegible]

اپنے کمال فن کا [illegible]

[illegible] زیادہ [illegible]

[illegible] لفظ کی [illegible]

[illegible] موقع [illegible]

[illegible] دوسرے [illegible]

[illegible]

مستحکم کر لیا ہے۔

موجودہ دور میں بھرت ناٹیم کے نمایندہ فن کاروں میں شریمتی رُکمنی دیوی، شریمتی شانتا، بالا سرسوتی، وجینتی مالا اور پدمنی قابلِ ذکر ہیں۔ شریمتی رُکمنی دیوی نے اس رقص کو مقبولِ عام بنایا اور اس کو نیا وقار بخشا۔ شریمتی شانتا نے اس کی اُن اصلی خوبیوں کو برقرار رکھا جو تنجور کے پُرانے اسکول کا عطیہ تھیں مگر کملا، پدمنی اور وجینتی مالا جیسی ماہرِ فن رقاصاؤں نے ہندستان کے حسین ترین رقص کو نظر انداز کرکے فلمی زندگی اختیار کر لی ہے۔

کتھا کلی

کیرالا کی سرزمین جو اپنے تاڑ کے درختوں کے حسین جھرمٹ اور سمندری کناروں کے دل فریب مناظر کے لیے مشہور ہے، کتھا کلی کی جنم بھومی ہے۔ کیرالا میں اگرچہ کئی طرح کے رقص رائج ہیں جن میں سے ہر ایک مخصوص دل کشی کا حامل ہے لیکن کتھا کلی کی بات ہی کچھ اور ہے۔ کتھا کلی، کیرالا کا بے مثال تمثیلی رقص ہے۔ اس رقص میں "مُدراؤں" (اشاروں) کے ذریعہ جذبات کی ترجمانی کے جس فن کا مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ اپنی پختگی اور کاملیت کے اعتبار سے دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ کتھا کلی میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے (کتھا: کہانی، کلی: کھیل) رقص کے روپ میں کوئی کہانی بیان کی جاتی ہے۔ اس میں رقاص نہ گاتے ہیں اور نہ اپنی زبان سے کوئی لفظ ادا کرتے ہیں بلکہ وہ زبانِ بے زبانی سے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ رقص کے ساتھ الگ سے گیت اور موسیقی بھی ہوتی رہتی ہے۔ آرکسٹرا میں دو گویّے ہوتے ہیں جو کہانی بیان کرتے ہیں، اور دو ڈھول بجانے والے ہوتے ہیں جن میں سے ایک مدَلَم بجاتا ہے جو پکھاوج سے مشابہ ہوتا ہے۔ دوسرا ایک ڈھول بجاتا ہے جو ہمارے تاشہ سے مشابہ ہوتا ہے لیکن اس سے جسامت میں بڑا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک جھانجھ بجانے والا ہوتا ہے جو گانے والے کے ساتھ کبھی کبھی سنگت کرتا ہے۔ یہ رقص ہمیشہ کھلے میدان میں عارضی طور پر بنائے گئے اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے۔ سٹیج کی سادگی کا خاص خیال کیا جاتا ہے۔ روشنی کے لیے پیتل کا ایک اونچا شمعدان ہوتا ہے جس میں تیل کا چراغ روشن رہتا ہے جس کی خنک روشنی صد درجہ فرحت بخش ہوتی ہے۔ سنکھ کی آواز کے ساتھ ہی اس رقص کا پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں جو کہانی پیش کی جاتی ہے وہ عام طور پر ہندوستانی دیومالا سے لی جاتی ہے۔ اس پروگرام کو پیش کرنے کا روایتی طریقہ حسبِ ذیل ہے:

غروبِ آفتاب کے وقت ڈھول پیٹ کر اس پروگرام کا اعلان کیا جاتا ہے۔ پھر ناچ کا اصل پروگرام تھوڑے سے رقص، موسیقی اور پرارتھنا کے بعد جو پردے کے پیچھے ہوتی ہے، شروع ہوتا ہے۔ کتھا کلی کے کردار ڈھول کی بلند اور تیز آوازوں میں تیزی سے رقص کرتے ہوئے اسٹیج پر آتے ہیں۔ اس عمل کو "تِرَنوکّو" کہتے ہیں۔ اس کے اور اصل ناچ شروع ہونے کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے اُسے "میل پاڈ" کہتے ہیں جس میں ڈھول بجانے والوں اور گویّوں میں ساز اور سنگیت کا مقابلہ ہوتا ہے۔

کتھا کلی کی تربیت بہت سخت ہوتی ہے۔ تربیت حاصل کرنے والے بڑی سخت ورزشیں کرتے ہیں اور تیل کی مالش کراتے رہتے ہیں جس سے اُن کا جسم لچک دار اور اس رقص کے لیے موزوں ہو جاتا ہے۔ تربیت حاصل کرنے والوں کو "تِرَنوکّو"، "تو ڈایَم" اور "اَشٹ کلاسَم" سیکھنے میں، جو کتھا کلی کے مشکل ترین اور پیچیدہ رقص ہیں، گھنٹوں صرف کرنا پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں مُدرا یا اشاروں کی پیچیدہ زبان بھی سیکھنی ہوتی ہے جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ تربیت کا یہ سلسلہ برسوں تک چلتا ہے تب کہیں اُسے کتھا کلی کے پروگرام میں کوئی چھوٹا موٹا رول دیا جاتا ہے۔

میک اَپ (رُوپ بھرنا) ایک ایسا فن ہے جس کے لیے خصوصی فن کار کے میک اَپ میں دو تین گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ کتھا کلی کے تمام مرد فن کار ایک سفید چہرہ لگاتے ہیں۔ یہ چہرے چاول کی لیئی سے بنائے جاتے ہیں اور ان کو "چٹی" کہا جاتا ہے۔ اداکاروں کے چہرے کو رنگنے کے لیے کچھ خاص قاعدے ہیں۔ اعلیٰ کرداروں جیسے وشنو بھگوان، کرشن بھگوان، پانڈوؤں، رام اور لکشمن کو ہرے رنگ سے رنگا جاتا ہے، اور راکھششوں مثلاً راون کی ناک کو سرخ، اور آنکھوں کے چاروں طرف سیاہ رنگ لگایا جاتا ہے اور ان کی ناک پر لیمو کے برابر ایک سفید گولا دکھایا جاتا ہے۔ عورتوں کا میک اَپ بہت سادہ ہوتا ہے۔ آنکھوں کو رنگنے

کے لیے ایک خاص پودے کا عرق استعمال کیا جاتا ہے جس سے آنکھیں خون کی طرح سُرخ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ میک اپ کا کمال یہ ہوتا ہے کہ دیکھنے میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اداکاروں نے مصنوعی چہرے لگا رکھے ہیں لیکن اس چہرے پر جذبات کا آتار چڑھاؤ بہت واضح طور پر نظر آتا ہے۔ راکھششوں کا روپ بھرنے میں کتھا کلی کے اداکاروں کا دنیا میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میک اپ، لباس، موسیقی، ڈھول کی پر زور آواز اور چیخنے چلانے کی عجیب آوازوں سے کردار حقیقی راکھشش معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اداکاروں کے لباس اور مکٹ اگرچہ بڑا بوجھ معلوم پڑتے ہیں لیکن ان کی بھی ایک نرالی آن بان ہوتی ہے۔

کتھا کلی ناچ بلا شبہ ایک حد درجہ ترقی یافتہ فن ہے جس میں تمثیلی رقص (ڈانس۔ڈرامہ) پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ اس کی خاموش اداکاری دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ چاتّنی پانیکر، کرونا کر پانیکر، گوپی ناتھ رائنی مینن اور کنج کروپ کتھا کلی کے ممتاز فن کار ہیں حقیقتاً ہمیں کیرالا کے سورگباشی کوی وَلاتھول کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہیئے جن کی انتھک کوششوں سے کتھا کلی کو ہندوستان بھر میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی۔

منی پوری

منی پور، برف پوش ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے۔ زمین کی زرخیزی اور بارش کی کثرت کی وجہ سے یہاں ہمیشہ سے خوشحالی اور فراوانی کا دور دورہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ مطمئن اور سکھی ہیں اور سیدھی سادی مذہبی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس آسودہ ماحول میں یہاں جو رقص پروان چڑھا اس میں بڑی دل آویزی اور ہم آہنگی پیدا ہو گئی اور اسی لیے یہاں کے رقص کا عوام کی مذہبی زندگی سے بھی بڑا گہرا ربط رہا۔ کہا جاتا ہے کہ منی پور کے ابتدائی ناچوں میں بھگوان شیو اور پاروتی کی اساطیری داستانوں کو پیش کیا جاتا تھا۔ بعد ازاں جب وشنو مت کا فروغ ہوا تو رادھا اور کرشن منی پوری رقص کے مقبول موضوع بن گئے۔

منی پوری رقص کی چار قسمیں ہیں: (۱) لائی ہَرَوبا جس میں پرانے کلاسیکی اسٹائل بھی شامل ہیں (۲) آنسترُ ویدیا (۳) چالان گا تھان (۴) راس لیلا۔

لائی ہَروبا۔ منی پوری رقص کی یہ قسم سب سے قدیم ہے۔ اس کا مطلب ہے دیوتاؤں کا تیوہار۔ یہ درحقیقت ایک تمثیلی رقص ہے۔ مائی رانگ لائی ہَروبا ناچ میں جو بڑا رنگین اور دل کش رقص ہے سَو یا اس سے زیادہ افراد حصہ لیتے ہیں۔ مائی رانگ گاؤں میں تھانگ جنگ مندر کے سامنے ایک خصوصی تقریب میں یہ رقص پیش کیا جاتا ہے۔ ایک 'دو یا اُس سے زیادہ فن کار یہ رقص پیش کرتے ہیں اور اس میں منی پور کی عظیم رزمیہ نظم مائی رانگ بَرُو کی داستانوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ داستانیں نظم کے ہیرو کھمبا اور ہیروئن تھائی بی کے کارناموں سے متعلق ہوتی ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شیو اور پاروتی کے اوتار ہیں۔ یہ تقریب سات سے لے کر دس دن تک جاری رہتی ہے جس میں متعدد رقص شامل ہوتے ہیں۔ اس رقص کے بارہ حصّے ہوتے ہیں جو اس تقریب کے دوران میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اس رقص کی تکنیک بڑی کامل ہوتی ہے اور یہ رقص بھی بہت مشکل اور کلاسیکی تالوں جیسے چوتال، دھمار، رُدرتال، برہم تال اور سواری میں پیش کیا جاتا ہے جو منی پور کے کلاسیکی رقص کے ورثہ کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس فن کی مشق زیادہ تر دیوداسیاں کرتی تھیں مگر وشنو مت کے عروج کے ساتھ اسے بالکل نظرانداز کر دیا گیا لیکن گرو سوریہ بارہ سنگھ کی کوششوں کی بدولت یہ کلاسیکی رقص پھر زندہ ہوا اور اس کی شہرت منی پور کے باہر بھی پھیل گئی۔

آنسترُ ویدیا۔ آنسترُ ویدیا قدیم رقص کی ایک دوسری قسم ہے جس میں نٹ بازی کی تمام قسمیں شامل ہیں۔ یہ رقص تلواروں اور نیزوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جس میں مصنوعی جنگ بھی ہوتی ہے۔ اس رقص میں حصّہ لینے کے لیے بڑی چستی اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے جو برسوں کی سخت تربیت اور تعلیم کے بعد ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ زمانہ قدیم میں تمام مردوں کے لیے یہ رقص سیکھنا لازمی تھا۔ یہ رقص خاص طور پر درگا پوجا کے دوران پیش کیا جاتا ہے اور اس میں اُس وقت کا منظر دکھایا جاتا ہے جب لنکا کا راجہ راون مارا جاتا ہے۔

چالان گا تھان۔ وشنو مت کے آغاز کے ساتھ چالان گا تھان کا جنم ہوا۔ یہ درحقیقت ایک کیرتن ناچ ہے جس میں منجیرہ، کرتال اور کھول (مردنگ) استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن عام کیرتن ناچوں کے برعکس جو سادہ نوعیت کے ہوتے ہیں، چالان گا تھان کی ایک کلاسیکی تکنیک ہوتی ہے

جو آج بھی اس ناچ کے پرانے اُستادوں کی وجہ سے برقرار ہے۔ اس رقص میں حصہ لینے والے مرد فن کار کا لباس سفید دھوتی، اُترّیہ (ایک طرح کا دوپٹہ) اور پگڑی پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ عورتیں رنگ برنگ کے لباس پہنتی ہیں۔ یہ رقص ہمیشہ ٹولیوں میں ایک دائرہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں منجیرے کی آواز فضا میں اُبھرتی ہے جو رفتہ رفتہ تیز ہوتی جاتی ہے۔ بعد ازاں ڈھول بجانے والے اُچھلتے کودتے اور چکر کھاتے ہوئے میدان میں آجاتے ہیں۔ اس طور پر یہ رقص بہت جلد اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔

راس لیلا۔ راس لیلا منی پور کا خاص اور سب سے مقبول رقص ہے۔ "بھاگوت پُران" میں بھگوان کرشن کی لیلا کو پانچ ابواب میں بیان کیا گیا ہے جو راس پنچادھیائی کہے جاتے ہیں۔ منی پوری کے فن کار راس لیلا کو پیش کرنے میں اسی سے فیضان حاصل کرتے ہیں۔ راس کی چار خاص قسمیں یہ ہیں:۔ کُنج، وسنت، مہا اور نتیہ۔ راس لیلا کی پہلی تین قسمیں بالترتیب اساڑھ، بیساکھ اور کارتک میں پیش کی جاتی ہیں لیکن نتیہ راس کو سال کے کسی بھی حصہ میں اور کسی بھی تیوہار کے موقع پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ راس لیلا کی تقریبات عام طور پر کسی دربار یا کسی مقامی سربرآوردہ شخصیت کی سرپرستی میں منعقد کی جاتی ہیں۔ وشنومت کے پیروؤں کے نزدیک اس تقریب کی زبردست مذہبی اہمیت ہے۔ اس تقریب میں مشہور موسیقاروں اور رقاصوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ کرشن کے بھگت راس لیلا کو تفریح سے زیادہ مذہبی رسم سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ بھی عام ہے کہ اس میں حصہ لینے والوں کو روحانی فیضان حاصل ہوتا ہے۔

راس لیلا میں لباس کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اس میں حصہ لینے والی رقاصاؤں کے لباس میں ساٹن یا مخمل کی چست چولی ہوتی ہے جس پر سنہرا کام بنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چھتری نما سُرخ یا سیاہ رنگ کا لہنگا اور ایک چھوٹا اوپری لہنگا ہوتا ہے۔ اوپری لہنگے کی خوبصورت جھالر کمر سے نیچے لٹکتی رہتی ہے۔ لہنگے میں چھوٹے چھوٹے آئینے اور جواہرات ٹنکے ہوتے ہیں۔ سر پر کالی مخملی سی ٹوپی نما ایک چیز ہوتی ہے جس کے اوپر وہ باریک نقاب سا پہنتی ہیں جو چہرہ پر پڑا رہتا ہے مگر چہرہ چھپ نہیں جاتا بلکہ اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ کرشن جو راس لیلا کے تنہا مرد کردار ہیں ایک خاص مکٹ پہنتے ہیں جس میں سونے کا کام ہوتا ہے اور چونکہ کرشن جی کو مور کے پَر بہت پسند تھے اس لیے اس مکٹ پر دو ایک پر بھی لگا دیے جاتے ہیں۔ ان کی دھوتی ریشمی اور زعفرانی رنگ کی ہوتی ہے اور بازوؤں پر اور کلائیوں میں جگمگاتے ہوئے جواہرات ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں آرائش کے لیے پھول بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔

راس لیلا کا آغاز بھگتی کے گیتوں اور گیت گووند، گووند لیلامرت اور دیگر ادبی نظموں سے ہوتا ہے۔ راس لیلا کے رقصوں کے ذریعہ بھگوان کرشن کی زندگی کی مختلف جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔ بھگوان کرشن کو کہیں بندرابن میں تنہا بنسری بجاتے ہوئے اور کہیں رادھا یا ان کی ہنس مکھ گوپیوں کے ساتھ دکھایا جاتا ہے۔

گرو اموبی سنگھ اور گرو آتومبا سنگھ راس لیلا کے ممتاز رقاص ہیں اور اس وقت منی پوری رقص اکیڈیمی سے وابستہ ہیں لیکن زیادہ سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے اب اپنے فن کا عملی مظاہرہ نہیں کر سکتے۔ نوجوان رقاصوں میں بپن سنہا اور بمبئی کی جھاویری بہنیں مشہور رہی ہیں۔ منی پوری رقص اکیڈیمی نے حال میں راس لیلا کے جو پروگرام پیش کیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اکیڈیمی منی پوری رقص کے قدیم روایات کو برقرار رکھنے کے لیے پورے طور پر کوشاں ہے۔

کتھک

کتھک شمالی ہندوستان کا کلاسیکی رقص ہے۔ اگرچہ یہ رقص پورے شمالی ہندوستان میں رائج ہے لیکن لکھنؤ اور جے پور اس کے دو خاص مرکز تصور کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کتھک اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ شمالی ہندوستان کی آریائی تہذیب۔ تاہم صحیح طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ اس نے کب اور کیسے موجودہ شکل اختیار کی۔ کھجراہو، کونارک اور بھوبنیشور کی مندروں کی مورتیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں بھی عورتوں یا دیوداسیوں کا رقص رائج تھا۔ ڈرامہ کے فن سے متعلق قدیم کتابوں میں رقاصہ یا پاتر کے لوازمات کا خصوصی ذکر ملتا ہے۔ اتر پردیش کے دیہاتوں میں جو "پتریا" کا لفظ مستعمل ہے وہ اصل لفظ "پاتر" کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتی ہے۔

قیاس کیا جاتا ہے کہ ان رقاصاؤں کے گرو ایسے برہمن تھے جو ماہر موسیقار اور داستان گو تھے۔ یہ مناسب اشاروں اور سنگیت کے

ذریعہ رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں کو پیش کرتے تھے۔ "کتھک" یا "کتھیک" سنسکرت لفظ ہے جس کا مفہوم "کہانی کہنے والا" ہے۔ موجودہ کتھک بھی برہمن ہیں اور وہ اس کا مفہوم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "کتھا کرے سو کتھک کہائے۔" ان تمام چیزوں کے پیش نظر ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ موجودہ کتھکوں کا سلسلہ مندروں کے اُن روایتی موسیقاروں سے ملتا ہے جو دیوداسیوں کو ناچ بھی سکھاتے تھے۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد اور مسلم حکومت کے قیام کا شمالی ہندوستان کی تہذیب اور تمدن پر گہرا اثر پڑا۔ اس وقت کی مروجہ اور غیر ملکی تہذیب کے امتزاج سے جو کلچر وجود میں آیا وہ ہندوستان کی ثقافتی تاریخ میں نمایاں اہمیت رکھتا ہے مگر اس ثقافتی انقلاب کے بعد دیوداسیوں کی حوصلہ شکنی ہوئی اور دیوی اور دیوتاؤں کی سیوا کرنے کی پوری ذمہ داری کتھکوں نے لے لی۔ راجہ اور نوابین اکثر ان کتھکوں کی خدمات تفریح طبع یا کسی مخصوص تقریب کے لیے حاصل کرتے تھے۔ امرا اور رؤساء کی دولت کی کشش نے رفتہ رفتہ کتھکوں کو درباری رقاص کی حیثیت سے شہروں میں منتقل کر دیا۔ اس طور پر کتھکوں نے نوابین اودھ اور راجستھان کے راجاؤں کے درباروں میں رسائی حاصل کر لی۔

مختلف فن کاروں کے کتھک ناچ میں باعتبار طرز آج جو فرق دیکھنے میں آتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی بنیادی تکنیک میں کوئی اختلاف ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ فن کار کی شخصیت نے اس میں انفرادیت اور بے ساختگی پیدا کر دی ہے ـــ ٹھیک اُسی طرح جس طرح شمالی ہند کے "خیال" گائیکی کا بہت کچھ انحصار گانے والے کے تخیل اور شخصیت پر ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں طرز ادا اور لباس میں تبدیلی ہو گئی لیکن یہ بات ضرور حیرت انگیز ہے کہ سماجی اور مذہبی انقلاب کے باوجود کتھک کے قدیم بنیادی روایات اور مذہبی موضوعات کو برقرار رکھا گیا۔

کتھک ناچ کو اودھ کے واجد علی شاہ کے زمانہ میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ مہاراج بندادین اور کالکا مہاراج کے چچا ٹھاکر پرشاد اُن کے دربار سے متعلق تھے۔ ٹھاکر پرشاد مہاراج کے بعد بندادین مہاراج نے کتھک ناچ کو معراج کمال تک پہنچا دیا اور جب تک کتھک ناچ زندہ ہے اُس وقت تک اُن کا نام ادب اور تعظیم سے لیا جائے گا۔ مہاراج بندادین نے ٹھمری، ہولی اور بھجن بھی تصنیف کیے اور اُن کی تصنیف کردہ ٹھمریاں اور بھجن وغیرہ آج بھی بڑے احترام سے گائے جاتے ہیں۔ کالکا مہاراج کے لڑکوں یعنی مہاراج بندادین کے بھتیجوں جگن ناتھ پرشاد (اچھن مہاراج مرحوم) بیج ناتھ پرشاد (لچھو مہاراج) اور شمبھو مہاراج نے اُن کے بعد کتھک کے روایات کو زندہ رکھا اور آج کل اچھن مہاراج کے لڑکے برجو مہاراج ہندوستان میں کتھک ناچ کے ممتاز فن کار مانے جاتے ہیں۔

واجد علی شاہ کے زمانہ میں اور اُن کے بعد ابھی تک کتھک کے ان ماہرین کا لباس یہ تھا: ریشمی پائجامہ جس کی گوٹ پر زری کا کام ہوتا تھا، زربفت کی اچکن، دونوں کندھوں پر دوپٹہ۔ البتہ اب برجو مہاراج نے اُس میں یہ تبدیلی کی ہے کہ وہ دھوتی باندھتے ہیں اور جسم کے اوپر کا حصہ کھلا رہتا ہے۔ بازوؤں پر اور گلے میں زیورات استعمال کرتے ہیں۔ آج کل کی کتھک ناچنے والی خواتین چوڑی دار پائجامہ پر لمبا فراک (گھٹنے سے نیچے تک) اور فراک پر مخمل یا ساٹن کی ایک طرح کی واسکٹ پہنتی ہیں۔

کتھک ناچ کے تین خاص حصے ہوتے ہیں۔ نرت۔ نرتیہ اور ناٹیہ نرت، تال اور لے سے ہی زیادہ تعلق رکھتا ہے اور اس میں بھاؤ اور ابھینے نہیں ہوتے۔ کتھک نرت کے جو بول ہیں وہ سب اِسی عنوان کے ماتحت آتے ہیں۔ بول سے مطلب ہے پیروں کی اداکاری۔ اِن بولوں میں اپنی اپنی نوعیت کے لحاظ سے آمد، نٹ وری، پرمیلو، پرن سنگیت گرم لے اور شاعری سبھی شامل ہیں۔ عام طور سے ناچ کی شروعات "آمد" سے ہوتی ہے جس کے معنی ہی ہیں آنا۔ اس کے بعد نٹ وری، پرن وغیرہ دکھا کر ناچنے والا کچھ بامعنی اور مترنم چھند سناتا ہے اور تھوڑا بہت بھاؤ دکھاتا ہے مگر چونکہ بھاؤ بہت ہی کم ہوتا ہے اس لیے اس شاعری یا کوتیا کو نرتیہ ہی کے حصہ میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد گتوں کی شروعات ہوتی ہے۔ گتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ گت نکاس اور گت بھاؤ۔ گت نکاس، نرتیہ کا ایک حصہ سمجھی جاتی ہے اس لیے کہ اس میں تال اور لے کی اہمیت کم ہوتی ہے اور بھاؤ کی زیادہ۔ گت بھاؤ میں دو قسم کی گتیں شامل ہیں۔ چھوٹی گت اور بڑی گت۔ چھوٹی گت میں کرشن جی کی معمولی سی حرکات

(بقیہ صفحہ ۴۳ پر)

دعوتِ شوق

نامی انصاری

قدم ملا کے جو عزمِ جواں کے ساتھ چلیں — وہ آئیں قافلۂ دوستاں کے ساتھ چلیں
زمیں کو چھوڑ کے اب آسماں کے ساتھ چلیں — جو بادہ کش ہیں تو پیرِ مغاں کے ساتھ چلیں
اُٹھو، اُٹھو کہ ہم اس کارواں کے ساتھ چلیں

زمینِ ہند کو گلزار کر کے رہنا ہے — گہر فروش و گہر بار کر کے رہنا ہے
فضا کو مطلعِ انوار کر کے رہنا ہے — نصیبِ خفتہ کو بیدار کر کے رہنا ہے
اُٹھو، اُٹھو کہ ہم اس کارواں کے ساتھ چلیں

جہاں کو نرمیِ جذبات کی ضرورت ہے — نشاطِ روح کے نغمات کی ضرورت ہے
اشوک و بدھ کے پیامات کی ضرورت ہے — اُمید و اَمن و مساوات کی ضرورت ہے
اُٹھو، اُٹھو کہ ہم اس کارواں کے ساتھ چلیں

یہ کارواں ہے بہ ہر رنگ امن و الفت کا — نئی امنگ، نئے حوصلوں کی جنّت کا
پیام بر ہے یہ انسانیت کی عظمت کا — نقیب ہے یہ مساوات کا اخوّت کا
اُٹھو، اُٹھو کہ ہم اس کارواں کے ساتھ چلیں

ہزار سخت سہی، دشوار بھی سہی منزل — "کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل"
قدم اُٹھا کے نہ ہرگز رُکیں گے صاحبِ دل — لرز رہا ہے یقیناً ضمیرِ ہر باطل
اُٹھو، اُٹھو کہ ہم اس کارواں کے ساتھ چلیں

فضائے ہند کو جنّت نشاں بنائیں گے — جو تشنہ لب ہیں وہ رطلِ گراں لُٹائیں گے
زمیں کے سینے سے شمس و قمر اُگائیں گے — ہم اپنے عہد سے نامی نہ باز آئیں گے
اُٹھو، اُٹھو کہ ہم اس کارواں کے ساتھ چلیں

اخیار الاخبار لکھنؤ

نادم سیتاپوری

اخیار الاخبار

لکھنؤ

نمبر ۔ مطبوعہ ۔۔۔ ۱۸ ۔ مطابق ۔ شوال ۔۔۔ روز یکشنبہ ۔ جلد ۔۔۔

فہرست مضامین مندرجہ اخبار ہذا

کارسپانڈنٹ

گزشتہ صدی میں اخیار الاخبار کے نام سے کئی اخبار جاری ہوئے۔ پہلا ۲۴ رمئی ۱۸۶۸ء کو پٹنہ سے، دوسرا یکم نومبر ۱۸۷۲ء کو لکھنؤ سے اور تیسرا یکم اپریل ۱۸۸۳ء کو دہلی سے۔ موخر الذکر کے ایڈیٹر، منشی حبیب الدین احمد سوداگر تھے۔ ان تینوں ہم نام اخباروں کا کچھ نہ کچھ تعلق ان اداروں سے تھا جو اس زمانے میں "سرسید تحریک" کے سلسلے میں قائم کئے گئے تھے۔ پٹنہ کا اخیار الاخبار "سائنٹفک سوسائٹی بہار" کا سرکاری آرگن تھا جسے براہ راست علی گڑھ کا تعاون حاصل تھا۔ خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے:

"اردو کے قدیم اخباروں میں اخیار الاخبار (پٹنہ) کا درجہ بہت بلند ہے جو سائنٹفک سوسائٹی بہار کی طرف سے شایع ہوتا تھا۔ اس نے ہمیں مغربی علوم سے روشناس کرایا اور "دیسی زبان" کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کے اصول کی پر زور حمایت کی ہے"[1]

دہلی کا اخیار الاخبار گو کہ باقاعدہ طور پر کسی ادارے کا ترجمان نہیں تھا پھر بھی مسلمانوں کے تعلیمی اداروں سے اسے ایک خاص لگاؤ ضرور تھا۔ البتہ لکھنؤ کا اخیار الاخبار مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ کی طرف سے جاری کیا گیا تھا جو اپنے دور میں علوم اسلامی کی ایک اچھی درس گاہ کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ مدرسہ لکھنؤ کے شیعوں نے "سرسید تحریک" کے مقابلے میں جاری کیا تھا جس کا مقصد "سرسید تحریک" کے ان "لادینی اثرات" کا زائل کرنا تھا جو ان کے خیال میں انگریزی تعلیم کی وجہ سے پھیل رہے تھے۔ "سرسید تحریک" کے خلاف اس زمانے میں ایک اچھا خاصا محاذ جنگ قائم تھا۔ تہذیب الاخلاق کے جواب میں کانپور سے نور الآفاق پندرہ روزہ جاری ہوا اور تائید اسلام کے نام سے مرادآباد کے مولوی امجد علی اور قاضی احتشام الدین نے (۱۸۸۱ء) میں ایک ماہنامہ جاری کیا جس کا دوسرا نام "رد نیچریہ و نصاریٰ" تھا۔ اس رسالے میں جو مضامین شایع ہوا کرتے تھے ان کے عنوانات اس قسم کے ہوتے تھے۔ (۱) سید احمد خاں صاحب بہادر کا جھوٹ۔ (۲) سید احمد خاں صاحب بہادر کی جہالت۔ (۳) سید احمد خاں صاحب بہادر کا مذہب (۴) سید احمد خاں صاحب بہادر کی رائے تذبذب۔ غرض، اس زمانے میں

---

[1] ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ماہ نومبر ۱۹۵۹ء ۔ ص ۳۷۵

مسلمانوں کے ہر فرقے کی ایک بڑی تعداد بلا امتیاز مشرب و مسلک سر سید تحریک کے خلاف ایک محاذ پر متحد نظر آتی تھی۔ پٹنہ کے اخبار الاخبار اور لکھنؤ کے اخبار الاخبار میں پالیسی کا شدید تضاد و اختلاف تھا۔ پٹنہ کا اخبار علی گڑھ تحریک کا پر زور حامی اور معین کار اور لکھنؤ کا اخبار اس تحریک کا سب سے بڑا مخالف! لیکن لکھنوی اخبار کا یہ اختلاف صرف نظریاتی تھا۔ اس کو ذاتیات سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ نہ کبھی اس اخبار نے اپنی مخصوص روایتی تہذیب متانت سے ہٹ کر اس عامیانہ اور سوقیانہ روش کی پیروی کی جو اس دور کی سب سے بڑی صحافتی کمزوری تھی۔ جیساں چہ ۲۲ دسمبر ۱۸۷۵ء کے شمارے میں اخبار الاخبار نے ایک نوٹ "خیالات رندانہ اور مدرستہ العلوم" کے زیر عنوان لکھا ہے۔

"...... مدرستہ العلوم (علی گڑھ) کی بنا بھی ایسے ہی خیالات پر ٹھہر گئی ہے اور جب اس میں انکار علمائے محول اور دیندار ان اہل اسلام کی رائے جہاں پیرائے سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایسے امر عظیم کا تکفل آزاد منشوں کی تجویزات سے نہیں ہو سکتا بلکہ بہر کا دے دہریہ دے۔ اسکے قواعد اور انتظام میں رائے علمائے اہل اسلام چہ شیعہ و چہ سنی درکار ہے ...... ارے صاحبو۔ بھلا شیخ کیا جانے صابن کا بھاؤ! تم اپنے خیالات رندانہ وہیں تک نہ رکھو جہاں تک تمہارے اذہان کی رسائی اور تمہاری استعداد علمی اور زور آوری کارگر ہو۔ ایسے باریک کوچے میں بھلا تم کو ستہ ہماری سے سوا ٹھوکر کھانے اور منھ کے بل گر پڑنے کے اور کیا فائدہ ہوگا؟ تم کو اگر ایسا ہی منظور ہے تو کسی دفعہ منجملہ دفعات تعزیرات خواہ ایکٹ ۴۸ اور ہدایت نامہ مالگزاری خواہ بندوبست کی پارلیمنٹ قائم کر کے بوجود دفعات اس کی مودی رعایا اور خلاف خدایہ سرزمین ہندوستان میں بحضور گورنمنٹ منصف کے عذر داری پیش کر کے اس کی منسوخی کرا دو یا خواہ مخواہ سر رشتہ تعلیم ہی میں دخل در معقولات کرنا ہے تو آج کل جو تعلیم نسواں کے اجرا سے خصوصاً مندراس (مدراس) میں بعض شرفا زادیوں کی آزادی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ سر چوک چھیلا دوڑاتی ہوئی بے پردہ پھرنے لگی ہیں۔ اور ابھی کیا ہے جو اصلی غرض تعلیم نسواں سے ہے یعنی چونکہ لڑکوں کی پرورش زیادہ تر ماں کی حضانت اور حمایت میں ہوتی ہے جب ماں کو اخلاق یوروپین سکھائے جائینگے تو جتنے لڑکے ان کی پرورش میں ہوشیار رہوں گے بدون تعلیم کالج اور اسکول کے اخلاق میں تنفر کو اچھی طرح برتیں گے۔ جب یہ غرض پوری ہوگی تب مزا دیکھنا۔"

سر سید تحریک سے اصولی اور نظریاتی اختلاف کے باوجود اخبار الاخبار کے صفحات پر جب بھی سر سید کا نام لیا گیا ہے پورے ادب و احترام کے ساتھ! اسی طرح سر سید کی خانگی خبروں کا نہ تو کبھی مغالطہ کیا گیا نہ بلیک آؤٹ! ۱۴ جنوری ۱۸۷۷ء کے پرچے میں سر سید کے علی گڑھ پہنچنے کی خبر "آمد صاحبان والاشان" ملاحظہ ہو:

"سر سید احمد خاں صاحب بہادر مع صاحبزادوں کے بنارس سے علی گڑھ میں تشریف لائے۔ راجہ کشن داس صاحب ڈپٹی کلکٹر ان کے استقبال کے واسطے تشریف لے گئے اور محمود خاں بہادر (سید محمود) نے جو ولایت سے علم انگریزی تحصیل کر کے آئے ہیں ریل سے اتر کر ہوٹل میں جا کر یہ لباس انگریزی بجائے خوش جان تبدیل کیا! یہاں سے راجہ صاحب اور صدر الصدور صاحب اور محمد یوسف وکیل اور محمود خاں صاحب مالک بنگلے میں تشریف لے گئے۔"

اخبار الاخبار لکھنؤ کا پہلا شمارہ یکم نومبر ۱۸۶۲ء کو نکلا تھا۔ اختر الدولہ نے اختر شاہنشاہی میں لکھا ہے:

"اخبار الاخبار۔ شہر لکھنؤ۔ محلہ فرنگی محل...... ہفتہ وار ۸۔ ورق اوسط یوم چہار شنبہ۔ سالانہ (چندہ) سات روپیہ دس آنہ۔ مالک مولوی سید محمد علی صاحب اثنا عشری۔ یہ پرچہ خاص مذہبی اثنا عشری صاحبان کا ہے۔
از مطبع اخبار الاخبار۔ اجرائے یکم نومبر ۱۸۶۲ء"[1]

اسی اختر شاہنشاہی میں ایک دوسری جگہ صفحہ ۹۰ پر اسی اخبار کا ذکر اس تفصیل کے ساتھ ملتا ہے:

"اخبار الاخبار۔ شہر لکھنؤ متصل وکٹوریہ اسٹریٹ۔ مدرسہ ایمانیہ اثنا عشریہ۔ پندرہ روزہ بتاریخ ۱۰ و ۲۵۔ ماہ عربی کو شائع ہوتا ہے۔ آٹھ ورق خورد۔ غیر مذہب سے قیمت سالانہ سات روپیہ دس آنہ۔ اور شیعوں سے مطالبہ قیمت کا نہ ہوگا اور دیں تو واپس نہ ہوگی۔ مجاریہ مولوی

---

[1] اختر شاہنشاہی مطبوعہ اختر پریس لکھنؤ ۱۸۹۳ء ص ۱

سید محمد علی از مطبع اخبار الاخیار اجرائے ۱۸۸۸ء

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ پرچہ اپنے دوسرے دور میں پہنچ کر بجائے ہفتہ وار کے پندرہ روزہ رہ گیا تھا۔ اختر شاہنشاہی میں اس کا نام بجائے اخبار الاخیار کے اخبار الاخیار لکھا ہوا ہے جو غالباً کتابت کی غلطی ہے کیوں کہ دونوں ناموں میں صرف چند نقطوں کی تقدیم و تاخیر سے اس قسم کا فرق پیدا ہو سکتا ہے۔ اس دوسرے دور کے پرچے مجھے دستیاب نہ ہو سکے۔ صرف ابتدائی تین سال (۱۸۸۸ء لغایت ۱۸۹۰ء) کے نامکمل فائل کتب خانہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ میں محفوظ ہیں۔ انہیں کی مدد سے اس مضمون کی تکمیل کی جا رہی ہے۔

مدرسہ جس کی طرف سے یہ اخبار جاری کیا گیا تھا اور اخبار اگرچہ ایک مخصوص فرقے سے منسوب تھے لیکن ان دونوں کی مالی اعانت عام مسلمانوں کی طرف سے ہوتی تھی۔ چناں چہ چندہ دینے والوں کی فہرست میں جہاں ہندوستان کے شیعہ رؤسا اور عمائدین کے نام نظر آتے ہیں وہاں غالب کے سسرالی عزیز نواب علاء الدین خاں مرحوم رئیس لوہارو کا نام بھی شامل ہے جو بلاشبہ اس فرقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے جس کی طرف سے یہ اخبار جاری کیا گیا تھا۔ مدرسہ ایمانیہ کو ایک تحریک کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کے بنیادی مقصد کے پروپیگنڈے کے لیے ایک خاص مبلغ تمام ملک کا دورہ کرتا رہتا تھا اور اسی نام سے کئی مدرسے بنارس وغیرہ میں کھلوا چکا تھا۔

اخبار الاخیار ہر منگل کو مطبع اخبار الاخیار سے شایع ہوا کرتا تھا۔ پریس کے مالک اور اخبار کے منیجر مولوی سید محمد علی تھے۔ ابتدا میں اس کی ادارت کی باگ ڈور میر بنیاد علی کے ہاتھ میں تھی۔ پریس اور اخبار کا دفتر فرنگی محل (لکھنؤ) میں تھا۔ اخبار کا سائز ۲۶×۲۰ تھا اور حجم آٹھ صفحات ۲×۰ کالمی جلی کتابت ہوتی تھی۔ سرورق پر کچھ تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ اخبار کے چندے کی تفصیل اور فہرست مضامین ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق مضامین کے اشاعت کی اجرت بھی لی جاتی تھی جو عام طور سے دو آنہ فی سطر ہوتی تھی لیکن "مفید عام" مضامین مفت شایع کیے جاتے تھے۔ سالانہ چندہ علاوہ صرفہ ڈاک کے چھ روپیہ تھا اور مع محصول ڈاک سات روپیہ دس آنہ۔ علی الترتیب ایک پرچہ کی قیمت دو آنے اور ڈھائی آنے تھی۔ اخبار کے سرورق پر ایسی کوئی عبارت نہیں ہوتی تھی جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ اخبار مدرسہ ایمانیہ یا فرقہ شیعہ کا ترجمان ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ اخبار اپنی صحافتی تہذیب کے اعتبار سے اتنا بلند تھا کہ اسے پڑھنے والا کبھی یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی مذہبی اخبار کا مطالعہ کر رہا ہے۔ مدرسہ ایمانیہ سے اس کا جو تعلق تھا اس لحاظ سے کبھی کبھی اس میں مدرسہ کی کارروائیاں ضرور ہوتی تھیں یا پھر چھپتے تھے چھ ماہے مدرسہ ایمانیہ کے مؤسس و بانی ممتاز العلماء مولانا سید محمد تقی مجتہد کے فتوے۔ فرقہ وارانہ نوک جھونک، مذہبی مناظروں اور کٹر مولویانہ رنگ کے مضامین سے اس اخبار کو کوئی تعلق نہ تھا۔

اخبار الاخیار کی ایک اور خصوصیت بھی تھی جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ تھی اس کی آسان اردو۔ آسان اردو، آج کی ایسی نہیں پھر بھی یہ اخبار جس دور کا نمائندہ تھا اس لحاظ سے اس کی زبان کافی عام فہم تھی۔ ایک دینی عربی اسکول کے ترجمان کی حیثیت سے اس کی زبان خالص عالمانہ اور مولویانہ ہونی چاہیے تھی مگر اس کے برعکس اخبار الاخیار کی سرخیوں میں ایسی شگفتگی نظر آتی ہے کہ بعض وقت اودھ پنچ کا دھوکا ہوتا ہے حالاں کہ اودھ پنچ ایک خالص مزاحیہ اخبار تھا اور اخبار الاخیار جاری ہونے کے چار سال بعد نکلا تھا۔ اس کی سرخیوں میں ایک طرف تو وہی قدیم طرز صحافت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جو صرف مقام کے ذکر کے ساتھ مخصوص تھیں، مثلاً سمرقند، کابل، بمبئی، دہلی اور لکھنؤ وغیرہ۔ البتہ عام رواج کے خلاف "خبر" کا لفظ اڑا دیا گیا تھا ورنہ اس دور کے اخبارات میں ایسی سرخیاں "خبر سمرقند" "خبر لندن" "خبر دہلی" وغیرہ کے عنوان سے شایع ہوا کرتی تھیں۔ دراصل پھڑکتی ہوئی سرخیاں اور عنوانات اخبار الاخیار کی جان تھے۔ مثلاً "بزاز غلام بھی گھر سونا" "جو لنگے سو پادشاہ" "جے پور کا راج رونے سے نہیں ملتا" "آیئے حکیم صاحب قبلہ" "لکھنؤ کہ پورہ تھا اب کھ پورہ ہو گیا" "بھکاری اور پھوڑ ملنگے" "سیتاپور بنگالہ ہوا چاہتا ہے" وغیرہ۔ ان سرخیوں کو پڑھ کر کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ کسی ایسے اخبار کی سرخیاں ہوں گی جو تقریباً سو برس پہلے لکھنؤ سے جاری ہوا تھا۔

اس وقت کا ہندوستان، سیاسی اور ملکی تحریکوں کے جذبہ سے تقریباً خالی تھا۔ نہ آل انڈیا کانگریس اس وقت تک قائم ہوئی تھی نہ اودھ پنچ اس وقت تک شایع ہوا تھا۔ پھر بھی اخبار الاخیار کے فائلوں میں ایسا مواد ملتا ہے جو بڑی

حب الوطنی سے مملو ہے۔ دو ایک اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

اودھ کے معزول تاجدار واجد علی شاہ بہادر مٹیا برج میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے اور ان کے خلاف انگریزوں کا معاندانہ پروپیگنڈہ بدستور جاری تھا۔ اخبار الاخبار کی اشاعت مورخہ ۱۰ نومبر ۱۸۶۸ء میں ایسے ہی پروپیگنڈے پر تبصرہ کیا گیا ہے:

"جو بعض اخباروں میں اہالیان مٹیا برج متوسلان حضرت محمد واجد علی شاہ اعاد اللہ ملکہ کے خیالات کی نسبت افترا پردازی لکھی جاتی ہے اس کا منشا فقط افترا پردازی ان بعض بدخواہوں کی ہے جو سرکار شاہی میں ذلیل و خوار ہو چکے ہیں اور کسی طرح کی مداخلت ان کو نہیں ملتی خواہ وہ لوگ جو حاسد ہیں وہ ایسی ایسی خبریں جھوٹی اڑاتے ہیں۔ نہایت تعجب کا مقام ہے کہ حضرت محمد واجد علی شاہ اور اہل کاران ریاست محبت اور الطاف دولت برطانیہ کے اس قدر چشم دوختہ ہو رہے ہیں کہ باوجود تحریک اکثر محرکوں کے اپنی ریاست کا مقدمہ ولایت میں دائر نہیں کرتے جس کا انتظام بمقتضائے رنجش دو سرداروں کچھ سرسبزی بھی ممکن ہے تو ایسی خبریں جس سے گورنمنٹ کو اشتباہ اور ملال ہو اور سرکار محمد واجد علی شاہ دام دولتہ کو کسی طرح کا فائدہ سوائے نقصان کے نہ ہو۔ ۔ ۔ ۔"

پہلی جنگ آزادی کے بعد جو خوف و ہراس ہندوستان پر طاری ہو چکا تھا اس کے لحاظ سے انگریزوں پر کسی کڑی تنقید کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جس حد تک احتجاج کیا جاتا تھا وہ بھی ایک دشوار ہی کام تھا۔ ہندوستان میں ریلوں کا رواج نیا نیا ہوا تھا۔ آرام سے زیادہ تکلیفوں کی بھرمار تھی مگر لوگ زبان کھولتے ہوئے ڈرتے تھے کیوں کہ تمام ریلوے کمپنیاں دولت مند انگریزوں کی ملکیت تھیں اور انھیں صرف روپیہ سمیٹنے سے غرض تھی عوام کی آرام و آسائش سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سلسلہ میں کبھی کبھی اخبار الاخبار انھیں تنقید کر جاتا تھا۔

"کیوں صاحب! یہ ریلوے کارخانہ سرکاری ہے اور گورنمنٹ اس کی منتظم اور مالک ہے بالفظ تجارت پیشہ اور سوداگر لوگ! اور کوئی مالک کیوں نہ ہو جب معاملہ کا حرف درمیان میں آیا تو فقیر اور امیر، حاکم محکوم سب یکساں ہیں۔ بگھی والے اور یکے والے، بھٹیارے گاڑی بان، کہار، پالکی، الغرض سیکڑوں قسم کے کرایہ لینے والے ہر جگہ موجود ہیں مگر یہ نیا انداز ہے جو ریلوے کمپنی کر رہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک کوئی قانون عام بہ نسبت رفاہ خلائق کے ریلوے کارخانے کا تیار نہیں ہوا۔ گو بہی منفعت کے اشتہارات تو ہر چوکی پر آویزاں ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر پچاس روپیہ جرمانہ پڑھ لیجیے اور اس قدر تکلیفات (پر) جو مسافر کو ہوتی ہیں ان کی نسبت کوئی جرمانہ تجویز نہیں ہوا اور اگر ہوا تو ایسا کم۔"

اس زمانہ میں ریزگاری کی قلت ہوئی تو اخبار الاخبار لکھتا ہے:

"غلہ کا قحط تو تھا ہی اب پیسوں کا بھی قحط پڑ گیا۔ خداوند کریم اپنا رحم کرے اور ہر ایک کی آبرو بچائے۔ بہت سی ادنیٰ ادنیٰ باتیں ایسی ہیں جس پر گورنمنٹ کی کم توجہی سے رعایا بہت نقصان اٹھاتی ہے اور گورنمنٹ بیوپارانہ اور تجارتی معاملہ سمجھ کر کچھ مداخلت نہیں کرتی۔ آج کل اس ضلع بہرائچ میں پیسے ٹکہ کے بارہ (آنے) آتے ہیں۔ دو ماہ کا عرصہ گذرتا ہے کہ یہی "گورکھی پیسے" اکیس گنڈے تھے اور اب گھٹتے گھٹتے سترہ گنڈے بکتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سید سالار کے میلے کو بھی کئی یوم باقی ہیں۔ کارسپانڈنٹ اودھ اخبار بھی کئی سال سے اس ضلع میں ہے لیکن میلے میں کبھی اٹھارہ گنڈے سے کم پیسے نہیں بکے اور وہ بھی صرف دو ایک دن! امسال معلوم نہیں کیا باعث ہے کہ صرافوں نے ایک ماہ پیشتر سے سترہ گنڈے یعنی روپیہ کے بارہ آنے کر دیے ہیں یقین ہے کہ میلہ میں تیرہ یا چودہ گنڈے یعنی روپے کے دس آنے رہ جائیں گے۔ پیسوں کی کمی غریبوں کے لئے ایک بڑے نقصان کا باعث ہے۔ یعنی جو جنس آگے چھ پیسے بکتی تھی وہ اب پانچ پیسے سے بھی کم پر ملنا چاہیے لیکن بقال وہی نرخ جنس کا لگاتے ہیں چار ٹکے سیر آٹا سابق میں آتا تھا اور اب بھی وہی بھاؤ ہے۔"

ایسٹ انڈیا کمپنی نے انگلستان کے کپڑے کے کارخانوں کو ترقی دینے کی غرض سے ہندوستان کے کپڑے کی صنعت کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی۔ جب ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت آگیا تو اس وقت بھی ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا گیا۔ غرض، کپڑے کے ہندوستانی تاجروں کو اس سلسلہ میں ہمیشہ شکایت رہی۔ اخبار الاخبار نے اپنے ایک نوٹ بعنوان "ولایت والوں کی دغابازی" میں اسی مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔

"مانچسٹر کے عظیم الشان کارخانے والے کپڑوں کے بننے میں جس طرح کی دغابازی

کرتے ہیں اس کے باب میں ہندوستان کے بیوپاری مدت سے بڑی شکایت کرتے ہیں۔ چونکہ اُن کے کپڑوں کے تھان وزن کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں۔ اس واسطے اب یہ کارخانے والے کپڑوں کو وزن دار کرنے کے لئے کلپ اور مایہ بہت زیادہ دیتے ہیں جس سے ان کا وزن بہت ہوجاتا ہے۔ پس وہ لوگ اپنے فائدے کے واسطے اس طرح کی دغابازی کرکے ہندوستان کے بیوپاریوں کو فریب دیتے ہیں۔ علاوہ اُس نقصان کے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ کلپ زیادہ ہونے سے رکھے ہوئے تھان جلدی تم کر بیٹھ جاتے ہیں اور سڑنے کا داغ پڑجاتا ہے۔ ...... کپڑوں کے سوا سینے کے دھاگوں میں بھی اب فریب ہوتا ہے یعنی جن پکوں اور گولوں پر ایک سو وار لمبائی کا نمبر لگاتے ہیں اور اسی کے بموجب قیمت لیتے ہیں اُن میں فقط پچاس وار تاگا نکلتا ہے۔"

مشہور مرثیہ گو مرزا دبیر کی اولاد و اخلاف میں مرزا اوج کے نام سے بھی واقف ہیں لیکن دبیر کے ایک دوسرے صاحبزادے مرزا محمد ہادی عطارد کا نام شاید کم ہی لوگ جانتے ہوں کیونکہ ان کا انتقال دبیر کے سامنے عین عالم شباب ہی میں ہوگیا تھا۔ اخبار الاخبار کے شمارہ ۲۳ جولائی ۱۸۷۱ء میں عطارد کے انتقال کی خبر شائع ہوئی ہے:

"ہزار افسوس ہے کہ مرزا محمد ہادی المتخلص بعطارد ...... خوش رو خوش مزاج شاعر عدیم النظیر خلف الصدق جناب مرزا سلامت علی صاحب متخلص بہ دبیر نے یوم دوشنبہ تقضائے مبرم اور بحکم حکم الٰہی سے بعارضہ ہیضہ محرقہ وفات پائی اور دفعتاً ایسا سمیت نے اثر کیا کہ ہرگز کسی طرح اصلاح نہ ہوئی اور اگرچہ اطبائے حذاق نے کیسی کیسی تدبیریں فرمائیں......! دل پاش پاش ہوا جاتا ہے ہم جس وقت جیالی جناب مرزا دبیر صاحب کی ہمراہ جنازے کے یاد کرتے ہیں۔ کیا کہیں جو کچھ حالت ہماری ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو۔ ایسی اولاد لائق فائق اس طرح ناشاد و نامراد باپ کے سامنے دنیا سے اُٹھ جائے۔ باپ کے دل سے پوچھو! آدمی تو بشر ہے پتھر کا کلیجہ ہو وہ بھی پانی ہوجائے۔ خداوند کریم اس ماتم سخت میں اُن کو صبر عطا فرمائے اور اُس مرحوم کے مراتب اُخروی بڑھائے۔"

دلی کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ان کا جو مختصر سا خاندان رنگون گیا تھا ان کی پولیٹکل پنشن میں حکومت ہند نے معمولی سا اضافہ کیا اور زینت محل کے مکان کی تعمیر کے لئے بھی ایک رقم کی منظوری دی گئی تھی۔ اس کی خبر اخبار الاخبار نے شائع کی ہے۔

"تاجن خاندان دہلی کے قیدی جو انگریزی برہما میں نظر بند تھے جن کے اخراجات کے لئے وظیفہ مقررہ کافی نہ تھا اُن کے اضافہ منظوری کی تعداد سات سو پچاس روپیہ ماہواری گورنمنٹ ہند نے بھیجدی ہے اور واسطے تعمیر مکان زینت محل بیگم صاحبہ شاہ دہلی کے چار ہزار روپے کی منظوری فرمائی ہے۔" (۶۔ جنوری ۱۸۷۲ء)

غیر ملکی خبروں سے بھی اخبار الاخبار کے کالم خالی نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی سیاسی اور غیر سیاسی دونوں قسم کی معلومات مہیا کی جاتی تھیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

"اخبار لندن ٹیمز (ٹائمز) کو جنرل کننگھم صاحب لکھتے ہیں کہ روسی ہندوستان پر ہمالیہ پہاڑ کی راہ سے حملہ کرسکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُس طرف ہندوستانی آدمیوں کا قبضہ بہت ہے اور ہمیشہ خوف بھی رہتا ہے کہ روسیوں کو ادھر آنے سے کوئی منع نہ کرے گا بلکہ متواتر روسیوں کا شمال کی طرف ہند کے بڑھنا پایا جاتا ہے۔" (۳۱ دسمبر ۱۸۷۲ء)

"نیوز آف دی ورلڈ مورخہ ۱۰ نومبر سے معلوم ہوا کہ خدیو مصر کا ٹھیک یہ ارادہ ہے کہ ممالک حبش کو مملکت مصر کے متعلق کردیں۔ چنانچہ جب خدیو مصر وارد استنبول ہوئے تھے تو انھوں نے سلطان روم کو اپنے مافی الضمیر سے آگاہ کیا تھا اور سلطان بھی خاموش رہ گئے تھے۔"

(۱۴ جنوری ۱۸۷۳ء)

"ان دنوں شاہ ایران نے شہنشاہ جرمنی سے یہ نیا اقرار کیا جس کو شہنشاہ موصوف نے بھی منظور کرلیا ہے کہ جب ایران کی کسی دوسری سلطنت سے تکرار ہوگی تو اس کا فیصلہ بیچ میں پڑکر شاہ جرمنی کریگا۔"

(۲۲ جولائی ۱۸۷۳ء)

"فرانس اور اس کے ماتحت صوبوں میں کتب فروشوں کی تعداد پانچ ہزار چھ سو چوہتر ہے اور ٹیپ (ٹائپ) کے چھاپہ خانوں کی ایک ہزار تین سو نناوے اور پتھر کے چھاپے خانوں کی ایک ہزار چھ سو چوبیس بیان کی گئی ہے۔ ان میں سے قریب پنجم حصہ کے کتب فروش اور آٹھویں حصہ کے قریب ٹیپ (ٹائپ) کے چھاپے خانے اور چہارم حصہ کے پتھر کے

"دو ہزار تین سو تین اخبار اور رسالے فرانس میں جاری ہیں جن میں سے آٹھ سو چھیالیس پیرس میں چھپتے ہیں۔" (۱۴۔ جنوری ۱۸۶۳ء)

"جزیرہ اسٹریلیا میں ایک ایکٹ جاری ہوا ہے جس کی رو سے کل اخبارات یوم طبع سے سات روز کے اندر بلا محصول (ڈاک) روانہ ہو سکیں گے۔" (۳۰۔ دسمبر ۱۸۶۳ء)

پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد ہندوستانیوں میں "جلسۂ تہذیب" کے نام سے ایک نیم سرکاری تحریک نے جنم لیا تھا جس کا تذکرہ فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں جا بجا کیا ہے۔ جگہ جگہ "جلسۂ تہذیب" کے نام سے ادارے قائم کئے گئے تھے اور ان اداروں کی طرف سے اخبارات و رسائل جاری کئے گئے تھے۔ لکھنؤ میں بھی "جلسۂ تہذیب" کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا تھا۔ یکم اپریل ۱۸۶۳ء کے اخبار الاخبار میں اس کی روداد شائع ہوئی ہے۔

"۲۳ر مارچ (۱۸۶۳ء) کو ایک صحبت "جلسۂ تہذیب" لکھنؤ میں قائم ہوئی۔ اُس میں زیادہ تر اہتمام "سرانجمن" کو دربارہ حضوری ایڈیٹران و مہتمان اخبارات کی نسبت تھا۔ چنانچہ راقم خاکسار سید محمد علی مہتمم اخبار ہذا بھی حاضر ہوا۔ بنا بر اُس مجمع کے یہ معلوم ہوئی کہ لاہور میں ایک کمیٹی صاحبان انگریز نے اس غرض سے قائم کی ہے کہ ہندوستانی رعایا کو جو جو تکلیفات اور ایذائیں عملداری گورنمنٹ سے ہو رہی ہیں ان کا اظہار بذریعہ اخبار خواہ ذریعہ مناسب سے اگر کمیٹی پر ہو جائے تو اُن تکلیفات کو رفع کرنے میں پوری کوشش کمیٹی حسب ہدایت سرکار گورنمنٹ سے کر سکتی ہے۔"

اودھ کے معزول اور جلاوطن تاجدار جان عالم واجد علی شاہ کو اخبار الاخبار سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً اس اخبار کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے اور پابندی کے ساتھ یہ اخبار ملاحظہ عالی میں پیش کیا جاتا تھا۔ مٹیا برج کی خبریں خصوصیت کے ساتھ اس اخبار میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ اسی قسم کی ایک خبر ۱۴ر جنوری ۱۸۶۳ء کے پرچے سے نقل کی جاتی ہے:

"حضرت محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کہ روزہ ماہ رمضان المبارک کا بدون عذر شرعی ترک نہیں فرماتے ہیں بلکہ ترک خاصہ فرما کے فقط دعوت اراکین پر کہ وہ بھی ایک روپیہ سے زیادہ نہ ہو بوجہ کسب ثواب کے اکتفا کرتے ہیں چنانچہ اس ماہ رمضان المبارک میں بھی حضرت اقدس و اعلیٰ نے تمام روزے ماہ مبارک کے ادا فرمائے اور بترک خاصہ فقط دعوت اراکین قبول فرما کر ادائے فرض خدا سے سبکدوش ہوئے مگر ایک روپیہ سے زیادہ کسی صاحب خاص کی دعوت قبول نہ فرمائی تیس روز تیس اراکین نے دعوت کر کے آبرو پائی۔ حضرت نے بوجہ عارضہ تجیز و بواسیر کے ترک حقہ سے بڑی تکلیف اُٹھائی مگر روزہ ترک نہ فرمایا۔"

غرض اس دور کے اخبارات میں اخبار الاخبار کافی ترقی پسند اخبار کہا جا سکتا ہے اس لئے اور بھی کہ ایک دینی ادارے سے تعلق رکھنے کے باوجود اس نے عوامی صحافت سے اپنی کافی وابستگی رکھی۔ علیگڑھ تحریک سے اختلاف رائے اس زمانے میں عام مسلمانوں کا مزاج بن گیا تھا اور وہ اس تحریک کو اسی زاویۂ نگاہ سے پرکھنے کے عادی ہو چکے تھے جو اس عہد کے مذہبی رہنماؤں نے ان کی رگ رگ میں سمو دیا تھا۔ مجموعی حیثیت سے یہ اخبار اپنے زمانے میں لکھنؤ کے صف اول کے اخباروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ادبی حیثیت سے بھی اسے لکھنؤ کے دوسرے اخبارات کارنامہ اور بعض ساجھی وغیرہ کے مقابلے میں یہ امتیازی خصوصیت حاصل تھی کہ اس نے عام روش سے ہٹ کر مقفیٰ اور مسجع عبارت آرائی کے اسلوب نگارش کو اپنانے کی کوشش نہیں کی اور آسان و عام فہم اردو کو رواج دینے میں وقت کی ضرورتوں کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔





حیات لکھنوی

ہجومِ غم میں بھی عیش و خوشی کی بات کرو
دلِ شکستہ سے شائستگی کی بات کرو

کسی کے عیب پہ یہ نکتہ چینیاں کیسی
جو تم میں پائی گئی اُس کمی کی بات کرو

تمھارا ساتھ جو دے تم بھی ساتھ دو اُس کا
تمھاری بات کرے جو اُسی کی بات کرو

یہی نہیں کہ قفس میں ہو گفتگوے بہار
چمن میں رہ کے بھی آسودگی کی بات کرو

نہ چھیڑو تذکرہ گزری ہوئی عداوت کا
خلوصِ دل سے فقط دوستی کی بات کرو

حریمِ کعبہ میں لازم ہے احترامِ حرم
جو مے کدے میں ہو تو مے کشی کی بات کرو

سلوکِ مہر و وفا پر اُسے کرو مائل
نہ راہ زن سے کبھی رہ بری کی بات کرو

سب اہلِ ہوش و خرد جس کو سن کے جھوم اُٹھیں
جنونِ عشق میں اُس آگہی کی بات کرو

نہیں ہے اِس کے سوا کچھ حیات کا مفہوم
بہ قیدِ علم و عمل زندگی کی بات کرو

موہنی زکی

تا زندگی وفا کو نبھایا تو کیا کیا
اک روگ اپنے جی کو لگایا تو کیا کیا

غفلت میں جو ہوا مجھے اُس کا تو غم نہیں
غم ہے تو یہ کہ ہوش بھی آیا تو کیا کیا

گُل مسکرا کے شاخ پہ کہتا ہے بار بار
کانٹوں کو بھی گلے نہ لگایا تو کیا کیا

مینا میں میرے حصّے کی اک بوند بھی نہ تھی
میں نے بھی اپنا جام بڑھایا تو کیا کیا

کتنی ہی حسرتیں تھیں جو ہیں دل میں مثلِ داغ
اشکوں نے کچھ کو دھو کے بہایا تو کیا کیا

لائیں گی رنگ موہنی ناکامیاں تری
نیرنگیِ جہاں نے ستایا تو کیا کیا

جمال صابری

مرے آنسو مری وحشت کے ایوان تک نہیں آئے
ٹپکے آنکھ سے لیکن گریباں تک نہیں آئے

گئے ہر بزم میں وہ مسکرا کر پھول برسانے
مگر بھولے سے بھی گورِ غریباں تک نہیں آئے

جنونِ شوق کو بھی احترامِ حسن تھا اتنا
کہ میرے ہاتھ ادب سے خود گریباں تک نہیں آئے

انھیں شمعِ فروزاں نے بھڑک کر خاک کر ڈالا
جو پروانے تمھارے رُخِ تاباں تک نہیں آئے

مرے ضبط و وفا ظرفِ محبت کی امانت ہیں
وہ آنسو آنکھ سے جو میرے داماں تک نہیں آئے

اگر بھولے سے آجاتے تو فطرت ہی بدل جاتی
حوادث لے محبت کوے جاناں تک نہیں آئے

چراغاں دور سے کرتے رہے نجم و قمر برسوں
یہ ہے پاسِ ادب میرے شبستاں تک نہیں آئے

جمال اُن بادلوں پر بندشیں مے خانے کی ڈالیں
جو بادل کیف لینے زلفِ جاناں تک نہیں آئے

ٹریولنگ بیگ

رشید مدراسی

بس اسٹاپ پر امیدواروں کی لمبی قطار کو دیکھ کر شیلا کی رہی سہی اُمید بھی ٹوٹ گئی ـــــ وہ جب گھر سے چلی تھی تو پونے چھے بج رہے تھے اور اسے اپنی سہیلی کی سالگرہ پارٹی میں ٹھیک چھے بجے شریک ہونا تھا۔ اس نے اپنی سہیلی سے پکا وعدہ کیا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے لیکن وہ سالگرہ پارٹی میں وقتِ مقررہ پر شریک ضرور ہوگی۔ لیکن اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا وعدہ ایفا نہ ہو سکے گا۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا۔ چھے بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے اور بس میں سوار ہونے والوں کی تعداد؟ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی آدھے گھنٹے بعد بھی اُسے کسی بس میں سوار ہونے کا موقع نہ ملے گا۔ تو کیا وہ سچ مچ اپنی سہیلی کی سالگرہ پارٹی میں شریک نہ ہو سکے گی؟

اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں کہ شاید کوئی ٹیکسی مل جائے۔ ٹیکسی تو دور سڑک پر کوئی آٹو رکشا تک موجود نہ تھا کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل جاتا۔ غرض ہر طرف سے مایوس ہو کر اسے پبلک بس ہی کا سہارا لینا پڑا اور وہ بڑی بے چینی سے بس کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ ایک بس آئی، لیکن اسٹاپ پر رُکے بغیر آگے بڑھ گئی۔ "جگہ نہیں ہے ـــــ!" شیلا کو دوڑتی بس سے کنڈکٹر کی گونجدار آواز سنائی دی اور اس کی رہی سہی امید بھی پست ہونے لگی۔ اگلی بس میں صرف دو جگہیں خالی تھیں لہٰذا قطار کے اگلے حصے میں کھڑے ہوئے دو خوش نصیب امیدواروں کے علاوہ اور سبھی امیدوار صرف ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ تیسری بس آئی اور وہ بھی قریب فراٹے بھرتی ہوئی چلی گئی۔ "جگہ نہیں ہے ـــــ!" کئی امیدوار بڑبڑائے اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اور کچھ ہی دیر بعد سڑک پر غبارِ راہ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ بس نظروں سے غائب ہو چکی تھی۔

شیلا نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔ چھ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے اور سڑک پر کسی اگلی بس کے نشان تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ آج وہ اپنے گھر سے کس قدر خوش خوش چلی تھی۔ اس نے اپنی ریشمی ساری کی طرف دیکھا۔ یہ ساری اس نے دو ہی دن پیشتر چیلارام سے ایک سو دس میں خریدی تھی اور اسے کچھ ہی دیر پیشتر یہ سوچ کر کس قدر خوشی ہوئی تھی کہ وہ آج اپنی سہیلیوں کی جھرمٹ میں اپنی اس شاندار ساری میں ملبوس، اٹھلاتی ہوئی، بہ صد فخر و ناز شریک ہونے والی تھی۔ لیکن بُرا ہو قسمت کا کہ اس کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی ـــــ اور پھر کلائی پر بندھی ہوئی یہ نئی گھڑی اس نے پیار بھری نظروں سے اپنی چمکتی ہوئی نئی گھڑی کی جانب دیکھا۔ یہ گھڑی اس نے اپنی پچھلی تنخواہ سے خریدی تھی۔ لیکن اُف وہ یہ کس قدر قیمتی ہے! اس نے اپنے خیال ہی خیال میں گھڑی کی قیمت کا اندازہ کیا۔ پھر اچانک اس کی نظر اپنے نئے سینڈل پر جا پڑی۔ لمحہ بھر کے لئے اس نے بڑی لجاجت سے اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ اس کے خوشنما پیروں پر یہ نئے سینڈل کس قدر جچ رہے تھے! وہ اپنے پیروں اور سینڈل کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس کی بہت کم سہیلیاں ایسی تھیں جن کے پیر اس قدر خوبصورت تھے اور شیلا کو تو اپنے پیروں پر سچ مچ ناز تھا۔

کیا ہوا اگر وہ خود خوبصورت نہیں تھی؟ اس کے پیر تو بے حد خوبصورت تھے! اور پھر اس کے سڈول بازو اور نازک کلائیاں، شاید ہی کسی اور سہیلی کا جسم اس قدر تندرست اور متناسب تھا۔ بدقسمتی کہ بچپن ہی میں شیلا کا چہرہ چیچک کا شکار ہو گیا تھا ورنہ اس کا شمار اپنے اسکول کی معدودے چند خوبصورت لڑکیوں میں ہوتا۔ وہ بچپن ہی سے اپنے چہرے کے متعلق اپنی سہیلیوں کے طعنے سنتی آئی تھی۔ لڑکیوں نے اسے قسم قسم کے نام دے رکھے تھے۔ اس کی قریبی سہیلیاں اسے اکثر و بیشتر چھیڑا کرتی تھیں ـــــ لیکن اب وہ اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کی گویا عادی سی ہو گئی تھی اور سہیلیوں نے بھی اسے چھیڑ چھاڑ سے متاثر نہ ہوتے دیکھ کر

اسے چھیڑنا بند کر دیا تھا۔ شیلا نے رات کی تنہائیوں میں اپنے بستر پر لیٹے ہوئے کئی بار یہ سوچا تھا کہ آیا حسن صرف چہرے ہی میں ہوتا ہے؟ کیا ایک تندرست اور تنومند لڑکی جس کا ناک نقشہ ٹھیک ہو خوبصورت نہیں ہوتی؟ کیا چہرے کے بغیر عورت کا حُسن نامکمل ہے؟ لیکن اسے اپنے کسی بھی سوال کا جواب کبھی نہ مل سکا۔ جب کبھی وہ اس موضوع پر سوچتی تھی تو اسے اپنی سہیلیوں کے طنز بھرے فقرے یاد آتے تھے اور وہ رنجیدہ ہو کر اس موضوع پر سوچنا بند کر دیتی تھی۔ لیکن آج اس بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے وہ صرف اسی موضوع پر سوچنا چاہتی تھی۔ آخر اس کی اپنی شخصیت میں کس بات کی کمی تھی؟ خوبصورت سڈول جسم، متناسب اعضا، لوچدار آواز، متبسم چہرہ، لباس کا شُستہ مذاق، معقول تعلیم، حسین سیرت..... اس سے زیادہ کسی لڑکی میں اور کس بات کی ضرورت تھی؟

"لوگ صرف چہرہ دیکھتے ہیں۔ دل نہیں دیکھتے!" اس نے بیزاری سے اپنی گردن جھٹکی اور سڑک کے دوسرے سرے کی جانب دیکھنے لگی جہاں گرد و غبار اڑاتی ایک بس آتی دکھائی دے رہی تھی۔ اُمید بندھی۔ شیلا نے اپنے ماتھے کا پسینہ پوچھا اور کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ "اف بھگوان، پارٹی تو کبھی کی شروع ہو چکی ہوگی ـــ!" شیلا بڑبڑائی۔ کاش اس کے پر ہوتے اور وہ اڑتی ہوئی اپنی سہیلی کے گھر جا پہنچتی۔ اسے رہ رہ کر بس کے انتظار میں کھڑے ہوئے لوگوں پر غصہ آ رہا تھا جن کی ختم نہ ہونیوالی تعداد کی وجہ سے آج اپنی عزیز سہیلی کی سالگرہ پارٹی میں وقت پر شریک نہ ہو سکی تھی۔ جب غصہ میں کمی ہوئی تو وہ اپنے دونوں ہاتھ ملنے لگی اور دل ہی دل میں بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگی کہ اسے جلد از جلد کسی بس میں جگہ مل جائے اور وہ پارٹی کے اختتام سے پہلے اپنی سہیلی کے گھر جا پہنچے۔ اس کی دعا جلد قبول ہو گئی۔ مگر پوری نہیں۔ بس تو آئی لیکن صرف دس یا بارہ امیدوار اس بس میں جگہ پا سکے۔

"بُرا ہو قسمت کا ـــ کیا آج ہی سبھی لوگوں کو اس بس اسٹاپ سے بس پر سوار ہونا تھا؟ کبھی کبھی تو اس بس اسٹاپ پر اُلّو بھی نہیں بولتے اور آج؟" شیلا نے سوچا اور اس کی نگاہوں کے آگے امیدواروں کی لمبی قطار گھومنے لگی جس میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ سات بج گئے ـــ اور شیلا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اب پارٹی میں شریک ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ قریب تھا کہ وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بس اسٹاپ سے لوٹ پڑتی کہ ایک ریلیف (امدادی) بس آئی اور شیلا کو نہ چاہتے ہوئے بھی بس میں سوار ہو جانا پڑا۔

کنڈکٹر کو اپنی منزل بتا کر ٹکٹ خریدنے کے بعد شیلا نے اطمینان کی سانس لی۔ گو وقت بہت گذر چکا تھا لیکن پھر بھی اُسے توقع تھی کہ پارٹی ابھی ختم نہ ہوئی ہوگی اور یہ کہ اگر راستے میں بس کو کسی قسم کا حادثہ پیش نہ آئے تو وہ پارٹی میں شریک ضرور ہو سکے گی۔ اس نے پھر سے ایک دفعہ اپنی گھڑی دیکھی لیکن اس کی اس وقت کی یہ حرکت قطعی لاشعوری تھی۔ اس کا ارادہ وقت کے جاننے کا بالکل نہ تھا۔

اس نے ایک دفعہ پھر ایک گہری سانس لی اور اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے مسافروں کا ایک اچٹتی نظر سے جائزہ لینے لگی۔ بس میں اس وقت قسم قسم کے لوگ سوار تھے۔ کچھ عورتیں بھی تھیں، کچھ بچے بھی تھے۔ وہ ابھی کچھ ہی مسافروں کا جائزہ لے پائی تھی کہ اسے اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک خوبرو نوجوان اپنی طرف دیکھتا نظر آیا۔ شیلا نے نوجوان کی طرف دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ چوڑی پیشانی، گھنگھریالے بال، چوڑا چکلا سینہ، بھرے بھرے بازو، بے داغ لباس میں ملبوس نوجوان خاصہ جچ رہا تھا۔ نہ چاہنے پر بھی شیلا نوجوان کی جانب بار بار دیکھتی رہی۔ نوجوان خود بھی شیلا ہی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں شیلا کے چہرے کے بجائے اس کے پیروں پر مرکوز تھیں۔ شیلا کو اپنے پیروں میں ایک جھرجھری سے محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے پیر اپنی ریشمی ساری میں لپیٹ لئے لیکن قدم ساری کے باہر کھلے ہی رہ گئے۔ پھر جو شیلا نے دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ نوجوان نہ صرف اس کے پیروں کو تعریفی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا بلکہ اس کی نگاہیں شیلا کی خوشنما ساری پر بھی رینگ رہی تھیں۔ شیلا کا سارا جسم سکڑ سا گیا۔ وہ اپنے پیروں اور ساری کو کسی نوجوان کی نگاہوں کا نشانہ بنتے دیکھ کر شرما سی گئی تھی۔ لیکن اس احساسِ شرم کے ساتھ ہی اسے ایک دوسرا احساس بھی ہو رہا تھا۔ اسے ایک نہ معلوم سی خوشی بھی ہو رہی تھی کہ آج کوئی اس کی طرف دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا اپنا پچھلا تجربہ تو یہی تھا کہ لوگ اس کا چہرہ دیکھتے ہی اپنی نگاہیں دوسری جانب پھیر لیا کرتے تھے۔ لیکن آج جو کوئی اس کی جانب اس قدر دلچسپی سے دیکھ رہا

تھا تو اسے خواہش ہو رہی تھی کہ یہ کوئی اس کی جانب دیکھتا ہی چلا جائے اور وہ احساس کمتری جس میں کہ وہ مدتوں سے مبتلا رہی تھی آج ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور اپنے اس جان لیوا احساس سے چھٹکارا نصیب ہو۔ شیلا اپنی جگہ پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی دعوتِ شوق رقصاں تھی۔

بس کو ایک جھٹکا سا لگا اور بس ایک اسٹاپ پر رک گئی۔ کچھ مسافر اتر پڑے اور خالی جگہیں کچھ نئے مسافروں سے پر ہو گئیں۔ نوجوان اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اب وہ بس سے باہر سڑک کا نظارہ کر رہا تھا۔ نوجوان کو دوسری جانب متوجہ دیکھ کر شیلا نے چوری چوری خود اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ نئے سینڈل اسے اس وقت اور بھی خوشنما لگ رہے تھے۔ اور خود اس کے اپنے خوبصورت پیر؟ وہ محویت کے عالم میں اپنے پیروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی کہ بس کو ایک اور جھٹکا لگا اور وہ چل پڑی۔ صدر بازار قریب تھا اور سڑک پر ٹرافک بے حد تھی۔ اس قدر زیادہ کہ بس کے ڈرائیور کو بس پھر سے ایک دفعہ روک دینی پڑی اور وہ اگلی موٹر کاروں اور لاریوں کے آگے بڑھنے کا انتظار کرنے لگا۔ شیلا بس اور بس کے مسافروں سے دور خود اپنے ہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ آج اسے اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ حسن صرف عورت کے چہرے ہی میں نہیں ہوتا۔ اب اسے اپنی وہ ساری سہیلیاں یاد آ رہی تھیں جنہوں نے اسے وقتاً فوقتاً اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ کوئی نوجوان اس کی جانب لمحہ بھر کیلئے دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا ـــــ اس کا چہرہ چیچک زدہ جو تھا! لیکن آج نہ صرف ایک نوجوان اس کی جانب دیکھ رہا تھا بلکہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا!

شیلا نے چوری چوری نوجوان کی آنکھوں میں جھانکا۔ جب نوجوان نے شیلا کو اپنی جانب دیکھتے محسوس کیا تو خود بھی شیلا کی طرف دیکھنے لگا۔ شیلا کو یوں محسوس ہوا جیسے نوجوان کی آنکھوں میں پیار جھلک رہا ہو۔ لیکن یہ کیا؟ شیلا چونک پڑی۔ نوجوان پھر سے ایک دفعہ اس کے چہرے کے بجائے اس کے پیروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شیلا کا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نوجوان کو شیلا کے پیر بدنما لگ رہے ہوں بلکہ کسی کے پیروں کو اس قدر غور سے تھوڑی دیکھا کرتا ہے! شیلا نے دزدیدہ نگاہوں سے پھر سے ایک دفعہ نوجوان کی جانب دیکھا۔ لیکن اب نوجوان دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔

شیلا نے ایک گہری سانس لی۔ بس پھر سے چل پڑی اور کھڑکیوں کی راہ ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا جو آیا تو شیلا کی پیشانی پر بالوں کی ایک ننھی منی سی لٹ آ گری اور ہوا میں پھڑپھڑانے لگی۔ شیلا کو ایک لطف سا محسوس ہونے لگا اور ساتھ ہی اس نے سوچا کہ پیشانی پر کھیلتی ہوئی اس ننھی سی لٹ کی بدولت اس کے چہرے کی جاذبیت کچھ اور بڑھ گئی ہوگی۔ کچھ عورتوں کے چہرے پر بالوں کی لٹیں کس قدر خوبصورت لگتی ہیں، شیلا نے سوچا۔ اس نے کئی ایسی عورتیں بھی دیکھی تھیں جو اپنے بال سنوارتے وقت اپنی پیشانی پر ایک آدھ لٹ زبردستی لا دیا کرتی تھیں۔ لیکن خود اس کا اپنا معاملہ تو دوسرا تھا ـــ اس کے اپنے چہرے پر تو لٹ خود سے آ گری تھی!

شیلا نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ نوجوان اس کی اپنی پیشانی پر کھیلتی ہوئی لٹ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے شیلا کے چہرے کا جائزہ لیا پھر اس کی نظر شیلا کے جسم پر سے گذرتی ہوئی شیلا کے پیروں پر رک گئی۔ اور اب وہ پھر سے ایک دفعہ شیلا کے پیروں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا! شیلا نے اپنی گردن سیٹ کے پچھلے گدے پر ٹیک دی اور سیٹ پر پھیل کر پورے اطمینان سے بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر اب ایک انجانی قسم کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور وہ بس کی چھت کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نوجوان کی اس نظر بازی میں مخل نہیں ہونا چاہتی ہو۔ لیکن اس کی اس ظاہری بے تعلقی کے پس پردہ اس کا دل فرطِ انبساط سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ اسے یہ سوچتے ہوئے بے حد مسرت ہو رہی تھی کہ آج اس کی سبھی سہیلیوں کو مات ہوئی تھی اور جیت خود اس کے اپنے حصے میں آئی تھی۔

وہ ابھی اپنی اس کامیابی سے بخوبی لطف اندوز بھی نہ ہو پائی تھی کہ بس کو ایک اور جھٹکا لگا اور بس رک گئی۔

"محترمہ آپ کی سیٹ تلے میرا "ٹریولنگ بیگ" رکھا ہے۔ اگر آپ براہ کرم اپنے پیر ہٹا لیں تو ....." کسی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"جی!" وہ چونک پڑی۔

خوبرو نوجوان قریب کھڑا انگلی سے شیلا کی سیٹ کے نیچے رکھے ہوئے اپنے سفری بیگ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"جی!" شیلا کی ایک سرد آہ نکل گئی۔ بس کے پیر خود بخود کھسک گئے۔

نوجوان نے اپنا بیگ باہر نکالا اور شکریہ کہہ کر بس سے نیچے اُتر پڑا۔ اس نے شیلا کی طرف ایک دفعہ مڑ کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

شیلا کے ہوائی قلعے جیسے یک بیک گر پڑے ـــــ نوجوان راستہ بھر شیلا کے خوبصورت پیروں کو تعریفی نگاہوں سے دیکھتا نہیں آیا تھا بلکہ اپنے بیگ کی حفاظت کرتا رہا تھا کہ کہیں کوئی چور اُچکا 'نظر بچا کر' بیگ نہ لے اُڑے۔

شیلا کو جیسے کسی نے کسی پہاڑ کی بلند چوٹی سے کسی عمیق گہرائی میں ڈھکیل دیا تھا ـــــ اور وہ گم صم بیٹھی اپنے حماقت آمیز خیالات پر غور کر رہی تھی کہ اسے کنڈکٹر کی آواز سُنائی دی۔

"میڈم ـــ آپ کو کہاں جانا ہے؟"

"چھوٹا بازار" اس نے لاشعوری طور پر جواب دیا۔

"وہ تو کب کا گذر چکا ـــ ڈرائیور گاڑی روک دو ـــ!" کنڈکٹر نے ڈرائیور کو آواز دی۔ بس رُک گئی۔ شیلا بس سے نیچے اُتر پڑی ـــ

جب وہ واپس "چھوٹا بازار" کے قریب سے گذر رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ اس کی اپنی سہیلی کے مکان سے مہمان دو دو چار چار کی ٹولیوں میں نکل کر اپنے گھر واپس لوٹ رہے تھے ـــــ پارٹی ختم ہو چکی تھی!



ہندوستان کے کلاسیکی ناچ

(بسلسلۂ صفحہ ۳۱)

سکنات بہت تھوڑے سے وقفہ کے لیے پیش کی جاتی ہیں مثلاً رادھکا جا رہی ہیں، کرشن جی اُن کا آنچل پکڑ لیتے ہیں اور رادھکا آنچل چھڑا کے ایک خاص ادا سے انھیں دیکھنے لگتی ہیں۔ یا کرشن جی مُرلی بجا رہے ہیں، رادھکا پیچھے سے آکر اُن کی مُرلی چھین لیتی ہیں اور کرشن جی انھیں پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ بڑی گت میں کرشن جی کی دوسری لیلائیں یا کارنامے دکھائے جاتے ہیں جیسے کالیا سانپ کے پھن پر کھڑے ہو کر کرشن جی کا ناچنا اور ناچ کر اُسے مطیع کرنا وغیرہ۔ گت کا مطلب ہے کہ رقاص کے پاؤں اور جسم کے دوسرے حصوں کی حرکت سے کسی ایک واقعہ کا سارا منظر آنکھوں کے سامنے پیش ہو جائے۔ ان گتوں کو پیش کرتے وقت منھ سے کچھ نہیں بولا جاتا۔ اس کے بعد اَرتھ بھاؤ آتا ہے یعنی کسی بھجن، ٹھمری یا دادرے کے بول گا کر اُس کی وضاحت چہرے، آنکھوں اور ہاتھوں کی حرکات سے کی جاتی ہے۔ اَرتھ بھاؤ میں گانے کا ایک ایک لفظ یا ایک ایک ٹکڑا چہرے، آنکھوں اور ہاتھوں کی حرکات سے کئی طرح سے پیش کیا جاتا ہے۔ "ارتھ بھاؤ" جسے عام طور سے "بھاؤ بتانا" کہتے ہیں، کتھک ناچ کا دلکش ترین جز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مہراج بندادین بعض الفاظ یا بعض ٹکڑوں کا بھاؤ ایک ایک گھنٹے تک مختلف طریقوں سے بتاتے تھے۔ آج کل شمبھو مہراج، بھاؤ بتانے کے سب سے بڑے ماہر ہیں۔

ورندابن کے راس لیلاؤں میں کتھک ناٹیہ موجود ضرور تھا مگر اُس میں ترقی اور اضافہ واجد علی شاہ نے اپنے عہد میں کیا۔ ناٹیہ سے مراد ہے کئی آدمیوں کا ایک ساتھ ایک وقت میں خاص لباس پہن کر ایسا ناچ پیش کرنا جس سے کوئی پورا واقعہ آنکھوں کے سامنے پیش ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی ناچ میں کسی پورے واقعہ کو پیش کرنا ہوگا تو اُس میں بول، بھاؤ، سنگیت سبھی چیزیں شامل ہو جائیں گی۔ ناٹیہ میں جب لباس، روشنی، پس منظر کی موسیقی وغیرہ اچھی ہو تو بڑا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔

چاند نگر

پرویز واربرٹنی

رات پر نور ستاروں کی قبا پہنے ہوئے
ایک نوخیز دلہن کی طرح شرماتی ہے
لوریاں گاتے ہیں سرمست ہوا کے جھونکے
غم میں ڈوبی ہوئی تنہائی کو نیند آتی ہے
دُودھیا رات کی دُھندلائی ہوئی وادی میں
یوں چمک اُٹھتے ہیں سناٹے کے قدموں کے نشاں
جس طرح پچھلے پہر رات کی تاریکی میں
آنسوؤں پر ہو سُلگتے ہوئے تاروں کا گماں
پُرفسوں رات کی پُرکیف فضا میں ہر سو
پھیلتی جاتی ہے زلفوں کی مقدس خوشبو
نظر آتی ہی نہیں چاند نگر کی سرحد
ختم ہوتا ہی نہیں شب کے ستاروں کا سفر
نیند آتی ہی نہیں درد سنبھلتا ہی نہیں
تک رہی ہے مجھے رہ رہ کے مری راہ گزر
دُودھیا رات کے نکھرے ہوئے آئینے میں
سہمے سہمے نظر آتے ہیں محبت کے کھنڈر
ایک ہی لے میں ہے سنسان فضا نغمہ سرا
دُور تک کوئی بھی آہٹ نہیں آواز نہیں
چاند بھی اپنے خیالوں میں ہے کھویا کھویا
رازِ دل کس سے کہوں ؟ کوئی بھی ہم راز نہیں
چاندنی رات پریشاں ہے مرے دل کی طرح
اُس کے لب پر بھی محبت بھرا افسانہ ہے
میں ہی گم راہ نہیں رات کے سناٹے میں
چاند بھی ایک بھٹکتا ہوا دیوانہ ہے

پرچھائیاں

دانش بریلوی

اُداس ہوں میں چراغِ مزار کی صورت
ہر آرزو کا ستارہ چمک کے ٹوٹ گیا

نصیب سوتا ہے انجان رہ گزر کی طرح
گلوں کے سوگ میں فصلِ بہار ہو جیسے
اُمید روتی ہے غم کی نڈھال باہوں میں
کسی کی یاد میں دل بے قرار ہو جیسے

طلب کی راہ میں ناکامیوں کا موسم ہے
لگی ہے آگ ابھی حسرتوں کے پھولوں میں
جواں خیال پہ مایوسیوں کی سایہ ہے
حیات جھولتی ہے حادثوں کے جھولوں میں

جنوں کے ہاتھ میں کچھ اجنبی سی یادیں ہیں
مسرتوں کی ہر اک رات ڈھلتی جاتی ہے
تصوّرات پہ ہے وحشتوں کی ویرانی
غموں کی دھوپ سے جاں تک پگھلتی جاتی ہے

سحر کی پلکوں پہ شبنم کے نرم آنسو ہیں
اُفق سے بہنے لگا آبشار کرنوں کا
ہوا سے جھپکیاں لیتے ہیں مخملی سائے
فضا میں جال سا ہے ریشمیں خوابوں کا
نفس نفس پہ ہیں تنہائیوں کی زنجیریں
سحر کھلی ہے شبِ انتظار کی صورت
خوشی کا ساغرِ رنگیں چھلک کے ٹوٹ گیا
اُداس ہوں میں چراغِ مزار کی صورت

اتر پردیش شاہ راہ ترقی پر

سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورتوں کی اصلاح و بحالی ـــــ بجلی حاصل کرنے کے لیے کوہ کنی ـــــ کارخانوں میں تربیت کی سہولتیں ـــــ اتر پردیش کے قیدخانے اپنے لیے کپڑا تیار کریں گے ـــــ پہاڑوں سے "جوئے شیر" ـــــ دھان، جوار اور کپاس کا مقابلہ ـــــ ضلع وارانسی میں بند کی تعمیر ـــــ متفرقات

گمراہ کردہ اغوا شدہ آبرو باختہ چھوڑی ہوئی اور طلاق دی گئی ایسی عورتوں اور لڑکیوں کو جو اخلاقی اور اقتصادی طور پر زبوں حال اور سماج کی ٹھکرائی ہوئی ہیں دہرہ دون کے حفاظتی و اصلاحی گھر میں راہ راست پر لایا جا رہا ہے۔ ایک منظم پروگرام کے تحت تعلیم، دست کاری، تفریحی مشاغل اور اخلاقی تربیت کے ذریعہ انھیں بحال کیا جا رہا ہے۔ ادارہ کا صحت مند اور پر سکون ماحول ان بدنصیبوں میں خود اعتمادی اور کام کرنے کا نیا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

شروع میں اتر پردیش کے محکمہ سماجی فلاح کے تحت ۱۹۵۶ء میں حفاظت گھر قائم ہوا تھا جو بعد میں سماجی و اخلاقی حفظان صحت اور مابعد نگہداشت خدمتی اسکیم کے تحت حفاظتی و اصلاحی گھر میں تبدیل کر دیا گیا۔ مذکورہ گھر کے قیام کے بعد سے اس میں ۲۵۶ عورتوں اور لڑکیوں اور ۲۳ بچوں کو پناہ دی جا چکی ہے اس وقت ان کی تعداد ۵۲ ہے۔ بچوں کے علاوہ ان میں سے ۲۲ عورتیں انسداد عصمت فروشی قانون کے تحت ۹ اخلاقی خطرہ کے تحت اور ۱۳ مقدمات میں ماخوذ تھیں۔

ضلعی پناہ گاہیں حفاظتی تنظیم دہرہ دون۔ آل انڈیا ویمنز ایسوسی ایشن آگرہ آباد۔ تمام ریلوے اسٹیشنوں کی خواتین گائڈ سماجی کارکن اور ضلع کے حکام کے ذریعہ ستائی ہوئی عورتوں کو مذکورہ حفاظتی و اصلاحی گھر پہنچایا جاتا ہے۔ جیسے ہی کوئی عورت وہاں داخل ہوتی ہے اسے غسل کے بعد پہننے کے لیے نئے کپڑے دیے جاتے ہیں اور اس کے استعمال شدہ کپڑے یا تو بیکار کر دیے جاتے ہیں یا ان کو جراثیم کش دواؤں سے دھو دیا جاتا ہے۔ باقاعدہ ڈاکٹری معائنے کے بعد نسوانی بیماریوں میں مبتلا عورتوں کے لیے پورے طور پر شفایاب ہونے تک رہائش کا علیحدہ بندوبست کر دیا جاتا ہے۔

جو عورتیں خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہوتی ہیں انھیں اسپتال بھیج دیا جاتا ہے ہر مکین کا ماہانہ ڈاکٹری معائنہ بھی کیا جاتا ہے اس کے علاوہ روزانہ ان کے سماجی اقتصادی اور نفسیاتی عوامل کا جائزہ لیا جاتا ہے جن کے تحت وہ بدنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ اور ان کی مجروح شخصیت کو اس طرح تبدیل کیا جاتا ہے کہ انھیں زندگی کی اصل قدروں کو پہچاننے میں مدد مل سکے۔

قیام و طعام لباس اور بستر کی فراہمی کے علاوہ جس پر فی مکین تقریباً ۳۰ روپیہ ماہانہ خرچ ہوتا ہے۔ آٹھویں درجہ تک تعلیم اور دست کاری اور ٹیکنیکل ٹریننگ کا بھی بندوبست ہے۔ صبح سات بجے سے بارہ بجے دوپہر تک درجے لگتے ہیں۔ دو ٹیچر لڑکیوں کی عام تعلیم اور دو ٹیچر بالغ عورتوں کے مختصر نصاب کی تعلیم سے وابستہ ہیں۔ مختصر نصاب کی ہر طالبہ کو ریاستی سماجی فلاحی مشاورتی بورڈ کی طرف سے پانچ روپیہ ماہانہ وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔ اس سال تین لڑکیوں نے جونیر ہائی اسکول پاس کیا ہے اور ۱۰ لڑکیوں نے آٹھویں درجہ میں داخل ہونے کی استعداد حاصل کر لی ہے۔

مذکورہ گھر کے مکینوں کو دن کے آخری حصہ میں مختلف دستکاریوں مثلاً سلائی، زردوزی، اون اور سوت کاتنے، کھلونے بنانے اور دری بننے کی تربیت دی جاتی ہے مکینوں کو کسی مخصوص پیشہ میں تربیت کے لیے منتخب کرنے سے

قبل خود ان سے تبادلہ خیال کے بعد اس پیشہ کے لیے ان کے میلان طبع اور استعداد کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ عام طور پر خواندہ عورتوں سے سلائی اور زردوزی کا کام سیکھنے کے لیے کہا جاتا ہے جو عورتیں کند ذہن ہیں وہ دری بننے اور اون کاتنے کے کام کو ترجیح دیتی ہیں۔ سلائی اور زردوزی کی تربیت حاصل کرنے والی ہر عورت کو پندرہ روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا ہے جو اس کے سیونگس اکاؤنٹ میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ ایک سال کی کامیاب تربیت کے بعد نظامت صنعت اتر پردیش کی طرف سے ان کو ڈپلومے دیے جاتے ہیں۔ عام صفائی اور امور خانہ داری کی پوری معلومات اور عملی تجربہ لڑکیوں کی عام تربیت کا جز ہیں۔ مہینہ میں ایک بار سپرنٹنڈنٹ کی موجودگی میں جمع ہو کر اپنی دشواریوں اور ان سے متعلق تجاویز پر تبادلہ خیال کرتی ہیں۔

مذکورہ گھر نے اب تک ۱۰۵ عورتوں اور لڑکیوں کی مناسب آبادکاری میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان میں سے ۱۷ کی شادی برسر روزگار اشخاص مثلاً ٹیچروں، ڈاکٹروں، کانسٹبلوں اور ریلوے کے ملازمین اور سرکاری دفاتر کے چپراسیوں سے ہو گئی ہے۔ ۱۰ کو سرکاری اور نجی ملازمتیں مل گئی ہیں۔ اور ۸۰ کو ان کے خاندانوں کو واپس کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ۳۵ لڑکیوں کو مزید تعلیم اور تربیت کے لیے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں داخل کیا گیا ہے۔ قانون انسداد عصمت فروشی کے تحت اپنی مدت قید پوری کرنے کے بعد رہا ہونے والی عورتوں کی تعداد ۹۱ تھی۔

مذکورہ گھر کی روزانہ زندگی صبح ۶ بجے دعا سے شروع ہوتی ہے اور یہ سلسلہ ۱۱ بجے تک جاری رہتا ہے۔ لیکن رات میں تقریباً ۲ گھنٹے مطالعہ کرتی ہیں۔ وہ شام کو مختلف کھیلوں میں حصہ لیتی ہیں۔ کبھی کبھی مشہور و معروف اصحاب ان کو اخلاقی درس بھی دیتے رہتے ہیں۔

اتوار اور دوسری تعطیلات کے موقعوں پر تعلیمی ڈاکومنٹری فلموں کا انتظام، تاریخی اور ثقافتی اہمیت کے حامل مقامات کی سیر اور ثقافتی ڈراموں کے انعقاد کا بھی پروگرام ہوتا ہے۔ مذکورہ گھر میں ایک ریڈیو سیٹ بھی لگا دیا گیا ہے۔

ہمالیہ کے دامن میں چکراتا روڈ سے وکاس نگر اور قصبہ دہرہ دون سے شمال مغرب کی جانب ۲۶ سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر ۷۰۰۰ اشخاص جمنا سے بجلی حاصل کرنے کے لیے مصروف کار ہیں جو پہاڑیوں سے نکل کر دہرہ دون کی وادی سے ہوتی ہوئی ہماچل پردیش اور اتر پردیش کے درمیان سرحد متعین کرتی ہے۔ یہ انتہائی سخت اور صبر آزما جد و جہد ہے جو ماضی میں دو بار ناکام ہو چکی ہے۔ دریا کے تند و تیز بہاؤ نے پہاڑوں سے ٹوٹے اور گھسے ہوئے پتھروں کا وادی میں انبار لگا دیا تھا اور جس کی متعدد تہیں جم گئی تھیں۔ اب اس وادی کو حسب ضرورت مشینوں اور انسانی محنت کے ذریعہ کھود کر انتہائی محنت و مشقت سے صاف کیا جا رہا ہے۔

ایک طرف مختلف جناتی مشینوں کے شور و غل میں ایک چھوٹا ریلوے انجن چھوٹی چھوٹی لائنوں پر چلتا ہے جس میں لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی گاڑیوں سے کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔ اس کے برعکس دوسری طرف وزن سے لدے ہوئے گدھے اور خچر ہیں اور مزدوروں کی وہ جماعت ہے جس میں مشرقی پنجاب، راجستھان اور اتر پردیش کے پرتاپ گڑھ، گورکھپور، گونڈہ، فیض آباد، سہارنپور اور مظفر نگر اضلاع کے مزدور شامل ہیں جو کھدائی اور بھانسی سے درآمد شدہ عمارتی پتھر پہنچانے کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ جہاں کہیں ضرورت ہوتی ہے وہاں بھاری پتھر کو توڑنے کا کام جس میں بعض پتھر دو سو ٹن وزن تک کے ہوتے ہیں ضرورت پڑنے پر قدیم طریقے سے بھی کیا جاتا ہے جس کے مطابق بھاری پتھروں کو گرم اور سرد کر کے توڑا جاتا ہے۔

اس تمام محنت و مشقت کا مقصد جس کا نظارہ کرنے والی گرد و پیش کی پہاڑیاں ہیں اس مقام سے ڈاک پاتھر کے قریب دو میل پر دریائے جمنا کے کنارے ۱۷۶ فٹ لمبے لیشتر کی تعمیر کرنا ہے یہاں ٹونس جمنا میں آ ملتی ہے اس کے علاوہ دریا کے بائیں کنارے سے کچھ فاصلہ پر کنکریٹ سے بنی ہوئی ۹ میل لمبی نالی جس کی چوڑائی ۳۴ فٹ اور گہرائی ۱۹ فٹ ہوگی اور جس میں ۴۰۰۰ کیوزک پانی بہانے کی صلاحیت ہوگی۔ پانی کا رخ موڑنے کے لیے ایک ہیڈ ریگولیٹر کی تعمیر اور ہیڈ ریگولیٹر سے قریباً پونے پانچ میل پر ڈھکرانی میں ۲۲۵۰۰ کیلوواٹ کے ایک بجلی گھر کی تعمیر کی جائے گی ڈھکرانی سے تقریباً ساڑھے تین میل نیچے ۳۴۰۰۰ کیلوواٹ کی پیداواری صلاحیت کے ایک دوسرے بجلی گھر کی تعمیر بھی کی جائے گی۔

یہ پراجیکٹ پہلی بار ۱۹۴۹ء میں شروع کیا گیا تھا لیکن اس کو ملتوی کرنا پڑا جس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت کے حالات اس امر کے مقتضی

تھے کہ غذائی پیداوار میں اضافے کے مسئلہ کو اولین اہمیت دی جائے چنانچہ ریاست کو اپنے تمام وسائل کے ساتھ اس مقصد کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ سات سال بعد ۱۹۵۷ء میں اس اسکیم پر دوبارہ عمل درآمد کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ بھی ایک دشواری کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اس مرتبہ حکومت پنجاب کی ایک تجویز کہ ڈاک پاتھر سے تقریباً ، ایمیل نیچے کی طرف جمنا کے دوسرے کنارے سے کوبچ کے مقام پر ایک مٹی کا باندھ تعمیر کیا جائے۔ اس کے راستہ میں حائل ہو گئی۔ منصوبہ بندی کمیشن نے ریاستی حکومت کو یہ مشورہ دیا کیونکہ مجوزہ باندھ کے نتیجہ میں ڈھکرانی اور ڈھالی پور بجلی گھر زیر آب ہو جائیں گے اس لیے جمنا پرلا پراجکٹ کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیا جائے جب تک کہ کوبچ باندھ سے متعلق جانچ مکمل نہ ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چار سال تک اس پراجکٹ کا کام بند رہا۔ دوسرے پنجسالہ منصوبہ کے اختتام کے قریب ریاستی حکومت کو کوبچ بند کی اسکیم کے رک جانے کی اطلاع دی گئی اور اس کو اپنے پراجکٹ پر عمل درآمد کی اجازت دی گئی۔ اس وقت سے تقریباً ڈیڑھ سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر گیا ہے۔ اس عرصہ میں تعمیری کام تیزی سے جاری ہے۔

اس پراجکٹ سے ۲۲،۲ کروڑ یونٹ بجلی سالانہ پیدا کی جا سکے گی اور اس سے انڈین ڈائنیمکس فیکٹری رشی کیش اور ہیوی الکٹریکلس فیکٹری جوالاپور کو کثیر مقدار میں بجلی فراہم کی جائے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ریاست کے مغربی اضلاع میں جہاں بجلی کی قلت کے سبب مزید صنعتی ترقی رکی ہوئی تھی آئندہ چند سال میں بجلی کی کوئی قلت نہ رہ جائے گی جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان اضلاع میں روزگار کی مزید سہولتیں مزید پیداوار تیز تر ترقی اور خوشحالی کا دور دورہ ہو جائے گا۔

ریاستی حکومت کے ذریعہ اتر پردیش کی فیکٹریوں اور تجارتی اداروں کے جائزہ سے اس امر کا انکشاف ہوا کہ ریاست میں ۳۰۷ ایسی فیکٹریاں ہیں جہاں اپرنٹس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت ۱۵۰۰ اپرنٹسوں کو تربیت دینے کے انتظامات ہیں۔

یہ سروے ریاستی اپرنٹس شپ تنظیم نے کیا تھا جس میں یہ جائزہ لیا گیا تھا کہ مذکورہ ایکٹ کے تحت فیکٹریاں اور تجارتی ادارے کتنے افراد کو تربیت دے سکتے ہیں۔

اس سروے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب تک جن ۵۰۹ فیکٹریوں کا سروے کیا گیا ہے ان میں ۲۰۲ ایسی فیکٹریاں ہیں جن میں تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

ابتدا میں ان اداروں کا سروے کیا گیا جن میں ۲۵ یا اس سے زیادہ افراد کام کرتے ہیں۔ حکومت نے اب سروے کا دائرہ وسیع کر دیا ہے تاکہ ان فیکٹریوں کی تربیت دینے کی صلاحیت کا بھی پتہ لگایا جا سکے جہاں ۲۵ سے کم افراد ملازم ہیں۔

اسی دوران ریاست میں اپرنٹس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت اپرنٹسوں کو تربیت دینے کی ایک اسکیم شروع کرنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ اس ایکٹ کا نفاذ یکم مارچ ۱۹۶۲ء سے ہوا۔

ریاستی حکومت کو جیسے ہی اس ایکٹ کے تحت وہ قواعد جن کو حکومت ہند نے مرتب کیا ہے موصول ہو جائیں گے ویسے ہی اس اسکیم پر عمل درآمد کر دیا جائیگا۔ ریاستی اپرنٹس شپ تنظیم اور اس سلسلہ میں ایکٹ کے عمل درآمد سے متعلقہ عملہ ریاست کا دورہ کرنے اور ملازمین سے ملاقات کرنے میں مشغول ہے تاکہ اس ایکٹ کے عمل درآمد کے لیے سازگار فضا تیار ہو سکے۔

جب ریاست کی تمام فیکٹریوں اور تجارتی اداروں کا سروے مکمل ہو جائے گا تو اتر پردیش کے تربیت اور روزگار کے ڈائرکٹر جو باعتبار عہدہ ریاستی اپرنٹس شپ کے صلاح کار مقرر کیے گئے ہیں ہر فیکٹری کے لیے اپرنٹسوں کا کوٹہ مقرر کریں گے۔ مذکورہ ایکٹ کے تحت کوئی آجر ان افراد کو تربیت دینے سے انکار نہیں کر سکتا جن کو تربیت دینے کی ذمہ داری مقرر حکام نے اس پر عائد کی ہے۔

حکومت اتر پردیش کے محکمہ جیل نے جیلوں میں کپڑے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے چھ تکلی والے امبر چرخوں کو استعمال میں لانا شروع کر دیا ہے۔ تجربہ کے طور پر یہ چرخے نینی سنٹرل جیل الہ آباد میں ۱۹۶۱ء سے چلائے جا رہے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ ان کے ذریعہ حکومت کے محکمہ جیل کی ضرورتوں کو آئندہ تین برسوں میں پورا کیا جا سکے گا۔ ریاستی جیلوں کے لئے تقریباً ۳ لاکھ گز کھادی دوسوتی کی سالانہ ضرورت ہے۔

یہ اسکیم امسال جنوری سے مستقل طور سے چلائی جا رہی ہے۔ کھادی کمیشن نے امبر چرخوں کے معائنہ کرنے اور قیدیوں کو تربیت دینے کے لئے تین انسٹکٹروں کا بندوبست کر دیا۔

نینی سنٹرل جیل الہ آباد میں اس اسکیم پر عمل درآمد کئے جانے سے قیدیوں میں زیادہ اور بہتر قسم کی کھادی پیدا کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ نینی سنٹرل جیل الہ آباد ان ۴۲ مرکزوں میں ایک ہے جسے کھادی کمیشن نے چھ تکلی والے امبر چرخہ اسکیم کے لئے منتخب کیا ہے۔

ایک قیدی کے لئے روزانہ آٹھ لچھیاں بنانے کا کوٹہ مقرر کر دیا گیا ہے لیکن اس کے علاوہ مال تیار کرنے پر بارہ نئے پیسے فی لچھی بطور بونس یا انعام دیا جاتا ہے اور اس اسکیم کے تحت چند محنتی قیدیوں نے جنوری ۱۹۶۲ء سے ۳۵ سے ۱۷ روپیہ ماہانہ کے انعامات حاصل کئے ہیں۔

اس اسکیم کی وجہ سے عمدہ قسم کی کھادی کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ چھ تکلی والے چرخہ میں دوہرے عمل کا طریقہ بھی ہے جس کی وجہ سے پونی اور عمدہ قسم کا سوت ساتھ ساتھ تیار ہوتا رہتا ہے۔

قیدیوں نے گزشتہ مارچ۔ اپریل اور مئی میں بالترتیب ۳۵۲۸ - ۴۵۴۵ اور ۴۸۰۲ لچھیاں بنائی ہیں۔ یہ پیداوار مسلسل بڑھ رہی ہے۔ جن قیدیوں کو یہ چرخہ مل گیا ہے وہ ایک ایک پائی کما کر اکٹھا کر رہے ہیں تاکہ وہ قید سے نجات پانے کے بعد بہتر طور پر زندگی بسر کر سکیں۔

جو سوت چھ تکلی والے چرخہ سے پیدا کیا جاتا ہے اس سے قیدیوں کے لئے کپڑے بنے جاتے ہیں۔ دوسوتی اور پلنگ پوش۔ تیار کرنے کے لئے حال ہی میں ایک علاحدہ سکشن کھول دیا گیا ہے اور قیدیوں کو بنائی کے فن کی تربیت بھی دی جا رہی ہے۔ قیدیوں میں اس کا ردعمل اچھا ہے۔ بہت سے قیدیوں نے روزانہ ۴۰ فٹ کپڑا بنا جبکہ روزانہ کی مقررہ مقدار ۲۰ فٹ ہے۔ بنائی کے کام میں بھی مقررہ مقدار سے زیادہ کام کرنے پر ۸ نئے پیسے فی فٹ انعام دیا جاتا ہے۔ ان چھ تکلی والے امبر چرخوں سے پیدا کئے گئے سوت سے گزشتہ مئی کے اختتام تک ۴۲۲۷ گز دوسوتی اور ۳۰۰ پلنگ پوش بنے گئے ہیں۔

کالاٹہ گودام کے قریب گولا ندی کے بائیں کنارے کی جانب پہاڑیوں کو کاٹ کر ایک ڈھکی ہوئی نہر بنائی جا رہی ہے جس سے "گولا پار" کے علاقہ کی دھان کی سنچائی ہوا کرے گی۔

گولا وادی میں ۲۴ مئی سنہ ۱۹۶۰ء کو ایک زبردست طوفان آنے کی وجہ سے سنہ ۱۹۶۱ء میں سیمنٹ اور کنکریٹ سے تعمیر کردہ ایک محراب نما چھوٹی نالی منہدم ہو گئی اور ۶۲۲۵ ایکڑ اس تمام آراضی کی سنچائی کے لیے جس میں گیہوں اور دھان کی پیداوار ہوتی ہے اس نہر کو تعمیر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خاص حادثہ کے بعد کاشتکاروں کی فوری امداد کے لیے کچھ عارضی انتظامات کر دیے گئے تھے۔ چنانچہ جو پانی اس چھوٹی محراب نما نالی کے ذریعہ گزرا کرتا تھا اس کے رخ کو پیری گھاٹ برساتی کٹاؤ کے ذریعہ ندی کی طرف موڑ دیا گیا تھا۔

اس عمل سے اس علاقہ کے ۴/۵ حصہ میں آبپاشی کی جاتی تھی بقیہ علاقہ کے لیے ندی میں ایک پتھر کی دیوار بنوا دی گئی تھی اور اس طرح پانی کی سطح اونچی ہو جانے سے پانی پرانی نالی سے پھر گزرنے لگا تھا۔ ان انتظامات کے علاوہ اس علاقہ کے پینے کے پانی کی فراہمی پانی کے پائپ کے ذریعہ کر دی گئی تھی۔

اس عارضی بندوبست سے سنہ ۱۹۶۰ء اور سنہ ۱۹۶۱ء کے دوران کام چلتا رہا اور درمیانی مدت میں اس مسئلہ کو مستقل طور پر حل کرنے کے اقدامات بھی کیے جاتے رہے۔ ابتدائی سروے اور جانچ پڑتال سے یہ معلوم ہوا کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے تین طریقوں میں ایک استعمال کیا جا سکتا ہے جو یہ ہیں۔ سیمنٹ کنکریٹ کی محراب نما نالی۔ بکس نما قوس سی نالی اور کاٹ کر ڈھکی ہوئی نہر۔ جگہ کی موزونیت وغیرہ پر غور کرنے سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اس علاقہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے پہاڑیوں کو کاٹ کر ڈھکی ہوئی نہر بنانا ہی مناسب ہوگا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے جو منصوبہ بنایا گیا اس میں ایک ہیڈ ریگولیٹر۔ پیدل چلنے والوں کے لیے پل۔ دریا چکی۔ تہ صاف کرنے کی مشینیں ۱۵،۲۰ فٹ سے گرنے والا پانی کا جھرنا اور ساڑھے تین فرلانگ لمبی پہاڑیوں کو کاٹ کر بنائی جانے والی ڈھکی ہوئی نہر شامل تھی۔

گزشتہ جنوری میں جب اس نہر کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا تو منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں کچھ ناگہانی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جس جگہ کو کھودنا تھا وہاں بظاہر مٹی معلوم ہوتی تھی لیکن پانچ۔ چھ فٹ گہرائی تک

کھودنے کے بعد پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے اور چٹانیں ملنا شروع ہوگئیں اس لیے چٹانوں کو توڑنے کے لیے جدید قسم کی مشینوں کو وہاں لے جاکر تعمیر کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔

جب نالی کی کھدائی ہو رہی تھی تو کئی جگہ سے چشمے کا پانی پھوٹ نکلا اس لیے پانی کی سطح کو نیچا کرنے کے لیے پمپ بھی استعمال میں لائے گئے تاکہ کنکریٹ کی بنیادیں ڈالی جاسکیں۔ چونکہ بہت سے پہاڑی علاقوں میں تعمیری کام ہو رہا تھا اس لیے ہنرمند اور غیر ہنرمند مزدوروں کی قلت رہی اور ان کو بریلی۔ علی گڑھ۔ اور رام پور سے جاکر لانا پڑا۔

ان تمام دشواریوں کے باوجود نہر کی تعمیر کا کام تندہی سے جاری ہے اور توقع ہے کہ مذکورہ نہر سے آیندہ ماہ "گولاپار" کے علاقہ کے ضرورتوں کو پورا کر کے اس علاقہ کو پانی کی فراہمی کے سلسلے میں خود کفیل بنا دیا جائے گا اور بارش کے دوران "برساتی کٹاؤ" کی بھی ضرورت نہ رہ جائے گی۔

اس منصوبہ پر جس پر ۹۶ر۶ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ دن اور رات کام ہو رہا ہے اور ۶۰۰ غیر ہنرمند اور ۲۰۰ ہنرمند مزدوروں کو چھ ماہ کے لیے روزگار کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔

میسا خورد بھاؤڑرانی اور مسراہی کی گرام سبھاؤں نے بالترتیب دھان، جوار اور کپاس کی فی ایکڑ سب سے زیادہ پیداوار کر کے سنہ ۶۲-۱۹۶۱ء کے گرام سبھا کے خریف فصل کے مقابلہ میں اول انعامات حاصل کیے ہیں۔ ان کی دھان جوار اور کپاس کی فی ایکڑ پیداوار بالترتیب ۲۲ر۶۶ — ۴۸ر۳۸ اور ۱۵ر۱۳ من تھی جبکہ ریاست میں اسی سال فی ایکڑ اوسط پیداوار بالترتیب ۸۰ر۱۲ — ۷ر۴ اور ۱۵ر۱ من تھی۔

میسا خورد گرام سبھا نے جو ضلع ایٹہ کے آرا گڑھ ترقیاتی بلاک میں ہے ۸۰ر۳ ایکڑ علاقہ میں ۶۶ر۲۲ من فی ایکڑ خشک دھان پیدا کیا۔ یہ گرام سبھا آگرہ کے منطقہ اور ریاست بھر میں اول آئی ہے۔ اس لیے اس کو ۶۰۰۰ روپیہ کا ریاستی اور ۴۰۰۰ روپیہ کا آگرہ منطقہ کا پہلا انعام دیا جائے گا۔

بھاؤڑرانی گرام سبھا (مانک پور بلاک ضلع باندہ) اور مسراہی گرام سبھا (دھاتو پور بلاک ضلع الہ آباد) کو جوار اور کپاس کی پیداوار پر ۵۰۰۰ — ۵۰۰۰ روپیہ کے اول ریاستی انعامات دیے جائیں گے۔

ضلع باندہ میں مہوہ بلاک کی بھیتری گرام سبھا نے ۱۹ر۱۹۰۴ ایکڑ علاقے میں اوسطاً ۱۴ر۱۱ من فی ایکڑ خشک دھان پیدا کر کے ایک امتیازی مثال قائم کی ہے اس لیے ریاستی حکومت نے اسے اتنے وسیع علاقہ میں اوسطاً اتنی زیادہ پیداوار پر ۶۰۰۰ روپیہ کا مخصوص انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ بھیتری گرام سبھا کو جس کا نام دھان کی پیداوار میں بندیلکھنڈ کے منطقہ میں سرفہرست ہے اس منطقہ کا ۴۰۰۰ روپیہ کا پہلا انعام بھی دیا جائے گا۔

دھان سے متعلق چار چار ہزار روپیہ کے اول منطقائی انعامات مندرجہ ذیل گرام سبھاؤں کو دیے جائیں گے جنھوں نے اپنے ڈویژنوں میں سب سے زیادہ دھان پیدا کیا ہے۔

مہودا گرام سبھا (کھتولی بلاک ضلع مظفر نگر میرٹھ ڈویژن) ۵۵ر۵۲ ایکڑ علاقہ میں ۴۶ر۶۵ من فی ایکڑ — خالص پور گرام سبھا (ضلع اعظم گڑھ گورکھپور ڈویژن) ۳۱ر۱۷ ایکڑ علاقہ میں ۱۳ر۵۹ من فی ایکڑ۔ پرتی اوگر سین گرام سبھا (سرسواں بلاک ضلع الہ آباد۔ الہ آباد ڈویژن) ۵۹ر۵۲ ایکڑ علاقہ میں ۰۷ر۵۶ من فی ایکڑ۔ میسا سمرونا گرام سبھا (صنیت گنج بلاک ضلع سلطانپور۔ فیض آباد ڈویژن) ۱۷ ایکڑ علاقہ میں ۳۲ر۵۵ من فی ایکڑ۔ گرہی گرام سبھا (موہن لال گنج بلاک ضلع لکھنؤ۔ لکھنؤ ڈویژن) ۰۰ر۱۱۷ ایکڑ علاقہ میں ۳۱ر۵۰ من فی ایکڑ — لوہٹہ گرام سبھا (سیر بلاک ضلع بلیا وارانسی ڈویژن) ۹۱ر۱۵۳ ایکڑ علاقہ میں ۱۳ر۴۵ من فی ایکڑ —

مجموعی طور پر دھان کے مقابلہ میں ۳۱۹ گرام سبھاؤں نے اور جوار و کپاس کے مقابلہ میں بالترتیب ۲۵ اور ۲۸ گرام سبھاؤں نے حصہ لیا۔ اس سلسلے میں ۵۰ خطوں کی کٹائی گرام سبھاؤں میں کی گئی۔ جن کا انتخاب ریاستی اعداد و شمار کے مخصوص ماہر نے کیا تھا۔

ضلع وارانسی کی تحصیل چکیا میں کرمنا سا ندی کے کنارے نوگڑھ سے پہاڑ کی جانب تقریباً ۱۶ میل دور ۵۰۰ فیٹ لمبا اور ۹۰ فیٹ اونچا بند ۲ر۶ کروڑ روپیہ کی لاگت سے موسی کھنڈ منصوبہ کے تحت تعمیر کیا جا رہا ہے۔ اس بند کے خزانہ آب میں ۴۰۰ ملین مکعب فیٹ پانی جمع ہوسکے گا جس سے ۳۲۰۰ ایکڑ زمین زیر آب ہو جائے گی۔ اس میں سے صرف ۳۰۰

ایکڑ مزروعہ زمین ہے اور بقیہ ۹۲۰۰ جنگلات کی زمین ہے۔

اس خزانہ آب سے جو علاقہ زیر آب ہوگا اس میں صرف دو گاؤں پڑتے ہیں۔ ان گاؤں کے باشندوں کو ان کے کنوؤں اور مکانوں وغیرہ کا معاوضہ دے دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کو بسانے کے لیے قابل کاشت زمین بھی دی گئی ہے۔

اس خزانہ آب کے ذریعہ وارانسی اور غازی پور کے ضلعوں میں ۵۵۰۰۰ ایکڑ رقبہ کو آب پاشی کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی جس سے اناج کی سالانہ پیداوار میں تقریباً ۱۱۰۰۰ ٹن کے اضافہ ہونے کی امید ہے۔

اس منصوبہ کو مکمل کرنے کے لیے کل پانچ کروڑ مکعب فیٹ مٹی کا کام ہوگا جس میں سے اب تک ۱۶ کروڑ مکعب فیٹ مٹی کا کام پورا ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بند تک جانے والی آٹھ میل لمبی سڑک تعمیر کی جا رہی ہے۔ اب تک چار میل لمبی سڑک تعمیر ہو چکی ہے اور نہروں کی کھدائی کا کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ منصوبہ کے تحت مجموعی طور پر ۲۴۰ میل لمبی پرانی نالیوں کی از سر نو تعمیر یا ان کو چوڑا کیا جائے گا اور ۸۰ میل نئی نالیاں تعمیر کی جائیں گی۔

اس منصوبہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تکمیل میں غیر ملکی تبادلہ زر کی بالکل ضرورت نہیں پڑے گی کیوں کہ تمام ضروری مشینیں اور چھاٹک وغیرہ کی سپلائی کے لیے ہندوستانی کارخانہ داروں کو آرڈر دیے گئے ہیں۔ ایک دوسری خاص بات یہ ہے کہ اس منصوبہ کی لاگت اور فائدہ کا تناسب ۴۲۳ روپیہ آتا ہے جب کہ دوسری ریاستوں میں اس قسم کے منصوبوں کا یہ تناسب تقریباً ایک ہزار روپیہ ہے۔

اس منصوبہ کے مکمل ہونے یعنی ۶۵-۱۹۶۴ء تک ہر سال تقریباً دو ہزار سے زیادہ اشخاص کو روزگار ملے گا۔

متفرقات

تین مزید مشاہدہ گاہوں کا قیام۔ حکومت نے مالی سال رواں کے دوران اطفال ایکٹ ۱۹۵۱ء کے نفاذ کے سلسلہ میں لکھنؤ۔ الٰہ آباد اور بریلی میں ایک ایک مشاہدہ گاہ کے قیام کے لیے ۲۱۶۰۰ روپیہ منظور کیا ہے۔ اس ایکٹ میں بچوں کی حراست۔ نگہداشت اور بحالی سے متعلق دفعات موجود ہیں۔

علاوہ ازیں اس ایکٹ میں نوعمر مجرموں کی حراست ان پر مقدمہ چلانے اور سزا دینے سے متعلق دفعات بھی شامل ہیں۔

اس طرح کی مشاہدہ گاہوں کی تعداد چھ تک پہنچ گئی ہے۔ دیگر تین مشاہدہ گاہیں کانپور۔ وارانسی۔ اور آگرہ میں قائم کی جا رہی ہیں۔

مذکورہ مشاہدہ گاہیں اقامتی ہوں گی اور لکھنؤ۔ اور الٰہ آباد میں پچاس پچاس اور بریلی میں ۱۵ بچوں کے رہنے کی گنجائش ہوگی۔ ان مشاہدہ گاہوں کے مکینوں کو کھانا۔ کپڑے۔ بستر اور سامان آرائش مفت فراہم کیا جائے گا۔ ان کی صحت کی دیکھ بھال کے لیے تھوڑے وقت کا ایک ڈاکٹر بھی ہوگا۔

ہر مشاہدہ گاہ میں ایک چھوٹی لائبریری کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ مشاہدہ گاہ کی نگرانی کی ذمہ داری پورے وقت کے ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پر ہوگی۔

جن بچوں کے مقدمات اطفال ایکٹ کے تحت زیر سماعت ہیں وہ اس وقت تک مشاہدہ گاہ میں رکھے جائیں گے جب تک نوعمر مجرموں کی عدالت ان کے مقدمات کا فیصلہ نہ کر دے۔

دیہی آیورویدک ڈسپنسریاں، نو مزید ڈسپنسریوں میں اکتوبر سے کام شروع۔ ریاست کے دیہی علاقوں میں آئندہ یکم اکتوبر سے مزید نو ریاستی آیورویدک ڈسپنسریوں میں کام شروع ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں ریاستی حکومت نے احکام جاری کر دیے ہیں۔ اس طرح اتر پردیش میں دیہی طریقہ علاج سے متعلق ڈسپنسریوں کی تعداد ۶۴ ہو جائے گی۔ ان میں سے ہر ایک ڈسپنسری میں بہ یک وقت ۴ مریضوں کو بھرتی کرنے کی گنجائش ہوگی۔

یہ ڈسپنسریاں مندرجہ ذیل مقامات پر قائم کی جائیں گی۔

بہادر گنج (غازی پور)۔ رانی گنج (پرتاپ گڈھ)۔ مہولی (بستی)۔ بیکولی (فیض آباد)۔ تری پالی بازار (دیوریا)۔ موضع سلطان پور (بلیا)۔ موضع منگل پور (کانپور)۔ پیپ گنج (گورکھپور)۔ اور سکراوا (سہارنپور)

ان میں سے ہر ڈسپنسری میں ایک وید اور ایک کمپاؤنڈر ہوگا۔ عملہ کی تنخواہوں کے علاوہ ریاستی حکومت کو دواؤں کی خریداری اور دوسرے اخراجات کے سلسلہ میں ۱۲۲۵ روپیہ سالانہ کے مصارف برداشت کرنا پڑیں گے۔ ریاستی حکومت نے ہر ڈسپنسری کو ضروری سامان فرنیچر بستر اور پلنگ وغیرہ کی خریداری کے لیے ۲۲۵۰ روپیہ دیا ہے۔

ایک سہ ماہی میں ۵۶ قصبوں کو بجلی کی سپلائی۔ اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کی اطلاع کے مطابق مارچ ۱۹۶۲ء کو ختم ہونے والی سہ ماہی کے دوران ریاست کے ۱۹ اضلاع کے ۵۶ قصبوں کو بجلی سپلائی کی گئی ہے۔

جن قصبوں کو بجلی سپلائی کی گئی ہے ان کے نام درج ذیل ہیں۔

ضلع بارہ بنکی میں رسولی۔ بریلی میں ذکار۔ رچیا اور دسورا۔ باندہ۔ بستی میں ودمراگنج۔ نگر۔ تاس۔ امردھوبا اور بلور۔ بدایوں میں سلسر اور وزیر گنج۔ بلند شہر میں اورنگ آباد۔ کرورا۔ اور سرائے چھبیلا۔ ہردوئی میں ڈوئی والا۔ ایٹہ میں اروانا نگر کالونی۔ فرخ آباد میں سمدھین اور سٹرلی۔ فیض آباد میں بھدرسا پارود۔ شن نگر۔ فتح پور میں سستھیل گنج اور راشکہ۔ گونڈہ میں دھنے پور اور وزیر گنج۔ گورکھپور میں بدری بازار اور کیری نگر۔ ہردوئی میں نجھولی۔ گجو۔ گوپامئو اور ہنورا۔ جونپور میں رامپور۔ کیراکت اور میرگنج۔ کھیری میں میلانی۔ کانپور میں بھاسلی۔ رنیا۔ سچیدی اور سرسول۔ متھرا میں ادنیگ۔ گوردھن تھابن اور رایا۔ مرادآباد میں نرولی اور جلال آباد۔ مظفر نگر میں بڈھانا۔ کوانا اور تیا۔ پیلی بھیت میں پورن پور۔ رائے بریلی میں نظیر آباد۔ شاہجہانپور میں عزیز گنج۔ سیتاپور میں قطب نگر سلطان پور میں دوست پور۔ اناؤ میں کھرست۔ وارانسی میں باندہ میں باندہ۔ میرٹھ میں خورجہ نگلا اور نینی تال میں کچھ۔

سیلاب سے تحفظ کے اقدامات۔ تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے شروع ہونے سے ایک ریاست کے مختلف دریاؤں کے سیلاب سے متاثرہ میدانی علاقوں کے ۹۴۹ مواضع کی سطح سیلاب آنے کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ سطح آب سے بھی اونچی

گورکھپور ضلع کے ۱۰۰ دیوریا ضلع کے ۵۰ مواضع کی سطح کو جو عام طور پر رائی۔ گھاگرا اور گنڈک کی تباہ کاریوں کی زد میں آتے رہتے ہیں اونچا کرنے ۴۴ کا تخمینہ ہے۔

تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے دوران ہر سال متاثر ہونے والے ۱۰۰۱ مواضع کی سطح کو اونچا کرنے کی تجویز ہے۔

ریاست میں کل ... مواضع ایسے ہیں جن کو سیلاب سے محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان دیہاتوں میں ۴۳۲۹ مواضع کی سطح دو پنجسالہ منصوبوں کے دوران اونچا کر کے محفوظ کیا جا چکا ہے۔

ایک سال میں گیارہ واٹر ورکس۔ موجودہ منصوبہ کے پہلے سال میں اتر پردیش کے مزید ۱۱ شہروں میں واٹر ورکس کی تعمیر مکمل ہو گئی ہے جس سے وہاں کے لوگوں کو پینے کا صاف اور شفاف پانی ملنے لگا ہے۔ نئے واٹر ورکس گونڈہ۔ بارہ بنکی۔ رائے بریلی۔ بہیڑی۔ چنار۔ شکوہ آباد۔ بردت۔ کالپی۔ نکیم پور کھیری۔ امروہہ اور شاملی میں چالو کر دیے گئے ہیں۔ سال رواں میں مظفر نگر۔ کھتولی۔ سرونہ۔ بھدوہی۔ بندکی۔ اہروسا۔ اولڈ لبستی (پرانی) بلرام پور۔ مئو ناتھ بھنجن۔ جانش۔ لال گنج۔ بلگرام۔ مہوبہ۔ مئورانی پور۔ ٹنک پور۔ تا ہجہانپور اور بسواں میں واٹر ورکس کے مکمل ہو جانے کی امید ہے۔

موجودہ مالی سال میں واٹر ورکس کی اسکیموں کے لیے بجٹ میں ۱۳۶ لاکھ روپیہ مخصوص کیا گیا ہے جس میں سے مختلف مقامی اداروں کو پانی کی فراہمی کی اسکیموں کے لیے ۲۶ لاکھ روپیہ بطور قرض منظور کیا جا چکا ہے۔

تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے اختتام تک اتر پردیش میں واٹر ورکس کی تعداد ۱۳۵ ہو جانے کی توقع ہے۔ اس وقت ریاست میں ۸۵ واٹر ورکس ہیں۔

تامل کتاب "ہند چین سرحد کا مسئلہ" حکومت مدراس نے ایک تامل کتاب بعنوان "ہند چین سرحد کا مسئلہ" ضبط کر لی ہے۔ یہ کتاب سیلون میں چینی سفارت خانہ کے پبلسٹی ڈویژن نے شائع اور سوریہ پرنٹرس کولمبو نے طبع کی تھی۔ اس کتاب میں ایک نقشہ ہے جس میں شمالی مشرقی سرحدی علاقہ اور لداخ کے ایک حصہ کو چین کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں ایسا مواد موجود ہے جو ہندوستان کی علاقائی سالمیت یا سرحدوں کے صحیح تعین کے منافی ہے۔

حکومت نے مذکورہ کتاب کی تمام نقلیں اور دیگر مسودات جس میں اس کتاب کی نقل ترجمہ یا اقتباسات ہوں ضبط کر لیے ہیں۔

"دھرم سدھانت پرکاش" ضبط۔ حکومت اتر پردیش نے پادری ادیانی ۔ لال ساکن یالودگا ہن دھرماتری مدھیہ پردیش کا تصنیف کردہ کتابچہ "دھرم سدھانت پرکاش" ضبط کر لیا ہے۔ یہ کتابچہ پیجین پریس الہ آباد نے طبع اور نارتھ انڈیا کرسچین ٹریکٹ اینڈ بک سوسائٹی الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ اس میں ایسا مواد موجود ہے جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے یا پہنچ سکتی ہے۔ حکومت نے اس کتاب کی ہر نقل اور

اس سے متعلق تمام مسودات جن میں اس کے ترجمے۔ اقتباسات وغیرہ ہیں ضبط کر لیے ہیں۔

سول الیکٹریکل اور میکینیکل انجینیرنگ کے ڈپلوما۔ اترپردیش کے سات ٹیکنیکل اداروں کے طلبا ریاستی ٹیکنیکی تعلیمی بورڈ کے ذریعہ لیے گئے سول میکینیکل اور الیکٹریکل انجینیرنگ کے ڈپلوما کے آخری امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مرکزی حکومت کے تحت ماتحت جگہوں پر بھرتی کے اہل ہوں گے۔ حکومت ہند نے حال ہی میں یہ فیصلہ اعلان طور پر کیا ہے۔

وہ ٹیکنیکی ادارے جو اس فہرست میں شامل ہیں درج ذیل ہیں:

گاندھی انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ مظفر نگر۔ ڈی۔ این۔ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میرٹھ۔ سول انجینیرنگ اسکول الہ آباد۔ سول انجینیرنگ اسکول لیلا۔ کے ای ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ روڑکی ڈی۔ ایس۔ انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ برودت اور ایم۔ پی۔ انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ گورکھپور۔

اسی طرح حکومت میسور نے گورنمنٹ پولی ٹیکنیک لکھنؤ۔ گورنمنٹ پولی ٹیکنیک گورکھپور۔ ہیوٹ پولی ٹیکنیک لکھنؤ۔ لکھنؤ پولی ٹیکنیک لکھنؤ۔ ٹیکنیکل کالج دیال باغ آگرہ۔ بی۔ ایم۔ دی پولی ٹیکنیک متھرا۔ چندولی پولی ٹیکنیک چندولی اور نینی تال پولی ٹیکنیک نینی تال کے [illegible] ڈپلوما [illegible] کو تسلیم کر لیا ہے۔

سکریٹریٹ کا امتحان۔ اترپردیش سکریٹریٹ [illegible] اپر ڈویژن اور لوور ڈویژن اسسٹنٹوں [illegible] کے لیے [illegible] پبلک سروس کمیشن الہ آباد کے زیر اہتمام [illegible] میں ایک مشترکہ امتحان ہو گا۔ یہ امتحان بیک وقت لکھنؤ، الہ آباد، بریلی، میرٹھ، آگرہ اور گورکھپور مقامات پر منعقد ہو گا۔

[illegible] کی ۶۰ جگہوں اور لوور ڈویژن کی ۲۰ جگہوں پر تقرری کی جائے گی۔ اپر ڈویژن اور لوور ڈویژن میں فہرست مندرج اقوام کے امیدواروں کے لیے ۱۴۔ ۱۳ جگہیں محفوظ کر لی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں پبلک سروس کمیشن الہ آباد کے دفتر میں اپر ڈویژن کی ایک جگہ اور لوور ڈویژن کی ۴ جگہیں ہیں جو فی الحال عارضی ہیں لیکن ان کے مستقل [illegible] کی امید ہے۔

سکریٹریٹ کے ایسے عارضی اسسٹنٹ جو ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۱ء کے خصوصی امتحان میں اہل ثابت ہو چکے ہیں عمر کی کسی قید کے بغیر اس امتحان میں بیٹھ سکتے ہیں۔

سکریٹریٹ کے ایسے اسسٹنٹ جو اس امتحان میں بیرونی امیدوار کی حیثیت سے شرکت کرنے کے حق دار ہیں مذکورہ امتحان کے لیے چاہیں تو درخواستیں دے سکتے ہیں۔

لیکھ پالوں کی کانفرنس۔ کچھ اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی۔ میں جولائی کے پہلے ہفتہ میں اترپردیش کے وزیر مال شری حکم سنگھ نے [illegible] ایسوسی ایشن کی دو روزہ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے یہ اشارہ کیا کہ ریاست میں لیکھ پالوں کی تعداد میں جلد ہی اضافہ کیے جانے کا امکان ہے۔

اس بیان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ درحقیقت کانفرنس میں وزیر موصوف نے یہ کہا کہ اگر لیکھ پالوں کی تعداد کا کبھی مطالبہ کیا گیا تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔

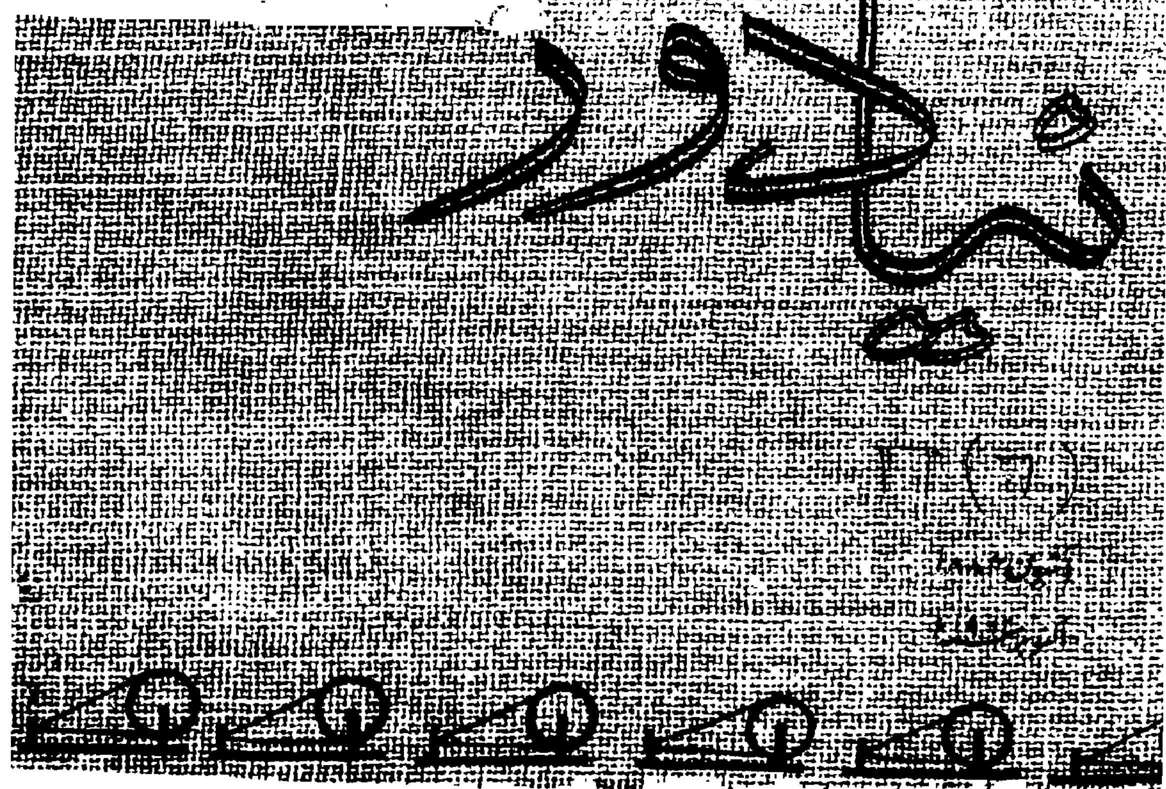
اخباروں کی رپورٹ میں وزیر موصوف سے یہ بھی منسوب کیا گیا تھا کہ لیکھ پالوں کی تنخواہ ان کے کام کے مقابلہ میں کم ہے۔ ان کے سامنے لیکھ پالوں کی تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ انھوں نے کانفرنس پر یہ واضح کر دیا کہ پٹواریوں کی جگہیں ختم کر کے لیکھ پالوں کا پہلے ہی ایک نیا کیڈر قائم کر دیا گیا ہے جن کی تنخواہ کی شرح اور تنخواہ دونوں زیادہ ہیں۔

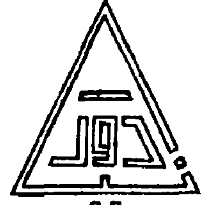
کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے وزیر مال شری حکم سنگھ نے لیکھ پالوں کو یاد دلایا کہ وہ بہت بدنام لوگ ہیں اور اسی لئے انھوں نے لیکھ پالوں کو یہ صلاح دی کہ وہ اس طرح اپنے اطوار درست کریں کہ عوام کو اس قسم کی شکایتوں کا موقع نہ ملے۔

★

REGD. No. 4319







جلد ۱۷ | نمبر ۷

آشون ۱۸۸۴

اکتوبر ۱۹۶۲ء

چندہ سالانہ : پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
امیہ بھوشن ملک
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ ہاج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں حکومت اتر پردیش اُن سے بہرحال متفق ہو۔

اپنی بات

ہندوستان کی سرزمین نے ایسی متعدد جلیل القدر اور عظیم المرتبت ہستیوں کو جنم دیا جو نہ صرف اپنے وطن کے لیے باعثِ فخر تھیں بلکہ جنھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی اور جن کا ساری دنیا نے احترام کیا۔ مہاتما گاندھی ان عظیم ہستیوں میں تو تھے ہی مگر ان میں کئی خصوصیتیں ایسی بھی پائی جاتی تھیں جن کی وجہ سے انھیں ایک انفرادیت حاصل ہو گئی ہے۔ وہ بیک وقت ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر، جنگِ آزادی کے سپہ سالار، مصلحِ قوم، تعلیم و اقتصادیات کے ماہر، روحانی اقدار کے علمبردار، غرض سبھی کچھ تھے۔ موجودہ دنیا میں ایسی ہستیاں تو مل جائیں گی جنھوں نے اپنے ملک کو بیرونی اقتدار سے نجات دلائی، یا میدانِ جنگ میں بڑے کارہائے نمایاں کیے، یا اپنی قوم کی سماجی اصلاح کی، یا اقتصادیات کے بڑے اچھے نظریے پیش کیے، یا ملکی انتظام و انصرام میں غیر معمولی فہم و تدبر کا ثبوت دیا، یا اپنے ناخنِ تدبیر سے پیچیدہ عقدہ ہائے سیاست کی گرہ کشائی کی، مگر ایسی مثال نہ ملے گی جہاں کسی ایک فرد نے یہ سارے کردار ادا کیے ہوں۔ یہ مجموعۂ صفات ذات، صرف گاندھی جی کی تھی۔ مگر ان کی یہی ہمہ خوبی نہ تھی بلکہ ان کی عظمت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ انھوں نے مختلف اور متعدد مسائل کے حل کے لیے جو راستہ اختیار کیا وہ اوروں سے بالکل جداگانہ تھا اور جو طریقے انھوں نے اپنائے وہ بالکل انوکھے اور ساتھ ہی ساتھ اتنے پاکیزہ، اتنے سحر کن اور اتنے مؤثر تھے کہ ساری دنیا ان کی قائل ہو گئی۔ انگریزی کی ایک مثل ہے کہ "عشق اور جنگ میں ہر بات جائز ہے۔" گاندھی جی دنیا کی ایک نہایت طاقت ور حکومت سے جنگ کر رہے تھے۔ انھوں نے اس جنگ میں کامیابی بھی حاصل کی۔ وہ بھی اس مثل پر عمل کرتے تو نہ حیرت کی بات ہوتی نہ اعتراض کی، مگر اس زبردست جنگ میں انھوں نے "ہر بات" کو جائز سمجھنا تو درکنار، صرف وہ بات جائز سمجھی جو حق و صداقت کے معیار پر پوری اترتی ہو۔ ان کے نزدیک "ستیہ" یا صداقت ہی سب کچھ تھی۔ ان کے خیال میں صداقت اور خدا ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔ اس صداقت میں سورج کی روشنی سے لاکھوں گنی تیز روشنی پائی جاتی ہے اور اس صداقت کو سمجھنے، آشنا ہونے اور پرکھنے کے لیے دنیا کی ذلیل ترین مخلوق سے بھی محبت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جو شخص اس صداقت کو اپنانا چاہتا ہے وہ پھر زندگی کے کسی شعبے سے غیر متعلق نہیں رہ سکتا۔ گاندھی جی نے اس صداقت کو اپنا لیا تھا اور انھیں کے بقول اسی لیے وہ سیاست میں حصہ لینے لگے تھے۔ لیکن چوں کہ وہ صداقت کے اتنے بڑے علمبردار اور پیرو تھے اس لیے جب ملکی سیاست کی وہ قیادت کرنے لگے تو وہ اس سیاست کو روحانی سطح پر لے آئے اور اپنی جنگِ آزادی کو بھی صداقت (ستیہ گرہ) کا نام عطا کیا۔ اس ستیہ گرہ کا سب سے بڑا عنصر اہنسا یا عدم تشدد تھا۔ ظاہر ہے کہ جب گاندھی جی دنیا کی ذلیل ترین مخلوق سے بھی محبت کرتے تھے تو اپنے مخالفین کو تکلیف کیسے پہنچاتے اور ان کے مقابلے میں تشدد سے کیسے کام لیتے۔ تحریکِ آزادی کے دور میں اور اس کے بعد بھی ایسے واقعات پیش آئے جب کہیں کہیں تشدد رونما ہو گیا۔ گاندھی جی نے ہر ایسے موقع پر یا تو تحریک بند کر دی یا مَرن برت رکھ لیا۔ اہنسا یا عدم تشدد کے وہ اتنے قائل تھے کہ بین الاقوامی جنگ کا علاج بھی وہ اسی کو سمجھتے تھے۔ وہ ہندوستان کی آزادی کو بھی خیرباد کہہ سکتے تھے مگر عدم تشدد کو ہاتھ سے نہیں دے سکتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں جب جرمنی کے ہوائی جہازوں نے لندن پر بم باری کی تو گاندھی جی بہت متاثر ہوئے۔ ان کی ہمدردیاں اتحادیوں کے ساتھ تھیں، پھر بھی انھوں نے یہ سوچا کہ حکومتِ برطانیہ کو ایک خط لکھا جائے جس میں اسے یہ مشورہ دیا جائے کہ وہ ہتھیاروں کا استعمال نہ کرے بلکہ عدم تشدد کی بنیاد پر ہٹلر کا مقابلہ کرے۔ نیز یہ کہ اس کا نتیجہ چاہے یہ نکلے کہ ہٹلر انگلستان پر قبضہ کر لے تب بھی برطانیہ جرمنی کی اطاعت نہ قبول کرے بلکہ عدم تشدد ہی کی بنیاد پر اس سے عدم تعاون کرے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو جب گاندھی جی کا یہ خیال معلوم ہوا تو انھوں نے ایسا خط لکھے جانے سے اختلاف کیا اور گاندھی جی سے کہا کہ اس موقع پر اس قسم کا خط بھیجنے سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ گاندھی جی دو دن تک خاموش رہے۔ پھر انھوں نے مولانا آزاد سے کہا کہ کچھ بھی ہو میں خیالات کا اظہار ضرور کر دوں گا۔ اور اس کے بعد انھوں نے وائسرائے کو اس قسم کا خط بھیج بھی دیا۔ اس دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں گاندھی جی نے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ اگر حکومتِ برطانیہ اس شرط کے ساتھ ہندوستان کو آزادی دینا چاہے کہ آزاد ہو جانے کے بعد لڑائی میں شریک ہو جائے گا تو میں آزادی کی پیش کش نامنظور کر دوں گا۔ سیاسیات کے علاوہ مذہب، سماجی اصلاح، تعلیم، ملکی اقتصادیات، غرض کہ زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں گاندھی جی کے کچھ نظریات تھے اور وہ آزاد ہندوستان کو انھیں نظریات کا حامل اور پیرو دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے خوابوں کا ہندوستان یہ تھا کہ اس میں غریب سے غریب آدمی کو بھی یہ احساس ہو کہ یہ اس کا ملک ہے جس میں اس کی آواز کا اثر ہے۔ وہ ایک ایسا ہندوستان دیکھنا چاہتے تھے جس میں اونچ نیچ کا کوئی طبقہ نہ ہو اور جس میں ہر فرقہ کامل اتحاد اور یک جہتی کے ساتھ رہ سکے۔ اس ہندوستان میں وہ نہ چھوت چھات کی لعنت گوارا کر سکتے تھے اور نہ کسی قسم کی نشہ بازی۔ اس ہندوستان میں وہ عورتوں کے وہی حقوق دیکھنا چاہتے تھے جو مردوں کو حاصل ہوں۔ گاندھی جی صرف اپنے وطن ہی کے بہی خواہ نہ تھے بلکہ وہ ساری دنیا کے خیر خواہ تھے۔ وہ ہندوستان کی آزادی اس غرض سے چاہتے تھے کہ دنیا کے دوسرے ملک اس کی اچھی باتوں سے سبق لیں اور اس کے وسائل سے دوسرے ملکوں کو فائدہ پہنچے۔ ہم اکتوبر کی دوسری تاریخ ہر سال گاندھی جینتی مناتے ہیں اور گاندھی جی کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا خراجِ عقیدت یہی ہے کہ ہم گاندھی جی کی تعلیمات کو سمجھیں، ان کی زندگی سے سبق لیں اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔ —— ایڈیٹر

آشون ۱۸۸۴ اکتوبر ۱۹۶۲ء

سفر ہمسفر

شمیم کرہانی

میں زندگی کا حقیقت شناس راہی ہوں
مجھے حیات کی دشواریوں سے کب انکار
مگر میں زیست کا تاریک رُخ ہی کیوں دیکھوں
مری نگاہ کو ملتے ہیں صبح کے آثار

مرے قدم، مرے قدموں کے ساتھ اور قدم
انھیں اجاڑسی راہوں میں آکے ملتے ہیں
یہ تجربہ ہے کہ انجان رہ گزاروں میں
یگانگی کے نئے لالہ زار کھلتے ہیں

مجھے قبول کہ ماحول کے اندھیرے کو
سحر کا نور سمجھنا فریب کاری ہے
مگر مرے دلِ بیمار سے کوئی پوچھے
کہ بے اُمید جیسے ایک رات بھاری ہے

صنم کدوں کے یہ پیکر، یہ مسجدوں کے جسد
ہماری آنکھ سے ہیں روح کو چھپائے ہوئے
نگاہ، جلوۂ وحدت کے انتظار میں ہے
انھیں اُٹھاؤ کہ پردے یہیں گرائے ہوئے

ہر ایک گوشۂ ہستی میں آرزو کے کنول
ہوا میں کانپ رہے ہیں کہ بجھ نہ جائیں کہیں
مگر ہواؤں کی طاقت بھی سہمی سہمی ہے
کہ بجھ سکیں گے نہ افکار کے چراغ حسیں

ہماری راہ، جنون و خرد کا سنگم ہے
جہاں پیامِ اجنتا و تاج ملتا ہے
ہر ایک نقش، ہر اک نقش کے تبسّم میں
تمدّنوں کا حسیں امتزاج ملتا ہے

پڑے ہیں راہ میں تہذیب کے کھنڈر لاکھوں
ملے ہیں مجھ کو جہاں دانشِ کہن کے ایاغ
انھیں قدیم ایاغوں سے آج روشن ہے
مرے دماغ کا فانوس، میرے دل کا چراغ

حیاتِ اہلِ جنوں شادکام رہتی ہے
رواج و رسم آزاد آسماں کے تلے
دیے کو اپنی ضیا پاشیوں سے مطلب ہے
وہ مسجدوں میں جلے یا صنم کدوں میں جلے

اسی اُداس ڈگر کے ہر ایک ذرّے سے
تضادِ رنگ و رسوم و صفات کے ہوتے
وفا کے دشت میں، دل کے اُجاڑ صحرا میں
ملے ہیں مجھ کو ہم آہنگِ زیست کے سوتے

مزاجِ صرصرِ بے باک خود ہے تشنہ پسند
کہ جل کے آگ کے شعلے بڑھاتی رہتی ہے
گلوں کی بزم کو کرتی ہے انتشار آگیں
تو بے گناہ دیوں کو بجھاتی رہتی ہے

اکتوبر ۱۹۶۲ء

آشون ۱۸۸۴

پھر اب قدم مرے کیوں جستجو کی راہ میں ہیں
ملے گا کیا مجھے حسرت کی رہ گزاروں میں
مجھے تو ذہن کی تاریکیوں میں کھونا ہے
مرا مزار بھی ہوگا، انھیں مزاروں میں

مگر اُمید کے دامن کو چھوڑ دوں کیوں کر
کہ آرزو ہے تو جینے کے ہیں سہارے بھی
اُمنڈ رہے سیاہی کے تہہ بہ تہہ بادل
انھیں تہوں سے مگر جھانکتے ہیں تارے بھی

چلو زمیں سے ستاروں کی رہ گزر کو چلیں
ملے جو راہ میں زنجیر توڑ دیں اُس کو
یہ کارواں، یہ سفر تو خوشی کا سودا ہے
جو ہم سفر کوئی جھجکے تو چھوڑ دیں اُس کو

کہ اُس کی عمر کٹی ہے کئی اندھیروں میں
فضائے جہل، ہوائے نشاط، قید فرنگ
یہ سب ہیں رحم کے قابل انھیں معاف کرو
ہمیں تو ان سے نہیں ان کی ذہنیت سے ہی جنگ

اگر پرستشِ اجسام دخل و سنگ ہے زیست
اگر عبادتِ محراب و در ہے اصلِ حیات
تو عینِ ذات کو ہم رکھ دیں طاقِ نسیاں میں
جلا کے محفلِ ہستی میں رکھ دیں شمعِ صفات

ہر ایک ذرّے کو اک دیوتا کریں تسلیم
ہر اک مقام پہ تازہ حرم بنا ڈالیں
ہے نہ کوئی جگہ پھر کہیں خدا کے لیے
زمیں کو اتنے خداؤں سے ہم سجا ڈالیں

مگر مریض توہم کا یہ علاج نہیں
علاج یہ ہے کہ دانش کو نور بیز کریں
فروغ روح سے پرچھائیاں سرکتی ہیں
ہجومِ شب ہے، چراغِ یقیں کو تیز کریں

خزاں رسیدہ نظاروں میں رنگ و نور بھی ہے
نظر اُداس نہ ہو تو فضا اُداس نہیں
جہاں میں نورِ حقیقت ہے خود شناسی سے
جو خود شناس نہیں وہ خدا شناس نہیں

یہ رہ گزر، یہ مرے ہم سفر، یہ عہدِ سفر
تلاشِ خود میں نہ معبود کی تلاش میں ہیں
نجات و امن جہاں کا انھیں گماں بھی نہیں
یہ اپنی منزلِ مقصود کی تلاش میں ہیں

مگر یہ منزلِ مقصود مل نہیں سکتی
ملے گی جب کہ سبھی اس جہاں کے ساتھ چلیں
قدم ملا کے قدم سے، دلوں میں ڈال کے دل
خلوصِ عزم لیے، کارواں کے ساتھ چلیں



گاندھی جی

سلطانہ حیات

بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک بے تکلف نشست میں گاندھی جی کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ سبھی لوگ ان کے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک صاحب کا خیال تھا کہ باپو کا فلسفہ عام آدمی کی سمجھ سے بالاتر ہے اور ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں اور ان میں تضاد ہوتا ہے۔ اس پر مسٹر محمد یعقوب (مرادآبادی) مرحوم نے کہا: "نہیں، یہ واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ بات یہ ہے کہ لوگ ان کی سیدھی سادی باتوں کو مشکل معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ گاندھی جی جو بات کہتے ہیں، وہ بہت سیدھی اور صاف ہوتی ہے اور ان میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی ہے"۔

میں خاموشی کے ساتھ یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ مجھے یہ رائے اچھی معلوم ہوئی۔ اگلی بار جب باپو سے ملنا ہوا تو میں نے ان سے یعقوب حسن کی بات کا تذکرہ کیا۔ باپو اطمینان کی ہنسی ہنسے۔ ان کو کچھ حیرت بھی تھی اور کچھ خوشی بھی۔ حیرت غالباً اس بنا پر تھی کہ یعقوب صاحب سرکاری حلقے سے متعلق تھے جو باپو سے اس وقت بہت کافی بدگمان تھا اور اس کا کبھی کبھی اظہار بھی ہوتا رہتا تھا۔ خوشی اس بات سے ہوئی کہ سرکاری حلقے کے لوگ بھی ان کو اور ان کی باتوں کو سمجھنے لگے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ان کے طرزِ عمل اور بیانات میں کوئی سمجھ میں نہ آنے والی پیچیدگی نہیں ہوتی ہے۔ پھر اس موضوع پر کافی دیر تک مجھ سے اور باپو سے باتیں ہوتی رہیں۔

واقعہ بھی یہ ہے کہ اگر باپو کی تمام سیاسی تحریکوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو ان میں دو باتیں نمایاں ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے جو تحریک بھی پیش کی وہ بہت سیدھی سادی، صاف ستھری ہوتی تھی اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ تیر بہدف ثابت ہوئی۔

باپو دنیا کے ان چند "دیدہ ور" لوگوں میں سے تھے جن کی نگاہ حقیقت آشنا تھی اور جو زندگی کے تانے اور بانے کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ کسی قسم کا تعصب، تنگ نظری اور ذاتی توہمات ان کی نگاہ میں کبھی نہیں پیدا کر سکتے تھے۔ وہ اگر کبھی غلطی بھی کرتے تھے تو جلد ہی سنبھل جاتے تھے کیونکہ وہ خود اپنا جائزہ لیتے رہتے تھے اور اس طرح ان کی نظر اپنی غلطی تک پہنچ جاتی تھی۔

گاندھی جی نے حکومت برطانیہ جیسی عظیم طاقت کو اپنی انھیں سیدھی سادی باتوں اور تحریکوں سے اس طرح بے بس کر دیا کہ اس کو ہندوستان چھوڑنا ہی پڑا۔ ان تحریکوں کے طریقہ کار پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب گاندھی جی نے جنگ آزادی کی قیادت سنبھالی تو اس وقت کی ملکی حالت کا جائزہ لے لیا جائے۔

اگرچہ اس وقت تک ملک میں سیاسی تحریکیں مختلف انداز میں شروع ہو چکی تھیں اور ہندوستانیوں کے ایک طبقے میں اس کا احساس پیدا ہو گیا تھا کہ انھیں برطانیہ کی غلامی کا جوا اتارنا ہے، تاہم عوام اور خواص کے ایک بہت بڑے طبقے میں مغربی تہذیب کی بڑی وقعت تھی۔ وہ اپنی ملکی تہذیب کو بہ نظرِ حقارت دیکھتے تھے، یہاں تک کہ اپنے وطن

کے شاندار ماضی کو بھی ایک غیر مہذب دور سمجھتے تھے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ادب جس کو ہم آج فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں، ایک طبقہ لے فرسودہ اور حقیقت دور سمجھ کر ٹھکراتا تھا۔ اوّل تو انگریزی داں کا ایک طبقہ اس کو پڑھتا ہی نہ تھا اور اگر پڑھتا بھی تھا تو پڑھ کر شرماتا تھا اور میر و غالب کے مقابلہ میں کیٹس اور شیلے کی شاعری پر سر دھنتا تھا۔ طرزِ معاشرت اور وضع قطع کے لحاظ سے "صاحب بہادر" بن جانا "مہذب" ہونے کی علامت تھی۔ ہندوستان میں کچھ حلقے اور طبقے ایسے ضرور تھے جنھوں نے کبھی انفرادی اور کبھی منظم طریقے پر اس آندھی کا مقابلہ کیا اور اپنے پرانے تہذیبی اقدار کو مغربی طوفان سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ مثلاً دیوبند میں علماء ہند کے ایک تعلیمی ادارے کا قیام، اسی طرح سے اور بھی تحریکیں چلیں جن کا مقصد اپنے تہذیبی اثاثے کو غیر ملکی تہذیب کے نرغے سے بچانا اور محفوظ کرنا تھا۔ مگر ان تمام تحریکوں کو بڑے پیمانے پر اس لئے کامیابی حاصل نہ ہوسکی کہ وہ مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتے ہوئے زمانے کی رفتار کو بھی روکنا چاہتے تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس وقت زمانے کی مادی ترقی اور مغربی تہذیب مترادف باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ بہرحال ان کوششوں پر رجعت پسندی کا لیبل لگا کر نئی پود مغربی تہذیب کو تیزی کے ساتھ قبول کر رہی تھی۔

ایک اور چیز جو ہندوستان کو گھن کی طرح کھا رہی تھی وہ تھی گاؤں کی انفرادیت کا ختم ہو جانا۔ ہندوستان کی تاریخ میں گاؤں کی انفرادیت ہمیشہ قائم رہی۔ اس کی اپنی پنچایتیں ہوتی تھیں۔ گاؤں والے اپنی ضروریاتِ زندگی خود پیدا کر لیتے تھے۔ اور کہیں کہیں تو یہ پنچایتیں ہی لگان وصول کرکے حکومتِ وقت کو دیتی تھیں۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف حکومتیں قائم ہوتی رہیں اور مٹتی رہیں۔ یہ کبھی طاقتور بھی ہوئیں اور کبھی کمزور اور برائے نام بھی۔ مگر گاؤں اور کبھی چند گاؤں کا مجموعہ ہر حالت میں ایک مکمل یونٹ رہا۔ ہندوستان میں مختلف حملہ آور آتے رہے نئی نئی باتیں بھی ان کے ساتھ آتی رہیں لیکن ان لوگوں نے گاؤں کی اس انفرادیت کو ختم نہیں کیا۔ جو حملہ آور صرف لوٹنے کھسوٹنے آئے تھے وہ تو مال و متاع لیکر چلے گئے۔ انھیں گاؤں کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ لیکن جو لوگ یہاں بس گئے انھوں نے گاؤں کی انفرادیت کو ختم کرنا ملک کو

تباہ و برباد کرنے کے مترادف سمجھا۔ اسی لئے کوئی اور کسی کی بھی حکومت قائم ہوتی ہندوستان کی اصلی زندگی ان حکومتوں کے ردوبدل سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتی تھی لیکن انگریزوں کا طرزِ حکومت بالکل جدا تھا۔ انھوں نے ایک باقاعدہ حکومت خود قائم کی مگر ہندوستان کو کبھی گھر نہ سمجھا بلکہ ایک ایسی کان سمجھا جس سے سونا نکال نکال کر اپنے ملک کو بھیجا جائے۔ ملک کی حقیقی ترقی اور اس کے باشندوں کے مستقبل سے انھیں زیادہ سروکار نہ تھا۔ ملک پر اپنے اقتدار کو مستحکم بنانے کے لئے انھوں نے گاؤں پنچایتیں ختم کر دیں اور دیہاتوں میں خالص جاگیردارانہ نظام کی بنیاد ڈالی تاکہ زمیندار، تعلقدار، راجہ اور نواب حکومتِ برطانیہ کے قیام کے لئے ستون کا کام دیتے رہیں۔ کرگھے ختم کر دیے گئے، گھریلو صنعتوں سے غفلت برتی گئی اور ہندوستان جس کا ہر گاؤں اور قریہ اپنی ضرورت کی چیزیں خود پیدا کر لیتا تھا، برطانیہ کا محتاج ہو گیا۔ لنکا شائر کے کارخانوں کا کپڑا ہندوستان کا تن ڈھکنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں غربت بڑھتی جا رہی تھی۔

یہ تھا وہ پس منظر جب مہاتما گاندھی نے ہندوستان کے میدانِ سیاست میں قدم رکھا۔ ان کے سامنے اس وقت تین خاص کام تھے۔

(۱) ہندوستان کو انگریزوں کی ذہنی غلامی سے نجات دلانا۔

(۲) ہندوستان کو سیاسی غلامی سے آزاد کرانا۔

(۳) ہندوستانیوں میں ایک سائنٹفک اور حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر پیدا کرنا۔

یہ مسائل آج الگ الگ معلوم ہوتے ہیں مگر اس وقت نہ وہ اس قدر واضح تھے اور نہ عملی طور پر ان کو الگ الگ کیا جا سکتا تھا۔

اس زمانے میں ہندوستان کو آزاد کرانے کی دوسری کوششیں بھی برابر جاری تھیں۔ حکومت کو دہشت زدہ کرنے کے لئے بم بھی پھینکے گئے اور خفیہ تحریکیں بھی چلیں۔ مگر ان سب کے پس پشت تشدد کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں اب تک تشدد کے ذریعہ سے ہی آزادیاں حاصل کی جاتی رہی تھیں۔ لیکن اگر ہندوستان بھی اسی طریقے پر کاربند ہو جاتا تو دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا، طاقت سے طاقت ٹکراتی اور اس کے بعد بھی یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ حق دار اپنا حق پا ہی جاتا کیونکہ جس کے پاس طاقت ہوتی ہے اس کا ہی حق مانا جاتا ہے۔ ہندوستان کی تشدد پسندانہ تحریکوں کا بھی

بھی ختم ہوا۔ برطانیہ کی آہنی طاقت نے ایسی تمام تحریکوں کو دبا دیا تھا۔
مہاتما گاندھی نے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے عدم تشدد اور ستیہ گرہ کا راستہ اختیار کیا اور عملی پروگرام کے لئے چرخہ پیش کیا۔ چرخہ پر شروع شروع میں سب نے اعتراض کیا۔ سب سے زبردست اعتراض یہ تھا کہ مہاتما گاندھی رجعت پسند ہیں۔ مشین کے زمانے میں وہ صدیوں پرانے چرخے کو پھر سے رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مگر گاؤں کی کھوئی ہوئی خوشحالی واپس لانے کی اور کوئی سبیل نہیں تھی۔ چنانچہ جب ہندوستان کے گھر گھر میں چرخا چلنے لگا، بدیسی کپڑوں کی ہولی جلائی جانے لگی اور ہندوستانیوں کے بدن پر کھدر نظر آنے لگا تو لنکا شائر کے کارخانے بند ہونا شروع ہو گئے۔ فاقہ زدوں کو جن کے سامنے صرف موت تھی، دو روٹی کا سہارا مل گیا۔ چرخے کی اس تحریک نے جہاں انگریزوں کے سیاسی مدبر کو حیران و پریشان کر دیا وہاں ہندوستانیوں کو وہ بیش بہا خزانے نظر آنے لگے جو ابھی تک ان کی نظروں سے چھپے ہوئے تھے اور جنہیں وہ غیر ملکوں اور ان کے باشندوں کے دامن میں تلاش کر رہے تھے۔

چرخے کے اس خوشگوار ردعمل نے ہندوستانیوں کو اپنی طاقت، اتحاد اور تنظیم کی قوت کی نشان دہی کی۔ ہندوستانی دیکھ رہے تھے کہ چرخا چلانے سے حکومت برطانیہ کی بنیادیں متزلزل ہو رہی ہیں۔ ہندوستان کے بازاروں میں اب برطانیہ کے بنائے ہوئے کپڑوں کی مانگ گھٹ گئی تھی۔ اس کامیابی نے ہندوستانیوں کو یہ بھی احساس دلایا کہ ہم ہندوستانی اگر اسی طرح متحد رہے تو برطانیہ کی غلامی کا جوا اتار پھینکیں گے۔

باپو نے یہ کام چرخے سے لیا کہ دیسی کپڑے کو بدیسی کپڑوں کی جگہ دلا کر لاکھوں ہندوستانیوں کو فاقوں سے بچا لیا۔ تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ اس کی جگہ باپو اور دوسرے سربر آوردہ لیڈر مل کر کپڑے بنانے کے دس پانچ یا بیس پچیس مل قائم کر دیتے (حالانکہ یہ اس وقت قطعی ناممکن تھا)۔ لیکن ان کارخانوں کے قائم ہو جانے کے بعد اگر حکومت انہیں بند کر دینے پر آمادہ ہو جاتی تو وہ سینکڑوں طرح کے بہانے ڈھونڈ نکالتی اور ایسے قانون نافذ کر دیتی کہ ان کارخانوں کا چلانا مشکل ہو جاتا۔ لیکن لاکھوں چرخوں اور کرگھوں کو نہیں ختم کیا جا سکتا تھا جو ملک کے طول و عرض میں گاؤں گاؤں پھیل گئے تھے۔ دوسرے کارخانوں کے قیام سے ہندوستانیوں میں وہ احساس خود اعتمادی نہیں پیدا ہو سکتا تھا جو چرخے کی تحریک نے پیدا کر دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ چرخے اور کھادی کی تحریک نے ہمارے دلوں میں شعوری اور غیر شعوری طور سے قومیت کا احساس پیدا کر دیا۔ یہ تحریک شروع شروع میں کوئی بڑی چیز نہیں معلوم ہوتی تھی۔ بلکہ ایک معمولی سی بات نظر آتی تھی۔ حکومت نے بھی اس کو اسی نظر سے دیکھا کہ لوگ خود چرخا چلا کر اپنے کرگھوں پر اسی سوت سے کپڑا بن لیتے ہیں اور خود ہی پہن لیتے ہیں تو اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے اور اس فعل کو غیر قانونی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے! ایسی صورت حال میں جابر سے جابر حکومت بھی اپنے آپ کو بے بس ہی پاتی۔ چرخے کے استعمال کے ساتھ بدیسی مال کا بھی بائیکاٹ شروع ہوا اور حکومت نے محسوس کیا کہ اب ہندوستان کے بازار بھی برطانیہ کے ہاتھ سے نکلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ عدم تعاون اور سول نافرمانی کرنے والوں اور بدیشی دوکانوں پر دھرنا دینے والوں کو جیلوں میں بھرنے لگی مگر اس کے بعد بھی حکومت اور عوام دونوں نے یکساں طور پر محسوس کیا کہ یہ سب چرخے اور کرگھے کا جواب نہیں ہے۔

قانون شکنی

دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالئے۔ کسی ملک کی غلامی کا جوا اتار پھینکنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ جن ملکوں نے زمانہ ماضی یا زمانہ حال میں آزادی حاصل کی ہے ان کو خون ضرور بہانا پڑا ہے۔ مگر گاندھی جی نے آزادی کی جو لڑائی جیتی اس کا ایک اور حربہ عدم تشدد پر مبنی قانون شکنی تھی۔

ہندوستانی قانون شکنی کی تحریک، گاندھی جی کے سیاسی مدبر کی لاثانی مثال ہے۔ دوسرے ممالک میں توپ اور بندوق چلا کر اور گولہ بارود بنا کر قانون شکنی کی جاتی ہے مگر باپو نے نمک بنا کر پوری دولت برطانیہ کا دبدبہ ختم کر دیا۔

ہندوستان کے گاؤں گاؤں اور شہروں شہروں میں پولیس کو اور کلکٹر کو اطلاع دینے کے بعد ایک ایک تولہ نمک بنایا گیا اور بیچا گیا۔ انگریزوں نے ایسا نمک بنانے والوں اور بیچنے والوں پر گولیاں بھی چلائیں اور گرفتاریاں بھی کیں۔ لیکن ایک چھٹانک نمک کی پڑیا ہاتھوں میں دبائے اگر کوئی ہندوستانی انگریزوں کی گولی کھا کر مر گیا تو مارنے والے بھی شرما گئے۔ چٹکی بھر نمک بنانے پر اگر سزا دے دی گئی تو سزا دینے

والا خود بھی شرما گیا!

انفرادی ستیہ گرہ

دوسری عالمگیر لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ وائسرائے کی جانب سے مختلف اعلان ہوئے۔ ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی اندولن چلایا گیا تو ستیہ گرہ کرنے والے نہتوں پر بھی گولیوں کی بارش کر دی جائے گی۔ مگر باپو نے انفرادی ستیہ گرہ کا نعرہ دیا۔ خاموشی کے ساتھ ایک ایک شخص حکومت کے اراکین کو بتا کر خط لکھ کر اپنے آپ کو ستیہ گرہ کے لئے پیش کرتا رہا۔ برطانیہ کی وہ بندوقیں جن میں اندھا دھند گولیاں برسانے کے لئے کارتوس بھرے جا چکے تھے، ایک ایک آدمی کو دیکھ کر سیل گئیں۔ ایک ستیہ گرہی کو کوئی کیا مارے؟ اگر مارے بھی تو کیا ہاتھ آئے گا؟ ہندوستان کے جیل خانے بھر گئے، حکومت پریشان ہو گئی۔

ستیہ گرہ کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں اور اسی پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب اسکے بنیادی اور سیدھے سادے اصول دیکھئے۔ ستیہ گرہ کرنے کی شرط اول یہ ہے کہ جو لوگ کسی مسئلے کا حل ستیہ گرہ کی مدد سے حاصل کرنا چاہتے ہوں وہ اپنے دل میں سو فی صدی مطمئن ہوں کہ وہ حق پر ہیں اور انھوں نے اس مسئلے کو اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے۔

ستیہ گرہ کرنے والوں کو اس بات کا بھی خیال کرنا ضروری ہے کہ ان کے مخالفین کے پاس کوئی معقول دلیل ایسی نہ رہے جس میں حق کا کچھ حصہ ان کو بھی مل جائے یا دوسرے لفظوں میں ان کے پاس بھی اپنے عمل کا کوئی جواز ہو۔ باپو اس معاملے میں بہت محتاط تھے اور کبھی وہ ایسی چیز کے لئے ستیہ گرہ نہیں کرتے تھے جس کے بنیادی اصول میں کسی کی دو رائیں ہو سکتی ہوں۔

ستیہ گرہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ مخالفین کو گفتگو و شنید سے راضی کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کی ہر دلیل کا معقول اور سوچ بچار کے بعد جواب دیا جائے۔ یہ گفتگو بالکل صاف صاف اور پورے ملک کے سامنے ہو تاکہ واقعات کی مکمل تصویر زیادہ سے زیادہ لوگوں کے سامنے آ جائے۔ اس مسئلے کو عوام کے سامنے اس طرح سے پیش کیا جائے کہ عوام خود حق اور ناحق کی تمیز کر سکیں اور یہ سب محسوس کریں کہ حق ستیہ گرہ کرنے والوں کے ساتھ ہے اور مخالفین صرف ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں۔ ستیہ گرہی اسی صورت میں عملی قدم اٹھائے۔

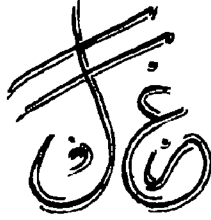
اس عملی قدم کی مختلف شکلیں ضرورت اور موقع کے لحاظ سے ہو سکتی ہیں مگر جو قدم بھی اٹھایا جائے اس کی شرط یہ ہے کہ وہ عدم تشدد پر مبنی ہو کیونکہ مخالفین پر اسی طرح عملی دباؤ پڑ سکتا ہے۔ مخالفین کا ضمیر بھی ستیہ گرہ کرنے والوں کا اسی طرح ساتھی بن سکتا ہے۔ قصہ مختصر ستیہ گرہ کرنے والوں کے ہر قدم اور حرکت کی چوٹ مخالفین کے ضمیر پر پڑے۔ کیوں کہ ستیہ گرہ کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ ظلم کرنے والوں کا دل بدل دے اور وہ اپنے ظلم سے خود باز آ جائیں یا حالات ایسے بنا دیے جائیں کہ زیادتی کرنے والوں کو اپنی خیر و عافیت اسی میں نظر آئے کہ وہ ظلم سے دست کش ہو جائیں۔

ستیہ گرہ کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول یہ ہے کہ ستیہ گرہ محبت، شفقت اور نرمی کے ساتھ کی جائے اسکے برخلاف اس میں اگر نفرت، جلن اور کڑھن آ جائے گی تو ستیہ گرہ کرنے والوں کا اصلی نشانہ یعنی مخالفین کا ضمیر غصہ اور انتقام کی اوٹ میں چھپ جائے گا۔ اس مسئلہ کو ذرا اور واضح کر لیں۔ بات یہ ہے کہ اگر ستیہ گرہی کی کسی حرکت پر مخالف کو اتنا غصہ آ جائے کہ اس میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھے تو پھر وہ ستیہ گرہی پر جوابی حملہ کرے گا، اور اس حملے میں وہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھنے لگے گا اور اس طرح ستیہ گرہ کرنے والے اپنی بازی ہار جائیں گے۔

عدم تشدد کے صرف یہی معنی نہیں ہیں کہ آپ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے لڑائی جھگڑا نہ کیجئے بلکہ اس اصطلاح میں یہ بھی شامل سمجھئے کہ دوسروں کی مار کھائیے، زیادتی برداشت کیجئے یا گولی سے اڑا دیے جائیے مگر آپ الٹ کر جوابی حملہ نہ کیجئے۔ سب زیادتیاں خندہ پیشانی سے برداشت کیجئے مگر اپنی بات پر جمے رہیئے۔ عدم تشدد کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ اس پر عمل کرنے والے کے پاس شیر کا سا دل ہو جبھی وہ اتنا سخت کام کر سکتا ہے۔

کوئی سوچ سکتا تھا کہ باپو کی چرخا چلانے، انگریزوں سے عدم تعاون کرنے، نمک بنا کر قانون شکنی کرنے کی جیسی سیدھی سادی تحریکیں حکومت برطانیہ کی بنیادیں ہلا دینے کے لئے کافی ہیں





جوش ملسیانی

صبر سے اب تو گزارا ہو گا ۔۔۔ چارہ سازوں سے نہ چارا ہو گا
تو بھی دشمن ہے تو اے دردِ نہاں ۔۔۔ کون ہمدرد ہمارا ہو گا
دل ہے کیوں جنسِ وفا کا گاہک ۔۔۔ جانتا ہے کہ خسارا ہو گا
جس کی آہوں سے پریشاں ہو تم ۔۔۔ کوئی تقدیر کا مارا ہو گا
مے کدے میں بھی ہے ناصح موجود ۔۔۔ اب یہاں بھی نہ گزارا ہو گا
غم کو انعام سمجھنے والو! ۔۔۔ زہر کب تک یہ گوارا ہو گا
عشق میں موت تو آتی ہی نہ تھی ۔۔۔ تم نے بے موت ہی مارا ہو گا
کل جسے ڈوبتے دیکھا تم نے ۔۔۔ میری قسمت کا ستارا ہو گا
زندگی نعمتِ عظمیٰ ہی سہی ۔۔۔ موت پر کس کا اجارا ہو گا

کوئی آفت نہ ٹلے گی اے جوشؔ
جب تک اُن کا نہ اشارا ہو گا



زبان میں تلفظ اور لہجے کی اہمیت

عتیق احمد صدیقی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آواز کی اثر انگیزی کا تعلق محض اس کی ہلکی بھاری، نرم، تیز وغیرہ صفات سے ہے۔ آواز کے اس تنوع کا تعلق چونکہ جسمانی ساخت سے ہوتا ہے، اس لئے کرخت آواز کو ملائم اور خوشگوار بنانے کے لئے مختلف ترکیبوں کا استعمال تجویز کیا جاتا ہے جن کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اعصاب میں لوچ پیدا کیا جائے اور ان کی ساخت میں اگر کوئی ناہمواری ہے تو اس کو دور کیا جائے۔ مثلاً بعض اوقات مشورہ دیا جاتا ہے کہ زیادہ زور سے نہ بولو، دھیمے بولنے کی کوشش کرو، بولنے کی رفتار کو کم کرو وغیرہ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ زور سے بولنے یا آہستہ بولنے سے آواز کی اثر انگیزی میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوتا۔ ہاں جمالیاتی احساس کے نقطۂ نظر سے ہلکی آواز بھاری آواز کے مقابلے میں زیادہ پرکشش ہو سکتی ہے۔ مگر جسمانی ساخت میں تبدیلی آسان نہیں۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ گفتار کی اثر پذیری میں محض ذہن و حلق کو دخل ہے یعنی یہ تمام تر حلق سے متعلق ہے۔ لیکن حقیقت صرف اس قدر نہیں، اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔

ایک رہنما، ایک استاد، ایک مقرر، ایک تاجر، یہاں تک کہ ایک معمولی آدمی کے لئے بھی آواز کی اثر انگیزی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جب اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہ کی جا سکے کہ گفتار کا تاثر ہماری بات میں ایک وزن پیدا کر دیتا ہے۔ اثر انگیزی کے لئے گفتگو کا برمحل ہونا، جملوں کی ساخت، لفظوں کی ترتیب اور ان کا انتخاب یقیناً اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ اتنی ہی اہم ہے کہ جو الفاظ ہم بول رہے ہیں، ان کی ادائگی کا کیا انداز ہے۔ الفاظ کی ادائگی میں ہم نے ان کی صحت کا کہاں تک خیال رکھا ہے۔ ہمارا لہجہ کہاں تک ہمارے دلی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ اپنے پرخلوص جذبات کو ہم نے کس حد تک الفاظ کے پیکر میں ڈھالا ہے۔

الفاظ کے انتخاب کا معاملہ تو محض تعلیم یافتہ افراد تک محدود ہو سکتا ہے۔ ان کے پاس الفاظ و لغات کا ایک وافر ذخیرہ ہوتا ہے اور اظہار مدعا کے لئے الفاظ کے انتخاب کی گنجائش ہوتی ہے۔ لیکن عوام الناس کا ذخیرۂ الفاظ اتنا زیادہ نہیں ہوتا۔ ان کے پاس اس سے زیادہ الفاظ نہیں ہوتے کہ وہ اپنے سیدھے سادے خیالات کو سیدھے سادے انداز میں پیش کر سکیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر شخص اپنی مادری زبان کے اتنے الفاظ ضرور جانتا ہے کہ وہ ضروریات زندگی اور بنیادی محسوسات کے اظہار پر قادر ہو سکے۔ مگر گفتگو میں الفاظ کی تعداد سے زیادہ تلفظ کی صحت اہم ہوتی ہے۔ یہاں تلفظ سے مراد تلفظ کا وہ روایتی تصور نہیں، جس کا جھگڑا تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان رہتا ہے یا جس کی بنیاد پر زبان معیاری اور غیر معیاری کے درجات میں تقسیم کی جاتی ہے، بلکہ یہاں تلفظ کا صرف وہ پہلو مراد ہے، جس کا تعلق صوتی نظام سے ہے۔

عام بول چال میں ہمیں تلفظ کی صحت کا احساس ہو یا نہ ہو، لیکن اگلے وقتوں کے لوگ اس سے غافل نہ تھے۔ مقدس صحیفوں اور مذہبی کتابوں کے بارے میں تلفظ کی صحت پر جو زور دیا گیا، وہ خود زبان سے متعلق علوم کی ترویج کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ویدک زبان کو صحت کے ساتھ پڑھنے کے لئے پانینی نے جو اصول مرتب کئے وہ عصر حاضر کے ترقی یافتہ علم صوتیات میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ قرآن کی تلاوت کے لئے عربی اور غیر عربی علما نے تجوید و ترتیل کے اصول مرتب کئے۔ ان سب اصولوں کی ترتیب و تدوین میں بنیادی نقطۂ نظر یہی رہا کہ تلفظ میں غلطی نہ ہو۔ تلفظ کے غلط ہونے سے نہ صرف یہ کہ مطلب خبط ہونے کا امکان تھا، بلکہ ان صحیفوں کی زبان بھی متاثر ہو سکتی تھی۔ زبان کا تعلق چونکہ سماعت سے بھی ہے اس لئے ان بزرگوں نے نہ صرف اصول قرات مرتب کئے، بلکہ استادی اور شاگردی کا وہ سلسلہ بھی قائم کیا جس میں شاگرد استاد سے صحیح لہجہ بھی سیکھتا ہے۔ صحیح تلفظ اور صحیح لہجے کے ساتھ خواندگی سے جو اثر مرتب ہوتا ہے، اس سے کون واقف نہیں۔

غرض زبان میں تلفظ اور لہجے کی بنیادی اہمیت ہے۔ ان سے متعلق

مزید بحث کرنے سے پہلے ان کی نوعیت پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

اتنی بات سبھی جانتے ہیں کہ زبان الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے۔ الفاظ کی ترکیب و ترتیب حروف سے ہوتی ہے یعنی زبان کی بنیادی اکائی حروف (موجودہ علمی اصطلاح میں "صوتیے") ہوئے۔ اس لئے زبان کی صحت کا دارومدار اصوات کی صحیح ادائگی پر ہوا۔ غیر زبان کے تلفظ میں ہر شخص کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ ہمارے لئے کچھ نئی نہیں۔ ہر زبان کے تلفظ کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے جسے خود اہل زبان ہی صحیح طور پر استعمال کرسکتے ہیں۔ یہ ناممکن تو نہیں کہ کوئی شخص مشق و مزاولت سے غیر زبان کے تلفظ پر اہل زبان کی سی قدرت حاصل کرلے، مگر یہ مشق صبر آزما ضرور ہوگی۔

اصوات کی صحیح ادائگی کا دارومدار ان کے مخرج کی صحت پر ہوتا ہے۔ زبان کے نفسیاتی پہلو سے قطع نظر، قدرت نے جو اعضائے مخارج ہمیں دیئے ہیں وہ ہمارے منہ میں واقع ہیں۔ یعنی ہونٹوں سے لے کر حلق تک جس میں ہونٹ، دانت، زبان، تالو وغیرہ، منہ کا خلا اور ناک کی طرف جانے والا راستہ شامل ہیں جسم کے اسی حصے میں ہوا کی آمد و رفت کو مختلف طریقوں سے متاثر کرکے آوازیں پیدا کی جاتی ہیں۔ کہیں دو اعضائے مخارج کے درمیان انقباض کے طور پر ہوا میں رگڑ پیدا کی جاتی ہے، کہیں ہوا کی گزرگاہ میں اس طرح کی رکاوٹ پیدا کی جاتی ہے کہ منہ کے کسی لچک دار حصے یعنی زبان کے اگلے حصے میں، ارتعاشی کیفیت پیدا ہوجائے۔ کہیں محض زبان کی حرکت اور ہونٹوں کی شکل میں تبدیلی کرکے آوازوں کو ادا کیا جاتا ہے یعنی کوئی رکاوٹ یا انقباض یا ارتعاش کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ پھر بعض آوازوں کی ادائیگی کے لئے ہمیں باہر آنے والی ہوا کو ناک کے راستے سے بھی گزارنا ہوتا ہے۔

اوپر مذکور ہوا ہے کہ ہر زبان کا تلفظ اہل زبان ہی صحیح طور پر ادا کرسکتے ہیں۔ لیکن غیر زبان والوں کو چھوڑ دیجئے۔ خود اہل زبان بھی کبھی اپنی بے توجہی کے باعث حروف (اصوات) کی صحیح ادائگی کا خیال نہیں رکھتے۔ یا کسی قدرتی نقص کے باعث آواز کے صحیح تلفظ پر قادر نہیں ہوتے۔ اردو سے متعلق ذیل میں اشارۃً ایسی کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

ر کی آواز میں باہر آنے والی ہوا کو زبان سے اس طرح روکا جاتا ہے کہ زبان کی نوک مرتعش ہوجاتی ہے۔ اس ارتعاشی حالت میں زبان کی نوک مسوڑھے کے اندرونی حصے کو ایک بار چھوتی ہے لیکن بعض لوگ زبان کے درمیانی حصے اور تالو کے ابتدائی حصے کے درمیان ہوا کے انقباض سے یہ آواز پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح ر کی آواز غ کی آواز کے مشابہ ہوجاتی ہے۔ مثلاً "گھر" کا تلفظ کچھ اس طرح ہو کہ "گھغ" سے ملتی جلتی آواز سنائی دے۔ یہ تو لغزش مخرج کی ایک انتہائی شکل تھی لیکن اسی آواز کے ادا کرتے وقت ارتعاشی کیفیت میں ذرا سی کمی اس آواز ر کو دوسروں کے لئے مشکل فہم بنا سکتی ہے۔ خود راقم الحروف کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے۔

اگر بندشی آوازوں (وہ آوازیں جن کی ادائگی میں ہوا کو کسی مقام پر روکنا پڑتا ہے مثلاً ب، پ، ت، ک وغیرہ کے تلفظ) کی ادائگی میں ہوا پوری طرح بند نہ کی جائے، تو حرف کی صحت مشتبہ ہوسکتی ہے۔ مثلاً "پھل" یا "پھول" کی پھ کی ادائیگی اس طرح کی جائے کہ وہ ف کی شکل تو اختیار نہ کرے، مگر ف کے مشابہ ضرور ہوجائے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے کہ دونوں لب ہوا کو پوری طرح روکیں۔ آپ بعض لوگوں کو گفتگو کرتے وقت ہونٹ ملاتا ہوا نہیں دیکھیں گے جس سے ان کا ب اور پ کا تلفظ عجیب انداز اختیار کرلیتا ہے۔ ب کی آواز و کے مشابہ ہوجاتی ہے۔

تلفظ کی انتہائی مکروہ شکل وہ ہوتی ہے جب صفیری آوازوں (وہ آوازیں جو دو اعضائے مخارج کے درمیان ہوا کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہیں، مثلاً خ، ز، ف وغیرہ) کو بندشی آوازوں میں تبدیل کردیا جاتا ہے۔ تلفظ کی ان تمام ترغلط کاریوں کے باوجود گفتگو قابل فہم ہوسکتی ہے، لیکن اس کی اثر پذیری معدوم ہوکر رہ جائے گی۔

بعض اوقات جب حلق اور دہن خشک ہو رہے ہوں اور پیاس کی شدت محسوس ہو رہی ہو تو ہم الفاظ کی ادائگی میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ خشکی کی حالت میں اعضائے مخارج نہ ایک دوسرے کے ساتھ مکمل اتصال پیدا کرسکتے ہیں کہ ہوا بالکل رک جائے اور نہ ایک دوسرے کے قریب آکر وہ رگڑ پیدا کرسکتے ہیں جو صفیری آوازوں کے لئے درکار ہوتی ہے۔ اور نہ ارتعاشی کیفیت ہی عمدگی کے ساتھ پیدا کی جاسکتی ہے۔ طبی نقطۂ نظر سے لعاب دہن کی

جو کچھ بھی اہمیت ہو لیکن لسانی اعتبار سے آوازوں کی تشکیل میں اس کا بڑا اہم حصہ ہے۔ مشین میں تیل نہ ہو تو وہ معمول کے مطابق کام نہ کر سکے گی، چناں چہ لعاب دہن کی عدم موجودگی یا کمی بھی اعضائے مخارج کے فعل کو متاثر کر دیتی ہے۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ آوازوں کی تشکیل میں اس امر کو بھی اہمیت حاصل ہے کہ باہر آنے والی ہوا منہ سے ہو کر گزرتی ہے یا ناک سے۔ ہوا جب ناک سے گزرتی ہے تو انفی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ یوں تو تقریباً کل آوازوں کو انفی بنایا جا سکتا ہے، لیکن انفی آوازیں صرف دو ہیں — م اور ن۔ اس کا تجربہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ ناک کو بند کر کے م اور ن کی آوازیں پیدا نہیں کی جا سکتیں۔ یہ اس لئے کہ ان آوازوں کی ادائگی میں حلق کے راستے پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا کو ناک کے راستے (NASAL COVITY) سے ہو کر گزرنا ہوتا ہے۔ باقی سب آوازوں کے لئے ہوا کا راستہ منہ سے گزرتا ہے۔ اب اگر بے توجہی کے باعث ہم دہنی آوازوں کو انفی رنگ دے دیں تو یہ تلفظ کی لطافت پر بار ہوگا۔ یہاں یہ صورت پیش آتی ہے کہ منہ سے گزرنے والی ہوا کا کچھ حصہ ناک سے ہو کر گزرتا ہے جس سے آوازوں میں نون غنہ کی مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض لوگوں کو "جگہ" کا تلفظ اس طرح کرتے سنا گیا ہے گویا ج کے بعد ن کی آواز بھی شامل ہے، یعنی جنگہ، یا چاول کے بجائے چانول، آٹا کے بجائے آنٹا وغیرہ۔ حالانکہ یہاں "نون غنہ" کا ہلکا سا اظہار کیا جاتا ہے، مگر یہ ثقالت کا باعث بن جاتا ہے۔ بچپن سے اس قسم کی بے توجہی کا شکار ہو کر بعض لوگ "گنگنے" ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کوئی قدرتی نقص ہے، لیکن عام حالتوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اکثر و بیشتر یہ محض تلفظ کی عادت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر اعضا کی ساخت ہی میں کوئی نقص واقع نہیں ہے (جیسا کہ عام طور پر نہیں ہوتا) تو تھوڑی سی مشق کے ذریعے اس سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ علاج معالجہ کے سلسلے میں "علاج گویائی" (SPEECH THERAPY) کو ایک مستقل حیثیت حاصل ہے۔ اس علاج میں اسی قسم کے نقائص کا علاج تلفظ کی صحیح مشقوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

یہاں تک جن امور کا ذکر ہوا، ان کا تعلق اصوات کے اس پہلو سے ہے، جو مفرد آوازوں سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن جب آوازیں مرکب طور پر لفظوں کی شکل میں، اور پھر لفظوں کی ترکیب جملوں کے پیرایے میں ظاہر ہوتی ہے، تو آوازوں کا در و بست اپنے اندر کچھ اور نئے پہلو پیدا کر لیتا ہے یہ لفظوں سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں اور جملوں سے بھی۔ آواز کے زیر و بم سے آواز کے دباؤ کی کمی اور زیادتی سے بعض زبانیں الفاظ کے معنی بدل دینے کی خصوصیت رکھتی ہیں۔ چینی اور جاپانی زبانوں میں ایک لفظ محض آواز کے اتار چڑھاؤ (TONE) کی تبدیلی سے تین تین اور چار چار مختلف النوع معنی اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً چینی زبان میں محض (TONE) کی تبدیلی سے ایک ہی لفظ (MA) کے معنی بہ یک وقت "ماں"، "پٹ سن" "گھوڑا" اور "زجر و توبیخ کرنا" ہو جاتے ہیں۔ انگریزی میں آواز کا دباؤ (STRESS) خاص اہمیت رکھتا ہے، اور کسی حد تک معنی کو متاثر کرتا ہے۔ اردو میں آواز کے اتار چڑھاؤ اور دباؤ سے اس قسم کی تبدیلیاں کم ہی پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً ذیل کے دو جملوں میں لفظ "یہ" کے معنی کا فرق ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ یہ میری کتاب ہے۔

۲۔ بازار میں یہ بڑے بڑے آم بک رہے ہیں۔

مگر جملوں کی ادائگی میں آواز کا لہجہ[1] (INTONATION) بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ خصوصیت شاید دنیا بھر کی زبانوں میں قدر مشترک کے طور پر موجود ہے۔ لہجے کے بارے میں آئی سی۔ وارڈ نے لکھا ہے کہ اگر طلبا یہ بات جان لیں کہ گفتار میں صحیح ترنم بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ تلفظ کی صحت، تو وہ زبان کی اس اہم خصوصیت کی طرف زیادہ توجہ دیں گے اور اس کے حصول میں زیادہ وقت اور توانائی صرف کریں گے۔ ریچ۔ ای پامر کا خیال ہے کہ اصوات اور لہجہ ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ایک کو نظر انداز کر کے دوسرے کو سیکھنا مہمل سی بات ہے۔ یہ خیال انگریزی زبان سے متعلق ہیں۔ لیکن اور کسی بھی زبان کے بارے میں ان کی صحت مشتبہ نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر لی کے الفاظ میں "لہجہ زندہ زبان کا ایک جز ہے، جسے ہم گفتگو کے لئے سیکھنا چاہتے ہیں اور

[1] ڈاکٹر گیان چند جین (INTONATION) کے لئے "سر لہر" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ "لہجہ" کے مقابلے میں نامانوس سا ہے۔

ہمیں اس کے استعمال پر قادر ہونا چاہیئے"۔ اردو بلاشبہ ایک زندہ زبان ہے اور لہجے کی اہمیت سے یہاں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

لہجہ کی اہمیت اور افادیت ذیل میں ایک جملے کے تجزیے سے واضح ہو جائے گی۔ ایک معمولی سا جملہ لیجئے :۔ "میں اس وقت چاء پینا چاہتا ہوں"۔ اس جملے کو روانی کے ساتھ پڑھ کر یا بول کر اس سے وہ سادہ ترین مفہوم اخذ ہوگا، جو لغوی اعتبار سے اس کے الفاظ ترکیبی میں شامل ہے۔ لیکن اس میں یقیناً کچھ اور معنی بھی ہو سکتے ہیں، جو ماوراء الفاظ ہیں، جن کی ادائیگی میں الفاظ کی تبدیلی کی ضرورت نہیں بلکہ محض آواز کا لہجہ ان کا اظہار کر سکتا ہے۔ کسی مفہوم کے اظہار کا یہ انداز مفرد الفاظ میں اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ محض جملوں میں ہی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آواز کے اتار چڑھاؤ کو اگر خطوط اور ہندسوں کے ذریعے ظاہر کیا جائے تو مندرجہ بالا جملے کو ادائگی کے اعتبار سے مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس تقسیم کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ بولنے والا مفہوم کے بہت سے پہلوؤں میں سے کس کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور سامع کو کیا تاثر دینا چاہتا ہے۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ آواز کے لہجے کی تبدیلی سے مفہوم میں کیا تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے ہم یہاں آواز اور لہجے کے محض دو درجات مقرر کر لیتے ہیں۔ ایک پست لہجہ عمومی اظہار بیان کے لئے، اور دوسرا بلند لہجہ خصوصیت کے ساتھ کسی لفظ پر زور دینے کے لئے۔ ہندسوں میں ان کو ۱ اور ۲ سے ظاہر کیا جائے گا۔ سابقہ سپاٹ روانی کے ساتھ بولنے کے بجائے جملے کو لہجہ ۱ اور ۲ کے امتزاج کے ساتھ بولئے۔ بلند لہجہ لفظ "میں" کے ساتھ مختص کر کے باقی جملے کو پست لہجے کے ساتھ ادا کیجئے۔

(۲) میں | (۱) اس وقت چاء پینا چاہتا ہوں۔

اس لہجے میں بولنے سے سننے والا سمجھے گا کہ بولنے والا لفظ "میں" کو خاص اہمیت دے رہا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ خواہ دوسرے لوگ اس وقت کوئی اور مشروب پسند کریں لیکن میری پسند کی چیز چاء ہے۔ اب لہجہ کی ترتیب بدلئے:

(۱) میں | (۲) اس وقت | (۱) چاء پینا چاہتا ہوں

یہاں لفظ "میں" کی تخصیص باقی نہ رہ کر "وقت" کی تخصیص ہو جاتی ہے۔ یعنی تعین وقت کے لئے ایک بات کہی جا رہی ہے۔ لہجہ کی ترتیب ایک بار پھر بدل دیجئے:

(۱) میں اس وقت | (۲) چاء | (۱) پینا چاہتا ہوں

یہاں سامع کی توجہ خواہ مخواہ "چاء" کی طرف مبذول ہو جاتی ہے یعنی کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ کسی اور وقت کوئی اور مشروب پسند کیا جا سکتا ہے، لیکن اس وقت میں "چاء" کا خواہش مند ہوں۔

اسی طور پر "پینا چاہتا ہوں" پر بلند لہجہ کا استعمال ایک خاص مفہوم دیتا ہے اور سیاق عبارت کے ساتھ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ کہنے والے کے ذہن میں کون سا پہلو زیادہ اہم ہے۔ یہاں گفتگو محض ایک جملے سے کی گئی ہے۔ کسی بھی طویل گفتگو کے ہر ہر جملے پر یہی بات عائد ہوتی ہے۔ آواز کا زیر و بم نہ صرف یہ کہ کہنے والے کے مطلب کی وضاحت کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ اس گفتگو میں ایک حسن ایک سلیقہ پیدا کرتا ہے، بلکہ سامع کو بھی کافی حد تک متاثر کرتا ہے۔ ان اصولوں سے ہر وہ شخص جو کوئی بھی زبان بولتا ہے، کسی نہ کسی حد تک استفادہ کرتا ہے۔ لیکن شعوری طور پر ان کی اثر پذیری سے واقف نہیں ہوتا۔ کسی بھی اچھے مقرر اور اچھے متکلم کی تقریر و تکلم کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ تقریر کی دل کشی میں آواز کے اس زیر و بم کو بڑا دخل حاصل ہے۔ مغرب نے اور علوم کی طرح بول چال کے انداز کو بھی ایک علم بنا دیا ہے۔ آواز کے لہجے پر مستقل تصنیفات موجود ہیں۔ ہما کی عملی تربیت کے لئے گراموفون ریکارڈ تیار کئے گئے ہیں جس سے اہل زبان اور غیر زبان والے جو انگریزی بول چال سیکھنا چاہتے ہیں، استفادہ کرتے ہیں۔ بی۔ بی۔ سی کے نشریات میں "ریڈیو کے ذریعے انگریزی" کا مستقل پروگرام ہوتا رہتا ہے جس میں انگریزی تلفظ کے ساتھ ساتھ آواز کے لہجے کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

غرض ایک طرف تلفظ کی صحت، دوسری طرف لہجے کی تھوڑی سی شعوری مشق کے بعد ہم اپنی گفتگو کو دل کش بنا سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ گفتگو کرتے وقت کسی خاص لہجہ کا شعوری احساس گفتگو میں وقتی طور پر بعض نقائص پیدا کرنے کا ذمہ دار بن جائے، لیکن مشق جاری رکھی جائے تو یہ نقائص محض عارضی ثابت ہوں گے۔ کچھ وقت کے بعد مشق پختہ ہو جائے گی اور لاشعور میں رچ بس کر عادت کا جزو بن جائے گی۔ اس کے بعد گفتگو انداز تکلم کا ایک عمدہ نمونہ پیش کرے گی۔ صرف ہمارے الفاظ نہیں بلکہ آواز کا زیر و بم بھی ہمارے جذبات کا صحیح آئینہ دار ہوگا۔

افسانہ

پرچھائیاں

رشید الدین

وہ گاؤں سرتیا کو کافی پسند آیا۔ ویسے بھی دیہاتوں سے اُسے پہلے ہی سے ایک خاص اُنس تھا۔ اپنی بیس سالہ زندگی شہر میں گزارنے کے باوجود وہ دیہات کی زندگی کو ترجیح دیتی تھی۔ اس کا متوسط گھرانا شہری کا رہنے والا تھا لیکن اُس کے دل میں دیہاتی زندگی کی اَن دیکھی رنگینیاں اور بے کراں خلوص و سادگی ہمیشہ چٹکیاں لیتی رہتی تھیں اور آج جب کہ اس نے اپنی عملی زندگی میں پہلی بار قدم رکھا تھا اُسے اپنی اس خواہش کو پوری کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد کئی سال تک وہ بیکار رہی۔ بے کاری کے دنوں میں اُسے شہری زندگی کے کھوکھلے پن کا اچھی طرح احساس ہو گیا تھا۔ شہر میں زندگی ایک مشین کے مانند ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہر شخص اپنے کام میں مشغول۔ کسی سے کسی کو کوئی سروکار نہیں۔ کوئی مر رہا ہے تو اپنی بلا سے، کوئی جی رہا ہے تو جیتے جائیے، انھیں کیا کرنا ہے۔ اور مسلسل بیکاری اور گھر کی چہار دیواری میں بند رہنے سے اگر کسی لڑکی کا دل گھبرا جائے اور وہ شام کے وقت یونہی ذرا گھر سے باہر نکل جائے تو ہزاروں نظریں اس کا یوں پیچھا شروع کر دیتی ہیں جیسے وہ بس نعمتِ غیر مترقبہ ہے اور اگر اب نہ دیکھا جائے تو پھر زندگی بھر اس کا موقع نہیں ملے گا۔

شہر کی یہ ساری چیزیں اُسے قطعی پسند نہیں تھیں۔ اور اسی وجہ سے جب وہ کئی برسوں کی مسلسل بے کاری اور معاشی پریشانی کے بعد نوکری کرنے نکلی تو اس نے بغیر کسی جھجک کے دیہات میں جانا منظور کر لیا۔ آزادی کے بعد حکومت نے دیہاتوں کو سدھارنے اور دیہاتیوں کو ایک جمہوری ملک کے باشعور شہری بنانے کے لیے ایک محکمہ قائم کیا تھا۔ اس محکمے میں جہاں مردوں کو بھرتی کیا جاتا تھا وہیں عورتوں کو بھی لیا جاتا تھا تاکہ دیہاتی عورتوں کی زندگی میں بھی انقلاب آ جائے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس محکمے کیلئے مرد جتنے چاہیے مل جاتے تھے لیکن عورتیں نہیں ملتی تھیں۔ اسکولوں اور کالجوں سے جو لڑکیاں پڑھ کر نکلتی تھیں وہ دیہات میں رہنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس وجہ سے عورتوں کے لیے یہی ایک محکمہ ایسا تھا جس میں ہمیشہ جگہیں خالی رہتی تھیں۔ اور جب اس نے نوکری کی تلاش کی تو یہی ایک محکمہ ایسا ملا جس میں ایک سے زائد نشستیں خالی تھیں۔ پوچھ گچھ پر اُسے معلوم ہوا کہ حکومت نے دیہاتوں کی ترقی کے لیے ایک نیا محکمہ قائم کیا ہے لیکن انھیں اس کام کے لیے خاطر خواہ تعداد میں عورتیں نہیں مل رہی ہیں۔ اُسے یہ سن کر ایک طرف تو بے حد خوشی ہوئی اور دوسری طرف حیرت بھی۔ اس نے فوراً اپنا نام رجسٹرڈ کرا لیا اور اپنی بعض دوستوں کو بھی اس کام کے لیے سمجھا بجھا کر راضی کر لیا۔ ان سب کو تقرری کے پروانے بھی جلد ہی مل گئے اور وہ سب اپنے اپنے حلقوں کو چلی گئیں۔ انھیں جو حلقے ملے تھے وہ اتفاق سے ایک دوسرے سے متصل تھے۔ یہ پورا علاقہ پہاڑی تھا۔ ہر حلقے میں کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے اور ایک بڑا سا گاؤں ان تمام حلقوں کا مستقر تھا جہاں یہ لوگ رہتے تھے۔ دن میں وہ لوگ اپنے اپنے حلقوں کو چلی جاتیں اور شام کو پھر اپنے مستقر واپس آ جاتیں۔ اسی لیے وہ لوگ دیہات میں بھی کسی قسم کی اجنبیت محسوس نہیں کرتی تھیں۔ البتہ ان سب کے دلوں میں ایک انجانا خوف رہ رہ کر پیدا ہو جاتا تھا لیکن انھوں نے ایک دوسرے

سے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ خود سرتیا بھی ایک نئے ماحول میں، اور وہ بھی اس طرح پہاڑوں سے گھرے ہوئے ماحول میں رہنے سے کچھ ڈر سی جاتی تھی۔

رفتہ رفتہ ان سب کا خوف دور ہوتا گیا اور وہ سب اُس علاقے اور ماحول سے مانوس ہونے لگیں۔ خاص طور پر ان کا مستقر جو گاؤں تھا وہاں کے لوگ کافی ملنسار، سمجھ دار اور مخلص تھے۔ انھیں رہنے کے لیے حکومت کی طرف سے عمدہ کوارٹرز ملے ہوئے تھے جو حال ہی میں تعمیر کیے گئے تھے۔ کام کوئی زیادہ نہیں تھا اس لیے باری باری کھانا وہ لوگ خود پکا لیتی تھیں۔ سرتیا بالخصوص اپنی دوستوں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔ گاؤں میں کافی دھوبی نہیں تھے اس لیے انھیں اپنے کپڑے بھی خود دھونے ہوتے تھے۔ گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ پنگھٹ پر جا کر کپڑے دھونے میں انھیں بڑا مزا آتا تھا۔ کپڑے دھو لینے کے بعد ان میں سے ایک ترنگ میں آ کر دوسری پہ پانی اُچھالتی، دوسری تیسری پہ۔ اور اس طرح بڑی دیر تک وہ آپس میں ایک دوسرے پر پانی اُچھالتیں اور محظوظ ہوتیں۔ دیہاتوں میں ہر شخص اپنا کام خود کرتا ہے، یہ چیز سرتیا کو بہت پسند تھی۔ دیہاتوں میں امیرانہ زندگی کی وہ جھلکیاں نہیں تھیں جو شہروں میں اُس کے لیے مسلسل عذاب جان بنی ہوئی تھیں۔ اُسے یہاں سچا سوشلزم نظر آیا۔

نام بھی بڑا بھلا سا تھا گاؤں کا ـــــ ناگا پور۔ کتنا بڑا پن اور کتنی دل کشی ہے اس نام میں! ناگا پور میں ایک بڑی اچھی ندی تھی۔ ندی کے اوپر ایک پرانا بند تھا جو اب ٹوٹ گیا تھا اور اس سے آب پاشی میں کسی قسم کی مدد نہیں مل سکتی تھی لیکن وہ بند تفریح کا بڑا اچھا مرکز تھا۔ اس کے دونوں طرف گہرا پانی تھا اور بیچ میں سے پتھر کی ایک بہت چوڑی دیوار اسے چیرتی ہوئی چلی گئی تھی۔ شام کے وقت اس بند کے پاس بیٹھنے میں بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ندی کے کنارے ہی ایک پرانا مندر تھا جو بے انتہا اونچا تھا۔ اس لیے گاؤں والے اسے "اونچا مندر" کہتے تھے۔ اونچے مندر میں اب بھی شام کے وقت بڑے اہتمام سے پوجا ہوتی تھی۔ اور جنگل سے واپس آنے والے مویشیوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ مندر کی گھنٹیاں مل کر بڑی دلربا آواز پیدا کرتی تھیں۔ اس گاؤں میں کافی کھنڈر پائے جاتے تھے جن سے اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ کافی آباد اور متمدن گاؤں رہا ہوگا۔ کہتے ہیں یہاں ایک راجہ رہتا تھا جس کے محل کے کھنڈر ابھی تک اس کے وجود کی گواہی دے رہے تھے۔ لیکن قانون قدرت نے اس راجہ کی راجدھانی کو ایک معمولی گاؤں میں تبدیل کر دیا تھا جہاں زیادہ تر غریب گھرانے کے لوگ رہا کرتے تھے جن کا پیشہ زیادہ تر کھیتی باڑی، مزدوری یا پھر ماہی گیری تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی تھا جہاں چوتھی جماعت تک تعلیم ہوتی تھی۔ گاؤں کے لڑکے عموماً چوتھی جماعت تک پڑھنے کے بعد مویشیوں کے پیچھے لگ جاتے تھے یا اپنے بڑوں کا زراعت میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیتے تھے۔

سرتیا دیہاتیوں کی خدمت ایک سرکاری نوکری سمجھ کر نہیں بلکہ خلوص دل سے کر رہی تھی۔ اس کی کئی دوستوں کو دیہاتیوں سے بات چیت کرتے وقت ایک ہی چیز کو بار بار سمجھاتے ہوئے چڑچڑا پن لگتا تھا۔ لیکن سرتیا کسی بھی موضوع پر بڑی مستعدی سے بولتی تھی، اس کی اچھائیاں اور برائیاں دونوں ہی اجاگر کرتی تھی اور پھر انھیں وہ چیز اپنانے کی تلقین کرتی تھی۔ وہ بے کھٹکے ان کے تنگ و تاریک مکانوں میں گھس جایا کرتی تھی جہاں ایک طرف مویشی بندھے ہوتے تھے تو دوسری طرف ہنڈیا پکتی ہوتی تھی اور تیسری طرف گھر کے افراد لیٹے ہوتے تھے۔ وہ دیہاتی عورتوں کو ان کی زبان میں بڑے ملائم لہجے میں اس طرح خلط ملط رہنے کی برائیاں سمجھاتی اور انھیں چھوٹے گھر کو قرینے سے سجانے کی ترکیبیں سمجھاتی۔ اس کے حلقے کے مرد بھی انھیں باتوں سے اس کا احترام کرتے تھے اور جب وہ کسی گھر میں داخل ہوتی تو مرد باہر نکل جاتے۔ اس طرح وہ عورتوں سے کھل کر بات کر سکتی تھی۔ عورتیں بھی اسے اپنی مجبوریاں اور دقتیں بتاتی تھیں۔ راستے میں بھی جہاں کہیں اسے مرد ملتے تھے وہ احتراماً اس کا راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ اور نوجوان تو اسے گاؤں میں اِدھر اُدھر گھومتے کبھی نظر نہ آتے۔ ہر بار وہ کسی مزدوری کام سے بڑی جلدی میں گاؤں آتے اور پھر فوراً ہی کھیتوں کو واپس چلے جاتے۔ وہ اکثر اپنے حلقے کا پیدل ہی دورہ کرتی تھی۔ بعض روز یوں ہوتا کہ وہ سب مل کر کسی ایک کے حلقے میں چلی جاتیں اور وہاں کی ترقی کی رفتار دیکھتیں، اور پھر دوسرے دن سب مل کر کسی دوسرے حلقے میں جا کر اس کا تقابل پہلے سے کرتیں۔ اس طرح وہ سب مل کر سارے

حلقوں کا دورہ کرلیتی تھیں ایسے دنوں میں انھیں بڑا لطف آتا تھا۔ ہر روز صبح ناشتہ کرنے کے بعد سرتیا اور اس کی سہیلیاں اپنے اپنے حلقے کے کسی نہ کسی گاؤں کو چلی جاتیں اور شام کو پھر اپنے مستقر واپس آجاتیں۔

سرتیا کو دیہاتوں کے لوک ناچوں اور لوک گیتوں سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ ایسے سوشل پروگراموں میں وہ بڑی دلچسپی سے شریک ہوتی اور اس کی مفصل رپورٹ اپنے محکمے کو بھیجتی۔ نوجوان لڑکیوں کا بھاگتے بچاتے ہوئے یہ کورس اسے بہت پسند تھا:

"او میرے شہر سے آنے والے ساجن!
اب کی بار جو آنا تو میرے لیے چاندی کی ایک پائل لانا۔
بھلا میں خالی پاؤں پنگھٹ کیسے جاسکتی ہوں۔
میں جب بھی اپنی سہیلیوں کو پائل پہنے دیکھتی ہوں
نہ جانے کیوں ـــ میرا من جلنے لگتا ہے
اور میں دل ہی دل میں شرمانے لگتی ہوں
کیا تم اپنی سجنی کو یوں ہی رسوا کروگے؟
جب تم مجھے پائل لادوگے تو ـــ
میں اسے پہن کر چھم چھم کرتی ہوئی گاگر اٹھائے
پنگھٹ جاؤں گی
پھر میں پنگھٹ کی رانی کہلاؤں گی
کیا تم مجھے پنگھٹ کی رانی نہیں بناؤگے؟

کتنی معصوم خواہش ہے ان کی۔ وہ دل ہی دل میں سوچتی۔ وہ بھی تو کنواری ہے۔ مگر اس کی کوئی خواہش اتنی معصوم کہاں! شہر کی جو پڑھی ہوئی ہے! وہ اپنے آپ سے سوال کرکے پھر خود ہی جواب دیتی۔

مگر اس کی یہ پُرسکون زندگی زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکی۔ اور اچانک شہر سے آئے ہوئے ایک نوجوان نے اس کی اس زندگی کو ایک دم درہم برہم کردیا۔ اُسے اس نوجوان پر بے پناہ غصہ آتا تھا۔ جہاں دیکھو وہ اسے یوں گھورتا تھا جیسے اب کھا ہی جائے گا۔ گاؤں کی کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں وہ نہ پہنچ جاتا ہو، مندر کے پاس وہ موجود، ندی پر وہ موجود۔ مدرسے کے چبوترے پر وہ موجود۔ غرض وہ اس سے جتنا بچنا چاہتی تھی وہ اتنا ہی اس کے سامنے آتا تھا اور خواہ مخواہ اس کے کاموں میں دلچسپی لیتا۔ یہ بات وہ اپنی دوستوں سے بھی تو نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس سے خواہ مخواہ مذاق کا ایک عذر پیدا ہوجاتا لیکن یہ شروع شروع کی بات تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ نہ جانے کیوں یہ محسوس کرنے لگی کہ جیسے وہ اس کی طرف کھنچی جا رہی ہے۔ پھر جلد ہی اُس نے اپنے اس خیال کو دل سے نکال دیا۔ وہ یہاں حکومت کی نوکری کرنے اور دیہاتیوں کی خدمت کرنے آئی تھی، کسی نوجوان سے محبت کرنے نہیں!

ایک بار گاؤں میں میلہ لگا۔ یہ میلہ بیساکھی کے موقع پر ہر سال لگتا تھا۔ بڑی چہل پہل تھی۔ ندی کے کنارے اور دیوی کے مندر کے آس پاس عوام کا بے پناہ ہجوم تھا۔ جدھر دیکھو اُدھر آدمی ہی آدمی تھے۔ طرح طرح کے سامان کی دوکانیں لگی تھیں۔ کھیل تماشے ہو رہے تھے۔ سرتیا بھی میلہ میں گھوم رہی تھی تاکہ حکومت کو اپنی رپورٹ بھیج سکے۔ ایک جگہ کچھ نوجوان ایک گیت پیش کر رہے تھے، رقص کے ساتھ۔ سرتیا کو یہ گیت اور رقص بہت پسند آیا۔ اپنی دوستوں کے ساتھ وہ وہاں ٹھہر گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُسے احساس ہوا کہ وہی نوجوان ان لوگوں کی قیادت کر رہا ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کی نظریں سرتیا پر مرکوز ہیں۔ یہ چیز اُسے بُری معلوم ہوئی۔ اس کا سارا موڈ خراب ہوگیا۔ "ہوں۔ حد ہوگئی بدتمیزی کی بھی۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے نکل گئی۔

لیکن گھر آکر بھی اُسے چین نہ آیا۔ وہ میلہ سے اپنی دوستوں کو کچھ بتائے بغیر گھر آگئی تھی اور پلنگ پر لیٹ گئی تھی۔ اس کے دماغ میں خیالوں کا ایک طوفان امنڈ آیا تھا۔ اس نے سوچا وہ اتنی بزدل تو نہیں کہ ایک معمولی نوجوان سے ڈر جائے یا اس سے ہار مان لے۔ وہ ایک سرکاری ملازم ہے۔ اگر نوجوان نے کوئی گستاخی کی تو اُسے اس گستاخی کی سزا مل سکتی ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کے اندر کی سوئی ہوئی عورت جاگ پڑی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس نوجوان سے کیوں نہ پوچھے کہ وہ جہاں جاتی ہے وہ بھی وہاں کیوں پہنچتا ہے اور آخر وہ چاہتا کیا ہے۔ اُسے خیال آرہا تھا کہ وہ ایسا بڑا تو نہیں معلوم ہوتا کہ اس سے اتنی بات بھی نہ کی جائے۔ اور یہ سوچتے سوچتے وہ خود ہی شرما گئی۔ نہ جانے کیوں؟ حالانکہ اُس وقت کمرے میں کوئی بھی تو نہیں تھا۔

مگر وہ اپنے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ کیونکہ دوسرے دن وہ نوجوان نظر ہی نہ آیا۔ دو تین دن کے بعد وہ خود بھی اپنے کاموں میں لگ گئی۔ اور یہ واقعہ بڑی حد تک اس کے ذہن سے نکل گیا۔

ایک دن شام کو جب وہ مندر جا رہی تھی تو اس کے صدر دفتر کا چپراسی مل گیا جو شہر سے ایک سرکاری مراسلہ لایا تھا۔ اس کو اس نے اپنے کوارٹر پر بھجوا دیا اور خود مندر چلی گئی۔ مندر سے آنے کے بعد اس نے سرکاری خط دیکھا۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس میں اُس نے یہ پڑھا کہ اس کے سب سے بڑے افسر کو اس کا کام بے حد پسند آیا تھا اور اُس نے اس کی بے حد تعریف کی تھی۔ اُس میں ان کے پرسنل اسسٹنٹ ورما کے دورے کا بھی ذکر تھا جنھوں نے خفیہ طور پر کئی دن تک اس حلقہ کا دورہ کیا تھا۔

"ورما صاحب بھی تو یہاں آئے تھے۔" چپراسی نے بہت دیر یوں ہی گم صُم بیٹھنے کے بعد پہلی مرتبہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے کہا

"ارے ہاں!" وہ چونک پڑی "ارے بھئی ہم لوگوں کو معلوم ہی نہ تھا ورنہ ہم سب ان سے ملتے نہ جا کر!" وہ بولی۔

"مگر بہن جی اس کا آپ کو پتہ کیسے چلتا۔ وہ تو خفیہ طور پر آئے تھے۔" وہ بولا۔

چپراسی کی زبانی اُسے یہ بھی معلوم ہوا کہ بڑے دفتر میں اس کی کارکردگی کے بڑے چرچے ہیں۔ اس کا حلقہ ساری ریاست میں سب سے اچھا رہا۔ اس سلسلے میں اسے حکومت کا ایک خاص انعام ملے گا۔ وہ مارے خوشی کے کچھ نہ بول سکی۔ اس نے دوڑ کر اپنی تمام دوستوں کو بلا لیا اور وہ مراسلہ دکھایا جو ابھی ابھی دفتر سے آیا تھا جس میں اُسے جلد ہی ترقی دینے کا بھی ذکر تھا۔

اور جب سارا شور و ہنگامہ ختم ہو گیا تو اس نے اپنے آپ کو لیمپ کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ اس کی ساری سہیلیاں اپنے اپنے کمروں میں سونے جا چکی تھیں۔ چپراسی بھی برآمدے میں بستر بچھا کر سو گیا تھا۔ مگر وہ ابھی تک جاگ رہی تھی اور کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

"تو وہ نوجوان پرسنل اسسٹنٹ ورما تھا!" وہ اپنے آپ بڑبڑائی۔

خوشی اور غم کے ملے جلے احساس سے اس کی طبیعت عجیب مکدر ہو گئی۔ اسے دل ہی دل میں اپنے اس خیال پر پشیمانی ہونے لگی جو اس نے اپنے افسر کے متعلق کیے تھے اور پھر اس نے اپنے ذہن میں اس نوجوان کی پرچھائیاں مدھم ہوتے دیکھیں اور اس کی جگہ ایک افسر کی پرچھائیاں اُبھرتے دیکھیں جو فائلوں کے انبار پر جھکا تیز تیز قلم چلا رہا تھا اور پھر وہ بھی بہت سے سادہ کاغذ لیے آئے ہوئے مراسلوں کا جواب لکھنے بیٹھ گئی!



اُردو مصنّفین کو انعامات

حکومت اتر پردیش نے اتر پردیش انعام کمیٹی (جس کے صدر ڈاکٹر سمپورنانند گورنر راجستھان ہیں) کی سفارشات کے بموجب ۱۹۶۱ء کے لئے اردو کے مندرجۂ ذیل مصنفوں کو ان کی کتابوں پر انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔
غالب انعام (مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کو ان کی کتاب "فرہنگِ اثر" پر۔ اکبر الٰہ آبادی انعام (۱۲۰۰ روپیہ)۔ سید صباح الدین عبدالرحمان کو ان کی کتاب "ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام" پر۔ رام پرشاد بسمل انعام (۸۰۰ روپیہ)۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کو ان کی کتاب "حالی بحیثیت شاعر" پر۔ ان کے علاوہ حسب ذیل مصنفوں کو پانچ پانچ سو روپے کے متفرق انعامات دیئے گئے ہیں: شری سراج لکھنوی کو ان کے دیوان "شعلۂ آواز" پر۔ شری غلام ربانی تاباں کو ان کے دیوان "حدیثِ دل" پر۔ شری رشید احمد صدیقی کو ان کی کتاب "ہم نفسانِ رفتہ" پر۔ شری محمد عتیق صدیقی کو ان کی کتاب "گلکرسٹ اور اس کا عہد" پر۔ شری رام لعل کو ان کے افسانوں کی کتاب "گلی گلی" پر۔

سائیکل ـــــ گود سے گور تک

عبدالمجیب سہالوی

سائیکل دو ٹانگوں کی وہ سواری ہے جو اپنی ٹانگوں کے بجائے سوار کی ٹانگوں کے بل بوتے چلتی ہے لیکن اس کے باوجود سوار کو یہ غلط فہمی رہتی ہے کہ وہ پیدل نہیں سواری پر جا رہا ہے!

غالب نے کہا تھا کہ "ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں"۔ عجیب بات ہے غالب کے زمانہ میں زنجیر، مانع دشت نوردی سمجھی جاتی تھی لیکن سائیکل نے ثابت کر دیا کہ زنجیر (چین) کے بغیر وہ چل ہی نہیں سکتی۔ بلکہ ہم نے ایسی ایسی سائکلیں دیکھی ہیں کہ اگر چین نہ ہوتی تو ان کا پہچاننا دشوار ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جسطرح نوکری کیلئے سوائے سفارش کے کسی چیز کی ضرورت نہیں اسی طرح سائیکل کے لئے سوائے چین کے کسی پرزے کی حاجت نہیں۔ بلا برک کی سائیکل دیہات میں عام اور شہر میں خاص ہے۔ رہی گھنٹی تو وہ نہ عام ہے نہ خاص بلکہ دھرا دُ جوڑا ہے جو رکھا رہے اور وقت ضرورت پر بھی کام نہ آئے۔ گدّی کے لئے بھی ضروری نہیں کہ وہ گدّی معلوم ہو۔ وہ اڈّے کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے جس پر سوار بیٹھنے کے بجائے ٹیک کر چل سکتا ہو۔ ہینڈل بھی 'داشتہ آید بہ کار' کے طور پر رکھے گئے ہیں ورنہ ماہرین فن ہینڈل چھوڑ کر بھی سائیکل چلا لیتے ہیں۔ پیڈل کی جگہ لکڑی لگا کر سائیکل چلانا تو دیہات کا فیشن ہو گیا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے ان آنکھوں نے تو ایسے شہ سوار بھی دیکھے ہیں جو بلا ٹائر ٹیوب کی سائیکل پر میلوں چلے جاتے ہیں اور انھیں ایک منٹ کے لئے یہ خیال نہیں آتا کہ سائیکل کے اس بے گور و کفن لاشے پر انھیں بیٹھنا نہیں، کاندھے پر لے جانا چاہئے۔

لیکن سائیکل نے زمانے کے ان لوگوں میں سے جو دھن بنک ہیں، من سیاست میں اور تن جنتا کی سیوا کے لئے وقف کر دیتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی لاش کو قبرستان لے جانے کے بجائے طلبا کے تجربہ کے لئے میڈیکل کالج کو دئے جانے کی وصیت کر جاتے ہیں۔ بیچاری سائیکل کے پاس نہ من ہے نہ دھن لیکن اس نے اپنے تن کو جن سیوا کے لئے مخصوص کر دیا ہے تاکہ وہ گود سے گور تک تمام منزلیں اس کے تن لاغر پر طے کریں۔

ہمیں نے کیا آپ نے بھی اکثر دیکھا ہوگا کہ بچہ اپنی ماں کی ہمراہی میں کیریر پر بیٹھ کر دنیا میں آنے سے پہلے ہی دنیا کی اونچ نیچ کا تجربہ کرتا ہوا سنیما کا سکنڈ شو دیکھنے جاتا ہے اور واپسی میں کسی رکشے کی لپیٹ میں آ کر گھر میں جنم لینے کے بجائے اسپتال میں جنم لیتا ہے۔ پھر وہاں سے اس شان سے آتا ہے کہ بھائی ڈنڈے پر، باپ گدّی پر، ماں کیریر پر اور خود گود میں!

گود میں تھوڑے دن دم لینے کے بعد سائیکل کی یاد پھر ستاتی ہے اور وہ ایک دم ماں کی انگلی چھوڑ کر ہینڈل تھام لیتا ہے اور پیڈل پر پیر ٹکا کر "قینچی کی مشق" کرنے لگتا ہے۔ لیکن منچلی طبیعت "قینچی" کی کچ کچ سے جلد ہی اکتا جاتی ہے اور قینچی سے اُچھل کر وہ گدّی پر آ جاتا ہے مگر گدّی نشینی آسان نہیں۔ پہلے ہی دن ٹرک سے ٹکر کھا کر اسپتال جاتا ہے اور وہاں ٹوٹی ٹانگ میں کھپچی بندھوا کر دل میں سائیکل پر دوبارہ چڑھنے

کی تمنا لئے گھر واپس آتا ہے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ زندگی کا تجربہ اور سائیکل کی سواری بغیر چوٹ کھائے نہیں آتی۔ چنانچہ یہ صاحبزادے ٹرک سے ٹکر کھا کر باقاعدہ "گدی نشین" بن ہی جاتے ہیں۔

بوڑھا سائیکل سوار، سائیکل کم چلاتا ہے بریک زیادہ لگاتا ہے اور جوان سائیکل سوار بریک لگانے کے موقعہ پر بھی پیڈل چلانے لگتا ہے۔ ایک سائیکل کو زندگی کا حادثہ اور دوسرا، حادثہ کو زندگی خیال کرتا ہے اور اس کی تلاش میں شہر کی سڑکوں پر بے تحاشا سائیکل چلاتا ہوا تیر کی طرح آنے والی سٹی بس کی آغوش میں آنے کی پوری کوشش کے باوجود نالی میں گر کر مجمع سے جاں نثاری کی داد طلب کرتا ہے۔

دل کی چوٹ کی طرح نوجوان سائیکل سوار سائیکل کی چوٹ سے بھی بدمزہ نہیں ہوتا اور اظہار ہمدردی کو بدذوقی خیال کرتا ہے۔ جب وہ سائیکل پر سوار ہوتا ہے تو اپنی ٹانگ کو اپنا "آئینہ" سمجھتا ہے اور اقبال کے اس مصرع کو ہر وقت گنگناتا رہتا ہے:

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ

اور جب یہ آئینہ ٹوٹ جاتا ہے تو وہ دوسرا مصرع پڑھتا ہے:

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

مطلب یہ کہ ٹانگ بچا بچا کر رکھنا "سائیکل ساز" کی نگاہ میں ذلیل ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں اور کوئی غیرت دار سائیکل سوار یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتا کہ اپنی ٹانگ بچانے کے لئے سائیکل میں ٹانگ اڑا کر بریک لگائے کیونکہ بریک لگانا اور بریک رکھنا دونوں جواں مردی کے خلاف ہیں!

سائیکل کی سواری میں یہ بڑی خوبی ہے کہ اس میں آدمی چوٹ کھا کر اور چاق چوبند ہو جاتا ہے اور گرتے ہی جھاڑ پونچھ کر اس طرح کھڑا ہو جاتا ہو کہ وہ نہیں بلکہ اس کے دشمن گرے ہوں گے، وہ تو محض مجمع کی خاطر سے اتر پڑا تھا۔ پھر وہ مجمع سے اس تیزی سے نکل کر بھاگتا ہے جیسے اس کی گاڑی چھٹی جا رہی ہو اور اسے اپنی خستگی کی داد لینے کی بھی فرصت نہ ہو۔

لکھنؤ کی ایک بے نظیر سڑک پر جہاں کپڑے اور ریل والے پیدل چلنے والوں سے یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ "نٹ پاتھ میرا باقی تیرا" اور جہاں بسیں بے بسوں سے یہ کہتی سر پر چڑھتی چلی آتی ہیں کہ جس کو ہو جان و دل عزیز میری گلی میں آئے کیوں، ایک رات ان آنکھوں نے وہ دیکھا جس کو دوبارہ دیکھنے کی نہ تو آنکھوں کو ہوس ہے نہ دل کو تاب۔ ایک صاحب پیچھے کیریر پر مسلم چارپائی باندھے، ہینڈل میں دونوں طرف جھولے ٹانگے اور ڈنڈے پر بیگم کو "مالِ عرب پیشِ عرب" کی شان سے بٹھائے غالباً مکان دار کو کرایہ کے بجائے داغِ مفارقت دے کر دوسرے مکان کی تلاش میں گومتی پار جا رہے تھے کہ بس اور ٹھیلے کے درمیان اس بری طرح پھنسے کہ مکان کی تلاش سے بے نیاز ہو کر مع ساز و سامان اسپتال منتقل ہو گئے لیکن جس طرح شہر میں مکان کی تنگی کی بنا پر لوگ مہمان کو برکت کی نشانی کے بجائے زحمت کی علامت خیال کرنے لگے ہیں اسی طرح جگہ کی قلت کی وجہ سے مریض کو بھی بعض اوقات مجبور ہو کر ناخواندہ مہمان سمجھا جاتا ہے۔ وہ تو کہئے کہ یہ بچارے ایسے زخمی ہوئے تھے کہ ان کے لئے کوئی بہانہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی، موت خود بہانہ بن گئی ہو گی اور وہ جلد ہی اسپتال سے عیش باغ منتقل کر دئے گئے ہوں گے۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ منتقلی کیسے ہوئی ہو گی۔ ہمارا خیال ہے اس آڑے وقت پر بھی سائیکل ہی کام آئی ہو گی۔ لیکن مرحوم کو سائیکل اور چارپائی ساتھ رکھنے کا جو شوق تھا اس کی بنا پر لوگوں کا خیال ہے یہ فرض دونوں کی مشترکہ کوشش سے انجام پایا ہو گا لیکن سارا بار سائیکل ہی کے کاندھوں پر بہر حال رہا ہو گا۔

ہندستان جب تک چارپائی سے اٹھ کر سائیکل کے عہد میں نہیں پہونچا تھا بلکہ چارپائی پر انگڑائیاں لے کر بان دوہ توڑ رہا تھا، اس وقت تک تمام کام یا تو چارپائی پر یا چارپائی کے ذریعہ انجام پاتے تھے لیکن اب چارپائی سے چھلانگ مار کر سائیکل کی گدی پر پہونچتے ہی جملہ کام سائیکل پر انجام پاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دن بھی جلد ہی آ جائیں جب سائیکل سبکدوش ہو کر چارپائی کی طرح کونے میں کھڑی ہو جائے اور تمام کام ہیلی کاپٹر کے ذریعہ انجام پانے لگیں۔

آپ کو یقین آئے یا نہ آئے، واقعہ یہ ہے کہ دیہات میں سائیکل آدمیوں کے علاوہ جانوروں کے کام میں بھی آنے لگی ہے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ نہر کی پٹری پر ایک بھینس سائیکل کے پیچھے اس طرح بھاگی

چلی جارہی ہے جس طرح انجن کے پیچھے ریل کا ڈبہ! میں احتیاطاً پٹری سے اُتر کر دیکھنے لگا کہ معاملہ کیا ہے۔ تھوڑی دیر میں سائیکل قریب آگئی اور میں نے دیکھا کہ کیریر پر ایک جھوتے میں بھینس کا بچّہ آنکھیں بند کئے چاند کی سیر کے خواب دیکھتا چلا جارہا ہے اور بھینس ماما کی ڈوری میں بندھی اپنے ہونے والے خلاباز بچے کو بھیں بھیں کرکے 'چندا ماما دور کے والی پرانی لوری سُناتی جارہی ہے۔ اس کے بعد میں بے اختیار چیخ اُٹھا کہ 'بسیار گاڑی دیدہ اَم لیکن تو چیزے دیگری'۔

بھینس کے ذکر پر عام طور پر 'بھینس کے آگے بین بجے اور بھینس کھڑی پگورائے' والی مثل یاد آجاتی ہے لیکن مجھے نہ تو بین سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ پگورانے کی عادت۔ اس لئے سائیکل کے پیچھے بھاگتی بھینس دیکھ کر اگر سائیکل سوار دودھ والے کا خیال آجائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ دودھ والا ڈالی گنج سے امین آباد کی طرف اس شان سے چلتا ہے کہ سر پر کلس رکھکر بتاشوں پر ناچنے کی پرانی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی۔ اس کے کیریر پر دہی کا کونڈا، ہینڈل پر دودھ کی بالٹیاں اور سر پر بالائی سے بھری چکتی تھالی اس طرح رکھی ہوتی کہ معلوم ہوتا سورج دیوتا شہر کی سیر کو نکلے ہیں۔

تجربہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دیہات میں ووٹ اور سائیکل میں بڑا گہرا تعلق ہے چنانچہ جنرل الکشن میں اس مرتبہ سائیکل سوار امیدوار بہت کامیاب ہوئے۔ وجہ یہ ہے کہ موٹر کی پرانی عادت ہے کہ وہ گاؤں کے باہر کسی بڑے زمیندار کی کھٹار کے سامنے آکر رُک جاتی ہے اور گاؤں کی پگ ڈنڈی پر جانے سے کتراتی ہے مگر سائیکل کھیت کی منڈیر پر بھی لہراتی ہوئی کسان کے چھپر تلے پہونچ جاتی ہے اور نمشکار کرکے ووٹ پکا کر لیتی ہے۔

ہمارے حلقے کے ایک امیدوار صرف اس لئے کامیاب ہوگئے کہ وہ سائیکل کی سواری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وہ الکشن کے زمانے میں اپنے ایک ہمزاد کو کیریر پر بٹھا کر ووٹ کی تلاش میں منہ اندھیرے نکل جاتے اور کم از کم پچاس ساٹھ میل کا چکر لگا کر رات گئے گھر واپس آتے۔ ہمزاد کو صرف اس لئے ساتھ رکھتے کہ جب گدی پر بیٹھے بیٹھے جی اُکتا جاتا تو مزہ بدلنے کے لئے کیریر پر آجاتے لیکن ان کی سائیکل جو مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی پن چکی کی طرح دُھن کی پوری اور کام کی پکی تھی بغیر دم لئے چلتی رہتی۔ اس نے اپنا چلنا اس وقت تک نہیں بند کیا جب تک ووٹ پڑنا بند نہ ہوگئے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ جہاں سائیکل امیدوار کو الکشن جتانے میں مدد دیتی ہے وہاں امیدوار کے مخالفوں سے بدلا لینے میں بھی ہاتھ بٹاتی ہے۔ سناٹے میں نہر کی پٹری پر سائیکل سے سائیکل لڑا کر لڑنے کا بہانہ فراہم کرتی ہے اور مارپیٹ کے بعد بھاگنے میں خاطر خواہ مدد کرتی ہے۔

کیا آپ کو لکھنؤ میں دو بجے رات کے بعد امین آباد سے گذرنے کا اتفاق ہوا ہے؟ میرا خیال ہے نہ ہوا ہوگا اس لئے کہ آپ غالباً اخبار نویس ہیں نہ شہر کے شب بیدار نگہباں جن کی سرگرمیاں رات ڈھلے شباب پر آتی ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ایک زبانِ قلم خبریں اخبار پر منتقل کرتا ہے، دوسرا بیچ سڑک پر کھڑا ہو کر براہ راست حلق سے خبریں براڈ کاسٹ کرتا ہے اور جب چوراہے پر دونوں کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو ہم پیشہ ہونے کی کدورت کے باوجود دونوں اپنے اپنے راستے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جو کتا دونوں رہتے ہیں اس لئے ایک رکشے کے پیچھے چھپنے اور دوسرا رکشے پر بھاگنے کے لئے رکشے کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس بنا پر وہ دونوں اس کی شہادت دے سکتے ہیں کہ اگر دو ٹانگ کی سائیکل نہیں تو اس کا تین ٹانگ کا بھائی 'رکشا' چارپائی سے کم سونے کے کام میں استعمال نہیں ہوتا۔ یہ رکشے جو رات گئے تک سواریاں ڈھوتے ہیں رات ڈھلے چارپائی میں منتقل ہو کر سیکڑوں رکشے والوں کے سونے کے کام میں آتے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ رکشے پر سونے کی مشق کے بعد سولی پر نیند آسان ہو جاتی ہے اسی لئے رکشے والے سولی پر چڑھ کر جان دینے کے بجائے رکشا چلا کر جان دینا زیادہ بہادری خیال کرتے ہیں۔





سید ثواباقر

غمِ عشرت ہی کہیں عشرتِ غم تک پہنچے
زندگی کا کوئی مفہوم تو ہم تک پہنچے

بیٹھے ہیں اپنی جگہ اور تقاضا یہ ہے
بڑھ کے خود منزلِ مقصود قدم تک پہنچے

نغمہ و شعر کے سانچے میں اُنھیں ڈھال لیا
چند آنسو جو مرے دیدۂ نم تک پہنچے

دستِ سائل کے تجاوز پہ نہ تنقید کرو
بات بڑھ کر نہ کہیں دستِ کرم تک پہنچے

پھر مجھے راہ دکھانے کا ارادہ بھی کرے
رہ نما پہلے مرے نقشِ قدم تک پہنچے

اللہ اللہ ! یہ ہنگامۂ پیکارِ حیات
وہ پکاریں بھی تو آواز نہ ہم تک پہنچے

مے و مینا سے ہوئی شرحِ بہاراں اقصا
پھول تو چند اشارے تھے جو ہم تک پہنچے



وفا ملک پوری

اُن کی نگہِ ناز کے ٹھکرائے ہوئے ہیں
ہم جرمِ محبت کی سزا پائے ہوئے ہیں

جو آپ کے گیسو کی ہوا کھائے ہوئے ہیں
وہ بن کے محبت کی گھٹا چھائے ہوئے ہیں

یہ سایہ نشینانِ گزرگاہِ تمنّا
کچھ عشق کے کچھ عقل کے بہکائے ہوئے ہیں

اب ان کو نئی صبح کا پیغام سنا دو
جو تیرگیٔ وقت سے گھبرائے ہوئے ہیں

مے چھلکے گی، مے اُبلے گی، مے برسے گی رندو
مے خانے میں خود شیخِ حرم آئے ہوئے ہیں

توبہ نہیں ٹوٹے گی سبو آ کے کرے خم آئے
مے کش تری آنکھوں کی قسم کھائے ہوئے ہیں

اب اُن کے تغافل کا وفاؔ ذکر نہ چھیڑو
دیکھو تو وہ کس ناز سے شرمائے ہوئے ہیں



ننھے جوہر کی کہانی

علی ارشاد نقوی

آج سے تقریباً دو ہزار سال قبل کے فلسفی اور اہل علم اس امر سے واقف تھے کہ دنیا کی ہر مادی[1] شے کچھ ایسے چھوٹے چھوٹے ذرات سے مل کر بنی ہے جن کی تقسیم نا ممکن ہے۔ اُن کی یہ واقفیت خالص علمی اور بہت کچھ اعتقاد کی بنا پر تھی مگر وہ اپنے اس نظریے کا کوئی عملی ثبوت نہ دے سکے۔ پانچویں صدی قبل مسیح کا یونانی سائنس داں لیوسی پس (LEUCIPPUS) اور اس کا شاگرد ڈیماکریٹس (DEMOCRITUS) پہلے وہ لوگ تھے جن کا ذکر مادّے کے ان چھوٹے ذرات یعنی ایٹم کا تصوّر پیش کرنے والوں کی فہرست میں ملتا ہے۔ مگر ان کا پیش کردہ نظریہ بھی عملی ثبوت مفقود ہونے کے باعث ایک عرصے تک راہبری کرنے سے قاصر رہا۔ لوگوں کے تصور میں عجب عجب ایٹم آتے رہے یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی میں انگلستان کے سائنسداں ڈالٹن (DALTON) نے پہلی بار ایک قابل تسکین نظریہ پیش کیا۔

ڈالٹن نے بتایا کہ مادّہ مختلف عناصر[2] سے مل کر بنتا ہے اور ہر عنصر ایک خاص قسم کے ذرات یعنی ایٹم کا ترتیبی مجموعہ ہوتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایک عنصر کے ایٹم دوسرے عنصر کے ایٹم سے مختلف ہوتے ہیں۔ اتنا معلوم ہونے پر بھی عرصۂ دراز تک ایٹم اور اس کی خوردی کا صحیح تصور قائم کرنا دشوار رہا۔ آخر ایک وقت ایسا بھی آگیا جب لوگوں کو ایٹم کے بھی ٹکڑے نظر آنے لگے۔ اس سلسلے میں جرمن ماہر طبیعات، رانجن (RONTGEN) کا نام خصوصیت سے آتا ہے۔ ایک دن وہ سر ولیم کروکس (SIR WILLIAM CROOKES) کے ایجاد کردہ قطب منفی شعاعوں (CATHODE RAY) کے آلے پر کام کر رہا تھا کہ اسے دفعتاً ایسی شعاعیں ملیں جو شیشے اور دیگر بہت سی چیزوں میں سے گذرنے کی طاقت رکھتی تھیں۔ ان شعاعوں کا نام رانجن نے "اکسرے" رکھا اور ان کے خواص معلوم کرنے کے لئے اس نے طرح طرح کے تجربات کئے۔ ان تجربات نے آنے والے سائنسدانوں کے لئے بہت سی نئی راہیں کھول دیں۔ اسی سلسلے میں مزید تحقیقات کے بعد ایک انگریز پروفیسر سر جان ٹامسن نے یہ دریافت کیا کہ قطب منفی شعاعیں، منفی برق پاروں کا ایک متحرک اجتماع ہوتی ہیں اور یہ برق پارے ایٹم کا ایک جز ہوتے ہیں۔

ایٹم کیا ہے؟

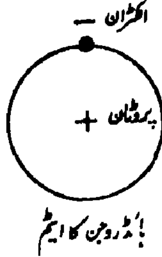
ایٹم کے وجود سے آج کوئی ذی فکر منکر نہیں لیکن اُسے انفرادی

---

[1] دنیا کی ہر وہ شے جس کا طبعی طور سے احساس ہو سکتا ہے مادّہ کہلاتی ہے۔

[2] عہد قدیم کے فلسفیوں نے آب، آتش اور ہوا کو عنصر قرار دیا تھا مگر یہ اشیا مرکب ثابت ہوئیں۔ جدید تشریح کے مطابق اس وقت تک سو سے اوپر عناصر دریافت ہو چکے ہیں جن میں بہت سی گیسیں جیسے ہائیڈروجن، آکسیجن وغیرہ، کچھ رقیق اشیا جیسے برومین (BROMINE) اور متعدد ٹھوس چیزیں جیسے سونا، چاندی، ریڈیم اور یورنیم وغیرہ شامل ہیں۔

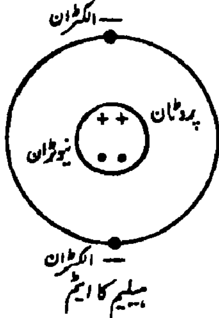
حیثیت سے نہ تو کسی نے دیکھا ہے اور نہ دیکھ سکتا ہے۔ ہم کسی عنصر کو چھوٹے چھوٹے ذرات میں منقسم کر سکتے ہیں اور پھر ممکن ہے ان ذرات کے بھی ٹکڑے ہو سکیں لیکن آخر میں ایک حد ایسی آجائے گی جب ذرات کی تقسیم ناممکن ہو جائے گی اور یہ حد اس وقت پہنچے گی جب ذرات طبیعی حیثیت سے نکل کر تخئیلی جسامت اختیار کر لیں گے۔ دراصل عناصر کے یہی چھوٹے سے چھوٹے اجزا جو انفرادی حیثیت سے وجود نہیں رکھتے منفقہ حالت میں مادّے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مادہ عناصر سے بنتا ہے اور عنصر ایٹموں کی مجموعی شکل ہے۔ علاوہ بریں مختلف عناصر کے ایٹم ایک دوسرے سے جداگانہ ہوتے ہیں۔ ان کی ساخت اور وزن سب ہی میں فرق ہوتا ہے۔ مگر ان ایٹموں میں آپس میں اتنی مناسبت ضرور ہے کہ ان کی تعمیر مثبت اور منفی برق[1] سے ہوتی ہے۔ ہر ایٹم کی مثبت برق اس کے مرکز پر رہتی ہے اور منفی برق مرکز کے گرد محور پر۔ یہ ترتیب نظام قدرت میں سورج اور اس کے گرد گھومنے والے سیاروں سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ ایٹم میں مثبت اور منفی برق کا تناسب کچھ ایسا ہوتا ہے کہ مرکزی برقی اکائیوں (PROTONS) کا مثبت بار[3] محور کے منفی برق پاروں (ELECTRONS) کے منفی بار کے ساتھ تعادل (BALANCE) قائم رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر سب پیشتر ہائڈروجن کے ایٹم کا جائزہ ہی زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ ایٹم سب سے ہلکا ہوتا ہے اور اس میں واحد مثبت برقی اکائی[2] پروٹان (PROTON) کہلاتی ہے۔ اس پروٹان کا مثبت بار[3] محور کے تنہا برق پارے (الکٹران ـ ELECTRON) کے منفی بار کو بے تاثیر کرتا ہے۔



ہائڈروجن کا ایٹم

ایک پنہاں قوت الکٹران اور پروٹان کے درمیان ہمیشہ کچھ فاصلہ قائم رکھتی ہے۔ اگر یہ قوت فاصلہ قائم نہ رکھے تو الکٹران، پروٹان کی سمت کھنچ آئے اور ایٹم کی شکل ہی بدل جائے۔

اب اگر ہم ایک دوسرے عنصر ہیلیم[4] (HELIUM) کی جانچ کریں تو اس میں مرکز پر دو پروٹان ملیں گے اور محور پر دو الکٹران۔ ان کے علاوہ ہیلیم کے مرکز پر کچھ ایسے خفیف ذرات بھی ہوتے ہیں جن میں نہ تو مثبت برق ہوتی ہے اور نہ منفی مگر ان میں پروٹان کی طرح وزن ہوتا ہے۔ ان خفیف ذرات کو نیوٹران (NEUTRON) کہا جاتا ہے۔ اس طرح ہیلیم کے ایٹم کا وزن اس کے دو نیوٹران اور دو پروٹان کا مجموعی وزن ہوتا ہے۔



ہیلیم کا ایٹم

ہائڈروجن اور ہیلیم کے ایٹم ہلکے ایٹموں میں گنے جاتے ہیں۔ اب اگر ہم کچھ بھاری ایٹموں کی طرف رجوع ہوں تو ہم کو ان میں ایک محور کی جگہ کئی

---

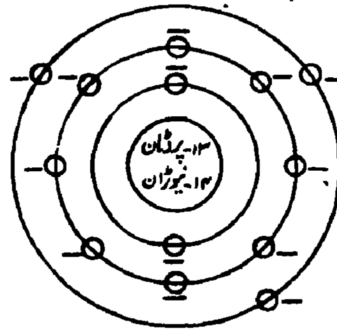
[1] تقریباً ہر مادّی شے برقی تاثرات سے معمور ہے اور اس میں دو اقسام کی برق پنہاں ہوتی ہے جو ایک دوسرے سے متضاد ہونے کے باعث اس وقت تک محسوس نہیں ہوتی جب تک دونوں متضاد اقسام کو الگ الگ نہ کر لیا جائے۔ برق کے ان دو اقسام میں سے ایک کو منفی برق اور دوسری کو مثبت برق کہا جاتا ہے۔

[2] مثبت برق کا سب سے چھوٹا تخئیلی جز۔

[3] بار بڑی حد تک مقدار سے تعلق رکھتا ہے۔

[4] یہ ایک گیس ہے جس کی بہت قلیل مقدار ہوا میں ملتی ہے۔

کئی محور ملیں گے۔ مثال کے طور پر الومنیم کے ایٹم میں تین محور ہوتے ہیں جہاں پہلے محور پر دو، دوسرے پر آٹھ اور پھر تیسرے پر تین الکٹران ہوتے ہیں۔ ایٹم کے مرکز پر تیرہ پروٹان اور چودہ نیوٹران ہوتے ہیں۔ اس ایٹم کا وزن اس کے تیرہ پروٹان اور چودہ نیوٹران کے مجموعی وزن کے برابر ہوتا ہے اور اس کے تیرہ پروٹان کا مثبت برقی بار تیرہ الکٹران کے منفی برقی بار سے مساوی ہوتا ہے۔



الومنیم کا ایٹم

(نفی کے نشان سے الکٹران مراد ہے)

اس طرح مختلف عناصر کے ایٹموں کی ساخت الگ الگ ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی صورت ایسی پیدا کی جاسکے کہ آسانی سے ان ایٹموں میں پروٹانوں کی تعداد گھٹ بڑھ سکے تو ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں بدلنا دشوار نہ ہوگا۔ اسی تحقیق کی بنا پر کچھ عناصر کو تبدیل کرنے میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔ الومنیم، فاسفورس[4] میں میں بدلا جاچکا ہے۔ مگر یہ فاسفورس جلد ہی یعنی تقریباً سوا دو منٹ میں سلیکن[5] (SILICON) میں تبدیل ہوگیا۔ اس قسم کے تغیر کے لئے عناصر کو ایسی شعاعوں سے متاثر کیا جاتا ہے جو ان عناصر کے مرکزی پروٹانوں کی تعداد میں اضافہ یا کمی پیدا کرسکیں۔ ان شعاعوں میں ایک تو وہ شعاعیں ہیں جو مثبت برقی پاروں کا اجتماع ہوتی ہیں۔ اُن کو "الفا" شعاعیں کہا جاتا ہے۔ دوسری "بیٹا" (BETA)

۴ ایک ٹھوس عنصر جو ہوا لگتے ہی بلند شعلوں کے ساتھ جلنے لگتا ہے۔

۵ ایک عنصر ہے جو ریت سے حاصل ہوتا ہے۔

شعاعیں کہلاتی ہیں جو منفی برقی پاروں سے مل کر بنتی ہیں اور تیسری "گاما" شعاعیں ہیں جن میں بظاہر برقی تاثرات نہیں ہوتے۔ ان تینوں اقسام کی شعاعیں کچھ مخصوص عناصر جیسے یورینیم (URANIUM) اور ریڈیم (REDIUM) وغیرہ سے نکلتی ہیں۔ ان عناصر کے ایٹموں میں خود بخود تغیر ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر یورینیم کی ایک قسم جسے 238۔U کہا جاتا ہے کچھ عرصے کے بعد خود بخود ایک دوسرے عنصر "تھوریم" میں بدل جاتی ہے اور اس تبدیلی کے دوران یورینیم سے الفا شعاعیں رہا ہوتی رہتی ہیں۔ یہ سلسلۂ تبدل یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ عرصۂ دراز تک چلتا رہتا ہے جس سے متواتر الفا اور بیٹا شعاعیں رہا ہوتی رہتی ہیں اور یکے بعد دیگرے کئی عناصر بنتے رہتے ہیں۔ آخر میں جب یورینیم سیسے میں بدل جاتا ہے تو تغیرات کی کڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ اس قسم کے از خود رفتہ تغیر کو ریڈیائی سرگرمی (RADIO ACTIVITY) کہا جاتا ہے۔ ریڈیائی سرگرمی رکھنے والے چار خاص عناصر یورینیم، تھوریم (THORIUM) پروٹو ایکٹینیم (PROTOACTINIUM) اور پلوٹونیم (PLUTONIUM) وغیرہ ہیں جو خود کردہ ریڈیائی سرگرمی کا مظاہرہ کرتے کرتے ایک مدت کے بعد فنا ہوجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے عناصر بھی ہیں جو مختلف شعاعوں سے متاثر کئے جانے پر ریڈیو ایکٹو[6] ہوجاتے ہیں۔ ان کی ایک مثال المونیم ہے جو الفا شعاعوں سے اثر پذیر ہوکر فاسفورس میں بدل جاتا ہے اور یہ فاسفورس ریڈیو ایکٹو ہوتا ہے۔

ابتدائی سرگرمیاں

تقریباً ۱۹۲۰ء سے ایٹم اور اس کے متعلق تحقیق ہر ملک کے سائنس دانوں کے لئے ایک بہت ہی مرغوب مشغلہ رہا اور ایٹم کی شکستگی[7] کی نئی نئی تدبیروں کی جانچ برابر ہوتی رہی۔ اسی دوران میں ایک نیا آلۂ کار 'نیوٹران' جس کا ذکر پہلے آچکا ہے سائنس دانوں کے ہاتھ لگا اور اس سے نیوٹران زنی کرکے بہت سے ایسے ایٹموں کو توڑ

۶ ریڈیائی سرگرمی کے مظاہرے کی صلاحیت حاصل کرلینا۔

۷ ایٹم میں موجود پروٹانوں کی تعداد میں تبدیلی پیدا کرنا۔

کیا جا سکا جو الفا۔ بیٹا یا دیگر شعاعوں سے اثر پذیر نہ ہوتے تھے۔ علاوہ بریں ایسے ایٹم جو الفا یا بیٹا شعاعوں کے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے نیوٹران سے تسخیر کئے جانے پر ادر ہی گل کھلانے لگے۔ نیوٹران کے ذریعہ بوچھار (BOMBARDMENT) کرکے یورینیم ایٹم کے قلب کو اس طرح شکستہ کر دیا گیا کہ اس سے دو مختلف عناصر بیریم اور کرپٹان حاصل ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ بہت سے یعنی تقریباً چودہ نئے نیوٹران بھی رہا ہوئے جو مزید توانائی کا وسیلہ بنے۔ اس مشاہدے نے ایٹم کی شکستگی کے ذریعے حصولِ توانائی کی امید دلائی۔ یہ ایک لحاظ سے اس خیال کی تجدید تھی جس کا اظہار ۱۹۲۴ء میں شفیلڈ یونیورسٹی کے ڈاکٹر ٹی۔ ایف۔ وال نے کیا تھا۔ ڈاکٹر وال نے جب ایٹم کی شکستگی کے متعلق اعلان کیا تو انھیں بہت سے خطوط موصول ہوئے جن میں انھیں بہت برا بھلا کہا گیا تھا۔

اب ایٹم کی شکستگی اور اس شکستگی سے رہا ہونے والی طاقت پر قابو پانے کی ہر طرف کوششیں ہو رہی تھیں۔ اس سلسلے میں فرانس کے سائنس داں جولیو (JOLIOT) اور ان کی بیوی آیرین کیوری (IRENI CURIE) اٹلی کے سائنس داں فرمی (FERMI) آسٹریا کی ماہرہ طبیعات ڈاکٹر لائز میٹنر (MEITNER) اور جرمنی کے دو ماہر طبیعات آٹو ہان (OTTO HANN) اور اسٹراسمین (STRASSMAN) کے نام خصوصیت سے آتے ہیں۔ یہ سب سائنس داں اپنی اپنی تحقیقات کے سلسلے میں آپس میں تبادلۂ خیال کرکے امید افزا نتائج پر پہنچتے رہے۔ ڈاکٹر میٹنر، آٹو ہان اور اسٹراسمین ایک ساتھ کام کر رہے تھے لیکن ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر میٹنر کو یہودن ہونے کے سبب سے جرمنی چھوڑنا پڑا۔ اسی دوران میں فرانس کے جولیو اور کیوری نے تجربوں کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ اگر یورینیم کے ایٹم کا انشقاق[1] (FISSION) کیا جائے تو کچھ نیوٹران رہا ہوں گے۔ یہ نیوٹران جب ایٹم کے دوسرے مرکزہ جات (NUCLEI) پر زور آزمائی کریں گے تو مزید نیوٹران ملیں گے اور اس طرح ان پیکر توانائی الکٹرانوں کی رہائی کا ایک سلسلہ قائم ہو جائے گا۔ اس سلسلے کو مسلسل تعامل (CHAIN REACTION) کہا جاتا ہے۔ معمولی یورینیم کے ذریعے مسلسل تعامل کا امکان نہیں بلکہ اس کے لئے یورینیم کی مخصوص قسم 235 - U درکار ہے۔

پہلا ایٹم بم

یہاں تک جو کچھ ہوا وہ سب کے علم میں ہوا لیکن مزید تحقیق کا کام در پردہ کیا جانے لگا اور ہر ترقی یافتہ ملک اپنی اپنی جگہ یہ کوشش کرتا رہا کہ ایٹمی توانائی کو کس صورت لڑائی میں استعمال کیا جائے۔ ایک عرصے تک بظاہر خاموشی رہی مگر اس خاموشی کے بعد آنے والے طوفان نے سب سے پہلے جاپان کے شہر ہیروشیما کو اپنا نشانہ بنایا۔ ہیروشیما پر ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو پہلا ایٹم بم پھینکا گیا۔ یہ بم سویرے ہی گرایا گیا اور زمین سے تقریباً ایک ہزار فٹ کی بلندی پر پھٹا۔ بم پھٹتے ہی اس میں رکھا ہوا یورینیم ۲۳۵ (U - 235) انتہائی گرم گیسوں میں تبدیل ہو گیا۔ یہ گیسیں اس قدر گرم تھیں کہ گرد و نواح کی ہوا تک جلنے لگی اور پھر ساتھ ہی ساتھ U - 235 سے نکلنے والی گاما شعاعوں نے پے در پے حملے کرکے جاندار اور بے جان سب پر تباہی مچا دی۔ جاندار مرنا شروع ہو گئے اور عمارتیں وغیرہ زلزلے کے مانند جھٹکوں سے گرنے لگیں۔ آن کی آن میں تقریباً ایک لاکھ افراد مر گئے اور اتنے ہی ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گئے۔ ایسے خوش قسمت معدودے چند تھے جو اس آفتِ ناگہانی سے بالکل بچے رہے۔ زخمیوں کی حالت بہت ہی بری تھی۔ کہا جاتا ہے کہ زندہ اور مردہ کی تفریق دشوار ہو گئی تھی۔ زندوں میں زیادہ تر ایسے تھے جو آنکھیں کھولے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ ان میں اتنا بھی دم نہ تھا کہ کراہ سکیں یا ہل سکیں۔ اس وقت کی ہیبت اور بے بسی کا عالم ایک لڑکے شوزو نشیو (SHUZO NISHIO) نے اس طرح بیان کیا ہے :-

"جب آگ تھوڑی کم ہوئی تو ہم پہاڑی سے اتر کر شہر میں داخل ہوئے۔ وہاں جدھر بھی نگاہ جاتی تھی مُردوں کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ ان مردوں کے چہروں اور جسم پر بڑے بڑے آبلے تھے اور ان کی آنکھوں سے ایک عجیب طرح کا تیل جیسا رقیق مادہ نکل رہا تھا۔ شہر کی ہر چیز راکھ

---

[1] کیمیاوی طریقوں سے خفیف اجزا میں منتشر کر دینا.

ہو چکی تھی اور وہ راکھ اب بھی گرم تھی۔ کل ہم سب ایک ساتھ تھے
مگر آج میرے علاوہ باقی سب راکھ ہو چکے ہیں"

یہ بم جو ہیروشیما پر گرایا گیا اس کی طاقت اتنی تھی جتنی ٹرائی نائٹرو ٹالوین (TRINITROTOLVENE) یا ٹی۔ این۔ ٹی[1] سے تیار کئے گئے اتنے بڑے بم کی ہوتی ہے جو تقریباً بیس ہزار ٹن ٹی۔ این۔ ٹی سے بنایا گیا ہو۔ دوسرا ایٹم بم جاپان ہی کے ایک ایک شہر ناگاساکی میں گرایا گیا۔ اپنی مقررہ ایک ہزار فٹ کی بلندی پر نہ پھٹنے کے سبب سے یہ بم پہلے بم کا جتنا تباہ کن ثابت نہیں ہوا مگر اس کی تباہ کاریاں اور اثرات بھی معمولی نہ تھے۔ ان بموں نے جنگ عظیم اور ساتھ ہی ساتھ جاپان کا تو خاتمہ کر دیا مگر لوگوں کی اس سے بھی زیادہ خطرناک بم بنانے کی ہوس کو اور بڑھا دیا۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں روس نے ہائڈروجن بم بنانے کا اعلان کیا اور ۱۹۵۴ء میں امریکہ نے ہائڈروجن بم کا کامیاب تجربہ کیا۔ اس کے بعد ہی ان دونوں ملکوں نے اپنے اپنے بموں کی طاقت آزمانا شروع کی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

ایٹم بم کی بناوٹ

متعدد وجوہ کی بنا پر اس بارے میں کوئی تفصیل وار تحریر پیش کرنا ممکن نہیں مگر ہاں کچھ موٹی موٹی باتوں کا ذکر ضرور کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی ریڈیائی سرگرمی رکھنے والے عناصر جیسے یورینیم یا پلوٹونیم کو نیوٹران کے ذریعے مشتعل کیا جائے تو یہ عناصر متعدد نیوٹران رہا کرتے ہیں اور یہ رہا شدہ نیوٹران فوراً ہی مزید نیوٹران کے وجود میں آنے کا باعث ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک دور و تسلسل شروع ہو جاتا ہے اور عنصر کا مرکزی مجموعہ (NUCLEUS) ہلکے ہلکے حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ اس تبدیلی کو مرکزی انشقاق (NUCLEAR FISSION) کہا جاتا ہے اور یہ انشقاق کثیر توانائی کی رہائی کا باعث ہوتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک

کلوگرام یورینیم یا پلوٹونیم کے انشقاق سے تقریباً اسی قدر طاقت پیدا ہوتی ہے جتنی بیس ہزار ٹن ٹی۔ این۔ ٹی کے پھٹنے سے۔ یورینیم وغیرہ کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اگر ان کا حجم (SIZE) ایک مخصوص حجم سے بڑھ جاتا ہے تو ان میں خود بخود انشقاق واقع ہوتا ہے۔ اب اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ عناصر خود بخود نہ پھٹیں اور وقت معینہ تک محفوظ رہیں تو یہ ضروری ہے کہ حجم کے اعتبار سے ہم ان کی اتنی ہی مقدار کو یکجا رکھیں جتنی از خود انشقاق کی صلاحیت نہ رکھتی ہو۔ ایٹم بم یورینیم اور اس قسم کے دوسرے عناصر کے انھیں خواص کو مد نظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔ اس بم کے خول میں یورینیم یا پلوٹونیم کے الگ الگ دو ڈھیر صرف اتنے بڑے ہوتے ہیں جن میں خود سے انشقاق کی صلاحیت نہیں ہوتی مگر جب یہ دونوں ڈھیر آپس میں مل جاتے ہیں تو ان کا حجم اتنا ہو جاتا ہے کہ خود بخود انشقاق واقع ہوتا ہے۔ ڈھیروں کو ایک دوسرے سے ملانے کا کام کلوں کے ذریعے سے ہوتا ہے جو ایک مقررہ وقفے میں اپنا کام پورا کرتی ہیں۔

ایٹم بم سے بھی زیادہ خطرناک ہائڈروجن بم ہے جو قدرت میں واقع ہونے والے ان تغیرات کو پیش نظر رکھ کر بنایا گیا ہے جو سورج کے شدید ترین درجۂ حرارت سے منسلک ہیں۔ سورج کی سطح کا درجۂ حرارت تقریباً دو کروڑ ڈگری ہے۔ اس درجۂ حرارت پر گرد و نواح کی ہائڈروجن ہیلیم میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس غیر معمولی درجۂ حرارت پر یہ کیمیاوی تبدیلی شدید ہیجان کا باعث ہوتی ہے۔ اسی ہیجان کو دوسرے الفاظ میں توانائی کہا جاتا ہے۔ ہائڈروجن بم کی تباہ کن توانائی کی تخلیق انھیں اصولوں پر ہوتی ہے۔ اس بم میں بھی ہائڈروجن کو ہیلیم میں تبدیل کرتے ہیں مگر یہاں معمولی ہائڈروجن کی بجائے ایک خاص قسم کا ہائڈروجن (جس کے ایٹم کا وزن ایک نہیں دو ہے، جسے بھاری ہائڈروجن کہتے ہیں) استعمال ہوتا ہے۔ اس بھاری ہائڈروجن میں کیمیائی انقلاب پیدا کرنے کے لئے جو بلند درجۂ حرارت درکار ہے وہ ایٹم بم مہیا کرتا ہے کیونکہ انشقاق کے وقت وسط ایٹم بم کا درجۂ حرارت تقریباً اتنا ہی ہوتا ہے جتنا سطح آفتاب کا۔ اس طرح یورینیم کا ایٹم بم ہائڈروجن

---

[1] یہ ایک رقیق شے ہے جو تھوڑی ہی گرمی پانے پر شدید دھماکے کے ساتھ پھٹتا ہو یہ بم بنانے کے کام آتا ہے۔

بم میں فلیتے کا کام کرتا ہے۔

ایٹم بم کے پھٹنے کے اثرات

ایٹم بم کے پھٹتے ہی گاما شعاعیں اور نیوٹران کی لہریں تیزی سے فضا میں پھیلنے کی کوشش کرتی ہیں اور انشقاق کے بعد تقریباً ایک منٹ تک ان کی رہائی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسی اثنا میں ایٹم بم کے شق شدہ اجزا کا درجۂ حرارت کئی کروڑ ڈگری ہو جاتا ہے اور ان سے پیدا ہونے والی گیسیں جن کا دباؤ بھی کرۂ باد کے دباؤ کا کئی کروڑ گنا ہوتا ہے ایک بڑے گولے کی شکل میں اوپر اٹھتی ہیں۔ اوپر اٹھنے کے دوران اس گولے کا درجۂ حرارت کئی بار گھٹتا بڑھتا ہے اور آخر میں یہ گولہ تیز رفتاری سے بلند ہونا شروع ہوتا ہے۔ گیسوں کے اس گولے کے تیزی سے بلند ہونے کے باعث ایک خلا سا قائم ہو جاتا ہے جس کو پر کرنے کے لئے گرد و غبار اس کثرت سے اٹھتا ہے کہ اس کے بادل چھا جاتے ہیں۔ اب یہ گولہ غائب ہونا شروع ہوتا ہے اور اس کی جگہ کھمبے کی شکل کا گیسوں کا ایک بادل چھا جاتا ہے۔

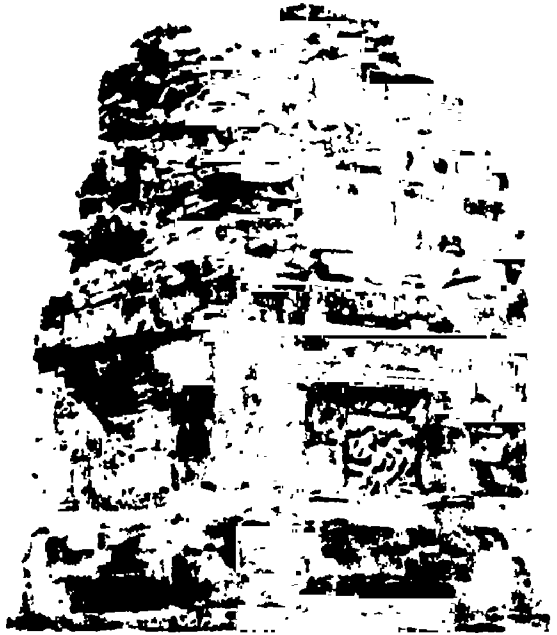
ایٹم بم سے رہا ہونے والی توانائی کا تقریباً تہائی حصہ حرارتی توانائی کی شکل میں رونما ہوتا ہے جس میں اتنی تمازت ہوتی ہے کہ تقریباً تین فرلانگ کے دائرے میں کاغذ جل اٹھتا ہے۔ اس کے علاوہ ایٹم بم کی چمک اپنی پوری آب و تاب پر چمکتے ہوئے سورج سے تقریباً پانچ سو گنی ہوتی ہے۔ جہاں ایٹم بم پھٹتا ہے وہاں سے کافی فاصلے تک اس کی تابندگی بینائی کو ختم کر سکتی ہے۔ ایٹم بم کی توانائی کا دو تہائی حصہ صدمہ رساں لہروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ لہریں فضا میں اس قدر تلاطم برپا کرتی ہیں کہ ان کے سبب سے جو تباہی ہوتی ہے وہ شدید زلزلوں کی بربادی سے بھی تجاوز کر جاتی ہے۔ بڑی بڑی عمارتیں ہوا کے غیر معمولی دباؤ سے آن کی آن میں ڈھیر ہو جاتی ہیں اور ان گرتی ہوئی عمارتوں کے منتشر ٹکڑے ایسی تیز رفتاری سے اڑتے ہیں کہ یہ خود گولیوں اور چھوٹے بموں کا کام کرتے ہیں۔

ایٹم بم کی تباہ کاریوں کی شدت کا انحصار کئی اور باتوں پر بھی ہوتا ہے مثلاً یہ کہ بم زمین پر پھٹا ہے یا زمین سے کچھ بلندی پر۔ مثال کے طور پر اگر ایک بھاری بیس میگاٹن ٹی۔ این۔ ٹی کی طاقت رکھنے والا ایٹم بم سطح زمین سے کچھ بلندی پر پھٹتا ہے تو اس کی صدمہ رساں لہریں جائے وقوع سے تقریباً ۵، مربع میل کے رقبے میں ساری عمارتوں اور درختوں وغیرہ کو گرا دیں گی اور اس کی تمازت کے مضر اثرات تقریباً ۱۵ میل تک ہر چہار طرف محسوس کیے جائیں گے۔ کچھ فاصلے تک تو گرمی اتنی شدید ہوگی کہ انسان کی کھال تک خود بخود جل جائے گی۔ صدمہ رساں لہروں اور گرم شعاعوں کے علاوہ جو بلائیں سطح زمین پر نازل ہوتی ہیں ان کی کرشمہ سازی تو چند ہی سکنڈ رہتی ہے مگر اس کے بعد جو تباہ کن اثرات وجود میں آتے ہیں وہ عرصہ دراز تک انسان کی ہمیت کی پردہ پردری کرتے رہتے ہیں چنانچہ اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ ایٹم بم کی ریڈیائی شعاعوں سے مسموم فضا نہ صرف موجودہ نسل کے لیے مضر ثابت ہو بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی ضرر رساں ہو۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ریڈیائی ہیجان تین قسم کی شعاعوں کی صورت میں رونما ہوتا ہے جن کو الفا، بیٹا اور گاما شعاعوں کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کے علاوہ انشقاق کے سبب سے ریڈیو ایکٹو عناصر کے چھوٹے چھوٹے ذرات بھی اکثر بادلوں کی شکل میں فضا میں چھا جاتے ہیں۔ یہ ذرات فضا پر اس وقت تک طاری رہتے ہیں جب تک وہ ہلکے رہتے ہیں لیکن گرد و غبار سے وابستہ ہونے پر ان کا وزن بڑھ جاتا ہے اور اس وقت یہ آہستہ آہستہ زمین پر گرنا شروع ہوتے ہیں۔ اسی منظر فطرت کو ریڈیائی فال آوٹ (FALL OUT) کہا جاتا ہے۔ "فال آؤٹ" کے ذریعہ بہت سے ضرر رساں عناصر جیسے اسٹرانشیم۹۰[1] (STRONTIUM – 90) اور آیوڈین ۱۳۱ (IODINE – 131) وغیرہ سطح زمین پر پہنچ کر طرح طرح کے نقصانات کا باعث ہوتے ہیں۔ ایسے بیشتر عناصر کی ایک محدود مقدار ہماری تندرستی اور اعضاء کی نشو و نما کے لیے ضروری ہے مگر ان کی زیادتی طرح طرح کے نقصانات پہنچنے کے امکانات پیدا کر دیتی ہے۔ اسٹرانشیم۔۹ اپنی ریڈیائی سرگرمی کے باعث "بیٹا"

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۳ پر)

[1] اسٹرانشیم ایک دھات ہے۔





وملا ساھنی

اتر پردیش میں للت پور (ضلع جھانسی) سے ٹک بھگ ۱۹ میل دور، بیتوا ندی کے کنارے "دیوتاؤں کی سرزمین" دیوگڑھ واقع ہے۔ دیوگڑھ اب ویران ہوگیا ہے اور چاروں طرف جنگلوں سے گھرا ہوا ہے لیکن ایک زمانے میں وہ اس راستہ پر واقع تھا جو اتر میں پوا یا کو دکھن میں ایران بھلسا اودے گری اور سانچی سے ملاتا تھا۔ دیوگڑھ کے مندروں کی تاریخ کا سلسلہ گپت عہد تک پہنچتا ہے اور وہاں اس عہد کے کئی اور مندروں کے بھی آثار پائے گئے ہیں۔ دیوگڑھ میں گپت عہد کے بعد کے بنے ہوئے مندروں میں کئی جین مندر بھی ملتے ہیں جو پہاڑیوں پر بنے ہیں۔

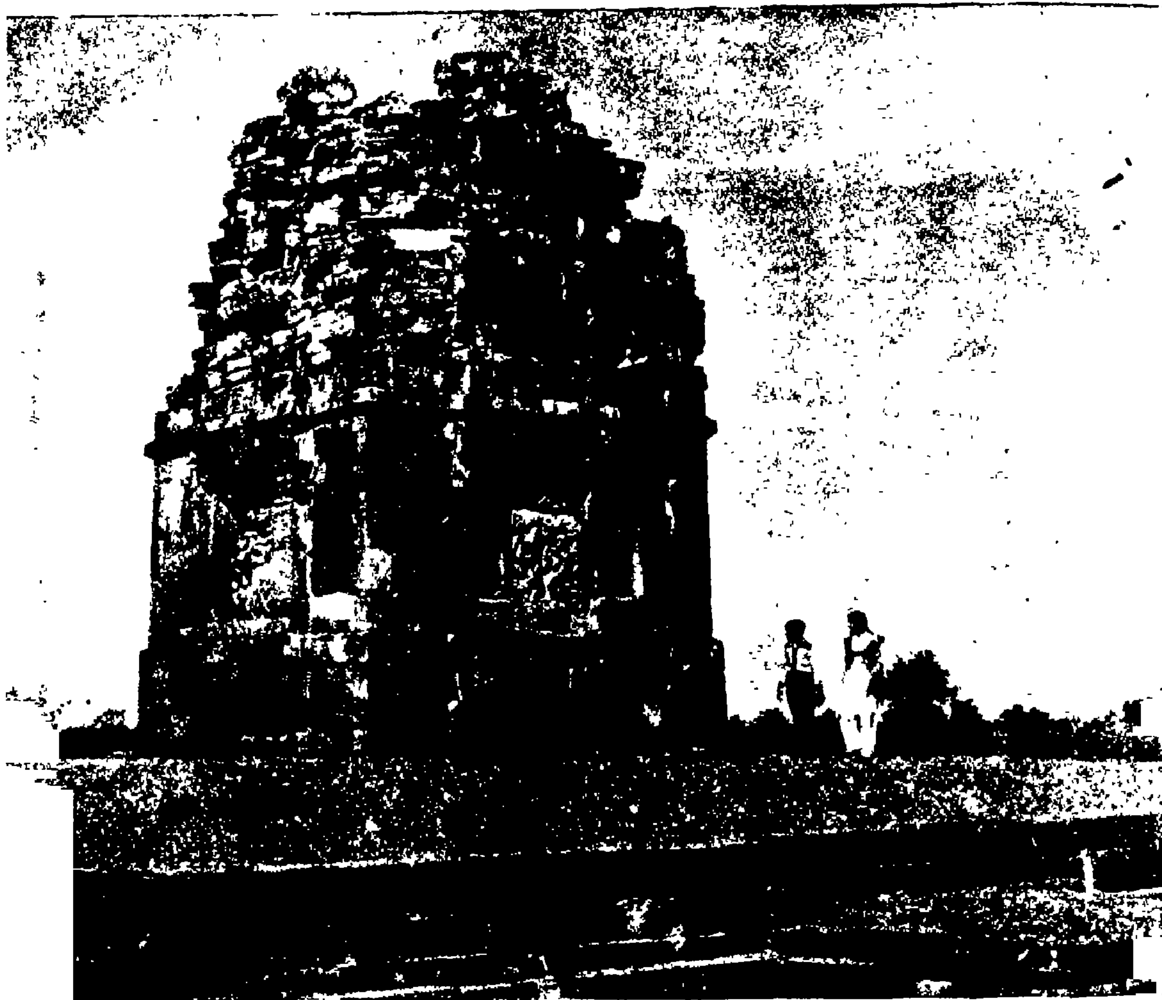
دیوگڑھ کے ان مندروں میں گپت عہد کے ایک وشنو مندر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس مندر کو دشاوتار (دس اوتاروں کا مندر) کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ مندر، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھری ہوئی ایک افتادہ زمین پر بنا ہوا ہے۔ اس کی طرز تعمیر اور اس کے اعلیٰ درجہ کے مجسموں کی بنا پر دیا رام ساہنی، پرسی براؤن اور مادھو سروپ وتس نے اس مندر کی تعمیر کا زمانہ چھٹی صدی عیسوی کا ابتدائی دور مقرر کیا ہے، بنرجی نے چھٹی صدی عیسوی کا آخری دور قرار دیا ہے اور کننگھم نے ساتویں صدی کا ابتدائی زمانہ۔ اگر اس مندر کا دوسرے مقامات مثلاً بھٹا، کٹھاری، بھمرا، اودے گری وغیرہ کے مندروں سے مقابلہ کیا جائے تو بہ خوبی اندازہ ہو جائے گا کہ اس چھوٹی سی مگر شاندار تعمیر میں گپت طرز تعمیر اپنے معراج کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ مندر کی خاص مورتی چوں کہ گم ہو گئی ہے اس لیے اس بارے میں قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں کہ یہ مندر کس دیوتا کے لیے بنوایا گیا تھا مگر تہ خانے کے دروازے کے لنٹل کے للاٹ بمبہ (بالائی حصہ) پر اننت پر بیٹھے ہوئے وشنو کی مورتی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وشنو مندر ہی تھا۔ کھدائی کے دوران وشنو کی کئی مورتیاں اور ان کے علاوہ دیواروں پر کئی ایسی پٹیاں دستیاب ہوئی ہیں جن پر وشنو کے مختلف اوتاروں مثلاً رام، کرشن، نرسنگھ، وامن کی کتھائیں

۱؎ گپت عہد، ہند قدیم کا عہد زریں۔

۲؎ ہندوستان کے آثار قدیمہ کے ماہرین۔

۳؎ نرسنگھ، وشنو جی کے اوتار تھے۔ ہرن کشیپ، راکشسوں کا ایک راجہ تھا اور اُسے وشنو جی سے خاص عداوت تھی۔ مگر اس کا لڑکا پرہلاد، وشنو جی کا بڑا

(بقیہ حاشیہ ۳؎ اور حاشیہ ۴؎ صفحہ ۲۹ پر)

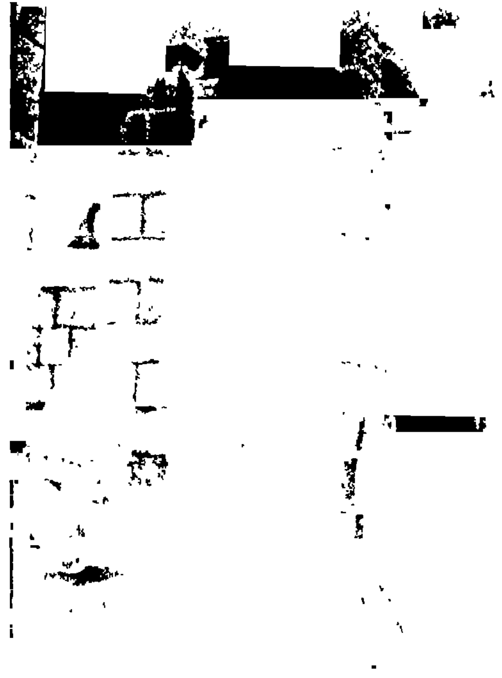


دیوگڑھ کا وشنو مندر۔

دیوگڑھ کے مندر کی

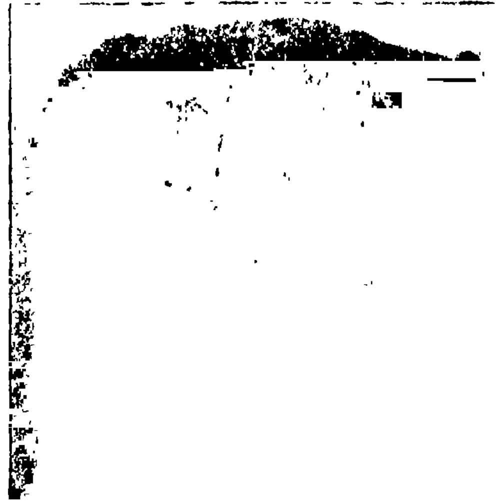


مندر کے جنوبی



مندر کا ستون

م چندر جی تیر چلا رہے ہیں اور لکشمن جی اپنی کمان کھینچ رہے ہیں



تراشی کے کچھ نمونے



سامنے دروازے کے داہنے بازو کے نیچے کے حصے میں ایک جوڑا (مرد عورت) ایک خادم اور ایک

وشنوجی کے ہاتھوں "گجیندر موکش" ہاتھی کی نجات (سندھ کے شمال کی جانب)





نت سائی



دیوگڑھ کے مندر کی مشرقی دیوار میں سنگ تراشی کا ایک نمونہ
جس میں نر نارائن کو تپسیا کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

کھدی ہوئی ہیں۔ اس وجہ سے اس مندر کو دشاوتار مندر کہنا حق بجانب معلوم ہوتا ہے۔

اس عمارت میں گپت مندروں کی چپٹی چھت کی جگہ "شکھر"[۴] طرز نے لے لی ہے۔ دراصل پتھر کے بنے ہوئے مندروں میں شکھر طرز کا یہ پہلا نمونہ ہے۔ پوجا گنش (پوجا کا خاص کمرہ) کا بالائی حصہ اہرام کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ بدقسمتی سے مندر کا بالائی حصہ کھنڈر بن چکا ہے اس لیے اس کی شکل کی تفصیلات نہیں بتلائی جا سکتیں۔ دروازے کے بازوؤں پر کھدی ہوئی تصویروں کا مطالعہ کرنے سے البتہ اس کے متعلق کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مندر ایک بلند چبوترے کے بالکل بیچ میں بنا ہوا ہے۔ دیارام ساہنی کی نگرانی میں جو کھدائی ہوئی اس کے نتیجے میں کونوں پر مربع بنیادیں نمودار ہوئیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل مندر "پنچایتن"[۵] نمونے کا رہا ہوگا جس کے بیچ کی عمارت خاص پوجا کے لیے مخصوص تھی اور چاروں کونوں پر چار چھوٹی تعمیرات یا عبادت کدے تھے۔

مندر تک پہنچنے کے لیے چاروں طرف سے زینے بنے ہوئے ہیں۔

(بہ سلسلہ صفحہ ۲۳)

عقیدت مند تھا۔ باپ نے اس پر ناراض ہو کر بیٹے کو کئی مرتبہ قتل کرنے کا حکم دیا لیکن لڑکا کسی نہ کسی طرح ہر مرتبہ بچ گیا۔ آخر ہرن کشیپ نے اُسے ایک کھمبے میں بندھوا دیا اور تلوار لے کر خود اسے قتل کرنے چلا۔ اُسی وقت کھمبا پھٹا اور وشنوجی نرسنگھ کے روپ میں اس سے نکل پڑے۔ (یہ روپ نصف شیر اور نصف آدمی کا تھا)۔ کھمبے سے نکلتے ہی نرسنگھ نے ہرن کشیپ پر حملہ کر دیا اور اُسے چیر پھاڑ ڈالا۔

[۲] وامن بھی وشنوجی کے ایک اوتار تھے۔ بلی، راکششوں کا ایک راجہ تھا مگر دیوتاؤں کے راجہ اندر سے بھی زیادہ طاقت حاصل کرنے اور ان کی گدی چھیننے کے لیے اس نے زبردست تپسیا اور ریاضت شروع کر دی۔ آخر وشنوجی وامن (یعنی بونا) کے روپ میں بلی کے پاس گئے اور اس سے تین قدم زمین دان کے طور پر مانگی۔ بلی بڑا سخی تھا۔ اس نے اجازت دے دی۔ وامن نے تین قدم میں تینوں لوک (عالم) کا احاطہ کر لیا۔ اس طرح بلی کی ساری مملکت اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور اسے وہاں سے چلے جانے پر مجبور ہونا پڑا لیکن وشنوجی نے اس کی تپسیا کی وجہ سے اُسے پاتال (زمین کے نیچے) کا راجہ بنا دیا۔

[۴] شکھر ایک طرح کی چھت۔

[۵] وہ عمارت جس میں پانچ عمارتیں ایک دوسرے سے ملحق ہوں اور سب مل کر ایک عمارت کہی جائے۔ چار عمارتیں چار گوشوں میں ہوتی ہیں اور ایک وسط میں۔

مندر میں پوجا کا خاص کمرہ (گربھ گرہ) ۱۰ فٹ ۶ انچ مربع تھا۔ اس کا اندرونی حصہ تو نہایت سادہ ہے مگر اس کے برعکس پچھم جانب کے دروازے پر نہایت ہی نفیس نقش و نگار کھدے ہوئے ہیں۔ باقی تین جانب کی دیوار پر باہر کی طرف دھنسی ہوئی پٹیوں پر وشنو کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ پٹیاں بھی سنگ تراشی کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور دروازے کے نقش و نگار سے ہم آہنگ۔ کھدائی میں چند کھمبے بھی ملے جن سے کنگھم اور برجی برادوں نے یہ قیاس کیا ہے کہ چاروں طرف سائبان (پورٹیکو) رہے ہوں گے جو ان کھمبوں پر قائم تھے۔

بہرحال، مندر کا حسین ترین حصہ مغربی جانب کا دروازہ ہے۔ اُس کے بازو چار پہل کے ہیں اور ہر پہل منقش ہے۔ ہر پہل کے نیچے کے حصے میں ایک بونا بنا ہے جس کے توند نکلی ہے اور وہ ایک کلش (گھڑا) لیے ہوئے ہے جس سے بیلیں باہر نکلی ہوئی دکھائی پڑتی ہیں۔ باہری کناروں کے لنٹل پر اپنے اپنے واہن پر (گاڑیاں) بیٹھی ہوئی گنگا اور یمنا کی مورتیاں ہیں۔ بعد کے مندروں میں یہ مورتیاں نیچے کے حصے میں بنائی جانے لگیں "للاٹ بمب"[۶] کی متوازی پٹی کے بیچ میں اننت[۷] پر بیٹھے ہوئے چار ہاتھ والے وشنو کی مورتی بنی ہوئی ہے۔

مندر کے تینوں طرف ۵ فٹ چوڑی اور ۴ فٹ اونچی دھنسی ہوئی پٹیاں (SUNK PANELS) ہیں جن میں وشنو کی کتھاؤں کو دکھاتے ہوئے پتھر کے ابھرتے ہوئے مجسمے بنے ہیں۔ یہ پٹیاں (PANELS) دیوار میں کھدے ہوئے کھمبوں (جن کے صرف سامنے کا حصہ بنا ہوا ہے) اور مرغول گر یعنی (ARCHITRAVES) کے بیچ میں بنے ہیں۔ ابھری ہوئی تصویروں کے ذریعہ جو ان میں سے داہنی طرف ایک دائرہ کی طرح بنی ہیں "گجیندر موکش"[۸] کی کتھا پیش کی گئی ہے۔ اس سین میں ایک ہاتھی کو دکھایا گیا ہے جو کنول کے ایک تالاب میں کھڑا ہے۔ ایک ناگ اس کے پیروں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اور وشنو (جنھیں سب سے اوپر گرڑ پر بیٹھے ہوئے اور داہنے ہاتھ میں گرز لیے ہوئے دکھایا گیا ہے) ہاتھی کو ناگ کی لپیٹ سے

---

[۶] دروازے کے اوپر

[۷] ایک سانپ جس کے ہزار پھن بتاتے ہیں اور وشنوجی جس سے ٹیک لگا کر آرام کرتے ہیں۔

آزاد کر رہے ہیں۔ ناگ کا جوڑا ہاتھ جوڑے ہوئے معافی کا طلبگار ہے اور ہاتھی اُٹھتی ہوئی سونڈ میں وشنو کو نذر کے طور پر کنول پیش کر رہا ہے۔ اوپر ایک پٹی میں پرواز کرنے والی آسمانی مخلوق ایک مکٹ (تاج) کو ہاتھ میں لیے ہوئے مشرقی دیوار پر نر اور نارائن کی پراسچت (کفّارہ) کا منظر کھدا ہوا ہے۔ یہ دونوں درختوں کے نیچے چٹانوں پر بیٹھے ہیں۔ دوسری پٹی پر برہما کو دکھایا گیا ہے جن کے دونوں طرف آسمانی مخلوق نظر آ رہی ہے۔

جنوب کی جانب وشنو اننت شائی کو سات سروں والے سانپ (شیش ناگ[11]) پر آرام کر رہے ہیں۔ شیش ناگ کا پھن دیوتا کے سر پر چھتر کا کام دے رہا ہے۔ ان کے پاؤں کے پاس لکشمی دیوی ہیں اور پس منظر میں بھو دیوی[12] اور گرڑ[13] ہیں۔ پٹی کے اوپر کے حصے میں ایک کنول پر برہما بیٹھے ہیں اور ان کے ایک جانب اِندر[14] اور کارتکیہ[15] اور دوسری جانب شِو[16] گوری ہیں۔ نیچے ایک پٹی ہے جس میں چھ شکلیں بنی ہوئی ہیں۔

مندر کی کرسی پر جو پٹیاں ہیں ان میں رام اور کرشن کی کتھاؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً رام اہلیا[17] کا اُدھار کر رہے ہیں۔ رام اور سیتا بن کو جا رہے ہیں، نند[18] اور یشودھا، کرشن اور بلرام کو گود میں لیے ہیں، کرشن "شکٹ لیلا"[19] کر رہے ہیں۔ اسی طرح وشنو کے دوسرے اوتار بھی پیش کیے گئے ہیں۔

اِس مندر کے اگرچہ بہت سے مجسّمے گم ہو گئے ہیں اور بہت تھوڑے سے باقی رہ گئے ہیں لیکن جو ہیں وہ فن کی ایسی پختگی کا ثبوت دیتے ہیں جس کی مثال ہندستان کی سنگ تراشی اور مجسمہ سازی کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ دیومالا کی کتھائیں پٹیوں میں جس حسن اور خوبصورتی سے کھودی گئی ہیں، چوکھٹوں میں جو نفاست اور نزاکت پائی جاتی ہے، مجسموں میں جو تناسب اور زندگی ملتی ہے اور ان میں جو روحانی سکون اور وقار پایا جاتا ہے ان سب کی وجہ سے یہ مجسمے اور شکلیں آرٹ کے یقیناً اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔



۹۔ ارجن اور کرشن جی کے نام ہیں۔

۱۰۔ وشنو جو اننت کے سہارے آرام کر رہے ہوں۔

۱۱۔ سانپوں کا راجہ اننت

۱۲۔ زمین کی دیوی ۔ پرتھوی

۱۳۔ چڑیوں کا راجہ

۱۴۔ دیوتاؤں کا راجہ

۱۵۔ دیوتاؤں کا سپہ سالار

۱۶۔ شنکر پاروتی ۔

۱۷۔ رام چندر جی جب سوئمبر میں دھنش توڑنے جا رہے تھے تو راستے میں انھیں ایک پتھر دکھائی دیا۔ انھیں یہ بتایا گیا کہ یہ گوتم رشی کی بیوی اہلیا ہیں جو کسی بددعا کی وجہ سے پتھر ہو گئی ہیں اور اب آپ انھیں نجات دے سکتے ہیں۔ رام چندر جی نے اُن کا اُدھار کیا اور وہ پھر عورت بن گئیں۔

۱۸۔ نند ۔ یشودھا۔ کرشن جی کو ان کے پیدا ہوتے ہی ان کے ماموں کنس نے قتل کر ڈالنا چاہا۔ اس پر ان کے والدین نے کرشن جی کو نند اور اُن کی بیوی یشودھا کے پاس پرورش کے لیے خفیہ طور سے بھیج دیا۔ نند اور یشودھا نے انھیں اپنے لڑکے کی طرح پالا۔ بلرام انھیں نند اور یشودھا کے لڑکے ہیں۔

۱۹۔ کرشن جی کی ماں (یشودھا) جب کسی کام میں مصروف ہوتیں تو کرشن جی کو ایک گاڑی میں لٹا دیتیں۔ کنس کو اس کا پتہ چل گیا اور اس نے ایک راکشش کو بھیجا کہ جب یشودھا کرشن کو پالنے میں لٹا کر کوئی کام کرنے چلی جائیں تو راکشش کرشن جی کو مار ڈالے۔ راکشش کرشن جی کی گاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ یشودھا، گاڑی میں کرشن جی کو لٹا کر کہیں چلی گئیں مگر کرشن جی کو راکشش کی آمد کا علم ہو چکا تھا۔ انھوں نے اپنی شکتی (روحانی طاقت) کے زور سے گاڑی کو راکشش پر گرا دیا اور اس گاڑی میں اتنا وزن پیدا کر دیا کہ راکشش اس کے بوجھ سے دب کر مر گیا۔ اسے "شکٹ لیلا" کہتے ہیں۔ ———— امنا چتر

تکنیکی تعلیم

اجاریہ جگل کشور

مہاتما گاندھی نے جب انقلاب کی علامت "چرخہ" کو لے کر ملک کی قیادت سنبھالی تو ملک کے اس طبقے نے جو عوام کی فلاح کا دلی طور پر متمنی تھا ایک نئے انداز فکر کو اپنایا۔ اس طبقے نے یہ محسوس کیا کہ ملک کی اقتصادی زبوں حالی کی اصل وجہ وہ نظام تعلیم ہے جو ہاتھ کی محنت کے کام کے لئے نفرت اور کلرکی کے لئے رغبت پیدا کرتا ہے۔ اس زمانے میں تعلیم کو پھیلانے کے لئے جس نظریے پر عمل کیا جاتا تھا اس کے پس پشت خود غرضی، اقتصادی استحصال، تفریق پیدا کرنے کی سوچی سمجھی پالیسی کار فرما معلوم ہوتی تھی۔ ان حالات کا تقاضہ یہ تھا کہ نظام تعلیم میں کلی تبدیلی کی جائے لیکن اس زمانے میں یہ کام ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ ایک طرف مغربی ممالک زندگی کی تمام آسائشوں اور خوش حالی سے بہرہ مند تھے اور دوسری طرف ہمارے ملک میں لوگ بھوکے، مزدور غیر ہنرمند اور پیداواری طریقے فرسودہ تھے۔ یہ محسوس کیا گیا کہ تعلیم اور اقتصادی ترقی لازم و ملزوم ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اقتصادی ترقی لانے کے لئے پہلا اقدام یہ کیا گیا کہ بنیادی تعلیم کا ایک ایسا نظام بنایا گیا جس میں دستکاری کی تربیت کو مرکزی مقام دیا گیا۔ ملک میں تکنیکی اداروں کی مانگ بھی بڑھنے لگی اور ۱۹۴۷ء تک ملک میں ڈگری کورس کے اداروں کی تعداد ۳۸ تک پہونچ گئی جن میں ۲۹۴۰ طلبا کے داخلے کی گنجائش تھی اور ان اداروں سے ۱۲۷۰ گریجویٹ پاس ہو کر نکلے۔ ڈپلوما تک ڈپلوما کورسوں کے اداروں کی تعداد ۵۳ تک پہنچ گئی تھی جن میں ... طلبا کے داخلے کی گنجائش تھی [illegible] اور ان سے ۱۵۰۰ ڈپلوما ہولڈر پاس کر نکلے۔ اس نظریے کو روز افزوں تقویت حاصل ہوتی گئی کہ عوام کا بہتر معیار زندگی تکنیکی ترقی پر منحصر ہوتا ہے اور تکنیکی ترقی کے لئے تربیت یافتہ افراد ضروری ہوتے ہیں۔ انسانی طاقت سے متعلق کمیٹی نے سائنسی اور تکنیکی عملہ کا ایک قومی رجسٹر بنانے کی سفارش کی اور یہ قاعدہ بنایا گیا کہ اس رجسٹر میں وہی افراد شامل کئے جائیں گے جو کم سے کم بی۔ایس۔سی ڈگری۔ انجینیرنگ ڈپلوما یا اس میں ڈپلوما کے حامل ہوں گے۔ ۱۹۴۷ء میں انجینیروں کی تعداد ۱۰ ہزار تھی۔ ۱۹۵۱ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۱۵ ہزار اور ۱۹۵۵ء میں تقریباً ۲۵ ہزار ہو گئی۔ لیکن یہ تعداد ضرورت کے لئے کافی نہ تھی۔ ۱۹۵۶ء میں یہ اندازہ لگایا گیا کہ ملک میں تقریباً ۱۸۰۰ انجینیروں کی اور ضرورت ہے اور ۱۹۵۶-۱۹۶۱ء کی مدت میں تقریباً ۳۶۰۰ انجینیروں کی اور ضرورت پڑے گی۔ دوسرے منصوبے کی مدت کے [illegible] ان مختلف زمروں کے ۲۸۳۰ انجینیروں اور ۴۹۰۰ ڈپلوما ہولڈروں کی ضرورت تھی۔ انجینیروں کی فراہمی اور تخمینی تعداد شمار کے موازنے سے دیکھا گیا کہ ۱۹۶۰-۶۱ء میں ملک میں انجینیرنگ کی مختلف شاخوں میں تقریباً ۱۸۰۰ گریجویٹوں اور ۸۰۰۰ ڈپلوما ہولڈروں کی کمی تھی۔ تیسرے منصوبے [illegible]

[illegible]

[illegible]

کے ضمن میں بھی یہ بھی پالیسی تیسرے منصوبے کی مدت [illegible]

(۱۹۶۱-۶۲ء) میں ۲۵۵۰۰ ایگری کلچرل گریجویٹوں یا سالانہ تقریباً ۹۰۰۰ کی ضرورت کا اندازہ لگایا گیا تھا جب کہ اس وقت محض ۱۶۰۰ طلبا کی تعلیم کی سہولتیں دست یاب ہیں۔ اسی طرح نگہداشت مویشیان، ڈیری، مچھلیوں کا محکمہ، مٹی کے تحفظ، زراعتی مارکٹنگ، زراعتی تحقیق، زراعتی اعداد و شمار، زراعتی معاشیات اور پودوں کے تحفظ کے ضمن میں بھی ٹکنیکل عملے کی کمی ہے۔ علاوہ ازیں کیمسٹ، کیمیکل ٹیکنالوجسٹ اور ماہرین طبیعات، ارضیات، حیاتیات اور نباتات وغیرہ کی بھی کمی ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے دوسرے منصوبے کے دوران انجینئرنگ کالجوں میں داخلے کی گنجائش بڑھا دی گئی اور پالی ٹیکنیک کی تعداد تگنی کر دی گئی۔ پیشے کی درجہ بندی کے لیے بین الاقوامی معیاری درجہ بندی کو کچھ رد و بدل کے ساتھ اپنایا گیا اور ۶۲ قسم کی صنعتوں کو تسلیم کیا گیا۔

تیسرے منصوبے کے تحت ڈگری کورسوں میں مزید ۱۲ ہزار اور ڈپلوما کورسوں میں مزید ۱۵ ہزار طلبا کے داخلے کی گنجائش پیدا کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا۔ اس نشانے کو پورا کرنے کے لیے انجینئرنگ کے نئے ادارے کھولے جائیں گے اور موجودہ اداروں کی توسیع کی جائے گی۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ انجینئرنگ کالجوں میں سالانہ تیس ہزار اور پالی ٹکنیک اداروں میں ۵۰ ہزار افراد کا داخلہ ہونا چاہیے۔ ریاستی حکومتوں کی ذاتی نئے اداروں کے قیام، موجودہ اداروں کو تقویت پہنچانے، ٹیچروں کو تربیت اور ان کو مزید وظائف دینے کی سکیمیں تیار کی گئی ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں دہلی میں ایک کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کھولا گیا اور ۱۴۱ طلبا کو مختلف ڈگری کورسوں میں داخل کیا گیا۔ علاوہ ازیں کانپور میں ایک ادارہ کو ترقی دی جا رہی ہے نیز بمبئی اور مدراس کے اداروں کو تقویت پہنچائی گئی ہے۔ اور کھڑک پور، بمبئی، مدراس، کانپور اور بمبئی کے قومی اہمیت کے اعلیٰ ٹکنیکی اداروں کو ملانے کے لیے پارلیمنٹ نے ۱۹۶۱ء میں ایک جامع قانون پاس کیا۔ ان اداروں کے پوسٹ گریجویٹ کورسوں میں طلبا کی مجموعی تعداد ۲،۲۳ تھی۔

دوسرے منصوبے کے دوران آٹھ ریجنل کالجوں کے لیے منظوری دی گئی تھی جن میں سے ایک کو چھوڑ کر سب کا قیام عمل میں آ گیا اور جو کالج دوسرے منصوبے میں نہیں قائم ہوا تھا وہ اگست ۱۹۶۰ء میں الٰہ آباد میں کھولا گیا۔ علاوہ ازیں مزید سات ریجنل کالجوں کے لیے منظوری دی گئی ہے۔ یہ کیرالا، گجرات، پنجاب، راجستھان، مدراس، آسام اور اڑیسہ میں کھولے جائیں گے۔ کیرالا اور گجرات کے کالج وی کودی اور سورت کے مقام پر قائم ہو چکے ہیں۔

ریاستوں نے تیسرے منصوبے کے تحت ۱۰ انجینئرنگ کالج اور ۱۰۰ پالی ٹکنیک ادارے کھولنے کی تجویز ہے۔ سن ۱۹۶۱-۶۲ء میں ریاستی حکومتوں نے ۱۰ انجینئرنگ کالج اور ۴۵ پالی ٹکنیک ادارے قائم کیے۔ حکومت اڑیسہ نے رورکیلا میں ایک انجینئرنگ کالج قائم کیا۔

لڑکیوں کے پالی ٹکنیک ادارے قائم کرنے کے لیے ایک سکیم بنائی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ۱۰۰ جونیئر ٹیکنیکل اسکولوں کے قیام کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ ان اسکولوں میں سے منصوبے کے پہلے برس میں ۱۱ اسکول یعنی مدراس میں ۳، آندھرا پردیش میں ۲، مدھیہ پردیش میں ۲ اور کیرالا میں ۴ کھولے گئے ہیں۔

ٹکنیکی اداروں میں داخلے کی گنجائش ڈگری کورسوں میں ۱۵۶۹۰ اور ڈپلوما کورسوں میں ۲۴۶۶۴ تک پہنچ گئی۔ سن ۱۹۶۱-۶۲ء میں ان اداروں میں ۳۰۰۰ گریجویٹ اور ۱۰۳۵۰ ڈپلوما ہولڈر کامیاب ہو کر نکلے۔ علاوہ ازیں صنعتی انجینئرنگ کی تربیت کا ایک قومی ادارہ، فاؤنڈری کا ایک قومی ادارہ، پرنٹنگ ٹیکنالوجی کا ایک مرکزی ادارہ بھی قائم کیا جا رہا ہے۔

ریاستوں میں ٹکنیکی تعلیم کی ترقی کے مطالعے سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ ریاستوں نے اس ضمن میں نمایاں ترقی کی ہے۔ پہلے منصوبے کے دوران جو اداروں کی تنظیم کی گئی اور ٹکنیکی تعلیم کی توسیع کا بندوبست کیا گیا۔ دوسرے منصوبے کے دوران ٹکنیکی عملے کے سلسلے میں ایک جامع پالیسی بنائی گئی۔ ٹکنیکی سازوسامان اور مختلف درجوں کے ٹکنیکی عملے کی ضروریات کا اندازہ لگایا گیا جس کے نتیجے میں موجودہ اداروں کو تقویت پہنچائی گئی اور نئے ادارے کھولے گئے جن میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کانپور، محکمہ صنعت کے تحت ۵ انجینئرنگ ادارے ۔۔۔ کے تحت ۵ مزید ادارے نجی انتظام کے تحت اور دوسرے کے ۱۲ اسکول جن میں سے کچھ بعد کو ختم کر دیئے گئے، شامل ہیں۔ اب تک ۴ اداروں یعنی علی گڑھ یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، رڑکی یونیورسٹی اور انجینئرنگ کالج آگرہ میں ڈگری کے معیار کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ڈگری انجینئرنگ اداروں کی تعداد بڑھا کر ۴

سے ۱۶ اور ڈپلوما کے اداروں کی ۵۰ سے ۲۵ کردی گئی۔ ڈگری کے نصاب میں داخلوں کی گنجائش جو سن ۵۷-۱۹۵۶ء میں ۶۰۴ تھی سن ۶۱-۱۹۶۰ء میں بڑھ کر ۹۹۰ ہوگئی جب کہ ڈپلوما کے نصاب میں داخلوں کی گنجائش جو سن ۵۷-۱۹۵۶ء میں ۱۱۲۰ تھی سن ۶۱-۱۹۶۰ء میں بڑھ کر ۲۸۵۰ ہوگئی۔ پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے ضمن میں رڑکی یونی ورسٹی میں ۱۹۰ اور ہارکورٹ بٹلر ٹیکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ میں ۳۰ طلبا کے داخلوں کی گنجائش ہے۔

ترقیاتی پروگرام کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ڈگری کورسوں میں داخلوں کی گنجائش میں ۴۹ کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ گورکھ پور میں ایک نیا انجینیرنگ کالج قائم کیا گیا ہے جس میں سالانہ ۱۲۰ طلبا کے داخلوں کی گنجائش ہے۔ الہ آباد میں موتی لال نہرو ریجنل انجینیرنگ کالج قائم کیا گیا ہے جہاں ۶۰ طلبا کے داخلے کی گنجائش ہے۔ انجینیرنگ کالج دیال باغ آگرہ کے داخلوں کی گنجائش میں ۶۰ کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ بستی گونڈہ اعظم گڑھ اور مرادآباد میں ڈپلوما کے معیار کے ۵ ادارے قائم کرنے کی تجویز ہے جس میں سے ہر ایک میں ۶۰ طلبا داخل کیے جاسکیں گے۔ علاوہ ازیں سری نگر (گڑھوال) میں بھی ایک ادارہ قائم کرنے کی تجویز ہے جس میں ۱۲۰ طلبا کا داخلہ ہوسکے گا۔ رڑکی، گورکھ پور اور بڑوت کے کمتر معیار کے اداروں کو ترقی دی جا رہی ہے تاکہ ان میں داخلوں کی گنجائش ۶۰ سے ۱۲۰ ہوجائے۔ علاوہ ازیں بلیا، الہ آباد، میرٹھ اور مظفر نگر کے کمتر معیار کے اداروں کو اس حد تک ترقی دی جائے گی کہ وہ ٹکنیکی تعلیم سے متعلق کل ہند کاؤنسل کے مقررہ معیار پر پورے اتر سکیں۔ ان اداروں میں داخلوں کی گنجائش ۶۰ سے بڑھا کر ۱۲۰ کردی جائے گی۔ موجودہ منصوبے کے دوران بریلی، جھانسی، نینی تال، چندولی (دارانسی)، ہنڈیا (الہ آباد) کے ڈپلوما اداروں، سول انجینیرنگ اور ہیوٹ پولی ٹیکنیک اور ہندو ایجوکیشن سوسائٹی پالی ٹیکنیک لکھنؤ اور ٹیکنکل کالج دیال باغ آگرہ میں سے ہر ایک میں مزید ۶۰ نشستوں کے بندوبست کی تجویز ہے۔ لکھنؤ میں لڑکیوں کے لیے پالی ٹیکنیک کھولنے کی تجویز ہے۔ ریاست میں چمڑہ کی صنعت کی ترقی کے پیش نظر آگرہ میں چمڑہ کی ٹکنیک سے متعلق ایک ڈپلوما ادارہ کھولنے کی تجویز ہے۔ علاوہ ازیں کانپور کے موجودہ ادارے کی حالت بھی بہتر بنائی جائے گی۔ الہ آباد کے ناردرن ریجنل اسکول آف پرنٹنگ کو ترقی دینے کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔

قومی سطح پر تحقیق کی تربیت سے متعلق وظیفہ کی اسکیم کے تحت دوسرے پنجسالہ منصوبے کے دوران ۵۰۰ وظیفے منظور کیے گئے تھے وظیفوں کی تعداد بڑھا کر ایک ہزار کرنے کی تجویز ہے۔ سن ۶۲-۱۹۶۱ء کے دوران قومی ریسرچ فیلوشپ کے تحت ۲۱ فیلو نے کام کیا اور ڈپلوما اور ڈگری کورسوں میں نئے داخلوں کے لیے ۱۷۰۰ وظیفے منظور کیے گئے اور گزشتہ سال کے ۱۹۰۷ منظور شدہ وظیفے اعلیٰ درجوں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے جاری رکھے گئے۔ زیر نظر سال میں ۲۳۴ ٹیچروں کو تربیت دی گئی۔

ستمبر سن ۱۹۵۶ء میں کابینہ کی سطح پر وزیر اعظم کے زیر صدارت انسانی طاقت سے متعلق ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی اور وزارت داخلہ کے تحت انسانی طاقت سے متعلق ایک نظامت قائم کی گئی تھی جس پر کابینی کمیٹی کے لیے سکریٹریٹ کی فراہمی اور اس کے فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کی ذمہ داری عاید کی گئی ہے۔ مرکزی حکومت کی ہر وزارت میں ایک مین پاور آفیسر کی تقرری کی گئی ہے اور ہر ریاستی حکومت نے ایک مین پاور پلاننگ آرگنائزیشن قائم کیا ہے۔ انسانی طاقت سے متعلق نظامت کا کام ان سرگرمیوں میں رابطہ پیدا کرنا اور منصوبہ بندی کمیشن سائنسی اور صنعتی تحقیق سے متعلق کاؤنسل، مرکزی پبلک سروس کمیشن، یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن اور انسانی طاقت کے مسائل سے متعلق دیگر اداروں سے تعاون کرنا ہے۔ اقتصادی ترقی کے سلسلہ میں انسانی قوت پر ہر زمانے سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ ایک قوم کا اقتصادی مستقبل جمع شدہ دولت پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار اس کی دولت پیدا کرنے کی قوت پر ہے۔ اس طرح تعلیم اور اقتصادی دولت ایک سرے سے وابستہ ہیں کیوں کہ نظام تعلیم کے دانش مندانہ اطلاق کے ذریعے دولت پیدا کرنے کی استعداد حاصل کی جاسکتی ہے۔



ذوق

اور

علمِ تصوّف

محمد انصار اللہ نظر

کبھی میں شیخ شیوخ اور کبھی شیخ رئیس
کبھی علّامہ کبھی صوفی صافی طینت

اپنے متعلق شیخ محمد ابراہیم ذوق کے اس عجب کو بظاہر شاعرانہ تعلی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذوق کے کلام میں تصوف پر نہ صرف کثرت سے اشعار ملتے ہیں بلکہ ان اشعار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کو مسائل تصوف پر پورا عبور حاصل تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مجموعی طور پر اردو شاعری، خصوصاً غزل، میں تصوف کا عنصر عموماً حاوی رہا ہے اور اساتذۂ متقدمین کے کلام میں تو صوفیانہ خیالات اور مضامین بہت نظر آتے ہیں۔ ذوق کے عہد میں بھی تصوف کا اردو شاعری میں بڑا دخل تھا۔ غالب جیسے "بادہ خوار" نے بھی "مسائل تصوف" کے بیان کو بڑی اہمیت دی تھی لیکن ذوق نے اپنے اشعار میں مسائل تصوف کو جس انداز اور جامعیت سے پیش کیا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تصوف کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کے اسرار و رموز اور اس کی باریکیوں سے انھیں اتنی واقفیت تھی جتنی ان کے ہم عصروں کو شاید نہ تھی۔ اس سلسلہ میں دو رائیں ملاحظہ ہوں:

"تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تفسیر کبیر دیکھ کر اٹھے ہیں۔ خصوصاً تصوف میں ایک خاص عالم تھا۔ جب تقریر کرتے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں۔ وحدت وجود اور وحدت شہود میں علم اشراق کا پرتو دے کر کبھی ابو سعید ابوالخیر ستھے کبھی محی الدین عربی۔ پھر جو کہتے ایسی کانٹے کی تول کہتے تھے کہ دل پہ نقش ہوجاتا تھا۔ جو کچھ ان سے لیا ہے آج تک دل پر نقش ہے۔" (آب حیات: ص۴۷۹)

"خسرو روزگار کی بہ دولت جس قدر درجہ اعتبار کا بلند ہوا مرتبہ پندار کا پست اور جتنا دبستان کمال میں ہوشیار ہوا میکدۂ عرفان میں مست۔۔۔ اگر علم کی آنکھ باریک بینی کی طرف متوجہ ہوتی کثرت میں معنی وحدت کو صورت کثرت سے روشن تر مشاہدہ کرتی۔۔۔" (گلستان سخن)

تصوف کا رنگ ذوق کے اولین اشعار میں بھی ملتا ہے۔ یہ رنگ پختگی سن و سال کے بعد پختہ ہوتا جاتا ہے اور جب وہ مسائل تصوف پر اچھی طرح عبور حاصل کر لیتے ہیں تو وہ زاہد اور فاسق سب کو ایک درجہ میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ ؎

مت بھول بندگی پر غرّے میں آکے، بندے   زاہد ہے تا بہ فاسق سب ہیں خدا کے بندے

تصوف کی ابتدا کے متعلق اختلاف ہے۔ ذوق اس اختلاف میں تو نہیں پڑتے البتہ اتنا کہتے ہیں کہ تصوف سے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا جب تک دل کی صفائی نہ کی جائے۔ ؎

تا صاف کرے دل نہ مصفّا سے صوفی   کچھ سودِ صفا علم تصوف نہیں کرتا

وہ اپنے اشعار میں موقع بہ موقع دل کی صفائی پر زور دیتے ہیں اور مختلف مثالوں کے ذریعہ اس کی اہمیت ثابت کرتے ہیں، اس کے فواید بیان کرتے ہیں، "اہل صفا" کی خصوصی اوصاف کا تذکرہ کرتے ہیں اور پھر صفائی دل کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ ؎

خاکِ آئینہ سے ہے نام سکندر روشن   روشنی دیکھتا گر دل کی صفائی کرتا

دل صاف ہو تو چاہیے معنی پرست ہو   آئینہ خانہ خانۂ صورت پرست ہے

ہے آئینہ خانہ بھی گذرگاہ بد و نیک   دیکھا نہ کبھی ہم نے در اہل صفا بند

صفائے دل کی یہی ہو صورت کہ دل میں آنے نہ دے کدورت
کہ بیٹھ جائیں گے بالضرورت اس آئینہ میں یہ زنگ ہو کر

روضۃ الصفا بڑی اہم تاریخ ہے جو تیموریوں کے دور میں تصنیف ہوئی۔ یہ کتاب سات جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں اسلام اور ایران کی تاریخ اور خاص کر تیموری دور کے حالات ابوالغازی سلطان حسین (متوفی ۹۱۲ھ) کی سلطنت کے آخر تک کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مصنف محمد بن خاوند شاہ بن محمود معروف بہ میر خواند بلخ کے نجیب زادوں میں تھا اس نے ۹۰۳ھ میں بہ مقام ہرات وفات پائی۔ بعد میں اس کتاب پر چند جلدوں کا اضافہ کیا گیا۔ بہادر شاہ کے زمانہ تک ہندوستان میں بھی اس تصنیف کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ لیکن ذوق کے نزدیک دل کی صفائی مطالعۂ کتب اور ایسی اہم کتاب سے بھی زیادہ ضروری تھی۔

پڑھے کتاب کے قصوں میں کیا کرو دل خوش   جو دل ہو صاف بہ از روضۃ الصفا سمجھو

صفائی دل کے متعلق ذوق نے ایک بڑی دلچسپ بات کہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو لوگ سیاہ دل ہیں وہ اگر صاف دلوں سے ملیں گے تو ان کے دل کی سیاہی اور شدت اختیار کرے گی۔ ظاہرا یہ بات عجیب ہے لیکن غور کرنے سے حقیقت نما ہو جاتی ہے۔ سیاہی اور سفیدی کا امتیاز اندھیرے میں ممکن نہیں۔ البتہ روشنی میں کسی چیز کی سیاہی اور صفائی دونوں کھل کر سامنے آجاتی ہیں حتی کہ اگر معمولی بھی ہو تو وہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ گویا روشنی کسوٹی ہے اور صاف دل بزرگوں کی حیثیت بھی یہی ہے۔ جب تک ان سے سابقہ نہ ہو ہم اپنے ڈگر پر بسر کر سکتے ہیں لیکن جب ان کی صحبت میں آئیں گے تو ہمارے دل کی بھلائی برائی کھل کر سامنے آجائے گی۔ ذوق کہتے ہیں۔

صحبت صاف دلاں سے ہوں مکدر تیرہ دل   زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں

ذوق نے اپنا مسلک بھی اس شعر میں ظاہر کر دیا ہے:

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں   اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

بہ حساب ابجد لفظ "حسد" کے ۷۲ عدد ہوتے ہیں۔ ذوق کا مطلب یہ ہے کہ میں مسلمانوں کے ۷۲ فرقوں کے اختلافات سے بالاتر ہوں۔

ایرانی تصوف کے دو شعبے ہیں۔ منفی اور مثبت۔ ذوق کے یہاں دونوں شعبوں کا ذکر آتا ہے۔ منفی شعبہ وہ ہے جس میں ترک دنیا، ترک علایق، ریاضت، قناعت، فقر اور کمبل پوشی (صوف بہ معنی کمبل کا لفظ خود اسی طرف اشارہ کرتا ہے) وغیرہ بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ذوق کے حسب ذیل اشعار مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں:

گر بعد فقر پھر سگِ دنیا ہوا فقیر   کمبخت پاک ہو کے پلیدوں میں مل گیا

تو نجس قوت دل کا کہ بڑی کاوش سے   اسم کو میں نے تہ کندہ کیا ہو اس میں

ہے جوہر کمال پہ ننگا اگر فقیر   ہے تیغ تیز ننگ ہے اس کو غلاف سے

مذکورہ اشعار میں ریاضت، ترک دنیا اور ترک لذات کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس موقع پر فقراء کے اس عقیدہ کی طرف اشارہ کر دینا بھی مناسب ہے کہ جب دل پر خدا کا نام نقش ہو جائے تو یہ کسی صورت سے مٹ نہیں سکتا۔ اس درجہ کو پہنچنے کے بعد فقیر کو کسی نوعیت کی آلودگی کا خطرہ نہیں ہوتا۔ اس وقت اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے:

منہ سے لگا ہوا ہے اگر جام مے تو کیا   ہے دل سے یاد ساقی کوثر لگی ہوئی

اور فقیر کو اگر شراب سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے اور شراب کے حرام ہونے کو بہ طور جواز پیش کریں تو وہ بلا خوف یہ کہہ سکتا ہے

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں   کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا

ذوق غالبا اس عقیدہ سے اس حد تک متاثر تھے کہ وہ اہل اللہ کی پاکیزگی اور ہر حال میں آلودگی سے غیر ملوث رہنے کے قائل تھے۔ چنانچہ مختلف مثالوں سے اس کی وضاحت کرتے ہیں:

ہو سکے آلودہ دامن پاک دامن کس طرح   اے زلیخا چھوڑ دامن یوسف کنعان کا

چشمۂ آئینہ میں کب تر ہوا پائے نگاہ   اس طرح جاتے ہیں دیکھا پاک دامن آب میں

آلودہ سر سے نہ ہوئی چشم میں نگاہ   دیکھا جہاں سے صاف ہی اہل صفا چلے

ایرانی تصوف کا یہ منفی شعبہ کہ جس میں تمام صفات عالم ظاہر کی نفی ہے ہندوستانی تصوف سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔ ذوق نے کہیں کہیں اس طرف بھی اشارے کر دیے ہیں مثلاً:

کسی کنج غم پہ ہے جوگی جو چشم ہند و نژاد   تو اس کو گھیرے ہیں مژگاں کے بالکے کیا

محو ہو جب تک کہ جوگی شغل استدراج میں   سینہ دم میں رکھے مرغ نفس کو اپنے مقام

ایرانی تصوف کا دوسرا شعبہ مثبت ہے اور اس میں سلوک، جستجو، طلب

ط مراحل، اخلاص، عبادت، ایثار، بے غرض خدمت، مطالعہ، تربیت نفس، محبت، کسب معرفت، مقام عشق الٰہی پر پہنچنے، اس کی ہستی میں خود کو فنا کر دینے اور اوامر حق پر مضبوطی سے پابند رہنے کو اصل جانتے ہیں۔ دیوان ذوقؔ میں اس سلسلے کے اشعار زیادہ ملتے ہیں اور شاید ذوقؔ اسی شعبہ تصوف پر خود بھی عامل و پابند تھے کیوں کہ انھوں نے بڑی شدت سے اوامر حق کے ترک کی مخالفت کی ہے۔ مثال میں یہ چند شعر حاضر ہیں: ـ

دیدۂ آبلہ پا کا تو یہی ہے رونا   کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج
دل عبادت سے چرانا اور جنت کی طلب   کام چور اس کام پر کس منہ سے اجرت کی طلب
ہو علاحدہ ہی یگانگی سے ہم آشنا بیگانگی سے   اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی کہ نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے
زمیں پہ نور قمر کے گرنے میں صاف اظہار دوستی ہے   کہیں جو روشن ضمیران کا فروغ انکی فروتنی ہے
اے ذوقؔ اس صور کدہ میں ہیں ہزاروں صور   کوئی صورت اپنے صورتگر کی بے صورت نہیں

تصوف کے اس مثبت تصور کو مان لینے کے بعد منفی پہلو کی بیشتر باتیں قابل عمل نہیں معلوم ہوتیں۔ چنانچہ ذوقؔ کے یہاں بھی اس کی مثالیں مل جاتی ہیں:

ممکن نہیں ہے ذوقؔ علائق سے چھوٹنا   جب تک کہ روح کو ہے علاقہ بدن کے ساتھ

کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ   گیا زباں سے نکل اس کی جیسے تیر از شست
گرو قطع تعلق کدام شد آزاد   بریدۂ زہمہ با خدا گرفتار است

رُباعی

اے ذوقؔ کرے گا کوئی دنیا کیا ترک   دنیا ہے بری بلا ارے کیسا ترک
ممکن نہیں ترک ہو کسی سے دنیا   جب تک نہ کرے آپ اپنے تئیں آپ ترک

تصوف کے مسائل میں "مسئلہ وحدت الوجود" کا ذکر اکثر آتا ہے اور ذوقؔ نے بھی اکثر اس مسئلے سے بحث کی ہے۔ یہاں مختصراً اس کا ذکر بھی مناسب ہو، حالاں کہ یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے اور خود اس کے بانی کے بیانات میں تضاد ملتا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر ابن عربی کہتے ہیں:

"اے وہ جو مجھ کو دیکھتا ہے اور میں اس کو نہیں دیکھتا۔ کتنی مرتبہ میں اس کو دیکھتا ہوں اور وہ مجھ کو نہیں دیکھتا۔"

اس پر گرفت ہوئی کہ وہ تم کو نہیں دیکھتا عجب کہ تم یہ جانتے ہو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے تو انھوں نے اس پر تضمین کر دی۔ کہا:

"اے وہ جو مجھ کو گنہگار دیکھتا ہے اور میں اس کو گرفت کرنے والا نہیں دیکھتا۔ کتنی مرتبہ میں اس کو احسان کرنے والا دیکھتا ہوں اور وہ مجھ کو پناہ لینے والا نہیں دیکھتا؟"

جس مسئلہ پر اس کا بانی خود مطمئن نہ ہو سکا ہو اس سے دوسروں کو کیا اطمینان حاصل ہو سکتا ہے؟ ذوقؔ نے مسئلہ کے اس پہلو کی طرف نہایت شاعرانہ انداز سے اشارہ کیا ہے:

لکھتا ہے شیخ مسئلۂ وحدت الوجود   لیکن دوئی عیاں ہے قلم کے شگاف سے

ابن عربی نے اس مسئلہ کو ثابت کرنے کے لیے جو دلایل پیش کیے ہیں وہ کئی ہیں۔ ایک یہ بھی ہے: "مجھے اس شخص کے مکلف بنانے پر تعجب ہے جس کا وہ خالق ہے حالاں کہ میں اپنا کوئی فعل نہیں دیکھتا۔ پس اے کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ کون مکلف ہے اس لیے کہ یہاں اللہ کے سوائے کسی اور کا وجود نہیں!"

یہ بات کہ ہر شے میں خدا کا جلوہ ہے مسلمہ حقیقت ہے۔ ذوقؔ نے اپنے ایک شعر میں ابن عربی کے مذکورہ خیال کو گویا اردو میں نظم کر دیا ہے۔ ـ

اس بت کدے میں کون ہے کافر ترے سوا   تو آپ بت پرست و بت و بت تراش ہے

تصوف کی ابتدا عقیدہ کی صورت میں ہوئی تھی لیکن رفتہ رفتہ اس نے ایک علم کی صورت اختیار کر لی چنانچہ دوسرے تمام علوم کی طرح اس کے بھی اصول و قواعد اور مصطلحات وضع و منضبط کیے گئے۔ وقت، مقام، حال، قبض، بسط، ہیبت، انس، تواجد، جمع، فرق، فنا، بقا، غیبت و حضور، ذوق و شرب، محو و اثبات، سر، تجلی، محاضرہ، مکاشفہ، تلوین و تمکین، قرب و بعد، خواطر، علم الیقین، حق الیقین، عین الیقین، ستر، ہجوم وغیرہ مشہور اصطلاحات ہیں۔ امام غزالی وغیرہ کے عہد تک ان میں بہت کچھ اضافے بھی ہوئے اور سالک، سکان، شطح، ذہاب، وصل و فصل، رغبت، وجد، علت، غیرت، حریت، غربت، ادب، ارادہ، ہمت وغیرہ الفاظ بھی مصطلحات کی حیثیت سے رائج ہوئے۔ ان مصطلحات کو استاد ذوقؔ نے خود سیکھا، سمجھا اور اردو شاعری میں منتقل بھی کیا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ذوقؔ نے پہلی مرتبہ اردو شاعری میں تصوف اور اس کی مصطلحات کو جگہ دی کیوں کہ ان سے پہلے مرزا مظہر اور خواجہ دردؔ جیسے بزرگ عالم صوفی شعرا بھی ہو چکے تھے لیکن یہ بہر حال صحیح ہے کہ ذوقؔ نے مختلف علوم کی مصطلحات کو نظم کرنے میں خاص دل چسپی لی اور اس طرح زبان کو علمی کاموں کے لیے تیار کر دیا۔ اس موقع پر چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

ہمیشہ ہے مجھے سرمایہ فنا میں بقا — حباب وار ہوں میں آبِ زندگانی میں

غافل جو دم کی آمد و شد سے نہ ہوئے تو — ہر دم ہے تجھ کو سیرِ وجود و عدم نصیب

نہ چھوڑے گی جیتا مجھے چشمِ قاتل — یقیں ہے یقیں بلکہ عین الیقیں ہے

ہے مقام زندگی زیرِ دمِ شمشیرِ مرگ — ہو گیا جس طرح کوئی دم گزارا ہو گیا

جامِ ہستی بھی لگا منہ سے نہ کچھ خوف کے ساتھ — ذوق کے ساتھ قدحِ ذوق سے پینا بھر کے

کیوں اتنا گراں ہے جو رختِ سفر بھی — اے راہ روِ ملکِ عدم اٹھ نہیں سکتا

یہ حیاتِ چند روزہ جو نہ سدِ راہ ہوتی — تو پھر ایک عرصہ گاہِ عدم و وجود ہوتا

کشتی سوار عمر ہے بحرِ فنا میں جسم — جس دم بہا کے لے گیا طوفان بہہ گیا

اے ذوق کس کو چشمِ حقارت سے دیکھیے — سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

فرشتے تیرے دامن کو بنائیں جانماز اپنی — اگر دھو ڈالے تو داغِ غمِ پندار دامن سے

وہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی — اگر ہاتھ آئے گا گنجینۂ قاروں نہ ٹھہرے گا

کیا کہیں اس سے جو ہم سے زیادہ جانتا — وہ ارادہ ہے ہمارا بے ارادہ جانتا

ہوا سجود ملائک یہ ظلوم اور جہول — یعنی انسان قوی بخت ضعیف الخلقت

بندہ نوازیاں تو یہ دیکھو کہ آدمی — جزوِ ضعیف محرمِ اسرارِ کل ہوا

جو بارِ آسمان و زمیں سے نہ اٹھ سکا — تو نے غضب کیا دلِ شیدا اٹھا لیا[1]

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ ذوق تصوف کے مثبت پہلو کو اختیار کرنا بہتر جانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان تمام چیزوں پر تنقیدیں کی ہیں جو بظاہر مذہب سے منسوب ہیں لیکن فی الاصل اوامرِ حق کے خلاف ہیں۔ مثلاً ان کا ایک شعر ہے:

درویش ہے وہی جو ریاضت میں چست ہو — تارک نہیں فقیر بھی راحت پرست ہے

ذوق نے اپنے علم سے صرف غزلوں یا قصیدوں کی تشبیب ہی میں فائدہ نہیں اٹھایا ہے بلکہ مدح میں بھی اکثر تصوف کے مختلف نکات سے لطف پیدا کرتے ہیں مثلاً

شمس کو پہنچے تری رائے سے یوں کسبِ فیض — تو ہو مغرب میں گرے پر تو نورِ مطلق

جس طرح روشنیِ قلبِ اہلِ اشراق — عرصۂ دور سے شاگرد کو دیتے ہیں سبق

لیکن ان اشعار سے واقعی لطف حاصل کرنے کے لیے علمِ تصوف میں مہارت ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت غوث علی شاہ صاحب کی زبان سے اکثر ذوق کے اشعار سُنے گئے۔ چند واقعات تذکرۂ غوثیہ سے نقل کرتا ہوں:

"ایک موقع پر نفیِ ادراک کو بیان کرتے ہوئے قرآن پاک کی یہ آیت بابرکت پڑھی: "لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ" اور پھر فرمایا کہ اگر انسان غور کرے تو سب کچھ اپنے آپ میں موجود ہے۔ پھر ذوق کا یہ شعر بھی پڑھا

اس دیں مجھ میں لطافت ہے اے ذوق مثلِ بوئے گل[1] — وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا
(ص ۲۳۹)

"ایک موقع پر حضرت موصوف نے فرمایا کہ منشاء سرکا یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو نہ دیکھے جیسے آنکھ تمام جہان کو دیکھتی ہے لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھتی[2] ..... اسی طرح ناک ہر شے کی خوشبو و بدبو سونگھتی ہے اِلّا اپنے پیٹ کی بدبو سے محض بے خبر ہے۔ ہاں اگر فضلِ خدا شاملِ حال ہو اور کوئی مردِ خدا اپنے وجود کی سیر کرا دے تو سبحان اللہ ؎

وہ ہے پاس میرے مری بدگمانی — لیے پھرتی مجھ کو کہیں کا کہیں ہے
(ص ۲۴۰)

"ایک موقع پر شیطان کا ذکر کرتے ہوئے حضرت موصوف نے قرآن پاک کی ایک آیت تلاوت فرمائی: من یھدی اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہٗ۔ اور پھر یہ شعر پڑھا

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اس کی — کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے
(ص ۲۲۲)

حضرت موصوف کی زبان سے مرض الوفات میں چند بار ذوق کا یہ شعر بھی سُنا گیا۔

دیکھا دمِ نزع دلِ آرام کو — عید ہوئی ذوق دمِ شام کو"

مذکورۂ بالا سطور سے ذوق کا تصوف سے بخوبی واقف ہونا واضح طور پر ثابت ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے کئی ایسے واقعات نقل کیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوق تصوف اور فقر کے اصولوں پر عامل بھی تھے (تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں آبِ حیات: ۵۰۵ تا ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۲ وغیرہ)۔

---

[1] ذوق کے اس شعر کو پڑھ کر حافظ شیرازی کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید — قرعۂ فال بہ نامِ من دیوانہ زدند

[1] یہ مصرع اس طرح ہے ع مجھ میں اس میں ربط ہے گویا بہ رنگِ بوئے گل [2] اس موقع پر ذوق ہی کا ایک شعر یاد آتا ہے

سب کو دیکھا اس نے اور اس کو نہ دیکھا جوں نگہ — وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

نیا ہندوستان

کرشن گوپال مغموم

کسی کو دیکھنا ہو تو نیا ہندوستاں دیکھے
وطن کے کارواں کو جانبِ منزل رواں دیکھے
خزاں نے جس جگہ ڈیرا جما رکھا تھا صدیوں سے
وہاں بے فکر جنت کی بہاروں کا سماں دیکھے
ہمیں نے بہتے دریاؤں کے رخ کو موڑ ڈالا ہے
کوئی دیکھے، ہماری ہمت تاب و تواں دیکھے
پہاڑوں کا کلیجا اور چٹانوں کا جگر شق ہے
کوئی ہر سنگ پر فرہاد کا تیشہ رواں دیکھے
نہ دیکھا ہو زمیں پر جس نے تاروں کا اتر آنا
بہ وقتِ شب وہ برقی قمقموں کی کہکشاں دیکھے
جہاں کی خاک سے اک گھاس کی پتی نہ اگتی تھی
بچشمِ خود وہاں کوئی لہکتی کھیتیاں دیکھے
جہاں پانی کا اک قطرہ نہ تھا، ان ریگزاروں میں
بہ ہر سو کوئی آ کر منظرِ آبِ رواں دیکھے
جہاں جنگل میں آدم کی نظر رستہ نہ پاتی تھی
وہاں چشمِ نظارہ جو نرالی بستیاں دیکھے
نظر محنت کشوں کی اب نہایت شوق سے اٹھ کر
فضائے آسماں میں کارخانوں کا دھواں دیکھے
صدائیں ورکشاپوں کی بھلی معلوم ہوتی ہیں
کوئی مزدور کو اس تال پر نغمہ خواں دیکھے
حقیقت میں ہماری کوششوں کا منتہا یہ ہے
زمانہ صنعت و حرفت میں ہم کو کامراں دیکھے
نہ آیا فرق کچھ اہلِ عمل کی تیز گامی میں
اگرچہ راہ میں حائل بہت سنگِ گراں دیکھے
عمل کی قوتِ بیدار ہر ہندی میں پیدا ہے
کوئی اس کا یقینِ محکم و عزمِ گراں دیکھے
نمایاں جذبۂ تعمیر ہے ملکی وسعت سے
کوئی اہلِ وطن کے دل کا جوشِ بیکراں دیکھے
جسے ہمت نہ ہو راہِ عمل میں پاؤں رکھنے کی
ہمارے حوصلے کی عزم کی [illegible] دیکھے
ہمارا ذکرِ خیر آئے نہ کیوں مغموم! ہر لب پر
ہمیں جب ایک دنیا ضامنِ امنِ جہاں دیکھے

سچائی

شعری مینائی

کہیں پیسے کی الجھن ہے، کہیں روٹی کا پینا ہے
کہیں ہندو دھرم اپنا، کہیں اسلام اپنا ہے
تباہی کی نظر میں ہم نہ ہندو ہیں نہ مسلم ہیں
غموں کی رہ گزر میں ہم نہ ہندو ہیں نہ مسلم ہیں

اجالا پھیلتا ہے جب فضا میں صبحِ تاباں کا
کہیں آتا بھی ہے گھر دیکھ کر ہندو مسلماں کا
جگت کو گود میں لیتی ہے جس دم شب کی تاریکی
تعصب کی کہیں ہوتی ہے اس کے دل میں باریکی

کہیں فاقے کی آمد بھی رہی ہے فرقہ وارانہ
کہیں دولت کے لب پر بھی رہا مذہب کا افسانہ
بناوٹ جسم کی سمجھو نہ ہندو ہے نہ مسلم ہے
لہو کا رنگ تو دیکھو نہ ہندو ہے نہ مسلم ہے

کہیں دنیا میں محنت کا کوئی مذہب نہیں پیارے
نہ محنت ہو تو جینے کا کوئی مطلب نہیں پیارے
نہ یہ مسجد کے فتنے ہیں، نہ یہ مندر کی چالیں ہیں
یہ آپس کی کشاکش بھی کسی کافر کی چالیں ہیں

جو خنجر ہاتھ میں لے کر کرے تلقین مذہب کی
وہ جاہل درحقیقت کرتا ہے توہین مذہب کی
نہ یوں ہندو ہوا کوئی نہ یوں اسلام پھیلا ہے
کہیں خنجر کے سایے میں خدا کا نام پھیلا ہے

دھرم کے ماننے والے کبھی کیوں حیوان ہو جائیں
دھرم مانیں تو یوں مانیں کہ ہم انساں ہو جائیں
کبھی آپس کے جھگڑوں سے تباہی ٹل نہیں سکتی
یہاں "بنیادِ مذہب" پر سیاست چل نہیں سکتی

اگر اس وقت ہم ہندوستاں پر مر نہیں سکتے
تو پھر انسانیت کے واسطے کچھ کر نہیں سکتے

عبدالحی تاباں

سید محمود نقوی

اردو ادب کے عہد زریں کے ایک بامزہ اور رنگین طبع صاحب دیوان شاعر، میر عبدالحی تاباں جیسے خوش فکر تھے ویسے ہی خوش خلق بھی۔ جتنے خوب صورت تھے اتنے ہی پاکیزہ سیرت بھی۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ گوری چٹی رنگت پر سیاہ لباس زیب تن کرتے۔ بہ قول مولانا آزاد: "حسن صورت کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ کو بھی دیکھنے کا اشتیاق ہوا...... بادشاہ خود سوار ہو کر اس راہ سے نکلے انھیں بھی خبر ہو گئی تھی۔ بنے سنورے اور بازار کی طرف مونڈھا بچھا کر آ بیٹھے۔ بادشاہ جب اس مقام پر پہنچے تو اس لیے کہ ٹھہرنے کا ایک بہانہ ہو، وہاں آب حیات[1] مانگا اور پانی پی کر دیکھتے ہوئے چلے گئے۔"

غرض ایک طرف حسن پرستوں کے لیے سامان ذوق نظر اور دوسری جانب خود طبیعت مائل بہ عشق پائی تھی۔ میر تقی میر کی زبانی ان کی تعریف سنیے۔ لکھتے ہیں:

"تا حال در زمرۂ شعرا ہم چو او شاعر خوش فکر از کمن بطون عدم بعرصۂ ظہور جلوہ گر نشدہ بود۔ زبان رنگینش پاکیزہ تر از برگ گل، گلستان سخن را نازک دماغ بلبل سمندر۔ نگین فکرش گلگوں باد بہار طابق النعل بالنعل است۔ ہر چند عرصۂ سخن وایں در لفظہا گل و بلبل تمام است، اما بسیار رنگیں می گفت۔ از رنگ آتش بے اختیار از دہن من گل کمالش سر می زد۔ نسبت بہ شعرا او استاد اور او رتبۂ شاگردی او نبود۔"[2]

میر کی رائے تاباں اور ان کے استاد یا استادوں کے بارے میں کیا ہے۔ اس سے بحث نہیں مگر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ تاباں نے اصلاح سخن کے لیے کس کو منتخب کیا؟ یہ مسئلہ تذکرہ نگاروں میں ابتدا ہی سے مختلف فیہ ہے۔

میر نے محمد علی حشمت کو تاباں کا استاد بتایا ہے۔ میر حسن ان کے ہم خیال ہیں۔ قاسم بھی اسی کو صحیح مانتے ہیں۔ کچھ نے سودا کا شاگرد قرار دیا ہے جو بالکل ہی بے بنیاد ہے۔ مولانا آزاد نے حشمت کے ساتھ حاتم کا نام بھی لکھا ہے۔ رائے بچھمی نراین شفیق 'چمنستان شعرا' میں میر کے قول پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ظاہرا تحصیل علوم بخدمت حشمت کردہ و اصلاح شعر از حاتم می گرفت۔"

اس کے ثبوت میں انھوں نے تاباں کے دو شعر بھی نقل کیے ہیں:

اور ہی رتبہ ہوا ہے تب سے اس کے شعر کا
جب سے حاتم نے توجہ کی ہے تاباں کی طرف

ریختہ کیوں نہ میں حاتم کو سناؤں تاباں
اس سوا دوسرا کوئی ہند میں استاد نہیں

شفیق کے اس خیال کی تردید میں متعدد اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جو بحر سخن میں تاباں کی کشتی کا ناخدا حشمت کو قرار دیتے ہیں۔ بطور دلیل صرف دو شعر پیش ہیں:

کہے تو کس طرح تاباں غلط الفاظ معنی ہیں — کہ تیرے پاس حشمت سا ترا استاد بیٹھا ہے
سخن کے بحر میں آ کے مری کشتی تباہی تھی — کنارے آ لگی جب سے ہوا تو ناخدا حشمت

مولوی عبدالحق کے نزدیک اس بارے میں مصحفی کا قول زیادہ قرین صحت ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"اگر چہ زبانی و ابتدا شاگرد محمد علی حشمت کہ شاگرد محمد غنی بیگ قبول کشمیری است، بسیار بسر بردہ۔"

---

[1] شاہان دہلی کے کاروبار کے لیے الفاظ خاص مستعمل تھے۔ مثلاً پانی کو آب حیات، کھانے کو خاصہ وغیرہ۔ [2] نکات الشعرا ص۔

دیوان تاباں تین قلمی نسخوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے مقدمہ میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"... لیکن ایک قلمی دیوان میں جس سے اس مطبوعہ نسخہ کی ترتیب میں مدد لی گئی ہے ان دونوں شعروں میں بجائے حاتم کے حشمت لکھا ہے۔"

ڈاکٹر زور کے بیان کے مطابق برٹش میوزیم میں بھی تاباں کا ایک نفیس دیوان موجود ہے جس میں علاوہ دیگر اختلافی اشعار کے تینوں کے چند اشعار میں نسخوں کے اختلاف سے حاتم و حشمت کا فرق ہے۔ اس میں حاتم ہی تحریر ہے۔ متذکرہ بالا دو شعروں میں بھی حاتم کا نام ہے۔ اس طرح ان اشعار میں تاباں کے چار قلمی نسخوں میں سے تین میں حاتم کا نام آتا ہے اور صرف ایک میں حشمت کا، جو حاتم کی بھی استادی کا ایک ثبوت ہے۔ مزید برآں حاتم نے خود تاباں کو اپنے مقدمہ دیوان میں حلقۂ شاگردی میں شمار کیا ہے اور ان کے کچھ اشعار بھی اس کا ثبوت ہیں:

فیض صحبت کا تری حاتم عیاں ہو ہند میں
طفل مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہو گیا

ریختہ کے فن میں ہیں شاگرد حاتم کے بہت
پر توجہ دل کی ہے ہر آن تاباں کی طرف

ان تفصیلات و تصریحات کی روشنی میں تاباں کا شاگرد حاتم ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ پہلو پھر بھی قابل غور رہتا ہے کہ تاباں نے پہلے حاتم کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا یا حشمت کے، اور ہر دو میں سے کس سے زیادہ شرف تلمذ رہا۔ یہ امر قیاس و شواہد کی بنا پر یوں طے کیا جا سکتا ہے کہ ابتدائی دور میں تو تاباں نے حاتم ہی سے اصلاح سخن لی جیسا کہ مصحفی کا بھی بیان ہے، جس کا ثبوت یہ شعر بھی ہے:

فیض صحبت کا تری حاتم عیاں ہو ہند میں
طفل مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہو گیا

پھر بہ وجوہ تاباں کو حاتم کی شاگردی ترک کرنا پڑی اور مجبوراً حشمت سے رابطہ پیدا کیا۔

دوسے دریا میں تاباں پرے آئی تنا
جب گیا تھا یار حاتم اور رہے تھے دارم

اس استادی شاگردی کا رشتہ عرصۂ دراز تک بلکہ انتقال حشمت (۱۱۶۱ھ) تک برقرار رہا۔ مگر تاباں کی مدت حیات کے چند سال ابھی باقی تھے۔ چنانچہ انھوں نے حاتم سے پھر اصلاح لینا شروع کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حاتم کے شاگردوں کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی۔ اس دور کی یادگار وہ چند اشعار ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ان میں سے یہ شعر تو بہت ہی واضح ہے:

ریختہ کے فن میں ہیں شاگرد حاتم کے بہت
پر توجہ دل کی ہو ہر آن تاباں کی طرف

تاباں کے جو دو شعر چمنستان شعرا کے حوالہ سے اوپر نقل ہو چکے ہیں ان میں سے پہلے شعر میں الفاظ "اور ہی" "تب سے" اور "جب" سے قابل غور ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ تاباں اپنے کلام میں جا بجا حشمت کی استادی و برتری کا ذکر کر چکے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ تاباں نے حشمت کے انتقال کے بعد پھر حاتم سے رجوع کیا تھا۔ تاباں کے اس شعر کو "ریختہ کیوں نہ میں حاتم کو ....." جب حسب ذیل شعر کے مقابلہ میں پڑھیے تو اور وضاحت ہو جائے گی۔

ہوا شاگرد تب حشمت کا تاباں
نہ پایا اس سا کوئی جب اور استاد

اس تفصیل کے بعد یہاں ان دونوں استادوں کے حق میں صاحب چمنستان الشعرا کے دلچسپ الفاظ نقل کرنا لطف سے خالی نہ ہوگا۔ شیخ محمد حاتم کے لیے لکھتے ہیں:

"مردیست جاہل، متمکن و منقطع وضع، دیر آشنا۔ خدا نداردہ دریافتہ نمی شود کہ ایں رگ کہن بہ سبب شاعری است کہ ہم چو من دیگرے نیست، یا وضع او ہمیں است۔"

کچھ اس طرح محمد علی حشمت کی بابت تحریر فرماتے ہیں کہ

"اکثر بر شعر با مردمان اعتراضات بے جا می کرد و جواب با صواب می یافت۔ در شعر ریختہ کے بنیاد پاچیانہ می گفت کہ پہلو دارد۔ حاصل عجب ہنگامہ پردازے بود۔"

بہرصورت استادان تاباں کے بارے میں موصوف کا خیال جو کچھ بھی ہو مگر انھوں نے عبدالحی تاباں کو اچھے الفاظ سے یاد کیا ہے اور ان کو ان کے استادوں سے بہتر شاعر مانا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ تاباں بہ حیثیت شاعر خوش فکر تھے۔ لیکن مرحوم جگر کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

شراب بہت پیتے تھے۔ نوبت بایں جا رسید کہ کثرت شراب نوشی نے دوستوں اور احباب کی آمد و رفت میں کمی کر دی لیکن مرنے سے کچھ پہلے توبہ کر لی۔ خدا جانے قربت موت اس توبہ کا سبب بنی یا توبہ قربت موت کا سبب ہوئی کہ ترک شراب کے ہفتہ عشرہ کے اندر قبل از وقت نشۂ زندگی بھی

اٹر گیا۔[1] ترکِ شراب کے بعد، مگر موت سے پہلے، تمام دوستوں اور عزیزوں کو اسی کیفیت سے مطلع کر دیا تھا کہ میں نے توبہ کی، تم گواہ بنتا ہوں، میری خبر گیری کا کرنا اس لیے کہ کثرتِ استعمال سے شراب میرے مزاج میں داخل ہوگئی تھی، اس کے چھوڑنے سے خود اپنے کو چھوٹتا نظر آتا ہوں، بایں صورت میرے حال سے غفلت خلافِ عقل ہوگی۔

تاباںؔ بڑے ہر دل عزیز شخص تھے۔ دہلی کے تقریباً سب ہی اہلِ علم فضلا در اساتذہ سے ان کے تعلقات بہت ہی خوش گوار رہے۔ وہ جہاں بھی جاتے شمعِ محفل رہتے۔ جو ایک بار ان سے ملتا دوبارہ ملنے کی خواہش رہتی۔ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کے حسین امتزاج کے ساتھ ان کی شاعری نے ان کی شخصیت میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ بہ قول میر حسنؔ:

"گرم بازاری ریختہ از اں شعلہ رو دو بالا شد۔ اکثر اشخاص ایں فن را وسیلہ ساختہ دخیلِ صحبت او شدند۔"

یہی وجہ ہے کہ سبھی تذکرہ نگاروں نے تاباںؔ کا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا ہے اور ان کے 'شمعِ محفل اور چراغِ بزمِ دل' ہونے کے ساتھ 'اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ پسندیدہ' کی تعریف و توصیف سے نوازا ہے۔ میرؔ ایسے کم آمیز شخص سے ان کی شناسائی اور ملاقات بہت مختصر رہی مگر دوبارہ ملاقات کی آرزو باقی رہ گئی۔ لکھتے ہیں: "معشوق عجیبے از دست روزگار رفت افسوس، افسوس، افسوس۔" ایک غزل کے مقطع میں بھی کہتے ہیں:

داغ ہے تاباںؔ علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میرؔ   ہو نجات اس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

تاباںؔ کی زندگی اور مزاج میں جس طرح شراب داخل ہوگئی تھی اسی طرح خمریات بھی ان کی شاعری میں رچ بس گئی تھی۔ ان کے نزدیک وقتِ مے نوشی شبِ ماہتاب سے زیادہ زورِ ابر اور فصلِ گل ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کا جی شراب کو بے اختیار چاہتا ہے۔ مینھ برستا ہو اور وہ ترستے ہوں تو ان کے لیے بارانِ رحمت نہیں باعثِ غضب و عذاب ہو جاتا ہے:

چمن ہو ابر ہو ساقی ہو جام و صہبا ہو   بڑا مزہ ہو جو یہ سب مجھے مہیا ہو

جامِ گل باغ میں لبریز ہوا شبنم سے   ساقیا صبح ہوئی بھر ساغرِ صہبا کیتئیں

ساقی اٹھا ہے ابر ہو لئے شراب ہے   اس وقت مے نہ دے تو قیامت عذاب ہے

کس کی نگاہِ مست کا ان کو اثر ہوا   کیوں جھومتے ہیں باغ میں پھر خوشہ ہائے تاک

آرزو ہی رہی یہ دانۂ تاک   قطرۂ مے کبھو نہ ہو ٹپکا

جب مجھے گھیرتا ہے غم، تاباںؔ   ساغرِ مے کو بھر پلاتا ہوں

اسی سلسلہ کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

ہوتا ہوں جو ترا اشتیاقی ساقی   بے خود ہو پکارتا ہوں ساقی ساقی

ہے مجھ کو خمارِ شب کا لا صبح ہوئی   شیشہ میں جو کچھ کہ مے ہے باقی ساقی

تاباںؔ کا عشق محض مجازی ہے۔ موجودہ دیوان میں جو تقریباً تاہیں اشعار پر مشتمل ہے گنتی کے دو چار اشعار کے علاوہ شاید ہی اور شعر ہوں جن سے عشقِ حقیقی کا اظہار ہوتا ہو۔ اگر انھیں کبھی خدا یاد بھی آتا ہے تو اس کا وسیلہ میکدہ اور عشقِ بتاں ہی ہے۔ خود معترف ہیں:

نہ ہوتا دل مرا محتاج صہبا کا تری ساقی   مئے وحدت سے یہ ساغر اگر لبریز ہو جاتا

شیخ اب جلوہ خدا کا میکدہ میں ہے بسے   کیوں رگڑتا ہے جبیں کعبہ کے تو در پر جبیں

بتاں کے عشق سے میں کیوں نہ ہوں شاد   کہ ان کو دیکھ، آتا ہے خدا یاد

اس "بتاں کے عشق" کو انھوں نے بہت سلیقہ سے برتا، اس کے تمام آداب و رموز سے واقفیت حاصل کی اور یہ سمجھ لیا کہ عاشق کو شمع کا سوز و گداز اور پروانے کی وارفتگی اور جاں نثاری دونوں ہی لازم ہیں۔ چناں چہ وہ راہِ عشق کی دشواریاں اور محبوب کی بے التفاتیاں سہتے ہیں، مگر مجنوں کے باوجود راہِ فرار اختیار نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ خدا نے انھیں "برائے عشق" پیدا ہی کیا ہے۔ لیکن ان کی عاشقی کو بوالہوسی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ تاباںؔ کا عشق ایک 'فن' ہے اور وہ فن کار، انھیں وصل سے زیادہ انتظار میں مزہ آتا ہے اور "خوباں کی وفا" سے زیادہ "جفا" خوش آتی ہے۔ پھر جب عشق کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے تو ان کے لیے جینا مرنا یکساں ہو جاتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ناصح نہیں ہے کام مجھے عقل ہوش سے   پیدا کیا ہے مجھ کو خدا نے برائے عشق

---

[1] ولادت کی طرح وفات کی بھی صحیح تاریخ محقق نہیں۔ پیدائش ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۸ء۔ وفات ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء اور ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء کے درمیان، بالترتیب ڈاکٹر زور اور عبدالحق صاحب کی تحقیق کے مطابق۔

کوئی ناخوش ہو خوباں کی وفا سے　　مجھے تو ان کی آتی ہے جفا خوش

جسے لذت درد و غم کے کچھ حاصل نہیں ہوتا　　وہ ہرگز زمرۂ عشاق میں کامل نہیں ہوتا

کس کس طرح سے دل میں گذرتی ہیں حسرتیں　　ہے وصل سے زیادہ مزہ انتظار کا

جب سے ہوئی معلوم میرے تئیں حقیقت عشق کی　　جینا مرنا میرے نزدیک یکساں ہوگیا

اور تو فن بہت ہیں پر تاباں　　عاشقی کا بھی اور ہی فن ہے

عشق مجازی کے بلند، نازک اور لطیف پہلوؤں کو بھی انھوں نے چھیڑا ہے اور کامیابی کے ساتھ۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

آج تھمتے نہیں مرے آنسو　　تیرے کوچہ کی راہ پائی ہے

جفا سے اپنی پشیماں نہ ہو، ہوا سو ہوا　　تری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا

آج آیا چاہتا ہے یار شاید گھر مرے　　بے قراری جی کو ہے اور دل کو ہے اضطرار

ان کی عشقیہ شاعری کا ایک خاص جز گل و بلبل کے استعارے (Symbols) بھی ہیں جن کا تیر کی ناقدانہ نظر نے بھی اس طرح جائزہ لیا ہے: "ہر چند عرصۂ سخن او ہمیں در لفظ ہائے گل و بلبل تمام است اما بسیار رنگیں می گفت"۔ یہ استعارات ان کے اپنے مافی الضمیر، مشاہدات زندگی اور تجربات عشق کی نشاں دہی کرتے ہیں:

از بس رہا تصور گل ہر نفس مجھے　　اب ہوگیا احاطۂ گلشن قفس مجھے

چمن میں آتش گل بے طرح دہکتی ہے　　لگے گی مفت میں بلبل کے آشیاں کو آگ

کسی گل میں نہیں پانے کی تو بوئے وفا ہرگز　　عبث اپنا دل اے بلبل چمن میں مت لگا ہرگز

تیر نے اپنے دیوان کے لیے کہا تھا: "درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان ہوا" تاباں بھی اسی قسم کی بات کہتے ہیں۔ قطعہ

آتی ہے بوئے درد ہمارے سخن کے بیچ
جز آہ و فغاں اس میں کچھ ذکر نہیں ہرگز

لیکن ان کے مزاج میں فطری غم و الم کم ہے بلکہ کچھ تو نا کردہ گناہوں کی حسرت ہے اور کچھ پورے نہ ہو سکنے والے ارمانوں کی تکلیف۔ ان کے چند اشعار اس بات کو شاید زیادہ واضح کر سکیں:

آئی بہار کیوں کہ گریباں کو کیجیے چاک　　ہاتھوں میں ہائے ضعف سے طاقت نہیں رہی

لیکن افسوس یہ ارمان سدا جی میں رہا　　کہ کوئی یار ہوا ایسا جو نہ ہو دل کے جدا

تاباں فلک کے جور سے نالاں نہیں ہے کیا　　سب کچھ ہو پر کسی کا مقید نہ ہو کوئی

مولوی عبدالحق مرحوم نے تاباں کے کلام کو صاف سادہ اور شیریں بتاتے ہوئے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ان کی شاعری میں زبان اور بول چال کا لطف پایا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ دور محمد شاہی کے اس نوجوان شاعر نے اپنے جذبات و خیالات کو اس قدر سادہ اور صاف زبان میں پیش کیا ہے کہ وقت حاضر کے ایک عام پڑھنے والے کو بھی ان کا کلام پڑھتے وقت الفاظ کی اجنبیت کا کوئی احساس نہیں ہوتا مثلاً

صلائے جذبیاں پھر گلستاں میں بہار آئی　　جنوں کے داغدار و خوش ہو فصل لالہ زار آئی

تاباں تو رشتۂ غم و اندوہ توڑ اب　　تار نگہ میں اشک کے موتی پرو چکا

نہ گل رہے تھے چمن میں نہ شور بلبل تھا　　خزاں کو دیکھ کے آیا بہار پہ رونا

گلی میں یار کے میں پاؤں رکھ سکوں کیوں کر　　کہ واں تو حکم نہیں مجھ کو جبہ سائی کا

تاباں کے کلام میں جابجا اخلاقی نصائح انسانی، زندگی اور اس کے متعلقات، دنیا کی حباب کی سی کیفیت اور سراب کی سی حقیقت کے درس بھی اچھے عنوان اور پیرایہ میں ملتے ہیں:

جب تلک رہے جیتا چاہیے ہنسے بولے　　آدمی کو چپ رہنا موت کی نشانی ہے

غنیمت جان جینا آدمی کا　　بھروسہ کچھ نہیں اس زندگی کا

کسی سے کیجئے مروت نہ اس زمانے میں　　کہ اب برا ہی نتیجہ ہے یاں بھلائی کا

سفر دنیا سے کرنا کیا ہے تاباں　　عدم ہستی سے راہ یک نفس ہے

جاتی ہے عمر ہر دم ہم کو خبر نہیں ہے　　کیا جانیے کہ کب تک ہم بے خبر رہیں گے

دیوان تاباں میں خاصی تعداد میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو میر و غالب ایسے باکمالوں کے اشعار سے قریب المعنی یا متحد المعنی ہیں۔ میر کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ہم عصر تھے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے زور مارا ہو اور میر کا انداز نصیب ہو گیا ہو۔ لیکن غالب کے لیے اس کی گنجائش نہیں۔ غالب کا مشہور شعر ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اب تاباں کا یہ شعر پڑھیے۔

نام فردوس کا سنتی ہوئی سب باتیں ہیں　　یار اپنے ہی کے کوچہ میں گذر بہتر ہے

جھوٹ کہتا ہے یہ واعظ کہ ہے جنت میں بہار　　ایک گل بھی واں نہیں یاں کے گلستاں کی طرح

غالب کا ایک اور معروف شعر ہے ؎

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں　　عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

تاباں کہتے ہیں ؎

ہم تو اپنا سر دیے پھرتے ہیں راہِ عشق میں — کیا تری تلوار سے ڈرتے ہیں اے جلاد ہم

غرض، تاباںؔ کے متعدد اشعار غالبؔ کی یاد دلاتے ہیں۔ ذیل میں کچھ اور اشعار پیش ہیں۔ انھیں پڑھیے تو بے ساختہ غالبؔ کے شعر بھی آپ کی زبان پر یا ذہن میں آجائیں گے:۔

سب کو اے ساقی پلاتا ہے تو انگوری شراب — ہم کو ساغر کیوں نہیں دیتا رہے ہیں تاک ہم

گالیاں تو جو دے گیا تھا مجھے — مجھ کو اب تک وہ یادگاری ہیں

ہو گیا کشود کار کہ ہوتی نہیں کبھی — مفتاحِ فضل بابِ اجابت دعا مری

تاباںؔ کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ رباعیات، مخمس، مسدس، مثلث، ترکیب بند، مستزاد، قصیدہ، مثنوی، متعدد تضمینیں (بیشتر حافظؔ اور مظہرؔ کی غزلوں پر) اہم تاریخی قطعات، سب ہی کچھ ہے۔ سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف و قوافی میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے

مختصر یہ کہ تاباںؔ کے اشعار میں اک ربودگی ہے اور والہانہ پن کیف و مستی ہے اور شوخی و سرشاری۔ انھوں نے رُخ شعر میں امید کے رنگ بھی بھرے مگر ان کی قلم کاری سے یاس کی بھریاں بھی ابھری ہیں۔ ان کا کلام "آہ" اور "واہ" دونوں کا ایک امتزاج ہے۔ اس میں آمد بیشتر نظر آتی ہے اور آورد کم آخر میں ان کی ایک غزل ملاحظہ کیجیے جس کو بے شبہ ان کے کلام کی منتخب اور نمائندہ غزل کہہ سکتے ہیں۔

جوں برگِ گل سے باغ میں شبنم ڈھلک پڑے — کیا ہو کہ برگِ تاک سے یوں مے ٹپک پڑے

جوں عکسِ آفتاب ہو بے تاب موج سے — دریا میں تیرے منھ کی اگر ٹک جھلک پڑے

بے شبہ جانتا ہوں کہ ملتا ہے تجھ سے غیر — تیری طرف سے دل میں مرے کیوں نہ شک پڑے

محفل کے بیچ سن کے مرے سوزِ دل کا حال — بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

تاباںؔ بجز تلاش نہیں شعر کا مزہ — پھیکا ہے وہ طعام نہ جس میں نمک پڑے

ایٹم اور جوہری توانائی

(بسلسلہ صفحہ ۲۷)

شعاعیں رہا کرتا ہے۔ یہ شعاعیں ہڈیوں اور ان کے اندر کے گودے تک کو سخت نقصان پہنچاتی ہیں۔ اسٹرانشیم ۹۰ کی ضرر رساں مقدار جسم میں داخل ہو جانے سے لیوکیمیا (LEUKAEMIA) جیسا مہلک مرض ہو جاتا ہے اگر اسٹرانشیم کا جھکاؤ ہڈیوں کی سمت ہوتا ہے تو پھوڑے سے پڑ جاتے ہیں جنھیں "بون ٹیومر" (BONE TUMER) کہا جاتا ہے۔ یہ مرض بھی زیادہ تر مہلک ہی ثابت ہوتا ہے۔ اسٹرانشیم کے مضر اثرات صرف ایک ہی نسل تک محدود نہیں رہتے بلکہ یہ اس نسل سے تولد ہونے والی نسلوں کے لیے اور زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔ آنے والی نسلیں جن کے آبا و اجداد کو اسٹرانشیم ۹۰ یا اور کسی ریڈیو ایکٹو عنصر کی غیر معمولی مقدار سے نقصان پہنچا ہے طرح طرح کی بیماریوں اور تکالیف میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اسٹرانشیم کے مانند آیوڈین ۱۳۱ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے متعدد امراض کا باعث ہو سکتا ہے۔ انسان کے جسم میں ایوڈین کی جائے قرار غدود درقیہ (THYROID GLANDS) ہیں۔ غذا یا سانس کے ذریعہ اگر اس کی زیادہ مقدار جسم میں داخل ہو جائے تو معلوم نہیں کتنی تکالیف پیدا ہو جائیں۔ ان تکالیف کا باعث ریڈیو ایکٹو عناصر میں مقید الفا، بیٹا اور گاما تینوں اقسام کی شعاعیں

ہو سکتی ہیں۔ اس کے قطع نظر بہت سے عناصر انسان کی کھال سے مس ہونے پر بھی ایذا بخش ثابت ہوتے ہیں مگر یہاں نقصان صرف گاما شعاعوں کے ذریعہ پہنچتا ہے کیوں کہ الفا اور بیٹا شعاعیں کھال میں اتنی پیوست نہیں ہوتیں کہ زیادہ ضرر پہنچے۔

"گاما" شعاعوں کا اثر اولاً خون بنانے والے چھوٹے چھوٹے بند حلقوں (CELLS) پر ہوتا ہے جس کے سبب سے ان حلقوں کی تعداد میں کمی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ کمی کچھ عرصے کے بعد مختلف تکالیف اور بیماریوں کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ ابھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون سے مخصوص آزار ہیں جو حقیقتاً ایک ریڈیو ایکٹو شے کے جسم میں داخل ہونے یا خارجی ذرائع سے جذب ہونے سے پیدا ہوتے ہیں پھر بھی تحقیق کنندگاں کی زیادہ تعداد اس پر متفق الرائے ہے کہ جنسی اثرات کی بنا پر ریڈیو ایکٹو اشیا موجودہ نسل کی بہ نسبت آنے والی نسلوں کو زیادہ نقصان پہنچائیں گی اور آئندہ کی نسلوں میں طرح طرح کے پیدائشی نقص پائے جانے کا اندیشہ رہے گا۔ کیا عجب ہے کہ جنسی اثرات کے باعث ایک ٹانگ یا ایک ہاتھ کے بچے پیدا ہوں یا پھر ایک آنکھ والی یا اندھی اولاد ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سب اعضا موجود ہوں لیکن ناقص ہوں، آنکھیں ہوں مگر بینائی نہ ہو، کان ہوں مگر سماعت نہ ہو۔

ہار جیت

اکرم شروانی

تنظیم کا سردار کالو مر گیا لیکن تنظیم زندہ تھی اور اسے اب پھر کسی سردار کی ضرورت تھی۔ چنانچہ نئے سردار کا انتخاب کرنے کے لیے شہر کے تمام جیب کترے چاچا چودھری کے مکان پر جمع ہوئے تھے۔ چاچا چودھری اپنے وقتوں کے بہترین ماہر فن تھے اور کبھی عرصہ دراز تک تنظیم کے سردار بھی رہ چکے تھے لیکن اب بڑھاپے کی وجہ سے انھوں نے اپنے پیشے سے علحٰدگی اختیار کر لی تھی اور ان کے ذمہ اب صرف تنظیم کی سرپرستی اور اہم مشورے دینے کی ذمہ داری باقی رہ گئی تھی۔

چندن جس وقت چاچا چودھری کے مکان پر پہنچا اس وقت وہاں سردار کے انتخاب کا جھگڑا زوروں پر تھا۔ تنظیم کے نو آموز ممبروں کی تو خیر ہمت ہی نہیں پڑتی تھی کہ وہ سرداری کے عہدے کے لیے اپنا حق جتائیں لیکن پرانے ممبر سرداری حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ ہر سینیر ممبر اپنے دوسرے ساتھی کی دلیل کی کاٹ کر رہا تھا۔ گروہ کے سب سے پرانے ممبر جبار خاں کا خیال تھا کہ سردار کا عہدہ اسے ہی ملنا چاہیے جو عمر، تجربے اور فن کے لحاظ سے گروہ میں سب سے افضل ہو۔ غالباً انھیں یقین تھا کہ اس میدان میں ان کا حریف نکلنا نہ صرف دشوار بلکہ قریب قریب ناممکن ہے۔ بھورے کی رائے تھی کہ گروہ کے ممبر آپس میں چناؤ کر کے سردار کا انتخاب کر لیں۔ شیرو اس بات پر اڑا ہوا تھا کہ سردار چننے کے لیے قرعہ اندازی سے اچھا اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ غرض دو ڈھائی گھنٹے سے بحث اسی ایک نکتے کے گرد چکر لگا رہی تھی لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ آخر کار چاچا چودھری نے حل تلاش کر ہی لیا۔ انھوں نے فیصلہ کن انداز میں اعلان کیا: "کل ایک کھلا ہوا مقابلہ ہوگا جس میں حصہ لینے کی ہر ایک کو اجازت ہوگی۔ صبح سویرے سے لے کر سورج چھپنے تک سب اپنی اپنی قسمت آزمائی کریں گے اور اسے ہی چنا جائے گا جو سب سے زیادہ کمائی کر کے لائے گا۔" بات چونکہ سب کے لیے یکساں موقع فراہم کرنے والی تھی اسی لیے ہر ایک کے دل میں اتر تی چلی گئی اور دوسرے دن سورج چھپے پھر چاچا چودھری کے مکان پر اکٹھے ہونے کا فیصلہ کر کے سب نے اپنے اپنے ٹھکانے کی راہ لی۔

صبح ہی سے شہر میں جیب کتروں کا بازار گرم ہونا شروع ہو گیا۔ جہاں جس کا بس چلتا ہاتھ کی صفائی دکھا جاتا۔ شہر کے ہر گلی کوچے اور بازار میں لوگوں کی جیبیں کھٹا کھٹ صاف ہو رہی تھیں اور یہ صفائی بھیڑ بھاڑ والے علاقوں مثلاً سینما گھروں، ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ وغیرہ پر اپنے عروج پر تھی۔ چندن نے صبح اٹھ کر ساڑھے تین آنے میں ایک نیا سیون او کلاک (7 O'CLOCK) بلیڈ خریدا اور کام شروع کرنے سے پہلے دولت کی اس کنجی کو کئی بار چوما۔ پھر شہر کے گنجان آبادی والے علاقوں اور پُر رونق بازاروں میں چندن کی دو انگلیوں کے درمیان اس ننھے منے فتنے نے قیامت جگانا شروع کر دی۔ لوگوں کی جیبوں سے بٹوے گم ہونے لگے۔ منٹوں اور سکنڈوں میں ہر بھری پُری جیب یوں اجڑنے لگی جیسے خزاں کے ہاتھوں ہرا بھرا چمن۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چندن کا ماہر ہاتھ حرکت میں آتا، بے خبر لوگوں کی جیب پر بلیڈ کا ہلکا سا دباؤ پڑتا اور روپے کھسک کر یوں اس کی جیب میں آجاتے جیسے بچہ ماں کی آغوش میں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کا ہاتھ بلیڈ پر نہیں بلکہ ٹکسال کی مشین کے کسی بٹن پر حرکت کر رہا ہو۔ ادھر دبایا اور اُدھر دولت مشین کے باہر۔ دوپہر تک وہ کافی محنت کرتا رہا۔ بھاگ دوڑ، خود کو بچا کر دوسروں کی صفائی ظاہر ہے یہ سب کچھ بچوں کا کھیل تو نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوپہر کو جب چندن اپنی کھولی پر پہنچا تو خاصی تھکن محسوس کر رہا تھا۔

آرام سے فرش پر بیٹھ کر اس نے اپنی جیبیں خالی کرنا شروع کر دیں۔ رنگ برنگے بٹوے، زنانہ و مردانہ پرس، مڑے تڑے اور کرارے نوٹ، گول گول چمکدار روپے، نئے اور پرانے پیسے جو ایک دوسرے سے یوں گلے مل رہے تھے جیسے جدائی کے وقت بھائی بھائی سے۔ کچھ بٹوے مالدار تھے اور کچھ بے حد غریب۔ بہت سے مردانہ پرسوں میں چند تصویر بتاں کے

علاوہ اور زنانہ پرسوں میں کریم، پاؤڈر، لپ اسٹک اور آئینہ اور کنگھے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔" ہونہہ۔ سالی فیشن زادیاں! چھوکریوں کے غلاف!" اس نے دونوں کو ساتھ خطاب عطا کیے اور نفرت سے منہ کو سکوڑتے ہوئے تمام پرسوں کو حقارت سے ایک کونے میں پھینک دیا۔ پھر اس نے روپیوں کو گننا شروع کیا۔ کل ملا کر ایک سو تینتیس روپیہ نواسی نئے پیسے تھے۔ نوٹوں سے چندن کی آنکھیں چمکنے لگیں اور کامیابی اسے اپنے سے بہت قریب نظر آنے لگی۔ اس نے ایک اچھا سا سرخ رنگ کا پرس منتخب کیا اور نوٹوں کی گڈی کو نقدی سمیت اس میں رکھ کر احتیاط سے اسے اپنے کوٹ کی بائیں جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ تکیے سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتے ہوئے اس والی کھولی پر پہنچ گیا جہاں دبلا پتلا نثار اپنی کمائی گن رہا تھا۔ چندن نے کواڑوں سے کان لگا دیے جو اندر سے بند تھے۔ نثار کی آواز کا اتار چڑھاؤ اور پرمسرت لہجہ بتلا رہا تھا کہ آج اس کا ہاتھ بھی گہرا رہا۔ "دس، بیس، تیس" نثار کی ہلکی ہلکی آواز چندن کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ گنتی جب پچاس سے آگے بڑھی تو چندن کے کان کھڑے ہو گئے اور ایک سو ایک کی صدا سن کر تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔ "تو اس کا مطلب ہے کہ میں نے ابھی تک بھاڑ ہی جھونکا ہے" اس نے اپنے دل میں سوچا اور واپس اپنی کھولی میں لوٹ آیا۔ "سرداری حاصل کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہوگا" اس کا ذہن کہہ رہا تھا "اور بہت سے روپئے! ڈھیر سارے نوٹ!" آج اس نے دوپہر کا کھانا بھی گول کر دیا۔ کھانا کھانے کا مطلب تھا کم از کم ایک آنے کا خون اور ہر آنے کے خون کے ساتھ اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا خون وابستہ تھا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ اٹھا اور کوٹ پہن کر کھولی سے باہر نکل گیا۔ اس باری میں اس کا پانسا ہلکا پڑ رہا تھا۔ بارہ بجے سے لے کر تین بجے تک وہ صرف بیس روپیہ اور صاف کر سکا اور اب اس کے بٹوے میں کل ایک سو ترپن روپیہ نواسی نئے پیسے ہو گئے۔ کمائی کی شرح کم ہو جانے کی وجہ سے اس پر مایوسی کا عالم طاری ہونے لگا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اب اس کا رخ اسٹیشن کی طرف تھا جہاں شام کے وقت یکے بعد دیگرے کئی ڈاؤن ٹرینیں آتی تھیں۔ "اگر ایک بھی موٹا مرغا پھنس گیا تو پو بارہ ہو جائیں گے" اس نے سوچا اور تیزی سے راستہ طے کرنے لگا۔ اسٹیشن پر پہنچ کر کافی دیر تک تو اسے مقصد براری کی کوئی شکل نظر نہیں آئی لیکن ٹھیک تین بجکر اٹھاون منٹ پر بادشاہ پل والی ڈیلکس کا انجن اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا اور ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے ایک نوجوان اترا۔ اس نے سیاہ سرج کا سوٹ اور بے داغ اور سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں کئی سنہری انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ بایاں ہاتھ اس نے پتلون کی جیب میں ڈال رکھا تھا اور داہنے ہاتھ سے ایک چھوٹا سا سوٹ کیس سنبھال رکھا تھا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی مال دار گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ پلیٹ فارم سے باہر آ کر نووارد سامنے والے کیفے کے کاؤنٹر پر پہنچا اور وہیں کھڑے کھڑے اس نے ایک گلاس ملک شیک پیا۔ پیسے ادا کرنے کے لیے جب اس نے بٹوہ نکالا تو دیکھتے ہی چندن کے منہ میں پانی بھر آیا۔ بٹوے کی تندرستی اس بات کی شاہد تھی کہ [illegible]۔ پیسے ادا کرنے کے بعد اس نے قدرے بلند آواز سے کاؤنٹر کلرک سے سو روپیہ کے نوٹ کے چینج کے متعلق استفسار کیا اور نفی میں جواب پا کر اس نے بے پروائی سے بٹوہ کوٹ کی بیرونی جیب میں ڈال لیا۔

چندن کو اپنا دل کنپٹی میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ کامیابی کو اپنے اتنے قریب پا کر اس کے ہاتھ پاؤں میں سنسنی ہونے لگی۔ چندن یا آج تیسری بار چاندی کا دن [illegible]۔ وہ تھوڑے سے فاصلے سے نووارد کا تعاقب کر رہا تھا اور اپنی تقدیر چمکانے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔

اسٹیشن سے نکل کر نوجوان نے شہر کا رخ کیا۔ تھوڑی دیر جواہر بازار میں گھومنے کے بعد وہ سیدھا گاندھی گیٹ پہنچا اور وہاں جیفرے اینڈ سنس کی دکان پر کچھ زیورات دیکھے۔ پھر وہاں سے ہوتا ہوا گاندھی روڈ پر ہوتا ہوا تصویرستان سینما کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گیا۔ کافی دیر تک تعاقب کے باوجود چندن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نووارد گردش دوراں کی طرح چلا ہی جا رہا تھا اور رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا اور چندن کا ہاتھ بٹوے پر کانپ کر رہ جاتا۔ جب پیچھے سے ہاتھ ڈالنا ممکن نظر نہ آیا تو چندن کے دماغ میں ترکیب میں ردوبدل کرنے کا خیال آیا۔ تصویرستان تک پہنچتے پہنچتے ایک لمبا چکر کاٹ کر وہ نووارد کے سامنے آ گیا۔ دلیپ کمار کی نئی فلم کا پہلا دن تھا۔ رش زیادہ

اور موقع غنیمت۔ چندن سامنے سے نووارد سے ٹکرا گیا۔ اور نووارد کا سوٹ کیس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آ رہا۔

"دیکھ کر نہیں چلتے بھئی!" نووارد نے نرم لہجے میں کہا اور جھک کر سوٹ کیس اٹھانے لگا۔

"م..... م..... معاف کیجیے گا" چندن نووارد کے نرم لہجے پر گڑبڑا گیا۔

"اٹ از آل رائٹ" نووارد مسکرایا اور سوٹ کیس سنبھال کر آگے بڑھ گیا۔

نووارد کے نظروں سے غائب ہو جانے کے بعد چندن نے اطمینان کا ایک لمبا سا سانس لیا۔ ٹکر کے دوران اس کا بلیڈ جاگتا رہا تھا اور نووارد کا موٹا تازہ بٹوہ کب کا اس کی جیب میں آ گیا تھا۔ "بے چارہ" چندن کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ نووارد کے بٹوے پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ مغرب میں جھکتے ہوئے سورج کی کرنیں شہر کی اونچی اونچی عمارتوں کی پیشانی چوم رہی تھیں۔ چندن تیز تیز قدموں سے چاچا چودھری کے مکان کا راستہ طے کرنے لگا۔ خوشی کے مارے اس نے نووارد کا بٹوہ کھول کر اس کے اندر رکھی ہوئی رقم گننے تک کی زحمت گوارا نہیں کی۔

سورج چھپ جانے کے بعد چاچا چودھری کے مکان پر دوبارہ شہر کے تمام جیب کترے اکٹھا ہوئے۔ کتنوں ہی کے منہ لٹکے ہوئے تھے اور کتنوں کے چہرے سے خوشی ٹپکی پڑ رہی تھی۔ چندن آج بہت زیادہ خوش تھا۔ وہ چاچا چودھری کے لیے بیڑی کے ایک نہیں دو دو بنڈل لایا تھا۔ اب اسے کیا غم تھا؟ اجنبی کے بٹوے کی موٹائی بتلا رہی تھی کہ اس کے اندر کم از کم پانچ سو روپیہ کی کوئی رقم موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ روپیے ہوں۔ تھوڑی دیر گپ شپ کرنے کے بعد تمام لوگ ایک دائرے کی شکل میں چبوترے پر بیٹھ گئے۔ ناکام ممبروں نے اپنے آپ کو مقابلے سے الگ کر لیا اور چاچا چودھری کے ہاتھوں آج کے مقابلے میں آنے والی رقموں کی گنتی شروع ہوئی۔ ہر ایک کی رقم گن کر وہ بہ آوازِ بلند اس کا اعلان کرتے جاتے۔

"گلشن ـــ اسّی روپیے"۔

"رگھوبیر ـــ نناوے روپیے چھ آنے"۔

"نثار ـــ ایک سو اکیس روپیے چار نئے پیسے"۔

"چھوٹے خاں ـــ تینتالیس روپیے"۔

ہر اعلان پر چندن کا دل زور سے دھڑکتا لیکن رقم جب کم نکلتی تو اس کا سینہ فخر سے اور تن جاتا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس کی ایک جیب میں اس کا اپنا بٹوہ ہے جس میں پوری ایک سو ترپن روپیے نواسی نئے پیسے کی تگڑی رقم موجود ہے اور دوسری جیب میں ـــ ہاہاہا! خزانہ ہی خزانہ! وہ رہ رہ کر بیڑی کے لمبے کش لگاتا اور تن کر بیٹھ جاتا۔

سب کی رقم گنی جا چکی تھی اور اب چندن کی باری تھی۔ اب تک شمار کیے ہوئے روپیوں میں شیرو کی رقم سب سے زیادہ تھی۔ اس نے دن بھر میں ایک سو انچاس روپیے ساڑھے سات نئے کمائے تھے اور اب بار بار ہر ایک کی طرف دیکھ دیکھ کر مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا۔ یکایک چودھری نے چندن کا نام پکارا اور چندن اپنی جگہ سے اٹھ کر چودھری کے سامنے جا بیٹھا۔

"کیسا ہاتھ رہا چندن؟" چاچا چودھری نے مسکرا کر پوچھا۔

"چاندی" "چاچا چاندی" چندن نے چاچا کو بازوؤں میں بھر لیا۔

"میرے پاس سب سے زیادہ رقم ہے"۔ اس نے ایک فاتح کی طرح گردن تان کر کہا اور ساتھ ہی اپنے کوٹ کی داہنی جیب سے نووارد کا موٹا تازہ بٹوہ نکال کر چودھری کی طرف اچھال دیا۔ چودھری نے بٹوہ کھول کر اسے زمین پر الٹ دیا اور اس کے اندر سے ردی کاغذوں کا ایک موٹا سا پیکٹ اور تین نئے پیسے نکل کر فرش پر بکھر گئے۔ کئی قہقہے بلند ہوئے جس میں شیرو کا قہقہہ سب سے زیادہ تندرست تھا اور چندن جھینپ کر رہ گیا۔ دفعتاً اسے اپنی بائیں جیب کا خیال آیا جس کے اندر رکھے ہوئے اس کے اپنے بٹوے میں بھی شیرو سے زیادہ رقم موجود تھی۔ چندن نے حقارت اور نفرت کی غصہ بھری نگاہوں سے شیرو کی طرف دیکھا اور بے تابی سے اپنا ہاتھ کوٹ کی بائیں جیب میں ڈال دیا۔

لیکن اس وقت چندن کی حالت واقعی قابلِ رحم ہو گئی جب اس کا ہاتھ کٹی ہوئی جیب کے بڑے سے سوراخ سے گزرتا ہوا پتلون تک پہنچ گیا۔



نذر

صدیق نظر

یہ تیرگی کے اُمنڈتے ہوئے سیہ بادل
مری حیات کی راہوں میں گھر کے آئے ہیں
یہ مفلسی کے اندھیرے، یہ درد کے سائے
مرے شعور پہ احساس بن کے چھائے ہیں
مرا نصیب بنی جا رہی ہے تاریکی!
نگاہ ڈھونڈھتی پھرتی ہے روشنی کا سراغ
تلاش کرتی ہے حسرت فسردہ دامن یار
وفائیں سر بہ گریباں کہ ہے کہاں دل دار

کشاکش غم ہستی میں، میری رسم وفا
تری نگاہ کے سائے تلاش کرتی ہے
نہ جانے کتنی تمناؤں کو سجائے ہوئے
نظر نظر میں چراغ وفا جلائے ہوئے
میں پھر رہا ہوں تری یاد کو چھپائے ہوئے
تخیلات کی پُر کیف بزم اُلفت میں
جہاں ترے لب و عارض کے پھول کھلتے ہیں
جہاں دلوں کو پیام نشاط ملتے ہیں

مرے خیال کی ہر پیچ شاہ راہوں پر
نگاہ و ذہن میں پازیب سی چھنکتی ہے
ترے جمال کی پرچھائیں سی دمکتی ہے
پیام آتا ہے مجھ تک تری تمنا کا
اندھیری شب میں کوئی شمع سی جلا ما کر
دل غریب میں پیہم خیال آتا ہے
کہ تیرے ساتھ گزاریں یہ گردش ایام
ترے ہی ہاتھ سے پیتے رہیں خلوص کے جام

بہت گراں سہی تاریکی حیات مگر
میں شام غم کے دھندلکوں سے ڈر نہیں سکتا
قریب آ جا کہ تجدید آرزو کر لوں
میں زندگی سے بغاوت تو کر نہیں سکتا

غزل

شیو پرشاد کشل

پیدا ہوا ہے غم تو سوا ہو کے رہے گا
یہ عقدہ محبت کا ہے وا ہو کے رہے گا

مٹنا مرا پابند رضا ہو کے رہے گا
ہر نقش قدم نقش وفا ہو کے رہے گا

یہ جانتے تو دل نہ کبھی ہم تجھے دیتے
ہاتھوں سے ترے خون وفا ہو کے رہے گا

کس دل سے میں اس دل کا بھلا کیوں نہ کروں حضرت
یہ دشمن جاں میرا بھلا ہو کے رہے گا

آنے دو تصور میں مرے قوت تحریک
تصویر کا پردہ ہے تو وا ہو کے رہے گا

سمجھے نہ تجھے ہے موت کا پیغام محبت
دل پائیں گے تو نذر ادا ہو کے رہے گا

حالات کچھ ایسے ہیں کشل درد جگر کے
رفتار بتاتی ہے سوا ہو کے رہے گا



اتر پردیش شاہراہِ ترقی پر

ماتا ٹیلہ بند ـــــ آگرہ اور متھرا کمایوں کے علاقے سے مل گئے ـــــ بجلی کا بینک ـــــ اتر پردیش میں چار اور بڑے کارخانے ـــــ مندرج فہرست اقوام کے طلبا کو وظیفے ـــــ تکنیکی تعلیم کے لیے قرضے ـــــ پہاڑی اضلاع میں زرعی پیداوار ـــــ کوڑھ کے مریضوں کے لیے مالی امداد ـــــ متفرقات

گرم دریائے جمنا کے کنارے سطح زمین کی تنگ پٹی سے ہوتے ہوئے اتر پردیش کی جنوبی سرحد کی جانب آگے بڑھیں تو ہرے بھرے میدانوں کے بعد یکایک گہری گھاٹیاں اور منتشر پہاڑ اور پہاڑیوں کے چھوٹے چھوٹے سلسلے ملتے ہیں اور یہ پہاڑی خطہ جو تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار مربع میل میں پھیلا ہوا ہے بندیل کھنڈ کے نام سے مشہور ہے۔

ان پہاڑیوں کے درمیان کچھ علاقے ایسے ہیں جن میں گھنے اور چھدرے جنگل پائے جاتے ہیں۔ گھنے جنگلوں میں تیندو۔ بانس۔ بالرو۔ مہوا۔ ساگون اور ڈھیر کے درخت بکثرت ملتے ہیں۔ ان پہاڑیوں سے کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں نکلتی ہیں جو جمنا میں مل جاتی ہیں۔

ان ندیوں میں اُن ندیوں کے مقابلہ میں جو ہمالیہ پہاڑ سے نکلتی ہیں برابر پانی نہیں رہتا اور گرمی کے موسم میں تو وہ بالکل سوکھ جاتی ہیں اور برسات میں ان میں بہت زیادہ پانی آجاتا ہے۔

اس خطہ میں بارش بہت کم ہوتی ہے اور پانی بہت گہرائی میں ملتا ہے۔ اس لیے کنوؤں کی تعمیر پر بہت زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ اس خطہ میں اگرچہ ہموار زمین کے قطعات ہیں لیکن ان دقتوں کی بنا پر کھیتی باڑی کرنا فائدہ مند نہیں ہے۔ اس خطہ کے باشندے صدیوں سے خشک سالی کی مصیبتوں سے دوچار رہے ہیں اور یہاں محض موٹا اناج جیسے باجرہ کودوں اور سوٹھ پیدا ہوتا ہے۔

عہد وسطیٰ میں دو جنگجو قبائل بندیلے جن کے نام پر یہ سارا خطہ اب بھی بندیل کھنڈ کہلاتا ہے اور ان کے آباؤ اجداد چندیلے اس خطہ پر حکمرانی کرتے تھے۔ انھوں نے آبپاشی کے لئے چشموں کا پانی جمع کرنے کے لئے وادیوں میں پشتے تعمیر کئے تھے۔ ان میں سے کچھ پشتے جو زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں بروا ساگر۔ جھنیا۔ مدن ساگر۔ کرت ساگر اور بیجے نگر کے نام سے موسوم ہیں۔

انیسویں صدی تک ان پشتوں پر کچھ توجہ دی جاتی تھی لیکن بعد میں کمزور حکمرانوں کے ایک طویل دور میں بے توجہی کی وجہ سے ان کی حالت خراب ہوگئی اور ۱۸۰۰ء میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ آبپاشی کی سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے یہ سارا خطہ اجاڑ اور بے آب و گیاہ ہوگیا۔

۱۸۵۶ء کے بعد سے اس خطہ میں تقریباً ہر سال قحط پڑنا معمول بن گیا۔ انگریزوں نے پہلے اس مسئلہ پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن بعد میں انھوں نے اس کو حل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اور اس ناکامی کے بعد انھوں نے اس علاقہ کو خالی کرنے اور جنگلات میں بدل دینے کا منصوبہ بنایا۔

لیکن یہ خیال ترک کر دیا گیا اور ۱۸۷۰ء میں آبپاشی کے لئے کنوئیں وغیرہ تعمیر کئے گئے اور بعد ازاں دو بڑی جھیلیں پچوارا اور گروارا بنائی گئیں علاوہ ازیں جھنیا۔ بروا ساگر۔ کونجا بھانور۔ باجیا اور بیجے گڑھ کی پرانی جھیلوں کی مرمت کی گئی۔

ان اقدامات کے باوجود ۱۸۶۳-۶۴ء اور ۱۸۶۹ء میں قحط پڑے

اس لئے اس مسئلہ پر دوبارہ غور و خوض کیا گیا اور سنہ ۱۸۸۰ء سے مختلف اوقات میں کئی آبپاشی کمیشن مقرر کئے گئے۔ ان کمیشنوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس خطہ کو اس وقت تک قحط اور قلت سے محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ ۴۰ فی صدی مزروعہ رقبہ کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم نہیں کر دی جاتیں۔

کمیشن کی سفارش پر سنہ ۱۸۸۰-۸۱ء میں جھانسی سے شمال کی جانب ۱۵ میل دور بیتوا ندی کے کنارے پاریچھا بند تعمیر کیا گیا۔ بیتوا اور اس کی معاون ندیاں اس خطہ کی ترقی کا سب سے زیادہ اہم وسیلہ ہیں۔

پاریچھا بند کا پانی آبپاشی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے ناکافی ثابت ہوا۔ اس لئے سنہ ۱۸۹۸ء میں اس خزانہ آب میں پانی کی گنجائش بڑھا کر ۲۰۴۴۲ ملین مکعب فیٹ ہو گئی۔

چونکہ آبپاشی میں تیزی سے توسیع ہوتی رہی اس لئے جھانسی سے تقریباً ۲۰ میل جنوب کی جانب ڈھکوان میں سنہ ۱۹۰۶ء میں بیتوا پر ایک دوسرا ذخیرہ آب تعمیر کیا گیا جس میں ۴۳۴۸ ملین مکعب فیٹ کی گنجائش تھی۔ لیکن جلد ہی اس کو بڑھا کر ۳،۵۹ ملین مکعب فیٹ کو دینا پڑا۔

ضلع جھانسی میں سنہ ۱۹۰۶ء میں اور سنہ ۱۹۱۲ء کے درمیان بیچ اور کرم کے نو ذخیرہ ہائے آب تعمیر کئے گئے۔ لیکن سنہ ۱۸۹۵-۹۶ء کے شدید قحط تک بندیلکھنڈ کے دیگر تین اضلاع پر کوئی توجہ نہیں دی گئی اور سنہ ۱۹ء سے لیکر سنہ ۱۹۰۸ء تک کی خشک سالی نے اس علاقہ میں ریاست کے ذریعہ آبپاشی کی سہولتیں فراہم کئے جانے کا احساس دلایا۔ اس کے نتیجہ میں سنہ ۱۹۰۶ء اور سنہ ۱۹۱۵ء کے درمیان تقریباً ۲۵ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تمام علاقہ میں بہت سے بند نہروں۔ تالابوں اور بندھیوں کی تعمیر کی گئی۔

ان تعمیرات میں گنگاؤ بند اور دریا پور ذخیرہ آب شامل ہیں۔

سنہ ۱۹۴۳ء کے آخر تک آبپاشی کے ریاستی ذرائع سے چار لاکھ ایکڑ آراضی سے کچھ زیادہ یا بندیلکھنڈ کا ۱۱ فیصدی مزروعہ علاقہ ہر سال سیراب کیا جا سکتا تھا۔ آبپاشی کی سہولتوں کی فراہمی کے سلسلہ میں مجموعی طور پر ۳ کروڑ روپیہ کے اخراجات ہوئے۔

قحط سے متعلق کمیشن کی سفارشات کے مطابق آبپاشی کی سہولتوں کی فراہمی کے سلسلہ میں اب بھی بہت کام باقی تھا لیکن سنہ ۱۹۴۳ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک کوئی کام شروع نہیں کیا گیا۔

آزادی کے بعد بہت سے منصوبے شروع کئے گئے جس میں کثیر المقاصد ماتا ٹیلہ بند سب سے بڑا منصوبہ ہے جو جھانسی۔ جالون اور ہمیر پور کے اضلاع کی ۲۵۹۶۰۰ ایکڑ اور مدھیہ پردیش کی ۱۵۴۰۰۰ آراضی کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم کرنے کے پیش نظر وضع کیا گیا تھا۔

آبپاشی کی سہولتوں کی فراہمی کے علاوہ اس منصوبہ کا مقصد جھانسی۔ جالون۔ ہمیر پور اور باندہ کے اضلاع کے لئے ۴۲،۵۸ ملین یونٹ بجلی پیدا کرنا ہے۔ علاوہ ازیں بندیلکھنڈ کی ضروریات کی تکمیل کے بعد جو بجلی فاضل بچے گی وہ کانپور۔ تھرمل اسٹیشن کو سپلائی کی جائے گی۔

اس کے مکمل ہو جانے پر اس سے بینا اور جھانسی کو پانی فراہم کیا جائے گا اور بڑے پیمانہ پر مچھلی پالن کی ترقی کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔

اس منصوبہ پر سنہ ۱۹۵۲ء میں کام شروع کیا گیا تھا یہ کام دو مرحلوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں پہلا آبپاشی اور دوسرا بجلی کا مرحلہ ہے۔ اس منصوبہ پر سنہ ۱۹۵۷ء تک تسلی بخش طور پر کام ہوتا رہا جبکہ پھاٹکوں کے لئے غیر ملکی تبادلہ زر کی عدم دستیابی کی وجہ سے دو سال کام بند رہا۔

اس وقت بند کے فالتو پانی کی نکاسی کے مرکزی سیکشن میں ۲۳ پھاٹک لگائے جا رہے ہیں۔ ہر ایک پھاٹک ۳۳ فیٹ اونچا اور ۴۰ فیٹ چوڑا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ پھاٹک لگانے کا کام جون سنہ ۱۹۶۳ء تک پورا ہو جائے گا۔

یہ بند ڈھکواں خزانہ آب سے چڑھاؤ کی جانب ۱۰ میل کی دوری پر واقع ہے۔ اس کی مجموعی لمبائی ۱۸۲۵۰ فیٹ اور اونچائی ۸۰ فیٹ ہے۔ اس بند کا پختہ حصہ جو مستحکم بنیادوں پر تعمیر کیا گیا ہے بنیاد سے ۱۵۰ فیٹ اونچا ہے۔

اس بند کے خزانہ آب میں ۴۰ ہزار ملین مکعب فیٹ پانی جمع ہو سکتا ہے۔ اس کو ہمیشہ بھرا رکھنا ممکن ہے۔

خزانۂ آب میں جب پورا پانی بھر جائے گا تو یہ ۴۵ ہزار ایکڑ میں پھیل جائے گا جس سے ۷۹۰۰ ایکڑ مزروعہ زمین زیرِ آب ہو جائیگی اور ۵۵۰۰۰ افراد متاثر ہوں گے جن میں سے بیشتر کو دوسرے علاقوں میں بسایا جا چکا ہے۔

اترپردیش کے وزیرِ اعلیٰ شری چندر بھان گپتا نے بریلی سے سات میل دور رام گنگا کے ایک پل کا ۱۰ اگست کو افتتاح کیا۔ اس پل کی وجہ سے ایک طرف کمایوں کے پہاڑی مقامات نینی تال۔ الموڑا اور رانی کھیت اور دوسری طرف آگرہ۔ متھرا اور علی گڑھ کے درمیان ہر موسم میں سڑک کے ذریعہ آمد و رفت کی سہولتیں مہیا ہو گئی ہیں۔

آمد و رفت کی اس سہولت کی فراہمی سے کمایوں کے پھلوں کی اور زیادہ کھپت اور بمبئی اور راجستھان سے زیادہ تعداد میں سیاحوں کو کمایوں کے صحت افزا مقامات کی جانب متوجہ کرنے کے مقاصد پورے ہو گئے ہیں۔

اس پل کے ذریعہ نہ صرف ریاست کے دو بڑے شہروں آگرہ اور بریلی کا درمیانی فاصلہ تقریباً ۵۰ میل کم ہو گیا ہے بلکہ بریلی۔ آگرہ روڈ کو دہلی۔ بمبئی قومی شاہراہ سے ملا دیا گیا ہے۔

اس پل کے بن جانے سے اب کمایوں کے پھل سڑک کے ذریعہ آگرہ اور متھرا اور وہاں سے بمبئی اور راجستھان بھی بھیجے جا سکیں گے۔

بمبئی اور راجستھان سے کمایوں کے صحت افزا مقامات کو جانے والے سیاحوں کو اب کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور متھرا میں گاڑی بدلنے کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اب وہ براہِ راست سڑک کے ذریعہ بریلی ہوتے ہوئے جا سکیں گے جس میں پہلے کے مقابلہ میں بہت کم وقت لگے گا کیونکہ یہ نزدیک کا راستہ ہے۔

اس پل کے ذریعہ کمایوں کے جنگلات سے اور زیادہ عمارتی لکڑی اور جنگلات کی پیداوار یعنی صنعتوں کے لئے خام مال۔ پہاڑیوں کے دامن سے تیر اور ترائی سے چاول جنوبی مغربی ضلعوں کو بھیجا جا سکتا ہے اور ان ضلعوں سے کمایوں کے پہاڑی علاقوں اور روہیلکھنڈ کے دوسرے مقامات کو اس پل کے راستے سے اناج اور دیگر اشیاء صارفین بھیجی جا سکیں گی۔

اس پل کے تعمیر ہونے سے پہلے اترپردیش کے شمالی مشرقی اضلاع یعنی الموڑا۔ نینی تال۔ پیلی بھیت۔ رام پور۔ شاہ جہانپور۔ اور بریلی اور جنوبی مغربی اضلاع یعنی آگرہ۔ متھرا۔ علی گڑھ۔ بدایوں۔ ایٹہ۔ مین پوری اور اٹاوہ کے درمیان سڑک کے ذریعہ آمد و رفت کا سلسلہ برسات میں تقریباً چھ مہینہ تک منقطع رہتا تھا۔

اب تک اس مقام پر ندی کو پار کرنے کے لئے ہر سال نومبر میں پیپوں کا ایک عارضی پل بنایا جاتا تھا جو جون میں توڑ دیا جاتا تھا اور برسات کے زمانہ میں کشتیوں کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ اور سیلاب کے زمانہ میں کشتی کے ذریعہ ندی پار کرنے کا سلسلہ بھی اکثر ختم کرنا پڑتا تھا۔ پیپوں کے پل سے محض ۵ ٹن تک کے وزن کی گاڑیاں وغیرہ گزر سکتی تھیں اس لئے ہلکی گاڑیاں ہی پل کے ذریعہ ندی کو پار کر سکتی تھیں۔ اس میں کافی پریشانی ہونے کے علاوہ بہت وقت بھی لگتا تھا۔ پیپوں کے پل پر ہر سال ۸۰ ہزار روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ رام گنگا پر پل بن جانے سے اب اس کی بچت کی جا سکیگی۔

اس پل کے ذریعہ نہ صرف ندی کے دونوں طرف کے علاقوں کو جو گنے کی کاشت کے لئے مشہور ہیں اس منطقہ کی گنا ملوں سے ملا دیا گیا ہے بلکہ ضلع بریلی کی آنولہ تحصیل کو جس میں بہت زیادہ اناج پیدا ہوتا ہے ضلع کے صدر مقام سے ملا دیا گیا ہے۔

اس اہم پل کی تعمیر سے شمالی مشرقی ریلوے کے بریلی۔ کاسگنج سیکشن میں مال کی آمد و رفت کا زبردست بار بھی بڑی حد تک کم ہو جائے گا۔

رام گنگا پل منصوبہ ۸۶٫۵۰۸ لاکھ روپیہ کی لاگت سے پانچ سال میں پورا کیا گیا۔ اس میں جو روپیہ لگا ہے وہ ریاستی حکومت نے اپنے وسائل سے مہیا کیا ہے اور ریاستی محکمہ تعمیر عامہ کے ایک خصوصی ڈویژن نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ اس منصوبہ میں رام گنگا پل کی تعمیر کے علاوہ سردار نگر نالہ کے اوپر ایک دوسرے پل کو جانے والی تقریباً ساڑھے چار میل لمبی سڑکوں کی تعمیر بھی شامل ہے۔

یہ پل جس کی لمبائی ۲۲۰۴ فیٹ ہے میدانی علاقوں میں رام گنگا

ہی کے اوپر دوسرا پل ہے۔ اس کے علاوہ حال ہی میں ضلع گھنور ں تیر کوٹ کے مقام پر ایک اور پل بنایا گیا ہے۔

چودہ محرابوں پر مشتمل پریل سیمنٹ کنکریٹ کے پہلے سے ڈھالے ے ڈھانچہ سے بنایا گیا ہے جو دنیا میں پل کی تعمیر کا جدید ترین طریقہ ہے۔ ں طریقہ سے تقریباً ۰۰،۰ ٹن فولاد اور ۰۰۰ ٹن سیمنٹ کی بچت کی گئی ہے۔

اس پل کی تعمیر میں تقریباً ۳۵،۵ ٹن سیمنٹ ۵۸۶ ٹن فولاد ۱۰ ٹن زیادہ دباؤ کا فولاد اور ایک کروڑ سے زیادہ اینٹیں استعمال کی گئی ہیں۔

اس پل پر گاڑیوں کی آمد و رفت کے لئے ۲۴ فیٹ چوڑی سڑک بنائی گئی ہے۔ پل پر سے ۷۰ ٹن تک کے وزن کی گاڑیاں گذر سکتی ہیں۔

مئو اور گورکھپور کے تھرمل اسٹیشنوں کو مغل سرائے سے جوڑ جانے لی ۰۶ میل لمبی ۱۳۲ کے۔وی کی دوہری سرکٹ لائن مئو سے گورکھپور انے والی ۵۸ میل لمبی ۱۳۲ کے۔ وی کی دوہری لائن اور مغل سرائے روارانسی کے درمیان ۱۲ میل لمبی ۱۳۲ کے۔ وی کی اکہری سرکٹ لائن ے ذریعہ ملایا جا رہا ہے۔

مغل سرائے مئو لائن پر سو سو فیٹ اونچے ۲۹۰ ٹاور نصب کرنے ے سلسلہ میں انتظامات کئے جا رہے ہیں اور اب تک ۲۰ مینار مکمل ہو چکے ہیں۔ مغل سرائے۔ وارانسی لائن پر ۳۰ ٹاور بنائے جا چکے یں اور مئو اور گورکھپور کے درمیان ۳۰۰ ٹاور بنائے جائیں گے۔

غازیپور سے تقریباً ۸ میل اوپر کی طرف چوچک کے قریب مغل سرائے لائن گنگا کے اوپر سے گزرتی ہے۔ مئو گورکھپور لائن دوہری گھاٹ میں گھاگرا سے گزرتی ہے۔ رام نگر سے دو میل اوپر کی طرف گنگا کے اوپر سے مغل سرائے وارانسی لائن بھی گزرتی ہے۔

۳۳ کے۔ وی اور ۱۱ کے۔ وی کی لائنوں اور ذیلی اسٹیشنوں چھوڑ کر جو مشرقی اضلاع میں دیہی علاقوں کو بجلی فراہم کرنے کے لئے قائم کئے جائیں گے۔ مذکورہ منصوبہ کی لاگت تخمینہ ۱،۶۹۸،۰۰۰ روپیہ ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اس سے کل لاگت کا ۵ر۷ فیصدی وصول ہو جائے گا۔

پہلے پنجسالہ منصوبہ کے دوران ریاست کے مشرقی اضلاع میں صنعتی اور زراعتی ترقی کے پیش نظر مئو اور گورکھپور تھرمل اسٹیشن قائم کئے گئے تھے جن میں سے ہر ایک کی پیداواری صلاحیت ۱۵۰۰ کے۔ ڈبلو تھی۔ اس وقت سے ان اسٹیشنوں پر سب سے اہم بار آبپاشی کے کاموں کے لئے ریاستی ٹیوب ویلوں کا چلانا ہے۔

ٹیوب ویل کے ذریعہ آبپاشی کے زمانہ میں بجلی گھروں کی پیداواری صلاحیت ۲۰۰۰ کے۔ ڈبلو کا کم و بیش پورا استعمال ہوتا ہے لیکن برسات میں جب ٹیوب ویلوں کو چلانے کی ضرورت نہیں رہتی تو بجلی کی مانگ بہت کم ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں اسٹیشنوں کی پیداواری صلاحیت کا بیشتر حصہ استعمال میں نہیں آتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ریاست کے مشرقی اضلاع میں صنعتی گھریلو اور عام مقاصد کے لئے مزید بجلی کی کافی مانگ ہے۔ ان علاقوں میں بجلی کی مجموعی مانگ مئو اور گورکھپور اسٹیشنوں سے پوری نہیں ہو سکتی ہے۔

اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ اول یہ کہ بجلی پیدا کرنے کے لئے مزید سیٹ لگا دئے جائیں اور دوسری یہ کہ مئو اور گورکھپور اسٹیشنوں کو ریہاند سسٹم سے ملا دیا جائے۔ بجلی پیدا کرنے کے لئے مزید سیٹوں کے لئے غیر ملکی زر مبادلہ کی ضرورت ہوگی اور اس پر اخراجات بھی کافی ہوں گے۔ علاوہ ازیں ایک نئے پلانٹ کے لئے کم از کم چار سال درکار ہیں جو برسات کے زمانہ میں جزوی طور پر بیکار رہے گا۔

دونوں اسٹیشنوں کو ریہاند سسٹم سے ملانے میں خاص فائدے ہیں۔ برسات کے زمانہ میں بھی اور اس زمانہ میں بھی جبکہ دونوں بجلی گھروں کی مجموعی پیداواری صلاحیت سے بجلی کی مانگ کم ہوگی تو فاضل بجلی کو ریہاند سسٹم کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے جو اسٹوریج اسکیم ہونے کی وجہ سے بجلی حاصل کر سکتا ہے۔ جب مشرقی علاقہ کے بجلی گھروں کو ان کی پیداواری صلاحیت سے زیادہ بجلی کی ضرورت ہوگی تو ریہاند سسٹم جمع شدہ بجلی کو واپس کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ریہاند سسٹم

بجلی کے بینک کی حیثیت سے کام کر سکتا ہے وہ مشرقی بجلی گھروں سے فاضل بجلی حاصل کر سکتا ہے اور جب ان کی پیداواری صلاحیت سے زیادہ بجلی کی ضرورت ہو تو اسے واپس بھی کر سکتا ہے۔

ان کو ملانے کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ دونوں اسٹیشنوں پر ۵۰۰۰ — ۵۰۰۰ کیلوواٹ کے دو اسٹینڈ بائی سیٹوں کے بجائے ۵۰۰۰ کیلوواٹ کے صرف ایک اسٹینڈ بائی سیٹ سے کام چل جائیگا عملی طور پر اس سے دونوں اسٹیشنوں کی مشترکہ پیداواری صلاحیت ۲۰۰۰۰ کے ڈبلو سے بڑھ کر ۲۵۰۰۰ کے۔ ڈبلو ہو جائیگی۔

توقع کی جاتی ہے کہ جب ان دونوں اسٹیشنوں کو رہانڈ سسٹم سے ملا دیا جائے گا تو یہ مربوط تھرمل اسٹیشن، ۱۹۷ ملین یونٹ سالانہ بجلی پیدا کریں گے جبکہ وہ سردست ۲۴ ملین یونٹ سالانہ بجلی پیدا کرتے ہیں۔

مرکزی حکومت کے ذریعہ اتر پردیش میں پبلک سیکٹر میں چار صنعتیں قائم کی جا رہی ہیں جو یہ ہیں۔ بجلی کی بھاری مشینیں تیار کرنے کا کارخانہ۔ اینٹی بائیوٹکس کارخانہ۔ کیمیادی کھاد کا کارخانہ اور ڈیزل لوکو موٹیو کارخانہ۔

یہ اطلاع ودھان پریشد میں سوالات کے وقفہ میں وزیر اعلیٰ شری چندر بھان گپتا نے شری سردے نرائن سنگھ کے تحریری جواب میں دی۔ ممبر مذکور کو مزید بتایا گیا کہ بھاری مشینیں تیار کرنے کے کارخانہ پر جو جوالا پور (ہردوار) میں قائم کیا جائے گا تقریباً ۵۰ کرور روپیہ خرچ ہوگا۔ اور یہ اُمید کی جاتی ہے کہ یہ کارخانہ تیسرے منصوبہ کے آخر تک قائم ہو جائے گا۔ ریاستی حکومت اس منصوبہ کے لیے ۳۴ لاکھ روپیہ کی تخمینی لاگت کی زمین کا بندوبست کر رہی ہے اور بقیہ اخراجات مرکزی حکومت برداشت کرے گی۔

وزیر اعلیٰ نے مزید بتایا کہ اینٹی بائیوٹکس کارخانہ رشی کیش میں ۱۵ کرور روپیہ کی لاگت سے انڈین ڈرگ اینڈ فارماسیوٹیکلس کے ذریعہ قائم کیا جائے گا۔ ریاستی حکومت اس کے لیے زمین کا بندوبست کرے گی اور بقیہ اخراجات مرکزی حکومت برداشت کرے گی تیسرے منصوبہ کے آخر تک اس منصوبہ کے بھی پورے ہو جانے کی امید ہے۔

وزیر اعلیٰ نے اس سلسلہ میں مزید بتایا کہ کیمیادی کھاد کا کارخانہ گورکھپور میں قائم کیا جائے گا اور اس کا سارا خرچ مرکزی حکومت برداشت کرے گی۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ کارخانہ بھی تیسرے منصوبہ کے آخر تک قائم ہو جائے گا۔ کیمیادی کھاد کارپوریشن کے ذریعہ یہ کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے۔ ڈیزل لوکو موٹیو کارخانہ مرکزی حکومت اپنے صرفہ سے منڈواڈیہ (وارانسی) میں قائم کر رہی ہے۔

ڈائرکٹر ہریجن اور سماجی فلاح اتر پردیش کے ذریعہ جاری کیے گئے ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ مندرج فہرست اقوام کے طلبا کو آئندہ آرٹس کے مضامین کے بجائے تکنیکی مضامین میں داخلہ لینا چاہیے تاکہ تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری دور کی جا سکے حکومت ہند نے بھی ڈپلوما کے نصابوں میں مندرج فہرست اقوام کے پوسٹ میٹرک طلبا کو وظیفے دینے کے سلسلہ میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ حکومت ہند کی طرف سے مستقبل میں مندرج فہرست اقوام کے صرف ایسے طلبا کو وظیفے دیے جائیں گے جو ہائی اسکول یا اس کے مساوی کوئی دوسرا امتحان پاس کرنے کے فوراً بعد ڈپلوما کے نصابوں میں داخلہ لیں گے۔ مندرج فہرست اقوام کے ایسے امیدواروں کو وظیفے نہیں دیے جائیں گے جو انٹر سائنس یا بی۔ ایس۔ سی میں فیل ہونے کے بعد ڈپلوما کے نصابوں میں داخل ہوں گے علاوہ ازیں ان طلبا کو بھی وظیفے نہیں ملیں گے جنھوں نے انٹر سائنس یا بی۔ ایس۔ سی میں کم نمبر حاصل کیے ہوں۔ ایسے حالات میں صرف ان طلبا کو وظیفے دینے پر غور کیا جائے گا جنھوں نے ہائی اسکول یا اس کے مساوی کوئی دوسرا امتحان پاس کرنے کے بعد ڈپلوما کے نصابوں میں داخلہ کے لیے درخواستیں دی ہوں اور ان کو داخل نہ کیا گیا ہو۔ ایسے طلبا کو تعلیمی ادارہ کے افسر اعلیٰ سے یہ سرٹیفکٹ حاصل کر کے پیش کرنا ہوگا کہ انھوں نے ہائی اسکول یا اس کے مساوی کوئی دوسرا امتحان پاس کرنے کے بعد ڈپلوما میں داخلہ کے لیے درخواستیں دی تھیں مگر ان کو داخل نہیں کیا گیا تھا۔

پریس نوٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ ایسے طلبا کو جو ہائی اسکول یا اسکے مساوی کوئی دوسرا امتحان پاس کرنے کے بعد ڈپلوما کے نصابوں میں داخل

کر لیے گئے تھے اور انھوں نے خود ہی ان نصابوں میں شرکت نہیں کی یا ایسے طلبا کو جنھوں نے ہائی اسکول یا اس کے مساوی کوئی دوسرا امتحان پاس کرنے کے بعد ان نصابوں میں داخلے کے لیے درخواستیں نہیں دیں اور اب انٹر سائنس یا بی۔ ایس۔ سی میں فیل ہونے کے بعد یا ان امتحانوں میں کم نمبر پانے کے بعد داخلہ کے خواہشمند ہیں وظیفے نہیں دیے جائیں گے۔

تکنیکی تعلیم کے قرضوں کے پروگرام کا جہاں تک تعلق ہے یہ امید کی جاتی ہے کہ سال رواں ایک اہم سال ثابت ہوگا۔ اگرچہ بجٹ میں اس پروگرام کے لیے ۸،۳۰ لاکھ روپیہ مقرر کیا گیا ہے لیکن ان قرضوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے ۵،۰۰ لاکھ روپیہ کی مزید رقم بہم پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس پروگرام کی افادیت کے پیش نظر مزید رقم کی فراہمی قریب قریب یقینی ہے۔ گزشتہ سال ۶،۱۶ لاکھ روپیہ کی مقررہ رقم کے مقابلہ میں کل ۱۰،۸۷ لاکھ روپے کے قرضے منظور کیے گئے تھے۔

تیسرے پنج سالہ منصوبہ میں اس مقصد کے لیے ۳۰ لاکھ روپیہ مقرر کیا گیا ہے جس میں سے تقریباً ۲۵ لاکھ روپیہ منصوبہ کے پہلے دو برسوں ہی میں بطور قرضہ تقسیم کر دیے جائیں گے۔ اس پروگرام کی حد درجہ مقبولیت کا یہ ایک بین ثبوت ہے۔

مالی سال رواں میں اب تک ۳۹ طلبا کو بیرونی ممالک میں اعلیٰ سائنسی اور تکنیکی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجموعی طور پر ۲،۲۸ لاکھ روپے کے قرضے دیے جا چکے ہیں جس سے اسکیم کے آغاز سے قرضے پانے والے طلبا کی مجموعی تعداد ۲۳۱۹ اور ان کو دیے گئے قرضہ کی مجموعی رقم ۲۳،۴۰ لاکھ روپیہ ہو گئی ہے۔

یہ پروگرام سنہ ۵۰-۱۹۴۹ء میں شروع کیا گیا تھا اور شروع میں محض تین طلبا کو ۶۰۰ روپیہ دینے کا بندوبست تھا۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سال تقریباً ۳۰۰ طلبا کو تقریباً ۱۴ لاکھ روپیہ کے قرضے تقسیم کیے جائیں گے۔

اس پروگرام کے تحت بیرونی ممالک میں اور ملک کے اندر اعلیٰ سائنس اور تکنیکی تعلیم حاصل کرنے کے لیے طلبا کو بالترتیب ۱۰ ہزار اور پانچ ہزار روپیہ تک بطور قرضہ دیا جاتا ہے۔ اس قرضہ پر ایک فی صدی سالانہ سود لیا جاتا ہے جو متعلقہ نصاب تعلیم کی تکمیل کے ایک سال بعد سات مساوی سالانہ قسطوں میں وصول کیا جاتا ہے۔

تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے دوران ریاست کے پہاڑی ضلعوں میں زراعتی پیداوار میں اضافہ کرنے سے متعلق اسکیموں پر عملدرآمد کے لیے ۳،۲۷ کروڑ روپیہ کی مجموعی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں محکمۂ زراعت کے علاوہ لوکل سیلف گورنمنٹ گنا اور صنعت کے محکمہ جات ان علاقوں میں اپنی اسکیمیں چلائیں گے جن کا زراعتی پیداوار سے براہ راست تعلق ہوگا۔

محکمۂ زراعت ۲،۴۷ کروڑ روپیہ کی مجموعی لاگت سے کل ۳۵ اسکیموں پر عملدرآمد کرے گا۔ محکمہ لوکل سیلف گورنمنٹ دہرہ دون میں گندے پانی کو کام میں لانے سے متعلق اپنی واحد اسکیم پر عملدرآمد کے سلسلہ میں ۵ لاکھ روپیہ خرچ کرے گا۔

محکمۂ صنعت کو اپنی اسکیموں کو بروئے کار لانے کے پیش نظر ۳۰ لاکھ روپیہ دیا گیا ہے۔ یہ اسکیمیں موجودہ پودگھروں کی توسیع، پھلوں کے پودوں کے نقل و حمل کے اخراجات میں امداد دینے، سرکاری باغات کی ترقی، چوبٹیا کے پھلوں کی تحقیق سے متعلق ادارہ اور چوبٹیا میں واقع باغبانی کی تربیتی مرکز کی توسیع، ڈبوں میں بند کرنے سے متعلق مزید احتیاطی مراکز (جہاں تربیت دی جائے گی) پروسیسنگ واحد [illegible] کے پیش نظر پھل پیدا کرنے والوں کی امداد باہمی انجمنوں کے قیام [illegible] میں فروٹ پروسیسنگ فیکٹری کے قیام اور گشتی [illegible] سے متعلق واحدہ کے قیام سے متعلق ہیں۔

گنا کے محکمہ کی جانب سے شکر ملوں کے گرد [illegible] کی لاگت سے کنکریٹ کے راستوں اور کولتار کی سڑکوں کی تعمیر بھی کی جائے گی۔

تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے پہلے سال کے دوران پہاڑی اضلاع میں متعدد اسکیموں کے تحت جو ترقی ہوئی ہے اس کی رپورٹ ریاستی حکومت نے طلب کی ہے۔

حکومت اتر پردیش نے مالی سال رواں کے دوران ہند کشٹ نوارن سنگھ کی اتر پردیش برانچ کو ریاست میں کوڑھ کے مریضوں کی امداد کی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے کے لیے ۵۰ ہزار روپیہ منظور کیا ہے۔ یہ ادارہ اس رقم کو سروے کرنے تعلیم اور علاج و معالجہ۔ پرچار کے لیے ایک گشتی گاڑی رکھنے۔ کوڑھ کی دوائیں خریدنے اور ان کو رضا کار اداروں کو تقسیم کرنے پر صرف کرے گا۔

ہند کشٹ نوارن سنگھ کی اتر پردیش برانچ ریاست میں کوڑھ کے بڑھتے ہوئے خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے سنہ ۱۹۲۵ء میں قائم کی گئی تھی۔ اتر پردیش میں کوڑھ کی روک تھام کی سرگرمیوں میں رابطہ قائم کرنے اور ان کی توسیع کے پیش نظر سنہ ۱۹۵۹ء میں اس ادارہ کی تشکیل نو کی گئی تھی۔ رشی کیش کے قریب برہم پوری میں کوڑھیوں کی بستی کو بہتر بنانے۔ اتر پردیش میں کوڑھ کی بیماری کا جائزہ لینے۔ کوڑھ گھروں کو مالی امداد دینے اور رضا کار اداروں کو مفت دوائیں بہم پہنچانے کے لیے اس ادارہ کو سنہ ۱۹۵۹-۶۰ء میں ایک لاکھ روپیہ کی غیر مکرر مالی امداد دی گئی تھی۔ علاوہ ازیں سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء میں ۷۴۸۰۰ روپیہ اور سنہ ۱۹۶۱-۶۲ء میں ۵۰۰۰۰ روپیہ کی غیر مکرر مالی امداد دی گئی۔

اتر پردیش میں ایسے رضا کار اداروں کی تعداد ۱۲ ہے جو کوڑھ کے مریضوں کو امداد بہم پہنچانے کا کام کر رہے ہیں۔

اتر پردیش میں اس وقت کوڑھ سے متعلق اداروں کی تعداد ۱۸ ہے جن میں مجموعی طور پر ۱۵۰۰ پلنگوں کا بندوبست ہے۔ ان میں سے تین ادارے حکومت اور بقیہ مختلف رضا کار ایجنسیوں کے زیر انتظام ہیں۔ ریاستی حکومت کے ذریعہ ان اداروں کو سالانہ مالی امداد دی جاتی ہے۔

مرکزی حکومت نے سنہ ۱۹۵۴ء میں کوڑھ کی روک تھام سے متعلق جو کمیٹی مقرر کی تھی اس کی رپورٹ کے مطابق اتر پردیش میں کوڑھ کے مریضوں کی تخمینی تعداد ۸۰ ہزار ہے۔

متفرقات

سنسکرت کے ممتاز عالموں کو مالی امداد

حکومت اتر پردیش نے سنسکرت کے ممتاز عالموں کو جو روایتی مشرقی طریقہ تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ مالی امداد۔ ماہانہ الاؤنس دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے مالی سال رواں میں دس ہزار روپیہ مقرر کیا گیا ہے۔

یہ اسکیم ایسے عالموں کی اعانت کے لیے شروع کی گئی ہے جنھوں نے روایتی طریقہ سے تعلیم حاصل کی ہے اور جو اپنے طلبا کو اس طریقہ سے تعلیم دینے میں یقین رکھتے ہیں۔

اس اسکیم کے تحت ایسے عالموں کو مالی امداد دی جائے گی جو ایک یا دو طلبا کو ٹیوشن فیس لے کر اپنے گھر پر پڑھانے کے لیے یا سنسکرت ادب کی تاریخ یا متعلقہ مضامین میں ریسرچ کرنے یا اس سلسلہ میں تنہا کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔

یہ مالی امداد انفرادی معاملوں میں عام طور پر ۱۰۰ روپیہ ماہانہ سے یا یکمشت ۵۰۰ روپیہ سے کم نہیں ہوگی۔ مستثنیٰ معاملوں میں مالی امداد کی رقم بڑھائی جا سکتی ہے یا دونوں قسم کی امداد دی جا سکتی ہے۔

درخواستیں سکریٹری ایجوکیشن سی۔ ڈپارٹمنٹ۔ حکومت اتر پردیش کونسل ہاؤس۔ لکھنؤ بھیجنا چاہیے جہاں سے دیگر تفصیلات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔

ناشرین کو غلط نقشوں کے خلاف تنبیہ۔ حکومت اتر پردیش نے ناشرین کو اس قسم کی کوئی بھی چیز شائع کرنے کے خلاف تنبیہ کیا ہے جو ہندوستان کی سرحدوں اور اس کی علاقائی سالمیت کے منافی ہو۔ کیونکہ اس قسم کا فعل فوجداری ترمیمی ایکٹ سنہ ۱۹۶۱ء کے تحت جرم ہے۔

ناشرین کو ان کے ذاتی مفاد کے پیش نظر یہ صلاح دی گئی ہے کہ وہ وثوق کے ساتھ اس امر کا اطمینان کر لیں کہ انھوں نے جو نقشے اور اٹلسیں شائع کی ہیں ان میں ہندوستان کی خارجی سرحدوں کو صحیح طور پر پیش کیا گیا ہے۔

نقشوں کی جانچ اور ان کو درست کرنے کی سہولت ڈائرکٹر پبلیکیشن سروے آف انڈیا۔ ہاتھی بارکالا۔ دہرہ دون کے دفتر دستیاب ہے۔ غلط نقشوں کی اشاعت کے امکان سے بچنے کے ناشرین اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ غلط نقشوں کی اشاعت سے فوجداری ترمیم [illegible] سنہ ۱۹ء کی دفعات کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

مراسلہ

حضرت اثر لکھنوی اور نور اللغات

جناب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کی کتاب فرہنگ اثر کی اشاعت سے پہلے اور اُس کے بعد بھی نیا دور لکھنؤ میں نور اللغات پر اُن کے کئی مضامین نکل چکے ہیں۔ فرہنگ اثر پر ریویو بھی ہو چکا ہے۔

اُردو کے لُغت کی حیثیت سے نور اللغات کی اہمیت اور افادیت کا حضرت اثر خود اعتراف کر چکے ہیں، خاص کر اس لیے کہ وہ انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انفرادی کوششوں ہی کی وجہ سے نور اللغات میں غلطیوں کا ہونا ممکن ہے اور بعض جگہ غلطیاں پائی بھی جاتی ہیں۔ ان باتوں کی پیش نظر عرصہ ہوا (فرہنگ اثر کی اشاعت سے پہلے) میں نے نور اللغات پر نظر ثانی کرنا شروع کر دی تھی۔ اس اثنا میں حضرت اثر نے فرہنگ اثر شائع کر دی لیکن یہ کتاب بھی اپنی جگہ کوئی مکمل لغت نہیں ہے، وہ زیادہ سے زیادہ سرمایۂ زبان اردو اور نور اللغات کا ایک مجمل تتمہ یا تبصرے کا کام دے سکتی ہے جیسا کہ اثر صاحب نے خود اقرار کیا ہے۔ بہرحال نور اللغات اور فرہنگ اثر مل کر ایک مستند لغت بن سکتے تھے لیکن افسوس ہے کہ اس کی تیاری میں جناب اثر نے غالباً زیادہ توجہ، غور و فکر، تحقیق اور تلاش سے کام نہیں لیا اور کافی چھان بین کیے بغیر اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف فرہنگ اثر میں خامیاں رہ گئیں اور دوسری طرف نور اللغات میں دیے ہوئے صحیح الفاظ کے بارے میں بھی خواہ مخواہ کی غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ اس بارے میں رسالہ نگار لکھنؤ کے صفحات میں فرہنگ اثر کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کر رہا ہوں کیوں کہ نیا دور لکھنؤ میں شاید زیادہ گنجائش نہ نکل سکے۔ یہاں میں فرہنگ اثر اور نور اللغات کے بارے میں صرف چند باتیں بہت ہی اختصار سے عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) جناب اثر نے بعض الفاظ اور محاورات وغیرہ کے بارے میں لکھ دیا کہ یہ لفظ یا محاورہ نور اللغات میں "درج نہیں" مثلاً "اُلٹی آنتیں گلے پڑنا، آنکن، آنکھ بدلنا، آنکھ چھپنا وغیرہ وغیرہ لیکن یہ الفاظ علی الترتیب نور اللغات کے صفحات ۲۷۷، ۳۷، ۱۵۲ اور ۱۵۸ پر درج ہیں۔

(۲) فرہنگ اثر میں کئی جگہ کسی فارسی محاورے یا مقولے کے متعلق بھی (جو اُردو میں عام طور سے رائج بھی نہیں ہیں) اثر صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ نور اللغات میں "درج نہیں"! مثلاً "اگر یار اہل است کار سہل است"

اوّل تو نور اللغات اُردو کا لغت ہے جس میں ہر فارسی محاورے کے درج ہونے کی ضرورت نہیں، پھر حضرت اثر نے مذکورہ مقولے کا اُردو میں کوئی استعمال بھی تو نہیں بتایا اور صرف یہ فرما دیا کہ میر نے اس کا ترجمہ اپنے ایک شعر میں کیا ہے۔

(۳) اعتراض کرتے وقت حضرت اثر نے اکثر فارسی کے مستند لغات پر نظر نہیں ڈالی اور نور اللغات میں مندرج متعدد الفاظ کے بارے میں فرہنگ اثر میں یہ لکھ دیا کہ فارسی لغات میں درج نہیں یا سند نہیں پیش کی گئی مثلاً "آبِ آتش رنگ" کے معنی نور اللغات میں درج ہیں۔ "شراب سرخ، اشکِ خونیں"۔ اثر صاحب نے اپنی فرہنگ میں لکھ دیا کہ "اشکِ خونیں کی طرف اشارہ بہت مشتبہ ہے۔ کوئی سند بھی پیش نہیں کی اور فارسی لغات میں بھی آبِ آتش رنگ کے معنی اشکِ خونیں درج نہیں ملے"۔ اوّل تو کسی لغت کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اس میں کسی لفظ یا محاورے کے صحیح معنی اور مفہوم بتانے کے بجائے صرف یہ لکھ دیا جائے کہ "مشتبہ ہے"۔ صاحبِ لغت کا فرض ہے کہ اس لفظ یا محاورے کے متعلق تحقیق کر کے کوئی قطعی بات لکھے۔ دوسرے جن الفاظ کے بارے میں اشتباہ ظاہر کیا گیا ہے فارسی لغات میں اُن کے وہی معنی دیے گئے ہیں جو نور اللغات میں درج ہیں۔ ملاحظہ ہو ہفت قلزم: "کنایہ از شراب لعلی و اشکِ خونیں باشد"۔ فرہنگ آنند راج میں ہے: "آبِ آتش رنگ" اشکِ خونیں (صائب)

زخاکِ افسردہ تر وز باد سرگرداں ترم باشم
علاج دردِ من از آبِ آتش رنگ می آید

حضرت اثر نے اسی طرح "آبِ ارغوانی" کے بارے میں فرمایا ہے کہ "آبِ ارغوانی بمعنی اشکِ غم میری نظر سے نہیں گزرا اور سند کا محتاج ہے"۔ اگر حضرت اثر نے ہفت قلزم، فرہنگ جہانگیری اور فرہنگ آنند راج ملاحظہ فرمایا ہوتا تو نور اللغات میں مندرج معنی کی تصدیق ہو جاتی۔

(۴) نور اللغات میں دی ہوئی بعض فنی اصطلاحات مثلاً "لم پرا" کے بارے میں فرہنگ اثر میں لکھا ہے کہ "لکھنؤ میں کوئی نہیں بولتا" یا "میرے کان اس سے آشنا نہیں"! حالاں کہ اگر لکھنؤ کے کبوتر بازوں سے پوچھا جائے تو وہ بتا دیں گے کہ لم پرا وہ کبوتر ہے جس کے پر دراز ہوں۔ رشک لکھنوی نے نفس اللغہ میں لم پرا بمعنی دراز پر دیا ہے۔

(۵) فرہنگ اثر میں اثر صاحب نے جا بجا اپنے شعر سنداً پیش کیے ہیں۔ جناب اثر کی علمیت تسلیم لیکن یہاں معاملہ مدعی و مدعا علیہ کا ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں اپنا ہی شعر پیش کرنا مناسب نہیں۔ یوں تو اثر صاحب کا اتنا ارشاد ہی کافی ہوتا کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا"۔ چلیے چھٹی ہوئی۔ ہنسنے کی بات تو یہ ہے کہ حضرت اثر کئی جگہ یہ بھی فرما چکے ہیں کہ محاورات کے سلسلے میں شعر سے سند نہ پیش کی جائے اور خود ہی شعر پیش کرتے ہیں اور وہ بھی اپنے۔

(۶) فرہنگ اثر میں متعدد جگہ مستند لغات اور مستند شعرا کو ثبوت میں

[illegible] زنے کے بجائے مستشرقین مثلاً پلیٹس اور فیلن کے حوالے بڑے وثوق کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقعوں پر ثبوت اہل زبان کے کلام سے دینا [illegible] مستشرقین سے۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ صاحب فرہنگ [illegible] میں مستشرقین کی [illegible] فرماتے ہیں۔

[illegible] بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث یا [illegible] محاورات میں الفاظ کے تلفظ کے [illegible] میں جناب اثر نے عجیب [illegible] توجیہات پیش کر کے ایک حکم لگا دیا ہے۔ مثلاً آبشار کے بارے میں اثر صاحب فرماتے ہیں کہ "جن لوگوں نے آبشار کو دیکھا ہے [illegible] اس کو مونث نہ کہیں گے۔ پانی کا حجم اور زور و شور کے ساتھ بلندی سے گرنا اس [illegible] صاف ہے۔" تذکیر و تانیث کا تعین کرنے کے لیے اگر یہی معیار مقرر [illegible] تو پھر دنیا کی وسعت [illegible] کو دیکھتے ہوئے اسے مونث کی جگہ [illegible] چاہیے۔ حضرت اثر نے "آبشار" کے مذکر ہونے کے ثبوت میں تحسین [illegible] شعر بھی دیا ہے لیکن اس کے مقابلے میں امیر اللغات [illegible] [illegible] (منشی سجاد حسین) [illegible] اردو [illegible]

(حیدرآباد) پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں "آبشار" کو مونث بتایا گیا ہے۔ نوراللغات میں سند کے طور پر نوازش دہلوی کا شعر پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح جاہ لکھنوی کا شعر خلاف جمہور قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک اور محاورہ "چڑیاں چگ گئیں کھیت" کے سلسلے میں حضرت اثر نے لکھا کہ "چڑیاں کی چ کے زیر کی جگہ پیش کر دیا جائے تو ترنم پیدا ہو جائے گا" اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ محاورے نے اور تال کے حساب سے وضع ہونا چاہیے۔

(۸) بعض جگہ حضرت اثر نے کچھ کا کچھ دیکھا اور کچھ کا کچھ لکھ دیا۔ مثلاً "بالم کھیرا" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "بالم کھیرا ایک قسم کا سفیدی مائل چھوٹا کھیرا ہے۔ فیلن سے میری تائید ہوتی ہے۔" فیلن نے "بالم کھیرا" کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے: (A superior white cucumber)"۔ میں نے انگریزی لغت دیکھے لیکن ان میں سپیریر کے معنی کہیں چھوٹے کے نہیں ملے۔ کیا سمجھوں کہ فیلن غلط انگریزی لکھتا ہے یا مولف فرہنگ اثر نے ہندی میں اس کے معنی غلط پہنائے ہیں؟ ——— طاہر محسن کاکوری

★

تصحیح

[illegible] کی اشاعت ستمبر ۱۹۶۲ء میں ہندوستانی [illegible] کی تصویروں [illegible] بائیں طرف اوپر تصویر کے نیچے غلطی سے [illegible] سراج لکھ دیا گیا [illegible] کوئی [illegible] ہے۔

۲۔ [illegible] (مئی ۱۹۶۲ء) میں [illegible] کے عنوان سے جو مضمون شائع [illegible] کا لکھا ہوا ہے۔ [illegible] غلط چھپ گیا [illegible] میں نام [illegible] ہے۔

۳۔ نیا دور (جون ۱۹۶۲ء) میں [illegible] کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں لکھنے والے کا نام یوسف سرمست چھپ گیا ہے حالانکہ صحیح [illegible] سرمست ہے۔

۴۔ نیا دور (جون ۱۹۶۲ء) میں نقد و تبصرہ کے تحت امیر خسرو کے سلسلے میں ایک جگہ "ترکی النژاد" چھپ گیا ہے۔ یہ ترکیب صحیح نہیں ہے "ترکی نژاد" ہونا چاہیے۔

★

ذوق اور علمِ تصوف ——— (بسلسلہ صفحہ ۳۷)

۲۔ ذوق کہتے ہیں

[illegible] فقر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے
دنیائے زر و مال [illegible] نہیں کرتا

[illegible] یہ حقیقت بھی ہے کہ شعرائے دہلی دامن چھوڑ کر حیدرآباد اور لکھنؤ وغیرہ مقامات تک جا رہے تھے لیکن ذوق کی قناعت پسند طبیعت نے ان کو شہر سے باہر نہ نکلنے دیا۔

REGD. No. A-319

میٹری ناپ تول

۱۔ وزن

ٹن سے میٹری ٹن تک

ٹن	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
میٹری ٹن	[illegible]	[illegible]	۳٫۰۵	۴٫۰۶	۵٫۰۸	۶٫۱۰	۷٫۱۱	۸٫۱۳	۹٫۱۴	۱۰٫۱۶

پاؤنڈ (اے۔وی) سے کلوگرام تک

پاؤنڈ	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
کلوگرام	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۱٫۸۱	۲٫۲۷	۲٫۷۲	۳٫۱۸	۳٫۶۳	۴٫۰۸	۴٫۵۴

تولے سے گرام تک

تولہ	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	[illegible]
گرام	۱۱٫۶۶	۲۳٫۳۳	۳۴٫۹۹	۴۶٫۶۵	۵۸٫۳۲	۶۹٫۹۸	۸۱٫۶۵	۹۳٫۳۱	۱۰۴٫۹۷	۱۱۶٫۶۴

سیر سے کلوگرام تک

سیر	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
کلوگرام	۰٫۹۳	۱٫۸۷	۲٫۸۰	۳٫۷۳	۴٫۶۷	۵٫۶۰	۶٫۵۳	۷٫۴۶	۸٫۴۰	۹٫۳۳

من سے کوئنٹل تک

من	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
[illegible]	۰٫۳۷	۰٫۷۵	۱٫۱۲	۱٫۴۹	۱٫۸۷	۲٫۲۴	۲٫۶۱	۲٫۹۹	۳٫۳۶	۳٫۷۳

۲۔ لمبائی

میل سے کلومیٹر تک

میل	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
کلومیٹر	۱٫۶۱	۳٫۲۲	۴٫۸۳	۶٫۴۴	۸٫۰۵	۹٫۶۶	۱۱٫۲۷	۱۲٫۸۷	۱۴٫۴۸	۱۶٫۰۹

گزوں سے میٹر تک

گز	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
میٹر	۰٫۹۱	۱٫۸۳	۲٫۷۴	۳٫۶۶	۴٫۵۷	۵٫۴۹	۶٫۴۰	۷٫۳۲	۸٫۲۳	۹٫۱۴

انچوں سے ملی میٹر تک

انچ	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲
ملی میٹر	۲۵٫۴۰	۵۰٫۸۰	۷۶٫۲۰	۱۰۱٫۶۰	۱۲۷٫۰۰	۱۵۲٫۴۰	۱۷۷٫۸۰	۲۰۳٫۲۰	۲۲۸٫۶۰	۲۵۴٫۰۰	۲۷۹٫۴۰	۳۰۴٫۸۰

۳۔ رقبہ

ایکڑ سے ہیکٹر تک

ایکڑ	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
ہیکٹر	۰٫۴۰	۰٫۸۱	۱٫۲۱	۱٫۶۲	۲٫۰۲	۲٫۴۳	۲٫۸۳	۳٫۲۴	۳٫۶۴	۴٫۰۵

مربع گزوں سے مربع میٹروں تک

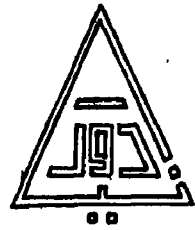
مربع گز	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
مربع میٹر	۰٫۸۴	۱٫۶۷	۲٫۵۱	۳٫۳۴	۴٫۱۸	۵٫۰۲	۵٫۸۵	۶٫۶۹	۷٫۵۳	۸٫۳۶

۴۔ مقدار

گیلن (امپیریل) سے لیٹر تک

گیلن	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰
لیٹر	۴٫۵۵	۹٫۰۹	۱۳٫۶۴	۱۸٫۱۸	۲۲٫۷۳	۲۷٫۲۸	۳۱٫۸۲	۳۶٫۳۷	۴۰٫۹۱	۴۵٫۴۶

کارتیک ۱۹۹۴



جلد ۱۷ | نمبر ۸

کارتک ۱۸۸۴

نومبر ۱۹۶۲ء

چندہ سالانہ : پانچ روپے

فی پرچہ : پچاس نئے پیسے

ایڈیٹر

صباح الدین عمر

پبلشر

اُمیش بھوشن ملک

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر

جے۔ ڈبلو۔ ہاچ

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ

نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات۔ اُترپردیش

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں حکومتِ اترپردیش اُن سے بہرحال متفق ہو۔

اپنی بات

نومبر کی ۱۴ ہندوستان کے محبوب وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس موقع پر ہر ہندوستانی کی زبان سے بے ساختہ یہی نکلتا ہے کہ "تم سلامت رہو ہزار برس" اور یہ دل کی بھی آواز ہوتی ہے ۔ جواہر لال حقیقت ہندوستان کے وزیر اعظم ہی نہیں نئے ہند کے معمار بھی ہیں ۔ ان کے حصے میں یہ سعادت آئی ہے کہ انھوں نے ملک کو [illegible] برس تک [illegible] کی بنیادیں مضبوط کرنے میں بھی اُن کا سب سے اہم کردار رہا اور جب ہندوستان کو [illegible] آزادی کے بعد جو مسائل درپیش ہوئے تھے اُن کے لیے جواہرلال نہرو ہی کے دماغ اور دور بین نگاہوں کی ضرورت تھی ۔ [illegible] ان ہی کی صلاحیتوں کی بدولت جواہرلال نے ان مسائل کو حل کیا اور یہ وہ ایک طرف ہندوستان کے اقتصادی ڈھانچے کے درست کرنے میں مصروف ہو گئے اور دوسری طرف صف اقوام عالم میں ہندوستان کے لیے ایک ممتاز مقام حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے ۔ یہ جواہرلال جی کی وسیع النظری اور [illegible] ہے کہ انھیں دونوں مہموں میں کام یابی ہوئی ۔ ان کی نگرانی میں ملک اور ملک کی ہر ریاست کے لیے پنج سالہ اقتصادی منصوبے تیار کیے گئے اور بین الاقوامی معاملات میں ہندوستان کی آواز نہ صرف سُنی جانے لگی بلکہ اس آواز کا ایک خاص احترام کیا جانے لگا ۔ یہی وجہ ہے کہ آج [illegible] جواہرلال نہرو کا شمار دُنیا کے ممتاز ترین رہ نماؤں میں ہے ۔ جہاں یہ اگر ایک طرف وہ ہندوستان کی [illegible] اور ہر دل عزیز ترین ہستی ہیں تو دوسری طرف خطرات سے سہمی ہوئی دُنیا کے لیے ایک بڑا سہارا ۔ اس طرح جواہرلال نہرو ایک بہت بڑے قوم پرور بھی ہیں اور بہت بڑے آفاقیت پسند بھی ۔ اُن کی قوم پروری میں تنگ نظری نہیں بلکہ آفاقیت ہے ۔ وہ ہندوستان ہی کا بھلا نہیں چاہتے بلکہ وہ ساری زمین کا بھلا چاہتے ہیں ۔ وہ اس دور میں جب کہ صاف گوئی اور حق گوئی ایک جنس کم یاب ہے حق و صداقت کے زبردست علم بردار ہیں ۔ انھوں نے دُنیا کے مختلف اہم مسئلوں پر رائے زنی کی ہے لیکن کسی سے مرعوب ہوئے بغیر انھوں نے "طاہا" کو کبھی "قند" نہیں کہا اور حق بات کہنے میں اپنے اور بیگانے کی کبھی پروا نہیں کی ۔ کم زور ملکوں کا انھوں نے ہمیشہ ساتھ دیا اور طاقت ور ملکوں کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی ۔ اسی لیے دُنیا کے کم زور ملک انھیں اپنا سب سے بڑا ساتھی اور ہمدرد سمجھتے ہیں اور طاقت ور ملک ان کی غیر جانب دارانہ اور آزاد رائے کی قدر کرتے ہیں ۔ جواہرلال کی اسی پالیسی نے دُنیا کی نظروں میں ہندوستان کا مرتبہ بلند کر دیا ہے اور بین الاقوامی مسائل میں اس کا غیر جانب دارانہ رویہ اور عالمی مسلک بہتوں کے لیے شمع ہدایت کا کام دیتا ہے ۔ ہندوستانی ہندوستان کے اس مایہ ناز رہ نما اور وزیر اعظم پر جس قدر بھی فخر کریں کم ہے ۔ لیکن جواہرلال کی ذات پر فخر کرنا ہی ہمیں زیب نہیں دیتا بلکہ اس وقت جب کہ ہندوستان متعدد اہم اندرونی اور بیرونی مسائل سے دوچار ہے ، جواہرلال کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا اور ان کے مشورے پر عمل کرنا بھی ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے ۔ یہ مشورے کیا ہیں ؟ صرف یہ کہ اپنے وطن کو اپنی ذات سے مقدم سمجھو ، صوبائی اور لسانی تعصبات سے بالاتر رہو ، قوم میں یک جہتی اور ایکتا کے جذبے کو فروغ دو اور ملک میں ایک سوشلسٹ نظام کی ترویج میں مدد دینے کے لیے پنج سالہ منصوبوں کو کام یاب بناؤ اور ان کی کام یابی کے لیے سرمایہ فراہم کرنے میں تھوڑے سے ایثار اور قربانی سے کام لو ۔

جواہرلال جی نے ہندوستانیوں کو اپنی زندگی اور اپنے عمل سے جہاں اور سبق دیے ہیں وہاں بچوں سے محبت کرنا بھی سکھایا ہے ۔ محبت کرنے کے معنی یہ نہیں کہ بے جا لاڈ پیار سے انھیں بے تمیز بنا دیا جائے ۔ بچوں سے اصل محبت یہ ہے کہ اُن کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھا جائے ، ان کے لیے گھر میں اور گھر کے باہر ایک صحت مند ماحول قائم رکھا جائے ، اُن کی صلاحیتوں کو اُجاگر ہونے کا موقع دیا جائے ، اگر اُن میں کوئی کج روی پائی جاتی ہے تو اُس کے اسباب پر غور کیا جائے اور اِن باتوں کو دور کیا جائے جن کی وجہ سے یہ کج روی پیدا ہو گئی ہے ۔ غرض ان بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشو و نما کے لیے پوری کوشش کی جائے اور اُن کی طرف سے غفلت نہ برتی جائے کیوں کہ یہی بچے آگے چل کر قوم اور ملک کے ناخدا بنیں گے ۔ جواہرلال جی کو بچوں سے جو محبت ہے اس کا خیال کرتے ہوئے ہندوستان بھر میں ہر سال ۱۴ ؍ نومبر کو "بچوں کا دن" بھی منایا جاتا ہے ۔ بچوں کے لیے یہ خوشی منانے کا دن ضرور ہے مگر والدین کے لیے یہ روز بچوں کے مسائل پر غور و فکر کرنے کا دن ہے ۔ اگر ایمان داری اور خلوص کے ساتھ ان مسائل پر غور و فکر ہو جایا کرے تو یہ بچوں کے حق میں بھی مفید ہوگا اور قوم کے مستقبل کے حق میں بھی ۔

● حکومت اتر پردیش اپنے ہندی سمتی فنڈ سے ہر سال سنسکرت ، ہندی اور اُردو کے مصنفین کو اُن کی تصنیفوں پر انعامات دیتی ہے ۔ اُردو کتابوں پر ایک انعام (غالب انعام) ۱۵۰۰ روپے کا ، دوسرا انعام (اکبر الٰہ آبادی انعام) ۱۲۰۰ روپے کا ، تیسرا انعام (رام پرشاد بسمل انعام) ۸۰۰ روپے کا ہوتا ہے ۔ ان کے علاوہ پانچ پانچ سو روپے کے پانچ متفرق انعام ہوتے ہیں ۔ اس سے قبل جن اُردو مصنفین کو انعامات دیے گئے ہیں اُن کے ناموں کا حال میں اعلان ہو چکا ہے ۔ آئندہ انعامات دیے جانے کے سلسلے میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ جو کتابیں جنوری ۱۹۶۱ء کے بعد شائع ہوئی ہیں اُن کی سات سات جلدیں ایجوکیشن (سی) ڈپارٹمنٹ ، کونسل ہاؤس ، لکھنؤ کو بھیج دی جائیں ۔ کتابیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۶ ؍ نومبر ہے ۔ اگر انعام دینے والی کمیٹی کی رائے میں کوئی کتاب ایسی ہے جو انعام دینے کے قابل ہے مگر اُس کی کوئی جلد موصول نہیں ہوئی ہے تب بھی اُس پر انعام دیا جا سکتا ہے ۔ مزید تفصیلات مذکورہ محکمے سے معلوم کی جا سکتی ہیں ۔ —— ایڈیٹر

غزل

کس تازہ فسانے کا رنگین یہ عنوان ہے
اک اشک نیا سا کچھ پلکوں پہ فروزاں ہے

پتھر بھی پگھلتا ہے، اپنا تو یہ ایماں ہے
ڈھونڈو گے تو پاؤ گے، دشمن میں بھی انساں ہے

کھولا ہی کیا گرہیں، چھوٹا نہ مگر قیدی
تعمیرِ جہاں یوں ہی زنداں پسِ زنداں ہے

ہو جبر کے ہاتھوں جب تعمیر گلستاں کی
صورت میں نشیمن کی ہر شاخ پہ زنداں ہے

پھولوں سے ہٹا کر جب کانٹوں پہ نظر ڈالی
تب مجھ کو یقیں آیا، ہاں فصلِ بہاراں ہے

اک غم وہ ہے جو دل کو دیتا ہے توانائی
اور ایک وہ ہے جس سے پلکوں پہ چراغاں ہے

دیواریں بنیں در، اور در بن گئے دیواریں
یہ راہِ محبت بھی اک بھول بھلیاں ہے

اب عالمِ خاکی کی، اس دور میں دانش کے
تاروں پہ تو یورش ہے، ذرّوں سے ہراساں ہے

مسجد کا نمازی بھی، مندر کا پجاری بھی
مُلّائے برہمن کی باتوں سے پریشاں ہے

آنند نرائن ملا

نومبر ۱۹۶۲ء

کارنگ ۱۸۸۴

ہندوستانی عوامی ادب

محمد یسین

کسی ملک کا عوامی ادب (لوک ساہتیہ) اس ملک کے عوام کے دل و دماغ کا پیداوار ہوتا ہے اور ان کے دلی جذبات کا سچا مظہر۔ دنیا کے ہر علاقہ میں لوک گیتوں اور لوک کتھاؤں میں سیدھے سادے اور بھولے بھالے عوام کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ عالم رنگ و بو کا کوئی کونا ایسا نہیں جہاں دھڑکتے دلوں کے محسوسات مترنم نغموں اور سُریلے گیتوں میں منتج کر فضا میں رس بسے نہ ہوں۔ علاقائی اختلاف کی وجہ سے گیتوں، کتھاؤں اور کہانیوں میں کچھ فرق لازمی ہے لیکن ان سب میں جذبہ کی ہمرنگی اور محسوسات کی ہم وضعی ایک قدر مشترک ہے۔ عقیدت، محبت، نفرت، وطن کی الفت، ہجر و فراق، ایثار، دھرم اور "ادھرم" کے خیالات و جذبات ہر جگہ اور ہر دل میں ایک جیسے موجود ہیں۔

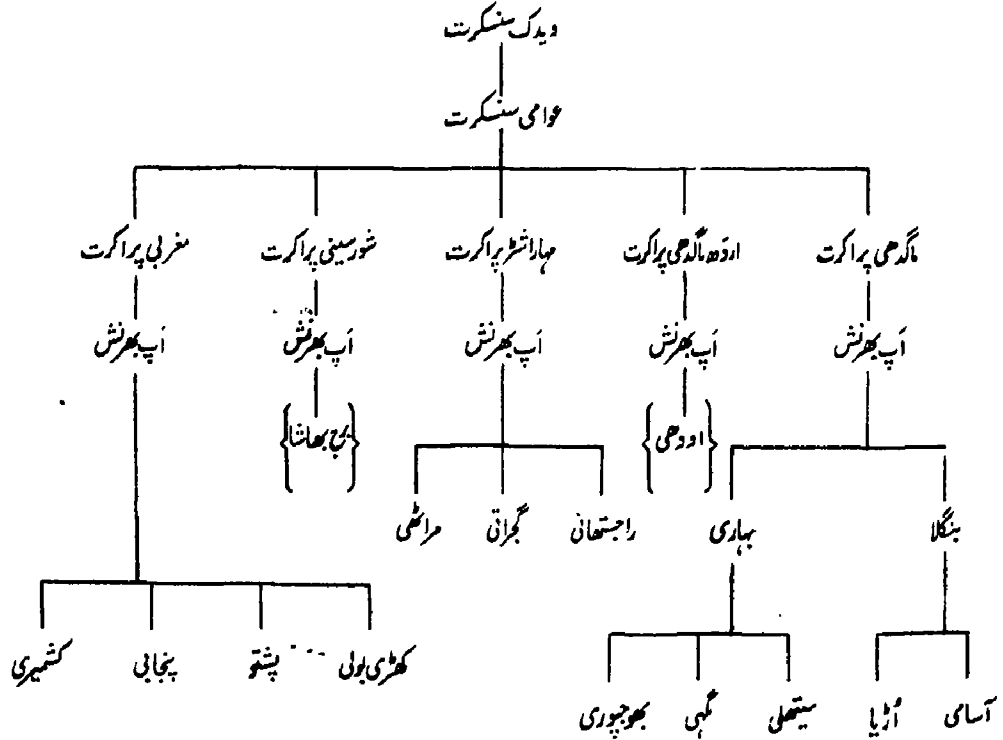
عوامی ادب کے تحت وہ تمام علمی اور ادبی سرمایہ آجاتا ہے جس میں انسان کا روایتی اور تاریخی روپ نکھر آتا ہے اور جس کے منبع عوام ہوتے ہیں۔ مذہبی عقائد، دھرم گاتھائیں اور کتھائیں، کہانیاں اور پہیلیاں سبھی اس میں شامل ہیں۔ جس طرح ہر ملک کی اپنی زبان ہوتی ہے اسی طرح اس کا اپنا لوک ساہتیہ بھی ہوتا ہے۔ اس کی تازگی اور شادابی کا راز فطرت سے قربت ہے۔ لوک ساہتیہ اس آئینہ کی طرح ہے جس میں عوام کے تمام خط و خال نظر آتے ہیں۔ اس میں جس سماج کی عکاسی کی گئی ہے وہ تندرست اور اخلاقی اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ اسی لئے یہاں دھرم، سماج اور قومیت کا احساس بدرجہ اتم ملتا ہے۔

لوک ساہتیہ ماضی کی بازگشت اور حال کا نقیب ہوتا ہے۔ 'مہذب' ادب کی طرح اس میں بھی زندگی اور حرکت محسوس ہوتی ہے اور اس کے پردہ میں بدلتے ہوئے سماج کا رنگ روپ دیکھا جا سکتا ہے۔ عوامی فن اور انفرادی فن کے درمیان خاص فرق یہ نہیں کہ ایک کی تخلیق گروہ کے ذریعہ ہوتی ہے اور دوسرے کی افراد کے ذریعہ بلکہ اصل فرق یہ ہے کہ جہاں انفرادی فن میں مخصوص شخصیتوں کا ذاتی میلان غالب رہتا ہے وہاں عوامی فن اجتماعی زندگی کی ضروریات اور محرکات کی نمائندگی کرتا ہے۔ عوامی فنکار اپنے ذاتی خیالات اور تصورات کے بجائے پورے سماج کی زندگی، کردار، احساسات اور میلانات کی عکاسی کرتا ہے جو لوک گیتوں اور لوک کتھاؤں سے بخوبی واضح ہے۔ لوک ساہتیہ میں بنیادی انسان (BASIC MAN) بولتا ہے۔ ساتھ ہی اسمیں ہر زمانہ میں بدلتے ہوئے حالات و واقعات کی بھی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس ساہتیہ میں وہ تمام آفاقی عناصر ملتے ہیں جن سے اس کی تازگی اور مقبولیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

ہمارا ملک لوک ساہتیہ میں دنیا کے مشہور ملکوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس دیس میں دراوڑ، آریہ، ہون، شاک، افغان، مغل، ایرانی اور عربی نسل کے لوگ آئے اور اپنے ساتھ طرح طرح کے عقائد اور رسوم، تقریبیں اور تیوہار لے آئے۔ دیسی روایت سے مل جل کر یہ عناصر ہندوستان کی عام تہذیب کا حصہ ہو گئے۔ آج بھی ہمارے ملک میں آریہ اور دراوڑی دونوں خاندان کی زبانیں پائی جاتی ہیں۔ آریائی زبانوں میں گجراتی، مراٹھی، پنجابی، ہندی، بہاری، بنگلا، اڑیا اور

آسامی زبانیں شامل ہیں۔ دراوڑی زبانوں کے تحت تمل، تیلگو، کنڑا اور ملیالم وغیرہ زبانیں آتی ہیں۔ ان تمام زبانوں کی مختلف بولیاں (DIALECTS) ہیں اور ان بولیوں کی بھی "ذیلی بولیاں" (SUB - DIALECTS) ہیں۔ مثال کے طور پر محض ہندی زبان میں راجستھانی، برج بھاشا، اودھی، بھوجپوری، بندیل کھنڈی، چھتیس گڑھی اور مگہی وغیرہ بولیاں شامل ہیں۔ ان تمام بولیوں میں عوامی ادب کا زبردست سرمایہ ہے۔ ہر علاقہ میں لوک گیت، گاتھائیں اور کہانیاں، مقولے اور کہاوتیں، محاورے اور پہیلیاں پائی جاتی ہیں۔ فاصلہ اور دوری کے باوجود تمام ہندوستانی لوک ساہتیہ میں مشترک عناصر ملتے ہیں، جو ہماری قومی وحدت کا ثبوت ہے۔

ہندوستانی لوک ساہتیہ کے ماخذ دو ہیں۔ ایک مذہبی یا اساطیری (MYTHOLOJICAL) اور تاریخی واقعات جو تمام علاقائی بولیوں کے عوامی ادب میں مشترک ہیں۔ دوسرے، علاقائی یا مقامی روایات جو کسی خاص جغرافیائی خطے سے متعلق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی ہر زبان کے لوک ساہتیہ میں اگر ایک طرف رام، کرشن، وید اور پُران کے ساتھ تاریخی واقعات قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں تو دوسری طرف ہر بولی میں مقامی روایات اور حکایات بھی ملتے ہیں جو ان کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ مشترک عناصر یعنی رامائن، مہابھارت، وید پُران اور قدیم تاریخ کی ماخذ سنسکرت زبان ہے جو ہندوستانی عوام بالخصوص ہندو فرقہ کے تمام خیالات اور عقائد کا سرچشمہ ہے۔ دوسری طرف ہر خطہ کی اپنی مخصوص تاریخ، روایت اور معاشرت ہے۔ ان اسباب کی بنا پر ان علاقوں کے لوک ساہتیہ میں کچھ خاص عناصر ملتے ہیں۔ بنگال کی موجیں مارتی ہوئی ندیوں کی سرسبز و شاداب سرزمین میں جو گیت سننے کو مل سکتے ہیں وہ راجستھان کے ریگستان میں ناممکن ہیں۔ اسی طرح یو۔ پی اور بہار کے وسیع میدان اور زرخیز دوآبوں میں لوک بیوہار دکن کے پٹھاروں سے بہت حد تک مختلف ہیں۔



ویدک زمانہ سے لیکر آٹھویں صدی تک ہندوستان پر سنسکرت کا بول بالا رہا۔ اس طویل عرصہ میں بدھ اور جین دھرم کے باعث سنسکرت کو نقصان بھی پہنچا لیکن آٹھویں صدی میں شنکر آچاریہ نے پھر اس کا احیا کیا اور سنسکرت کا اثر شمالی ہند کی آریائی زبانوں کے علاوہ جنوبی ہند کی دراوڑی زبانوں پر بھی پڑا۔ لیکن عوام کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے کسی نئے "ذریعہ" (MEDIUM) کا سہارا لینا پڑا۔ چنانچہ مقامی بولیوں اور سنسکرت کے لفظوں کے ملاپ سے پالی اور پراکرت زبانوں کا عروج ہوا اور انھیں زبانوں سے علاقائی بولیوں نے نیا روپ دھارن کیا۔ ذیل کے خاکے سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے:

ہندوستانی عوامی ادب کو بخوبی سمجھنے کے لئے یہ تاریخی پس منظر ذہن نشین ہونا چاہیے کہ جب نویں دسویں صدی کے قریب سنسکرت کی جگہ پراکرت اور دوسری علاقائی بولیوں نے لینا شروع کی تو اسی زمانہ میں ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے بھی شروع ہو گئے۔ غیر ملکی حملہ آوروں کی وجہ سے ابتدا میں سارا ملک ابتری اور طوائف الملوکی سے دوچار تھا لیکن جب ہندو اور مسلمان اپنے تفرقوں کو بھلا کر ایک دوسرے سے قریب آنے لگے تو ہندوستان کی بھگتی تحریک اور مسلمانوں کے تصوف نے ایک خاص رنگ پیدا کیا۔ ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں میں دسویں صدی عیسوی سے لے کر سولہویں صدی عیسوی تک ایک قسم کی جذباتی ہم آہنگی کا دور تھا۔ بنگال میں ہندو مسلم کلچر کا یہ ملاپ شونیہ پران میں بخوبی محسوس ہوتا ہے جس میں ہندو اوتار اور مسلم پیغمبر ایک دوسرے کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح "نبی بنش" میں اگرچہ نبیوں کے قصے ہیں لیکن ان میں برھما، وشنو، شیو اور کرشن بھی شامل ہیں۔ "ستیہ پیر" اسی اتحاد کا نتیجہ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ "جاگ گان" (رت جگا) اور "جاری گان" (زاری) تمام بنگالی باشندوں کی مشترکہ وراثت ہے۔ بنگال کی طرح بھوجپوری میں بھی چودھویں پندرھویں صدیوں میں کبیر، دھرم داس، لکشمی سکھی، بلاکی داس ایسے سنت شاعر گزرے جن کے یہاں ہندو فلسفہ اور اسلامی تصوف کا ملا جلا روپ ملتا ہے۔ بھوجپوری میں مسلمانوں کے "بالا پیر" (غازی میاں) بنگالیوں کے "ستیہ پیر" سے ملتے جلتے ہیں بلکہ اودھی علاقہ میں مسلمان شعرا ملک محمد جائسی، قطبن، عثمان، عالم، شیخ نثار، قاسم شاہ اور نصیر کے ساتھ ساتھ ہندو سنت (پریم مارگی شاعر) ایشور داس، کنور مکند سنگھ، سیوا رام اور جیون لال ناگر قابل ذکر ہیں۔ بنگالی کے "ستیہ پیر" اور اودھی و بھوجپوری کے "بالا پیر" کے ساتھ برج بھاشا اور پنجابی کے "ظاہر پیر" (گگا پیر) کی داستان بھی کم دلچسپ نہیں۔ یہ سنت اور رہنما ہندو مسلم اتحاد کے بہترین نمونے تھے۔ پنجابی زبان میں ہندو مسلم جذباتی ہم آہنگی کی یہ لے تو اس قدر بڑھی کہ دونوں مذاہب شیر و شکر ہو گئے۔ گرو گورکھ ناتھ، بابا فرید شکر گنج، خسرو اور ولایت شاہ کے ساتھ گرو نانک اور کبیر تمام پنجابیوں کے دلوں سے بہت نزدیک ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی یہ لہر جنوبی ہند بھی پہنچی جہاں ہندو روایات اور عقائد پر اسلامی معاشرت اور رسوم کا گہرا اثر پڑا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستانی لوک ساہتیہ خلا کی چیز نہیں بلکہ اس پر صدیوں کی تاریخی و تہذیبی اتحاد اور مذہبی و لسانی ہم آہنگی کی چھاپ ہے۔

اصلی ہندوستان شہروں میں نہیں بلکہ گاؤں میں بستا ہے اسی لئے لوک ساہتیہ کے خزانوں کی تلاش کے لئے گاؤں کا رُخ کرنا پڑے گا۔ گاؤں آج بھی اپنے مخصوص روایتی نظام کے باعث شہر کی "مہذب" (SOPHISTICATED) دنیا سے منفرد ہیں۔ گاؤں کا سارا سماج ایک فیروزی دار العلوم کی طرح ہے جس میں ہر ذات کے لوگ ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ مذہبی تفریق کے باوجود تفریح طبع کے ذرائع سب کیلئے یکساں ہیں۔ میلے ٹھیلے، کھیل تماشے اور دوسری تفریحوں پر ذلت پات کا ٹھپہ نہیں لگتا ہے۔ گاؤں میں بچوں کی تعلیم ماں کی گود سے شروع ہوتی ہے۔ پھر لوریوں، کہانیوں اور کھیلوں کی باری آتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ مذہبی کتھاؤں اور گاتھاؤں سے واقف ہو جاتے ہیں۔ ماحول کی رنگینی اور شباب کے تقاضے گیتوں کے روپ میں ڈھلتے ہیں۔ جوان عشقیہ گیتوں میں دلچسپی لیتے ہیں لیکن بہادری کے منظوم قصوں سے یکساں رغبت رکھتے ہیں۔ بڑے بھجن اور مذہبی گیتوں سے سکون قلب حاصل کرتے ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم گڑیوں سے شروع ہوتی ہے۔ کھیل کود ہی میں وہ گھر گرہستی کے تمام رموز سے آشنا ہو جاتی ہیں۔ کچھ سیانی ہونے پر

وہ گیت سیکھنے لگتی ہیں یا گیت اور نغمے انھیں خود موزوں کرنے لگتے ہیں یہ گیت ہر تیوہار اور خوشی کے ہر موقع پر گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں کے ذریعہ لڑکیوں کو آئندہ ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ اس طرح عوامی ادب یا لوک ساہتیہ کی "زبانی روایت" (Oral Tradition) بغیر کسی درس و تدریس کے گاؤں کی آزاد فضا میں نسلاً بعد نسلٍ چلی آرہی ہے۔ چونکہ اس ادب کی تخلیق کسی فرد واحد کی مرہون منت نہیں اس لئے اس میں نہ صرف یہ کہ مختلف ذہنوں کی جھلکیاں ملتی ہیں بلکہ زمانہ کے ساتھ اس میں نمایاں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں مختصر یہ کہ ہندوستانی لوک ساہتیہ کا خزانہ اس قدر بیش بہا ہے کہ اسے چند صفحات میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ البتہ اس کی تقسیم (Classification) سے اس سرمایہ کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ مغربی اور مشرقی نقادوں نے لوک ساہتیہ کی کئی طرح سے تقسیم کی ہے لیکن حسب ذیل تقسیم سب سے زیادہ قابل قبول ہے:

(۱) لوک گیت (عوامی گیت) (Folk Songs)
(۲) لوک گاتھا (عوامی داستان) (Folk Bellods)
(۳) لوک کتھا (عوامی قصے) (Folk Tales)
(۴) لوک ناٹک (عوامی ڈرامے) (Folk Dramas)
(۵) لوک بول (عوامی مقولے) (Folk Sayings)

ہندوستان کے لوک ساہتیہ کا یہ ایک مختصر تعارف ہے۔ لیکن ہمارا ملک ایک بہت وسیع و عریض ملک ہے۔ یہاں کشمیر سے راس کماری تک اور گجرات سے بنگال تک مختلف صوبوں میں مختلف بولیاں رائج ہیں اور اُن میں سے ہر ایک کا ایک مخصوص لوک ساہتیہ بھی ہے جس میں لوک گیت، لوک گاتھا، لوک ناٹک، لوک بول، لوک کتھا سبھی کچھ پائے جاتے ہیں۔ اِن میں سے ہر لوک ساہتیہ کی کچھ انفرادی خصوصیتیں بھی ہیں۔ لیکن جس طرح یورپ کی مختلف زبانوں مثلاً اطالوی، فرانسیسی، جرمنی، انگریزی، ولندیزی وغیرہ میں کچھ مشترک خیالات اور روایات اس وجہ سے ملتے ہیں کہ یہ سب زبانیں یونانی اور لاطینی زبانوں کے بطن سے پیدا ہوئیں اُسی طرح ہندوستان کی مختلف بولیوں کے لوک ساہتیہ میں بھی کچھ قدر مشترک پائی جاتی ہے کیونکہ یہ ساری بولیاں سنسکرت سے پیدا ہوئیں۔ لیکن ہندوستان کے مختلف خطوں کے لوک ساہتیہ اور ان کے گیتوں، گاتھاؤں، کتھاؤں، ناٹکوں اور محاوروں اور کہاوتوں کا تفصیلی جائزہ لینے کے لئے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔



مرزا کا گھر بسا

آوارہ

اپنے نزدیک ہم مرزا اور ان کے شوخ ، حاضر جواب خدمت گار بادل نا کی داستان ختم کر چکے تھے جو یہ خبر وحشت اثر آئی کہ ہے ہے، مرزا خانہ ویران ہو گئے، یعنی خانم صاحب چل بسیں، اور تربت کے پھول باسی نہ ہونے پائے تھے جو سُنا کہ اللہ رکھے مرزا صاحب کو پانچویں شادی کا ارمان ہے۔ اور بدلو نے اس کام کے سرانجام دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ شادی ہوئی اور کس ٹھاٹھ سے ہوئی، سننے کی بات ہے۔

(صبح ہو۔ آفتاب سوا نیزے اٹھ چکا۔ مرزا صاحب ہاتھ میں بیت لپلپاتے دالان میں ٹہل رہے ہیں)

مرزا۔ "کچھ بھی ہو، آج ایک سنوں گا۔ آنے دیجئے پاجی کو، مارے مارے کوڑوں کے پیٹھ کی چمڑی کیسنت نہ بنا دی تو مغل نہیں چمار۔ قسم ہے لال مرچوں کا توبڑہ منہ پہ نہ چڑھوایا تو مجھ پر تھوک اور شیطان کی پھٹکار۔ نابکار ایک منہ اندھیرے سے جو الوپ ہوا ہے تو غضب خدا کا سوا پہر دن چڑھنے آیا اب تک پلٹنے کی سدھ نہیں۔ آنے دیجئے اس مادر پدر آزاد کو۔ . ."

(قریب تھا کہ مرزا کے غصے کا بوائلر پھٹ جائے جو دور سے بدلو کی آواز سنائی دی)

بدلو۔ "چھوم چھوم چھنن چھنن، چھوم چھوم چھنن چھنن . . . ."

مرزا۔ (دانت پیس کر) "بدلو" !

بدلو۔ "اُنہہ ! سَم پہ تو آنے دیجئے حضور"

مرزا "چپ" !

بدلو۔ "سُن تو لیجئے پہلے۔ چھوم چھوم چھنن چھنن۔ چھوم چھوم چھنن چھنن چھنن چھنن چھوم۔ چھنن چھنن چھوم۔ چھنن چھنن چھوم۔ آں۔ یہ آئے سم پہ۔ اب فرمایئے :

مرزا (گرج کر) "یوں نہیں سنے گا۔ لانا تو میرا بیت"

بدلو "اور یہ ہاتھ میں جو ہے۔ چلئے اور کیا فرماتے ہیں"

مرزا (بیت لپلپا کر) "کپڑے اتار دو"

بدلو۔ "واہ ! اور جو کسی نے دیکھ لیا ؟"

مرزا۔ "میں ایک نہیں سنتا۔ بس تو دگلا اتار۔ پھر کرتا اور . . . ."

بدلو۔ "ہاں ہاں آگے نہ بڑھیئے گا۔ دگلا کرتا آپ پہ سے صدقے، بہن کے آنسہ دیکھ لیجئے گا۔ عین مین جیسے کھیت میں ہوّا کھڑا ہو۔ پھر مجھے الہنا نہ دیجئے گا" (کپڑے اتارتے ہوئے) "یہ لیجئے دگلا۔ اور ۔ اور یہ لیجئے . . . ."

مرزا۔ (بات کاٹ کے) "بجوڑے ! دیکھنا وہ چار چوٹ کی مار دی ہو کہ بتا پانی، جلتی ہوا تیرا تماشہ دیکھے ! کیوں بے ادب ! تیرے کپڑے اور ہم پہنیں گے ؟"

بدلو۔ "کیا ہوا۔ سو دفعہ میں نے جو آپ کا گوٹہ لا دلیے۔ اب کے میرا آپن آپ سہی۔ لیکھا ڈیوڑھا برابر۔ مگر . . ."

مرزا۔ "برابر کے بچے۔ اگر مگر کچھ نہیں۔ بہت سن چکا۔ آج آپے سے باہر ہونا پڑا۔ مار مار کے لوتھ ڈال دوں گا، پھر ٹنگڑیوں میں رسی بندھوا کے سامنے میں کھچواؤں گا اور گھورے پہ ڈلوا دوں گا۔ شہر بھر کے چیل کوّے نقلیں بجائیں گے اور . . . ."

بدلو۔ "اور کچھ بھی سنئے گا یا اپنی ہی کہے جایئے گا۔ میں پوچھتا ہوں آخر اتنا گرملنے کی وجہ ؟"

مرزا۔ "ایں ! وجہ پوچھتا ہے گستاخ !"

بدلو۔ "نہ پوچھوں تو یہ مہینہ بھر جو سر کھپی کی ہے میں نے اس کے دام کون دے گا ؟"

مرزا۔ "خاموش ! نیا دیئے میں تیری عیاریوں کو خوب جانتا ہوں اب کوئی نئی گنڈے گا۔ تو سن لے کہ میں ایک نہیں سننے والا۔ اب بول ؟"

بدلو۔ "بولنے ہی تو نہیں دیتے آپ۔ ہائے، آتے ہی وہ ہیٹو الیا کہ اتنا بچھے دار توڑا وہیں ٹھپ ہو کر رہ گیا"

مرزا۔ "توڑا جوڑا میں نہیں جانتا۔ میں تیری ہڈی پسلی توڑنا جانتا ہوں"

بدلو۔ "توڑیئے توڑیئے، مالک ہی جو ٹھہرے۔ اتنا ہم سے سن لیجئے کہ ایک دفعہ کا ٹوٹا بدلوا آپ کے فرشتے خاں سے بھی نہیں جڑنے کا۔ اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ

جو سینا جانتا ہے اُسے ادھیڑنا بھی آتا ہے۔"

مرزا ۔ "اب تمہاری کھال ادھڑے گی، تب دوسری بات ہوگی۔"

بدلو ۔ "تو آئیے پٹ پاٹ لیجئے چھٹی ہو۔ جاؤں کسی اور بھلے آدمی کی گردن ٹٹولوں۔ خداوندا، میں کس عذاب میں پڑ گیا!"

مرزا ۔ "مار کے ڈر سے برخوردار اول فول بکنے لگے۔ ہر دیئے! میں تیرے ایک ایک چھل کو جانتا ہوں۔ گول مول باتیں بنا کے مجھے ٹالنا چاہتا ہے۔ چلو بیٹھ کھولو۔ غصہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

بدلو ۔ "بیٹھ کا تو ذرا خیال نہیں۔ سوچ اس کا ہے کہ خود کرتا ہوں تو یہ مہینہ وہ بھی سر ادھار کھاتے ہیں۔ اور حضور گیہوں کی تین تھلی چپاتیاں، اور آپ کی سلامتی میں کالے اُڑد کی ڈوئی بھر دال۔ آپ کیا کھاؤں گا، اس نصیبوں جلی کو کیا کھلاؤں گا۔ دوسرے کو پہچانتا ہوں تو یہ سونے کی چڑیا پنجرے سمیت مفت میں ہاتھ سے جاتی ہے۔ بڑے چکر میں ہوں کہ ہونا ہے، اور سورج ڈھلنے سے پہلے آج ہی ہونا ہے۔"

مرزا "بکواس بند۔ تم سمجھو کہ چکر کہہ سے پیٹھ بچا لوں، تو ایک نہیں، دس بار کان کھول کے سن لو کہ صاحب زادے اب میں تمہاری اُڑن گھائیوں میں نہیں آتا نہیں آتا۔"

بدلو ۔ "نہیں آتے تو آپ بھی سن لیجئے کہ بی خورشید بھی آپ کے پلے نہیں پڑتیں۔ وکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں، یہ بھی نہیں ہو سکتا۔"

مرزا ۔ (کچھ نرم پڑ کے) "کون خورشید؟"

بدلو ۔ "جی وہ خورشید، جن کے لئے زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہم نے! اور ایمان کی تو یہ ہے کہ حد کر دی نمک حلالی کی۔ بھول گئے۔ بوکھلائے بوکھلائے پھرتے تھے، شادی شادی رٹ لگا رکھی تھی۔ ہم نے گلی گلی کی دھول سے ڈالی۔ محلے محلے کی خاک چھانی، کیا کیا پاپڑ بیلے، کیسے کیسے پاپڑ بیلے، کن کن بچوں سے کام لیا، کیسے کیسے داؤں کھیلے، تب کہیں جا کے آپ کے جوڑے لائق کی لونڈیا ہتے چڑھی۔ خوشی خوشی آئے تھے کہ حضور سے انعام لیں گے، دو شالہ اوڑھیں گے، تو واہ وا! انھوں نے منہ چوٹتے ہی گال کاٹا ــ اب جلدی کیجئے، ٹھونکا پیٹا ہو وہ سب ایک دم ہو جائے تو بھر پائے ہم، ایسی نوکری سے توبہ کی، کان پکڑے۔"

"ایں؟ ارے بھئی یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"یہ کہہ رہا ہوں کہ اُٹھیے، منہ پہ دو چلو پانی کے چھپاکے مار کے چلئے، اور نکاح کے دو بول پڑھوا لیجئے۔" "اچھی سُن لیا آپ نے؟" -

مرزا ۔ "سُنا تو سب کچھ۔ مگر بھئی یہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کیا؟"

بدلو ۔ "یہی تو ہیں بادل خاں کے توڑ جوڑ۔ اے حضور کچھ خبر ہے، وہ دلھن بھی بن چکی ہوں گی، قاضی جی کا کھٹ راگ کون پالے، اپنے ملا جی نکاح باندھ دیں گے، سستا پڑے گا۔ سوا پیئے اور تیا بھر گڑ میں پورا نکاح بندھ جائے گا۔ رہے گواہ، سو ایک آپ کا یہ غلام، دوسرا انھیں کے محلے کا کوئی پکڑ لیں گے۔"

مرزا ۔ "اے ماں بادل خاں، یہ تو ہتھیلی پہ سرسوں جما دی تم نے!"

بدلو ۔ "دیکھے جائیے ابھی تو آنکھوں میں پھوے گی۔"

مرزا ۔ "یہ تو ہوا۔ مگر اس سراسری اور ساری باتوں کا سرانجام کیسے ہوگا؟ مہندی، سانچق، چڑھاوے کا جوڑا، برات کا بلاوا، دعوت کی تیاری، دولھا جیسو بنا، یہ سب اتنی دیر میں کیوں کر سے ہوگا۔"

بدلو ۔ "یہ! جیسے وہ ان سب چیزوں کی بھوکی ہی تو ہیں؟"

مرزا ۔ "کیا معنی؟"

بدلو ۔ "معنی یہ کہ آپ کے نزدیک سونے کی چڑیا میں نے یوں ہی اَلل ٹپ کہہ دی تھی۔ اے حضور وہاں تو سامان اور مال ٹال کے گر گج لگے ہیں۔ آپ کے گھر میں تو جہیز کی ایک جو تھائی بھی نہیں سمانے کی۔ میرا کہا مانئے اور چوکھوں کیجئے۔"

مرزا "مانا، مگر سسرال کے لوگ کیا کہیں گے؟"

بدلو "جب ہو بھی کوئی سسرال میں۔ پیٹ میں تھیں جو باوا گزرے، پیدا ہوئیں تو اماں چل بسیں، بھائی نہ بہن خالہ، پھپھی، ماموں، چچا سے مطلع صاف ماشاء اللہ سے تن تنہا نقد دم ہیں۔ اپنی خوشی کا کھاتی ہیں۔ اپنی مرضی کا پہنتی ہیں۔ اب سلامتی سے آپ دولھا دلھن کی جوڑی ہی ہوگی۔"

مرزا ۔ "بادل خاں یہ ہے تو قسم سے ہماری زندگی سوارت ہو گئی، اور بھئی تمھیں بڑا ثواب ملا۔"

بدلو ۔ "ملا تو کیا، ملتے ملتے رہ گیا۔ بیت کی لپ لپاہٹ ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے۔"

مرزا "وہ تمہاری اپنی حماقت سے، یہ کوئی طریقہ تھا کہ آئے تو جھوم جھوم کرتے۔"

بدلو ۔ "خوشی کے موقع پر مرثیہ پڑھنا آپ کے نزدیک؟ یہ بات نہیں، اصل یہ ہے کہ گرز د، مار کھانے کی نشانی، آپ جب دیکھو تب حد سے حد ہو ہی

جانتے ہیں۔ اب مجھ بجناہتہ کرکے۔ کیجیے ادھر میری سنیے :

مرزا ۔ نہیں تم پہلے میری سنو۔ ہماری شادیوں کے پہلے جوڑے نکالو ان میں سے کوئی ذری نوق دلبھڑک ساچھانٹ کے ڈانٹ لیں گے۔ اور ہاں بھئی ستم ہوگیا۔ یہ خضاب کا کیا ہوگا؟ ایک دن مہندی کا استر، دوسرے دن وسمے کا آبرا، یہ کیوں کر ہوگا؟

بدلو "حضور آپ کی اس ذکر کتھا میں شادی کی ساعت نہ کہی جاتی ہے، پھر اس کا منہ لے کے رہ جائیے گا خضاب وزاب کو ماریئے گولی۔ ایسا ہی ہے تو منہ پہ ڈھاٹا باندھ لیجئے، وہاں ہوگا کون جو آپ میں مین میکھ نکالے گا۔ پوچھو بھی بیٹھا کہہ دیں گے رات کلے کو پُروا مار گئی۔ رہے کپڑے تو خدا آپ کو نیکی دے ان کا حساب یہ ہے کہ پہلی شادی کا جوڑا گھس کے تھبتا تار ہوا۔ دوسرے کا گوٹہ پٹھا جل کے خرچ میں آیا۔ تیسرا آپنے چوتھی شادی میں پہنا، اب جو بچا کھچا رہ گیا ہے وہ میں نہ پہننے دوں گا ":

مرزا ۔ " وجہ ؟ "

بدلو ۔ " اے عاقبتی جوڑے کے لئے بھی کچھ رکھئے گا، یا اس وقت خدا راہ میں کرنا ہیجانہ مجھے اپنا دینا پڑے گا ؟ "

مرزا ۔ " کہتے تو ٹھیک ہو، مطلب یہ کہ یوں ہی چلے چلیں ؟ "

بدلو ۔ " اور نہیں کیا، نکاح آپ کے بندے کا یا کپڑوں کے گٹھے سے ؟ "

مرزا ۔ " اب خیال آیا، اماں صورت شکل، عمر وغیرہ سب کچھ بھال لی ہے ؟ "

بدلو ۔ " اے حضور کیا کہنا ہے۔ آپ کے نمک کی قسم، جی تو بہت کُل ملایا پھر میں نے کہا دو مہینے آپ کے نام سے خون پانی ایک کیا ہے، آپ کا گھر بسنا چاہیے ورنہ میاں ایسی دلھن تو قاف کے پردے میں بھی نہیں بات آنے کی، میں خود کر لیتا ":

مرزا ۔ (ہنس کر) " تو کیا کرے گا ابھی سے۔ بدلو ان بیویوں کے بھابجے اٹھانا، نا مشکل ہے، فولاد کا کلیجہ چاہیئے ":

بدلو ۔ " جی میاں کے ... ... ہو گیا۔ میں نے کہا مالک کی برابری کیا کروں۔ حضور تو ... ... سمجھتے ہیں دیکھئے دیر کئے چلے جا رہے ہیں ":

مرزا ۔ " بادل میاں ... ... لا حول کرتم پرانے جوڑے ہی ٹھیک ٹھاک کر دو ":

بدلو ۔ " لے حضور اب یاد آیا، آپ قسمت کے بڑے بھاگوان ہیں۔ لے آپ منہ ہات دھو، کنگھی کر، سرمہ لگا، بن ٹھن ہو جایئے، میں ابھی آیا ":

مرزا ۔ " ارے بھئی ایسے میں نوشہ کو چھوڑ کر کہاں چلے ؟

بدلو ۔ " آپ کے لئے جوڑے کا انتظام کرنے۔ نبو میراثی کی قد چیا ٹوپی اور سرخ اطلس کی اچکن چپکے سے مانگے لاتا ہوں، پہن کے ادھر سے میری فرد اڈلھا بیلے چلئے ":

مرزا ۔ " بدلو دیکھو بیت یاد آیا ":

بدلو ۔ " بیت نہ لیجیے گا حضور، بن ٹھن کو ضعیفی کا شبہ کریں گی دلھن بیگم ":

مرزا ۔ " اور تم بد کلامی سے باز نہ آؤ گے ؟ "

بدلو ۔ " نشا خاطر رہیں حضور۔ یہ چلنے کے دو منہ ہیں، کل سے نئی دلھن کا راج اور بدلو کی نوکری تمام ":

مرزا ۔ " بڑے ادیب ہو۔ ہاں بھئی وہ جہیز دہیز کا کیا ذکر تھا۔ تم کہتے ہو اس گھر میں رکھنے کی جگہ نہیں ":

بدلو ۔ " میرے حواس تھوڑی گئے ہیں۔ یہ خورشید محل جو قلعے کا قلعہ کھڑا ہے، یہ حضور کس کا ہے۔ اور کب کام آئے گا۔ جہیز میاں لا دکے لانے کی کیا ضرورت تھوڑا سا مال ہے ان کے ہاں ؛ بان ساڑھے پان سے اوپر تو میاں تانبے پیتل کے برتن باسن ہیں۔ پھر پلنگ پیڑھی، میز کرسی فرش، فروش، جھاڑ فانوس، کپڑا لتا گہنا پاتا، میاں یہ بوتی فہرست ہے ":

مرزا ۔ " ارے میاں بادل خاں تمہارے بھاگ تو آج کھلے ":

بدلو ۔ " ٹھہریئے ابھی تو اور کھلیں گے۔ بیٹھ جو کھار ہی ہے ":

مرزا ۔ " اماں وہ ایک ذری طبش کا وقت تھا۔ ہاں تو صورت شکل کی کچھ کہی ہے ":

بدلو ۔ " کہاں نہ چاند سورج کو چھپایئے انھیں نکالئے۔ اور ان کے چہرے پہ نگاہ ٹھہرتی کب ہے جو کوئی دیکھ سکے۔ انگلیٹ کی اتنی سبک جس سے سنا ہی سنا کہ خورشید بی کا سایہ جس پر پڑ جائے، چڑیل سے پرستان کی پری بن جائے۔ پان کی سرخی گلے میں اترتی دکھائی دیتی ہے۔ جس محفل میں بیٹھ جائیں، چاند نا ہی چاندنا ہو جائے، عقل داڑھیں ابھی پھوٹی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ سنی کو ٹنا تھا، خورشید کو آنکھوں دیکھا۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد سارا حال ہی جو کھلا جاتا ہے، بس اب دیر نہ کیجیے۔ بس بج گئے، سورج ڈھلے ان کے ہاں نکاح نہیں ہوتا۔ آگے آپ جانیں ":

مرزا "بہتر۔ تم جا کے نبو اسے کپڑے مانگ لاؤ، مگر پینے نام سے خبردار !"

بدلو ۔ " اور نہیں تو کیا آپ کو بدنام کرنا ہے، میں گیا اور ابھی آیا ":

(بدلو چلا گیا)

مرزا ۔ (اپنے آپ سے) "بڑا حرفتی ہے! قسم سے جو یہ سب ٹھیک ہو گیا تو سمجھے کہ یہ شادی ہمیں راس آئی۔ ورنہ چار تو ایسی نیک بخت ملی تھیں کہ جینا اجیرن تھا۔ اب برادری چین لگتا ہے۔ چار چار ماما ئیں رکھوں گا۔ انھیں تو پل کے پانی بھی نہیں پینے دوں گا۔ باہر خدمت گار رہوں گے۔ ڈیوڑھی پہ پہرے دار رہیں گے اور..."

بدلو ۔ (آتے ہوئے) "لیجئے حضور کام بن گیا۔ بے مان نے جوتی میں سیکن ٹوپی دی' اور پچاس نخرے کئے۔ سلمہ نہ جھڑنے پائے' اچکن سلے نہیں!"

مرزا ۔ "تو بھئی بسم اللہ کر کے تمھیں نوشہ بھی بنا دو۔"

بدلو ۔ (ہنس کر) "پہلے سیرا نیگ دلوایے۔"

مرزا ۔ "جو مانگو۔"

بدلو ۔ "بیتوں کے سوا حضور سے اور کیا ملتا ہے۔ اچکن میں جانوں ذرا ڈھیلی ڈھل ڈھل رہے گی۔ پروا نہیں۔ دیکھے گا کون۔ یہ لیجئے ٹوپی۔ ارے یہ تو کانوں تک آ گئی۔ خیر کندیں سگے جوانی کے سرکی ہے' اور یہ آپ نے کاجل لگایا ہے یا ساری کجروٹی کا لیپ آنکھوں پہ چڑھایا ہے۔ مگر میاں میری آنکھوں خاک' کہنے کو پرانی ٹوپی اچکن ہے' آپ سج کے رہ گئے ہیں اتنا تو میں جانتا ہوں!"

مرزا ۔ "لو بھئی ہم تیار' تم آگے چلو' ہم فرد اڈرے پیچھے چلتے ہیں۔"

بدلو ۔ "آپ ذرا کراہتے چلئے۔ لوگ سمجھیں جوڑی چڑھی ہے حکیم کے یہاں جا رہے ہیں۔ چلئے بسم اللہ۔"

(مرزا جی پانچویں بی بی بیاہ لائے' رات بیتی' دوسری صبح ہوئی' اب جو دیکھا تو مردانے میں اکیلے ٹہل رہے ہیں۔ داڑھی کا بال بال کھلا ہوا ہے)

مرزا ۔ "پل بھر کو آنکھ جھپکی ہو تو قسم لے لیجئے' پہاڑ سی رات کٹ گئی۔ ایک ایک پاؤں سو سو من کا ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس فاختہ کا میں کروں تو کیا۔ لوگ مجھے ساٹھ کی لپیٹ میں سمجھتے ہیں' مان لیا بھئی۔ یہ ڈھنڈو تو مجھ سے بھی چار ہاتھ آگے ہے۔ کیوں نہ ہو' عقل داڑھیں جو پھوٹ رہی ہیں۔ چہرہ مہرہ تو دیکھئے' پچھل پیری کا لکھا جیسوا کی نانی معلوم ہوتی ہے۔ جی اور کیا۔ خیر بچا بدلو تمھارا خون میرے ہاتھ سے لکھا تھا وہ آج ہو گا۔ قسم سے تسمہ نہ لگا رکھوں گا۔ بوٹی بوٹی قیمہ کر کے چیل کوؤں کو لٹاؤں گا' اور ہڈیوں کا آبگوشت محلے بھر کے لینڈیوں کو پلاؤں گا۔

جہیز سے کے آ رہی تھی قطامہ! نمک حرام نے پورا کسا ہنہ میرے گھر الٹوا دیا تھا۔ وہاں غیرے تنی کا ثابت بدھنا بھی نہیں۔ زیور گھنے کی پوچھیے تو آنکھیں چندھیا جائیں۔ تانبے کا تار پاس نہیں وہاں صندوقچے پہ صندوقچہ بھرا پڑا تھا۔ میاں بدلو' اچھے کو تم نے بیاہ دیا۔ اب ذری اس بیت کی بانگی بھی دیکھنا۔ چھچھوڑے نہ اڑیں تو نام کلوا بھنگی رکھ دینا...."

بدلو ۔ (آتے ہوئے) "وہ میں نے کب کا رکھ دیا۔ آنچ بھی تیز کر دی۔ کوئی دم میں تیتر' ہیبھک کے آتا ہے (پاس آ کے) میں نے کہا غلام کی۔ بارکہ..."

(مرزا کے تیور' در بات میں بیت دیکھ کر) "یہ پھر دہی بیت' خدا خیر کرے!"

مرزا ۔ "کون؟ بادل خاں صاحب یہاں تشریف لایئے۔"

بدلو ۔ "(ذرا دور سے) "حکم؟"

مرزا ۔ (بیت لپلپا کر) "بیت دیکھا ہے؟"

بدلو ۔ "دیجئے تو دیکھوں۔"

مرزا ۔ "کیوں صاحب وہ خورشید بیگم کہاں ہیں؟"

بدلو ۔ "لیجئے یہ مجھ سے پوچھنے کی بات ہے۔ اپنی مسہری پہ ہوں گی۔"

مرزا ۔ "اور وہ ساڑھے پانسے برتن۔؟"

بدلو ۔ "جھکڑے جائیں تو لے کے آئیں۔"

مرزا ۔ "اور وہ خورشید محل؟"

بدلو ۔ "یہاں آسنے سے تو رہا۔"

مرزا ۔ "جی! اور یہ اندر کون ہے؟"

بدلو ۔ "حضور کی بیاہتا بیوی نمبر پانچ۔ خورشید بیگم عرف بلاقن!"

مرزا ۔ (ایک سانس بھر کے) "نکال نکال اس کو میرے گھر سے۔ دغا باز' فریبی مکار' جعلسازی باز گینے' دلال' نکال اس شیطان کی خالہ کو میرے گھر سے نکال اور تو سب سے پہلے... پہلے۔"

(بدلو کو مارنے بڑھتے ہیں)

بدلو ۔ "پہلے نیکی کر دریا میں ڈال۔ ٹھہریئے' میرا لین دین ہوتا رہے گا۔ گھنٹہ بھر سے وہ بنوا میراثی کھڑا اپنی جوتی کو رو رہا ہے۔ پائیں بات سے پہلے وہ رکھ دیجئے۔ اور میں' تو لیجئے یہ چلا"

اے عظیم رہبر

ساجد امیٹھوی

اے جواہرلال نہرو ! نازشِ ہندوستاں
ہر قدم تیرا ہے منزل' اے امیرِ کارواں !
ناز کرتا ہے تری اک ذات پر دورِ رواں
اے اہنسا کے محافظ' حامیِ امن و اماں!

مطربِ رنگیں نوا' گاتے ہیں تیرے ساز پر
سب کے سب لبیک کہتے ہیں تری آواز پر

مردِ میدانِ عمل' اے مستِ جوشِ انقلاب!
تو نے آزادی کے ذرّے کو بنا کر آفتاب
کر دیا تاریخ کے ہونٹوں کو مجبورِ جواب
اللہ' اللہ! یہ تری فطرت کا ذوقِ کامیاب

حوصلے انگڑائیاں لیتے ہیں ہمت پر تری
داد دیتا ہے زمانہ فتح و نصرت پر تری

منزلِ پرخار کے صدموں سے ٹکراتا ہوا
تو چلا تو راستے میں پھول برساتا ہوا
اتحاد و امن کے سورج کو چمکاتا ہوا
عہدِ نو کے واسطے تہذیبِ نو لاتا ہوا

اے وزیرِ اعظم تری گردش میں صبح و شام ہے
تو ہی تو ہے ہر طرف تیری سیاست عام ہے

اہلِ فن' اہلِ ہنر' اہلِ قلم' اہلِ کمال
ایک سے ہیں ایک بڑھ کر بے نظیر و بے مثال
چپ ہے لیکن جو جہاں ہے دیکھ کر تیرا یہ حال
آسکے تیرے مقابل یہ کسی کی کیا مجال

شمعِ محفل بن کے تو ہی لاکھ پروانوں میں ہے
روشنی تیری جہاں بھر کے شبستانوں میں ہے

سخت مشکل بھی ترے آگے کوئی مشکل نہیں
تیری نظروں میں کبھی تاریک مستقبل نہیں
درد سے ہے آشنا' احساس سے غافل نہیں
کون سا پہلو ہے وہ جس میں کہ تیرا دل نہیں

ایک شاعر ہی نہیں تیرا فقط مدحت نگار
سارا عالم کرتا ہے شرحِ حقیقت بار بار

غم گسارِ ناتواں' ٹوٹے دلوں کا چارہ ساز
حریت کی روح ہے تیرا پیامِ دل نواز
تیری محفل میں نہیں تفریقِ محمود و ایاز
ہے دعا ہر عقیدت عمر ہو تیری دراز

عظمتِ انسانیت کی شرم تیرے ہاتھ ہے
تو جو اس کے ساتھ ہے ساجد بھی تیرے ساتھ ہے

شاہ تراب علی قلندر

فضیل جعفری

شاہ تراب علی تراب کا اجمالی ذکر ہمیں سب سے پہلے شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے تذکرۂ ریاض الفصحا میں ملتا ہے۔ مصحفی لکھتے ہیں: "شاہ تراب علی تراب تخلص، پسر شاہ کاظم، ساکنۂ کاکوری، طبع رسا و ذہن ذکا دارد" اور اس کے بعد انھوں نے ان کا ایک شعر فارسی کا اور چودہ شعر اردو کے نقل کئے ہیں۔ ریاض الفصحا کے علاوہ شاہ تراب کے حالات قدرے تفصیل سے شاہ تقی حیدر قلندر کی فارسی تالیفات روض الازہر، ماثر القلندر اور اصفار الابرار میں درج ہیں۔

شاہ تراب کے والد شاہ کاظم علی قلندر، مخدوم نظام الدین عرف شیخ بھکاری کاکوروی کی اولاد سے تھے۔ تذکرۂ حمیدی مصنفہ آغا حمید الدین بدخشانی اور داد الاخرۃ مصنفہ مولانا سید عبد الرشید ملتانی سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا سلسلۂ نسب مولانا محی الدین عبد القادر جیلی اور قاری امیر سلیمان ناصر جیسے جید علما و بزرگان دین سے ہوتا ہوا سیدنا علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ شاہ تراب ۱۱۸۲ھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت دلی میں مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد رونق محفل تھے۔ میر تقی میر اور مصحفی دلی چھوڑ چکے تھے۔ شاہ تراب کے والد شاہ کاظم خود ایک اچھے شاعر اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ شاہ تراب نے ابتدائی تعلیم قدرت اللہ بلگرامی اور مولوی معین الدین بلگرامی سے حاصل کی۔ حدیث کے درسیات مولانا حمید الدین محدث کاکوروی سے لئے۔ مولوی نجم الدین خاں سے عروض اور مولوی فضل اللہ نیوتنوی سے فقہ پڑھی۔ پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے تمام تعلیمی مراحل طے کر لئے۔ سترہ سال کی عمر میں آپ کی شادی مظفر الدولہ بخشی الملک ابو البرکات خاں کی نواسی سے کر دی گئی جو نہ بعوض جیکلہ دار شاہی کی بیٹی تھیں۔ اس طرح نو عمری ہی سے خانگی ذمہ داریاں آپ کے کندھوں پر آپڑیں۔ لیکن خانگی زندگی کی ذمہ داریوں کے باوجود آپ راہ طریقت پر گامزن رہے اور ساری عمر زہد و تقویٰ، راستبازی و پرہیزگاری اور تصنیف و تالیف میں بسر کر دی۔ ان کے والد شاہ کاظم نے ان کی ان صلاحیتوں کا اعتراف اپنے ایک مکتوب میں یوں کیا ہے: "برتراب علی تمام بار خانگی افتادہ است۔ من حیرانم کہ چہ گونہ صبر می کند۔ خدایش جزائے خیر دہد۔ دنیا و آخرت ہمہ تابع او باشد۔ مولانش در دل آنچناں بود کہ ہیچ پر دلے در جہانش بنا باشد۔"

شاہ تراب فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر تھے۔ میر سوز جیسے مسلم الثبوت استاد فن اور خواجہ آتش جیسے عظیم اور صاحب طرز غزل گو کی موجودگی میں یہ اعلان کرنا ؎

آتش کی غزل دیکھی شاہ سوز کا دا سوخت — تجھ سا میں تراب ایک دیکھا نہ سنا گرم

کسی معمولی شاعر کے بس کی بات نہ تھی۔

تحقیق بسیار کے باوجود یہ پتہ نہیں چل سکا کہ شاہ تراب نے پہلے فارسی میں شعر کہنا شروع کیا یا اردو میں۔ قیاس یہ ہے کہ اس زمانے میں چونکہ شرفائے اودھ میں فارسی کا چلن زیادہ تھا اس لئے انھوں نے فارسی ہی سے شاعری کی ابتدا کی ہوگی اور بعد میں عوام کے مذاق کو مدنظر رکھتے ہوئے ریختہ گوئی کو اپنا لیا ہوگا۔ فارسی میں ان کا تخلص شہید تھا۔ ایک مقطع ملاحظہ ہو۔

بگذار کہ حسب عالم آمد   ایں بیت کہ گفتۂ شہید است

مصحفیؔ نے ان کا حسب ذیل فارسی شعر نقل کیا ہے۔

کہ : دنیا نفرت آید مرد دنیا دار را   سگ ہمیشہ دشمت دارد طعمۂ مردار را

آپ نے ایک فارسی مثنوی بھی تصنیف کی تھی جس کا نام اپنے والد بزرگوار کے حکم سے "اصل المعارف" رکھا۔ ثبوت میں خود ان کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

از جناب والدم شیخ ہدیٰ   نام ایں اصل المعارف شد عطا

شاہ تراب کے تصانیف میں فارسی مثنوی اور ایک ضخیم اردو دیوان اور ایک طویل اردو مثنوی موسوم بہ "عاشق و صنم" کے علاوہ جن کتابوں کا پتہ چل سکا ہے وہ یہ ہیں۔ پانچ جز پر مشتمل ایک رسالہ مجمع الفوائد۔ امام شعرانی اور شیخ اکبر کے تالیفات کے منتخبات پر مشتمل دوسرا رسالہ فتح الکنوز فن تاریخ اور سیرت نویسی سے متعلق سوم جز کی ایک مبسوط کتاب حصول المقصود اور بیعت و خلافت اور دیگر شرعی مسائل سے متعلق آپ کے تصانیف شرائط الوسائط' اسناد المتبعت' مجاھدات الاولیا اور کشف المتواری وغیرہ ہیں جو سب کی سب فارسی زبان میں ہیں اور اب کمیاب ہیں۔ ان کے علاوہ مطالب رشیدی کے عنوان سے ایک کتاب فلسفۂ اخلاق پر بھی لکھی۔

اپنے اردو دیوان کے بارے میں کشف المتواری میں لکھتے ہیں" دیوانے در زبان ہندی ریختہ نیز جمع کردہ ام و در آں ہزار غزل بودہ باشد کہ اکثر مردم آں را در مجالس می خوانند و ازاں ذوق و کیفیت می بردارند" یہ ضخیم دیوان شاہ صاحب کی زندگی میں تو زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا لیکن ان کی وفات کے بعد اس دور کے سب سے بڑے مطبع "مطبع نولکشور" نے اس کے متعدد اڈیشن شایع کیے جو ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ پہلے اڈیشن کی اشاعت ۱۸۸۴ء میں ہوئی۔ دیوان کے شروع میں مطبع کی جانب سے جن لفظوں میں شاہ تراب کا تعارف کرایا گیا ہے اس سے ان کی عظمت، بزرگی اور شہرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ اب سے کم و بیش سو سال پہلے کی اردو تحریر کی بھی ایک دلکش جھلک اس دیباچے میں ملتی ہے۔ نمونے کے طور پر ملاحظہ ہو" افسوس رنگ ثبات زمانہ بے اعتبار اور بہار گلشن ناپائدار ہے۔ فنا کی ہوا کس قدر تیز ہے کہ باغ ہستی میں ہر وقت موسم برگ ریز ہے۔ صبح کو گل کا بازار ہے شام کو شبو کی بہار۔ ہر نفس صبح کا رنگ بدلتا ہے دو پہر میں آفتاب کا حسن ڈھلتا ہے۔ پو پھٹتے ہی انجمن انجم کا خواب فراموش ہے۔ فلک کا منہ دھواں ہے۔ اس غم میں نیلی پوشش ہے جو زنگ سے ہوا ہے جو

شے ہے فنا ہے۔ خاصانِ خدا بھی اس مقدمے میں بے اختیار ہیں۔ انبیا تک اس بات میں مجبور و لاچار ہیں۔ حضرت موسیٰ پھرتے پھرتے تہہ عدم میں بیٹھے۔ حضرت عیسیٰ قم کہتے کہتے دنیا سے اٹھے۔ حضرت یوسف نے مصر وجود کو ترک کیا۔ حضرت ابراہیم نے باغ خلد کا ساز و برگ کیا۔ اس زمانے میں بھی کہ ماہ جمادی الاولیٰ کی پانچویں یکشنبہ رات ڈیڑھ پہر گزرے، آفتاب فلک ہدایت، قطب سپہر ولایت، آب و رنگ چمنستانِ نبوت، گوہر محیط معرفت، تشریف بالائے بانہ ایمان، درۃ التاج فرق عرفان، ہمائے اوج ریاضت، عنقائے قاف قناعت، شبلیٔ زمان، جنیدِ دوراں، آبروئے آئینۂ توحید، موج قلزم تفرید، کعبۂ جہان و جہانیان، قبلۂ عالم و عالمیان، قلندر بے مثل، صوفیِ بے بدل، مخدوم لفظ ولی حضرت شاہ تراب علی قدس سرہ العزیز نے اس دار فانی سے انتقال کیا۔ ہندوستان کو بے چراغ کر دیا۔ فی الواقع ملک اودھ پر ان کے سبب سے کعبۂ ہند کا مصداق تھا۔ ہر زبان پر ان کے فیض کا ذکر، دور دوراں کا نام مشہور ہے۔ ان کے فضل و کمال کے مرتبے سے ادراک معذور اور اظہار کرامات و خوارق عادات سے حوصلۂ بشر مجبور ہے۔

شاہ تراب کو شرف تلمذ کس سے حاصل تھا اور انھوں نے شاعری میں کس کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا اس کا کوئی ذکر کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔ اغلب یہ ہے کہ انھوں نے ابتداً اپنی غزلیں اپنے والد شاہ کاظم کو دکھائی ہوں گی۔ شاہ کاظم ایک اچھے شاعر بھی تھے اور خاص طور پر ٹھمریاں کہنے میں انھیں بہت کمال حاصل تھا۔ ان کی ٹھمریوں کا ایک مجموعہ سانت رس کے نام سے شایع بھی ہو چکا ہے۔

شاہ تراب فطرتاً تصوف کی طرف مائل تھے اور ان کی شاعری پر بھی یہی رنگ غالب تھا۔ یوں تو آپ کے دیوان میں سیکڑوں اشعار خالص عاشقانہ معاملہ بندی کے بھی ملتے ہیں لیکن خاص رنگ شاعری متصوفانہ تھا اور اس وادی میں آپ نے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی تھی۔ وہ نہ تو اپنے ہم عصر مشہور صوفی بزرگ شاہ نیاز بریلوی کی طرح خالص عشق حقیقی میں ڈوبے رہتے تھے نہ ان کا کلام خواجہ میر درد کی طرح عشق مجازی سے بھرا ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے لئے ایک درمیانی راستہ نکالا تھا۔ جس پر وہ بڑی کامیابی سے گامزن رہے۔ اسے صوفیانہ شاعری میں ہم بجا طور پر شاہ تراب کا ایک کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

جب تلک شیشے پہ زنگ غیریت پڑتی ہے دیکھ   دل گئی صورت حقیقت میں تو کیا دریا ہوئے

کعبہ ہو کہ بتکدہ ہو یارو
ہیں دونوں اسی مظہر کی راہیں

گر آنکھ کھلے تو صاف دیکھو
ڈالے ہے گلے میں یار باہیں

جو وعدہ وصل کا دور و دراز کرتا ہو
میں اسکے وصل کا مشتاق تا قیامت ہوں

دل کو ایسا درد لاحق ہو کہ جینا ایکدم نہیں
عشق کا وہ زخم ہے جس کا کوئی مرہم نہیں

عرفان حق سے جس کی ہوئی ہو نظر بلند
ہفت آسمان پست ہیں اس کی نگاہ میں

لیلیٰ و شیریں سے کیا اس کو کوئی تمثیل دے
جس پری رو سے کوئی شکل بشر ملتی نہیں

جو تم کو بھلاتا نہیں تم اس کو نہ بھولو
بت یاد کرو اس کی خفی ہو کہ جلی ہو

شیفتہ ہوں میں ترے ناز و ادا کا ہر طرح
جس طرح چاہو نمود اپنی طرح داری کرو

شاہ تراب کا تعلق صوفیوں کے اس گروہ سے تھا جو وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ان صوفی بزرگوں کے نزدیک

معرفت مصدر انا الحق ہے کہ عارف ہے وادیٔ ایمن

چنانچہ شاہ تراب علی نے ذیل کی غزل مسلسل میں اپنے اس مسلک کی بھرپور اور جامع شرح کی ہے۔

پردۂ حسن میں چھپا ہوں میں
اپنی صورت پہ مبتلا ہوں میں

خود ہی عاشق ہوں خود ہی ہوں معشوق
خود ہی ہوں درد، خود دوا ہوں میں

کھول کے آنکھ کر کے صاف نگاہ
دیکھ کیا بنا ٹھنا ہوں میں

غمزہ ہوں، عشوہ ہوں، کرشمہ ہوں
جلوہ ہوں، ناز ہوں، ادا ہوں میں

لطف ہوں، مہر ہوں، کرم ہوں تمام
قہر ہوں، جور ہوں، جفا ہوں میں

ہے جلال و جمال میری شان
گرچہ دونوں سے ماورا ہوں میں

جس کو میں چاہوں وہ مجھے چاہے
غیر ہے کون جس کو چاہوں میں

کوئی میرے سوا نہیں موجود
عرش ہوں فرش ہوں سما ہوں میں

مجھ سے سب مانگتے ہیں اپنی مراد
سب کا مقصود مدعا ہوں میں

ہوں بری وہم و فہم سے تیرے
کیا بتاؤں تراب کیا ہوں میں

قلندر کی عاشقانہ شاعری کا ایک اہم اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ان کا "عاشق" نہ اردو شاعری کے عام روایتی عاشق کی طرح سسک سسک کر ہائے یا رب دم توڑ دینے والا ہے اور نہ ان کا "معشوق" بیرحم، سفاک اور سنگدل ہے جو برہنہ خنجر لئے ہوئے بس بیچارے عاشق کو قتل کر دینے اور اس خونریزی کا تماشہ دیکھنے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ یہاں "عشق" کوئی ماورائے عقل و فہم شے بھی نہیں ہے۔ بلکہ شاہ تراب کی غزلیہ شاعری کا خمیر براہ راست زندگی کی عام قدروں، معتدل اور متوازن انسانی جذبوں اور لمحاتی کیفیتوں سے تیار کیا گیا ہے۔ ان کے یہاں عاشق و معشوق آفاقی ہیولے نہیں رکھتے بلکہ جمالیاتی ذوق و وجدان رکھنے والے عام انسان ہیں جن کا عشق ماورائے فطرت نہیں ہوتا۔ یہ سماجی قوانین ماحول اور حالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ چھپ چھپ کر ملتے تو ہیں لیکن رسوائیوں سے ڈرتے بھی ہیں، جن کے درمیان رقیب بھی آتے ہیں۔ ذیل میں کچھ اشعار دیے جا رہے ہیں جن سے شاہ تراب کی غزلیہ شاعری کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

نہیں چھوٹنے کا مجھ سے کوچہ عشق
کہو واعظ سے یارو اپنے گھر جائے

پتھر کو کیا آب تو لوہے کو کیا نرم
واللہ کوئی عشق کی تاثیر کو دیکھے

عشق نے میرے تجھے نازاں کیا ہے حسن پر
کرے مجھ سے بدظنی و بدگمانی چند روز

چاہ خوبوں کی کچھ گناہ نہیں
عشق کہتے ہیں اس کو یا تقصیر

جو زلف رسا کو کہے نا رسا
تو ہو عشق میں نا رسائی کی بات

عشق میں جیسا تو بے دل ہو تراب
جگ میں ایسا کون صاحب دل ہوا

عشق نے دل کو نوجوان کیا
ہجر نے تن کو ناتوان کیا

میں کیا بتاؤں محبت کی کیفیت کیا ہے
کوئی تراب سے پوچھے مزا محبت کا

یارو جس کو تم بہت کہتے ہو شوخ
دیکھ کر مجھ کو وہ کیوں شرما گیا

عاشق ہوں نہیں رکھتا ہوں کچھ مال و اثاثا
جز دیدۂ حیراں کہ گدائی کا ہے کاسا

صد شکر کہ الفت کا مزہ اس نے بھی پایا
خالی نہ گئی عاشق صابر کی محبت

پھیر لی آنکھ یار نے سب سے
ہم سے وہ بھی نگاہ باقی ہے

مجھ کو اپنا سمجھ کے کہتا ہے
یہ فقیروں میں رند مشرب ہے

جلوہ گر جب تیں چمن میں وہ بت گلرو ہے
کیا مہکتا ہے چمن چاروں طرف خوشبو ہے

بے طرح دل کو وہ باتوں میں لگا لیتا ہے
اس کی تقریر میں کیا جانیے کیا جادو ہے

تراب کیوں نہ کروں ہر کسی سے میں الفت
مجھے تو سب میں محبوب دیکھ پڑتا ہے

منہ سے کچھ کہہ نہیں سکتا ہوں میں اللہ اللہ
لطف اس بت کا خدایا مرا جی جانتا ہے

محبت کا اثر کیا کم ہے اے تراب
کہ سب سے مجھ کو بے پروا کیا ہے

ان کے علاوہ شاہ تراب کے یہاں صدہا ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں حسن و عشق، محبوب کے عشوہ و ناز اور وصال و فراق کی کیفیتیں نظم کی گئی ہیں۔ اس طرح کے اشعار شعری خوبیوں کے علاوہ خلوص اور تاثیر کی بڑی اچھی مثالیں

ہیں۔ شاہ تراب کی چھوٹی بحر کی غزلیں خصوصیت سے اپنے اندر بڑا رچاؤ، نکھار شوخی، لطافت اور نشتریت رکھتی ہیں۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

کر دیا غم نے ناتواں ہم کو — طاقت نالہ اب کہاں ہم کو
گل ہنسا، غنچہ ہو گیا خاموش — سن کے بلبل کا نالہ و زاری
بھری مجلس میں کل اس شمع رخ نے — جلایا مجھ کو پروانہ سمجھ کے
عاشقی کا بن نامرادی ہے — عشق وہ کام نامرادی ہے
نہ ہوئے ہم کسی کے دست نگر — یہ تو احسان نامرادی ہے
کبھی لعل اور کبھی گوہر اشک — دیکھ اسے جوہری تماشا ہے
اس کا دکھ پوچھو جس کی عمر تمام — عشق کے کاروبار میں گزری
غیبت سے رقیب کے نہیں خوف — ڈر ہے اسی بدگماں سے ہم کو
ہم کو کیا گریہ دیدہ روتے ہیں — خود ہی وہ اپنا گھر ڈبوتے ہیں
شوق میں دل کا حال پوچھ نہ کچھ — وعدۂ بے وفا کی تاب نہیں
خار و خس چومتے ہیں اس کے قدم — خوش ہے مجنوں برہنہ پائی میں
موئے پیچاں سے اس کو کیا نسبت — ہے یہ بہتان محض سنبل پر
رند مستوں کو میکدے کی خاک — خواہش ساغر و سبو نے کیا
شور کرتی ہے باغ میں بلبل — کیا جنوں، موسم بہار آیا

. . . .

شاہ تراب نے اگرچہ اپنی ساری زندگی نواح لکھنؤ میں گزاری (اور ان دنوں لکھنؤ کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ ہندستان کے کونے کونے سے شعرا، ادبا، علما اور فن کار کھنچے چلے آ رہے تھے) لیکن انھیں لکھنؤ سے زیادہ الٰہ آباد سے لگاؤ تھا۔ وجہ جو بھی رہی ہو بہرحال انھوں نے اپنے اس تعلق اور ارادت کا ذکر اکثر اشعار میں کیا ہے:

گل سے بیدل ہوں جس کی یاد میں — ہے وہ بت گل سے الٰہ آباد میں
کس طرح اس بت کی خوبی پرکھوں میں لالہ — جس کی شہرت لکھنؤ سے تا الٰہ آباد ہے
یا الٰہی وہ الٰہ آباد ہو — ایسے بت بستے ہیں جس دیہات میں
دیر میں جو کرے خدا کو یاد — رام پور اس کو ہے الٰہ آباد

غزلوں کے ایک ضخیم دیوان کے علاوہ شاہ تراب نے ۳۰۳ اشعار پر مشتمل ایک اردو مثنوی بعنوان "عاشق و صنم" بھی چھوڑی ہے۔ یہ مثنوی بحر ہزج مسدس محذوف یعنی مفاعیلن مفاعیلن فعولن کے وزن میں لکھی گئی ہے۔ مثنوی کا آغاز "عشق" کے کاروبار، اس کی کیفیتوں اور عام انسانی زندگی پر اس کے اثرات کی طرف بلیغ اشاروں سے کیا گیا ہے۔ اصل حصہ یوں شروع ہوتا ہے:

جوار لکھنؤ میں اک جواں تھا — نہ پوچھو کس طرف تھا اور کہاں تھا
عجب ایجاد اس کی حق نے کی تھی — عجب صورت اسے خالق نے دی تھی
نہ جسم اس کا بنا تھا آب و گل سے — مجسم تھا وہ گویا جان و دل سے
وہ سر سے پاؤں تک تھا صورت درد — فغان گرم کہیے یا دم سرد
نظر بازوں میں تو استاد تھا وہ — کہیں مجنوں کہیں فرہاد تھا وہ

اور پھر قصہ یوں بڑھتا ہے کہ یہ مجنوں، جسے شاہ تراب نے عاشق کے نام سے یاد کیا ہے، ایک دن لکھنؤ کے قدیم محلہ آصف گنج سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر اپنے "صنم" پر پڑی اور وہ اس پر سو جان سے فریفتہ ہو گیا۔ اس کا سراپا ملاحظہ ہو:

قد و قامت تھا آفت اور قیامت — سراپا ناز سر تا پا نزاکت
جھلکتی اس طرح اس کی جبیں تھی — کہ ہمسر اس کی زہرہ بھی نہیں تھی
وہ ترک مست یعنی چشم آہو — کہے ہیں جس کو عاشق عین جادو
دہن یوں تنگ جیسے غنچۂ گل — وہ تنگی سے نہ لے کیوں نام بلبل
تبسم کا جو عالم زیر لب تھا — قیامت تھا بلا تھا کیا غضب تھا
ملائم گفتگو آہستہ گفتار — کرے اک بات میں سو دل گرفتار
نہ پوچھو وضع اس سیمیں بدن کی — سراپا تھی سجاوٹ بانکپن کی

پوری مثنوی عشق و محبت اور ہجر و وصال کے مضامین سے لبریز ہے۔ آخر میں مثنوی کا رخ عشق مجازی اور عشق حقیقی کے مسائل کی طرف موڑ دیا ہے اور خاتمہ پر چند اشعار سبب تصنیف کے سلسلے میں کہے ہیں:

نہ تھا کچھ مثنوی پر دھیان اپنا — کبھی ادھر نہ تھا میلان اپنا
برس دس ایک اس عرصے کو آئے — کیا تھا مثنوی کا قصد میں نے
نہیں ملتی تھی آگے اتنی فرصت — کہ کیجے اس کہانی کی کتابت
رہے رہتا تھا یہ مرکوز خاطر — کہ اس آغاز کو کرنا ہے آخر
کیا القصہ پھر میں نے یہ معمول — ہوا دل مثنوی کی سمت مشغول
الٰہی جس طرح تیرے کرم سے — فراغت پائی میں نے اس رقم سے
سخن کو سبز کر دنیا میں سرسبز — قیامت تک رہے میرا شجر سبز

جہاں میں عمر کی کیا پائداری — سخن ہے شاعروں کی یادگاری

خاتمۂ مثنوی کی دو تاریخیں خود مصنف نے کہی ہیں جو یہ ہیں:

ہوئی تاریخ اس کی دل کو درخواست — کہ کہیے فی البدیہہ و بے کم و کاست
خرد نے تب کہی تورا تبسم کی — بجا ہے داستان عاشق صنم کی

کہا میں نے خرد سے پھر یہ فی الفور — کہ تاریخ اس کی کہیے آپ اک اور
... تعمیہ ... کا جو — کہا اس نے کہ کیا مشکل ہے کہہ دو

جس پہ داستاں ہے نادر دہر
ہے جس کا تعمیہ رو سے ابجد — ۱۲۰۸ھ

غزل و مثنوی جیسے فارسی اسالیب بیان کو اپنانے کے علاوہ شاہ تراب نے خالص ہندوستانی رنگ میں بھی طبع آزمائی کی ہے جو بیحد خوبصورت اور جاندار ہے۔ شاہ تراب کی ٹھمریاں اپنے اندر وہی رس رنگ، مٹھاس، گھلاوٹ اور سرمستی رکھتی ہیں جو میرا بائی کے بھجنوں کا خاصہ ہے۔ ان ٹھمریوں میں ہندوستانی تہذیب، یہاں کے موسم، یہاں کے تہوار، میلے ٹھیلے اس طرح رچے بسے ہیں کہ قاری کا ذہن ترک شیرازی کو یکسر فراموش کر کے تیغ ہندی کے سامنے پورے خلوص سے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

ہولی اور بسنت کے موقعوں پر گاؤں گاؤں اور گلی گلی ہونے والے جشن، ساون کے لہراتے موسم میں البیلی ناریوں کے دلوں میں جاگ اٹھنے والی پیا ملن کی آس، پردیسی ساجن کے برہ میں برہن کی پریم پکار، سکھیاریوں کے کومل گات، برج میں مرلی منوہر شیام کی بنسی کی مدھر تان پر گوپیوں کا رقص، گاؤں کے بسنت منانے والے نوجوانوں کی چھیڑ چھاڑ، لاج بھرے نینوں کی چت چور ... ماں باپ کی نگری چھوڑ کر جانے والی دلہنوں کے دلوں کی غم خیز دھڑکنیں، غرضیکہ وہ سارا نقشہ ان ٹھمریوں میں موجود ہے جسے ہم خالص ہندوستانی مناظر کہہ سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل ٹھمری میں بسنت کی کیسی سچی اور دلکش تصویر کھینچی گئی ہے:

آیو بسنت بیتن متواری — امنگ چلیں سب باری کنواری
کوئی عبیر لئے بھر جھولی — کوئی بنائے رہی پچکاری
کوئی بجاوت دف کوئی گاوت — کوئی اگر ماں ناچت تھاری
لال گلال لگائے مکھ پر — رنگ سے بھیجی چنریا ساری
اب ہی تو برج ماں دھوم مچی ہے — ہوری کھیلت ہے شیام بہاری
آپ پکھپے سب کو رنگ دے — کہے تراب اکش چتر کھلاری

فراق کی تصویر کشی یوں کی ہے:

کا سوں کہوں دکھ اپنا دئی — پیت نئی کی ریت نئی
ایک نجر دکھلائے موہے بارا — کاہو جتن پھر سدھ نہ لئی
پیت لگا کے دراشو جات ما — ناحق میں بدنام بھئی

کیسے پڑے کل جیو کو ہمارے — جب کے بچھڑ گئے پریتم پیارے
کھو بیٹھت دن جیت سگرو — رین کٹت ہے گن گن تارے
تھاکت گیوں کہہ کہہ کے سندیا — لکھ لکھ پتیاں ہم تو ہارے
جو ملے آوے تراب پیا کو — برہن وا پر تن من وارے

ماں باپ کا گھر چھوڑ کر سسرال جانے والی دلہن کے جذبات کی ترجمانی اس طرح کی ہے:

اب تو چلی میں دیس بدیس — بابل توری نگری چھوٹی
برہن پھیر کٹھن ہے آون — آس ملن کی ٹوٹی
سسرے جات ہوں سنگ پیا کے — ماتا پتا سے روٹھی
سکھیاں جنت ہیں اس بیرت میں — ان کوئی ... کوٹی
سانچا پیت کوئی نا جگ ماں — پیت جگت کی جھوٹی

شاہ تراب کو اپنے والد شاہ کاظم سے غیر معمولی محبت، عقیدت اور ارادت تھی جس کا اظہار انھوں نے اپنی ٹھمریوں میں بھی کیا ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۸ پر)

---

۱. مہوئیں ۔ ۲. مٹھی ۳. کھڑی ۔ ۴. بھیگی ۵. ... ۶. چالاک ۷. کیں سے ۸. پی ۹. اس سے ۱۰. دھونڈتے تھکے ۔ ۱۱. سارا ۱۲. تھک ۱۳. خطوط ۔ ۱۴. آس ۱۵. راستہ ۔ ۱۶. ماں ۔

زہر خند

عفت بانو زیبا

ہر ایک درد، ہر اک غم پہ مسکراؤں گی
فغاں پہ، نالۂ پیہم پہ مسکراؤں گی
خود اپنے دیدۂ پُرنم پہ مسکراؤں گی
نزولِ گیسوئے برہم پہ مسکراؤں گی
یہ حد ہے لغزشِ آدم پہ مسکراؤں گی
میں آج تلخیٔ عالم پہ مسکراؤں گی

بہار جائے گلستاں سے چھین لاؤں گی
شبابِ صبحِ بہاراں سے چھین لاؤں گی
مسرتیں گلِ خنداں سے چھین لاؤں گی
سرورِ حسنِ پشیماں سے چھین لاؤں گی
میں زندگی کا نیا راستا بتاؤں گی
میں آج تلخیٔ عالم پہ مسکراؤں گی

نیا جہان، نیا آشیاں بناؤں گی
میں بلبلوں کو نئی داستاں سناؤں گی
جمال و نور سے سارا جہاں سجاؤں گی
مذاقِ زیست کو گل پاشیاں سکھاؤں گی
نیا چراغ نئے ڈھنگ سے جلاؤں گی
میں آج تلخیٔ عالم پہ مسکراؤں گی

ملا ہے دورِ خزاں ہی سے رنگ و بو مجھ کو
دیا ہے گریۂ شبنم ہی نے نمو مجھ کو
ملی ہے دیدۂ پرنم سے آبرو مجھ کو
نہیں ہے اب کسی دامن کی جستجو مجھ کو
خزاں کی مانگ بہاروں سے میں سجاؤں گی
میں آج تلخیٔ عالم پہ مسکراؤں گی

خزاں کے پھول سے چھینی ہے تازگی میں نے
جبینِ ناز سے مانگی ہے بندگی میں نے
شبِ سیاہ میں ڈھونڈھی ہے روشنی میں نے
ہجومِ یاس میں پائی ہے زندگی میں نے
ہر اک رواج ہر اک رسم کو مٹاؤں گی
میں آج تلخیٔ عالم پہ مسکراؤں گی

تری نظر میں مچلتے ہوئے فسوں کی قسم!
مری حیات، مری حسرتوں کے خوں کی قسم!
شا دیا مجھے جس نے اُسی جنوں کی قسم!
جو مل سکا نہ کبھی ہاں اسی سکوں کی قسم!
ہر اضطراب کو رشکِ سکوں بناؤں گی
میں آج تلخیٔ عالم پہ مسکراؤں گی

کوئی جنوں مرے دامن کو پا نہیں سکتا
کوئی فسوں مرے خرمن پہ چھا نہیں سکتا
کسی کا غم مری ہستی مٹا نہیں سکتا
ترا خیال بھی مجھ کو رلا نہیں سکتا
ہر ایک عیش کی سچ مچ ہنسی اڑاؤں گی
میں آج تلخیٔ عالم پہ مسکراؤں گی

فریب اپنی ہی باتوں سے کھا رہی ہوں میں
خیالِ خواب کی دنیا بسا رہی ہوں میں
شعاعِ مہر سے آنکھیں لڑا رہی ہوں میں
جگر میں درد ہے اور مسکرا رہی ہوں میں
یہ کائنات بہر حال میں بچاؤں گی
میں آج تلخیٔ عالم پہ مسکراؤں گی

جمعدار سنگھ

وجاہت علی سندیلوی

پریم ناتھ مہروترا نے بھارت کاٹن ملس کے منیجنگ ڈائرکٹر کی چمکتی ہوئی عالیشان کوٹھی پر ، ۲۷ دسمبر ۱۹۶۰ء کی سنہری دھوپ میں اطمینان اور آسائش کی جو مسرت انگیز فضا طاری تھی اسے دیکھ کر کسے خیال ہو سکتا تھا کہ اس کا مختصر خاندان جو باہمی محبت اور رفاقت کا ایک مثالی نمونہ تھا ، چند ہی گھنٹوں میں ایک لرزہ خیز اور ہیبت ناک آزمائش کا شکار ہو جائے گا؟

پریم ناتھ چالیس سال کے وجیہہ اور انتہائی خوش مزاج انسان تھے۔ گیارہ بجے کے قریب کارخانے جانے کے لئے وہ کپڑے پہن کر کوٹھی سے باہر آئے تو ان کے باپ کے وقت کا پرانا ملازم جمعدار سنگھ ان کے پیچھے تھا اور وہ ہنس ہنس کر اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔ جمعدار سنگھ خود بھی بڑا ہنس مکھ تھا اور پریم ناتھ اس سے اکثر مذاق کیا کرتے۔ کوٹھی کے سامنے وسیع لان کے چبوترے پر ان کی بیوی شوبھا دیوی ایک نیچی کرسی پر نیم دراز کچھ بن رہی تھیں۔ دس سال کی چھوٹی لڑکی 'آشا' پاس ہی بیٹھی خاکوں میں رنگ بھر رہی تھی۔ چودہ سال کا بڑا لڑکا گگن ناتھ تتلیاں پکڑنے کے لئے دوڑ رہا تھا۔ شوبھا دیوی شوہر کو دیکھ کر کھڑی ہو گئیں اور ڈرائیور نے بیٹھنے کے لئے موٹر کا دروازہ کھولا تو انھوں نے قریب آکر پریم ناتھ سے کہا: "آج ذرا جلد ہی آجائیے گا!" پریم ناتھ نے موٹر میں بیٹھتے اور ہنستے ہوئے کہا "اور آپ کا یہ خادم دیر میں کب آتا ہے؟ کہئے کس وقت حاضر ہو جاؤں؟"

شوبھا نے جواب دیا: "بس یہی دو بجے تک آجائیے گا۔ بچوں نے آج پک نک کا پروگرام بنا رکھا ہے"۔ گگن ناتھ اور آشا بھی باپ کی موٹر کے پاس آگئے تھے۔ گگن ناتھ بولا: "پاپا میرا کیمرہ آج نہ بھولئے گا ورنہ پک نک کا مزہ آدھا رہ جائے گا"۔

آشا موٹر کی کھڑکی میں جھکتی ہوئی بولی: "میری گڑیوں نے نہیں معلوم کب سے چائے نہیں پی ہے۔ اب آج ان کے لئے چائے کا سٹ ضرور ضرور لیتے آیئے گا"۔

"بہت اچھا! بہت اچھا! بہت اچھا! پک نک پر چلیں گے تو تم لوگ اپنی چیزیں خود پسند کر کے راستے ہی میں خرید لینا" پریم ناتھ نے بچوں سے کہا اور پھر آشا سے بولا" دیوی جی! میں ڈھائی بجے تک ضرور آجاؤں گا" اور بچوں کی خوشی کی تالیوں اور چیخوں کے درمیان موٹر روانہ ہو گئی۔

کوٹھی کے احاطہ کے باہر جھاڑیوں کی آڑ میں ایک شخص نہیں معلوم کتنی دیر سے چھپا کھڑا تھا۔

موٹر کو روانہ ہوتے دیکھ کر وہ باہر نکلا اور کچھ دور پر کھڑی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر بڑی تیزی سے روانہ ہو گیا۔

. . . . .

ڈھائی بج گئے۔ پریم ناتھ واپس گھر نہیں آئے۔ شوبھا نے کارخانے میں فون کیا تو معلوم ہوا کہ پریم ناتھ ایک بجے کے قریب دو نو وارد آدمیوں کے ساتھ ان کی موٹر پر لنچ کے لئے گئے تھے اور ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔ تین بج گئے! شوبھا نے کلب فون کیا لیکن پریم ناتھ وہاں بھی نہیں تھے۔ پھر اس نے قریب قریب شہر کے تمام ہوٹلوں اور ریسٹورانوں کو جہاں پریم ناتھ

جا سکتے تھے فون کر ڈالا لیکن ہر جگہ کا جواب مایوس کن تھا۔
چار بج گئے۔ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ شوبھا کی پریشانی، بچوں کی بے تابی بڑھتی جاتی۔ اور پھر پانچ۔ چھ۔ سات۔ آٹھ اور نو بج گئے اور پریم ناتھ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس پورے عرصے میں شوبھا اور جمعدار سنگھ نے مشکل ہی سے ٹیلیفون کا ریسیور ہاتھ سے رکھا تھا۔ ٹیلیفون ڈائرکٹری میں کوئی ممکن پتہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔ دوست۔ عزیز اور شناسا سب ہی کو ٹیلیفون کیا گیا تھا لیکن نتیجہ نفی تھا۔ جمعدار سنگھ نے ہسپتال، اسٹیشن اور پولیس چوکیاں بھی نہیں چھوڑی تھیں لیکن پریم ناتھ، معلوم ہوتا، جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ شوبھا سر نیچا کئے نشست کے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر ہر وقت کھیلتا ہوا وہ تبسم جو اپنے شوہر، بچوں اور گھر پر ناز کرنے کی غمازی کرتا اب ایک اُداسی بن کر چھا گیا تھا۔ ممن ناتھ اور آشا کمرہ میں کھیل رہے تھے لیکن ان کی گھبرائی ہوئی آنکھیں اور ہر آواز پر چونکنا صاف بتا رہے تھے کہ اپنے باپ کے لئے وہ اپنی ماں کی پریشانی میں برابر کے شریک ہیں۔ جمعدار سنگھ ٹیلیفون سے ہار مان کر ایک اسٹول پر خاموش بت بنا بیٹھا تھا۔

چھ بجے کے قریب جب کوٹھی کے احاطے میں موٹر آنے کی آواز آئی تو تینوں بے تحاشا کوٹھی کے باہر دوڑ پڑے لیکن ڈرائیور کو خالی موٹر لاتے دیکھ کر ان کی مایوسی میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا۔ شوبھا کی آنکھوں سے تو آنسو پھوٹ نکلے لیکن اس نے بچوں کی نظریں بچا کر انھیں پونچھ ڈالا۔ ڈرائیور نے پریم ناتھ کو دفتر سے جاتے بھی نہیں دیکھا تھا۔

ساڑھے نو بجے، تو جمعدار سنگھ ایک دم سے کھڑا ہو گیا: "بہو جی تم پریشان نہ ہو۔ کھانا کھا کر تم اور بچے سو رہو۔ کمرے کے دروازے اندر مضبوطی سے بند کر لینا۔ بھیا جی کو تلاش کرنے میں خود جا رہا ہوں۔"

شوبھا کچھ نہ بولی۔ آشا نیچے قالین ہی پر سو گئی تھی اور ممن ناتھ ماں کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ جمعدار سنگھ نے کمرے سے باہر نکل کر گھر کے سارے نوکروں اور ڈرائیور کو جمع کیا اور ساری کوٹھی کا چکر لگا کر خود دیکھ لیا کہ ہر دروازہ اور کھڑکی ٹھیک سے بند ہے۔ پھر بہو جی اور بچوں کے لئے کمرے ہی میں کھانا لے جانے کی ہدایت کر کے ہر ایک کو تاکید کی کہ وہ مستعدی سے رات بھر جاگتا رہے۔ ڈرائیور رحمت علی کو جو بہت پرانا ملازم تھا اُس نے ایک بندوق دے کر نیچے ہال میں ٹیلیفون کے پاس کرسی پر بٹھا دیا اور کہا "دیکھو رحمت تم اپنی جگہ سے ہلنا مت! کوئی بھی بات ہو تو فوراً پولس کو اطلاع کر دینا۔ بھیا جی کے نہ آنے میں مجھے کوئی اور ہی بات دکھائی دیتی ہے" اور پھر سنسان رات میں وہ موٹر سائیکل لے کر روانہ ہو گیا۔

. . . . . .

شوبھا کچھ اونگھ سی گئی تھی کہ دفعتاً بستر کے پاس کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس نے بجلی جلا کر پاس ہی بستر پر بچوں کو دیکھا تو وہ بے خبر سو رہے تھے۔ گھڑی پر بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا: "آپ شوبھا دیوی ہیں؟ جی! دیکھئے پریم ناتھ جی بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ دوستوں کے ساتھ ہیں۔ ان کا خط کل سویرے آپ کو مل جائے گا۔ آپ ان کی ہدایتوں پر عمل کیجئے گا تو اُن کے آپ کے اور بچوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے" اور قبل اس کے کہ شوبھا کچھ بھی پوچھ سکتی ٹیلیفون خاموش ہو گیا۔ اپنی اضطراری کیفیت میں وہ چیخی: "آپ کون ہیں؟ کہاں سے بول رہے ہیں؟" لیکن دوسری طرف ریسیور رکھا جا چکا تھا اور اس کا جواب صرف خاموشی تھی۔ اس نے فوراً ٹیلیفون ایکسچینج سے پوچھا کہ ابھی اسے کہاں سے ٹیلیفون کیا گیا تھا۔ جواب میں اسے بتایا گیا: "پبلک ٹیلیفون نمبر چار سے"! شہر میں ایسے پبلک ٹیلیفون پندرہ سولہ تھے بلکہ ایک تو خود اس کی کوٹھی کے سامنے ہی تھا!

شوبھا نے ایک کراہ کے ساتھ ریسیور رکھ کر بجلی گل کر دی۔ پریم ناتھ دشمنوں کے نرغے میں تھا! اب اندھیرے میں وہ تھی اور اس کے وحشت خیز خیالات! اور پریم ناتھ کی سلامتی کی دعائیں!!

سویرے شوبھا کو کوٹھی کے لیٹر بکس سے پریم ناتھ کا یہ خط ملا جو اس نے کانپتے ہاتھوں سے کھول کر ڈبڈبائی آنکھوں سے تنہائی میں پڑھا۔

میری اپنی شوبھا۔

میں سخت خطرے میں ہوں لیکن اگر تم چاہو تو جان کا صدقہ مال دے کر تم سے اور بچوں سے آکر پھر ہنسی خوشی مل سکتا ہوں۔ میری رہائی کی قیمت پندرہ ہزار روپیہ ہے۔ میں تمھارے نام کی چودہ ہزار روپیوں کی چیک بھیج رہا ہوں۔ ایک ہزار روپیہ میری میز کی اوپر والی دراز میں ہے اُسے ملا لینا۔ اور یہ کل روپیہ تم دس دس روپیوں کے نوٹوں میں ایک سوٹ کیس میں رکھ کر رحمت علی کو دینا کہ وہ ۲۸۔ دسمبر کی رات کو نو بجے شکلا روڈ پر لے جا کر وہاں سڑک کی موڑ پر درختوں کے درمیان چبوترے

پر جو ایک ویران مٹھ ہے اس میں رکھ کر فوراً لوٹ جائے۔ توقع ہے ہرگز ہرگز نہ ٹھہرے روپیہ پہنچ جانے کے دو گھنٹے کے اندر میں تم سے آملوں گا۔ خبردار اس کا ذکر کسی سے بھی حتیٰ کہ نوکروں اور بچوں سے بھی نہ کرنا ورنہ میرے سامنے جو دو مسلح آدمی بیٹھے ہیں وہ پلک جھپکاتے میرا کام تمام کر دیں گے۔ شوبھا! یہ میری اپنی زندگی کا معاملہ ہے۔ تم نے ذرا سی بھی لغزش کی تو میرا قاتل وہ شخص نہیں ہوگا جس کی گولی میرے سینے کے پار ہوگی بلکہ تم! بچوں کو بہت بہت پیار، اور ہاں ان سے اور جو کوئی بھی مجھے پوچھے کہہ دینا کہ میں شہر کے باہر گیا ہوں اور ۲۰ کو رات میں گیارہ بجے واپس آؤں گا۔ یہ خط مجھے روپوں کے ساتھ ہی واپس کر دینا۔

تمہارا اپنا۔ پریم ناتھ

شوبھا سسکیاں لیتی ہوئی اپنے کمرے میں انتہائی بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ بچے اپنے کھیل گھر میں مصروف تھے۔ رمت علی بدستور اپنی جگہ پر تھا البتہ سویرا ہوتے ہی اس نے اپنی بندوق سامنے کی الماری پر رکھ دی تھی تاکہ دیکھنے والوں کو کوئی بات دیکھ کر وحشت نہ ہو۔ آٹھ بجے کے قریب جمعدار سنگھ واپس آیا۔ وہ حد سے زیادہ تھکا ہوا تھا اور رات بھر جاگتے رہنے کے باعث اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور معلوم ہوتا تھا جیسے چند ہی گھنٹوں میں اس کی عمر میں دس سال کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ سیدھا شوبھا کے کمرے میں پہنچا۔ شوبھا اسے دیکھ کر بے اختیار رونے لگی اور پھر اس نے رات کے ٹیلیفون کا واقعہ بیان کر کے پریم ناتھ کا خط اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ جمعدار سنگھ خط پڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور خاموشی سے سر جھکا لیا۔

شوبھا نے کہا: "پندرہ ہزار روپیہ کیا اگر ان کے لئے میری جان بھی کام آئے تو میں ایک لمحے کے لئے بھی جھجکنے والی نہیں۔"

کچھ دیر خاموشی کے بعد جمعدار سنگھ بولا: "مالک کی جان کے لئے پندرہ ہزار کیا کل روپیہ جائداد بلکہ اس کوٹھی کی ایک ایک اینٹ کی قربانی بھی کم ہے لیکن محض روپیہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ ڈاکو آخر تک برابر روپیہ مانگتے چلے جائیں گے اور پھر مالک کو رہا بھی نہیں کریں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ یہ کہتے ہوئے شوبھا کی طرف دیکھ کر کچھ رک گیا: "بہو جی آپ لالہ ذودھر داس سیٹھ عبداللہ اور سیٹھ بنارسی لال کے حشر اخبارات میں پڑھ ہی چکی ہیں۔ ان ڈاکوؤں کا علاج صرف ان کا پتہ لگا کر ان کو ختم ہی کرنا ہو سکتا ہے۔ میری تجویز یہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور پھر دو گھنٹوں تک شوبھا اور جمعدار سنگھ کے درمیان بحث ہوتی رہی اور آخر میں قائل ہو کر شوبھا نے جمعدار سنگھ کی تجویز مان لی صرف اس ترمیم کے ساتھ کہ جو کچھ بھی کیا جائے وہ صرف نجی طور سے اور بہت خفیہ۔ جمعدار سنگھ کی تجویز کا خلاصہ یہ تھا کہ ڈاکوؤں کو تھوڑی تھوڑی رقم پہنچتی رہنا چاہیئے تاکہ وہ روپیہ پانے کی امید میں پریم ناتھ پر ہاتھ نہ اٹھائیں اور ساتھ ہی ساتھ ڈاکوؤں کا پتہ لگانے اور پریم ناتھ کو ان کے چنگل سے آزاد کرانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا جائے اور یہ کام جمعدار سنگھ صرف خود کرے۔

شوبھا نے پریم ناتھ کی ہدایت کے بموجب اس کی میز کی اوپر والی دراز کھولی تو اس میں روپوں کے بجائے کچھ خطوط تھے۔ ان سب میں پریم ناتھ کو طرح طرح سے دھمکیاں دے کر ان سے روپیہ وصول کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جمعدار سنگھ نے ان خطوط کو اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا: "دیکھئے بھیا جی نے اپنے خط میں کس ہوشیاری سے ان کی جانب اشارہ کیا ہے۔ کل روپیہ ایک دم سے ادا کرنے کے وہ بھی خلاف معلوم ہوتے ہیں۔"

شوبھا پر ایک سکتہ سا طاری تھا۔ جمعدار سنگھ نے جاتے جاتے کہا: "بہو جی دیکھئے آخر میں جیت ہماری ہی ہوگی! میں نے کوٹھی کی حفاظت کے لئے دو نئے چوکیدار بلائے ہیں۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں آتے ہوں گے اور بالکل خفیہ طور پر صرف کوٹھی کے اندر رہیں گے۔ گیارہ بجے بینک جا کر آپ کا چیک پیش کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ اس بات کا پتہ ہمارے دشمن بہت آسانی سے لگا سکتے ہیں۔ ہاں مینیجر سے ایک تحریر لے لیجیے گا۔ بھیا کی حفاظت کی خاطر آپ اپنے کردار سے دشمنوں کے دماغ میں ذرا سا بھی شبہ نہ پیدا ہونے دیجیے گا۔"

دوپہر میں بینک سے لوٹنے کے بعد جمعدار سنگھ کے مشورے سے شوبھا نے پریم ناتھ کو یہ خط لکھا۔

میرے مالک! میں آپ کے چرنوں پر اپنا سر ڈال دینے کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ میں گیارہ بجے بینک گئی تھی۔ بینک مینیجر نے کہا کہ وہ اتنا روپیہ ایک ہفتے کے نوٹس کے بغیر نہیں دے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو تحریر دی ہے وہ آپ کو بھیج رہی ہوں۔ میں نے آپ کی طرف سے انھیں نوٹس بھی دے دیا ہے۔ اب روپیہ اگلے مہینے کی چار کو ملے گا۔ پتی دیو! میرا تمام زیور بھی تو آپ

ہم کے نام سے بینک میں جمع ہے ورنہ میں اسی کو بیچ ڈالتی۔ بڑی مشکل سے میں نے تین ہزار کا انتظام کیا ہے اور ایک ہزار آپ کی دراز سے نکال لیا ہے۔ اس وقت کل چار ہزار بھیج رہی ہوں۔ جہاں آپ کی جان کی بازی لگی ہے وہاں بھلا مجھ سے کوئی بے احتیاطی ہو سکتی ہے؟ آپ کا پچھلا خط واپس کر رہی ہوں۔ میں نے ہر بات بالکل پوشیدہ رکھی ہے۔ آپ کو پوچھنے والوں سے میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ دلی کی نمائش گئے ہیں۔ گمن اور آشا ٹھیک ہیں۔ اور آپ کو بہت یاد کرتے ہیں میرے سوامی آپ جلد آیئے!۔

آپ کی شوبھا

چار بجے کے قریب شوبھا کے کمرے میں جمعدار سنگھ، گمن ناتھ اور آشا آئی تو شوبھا انھیں دیکھ کر بڑی مشکل سے اپنی چیخ روک سکی۔ جمعدار سنگھ کا سر اور داڑھی منڈی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی ٹوپی اتار پھینکی تھی اور کرتے دھوتی کے بجائے قمیض اور نیکر پہنے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر عینک چڑھی ہوئی تھی اور پیروں میں ربر کے پرانے جوتے تھے۔ گمن ناتھ اور آشا انتہائی میلے اور پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور بالکل سڑک کی نالیوں میں کھیلنے والے بچے معلوم ہوتے۔ ان کے حلیے بھی بالکل ہی بدلے ہوئے تھے۔

شوبھا نے بگڑ کر کہا: "جمعدار سنگھ کیا یہ مسخرے پن کا کوئی موقع ہے؟"

جمعدار سنگھ سنی ان سنی کر کے بولا "بہو جی ہم لوگ اپنے کام پر جا رہے ہیں"

"تو کیا اپنے ساتھ بچوں کو بھی لے جاؤ گے؟" شوبھا نے چیخ کر کہا۔

"بہو جی میں پوری ذمہ داری کے ساتھ ان بچوں کو لے جا رہا ہوں۔ یہ میرے پاس آپ سے زیادہ محفوظ رہیں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ روپیہ جلد سے جلد وصول کرنے کے لئے ڈاکو بھیا جی کو تو چھوڑ دیں لیکن ان بچوں کو پکڑ لے جائیں۔ اب بھیا جی کو آزاد کرائے بغیر ہم واپس نہیں آئیں گے۔ کوئی خاص بات ہو تو میری بہن کے یہاں رحمت سے اطلاع کرا دیجئے گا۔"

شوبھا سوائے دہشت سے گھورنے کے اپنی زبان تک نہ ہلا سکی۔

جمعدار سنگھ کہتا رہا: "آپ وقت مقررہ پر رحمت کو بھیج دیجئے گا۔ گھبرایئے نہیں میرے لئے یہ کام نیا نہیں ہے۔ میں ایک زمانے میں اس قسم کی تحقیقاتیں بھی کیا کرتا تھا۔"

شکلا روڈ شہر کے پچھلی کونے پر ایک سنسان سڑک تھی جس پر جاڑوں میں سات ہی بجے سناٹا چھا جاتا۔ صرف کبھی کبھار کسی موٹر یا سائیکل کے گزرنے یا اکا دکا راہ گیروں کی آمد و رفت کی آواز آ جاتی۔ اس کے دونوں طرف راستے سے کافی فاصلہ چھوڑ کر عمارتوں کا ایک سلسلہ چلا گیا تھا جو کہیں کہیں کھیتوں، باغوں اور باغیچوں کی وجہ سے منقطع ہو جاتا تھا۔ بائیں جانب جدھر سے سڑک یک دم گھوم جاتی گھنے درختوں کے کنج میں پیپل کے درخت کے نیچے چبوترے پر ایک بہت پرانا مٹھ تھا جس کی چھت اور دروازے غائب ہو چکے تھے۔ صرف گری ہوئی چھوٹی چھوٹی دیواریں کھڑی تھیں۔ بجلی کی روشنی کا کھمبا یہاں سے کافی دور تھا اس لئے درختوں کے کنج میں اور اس کے آس پاس بالکل گھپ اندھیرا تھا۔

دو گھنٹے گھومنے تو بجے ہیں۔ ایک نیلی موٹر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نمودار ہوئی اور مٹھ کے سامنے آ کر ایک دم سے رک گئی۔ اس میں سے رحمت علی ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس اور دوسرے میں ٹارچ لئے ہوئے نیچے اترا اور ٹارچ کی روشنی میں سیدھا مٹھ کے اندر چلا گیا اور سوٹ کیس رکھ کر فوراً الٹے پیروں واپس آ گیا۔ موٹر بڑی تیزی سے گھوم کر جس سمت سے آئی تھی اسی سمت روانہ ہو گئی۔

دس منٹ کے بعد ایک موٹر سائیکل آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پورب سے پچھم کی طرف نکل گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہی موٹر سائیکل پچھم سے پورب کی طرف واپس ہو گئی۔ دس منٹ تک بالکل سناٹا رہا۔ پھر سڑک کے داہنی طرف کسی عمارت میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ پندرہ منٹ بعد مٹھ کے دوسری جانب جھاڑی سے چار سائے نمودار ہوئے۔ تین سائے سڑک تک آ کر درختوں کی آڑ میں چھپ گئے چوتھا سایہ ٹارچ لئے ہوئے آگے بڑھا اور جا کر مٹھ سے سوٹ کیس لے آیا۔ اور پھر چاروں سائے جھاڑیوں میں گھس کر غائب ہو گئے۔ البتہ راستے پر ٹارچ کی مدھم روشنی سے جو دور سے صرف جگنو کی طرح چمکتی، پتہ چل رہا تھا کہ وہ سامنے والی عمارت میں جا رہے ہیں۔

آدھ گھنٹہ انتہائی خاموشی سے گزر گیا۔ پھر مٹھ کے سامنے والے آم کے درخت سے ایک شخص نیچے اترا۔ یہ جمعدار سنگھ تھا۔ اس نے پاس ہی سڑک کے کنارے رکھے ہوئے کوڑا ڈالنے کے پیپے کے قریب جا کر کہا "آشا بیٹی نکل آؤ!" آشا جو پیپے میں کٹے ہوئے سوراخوں سے کل تماشا دیکھ رہی تھی خشک پتوں کے ڈھیر سے نکل کھڑی ہوئی اور جمعدار سنگھ نے اسے پیپے سے باہر نکال لیا۔ آشا نے بڑے دردناک لہجے

میں آہستہ سے کہا: "سوٹ کیس پتا جی لے گئے۔ وہ میرے پاس سے گزرے تو میں نے اس اندھیرے میں بھی انھیں پہچان لیا۔ آپ نے آنا منع نہ کیا ہوتا تو میں انھیں پکار لیتی۔"

جمعدار سنگھ نے تسلی دیتے ہوئے کہا: "ہاں بیٹی بھیا جی کو میں نے بھی دیکھا۔ ان کے پیچھے وہ تین مسلح آدمی تھے۔ تمھارے منھ سے ذرا بھی آواز نکلتی تو ان کے لیے خطرہ ہی خطرہ تھا۔"

دونوں آگے بڑھے تو سڑک کے ایک درخت کے نیچے جمعدار سنگھ کھانسا۔ مگن ناتھ خاموشی سے نیچے اتر آیا اور جمعدار سنگھ سے لپٹتے ہوئے بولا: "میں نے دیکھ لیا، وہ سامنے والی بڑی عمارت میں گئے۔"

جمعدار سنگھ نے آشا کو گود لیتے ہوئے اور مگن ناتھ کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا: شاباش بہادرو! ہم نے آدھی لڑائی جیت لی ہے۔ اب چلو تم لوگ سو رہو! مجھے کچھ کام باقی ہے۔ اگر وہ لوگ رات میں باہر نہیں جاتے ہیں تو بس وہ اسی عمارت میں ہیں!"

دمودھر نواس ایک بہت بڑی اور پرانی عمارت تھی۔ اس میں سامنے دکانیں تھیں اور اوپر اور اندر کے حصے میں پندرہ سولہ کرایہ دار رہتے۔ کچھ لوگوں کے پاس صرف کوٹھریاں تھیں اور کچھ کے پاس مختلف چھوٹے اور بڑے مکان تھا مکڑے۔ دو دو دکانوں کو ملا کر ایک چھوٹا سا ریستوراں تھا۔ بہت سے کرایہ دار اور آس پاس کے رہنے والے اسی ریستوراں میں کھانا کھاتے اور چائے پیتے۔

اس ریستوراں میں ۲۹ دسمبر سے بدھو نام کا ایک بوڑھا اور ایک میلا کچیلا صرف پھٹی بنیائن اور نیکر پہنے لڑکا کلو، ریستوراں میں چائے پلاتے اور کرائے داروں کے لیے کھانا اور چائے لے جانے پر نوکر ہو گئے تھے۔ یہ جمعدار سنگھ اور مگن ناتھ تھے۔ انھوں نے اپنے رہنے کے لیے دمودھر نواس کے احاطے میں ایک چھوٹی سی کوٹھری بھی کرائے پر لے لی تھی۔ ان کے ساتھ ایک چھوٹی سی لڑکی بھی تھی۔ وہ آشا تھی۔ جو دن بھر اپنے ہم عمر لڑکے اور لڑکیوں کے غول میں کھیلتی اور ساری عمارت کا چکر لگاتی رہتی۔

سویرے سے قریب آدھی رات تک بدھو اور کلو کھانا، ناشتہ اور چائے لیے ریستوراں اور دمودھر نواس کے مختلف حصوں میں دوڑتے رہتے اور کبھی کبھی ریستوراں کے مالک اور گاہکوں کی ڈانٹ پھٹکار بھی سنتے۔

دوسری رات کو سوتے وقت مگن ناتھ نے پوچھا "کچھ پتا چلا؟" جمعدار سنگھ نے سر ہلایا "کچھ نہیں بیٹا! لیکن ہمت نہ ہارو۔ میرا دل کہتا ہے کہ بھیا جی یہیں اسی عمارت میں۔" مگن ناتھ نے پھر پوچھا "ماتا جی کے پاس سے کوئی خبر ملی؟" جمعدار سنگھ بولا "بھیا جی کا ڈاک سے دوسرا خط آیا ہے کہ ۴ جنوری کو بینک سے چودہ ہزار نکال کر پہلے ہی والی ترکیب سے پھر بھیج دیا جائے۔ گویا چودہ ہزار کے بجائے اب اٹھارہ ہزار کا مطالبہ ہو گیا۔"

ایک دن بعد ۳۱ دسمبر کی رات میں مگن ناتھ نے پھر پوچھا: "بابا کچھ پتا چلا؟"

جمعدار سنگھ نے پھر سر ہلایا "کچھ نہیں بیٹا!"

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر جمعدار سنگھ خود بولا: "آج آشا کہتی تھی کہ وہ اور بچوں کے ساتھ گیند ڈھونڈھنے پچھمی کونے والے آخری مکان میں جس کا ایک دروازہ دوسری طرف بھی کھلتا ہے، گئی تھی تو وہاں نیچے صحن میں ایک شخص بیٹھا اپنا ریوالور صاف کر رہا تھا۔ بچوں کو دیکھتے ہی اس نے ریوالور اور بہت سے کارتوس پر جلدی سے ایک تولیہ ڈال دی تھی اور دو تین بچوں کو مار کر ان کا گیند دور پھینک دیا تھا۔"

مگن ناتھ کچھ نہیں بولا۔ اس کی سسکی کی آواز سن کر جمعدار سنگھ نے خود بھی ایک ٹھنڈی سانس لی: "ہمت نہ ہارو بیٹا۔ یہ بادل چھٹ جائیں گے اور سورج پھر نکلے گا!"

پہلی جنوری کو ۹ بجے دن میں مگن ناتھ نے جمعدار سنگھ کو اپنی کوٹھری میں لے جا کر آہستہ سے کہا: "بابا اسی پچھمی کونے والے مکان میں ناشتہ اور چائے تو پانچ آدمیوں کا منگایا جاتا ہے لیکن دکھائی صرف چار پڑتے ہیں۔ اور پھر دو آدمی نیچے صحن یا دالان میں رہتے ہیں اور دو مستقل اوپر والے کمرے کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور وہ لوگ مجھے کبھی زینے کے اوپر چڑھنے نہیں دیتے بلکہ مجھ سے کشتی نیچے ہی رکھوا لیتے ہیں اور اسے خود اوپر لے جاتے ہیں۔"

جمعدار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا: "بیٹا ہم نے لڑائی جیت لی ہے اور دشمنوں کو نیست و نابود کر دینے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے لیکن خبردار اب جب تک میں نہ کہوں تم اس مکان میں ہرگز نہ جانا۔ چار آدمی تو اس میں مستقل رہتے ہیں لیکن رات میں ۱۰ بجے کے بعد تین چار اور بھی آ جاتے ہیں جو سویرے

اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ جو کمرہ ہر وقت بند رہتا ہے اس میں کوئی کھڑکی نہیں ہے۔ ایک کھڑکی تھی ضرور، وہ بند کر دی گئی ہے۔ صرف ایک چھوٹا سا روشن دان بنا ہے جو زمین سے ۱۵ یا ۱۶ فٹ اونچا ہے۔ برآمدے میں جو دروازہ ہے وہ تو ہر وقت بند رہتا ہے لیکن اس کے پاس لوہے کی سلاخوں کا ایک کھلا جنگلا ہے جس سے اندر کی ہر بات باہر برآمدے میں بیٹھے لوگ دیکھتے رہتے ہیں۔ میں اس مکان کے مقابلے میں جو دوسرا مکان بالکل اسی جیسا بنا ہے اس میں جا کر پورا نقشہ سمجھ چکا ہوں۔"

اسی روز دوپہر جب اس مکان میں جمعدار سنگھ پانچ آدمیوں کا کھانا اور چائے لے کر گیا تو دو دو آدمیوں کی کشتیاں الگ تھیں اور ایک آدمی کی الگ۔ الگ کشتی میں چائے کی پیالی کے نیچے طشتری میں اس جگہ جہاں پیالی رکھی جاتی ہے پنسل سے لکھا تھا: "ج سنگھ"۔ روٹیوں کے بیچ میں ایک پنسل کا ٹکڑا چھپا تھا اور پلیٹوں کے درمیان آڑ میں ایک تیز چاقو بھی رکھا تھا۔

برتن واپس آئے تو جس جگہ جمعدار سنگھ نے لکھا تھا اسی جگہ لکھا ہوا تھا "پریم ناتھ — انتہائی خطرناک۔" چاقو غائب تھا۔

چار بجے شام کو چائے کی جو ایک الگ کشتی جمعدار سنگھ لے کر گیا اس میں طشتری کے بیچ میں پیالی رکھنے کی جگہ پر لکھا ہوا تھا "سُتلی — ڈھیلا" اور کشتی کے کپڑے کے نیچے ۵ یا ۵۰ فٹ سُتلی بچھی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اینٹ کا ایک چھوٹا ڈھیلا بھی چھپا ہوا تھا۔

دور گھنٹہ گھر نے بارہ بجائے۔ رات بالکل خاموش تھی اور جسم میں تیر کی طرح گھستے ہوئے انتہائی سرد ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ جمعدار سنگھ روشن دان کے نیچے تین گھنٹوں سے چھپا بیٹھا تھا۔ دفعتاً دیوار میں ڈھیلا لگنے کی ہلکی سی آہٹ ہوئی اور دھیرے دھیرے سُتلی میں بندھا ایک ڈھیلا زمین پر آ کر رک گیا۔ یہ ڈھیلا ایک کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔ جمعدار سنگھ نے جھپٹ کر یہ کاغذ کھول کر بہت چھوٹے ٹارچ کی مدھم روشنی میں پڑھا۔ اس میں لکھا تھا: "شوبھا اور بچوں کو بچاؤ۔ روپیہ دینے پر بھی یہ مجھے مار ڈالیں گے لیکن تھوڑا تھوڑا روپیہ آئندہ وعدہ کے ساتھ پہنچتا رہے گا تو میری موت کی گھڑی ٹلتی رہے گی۔ لیکن اب آگے بہانہ کیا کرو گے؟ دو مسلح آدمی سلاخوں سے مجھے گھورا کرتے ہیں۔ آج کئی سادہ چیکوں پر مجھ سے دستخط کرائے گئے ہیں۔ تمھیں ہر صورت مایوسی ہی کی دکھانی پڑتی ہے۔ تمھاری ذرا سی لغزش مجھے فوراً موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔ پریم ناتھ۔"

جمعدار سنگھ نے جیب سے ایک چھوٹی سی پوٹلی نکال کر سُتلی میں باندھ دی۔ سُتلی کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا اور پوٹلی سُتلی کے ساتھ اوپر اٹھتی چلی گئی۔ پوٹلی میں روٹی کے اندر ایک چھوٹا سا پستول پندرہ کارتوس اور انگلی کے برابر ایک چھوٹی سی ٹارچ تھی اور ساتھ ہی میں یہ پرچا "بھیا جی گھبرائیے مت۔ کل چائے اور دال میں نشہ ہوگا۔ ہوشیار۔ آپ کا تابع دار۔ جمعدار سنگھ۔"

دوسرے دن یعنی ۲ جنوری کو رات میں ۹ بجے کے قریب جمعدار سنگھ کھانے کے برتن واپس لینے گیا تو نیچے صحن یا تدداری میں بیٹھنے والے دونوں آدمی اونگھ رہے تھے۔ جمعدار سنگھ نے لپک کر انھیں کلوروفارم کی شیشی سنگھا دی اور وہ بے سدھ ہو کر جہاں بیٹھے تھے وہیں گر پڑے۔ وہ دبے پیروں زینے پر دوڑتا چلا گیا۔ اوپر برآمدے میں دو آدمی بے ہوش پڑے تھے۔ اس نے انھیں بھی کلوروفارم سنگھا دیا اور ان کی جیبیں ٹٹول کر ان میں سے کنجی اور ریوالور نکال لیے۔ سلاخوں کی آڑ سے پریم ناتھ یہ تماشا بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ جمعدار سنگھ نے جلدی سے اس کے کمرے کا قفل کھولا اور اس کو اپنا ہی جیسا ایک نیکر دیتے ہوئے کہا: "بھیا جی اسے پہن لیجیے اور یہ برتن اٹھا کر فوراً بھاگ نکلیے۔ سڑک کے سامنے ہی موٹر کھڑی ہے اور اس میں بھوجی اور بچے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

پریم ناتھ نے نیکر پہنتے ہوئے کہا: "اور تم؟"

جمعدار سنگھ بے صبری سے بولا "بھیا جی آپ بھاگیے۔ میں پیچھے آتا ہوں۔ دیکھیے یہاں رات کو آنے والے لوگوں کے آنے کا وقت آ چکا ہے۔"

پچھلے دروازے پر زور سے کھٹ کھٹ ہوئی۔ جمعدار سنگھ نے پریم ناتھ کو باہر ڈھکیلتے ہوئے کہا "بھیا جی! بھاگیے! وہ لوگ آ گئے! پچھلا دروازہ نہیں کھلا تو وہ فوراً آگے سے آنے کی کوشش کریں گے۔ آپ کو اکیلے برتن لے جاتے دیکھیں گے تو غالباً شک نہ کریں گے۔ میں نے باہر پولیس کا انتظام بھی کر رکھا ہے۔"

پریم ناتھ تیزی سے بھاگا اور ایک سانس میں مکان سے باہر ہو گیا۔

پریم ناتھ ہانپتا ہوا سڑک کے پاس اپنی موٹر میں پہنچا تو شوبھا اور آشا اس

سے بے اختیار لپٹ گئیں لیکن گمن ناتھ نہیں تھا۔

"گمن ناتھ کہاں ہے؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"ابھی یہیں تھا۔ آپ کے آنے میں دیر ہوئی تو وہ تھوڑی دور آگے بڑھ کر دیکھنے چلا گیا تھا۔"

"پتا جی آپ گھبرائیے نہیں، وہ بڑا بہادر ہے" آشا نے تسلی دی! اور خوشی کے آنسو کے درمیان پریم ناتھ اور شوبھا مسکرا دیے۔

دور دسو دھر نواس سے ایک ساتھ ریوالور کے کئی فیر ہوئے پھر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد فیر ہونے لگے اور اس کے بعد کھٹ کھٹ مشین گن چلنے لگی۔

"بیچارا جمعدار سنگھ!" پریم ناتھ نے بڑی حسرت سے کہا۔

"اور گمن؟" شوبھا چیخی۔

رحمت ڈرائیور بولا: بھیا جی اب آپ یہاں نہ ٹھہریے! آپ موٹر لیکر جائیے میں ان دونوں کو موٹر سائکل پر لے کر ابھی آتا ہوں۔"

پریم ناتھ نے کچھ پس و پیش کیا اور پھر یہ کہتے ہوئے موٹر آگے بڑھا دی "اچھا میں چیٹرجی روڈ پر تھانے کی چوکی کے سامنے تمہارا انتظار رہوں گا۔"

آدھ گھنٹے کے بعد گمن ناتھ، جمعدار سنگھ اور رحمت موٹر سائکل پر واپس آئے تو جمعدار سنگھ اچھل اچھل کر کہنے لگا: "آج گمن بابو نے میری جان بچالی"

"دیکھا پتا جی!" آشا خوش ہو کر بول اٹھی۔

"وہ کیسے؟" پریم ناتھ نے پوچھا۔

"آپ کے جانے کے پانچ منٹ بعد جب میں نے سمجھ لیا کہ آپ خطرے سے باہر ہو گئے ہوں گے تو میں نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا سارے مکان پر سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن جیسے ہی میں نے باہر قدم نکالا مجھ پر زینے کے پاس سے فیر ہوا۔ میں زمین پر لیٹ گیا اور دو تین گولیاں میرے اوپر سے گزر گئیں۔ چار آدمی جو پیچھے کھڑے تھے ریوالور لیے میری طرف دوڑے لیکن اسی وقت گمن بابو نے بجلی گل کر دی۔ میں نے فوراً دروازے میں سنگنی لگا کر اور اندھیرے میں سلاخوں کے پاس لیٹے لیٹے دو کو وہیں ٹھنڈا کر دیا۔ دو بھاگے تو وہ نیچے پولیس کے جو دروازہ توڑ کر گھس آئی تھی، زخمی ہو کر ہاتھ لگے! چار جو بے ہوش پڑے تھے وہ تو بوروں کی طرح پولیس لاری پر لاد دیئے گئے۔ پورے گینگ کا گینگ صاف ہو گیا! کپتان صاحب کہتے تھے کہ اس گینگ کو پکڑوانے کے لیے پندرہ ہزار انعام مقرر تھا۔ اب یہ انعام میرے گمن بابو اور آشا دیوی کو ملے گا۔"

شوبھا نے چیخ کر پوچھا "او گمن کیا تم مکان کے اندر گولیوں کی بوچھار میں تھے؟"

نہیں ماتا جی میں مکان کے باہر برو ٹھے میں تھا۔ وہیں بجلی کا مین سوئچ ہے۔ تب نے جب کئی ریوالور ایک ساتھ چلتے سُنے تو میں نے سوچا کہ بھلا ایک آدمی اتنے بہت سے آدمیوں کا اُجیالے میں کیسے مقابلہ کر سکتا ہے؟ یہ سوچ کر میں نے بجلی گل کر دی۔"

پریم ناتھ نے جمعدار سنگھ سے پوچھا: "اور یہ بائیں ہاتھ میں کیا چھپائے ہوئے ہو؟"

جمعدار سنگھ نے مسکرا کر ہاتھ سامنے کر دیا: "کچھ نہیں اس ہاتھ سے میں نے ایک گولی روک لی تھی۔" ہتھیلی زخمی اور لہو لہان تھی!

پریم ناتھ نے وفور محبت سے اس خون سے تر بتر ہاتھ کو اپنے ماتھے سے لگا لیا۔ شوبھا نے جمعدار سنگھ کے پیر چھوئے اور موٹر اسپتال کی طرف بڑی تیزی سے روانہ ہو گئی۔ آشا جمعدار سنگھ کی گود میں سو رہی تھی اور گمن ناتھ اس کا زخمی ہاتھ رومال میں لپیٹے اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ دفعتاً جمعدار سنگھ کا سر ایک طرف ڈھلک گیا!! — اسپتال پہنچ کر پتہ چلا کہ ایک گولی اس کے داہنی طرف سینے پر بھی لگی تھی۔



نہرو اور امن

(برائے نیا دور)

خورشید افسر بسوانی

وطن میں پھیل چکی تھی فضا غلامی کی — سبھی پہ سایہ فگن تھی گھٹا غلامی کی

خود اپنے گھر میں مقید تھے ہم ابھی اے دوست — حد امید میں تھی شام غم ابھی اے دوست

ابل رہے تھے شرارے وطن کے سینے سے — زمین سرخ تھی خون جگر کے پینے سے

لگی تھی آگ ابھی ایشیا کے دامن میں — مچل رہی تھی ابھی برق گھر کے آنگن میں

فرنگیوں کا یہ مقصد تھا ملک لٹ جائے — وہ گل کھلاؤ کہ ہندوستاں پہ آنچ آئے

وہی ہوا کہ ہم آپس میں لڑ گئے اکثر — ہزاروں شہر وطن کے اجڑ گئے اکثر

مگر مشیت رب کو عتاب آ ہی گیا

زمین ہند پہ اک انقلاب آ ہی گیا

سحر طلوع ہوئی ایسا آفتاب لیے — کہ جس کی ضو میں نئے دور کا شباب لیے

ترس رہی تھی ابھی قوم رہنما کے لیے — بھٹک رہے تھے سفینے بھی ناخدا کے لیے

خوشا کہ اہل وطن کا نصیب جاگ اٹھا — عروس ہند کا خفتہ نصیب جاگ اٹھا

مرے وطن نے جواہر سا رہنما پایا — ستم زدوں کے مقدر نے آسرا پایا

بغیر جنگ ہی آزاد ہو گئے ہم لوگ

اماں کے سائے میں آباد ہو گئے ہم لوگ

جہد مسلسل

رضا امروہوی

فریب دے کے ہمیں آپ آزماتے رہے — کمال ظرف کہ ہم بھی فریب کھاتے رہے

چراغ فکر و عمل زندگی کی راہوں میں — قدم قدم پہ بپاس وطن جلاتے رہے

ہزار بار یہ سوچا کہ دل کی بات کہیں — ہر ایک بار ستم کے خیال آتے رہے

تمھیں خبر ہے کہ ذوق نگاہ کی ہم لوگ — تمھاری شوخ نگاہی سے داد پاتے رہے

یہ کیا ستم ہے خیال و نظر سے ہٹ کر بھی — وہ کائنات خیال و نظر پہ چھاتے رہے

ہماری جہد مسلسل کی قدر کر اے دوست — ہم آندھیوں میں چراغ وفا جلاتے رہے

تمام عمر اسی اہتمام میں گزری — وہ روٹھتے ہی رہے اور ہم مناتے رہے

وطن کی راہ گزاروں کے سیکڑوں دیے — ہمارے خون جگر سے فروغ پاتے رہے

ہمارا شیشۂ دل توڑنے کو محفل میں — نظر جھکائے ہوئے آپ مسکراتے رہے

یہ حادثہ بھی محبت میں بارہا گزرا — وہ یاد آتے رہے اور ہم بھلاتے رہے

حریف خار بچھاتے رہے مگر ہم لوگ — نئی سحر کی طلب میں قدم بڑھاتے رہے

تمھاری انجمن ناز میں تمھارے لیے — تمھارے حسن پہ غزل ہم بھی گنگناتے رہے

ہجوم غم میں بھی اہل وطن بصد راحت — ہر ایک منزل مشکل پہ مسکراتے رہے

جو فاصلہ تھا وہی آج بھی ہے کیا کہیے — وہ دور ہوتے رہے ہم قریب آتے رہے

کبھی نگاہ ستم ہے کبھی نگاہ کرم — وہ آگ دل میں لگاتے رہے بجھاتے رہے

بھر اپنے جذبۂ تعمیر سے وفا کے محل — نئی حیات کی راہوں میں ہم بناتے رہے

رضا جنھوں نے سکون حیات لوٹا تھا

وہی حیات محبت میں یاد آتے رہے

مغل فنِ مصوّری

نجم الحسن

مسلمانوں نے ہندستان آنے کے بعد جلد ہی نئے روایات کو اپنانا شروع کر دیا تھا۔ چناں چہ اِن مسلمانوں کے ابتدائی فنی تخلیقات میں قدیم ہندستانی آرٹ کے روایات کی بھی قدرے ملاوٹ تھی لیکن اِس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اُن میں مقامی روایات اور ثقافتی عناصر دال میں نمک کی حد تک پائے جاتے تھے۔

بارھویں اور سترھویں صدی کے درمیان کے طوالانی عرصہ میں ہندستان کے مسلمان حکمراں فن مصوری کے کسی نئے اسکول کی داغ بیل نہ ڈال سکے۔ یہ ضرور ہے کہ اسی عہد کی معدودے چند تصویریں ہمیں آج بھی مل جاتی ہیں لیکن محض ان کی موجودگی سے فن مصوری کی کسی منظم یا غیر منظم تحریک کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان دربار نہیں مصوری پر کوئی پابندی نہیں عائد تھی اور یہ کہ یکے بعد دیگرے مختلف سلاطین اس فن کی سرپرستی کرتے رہے تھے لیکن مسلمانوں کی آمد کے دوسرے دور میں جب مغلوں نے ہندستان کو اپنا مسکن بنایا تو فن تعمیر اور فن مصوری کے شعبوں میں نہ صرف نئے روایات کی بنیاد پڑی بلکہ دو مختلف نسلوں اور نظریوں کے روایات نے شیر و شکر ہو کر ملک کے فنون لطیفہ کو حیاتِ نو بخشی۔ اس عظیم تحریک کی بنیاد رکھنے کا سہرا اکبر اور اس کے عالی دماغ دانشور مصلاح کاروں کے سر ہے۔

اکبر نے اپنے دربار سے متعلق باکمال مصوروں کا ایک کارخانہ قائم کیا۔ اس کارخانہ میں پرورش پائے ہوئے روایات نے ہندستانی فن مصوری کو نہ صرف یہ کہ متاثر کیا بلکہ سو سال تک ان پر چھائے رہے۔ تصویر کشی کے سلسلہ میں اکبر کہا کرتا تھا کہ "مصور جسم کا خاکہ ہی بنا سکتا ہے اُس میں روح نہیں ڈال سکتا' اور اس کی یہ بیچارگی دلیل ہے خداوند عالم کی بزرگی اور عظمت کی جو بے جان قالب میں روح پھونک کر اُسے زندگی بخشتا ہے۔"

اکبر کو کتابیں مصور کرانے کا بہت شوق تھا۔ یہ ذوق ایرانی ثقافت کا اثر تھا۔ شاعری' تاریخ ' دیومالا ' رومان غرض ہر موضوع اور قسم کی تزئین کی طرف اکبر نے ذاتی توجہ دی۔ اس سلسلہ کا شاہکار "حمزہ نامہ" کی تصویریں ہیں جو عریض کپڑے پر بنائی گئی تھیں۔ ان تصویروں کی تعداد کئی سو بتائی جاتی ہے۔ ان میں کچھ ہی تصویریں ہم تک پہنچ پائی ہیں۔ اُن کی اکثریت ویانا اور لندن کے کتب خانوں اور عجائب خانوں میں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر مقابلتہً درجہ بندی کی جائے تو مغل عہد کے اعلیٰ فنی نمونے ہمارے ملک میں مشکل ہی سے ملیں گے۔ اعلیٰ اور بہترین نمونے انگریزی عہد میں یورپ کے ملکوں کو پہنچ گئے اور ہم ان کو دیکھنے سے بھی محروم ہو گئے۔ خوش قسمتی سے مصور قلمی نسخوں میں سے ایک بڑا اچھا نسخہ "رزم نامہ" مہاراجہ جے پور کے یہاں موجود ہے۔ "رزم نامہ" دراصل مہابھارت کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بھی اکبر ہی کے حکم سے کیا گیا تھا۔ اِسے مصور کرنے کا کام بھی دربار کے بہترین مصوروں کے سپرد ہوا تھا۔ اسی طرح ایک اور اہم قلمی نسخہ خاندان تیموریہ کی مصور

تاریخ ہے جو کتب خانۂ خدا بخش (پٹنہ) میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ عہد اکبری کے کچھ اور مخطوطات بھی مختلف ذاتی کتاب خانوں میں ملتے ہیں لیکن ایسے نسخوں کی تعداد بہت کم ہے۔

دربار اکبری کے مصوروں کے بارے میں ہمارا علم بہت محدود ہے اور فن مصوری کی تاریخ سے ذوق رکھنے والوں کے لئے اس میدان میں تحقیق کی بڑی گنجائش ہے۔ مختلف تصویروں پر مصوروں کے دستخط کے علاوہ ہمیں ان باکمال مصوروں کے متعلق معلومات کا واحد ذریعہ ابوالفضل کی تحریریں ہیں مگر ان تحریروں میں بھی ہم کو صرف چند ہی نام ملتے ہیں۔ ان کے مطابق میر سید علی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد کا شمار استادوں میں تھا۔ یہ دونوں حضرات ایرانی تھے اور ہمایوں کی دعوت پر ہندوستان آئے تھے۔ ان ہی کی رہنمائی میں دربار اکبری کے دیگر مصور بھی کام کرتے تھے۔ عہد اکبری کا بہترین مصور دسونت تھا جس کے لئے یہ مشہور ہے کہ وہ ذات کا کہار تھا۔ بدقسمتی سے دسونت نے اوائل جوانی ہی میں خودکشی کرلی اور اس کے موئے قلم سے نہ جانے کتنے شاہکار تخلیق ہونے سے رہ گئے۔ اکبری عہد کے دوسرے مشہور فن کاروں میں بساون، فرخ بیگ اور کلاک ہیں۔ آخر الذکر اپنے رنگوں کی شوخی اور خطوط کی نزاکت کے لئے ممتاز ہے۔

عہد اکبری کی تصویروں کا طرۂ امتیاز ان کی گنجان ترتیب، توانائی ایک بھرپور حرکت کا لطیف احساس اور ان کے رنگوں کی شوخی ہے۔ اس عہد میں چونکہ ایران سے گہرے سیاسی اور ثقافتی تعلقات اور رابطے قائم تھے اور فن مصوری اپنے نقطۂ عروج پر تھا اس لئے یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ایران کے فنی روایات (ایرانی استادوں کی موجودگی کی وجہ سے خصوصاً) دربار اکبری کے مصوروں پر اثرانداز ہوں۔ لیکن چونکہ ان ایرانی استادوں نے ہندوستانی فنی روایات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور انھیں کے ہم پلہ ہندوستانی مصوروں نے ان غیر ملکی روایات کو بہت دانشمندی کے ساتھ ملکی روایات کے ضمیر کا لحاظ کرتے ہوئے ان کو ملکی روایات میں سمویا تھا اس لئے اس ثقافتی اختلاط کے نتیجے میں جو نیا طرز ابھرا وہ صحت مند طور پر توانا اور صالح اور ہندوستانی فن مصوری کے خزانے میں ایک بیش بہا اضافہ ثابت ہوا۔ ایرانی طرز کی نزاکت اور ترتیب میں مشاہدۂ قدرت کی باریک بینی نے تصویروں میں تفصیل پیدا کی اور مقامی زیبائش کے عناصر نے اس نئے طرز کو ایک مزید گہرائی بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ مغل آرٹ میں حقیقت پسندی کی کمی نہیں۔ اکبر کے عہد کی تصویروں میں ہمیں پورٹریٹ یعنی شخصی شبیہوں کی بالتفصیل عکاسی کی طرف اچھا خاصہ رجحان نظر آتا ہے۔

یہی رجحان جہانگیر کے عہد میں پھلا پھولا اور مغل طرز کی بہترین شبیہیں عہد جہانگیر میں تخلیق ہوئیں۔ ان تصویروں میں انفرادیت کا لحاظ بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ جہانگیر کو فن مصوری سے بڑا جذباتی اور پرجوش لگاؤ تھا۔ اس عہد میں دربار سے تعلق رکھنے والے اکابر کی شبیہوں کے متعدد البم جہانگیر نے تیار کرائے تھے۔ ان شبیہوں میں سے چند میں نہ صرف انفرادیت بلکہ نفسیاتی معرفت کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں جانوروں خصوصاً پرندوں کی حقیقت پسند تصاویر پر بھی اچھا خاصا زور دیا گیا اور پرندوں کے حقیقت پسند "مطالعے" کثیر تعداد میں بنائے گئے۔ مصوری کی اس صنعت میں استاد منصور کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ باریک سے باریک تفصیل بھی منصور کے موئے قلم سے نہ بچ سکی۔

عہد جہانگیر کی تصویروں میں عمومی طور پر عہد اکبری کی تخلیقات کا آہنگ اور توانائی تو نہیں پائی جاتی لیکن ان میں ایک خاص طرح کی سنجیدگی اور وقار ضرور پایا جاتا ہے۔ رنگوں کے لہجے (TONE) میں ایک لطیف سی تفریق پائی جاتی ہے اور عہد اکبری کے مقابلے میں خطوط کی روانی میں بھی کمی نظر آتی ہے لیکن اسی نسبت سے ان کی نزاکت بڑھ گئی ہے۔

اس عہد کی مشہور ترین تصویریں جو ہم تک پہنچی ہیں وہ جہانگیر کے البم ہیں۔ ان کے کچھ حصے برلن کی سابق پرشن اسٹیٹ لائبریری میں اور کچھ کتاب خانۂ "قصر گلستان" تہران میں ہیں۔ ان البموں میں مرکزی تصویر کے چاروں طرف پرکار حاشیے ہیں جن پر گل بوٹے، شکار کے مناظر گروہ در گروہ خوردبینی شبیہیں اور اس دور کی سماجی زندگی کے چند مناظر بڑی چابکدستی اور کامیابی سے زیبائشی طور پر سنہرے رنگ سے نقش کئے گئے ہیں۔



ایک کتاب کی تصویر کشی ——— ابتدائی مغل عہد

(بشکریہ ریاستی میوزیم لکھنؤ)

(نیا دور کے ان صفحات پر مغل فن مصوری کے بعض نمونوں کے فوٹو شائع کیے جا رہے ہیں۔ ان نمونوں کی تصویریں لکھنؤ کے ریاستی عجائب خانے میں محفوظ ہیں اور ریاستی عجائب خانے ہی کی عنایت سے یہ تمام فوٹو لیے جا سکے ہیں۔ ان کا حق اشاعت ریاستی میوزیم لکھنؤ کے نام محفوظ ہے)



زیب النسا مخفی ——— سترھویں صدی

(بشکریہ ریاستی میوزیم، لکھنؤ)

حضرت عیسیٰ کی پیدایش — شاہ عالم ثانی — مغل دور، یورپین طرز کی آمیزش

(بشکریہ ریاستی میوزیم، لکھنؤ)



چڑیا ——— عہد جہانگیر

(بشکریہ ریاستی میوزیم، لکھنؤ)

مغل فن مصوری کے چند نمونے

اورنگ زیب



جہانگیر کی شبیہ
(بہ شکریہ: ریاستی میوزیم، لکھنؤ)



شیواجی کے لڑکے، راجہ سمبھا — سترھویں صدی
(بہ شکریہ: ریاستی میوزیم، لکھنؤ)



"شبیہ جلوس حضرت شاہنشاہی" —— آخری مغل عہد

(بہ شکریہ، ریاستی میوزیم لکھنؤ)

جہانگیر کے بعد فن مصوری کی سرپرستی اور ترقی مزید کو اچانک دھکا لگا۔ شاہجہان کو فن مصوری سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ تاج محل کے خالق کا سرپرست تو عمارتوں کا دیوانہ تھا۔ شاہجہان نے کارخانۂ مصوری میں تخفیف بھی کی لیکن اس کے باوجود دربار میں اعلیٰ قسم کی تصویریں بنائی جاتی رہیں۔ اس عہد میں رنگوں کے انواع اور اقدار میں اضافہ ہوا اور تصویروں کی ظاہری صورت بہتر ہونے لگی اس طرح تکنیک کے اعتبار سے اس عہد میں مصوری کو ضرور ترقی ہوئی لیکن زوال پذیر اثرات بھی اسی عہد میں ظاہر ہونے لگے۔ چنانچہ دربار کے آداب کے مطابق وضع، قطع اور انداز میں ایک طرح کی کرختگی فنی کمزوری کی حد تک پہنچ گئی اور موئے قلم کی تمکنت' آمد' اور روانی کی جگہ "آورد" نے لے لی۔

اس عہد کی تصویروں کی ایک اور خصوصیت بھی قابل ذکر ہے۔ تصویر کا موضوع دربار سے جس قدر دور ہوتا ہے تصویر اسی قدر زندہ اور بولتی معلوم ہوتی ہے۔ ان تصاویر میں فنی آزادی اور قلم کی روانی بھی زیادہ ہے۔ کھلی ہوئی فضا میں' خواہ وہ چاندنی رات ہو یا نور کا تڑکا' صوفیوں اور درویشوں کا طائفہ ہو یا اہل علم کی کسی محفل کی منظرکشی' تصویر میں نہ صرف ماحول کی کامیاب عکاسی ہے بلکہ اس ماحول کے اٹل خصوصیات بھی صاف طور پر ان تصویروں سے عیاں ہو جاتے ہیں۔

اسی عہد میں ہم کو پہلی بار مغل تصویروں میں مغربی آرٹ کا اثر بھی نمایاں طور پر نظر آنے لگتا ہے۔ فن مصوری کے مشرقی روایات تصویرکشی میں صرف دو سمتوں ـــــ لمبائی اور چوڑائی ـــــ کا تعین کرتے ہیں۔ مشرقی اقدار فن میں گہرائی یا فاصلہ کا احساس و تعین موجود نہیں لیکن مغربی فن کی یہ ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں آنے والے تاجروں اور پادریوں کی لائی ہوئی تصویروں کے زیر اثر PERSPECTIVE یعنی گہرائی یا نزدیکی اور دوری کے احساس کو بھی مغل مصوروں نے اپنے فن میں سمونے کی کوشش کی مگر یہ تجرباتی حد تک محدود رہی اور عام نہ ہو سکی۔

اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب نے فنون لطیفہ کی سرپرستی نہیں کی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمیں ایسی بہت سی تصویریں ملتی ہیں جنھیں اورنگ زیب ہی کے عہد کا کہا جا سکتا ہے۔ البتہ جمالیاتی اعتبار سے ان تصویروں کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ ہمارے سامنے ایک ایسی روایت بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب خود بھی تصویریں بنواتا تھا۔ اس روایت کے مطابق وہ تمام اہم سیاسی قیدیوں کی تصویریں بنواتا اور ان تصویروں کو دیکھ کر ان کی صحت کے بارے میں رائے قائم کرتا۔ اگر کسی قیدی کی صحت بہتر نظر آتی تو اس کی خوراک میں حسب ضرورت دیر اثر زہر کی مقدار بڑھا دینے کا حکم دیتا تاکہ وہ جلد ہی دنیا سے کوچ کر جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس روایت کی حیثیت افسانے سے زیادہ نہیں۔

بہرحال' اورنگ زیب کے دور کی تصویریں نہ صرف یہ کہ زوال پذیر خصوصیات کی حامل ہیں بلکہ قطعی طور پر ادنیٰ درجہ کی تخلیقات ہیں۔ اعلیٰ تخلیقات اس عہد میں شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ اسی عہد میں تصویر کا راجستھانی اسکول جو بہت بڑی حد تک مغل طرز سے متاثر ہو چکا تھا اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ دوسری طرف اس عہد کی مغل تصویروں میں بھی راجستھانی قلم کے اثرات نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ دکن کے فنی روایات بھی کہیں کہیں جھلکتے ہیں۔ لیکن ان تمام نئے اثرات کے باوجود (جو مغل فن کو حیات نو بخش سکتے تھے) مغل فن مصوری اپنے ابتدائی عہد کی برجستگی نہ پا سکا اور زوال کی طرف تیز رفتاری سے بڑھتا رہا۔

مغل اسکول کی تصویریں اورنگ زیب کے بعد بھی اچھی خاصی تعداد میں بنتی رہیں لیکن ان کی کوئی خاص درجہ بندی نہیں کی جا سکتی عیش پسند محمد شاہ رنگیلے کے دور میں اس زوال پذیر اسٹائل میں کچھ اچھی رومانی تصویریں بنیں لیکن تکنیک کی خوبی کے پس پردہ ان میں وہ عریانیت اور ریاکاری جھلکتی ہے جو دیکھنے والے کو بار خاطر ہوتی ہے۔

شاہ عالم کے عہد سلطنت میں مغل فن مصوری اپنی زندگی کے آخری لمحات میں تھا۔ فن اپنی بدترین سطح پر پہنچ چکا تھا لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ ایسے وقت میں بھی مغل تصویروں کے بہترین نمونوں کی نقل بہت اعلیٰ پیمانے پر ہو رہی تھی۔ شاہ عالم کی حیثیت صرف ایک

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۸ پر)

ہریجنوں کی فلاح

مہابیر پرشاد سریواستوا

چھوت چھات کو ہمارے ملک کے دستور سے ختم کر دیا گیا ہے اور اسے کسی بھی صورت میں برتنا جائز نہیں ہے۔ یہ کوشش کی جا رہی ہے اور اس کے لئے کثیر رقم صرف کی جا رہی ہے کہ ہماری سماجی زندگی سے یہ بدنما دھبہ مٹ جائے اور وہ طبقہ جسے "اچھوت" کہا جاتا ہے جلد از جلد سماج کے دوسرے طبقوں کے برابر آ جائے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود چھوت چھات آج بھی ہمارے درمیان موجود ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ چھوت چھات کے اصول پر عمل نہ کرنا ایک پاپ ہے اور اس کا مرتکب مرنے کے بعد نرک میں جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری روزمرہ زندگی کے تمام شعبوں میں مذہب کی اصل روح کو ذاتی اغراض پر ہمیشہ سے قربان کیا جاتا رہا ہے۔ یہی ان تمام بدعنوانیوں کا راز ہے جو آج ہمارے سماج میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ چھوت چھات ایک وسیع تر مسئلہ ہے جس کو محض قانون سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو مستقل طور پر حل کرنے کے لئے ہمیں سماج میں ایک ایسا نظم قائم کرنا ہوگا جو مذہب کی اصل روح سے ہم آہنگ ہو۔ ہماری مذہبی کتابوں میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔

اروبندو کے قول کے مطابق کرشن بھگوان بھگود گیتا میں کہتے ہیں "جو یوگی وحدت کی بنیاد پر سب کے روپ میں مجھے دیکھتا ہے وہ جو بھی کرتا ہے اور جس ڈھنگ سے بھی رہتا ہے میرے ساتھ ہے۔"

گیتا میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ انسان کا درجہ گن (خوبی) اور کرم (کام) پر منحصر ہے نہ کہ جنم پر جیسا کہ ذات پات کے نظام میں سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح ہریجن کیا تمام لوگ برہمن، کشتری، ویش اور شودر کے چاروں ورنوں میں سے کسی میں بھی رکھے جا سکتے ہیں اور اپنے مزاج اور سبھاؤ کے مطابق کام کر سکتے ہیں۔

بھگود گیتا کے مطابق جو کوئی بھی ایشور سے لو لگائے اور بھگتی کے ساتھ اس کی پوجا کرے اسے سادھو اور سنت سمجھنا چاہئے۔ ایشور کے مندر میں جنس، ذات یا دھرم کا کوئی بھید بھاؤ نہیں ہے۔ مذہبی عبادات آج محض رسمی اور روایتی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ آج لوگوں میں مذہب کی سچی اور سادی روح دوڑانے کے لئے ایک ہمہ گیر مہم شروع کی جائے۔

ذات پات کی رکاوٹوں کو دور کرنے کی تحریک سب سے پہلے راجہ رام موہن رائے نے شروع کی تھی اور رشی دیانند نے ہریجنوں کی بھلائی کا بیڑا اُٹھایا۔ جب مہاتما گاندھی ۱۹۱۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس میں داخل ہوئے تو ہریجنوں کی فلاح کے مسئلے نے بڑی اہمیت اختیار کر لی۔ مہاتما گاندھی چھوت چھات کو ہندو دھرم کے لئے ایک بہت ہی بدنما دھبہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چھوت چھات ایک ایسی بلا ہے جو طرح طرح کی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک پکے مذہبی انسان کی حیثیت سے مہاتما گاندھی یہ کہتے تھے کہ وہ مذہب ہرگز سچا نہیں ہو سکتا جو تنگ نظری

کی تعلیم دے اور عقلی دلائل پر پورا نہ اُترے ۔ "ینگ انڈیا" میں انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے "چھوت چھات ایک ایسا زہر ہے جو ہندو سماج کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ ورن آشرم سے برتری اور کمتری کا دھرم نہیں مراد ہے۔ کسی بھی شخص کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ دوسرا اس سے حقیر ہے۔ اسے ہر انسان کو اپنا بھائی سمجھنا چاہئے۔ یہ مذہب کا بنیادی اصول ہے"

مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں اس سلسلہ میں علاوہ سیاسی پروگرام کے ایک سماجی سدھار کا بھی پروگرام شروع کیا گیا۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ پچھڑے ہوئے طبقوں کی زندگی بہتر بنائی جائے ان کی سماجی، دماغی اور اخلاقی حالت کا سدھار کیا جائے۔ ان کو تلقین کی جائے کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجیں اور ان کو وہی سہولتیں پہنچائی جائیں جو دوسرے شہریوں کو حاصل ہیں۔ اس پروگرام کے تحت سماجی کارکنوں نے سارے دیش میں بھرپور پرچار شروع کیا۔ اس سے ہریجنوں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ مہاتما گاندھی نے کوشش کی کہ ہریجنوں کے ساتھ اونچی ذات کے ہندوؤں کا جو رویہ ہے وہ بدل جائے۔ ساتھ ہی انھوں نے ہریجنوں کے سدھار کے بھی اقدام کئے۔ غرض کہ انھوں نے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر توجہ کی۔ انھوں نے جو کیا اس پر عمل بھی کیا۔ وہ بھنگی بستی میں رہے اور بھنگی کا کام بھی کیا۔

مشہور برطانوی مصنف مسٹر اسٹیج۔ این بریلیفورڈ نے مہاتما گاندھی کی خدمات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ " اس صوفی کا یہ کام کہ ایک دن وہ پائخانہ صاف کرے اور دوسرے دن ہریجنوں کے لئے مندر کھلوائے تاریخ کا سب سے اعلیٰ اور حیرت انگیز باب ہے۔ کیا انسان کا ذہن کسی اور سنت کا نام لے سکتا ہے جس نے دبے اور کچلے ہوئے لوگوں کی حالت کو بہتر بنانے اور ان میں خودداری پیدا کرنے کے لئے اس سے زیادہ کچھ کیا ہو۔ انھوں نے ایک ایسے ظالمانہ رواج کو توڑا ہے جو قدیم ترین زمانہ سے چلا آرہا تھا ہندوستان آج مہاتما گاندھی کی عزت نہ زیادہ تر اس لئے کرتا ہے کہ انھوں نے جنگ آزادی کی رہنمائی کی۔ انسانیت پر ان کا اس سے بھی بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اچھوتوں کے لئے آزادی کا راستہ نکال دیا۔

جب ۱۹۳۷ء میں تمام صوبوں میں وزارتیں بنیں تو انھوں نے ہریجن سدھار کا کام بڑی سرگرمی سے شروع کیا اور دوسرے مسائل پر اس کو ترجیح دی۔ مقصد یہ تھا کہ ہریجنوں میں تعلیم بڑھائی جائے اور سرکاری ملازمتوں میں ان کو کافی نمائندگی دی جائے۔ ان کے سدھار کے دوسرے پہلوؤں مثلاً بیگار اور سماجی نابرابری کو ختم کرنے پر بھی توجہ کی گئی۔ ان اقدامات سے ان کی حالت میں نمایاں سدھار ہوا۔ ہریجنوں میں اس طرح ایک روشن خیال اور تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہوگیا جو ان کی ترقی کا رہبر بنا۔ بدقسمتی سے ۱۹۳۹ء میں ان وزارتوں کے مستعفی ہو جانے سے ہریجنوں کی فلاح کا یہ کام رُک گیا۔ پھر بھی یہ تو ہوا ہی کہ چھوت چھات کو ختم کرنے کی جد و جہد شروع ہو گئی تھی اور ہریجنوں کی آئندہ ترقی کے لئے بنیاد رکھ دی گئی تھی۔

آزادی ملنے سے ملک کو نہ صرف چند بلکہ سب کی بھلائی اور خوشحالی کے لئے منصوبہ بنانے اور سماجی اور اقتصادی نابرابری کو ختم کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ ہریجنوں کو آئینی تحفظات دینے کے بھی انتظام کئے گئے مثلاً دستور کی دفعہ ۱۵ کی رو سے کسی بھی شہری سے مذہب نسل ذات طبقہ اور جائے پیدائش یا ان میں سے کسی بنیاد پر بھی امتیاز نہیں برتا جا سکتا۔ مذکورہ بالا باتوں پر کسی بھی شخص کو دکانوں پبلک رستورانوں، ہوٹلوں، پارکوں، کنوؤں، تالابوں، گھاٹوں، سڑکوں اور ان عام جگہوں پر آنے جانے سے نہیں روکا جا سکتا جن کا کل یا جزو خرچ سرکاری خزانہ سے پورا کیا جاتا ہے۔ دستور میں ہریجنوں کے اس بنیادی حق کو بھی پورے طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ سماج میں ہر اعتبار سے دوسروں کے برابر ہیں۔ دفعہ ۱۷ میں [illegible] ہے کہ "چھوت چھات ختم کر دی گئی ہے اور اسے کسی بھی صورت میں برتنا جائز نہیں ہے۔ چھوت چھات کی بنیاد پر کوئی بھی پابندی لگانا ایک قابل سزا جرم ہوگا۔" دستور میں یہ بھی درج ہے کہ "ریاست کو سماج کے کمزور طبقہ اور خاص کر مندرجہ فہرست اقوام اور قبائل کے تعلیمی اور اقتصادی مفاد کا پورا خیال رکھنا چاہیے۔" ہریجنوں کے اقتصادی اور سیاسی مفاد کے تحفظ کے لئے پارلیمنٹ۔ ریاستوں کی قانون ساز اسمبلیوں اور مرکزی اور ریاستی ملازمتوں کی ملازمتوں میں ان کے لئے جگہیں محفوظ کی گئی ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ دستور میں ہریجنوں کے مفاد کا کافی حد تک تحفظ کیا گیا ہے اور ایسی بھی دفعات رکھی گئی ہیں کہ ہریجنوں اور سماج کے دوسرے افراد کا فرق دور ہو اور جیسا کہ گاندھی جی چاہتے تھے بالآخر سب مل جائیں۔

اس طرح سماجی نا برابری کو دور کرنے کا معاملہ نظم و نسق کے دائرہ عمل میں آ گیا اور تمام کوششیں اس بات کی ہونے لگیں کہ منظم معاشیات کے ذریعہ اشتراکی طرز کے سماج کی منزل حاصل ہو۔

اتر پردیش میں ہریجنوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کا رہن سہن سنوارنے کیلئے لاکھوں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ ہریجنوں کے سدھار کے پروگرام میں تعلیم کو نمایاں اہمیت دی گئی ہے اور ابتدائی درجوں سے یونیورسٹی کے مرحلہ تک کی تعلیم ہریجنوں کے لئے مفت کر دی گئی ہے۔ سرکاری یا کسی ایسے اسکول یا کالج میں جس کو حکومت سے امداد ملتی ہے۔ کسی ہریجن طالب علم سے ٹیوشن، کھیل کود، لائبریری، میڈیکل یا ہاسٹل کے لئے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ غیر سرکاری تعلیمی اداروں کو اس سلسلہ میں جو خسارہ ہوتا ہے اس کو حکومت خاص مالی امداد سے پورا کرتی ہے۔ ہریجنوں کو تکنیکی تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفے دئے جاتے ہیں اور دیگر مالی امداد دی جاتی ہے۔

بے گھر بار ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں کی آبادکاری کے لئے انھیں زرعی زمینیں دی گئی ہیں اور کئی ضلعوں میں ان کی بہت سی بستیاں بسائی جائیں گی۔ دوسرے ترقیاتی مقاصد مثلاً مکانوں اور کنوؤں کی تعمیر اور مرمت بستیوں کی ترقی کے لئے بھی مالی امداد اور دیگر سہولتیں دی جا رہی ہیں۔ جنگلاتی علاقوں میں ہریجنوں کی امداد باہمی انجمنیں بھی قائم کی جا رہی ہیں تاکہ درمیانی اشخاص یا ٹھیکداروں کا عمل دخل نہ ہو۔

سرکاری ملازمتوں میں تقرری کے لئے بھی حکومت نے یہ طے کیا ہے کہ ہریجنوں کا مفاد پیش نظر رکھا جائے۔ ان کے لئے عام طور پر ۱۸ فی صدی جگہیں محفوظ کر دی گئی ہیں۔ یہ شرط بھی رکھی گئی ہے کہ اگر کسی سال ملازمت کے لئے کافی تعداد میں امیدوار دستیاب نہ ہو سکیں تو یہ کمی اگلے سال پوری کی جائے۔

اتر پردیش کے مختلف مقامات پر سابق جرائم پیشہ قبائل کو بسایا جا رہا ہے تاکہ وہ دوبارہ مجرمانہ زندگی اختیار کرنے کے لئے مجبور نہ ہوں، سابق جرائم پیشہ قبائل کے ... اسے زائد خاندان لکھنؤ، کانپور، مرادآباد، گورکھپور اور مظفر نگر کے سرکاری مرکزوں میں رہ رہے ہیں۔ ان کو کاشت کے لئے زمین، بیل اور زراعتی آلات فراہم کئے گئے ہیں۔ سابق جرائم پیشہ قبائل کے بچوں کے لئے گورکھپور، الہ آباد اور لکھنؤ میں اسکول کھولے گئے ہیں جن میں ہوسٹل بھی ہیں یہاں ان بچوں کو ان کے خاندانوں کے غیر صحت مند ماحول سے الگ رکھ کر تعلیم دی جاتی ہے۔ مستقبل قریب میں ایسے اور اسکول بھی کھولے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ چھوت چھات ختم کرنے اور پس ماندہ طبقوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے حکومت ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ یہ لازمی ہے کہ علاقائی کمیٹیاں اور گاؤں سماج چھوت چھات دور کرنے میں اپنی ذمہ داری محسوس کریں جو اب بھی کسی نہ کسی صورت میں باقی ہے خاص کر دیہاتوں میں جہاں کے رسم و رواج توہمات اور سوایات پر مبنی ہیں۔ تمام لوگوں کی برابری کے لئے پرسکون طور سے جدوجہد جاری رہنا چاہئے۔ ہریجنوں کو خود بھی اپنی اصلاح کرنا چاہئے۔ چھوت چھات کی برائی سے نجات پانے کے لئے ذہنی انقلاب اور خیالات میں بنیادی تبدیلی لازمی ہے جس کے بغیر ہم جذباتی اور ذہنی یکجہتی کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔



اُردو تنقید کے ارتقا کا ایک سرسری جائزہ

احتشام بن حسن

فن تنقید کے ارتقا کا جائزہ لینا، ہر انسان کے ذہنی نشیب و فراز کی تاریخ مرتب کرنے کے مترادف ہے۔ بہ قول میتھو آرنلڈ " ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے:" ملک کی فکری اور تہذیبی سرگرمیوں سے ہٹ کر خالص ادب کی تلاش یقیناً ایک امر موہوم ہوتی ہے۔ ایک قدیم یونانی نقاد لانگی نس کی رائے ہے کہ " ادب کے اعلیٰ اور پُرعظمت تصانیف کی پیدائش کا سب سے بڑا ذریعہ اُس زمانے کے اخلاقی اور معاشرتی رسم و رواج ہوتے ہیں۔"

اگر ہم اس تعریف کی روشنی میں اپنے ادب کی تنقید اور اُس کے سلسلۂ ارتقا کا جائزہ لیں تو ہمیں ان تمام ملک گیر سیاسی، سماجی اور معاشرتی عوامل کو پیش نظر رکھنا ہوگا جن کے رد و بدل سے تنقیدی شعور ترقی پذیر رہا اور حالات کے ساتھ ساتھ اسالیب و نظریات متغیر ہوتے رہے۔ تنقیدی مزاج کے بننے اور سنورنے میں جو منزلیں آتی گئیں اُن کے پس منظر کا جائزہ بھی ازبس ضروری ہے لیکن جب ہم اُردو ادب کے تنقیدی سرمایے پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس کے آغاز کے تعین میں بڑی دقت پیش آتی ہے کیوں کہ ہم ابھی تک صحیح طور پر کسی ایک خاص فرد کا نام نہیں لے سکتے کہ فلاں شخص اُردو تنقید کا بانی ہوا ہے۔ البتہ اس کے ارتقا کے مدارج تک ہماری نظریں رسائی پالیتی ہیں۔

درحقیقت ہمارے ادبی ڈھانچے میں تنقیدی شعور کی ابتدا انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہوئی۔ سن ۱۸۵۷ء سے قبل ملک کے حالات کچھ تھے اور بعد میں کچھ اور ہو گئے۔ پہلے ہمارے سماجی روایات کا رُخ ناقدانہ کم اور مقلدانہ زیادہ تھا۔ سماج کے مسائل میں انسانی زندگی کے سامان بود و باش کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ عیش، نشاط کی سرمستیاں اور شعور کی ناپختگی ہزار جلوہ آرائیوں کے ساتھ موجود تھی۔ ایک مایوسی، تھکاوٹ اور اندھی تقلید کا جذبہ ہر صنف میں جلوہ نما تھا۔ امرائے سلطنت شعرا و ادبا کی سرپرستی زیادہ تر اپنے ذہنی تعیش کی خاطر کرتے؛ ادیب و شعرا دربار سے وابستہ ہونے کی وجہ سے قصائد اور دل چسپ داستانوں سے ان کی دل جوئی اور سماعت نوازی کرنے میں فخر محسوس کرتے۔ غرض کہ ادب پر ایک طرح کا جمود طاری تھا، کوئی پرواز تخیل اور فکری بلندی عیاں نہ تھی۔

سن ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے جہاں ملکی و سماجی حالات کو تہ و بالا کر دیا وہاں ادب کے تمام شعبوں میں ایک حرکت اور روشنی بھی پیدا کی۔ شعر و نغمہ کے موضوعات میں تنوع آیا اور داستان گوئی میں حقیقت نگاری کا رجحان پیدا ہوا۔ تنقیدی شعور کی ابتدا بھی اسی انقلاب کی رہین سمجھنی چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے اُردو شاعروں کے تذکرے ضرور لکھے گئے لیکن جس طرح اُردو شاعری عربی اور فارسی سے متاثر تھی اسی طرح ان تذکروں میں بھی عربی و فارسی کے گہرے اثرات ملتے ہیں، مثلاً فارسی ادب کی تنقید کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم بیان و عروض پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور تخیل، مطالب اور ندرت پر کم۔ اُردو کے ان تذکروں میں بھی الفاظ و معانی کی بحثیں زیادہ ملتی ہیں۔ میر تقی میر کی کتاب نکات الشعرا کو لے لیجیے۔ یہ تذکرہ نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے لیکن اس میں زندگی اور اُس کے مسائل پر کتنی بحث ہے یہ ایک علیحدہ بات ہے۔ دراصل اُس وقت تک اس امر پر غور ہی نہیں ہوتا تھا کہ ادب کا تعلق زندگی سے کیا ہے۔ یہ مسائل نہ فارسی تنقید میں اُٹھائے گئے اور نہ اُس کے

زیرِ اثر ان تذکروں میں متقدمین نے اٹھائے جتیر کا لکھا ہوا تذکرہ ہو یا اس دور کے دوسرے تذکرے، اُن میں شاعر کے بارے میں ذاتی رائے کا اظہار زیادہ ہوتا تھا کسی اصول نقد کی روشنی میں شعرا کے کلام کو نہیں پرکھا جاتا تھا۔ بہ قول پروفیسر احتشام حسین "ان تذکروں سے ہم شعرا کے نہاں خانۂ دل میں نہیں جھانک سکتے"۔ یہ صحیح ہے کہ ان تذکروں میں کہیں کہیں کسی قدر ناقدانہ فکر ضرور مل جاتی ہے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان سب میں فارسی تقلید نمایاں ہے اور صحیح قسم کے تنقیدی شعور کی ابتدا انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہی ہوتی ہے۔

اس جدید اردو تنقید کے بانی محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی ہیں جنھوں نے اُردو میں تنقید کے نظریے اور اصول مرتب کیے اور عملی تنقید میں ایک جامعیت پیدا ہوئی۔ اس میدان میں اوّلیت کا سہرا محمد حسین آزاد کے سر بندھتا ہے۔ ان کی آبِ حیات اُردو کا پہلا تذکرہ ہے جس میں شعرا کے بارے میں ذاتی رائے سے ہٹ کر ان کی شخصیت اور ان کی شاعری کے اثر دکھانے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ کوشش بہت نمایاں طور پر جلوہ گر نہیں ہوتی لیکن ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا آزاد نفسِ شعر کے بارے میں بھی کچھ سوچتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے نہ صرف شعر کو سماجی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے بلکہ آبِ حیات میں جن شعرا کا تذکرہ کیا ہے ان سے اُن کے دور کی تہذیبی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ آبِ حیات کے ہر باب کے آغاز میں جو حصّہ اس دور کے شعرا کے تعارف کے لیے لکھا گیا ہے وہ آزاد کی اسی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔ تقریباً اسی قسم کا اظہار نیرنگِ خیال کے دیباچے اور ان کے لکچروں سے بھی ہوتا ہے اور اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ محمد حسین آزاد شعر و شاعری کے بارے میں ایک واضح رائے رکھتے تھے۔ اس سے میرا مدعا یہ ہے کہ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ شعر و شاعری کی روح کو سمجھنے کے لیے صرف علمِ بیان ہی کافی نہیں ہے بلکہ شعر کی وجدانی کیفیت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ وہ شعر کو سماجی مسائل کی روشنی میں حل کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اُردو میں پہلی مرتبہ عقلیت پسندی (Rationalistic View) اختیار کی۔ ان کے یہ خیالات انگریزی ادب سے واقفیت کی بنا پر پروان چڑھے تھے۔ "کرنل ہالرائڈ" لاہور کے قیام میں انھوں نے اپنے ادبی شعور کو بیدار کیا اور مطالعے سے اُن کے خیالات میں بھی تنوع اور فراخی آئی۔ مولانا حالی کی صحبت بھی کافی حد تک مؤثر ثابت ہوئی۔ پنجاب میں ہالرائڈ کی تحریک پر حالی کی معیت میں انھوں نے آزاد شاعری کی بنیاد ڈالی جس میں فطری، سماجی اور قدرتی عنوانات کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ درحقیقت یہ مشاعرہ اردو ادب میں جدید رجحانات کا محرک ہوا۔ اس کے بعد حالی اور آزاد کی مشترکہ کوششیں اس سلسلے میں بہت کارگر ثابت ہوئیں۔ غزل نے محدود دائرے سے نکل کر نظم کے قالب میں پناہ لی۔ موضوعات کی اسی تبدیلی سے شعوری بلندی اور فطری بالیدگی پیدا ہوئی اور اس طرح شاعری زندگی کے قریب آ گئی۔ شاعری کے نئے تقاضوں کا احساس عام ہوتا گیا۔

مولانا حالی کا تنقیدی شعور مولانا آزاد سے زیادہ پختہ اور معیاری تھا۔ اُن کی نظر میں گہرائی اور گیرائی تھی۔ وہ حالات کے سمجھنے میں کافی حساس واقع ہوئے تھے۔ چناں چہ وہ ادب کو زندگی کا آئینہ بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے شعر و سخن کے علاوہ تنقید کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ وہ سرسید اور "سرسید تحریک" سے بھی بے حد متاثر تھے۔ ادھر سرسید، جوہرِ قابل کے قدرداں تھے۔ اُن کی نظریں حالی جیسے گوہرِ گراں مایہ پر پڑیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حالی اُن کی رہنمائی میں نقاد بنے۔ "مسدس" کے خالق بنے، سوانح نگار بنے، "مکمل زبان" کے سربراہ بنے۔ بہ قول مولوی عبدالحق، حالی کے آبگینۂ دل میں چنگاری بھی تھی جس کو سرسید نے بھڑکا کر شعلہ بنا دیا، اسی کی شعلہ تابی سے وہ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رُلایا۔ علم کے اعتبار سے بھی وہ بہت بلند تھے۔ اُن کی نظر مغربی ادب پر بھی تھی۔ ان کا ادبی ذوق اور طبیعت کا میلان اُن کو علم و ادب کی آغوش میں کشاں کشاں کھینچ لے گیا۔ وہ جدید و قدیم کا سنگم تھے۔ انھوں نے قدیم صالح روایات کا احترام کیا اور مقلدانہ ذہنیت سے بغاوت بھی کی۔ انھوں نے عصری تقاضوں کو سمجھا اور فکر و شعور کو مشعلِ راہ بنایا۔ درحقیقت اس جذبے نے اُن کو سرسید سے وابستہ ہونے پر مجبور کر دیا اور ہزاروں مخالفتوں کے باوجود انھوں نے اپنے قدم پیچھے نہ ہٹائے۔ اُن کی فطرت حساس تھی، وہ بیدار مغزی کے ساتھ سوچتے تھے، فیصلہ کرتے تھے اور پھر قدم بڑھاتے تھے۔ اُن کے یہاں ذہنی انتشار مفقود ہے۔ اُن کے سیاسی شعور پر بھی سرسید کی عقلیت کی چھاپ ہے۔ وہ سرسید کے ذہنی صور پر مرید تھے۔ انھوں نے شعر و ادب کے مسائل پر غور کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ موجودہ حالات میں شعر کی صورت وہ نہیں ہے جو ہونی چاہیے اس لیے اس کی اصلاح ضروری تھی۔ نئے سماجی حالات کس طرح کا ادب چاہتے ہیں، یہ ہمیشہ ان کی فکر کی گرفت میں رہا اور آہستہ آہستہ تنقیدی اصولوں کی شکل میں ظاہر ہوا جس پر ہماری اُردو تنقید کی عمارت کھڑی ہے۔ حالی نے نئے سماجی تقاضوں سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ شاعر نہ "تلمیذ الرحمٰن" ہو اور نہ "ملہمِ غیب"۔ نہ مضامین غیب سے

آتے ہیں اور وہ شاعر بقول "صریر خامہ نوائے سروش ہوتا ہے"۔ بلکہ ہمارے گرد و پیش کے حالات شاعر کو متاثر کرتے ہیں۔ حالیؔ شاعری کو سماج کی ایک اہم ضرورت خیال کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک شاعری کو سوسائٹی یا معاشرے کے ذہنی، سیاسی، اقتصادی حالات کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ مقدمے میں لکھتے ہیں :

"جب افلاس میں قوت لایموت اور تونگری میں جاہ و منصب کے لیے کوشش کی جاتی ہے، دُنیا میں چاروں طرف خود غرضی دیکھی جاتی ہے، اس وقت انسان کو سخت مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اگر اس کے پاس ایسا کوئی علاج نہ ہوتا جو دل کو بہلانے اور تازہ رکھنے میں چپکے چپکے لیکن نہایت قوت کے ساتھ افلاس کی صورت میں مرہم اور تونگری کی صورت میں تریاق کا کام کر سکے۔ یہ خاصیت خدا نے شعر میں ودیعت کی ہے کہ وہ ہم کو محسوسات کے دائرے سے نکال کر ہماری گزشتہ اور آئندہ حالت کو موجودہ حالت پر غالب کر دیتا ہے۔"

حالیؔ شاعری کو اخلاق کے سُدھار اور قومی و ملّی احساسات کو بیدار کرنے کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ اُن کی نظر میں شاعر اپنے کلام سے مردہ قوم کے تنِ خاکی میں زندگی کی شمع روشن کر سکتا ہے۔ خود اُن کی شاعری اِسی انقلابی جذبے کی مصداق ہے۔ مسدّس حالیؔ نے مسلم طبقے میں ایک حرکت اور انقلاب پیدا کر دیا۔ اُن کی مثنویاں بھی تاثیر، جوش اور سادگی کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ غرض حالیؔ کا تنقیدی نقطۂ نظر مشرقی اور مغربی ادب کی آمیزش سے بنا تھا۔ اس میں حسّاس ذہن کی تابناکی بھی تھی اور عقل و دانش کی بہاں تابی بھی۔ انھوں نے محمد حسین آزاد کی طرح عقلیت پسندی کو اپنایا تھا۔ وہ تنقید کو محض کھرے کھوٹے کی جانچ کا آلہ تصور نہیں کرتے تھے بلکہ تنقید کو ادب میں اصلاح کردار اور اخلاق کے استوار کرنے کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے۔

حالیؔ کی عملی تنقید نگاری کا نمونہ یادگارِ غالبؔ ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے متعین کردہ تنقیدی نظریے برتنے کی کوشش کی ہے۔ مقدمے میں انھوں نے جو معیار قائم کیا ہے اس کتاب میں اُسے عملی طور پر نباہا ہے۔ حیاتِ جاوید بھی حالیؔ کی عملی تنقید نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔

اس دور کی اہم ترین شخصیت علامہ شبلیؔ ہیں جن کے متعلق رام بابو سکسینہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "اگر کوئی شخص بیک وقت عالم، مورخ، ادیب، شاعر، نقاد، سوانح نگار، صاحبِ طرز انشا پرداز ہو سکتا ہے تو وہ شبلیؔ کی ذات ہے"۔ شبلی کا مزاج شاعرانہ تھا لیکن اُن کی نظر ناقدانہ تھی۔ وہ ادب کے متعلق واضح نظریہ رکھتے تھے۔ اُن کی ناقدانہ نظر مغرب و مشرق کے ادب کے مطالعے کے بعد بنی تھی۔ ان کا سیاسی سماجی شعور بھی اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ پختہ تھا۔ تنقید پر ان کا عظیم کارنامہ موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ اور شعر العجم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں اُن کا بنیادی نقطۂ نظر محققانہ اور حقیقت پسندانہ ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے شبلی کی تنقید کے بارے میں لکھا ہے : "شبلی اُردو کے ممتاز نقاد ہیں۔ انھوں نے اُردو میں تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ اُن کے ساتھ آزاد اور حالیؔ بھی اس سلسلے میں پیش پیش رہے اور اُردو میں تنقید کے علم برداروں کی حیثیت سے اُن کا مرتبہ بھی اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن شبلی کی تنقید کا انداز ان دونوں نقادوں سے مختلف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی ایک مخصوص انفرادیت رکھتی ہے اور اس نے اُردو تنقید کو ایک نئے انداز سے آشنا کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔

شبلی نے تنقید کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کی طرف توجہ کی ہے۔ ان کا خاص میدان شاعری کی تنقید ہے۔ انھوں نے شاعری کے اصولوں پر بھی بحث کی ہے۔ اصنافِ سخن کے اصول بھی وضع کیے ہیں اور شاعروں پر عملی تنقید بھی کی ہے۔ اس لحاظ سے اُن کی تصنیف شعر العجم خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے۔ شعر العجم کی پانچ جلدیں ہیں۔ ان میں چوتھی جلد نظریاتی و اصولی تنقید سے متعلق ہے اور اس میں شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بصیرت افروز تنقیدی بحث اور اصنافِ سخن کا تنقیدی تجزیہ ہے۔ بقیہ جلدوں میں مختلف فارسی شعرا اور فارسی شاعری کے مختلف رجحانات کا تنقیدی جائزہ ہے۔ غرض اس کتاب میں نظری اور عملی تنقید کے بہت اچھے نمونے موجود ہیں۔ اس کو سامنے رکھا جائے تو شبلی کے انداز تنقید کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔"

شبلیؔ کے بارے میں یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اُن کی نظر تاریخی واقعات اور تحقیقی مسائل پر بھی تھی جس کی وجہ سے اُن کے یہاں فارسی کے روایات کا احترام زیادہ نمایاں طور پر ملتا ہے۔ جس طرح ایک مورخ واقعے کی صحت پرکھ کرتا ہے اسی طرح وہ تنقیدی موضوعات میں بھی تاریخ نگاری کے اصول کو پیش نظر رکھتے تھے۔ وہ گرد و پیش کے حالات کا مطالعہ گہری نظر سے کرتے تھے۔ وہ وسیع النظر اور معتدل مزاج شخصیت کے مالک تھے۔ جتنی آسانی سے وہ شعر کے عمیق مفہوم تک پہنچ جاتے تھے وہ اُن کے معاصرین میں کم ہی میں پایا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ شعر العجم میں کچھ خامیاں بھی رہ گئی ہیں جنھیں محمود شیرانی نے تنقید شعر العجم کے نام سے پیش کر دیا ہے۔ لیکن اس سے شبلی کی ناقدانہ حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بیسویں صدی کے ربع اوّل میں تنقید پر اور بھی کام ہوا لیکن اُسے دیکھ کر یہ

زیرِ اثر ان تذکروں میں متقدمین نے اُٹھائے میر کا لکھا ہوا تذکرہ ہو یا اُس دور کے
دوسرے تذکرے اُن میں شاعر کے بارے میں ذاتی رائے کا اظہار زیادہ ہوتا تھا
کسی اُصول نقد کی روشنی میں شعرا کے کلام کو نہیں پرکھا جاتا تھا۔ بقول پروفیسر
احتشام حسین "ان تذکروں سے ہم شعرا کے نہاں خانۂ دل میں نہیں جھانک
سکتے۔" یہ صحیح ہے کہ ان تذکروں میں کہیں کہیں تو کسی قدر ناقدانہ فکر ضرور مل جاتی ہے
مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان سب میں فارسی تقلید نمایاں ہے
اور صحیح قسم کے تنقیدی شعور کی ابتدا انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہی ہوتی ہے۔

اس جدید اُردو تنقید کے بانی محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی ہیں جنھوں
نے اُردو میں تنقید کے نظریے اور اصول مرتب کیے اور عملی تنقید میں ایک جامعیت
پیدا ہوئی۔ اس میدان میں اوّلیت کا سہرا محمد حسین آزاد کے سر بندھتا ہے۔ اُن
کی آبِ حیات اُردو کا پہلا تذکرہ ہے جس میں شعرا کے بارے میں ذاتی رائے
سے ہٹ کر اُن کی شخصیت اور اُن کی شاعری کے اثر دکھانے کی شعوری کوشش
کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ کوشش بہت نمایاں طور پر جلوہ گر نہیں ہوتی لیکن ضرور
معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا آزاد نفسِ شعر کے بارے میں بھی کچھ سوچتے تھے۔ مولانا
محمد حسین آزاد نے صنفِ شعر کو سماجی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے بلکہ
آبِ حیات میں جن شعرا کا تذکرہ کیا ہے اُن سے اُن کے دور کی تہذیبی جھلکیاں
بھی ملتی ہیں۔ آبِ حیات کے ہر باب کے آغاز میں جو حصہ اُس دور کے شعرا
کے تعارف کے لیے لکھا گیا ہے وہ آزاد کی اسی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔
تقریباً اسی قسم کا اظہار نیرنگِ خیال کے دیباچے اور ان کے لکچروں سے
بھی ہوتا ہے اور اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ محمد حسین آزاد شعر و شاعری کے
بارے میں ایک واضح رائے رکھتے تھے۔ اس سے میرا مدعا یہ ہے کہ وہ یہ بات
اچھی طرح سمجھتے تھے کہ شعر و شاعری کی روح کو سمجھنے کے لیے صرف علم بیان ہی کافی
نہیں ہے بلکہ شعر کی وجدانی کیفیت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر رکھنا بھی
ضروری ہے۔ وہ شعر کو سماجی مسائل کی روشنی میں حل کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح
اُنھوں نے اُردو میں پہلی مرتبہ عقلیت پسندی (Rationalistic View)
اختیار کی۔ ان کے یہ خیالات انگریزی ادب سے واقفیت کی بنا پر پروان چڑھے
تھے۔ "[illegible]" لاہور کے قیام میں اُنھوں نے اپنے ادبی شعور کو بیدار کیا
اور مطالعے سے اُن کے خیالات میں بھی تنوع اور فراخی آئی۔ مولانا حالی کی صحبت
بھی کافی حد تک مؤثر ثابت ہوئی۔ پنجاب میں ہالرائڈ کی تحریک پر حالی کی

میں اُنھوں نے آزاد شاعری کی بنیاد ڈالی جس میں فطری، سماجی اور قدرتی عنوانات
کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ درحقیقت یہ مشاعرہ اردو ادب میں جدید رجحانات کا
محرک ہوا۔ اس کے بعد حالی اور آزاد کی مشترکہ کوششیں اس سلسلے میں بہت کارگر
ثابت ہوئیں۔ غزل نے محدود دائرے سے نکل کر نظم کے قالب میں پناہ لی۔ موضوعات
کی اس تبدیلی سے شعوری بلندی اور فطری بالیدگی پیدا ہوئی اور اس طرح شاعری
زندگی کے قریب آ گئی۔ شاعری کے نئے تقاضوں کا احساس عام ہوتا گیا۔

مولانا حالی کا تنقیدی شعور مولانا آزاد سے زیادہ پختہ اور معیاری تھا۔ اُن کی
نظر میں گہرائی اور گیرائی تھی۔ وہ حالات کے سمجھنے میں کافی حساس واقع ہوئے تھے۔
چنانچہ وہ ادب کو زندگی کا آئینہ بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے اُنھوں نے شعر و سخن
کے علاوہ تنقید کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ وہ سرسید اور "سرسید تحریک" سے بھی بے حد
متاثر تھے۔ ادھر سرسید، جوہرِ قابل کے قدرداں تھے۔ اُن کی نظر میں حالی جیسے
گوہرِ گراں مایہ پر پڑیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حالی اُن کی رہنمائی میں نقاد بنے۔ "مسدس" کے
خالق بنے، سوانح نگار بنے، ملک کی زبان کے سربراہ بنے۔ بقول مولوی عبدالحق:
حالی کے آبگینۂ دل میں چنگاری بھی تھی جس کو سرسید نے بھڑکا کر شعلہ بنا دیا، اسی
کی شعلہ تابی سے وہ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رُلایا۔ علم کے اعتبار سے بھی وہ
بہت بلند تھے۔ اُن کی نظر مغربی ادب پر بھی تھی۔ اُن کا ادبی ذوق اور طبیعت کا میلان
اُن کو علم و ادب کی آغوش میں کشاں کشاں کھینچ لے گیا۔ وہ جدید و قدیم کا سنگم تھے۔
اُنھوں نے قدیم صالح روایات کا احترام کیا اور مقلدانہ ذہنیت سے بغاوت بھی
کی۔ اُنھوں نے عصری تقاضوں کو سمجھا اور فکر و شعور کو مشعلِ راہ بنایا۔ درحقیقت
اس جذبے نے اُن کو سرسید سے وابستہ ہونے پر مجبور کر دیا اور ہزاروں مخالفتوں کے
باوجود اُنھوں نے اپنے قدم پیچھے نہ ہٹائے۔ اُن کی فطرت حساس تھی، وہ بیدار مغزی
کے ساتھ سوچتے تھے، فیصلہ کرتے تھے اور پھر قدم اٹھاتے تھے۔ اُن کے یہاں ذہنی
انتشار مفقود ہے۔ اُن کے سیاسی شعور پر بھی سرسید کی عقلیت کی چھاپ ہے۔ وہ
سرسید کے ذہنی شعور پر مر مٹے تھے۔ اُنھوں نے شعر و ادب کے مسائل پر غور کیا تو وہ اس
نتیجے پر پہنچے کہ موجودہ حالات میں شعر کی صورت وہ نہیں ہے جو ہونی چاہیے اس لیے
اس کی اصلاح ضروری سمجھی۔ نئے سماجی حالات کس طرح کا ادب چاہتے ہیں؟ یہ ہمیشہ
ان کی فکر کی گرفت میں رہا اور آہستہ آہستہ تنقیدی اصولوں کی شکل میں ظاہر ہوا جس
پر ہماری اُردو تنقید کی عمارت کھڑی ہے۔ حالی نے نئے سماجی تقاضوں سے متاثر
ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ شاعر نہ "تلمیذ الرحمٰن" ہے اور نہ "ملہمِ غیب"۔ نہ مضامین غیب سے

آتے ہیں اور وہ شاعر صرف "صریر خامہ نوائے سروش ہوتا ہے"۔ بلکہ ہمارے گرد و پیش کے حالات شاعر کو متاثر کرتے ہیں۔ حالی شاعری کو سماج کی ایک اہم ضرورت خیال کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک شاعری کو سوسائٹی یا معاشرے کے ذہنی، سیاسی، اقتصادی حالات کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ مقدمے میں لکھتے ہیں:

"جب افلاس میں قوت لایموت اور تونگری میں جاہ و منصب کے لیے کوشش کی جاتی ہے، دُنیا میں چاروں طرف خود غرضی دیکھی جاتی ہے، اس وقت انسان کو سخت مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اگر اس کے پاس ایسا کوئی علاج نہ ہوتا جو دل کو بہلانے اور تازہ رکھنے میں چٹکے چٹکے لیکن نہایت قوت کے ساتھ افلاس کی صورت میں مرہم اور تونگری کی صورت میں تریاق کا کام کر سکے۔ یہ خاصیت خدا نے شعر میں ودیعت کی ہے کہ وہ ہم کو محسوسات کے دائرے سے نکال کر ہماری گزشتہ اور آئندہ حالت کو موجودہ حالت پر غالب کر دیتا ہے۔"

حالی شاعری کو اخلاق کے سُدھار اور قومی و ملی احساسات کو بیدار کرنے کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ اُن کی نظر میں شاعر اپنے کلام سے مردہ قوم کے تنِ خاکی میں زندگی کی شمع روشن کر سکتا ہے۔ خود اُن کی شاعری اسی انقلابی جذبے کی مصداق ہے۔ مسدس میں حالی نے مسلم طبقے میں ایک حرکت اور انقلاب پیدا کر دیا۔ اُن کی مثنویاں بھی تاثیر، جوش اور سادگی کے لحاظ سے ممتاز ہیں۔ غرض حالی کا تنقیدی نقطۂ نظر مشرقی اور مغربی ادب کی آمیزش سے بنا تھا۔ اس میں حساس ذہن کی تابناکی بھی تھی اور عقل و دانش کی جہاں تابی بھی۔ انھوں نے محمد حسین آزاد کی طرح عقلیت پسندی کو اپنایا تھا۔ وہ تنقید کو محض کھرے کھوٹے کی جانچ کا آلہ تصور نہیں کرتے تھے بلکہ تنقید کو ادب میں اصلاح کردار اور اخلاق کے استوار کرنے کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے۔

حالی کی عملی تنقید نگاری کا نمونہ یادگار غالب ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے متعین کردہ تنقیدی نظریے برتنے کی کوشش کی ہے۔ مقدمے میں انھوں نے جو معیار قائم کیا ہے اس کتاب میں اُسے عملی طور پر نباہا ہے۔ حیات جاوید بھی حالی کی عملی تنقید نگاری کا اچھا نمونہ ہے۔

اس دور کی اہم ترین شخصیت علامہ شبلی ہیں جن کے متعلق رام بابو سکسینہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "اگر کوئی شخص بیک وقت عالم، مورخ، ادیب، شاعر، نقاد، سوانح نگار، صاحبِ طرز انشا پرداز ہو سکتا ہے تو وہ شبلی کی ذات ہے"۔ شبلی کا مزاج شاعرانہ تھا لیکن اُن کی نظر ناقدانہ تھی۔ وہ ادب کے متعلق واضح نظریہ رکھتے تھے۔ اُن کی ناقدانہ نظر مغرب و مشرق کے ادب کے مطالعے کے بعد بنی تھی۔ ان کا سیاسی سماجی شعور بھی اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ پختہ تھا۔ تنقید پر ان کا عظیم کارنامہ موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں اُن کا بنیادی نقطۂ نظر محققانہ اور حقیقت پسندانہ ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے شبلی کی تنقید کے بارے میں لکھا ہے: "شبلی اردو کے ممتاز نقاد ہیں۔ انھوں نے اُردو میں تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ اُن کے ساتھ آزاد اور حالی بھی اس سلسلے میں پیش پیش رہے اور اردو میں تنقید کے علم برداروں کی حیثیت سے اُن کا مرتبہ بھی اپنی جگہ مسلم ہے لیکن شبلی کی تنقید کا انداز ان دونوں نقادوں سے مختلف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی ایک مخصوص انفرادیت رکھتی ہے اور اُس نے اُردو تنقید کو ایک نئے انداز سے آشنا کیا ہے۔ ... ...

"شبلی نے تنقید کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کی طرف توجہ کی ہے۔ ان کا خاص میدان شاعری کی تنقید ہے۔ انھوں نے شاعری کے اصولوں پر بھی بحث کی ہے۔ اصنافِ سخن کے اصول بھی وضع کیے ہیں اور شاعروں پر عملی تنقید بھی کی ہے۔ اس لحاظ سے اُن کی تصنیف شعر العجم خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے۔ شعر العجم کی پانچ جلدیں ہیں۔ ان میں چوتھی جلد نظریاتی و اصولی تنقید سے متعلق ہے اور اس میں شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بصیرت افروز تنقیدی بحث اور اصنافِ سخن کا تنقیدی تجزیہ ہے۔ بقیہ جلدوں میں مختلف فارسی شعرا اور فارسی شاعری کے مختلف رجحانات کا تنقیدی جائزہ ہے۔ غرض اس کتاب میں نظری اور عملی تنقید کے بہت اچھے نمونے موجود ہیں۔ اس کو سامنے رکھا جائے تو شبلی کے انداز تنقید کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔"

شبلی کے بارے میں یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اُن کی نظر تاریخی واقعات اور تحقیقی مسائل پر بھی تھی جس کی وجہ سے اُن کے یہاں فارسی کی روایات کا احترام زیادہ نمایاں طور پر ملتا ہے۔ جس طرح ایک مورخ واقعے کی تاریخ پیدا کرتا ہے اسی طرح وہ تنقیدی موضوعات میں بھی تاریخ نگاری کے اصول کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ وہ گرد و پیش کے حالات کا مطالعہ گہری نظر سے کرتے تھے۔ وہ وسیع النظر اور معتدل مزاج شخصیت کے مالک تھے جتنی آسانی سے وہ شعر کے عمیق مفہوم تک پہنچ جاتے تھے وہ اُن کے معاصرین میں کم ہی میں پایا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ شعر العجم میں کچھ خامیاں بھی رہ گئی ہیں جنھیں محمود شیرانی نے تنقید شعر العجم کے نام سے پیش کر دیا ہے۔ لیکن اس سے شبلی کی ناقدانہ حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بیسویں صدی کے ربع اول میں تنقید پر اور بھی کام ہوا لیکن اُسے دیکھ کر یہ

کہا جا سکتا ہے کہ اس میں عصرِ جدید کے بجائے قدما کے طرزِ تنقید نگاری کی جھلک زیادہ نمایاں رہی۔ ان ناقدین نے تذکرہ نگاری کو معیارِ تنقید بنایا۔ بعض نے اس کے علاوہ دوسرے مسائل کو بھی تنقید کے موضوع میں شامل کر لیا۔ اس دور کا ایک تذکرہ خمخانۂ جاوید لالہ سری رام کا تصنیف کردہ ہے۔ یہ محض تذکرہ ہی نہیں بلکہ اس میں خال خال تبصرہ اور تنقید بھی آگئی ہے۔ امداد امام اثر کی مشہور تصنیف کاشف الحقائق معروف بہ بہارستانِ سخن بھی نئے اور پرانے اصولِ نقد کی آئینہ دار ہے۔ اس زمرے میں محمود شیرانی کا نام بھی ناقدین میں کم اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ ناقد سے زیادہ محقق نظر آتے ہیں۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بالکے ذہین تھے اور ادب پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ عارفانہ انداز تحریر اور محققانہ معیارِ تنقید ان ہی کا حصہ ہے۔ شبلی جیسے محقق و ناقد کی شعر العجم پر ان کی تنقید اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے علاوہ مولانا عبد السلام ندوی صاحب شعر الہند، محمد یحییٰ تنہا مؤلف سیر المصنفین اور مولانا سید عبد الحئی صاحب گلِ رعنا کے نام بھی اسی سلسلے میں آتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اردو تنقید کے ارتقا کا اگر بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے اور ان تمام عناصر کی چھان بین کی جائے جو اس کی ترقی کا باعث بنے تو ادب کی رومانوی تحریک کا بھی جائزہ لینا پڑے گا۔ اس تحریک سے اردو میں جذبہ اور عقل کی کشمکش کی گتھیاں سلجھیں، کثر صاف و سادہ مسائل ابھرے ہیں۔ خاص طور پر سرسید کی اصلاحی کوششوں سے ذہنوں میں نئی روشنی پروان چڑھنے لگی تھی۔ عین ایسے ماحول میں رومانوی تحریک کا آغاز ہوا۔ سرسید جس کارواں کے میر تھے اسی کارواں نے آگے چل کر ادب کی اس رومانوی تحریک کا سہارا لیا اور "علی گڑھ تحریک" کے فرزند اس سے وابستہ ہو گئے۔ ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری، مہدی افادی، سجاد انصاری، سجاد حیدر یلدرم، قاضی عبد الغفار، رشید احمد صدیقی اور نیاز فتحپوری وغیرہ اس کے خاص نمائندے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ حسن کی تلاش، واقعاتی پس منظر کی تخلیق، عقل سے گریز، جذبہ اور وجدان پر زور، احساس و ادراک کی کیفیت ان کی تحریروں کی جان بن گئی۔ رومانوی تحریک پر ملک کے سیاسی اور سماجی حالات کا بھی اثر پڑا۔ اردو میں جمالیاتی ذوق اور افسانہ نگاری کے رجحان نے کافی حد تک ترقی کی۔ زبان و اسلوب میں پاکیزگی اور نکھار، لطیف میلانات کی جھلک آیا۔ خالص ادبی اور تنقیدی تحریروں میں فلسفیانہ زبان سے گریز کیا جانے لگا۔ تنقید نے کائنات کے تمام پامال موضوعات پر توجہ دینی شروع کی۔ اس کے علاوہ انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے جو اس تحریک کے ذریعہ سامنے آئے وہ اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئے۔ انشائیہ (Essays) کی ترقی بھی کافی حد تک اسی دور میں ہوئی۔ سجاد انصاری اور نیاز فتحپوری کے انشائیے اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے پیرایۂ بیان میں سادگی اور حسن جھلکتا ہے۔ ان موضوعات کے علاوہ اس دور میں تنقیدی رجحانات میں بھی اضافہ ہوا اور مطالعے کی آزادی نے نظریات کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد دی۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ رومانوی مزاج کے ڈھالنے میں ٹیگور کی شخصیت اور فلسفے کو بھی دخل ہے۔ جہاں تک ٹیگور کی تخلیقات کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے مزاج میں جمالیاتی ذوق پوری طرح موجود تھا۔ ان کا ادبی نقطۂ نظر حسن جمالیات اور حسن کی ستائش پر مرکوز نظر آتا ہے۔ ان کی تخلیقات جب منظرِ عام پر آئیں تو اس کا اثر اردو زبان نے بھی قبول کیا۔

اس تحریک کے ساتھ ماورائیت اور انفرادیت کے تصورات بھی اردو میں پہلی بار داخل ہوئے مثلاً ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کی کتاب محاسنِ کلامِ غالب ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے: "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوانِ غالب"۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رومانوی تحریک نے تنقید کے اصول و ضوابط نہیں بنائے بلکہ ایک غیر مشروط اور مبہم انداز اختیار کر کے عقلیت پسندی کے برخلاف جذبے کی اہمیت پر زور دیا۔ تنقید کو محض جذبہ اور تاثرات کا آلہ نہیں بنایا جا سکتا۔ عقل اور تدبر کی رہبری بہرحال حاصل کرنی ہی پڑتی ہے۔ اسلوب و نظریے محض تاثراتی نہیں ہوتے بلکہ ان میں شعوری تجربات اور سماجی زندگی کے مسائل کا تجزیہ اپنے پورے خدوخال کے ساتھ واضح کر دیا جاتا ہے۔ نظریات کی تخلیق بنیادی طور پر افکار اور عمل کا عکس ہوتی ہے۔ انسان وہی سوچ سکتا ہے جو اس کے شعور میں رونما ہوتا ہے۔ اس کا ضمیر اس کے دروں کی آواز بن جاتا ہے۔ ذوقِ جمال اور ادراکِ حسن اس کی ازلی خو ہے۔ ادب جتنا انسان کے دل و دماغ کو متاثر کرے گا اتنا ہی اس سے ٹھنڈک اور فرحت پیدا ہو جائے گی۔ رومانی نقاد حسن کی تلاش میں ہفت افلاک کی سیر تو کرتے ہیں لیکن کبھی اپنے آبگینۂ دل میں غوطہ زن ہو کر عقل و خرد کی رہبری حاصل نہیں کر پاتے۔

نئے دور میں ایسے نقاد بھی ملتے ہیں جنھوں نے ادب کے فن پاروں کو بھی جانچنا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں قاضی عبد الودود، ڈاکٹر مولوی عبد الحق، نصیر الدین ہاشمی، پنڈت دتاتریہ کیفی وغیرہ کے نام بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عبد الحق نے دکن اسکول پر بڑا کام کیا اور اپنے بعد آنے والوں کے لئے

بہت سی راہیں کھول دی ہیں۔ اردو امام اثر اور وحید الدین سلیم کے یہاں بھی ہم کو اس کا اتباع ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین زور کی تنقید میں بھی تاریخی اور تحقیقی رجحان پایا جاتا ہے۔ اسلوب میں سادگی اور پاکیزگی ہونے کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین میں مقبول ہوئے ان کی کتاب "روح تنقید" انتقادی کتب میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اسی طرح مسعود حسن رضوی ادیب، سید سلیمان ندوی اور شاہ معین الدین ندوی کی تنقیدیں تاریخی و تحقیقی رجحان کی حامل ہیں۔ عالمانہ استدلال تنقید کا جوہر ہے یہ جوہر ان لوگوں کے یہاں کافی حد تک معیاری پایا جاتا ہے۔ تاثراتی انداز میں تنقید کرنے والوں میں عبدالقادر سروری، ممتاز حسین، آثر لکھنوی اور مولانا اختر علی تلہری کے نام شہرت کے مالک ہیں۔

اردو تنقید میں جدید ترین نظریات کا خالق اصل میں اختر حسین رائے پوری کا وہ فکر انگیز مقالہ ہے جو انھوں نے "ادب اور زندگی" کے عنوان سے ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا۔ اس مقالہ میں بعض چونکا دینے والی باتیں کہی گئی تھیں اور نئے میلانات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ بہ قول احتشام حسین جذباتیت، ناپختگی، خیال کی کمی، شعور کی خامی اور مسائل نقد کی ہمہ گیری سے ناواقفیت کے باوجود اس مضمون کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں ادب اور زندگی کے سماجی اور فکری رشتے کا پتہ ملتا ہے۔ ادب کی طبقاتی بنیادوں کی طرف ذہن جاتا ہے۔ اس کے افادی ہونے کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے اور ادیب کی سماجی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے معاً بعد جدید نظریات پر ترقی پسندی اور قدیم تحقیقی و تاریخی نقطہ نظر پر رجعت پسندی کے الزام تراشے جانے لگے۔ منشی پریم چند کی صدارت میں ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوئی، اور ادب کے موضوعات اور ادیب و نقاد کے فرائض و ذمہ داریوں پر بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ نظریاتی کشمکش اور مادی نقطہ نظر کی وضاحت میں کہنہ مشق ادیبوں اور نقادوں نے حصہ لیا۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری اور فراق وغیرہ نے اپنے نظریات اور ادبی موقف کی وضاحت کی۔ بہرحال اب مادیت کے فروغ اور سائنٹفک نظریات کی ترویج اور مارکسی فکر و نظر سے ادب کے تمام اصناف میں استفادہ کیا جانے لگا۔ "فن نقد" ایک تحقیقی موضوع کے علاوہ سماجی اور تہذیبی افکار و نظریات کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ موضوع سے ہٹ کر نظریہ پر ناقد کی دوربین نظریں معائب و محاسن کی جستجو کرنے لگیں۔ مغربی ادب بڑی تیزی کے ساتھ اردو ادب پر اثر پذیر ہونے لگا اور اردو کے بڑے بڑے صاحب قلم ادیبوں نے مطالعے کی ہمہ گیری اور ریاض سے نقد و نظر کے نئے زاویے تراشے۔

ہنری جیمس مین نے کہا تھا کہ تنقید کی اہمیت ادب اور زندگی کے اس فلسفے سے ہے جو تنقید میں کارفرما ہے۔ لیکن اس مسئلے پر غور کرنے سے پہلے کہ تنقید کا معیار کیا ہے کیا ہونا چاہیے، یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ درحقیقت تنقید کا اصل مفہوم کیا ہے اور اس فن کے عناصر کیا ہیں اور خصوصیت کے ساتھ اردو ادب کے مزاج پر یہ فن منطبق ہوتا ہے یا نہیں۔ ہمارے ملک کے ناقدین نے ان مسائل کی جانب بھی توجہ کی ہے اور بڑی حد تک ان حالات کا جائزہ لیا ہے اور ماحول کو سمجھنے اور غیر جانبداری پر کاربند رہتے ہوئے ان نظریات کا تجزیہ کرنے میں بھی کاوش کی ہے۔

موجودہ اردو تنقید کا ایک اہم نظریہ مارکسی نظریۂ تنقید ہے۔ ہندوستان میں اس نظریے کے سربراہوں میں سید احتشام حسین، علی سردار جعفری، سید سجاد ظہیر، اختر انصاری، خلیل الرحمن اعظمی، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ہندوستان میں ایسے ناقدین بھی ہیں جو کسی واضح نظریات کے نہ تو متبع ہیں اور نہ مادی نظریات کے خلاف۔ وہ اپنے انفرادی میلانات و تصورات پیش کرتے ہیں۔ اس صنف میں پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر معین احسن جذبی، عبدالشکور، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی وغیرہ کے نام ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

ہمارے ملک میں اردو کے تنقید نگاروں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو قدیم ہوتے ہوئے نئے دور کی رنگا رنگی میں شریک ہوتے ہیں اور اس طرح قدیم و جدید کا سنگم کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس صنف میں پروفیسر مسعود حسن رضوی، اختر علی تلہری، عبدالماجد دریابادی، سید علی عباس حسینی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

تنقیدی ادب کے ساتھ ساتھ مجھے چند ایسی شخصیتوں کا نام بھی لینا ضروری ہے جنھوں نے "زبان" کے موضوع پر بڑی دقت نظر کے ساتھ قلم اٹھایا ہے اور لسانیات پر ایک گراں قدر سرمایہ فراہم کر دیا ہے جو یقیناً تنقیدی مسائل میں زیر بحث آتا ہے اور ناقدین بھی اس سرمایہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ہندوستان میں آثر لکھنوی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر محی الدین زور کے نام خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ موجودہ تنقید نگاروں میں سب سے زیادہ دلچسپ شخصیت کلیم الدین احمد کی ہے جو ادب اور فن تنقید دونوں کے لئے ایک نگراں اور محتسب کی حیثیت رکھتی ہے۔

آخر میں پروفیسر آل احمد سرور کے ایک ریڈیو انٹرویو کا حوالہ دے دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں سرور صاحب نے اس انٹرویو میں "تنقید میں جمود ہے یا نہیں" کا جواب دیتے ہوئے کہا: "اس زمانے میں جتنی کتابیں تنقیدی موضوعات پر شائع ہوئی ہیں اتنی پہلے کبھی نہیں ہوئیں۔ پھر یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ یہ تنقیدی کتابیں شوق سے پڑھی جاتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تنقید کی مقبولیت بڑھ رہی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس دور کو بعض لوگ تنقید کا دور کہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں سیاسی اور سماجی حالات کی وجہ سے تخلیقی ادب میں کچھ انحطاط نظر آتا ہے۔ کم و بیش یہی حالات ہمارے ملک میں بھی ہیں لیکن اس کے مقابلے میں تنقید پر زیادہ توجہ کی جارہی ہے۔ اس لئے یہ کہنا تو کسی طرح صحیح نہ ہوگا کہ تنقید میں جمود ہے۔" آگے چل کر سرور صاحب نے فرمایا کہ "موجودہ تنقیدی سرمایہ سے بے اطمینانی تو میرے نزدیک ذہنی صحت کی علامت ہے لیکن یہ بات مجموعی طور پر صحیح معلوم ہوتی ہے کہ کیفیت اور کمیت دونوں کے لحاظ سے تنقید میں جمود یا سکوت کے بجائے بے چینی، تلاش، مختلف خیالات کی کشمکش اور مختلف زاویہ ہائے نظر کا تصادم ملتا ہے۔ اس کشمکش اور تصادم سے ادب کے لئے نئی نئی راہیں نکلیں گی۔"



شاہ تراب علی قلندر

(بسلسلہ صفحہ ۱۰)

ناظم جانیں تو بیت نبھائیں — شہ سے تراب نہ کچھ سنبھوی
گرو بن کون تراب لمیہرٹے — کاظم بیری کی میں بلہنار
ہاں ہاں تراب پراں توے بتیاں — کاظم شو کر موری سمتی

شاہ تراب نے ۱۸۵۸ء مطابق ۱۲۷۵ھ میں ۹۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی وفات کے بعد جو قصائد اور مراثی لکھے گئے ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ علمی، ادبی اور مذہبی لحاظ سے ان کا درجہ بہت بلند تھا اور وہ ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے۔ ذیل کے اشعار اس عقیدت و ارادت کو ظاہر کرتے ہیں جو لوگوں کو شاہ تراب سے تھی۔

ما ابد باشیم یارب زیر فرمانِ تراب — روز محشر نیز بگذاریم دامانِ تراب
زیبد از خاکِ مزارش توتیائے چشمِ من — زانکہ هستم خاکسارے از مریدانِ تراب
چون ہلال آسمانہ نعل فخر بر گردون زنم — منکہ باشم کفش بردارِ غلامانِ تراب

مولوی امجد علی امجد کاکوروی نے حسب ذیل تاریخ وفات لکھی تھی:

بیت یک تمیہ بر جستہ — نظم کردیم پئے سالِ وفات
یافت از حضرت رحمٰن و رحیم — شاہِ ایوان ولایت جنّات
۱۲۷۵ھ

ایک دوسری تاریخ مولوی محمد رضا علی صبر نے نکالی ہے۔

تراب علی شاہ صاحب کمال — شدہ سالکِ شاہراہِ بقا
بگو صبر تاریخ سالِ وصال — شدہ جاں بحق وارثِ الانبیا
۱۲۷۵ھ

۔ ۔ بچہ ۱۰۔ سنبھلے گا۔ ۱۹۔ استاد بہ زبان۔ ۲۱۔ سے ۲۲۔ سفارش



مغل فن مصوری

(بسلسلہ صفحہ)

کٹھ پتلی جیسی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں نہ تو طاقت تھی اور نہ کوئی بڑا خزانہ۔ عمارت سازی کی طرف وہ مجبوراً مائل نہ ہو سکتا تھا اور اسی لئے اس نے کم خرچ فن مصوری کی ٹوٹی پھوٹی سرپرستی کرنے کی کوشش کی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت کی سلطنت مغلیہ کی تہی دامنی کا عکس مصوری کی فنی تہی دامنی میں نظر آتا ہے۔ گو کہ تعداد کے اعتبار سے اس عہد میں بہت کافی تصویریں بنائی گئیں لیکن ان تصویروں کی بدرنگی، موئے قلم کی ناشائستگی اور کرختگی، فکر لطیف اور تخلیقی صلاحیت کا فقدان اس عظیم اسکول کے خاتمے کے غماز ہیں۔

غزلیات

قیس رامپوری

سناؤ ذکرِ بہاراں کچھ ان قرینوں سے
دھواں سا اُٹھنے لگے وحشیوں کے سینوں سے

ٹھہر گئی جو کہیں نبضِ گردشِ دوراں
تو قہقہے سے ڈھلے غم کے آبگینوں سے

لہو میں ڈوبنے والے نہ بہا سکے تو پھر
حیات ہنس کے ملی مے کدہ نشینوں سے

یہ مانتا ہوں کہ دنیا ہے مائلِ جدت
مگر یہ دل نہیں ڈھل سکتے ان مشینوں سے

وہ آنکھ جس نے بہکنے کا حوصلہ بخشا
وہ آنکھ مل گئی خود جا کے عیب بینوں سے

نہ جانے کون رہِ گلستاں سے گزرا ہے
کہ تر بتر ہیں سب اوراقِ گل پسینوں سے

جنابِ قیس زمانے کی دوستی پہ نہ جاؤ
سنا ہے سانپ نکلتے ہیں آستینوں سے

افسر آذری

وفا کے تلخ تریں امتحاں سے گزرے ہیں
اُٹھی ہیں انگلیاں ہم پر جہاں سے گزرے ہیں

ہمیں تو دیکھ کہ کس شانِ بے نیازی سے
نگارخانۂ شیشہ گراں سے گزرے ہیں

کبھی کبھی تری یادوں کے ہاتھ تھامے ہوئے
گماں یہ گزرا ہے ہفت آسماں سے گزرے ہیں

ترے فراق میں ایسا بھی وقت آیا ہے
جب اپنے شعر بھی دل پہ گراں گزرے ہیں

جہانِ دل بھی عجب اک جہان ہے افسر
نہ جانے کتنے جنازے یہاں سے گزرے ہیں

عطاء الرحمٰن ارشد

رنگینیٔ گل، آبِ گہر بانٹ رہا ہوں
زخمِ جگر و دیدۂ تر بانٹ رہا ہوں

زلفوں کے تموّج میں تھے جو ذکرِ جبیں گم
لے حسن وہی شام و سحر بانٹ رہا ہوں

ہر حسرت و اُمید کی تقدیر پہ رویا
یا شبنم و انجم گہر بانٹ رہا ہوں

منزل کے بہت رستے ہیں آؤ تو سرِ دار
ذوقِ سفر و راہ گزر بانٹ رہا ہوں

یہ تارے مرے جامِ شکستہ کے ہیں ذرّات
اے ظلمتِ شب! نورِ سحر بانٹ رہا ہوں

تلخابۂ لمحات سے لب ریز خمِ زیست
پیمانۂ خورشید و قمر بانٹ رہا ہوں

ارشاد یہ اشعار ہیں جذبات کی تشہیر
یا طرزِ فغاں، سوزِ جگر بانٹ رہا ہوں

نیا موڑ

پرشوتم سنگھ سیٹھی

اندرا اپنی بہن شیلا کا خط ملے جلے جذبات سے پڑھ رہی تھی۔ کبھی وہ ہنس دیتی اور کبھی سنجیدہ ہو جاتی تھی۔ خط نے اندرا کو خوش اس لیے کیا تھا کہ وہ جاڑوں کی چھٹیوں میں کالج بند ہونے کے بعد گھر آ رہی تھی۔ فکرمند یوں تھی کہ جس اندیشہ کا اس نے ذکر کیا تھا اس اندیشہ سے شیلا اور ونود کو وہ بچا نہیں سکتی تھی کیونکہ شیلا کا بہنوئی یعنی اندرا کا شوہر ڈاکٹر منوہر لعل ڈوب ڈوب کر ابھرتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ شیلا اور ونود کی موجودگی میں وہ گھر آ جائے۔ اگر وہ آ گیا تو اندرا اُسے گھر آنے سے روک بھی نہیں سکتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اندرا خط پڑھ چکی تو اس نے لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ نظریں سامنے پھیلے ہوئے ان کھیتوں کی طرف اٹھ گئیں جہاں سرسوں کے نازک پیڑوں میں اب گہرے پیلے رنگ کے پھول کھل چکے تھے۔ وہ ان پھولوں کو گھنٹوں دیکھا کرتی تھی۔ مگر یہ پھول اس کی اپنی زندگی میں رنگینیاں بکھیرنے کے بجائے اُس مایوسی اور اُداسی کا زرد رنگ اور گہرا کر دیتے تھے جو کوشش کے بعد بھی اندرا اپنی شادی شدہ زندگی سے اب تک دور نہیں کر سکی تھی اور شاید دور کبھی نہیں کر سکتی تھی۔

اندرا کی اُٹھتی ہوئی نگاہوں میں کل تک ہر طرف محبت کے سرخ پھول کھلا کرتے تھے۔ محبت یہی کرتی ہے۔ اُسے اپنی جوانی میں سرخ پھولوں سے بڑا پیار ہوتا ہے۔ اندرا کو بھی وہ سرخ پھول یاد تھے اس لیے کہ اُسے اپنی محبت کا وہ زمانہ اب تک یاد تھا جب وہ خود محبت کے ایک سرخ پھول کے سوا اور کچھ نہیں تھی اور منوہر اُس پھول کا بھونرا تھا۔ صبح شام وہ اس پھول کے ارد گرد چکر لگاتا رہتا اور محبت کے گیت گنگنایا کرتا تھا۔ اس وقت منوہر صرف منوہر تھا، ڈاکٹر نہیں تھا۔ اندرا کی ملاقات منوہر سے اچانک پکنک میں ہو گئی تھی۔ تعارف نے دونوں کو ایک دوسرے سے شناسا کیا تھا۔ بعد میں اُبھرتی ہوئی محبت نے دونوں کو ایک دوسرے کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ پھر اندرا اور منوہر نے ایک دوسرے کی محبت کی قسم کھائی تھی۔ اس قسم کو پورا کرنے کے لیے دونوں نے شادی کی تھی لیکن شادی کے بعد محبت نے منوہر کو فرض کی ڈگر بھی دکھا دی اور وہ اسی پر چل پڑا تھا۔

منوہر ڈاکٹر بنا تو شہر کے بجائے دیہات چلا گیا جہاں بہ قول اس کے بیماریاں ہی بیماریاں تھیں۔ وہ ڈاکٹر تھا اور ڈاکٹر کو اپنا انسانی فرض پیارا ہونا چاہیے۔ منوہر میں فرض کا یہ احساس پوری طرح پایا جاتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر ہر ہندوستانی کو تندرست اور صحت مند دیکھنا ہے تو ڈاکٹروں کو دیہات کا رُخ کرنا چاہیے مگر اندرا کو شہر پسند تھا۔ وہ ایک شہر میں پڑی بڑھی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ منوہر بھی شہر میں رہے لیکن ڈاکٹر منوہر نے بیوی کی یہ بات نہیں مانی اور شہر چھوڑ دیا۔ اسے بیمار بلا رہے تھے۔ ڈاکٹر منوہر دیہات سے کبھی کبھی شہر بھی آ جاتا تھا مگر اندرا اس زندگی سے خوش نہ تھی۔ منوہر یہ سمجھتا تھا مگر اپنی بیوی سے بے انتہا محبت کرنے کے باوجود وہ دیہات والوں کی خدمت سے باز آنے کے لیے تیار نہ تھا۔

اندرا نے پھر لمبی سانس لی اور اُسے سرسوں کی نازک بالیاں رقص

کرتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ سوچنے لگی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شیلا اور ونود کی موجودگی میں منوہر بھی آجائے اور شیلا کی یہ آزادی اُسے ناپسند ہو۔ اسی اندیشہ کے ماتحت شیلا نے لکھا تھا کہ ونود کی موجودگی میں اگر منوہر گھر آگئے تو اسے یقین ہے کہ اس کی محبت کا پھول سوکھ جائے گا اس لیے کوشش یہ کیجئے کہ وہ ان دنوں گھر نہ آئیں اور ان کی ملاقات ونود سے فی الحال نہ ہو تو بہتر ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اندرا اس خطرے کو کیسے روک سکتی تھی؟ رات کو اسی لیے وہ گہری نیند سے محروم رہی۔ صبح ہی دل دھڑکتا رہا اور شام کو جب وہ شیلا اور ونود کو لینے اسٹیشن گئی تو فکرمند تھی۔ لیکن یہ فکر ونود سے ملنے کے بعد خود بخود دور بھی ہو گئی کیونکہ اندرا نے ونود کی آنکھوں میں شیلا کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والی محبت دیکھ لی تھی۔ ونود ایک بڑے کارخانہ دار کا لڑکا تھا۔ اُسی کالج میں پڑھتا تھا جہاں شیلا پڑھتی تھی مگر سرمایہ دار ہونے کے باوجود اُس کے دل میں وطن کا درد تھا۔ گاؤں کے رہنے والوں سے اُسے خاص طور سے ہمدردی تھی اور اپنے ساتھیوں سے جن میں شیلا بھی تھی، وہ ان کے مسائل پر بحث کیا کرتا تھا۔ ونود پڑھنے لکھنے میں بھی اچھا تھا اور تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیتا تھا۔ شیلا بھی ان مقابلوں میں حصہ لیا کرتی تھی۔ اس طرح دونوں میں دوستی بڑھتی گئی اور دونوں نے حصولِ تعلیم کے بعد شادی کا قول و قرار بھی کر لیا۔ شیلا کے والد ایک اعلیٰ عہدے دار اور آزاد خیال آدمی تھے لیکن شیلا کو ابھی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ ان کے سامنے اپنے فیصلہ کا اعلان کر سکے۔ ہاں، بڑی بہن کو اُس نے اپنے راز سے ضرور مطلع کر دیا تھا۔ اور جب ایک چھٹی پڑی تو اُس نے بہن کو لکھا کہ وہ اُس کے یہاں آرہی ہے اور ونود بھی ساتھ آئے گا۔

اندرا ان دونوں کے آنے سے بہت خوش تھی۔ صرف اس لیے نہیں کہ اُس کی تنہائی کچھ دنوں کے لیے ختم ہو گئی تھی بلکہ اس لیے بھی کہ منوہر کے آنے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ونود کو دیکھ کر اُس پر بڑا اچھا اثر پڑا تھا۔ شرافت اس کے چہرہ سے ٹپک رہی تھی!

دوسرے دن اندرا نے شیلا سے تنہائی میں پوچھا: "ونود کے پتا کیا کرتے ہیں؟"

"ونود کے پتا کی کئی ملیں ہیں۔ دولت اتنی ہے کہ گنی نہیں جا سکتی!"

شیلا نے جواب دیا۔

"لیکن وہ تو کھدر پہنتا ہے۔" اندرا نے دریافت کیا۔ ونود کو کھدر کے کرتے پائجامے اور چپل میں دیکھ کر اندرا کو بڑی حیرت تھی۔

"بات یہ ہے دیدی کہ ونود بڑے گھر میں پیدا ہونے کے بعد بھی بہت سادہ طبیعت کا ہے۔ اُسے دیہات بہت پسند ہے۔ گاؤں کے رہنے والوں سے اُسے بڑی ہمدردی ہے اور وہ اکثر ان کی غریبی، مفلسی، بیماری اور جہالت کے بارے میں باتیں کیا کرتا ہے۔ بعض وقت تو مجھے ایسی باتوں سے اُلجھن ہونے لگتی ہے اور میں اُس سے بگڑ جاتی ہوں۔"

"نہیں۔ ہر بات پر غصہ کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔" اندرا نے سمجھایا۔

شیلا جواب دینا چاہتی تھی کہ ونود ہنستا ہوا آگیا اور اندرا سے کہنے لگا: "دیدی گھر کے مالک کہاں ہیں؟"

"دیدی اس گھر کی مالک ہیں۔" شیلا نے جھٹ سے جواب دیا۔

"میں دیدی سے پوچھ رہا ہوں، شیلا، وہی جواب دیں گی۔"

اندرا نے اس خیال سے کہ شیلا ونود کو سخت سست نہ کہہ دے کہنے لگی: "منوہر دیہات میں ہیں۔"

"انھیں بلائیے۔ ملنے کو جی چاہتا ہے۔"

"وہ نہیں آسکتے۔ میں نے یہی شرط لگائی تھی کہ تم ڈاکٹر منوہر سے نہ ملنا۔ بھول گئے ونود؟" شیلا نے فوراً کہا۔

"تمھاری شرط کی بنیاد ہی سمجھ میں نہیں آئی شیلا۔ پھر ملنے میں کیا برائی ہے؟" ونود نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ جو شخص میری دیدی کو خوش نہ کر سکے اس شخص سے میں محبت نہیں کر سکتی۔" شیلا نے سخت لہجہ میں کہا۔

"اس کا جواب دیدی دے سکتی ہیں نہ کہ تم؟" ونود نے ہنستے ہنستے کہا۔

قبل اس کے کہ شیلا جواب دے اندرا نے ہنستے ہوئے کہا: "چلو ونود ناشتہ کرو۔ آج باہر نہیں جانا ہے؟"

"آج آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں دیدی۔" ونود نے کہا۔

"میں کہاں جاؤں گی ونود؟" اندرا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں ضرور لے جاؤں گا!" ونود نے کہا: "اس لیے کہ گھر پر آپ اُداس رہتی ہیں۔ آج ہمارے ساتھ چلئے۔"

"اچھا! چلو پہلے ناشتہ تو کرلو۔" اندرا نے جواب دیا۔

"چلیئے!"۔۔۔ ونود نے کہا اور ناشتے والے کمرے میں چلا گیا۔

ونود اور شیلا کے ساتھ اندرا بھی گئی لیکن کھانے کے بعد وہ یہ کہہ کر چلی آئی کہ اسے گھر کا کام کاج دیکھنا ہے۔ شیلا اور ونود کیرم کھیلنے لگے۔ اندرا کو ونود بہت پسند آیا تھا اسی لیے وہ ونود کو ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سہ پہر کو اندرا بال بنا رہی تھی کہ اچانک ایک موٹر آکر رکی۔ آئینے گھبرا کر دیکھا تو اُس کا شوہر کھڑا ہنس رہا تھا۔ اندرا کچھ گھبرا سی گئی مگر منوہر نے اندرا کے قریب آکر اور مسکرا کر پوچھا۔

"کیا بات ہے اندرا! تم پیلی کیوں ہو رہی ہو؟"

"بیٹھیئے میں آپ کے لیے ناشتہ لاتی ہوں۔" اندرا نے جلدی سے کہا۔

ناشتہ کے بعد جب منوہر نے بیوی کو پریشان دیکھا اور ٹوکا تو اندرا نے شیلا اور ونود کی آمد کا حال بتایا۔ اونچ نیچ سمجھائی اور کہنے لگی کہ ونود کی موجودگی میں ہم دونوں میں کوئی جھگڑا نہ ہونا چاہیے اور اُس پر یہی ظاہر ہونا چاہیے کہ ہم لوگ اپنی اس زندگی سے بہت خوش ہیں۔

منوہر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم یہ ریہرسل چاہتی ہو جبکہ میں زندگی کا اصلی ناٹک کھیلنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم سے آج بھی اتنی ہی محبت ہے جتنی پہلے تھی۔ فرق یہ ہے کہ محبت کے دو اداکار ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ایک شہر میں ہے دوسرا دیہات میں۔ دونوں یک جا ہو جائیں تو زندگی کا ناٹک شروع ہو جائے۔ لیکن تم اگر یہ چاہتی ہو کہ ہم لوگ صرف ریہرسل کریں تب بھی میں اس کے لیے تیار ہوں کیونکہ ریہرسل کرتے کرتے اداکار زندگی کا اصلی ناٹک بھی شروع کر دیتے ہیں۔"

شام کو جب شیلا اور ونود شہر گھوم کر گھر آئے تو دونوں یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ اندرا اور منوہر باغیچہ میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ ونود کو شیلا نے منوہر اور اندرا کے متعلق جو کچھ بتایا تھا اُسے ونود کی آنکھیں غلط دیکھ رہی تھیں۔ شیلا کا یہ کہنا غلط ثابت ہو رہا تھا کہ دیدی اور جیجا میں اَن بَن ہے۔

ونود کی ملاقات ڈاکٹر منوہر سے ہوئی اور پھر ہر وقت ہونے لگی۔ ونود کی نظر میں منوہر نہ صرف کامیاب ڈاکٹر تھا بلکہ محبت کرنے والا شوہر اور فرض سے بھرپور انسان بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ونود ڈاکٹر منوہر کو بہت پسند کرنے لگا تھا، جبکہ شیلا اپنے بہنوئی کو شک کی نظروں سے ہی دیکھ رہی تھی۔ ونود اور شیلا میں منوہر کے بارے میں بحث بھی ہونے لگی۔ ونود ڈاکٹر منوہر کی تعریف کرتا تھا اور شیلا اُس کی مذمت کرتی تھی۔ باتوں باتوں میں شیلا، ونود سے بگڑ بھی جاتی تھی۔

ایک دن جب سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے تو ونود نے ہنستے ہوئے کہا: "آج سب لوگ جمع ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا فیصلہ بھی اس وقت سنا دیا جائے تو اچھا ہو۔" اور یہ کہہ کر اُس نے شیلا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔

"شیلا کا کیا فیصلہ ہے، یہ تو تم سمجھتے ہی ہو گے؟" منوہر بول اٹھا۔

شیلا نے اس پر قدرے ناراض ہو کر کہا: "جیجا جی، فیصلہ مجھے کرنا ہے اور کل صبح میں فیصلہ کا اعلان کر دوں گی۔"

مگر دوسرے دن شیلا کا یہ فیصلہ سن کر کہ وہ ونود سے شادی نہیں کر سکتی سب کو حیرت ہو گئی۔ ونود کی آنکھوں میں تو آنسو آ گئے۔ شیلا کے فیصلہ نے دراصل سارے گھر کو اُداس کر دیا تھا اس لیے اور بھی کہ ونود جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

"میں ونود سے گفتگو کرتا ہوں شاید کوئی نیا رُخ نکل آئے۔" ڈاکٹر منوہر نے اندرا سے الگ کہا۔

یہ کہہ کر وہ اوپر چلا گیا اور کئی گھنٹے وہ ونود سے باتیں کرتا رہا۔ شام کی چائے پر ونود بھی موجود تھا اور شیلا بھی۔ لیکن وہ ونود سے دور دور نظر آ رہی تھی۔ اچانک شیلا نے ونود کی طرف دیکھا اور خشکی سے پوچھا:

"گاڑی کا وقت ہو گیا ہے۔ کب تک باتیں کرتے رہوگے۔ جاؤ گے نہیں؟"

"اچھی جگہ آکر اور اچھے لوگوں سے مل کر جانے کو جی نہیں چاہتا شیلا!" ونود نے مسکرا کر نرمی سے کہا۔

"یہاں کب تک رہنے کا ارادہ ہے؟" شیلا نے گھبرا کر ونود کو دیکھا۔

"ہمیشہ!" ونود نے ہنس کر کہا: "تمھاری محبت نے مجھے دھتکار دیا

لیکن ایک اور محبت ایسی ہے جو میرا دامن پکڑے ہے۔"

"وہ کون سی محبت ہے؟"

"ہندوستان کی محبت — جسے سب حبّ الوطنی کہتے ہیں!"

ڈاکٹر منوہر نے اب زبان کھولی اور ہنس کر کہا:

"غصہ نہ کرو شیلا بات کو سمجھو۔ دنود نے تم سے محبت کی اور تمھاری محبت نے دنود کو وطن کی محبت سے بھی آشنا کر دیا۔ محبوبہ کی محبت عارضی ہو سکتی ہے لیکن وطن کی محبت ہمیشہ گلے لگائے رہتی ہے۔ تم نے دنود کو ٹھکرا دیا لیکن وطن کی محبت اپنے دنود کو ٹھکرائے گی نہیں۔"

"میں اسی لیے دنود سے نفرت کرنے لگی تھی کیونکہ میں دیکھ رہی تھی کہ آپ اسے بہکا رہے ہیں اور وہ آپ کے جال میں پھنس رہا ہے۔ میرا شک غلط نہیں تھا۔"

"جال تو تم نے پھیلایا تھا شیلا نہ کہ ڈاکٹر صاحب نے!" دنود نے سنجیدگی سے کہا: "ڈاکٹر منوہر نے جس محبوبہ سے مجھے متعارف کرایا ہے وہ مجھے کبھی اپنے سے جدا نہ کرے گی۔"

"جیجا کی باتوں میں نہ آؤ دنود! انھوں نے میری بہن سے کبھی محبت نہیں کی۔ انھیں وطن سے بھی محبت نہیں ہے۔"

"شیلا! تم دھوکے میں ہو۔ مجھے اپنے شوہر سے محبت ہے اور منوہر کو مجھ سے محبت ہے۔" اندرا نے جواب تک خاموش تھی کہا۔

"یہ سب جھوٹ ہے۔" شیلا نے کہا۔

"کل تک واقعی یہ سب کچھ جھوٹ تھا۔ تمھاری اور دنود کی خاطر ہم دونوں نے عارضی صلح کی تھی۔ ہم نے ایک جھوٹا ڈرامہ کھیلا تھا تاکہ تم پر اور دنود پر ہمارے ریہرسل کا اچھا اثر پڑے اور تمھاری زندگی سنور جائے۔ لیکن ریہرسل کرتے کرتے ہم دونوں پھر ایک دوسرے کے دلوں میں پہنچ چکے ہیں۔ محبت کے ڈرامہ کا ریہرسل بھی بڑا مبارک ہوتا ہے!"

"ریہرسل کرتے کرتے اندرا نے مجھے سمجھ لیا۔ اب وہ میرے ساتھ گاؤں میں رہے گی۔ وہاں ہم اسکول کھولیں گے جہاں تعلیم کی بڑی ضرورت ہے۔ میں ایک بڑا اسپتال کھولوں گا اور بیماریوں کے خلاف اعلانِ جنگ کروں گا۔ ان نیک کاموں میں دنود ہمارا ساتھ دے گا۔" ڈاکٹر منوہر نے ہنستے ہوئے کہا:

"سارا خرچ میرے ذمہ ہوگا۔ اندرا دیدی اور ڈاکٹر منوہر کا یہ ریہرسل واقعی بڑا مبارک ثابت ہوا۔" دنود فوراً بول اٹھا۔

"مبارک تو اس وقت ہوتا جب اس کا اثر شیلا پر پڑتا۔" منوہر نے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ شیلا بھی محبت کے اس اصلی ڈرامے میں جو اب شروع ہو رہا ہے اپنا پارٹ ادا کرے گی۔" اندرا بولی۔

"شیلا!" اندرا نے اسے محبت سے گلے لگاتے ہوئے کہا: "کیا تم ہمارا ساتھ نہیں دوگی؟ اب تو تمھاری دیدی کو بھی محبت کی چھاؤں مل گئی؟ تم اپنے جیجا سے کیا اب بھی ناراض رہوگی؟"

"شیلا! محبت کی دنیا برباد نہ ہونے دو۔ یہ اجڑ گئی تو پھر اس کا بسنا مشکل ہے۔" دنود نے کہا۔

"شیلا! محبت کرو۔ اس لیے کہ وطن کو بھی تمھاری ضرورت ہے۔" منوہر بڑے پیار سے بولا۔

"دنود کو اور ہم سب کو تمھارا انتظار ہے شیلا!" اندرا نے کہا۔

شیلا اچانک اٹھی اور بھاگ کر باہر چلی گئی اور باہر جاکر گانے لگی — اس کی آواز اس کے دل کی مسرتوں کو بکھیر رہی تھی۔ اس کا گیت فضاؤں کو رقص کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ خود گا رہی تھی اس کے ساتھ اس کی محبت بھی گا رہی تھی۔ منوہر اور اندرا نے مسکرا کر دنود کی طرف دیکھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے دونوں کو دیکھا اور باہر چلا گیا جہاں شیلا کا گیت اسے کب سے بلا رہا تھا۔ دنود کے جاتے ہی ڈاکٹر منوہر نے مسکرا کر اندرا کی طرف دیکھا اور اندرا نے ہنس کر آنکھیں جھکا لیں۔ محبت کہاں نہیں تھی!؟

غزل

نجیب رامش

گلشن میں اک سوالِ مجسّم بنی ہوئی — آئی ہے پھر بہار تجھے پوچھتی ہوئی
ڈر ہے کہیں نگاہ کی منزل بدل نہ جائے — اب تک بھی ہے تیری ہی جانب لگی ہوئی
اس دورِ خود فریب میں انسان کی حیات — جیسے ہوا کے چراغ کی لَو کانپتی ہوئی
اے زلفِ یار! تجھ سے شکایت نہیں مگر — دل پہ ہے کربِ گردِ تمنا جمی ہوئی
شرم اے نگاہِ ناز! تری بزم سے ہمیں — اک زندگی ملی تو شبِ غم بنی ہوئی
ہم آج کہہ اُٹھے تو گنہ گار ہو گئے
تیری گلی تو کب سے ہے مقتل بنی ہوئی

ساجن بھارتی

شیشہ آیا ہے، جام آیا ہے — زندگی کا پیام آیا ہے
بعدِ مدت پیام آیا ہے — جذبۂ شوق کام آیا ہے
جو مناسب ہو وہ سزا دیجے — آپ کا لب پہ نام آیا ہے
ذوقِ تکمیلِ آرزو لے کر — آج اک تشنہ کام آیا ہے
پھر تصور میں جلوہ گر ہیں وہ — ذوقِ نظارہ کام آیا ہے
خیر مقدم کیا ہے منزل نے
وہ بھی ساجن مقام آیا ہے

حسنین شرر

دل کو لازم خلش دیدۂ گریاں کے قریب — کہیں ملتا ہے سکوں خنجرِ عریاں کے قریب
خندہ زن وہ ہیں مرے دل کی زبوں حالی پر — آج خرمن ہے مرا شعلۂ رقصاں کے قریب
سبز ہو کے قلم شاخِ تمنا میری — دل نے پایا ہے سکوں خنجرِ براں کے قریب
میں ہوں بیمارِ وفا، فکر نہ کر اے دنیا! — شوق لایا ہے مجھے نشترِ مژگاں کے قریب
میں کوئی گل تو نہیں فصلِ بہاراں میں تلا — خار رہ رہ کے کھٹکتا ہے رگِ جاں کے قریب
یہی ملتا ہے شررؔ شمع سے پروانے کو
بڑھ گئی دل کی جلن منزلِ جاناں کے قریب

اثر الہ آبادی

قفس میں آ کے ملا تھا ذرا قرار مجھے — چمن سے آنے لگی دعوتِ بہار مجھے
شکایتِ ستمِ دوراں ہے ناگوار مجھے — ستائے جو نہیں آلامِ روزگار مجھے
میں خود ہی اپنے گناہوں پہ سخت نادم تھا — ترے کرم نے کیا اور شرمسار مجھے
ہر ایک بات نے ہر شے سے کر دیا مجبور — کسی نے دے کے بظاہر سب اختیار مجھے
جہاں سے شیخ و برہمن گزر سکیں دونوں — وفا کی راہوں کو کرنا ہے استوار مجھے
خزاں کی گود میں پل کر جواں ہوا ہوں اثرؔ
نہ راس آئے گی رنگینیٔ بہار مجھے

اُتّر پردیش شاہ راہِ ترقی پر

۵۶۰ مواضعات میں غذائی اسکیم کا آغاز ــــــ تیسرے منصوبے کے تحت اتر پردیش کی صنعتی ترقی ــــــ ماڈل جیل لکھنؤ میں کمبلے بنانے کی صنعت ــــــ قیدیوں کو نئے کام سکھانے کی تربیت ــــــ دیہی علاقوں کے لیے سستے پائخانے ــــــ ضلع مرزاپور میں ایک نئی بستی ــــــ آگرہ، الٰہ آباد اور وارانسی میں بجلی کے کنکشن کے نئے احکام ــــــ مخلوط بیسک اسکولوں کے لیے ۵۰۰ اسکول ماتائیں ــــــ عورتوں اور بچوں کے رضاکار ادارے حکومت کی نگرانی میں ــــــ یتیم خانوں کا قانون ۱۹ ضلعوں میں نافذ ــــــ بس کے مسافروں پر ٹیکس ــــــ متفرقات

حکومت اتر پردیش نے صحت بخش غذا کی ایک جامع اسکیم چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا مقصد دیہی عوام کو عملی طور پر ان طریقوں سے روشناس کرنا ہے جو صحت بخش غذا کی پیداوار کے لیے ضروری ہیں۔ ان کو اس کا استعمال بھی بتایا جائیگا اور کوشش کی جائے گی کہ وہ اس معاملہ میں خود کفیل بن سکیں۔

یہ اسکیم حالی سال رواں میں ۲ اکتوبر سے ۲۲ اضلاع کے ۲۸ بلاکوں کے ۵۶۰ منتخب مواضعات میں نافذ ہوگئی ہے۔ ہر بلاک میں ۲۰ گاؤں ہیں۔ آئندہ دو برسوں میں ۱۶۸۰ مزید مواضعات اس میں شامل ہو جائیں گے۔ ان ۲۸ بلاکوں میں مجموعی طور پر ۳۰۴۷ مواضعات ہیں جن کا رقبہ ۲۶۰۴۳۶ مربع میل اور آبادی ۱۹۰۴۴۰۴ ہے۔

اسکیم کا اصل مقصد غذا سے متعلق تعلیم و تربیت کے ایک مربوط اور جامع پروگرام کو بتدریج ترقی دینا ہے تاکہ قوت بخش غذائی اشیا مثلاً دودھ، پھل اور ترکاریوں انڈوں اور مچھلیوں کی پیداوار سے مقامی غذائی حالات بہتر بنائیں جا سکیں۔

ان بلاکوں کے نام درج ذیل ہیں۔

کلیان پور (کانپور)، متھرا (متھرا) چاکا (الٰہ آباد) بخشی کا تالاب (لکھنؤ) آصف پور (بدایوں) بلند شہر (بلند شہر) بیچ پوری (آگرہ) بڑوت (میرٹھ) پرگاؤں (جھانسی) دوہری گھاٹ (اعظم گڑھ) بارہ پور (فرخ آباد) سودا (فیض آباد) غازی پور (غازی پور) چرگاؤں (گورکھپور) بہادر آباد (سہارنپور) بہادر پور (الٰہ آباد) کالاکنکر (پرتاپ گڑھ) لکھنا (اٹاوہ) لکھنتی (بلند شہر) رام پور منہار (سہارن پور) پرتاپ گڑھ (پرتاپ گڑھ) پوڑی (پوڑی گڑھوال) رودر پور (نینی تال) مین پوری (مین پوری) چراغ گاؤں (وارانسی) تنکوہی (دیوریا) ہوال باغ (الموڑہ) اور لونی (میرٹھ)۔

اس اسکیم کے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے آخر تک ۲۰۱ لاکھ روپیہ خرچ کرنے کی تجویز ہے۔ سال رواں کے دوران ۵۰۰۰۰ روپیہ خرچ ہوگا۔ یو۔ این۔ آئی۔ سی۔ ای۔ ایف تعلیم کے ذرائع اور ضروری ساز و سامان فراہم کرے گی۔

اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دو میڈیکل افسران اور ایک ماہر غذا کی تقرری کی گئی ہے۔

یہ پروگرام گرام سیویکاؤں، گرام سیویکاؤں اور سیویکاؤں کے تربیتی مرکزوں نیز زراعت اور دوسرے محکموں کے تعاون سے آگے بڑھایا جائیگا۔

تربیتی اداروں کے نصاب میں انسانی غذا سے متعلق ۳۰ گھنٹے کی علمی اور عملی تعلیم کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے۔

مرغی پالن کے بہتر طریقوں کو پھیلانے کے خیال سے ان اداروں کے تربیت پانے والوں کو چوزے نکالنے کی مشینوں اور دوسری چیزوں کا استعمال بھی بتایا جائیگا۔

سال رواں میں ۱۶ بلاکوں میں مرغی پالن کے واحدے قائم کیے جائیں گے۔ ہر واحدے میں ۱۰۰۰ مرغیاں ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے فی مرغی کے حساب سے اور ۱۲۰۰۰ انڈے ۱۹ نئے پیسے فی انڈہ کے حساب سے تقسیم کرنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔

مچھلی پالن کی ترقی کے لیے مچھلی پکڑنے والوں کی تربیت دینے کے علاوہ

پنچایتوں کو قرضے، فنی اصلاح اور مچھلی کے بچے بھی فراہم کیے جائیں گے۔ اس کے بعد پنچایتوں پر یہ لازم ہوگا کہ وہ ہونے والی ماؤں اور دودھ پلانے والی ماؤں اور قبل از اسکول تعلیم پانے والے بچوں کو مہلا سمیتوں کے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق مفت مچھلیاں فراہم کرتا ہوں گی۔ سال رواں میں ایک ہزار ایکڑ میں مچھلیاں پالنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

دودھ کی پیداوار بڑھانے کے لیے یہ تجویز ہے کہ زیادہ چارہ مہیا کیا جائے اور دودھ دینے والے مویشی خریدنے کے لیے بلاکوں میں تقاوی قرضے دیے جائیں۔ سال رواں میں دودھ کی پیداوار کا نشانہ دس لاکھ پاؤنڈ مقرر کیا گیا ہے۔

اسکول کے باغوں کی ترقی کے لیے پنچایتوں سے کہا جائے گا کہ وہ ہر اسکول کے باغ کے لیے ایک ایکڑ تک زمین دیں۔ ان باغوں میں ایسے پھل اور ترکاریاں پیدا کی جائیں گی جن کی غذائی اہمیت زیادہ ہو۔ اسکول ٹیچر کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ باغات کی مناسب دیکھ بھال رکھے۔ ان باغوں کی پیداوار اسکول کے بچوں کے استعمال میں لائی جائے گی۔ اسکول ٹیچروں اور نوجوان رہنماؤں کو باغبانی کی مختصر تربیت دی جائے گی۔

بہتر غذائیت کے پیغام کو گھر گھر پہنچانے کے لیے پبلسٹی کے نظامی اور سماجی وسیلوں سے بھی کام لیا جائے گا۔

تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے دوران میں اترپردیش کی صنعتی ترقی کے لیے مزید ایک ہزار ایم۔ ڈبلیو بجلی کی ضرورت ہوگی۔

ریہاند بجلی کے چالو ہو جانے سے اترپردیش میں بجلی کی صورت حال بہتر ہو جائے گی۔ ہردوار گنج میں تھرمل سٹیشن کے چالو ہو جانے سے گنگا شاردا سسٹم میں بھی مزید ۱۱۳ ایم۔ ڈبلیو بجلی دستیاب ہو گئی ہے امید کی جاتی ہے کہ تیسرے منصوبہ کے اختتام تک ریاست کی صنعتی ترقی میں بجلی کی کمی کی وجہ سے رکاوٹ نہیں پڑے گی۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان علاقوں میں جہاں گنگا شاردا سسٹم کے ذریعہ بجلی سپلائی کی جاتی ہے موجودہ منصوبہ کے پہلے تین برسوں میں بجلی کی پیداوار ضروریات کے لیے ناکافی ہوگی لیکن سن ۶۵-۱۹۶۴ء سے جب کہ جمنا ہائیڈل پروجیکٹ کے چالو ہو جانے کی توقع ہے اور ۲۰ ایم۔ ڈبلیو کی پیداواری صلاحیت کے ہردوا گنج اسٹیم پاور اسٹیشن کا دوسرا مرحلہ مکمل ہو جائے گا بجلی کی پیداوار ضرورت سے تقریباً ۱۲ ایم۔ ڈبلیو فاضل ہوگی لیکن بڑھتی ہوئی مانگوں کی وجہ سے بجلی ضرورت سے پھر ۲۵ ایم۔ ڈبلیو کم ہو جائے گی۔ کانپور اور شاردا پاور سسٹم کو ریہاند سسٹم کو ملانے سے یہ کمی پوری کی جا سکے گی۔ اوبرا ہائیڈل اور تھرمل پاور اسٹیشنوں کے چالو ہو جانے سے سن ۶۶-۱۹۶۵ء سے تیسرے منصوبہ کے اختتام تک بجلی کی پیداوار ضرورت سے ۶۳ ایم۔ ڈبلیو فاضل ہوگی۔

کانپور پاور سسٹم کے علاقہ میں بجلی کی کمی رہنے کا امکان ہے لیکن سن ۶۵-۱۹۶۴ء میں ۲۰-۳۰ ایم۔ ڈبلیو کے دو سیٹوں کے چالو ہو جانے سے یہ کمی دور ہو جائے گی اور تقریباً ۴۳ ایم۔ ڈبلیو فاضل بجلی دستیاب ہوگی۔

امید کی جاتی ہے کہ سن ۶۴-۱۹۶۳ء سے ماتاٹیلہ ہائیڈل بجلی گھر ضرورت سے ۴ ایم۔ ڈبلیو فاضل بجلی پیدا کرے گا۔ اور سن ۶۶-۱۹۶۵ء میں بھی تقریباً ۲ ایم۔ ڈبلیو بجلی فاضل ہوگی۔

بجلی کی کل ضروریات میں سے بھاری درمیانی اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے لیے تقریباً ۱۶۹ ایم۔ ڈبلیو بجلی کی ضرورت ہوگی اور موجودہ بھاری صنعتوں کی توسیع کے لیے تقریباً ۵۲ ایم۔ ڈبلیو بجلی کی ضرورت پڑے گی۔

بھاری صنعت منصوبہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں جس کی بنیاد پر ریاست کا تیسرا منصوبہ بنایا گیا ہے ایسی بڑی اور درمیانی اور چھوٹی صنعتوں کا ذکر کیا ہے جن کا قیام نفع بخش ثابت ہو سکتا ہے۔ ان میں کاغذ، چینی مٹی کے برتن، پلاسٹک، کیمیاوی کھاد، بھاری کیمیاوی اشیا، الیکٹریکل، میکنکل، خام دھات کو صاف کرنے، پھر ٹسکر کپڑا، پریسزن انسٹرومنٹس اور سیمنٹ کی صنعتیں شامل ہیں۔

آئندہ چند برسوں میں پیری ضلع مرزا پور کے نزدیک المونیم فیکٹری کے لیے ۵۵ ایم۔ ڈبلیو کانپور میں قائم کیے جانے والے مرکب دھات اور اسپشل اسٹیل پلانٹ کے لیے ۲۰ ایم۔ ڈبلیو کانپور کی ریہان فیکٹری کے لیے ۴،۴ ایم۔ ڈبلیو سودی نگر ریہان فیکٹری کے لیے ۶ ایم۔ ڈبلیو وارانسی میں قائم ہونے والی کیمیاوی کھاد کی فیکٹری کے لیے ۱۲ ایم۔ ڈبلیو۔ گورکھپور کی کیمیاوی کھاد کی فیکٹری کے لیے ۲۵ ایم۔ ڈبلیو۔ اینٹی بایوٹکس فیکٹری رشی کیش کے لیے ۱۱،۵ ایم۔ ڈبلیو۔ بریلی کی مصنوعی ربر فیکٹری کے لیے ۱۰،۵ ایم۔ ڈبلیو۔ ہردوار میں بجلی کی بھاری مشینیں تیار کرنے کے پروجیکٹ کے لیے ۲۶ ایم۔ ڈبلیو۔ اور تیسرے منصوبہ کے دوران ریاست بھر میں قائم کی جانے والی ۲۷ صنعتی ریاستوں کے لیے ۲۶،۵ ایم۔ ڈبلیو بجلی کی ضرورت پڑے گی۔

ان کے علاوہ بڑی تعداد میں دوسری بھاری درمیانی اور چھوٹی صنعتوں کا

قیام عمل میں آ رہا ہے جن کے لیے مزید بجلی کی ضرورت ہوگی۔ ان صنعتوں میں سوتی اونی کپڑے، کیمیاوی کاغذ، ریل کے انجن کے پرزے، شکر، بناسپتی، عمارتی لکڑی، کانچ کے سامان، سگریٹ، مسالہ، کٹلری، چارہ کاٹنے کے پھل، بٹن، کاربن پیپر، سائیکل اور سلائی کے مشینوں کے پرزے اور روشنائی وغیرہ کی صنعتیں شامل ہیں۔

لکھنؤ، عزت نگر، مغل سرائے، گورکھپور اور جھانسی میں واقع ریلوے کی کارگاہوں کی توسیع کے پروگرام کے لیے بجلی کی ضرورت جو دوسرے منصوبے کے آخر میں ۱۹ ایم۔ ڈبلیو تھی موجودہ منصوبے کے آخر میں بڑھ کر ۱۲۵ ایم۔ ڈبلیو ہوگی۔

ماڈل جیل لکھنؤ میں گملے بنانے کی صنعت جیل کی روایتی صنعتوں سے ایک مختلف چیز ہے۔ پرانی صنعتوں میں صرف افادیت اور پائیداری پر زور دیا جاتا تھا۔ اس صنعت میں دیدہ زیبی پر بھی دھیان دیا جاتا ہے۔ یہاں کے بنائے ہوئے پھولوں اور پودوں کے طرح طرح کے گملے اتنے دیدہ زیب ہیں کہ گورنمنٹ ہاؤس، کونسل ہاؤس، بوٹینیکل گارڈن اور اسی طرح کی دوسری ممتاز عمارتوں اور پارکوں میں آویزاں کیے گئے ہیں۔

ماڈل جیل کے قیدیوں نے سن ۱۹۵۰ء میں یہ کام خود اپنے بل بوتے پر شروع کیا تھا۔ قیدیوں نے اس کام میں ۱۹۴۳ روپیہ ۹۰ نئے پیسے لگائے یہ انہیں ان کے فکسڈ ڈپازٹ کے سود کے طور پر ملے تھے۔

ان گملوں اور کھمبوں کی تیاری کے کئی مراحل ہوتے ہیں۔ پہلے مختلف شکل اور سائز کے مٹی اور لکڑی کے سانچے بنائے جاتے ہیں۔ جب یہ سانچے تیار ہو جاتے ہیں تو ان میں مناسب تناسب سے بالو، کنکریٹ اور سیمنٹ کا مرکب بھر دیا جاتا ہے۔ سڑکوں کے کھمبے اور بھاری پام کے گملے تیار کرنے کے لیے کنکریٹ کے مرکب میں لوہے کے چھڑ بھی رکھ دیے جاتے ہیں۔

جب مرکب سخت ہو جاتا ہے اور ایک قطعی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس کو سانچے سے نکال لیا جاتا ہے اور پھر اس پر پلاسٹر کیا جاتا ہے۔ پلاسٹر کے بعد اس کو سنگ مرمر کے ٹکڑے سے رگڑا جاتا ہے جس سے اس کی سطح چکنی ہو جاتی ہے۔ نقش و نگار بنانے کے بعد یہ اشیا فروخت کے لیے بھیج دی جاتی ہیں۔

اوسطاً نصف درجن قیدی روزانہ ان خوب صورت اشیا کو تیار کرنے کے لیے کام پر لگائے جاتے ہیں۔ ان اشیا کی مانگ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ اس صنعت کا سارا کام قیدی کرتے ہیں جس سے ان کی ۹۵۱۶ روپیہ ۹۲ نئے پیسے کی آمدنی ہوئی۔ اس میں سے حکومت کو کارخانہ میں کام کرنے والے قیدیوں کے کھانے وغیرہ کے اخراجات کے لیے ۴۵۹۶ روپیہ اٹھتّر پیسے ادا کیے گئے ہیں۔

اتر پردیش کے جیلوں میں بہت سی نئی صنعتیں اور تربیتی پروگرام شروع کیے گئے ہیں، مقصد یہ ہے کہ قیدی اپنی ضرورتوں کے معاملہ میں خود کفیل ہو جائیں نیز وہ ایسے نئے کام سیکھ سکیں جن کی مدد سے وہ رہا ہونے کے بعد اپنی روزی آپ کما سکیں۔

آگرہ سنٹرل جیل میں صابن اور فنائل کی صنعتیں شروع کی گئی ہیں۔ ان صنعتوں نے ۵۰۰ من سے زیادہ صابن اور ۶۰۰ گیلن سے زیادہ فنائل تیار کیا ہے۔ بریلی سنٹرل جیل میں کھیل کود کے سامان کی صنعت میں بیڈمنٹن ریکٹ اور چھڑیاں وغیرہ تیار کی جا رہی ہیں۔ بریلی کے کم سن مجرموں کے جیل بریلی میں پنسل بنانے کی صنعت بھی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ اس جیل کے قیدیوں نے تین ہزار سے زیادہ پنسلیں تیار کی ہیں۔

شیشہ کے دانے بنانے کی صنعت نے جو ناری بندی نکیتن لکھنؤ میں خواتین قیدیوں کی بھلائی کے لیے شروع کی گئی تھی، ۳۰۰ پونڈ سے زیادہ شیشہ کے دانے تیار کیے ہیں۔ اس جیل کی خواتین قیدیوں نے ۳۵۰ سے زیادہ قمیضیں تیار کی ہیں۔ نینی سنٹرل جیل میں خواتین قیدیوں کے لیے سلائی اور بنائی کی صنعت شروع کی گئی ہے۔ یہاں عورتوں نے بڑی تعداد میں ٹی کوزی، ٹے کے کوز، میز پوش، بنیائن، پاجامے، بے بی کوٹ اور بش شرٹیں وغیرہ تیار کی ہیں۔

دہرہ دون اور فتح گڑھ کے جیلوں میں ریشم کے کیڑے پالنے، دھلائی، رنگائی اور چھپائی کی صنعتیں قائم کی گئی ہیں۔ یہ صنعتیں ابھی تجربہ کے مرحلہ میں ہیں۔ دہرہ دون میں جاپانی ریشم کے کیڑوں سے کوئے تیار کیے جا رہے ہیں۔

نینی سنٹرل جیل میں قیدیوں کو نل سازی کی تربیت دی جا رہی ہے۔ یہاں کے قیدیوں نے پورے جیل کی پائپ لائن کی مرمت کی ہے۔

حکومت اتر پردیش کی گرد و پیش کی صفائی سے متعلق اسکیم کے تحت دیہی علاقوں کے لیے بڑے پیمانہ پر سستے پاخانے تیار کرنے کے لیے بلاکوں اور پنچایتوں

نے اترپردیش بھر میں ورک شاپ قائم کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔

ابتدا میں یہ اسکیم ریاست کے دس ضلعوں یعنی ہر ڈویزن کے ایک ضلع میں شروع کی جا رہی ہے۔ گرام پنچایتوں کو ان ورک شاپوں کو چلانے کی ذمہ داری سپرد کی جا رہی ہے جو اپنی صنعتی امداد باہمی انجمنوں کے ذریعہ اس کام کو کریں گی۔ ریاستی ادارہ منصوبہ بندی تحقیق اور عمل کے ذریعہ ان پنچایتوں کو تکنیکی امداد دی جا رہی ہے۔ محکمہ پنچایت راج اس اسکیم کے تنظیمی اور مالی امور کا نگراں ہے۔

ان ورک شاپوں میں سے پانچ میں کام شروع ہو گیا ہے۔ یہ ورکشاپ بھیلا (سہارن پور)، رتن پورہ (بلیا)، مہداول (بستی)، ٹونڈلہ (آگرہ) اور اکبرپور (فیض آباد) کے بلاکوں میں واقع ہیں۔ بقیہ پانچ ورک شاپ مراد آباد، جھانسی، اٹاوہ، پوڑی گڑھوال اور لکھنؤ کے ضلعوں میں قائم کیے جائیں گے۔ امید کی جاتی ہے کہ ان ورک شاپوں میں جلد ہی کام شروع ہو جائے گا۔

اس اسکیم کو شروع کرنے سے پہلے ادارۂ منصوبہ بندی تحقیق اور عمل نے بڑے پیمانہ پر سروے کیا تھا اور کئی برسوں تک لیبورٹری میں تجربات کیے تھے تاکہ ایسے آسان اور سستے ڈھانچے دریافت کیے جا سکیں جو دیہی علاقوں کے باشندوں کے لیے قابل قبول ہوں اور مقامی کاریگر انہیں بہ آسانی تیار کر سکیں۔ ادارہ نے اس سلسلہ میں ضروری عملہ کو تربیت دینے کا ایک جامع پروگرام بھی شروع کیا تھا۔

چنہٹ اور میرٹھ کے بلاکوں میں جو سروے کیے گئے ان سے معلوم ہوا کہ ان علاقوں کی بالترتیب ۱۷ اور ۵۰ فی صدی آبادی معدہ کی بیماریوں میں مبتلا ہے کیوں کہ ان علاقوں میں غلاظت کھلے میدانوں میں پھینکی جاتی ہے۔

کسی بلاک میں جدید قسم کے پاخانہ تیار کرنے کا پروگرام شروع کرنے سے پہلے وہاں کے لوگوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اس پروگرام کی افادیت کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد خواہش مند لوگوں کے مکانوں میں یہ پاخانہ لگا دیے جاتے ہیں۔

اس پروگرام پر تیزی سے عمل درآمد کے لیے سیکڑوں ولیج لیول ورکروں، سینیٹری انسپکٹروں، ہیلتھ وزیٹروں اور ماہرین فن معماروں کو اس پروجیکٹ کے تکنیکی، نفسیاتی اور اقتصادی مسائل سے نپٹنے کی تربیت دی گئی ہے۔

ضلع مرزاپور میں اوبرا ہائیڈل پروجیکٹ سے دو میل اور دریائے سون کے چوپن پل سے آٹھ میل کے فاصلہ پر تقریباً ایک کروڑ روپیہ کی لاگت سے ...، آدمیوں کے لیے ایک بستی بنائی جا رہی ہے۔

یہ بستی اس عملہ کے لیے بن رہی ہے جو اوبرا ہائیڈل اور تھرمل پروجیکٹ کی نگرانی کرے گا۔ اس میں پکی سڑکوں، بہتر کے مکانوں اور پانی کے انتظام کے علاوہ ایک بازار، اسکول، اسپتال، کلب، ڈیری فارم، روڈویز بس اسٹیشن، ڈاک اور تار گھر، ٹیلی فون ایکسچینج، تھانہ اور سینما بھی ہوں گے۔

پانی کا انتظام پینے کے لیے اور پارکوں اور باغوں وغیرہ کے لیے بھی ریہاند ندی سے کیا جائے گا۔ اس کے لیے یہاں پانی صاف کرنے کا ایک پلانٹ لگایا جائے گا۔ جب تک اوبرا ہائیڈل پروجیکٹ چالو نہیں ہوتا یہاں ریہاند بند کے بجلی گھر سے بجلی لائی جائے گی۔

امید ہے یہ بستی سن ۱۹۶۴ء تک بن کر تیار ہو جائے گی۔ فی الحال یہاں جانے کے لیے ایک کچی سڑک ہے جو چوپن سے چار میل دور مرزاپور۔ پیپری روڈ سے ہو کر نکلتی ہے۔ فی الحال یہاں بہت کم آبادی ہے۔ بیشتر حصے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ اور کام کرنے کے لیے مزدور بھی مشکل سے ملتے ہیں اس لیے زیادہ تر باہر سے مزدور بلائے جاتے ہیں یہاں کا پانی گندہ اور مٹیالا ہے ان دشواریوں کے باوجود تعمیر کا کام سرگرمی سے جاری ہے۔

یہ پروجیکٹ جس کی ابتدا اس بستی سے ہو رہی ہے ریہاند پاور پروجیکٹ کی ایک معاون اسکیم ہے۔ اس اسکیم کے تحت اترپردیش کے مشرقی حصوں کے لیے ریہاند بجلی گھر سے سستی پن بجلی فراہم کی جائے گی۔

ریہاند بجلی گھر سے تقریباً ۲۰ میل دریا کے اتار پر جہاں اوبرا نامی جگہ پر دریا کا بہاؤ تنگ ہو جاتا ہے ایک مٹی اور پتھر کا بند بنانے کی تجویز ہے۔ یہاں دریا کے ڈھال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پانچ چرخاب سے بجلی پیدا کی جائے گی۔ ہر چرخاب امید ہے .... ۲ کیلوواٹ بجلی پیدا کرے گا۔

بجلی گھر اور سوئچ یارڈ کے ڈزائن مکمل ہو رہے ہیں۔ پن بجلی مشینری کی تیاری ہو رہی ہے۔ اور ڈرلنگ کا کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ امید ہے عنقریب تعمیر بستی کو بجلی فراہم ہونے لگے گی۔

جن علاقوں میں الہ آباد بجلی لائسنس ۱۹۱۲ء، بنارس شہر اور کنٹونمنٹ

بجلی لائسنس سن ۱۹۲۵ء اور آگرہ شہر اور کنٹونمنٹ بجلی لائسنس سن ۱۹۲۲ء کے تحت بجلی سپلائی ہوتی ہے وہاں بجلی کنکشن کے بعض احکام میں حکومت اتر پردیش نے ترمیم کر دی ہے۔

یہ ترمیمیں بجلی کی سپلائی کو برقرار رکھنے اور اس کی منصفانہ تقسیم کے مقصد سے کی گئی ہیں۔ ان کے تحت الہ آباد اور وارانسی کی بجلی کمپنیاں تمام کاموں کے لیے ۱۰ ہارس پاور تک بجلی کی درخواستیں سختی کے ساتھ اس ترتیب سے منظور کریں گی جس ترتیب سے وہ موصول ہوں۔ لیکن ان کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ وہ منظور شدہ بجلی کے لوڈ لا دیں یا ایک شخص کو یا ایک عمارت میں ایک سے زیادہ پاور کنکشن منظور کر دیں۔

الہ آباد اور بنارس کی بجلی کمپنیوں کی سپلائی کے علاقوں میں ۱۰ ہارس پاور سے زیادہ اور ۲۵ ہارس پاور تک اور آگرہ کی بجلی کمپنی کے سپلائی کے علاقہ میں ۱۰ ہارس پاور تک بجلی متعلقہ ضلع مجسٹریٹ منظور کر سکیں گے لیکن گرہ میں ضلع مجسٹریٹ صبح ۸ بجے سے ۱۰ بجے رات تک اوقات میں آئس کریم، آئس کینڈری، چارہ کاٹنے، چھپائی کی مشینوں اور آٹا، چاول، دال، تیل اور پسائی کی ملوں کے لیے بجلی نہیں منظور کریں گے۔

پچیس ہارس پاور سے زیادہ کے کنکشن جہاں الہ آباد اور وارانسی کا تعلق ہے اور ۱۰ ہارس پاور سے زیادہ کے کنکشن جہاں تک آگرہ کا تعلق ہے حکومت اتر پردیش منظور کرے گی۔

چنانچہ الہ آباد اور وارانسی میں ۲۵ ہارس پاور سے زیادہ اور آگرہ میں ۱۰ ہارس پاور سے زیادہ بجلی کی درخواستیں سپلائیرس کے فارم پر تین نقلوں کے ساتھ متعلقہ بجلی کمپنی کو دینا ہوں گی۔ اگر بجلی کی مانگ صنعتی کام کے لیے ہو تو کمپنی درخواست کی ایک نقل ڈائرکٹر محکمہ صنعت اتر پردیش کانپور اور اگر زرعی کام کے لیے ہو مثلاً ٹیوب ویل اور کولڈ اسٹوریج وغیرہ تو ڈائرکٹر محکمہ زراعت اتر پردیش لکھنؤ کے پاس بھیجے گی ایک نقل اپنی رائے کے ساتھ حکومت اتر پردیش کے پاور ڈپارٹمنٹ کے پاس بھیجے گی اور ایک نقل اپنے پاس رکھے گی۔ ڈائرکٹر محکمہ صنعت یا ڈائرکٹر زراعت ان درخواستوں پر اپنی سفارشیں حکومت کو بھیج دیں گے۔

بجلی کمپنی یا ضلع مجسٹریٹ اس حد کے اندر جس کی منظوری کا انھیں اختیار ہے بجلی کنکشن ایک جگہ سے دوسری جگہ لگانے کے معاملوں کا فیصلہ خود ہی کریں گے بشرطیکہ اس سے ایک ہی عمارت میں دو یا دو سے زیادہ بجلی کنکشن نہ ہو جائیں یا بجلی کا بار یک جانہ ہو جائے۔

جن کنکشنوں کو کٹے ہوئے چھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئے ہیں ان کو دوبارہ لگانے کا فیصلہ بجلی کمپنی یا ضلع مجسٹریٹ اپنے اپنے اختیار سے کریں گے۔

ایسے کنکشنوں کو جو چھ مہینے سے زیادہ مدت سے کٹے ہوئے ہوں کے دوبارہ لگانے کی درخواستیں نئے کنکشن کی درخواستیں سمجھی جائیں گی۔

صارفین کے نام بدلنے کی درخواستوں کا فیصلہ ضلع مجسٹریٹ کریں گے۔

اضافہ کار کے سلسلہ میں بجلی کے استعمال کی منظوری بجلی کمپنی یا ضلع مجسٹریٹ دیں گے۔ بشرطیکہ اس سے کل منظور شدہ بجلی کے بار میں اضافہ نہ ہوتا ہو تو مقرد اور سو پنج "کے استعمال کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔

دیہی علاقوں کے مخلوط جونیر بیسک اسکولوں میں موجودہ تعلیمی سال سے مزید پانچ سو اسکول ماتاؤں کا تقرر کیا گیا ہے۔ گزشتہ سال بھی اتنی ہی اسکول ماتاؤں کی تقرری ہوئی تھی۔

یہ اقدام جس کے تحت گاؤں کی مقبول معمر عورتوں کی تقرری کی گئی ہے، اس مقصد کے پیش نظر کیا گیا ہے کہ ان دیہی علاقوں میں جہاں لڑکیوں کے الگ اسکول نہیں ہیں لڑکیوں کو مخلوط اسکولوں میں پڑھنے میں مشکلیں نہ ہوں۔ یہ اسکول ماتائیں لڑکیوں کو اپنی نگرانی میں اسکول لائیں گی گھر پہنچائیں گی اور اسکول میں بھی ان کی دیکھ بھال کرتی رہیں گی۔

حکومت اتر پردیش نے ان اسکول ماتاؤں کو ۲۰ روپیہ ماہانہ اعزازی رقم دینے کے لیے انترم ضلع پریشدوں کو ..... ۸ روپیہ کی رقم دی ہے۔

اتر پردیش کے ہر ضلع میں اسکول ماتاؤں کی تعداد حسب ذیل رہے گی۔

گورکھ پور، دیوریا، بستی، سلطان پور اور مراد آباد میں سے ہر ایک میں بیس۔ بارہ بنکی، گونڈہ، فیض آباد، المورہ، میرٹھ، آگرہ، کانپور اور جھانسی میں سے ہر ایک میں پندرہ۔ بلند شہر، علی گڑھ، متھرا، مین پوری، بدایوں، شاہ جہاں پور، فتح پور، الہ آباد، باندہ، اعظم گڑھ، اناؤ، رائے بریلی، سیتاپور، ہردوئی، کھیری، بہرائچ اور پرتاپ گڑھ میں سے ہر ایک میں دس۔ وارانسی میں سات۔ لکھنؤ، نینی تال، ٹہری گڑھوال، پوری گڑھوال، مرزا پور، جونپور، غازی پور، بلیا، ہمیر پور، دہرہ دون، سہارنپور، مظفر نگر، ایٹہ، بریلی

بجنور، پیلی بھیت، رام پور، فرخ آباد، اٹاوہ اور جالون میں سے ہر ایک میں پانچ اور ہردوئی میں تین۔

یو۔ پی وی مینس اینڈ چلڈرنس (کنٹرول) ایکٹ سنہ ۱۹۵۶ء ۱۹ اگست سنہ ۱۹۶۲ء سے اترپردیش کے ۱۳ اور ضلعوں میں نافذ ہو گیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں عورتوں اور بچوں کی بھلائی کے موجودہ ۷۷ رضاکار اداروں میں سے ۵۴ ادارے حکومت کی نگرانی میں آ گئے ہیں۔ اب تک یہ ایکٹ کانپور۔ الہ آباد۔ وارانسی۔ آگرہ۔ لکھنؤ اور میرٹھ کے ضلعوں میں نافذ تھا جہاں اس قسم کے تسلیم شدہ اداروں کی تعداد ۳۰ ہے اس ایکٹ کے علی گڑھ۔ متھرا۔ اٹاوہ۔ اناؤ۔ ہمیرپور۔ جونپور۔ بلیا۔ لکھیم پور کھیری۔ فیض آباد۔ سیتاپور۔ بلند شہر۔ مظفر نگر اور مرزاپور میں نافذ ہو جانے سے عورتوں اور بچوں کے ۲۴ ادارے اس کے دائرۂ عمل میں آ جائیں گے۔

اس ایکٹ میں اداروں کے مکینوں کی نگہداشت۔ حفاظت اور تربیت سے متعلق دفعات بھی شامل ہیں۔ اس ایکٹ کا اطلاق کسی ایسے ادارہ پر نہیں ہوگا جو لوکل باڈی ریاستی یا مرکزی حکومت کے زیر انتظام ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایکٹ کسی تسلیم شدہ ادارہ کے ہوسٹل یا گھر پر بھی نافذ نہیں ہوگا۔

حکومت نے اس قانون کے لیے ایک انتظامیہ بورڈ قائم کیا ہے جو ان اداروں کے لائسنس نگہداشت اور کارگزاری کے بارے میں حکومت کو مشورہ دے گا اور ان کے انتظامی معاملات کی بھی نگرانی کرے گا۔

نائب وزیر سماجی فلاح شریمتی پرکاش وتی سود نے ۱۴ ستمبر کو ودھان سبھا میں سوالات کے وقفہ میں بتایا کہ اترپردیش کے ۱۹ ضلعوں میں اترپردیش کا خواتین اور بچوں کے اداروں کے کنٹرول کا ریاستی قانون سنہ ۱۹۵۶ء نافذ کر دیا گیا ہے تاکہ یتیم خانوں کے بچوں کی مناسب دیکھ بھال کی طرف سے اطمینان ہو سکے۔

نائب وزیر نے جو وزیر صحت شری مہابیر پرشاد سریواستوا کی جانب سے شری رفیع خاں کے ایک سوال کا جواب دے رہی تھیں مزید بتایا کہ حکومت اترپردیش یتیم خانوں کو جو امداد دیتی ہے وہ صرف انتظام کے لیے نہیں، یتیم خانہ کے بچوں کی ٹریننگ کے لیے بھی ہے۔ یکمشت عطیے مختلف اداروں کی ضرورتوں اور ان کی مالی حالت کے پیش نظر دیے گئے ہیں۔

ایک دوسرے سوال کے جواب میں نائب وزیر نے بتایا کہ حکومت نے یتیموں اور لاوارث بچوں کے لیے متھرا میں ایک گھر قائم کیا ہے جہاں ہر فرد پر ۳۰ روپیہ سے زیادہ خرچ کیا جاتا ہے اس کے علاوہ یتیموں اور لاوارث بچوں کو ناگہانی ضرورت کے وقت فوری امداد دینے کے لیے ضلع مجسٹریٹوں کو ہر سال ۵۹۰۰ روپیہ دیا جاتا ہے۔

ایک ضمنی سوال کے جواب میں نائب وزیر نے بتایا کہ حکومت یہ چاہتی ہے کہ یتیم خانہ میں رہنے والوں کو ایسی تربیت دی جائے کہ وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہو سکیں۔

تاریخ جنگ آزادی کی ساتویں جلد جس میں سنہ ۱۸۵۹ء سے سنہ ۱۸۸۵ء تک کے واقعات بیان کیے گئے ہیں، ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۶۳ء کو یوم جمہوریہ کے موقعہ پر شائع کی جائے گی۔

تاریخ جنگ آزادی کی مشاورتی کمیٹی نے آج یہاں اپنے جلسہ میں جو وزیر تعلیم اچاریہ جگل کشور کی صدارت میں ہوا، اس کتاب کا مسودہ منظور کیا۔ کمیٹی نے یہ بھی ہدایت کی کہ مسودہ کو فوراً پریس میں بھیج دیا جائے تاکہ وہ مقررہ وقت پر شائع ہو سکے۔ اس مسودہ میں سنہ ۱۸۸۵ء کی بہت سی اہم دستاویزات شامل ہیں جن میں سے بعض میں سر سید احمد خاں نے دو قومی نظریہ کی تردید کی ہے۔

کمیٹی نے آئندہ کا اشاعتی پروگرام بھی طے کیا۔ اس نے یہ بھی طے کیا کہ تاریخ جنگ آزادی کی دو جلدوں کے لیے جن میں سنہ ۱۸۸۵ء سے سنہ ۱۹۱۹ء اور سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک کے واقعات ہوں گے ضروری مواد کی تدوین اور فراہمی کا کام تین برسوں کے اندر پورا ہو جانا چاہیئے۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ایسی سہولتیں فراہم کرنا چاہیئں جن سے اترپردیش میں جنگ آزادی سے متعلق ضروری مواد یورپ کے ملکوں سے حاصل کیا جا سکے۔ کمیٹی کے سکریٹری ڈاکٹر ایس۔ اے۔ اے رضوی جی کو

لندن یونیورسٹی نے ریسرچ اسوشی ایٹ شپ کی پیش کش کی ہے ۱۹ ستمبر کو لندن کے لیے روانہ ہوں گے۔ ڈاکٹر رضوی اپنے سفر کے دوران میں یورپ کے ملکوں کا دورہ کریں گے اور حکومت اترپردیش کی مطبوعات کے لیے ضروری مواد فراہم کریں گے۔

جلسہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر محمد حبیب اور ڈاکٹر نورالحسن دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر پرماتما سرن۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈاکٹر نندلال چٹرجی شری رؤف جعفری اور شری جی پی۔ پانڈے سکریٹری محکمۂ تعلیم نے شرکت کی۔

ٹرانسپورٹ کمشنر کے ذریعہ آج جاری کیے گئے ایک پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ اترپردیش میں بس کے تمام مسافروں کو یو۔پی موٹر گاڑی (مسافر ٹیکس) ایکٹ کے تحت یکم اکتوبر ۱۹۶۲ء سے واجب الادا کرایہ پر پانچ فی صدی ٹیکس دینا ہوگا۔ یہ ایکٹ مذکورہ تاریخ سے نافذ ہوگا۔

پریس نوٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ ہر مسافر کو یہ ٹیکس سفر شروع ہونے کے وقت ادا کرنا ہوگا۔ موٹر آپریٹر ہر مسافر سے جس میں ایسے مسافر بھی شامل ہیں جو مفت یا رعایتی کرایہ پر سفر کر رہے ہوں گے یہ ٹیکس وصول کرے گا۔ آخرالذکر معاملہ میں یہ ٹیکس کرایہ کی معمول کی شرح کی بنیاد پر وصول کیا جائے گا۔

موٹر آپریٹروں کو مسافروں سے وصول کی گئی ٹیکس کی رقم ہر مہینہ سرکاری خزانہ میں جمع کرنا ہوگی۔ یہ رقم اگلے مہینہ کے پندرہ دنوں کے اندر جمع کر دینا چاہیے۔

ایکٹ میں یہ بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ آپریٹر سے مسافر ٹیکس کی رقم ہر تیسرے مہینہ یک مشت وصول کی جائے۔

آپریٹر کو ایکٹ کے تحت اپنے کو ۳۱ دسمبر ۱۹۶۲ء تک رجسٹرڈ کرا لینا ہوگا۔

ایکٹ کی دفعات کی خلاف ورزیوں پر جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ پہلی بار خلاف ورزی کرنے پر ۵۰۰ روپیہ تک اور دوسری اور بعد کی خلاف ورزیوں پر ایک ہزار جرمانہ عائد کیا جا سکے گا۔

اس سلسلہ میں مزید معلومات کے لیے آپریٹر ریجنل ٹرانسپورٹ افسروں سے رجوع کر سکتے ہیں۔

یو۔پی گورنمنٹ روڈویز میں ۸۷ گزیٹیڈ اور ۲۰۳۳۳ نان گزیٹیڈ ملازمین کام کر رہے ہیں جن میں ۵۷ گزیٹیڈ اور ۶۱۸۹ ملازمین مستقل ہیں۔ روڈویز ملازمین کی سروس کے قواعد وضع کیے جا رہے ہیں۔

وزیر نقل و حمل شری مظفر حسن نے مندرجہ بالا اطلاع ۱۸ ستمبر کو ودھان سبھا میں سوالات کے وقفہ کے دوران شری سنت سنگھ یوسف کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے دی۔

وزیر موصوف نے مزید بتایا کہ حتی الامکان زیادہ سے زیادہ ملازمین کو مستقل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بکشتر نقل و حمل کو ۶۶ فی صدی عارضی ملازمین کے معاملات کی فہرست پیش کر دی گئی ہے ان کے معاملات پر غور کیا جا رہا ہے۔

مستقلی کے طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے شری مظفر حسن نے کہا کہ گزیٹیڈ افسران کو مستقلی سے قبل ایک دو سال کے پروبیشن پر رکھا جاتا ہے۔ پبلک سروس کمیشن کی سفارش پر انھیں مستقل کیا جاتا ہے۔ نان گزیٹیڈ عملہ میں صرف لیبر ویلفیر افیسر ٹریفک سپرنٹنڈنٹ اور اوورسیروں کو ایک سال کے پروبیشن پر رکھا جاتا ہے۔ نان گزیٹیڈ ملازمین کو ان کی ملازمت کی مدت بہتر کارگزاری اور کیرکٹر رول کی بنیاد پر مستقل کیا جاتا ہے۔

وزیر نقل و حمل نے اس بات سے انکار کیا کہ ڈرائیوروں کلینروں اور کنڈکٹروں کو دن بھر میں آٹھ گھنٹے سے زیادہ ڈیوٹی دینا پڑتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب کبھی ان سے ایک دن میں مقررہ اوقات سے زیادہ کام لیا جاتا ہے تو اس کے لیے انھیں اوور ٹائم دیا جاتا ہے۔

متفرقات

امداد باہمی سے متعلق ادب پر انعامات۔ اترپردیش کے امداد باہمی انجمنوں کے رجسٹرار کے ذریعہ اترپردیش میں امداد باہمی تحریک سے متعلق مناسب مضامین۔ ایک ایکٹ کے ڈرامے۔ مختصر افسانے اور گیت لکھنے والوں کو نقد انعامات دیے جائیں گے۔ تخلیقات کی خوبی کے اعتبار سے اعزازی رقم ۳۰ روپیہ سے لے کر ۱۰۰ روپیہ تک رکھی گئی ہے۔

امداد باہمی کی کسی بھی اہم سرگرمی مثلاً امداد باہمی مارکیٹنگ۔ امداد باہمی کاشت، خدمتی امداد باہمی انجمن۔ امداد باہمی بیج گودام۔ امداد باہمی تعلیم اور مزدوروں کی امداد باہمی انجمنوں کے موضوع پر تخلیقات بھیجی جا سکتی ہیں۔

مسودات ہندی یا اُردو میں ہونا چاہیے۔ مسودات کے موصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۰ نومبر ۱۹۶۲ء تک بڑھا دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں موضوعات کے خاکے اور دیگر ضروری تفصیلات رجسٹرار کوآپریٹیو سوسائٹیز۔ اتر پردیش لکھنؤ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

ہندی سمیتی کا پروگرام محکمہ اطلاعات کی ہندی سمیتی نے ہندی ادب کو مالا مال کرنے کے لیے موجودہ منصوبہ کی مدت میں ۲۵ لاکھ روپیہ کی تخمینی لاگت سے نادر اور درسی کتابوں کی اشاعت کا ایک پروگرام شروع کیا ہے۔

نادر کتابوں کی اشاعت کے پروگرام کے تحت ۳۰۰ کتابیں شائع کرنے کی تجویز ہے اور درسی کتابوں کے پروگرام کے تحت ۱۲۵ کتابوں کی اشاعت کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے یہ سمیتی اب تک لسانیات سے لے کر علم نجوم و طبیعات تک کے مختلف موضوعات پر ۲۷ کتابیں شائع کر چکی ہے۔

سال رواں کے دوران ۱۷ کتابیں شائع کرنے کے پروگرام کے تحت ۹ کتابیں زیر طباعت ہیں اور بقیہ کے مسودات کو آخری شکل دی جا رہی ہے۔ اس امر کا قوی امکان ہے کہ سال رواں میں مقررہ نشانہ کو پار کر لیا جائے گا۔

عنقریب شائع ہونے والی اہم کتابیں یہ ہیں "تنتر ساہتیہ" مصنفہ مہامہوپادھیائے پنڈت گوپی ناتھ کوی راج۔ "اردو بھاشا اور ساہتیہ" مصنفہ رگھوپتی سہائے فراق اور "دھرم شاستر کی تاریخ" شری پی۔ وی کانڑے۔

ہندی زبان کو مالا مال کرنے کی تکنیکی موضوعات پر ادب کی تخلیق کے لیے مصنفین کی ہمت افزائی جدید موضوعات پر اعلیٰ تعلیم کے لیے کتابوں کی فراہمی کے پیش نظر ہندی سمیتی نے ۵۷-۱۹۵۶ء میں اپنا اشاعتی پروگرام شروع کیا تھا۔

بھاگیرتی ندی پر نیا پل۔ بھاگیرتی ندی پر اسٹیل گرڈر پل ۹ ستمبر کو آمد و رفت کے لیے کھول دیا گیا۔ اس پل کی تعمیر سے گنگوتری اور بدری ناتھ کا درمیانی فاصلہ ۷۰ میل کم ہو گیا ہے۔

۱۸۰ فٹ لمبا اسٹیل گرڈر کا یہ پل بڑی موٹر گاڑیوں کے لیے تقریباً ڈھائی سال کی مدت میں چار لاکھ روپیہ سے زیادہ لاگت سے تعمیر کیا گیا ہے۔

اس اہم پل نے اتر کاشی کے سرحدی اضلاع اور چمولی کو براہ راست سڑک کے ذریعہ ملا دیا ہے۔ اس پل کی تعمیر سے پہلے رشی کیش کے راستہ سے آمد و رفت ہوتی تھی جس میں بہت زیادہ پریشانی ہونے کے علاوہ بہت زیادہ وقت اور روپیہ بھی خرچ ہوتا تھا۔

اس پل نے جس پر سے ۱۸ ٹن تک کی گاڑیاں گزر سکتی ہیں اتراکھنڈ میں آمد و رفت کا ایک اور اہم ذریعہ فراہم کر دیا ہے۔

رامپور بجلی گھر۔ اس سال کے آخر تک رامپور بجلی گھر کی بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت بڑھا کر ۸۹۲۵ کیلو واٹ کر دی جائے گی۔

گزشتہ اپریل میں اس بجلی گھر میں ۱۶۰۰ کیلو واٹ بجلی پیدا کرنے کی ایک یونٹ لگائی گئی تھی جس سے اس کی پیداواری صلاحیت ۴۲۰۰ سے بڑھ کر ۵۸۰۰ کیلو واٹ ہو گئی تھی۔

فی الحال ۳۱۲۵ کیلو واٹ بجلی پیدا کرنے کی ایک یونٹ لگائی جا رہی ہے۔ اس کا کام امید ہے دسمبر کے آخر تک پورا ہو جائے گا۔

رام پور بجلی گھر کی پیداواری صلاحیت کے اضافہ سے گنگا پار کے علاقہ میں اور زیادہ بجلی سپلائی کی جا سکے گی۔

گنے کی خریداری ٹیکس سے متعلق ایکٹ۔ سپریم کورٹ کی دستوری بنچ نے ہندوستان کے چیف جسٹس کے زیر صدارت ایک رٹ درخواست کو مسترد کر دیا ہے جس میں اتر پردیش کے گنے کی خریداری ٹیکس سے متعلق ایکٹ ۱۹۶۱ء کو ناجائز بتایا گیا تھا۔

یہ درخواست بجنور کی ایس۔ پی۔ شکر مل کے سابق پٹہ دار نے مذکورہ ایکٹ کے خلاف سپریم کورٹ میں پیش کی تھی جس کے تحت گنے کی خریداری پر شکر کی ہر ایک مل کو خریداری ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔

اترپردیش میں نئی پولیس کی تشکیل

شانتی پرشاد

ہماری پولیس کو عوام کا اعتماد اور احترام حاصل نہیں ہے اور بسا اوقات یہ نکتہ چینی کی جاتی ہے کہ ہماری پولیس نااہل ہے۔ یہ بے اعتمادی تمام تر اس کردار کی وجہ سے نہیں ہے جو پولیس کو آزادی کی متعدد تحریکوں کو دبانے کے سلسلہ میں ادا کرنا پڑا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ ناقابل تردید حقیقت بھی ہے کہ پولیس شاید درست انجام دہی سے قاصر رہی ہے جس کی آزادی کے عوام اس سے [illegible] ہوا ہے۔ کیا اس کی تنظیم میں کوئی خامی ہے یا پولیس کی نااہلیت اور عدم مقبولیت محض اس وجہ سے ہے کہ پولیس وقت کی ضرورتوں کے مطابق اپنے کو تبدیل نہیں کرسکی ہے یا اس کی وجہ ایسے حالات ہیں جن پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہ اہم سوالات ہیں اور حکومت اترپردیش نے ان کی جانچ کرنے اور مناسب حل تلاش کرنے کے لیے سن ۶۰ء میں ایک پولیس کمیشن مقرر کیا تھا کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے اور حکومت اس کی کچھ سفارشات کو نافذ کر چکی ہے اور بقیہ پر غور و خوض کر رہی ہے۔ اگرچہ کچھ برسوں بعد ہی ان تبدیلیوں کے پورے اثرات محسوس کیے جا سکیں گے تاہم اس امر کا جائزہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ریاست کی آئندہ پولیس کی کیا شکل ہوگی۔

پولیس کی تنظیم کے ضمن میں کمیشن نے ایک اہم سفارش یہ کی ہے کہ نگرانی کے عہدہ کی حیثیت سے سرکل انسپکٹر کی جگہ ختم کر دی جائے۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس رتبے کے افسروں کے تجربات کو انتظامی کاموں میں لگایا جائے۔ چنانچہ ۲، سرکل انسپکٹروں کو اہم تھانوں کا انچارج بنایا جا چکا ہے اور اس تبدیلی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان تھانوں کی کارکردگی بہتر ہو جائے گی۔ اس اسکیم کو بالآخر تقریباً ۱۰۰ اور تھانوں میں شروع کرنے کی تجویز ہے تاکہ ریاست کے تمام بڑے تھانے تجربہ کار اور جہاں دیدہ افسروں کے زیر انتظام آجائیں۔

امن و امان کو برقرار رکھنا اور جرائم کا پتہ لگانا پولیس کے دو اہم فرائض ہیں۔ اور پولیس کی ہردلعزیزی کا انحصار اسی بات پر ہے کہ وہ ان فرائض کو کس خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہے۔ یہ امر باعث تشویش ہے کہ پولیس کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی کہ پولیس کی تعداد بہت ناکافی ہے اور اس کے پاس اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے ضروری ساز و سامان بھی نہیں ہے۔ یہ صورت حال کیسے پیدا ہوئی؟

سب سے پہلے ہم امن و امان کے مسئلہ کو لیتے ہیں۔ انگریزوں کے لیے یہ مسئلہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا جنھوں نے سن ۵۷ء کے تجربہ کے بعد پولیس کی تنظیم کی تھی تاکہ ان کے خلاف دوسری بغاوت نہ ہوسکے اور وہ اپنے مقصد میں پورے طور پر کامیاب ہوئے۔ حصول آزادی کے بعد بھی پولیس نے سخت اور ناسازگار حالات میں فرقہ دارانہ ہنگاموں، سیاسی جماعتوں کے ذریعہ چلائی گئی ریاست گیر تحریکوں اور لازمی سروسز کی ہڑتالوں وغیرہ سے پیدا ہونے والی صورت حال کا مقابلہ کیا ہے۔ اور جو تمام عام چناؤ اور دوسرے چناؤ پرامن طور پر ہوئے اس کی ایک وجہ پولیس کا حسن انتظام بھی ہے۔ لیکن عام آدمی پولیس سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ آئے دن دیکھتا ہے کہ ٹریفک کا انتظام ٹھیک نہیں۔ سڑکوں پر سنگین حادثات ہوتے ہیں۔ غنڈہ گردی کے واقعات ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ پولیس بظاہر اس سلسلہ میں کوئی اقدام کیوں نہیں کرتی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا اور اس سادہ حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں کہ ان مسائل کو نپٹانے کے لیے پولیس کے پاس کافی آدمی، وسائل اور قانونی اختیارات نہیں ہیں۔ مزید برآں بڑے بڑے شہروں کے وجود میں آنے، گنجان گندی بستیوں میں کثرت آبادی اور تنگ سڑکوں پر تیز رفتار گاڑیوں وغیرہ سے نئے مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ پولیس کمیشن نے ابتدا میں ایک لاکھ سے زیادہ کی آبادی والے شہروں کے لیے امن و امان برقرار رکھنے کے لیے علیحدہ عملہ کی سفارش کی ہے۔ اس عملہ کی تعداد آبادی کے تناسب سے ہونا چاہیے۔ لمبے فاصلے طے کرنے اور جائے وقوعہ پر فوراً پہنچنے کے لیے کانپور اور لکھنؤ میں گشتی گاڑیاں مہیا کی گئی ہیں جن میں وائرلیس لگے ہوئے ہیں۔ اور وارانسی، الہ آباد، آگرہ، میرٹھ، علی گڑھ، مرادآباد، رام پور، بریلی، شاہجہاں پور، دہرہ دون، سہارنپور، جھانسی، گورکھپور، مرزاپور اور متھرا کے لیے ان اسکیموں کی منظوری دی گئی ہے۔ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ ہیڈ کانسٹیبلوں اور کانسٹیبلوں کو سائیکل الاؤنس دیا جائے تاکہ وہ سائیکلیں رکھیں اور فوری طور پر اقدام کرسکیں۔ اس طور پر پولیس ضرورت مندوں کی بروقت مدد کرسکے گی اور ان کی محبت حاصل کرسکے گی۔

پولیس کا دوسرا اہم فرض جرائم کی روک تھام اور ان کا پتہ لگانا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ پولیس کی تنظیم کے وقت امن و امان کے برقرار رکھنے کو نمایاں اور تفتیش کے کام کو ضمنی اہمیت دی گئی تھی۔ یہ امر نامناسب تھا۔ ہر ایک فرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ یہ توقع کرے کہ جب اس کی ذات یا جائداد کو کوئی خطرہ لاحق ہوگا تو حکومت مناسب اقدام کرے گی۔ اس لیے ہر فرد کو اس حقیقت کا احساس ہونا چاہیے کہ امن و امان کو برقرار رکھنے اور جرائم کی روک تھام اور تفتیش کو یکساں اہمیت حاصل ہے۔

جہاں تک جرائم کا پتہ لگانے کا تعلق ہے پولیس کا عوام سے اس وقت سابقہ
پڑتا ہے جب کہ وہ کسی جرم کا شکار ہوئے ہوں یا خود مجرم ہوں۔ جرائم کے شکار افراد کی پولیس سے
عام شکایت یہ ہے کہ جرم کی رپورٹ یا تو فوراً درج نہیں کی جاتی یا بالکل درج نہیں کی
جاتی یا اس کی اہمیت کم کردی جاتی ہے یا اس کو درج کرتے وقت پولیس کا رویہ
شایانِ شان نہیں ہوتا۔ پولیس کمیشن نے ان شکایتوں پر غور کیا ہے۔ حکومت اور محکمے نے
بھی یہ محسوس کیا کہ یہ ایک ایسی خرابی ہے جو پرخلوص کوششوں سے پورے طور پر ختم
کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں جنوری ۱۹۶۱ء میں واضح احکامات جاری کیے
گئے کہ تمام رپورٹیں درج کی جائیں۔ ماتحت عملے میں صحیح نفسیاتی نقطۂ نظر پیش
کرنے کے لیے اس امر پر زور دیا گیا کہ تھانہ داروں کی حسن کارکردگی جرائم کے اعداد
شمار پر منحصر نہیں ہوگی بلکہ اس بات کو مد نظر رکھا جائے گا کہ جرائم اور مجرموں سے
نپٹنے میں انہوں نے کتنی مستعدی سے کام کیا ہے۔ اس ضمن میں مخصوص مہمیں چلائی
گئیں۔ [illegible] پولیس افسران سادہ کپڑوں میں تھانوں میں رپورٹ درج کرانے گئے
تاکہ خود دیکھیں کہ ان احکام کی تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ ان مہموں سے یہ
[illegible] ہے کہ [illegible] اندراج اور اس سلسلے میں پولیس کے رویے میں کافی سدھار ہوا
ہے۔ [illegible] امید کی جاتی ہے کہ اس ضمن میں عوام کی شکایتیں دور
ہو جائیں گی۔ [illegible] دوسری شکایت یہ ہے کہ معاملات کی تفتیش
پر [illegible] توجہ [illegible] دی جاتی ہے۔ تفتیش اکثر بہت دیر سے شروع کی جاتی ہے اور
بہت سے معاملوں میں جن میں جرائم بہت زیادہ سنسنی خیز یا اہم نہیں ہوتے،
بہت سرسری طور پر تفتیش کی جاتی ہے۔ ایسے معاملوں میں بھی جن میں مجرمین گرفتار ہو چکے
ہیں عدالتوں میں فرد جرم بہت دیر سے بھیجی جاتی ہے۔ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ خرابیاں
موجود ہیں اور ان کو دور کرنا ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ یہ خامیاں
پولیس کی دیدہ و دانستہ غفلت یا عام شرارت کا نتیجہ نہیں ہیں۔

پولیس کی انتظامی کارروائی میں سب انسپکٹر کو مرکزی مقام حاصل ہے۔
وہ معاملات کی تفتیش کرتا ہے۔ مجرموں کو گرفتار کرتا ہے۔ مقدمات کی پیروی
کرتا ہے۔ روزنامچوں میں تفتیش کی تفصیلات درج کرتا ہے۔ بڑی تعداد میں متفرق
شکایتوں کی تحقیقات کرتا ہے۔ امن و امان سے متعلق مسائل کو نپٹاتا ہے اور
تمام میلوں وغیرہ میں معقول انتظامات کرنے کے علاوہ بہت سے متفرق قسم کے
فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ مزید برآں تھانوں کے تحت وسیع علاقہ ہوتا ہے اور
رسل و رسائل کے ذرائع ہمیشہ اور ہر جگہ تسلی بخش نہیں ہوتے۔ علاوہ ازیں ایسے تھانوں
کی تعداد بہت زیادہ ہے جہاں صرف ایک سب انسپکٹر ہوتا ہے۔ کام کی کثرت
کی وجہ سے اس کو کام کرنے سے پہلے سوچنے کا بالکل موقع نہیں ملتا۔ وہ مشین کی
طرح کام کرتا ہے۔ سب انسپکٹر مذمت سے کہیں زیادہ رحم کا مستحق ہے۔ یہاں
یہ بات واضح کردی جاتی ہے کہ ان باتوں سے پولیس کے ذریعہ تفتیش میں تاخیر
یا سرسری تفتیش یا غفلت کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جارہی
ہے بلکہ صرف حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جارہا ہے۔

پولیس کمیشن نے یہ بھی محسوس کیا کہ یہ ایک مشکل مسئلہ ہے جس کا حل تلاش
کرنا ہے۔ اس لئے اس نے یہ سفارش کی کہ جہاں ایک تھانہ بہت بڑے
علاقے یا بہت بڑی آبادی کی ضرورتیں پوری کر رہا ہو وہاں
ایک نیا تھانہ قائم کرکے اس کے دائرۂ عمل کو کم کردیا جائے۔ اور کسی تھانے میں
دو سے کم تھانیدار نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے تفتیش پر مامور عملہ میں امن و امان
قائم رکھنے سے متعلق عملہ سے علیحدگی کی بھی سفارش کی ہے۔ شروع میں یہ علیحدگی صرف
ایسے شہروں پر نافذ ہوگی جہاں کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔ بعد میں اس کی توسیع
ممکن ہو سکتی ہے۔ لیکن فی الحال ایسے اضلاع کے لئے جہاں تفتیش سے متعلق عملہ امن و
امان قائم رکھنے سے متعلق عملہ سے الگ نہیں کیا جاتا ہے یہ تجویز ہے کہ وہاں تفتیش
کے لئے خصوصی دستے مقرر کردیے جائیں تاکہ تھانے داروں کو طویل اور پیچیدہ تحقیقات
میں وقت نہ صرف کرنا پڑے جس کی وجہ سے دوسرے معاملات کا نقصان ہوتا ہے۔

دوسری شکایت جو بار بار کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ پولیس کی تفتیش کے طریقے
پرانے ہیں جرائم کے مقدمات چشم دید شہادت اور مال کے برآمد ہونے پر دائر کیے جاتے
ہیں جس میں مشتبہ افراد سے استفسار کو نمایاں اہمیت دی جاتی ہے۔ تھانے دار کو ایسے
ذرائع حاصل نہیں ہیں جن کی وجہ سے وہ معاملے کے ان سراغوں کی گرفت نہیں کر سکتے
جو ظاہر نہیں ہیں لیکن جائے واردات پر مجرم اس طرح کے سراغ چھوڑتے ہیں اور بعض
سراغ ایسے ہوتے ہیں جن کی صرف ماہرین ہی گرفت کر سکتے ہیں۔ موجودہ نمونا ک
صورت حال کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ تھانوں کو کیمرے نہیں فراہم
کیے جاتے ہیں جس سے تفتیش پر مامور پولیس کے افسران جائے وقوعہ کے مناظر کی تصویریں
کھینچ سکیں۔ ماضی میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ تفتیش کے سلسلے میں سائنسی طریقہ کار کی
تربیت دی جائے لیکن سائنسی لائنوں پر تفتیش کے سلسلے میں ضروری ساز و سامان
کے فقدان کی وجہ سے یہ تربیت زیادہ کارآمد نہیں ثابت ہو سکی۔ پولیس کمیشن نے
سفارش کی ہے کہ سراغ رسی کے سلسلے میں تھانیداروں کو ضروری سامان کی بہم رسانی

اور میرٹ فراہم کئے جائیں۔ اب ہمیں پرانی تجربی سے عملدرآمد ہو رہا ہے جتنا ممکن ہے بھروسہ ساز و سامان کی ۵۰۰ پیٹیاں تھانے داروں کو تقسیم کرنے کے لئے تیار کروائی گئی ہیں اور مزید ۵۰۰ کا آرڈر دے دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ریاست نے دس بڑے شہروں میں گشتی سائنسی واحدے قائم کرنے کی سفارش بھی کی گئی ہے۔ ان واحدوں کو موٹر گاڑیاں فراہم کی جائیں گی جن میں آلات لگے ہوں گے۔ ان گاڑیوں کے لئے ماہرین کا بھی بندوبست ہوگا۔ ان واحدوں کو واقعی کارآمد بنانے کے لئے جمع شدہ معلومات کی جانچ اور رابطہ کے لئے تجربہ گاہوں کی ضرورت ہوگی۔ حکومت نے جرائم کی جانچ سے متعلق ایک تجربہ گاہ کے قیام کی منظوری دے دی ہے جہاں ماہرین جانچ کریں گے اور سراغوں کو رپورٹ دیں گے جو انہیں حاصل ہو سکے۔

ایک سنگل ڈیجیٹ فنگر پرنٹ سسٹم قائم کرنے کی بھی تجویز ہے۔ مزید برآں یہ بھی تجویز ہے کہ کتوں کے دستے قائم کیے جائیں۔ کہ مجرموں کی بو سے ان کا تعاقب کیا جا سکے۔

یہ انتہائی ضروری ہے کہ پولیس جائے واردات پر جلد از جلد پہونچ سکے تاکہ سراغوں کو محفوظ کیا جا سکے اور مجرموں کا سرگرم تعاقب کیا جا سکے۔ اس مقصد کے پیش نظر تھانوں میں ٹیلیفونوں کی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں اور جہاں ٹیلیفون نہیں لگائے جا سکتے ہیں وہاں وائرلیس سیٹ لگائے جا سکتے ہیں۔ یہ سفارش بھی کی گئی ہے کہ اگر تھانے داروں کے پاس بجائے گھوڑے کے موٹر سائیکل ہو تو ان کو بجائے گھوڑے کے بھتے کے موٹر سائیکل کا بھتہ دیا جائے۔ یہ اقدام پولیس کی تیز رفتاری سے نقل و حرکت اور اس کی کارکردگی میں اضافہ کرے گا۔

پولیس کے خلاف خاص شکایت یہ ہے کہ وہ دوران تفتیش میں مجرموں کے ساتھ تشدد اور برا برتاؤ کرتی ہے جہاں بھی اس قسم کا برا برتاؤ کیا جاتا ہے وہ تفتیش کے پرانے طریقوں کا نتیجہ ہے۔ سائنسی طریقے تفتیش کے سلسلے میں برے برتاؤ اور تشدد کے رجحان کا خاتمہ کر دیں گے اگر سچائی کا پتہ کسی دوسرے طریقے سے لگایا جا سکتا ہے تو یہ خرابیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ اس لئے یہ تجویز ہے کہ ضروری ساز و سامان سے لیس استفسار کے مراکز قائم کئے جائیں جہاں مشتبہ افراد سے سائنسی طریقوں کو کام میں لا کر انسانیت کے ساتھ استفسار کیا جا سکے۔

یہ عام شکایت ہے کہ پولیس بے گناہ افراد کو پھانس لیتی ہے اور ان کے خلاف شہادت تیار کر لیتی ہے۔ اس خرابی کی بیخ کنی اسی وقت ہو سکتی ہے جب بڑے افسروں کی نگرانی زیادہ سخت ہو جائے اور جو لوگ قصوروار رہیں ان کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ پولیس کمیشن نے سفارش کی ہے کہ گزیٹیڈ افسران کم از کم ۴ یا ۵ تھانوں پر مشتمل حلقوں کے نگراں بنا دیے جائیں۔ حکومت نے اس سفارش کو منظور کر لیا ہے اور بیشتر اضلاع میں اسے شروع کر دیا ہے۔ تمام ریاست میں اس اسکیم کی توسیع نئی بھرتی ملازمین کی ترقی کی وجہ سے کی ہوئی ہے۔ تکمیل کی طرح یہ احکام جاری کر دیے گئے ہیں کہ گزیٹیڈ افسر زیادہ سے زیادہ مقامات واردات کا معائنہ کریں اور تحقیقات کا زیادہ سے زیادہ نگرانی جو ممکن ہو سکے کریں۔ یہ اقدامات کافی حد تک تحقیقات و تفتیش کی بدعنوانیوں کی روک تھام کریں گے۔

موجودہ نظام کے تحت پولیس کے مقدمات کی پیروی ہمیشہ تسلی بخش نہیں ہوتی۔ اس وقت ان مقدمات کی پیروی کے لئے دو ایجنسیاں ہیں۔ ایک مجسٹریٹ کی سطح پر پبلک پراسیکیوٹر اور اسسٹنٹ پبلک پراسیکیوٹر اور سیشن کی سطح پر ضلع سرکاری وکیل اور منتخب فہرست نگار ہوتے ہیں۔ ان دونوں ایجنسیوں میں کچھ باہمی ربط کا ہونا ضروری ہے تاکہ شروع سے آخر تک مقدمات کی پیروی مؤثر طور پر کی جا سکے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ان ایجنسیوں کا پولیس سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے تاکہ عدالت میں محض حقائق پیش کئے جا سکیں۔ یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ افسر تفتیش مقدمہ میں فریق نہیں ہوتا۔ اس کا کام صحیح واقعات کا پتہ لگانا اور مقدمہ کو عدالت میں صحیح دینا ہوتا ہے۔ اسی طرح پیروی کار وکیل بھی حقیقت کا تعین نہیں کرتا۔ یہ کام عدالت کرتی ہے۔ تاہم پیروی کار وکیل کا فرض ہے کہ وہ عدالت کے سامنے حقائق پیش کر دے جیسا کہ جانتے ہیں تفتیش کرنے والے پولیس افسروں کو بہت سی قانونی اور دیگر بندشوں کے اندر کام کرنا پڑتا ہے۔

ملک کی بہبودی کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ ایسا بندوبست ہونا چاہیے جس سے پولیس کے مقدمے پوری تفتیش کے بعد عدالتوں میں پیش کئے جا سکیں۔ ایسی صورت میں ممکن ہو سکے گا جب پیروی اور تفتیش کرنے والی ایجنسیوں کے درمیان قریبی رابطہ قائم کر دیا جائے۔ حکومت ان مسئلوں پر بھی غور و خوض کر رہی ہے اور یہ امید کی جاتی ہے کہ اس سلسلے میں جلد ہی خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو جائے گی۔

آخر میں پولیس فورس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس امر سے متعلق کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ پولیس کے فرائض بہت سخت پر مشقت اور ناگوار ہوتے ہیں۔ پولیس کمیشن اور حکومت نے بھی اس کو محسوس کیا ہے اور سب انسپکٹروں، ہیڈ کانسٹبلوں اور کانسٹبلوں کی تنخواہ کے اسکیل بڑھا دیے گئے ہیں۔ حکومت نے پولیس فورس کے لئے مکانات کے انتظامات کو بھی بہتر بنانے کے لئے ایک بڑا پروگرام شروع کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فلاحی اور تفریحی سہولتوں میں بھی توسیع کی جا رہی ہے۔ اس لئے یہ امید کی جاتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد پولیس سروس کی چھوٹی چھوٹی سی جگہوں میں بھرتی ہوں گے تاکہ یہ عوام کی مؤثر خدمت کر سکے اور پولیس مین کے نام کے ساتھ جو بدنامی وابستہ ہے وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

بچت کی نئی اسکیم

میعاد اور رقم میں اضافہ

چھوٹی بچت کی ایک نئی اسکیم پہلی جون ۱۹۶۲ء سے شروع ہوگئی ہے۔ اس میں پندرہ برس تک ہر مہینے تین سو روپے تک رقم جمع کی جاسکتی ہے۔ دس برس والے کھاتے میں بھی ہر ماہ جمع کی جانے والی رقم کی حد دو سو روپے تک مقرر کر دی گئی ہے۔

انکم ٹیکس سے مستثنا

دس سالہ اور پندرہ سالہ کھاتے میں جمع کی جانے والی رقم اسی طرح انکم ٹیکس سے مستثنا رکھی گئی ہے جس طرح زندگی کی بیمہ قسط یا پراویڈنٹ فنڈ میں جمع کی جانے والی رقم انکم ٹیکس سے مستثنا ہے۔

سود بھی ٹیکس سے مستثنا

دس اور پندرہ سالہ کھاتے میں جو رقم جمع کی جاتی ہے اس پر بالترتیب ۳ر۸ فی صدی اور ۴ر۴ فی صدی سود در سود ملتا ہے جو انکم ٹیکس سے مستثنا ہے۔

تفصیلی معلومات کے لیے قریب کے
"ڈاک خانے کے بچت بینک" سے رجوع کریں

شایع کردہ: محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

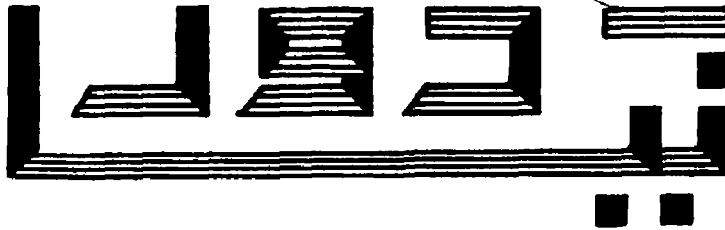
نومبر ۱۹۶۲ء

کارنگ ۱۸۰۰۴

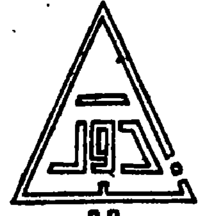


پنڈت نہرو اور بچے

دسمبر ۱۹۶۲ء



۵۰
نئے پیسے



جلد ۱۷ نمبر ۹

اگرہاینر ۱۸۸۴
دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
آمینہ بھوشن ملک
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ ہارج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ یو پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

عنوان

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں حکومت اترپردیش اُن سے بہرحال متفق ہو۔

اپنی دنیا

ہندوستان پر چین کا حملہ احسان فراموشی، جارحیت، بدعہدیوں اور دوستی کے پردے میں دشمنی کی بدترین مثال ہے۔ چین میں ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹ حکومت کے قیام کے بعد سے اب تک ہندوستان اور چین کی سرحد کے سلسلے میں جو مذاکرات اور جو واقعات ہوئے ہیں ان سے اس احسان فراموشی، جارحیت اور بدعہدی کا ثبوت ملتا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ان واقعات و مذاکرات کا ایک سرسری حوالہ دے دیا جائے۔ ہندوستان نے کمیونسٹ حکومت کے قیام کے بعد ہی اسے چین کی جائز حکومت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد ہندوستان نے اس امر کی بار بار کوشش کی کہ کمیونسٹ چین کو اقوام متحدہ میں شامل کر لیا جائے۔ نئے چین اور ہندوستان کے تعلقات خوشگوار تر بنانے کے لئے ہندوستان نے حکومت چین سے تبت کے بارے میں گفتگو کرنے کی پیش کش کی اور اس گفتگو کے نتیجے میں ۱۹۵۴ء میں ہندوستان اور تبت میں جو معاہدہ ہوا اس میں ہندوستان نے یہ تسلیم کر لیا کہ تبت چین کا ایک علاقہ ہے۔ ہندوستان اس معاہدے کے ماتحت تبت کے ان علاقوں سے بھی دست بردار ہو گیا جو حکومت برطانیہ کے ورثے کے طور پر اسے ملے تھے۔ اسی کے ساتھ ہندوستان اس پر بھی رضامند ہو گیا کہ ہندوستانی گشتی دستے جو اس وقت تک تبت کے بعض مقامات پر تعینات تھے ہٹا لئے جائیں۔ ہندوستان نے تبت میں ڈاک، تار اور ٹیلی فون سروسوں نیز ریسٹ ہاؤسوں کو بھی جو ہندوستان ہی کی ملکیت تھے برائے معاوضے چینی حکومت کو منتقل کر دیا۔ ہندوستان اور تبت کے اس معاہدے میں ہندوستان کے پانچ اصولوں (پنچ شیل) پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا۔ یہ پانچ اصول ہیں: ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت کا احترام، ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینا، ایک دوسرے کے علاقے پر جارحانہ اقدام نہ کرنا، اختلاف نظریات کے باوجود ایک دوسرے سے خوشگوار تعلقات قائم رکھنا اور ایک دوسرے کے مفاد اور بہبود کو پیش نظر رکھنا۔ اس کے بعد کمیونسٹ چین کے وزیر اعظم حکومت ہند کی دعوت پر ۱۹۵۴ء میں ہندوستان آئے اور پنڈت جواہر لال کا اور ان کا جو مشترکہ بیان باہمی گفت و شنید کے بعد شایع ہوا اس میں "پنچ شیل" پر کامل اعتماد کا پھر اظہار کیا گیا۔ اس تمام عرصے میں چین کی حکومت نے ہندوستان اور چین کی روایتی سرحد پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ تبت کے مسئلے پر ہندوستان اور چین میں جو بھی گفتگو ہوئی سرحد کا سوال کبھی نہیں اٹھایا گیا۔ وزیر اعظم نہرو نے ۲۰ نومبر ۱۹۵۰ء کو ہندوستان کی پارلیمنٹ (لوک سبھا) میں اعلان کیا تھا کہ "میک موہن لائن ہماری سرحد ہے" مگر چین نے اس اعلان پر بھی کوئی اعتراض یا احتجاج نہیں کیا۔ اس کے بعد تبت کے بارے میں جب چین اور ہندوستان سے معاہدہ ہوا تو اس وقت بھی چین نے سرحد کا کوئی سوال نہیں اٹھایا۔ لیکن ایک طرف تو سرحد کے سلسلے میں یہ خاموشی تھی دوسری طرف چین میں بعض ایسے نقشے شایع ہوئے جن میں ہندوستان کے بعض علاقوں کو چین کے علاقوں کی حیثیت سے دکھایا گیا تھا۔ وزیر اعظم نہرو جب ۱۹۵۴ء میں پیکنگ گئے تو انھوں نے وزیر اعظم چو این لائی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ وزیر اعظم چین نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ نقشے سابقہ حکومت (کومن تانگ) کے بنوائے ہوئے نقشوں کی نقل ہیں اور نئی حکومت کو ان پر نظر ثانی کا ابھی موقع نہیں ملا ہے۔ لیکن ان تمام یقین دہانیوں اور ہندوستان کے مصالحانہ اور دوستانہ رویے کے باوجود، جولائی ۱۹۵۴ء کو چین کی حکومت نے ریاست اتر پردیش میں بارہ ہوتی کے علاقے میں ہندوستانی فوجوں کی موجودگی پر اعتراض کر دیا۔ یہ گویا پہلا موقع تھا جب چین ہمارے ملک کے کسی علاقے پر اپنا دعویٰ کیا اور ہندوستان اور چین کے درمیان جو روایتی سرحد صدیوں سے چلی آ رہی ہے اس کی صحت پر معترض ہوا۔ یہ روایتی سرحد اور اس کی تاریخ کیا ہے؟ ہندوستان اور چین کے درمیان اس سرحد کی لمبائی ۲۵۰۰ میل ہے۔ اس سرحد کے تین حصے ہیں مشرقی، وسطی اور مغربی۔ مشرقی حصے میں اس کا تعین ۱۹۱۳ء-۱۴ء کی ایک سہ جماعتی کانفرنس میں ہوا جس میں حکومت ہند، حکومت چین اور تبت کے نمائندوں نے شرکت کی تھی۔ معاہدے پر تینوں ملکوں کے نمائندوں نے دستخط کئے تھے اور معاہدے کے ساتھ منظور شدہ سرحد کا نقشہ بھی شامل تھا۔ ہند چین سرحد کا یہ حصہ جو بھوٹان کے مشرق میں واقع ہے، کانفرنس میں حصہ لینے والے ایک برطانوی افسر کے نام پر میک موہن لائن کہلاتا ہے۔ وسطی منطقے کی سرحد، اتر پردیش، ہماچل پردیش اور پنجاب پر مشتمل ہے۔ سرحد کا یہ حصہ بھی ہمالیہ کے قدرتی آبی خط کی بنا پر متعین کیا گیا تھا اور اس کا وجود بھی بہت قدیم ہے جیسا کہ ہندوستان کے پرانے کاغذات مال سے پتہ چلتا ہے۔ مغربی حصے میں یہ سرحد ۱۱۰۰ میل لمبی ہے اور لداخ ۱۸۴۲ء کے اس معاہدے میں تسلیم کیا جا چکا ہے جو کشمیر کے نمائندے اور لاسا اور چین کے بادشاہ کے درمیان ہوا تھا۔ خود ۱۸۹۳ء، ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۹ء کے چینی نقشوں میں بھی یہ سرحد ہندوستانی نقشوں کے مطابق دکھائی گئی ہے۔ لیکن چین کی کمیونسٹ حکومت نے اس جانی بوجھی، قدیم اور تسلیم شدہ سرحد کی کھلی خلاف ورزی شروع کر دی اور چینی سپاہی ہندوستانی علاقوں میں داخل ہونے لگے۔ چین کے وزیر اعظم ۱۹۵۶ء میں پھر ہندوستان آئے اور جب وزیر اعظم نہرو نے ان کی توجہ اس طرف دلائی تو انھوں نے یہ کہا کہ ہم میک موہن لائن کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس یقین دہانی کے بعد بھی ہندوستانی علاقوں پر چینیوں کی پیش قدمی جاری رہی اور چین کے نقشوں میں ہندوستانی علاقوں کو چین کا علاقہ دکھایا جاتا رہا۔ آخر نوبت یہ آگئی کہ وزیر اعظم چین نے ۸ ستمبر ۱۹۵۹ء کو یہ لکھ دیا کہ سرحد کے بارے میں ہندوستان اور چین سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ہندوستان کے ۵۰ ہزار مربع میل سے زیادہ کے علاقے کے متعلق یہ دعویٰ کیا کہ وہ چین کا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ ہندوستان کے لئے نہ صرف تعجب انگیز تھا بلکہ ناقابل قبول بھی۔ لیکن امن برقرار رکھنے کی خاطر حکومت ہند نے چین کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ لداخ کے علاقے میں اپنی فوجیں اس روایتی سرحد تک ہٹا لے جو ہندوستانی نقشوں میں دی ہوئی ہے اور ہندوستان اپنی فوجیں اس حد تک ہٹالے جہاں تک چین کا دعویٰ ہے کہ یہ اس کی سرحد ہے تاکہ لڑائی کا اندیشہ نہ رہے۔ لیکن چین نے اس معقول تجویز کو نہیں قبول کیا۔ وزیر اعظم نہرو نے اس کے بعد وزیر اعظم چین کو گفتگوئے مفاہمت کے لئے دہلی آنے کی دعوت دی اور اپریل ۱۹۶۰ء میں دونوں میں اس مسئلے پر بات چیت بھی ہوئی مگر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ البتہ یہ طے ہوا کہ دونوں ملکوں کے افسران پرانے دستاویزات کی روشنی میں سرحد کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کریں۔ ہندوستان کی طرف سے افسروں کی بات چیت میں قدیم دستاویزات، کاغذات اور نقشے پیش کئے گئے مگر چینی افسروں نے کسی بات کو نہیں مانا اور چینی سپاہیوں نے اس اثنا میں ہندوستانی علاقوں میں اپنی پیش قدمی برابر جاری رکھی یہاں تک کہ ۲۰ اکتوبر کو چینی فوجوں نے ہندوستان پر باقاعدہ منظم حملہ کر دیا۔ یہ پانی کا سر سے اونچا ہو جانا ہے۔ ہندوستان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے اور پوری قوم ایک متحدہ عزم کے ساتھ حملہ آور کا مقابلہ کرنے اور اپنے وطن کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے کمربستہ ہو گئی ہے۔ ہم حق پر ہیں اور فتح حق کی ہوگی۔ لیکن اس کے لئے ہم کو قربانیاں دینی ہوں گی، ایثار کرنا ہوگا اور وطن کے مفاد کو اپنے ہر مفاد، یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی مقدم سمجھنا ہوگا۔ اس موقع پر ہمارے ادیبوں اور شاعروں پر بھی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انھوں نے آزادیٔ وطن سے قبل حریت نواز اور قوم پرورانہ نظمیں کہیں اور مضامین لکھے۔ حصول آزادی کے گیت سنائے اور اب وطن کی آزادی خطرے میں ہے ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے ولولہ انگیز تخلیقات اور نگارشات سے عوام میں مادر وطن کی حفاظت کے جذبے کو تیز تر کریں اور ان کو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس دلائیں۔

مطرب رہ کہاں اب بزم طرب تکلیف رہ پُرخار اُٹھا
ساقی یہ زمانِ عیش نہیں شیشہ نہ اٹھا تلوار اُٹھا

ایڈیٹر

امتحان کا وقت

پنڈت جواہر لعل نہرو

پنڈت جواہر لال نہرو، وزیر اعظم ہند نے ۲۲ اکتوبر کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے چین کے جارحانہ حملے کے بارے میں قوم کے نام ایک پیغام نشر کیا۔ اُن کی انگریزی تقریر کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

ساتھیو، دوستو اور ہم وطنو !

" میں بہت دنوں بعد آپ سے ریڈیو پر بات چیت کر رہا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ چینی فوجوں کی مسلسل اور شرم ناک جارحیت کے سبب ہماری سرحدوں پر جو سنگین صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے اس کے بارے میں آپ سے بات کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے جس کا مؤثر طور پر مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک کے لوگ امن پسند ہیں اور امن پسند طریقوں کے عادی رہے ہیں۔ اسی سبب پانچ سال پہلے جب لداخ میں ہماری سرزمین پر حملہ ہوا تب بھی ہم نے پُر امن پالیسی پر قائم رہنے کی کوشش کی۔ ہم نے پُر امن طریقوں سے باعزت تصفیہ کرنے کی کوشش کی۔ دُنیا کے ہر مسئلے میں ہماری یہی پالیسی رہی ہے۔ اپنے ملک میں بھی ہم نے اسی پالیسی پر چلنے کی کوشش کی۔ آج کی اس دُنیا میں جنگ کی ہولناکیوں سے ہم واقف ہیں اور ہم نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی کہ دُنیا جنگ کی لپیٹ میں نہ آنے پائے۔

لیکن جہاں تک ہماری اپنی سرحد کا سوال ہے ہماری ایسی ساری کوششیں رائیگاں گئیں کیوں کہ اس سرحد پر ایک طاقت ور اور بے شرم دشمن نے جسے امن اور پر اُمن طریقوں کا کوئی پاس و لحاظ نہیں ہے، ہمیں مسلسل دھمکیاں دیں اور ان دھمکیوں پر عمل بھی کیا۔ اس لیے اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس خطرے کا پوری طور پر احساس کریں جو عوام کی آزادی اور ہمارے ملک کی آزادی کو لاحق ہو گیا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ دُنیا کی کوئی طاقت ہم سے ہماری اُس آزادی کو نہیں چھین سکتی جو ہم نے ایک لمبے عرصے کی غیر ملکی غلامی کے بعد مصیبتیں اُٹھا کر، جد و جہد کر کے اور قربانیاں دے کر حاصل کی ہے۔ لیکن اس آزادی کو اور ملک کے ہر حصے کو ملک میں رکھنے کے لیے ہمیں پوری تیاری کرنی ہے، کمر کسنی ہے اور اُس سب سے بڑے خطرے کا سامنا کرنا ہے جس سے ہم اپنی آزادی کے بعد دو چار ہوئے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ ہم کام یاب ہو کر رہیں گے۔ دوسری ہر چیز کا اُس کے بعد نمبر ہے کیوں کہ سب میں پہلی چیز ہمارے عوام کی اور ہمارے ملک کی آزادی ہے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو ہم ہر چیز کو اس پر نچھاور کر دیں گے۔

ہندوستان کا قابلِ تعریف کردار ۔ میں یہاں پچھلے پانچ برسوں میں چین کی مسلسل جارحیت کی طویل تاریخ اور چینیوں نے اپنی تقریروں، غلط بیانیوں اور ہمارے ملک کے خلاف نفرت و حقارت کی باقاعدہ مہم چلا کر اپنی کارروائی کو حق بجانب قرار دینے کی کس کس طرح کوشش کی، یہ سب نہیں بیان کرنا چاہتا۔ تاریخ میں ایسے کردار کی شاید زیادہ مثالیں نہیں ملیں گی جیسا کہ بھارت نے چین کے معاملے میں پیش کیا ہے۔ چینی عوام اور حکومت کی دوستی اور اُن سے تعاون کی خاطر بھارت نے انتہائی حد تک کوشش کی۔ دُنیا کی کونسلوں میں اُن کی حمایت کی، اور اُس کا چینی حکومت نے یہ جواب دیا کہ بھلائی کے بدلے میں بُرائی کی حتی کہ ہماری مقدس سرزمین پر حملہ کر دیا۔ کوئی خود دار ملک خاص طور سے ہندوستان جسے اپنی آزادی سے پیار ہے ان حرکتوں پر خاموش نہیں رہ سکتا چاہے اس کے نتائج کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔

لداخ کی سرحد پر پانچ سال سے چینی جارحیت جاری ہے لیکن نیفا

(شمالی مشرقی سرحدی ایجنسی) کی سرحد بہت حد تک اس جارحیت سے محفوظ تھی۔ ایسے وقت پر جب کہ ہم کشیدگی کو کم کرنے کے طریقوں اور ذریعوں کی کھوج میں تھے اور دونوں حکومتوں کے نمائندوں کی ملاقات کا بھی امکان پیدا ہو چلا تھا، اس سرحد پر ایک نیا اور تازہ حملہ کر دیا گیا۔ یہ حملہ پچھلے ماہ ستمبر کی آٹھ تاریخ کو شروع ہوا۔ کشیدگی کو کم کرنے کا یہ عجیب طریقہ معلوم ہوتا ہے اور ہمارے ساتھ چین نے جس طرح سلوک کیا ہے اس کا یہ انداز ہے۔

واضح سرحد ۔ نیفا کے علاقے میں چین کے ساتھ ہماری سرحد بالکل واضح اور عرصۂ دراز سے متعین ہے۔ اس کو میک مہن لائن بھی کہتے ہیں۔ یہ لائن جو تبت اور بھارت کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے، چوٹیوں پر سے ہوتے ہوئے دریائی پانی کے منبعوں کو تقسیم کرتی جاتی ہے۔ اس کے میک مہن لائن کہلانے سے کافی عرصہ پہلے ہی تاریخ، رواج اور معاہدوں کے تحت دونوں ملکوں کے درمیان اسی سرحد کو تسلیم کیا گیا ہے۔ چینیوں نے بھی اس کو "غیر قانونی" قرار دینے کے باوجود کئی طور سے اسے قبول کیا ہے۔ اپنے نقشوں میں چینیوں نے نیفا کے ان علاقوں پر دعویٰ کیا جو عرصۂ دراز سے ہمارے نظم و نسق کے تحت رہے ہیں۔

"موجودہ چینی حکومت بارہ سال پہلے قائم ہوئی۔ اس سے پہلے تبتیوں نے اس سرحد پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ چینیوں نے بھی جو نقشے پیش کیے تھے اُن کے بارے میں انھوں بار بار تسلیم کیا تھا کہ وہ پُرانے، فرسودہ اور آج کے لحاظ سے بالکل بے جوڑ ہیں۔ اس کے باوجود اس پُرامن سرحد پر جہاں طویل عرصے سے کبھی کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا، چینیوں نے حملہ کیا۔ یہ حملہ بڑی تیاریوں اور ایک کثیر فوج کو لے کر کیا گیا تھا۔

فتح ہماری ہوگی ۔ مجھے اس سرحد پر اپنے فوجیوں کو پیش آنے والی ناکامیوں پر افسوس ہے۔ زیادہ تعداد، بھاری اسلحہ اور توپ خانے کی وجہ سے چینی فوجیں ہمارے سپاہیوں پر غالب آ گئیں۔ دشمن کی کثیر فوج کا ہمارے افسروں اور سپاہیوں نے جس جرأت و شجاعت سے مقابلہ کیا ہے اس پر میں انھیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ اس علاقے میں کچھ اور پسپائیاں بھی ہو سکتی ہیں لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کشمکش میں آخرکار ہماری ہی جیت ہوگی۔ جب بھارت جیسی قوم اپنی آزادی اور علاقائی سالمیت کی حفاظت کے لیے ہتھیار اٹھا لیتی ہے تو اس کے سوا کوئی اور نتیجہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمیں ایک طاقت ور اور بے شرم دشمن سے سابقہ پڑا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جھگڑا لمبے عرصے تک جاری رہے۔

ہمیں اس کے لیے ذہنی طور پر دوسری طرح تیار رہنا چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ یقین محکم اور تیاریوں کی بنا پر فتح ہماری ہوگی۔ اس کے علاوہ کسی اور نتیجے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا یہی اعتقاد ہونا چاہیے اور ہمیں مصمم عزم کر لینا چاہیے کہ ہم اپنے ملک کو حملہ آور سے نجات دلائیں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اس سلسلے میں کرنا کیا ہے؟ ہمیں اپنے عزم [?] کو فولادی بنا لینا ہوگا اور قوم کی طاقت اور وسائل کو اسی ایک مقصد میں لگا دینا ہوگا۔ ہمیں زمانۂ امن کے سست رفتار طریق کار کو ترک کر کے ایسے طریقے اپنانا ہوں گے جن کے نتائج فوری طور پر برآمد ہوں۔ ہمیں اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لیے تمام ممکن ذرائع استعمال کرنے ہوں گے۔

عوام کے فرائض ۔ لیکن اکیلی فوجی طاقت کافی نہیں۔ ملک کی صنعت بھی اس کے پشت پر ہونی چاہیے اور ہمیں بہتر طور پر اپنی پیداوار بڑھانی چاہیے۔ میں اپنے تمام کارکنوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہڑتالیں نہ کریں اور نہ کوئی ایسا کام کریں جس سے پیداوار کے اضافے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔ پیداوار سے مراد صرف کارخانوں ہی کی نہیں بلکہ کھیتوں کی پیداوار بھی ہے۔ جب قوم کو خطرہ لاحق ہو تو کسی قسم کی ملک دشمنی اور غیر سماجی سرگرمیاں برداشت نہیں کی جا سکتیں۔

ہم سب کو، چاہے ہم کوئی بھی کام کرتے ہوں، ایک بارِ عظیم اٹھانا ہے۔ ہمیں آزادی کی پوری پوری قیمت دینی ہوگی۔ اور اپنے عوام اور مادرِ وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قیمت بھی دی جا سکتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ملک میں تمام جماعتیں اور گروہ اس کارِ عظیم میں کندھے ملا کر چلیں گے اور اپنے اختلافات کو جن کی آج کوئی جگہ نہیں ہے بالائے طاق رکھ کر ان سب کے مقابلے میں، جو ہماری آزادی اور سالمیت کو خطرے میں ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں، ایک مضبوط و متحدہ محاذ قائم کریں گے۔

ہمیں جو بوجھ اٹھانا پڑے گا وہ بہت بھاری ہوگا۔ ہمیں چاہیے کہ پیداوار کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے بانڈ خرید کر اپنی بچت کو کافی بڑھائیں اور قومی دفاع کے بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کریں۔

ہمیں قیمتوں کو چڑھنے نہ دینا چاہیے اور ہمیں اس کا احساس ہونا چاہیے کہ جب ملک کو مشکلات درپیش ہوں تو اس وقت موقع سے فائدہ اٹھانے والے ملک کے دشمن ہیں اور قوم کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

ہم تیسرے منصوبے کے وسط میں ہیں۔ اس منصوبے کو ترک کر دینے

یا اس کی کسی اہم مد کو گھٹا دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم اس میں کہیں کہیں نئی ضروریات کے مطابق ردوبدل کر سکتے ہیں لیکن منصوبے کی بڑی بڑی مدوں کو سرانجام دینا ہی ہوگا کیونکہ ہم اسی صورت میں نہ صرف موجودہ بحران میں بلکہ آنے والے سالوں میں بھی اپنے ملک کو مضبوط بنا سکتے ہیں۔

ہمارے عوام کو اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ میں ان میں سے کچھ کی نشان دہی بعد میں کر سکوں گا۔ لیکن ہمارے لئے بڑی چیز یہ ہے کہ ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کا عزم کرلیں اور اس مقصد کے لئے سخت جدوجہد کریں۔ اس کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔ ہم اس وقت تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے جب تک ہماری جیت نہیں ہوتی کیونکہ ہم جارح یا غیروں کی غلامی کے سامنے سر نہیں جھکا سکتے۔

مستقبل پر اعتماد۔ ہمیں کسی قسم کی گھبراہٹ کا شکار نہ ہونا چاہئیے کیونکہ گھبراہٹ ہمیشہ بری ہوتی ہے۔ گھبراہٹ کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ ہماری پشت پر ایک متحد قوم کی طاقت ہے۔ ہمیں اس پر خوش ہونا چاہیئے لہٰذا ہمارے آج کے بڑے کام یعنی اپنی مکمل آزادی اور سالمیت کی حفاظت اور ہندستان کی مقدس سرزمین پر جارحانہ اقدام کرنے والوں کو ہٹانے میں صرف کرنا چاہئیے ہمیں اس کا مقابلہ معمولی طرح سے نہیں بلکہ سنجیدگی، مضبوط دل اور اپنی جدوجہد کی راستی اور اس جدوجہد کے انجام پر اعتماد رکھ کر کرنا ہوگا۔ افواہوں پر یقین کیجئے۔ کمزوردلوں کی باتوں پر کان نہ دھریئے۔ یہ ہم سب کی آزمائش کا وقت ہے اور ہمیں اس کام میں منہمک ہو جانا ہے۔ شاید ہم کچھ سہل پسند ہوتے جا رہے تھے اور بہت سی چیزوں کے متعلق فرض کرلیتے تھے کہ یہ تو ہو ہی جائے گا۔ لیکن آزادی کے متعلق اس طرح فرض نہیں کرلیا جاتا۔ اس کے لئے ہوش مندی، مضبوطی اور سختیاں جھیلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں آپ سب کو چاہے آپ کسی بھی مذہب، جماعت یا گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، اس لڑائی میں جس میں ہم کو لپیٹ لیا گیا ہے ایک دوسرے کا رفیق کار بننے کی صلائے عام دیتا ہوں۔ مجھے اپنے عوام پر اور ملک کے مستقبل پر پورا اعتماد ہے اور موجودہ صورت حالات میں سرخروئی کا یقین بھی۔ شاید اس مستقبل کے لئے کسی ایسی ہی آزمائش اور عزم کی ضرورت ہے۔

ہم ناوابستگی کی پالیسی پر کاربند رہے ہیں اور سبھی اقوام کی دوستی کے خواہاں رہے ہیں۔ مجھے اس پالیسی پر پورا اعتماد ہے اور ہم اس پر بدستور کاربند رہیں گے۔ ہم موجودہ مشکلات کی وجہ سے اپنے بنیادی اصولوں کو ترک نہیں کریں گے۔ اس پالیسی پر قائم رہنے سے ہم اس مشکل صورت حال کا مقابلہ بھی زیادہ موثر طور پر کر سکیں گے۔

میں آپ کی بھلائی کا متمنی ہوں اور چاہتا ہوں کہ آنے والے دنوں میں ہم پر جو کچھ بھی بیتے اس کا ہم ڈٹ کر مقابلہ کریں اور اپنے ملک کے عظیم مستقبل میں پورا پورا اعتماد رکھیں۔

جے ہند

عوام سرحد کی حفاظت کے لیے تیار رہیں

" ہماری شمالی سرحد پر ایک ایسے ملک نے دغابازی سے شرمناک اور جارحانہ اقدام کیا ہے جس کی جانب ہم نے ہمیشہ دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ یہی نہیں بلکہ اُسے پنچ شیل کے اعلیٰ اصُول بھی بتائے۔ چین نے اس نیکی کا بدلہ بُرائی سے اور دوستی کا بدلہ جارحیت سے دیا۔ دُنیا کی تاریخ میں ایسے دغابازانہ اور بزدلانہ حملے کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

" ... وقت کا یہ اہم تقاضا ہے کہ ہر فرد فضول خرچی سے احتراز کرے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کفایت شعاری سے کام لے اور پیداوار بڑھائے۔ بیوپاری نفع خوری اور ذخیرہ اندوزی سے دور رہیں۔ . . . . نوجوان ہمہ وقت تیار رہیں کیوں کہ انھیں اس نازک وقت میں اہم رول ادا کرنا ہے۔ ... خواتین گھریلو اخراجات میں زیادہ سے زیادہ کمی کریں اور اپنی بچت کو چھوٹی بچت اسکیم میں لگائیں۔ ... عوام قوم دشمن عناصر سے چوکنا رہیں اور ان پر کڑی نظر رکھیں۔"

شری سی، بی گپتا وزیر اعلیٰ اترپردیش
ایک براڈ کاسٹ کا اقتباس

آزادی اور اتحاد

حبیب احمد صدیقی

آدمی کا عقل و دانش میں بہت ہے یوں تو نام — سب سے اونچا ہے تو مخلوقات میں اس کا مقام
آدمیت کو وہی لیکن مٹاتا ہے مدام — آدمی ہی ابنِ آدم کو بناتا ہے غلام

کتنی ماؤں کی اُمیدوں کے اُجڑ جاتے ہیں باغ — کھانے پڑتے ہیں ہزاروں کو غمِ فرقت کے داغ
ٹوٹ جاتے ہیں مسرت سے بھرے لاکھوں ایاغ — تب کہیں جلتا ہے آزادی کا ملکوں میں چراغ

ایک مدت میں جلا ہے یہ چراغ اپنے یہاں — نور سے اس کے ہے اپنی انجمن رشکِ جناں
اس کی تابش سے منور ہے حریمِ قلب و جاں — روشنی میں اس کی چلتا ہے ہمارا کارواں

جد و جہدِ زیست میں کم زور ہونا جرم ہے — اپنی مجبوری و محرومی پہ رونا جرم ہے
باہمی نفرت کا دل میں بیج بونا جرم ہے — پا کے آزادی اسے غفلت سے کھونا جرم ہے

قوتِ بازو پہ ہر شے کا یہاں ہے انحصار — قوتِ بازو پہ تخت و تاج ہوتے ہیں نثار
قوتِ بازو سے ہے دنیا میں عزت و افتخار — قوتِ بازو نہ ہو تو کون سنتا ہے پکار

مملکت کو آزاد رکھنے کو فراست چاہیے — علم و حکمت چاہیے، عقل و ذہانت چاہیے
دل میں ہر اہلِ وطن کے عزم و ہمت چاہیے — سب سے بڑھ کر یہ کہ آپس میں محبت چاہیے۔

تنگ چشمی کے بجائے چاہیے اب اتحاد — جس میں ہو بغض و کدورت دل نہیں ہوتا وہ شاد
اُلفتِ باہم بڑھاؤ گے تو پاؤ گے مراد — زندہ باد، اے جذبۂ مہر و محبت! زندہ باد

مکند لال فدوی لاہوری

راز یزدانی

منشی مکند لال فدوی، سودا کے ایک مشہور ہم عصر تھے۔ اُن کا ذکر اردو کے مختلف تذکروں میں پایا جاتا ہے۔ فدوی کی جائے پیدائش لاہور ہے۔ ابتدائے سن شعور سے پہلے وہ کسی خاص وجہ سے کسی مرزا کے خانہ زاد کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے۔ ممکن ہے کہ اس میں ماں باپ کی قبل از وقت موت یا کسی ایسے ہی حادثہ کو دخل ہو۔ بہرحال چوں کہ طبیعت شاعری کے لئے مناسب پائی تھی لہذا وہ دہلی آکر صابر علی شاہ صابر کے شاگرد ہوئے اور زندگی کی ابتداء یوں ہوئی کہ نواب ضابطہ خاں کے اصطبل میں بارگیری پر (گھوڑوں کی مالش کی خدمت پر) ملازم ہوئے۔ شاعری کی وجہ سے ان کا تقرب حاصل کیا اور اُنکی فرمائش پر مثنوی یوسف زلیخا (مصنفہ جامی) کا اردو نظم میں ترجمہ شروع کیا جو نامکمل رہا اور اب ناپید ہے۔ ممکن ہے کہ فدوی نے بادشاہ کی مدح میں کوئی قصیدہ بھی کہا ہو اور ضابطہ نے اپنے اثر و رسوخ سے اس پر انعام بھی دلوا دیا ہو لیکن اس مثنوی کے نامکمل رہنے کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ فدوی کے مربی نواب ضابطہ خاں کی طرز الآن کی بساط اُلٹ گئی۔ ضابطہ خاں نجیب آباد چلے گئے اور فدوی مراد آباد آبسے۔ لیکن جلد ہی وہ کسی اور مربی کی تلاش میں آنولہ آگئے جہاں نواب محمد یار خاں امیر کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔ مگر یہ ملازمت کچھ مہینے ہی باقی رہی اور کسی نامعلوم وجہ سے ختم ہوگئی۔

اُس زمانہ میں دہلی سے جو صاحب کمال نکلتا تھا وہ فرخ آباد یا فیض آباد کا رخ کرتا تھا۔ فدوی بھی کھیڑے سے نکلے تو انھوں نے فرخ آباد کا رُخ کیا۔ فرخ آباد جانا فدوی کی زندگی کا سب سے منحوس واقعہ ثابت ہوا کیونکہ یہاں ان کی نظم کردہ مثنوی، جسے وہ اپنے فن کا شاہکار سمجھ کر ہر ایک کو سناتے تھے سودا کے ایک شاگرد میر فتح علی شیدا نے حرف گیری کر دی۔ اسے فدوی نے خاموشی سے برداشت نہیں کیا۔ انجام کار سودا سے ہجو کا معرکہ شروع ہو گیا اور فدوی لکھنؤ چلے گئے۔ لیکن لکھنؤ جانا بھی فدوی کو راس نہ آیا کیونکہ جلد ہی نواب احمد خاں بنگش کا انتقال ہو گیا اور سودا کے مربی، دیوان مہربان رند کی بساط دیوانی اُلٹ گئی جس کے بعد سودا نے بھی لکھنؤ کا رُخ کیا۔ لکھنؤ میں سودا، نواب اودھ کے مہمان اور درباریوں میں شامل ہو گئے۔ معلوم نہیں کیوں اس کے بعد فدوی کی لکھنؤ والی ملازمت باقی نہ رہی۔ ممکن ہے کہ فدوی کو لکھنؤ سے نکلوانا سودا کے جائز یا ناجائز اثر و رسوخ کا نتیجہ ہو۔ بہرحال فدوی کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ ان کی موت کے متعلق دو روایتیں مشہور ہیں ایک تو یہ کہ فدوی مراد آباد آکر فوت ہو گئے، دوسری یہ کہ بریلی میں قتل کر دیئے گئے۔ مجھے دوسری روایت میں وزن نظر آتا ہے کیوں کہ وہ فدوی کی لڑاکا طبیعت کے مطابق ہے۔

فدوی کی پیدائش اور رحلت کا سن قطعی نامعلوم ہے لیکن بعض دوسرے واقعات سے ہم اس کا اندازہ ضرور کر سکتے ہیں کیوں کہ ان واقعات کے صحیح سن ہمیں معلوم ہیں، مثلاً، سکرتال پر ضابطہ خاں کی شکست کی تاریخ یکم ماہ شوال ۱۱۸۵ھ ہے۔ یہی سال نواب احمد خاں بنگش کی رحلت کا ہے جس کے بعد سودا لکھنؤ پہنچے اور مہربان رند کے عروج کا ستارہ فرخ آباد کے اُفق سے غروب ہوا۔ مصحفی کے آنولہ سے

لکھنؤ جانے کا زمانہ بھی یہی ہے کیونکہ ضابطہ خاں کی شکست کے بعد ہی نواب محمد یار خان آمیر آنولہ سے ٹانڈہ چلے گئے۔ اس طرح ۱۱۹۵ء ہی وہ سال ہے جس میں مصحفی نے فدوی سے آنولہ میں ملاقات کی اور آنولہ سے فدوی کا فرخ آباد جانا اور وہاں سے لکھنؤ پہنچنا اور لکھنؤ سے نکلنا سب ۱۱۹۵ء کی باتیں ہیں اور ۱۱۹۵ء میں مصحفی لکھتے ہیں کہ فدوی کی عمر پچاس سے متجاوز تھی — دوسرے تذکرہ نویسوں نے اُسکی موت پچاس برس کی عمر میں لکھی ہے۔ ممکن ہے کہ اپنی ناعاقبت اندیشی اور طبعی عیاشی سے فدوی پچاس برس کی عمر میں مصحفی کو پچاس سے متجاوز معلوم ہوتے ہوں۔ بہرحال یہ قرین قیاس ہے کہ وہ ۱۱۸۵ء میں پچاس نہ سہی باون ترپن برس کے تھے۔ ان کی رحلت بھی ۱۱۹۵ء کے لگ بھگ معلوم ہوتی ہے۔ اگر ہم ان کی عمر چون برس مان لیں اور زیادہ سے زیادہ ۱۱۸۶ء کو ان کا سالِ رحلت تو سنِ پیدائش کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ صحیح صحیح تو نہیں لیکن اندازاً ان کی پیدائش ۱۱۳۲ء میں مفہوم و متیقن ہوتی ہے اور رحلت ۱۱۹۶ء میں۔

فدوی کے حالات زندگی کہیں ایک جگہ تفصیل کے ساتھ نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے نام، جائے پیدائش، سنِ ولادت اور سنِ وفات کے بارے میں اس قدر اختلافات پائے جاتے ہیں کہ قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا ناممکن ہوگیا ہے۔ بہرحال سطور بالا میں فدوی کے جو حالات زندگی درج کئے گئے ہیں وہ اُن مختلف تذکروں سے اخذ و استنباط کا نتیجہ ہیں جن میں مکندلال فدوی لاہوری کا ذکر ملتا ہے۔ فدوی کا ذکر جن تذکروں میں پایا جاتا ہے وہ سنِ تصنیف کے لحاظ سے ترتیب وار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

	نام	مصنف	سن تصنیف
(۱)	گلزار ابراہیم	امین الدولہ علی ابراہیم خاں بہادر	۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۴ء
(۲)	تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن	۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء
(۳)	تذکرہ ہندی گویان	مصحفی	ابتدا ۱۲۰۱ھ انجام ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴-۹۵ء
(۴)	گلشنِ ہند	مرزا علی لطف	۱۲۱۵-۱۷ھ
(۵)	مجموعۂ نغز	حکیم سید ابوالقاسم عرف میر قدرت اللہ قادری	۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶-۰۷ء
(۶)	دستور الفصاحت	حکیم احمد علی یکتا لکھنوی	۱۲۲۳ھ
(۷)	تاریخ فرخ آباد	میر ولی اللہ فرخ آبادی	۱۲۴۳ھ
(۸)	گلشن بے خار	نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ	۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۴-۳۵ء
(۹)	طبقات الشعرا	تاریخ شعرائے اردو مصنفہ فیلن کا ترجمہ مترجمہ مولوی کریم الدین	۱۸۴۸ء
(۱۰)	سخن شعراء	مولوی عبدالغفور نساخ	۱۲۷۱ھ
(۱۱)	یادگار الشعراء	شاہ اودھ کے کتب خانہ کی فہرست مرتبہ اسپرنگر کے اس حصہ کا ترجمہ جو شعرائے ریختہ کے حال پر مشتمل ہے	۱۲۹۱ھ
(۱۲)	شمیم سخن	مولانا عبدالحیٔ بدایونی	۱۳۰۱ھ / ۱۸۷۰-۷۱ء
(۱۳)	آب حیات	مولانا محمد حسین آزاد	۱۸۸۰ء / ۱۲۹۷-۹۸ھ
(۱۴)	گل رعنا	مولانا حکیم سید عبدالحیٔ	۱۳۵۳ھ / ۱۹۲۴-۲۵ء
(۱۵)	مرزا محمد علی فدوی	ڈاکٹر سید محمد حسنین	۱۷ جون ۱۹۵۶ء

اس فہرست کی رو سے اولیت کا شرف گلزار ابراہیم کو حاصل ہے لیکن اسی فہرست کی رو سے زیادہ مستندات مصحفی کے تذکرۂ ھندی گویان کی مانی جاسکتی ہے کیوں کہ مصحفی کی ذاتی ملاقات فدوی سے اس زمانہ میں ہوئی تھی جب وہ نواب محمد یار خان امیر کے ملازم اور اُن کے شعرائے دربار کی فہرست میں داخل تھے اور مصحفی خود اس حلقہ کے سرحلقہ فہرست تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا تذکروں میں جو کچھ فدوی کے متعلق ہے یہاں درج کر دیا جائے اور پھر ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے۔

" فدوی لاہوری مردے بود برخود غلط۔ برائے مباحثہ از مرزا محمد رفیع

سوّدا در فرخ آباد آمد و ذلت کشیدہ بوطنِ خود برگشت ۔ یوسف زلیخا ریختہ گفتہ و میر فتح علی شیدا در ہجو او قصۂ بوم و بقال نظم نمودہ"

(گلزار ابراہیم (صفحہ ۱۱۰)

" مردے بود برخود غلط ۔ برائے مباحثہ و مجادلہ بہ فرخ آباد پیش مرزا محمد رفیع سلمہٗ آمدہ ہنگامہ نمودہ و بعد از ذلت بسیار بوطنِ خود برگشت۔ یوسف زلیخا بزبانِ ریختہ گفتہ بود و بہمہ عالم می نمود کسے کہ از و لطف داشت از و محفوظ نشد ۔ حالا معلوم نیست کہ زندہ است یا مردہ ۔ میر فتح علی شیدا ہجو او خوب کردہ است و قصہ بوم و بقال حسب حال او درج نمودہ است "(تذکرۂ شعرائے اردو ۔ میر حسن صفحہ ۱۲۰)

" فدوی لاہوری شاگرد صابر علی شاہ صاؔبر تخلص ۔ گویند بقال پسرے بود ۔ نومسلمان شدہ و بغلامی مرزائے نام برآوردہ تربیت یافتہ ۔ مرزا محمد رفیع در ہجو او مذکور بقال و بوم آوردہ ۔ این کنایہ دلیل ساطع بر مقولہ مولف است ۔ الحاصل چوں ازاں اطراف اوردہ شدہ بملک ہندوستان رسید ۔ دعوائے شاعری خیلے در دماغش داشت و زیادہ از مرتبہ شاعری قدم در راہ امرد پرستی می گزاشت ۔ چند جا خانہ جنگی ہم کردہ ۔ بجو دکان حسین تعشق ارزیدہ ۔ اکثر اعضایش دیدم کہ مجروح بودند ۔ درایامیکہ از شاہ جہاں آباد بکھیڑ آمد دراں روزہا نقیر در آنولہ بود کہ شورش او بسمع برسیدہ ۔ آخر روزے برائے دیدنش رفتم ۔ اوباش چند گرد او نشستہ دیدم ۔ صحبت شعر درمیان آمد ۔ بعد روزے چند شنیدم کہ بہ سرکار نواب محمد یار خاں کہ ذکر ایشاں گزشت نوکر شد ۔ ہر گاہ بعد دو ماہ میاں محمد قائم و غیرہ فقیر ہم باریاب مجلس ایشاں بودند ۔ بہ سبب برہم زدگی مزاج نواب کہ بیان آں موجب تطویل است برخاستہ رفت و بعد شکست ضابطہ خاں در سکر تال از مرہٹہا بابل طبعی در قصبہ مراد آباد در گزشت ۔ عمرش از پنجاہ سال متجاوز خواہد بود ۔ در گفتن قطعہ طویل در ہر غزل ید طولیٰ داشت و نازش شاعری او اکثر ہمیں بود ۔ حسب فرمائش نواب ضابطہ خاں کہ پیش ازیں چندے رفیق ایشاں نیز بودہ است مثنوی یوسف زلیخا را بزبانِ ہندی نظم می کرد چنانچہ او ناتمام ماندہ ۔ کلامش بزبان بازباں بسیار دارد و ساز است " تذکرۂ ہندی گویاں صفحہ $\frac{۱۶۶}{۱۶۸}$

" بقال پسرے بود ۔ از نواح پنجاب کہ بر بنائے سعادت ازلی و عنایات لم یزلی بہ تاثیر صحبت اسلامیاں رشتۂ اطاعت دین مبین بگردن جان افگندہ بزمرہ اہل اسلام درآوردہ و خود را بمرزائی نامے ساخت و شوق شاعری بہم رسایندہ شاگرد صابر علی شاہ صاؔبر شد ۔ نہایت پرگو است قطعہ بندہائے طولانی گفتہ ۔ غلطی ہائے فاحش در شعر میکند ۔ بنا بر کثرتِ عشق خوب در کلامش یافت می شود ۔ قوتِ شعر گوئی بسیار داشت و مناسبت تام درین فن شریف بہم آوردہ ۔ اما جاہلِ محض کندۂ ناتراش یا جی مزاج لوطی طبع بیہودہ و یاوہ بود ۔ بایں ہمہ باسرا مد شعرائے فصاحت مرزا محمد رفیع سوؔدا طرف شدہ بہ ہجو ہایش پرداختہ ۔ مرزا ہم چند ہجو رکیک وے کردہ تشہیرش فرمودہ مشہور عالم ساخت ۔ بہر کیف آں کس و ناکس یک چند در سرکار نواب امارت انساب امیر الامرا ضابطہ خان بہادر عفی اللہ عنہ در بارگیران ملازم شدہ ۔ بہ تقریب شاعری تقرب نواب مرحوم بہم رسایندہ ۔ بہ اشارۂ آں مبرور یوسف زلیخائے استاد نامی مولانا عبدالرحمٰن جامی را (قدس سرہٗ العزیز) بزبان ریختہ برشتہ نظم کشیدہ "(مجموعۂ نغز ۔ صفحہ $\frac{۳۹}{۴}$)

" سوم از طبقہ ثانی فدوی لاہوری است کہ بقوت شاعری و معلومات فن کہ بزعم خود زیادہ تر داشت بمرزا مقابل شدہ مہاجات نمود و بسبب صفائی بندش و ایراد قطعہا در بیشتر غزل ہا شہرت بسیار گرفت و یکے از نام وراں عہد خود گردید ۔ اگرچہ از اصل بقال پسرے بود اما مزاجش عاشق پیشہ افتادہ شعر بسیار با مزہ می گفت "

(دستور الفصاحت ـــــ صفحہ ۷۶)

گلشن ہند گلزار ابراہیم کا ترجمہ ہے ۔ مترجم مرزا علی لطف ہیں ۔ گلزار ابراہیم (مخطوطہ) کی عبارت پہلے نقل کی جا چکی ہے اس لئے اب تاریخ فرخ آباد میں فدوؔی کا جو ذکر ہے اسے درج کیا جاتا ہے:

" فدوؔی شاعر مشہور در عہد نواب احمد خان بفرخ آباد آمدہ بمرزا رفیع السودا در مہاجات مطارحات نمودہ "

(تاریخ فرخ آباد ـــــ صفحہ ۴۳۹)

" فدوی تخلص باسم گمند لال بقال پسرے بودہ است ۔ بدولت اسلام فائز شدہ ۔ از اہل لاہور است ۔ درین معمورہ آمدہ با

سودا طرف شدہ۔ سودا برائے ادا ہجو رکیکہ گفتہ کہ مشہور
است۔ از شاگردان صابر علی شاہ صابر تخلص شمردہ می شود و گویند
کہ نقش محبت سادہ رویاں دل خواہ و دل نشیں داشت۔ بہ ایں تقریب
چند بار جنگہا آوردہ و زخمہا برداشتہ۔ آخر بابر سرکار نواب ضابطہ خان
ملازم و بہ عالم آخرت رفت و بعض اہل تذکرہ وے را از مغل دانش
فدوی بیگ نوشتہ اند۔" (گلشن بے خار۔ صفحہ ۹۸)

"یہ فدوی محمد حسن لاہوری شاگرد صابر علی شاہ المتخلص بہ صابر
کا تھا۔ یہ ایک بنئے کا لڑکا تھا اور ایک شخص مرزا نے حالت غلامی
میں اس کو تعلیم دلائی۔ بعد ازاں فدوی اپنے ملک کو چھوڑ کے فرخ آباد
میں آیا جہاں سودا سے اس کا مباحثہ ہوا۔ سودا نے ایک مخمس اس
فدوی لاہوری کی ہجو میں لکھا ہے جو کلیات سودا میں مندرج ہے۔
اس فدوی کے بہت سے لوگ بہ سبب اس کے غرور و نخوت کرنے
کے دشمن ہو گئے تھے۔ وہ واقع میں شورہ پشت آدمی تھا۔ جب
وہ لاہور سے آیا اس وقت اس نے بزبان ریختہ ایک قصہ بنام یوسف
زلیخا تصنیف کیا مگر میر فتح علی نے اس پر خوردہ گیری کی اور ہجو میں
ایک مثنوی بنام بوم و بقال تصنیف کی جس کا اول یہ ہے ؎

یار وخدا ایک ہے دوسرا برحق نبیؐ — صورت لوح و قلم جس کے لیے خلق کی
راست ہی ٹک بولیو۔ ان ہی کی سوگند ہے — آج زباں ہے کھلی کل تہیں بند ہے

جو کہ انتخاب دیوان سودا میں درمیان کلکتہ کے سودا کی طرف اس کو منسوب
کر کے اس کے دیوان میں غلطی سے چھپوادی ہے کیوں کہ سودا کی کہی
ہوئی وہ مثنوی نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ اس مثنوی میں وہ (مثنوی
کا کہنے والا) آپ اقرار سودا کے استاد ہونے کا کرتا ہے (یعنی اپنے
آپ کو سودا کا شاگرد ظاہر کرتا ہے) لیکن چھاپے خانہ والوں نے
اس میں کچھ تمیز نہیں کی ہے۔ فدوی نے یوسف زلیخا بحکم ضابطہ خاں
کے لکھی تھی جس کے پاس وہ چند روز رہا تھا۔ نواب محمد یار خاں کے
ملازموں میں بھی فدوی منسلک تھا جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ اس جائے
محمد قائم اور مصحفی اور شعرا اس زمانہ کے اس سے ملتے رہتے تھے۔ اس
نواب کے گھر میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ چوں کہ وہ نواب بد خصلت
تھا اس واسطے چند روز کے بعد وہ مجلس موقوف ہوئی۔ پچاس
برس کی عمر میں فدوی فوت ہوا۔ شاہ مبارک آبرو کا شاگرد تھا اور سپاہیانہ
روش رکھتا تھا۔" (طبقات الشعرا۔ صفحہ ۸۶)

"فدوی تخلص کنہیا لال لاہوری مقیم دہلی ملازم نواب ضابطہ خاں
شاگرد صابر علی صابر۔ اپنے مذہب کو ترک کر کے دینِ اسلام
قبول کر لیا تھا۔ باپ اس کا بقال تھا۔ سودا نے اسی کی ہجو رکیک کہی
ہے اور بعض اہل تذکرہ نے لکھا ہے کہ وہ قوم سے مغل تھا۔ فدائی
بیگ نام۔ غرض اس کے اشعار اچھے ہوتے ہیں مراد آباد میں فوت
کی۔" (سخن شعرا۔ صفحہ ۳۵۹)

"فدوی لاہوری دہلی میں رہتے تھے۔ سودا سے شاعرانہ
مقابلہ کرنے فرخ آباد آئے اور شکست کھائی اور اپنے وطن واپس
چلے گئے۔ کہتے ہیں کہ ایک بنئے کے لڑکے تھے۔ مسلمان ہو گئے تھے۔
صابر علی شاہ صابر کے شاگرد تھے۔ پچاس برس سے زیادہ کی عمر
پا کے انتقال کیا۔ کچھ دنوں نواب ضابطہ خاں کے رفیق رہے۔ ان
کی فرمائش پر یوسف زلیخا لکھی لیکن اس کو تکمیل کو نہ پہنچا سکے۔
ان کا نام مرزا فدوی بیگ تھا اور یہ مغل اور مذہباً شیعہ تھے۔
جوانی میں انھوں نے ایران کا سفر کیا اور اصفہان میں چار برس
قیام کیا۔ ضابطہ خاں کی ملازمت چھوڑ دینے پر لکھنؤ چلے گئے جہاں
ان کو دربار میں ایک جگہ مل گئی۔ بریلی میں قتل ہوئے۔"
(یادگار شعرا ــــــ صفحہ ۱۵۳)

"فدوی اصل میں ہندو تھے۔ مکند رام نام تھا۔ مسلمان ہو گئے
تھے۔ کم علم مگر طبیعت مناسب تھی۔ شعر اردو کہتے تھے۔ صابر علی
شاہ صابر کے شاگرد تھے۔ اور وضع فقیرانہ سے زندگی بسر کرتے
تھے۔ مشاعرے میں جاتے تو کبھی بیٹھتے کبھی کھڑے ہی کھڑے غزل پڑھتے
اور چلے جاتے تھے۔ احمد شاہ کی تعریف میں قصیدہ کہا تو بادشاہ نے
ہزار روپیہ نقد گھوڑا اور تلوار انعام دی۔ ان کا بھی دماغ بلند
ہوا اور دعویٰ ملک الشعرائی کا کرنے لگے۔ کچھ مرزا پر اعتراض کیے۔ اس
پر مرزا نے الو اور بنئے کی ہجو کہی۔ انجام کو فریقین کی ہجویں حد سے
گزر گئیں۔ فدوی نواب ضابطہ خاں کے ہاں نوکر بھی ہو گئے تھے
اور آخر میں انھیں لکھنؤ جانا پڑا۔ ان کا دیوان نہایت دل چسپ ہے۔

اور ہر غزل کا خاتمہ پیغمبر صاحب کی نعت یا کسی اور امام کی مدح پر کرتے ہیں۔ یوسف زلیخا کا ترجمہ بھی نواب صاحب کی فرمائش پر کیا ہے مگر گلزار ابراہیمی میں لکھا ہے کہ یہ ایک پرخود غلط آدمی تھا۔ مرزا کے مقابلہ کے لئے فرخ آباد میں آیا اور ذلت اٹھا کر گیا۔"

(آب حیات ــــــ صفحہ ۱۵۵)

"فدوی تخلص مکندلال لاہوری۔ شاگرد صابر علی صابر بطیب خاطر اپنے مذہب ہنود کو ترک کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے اور دہلی میں سکونت قبول کی۔ سودا نے ان کی ہجو لکھی ہے۔"

(شمیم سخن ــــــ صفحہ ۱۷۹)

تذکرۂ گل رعنا میں سودا کے تحتِ عنوان صفحہ ۱۴۴ پر لکھا ہے کہ
"رنگین۔ ندرت۔ فدوی مولوی ساجد اور میر ضاحک کی جیسی مٹی پلید کی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسنین نے مرزا محمد علی فدوی اور ان کے کلام اور ان کی شخصیت پر دو جلدوں میں ایک تصنیف کی ہے۔ اس میں مرزا محمد علی فدوی کا تذکرہ کرتے ہوئے "فدوی تخلص کے دوسرے شعرا" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

"کلام اور احوال زندگی کے بیان کرنے میں اکثر تذکرہ نگاروں نے ان فدویوں کو آپس خلط ملط کر دیا ہے۔ ان تمام فدویوں میں سید محمد محسن، مکندلال اور مرزا محمد علی کے نام زیادہ مشہور ہیں۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے سید محمد محسن فدوی۔ لالہ سیوک رام فدوی، مکندلال فدوی، مرزا اعظیم بیگ فدوی، سید فضل علی فدوی اور لالہ لچھمن رام فدوی کا حال بیان کیا ہے۔ مکندلال فدوی کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"تمام فدویوں میں مکندلال فدوی کی ہستی سب سے زیادہ معروف ہے۔ تقریباً کل مشہور تذکرہ نویس ان کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ ان کی شہرت کا سبب ان کا کردار اور مرزا رفیع سودا سے ان کا معرکۂ سخن ہے۔ ان کا نام مکندلال تھا۔ ان کے بزرگ پنجاب کے ہنود خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا پیشہ بقال کا تھا۔ اس لئے ابو القاسم نے انھیں "بقال پسرے بود"
لکھا ہے۔ مکندلال کی جائے پیدائش لاہور تھی اور بقول ابو القاسم یہ حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ نہیں معلوم کہ مکندلال کی تبدیلیِ مذہب کی کیا وجہ تھی۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ ترکِ مذہب کے بعد ان کی تربیت مرزائی طریقے کے مطابق ہوئی۔ ناسخ اور شیفتہ نے لکھا ہے کہ بعض تذکروں میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ یہ قوم مغل سے تھے۔ یہ بات حقیقت سے دور ہے...... غالباً انھوں نے مرزا عظیم بیگ اور مکندلال کے حالات کو خلط ملط کر دیا ہے۔"

"دہلی سے پھر یہ روہیلکھنڈ گئے... محمد یار خاں کی حضور میں باریاب ہوئے۔ محمد یار خاں ایک شاعر نواز انسان تھے۔ ریختہ میں امیر تخلص کرتے اور موسیقی سے بڑا شغف رکھتے تھے۔ مکندلال کو بھی محمد یار خاں کی سرکار میں ایک جگہ مل گئی۔" (صفحہ ۳۵۰)

"مکندلال کی شومیِ قسمت کہ انھوں نے دعوائے سخندانی کیا اور مرزا رفیع سودا جیسے عظیم و خطرناک شاعر سے نبرد آزما ہوئے۔ ان کی اس جرارت احمقانہ کے دو اسباب ہیں۔ ایک ان کا دعوائے سخندانی جو اُن کی فطرت کا خاصہ تھا... دوسرے ان کے مربی اور سرپرست محمد یار علی خان کا سودا کو اپنی رفاقت کی دعوت دینا اور سودا کا انکار کر دینا۔ اس وجہ سے یار محمد خاں کے درباری شعرا کا سودا سے آمادہ پیکار ہونا۔" (صفحہ ۲۹۰)

"سودا فرخ آباد میں احمد خاں بنگش کے ایک شاعر نواز دیوان مہربان خاں کی صحبت میں ایک باعزت زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی شاعری کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی اور قدردانانِ سخن اُن کے لئے آنکھیں بچھا رہے تھے۔ ایک طرف محمد یار خاں تھے تو دوسری طرف نواب شجاع الدولہ خود مرزا کی رفاقت کے خواہشمند تھے۔ سودا اپنے محسن دوست کی جو شاعر بھی تھے اور رند تخلص کرتے تھے، صحبت اور قدر روانی سے بہت شاد اور مطمئن تھے اور ان کی غیرت نے مہربان کی رفاقت کو ترک کرنا گوارا نہ کیا..... مرزا رفیع کے اس انکار سے لازماً محمد یار خاں کو خفت محسوس ہوئی۔ ان کی مجلس کے شعرا میں اس بات کا بڑا چرچا ہوا۔ کئی درباری شعرا موجود ہی تھے۔ ان میں مکندلال فدوی جیسا ایک لاابالی (جس کی صراحت آگے ملے گی) شاعر

بھی تھا۔ قیاس ہے کہ یار محمد خاں نے ایما سے مرزا رفیع کیساتھ معرکہ کا ایک پروگرام بنا ہوگا۔ مکند لال اسی غرض سے روہیلکھنڈ سے فرخ آباد گئے اور بزم آرا ہوئے۔ سودا نے اس معرکہ میں خود حصہ لیا یا ان کی نیابت ان کے شاگردوں نے کی۔ اس کا تفصیلی حال تو معلوم نہیں لیکن مکند لال کو اس معرکہ میں شکست فاش ہوئی۔" (صفحہ ۲۶۰)

مکند لال کے سلسلہ میں نواب ضابطہ خاں کا ذکر کرتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے:

"نواب ضابطہ خاں کی فرمائش پر مکند لال نے مثنوی یوسف زلیخا کو ہندی زبان میں نظم کیا۔ جب ضابطہ خاں کو مرہٹوں سے شکست ہوئی تو مکند لال نے مراد آباد کی راہ پکڑی۔ یہ وہی ضابطہ خاں ہے جس کے بیٹے غلام قادر خاں روہیلے نے شاہ عالم بادشاہ کی آنکھیں نکال لی تھیں اور قلعہ میں غارت گری اور سفاکی کا ایک عبرت ناک نمونہ چھوڑا تھا۔" (صفحہ ۲۶۱)

اردو شعراء کے تذکروں میں مکند لال فدوی کے متعلق جو کچھ پایا جاتا ہے اسے تفصیل کے ساتھ درج کر دیا گیا ہے۔ ان عبارتوں کی قابل نظر باتوں کے نیچے لکیر کھینچ دی گئی ہے۔ ان تذکروں کے مطالعے سے جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے یہ ہے کہ یہ تذکرے مکند لال فدوی کے اسلامی نام، تاریخ پیدائش اور وفات، سودا اور فدوی کے معرکہ کے اسباب و انجام وغیرہ کے بیان سے یکسر خالی ہیں۔ حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ ایک تذکرے کے الفاظ اور جملے دوسرے تذکرے میں اکثر یکساں ہیں (دیکھئے گلزار ابراہیم و تذکرہ میر حسن)۔ گویا ایک تذکرہ دوسرے تذکرہ نویس کے سامنے تھا اور وہ وہی الفاظ و جملے نقل کرتا چلا گیا ہے۔ ڈاکٹر حسینی نے جو قیاسات قائم کئے ہیں یا جو نتیجے نکالے ہیں وہ بھی صحیح نہیں ہیں (تفصیل آگے آئے گی)۔

مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندی گویاں میں فدوی کا ذکر ذرا تفصیل سے کیا ہے اگرچہ اس میں بھی اصول تذکرہ نویسی کو مد نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ لیکن مصحفی سے تذکرہ نویسی کے جدید تکنیک برتنے کی توقع رکھی بھی نہیں جا سکتی کیونکہ اس زمانے میں تذکرہ نویسی نے نہ اتنی ترقی کی تھی اور نہ قدیم تذکرہ نویس عصر جدید کے مفہوم تذکرہ نویسی سے آشنا تھے۔ پھر بھی

فدوی کے آنولہ آنے کے بعد اور نواب محمد یار خاں کے درباری شعرا میں داخل ہونے سے قبل وہ ان سے خود جا کر ملے تھے اور صحبت شعر بھی برپا ہوئی تھی۔ اس وقت وہ چاہتے تو فدوی کا صحیح اسلامی نام (اگر انھوں نے واقعی ترک مذہب کیا تھا) اُن کی عمر، پیدائش کی تاریخ اور قوم اور اس کے تربیت کرنے والے کا نام سب پوچھ سکتے تھے اور ممکن ہے کہ انھوں نے یہ سب کچھ پوچھا بھی ہو لیکن نواب محمد یار خاں کا حق نمک یوں ہی ادا ہو سکتا تھا کہ وہ ان سب باتوں کو ٹال جائیں اور اس کے متعلق غیر ضروری باتوں (جنھیں اس کے شاعرانہ کردار سے تعلق نہ ہونا چاہئے اور وہ اس کے اخلاق کو معیوب بنانے کیلئے ہی لکھی گئی ہیں) سے اپنے تذکرہ کو طولانی کر دیں۔ نواب محمد یار خاں اور فدوی کے درمیان سوئے مزاجی کی وجہ کو بھی وہ "ذکر او موجب تطویل است" کہہ کر آگے بڑھ گئے حالانکہ یہ الفاظ خود دلالت کرتے ہیں کہ اس سوئے مزاجی کے اسباب ان کو مفصلاً معلوم تھے۔ فدوی کے شعر پر رائے زنی کو بھی وہ ٹال گئے مگر ہر غزل میں طویل قطعوں کی موجودگی اور "کلامش بزبان بازاریان دائر و سائر" کہہ کے وہ فدوی کے مقبول عوام ہونے کا اقرار ضرور کر گئے۔ فاحش غلطیوں کا بھی انھوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا بلکہ ایک بات ایسی ضرور کہی کہ فدوی کے حالات اور اُلجھ گئے اور وہ بات "الحاصل چوں ازاں اطراف آوردہ شدہ" آوردہ شدہ کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ جب دلی آئے تو مرزا کی غلامی میں تھے۔

دوسری بات فدوی کی ذات کے متعلق ہے۔ وہ پورے وثوق سے انھیں بقال پسر نہیں کہتے بلکہ "گویند بقال پسرے بود" کہتے ہیں اور آگے بڑھ کر اس گویند کی تشریح بھی انھوں نے کر دی ہے۔ کہتے ہیں "مرزا محمد رفیع در ہجو او مذکور بقال دیوم آوردہ این کنایہ دلیل ساطع بر قول مصنف است" اس سے صاف ظاہر ہے کہ فدوی کو بقال پسر انھوں نے یوں سمجھا کہ سودا نے اپنی ہجو میں انھیں بقال پسر کہا ہے۔ اگر مرزا کی ہجو یں کسی کو بد نام کرنے میں دلیل ساطع کی طرح کام کر سکتی ہیں تو پھر کسی شیخ کو (جس سے مراد غالباً مولوی ساجد ہیں) اتنا بڑا اور گرا ہوا مانا جا سکتا ہے کہ وہ کسب معاش کے طور پر اپنی بیٹی سے کسب کرانے پر آمادہ ہو (دیکھئے کلیات سودا میں کسی شیخ کی ہجو جس کی ردیف ہے "شیخ جی")۔ کون نہیں جانتا کہ ہجویات اور قصائد میں جو عیوب اور محاسن بیان کئے جاتے ہیں الخ

میں قدم قدم پر غلوئے شاعرانہ اور بعید از حقیقت باتیں کہی جاتی ہیں۔ ان قصائد سے نہ کوئی بادشاہ "مظہر ذوالجلال والاکرام" ہو سکتا ہے نہ کسی بادشاہ کی رکاب چومنے کے لئے کسی کا اندیشہ (خیال) "نہہ کرسیٔ فلک" کو زیر پا رکھنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ اور سوداؔ کی ہجو نیاہ بخدا۔ سوداؔ کو ہجو کے معاملہ میں ان ہی تذکرہ نویسوں نے یہاں تک گرا ہوا تسلیم کیا ہے کہ صاحب بزم سخن صفحہ ۶۳ پر لکھتا ہے کہ "بلاہ ہجو بیشتر کشادہ بجادۂ مذمت پا نہادہ" اور صاحب طور کلیم نے اس سے بھی زیادہ صاف گوئی سے کام لیا ہے کہ "اہاجی بسیار گفتہ و بہ آں شیوہ داشتہ" ایک تذکرہ نویس نے یہاں تک لکھا ہے کہ سودا ہجو کی منزل سے بڑھ کر مذمت تک پہنچ جاتے ہیں۔

دوسرا اہم مسئلہ فدوی کے ترک مذہب کا ہے۔ لیکن ہمیں نہ فدوی کے ترک مذہب کے اسباب معلوم ہیں نہ ان کا اسلامی نام۔ اس کے برعکس ہمیں ان کا خاندانی نام (مکند لال) معلوم ہے۔ کئی تذکرے ان کے ترکِ مذہب کی وجہ تو بیان کرتے ہیں لیکن اسلامی نام صرف ایک میں ملتا ہے۔ جو تذکرے اُن کے ترک مذہب کی وجہ بیان کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ابتدا میں کسی مرزا کی غلامی کی وجہ سے مسلمان ہوئے اور تربیت مرزائی طریقہ پر ہوئی۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرزا فدائی بیگ فدوی بھی ایک شاعر گزرا ہے جو اطراف لاہور ہی کا رہنے والا تھا۔ وہ آزادانہ طریقۂ حیات بھی رکھتا تھا اور راسے موسیقی وغیرہ کا بھی شوق تھا۔ اس کے حالات سے خلط مبحث ہو کر اس کا قوی امکان ہے کہ مکند لال فدوی کو بھی نو مسلم سمجھ لیا گیا۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی کے گھر میں کوئی خانہ زادوں کی سی زندگی بسر کرتا ہو تو اس کا مذہب بھی اختیار کر لے۔ ایسے شخص پر گھر کا ماحول کچھ اثر ضرور کرتا ہے مگر ترک مذہب لازم نہیں آتا۔ ترک مذہب کے بعد اسلامی نام ایک ایسی چیز ہے جو بہر حال موجود ہونا چاہئے۔ صرف فیلن نے اپنی فہرست میں فدوی کا نام محمد حسین بتایا ہے (طبقات الشعرا) مگر فیلن کو بھی فدوی تخلص کی وجہ سے مغالطہ ہوا ہے کیونکہ فدوی تخلص کا ایک شاعر محمد حسن نامی بھی تھا چنانچہ مولوی عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرہ سخن شعرا میں صفحہ ۳۵۹ پر اس کا حال درج کیا ہے۔

"فدوی تخلص محمد حسن لاہوری مقیم دہلی شاگرد شاہ مبارک آبرو۔ ستار خوب بجاتے تھے آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ صاحب دیوان گزرے ہیں۔"

اس فدوی کا نام دوسرے تذکروں میں بھی ملتا ہے لیکن ایک دلیل فیلن کے دھوکا کھانے کی اور ہے۔ سخن شعرا میں نساخ نے محمد حسن فدوی کے دو شعر پیش کئے ہیں جن میں دوسرا شعر ہے ؎

یار ہم سے جو سدا چین بجبیں رہتا ہے ۔۔۔ نہیں معلوم بلا کون سی پیش آنی ہے

یہی شعر فیلن نے بھی طبقات الشعرا میں دیا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ فیلن ابتدا میں تو فدوی کو شاگرد صابر علی شاہ صابر لکھتا ہے لیکن آخر ذکر میں شاہ مبارک آبرو کا شاگرد بتاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فیلن نے دو ہم تخلص شعرا کا ذکر ملا دیا ہے۔

رہا آب حیات وغیرہ کا یہ بیان کہ وہ اپنی ہر غزل میں پیغمبر اسلام یا کسی امام کا ذکر ضرور کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ بات بھی اس کے مسلمان ہونے کی دلیل ساطع نہیں۔ میں نمونہ کلام میں تاریخ فرخ آباد سے فدوی کے کلام کا جو اقتباس درج کر رہا ہوں اس کی دوسری غزل جسے قطعہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا شروع سے آخر تک حضرت علی (علیہ السلام) کی منقبت میں ہے۔ اس کے باوجود اس سے مکند لال کا محمد حسن ہو جانا یا فدائی بیگ بن جانا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ہمارے سامنے بہت سی ایسی مثالیں ہیں کہ بعض ہندو شعرا نے زندگی بھر سوائے نعت کے کچھ نہیں کہا مثلاً دتو رام کوثری کہ ان کا تخلص تک اسلام کی جھلک رکھتا ہے۔ اردو کی مثنویوں میں بلحاظ فن اور ٹکنیک کے پہلا درجہ مثنوی سحر البیان (میر حسن کی تصنیف) کو حاصل ہے اور دوسرے درجہ پر گلزار نسیم مانی جاتی ہے جو پنڈت دیا شنکر نسیم کی ہے اور اس کی ابتدا بھی یوں ہے ؎

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ۔۔۔ ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے ۔۔۔ یعنی کہ مطیع پنج تن ہے

ظاہر ہے کہ ان شعروں پر اسلام کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے لیکن آج تک کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ اس چھاپ کی بنا پر نسیم کو مسلمان کہہ سکے کیونکہ ان کا نام دیا شنکر سب کو معلوم ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان شعروں کی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان شعروں سے اس زمانہ کے

کلچر میں اسلام کا شدید دخل ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم یہ ماننے کے لئے بالکل تیار ہیں کہ کمندلال پر (اگر کسی مرزا کی غلامی کا افسانہ صحیح ہے تو) اسلامی کلچر کی چھاپ زیادہ شدید تھی اور شیعی رجحانات رکھتے تھے۔ لیکن جب تک ان کے ترک مذہب کی صحیح وجہ اور ان کا اسلامی نام معلوم نہ ہو جائے ان کا مسلمان ہونا مشکوک رہے گا۔ وہ کمندلال تھے اور ہمیشہ کمندلال رہیں گے۔

تذکروں میں فدوی کی جن اخلاقی کمزوریوں کا ذکر شد و مد سے کیا گیا ہے وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:

(۱) حُسن پرستی (۲) امرد پسندی (۳) جنگ جوئی (۴) حقیقت سے زیادہ اپنی شاعری پر فخر (۵) شعر میں فاحش غلطیاں کرنا۔

ان تذکروں میں دو قسم کی تحریری تہذیب ملتی ہے۔ ایک تو وہ جس کی مثال مجموعۂ نغز وغیرہ میں ہے یعنی "جاہل محض، کندۂ نا تراش، پاجی مزاج، لوطی طبع، بیہودہ و یاوہ بود" دوسری کا نمونہ گلشن بے خار وغیرہ ہیں مثلاً "گویند کہ نقش محبت سادہ رویاں دلخواہ در دل نشین داشت و باین تقریب چند بار جنگہا آوردہ و زخمہا برداشتہ" لیکن ان تحریروں اور ان کے تند و تیز لہجے کی وجہ بھی ان ہی تذکروں میں مل جاتی ہے مثلاً مجموعۂ نغز ہی کو دیکھئے اس کے بعد ہی وہ لکھتا ہے۔ "بایں ہمہ با سرآمد شعرائے فصاحت مرزا رفیع سودا طرف شد" ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فدوی کی اخلاقی کمزوریوں کو ہلکے الفاظ میں بھی لکھا جا سکتا تھا بشرطیکہ وہ "سرآمد شعرائے فصاحت مرزا رفیع سودا سے طرف نہ ہوتا"۔ گویا سودا کا مقابلہ "وہ گناہ عظیم" تھا جس نے منٹو کے الفاظ میں فدوی کو رحمت اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکائے جانے سے روک دیا ورنہ اس سے پہلے صاحب نغز کا ارادہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ لکھتے ہیں: "بر بنائے سعادت ازلی و عنایات لم یزلی بہ تاثیر صحبت اسلامیاں رشتہ اطاعت دین مبین بگردن جاں افگندہ بزمرہ اسلامیاں در آوردہ خود را بمرزا فدوی نامے ساخت" انھیں دفعتاً یاد آ گیا کہ ارے اس بدتمیز "جاہل کندہ ناتراش پاجی مزاج "لوطی طبع" نے سرتاج شعرائے اردو مرزا سودا سے مقابلہ کی جرأت کی اسے تو کھونٹی پر نہیں سولی پر لٹکایا جائے"۔

یہی حال میر حسن کے تذکرۂ شعرائے اردو وغیرہ کا ہے۔ ان میں بھی فدوی کا اصل گناہ "مرزا رفیع السودا سلمہٗ سے مقابلہ کی جرأت ہی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اپنے فن پر ناز کسے نہیں ہوتا اور لفظ ناز کے مفہوم میں ہی حقیقت سے تجاوز کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ رہی حسن پرستی، سو یہ ذوق بھی بڑی بڑی شخصیتوں میں پایا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان شخصیتوں کے لئے ان کا تصوف وغیرہ ایک پائدار سپر بن چکا ہو۔ نقض امن، لڑائی جھگڑا اور زخم کھانا اور زخم پہنچانا ضرور بُری باتیں ہیں لیکن ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں یہ باتیں یا اپنی ذات سے اس قسم کے منسوبات فخر کا سبب سمجھے جاتے تھے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ خدائے سخن میر "عطار کے لونڈے" سے دوا لینے کا ذکر فخر کے ساتھ خود اپنے قلم سے نہ کرتے اور خواہ مخواہ یہ عیب اپنے سر نہ لیتے، اگر اس قسم کے منسوبات موجب فخر نہ سمجھے جاتے۔ جس طرح یورپ کے ادب پر "نائٹ ہڈ" تقریباً چار صدیوں تک جاری رہا اسی طرح سلطنت مغلیہ کے زوال پذیر ہونے پر مغل سوسائٹی میں ہی نہیں ملک کی عام سوسائٹی میں "غنڈہ گردی" جس میں سب باتیں آ جاتی ہیں، شیوۂ اشراف اور شرافت کی دلیل بن چکی تھی اور جس میں عوام ہی نہیں خواص بھی مبتلا تھے۔ اور ظاہر ہے کہ فدوی پر تو مغل کلچر کے اثرات تھے۔ ایک بڑی غلطی یہ بھی ہے کہ ہم فدوی کے ان عیوب کا تذکرہ کرتے وقت اس کی تربیت کے ذمہ داروں کو بھول جاتے ہیں۔ کیا معلوم کہ وہ مرزا جنھوں نے فدوی کی تربیت کی کن خوبیوں کے بزرگ تھے کہ ان کی صحبت کے نقوش فدوی پر اتنے گہرے پڑے۔

فدوی کے فنی اغلاط کی نشان دہی یا اس کی شاعری میں عیوب کی موجودگی کا اقرار یا انکار تو آج یوں ناممکن ہے کہ ہمارے سامنے اُس کا پورا کلام ہی موجود نہیں اور جو کچھ ہے اس میں کوئی ایسی فنی غلطی نظر نہیں آتی جسے اس زمانہ کے لحاظ سے فنی غلطی کہا جا سکے۔ البتہ فدوی کی سب سے بڑی غلطی مرزا سودا سے ہجو میں مقابلے پر آمادہ ہو جانا تھا۔ اگر اس کی ابتدا فدوی کی جانب سے ثابت ہو سکے تب تو اخلاقی لحاظ سے یہ غلطی تھی اور یہ ثابت نہ ہو سکے تو بھی حالات کے غلط اندازوں کی غلطی ضرور تھی۔

فدوی کے متعلق یہ تو ثابت ہے کہ وہ لڑ جانے والے قسم کا آدمی

تھا لیکن آدمی کتنی ہی مشتعل طبیعت کیوں نہ رکھتا ہو اُس کے اشتعال کا کوئی سبب ضرور ہوتا ہے خواہ وہ خفیف ہی کیوں نہ ہو ـــــ اتنا خفیف ہی کیوں نہ ہو کہ کوئی سنجیدہ مزاج آدمی حالات کے لحاظ سے اس کا تحمل کرلے یعنی اسے پی جانا زیادہ مناسب جانے۔ اس سلسلہ میں طبقات الشعرا کا اقتباس ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ صاحب طبقات ہمیں بتاتے ہیں کہ امیرالامرا نواب ضابطہ خاں کی فرمائش پر فدوی نے جامی کی مثنوی یوسف زلیخا کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا اور اس ترجمہ پر اُنھیں ناز تھا۔ ہر صحبت شعر و سخن میں وہ اس کا کوئی حصہ ضرور پڑھتا (یہ بات دوسرے تذکرے بھی بتاتے ہیں)۔ فرخ آباد کے جلسوں میں بھی فدوی نے اسے پڑھا۔ میر فتح علی شیدا نے جو سودا کے شاگرد تھے اس پر اعتراض کئے۔ فدوی کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو سودا کی ہجو گوئی اور اس کی مقبولیت اور سودا کے مقام کا لحاظ کرکے اسے ٹال جاتا۔ مگر فدوی اُسے خاطر میں لانے والا کب تھا۔ مصلحت بینی کا وہ خوگر ہی نہ تھا۔ ان اعتراضات کے جواب میں فدوی نے غالباً ایسے الفاظ کہے جن کی طرف شیدا نے فدوی کی ہجو میں اشارہ کیا ہے، ورنہ فتح علی شیدا کی ہجو میں مندرجہ ذیل اقتباسات کے معنے کیا ہوتے ہیں ؎

آکے شیدا جو ہو مرا شاگرد ۔۔۔ گوش دل سے سُنے مرا ارشاد

مرتبہ اس کے شعر کا یہ ہو ۔۔۔ سخن اس کا سخن کا ہو استاد

رفتہ رفتہ سُنا یہ شیدا نے ۔۔۔ کہا اُن نے کہ خانماں برباد

معنے کے گھر کو تونے ویراں کر ۔۔۔ پھینکدی اس کی کھود کے بنیاد

اس ہجو کے کچھ اور مصرعے اور شعر میرے خیال کی تائید کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

اتنے شاگرد ڈھونا ہیں عبث . . .

چاہے الوہی تو رہے بن کر ۔۔۔ خلق شاگرد اپنی کر ڈالے

گو نہ شاعر جہاں میں ہو کوئی ۔۔۔ شعر سودا نہ تجکو دکھلاوے

اور آخری دو شعر دیکھئے :

فرخ آباد کے محلوں میں ۔۔۔ حد سے بڑھ کر تو کر چکا ہے کلول

جلد یاں سے نکل وگرنہ ترا ۔۔۔ بھرم میں اسطرح سر دو نگا کھول

کس نیاید بزیر سایۂ بوم

در ہما از جہاں شود معدوم

اس ہجو سے ظاہر ہوتا ہے کہ فدوی نے شیدا کے اعتراض سُن کر کچھ ایسے الفاظ کہے کہ بچہ ہے، کچھ جانتا نہیں، سودا کے پھندے میں پھنس کر اور زیادہ خراب ہوگیا ہے، اگر میرا شاگرد ہو تو میں اسے بتاؤں کہ فن کیا ہے، پھر اپنے استاد سودا سے بھی بڑھ جائے کیوں کہ میں تو سودا کو بھی اصلاح دے سکتا ہوں۔ اس قسم کی باتوں کا وہ جواب ہو سکتا ہے جو شیدا نے دیا ہے۔ یہ نظم جو سودا کے سامنے اصلاح کے لئے آئی اور ان کے کان میں اپنے متعلق فدوی کے کہے ہوئے الفاظ کی بھنک پڑی تو جیسا کہ ان کی عادت تھی مارے غصہ کے آپے سے باہر ہوگئے اور آب حیات کے الفاظ میں جھٹ چیخ اُٹھے کہ "لانا تو غنچہ میرا قلمداں"۔ پھر آپس کی ہجویں حد سے گزر گئیں۔

سودا کے مقابلہ میں فدوی کیا ہر شخص کی بدقسمتی یہ ہے کہ سودا نے جو کچھ کہا وہ سب کا سب بلکہ دوسروں کا کہا ہوا بھی سودا کے نام سے منسوب ہوکر ہمارے سامنے موجود ہے (سودا مصنفہ چاند۔ ایم۔ اے عنوان الحاقی کلام) لیکن سودا کی جو ہجویں اُن کے حریفوں نے کہیں اُن کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ یعنی معاملہ یہاں یہ ہے کہ "تنہا پیش قاضی روی راضی آئی" لیکن آب حیات کی نوازش سے ہمیں معلوم ہے کہ دوسروں نے بھی خوب خوب اپنے دلوں کا بخار نکالا ہے مثلاً

جب چھوڑ شاعری کو سودا ہوا گویا ۔۔۔ . . . .

سر کو ہلا ہلا کر کہتی تھی اس کی مینا ۔۔۔ تا دھنیا دھنیا دھنیا تا تھیا تھیا تھیا

حق یہ ہے کہ فدوی نے بھی سودا کی ہجویں کہی ہوں گی۔ اگر ان کا کوئی ریکارڈ ہمارے سامنے ہوتا تو ہم اُن میں فدوی کا فن دیکھتے صرف ایک مثلث کا ایک بند (آب حیات کی نوازش سے۔ صفحہ ۱۵۵) ہمارے سامنے ہے :

کچھ کٹ گئی ہے چوٹی، کچھ کٹ گیا ہے جوڑا ۔۔۔ دم داب سامنے سے وہ اُڑ چلا لٹورا

بھڑوا ہے مسخرہ ہے، سودا اسے ہوا ہے

اور اسی سے ثابت ہے کہ فدوی جیسے شاعر نے جسے تذکروں نے بہت شورہ پشت اور لکھنؤ کے مشہور روایتی "بانکوں" کے روپ میں پیش کیا ہے، سودا کی ہجو میں اُس رکاکت کا ثبوت نہیں دیا جو سودا کے

یہاں عموماً پائی جاتی ہے۔ یہ ہے اس معرکہ کی تفصیل جو سودا اور فدوی میں ہوا اور اسی لیے تاریخ فرخ آباد اس معرکہ کی تفصیل میں خاموش ہے۔ اس نے اتنا تو لکھا ہے کہ فدوی ایک مشہور شاعر نواب احمد خاں کے عہد میں فرخ آباد آیا اور سودا سے ہجوؤں میں مقابلہ کیا۔ نہ اس نے یہ بتایا کہ مقابلہ میں ذلیل ہوا نہ اس نے شکست کا اعتراف کیا۔ بہرحال ہجو میں وہ مبارزت جس نے فدوی کی قسمت پر بدنامی کی مہر لگادی اور تذکرہ نویسوں کو اس سے بدظن کر دیا اس کی ابتدا میر فتح علی شیدا کی طرف سے ہوئی جس کا جواب دینے پر فدوی مشتعل طبع ہونے کی وجہ سے مجبور تھا۔

ڈاکٹر حسنین نے ہجووں کے اس مقابلہ میں نواب محمد یار خاں امیر کی سازش کا جو قیاس پیدا کیا ہے وہ میرے نزدیک بہ دوجوہ کمزور ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھ کی ہے، جو شخص سودا کو اپنی استادی کے لیے چنے، کیا وہ اتنا ناتواں خیال ہو سکتا ہے کہ تولے بغیر فدوی کو سودا کے مقابلے میں اتار دے اور شکست کی ذلت دوبارہ قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے، (اگر ڈاکٹر حسنین کا یہ خیال صحیح ہے کہ امیر نے سودا کے انکار سے کوئی ذلت محسوس کی تھی)، سودا کے انکار پر امیر قائم کے شاگرد ہوئے جو خود سودا کا شاگرد تھا۔ اگر ڈاکٹر حسنین کے قیاس کے مطابق امیر کو اس ذلت کا احساس ہوتا تو قائم کیا بہ قول غالب وہ تمام سودائیوں (سودا کے طرف داروں) سے نفرت کرنے لگتے۔ مگر ان کا سودا کے انکار کے قائم کو بسولی سے بلا کر اپنا استاد بنا لینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ سودا کے انکار میں اپنی توہین نہیں سمجھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قائم نے بھی فدوی کا سودا کے مقابلے میں جانا برداشت کر لیا جو خلاف توقع ہے۔ پھر نواب احمد خاں بنگش سے محمد یار خاں امیر کے سیاسی تعلقات کا بھی یہ تقاضا نہیں تھا کہ وہ فدوی کو سودا کے مقابلے پر بھیج دیتے۔ نواب احمد خاں نے محمد یار خاں کی وجہ سے علی محمد خاں کے بعد روہیلوں کے ملک کی دوبارہ تقسیم اپنے اثر درسوخ کے بل پر کرائی۔ اس کا بدلہ یہ تو نہ تھا کہ فدوی کو سودا کے مقابلے پر بھیجا جائے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر فدوی کو کوئی پشت پناہی میسر ہوتی تو اس جیسا مشتعل مزاج آدمی صرف ہجوؤں تک ہی بات کو نہ چھوڑتا بلکہ بہ قول (آب حیات ص۱۵۱)، وہ نثر میں جواب عرض کرنے کی کوشش کرتا اور جس طرح ایک کابلی پٹھان سودا کی زبان سے سرِ مشاعرہ اپنی ہجو سن کر سودا کے سینے پر چڑھ بیٹھا تھا اور یہ لفظ کہے تھے کہ "نظم خود ت گفتی حالا ایں نثر را گوش کن ہر چہ تو گفتی در نظم بود از ما ہمی اید جواب او در نثر ادا می کردم"۔ اگر فدوی کی کوئی مضبوط پشت پناہی ہوتی تو سودا کے حبشت کے شیلے کا تمام اسا فظ تھا نامراد فدوی کی طرف سے اس جنگ میں اس قسم کی کوئی حرکت کا صادر نہ ہونا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اسے کسی کی پشت پناہی حاصل نہیں تھی۔

اپنی کتاب مرزا محمد علی فدوی میں ڈاکٹر حسین کو ایک سانحہ اور بھی ہوا ہے جو نواب ضابطہ خاں کے بیٹے غلام قادر روہیلہ کے متعلق ہے۔ اس کا اقتباس بھی میں سطور بالا میں پیش کر چکا ہوں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہو کہ غلام قادر نے شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکالیں اور تیمور کے خاندان کی محل نشینوں کو سرِ دربار رقص کرنے پر مجبور کیا۔ چناں چہ ڈاکٹر اقبال نے ایک نظم اس واقعہ پر کہی ہے جس کے پہلے شعر کا دوسرا مصرع یہ ہے: "نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے"۔ لیکن جس زمانہ میں اقبال کی یہ نظم شائع ہوئی تھی اسی وقت اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے تاریخی حوالوں سے ثابت کر دیا تھا کہ غلام قادر نے جو کچھ کیا وہ ذاتی انتقام کی حیثیت سے تھا۔ قلعہ غوث گڑھ کی تباہی پر جب ضابطہ خاں کے بیوی بچے قید ہو کر بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے تو اس وقت غلام قادر آٹھ دس برس کا تھا۔ بادشاہ نے ضابطہ خاں کے حرم کو بھی سرِ دربار نچوا کر قتل کر دیا تھا لیکن غلام قادر کو اپنا "منظور نظر" بنا کے خصی کرا دیا اور قدسیہ باغ میں رکھا۔ اسے زنانے کپڑے پہن کر دربار میں آنے کا حکم تھا۔ غلام قادر جب تک نادان رہا اس کو برداشت کرتا رہا پھر بھاگ کر اپنے باپ کے پاس چلا گیا۔ (دیکھیے واقعات ظفر ہی ۳ الف۔ تاریخ تیموری ۱۲۷ ب اور جہاں نما ۱۰۲، ۷ الف و ۷۷ الف) تاریخ تیموریہ (۱۳۶ الف) میں یہاں تک لکھا ہے کہ چنبیلی دالی الحرم کا جھاڑا لینے پر مقرر تھی۔ اس نے غلام قادر سے رحم کی درخواست کی تو اس نے جواب دیا کہ چنبیلی تجھے یاد نہیں کہ بادشاہ نے غوث گڑھ کی تباہی پر میرے باپ کے پرستاروں کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ ظلم و ستم کا برتاؤ کیا تھا۔ بہرحال یہ جملہ معترضہ تو میں نے ان لوگوں کی آگاہی کے لیے لکھ دیا ہے جو اصل واقعہ سے ناواقف ہیں اور بھارت کی تاریخ کو صرف انگریز کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ فدوی کے متعلق اب مجھے اتنا عرض کرنا اور ہے کہ اس کے کلام کی خوبی کے متعلق اشارے تو جانب دار تذکروں تک میں ملتے ہیں لیکن غیر جانب دار تذکرے جن میں دستور الفصاحت اور تاریخ فرخ آباد کا نام لیا جا سکتا ہے اس کے کلام کی خوبی کے گواہ ہیں۔

آخر میں فدوی کے کلام کا کچھ نمونہ تاریخ فرخ آباد مصنفہ میر ولی اللہ

فرخ آبادی سے پیش کیا جاتا ہے:

گر بسے گلعذار آنکھوں میں　　گل لگے جیسے خار آنکھوں میں
غمزہ و عشوہ و کرشمہ و ناز　　قہر ہیں، ہر چہار آنکھوں میں

مدت سے آرزو تھی نہ آیا نظر کہیں　　اے دل ہمارے یار کی پوچھو خبر کہیں
نسبت ہو موتیوں کو مرے آنسوؤں کے ساتھ　　اے جوہری دکھانہ تو سلک گہر کہیں
مانند گل کھلے ہی رہیں گے یہ زخم عشق　　ناصح رفو نہ ہو دل صد چاک پر کہیں
ساون کی یہ جھڑی ہے گلستاں کے گرد برد　　ترسانہ میرے دل کو خدا سے بھی ڈر کہیں
ٹوٹے ہوئے نشے کے ہم آئے ہیں تجھ تلک　　ساقی تجھے قسم ہے پیالہ کو بھر کہیں

اس کے بعد اسی ردیف و قافیہ میں ایک قطعہ ہے۔

دوسری غزل یا قطعہ جس کے متعلق اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے کہ وہ حضرت علی کی منقبت میں ہے طویل ہے۔ اس کے آخری چار شعر درج ذیل ہیں۔

ہائے مرجائیں گے افسوس سی حسرت میں　　آشنا ایک بھی مرضی کا نہ پایا واللہ
ہم بھی منت سے محبت کی طلب رکھتے ہیں　　کیمیا ہے جو ملے یار کوئی خاطر خواہ
اس گھر ایک جو آتا ہے مرا شاہ نجف　　بندگی ان ہی سے رکھتا ہوں میں مولا گواہ
دیکھو تو کس کی میں خدمت میں سرافراز ہوا　　شاہ دین مظہر کل یعنی علی عالی جاہ

رضا لائبریری رام پور میں ایک قلمی بیاض ہے جو نواب زادہ کریم اللہ خاں ولد نواب فیض اللہ خاں یعنی نواب محمد یار خاں کے بھتیجے کی مرتب کی ہوئی ہے۔ اس میں فدوی کا کچھ کلام پایا جاتا ہے۔ چوں کہ فدوی امیر کے ملازم رہے ہیں، ممکن ہے کہ یہ کلام ان ہی فدوی کا ہو۔ بہر حال وہ حسب ذیل ہے۔

شوخ ہر آن تری ہم تو ثنا کرتے ہیں　　گالیاں دے تو ہمیں، ہم تو دعا کرتے ہیں
یار و انصاف کرو کیا ہو بتوں کا شیوہ　　گر وفا کیجے تو وہ ہم پہ جفا کرتے ہیں
ناصحا یار کے ملنے سے ملامت مت کر　　کہہ بھلا تو ہی کہ کیا اس میں برا کرتے ہیں

کچھ اور اگر دل میں ٹھہراؤ میرے صاحب　　پر واسطے خدا کے تم جاؤ میرے صاحب
بے طرح تک رہے ہو ادھر کو تم میاں جی　　مت مجکو ایسی آنکھیں دکھلاؤ میرے صاحب
وہ بات کیا ہے ایسی جس پر خفا ہوئے ہو　　مجکو بھی اس کے معنے سمجھاؤ میرے صاحب
کہنے لگا تماری میں شکل پر ہوں حیراں　　کس منھ سے تم ہو عاشق ٹھہراؤ میرے صاحب

میں نے کہا کہ مجھ پر کوئی اور آپ کا ہے　　مجھ کو بھی اس کی صورت دکھلاؤ میرے صاحب
کہنے لگا کہ تم سے پھرتے ہیں یاں ہزاروں　　مت مجھ سے ایسی شیخی جتلاؤ میرے صاحب
میں نے کہا کہ شیخی ہے شیخ زادے کے گھر میں　　آئے نہ میرے منھ کو کھلاؤ میرے صاحب

واللہ یہ تو فدوی عاشق تو نیک ہو گا
ناحق نہ اس کے اوپر جھنجھلاؤ میرے صاحب

ایک مخمس کے چند بند پیش ہیں۔

لذت و عیش زندگی ہم نے بھی کی تھی فلک　　بادہ ناب اور گزک شام سے تھا سحر تلک
. . . .　　نیند سے آنکھیں مل کر دیکھوں میں کہ یک بیک
صبح دمید و شب گزشت ماہ جبیں بخانہ رفت
روئے سحر سیہ کنید، یار بہ ایں بہانہ رفت

. . . .　　. . . . .
یاسمنے کی تھی روشنی صحن چمن میں ہر طرف　　نہروں کے لبِ دار پا جن کے چراغ صف بہ صف
آب روانِ مکیشی با نگ نے و صدائے دف　　کیا ہی سماں بندھا تھا پر مفت گیا وہ لطف
صبح دمید و شب گزشت ماہ جبیں بخانہ رفت
روئے سحر سیہ کنید، یار بہ ایں بہانہ رفت

سیو ذرا یہ گفتگو شب کو بروئے آب جو　　مشعل سے تھی زرد بروہم تھے اور تھا وہ خوبرو
چلتی تھی مے سبو سبو دل کے صنم سے دو بدو　　لیک وہ سب ہو لی رفو آخر شب نہ من نہ او
صبح دمید و شب گزشت ماہ جبیں بخانہ رفت
روئے سحر سیہ کنید، یار بہ ایں بہانہ رفت

. . . .　　. . . . .
تجکو وہ شوخ دل ربا صبر کی لے گیا متاع　　فدوی نے اس سے اک ذرا کچھ بھی نہ پایا انتفاع
اس کے سخن میں فتنہ اس کی ادا میں اختراع　　باتوں میں شب گزر گئی وقت پکارا الوداع
صبح دمید و شب گزشت ماہ جبیں بخانہ رفت
روئے سحر سیہ کنید، یار بہ ایں بہانہ رفت

فدوی کی غزلوں کے اشعار ڈاکٹر حسنین نے مرزا محمد علی فدوی ہی کے نام سے جمع کر دیے ہیں یہ اشعار تمام مشہور تذکروں سے لیے گئے ہیں اور بہت لطیف ہیں۔ بہت سے شعر یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا تھا مگر یہ تحصیل حاصل ہے۔ البتہ ان میں تین شعر "جفا باعث خفا باعث" اور "نہیں معلوم بلا کون سی پیش آئی ہے" محمد حسن فدوی لاہوری کے ہیں جو شاہ مبارک آبرو سے اصلاح لیتا تھا۔

ہمالہ کی جانب چلو!

سیّد حرمت الاکرام

چلو! ہمالہ کی جانب چلو کہ تیغ زنو!
اُبل رہے ہیں چٹانوں سے بجلیوں کے شرار
فضا کے دوش پہ لرزاں ہے ساعتوں کی پکار
وفا کے گرد ہے فتنہ طرازیوں کا حصار
وطن کی آن پہ مٹنا ہے تم کو ہم وطنو!

یہ سرزمیں ہے ولیوں، مہاتماؤں کی
ازل سے ایک حسیں چھاؤں خیمہ زن ہے یہاں
صداقتوں کی طراوت چمن چمن ہے یہاں
قدم قدم پہ محبت کا بانکپن ہے یہاں
یہ سرزمیں ہے اہنسا کے دیوتاؤں کی

مجال کیا کہ کسی کا قدم اِدھر آئے
پکارتے ہیں مہکتے ہوئے سے خواب ہمیں
پکارتے ہیں مہکتے ہوئے گلاب ہمیں
پکارتے ہیں کھنکتے ہوئے رباب ہمیں
بڑھو کہ آنچ نہ رنگِ حیات پر آئے

طلسم، چین کے سپنوں کا توڑنا ہوگا
کہا یہ کس نے کہ طاقت کی آزمائش ہے؟
یہ کیا کہ دولت و حکمت کی آزمائش ہے!
یہ اپنی اپنی صداقت کی آزمائش ہے
بڑھو کہ مکر کا پنجہ مروڑنا ہوگا

اُٹھو کہ روحِ شہیدوں کی بےقرار نہ ہو
نسیم آئی ہے لے کر دھمک بگولوں کی
عرق عرق ہے جبیں سوگوار پھولوں کی
نہ بھٹکنے پائے نظر پیار کے اصولوں کی
اُٹھو کہ آتما گاندھی کی شرمسار نہ ہو

حیات، پیار کے آغوش میں نکھرتی ہے
ریا و مکر کا غازہ نہ چاہیے اِس کو
گرجتی توپوں کا نغمہ نہ چاہیے اِس کو
بگل کا بینڈ کا تحفہ نہ چاہیے اِس کو
زمیں، کرشن کی بنسی سے پیار کرتی ہے

بڑھو کہ بہا ہوا ارتقا کا جادو ہے
صدائیں دیتا ہے ہندوستاں کا مستقبل
پکارتا ہے اُمنگوں کو جلوۂ منزل
بلا رہا ہے تمھیں وقت کا دھڑکتا دل
بڑھو کہ قافلہ سالار اپنا نہرو ہے

بڑھو! حیات کو زرباز و گل فشاں کر دو
دھواں دھواں ہے زلیخائے امن کا رُخسار
بجھا بجھا سا ہے یوسف کے حسن کا پندار
بڑھو کہ لٹتی ہے کنعانِ زندگی کی بہار
ہو چڑھا کے محبت کو جاوداں کر دو

آئینہ تہذیب

جلد ۱ | مطبوعہ ۱۰ ماہ اکتوبر ۱۸۸۲ اعیسوی روز دوشنبہ | نمبر ۵

اشتہار

یہ اخبار ہر دوشنبہ کو شایع ہوا کریگا۔ اس پرچہ مین تار برقی۔ مختلف واقعات عمدہ آرٹیکل۔ مباحثہ علمی۔ خلاصہ گورنمنٹ گزٹ نامہ نگارون کی تحریرین درج ہوا کرینگی۔ اس پرچہ کے ساتھ جو ورق ضمیمہ بھی رہیگا جسمین ظرافت کا چٹخارا۔ بڑے کٹے ہوئے لطیفے۔ نامی شعرا کی منتخب غزلین۔ ایڈیشن درج ہونگے۔ محاورات وہ اچھوتے کر چکا جو نہ اترینگے۔ زبان وہ شوخ کہ بیساختگی تڑپ تڑپ کر بلائین لے۔ اور فصاحت قدمون پر لوٹتی پھرے۔

المشتہر

پروپرائیٹر آئینہ تہذیب۔

ضوابط

۱۔ جن حضرات کی خدمت مین یہ پرچہ بلا طلب پہونچے تو قیمت ورنہ ایک کارڈ انکاری مطبع مین بھیجدین پرچہ نہ واپس کرین۔

۲۔ مابعد پر یہ پرچہ نہ بھیجا جائیگا۔

۳۔ قیمت بذریعہ منی آرڈر ڈاکخانہ آنا چاہیے۔

۴۔ پیشگی سالانہ کے لئے ایک مہینہ اور ششماہی کے لئے دو ہفتہ میعاد دی جائیگی۔

۵۔ لوکل کے خریدارون کے لیئے میعاد پیشگی سالانہ دو ہفتہ اور ششماہی ایک ہفتہ۔

۶۔ ضمیمہ آئینہ تہذیب بشرط وصول زر پیشگی مبلغ تین روپیہ آٹھ آنہ سالانہ کے پرچہ سے علحدہ بھی بھیجا جاسکتا ہے۔

۷۔ نامہ نگارون کی خدمت مین پرچہ مفت بھیجا جاویگا بالفعل مضمون اور خبر ہفتہ وار بھیجنا ہوگی۔

۸۔ تحریرین صاف خط مین ہون۔ ہجو۔ ذاتی جھگڑے۔ خوشامد۔ مذہبی تعصب نام کو بھی نہ ہو۔

۹۔ ہر قسم کی تحریرون کو پیڈ ہونا چاہئے ورنہ واپس کیجائیگی۔

۱۰۔ جملہ خط و کتابت پروپرائیٹر کے نام سے ہونا چاہیے۔

۱۱۔ اشتہار و مضامین خاص فی سطر دو آنہ۔ اور اگر ہمیشہ درج ہونگے تو کچھ رعایت کیجائیگی۔ سطر سے مراد کالم کی سطر ہے۔ شرح قیمت معہ محصول ڈاک۔

کوئینٹ و اتیالگ	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ	[illegible]
رؤسا و راجگان	عہ	[illegible]	۳	۲
عام شائقین	[illegible]	[illegible]	۳	۸
لوکل	[illegible]	[illegible]	۳	۲

مطبع میں چھپا بنارس مقام سید پور ضلع غازی پور

مشرقی اتر پردیش کا ایک قدیم اخبار

محمود الٰہی

جام جہاں نما سے لے کر تہذیب الاخلاق تک اردو صحافت نے ارتقا کی کئی اہم منزلیں طے کی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر منزل اپنی پہلی منزل سے کہیں نتیجہ خیز اور بار آور ثابت ہوئی۔ لیکن تہذیب الاخلاق نے جو خدمات انجام دیے ہیں، ان کا ذکر اردو ادب کے مورخ کے لیے ناگزیر ہوگا۔ یہی وہ پرچہ ہے جس نے صحافت کو باوقار اور فعال زندگی کا نمائندہ بنایا اور ادب و صحافت کے درمیان جو خلیج حائل

تھی' اُسے پُر کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے اُردو نثر کو زمانے کا ساتھ دینے اور وقت کے تقاضوں کو پہچاننے کا چلن سکھایا۔ اس پرچے کے بدخواہ زیادہ اور مداح کم تھے لیکن یہ جس حلقے کا ممدوح بنا' درحقیقت وہی حلقہ ادب اور زندگی کے دھارے کا رُخ موڑنا جانتا تھا۔ اس کے مضامین کی تقلید میں' لوگوں نے مضامین لکھنے کی کوشش کی۔ بہت سے اخبار نویسوں نے اسی طرز کا پرچہ نکالنا چاہا کیونکہ وہ تہذیب الاخلاق ہی کو معیاری صحافت سمجھتے تھے۔ 'آئینہ تہذیب' بھی جس کے تعارف کے لیے یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں' تہذیب الاخلاق کا ایک مقلد اور ہم نوا اخبار تھا۔

سرسید اپنے دوران ملازمت میں ایسے مقامات پر بھی پہنچے' جو اردو زبان وادب کے مراکز نہیں تھے لیکن ان مقامات پر انھوں نے اپنی قوت عمل کے جوہر اس طرح دکھائے کہ ہر جگہ اچھا خاصا علمی اور ادبی حلقہ بن گیا جو وقت کے نئے تقاضوں کو سمجھتا تھا اور سرسید کی تحریک کی قدر کرتا تھا۔ اتر پردیش کے مشرقی اضلاع میں جون پور ایک عرصے تک اسلامیات اور مشرقی علوم وفنون کا مرکز رہا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس کا حلقۂ اثر دوسرے مشرقی اضلاع بنارس' اعظم گڑھ' غازی پور اور دوسرے قریبی اضلاع تک پھیل گیا تھا۔ سرسید اتفاق سے غازی پور بھی پہنچے اور وہاں ملازمت کے سلسلے میں ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۴ء تک مقیم رہے۔ سرسید کا یہ مختصر قیام وہاں کی ذہنی بیداری کے لیے کافی تھا۔ وہاں دیکھتے ہی دیکھتے ایسے ادارے قائم ہو گئے جو اس عہد کے لحاظ سے بہت اہم تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سرسید ایک نئی دنیا کا جو خواب دیکھ رہے تھے' اس کی تعبیر انھیں غازی پور میں ملی۔ سائنٹیفک سوسائٹی کی تشکیل اسی سرزمین پر ہوئی اور انگریزی سے اردو میں ترجمے کے کام کی بنیاد یہیں ڈالی گئی۔ مشرقی اضلاع سے سرسید کا تعلق ان کے آخری زمانۂ ملازمت یعنی ۱۸۷۶ء تک قائم رہا۔ وہ اپنے عہدے سے بنارس میں سبکدوش ہوئے۔ سرسید نے غازی پور اور بنارس میں کتنی مقبولیت حاصل کی تھی' اس کا علم اُس زمانے کے اخبارات سے ہوتا ہے۔ ان کی مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہو سکتا' کہ غازی پور ضلع کے ایک قصبہ سید پور سے 'آئینہ تہذیب' نکالا گیا۔ سرسید نے 'تہذیب' کے لفظ پر کچھ اس طرح زور دیا تھا کہ اس زمانے میں اسے عنوان بنا کر موافقت اور مخالفت میں مضامین لکھے گئے۔ زیر بحث اخبار کے نام میں لفظ تہذیب کی شمولیت سرسید سے جذباتی وابستگی اور ان سے اثر پذیری کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

ضلع غازی پور میں سید پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں سے اس زمانے میں تو کیا آج بھی کسی اخبار کی اشاعت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اخبار کے سرپرست کو خود اس کا احساس تھا۔ اس نے پہلی اشاعت میں یہ لکھا کہ "سید پور اور اخبار"؟۔ بہرحال ذرائع اور وسائل کی کمی کے باوجود یہاں کے بعض اہل ذوق نے صبح بنارس نام کا پریس قائم کیا اور 'آئینۂ تہذیب' کا پہلا شمارہ ۱ ستمبر ۱۸۸۲ء کو نکالا۔ اس شمارے میں اس بات کا اعلان کیا گیا کہ اتوار کے بجائے دوشنبہ اس کا یوم اشاعت ہو گا۔

اس کے جتنے شمارے میرے پیش نظر ہیں' وہ دوشنبہ کو شائع ہوئے ہیں۔ پریس اور اخبار کے سرپرست بابو شیو پرشاد تھے۔ ادارت منشی محمد یٰسین شفق کے سپرد تھی۔

'آئینۂ تہذیب' ۱۲ ½ × ۹ ½ کے سائز پر نکلتا تھا۔ اس میں کبھی دس اور کبھی آٹھ صفحات ہوتے تھے۔ پہلے صفحہ پر اخبار کے قواعد وضوابط ہوتے تھے اور آخری صفحہ پر اشتہارات۔ اس میں ان لوگوں کی فہرست بھی شائع ہوتی تھی جو اخبار کی خریداری منظور کرتے تھے۔ اس فہرست سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع نہ تھا۔

اخبار کے پہلے صفحے پر اخبار کی قیمت کی شرح اس طرح درج کی جاتی تھی:

	سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
گورنمنٹ ووالیان ملک	عـہ/	۸/	۰۴/
رؤسا وراجگان	عـہ/	۴/	۰۳/
عام شائقین	سے/	۳/	۰۲/
لوکل	ہ/	سے/	۲/

اخبار میں جو اشتہارات شائع ہوتے تھے ان سے پتا چلتا ہے کہ کبھی کبھی اس کا چو ورقہ ضمیمہ بھی شائع ہوتا تھا جس میں چھپ سکتے ہوئے

قصے' نامی شعرا کی منتخب غزلیں' آبدار چٹکلے'' وغیرہ ہوتے تھے مگر میرے سامنے جو شمارے میں ہیں ان میں کوئی ضمیمہ نہیں ملتا۔

آئینۂ تہذیب کے پہلے شمارے میں سرپرست اور ایڈیٹر نے جو نوٹ شائع کیے تھے' ان سے اخبار کے نقطۂ نظر' معیار اور لائحۂ عمل کا علم ہوتا ہے۔ اس کے ضروری اقتباسات یہ ہیں:

"...... اتنا لحاظ رہے کہ مضامین صاف اور واضح خط میں ہوں ..... اور کسی کی ہجو یا خوشامد نہ ہو اور نہ مذہبی تعصب کا اشارہ ہو....''

"..... یہ پیشہ (ایڈیٹری) بہت ہی نازک اور نہایت مشکل ہے... جب کوئی مضمون نہیں سوجھتا اور پرچے کو فروغ نہیں ہوتا تو کسی کی ہجو' کسی کی شکایت' کسی کے گھر کا حال لکھنا شروع کر دیتے ہیں ..... اردو اخباروں کی وقعت اسی وجہ سے کم کی جاتی ہے کہ اس میں واہیات باتیں بھر دی جاتی ہیں.... ہم اس غیر مہذب طریقہ کو کبھی پسند نہیں کرتے اور نہ اپنے فائدے کی غرض سے کسی کی ہجو یا کسی کی شکایت چھاپیں گے بلکہ ہم اس پرچہ میں مہذب اور شائستہ اخباروں کا فوٹو اتار کر دکھا دیں گے۔ ہم ہمیشہ اس بات کی کوشش کریں گے کہ ہماری قوم ترقی کرے اور اس کے ماتھے سے نیم وحشی کا ٹیکہ دور ہو اور جہالت کے تاریک مکان سے نکل کر علم کے صاف ستھرے اور روشن مکان میں داخل ہو.....''

اس اخبار کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے انشا پردازی کے قدیم طرز کے خلاف آواز بلند کی اور مقفّیٰ و مسجع نثر کی شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ اس مخالفت کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ کسی نے اشاعت کے لیے "صحرا میں طاؤس مینا کا رقص'' کے عنوان سے ایک مضمون بھیجا تھا۔ اڈیٹر نے مضمون تو شائع کر دیا مگر اس پر یہ نوٹ بھی لگا دیا:

"مرقومۂ بالا مضمون کی سرخی اور بعض بعض جملوں میں شاعرانہ خیال کا رنگ آگیا ہے۔ ہم اس سے بھی زیادہ صاف عبارت چاہتے ہیں۔ چونکہ یہ پہلا پرچہ ہے اس لیے ہم نے اس کو مناسب نہیں سمجھا کہ اول ہی اول آپ لوگوں کی خاطر شکنی کی جائے یعنی مضمون درج اخبار نہ کیا جاتا۔''

ایک دوسرے مضمون کو اس نوٹ کے ساتھ اڈیٹر نے شائع کیا:

"....ہم نہایت ادب سے عرض کرتے ہیں کہ جو مضمون اس ناچیز پرچے کے لیے لکھا جائے اس میں ایشیائی طرز تحریر کا رنگ نہ آنے پائے۔ جس قدر استعاروں اور تشبیہوں کی فرضی لطافت سے احتراز کیا جائے' بہتر ہوگا....''

اڈیٹر نے صرف ان جملوں کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اپنے معیار زبان و ادب کو واضح کرنے کے لیے مستقل مضامین شائع کیے۔ "شیریں زبانی'' کے عنوان سے پہلی جنوری ۱۸۸۳ء کے شمارے میں جو مضمون شائع ہوا تھا' اس کا یہ اقتباس قابل توجہ ہے:

"......یہ نہ تصور کیا جائے کہ صرف قافیہ نمائیاں' گل و بلبل کے مضامین' لیلیٰ و مجنوں کے قصے' قد کی راستی' گیسو کی درازی' دہن کی موہومی' کمر کی معدومی' نگاہ طاقت ربا' نرگس شہلا' چشم شرگیں و سرمگیں' رخسارۂ حسین' راز و نیاز' عشوۂ و انداز' کبک کی سی رفتار' دلربایانہ گفتار' ہجر و وصل' آہ و بکا' نالۂ نارسا' چہرے کی زردی' صحرانوردی' آسمان کی شکایت' قصۂ رقابت' خزان و بہار' میخانۂ خمار' رندوں کا ہنگامہ' شیخ کا عمامہ — یہی شیریں زبانی' یا اسی پر شیریں زبانی ختم ہے جن کا صلہ چند لمحہ کی واہ واہ اور ماشاء اللہ میں مل جاتا ہے۔ نہیں شیرینی زبانی انسان کی عمدہ صفت ہے اور نہایت مفید خصلت....''

انگریزوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو' کے اصول کو جس شدت اور لگن کے ساتھ اپنایا تھا' یہاں اس پر بحث کرنے کا وقت نہیں ہے' کہنا یہ ہے کہ یہ اخبار جس دور سے متعلق ہے' اس دور میں انگریزوں کا یہ اصول عام نگاہوں کے سامنے بھی آگیا تھا اور ملک کا بیدار اور حساس طبقہ اس کے نتائج اور مضمرات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اس اخبار نے ملک کو اس خطرے سے متنبہ کیا اور ہندو مسلم اتحاد اور مختلف فرقوں کے درمیان میل جول پر مضامین شائع کیے۔ "قومی نفاق'' کے زیر عنوان اس نے جو مضمون شائع کیا تھا' اس کے چند جملے یہ ہیں:

"ہندوستان میں کثرت سے دو مذہب ہیں' ہندو اور مسلمان.....

جہاں تک مجھ کو اپنے ہندو بھائی کے مذہب سے واقفیت ہے
میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوؤں کو مذہبًا انسانی ہمدردی کا ضرور رہے۔
جو لوگ حیوانات کی تکلیف گوارا نہیں کرسکتے اور جان مارنے کو بیجا
سمجھتے ہیں وہ خیال کرسکتے ہیں کہ اپنے اس مقررہ اصول سے وہ انسان
کے ساتھ ہمدردی کرنے پر کس قدر مجبور ہیں۔ مسلمانوں کے مذہب میں
(جیسے میں سچے دل سے سچا جانتا ہوں) انسان کے ساتھ ہمدردی کرنے
کی سخت تاکید ہے......افسوس ہے ان مسلمانوں پر جو ہمدردی کے قانون
کو توڑیں اور اپنی پاک شریعت کے پاک حکم سے منہ موڑیں......مدت سے
یہ دونوں قومیں ہندوستان میں رہتی ہیں دونوں موجودہ گروہوں میں
اسی ملک کی پیداوار ہیں۔ یہیں کی آب و ہوا اور غذا نے دونوں کو
پرورش کیا ہے....''

آئینۂ تہذیب صحافت کے اصولوں کی پابندی کرنے کی کوشش کرتا
تھا۔ اس کے کالموں میں ان لوگوں کے خیالات بھی درج کیے جاتے تھے جو کسی
موضوع پر اس کے نقطۂ نظر کی مخالفت کرتے تھے۔ اس نے اردو اور ہندی
کے مسئلے پر ایک بار ایک طویل مضمون شائع کیا۔ ایک صاحب نے اس کا مدلل
مگر تلخ اور سخت جواب لکھا۔ اخبار نے اسے بطیب خاطر شائع کیا اور نفس
موضوع کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ اپنے پڑھنے والوں پر چھوڑ دیا۔ اردو میں
صنف انشائیہ کی ترقی مغربی ادبیات سے اثر پذیری کا ایک مظہر ہے۔ سرسید
کے بعض مضامین اس صنف کے اچھے نمونے ہیں۔ اس اخبار میں بھی کبھی کبھی
ایسے مضامین شائع ہوتے تھے جنھیں بجا طور پر انشائیہ کی صف میں لاسکتے ہیں۔

اُس زمانہ میں غیر ملکی اقتدار کی مخالفت کوئی آسان بات نہ تھی۔
ہر اخبار کو اپنے حاکموں کی نگاہ بھی دیکھنی پڑتی تھی۔ آئینۂ تہذیب
میں بھی حکومت وقت کی تعریف میں کبھی کبھی چند جملے شائع ہوتے تھے
مگر اس پر کڑی تنقید کرنے سے بھی اڈیٹر گریز نہیں کرتا تھا۔ آئینۂ تہذیب
نے ایک دوسرے اخبار سے یہ قول نقل کیا:

'' گورنمنٹ انگریزی کی عملداری میں علانیہ گھوڑدوڑ پر شرطیں لگائی
جاتی ہیں' بازیاں بدی جاتی ہیں۔ کیا اسے قماربازی نہیں کہتے اور اگر
قماربازی کے سر پر کوئی سینگ نہیں' یہ کھلم کھلا قماربازی ہے' تو
کیا وجہ ہے کہ حکام اس کھیل کی رکاوٹ نہیں کی جاتی ؟''

اس پر آئینۂ تہذیب کے اڈیٹر نے جن الفاظ میں تبصرہ کیا ہے' وہ اس
وقت کی سیاسی بیداری کے ترجمان ہیں۔ وہ الفاظ یہ ہیں:

'' سپید رنگت والے جو چاہیں کریں' کوئی پوچھنے والا نہیں۔ دنیا کا
آئین اور قانون تو صرف کالوں ہی کے واسطے اُترا ہے۔''

اس اخبار میں صرف ادبی اور علمی مضامین ہی نہیں شائع ہوتے تھے
بلکہ وقت کے تقاضوں کے پیش نظر اس میں جغرافیہ اور سائنس کے مبادیات
پر بھی اچھی' آسان اور سلیس زبان میں مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔
مندرجہ ذیل عنوانات سے جغرافیائی اور سائنسی مضامین کی افادیت کا اندازہ
ہوسکتا ہے:- سمندر کا بیان' زمین کی ابتدائی حالت کیا تھی' کرۂ زمین کی
حرارت کا بیان' چاند گہن' سورج گہن' دُم دار ستارہ' سورج کی روشنی کی
رفتار وغیرہ۔ اس قسم کے جو مضامین شائع ہوتے تھے اُن کا معیار اگرچہ
بلند نہیں لیکن اُس دور کو دیکھتے ہوئے ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔
مضمون نگاروں کا تصنیفی رجحان مدرسانہ ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ یہ مضامین
لکھے ہی گئے تھے ان لوگوں کے لیے جو اس کوچے سے ناآشنا تھے۔ ان کے
لکھنے والوں کے سامنے افہام و تفہیم کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ تھا۔ ایک
مضمون مکالمے کی صورت میں ہے۔ ایک شاگرد اپنے استاد سے چاند گہن
سورج گہن' دُم دار ستارہ اور سورج کی روشنی کی رفتار کے بارے میں
متعدد سوالات کرتا ہے۔ اور استاد ہر سوال کا جواب دل نشیں اور موثر انداز
میں دیتا ہے۔ دوران گفتگو میں استاد یہ بھی واضح کرتا جاتا ہے کہ لوگوں
نے توہم پرستی اختیار کرلی ہے اور کائنات کی حقیقت سمجھنے کی کوشش نہیں
کی۔ شاگرد کے اس خیال کا کہ دُم دار ستارے کا اثر کاروبار دنیا پر کیا
پڑتا ہے' استاد اس طرح جواب دیتا ہے:

'' عام خیال تو یہ ضرور ہے کہ یہ ستارہ بلا وجہ نہیں نظر آتا' جب
کوئی حادثہ ہونے والا ہوتا ہے تو ستارہ نمودار ہوتا ہے...... مگر
ہماری رائے یہ ہے کہ دُم دار ستارہ کا کاروبار دنیا میں کوئی دخل نہیں
ہے...... یہ ہندوستان ہے۔ یہاں کے لوگ تو نیم وحشی اور بے وقوف
کہے ہی جاتے ہیں۔ یورپ کے ایک شاعر (ملٹن) کا یہ خیال ہے کہ اس کا
ظہور خالی از علت نہیں......''

آئینۂ تہذیب کی خبروں میں بڑا تنوع ملتا ہے۔ موسم کے

حال سے لے کر سیاسی نشیب و فراز تک کا ذکر اس میں شامل رہتا تھا۔ خبروں کے لیے چار مستقل عنوانات قائم کیے گئے تھے۔ لوکل، مختلف اتفاقات، تار برقی اور خلاصہ گورنمنٹ گزٹ۔ لوکل کے عنوان کے تحت مقامی خبریں شائع کی جاتی تھیں۔ خبروں کے انتخاب میں مرتب اپنے قصبے کی تعمیر و ترقی ملحوظ رکھتا تھا اور برسر اقتدار طبقے کی سخت نکتہ چینی کرنے کو عار نہیں سمجھتا تھا۔ اگر قصبے میں بارش زیادہ ہوئی تو اس کی خبر اس طرح مرتب کی گئی:

"...... اس بارش کے سبب سے سردی زیادہ ہو گئی ہے اور کچھ دن زور و شور رہے گا۔ غریب کنگال لوگوں کی جاڑے میں مشکل ہے......"

ایک بار قصبے میں گندگی زیادہ پھیل گئی تھی۔ اس پر نامہ نگار نے بڑے تلخ لہجہ میں لکھا:

"...... بعض راستے اور گلیاں ایسی گندی اور کثیف ہیں کہ راہ چلنا دشوار ہے...... سید پور کی صفائی کے لیے میونسپل کمیٹی کو ضرور توجہ کرنی چاہیے۔ قوم کا روپیہ قوم کے لیے صرف ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہ ہوا تو ہم ضرور کہیں گے کہ ہماری قوم پر ظلم کیا جا رہا ہے......"

ملکی خبریں زیادہ تر "مختلف واقعات" کے مستقل عنوان کے تحت شائع کی جاتی تھیں۔ ان میں سے بعض خبریں اخبار کے اپنے نامہ نگاروں کی بھیجی ہوئی ہوتی تھیں اور اکثر دوسرے مشہور اخبارات سے اخذ کی جاتی تھیں۔ کوشش اس کی ہوتی تھی کہ ملک کے ہر حصے کی اہم خبریں سمیٹ لی جائیں۔ بعض خبریں مرتب کے تبصرے کے ساتھ شائع ہوتی تھیں جس سے اخبار کے موقف کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

بیرون ہند کی خبریں "تار برقی" کے زیر عنوان درج کی جاتی تھیں۔ روس، جرمنی، انگلینڈ، فرانس، مصر اور دوسرے بہت سے ملکوں کی اہم اور نمایندہ خبریں شائع کی جاتی تھیں جن کا بڑا حصہ انگریزی اخبارات سے ماخوذ ہوتا تھا۔ اخبار میں بیرون ہند کی صرف خبریں نہیں شائع ہوتی تھیں بلکہ کبھی کبھی بعض ممالک کے سیاسی حالات پر جامع تبصرہ بھی کیا جاتا تھا۔

مرتب کی اخبار نویسی کا جوہر خبروں کی ترتیب و تہذیب میں کھلتا ہے۔ اس نے بارہا اپنے اداریتی کالموں میں کہا کہ اردو کے اخبارات کو صحیح معنوں میں اخبار ہونا چاہیے تاکہ اردو کا، ملک کا اور اخبار نویسی کا وقار بڑھے۔ مرتب نے جو نظریہ پیش کیا تھا، اس پر اس نے عمل بھی کیا۔ وہ خبروں کے انتخاب اور ترتیب میں کبھی جذباتی نہیں ہوا۔ "سنسنی خیز" خبروں سے اس نے ہمیشہ گریز کیا۔

جو خبریں تعلیم و تعلم سے متعلق ہوتی تھیں، انھیں نمایاں طور پر شائع کیا جاتا تھا مثلاً تعلیمی کمیشن کے سامنے ملک کے ماہرین نے جو بیانات دیے تھے، ان کے ضروری اقتباسات بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیے جاتے تھے۔ اسی طرح مدرسۃ العلوم، علی گڑھ میں پختہ بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کے سلسلے میں "بزرگوں کی یادگار" کے عنوان سے مفصل اور نمایاں خبر شائع کی گئی۔ اخبار میں امتحان کے نتائج کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔

تعلیم نسواں کا اخبار بڑا حامی تھا۔ اس میں کبھی کبھی اس موضوع پر خاص مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ ان اقتباسات سے تعلیم نسواں کے سلسلے میں اخبار کے موقف کا علم ہو سکتا ہے:

" فرقہ نسواں کو اگر ہم اپنا ہمسر کہیں تو بجا اور درست معلوم ہوتا ہے...... موجودہ حالت فرقۂ عورات کو دیکھ کر رسم و رواج کو معائنہ کر کے ایک عجیب اور غریب صورت انقلاب سے کچھ کا کچھ نظر آتا ہے یعنی فی زمانہ عورات اندرونی اور مرد بیرونی منتظم قرار دیے گئے...... افسوس جب سے اس ملک کے باشندگان نے تعلیم نسواں کی طرف سے لاپروائی کی ہے، تمام عیش و آرام کو خاک میں ملا دیا ہے...... اس ملک کے باشندگان اور نیز گورنمنٹ کو اول اس طرف توجہ ہونی چاہیے۔ جس وقت تعلیم نسواں پھیل جائے گی اس وقت یہ ملک خود بخود ریفارم ہو جاوے گا ورنہ محال ہے۔"

"...... جو کام مرد لوگ کر سکتے ہیں وہ عورتیں بھی کر سکتی ہیں اور عورتوں پر بھی یہ فرض ہے کہ وہ تمام کام کریں اور ہر قسم کے علوم پڑھیں اور اپنے خیالات کو ترقی دیں......"

"آئینۂ تہذیب" کے ۷ شمارے میرے پیش نظر ہیں۔[۵] آخری

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۹ پر)

[۵] یہ پرچے میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ میں کالج کے وائس پرنسپل شیخ جگو صاحب اور لائبریرین شمی شریف کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ان پرچوں سے استفادہ کرنے کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

غزل

سالک لکھنوی

ترے سایے میں چشمِ یار کیا کیا
نظر آئے ہیں دل افگار کیا کیا

ہوئے معلوم ہر نقشِ قدم سے
رموزِ شوخیِ رفتار کیا کیا

نہ تھے جب تک نظر کے سامنے تم
تھا لطفِ حسرتِ دیدار کیا کیا

ہتی ظرفی پہ تیری چشمِ ساقی!
ہنسی ہے فطرتِ خود دار کیا کیا

بہ فیضِ ذوقِ سجدہ دیر و کعبہ
ملے ہیں آستانِ یار کیا کیا

سر شوریدہ اِک تیری بہ دولت
ملے ہیں نقش بر دیوار کیا کیا

تری آنکھوں کی شہ جب پا گئے ہیں
کھلے ہیں پھر لبِ اظہار کیا کیا

اُن آنکھوں سے جنھیں چھیڑا تھا تم نے
اُٹھے ہیں ابرِ گوہر بار کیا کیا

بہ ہر منزل ملی نقشِ قدم سے
رہ آسانی و دشوار کیا کیا

تھے ہم جب تک خریدارِ تمنا
رہی ہے گرمیِ بازار کیا کیا

ترے قدموں سے اے سالکؔ اُڑی ہے
ہوائے شوخیِ رفتار کیا کیا

[illegible]

غم کا بانکپن

ساحر بھوپالی

گھر سے باندھ کے نکلو، سر اب کفن یارو
دشمنوں کے نرغے میں، آج ہے وطن یارو

شب کے سینے سے پھوٹی، صبح کی کرن یارو
زندگی نے سی ڈالا، موت کا کفن یارو

اب نظر کو کیا بھائے، کوئی سیم تن یارو
دل کو موہ لیتا ہے، غم کا بھولا پن یارو

وصل بھی میسر ہے، دید بھی میسر ہے
سونی سونی ہے پھر بھی، دل کی انجمن یارو

ہر ستم زمانے کا، ہم نے جھیلا ہنس ہنس کر
تب کہیں ہمیں آیا، جینے کا یہ فن یارو

حسن کتنا ہی سنورے، عیش کتنا ہی نکھرے
غم کا بانکپن ہے پھر، غم کا بانکپن یارو

جب بھی آدمی بھٹکا، جادہ صداقت سے
پڑ گئی ہے ماتھے پر، وقت کے شکن یارو

بغض اور عداوت نے، نفرت و تعصب نے
خاک میں ملا ڈالی، رونقِ وطن یارو

جیتے جی ہے ناممکن، یاں سکون کا ملنا
موت ہی اُتارے گی، زیست کی تھکن یارو

اُن کو اب جتانا ہے، جی سے اب گزرنا ہے
دل میں ٹیس اُٹھاتی ہے، درد کی گھٹن یارو

حسن بھی تماشا ہے، عشق بھی تماشا ہے
اب نہ شیریں ہے کوئی، اور نہ کوہ کن یارو

دل میں درد اُٹھا ہے، لب پہ مسکراہٹ ہے
اب ذرا کوئی دیکھے، میرا بانکپن یارو

کچھ خبر ہے ساحرؔ کی، جو تلاشِ انساں میں
پھر رہا ہے سرگرداں ہو کے بے وطن یارو

دسمبر ۱۹۶۲ء

شعری تنقید کا نیا شعور — حالی سے پہلے

ثمینہ شوکت

اس میں شک نہیں کہ ادب کو عصری تقاضوں کا ساتھ دینا چاہیے لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ادیب خالق تصورات ہو اور اپنے عصر سے آگے سوچنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔ ادیب کی اصلی شخصیت اسی وقت ابھرتی ہے۔ یہ بات بھی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ ایک اچھا ادیب اچھا نقاد بھی ہوتا ہے، اس لئے اس کا شعور اسے فضا میں منتشر فکری اور سماجی رجحانات کا وقتاً فوقتاً احساس دلاتا رہتا ہے۔

اردو شاعری اور خاص طور پر اردو غزل کے موضوعات کی غیر ضروری تجدید کا رونا اب پرانا ہو چکا ہے لیکن ہماری دست رس میں ایسی معلومات کم آئی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہو کہ غزل کی تجدید کا شعور عہد جدید سے پہلے بھی پیدا ہو چکا تھا، اور نئے انداز سے سوچنے کی کچھ کوششیں قدیم زمانے میں بھی کی گئی تھیں۔ جدید دور میں نئے شعری تصورات کو رواج دینے میں سب سے پہلی شخصیت ہم کو محمد حسین آزاد کی ملتی ہے، جن کی فکر روشن نے ہماری شاعری اور ادب کی فرسودگی اور اس کی پامالی کو محسوس کیا اور بہت جلد اس کا ادراک کر لیا کہ ہماری قدیم شاعری کا سرمایہ صدیوں کی پرانی جنس بن چکا ہے، اس میں تنوع کی کمی ہے اور حقایق کی جگہ رسمی اور روایتی مضامین نے لے لی ہے۔ اس شعور کے ساتھ ہی انھوں نے اردو شاعری میں اصلاح کا پرچار کرنا شروع کیا۔ چنان چہ لاہور کی انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"تمھاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے اسکے آزاد کرنے میں کوشش کرو۔ نہیں تو تمھاری اولاد ایسا پائے گی کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہوگی۔"

حالی نے بھی مولانا آزاد سے اس سلسلے میں الہام حاصل کیا تھا لیکن آزاد کے مقابلے میں وہ اردو شاعری کی اصلاح کے لئے زیادہ لیس ہو کر آگے بڑھے۔ آزاد کے خیالوں کا رنگ گہرا ہو کر چوکھا ہو کر "مقدمہ" میں ظاہر ہوا۔ حالی لکھتے ہیں:۔

"غزل کی حالت فی زماننا نہایت ابتر ہے۔ وہ محض ایک بے سود اور دور از کار صنف معلوم ہوتی ہے۔"

مختصر یہ کہ حالی کے صحت مند شعور نے اردو شاعری اور خاص طور پر غزل کو نئے معیار بخشنے کی کوشش کی تھی۔ اس امر کا واضح سبب تو یہ تھا کہ ہماری شاعری اور ہمارا ادب تاریخی تقاضوں سے بڑی حد تک بیگانہ ہو چلا تھا۔

لیکن آزاد اور حالی دونوں سے پہلے تیرھویں صدی ہجری کے وسط میں اردو شاعری کی تعمیر نو کا احساس رکھنے والے ایک ادیب نے کہا تھا کہ:

"اردو غزل کے موضوعات پر اس قدر کثرت سے طبع آزمائی کی جا چکی ہے کہ اب اس میں کسی اضافے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اس لئے اپنی اوقات عزیز کو جانب مضمون گل و بلبل کے صرف نہ کیا۔ کس واسطے کہ سخن سرایان سابق نے کوئی مضامین اور مناسبت باغ و بستان کی . . . فروگزاشت نہیں کی کہ اب کسو کی فکر تازہ سے کوئی نئی بات

لکھی جا سے . . . "

ادیر کا اقتباس ایک ایسے ادیب کے احساسات ہیں جو نہ تو آزاد سے متاثر تھا اور نہ حالی سے' بلکہ ان دونوں سے کوئی پچیس تیس برس پہلے اس نے اردو غزل کی تجدید کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

ادبی اور فکری دنیا میں عام طور پر نئی تحریکوں کے نمایاں ہونے اور معین شکل اختیار کرنے سے پہلے ان کے عوامل اور عناصر منتشر اور غیر مربوط صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ اردو غزل کے موضوعات اور مضامین کی تجدید اور اس کی تنقید کے سلسلے میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ ادیر جس ادیب کے خیالات درج کئے گئے ہیں وہ راجہ مکھن لعل ہیں جو انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں دکن کے ادیبوں میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ مکھن لعل کی زندگی کا بڑا حصہ حیدرآباد میں بسر ہوا اور یہیں ان کی ذہنی اور ادبی زندگی کا آغاز اور نشو و نما ہوا۔ مکھن لعل کا شمار حیدرآباد کے عمائدین میں ہوتا تھا۔ وہ شاہجہاں پور کے ایک معزز کایستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ تلاش روزگار میں شاہجہاں پور چھوڑ کر شاہ نور چلے گئے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نور میں توقع کے مطابق انھیں فراخی نصیب نہ ہو سکی۔ اسی لئے وہ حیدرآباد چلے گئے۔ یہ زمانہ سکندر جاہ آصف جاہ ثالث (۱۲۱۸ء۔۱۲۴۴ھ) کا تھا۔ مکھن لعل کے وہاں پہنچنے کے ساتھ ہی ان کے عروج کا آغاز ہوا اور سکندر جاہ کے جانشین ناصر الدولہ (۱۲۴۴۔۱۲۶۶ھ) میں وہ اپنی ترقی کے منتہا کو پہنچ گئے۔[۱]

حیدرآباد آنے کے بعد مکھن لعل کا تعلق جلد ہی سکندر جاہ کے دربار سے ہو گیا اور سکندر جاہ کے محلات کے لئے غلہ پہنچانے کی خدمت پر وہ مامور کئے گئے۔[۲] اس زمانے میں مہاراجہ چندو لعل شاداں نظام کی پیشکاری کے عہدے پر مامور تھے اور انھوں نے مکھن لعل کو دربار کی مذکورۂ بالا خدمت پر مامور کیا تھا۔ مکھن لعل نے اپنی دیانت داری کی بدولت سکندر جاہ اور مہاراجہ چندو لعل کے مزاج میں دخل اور ان کا اعتماد حاصل کر لیا' چنانچہ جلد ہی مہاراجہ نے انھیں دربار میں اپنا عرض بیگی مقرر کر دیا۔ مکھن لعل کو سکندر جاہ کے دربار سے "راجہ" کا خطاب بھی عطا ہوا۔ بعد میں ناصر الدولہ نے اپنے زمانۂ فرماں روائی میں عید نوروز کے موقع پر انھیں "راجہ بہادر" کے خطاب سے بھی سرفراز کیا۔[۳] ناصر الدولہ کے زمانے میں مکھن لعل شہرت اور عروج کے جس مرتبہ پر پہنچ گئے تھے اس کا اندازہ ہم کو اس زمانے کے ایک قلمی نثری کارنامے سے ہوتا ہے جو نثر معینی کے نام سے موسوم ہے اور ۱۲۵۰ھ کا مرتبہ ہے۔[۴] اس میں ناصر الدولہ اور ان کے عہد کے صرف چھ عمائدین سلطنت کی مدح سرائی کی گئی ہے' جن میں مکھن لعل بھی شامل ہیں۔ ایک اور بات قابل ذکر یہ ہے کہ اس رسالے میں حکمران وقت ناصر الدولہ کی مدح کے بعد ہی مکھن لعل کی مدح کی گئی ہے اور مدح کا آغاز راجہ مکھن لعل "سفیر خوش تقریر" کے عنوان کے ماتحت ہوتا ہے۔ مضمون میں مکھن لعل کی فراخ دلی اور فیاضی کی دل کھول کر تعریف کی گئی ہے اور آخر میں ان کی مدح میں کچھ اشعار بھی لکھے ہیں۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے:

"راجہ بکرم راجہ یا راکہ بہ کرم وجود ادم زند و راجہ نل راجہ وجود کہ خود را بہ عالی منزلیتش داند . . . در راجگان ریاست آصفیہ ہم بخشش چناں بالا است کہ سرشیر برشیر و دربندگان دولت ناصریہ بہ اساست بازی بہ آں درجہ سرفراز است کہ درجنب حلقہ کمان . . سفیریست عالی ہم و کیلیست ذی کرم آصف جاہ بہادر و پیشکارش کہ عبارت از مہاراجہ عالی جاہ راجہ چندو لعل بہادر باشد بردیانت و امانت دارش نازاں و اہلکاران سرکار انگلشیہ ہم با او نزد مجت بازاں۔

ترا اے راجہ مکھن لال بادا · درخت جاہ و حشمت مثمر از بود
چہ پوری کز ظہورش · دودۂ تو · شود سرتا سر از انوار پرنور
گر در عین شخص ظل تو باد · مدام از لطف حق مقبول و منظور

مکھن لعل نے انگریز عہدہ داروں کے مزاج میں بھی بڑا رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ سکندر جاہ کے زمانے کے ریزیڈنٹ حشمت جنگ ہنری رسل اور سر چارلس مٹکاف جو بعد میں گورنر جنرل کے عہدے پر مامور ہو گئے تھے' مکھن لعل کے بڑے قدر دانوں میں سے تھے اور ملکی اور انتظامی معاملات میں ان سے مشورہ بھی کیا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے محلہ مغل پورہ میں مکھن لعل

۱۔ تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۲۶۳-۲۶۴
۲۔ مخطوطہ دستور الالقاب ورق ۲ ب مقالہ دوم
۳۔ کرانالوجی آف حیدرآباد صفحہ ۲۰۵
۴۔ مخطوطہ نثر معینی مخزونہ کتب خانہ ملکی ربانی

کی ڈیوڑھی کے آثار اب بھی باقی ہیں اور جس کوچے میں وہ ڈیوڑھی واقع تھی، وہ کوچہ "کوچہ مکھن لعل" کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار جب حیدرآباد آئے تو مکھن لعل ہی کی ڈیوڑھی میں قیام کیا تھا۔ اس زمانے میں حیدرآباد وہاں کے وزرا اور امرا کی سرپرستیوں کی بدولت اطراف و اکناف کے شعرا اور اہلِ کمال کا ملجا و ماویٰ بن گیا تھا۔ راجہ مکھن لعل بھی ماحول سے متاثر ہوئے اور اردو اور فارسی میں انھوں نے کچھ کلام بھی چھوڑا ہے، جو زیادہ تر نعت اور منقبت پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک "مسدس" بھی ملتا ہے جو بہت مختصر ہے۔ مرثیوں کی ایک بیاض میں، مکھن لعل کے لکھے ہوئے کچھ مرثیے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔

مکھن لعل پیشہ ور شاعر نہیں تھے۔ شاعری ان کے لئے محض اظہار کا ذریعہ تھی۔ انھوں نے مروجہ شاعری کے طرز کو چھوڑ کر سیدھے سادے اور بے تکلف انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ میری نظر میں وہ دیباچہ ہے جو انھوں نے اپنے ترجمۂ "رباعیات عمر خیام" پر قلمبند کیا ہے۔ اس دیباچہ کی اہمیت دو اعتبارات سے ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ دیباچہ متوسط دور کے ابتدائی نثری کارناموں میں سے ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مکھن لعل نے اس میں جس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے، وہ اس زمانے کے لئے بالکل نیا تھا۔ دیباچے میں راجہ مکھن لعل نے اُن محرکات کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے انھیں عمر خیام کی رباعیات کے ترجمے پر ابھارا تھا۔ غزل ہر زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی اردو کی مقبول ترین صنف تھی۔ لیکن جب مکھن لعل نے غزل کے میدان میں اپنی فکری صلاحیتوں کے لئے کوئی گوشہ تلاش کرنے کی کوشش کی، تو ان کے صحت مند تنقیدی شعور نے ان پر یہ واضح کر دیا کہ اب ان کے لئے یہاں کوئی مقام نہیں ہے ؎

حریفاں بادہا خوردند و رفتند تہی خم خانہا کردند و رفتند

سالہا سال سے غزل میں ایک ہی نوعیت کے موضوعات شعرا کی فکر کا مرکز و محور بنے رہے تھے جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقی وارداتوں کی جگہ رسمی اور روایتی مضامین نے لے لی۔ اردو شعرا میں متقدمین کے یہاں جذبات کی ہلکی ہلکی سی تڑپ کہیں نہ کہیں جھلک جاتی ہے لیکن بعد کے شعرا نے اپنے اطراف کی اور اپنے من کی دنیا کی طرف سے اس طرح سے آنکھیں موند لیں کہ انھیں سوائے تقلید اور پیروی کے کوئی دوسری راہ نظر نہ آئی۔ یہی وجہ ہے کہ

بے رنگ اور بے رس شاعری سے ہمارے اردو شعرا کے دواوین بھرے نظر آتے ہیں۔

مکھن لعل نے اردو غزل کی اس فرسودگی اور بے کیفی کا اندازہ اس وقت لگا لیا تھا جب انگریزی شاعری کے مطالعے کی وجہ سے ہمارے اردو پڑھنے اور لکھنے والوں میں فطری شاعری کا وہ شعور نہیں ابھرا تھا جو عہدِ نو کا امتیاز ہے۔ حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" حقیقت میں جدید عہد کے پیدا کردہ تنقیدی شعور کا نتیجہ ہے۔ لیکن مکھن لعل اپنے نئے ادراک کے لئے کسی خارجی محرک کے مرہونِ نہیں تھے، بلکہ اس معاملے میں محض ان کی حقیقت پسند سرشت نے ان کی رہنمائی کی تھی۔ حالی کے "مقدمہ" اور مکھن لعل کے "دیباچے" کے بعض حصوں میں بہت کم فاصلے رہ گئے ہیں۔ اور کہیں کہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ حالی کی آواز مکھن لعل ہی کے پچھلے جنم کی صدائے بازگشت ہے۔

مکھن لعل کا دیباچۂ قصائد رباعیات عمر خیام کمیاب ہے اور اس کا صرف ایک ہی مخطوطہ دستیاب ہو سکا ہے۔ فقیر محمد خاں گویا کی "بستانِ حکمت" اور رجب علی بیگ سرور کے عصر کی عبارت کا نمونہ ہے اور ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔ ذیل میں اس کے اہم اقتباسات درج کئے جاتے ہیں تاکہ مکھن لعل کے تنقیدی تصورات کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

سخن سنجانِ سابق نے کوئی مضامین اور مناسبت باغ و بستان کی اور دشت و کوہ و بیابان کی اور بیان فصل اور موسم کا اور مشاطگی باد صبا اور گلستاں کی اور زحمت سموم و صرصر خزاں کی اور بیان ابر و بارش کا اور سماں شفق کا اور تاثیر انجم اور خاصیت اشیا اور حقیقت آسمان کی اور گردش فلک نا ہنجار کی اور تابندگی ماہ و خورشید کی اور کڑکنا رعد کا اور کوندنا بجلی کا اور بیان فغان بلبل کا اور چہچہانا مرغان خوش الحان چمن کا اور ذکر طفلی و شباب و پیری اور مقدمہ حیات و ممات نزع کا اور غم ہونا ماتم شب کا اور بیان گورستان کا اور شرح ثروت و مفلسی کی اور تذکرہ سخی و بخیل کا اور بیان زہد و تقویٰ شیخ و زاہد کا اور بدمستی مستان معرفت کی اور جھگڑا کفر و اسلام کا اور احوال ملت و مذہب کا اور جھگڑا سبحہ و زنار کا اور ذکر خیر زیارت کا اور بیان مسافری راہ کا اور مخاطرہ دزدان سرمایۂ دین و ایمان کا اور تعریف کعبۂ شریفہ اور مدینۂ منورہ کی اور توصیف کعبۂ دل کی اور احوال مسجد و کنشت کا اور بیان شادی و غم کا اور معرکہ جنگ و جدل کا اور زحمت شجاعت شجاعان روئے زمین کی اور رفاقت اشراف اہل

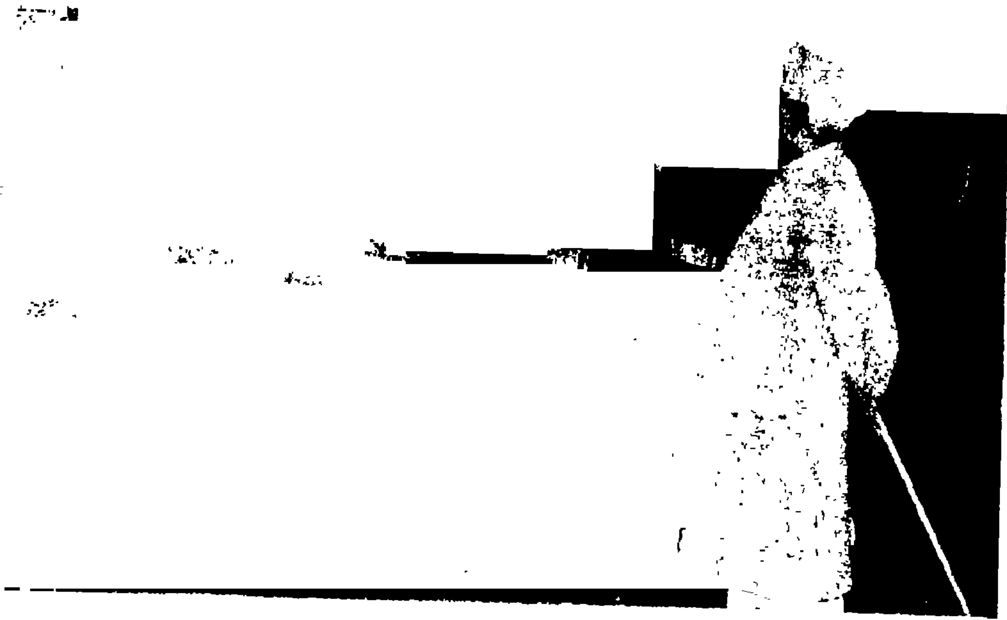
زمانہ کی اور مقدمہ فتح و ہزیمت کا اور تعریف خم و خمخانہ کی اور توصیف صراحی و جام و صہبا کی ڈہکانا مغبچوں کا اور ہشیاری میزاران میکدہ عشق کی اور رعنائی و زیبائی معشوقان رشک حور و غلمان کی اور تعریف سراپا ناز کی اور بیان عاشقی کا اور تپاک تحریر نامہ و پیام کا اور شرح قاصد و ایلچی کی اور انتظاری جواب نامے کی اور بیان عشوہ و غمزہ اور ناز و کرشمہ کا اور سرگشتگی عاشق کی اور بے وفائی معشوقان جہاں کی، مکر فاحشہ عورتوں کا اور اغوا کرنا رقیبوں کا اور بہکانا مشاطوں کا اور فریب پانا عاشق خستہ دل اور سینہ فگار کا اور بیان محفل طرب کا اور اشتیاق شب وصل کا اور بے قراری شب دیجور ہجر کی اور ذکر رخصت معشوق کا اور بیان افسردگی عاشق برتنا کا فروگزاشت نہیں کیا کہ اب کسو کے فکر تازہ سے کوئی نئی بات لکھی جاوے[1] ؎

اوپر کے اقتباس میں اردو شاعری کے عام موضوعات کی جو تفصیل مکھن لعل نے دی ہے وہ طویل ہے، لیکن مکھن لعل سے پہلے اور ان کے بعد بھی کسی نے ہماری شاعری کے موضوعات کے اتنے وسیع میدان کا احاطہ کرنے کی شاید ہی کوشش کی ہو۔ اس سے ان کے مطالعہ شاعری کی وسعت اور تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم اس اقتباس سے ان کے نظریہ شاعری کا بھی پتہ چلا سکتے ہیں۔ مکھن لعل کی نظر میں شاعری کو ہجر و وصال اور گل و بلبل کے افسانوں تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے۔ پامال مضامین کو طرز بیان کی الٹ پھیر سے نیا روپ دے کر پیش کرنا ان کے خیال میں شاعری نہیں تھی۔ قدیم شاعروں کے یہاں ظاہر ہے کہ ایک ہی مواد توڑ مروڑ کر نئے نئے سانچوں میں ڈھالا جاتا تھا۔ اسی لئے مکھن لعل کو اس کا شدید احساس تھا کہ اردو شاعری اپنے محدود موضوعات کی حد تک سیر حاصل ہو چکی ہے۔ وہ شاعر کے لئے یہ ضروری سمجھتے تھے کہ اپنی فکر تازہ سے نئی بات پیدا کرے۔ ان سارے تصورات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مکھن لعل کے ذہن میں ایک خاص قسم کا حقیقت پسندانہ شعور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ماحول سے بلند ہو کر سوچنے کی کوشش کی۔ انھیں اپنے عہد کی غزل کے سولہ سنگار ایک آنکھ نہیں بھائے۔ یہ دراصل ان کے صحت مند مذاق کی دلیل ہے۔ اسی لئے قدیم ڈگر کو چھوڑ کر انھوں نے خود "رو قدم راہ غلط کہنے" کی کوشش کی۔

دراصل مکھن لعل کے تحت شعور میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ غزل موضوعات کے لحاظ سے "غم جاناں" اور "شب فراق" سے ماورا بھی کچھ کہہ سکتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جب سے اردو شاعروں میں یہ احساس عام ہوا ہماری اردو غزل بھی ایک نئے اور جاندار طرز سے روشناس ہوئی۔ البتہ ایک خاص بات قابل ذکر یہ ہے کہ مکھن لعل کو نہ تو اپنے ذاتی رجحانات کے اعتبار سے اور نہ زمانے کے اقتضا کا خیال کر کے اس کی خواہش ہوئی کہ وہ اپنے تنقیدی خیالات کا پرچار کریں۔ اس لئے انھوں نے جو کچھ لکھا وہ گویا اپنے لئے لکھا۔ ان خیالات کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہ آواز بلند کچھ سوچ رہے ہیں۔ ان مجمل تصورات کو شرح و بسط اور تنظیم و ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کا سہرا حالی کے سر ہے۔ جو باتیں مکھن لعل نے اجمال کے ساتھ کہی تھیں حالی نے اپنے زمانے کے اقتضا اور اپنے علم و دلچسپی کے مد نظر انھیں شرح و تفصیل اور استدلال و براہین کے ساتھ ایک مکمل کتاب کی صورت عطا کی۔ حالی کے تصورات نئے عہد کے سانچوں میں ڈھل کر آئے تھے لیکن مکھن لعل اپنے عہد کی فکر کے مطابق سوچ رہے تھے یہ واضح ہے کہ مکھن لعل کے تنقیدی تصورات عام نہیں ہو سکے کیونکہ ابھی تک وہ کتاب خانے کی چار دیواری میں بند ہیں۔ اسی لئے مکھن لعل اپنے ان خیالات کی بدولت نہ تو مشہور ہوئے اور نہ حالی کی طرح معتوب جو خود ایک طرح کی شہرت ہے۔

ہماری شاعری کے موضوعات کی یکسانی اور تکرار سے اکتا جانے کے بعد مکھن لعل کے ذہن میں جو نیا تصور پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ شاعری ان پامال مضامین سے ہٹ کر بھی کی جا سکتی ہے۔ اس ادراک سے وہ کوئی عظیم تر کام لے سکتے تھے۔ لیکن ان کے سامنے جدید دور کے شعرا کی طرح سے کوئی نیا نظام شاعری موجود نہیں تھا اور نہ مروجہ شاعری سے متجاوز کوئی نمونے ان کی دسترس میں تھے۔ اسی لئے انھوں نے "عمر خیام کی رباعیات" کے ترجمے پر قناعت کر لی۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ مکھن لعل کو خیام کی رباعیات میں ایک وسیع تر دنیا اور کسی حد تک حقیقت پسندانہ تصورات ملے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ مکھن لعل سے پہلے عمر خیام کی رباعیوں کو اردو میں منتقل کرنے کی کسی نے کوشش نہیں کی تھی۔ اسی لئے یہ گنجینۂ فکر و لطافت اردو جاننے والوں کی نظر سے اوجھل تھا۔ مکھن لعل کے خیال میں ترجمے سے ہٹ کر طبع آزمائی

[1] مخطوطہ ترجمہ رباعیات عمر خیام ورق ۲ الف و ب۔ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن۔



"جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر"

چین نے پُرامن ہندوستان پر حملہ کیا ہے اور ہندوستان کے جوان مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔
(اوپر) شری سی، بی، گپتا وزیر اعلیٰ اُتر پردیش، اسپیشل پولیس فورس کے جوانوں سے باتیں کر رہے ہیں اور (نیچے) لوک سہایک سینا
کیمپ میں نوجوان فوجی ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں

" جسے جینا ہو مرنے کے لیے تیار ہو جانے "

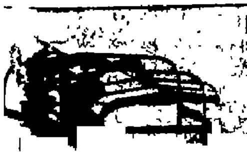


چین کے حملے نے اُتر پردیش کی خواتین میں
پیدا کر دیا اور شری بشونا تھ داس گورنر اُتر
وزیر محنت اُتر پردیش کی صدارت میں، لکھنو
جس کا دفتر راج بھون، لکھنؤ میں ہے۔ یہ کمیٹی
سہولت بہم پہنچا رہی ہے۔ کمیٹی نے مختلف
لیے اونی سامان تیار کرائی ہیں، زخمی سپاہی
اور رسالے جمع کر کے بھیجتی ہیں اور ریلوے اسٹیشن
انتظام کرتی



شری بشونا تھ داس گورنر اُتر پردیش، میں
جنرل کھنا کو جوانوں کے لیے "ٹوکن" کے

سیوا سمتی (مہیلا) کی طرف سے جوانوں





لڑکیاں سپاہیوں کے لیے سوئٹر بُن رہی ہیں

جوانوں کے لیے کتابیں اور رسالے جمع کیے گئے ہیں





جوانوں کے لیے خون جمع کیا جا رہا ہے

دمت کا ایک جذبہ
رشریمتی سوچتا کرپلانی
اتی (مہیلا) بن گئی
کو ہر ممکن آرام اور
ہیں' جو جوانوں کے
ن مہیا کرتی ہیں کتابیں
یے چائے پانی کا



ریلوے اسٹیشن پر جوانوں کو چائے پلائی جا رہی ہے

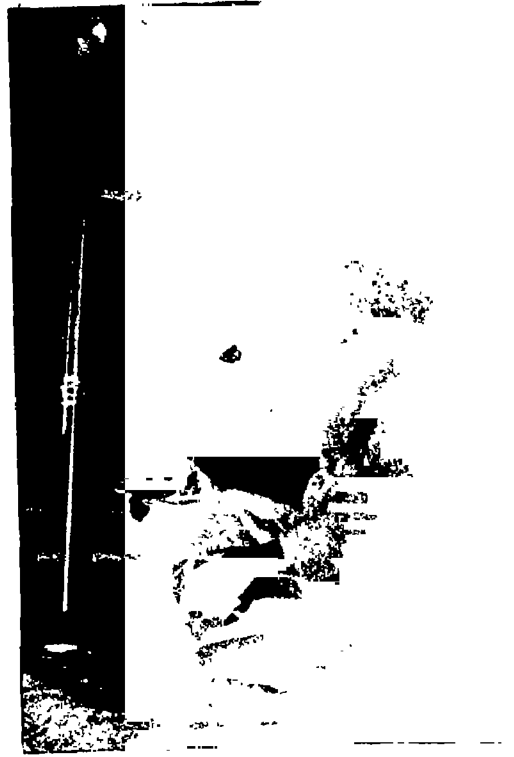


) کی جانب سے
یڈل پیش کر رہے ہیں

رہے ہیں







اتر پردیش کے کونے کونے میں ہر فرقے اور ہر مذہب کے افراد
نے لڑائی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے نیشنل ڈیفنس فنڈ میں چندہ دیا

اُوپر (داہنی طرف)
ایک بھوٹیا ضلع چمولی میں بھوٹیوں کی جانب سے

اور (بائیں طرف)
ایک گدی، نجیب آباد میں گدیوں کی جانب سے
وزیراعلیٰ اُتر پردیش کو
نیشنل ڈیفنس فنڈ کے لیے چندہ دے رہی ہیں

شاعر نے کہا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اور

لکھنؤ کی خواتین نے یہ دکھا دیا
کہ وہ

وقت پڑنے پر اپنے وطن کے لیے
اپنے آنچل کو پرچم بھی بنا سکتی ہیں



کے لئے فارسی کی طرح کا "سواد اردو سواد زبان ریختہ" میں نہیں تھا تاہم ان کے اردو کلام کے جو نمونے ملتے ہیں وہ ان کے مخصوص تصورات شاعری کے ہم نوا ہیں۔ عملاً شعر کی اخلاقی اور روحانی قدریں ان کی نظر میں زیادہ وزن رکھتی تھیں اسی لئے انھوں نے غزل بہت کم کہی اور جو کہی وہ مروجہ فضا میں سے ہٹی ہوئی ہے۔ فارسی میں ایک دو غزلیں ایسی ملتی ہیں جن میں عشق و محبت کی وارداتیں بیان کی گئی ہیں لیکن ان میں مکھن لعل کے جذبات کے تیور دیکھتے ہوئے یہ نہیں محسوس ہوتا کہ انھوں نے غیروں کی وارداتیں بیان کی ہیں، بلکہ یہ ان کے اپنے جذبات اور تجربات معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مکھن لعل نے جو باتیں دیباچے میں بیان کی تھیں، وہ محض بیان کرنے کے لئے نہیں تھیں، ان کے پیچھے ان کے ایقان کی پشت پناہی تھی۔ یہی سبب ہے کہ غزل کی فضا میں پرورش پانے اور سانس لینے کے باوجود انھوں نے اردو میں غزل نہیں کہی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مکھن لعل پابندیٔ روایت کو اُس زمانے میں غیر ضروری اور بے جا بندش سمجھتے تھے۔ چنانچہ فکر شعر کے جو نمونے انھوں نے پیش کئے ہیں وہ مروجہ شاعری سے ہٹے ہوئے ہیں اور ان کے اپنے زمانے میں غالباً وہ ویسے ہی روکھے پھیکے سمجھے جاتے تھے جیسے حالی کی شاعری اُن کے زمانے میں۔ مکھن لعل کے دیباچے کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ نئی قسم کے شعری تصورات ان کے تحت شعور میں مجمل حیثیت سے موجود تھے، اور جب وہ شعر کہنے بیٹھے تو اس سے بہتر جامہ وہ ان تصورات کو نہ دے سکے، جو انھوں نے دیا۔ انھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو ایسی آدرش ہستیوں کی مدح سرائی کے لئے صرف کیا جن کا وہ احترام کرتے تھے۔ جب وہ اپنا دیباچہ لکھ رہے تھے تو مکھن لعل کو شاید اس کا شعوری طور پر احساس نہیں تھا کہ وہ شعری روایت کے خلاف بغاوت کے بیج بو رہے ہیں۔ اس لئے انھوں نے جو کچھ کہا اصول سازی کے لہجے میں نہیں کہا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ ان کا دیباچہ منظر عام پر نہیں آیا، اس لئے تنقید غزل میں ایک نیا زاویہ جھلانے والوں میں آج تک ان کا نام نہیں لیا گیا۔ جس خاموشی کے ساتھ وہ ایک نئے انقلابی تصور کی طرف اشارہ کر کے گزر گئے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے بارے میں ضرورت سے زیادہ حسن ظن رکھتے تھے۔ یا پھر یہ کہنا پڑے گا کہ ادبی تاریخ کو ایک نیا موڑ دینے کے وہ اہل نہیں تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں اپنی بے نام و نمود ہستی کے مضمرات کا اندازہ نہیں تھا، ورنہ کیا اس کا امکان نہیں تھا کہ وہ اپنی آواز اتنی بلند کرتے کہ غزل گو شعرا کے حلقے میں ذرا سی ہلچل ہی مچ جاتی؟



مشرقی اترپردیش کا ایک قدیم اخبار

(بسلسلہ صفحہ ۲۳)

اخبار ہ۔ فروری ۱۸۸۳ء کا ہے۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ اخبار کب بند ہوا لیکن اس کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ توقع کے مطابق اس کو خریدار نہ مل سکے۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ جلد ہی بند ہو گیا ہوگا۔ بہرحال جب اترپردیش کے مشرقی اضلاع کی ذہنی بیداری کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس اخبار کا ذکر ضرور کیا جائے گا۔ اس کا حلقۂ اشاعت کتنا ہی محدود کیوں نہ رہا ہو، یہ ماننا پڑے گا کہ اس نے ترقی پسند نظریۂ حیات کی تبلیغ و تلقین کی اور نئی نسل کو وقت کی آواز میں آواز ملانے پر آمادہ کیا۔

تینوں ایک اور گلی میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں لیکن اسی لمحے انھیں کوئی سامنے سے آتا ہوا دکھائی دے گیا۔ وہ ٹھٹک گئیں۔

"میرا خیال ہے قدیر صاحب ہیں۔" اروناشاہ نے سائیکل سوار کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں جی وہ قدیر صاحب نہیں ہیں چلو۔"

"اری دہی تو ہے۔ کم بخت!" اسے دیکھ کر شاہدہ کا جیسے رواں رواں ہلک اٹھا ہو۔ "دیکھتی نہیں ہو، سائیکل کے پیڈلوں تک پاؤں پہنچانے کے لیے کیسی کیسی کوشش کر رہا ہے!"

ارونا اور شاما دونوں ہنس پڑیں لیکن شاہدہ بدستور مغموم تھی۔

بہت ہی چھوٹے قد کا قدیر ان کے پاس پہنچ کر سائیکل پر سے قریب قریب کود پڑا۔ تینوں کو بڑے مہذب طریقے سے سلام کیا۔ سب کا باری باری سے مزاج پوچھا اور پھر جیسے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے قدرے اطمینان سے بولا: "سن سنس کا کام پورا ہو گیا ہے؟"

"اتنی جلدی کیسے ہو جائے گا؟ ہم مشین ہیں یا انسان؟" اروناشاہ نے تڑ سے جواب دے مارا اگرچہ قدیر نے سوال بڑی محبت سے شاہدہ سے پوچھا تھا۔

"میرا مطلب ہے، آپ سن سنس میں مصروف ہیں نا!"

"آپ نے کیا دیکھا؟ کینٹین میں بیٹھی گپ مار رہی ہوں؟" اب بھی ارونا شاہ نے اسے تلخی سے جواب دیا کیوں کہ وہ شاہدہ کو بڑی محبت سے گھورے جا رہا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ سی آئی ڈی کا کام کرنے نکلے ہیں!" شاما لمہوترا کے لہجے میں خوشامد تھی۔ وہ مسکرا بھی رہی تھی۔ لیکن ہٹلر مارکہ مونچھوں اور سر پر پھنسا کر ٹوپی پہننے والے قدیر نے کھسیا کر بتیسی نکال دی اور کہا: "جی نہیں۔ میں تو ذرا بک ٹرسٹ تک جا رہا تھا۔ پرسوں بچوں کی تعلیمی کتابوں کی نمائش ہے نا!"

اس کے بعد چند لمحوں میں کارپوریشن کے ایک پرائمری سکول کی تینوں استانیاں ہونٹ سیے ہوئے کھڑی رہیں اور قدیر کو کوئی اور بات کرنے کی بجائے وہاں سے چلا جانا ہی بہتر معلوم ہوا۔ کود کر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے بولا: "اچھا آداب عرض۔"

وہ ایک دوسرے کی طرف گہری اور معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکرا پڑیں۔

"بیچارا شاہدہ کی محبت میں مرا جا رہا ہے!" شاما بولی۔

"وہ شاہدہ کو ایک نظر دیکھنے کے خاطر ہی سے تو اس طرف سے ہو کر گیا ہے۔ ورنہ بک ٹرسٹ کا سیدھا راستہ تو ادھر ہی سے ہے۔" اروناشاہ نے کہا۔

"ہو سکتا ہے بک ٹرسٹ جانے کا بھی محض بہانہ ہی ہو۔ وہ اگلی گلی میں سے ہو کر پھر ڈپارٹمنٹ کو لوٹ جائے۔"

شاہدہ جو ان کی باتیں سن سن کر مسکرا رہی تھی، بولی: "اف! تم دونوں تو اس کی اس طرح نمائندگی کر رہی ہو جیسے اس کی سگی بہنیں ہی تو لگتی ہو۔ کیوں؟"

"شاہدہ، تم اس کے ساتھ شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ تنخواہ بھی معقول پاتا ہے۔ اپنے ڈپارٹمنٹ میں بھی ہے۔ کبھی تمھیں ترقی بھی دلا سکتا ہے۔"

"ہاں بھئی شاہدہ۔ اب اسے مایوس نہ کرو۔ میں وعدہ کرتی ہوں قدیر کے ساتھ شادی کر دگی تو اس کے لیے تمھیں ایک پرانی سائیکل تحفے میں ضرور دوں گی۔"

شاہدہ نے دونوں کو انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا: "چلو چلو کچھ کام بھی کیا جائے۔ تم تو باتوں ہی میں وقت گزار دینا چاہتی ہو؟"

تینوں اپنے اپنے رجسٹر سنبھال کر ایک اور گلی میں داخل ہو گئیں اور دیوار پر نظریں گڑا کر پڑھنے لگیں: "کوچہ چھوٹے نواب صاحب۔"

کارپوریشن کی کالی روغنی پلیٹ کے آس پاس بے شمار پرانے اور نئے اشتہار چپکے ہوئے تھے۔ قریب ہی کے ایک مکان پر نمبر پڑا تھا۔ سی ۲۱۵۔ III۔

"یہاں کون رہتا ہے؟"

شاما نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو منزلہ بوسیدہ مکان کی کھڑکیوں اور اس کے دروازوں پر پرانے ٹاٹ لہرا رہے تھے۔

"کہیے! کس سے ملنا ہے آپ کو؟" بغیر دوپٹے کے آدھا جسم ٹاٹ کے پیچھے سے باہر نکال کر ایک جوان لڑکی نے پوچھا۔

"تمھارے باپ کا کیا نام ہے؟"

"جی؟"

"گھر میں کوئی ہے؟" شاہدہ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ امی ہیں۔"

"کوئی مرد نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ ابا کچہری چلے گئے ہیں۔"

"چلو ہم تمھاری امی سے کچھ پوچھیں گے"

تینوں اس کے پیچھے پیچھے اندر چلی گئیں۔ چھوٹے سے صحن میں ایک ادھیڑ عورت سر کھولے اپنی ایک دو لڑکی سے بالوں میں تیل لگوا رہی تھی جو ایک پتلون کے نچلے حصے پر پیوند لگاتی جاتی تھی۔

"آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

اس کے ساتوں بچے ان کے گرد گھیرا ڈال کر بڑی بڑی حیران آنکھوں سے سفید ساریوں اور سیاہ چمکتے ہوئے جوڑے والی عورتوں کو دیکھ رہے تھے۔

"ہم کارپوریشن کے شکشا دبھاگ سے آئے ہیں۔ آپ کے کتنے بچے پڑھتے ہیں؟"

"صرف شمع اور اکبر کو پڑھا رہی ہوں۔"

"باقی کو؟ آپ کے میاں کیا کرتے ہیں؟ کتنی تنخواہ پاتے ہیں؟"

سب بچے ہنسنے لگے۔ کچھ اور عورتیں بھی اڑوس پڑوس سے آگئیں۔ وہ ضروری ضروری باتیں نوٹ کر کے وہاں سے نکل آئیں۔ ایک بڑے مکان کے باہر دو دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ نان بائی، قصاب، نائی، پان سگریٹ والے سبھی ان کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک کپڑے والا کپڑا ناپتے ناپتے بھول گیا اور سر کھجلانے لگا۔ اس بڑی عمارت کا مالک اپنا منشی ساتھ لیے ایک ایک کرایہ دار سے کرایہ وصول کرتا پھرتا تھا۔ جہاں سے کرایہ نہیں ملتا تھا اس کی وہ کھڑے کھڑے توہین کر دیتا تھا۔ ایک موٹر گیرج کا منھ بانس کے ٹٹر سے بند تھا اندر سے صابن ملا ہوا میلا پانی بہہ کر باہر آرہا تھا۔ دھپا دھپ کپڑے دھونے کی آواز بھی تھی۔

"ارے بھئی اندر کوئی ہے؟" شاا ملہوترا نے ٹٹر کے سوراخوں میں سے جھانک کر بہت دھیرے سے پوچھا۔ لیکن جواب اسے بڑی کڑاکے دار آواز میں ملا۔

"ہاں ہے، کیا ہے؟"

ایک نیم برہنہ بوڑھی مگر تندرست عورت ٹٹر کے پیچھے کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر نمودار ہو گئی تھی۔

"تمھارے میاں کا کیا نام ہے بڑی بی؟"

"ہے نہیں، تھا۔"

تینوں نے اچنبھے سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کیا تھا؟"

"عبد الغفور خاں رام پوری۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہیں۔ پھر پوچھا۔

تمھارے بچے کتنے ہیں؟"

"اللہ کا فضل ہے۔"

وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ اور کچھ نہ پوچھا۔ آگے بڑھیں تو پیچھے سے اس بڑھیا نے چلا کر پوچھا: "بس! اور کچھ نہیں پوچھوگی؟ کہاں سے کھاتی ہو؟ کس کے سہارے جیتی ہو؟ جیتی بھی ہو یا نہیں؟"

اُس کا شور سن کر اِدھر اُدھر کے لوگ جمع ہونے لگے۔ نان بائی جست کی ایک بڑی پتیلی میں کف گیر چلاتے چلاتے کسی اندرونی جذبے سے سرشار ہو کر گانے لگا: "ابتدائے عشق میں ساری رات جاگے، اللہ جانے کیا ہوگا آگے۔"

دکانوں کا سلسلہ اب ختم ہو گیا تھا۔ ایک گرے ہوئے مکان کے ملبے پر لکڑی کی ٹال تھی۔ اُس کا مالک ایک سردار تھا جو جسم پر صرف ایک کچھ پہنے خود ہی لکڑیاں پھاڑ پھاڑ کر ایک طرف ان کا ڈھیر لگاتا جا رہا تھا۔ اس کی سردارنی لکڑی کے تخت پر بیٹھی بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ وہ اُس کے پاس جا کر پوچھنے لگیں۔

"تم یہاں رہتی ہو اسی ٹال پر؟" شاما ملہوترا کو ایک کونے میں لکڑی کا بنا ہوا کمرہ دکھائی دے گیا تھا جس کی چھت پر کپڑے سوکھ رہے تھے۔

"ہور کتھے رہیے؟" سردارنی نے بچے کا رُخ بدل کر دوسری طرف سے دودھ پلاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر پڑوس کے ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "سرکار نے کلیم وچ ایہہ مکان الاٹ نا کردِتا اے۔ پر اے رُڑ جا نڑے مسلمان خالی وہ تاں کرن!"

"اچھا تمھارے بچے کتنے ہیں؟"

"پنج۔"

"پڑھتے ہیں؟"

"نئیں۔ اِک اُس سامنے چوراہے تے سائیکلاں نوں پنچر لاوندا اے۔ دو جا اپنے چاچے نال پھیری تے کپڑا بیچن جاندا۔ تیجا لنگڑا تے اپاہج اے۔ باقی دو اجے چھوٹے نے۔"

"انھیں تم پڑھاتی کیوں نہیں؟"

"کی کراں جی پڑھا کے؟ اتنی طاقت دی نیں تاں!"

سردار کلہاڑی کو ایک لکڑی کے سینے میں پھنسا چھوڑ کر ان کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُس کے جسم سے پسینے کی نالیاں چل رہی تھیں۔ وہ ٹیلے پر سے اُتر آئیں اور پھر ایک دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ نوابی دور کی لکھوری اینٹوں والے مکانات اب خستہ ہو چکے تھے۔ ایک دیوار پر بیلوں کی جوڑی بنی ہوئی تھی۔ اس کے آگے گیہوں کی بالی اور درانتی۔ پھر دیپک' جھونپڑی' ہاتھی' سائیکل اور تالے کی کئی علامتوں کا سلسلہ تھا۔ وہ چلتے چلتے ایک مکان کے سامنے رُک گئیں۔ وہ بھی بہت پرانا تھا۔ اس کے در و دیوار تک کانپنے سے لگے تھے۔ ہڈیوں کے ڈھانچے کی طرح اس کی اینٹیں جابجا نکلی ہوئی تھیں جن کے بیچ سے سیمنٹ' چونا' مٹی سبھی کچھ گر چکا تھا۔ وہاں ان کا سواگت ایک بکری نے مہیا کر کیا۔

"یہاں کون رہتا ہے؟" انھوں نے بند دروازے سے پوچھا۔ لیکن بند دروازے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بند ہی رہا۔ تین چار بار کھٹکھٹانے پر اندر سے کنڈی کھلی جو ایک چھ سال کے بچے نے خالی پیٹی پر چڑھ کر کھولی تھی۔

"گھر میں کون ہے؟"

"اماں"۔

"اچھا' یہ پیٹی ہٹا لو۔ ہم لوگ اندر چلیں گے۔"

لڑکے کے جسم پر کھلے گریبان کی صرف ایک قمیص تھی۔ اس کے ہاتھوں' پیروں اور ٹانگوں پر مٹی لگی ہوئی تھی اور ایک گال پر بہتی ہوئی ناک سوکھ گئی تھی۔ مکان کا صحن بہت ہی کشادہ تھا۔ کئی کمرے تھے لیکن ایک کے علاوہ سب خالی' ویران اور گرے پڑے سے۔ آر پار بندھی ہوئی رسی پر تہمد اور تولئے سوکھ رہے تھے۔ برآمدے کے فرش پر جھوٹے برتن بکھرے پڑے تھے۔ ایک کمرے میں ایک چارپائی پر ایک عورت لیٹی ہوئی تھی۔ دوسری چارپائی پر ایک لڑکی تھی۔ تیسری چارپائی پر دو اور بچے لیٹے ہوئے تھے وہ دیکھتے ہی سمجھ گئیں سب بیمار تھے۔ ان کی آہٹ پاکر عورت نے آنکھیں کھول دیں۔ لیٹے لیٹے ہی اُنھیں غور سے دیکھا۔

"آپ کو کیا ہوا؟ بخار؟ یہ بچے بھی بیمار ہیں؟" ارونا شاہ اُس عورت کے قریب بیٹھ کر ہمدردی بھرے لہجہ میں پوچھنے لگی۔ شاما اور شاہدہ چپ چاپ پاس کھڑی تھیں۔ شاہدہ کی نظریں دیوار پر جمی تھیں۔ جس لڑکے نے دروازہ کھولا تھا وہ ماں کے سرہانے کھڑا ہو کر اور منہ میں قمیص کے دامن کا ایک کونہ دبا کر اُن عورتوں کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

"ہم سرکار کی طرف سے گھر گھر جا کر لوگوں کی آمدنی' ان کے بچوں کی تعداد اور تعلیم کے بارے میں ٹھیک ٹھیک جانکاری حاصل کرتے پھرتے ہیں۔" شاما ملہوترا نے اپنی اور دوسری اُستانیوں کی آمد کی غرض وغایت واضح کر دی۔

"لیکن آپ تو بیمار ہیں۔ کیونکر پوچھیں؟" ارونا بولی۔

اُس عورت نے گردن گھما کر اپنے لڑکے کو پکارا۔ "اے رفیق۔ ذرا پانی تو لا دے۔ حلق سوکھ رہا ہے۔"

رفیق پانی لے آیا اور وہ پی چکی تو قدرے اونچی آواز میں بولی۔ "پوچھئے۔"

تینوں بت بنی کھڑی رہیں۔ شاہدہ تو پہلے سے بھی زیادہ بجھ گئی تھی۔

"آپ کے خاوند کا کیا نام ہے؟"

"سعید احمد صدیقی۔"

"کیا کرتے ہیں؟"

"گھر سے باہر جاتے ہیں تو کلرکی۔ لوٹتے ہیں تو مار پیٹ' گالی گلوج۔"

شاہدہ نے اس کے ماتھے کو چھو کر وہاں پہلی بار زبان کھولی۔ آپ کو بہت تیز بخار ہے۔ آپ آرام کیجئے۔ ہم اور کچھ نہیں پوچھیں گے۔"

"نہیں نہیں پوچھے۔ مجھے بخار نہ ہوتا تب بھی میں آپ کو یہی بتاتی۔ اِس گھر میں سچ مچ یہی ہوتا ہے۔ وہ روزانہ شراب پی کر گھر آتے ہیں۔ ہم روزانہ اُن کے ہاتھوں سے پٹتے ہیں' گالیاں کھاتے ہیں۔"

"تنخواہ کتنی پاتے ہیں؟"

منّی ہوں ڈھائی سو پاتے ہیں۔ لیکن میرے ہاتھ پر ترا شی ہی رکھتے ہیں۔ جن میں مجھے سارے مہینے کا خرچ چلانا پڑتا ہے۔"

"یہی چار بچے ہیں آپ کے؟"

یہ سُن کر اُس عورت نے شاما کی طرف حیرت سے دیکھا جیسے اُس نے بہت ہی عجیب سوال پوچھ لیا ہو۔ پھر دھیرے سے کہا۔ "جی ہاں یہی ہیں اور میری جان کھانے کے لئے بہت ہی کافی۔ اس وقت بیمار نہ پڑے ہوتے تو ایسا اودھم مچا رہے ہوتے کہ آپ کے لئے یہاں دو منٹ بھی کھڑے رہنا دشوار ہو جاتا۔"

"سب پڑھتے ہیں نا!"

"جی نہیں پہلے پڑھتے تھے۔ اب نہیں بھیجتی۔ فیس اور کتابوں کی قیمت نہیں دے سکتی اس لئے اُٹھا لیا۔"

انھوں نے اور کچھ نہ پوچھا۔ شکریہ ادا کر کے باہر نکل آئیں۔ ارونا بولی۔ "بعض عورتیں بالکل شکایتی ٹٹو ہوتی ہیں۔ جب بھی آتے ملو اپنے پتی کی کسی نہ کسی بات کی شکایت ضرور کریں گی۔"

"میرا خیال ہے اپنے گھر والوں کو بگاڑنے والی ایسی ہی عورتیں ہوتی ہیں۔" شاما نے شاہدہ کا کندھا چھو کر پوچھا۔ "کیوں شاہدہ!"

ارونا ہنس کر بولی۔ "اس سے کیا پوچھتی ہو؟"

شاہدہ نے ان دونوں کی طرف عجیب افسردگی سے دیکھا جسے ارونا نے محسوس نہیں کیا اور بولی۔ "اچھا بھئی چلیں اب۔ کل بھی تو آنا پڑے گا!"

ارونا اور شاما کو ایک ہی محلے میں جانا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی رکشے میں بیٹھ کر چلی گئیں۔ شاہدہ دوسرے محلے میں رہتی تھی لیکن وہ اُس طرف جانے کی بجائے اُسی مکان میں لوٹ گئی جس میں وہ سب کے آخر میں گئی تھی۔

بیمار عورت کو شاہدہ کے واپس آجانے پر کچھ حیرانی سی ہوئی لیکن شاہدہ اس کے پاس بیٹھ کر بولی "مجھے یقین ہے کہ آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے۔ کہئے تو کھانا پکا دوں۔ دوا کی ضرورت ہو دوا لا دوں۔ بتائیے۔ آپ کس ڈاکٹر سے علاج کرا رہی ہیں؟"

یہ سُن کر اُس عورت کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ تکیے کے نیچے سے نسخے نکال کر اُس کے حوالے کر دیے اور بولی۔ "ان سے صبح کہا بھی تھا کہ آج دفتر نہ جائیے، چھٹی لے لیجئے۔ لیکن وہ منّی ان سنی کر کے چلے گئے۔"

شاہدہ رفیق کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی۔ دوا لے آئی۔ سب کو ایک ایک خوراک پلائی۔ پھر ان سب کے کھانے کے لئے کچھ پکایا۔ رفیق کو نل کے نیچے لے جا کر نہلایا۔ اس کے کپڑے بدلے۔ پھر کمرے اور برآمدے کا فرش صاف کیا۔ اِدھر اُدھر پھینکی ہوئی چیزوں کو سمیٹا۔ میز پر رکھی ہوئی کتابوں اور شیشیوں کو ترتیب سے رکھا۔ دیواروں پر ٹنگی ہوئی تصویروں کو بھی صاف کر دیا۔ اس طرح گھر کا نقشہ ہی بدل گیا، جیسے کوئی روتے روتے اچانک مسکرا دے۔

شاہدہ چاہتی تھی کہ اس عورت کے بالوں میں تیل لگا کر انھیں سنوار دے۔ وہ کئی روز سے روکھے بال لئے پڑی تھی۔ لیکن اُس عورت نے انکار کر دیا کہنے لگی "بس بہن اور کچھ نہ کرو۔ تم نے یہی بہت کر دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تمہارا شکریہ کس طرح ادا کروں لیکن ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ پتہ نہیں جی کے دل میں کیونکر آگئی! شاید ٹھیک ہی ہو۔ تمہارا نام شاہدہ تو نہیں؟"

اپنا نام سُن کر شاہدہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ وہ عورت کچھ لمحوں تک شاہدہ کو گھور گھور کر دیکھتی رہی۔ پھر نقاہت سے آنکھیں بند کر کے بولی۔ "جب تم ان کی تصویر صاف کر رہی تھیں میں نے تب ہی یہ اندازہ لگا لیا تھا۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے جس سے محبت کی تھی اُسی سے شادی کیوں نہ کی؟ میری زندگی کو کیوں دوزخ بنا ڈالا؟"

بیمار عورت آنکھیں بند کئے اور لیٹے لیٹے بول رہی تھی۔ شاہدہ سے اور کچھ نہ سُنا گیا۔ ساڑھی کے پلو سے آنکھوں کے کونے پونچھتی ہوئی دھیرے دھیرے باہر نکل آئی۔



نجیب رامش

اٹھو کہ پھر اس نئے زمانے میں "سرخ آندھی" مچل رہی ہے
جلو میں ایٹم کو لے کے اپنے تباہی پھر آنکھ مل رہی ہے
زبان لوح و قلم پہ تالے، شعور و عقل و خرد پہ پہرے
بس ایک ذرے کی تیز لو سے تمام دنیا دہل رہی ہے

قدیم تہذیب چیختی ہے کہ اب قدم لڑکھڑا رہے ہیں
وہ جن پہ فطرت کو ناز تھا ریت کے گھروندے بنا رہے ہیں

افق پہ منڈلا رہے ہیں پھر کشت و خوں کے سرخ سرخ بادل
فضاؤں میں گونج اٹھی ہے لائے دست بے "سپہر دشمنا کی ہلچل"
زمانہ پھر کوریا کا میدان "بننے والا ہے ہم نشینو !
ذرا سی آہٹ پہ چونک جانا چھلک جائے نہ "خونی چھاگل"

وگرنہ خوابوں کے اس جزیرے میں ایک طوفان جاگ اٹھے گا
قدیم "ابوالہول" بن کے اک بار پھر سے شیطان جاگ اٹھے گا

تم اپنے صحرا کے قیس بھی ہو، تم اپنے گلشن کے باغباں ہو
نئی چٹانوں کے کوہ کن ہو، تم اپنے شہروں کے حکمراں ہو
تمہارے باغوں میں "رات رانی" کے پھول مرجھا نہ جائیں یارو
تم اپنے میلوں کے دست و بازو، تم اپنی نہروں کے پاسباں ہو

تمہارے نگھٹ پہ مسکراتی رہیں سدا شوخ رادھیکائیں
تمہارے کھیتوں میں ہر گھڑی سبز چوڑیاں یونہی کھنکھنائیں

تمہاری بہنوں کی مانگ میں بجھ نہ جائیں سندور کی شعاعیں
چھوٹی موٹی سی تمہاری بہوئیں شین گن سے جھلس نہ جائیں
تمہارے بچے بلک بلک کر فضائے مسموم میں نہ تڑپیں
کنول سی نازک کنواریوں سے اب ان کے محبوب چھن نہ پائیں

تم اپنے دامن کی چھاؤں میں کہکشاں کے موتی سجا کے نکلو
تم اپنی آنکھوں میں عزم کی اک حسین مشعل جلا کے نکلو

خلا کی تاریک وادیوں کو حیات کا آفتاب دے دو
فسردہ غنچوں کی نکہتوں کو نیا نیا اک شباب دے دو
جو غم سے مرجھا رہے ہیں چہرے انہیں بھی رنگ گلاب دے دو
اٹھو! زمانے کے ہاتھ میں بڑھ کے پرچم انقلاب دے دو

بہت دنوں تک جہاں میں ظلم و ستم کے دیپک نہ جل سکیں گے
جو زہر بھر دیں دلوں میں، دنیا میں وہ سپیرے نہ پل سکیں گے

بسیرا

شہاب سرمدی

جھٹ پٹا وقت ——

گھنا باغ ——

گھنے باغ کے پیڑوں پہ ہزاروں پنچھی،

کوئی کالا، کوئی بھورا، کوئی دھومی سبزہ،

کوئی کنچن، کوئی نیلا، کوئی اُجلا، چِتلا،

کوئی ٹہنی پہ ہے بیٹھا، کوئی پتوں میں چھپا،

کوئی پنجوں پہ ٹِکا جھول رہا ہے جھولا،

جھرجھراتا ہے کوئی پنکھ، کوئی سوتا ہے،

کوئی بے چین ہے —

پَر مار کے اُڑتا ہے، پھر آجاتا ہے

شام کجلا گئی، لیکن ساتھی!

اِس بسیرے کے پُرانے باسی،

جو سدا سب کے برابر سے اُڑے

جو کبھی وقت کے پیچھے نہ رہے

آج آئے نہیں، کیا جانے کہاں رہ گئے، کیا بیت گئی!

گیت

وقار خلیل

جانے ایسی کون دشا ہے جیون ساگر ایک پہیلی

ہر کوئی جانے، ہر کوئی بوجھے، مَن پاپی اَن جانا

جنم جنم سے ٹھنی ہوئی ہے اندھیارے اُجیارے میں

مورکھ اندھیارا دم توڑے ساجن ایسے دیپ جلانا

لوبھی بھونرے پروا کے سنگ نگر نگر گھومے پھرتے ہیں

چھلاؤں سے پیار نہ کرنا اور نہ دھوکا کھانا

بیت جھڑ بیتا، سرسوں پھولی، ملن کی رت نہ آئی

نِدرا بھیتر چُپ چپ آنا، سپنوں کی زنجیر ہلانا

سمئے کا پہیا گھوم رہا ہے، کیا کرجگ اور کیا کلجگ!

گر تجھ سے کچھ بن پڑتا ہے اِس رُت میں بھی پھول کھلانا

فکر کے مانجھی! نظموں، غزلوں، گیتوں کی پتوار نہ چھوٹے

باڑھ پہ طوفاں، تیز تھپیڑے، نیا تیز چلانا

گیانی، پنڈت گُن میں گُم ہیں، مولانا پر نشہ سا ہے

راہ زنی پر خضر ہیں مائل، بہت کٹھن ہے راہ پہ لانا

کہت وقارا سُن بھئی سادھو! راہ چلت ہے ایک مسافر

اَشٹ گرہ کے یُگ میں تنہا، منزل ہے نہ ٹھور ٹھکانا



چمبہ کا سب سے قدیم لکشمی نارائن کا مندر



ہاچل کی پہاڑی ریاستوں کو جو اب یک پردیش "ہماچل پردیش" میں ضم ہو گئی ہیں، بجا طور سے "مندروں کی سرزمین" کہا جاتا ہے۔ اس علاقے کے مندر نہ صرف اپنی قدامت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ وہ پہاڑی فن تعمیر کے ایسے اچھوتے نمونے ہیں جنھیں دیکھ کر قدیم پہاڑی معماروں کی ہنرمندی، چابکدستی اور جاں فشانی کی بیساختہ داد دینی پڑتی ہے اور ان کے فن کی عظمت دلوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ فرہاد کا پہاڑ کاٹ کر نہر کھودنا حقیقت ہو یا افسانہ لیکن ہماچل کے ان پہاڑی مندروں کو دیکھ کر یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ اگر کسی چیز کو "جوئے شیر کا لانا" کہہ سکتے ہیں تو وہ ان پہاڑی مندروں کی تعمیر ہے۔ مندروں کے علاوہ اس علاقہ میں بعض قدیم قلعے بھی پائے جاتے ہیں۔

چمبہ جو کوہ ہمالیہ کی گود میں نہایت پر فضا سرسبز پہاڑی علاقہ ہے بیرونی حملوں سے ہمیشہ محفوظ رہا۔ یہی سبب ہے کہ یہاں نہایت قدیم مندر اور تانبے کے پرانے کتبے اب تک اپنی اسی حالت میں پائے جاتے ہیں۔ ان مندروں میں راجہ سیرو ورمن، راجہ مارتنڈ اور لکشمی نراین وغیرہ کے مندر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ تانبے کی پلیٹیں بھی جن پر پرانے راجاؤں کے نام کھدے ہوئے ہیں، یہاں ملتی ہیں۔ چمبہ کے مندروں کو پہاڑی اور میدانی دو قسم کے مندروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ موخر الذکر قسم کے مندر چھکنے بنے ہوئے ہیں۔ ان مندروں میں داخل ہونے کے لیے پہلے خوب صورت محرابوں کی ایک قطار ملتی ہے۔ یہ محرابیں دو دو ستونوں پر قائم ہیں اور رنگین نقش و نگار سے مزین ہیں۔ دوسری قسم کے مندر جنھیں "پہاڑی مندر" کہا جاتا ہے "دیوی اور ناگوں کے مندر" ہیں۔ یہاں شروع شروع میں ان پہاڑوں میں دیوی اور ناگ کی پوجا ہوتی تھی۔ بعد میں وشنو کی پوجا ہونے لگی۔ چمبہ کا سب سے قدیم مندر "لکشمی نراین" کا مندر ہے۔ اس میں سنگ مرمر کی ایک مورتی ہے۔ اس مندر میں تانبے کی ایک پلیٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے سنہ ۱۵۰۲ء میں راجہ پرتاپ سنگھ نے بنوایا تھا۔ ایک اور مندر "چندر گپت مندر" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں شیو جی کی ایک عظیم مورتی رکھی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے چمبہ کو بسانے والے راجہ سہیلا نے بنوایا تھا۔ ان

دونوں مندروں کے درمیان رادھا کرشن کا موجودہ طرز کا مندر بنا ہوا ہے جسے راجہ جیت سنگھ کی رانی نے ۱۸۰۰ء بکرمی میں تعمیر کرایا تھا۔ ایک اور عظیم مندر جسے گوری شنکر کا مندر کہتے ہیں، گیارھویں صدی میں تعمیر ہوا تھا۔ مندر کے سامنے پیتل کے بیل کی ایک مورتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسے راجہ سیدھ سین نے ۱۶۸۵ء میں بنوایا تھا۔ اس قسم کے مندروں کو پہاڑی زبان میں سکھارا مندر کہا جاتا ہے۔

چندر بھاگا وادی میں ایک ترلوکی ناتھ مندر ہے، جو اس علاقہ میں بودھوں کا بہت بڑا مندر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا انتظام ایک "لاما" کے سپرد ہے۔ اس مندر میں لاہول لداخ وغیرہ کے ہندو اور بودھ، دونوں پوجا کرتے ہیں۔ یہ مندر ایک خاص قسم کے پہاڑی پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اس مندر میں مہاتما بدھ کا سنگ مرمر کا مجسمہ رکھا ہے۔ مندر کی دیواروں پر جا بجا بدھ کے احکام و فرامین اور اقوال و ہدایات کے سنگی کتبات ہیں۔ اسی علاقہ میں کالی کا ایک مندر پایا جاتا ہے جسے "میرکلا کا مندر" کہا جاتا ہے۔ یہ مندر تیرھویں یا چودھویں صدی کی یادگار مانا جاتا ہے۔ ایک اور مندر ہے جسے راجہ امید سنگھ نے ۱۷۵۸ء میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ مندر پہاڑی فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ پتھروں پر جو الفاظ کھدے ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں دو رسم الخط رائج تھے۔ ان میں سے ایک کو "براہمی" اور دوسرے کو "کھاروشتی" کہا جاتا تھا۔ ان مندروں کے علاوہ ہماچل پردیش میں جا بجا تانبے کے پترے بھی ملتے ہیں جن پر زیادہ تر ان جاگیروں کی تفصیل درج ہیں جو پرانے زمانے میں مختلف راجاؤں نے برہمنوں کو عطا کی تھیں۔

منڈی میں بھی کئی خوب صورت مندر پائے جاتے ہیں جن میں "اردھوری کا مندر" اپنی شان کا نرالا مندر ہے۔ اس میں سنگ مرمر کی بنی ہوئی شیوجی اور پاروتی جی کی مورتیاں رکھی ہیں۔ شیوجی کی مورتی میں ان کے سر پر جٹائیں، گلے میں انسانی کھوپڑیوں کا ہار اور سانپ پڑے ہیں۔ ایک ہاتھ میں بین اور دوسرے میں ڈمرو دکھایا گیا ہے۔ پاروتی کے سر پر مکٹ، کانوں میں "سورن منی" اور ناک میں نتھ دکھائی گئی ہے۔ بڑی مورتی کو ایک شلا سے ملحق کیا گیا ہے جس پر شیوجی کی سواری۔ بیل وغیرہ کندہ ہیں۔ سارے مندر میں بڑے لاجواب نقش و نگار بھی بنے ہوئے ہیں۔

منڈی کا سب سے زیادہ اہم اور مشہور مندر بھوت ناتھ کا مندر ہے۔ اس مندر کو منڈی کا محافظ اور آفات سے بچانے والا مندر تصور کیا جاتا ہے۔ یہ مندر بھی شیوجی کے نام سے منسوب ہے۔ ایک اور عظیم مندر پنچ وکترہ کا مندر ہے جو بیاس اور سکیتی ندی کے سنگم پر واقع ہے۔ اس میں ستونوں پر نفیس نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ یہ تمام



منڈی کا مشہور "بھوت ناتھ کا مندر"

مندر صنعت پہاڑی فن کاروں کے کمالِ فن کے مرہونِ منت ہیں۔

مندروں کے علاوہ کملاہ کا قلعہ ہماچل کی بڑی قدیم عمارت ہے۔ یہ قابل دید قلعہ ہمیرپور کی سرحد پر ایک لگ بھگ پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے۔ اس قلعہ کو راجہ سورج سین نے ۱۶۲۵ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس قلعہ کے دروازے کی پیشانی گلکار کنگریوں سے آراستہ ہے۔ کنگریوں سے نیچے محراب کے دونوں جانب پتھر کے دو حسین گول پھول ہیں۔ پتھروں کی ساخت، ان کی نشست اور نقش و نگار کی وجہ سے قلعہ کا پھاٹک مجسم بہار معلوم ہوتا ہے۔ "بیر کوٹ کا قلعہ" بھی منڈی کی عمارتوں میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اسے "راجہ بیر سین" نے تعمیر کرایا تھا۔ اس قلعہ کے دونوں جانب فصیل ہے۔ اور مغربی رُخ پہ ایک عالی شان پھاٹک ہے۔ اس کے مشرق کی طرف "درگا مندر" کی شاندار عمارت ہے جو پہاڑی فن تعمیر کے جاہ و جلال کی ترجمان اور ہماچل کی تہذیب و شائستگی کی یادگار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قدیم قلعہ کے ایک سنگین چبوترے میں پانا سر رکھشس اور اس کے تینوں لڑکوں کے سر دفن ہیں۔ سکیت میں بھی نرسنگھ جی کا مندر ہے۔ یہ مندر سر تا سر سنگ خارا اور



سرزور کا ایک مندر

سنگ لاجورد کے تراشیدہ گول کا پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ ایک اور مندر جگن ناتھ کا مندر ہے جس کے اندر صندل کی لکڑی کی بنی ہوئی ایک پرکشش مورتی رکھی ہے۔
بھوج پور کے نزدیک رج کنڈ کا مندر ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔
اس کا آنگن پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ سمت ۱۷۵۲ بکرمی میں راجہ گر چند اور رانی بچن دیوی نے اس عظیم الشان مندر کو تعمیر کرایا تھا۔
ہماچل کے رام پور شہر میں بھی زمانہ گزشتہ کی نہایت قدیم مستحکم یادگاریں موجود ہیں۔ مثلاً یہاں ایک مندر ہے جس کے پتھر لوہے سے جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ غالباً ہندوستان کی سنگ تراشی کا بہت قدیم نمونہ ہے۔ اسی علاقہ میں ایک پہاڑی گاؤں کے اردگرد بدھ طرز کے بہت سے کھنڈر ملتے ہیں کئی استوپ بھی پائے جاتے ہیں ان کے گنبد ٹوٹ چکے ہیں۔ ان کی چار دیواری اور دروازے نہایت اعلیٰ درجہ کی سنگ تراشی کے کام سے مزین ہیں۔ ایک ستوپ کے چاروں طرف منقش پتھر کا جنگلہ ہے جس کے بالکل بیچوں بیچ بدھ بھگوان کی پتھر کی مورتی رکھی ہوئی ہے۔

ہماچل کے پہاڑی مندروں میں ایک نفیس پتھر "بلور" کی بنی ہوئی دیوتاؤں کی مقدس مورتیاں ملتی ہیں۔ کچھ عمارتیں سنگ لاجورد کی بنی ہوئی ہیں۔
شملہ سے ۱۴۵ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کے راستہ پر شروع سے آخر تک دیویوں اور دیوتاؤں کے متعدد چھوٹے چھوٹے مندر ہیں۔ سب سے اوپر چوٹی پر مقدس ترین مندر بنا ہے۔ اس سے ایک ہزار قدم پہلے کوئی زینہ نہیں ہے صرف ایک ہی پاٹ چٹان چلی گئی ہے۔
سرمور کے علاقہ میں بھی جو کوہ شوالک کے دامن میں واقع ہے ایسے قدیم مندر ملتے ہیں جو تعمیر کے لحاظ سے یکتا ہیں۔ وہاں کی مشہور جھیل رینکا کے پرسرام تال سے ایک سو گز کی اونچائی پر پہاڑ کے اوپر پرسرام جی کا خوب صورت مندر بنا ہوا ہے۔ جو پہاڑی فن کاروں کی بے عیب صناعی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے نزدیک مہاتما بدھ کے بھی تین مندر ہیں جن کی عمارتیں سنگ تراشی اور نقاشی کے عظیم تعمیراتی شاہکار ہیں۔ ان مندروں میں بدھ کے سیاہ رنگ کے خوش نما مجسمے اپنی تمام حسن کارانہ ہم آہنگی کے ساتھ استادہ ہیں۔

ہاٹ کوٹی میں تین چھوٹے مندر





صغیر احمد صوفی

گرفتارِ جنوں برسوں، اسیرِ رنگ و بو برسوں — برابر ہم نے کھایا ہے فریبِ آرزو برسوں
نہ جانے کیا ہوا، ورنہ ملی ہم تشنہ کاموں کو — نگاہِ لطفِ ساقی سے شرابِ آرزو برسوں
وہی آرامِ جاں آخر مرے دل کے قریں نکلا — عبث کرتا رہا راہِ وفا میں جستجو برسوں
عجب وہ فصلِ وحشت تھی، عجب وہ دل کا عالم تھا — وہ میرے پاس تھا لیکن پھرا میں کو بکو برسوں
جنونِ آگہی کے دور میں رسوائے مے خانہ — فدائے نازِ ساقی تھا بے جام و سبو برسوں

گزارے چند لمحے اُن کی بزمِ ناز میں صوفی
مجھے محسوس ہوتا ہے، رہا ہوں لکھنؤ برسوں

کرشن بہاری نور

مری تلاش کی منزل یہ آستاں تو نہیں
یہیں کہیں ترے قدموں کے کچھ نشاں تو نہیں

بلا رہے ہو تو چلتا ہوں یہ بتا دو مجھے
تمھاری بزم میں پابندیِ زباں تو نہیں

زمانہ کہتا ہے اے دوست جس کو فصلِ بہار
ترے چمن سے نکالی ہوئی خزاں تو نہیں

اِدھر جنوں تو حیا اُس طرف ہوئی بیدار
دلوں کی بات نگاہوں کے درمیاں تو نہیں

ہو کس طرح سے بیاں تیرے حُسن کا عالم
زباں نظر تو نہیں ہے، نظر زباں تو نہیں

اُبھر گئے ہیں جو دیر و حرم کی صورت میں
وہ نقش اپنے ہی سجدوں کے کچھ نشاں تو نہیں

مرے یقینِ محبت کو کیا ہوا اے نور
قدم قدم پہ گماں ہے وہ بدگماں تو نہیں

چندر پرتاپ سنگھ نظر

ساقیا! فیض ترا عام ہے مے خانے میں
مے نہیں ہو تو بس اک میرے ہی پیمانے میں

محتسب ترکِ مے و جام کی تلقین نہ کر
بات کچھ اور بگڑ جائے نہ سمجھانے میں

فرق مہماں نوازی میں نہ آئے ساقی!
رند اک شیخ کو لے آئے ہیں مے خانے میں

مجھ کو دیوانہ جو کہتے تھے انھیں ہوش نہ تھا
بات کچھ اور اُلجھتی گئی، سُلجھانے میں

بے نیازی کا نہیں کوئی گِلا اے ساقی!
ہم کو رہنا ہی تھا تشنہ ترے مے خانے میں

اک زمانہ ہے تماشائی ستم گر اس کا
کوئی تو بات ہے آخر ترے دیوانے میں

آپ بے وجہ پریشان نہ ہوں جانِ نظر
آپ کا ذکر کہاں ہے مرے افسانے میں

دادی اماں

عشرت میر

شام کے چار بجے اور پانچ برس کا پپو اسکول بس سے اُتر کر سیدھا دادی اماں کے پاس آتا۔ دادی اماں اس وقت یا تو شام کے کھانے کے لیے چولھا سلگا رہی ہوتیں یا پھر تیسرے پہر کی چائے بنانے میں مصروف ہوتیں۔ صحن کے دوسرے کونے سے پپو پکارتا، "دادی اماں!" اور دادی اماں دوڑ کر آتیں۔ پپو کو گود میں لے کر پیار کرتیں — پھر اس کے ماتھے پر بکھرے بالوں کی لٹوں کو ہٹاتے ہوئے پیار سے پوچھتیں: "بیٹا آج کیا کیا پڑھا تم نے؟" اور پپو کا اس بات پر منہ بن جاتا، اور وہ جلدی سے کہتا: "دادی بھوک لگ رہی ہے جلدی سے کچھ کھانے کو دے دو۔" روز کا یہی معمول تھا۔

صبح دس بجے جب پپو کے اسکول جانے کا وقت ہوتا تو دادی ماں اُسے ایک آنہ دیتیں اور ساتھ ہی ہدایات بھی: "بیٹا ایسی ویسی چیز مت کھانا۔ آج کل بیماریاں پھیل رہی ہیں۔" پپو سر ہلا دیتا اور اپنا بستہ سنبھالتا ہوا اسکول بس کی طرف دوڑ جاتا۔ جب تک موٹر نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی، دادی اماں پپو کے ہلتے ہوئے ہاتھ کا جواب دیتی رہتیں۔

دادی بظاہر تو اس گھر کے اندر کوئی خاص اہمیت نہ رکھتی تھیں لیکن گھر کا سارا کام کاج ان کے سپرد ہی تھا۔ صبح ہی اُٹھ کر پپو کو نہلانا، پھر ناشتہ تیار کرنا اور میاں بیوی کو اُٹھانے کے بعد پپو کو اسکول کے لیے تیار کرنا۔ خالد اور ان کی بیوی کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ پپو کے بارے میں پورا پورا خیال رکھتے وہ کب اسکول جاتا ہے، کب اسکول سے آتا ہے، کیا کھاتا ہے؟ ان تمام باتوں سے دونوں بے خبر رہتے۔

دادی اماں، کام کاج کے علاوہ پپو کا بھی پورا خیال رکھا کرتی تھیں اسے وقت پر سُلانا، جگانا، نہلانا اور کھلانا ان ہی کے ذمہ تھا۔ خالد دس بجے دفتر چلے جاتے، پھر رات گئے گھر واپس لوٹتے تھے۔ ستارہ، گرلس کالج میں لیکچرار تھی۔ وہ بھی اپنا زیادہ تر وقت باہر گزارتی۔ ان دونوں کو گھر سے کوئی مطلب نہ تھا۔ اِدھر دادی اماں اس زرد پتے کی طرح تھیں جو دن بھر پانی کے اندر تیرتا رہتا ہے اور رات کو پھر کنارے کے پاس آ کر ٹھہر جاتا ہے۔ دوسرے دن پھر وہی چکر........ اور اسی پتے کی زندگی پپو کے سہارے چل رہی تھی۔ روزانہ وہ پپو کو نیلے رنگ کا پوری آستین والا سوئیٹر اور نیلا نیکر پہنے اسکول بس میں چڑھتے دیکھتیں اور شام کو اُترتا دیکھتیں تو ان لمحوں کے اندر ان کی بوڑھی اور دھندلی آنکھوں میں عجیب سی چمک نمودار ہو جاتی۔ رات کو دادی اماں پپو کو سنہری پری اور جادو کے گھوڑے کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ اِدھر پپو دن بھر کی رپورٹ پیش کیا کرتا کہ آج اس نے اسکول میں کیا کیا۔ دادی اماں اسے سمجھانے لگتیں: "بیٹا دھوپ میں مت کھیلا کرو اور کسی سے لڑا جھگڑا مت کرو۔" پپو فوراً اٹھ کر بیٹھ جاتا اور کہتا — نہیں، دادی میں تو کسی سے نہیں لڑتا، تمام ماسٹر میری تعریف کرتے ہیں۔ اور دادی اماں اسے اپنے کمزور سینے سے لپٹا لیتیں۔

رات کو جب خالد دفتر سے واپس آتے تو ستارہ انھیں کھانا

نکال کر دے دیتی۔ اگر زیادہ رات نہ ہوئی ہوتی تو دونوں ٹہلنے نکل جاتے اور جب ٹہل کر دونوں واپس آتے تو دادی اماں سے چمٹا ہوا پپو سو چکا ہوتا تھا۔ اس طرح پپو نے صرف دادی اماں کا پیار پایا تھا۔ باپ کی محبت اور ماں کی ممتا سے وہ یکسر محروم رہا۔ ویسے بھی اُسے دادی اماں سے زیادہ انسیت تھی۔ دادی اماں کے بغیر وہ ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ رات کو خالد تھوڑی دیر تک انگریزی پرچوں کی ورق گردانی کرتے، بیوی سے بات چیت کرتے اور پھر بیڈ لیمپ بجھا کر سونے کے لیے لیٹ جاتے۔ ان کو دادی اماں سے باتیں کرنے اور پپو کے بارے میں پوچھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ ادھر ستارہ کو بھی کوئی زیادہ فکر نہ تھی۔ پپو کو پیدا کر کے جیسے انھوں نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ اس کی پرورش سے انھیں کیا مطلب۔

دادی اماں خالد کی دور کی رشتہ دار لگتی تھیں۔ خالد جب نیا نیا نوکر ہوا تھا تو وہ یہاں آگئیں۔ ان کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ خالد کو بھی آرام ہو گیا۔ پھر خالد نے شادی کر لی لیکن دادی اماں بدستور اس گھر کا سارا کام کرتی رہیں۔ سنتے تھے کہ دادی اماں کے کوئی اولاد نہ ہو سکی تھی اور اس "جرم" میں ہی ان کے شوہر نے انھیں شادی کے چند سال بعد ہی طلاق دیدی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پپو جب پیدا ہوا تو گویا دادی اماں کی گود ہری ہو گئی۔ اس بڑھاپے میں بھی ان کی ممتا کے سوتے خشک نہ ہوئے تھے اور انھوں نے اپنا سارا پیار پپو کے لیے وقف کر دیا۔ ادھر نئی روشنی اور ترقی پسند پڑھی لکھی بیوی کے لیے بچہ کی پرورش اور دیکھ بھال ایک مصیبت ہی تھی۔ دادی اماں کو پپو مل گیا اور ستارہ کو پنچھی جیسی آزادی۔ دونوں اس سودے سے مطمئن ہو گئے۔

اُس دن خالد دفتر سے ذرا جلدی آگئے۔ یہی نہیں بلکہ وہ کچھ خوش بھی دکھائی پڑ رہے تھے۔ سب کے لیے وہ تحفے لائے تھے۔ ستارہ کے لیے ریشمی ساڑھی، پپو کے لیے مٹھائی کا ڈبہ اور چاکلیٹ کے پیکٹ۔ — اور دادی اماں کے لیے — ہاں ان کے لیے بھی وہ ایک تحفہ لائے تھے — وہ تحفہ انھوں نے چپکے سے دادی اماں کے کمرے میں لے جا کر رکھ دیا تھا۔

گھر سے بات برابر کے گھروں میں پہنچی اور پھر سارے محلے کو پتہ چل گیا کہ خالد کی ترقی ہو گئی ہے۔ ان کی بیوی نے اسی خوشی میں فوراً ایک پارٹی کا انتظام کر لیا۔

رات کو دادی اماں جب اپنے کمرے میں پہنچیں تو سامنے ہی ایک نفیس جلد میں بندھا ہوا کلام پاک رکھا ہوا دیکھ کر ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔ خالد ان کے لیے کتنا اچھا تحفہ لایا تھا۔

پپو کے امتحانات قریب آتے جا رہے تھے۔ شام کو وہ ایک ماسٹر سے ٹیوشن پڑھنے لگا تھا۔ رات کو لیٹے لیٹے اچانک پپو اُٹھ کر بیٹھ گیا اور دادی سے بولا: "دادی، کل مجھے دو آنے دو گی؟"

"دو آنے لے کر کیا کرو گے؟"

"پہلے وعدہ کرو کہ دے دو گی۔"

"اچھا وعدہ کر لیا۔ چلو اب بتاؤ، کیا کرو گے؟"

"بتاؤں؟" پپو نے دادی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا: "دادی میں، دو آنے کے بڑھیا کے بال خرید دوں گا۔"

"بڑھیا کے بال!" دادی ہنس پڑیں۔ "بیٹا میں اپنے بال کاٹ کر تجھے دے دوں گی، تو دو آنے میں خریدے گا انھیں؟"

اس پر پپو زور سے ہنسا۔ وہ سمجھانے لگا: "نہیں دادی۔ واہ تم اتنا بھی نہیں جانتیں؟ "بڑھیا کے بال" تو گلابی رنگ کے ہوتے ہیں۔ وہی... میٹھے، جن کو اسکول کے سارے بچے کھاتے رہتے ہیں۔"

پپو کی یہ گفتگو کہیں برابر کے کمرے میں لیٹے ہوئے خالد کے کانوں میں پڑ گئی۔ انھوں نے ڈانٹا: "نہیں اسے پیسے ویسے مت دینا۔ یہ سب چیزیں بیماری کی جڑ ہیں۔" پپو سہم گیا اور اس وقت تو خاموش ہو گیا مگر اب اس پر دھن سوار ہو گئی وہ دادی اماں کو طرح طرح سے مطمئن کرتا کہ سارے بچے کھاتے ہیں، کوئی بیمار نہیں پڑا، پھر بڑھیا کے بال کھانے سے وہ کیسے بیمار پڑ جائے گا؟ ادھر دادی اماں خالد کے ڈر سے ٹالتی رہیں۔ آخر پپو کی ضد جب کافی بڑھ گئی تو انھوں نے ایک ترکیب سوچی: انھوں نے کہا: "اچھا تم امتحان میں فرسٹ ڈویژن لا کر دکھاؤ تو میں تمھیں آٹھ آنے دوں گی۔"

نتیجہ نکلا اور پپو سچ مچ فرسٹ ڈویژن پاس ہو گیا۔ اب تو اس نے دادی اماں کا ناک میں دم کر ڈالا اور دادی اماں کو آٹھ آنے دینے پڑے۔

لیکن ساتھ ہی تاکید کر دی کہ کسی سے کہے نہیں، اور پپو نے سر ہلا دیا۔

دوسرے دن آدھی رات کو پپو اٹھ بیٹھا۔ اس نے پانی مانگا۔ دادی اماں نے پانی پلایا تو انھوں نے دیکھا کہ پپو کا بدن گرم ہو رہا تھا۔ دادی اماں گھبرا گئیں، انھوں نے ستارہ کو جگایا۔ تھرمامیٹر لگانے پر پتہ چلا کہ کافی تیز بخار ہے۔ خالد نے پپو سے پوچھا: "تو نے اسکول میں کچھ کھایا تھا؟"

"کچھ نہیں کھایا تھا میں نے کچھ نہیں کھایا تھا؟" پپو نے کپکپاتی ہوئی آواز میں سہم کر جواب دیا۔

"جھوٹ بولتا ہے؟ تو نے وہاں ضرور کچھ کھایا ہے؟"

پپو سہم گیا۔ وہ خاموش رہا۔ اور پھر — خالد کو پتہ چل گیا کہ دادی اماں نے اسے چپکے سے پیسے دے دیئے تھے اور اس نے ان پیسوں سے بڑھیا کے بال کھائے تھے۔ خالد پر ایک دم غصہ سوار ہو گیا۔ وہ دادی اماں پر برس پڑے: "تمھاری عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں۔ منع کر دیا تھا مگر اب دیکھو نتیجہ اپنے لاڈ پیار کا۔ اف میں کیا کروں؟"

ادھر ستارہ نے دادی اماں کو بہت کچھ سنا ڈالا۔ دادی اماں نے سنا۔ ستارہ کہہ رہی تھی: "یہ بڑھیا ڈائن ہے، یہ میرے بچے کو مار کے چھوڑے گی۔ اس کی اولاد ہوتی تو اسے درد ہوتا۔ ہائے میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو....."

خالد نے گھبرا کر ڈاکٹر کو فون کیا اور بہت سی باتیں دادی کو سنا ڈالیں۔ دادی اماں چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ڈاکٹر آیا اس نے پپو کو دیکھا اور پھر بولا: "یہ چیچک کا کیس نہیں ہے۔ معمولی بخار ہے۔ اس وقت ایک خوراک دے دیجیے۔ رات ہی رات کو انشاءاللہ اتر جائے گا۔"

خالد نے پیتے پوچھا۔ انھیں ذرا اطمینان ہوا۔ اب انھوں نے سوچا کہ دادی اماں کو انھوں نے کتنی باتیں سنا ڈالی ہیں۔ ان کے دل میں وہ الفاظ کانٹے کی طرح چبھنے لگے، جو دادی اماں کو غصے میں سنا دیے تھے۔

صبح ہوئی۔ پپو کا بخار سچ مچ اتر گیا تھا۔ لیکن دادی اماں کے کمرے کا دروازہ نہیں کھلا۔ پپو دروازہ کھول کر اندر گھسا اور اس نے پکارا: "دادی اماں"۔ مگر ہمیشہ کی طرح آج دادی اماں نے "ہاں بیٹا" نہیں کہا۔ خالد جو باہر کھڑے تھے، گھبرا کر کمرے کے اندر داخل ہو گئے۔ سامنے پلنگ پر دادی اماں لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے پچکے ہوئے اور جھریوں دار رخساروں پر دو آنسو اپنے نقش چھوڑ گئے تھے۔

اور دوسرے لمحہ خالد دادی اماں کے سرد اور بے جان جسم سے لپٹ کر سسک رہا تھا۔



رباعیات

اختر رضوانی

یہ دیکھیے گا رنگِ کدورت تو نہیں
شکوہ تو نہیں اس میں شکایت تو نہیں
اے چارہ گرو! آپ کے افسانے سے
فریاد مری بارِ سماعت تو نہیں

اسلاف کی تاریخ پہ سو ناز کرو
ہاں ایک نئے عہد کا آغاز کرو
دو اہلِ زمانہ کو پیامِ تازہ
ماحول میں پر تول کے پرواز کرو

جب جان پہ بن آئی ہے اب پوچھا ہے
کیا کچھ ہے مرا ذوقِ طلب' پوچھا ہے
صد شکر کہ اک عمر گزر جانے پر
یاروں نے مرے غم کا سبب پوچھا ہے

کچھ لوگ یہی کہتے ہیں دیوانہ ہوں
دنیا سے جدا رہ کر بیگانہ ہوں
ایسے ہیں پریشاں مری ہستی کے ورق
جیسے کہ میں بھولا ہوا افسانہ ہوں

احساس کی رگ رگ میں لہو رقص کرے
خم وجد میں آجائے' سبو رقص کرے
اے کاش میسر ہوں وہ لمحے مجھ کو
میں گیت سناتا رہوں تو رقص کرے

صدائے غالب

اقبال ندیم

غزل جو ناظورۂ ادا تھی
غزل جو اک پیکرِ حیا تھی
غزل جو اک نغمۂ صبا تھی
غزل جو اک درد کی صدا تھی

وہی فلاحِ عوام تک ہے
وہی حیاتِ دوام تک ہے

یہ بات ظاہر ہے راز بھی ہے
کوئی پسِ پشت ساز بھی ہے

یہ سوچتا تھا کہ بے محابا
خلاؤں سے ایک عکس ابھرا
جو ذہن ڈوبا تو چاند نکلا
ہوا وہ کچھ اس ادا سے گویا

"میں وہ کہ جس نے غزل غزل کو
حیات کے فلسفے دیے ہیں
میں وہ کہ جس نے نظر نظر کو
نئے نئے زاویے دیے ہیں
میں وہ کہ جام و نگاہ و گل کو
ہزارہا سلسلے دیے ہیں
میں وہ کہ ہر حیرتی کو جس نے
شعور کے آئینے دیے ہیں
میں وہ زمینِ سخن کو جس نے
فلک نما تجربے دیے ہیں
میں وہ کہ کوہِ گراں سے ہٹ کر
مجھے سدا راستے دیے ہیں"

بایں تحکم' بایں تکلم
کوئی نہیں ہے سوائے غالب
حیات پرور بنائے غالب
رہے گی غالب صدائے غالب

اُتّر پردیش اور ترقی

ہند تبتی تجارتی معاہدے کا خاتمہ ایک نعمت ——— گیہوں اور جَو کی فی ایکڑ پیداوار کا نیا ریکارڈ ——— قوت بخش غذا پیدا کرنے کا اقدام ——— مرغی پالن کی تربیت ——— بندیلکھنڈ کو بجلی کی سپلائی ——— آب پاشی کی چھوٹی اسکیمیں ——— بہرائچ میں اُتر پردیش کا سب سے بڑا باندھ ——— رام پور اور نینی تال میں آب پاشی کی مزید سہولتیں ——— نانک ساگر ذخیرۂ آب قریب تکمیل ——— شاردا ساگر کے دوسرے مرحلے کا کام مکمل ——— ماتا ٹیلہ ذخیرۂ آب سے چار لاکھ ایکڑ کی آب پاشی ——— بلرام پور میں ذخیرۂ آب ——— قیدیوں کو تعلیم اور تربیت کی سہولتیں ——— ہردوار میں سیاحوں کے لیے آرام گھر ——— مجالس قانون ساز کے اراکین کا کلچرل پروگرام ——— متفرقات

اتر پردیش کے اترا کھنڈ ڈویژن کے ضلع پتھورا گڑھ کے عوام کے لیے ہند تبت تجارتی معاہدہ کا خاتمہ جس کی وجہ چین کی انتہا پسندی ہے اس لحاظ سے ایک نعمت ثابت ہوا ہے کہ اس نے انھیں یہ موقع فراہم کیا ہے کہ وہ اپنی روزی کے لیے تبت سے اپنی قدیم تجارت پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں اور اس علاقہ کی تعمیری سرگرمیوں میں حصہ لے کر پہلے سے زیادہ روپیہ پیدا کریں۔

اب ان کے لیے یہ بھی ممکن ہوگا کہ وہ خود اپنے کھیتوں اور مویشیوں پر پوری توجہ دے سکیں اور اپنے گھر والوں سے قریب رہ کر دوسرے نفع بخش کاموں میں حصہ لے سکیں ورنہ اس سے پہلے وہ سال بھر تجارت کے نشیب فراز سے فکرمند رہتے تھے اور انھیں تقریباً نصف سال اپنے گھروں سے دور رہنا بھی پڑتا تھا۔

اس ضلع میں نو تعمیر کا جو پروگرام شروع کیا گیا ہے اس سے عوام گزشتہ ۲ جون کو تبت اور ہندوستان کے تجارتی معاہدہ کے ختم ہونے سے جن پریشانیوں اور افکار سے دوچار تھے وہ پورے طور پر ختم ہو گئی ہیں۔ ان ترقیاتی منصوبوں نے عوام کے لیے روزگار اور روزی کمانے کی سینکڑوں نئی راہیں کھول دی ہیں۔

ضلع پتھورا گڑھ کے باشندے بڑی تعداد میں بڑی بڑی سڑکوں اور عمارتوں کی تعمیر کے پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ ان میں بعض نے دشوار گذار لیکن اہم پہاڑی علاقہ میں موٹر سڑکوں کی تعمیر کے ٹھیکے تک لیے ہیں۔ اب معمولی قلی بھی روزانہ سات روپیہ سے بارہ روپیہ تک بطور اجرت کما رہے ہیں۔ اس علاقہ میں ترقیاتی کام اتنے بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے کہ ان کے لیے آدمیوں کی کمی پڑ گئی ہے۔

اس کے علاوہ مقامی باشندے ترقیاتی اسکیموں کے نفع بخش پہلوؤں میں جن میں بھیڑوں کی افزائش نسل مرغ بانی اور باغبانی شامل ہیں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس علاقہ میں جڑی بوٹیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ان کا بیوپار بھی یہاں کے لوگوں کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ بن گیا ہے۔ علاوہ ازیں اون اور اس کی مصنوعات کی پیداوار میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جس سے سرحدی علاقوں کے سیدھے سادے لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو رہا ہے۔

ضلع پرتاپ گڑھ کی مونگا پور اور کس فیرا گرام سبھاؤں نے بالترتیب گیہوں اور جو کی فی ایکڑ پیداوار کا نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔

مونگا پور گرام سبھا جس نے ۹۸ء۳۷ ایکڑ رقبہ میں فی ایکڑ ۴۴ء۹۱ من گیہوں پیدا کیا ۶۲-۱۹۶۱ء کے ربیع مقابلہ میں سرفہرست رہی کس فیرا گرام سبھا جو کی پیداوار میں پہلے نمبر پر رہی۔ اس نے ۵ء۱۰ ایکڑ رقبہ میں فی ایکڑ ۵۱ء۸۷ من جو پیدا کیا۔ ان دونوں گرام سبھاؤں میں سے ہر ایک کو ۶۰۰۰ روپیہ کا ریاستی انعام اور ۴۰۰۰ ہزار روپیہ کا منطقائی انعام ملے گا۔

سال رواں کے ربیع مقابلہ میں گیہوں کی پیداوار کے سلسلہ میں حسب ذیل گرام سبھائیں اپنے اپنے منطقوں میں اول رہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو منطقہ کا پہلا انعام یعنی ۴۰۰۰ روپیہ ملے گا۔

لکھنؤ منطقہ۔ نگم پور گرام ضلع ہردوئی۔ اس نے ۷۹،۹۹ ایکڑ رقبہ میں فی ایکڑ ۸۰۷،۰۷ من گیہوں پیدا کیا۔

میرٹھ منطقہ۔ بھاگ پور گرام سبھا ضلع بلند شہر۔ اس نے ۵۶،۵۴ ایکڑ رقبہ میں ۴۵،۳۷ من گیہوں پیدا کیا۔

روہیلکھنڈ منطقہ۔ نسرول گرام سبھا ضلع بدایوں۔ اس نے ۲۲۳،۳۵ ایکڑ رقبہ میں فی ایکڑ اوسطاً ۴۱،۸۳ من گیہوں پیدا کیا۔

الہ آباد منطقہ۔ اکبر پور گرام سبھا۔ ضلع اٹیہ۔ اس نے ۶۱،۱۰ ایکڑ رقبہ میں فی ایکڑ ۳۷،۵۱ من گیہوں پیدا کیا۔

جھانسی منطقہ۔ لادن گرام سبھا ضلع جھانسی۔ اس نے ۵۳،۲۷ ایکڑ رقبہ میں فی ایکڑ ۲۵،۶۴ من گیہوں پیدا کیا۔

وارانسی منطقہ۔ انقیلا گرام سبھا ضلع بلیا۔ اس نے ۵۲،۷۵ ایکڑ رقبہ میں فی ایکڑ ۵۰،۲۲ من گیہوں پیدا کیا۔

نینی تال منطقہ۔ اسین گرام سبھا ضلع الموڑہ۔ اس نے ۳۷،۱۶ ایکڑ رقبہ میں فی ایکڑ اوسطاً ۴۹،۹۷ من گیہوں پیدا کیا۔

گورکھپور منطقہ۔ مقیم پور گرام سبھا ضلع گورکھپور۔ اس نے ۵۴،۰۱ ایکڑ رقبہ میں فی ایکڑ ۵۲،۰۵ من گیہوں پیدا کیا۔

جو کی پیداوار کے سلسلہ میں آگرہ منطقہ میں نرورا گرام سبھا اور جھانسی منطقہ میں لیلا گرام سبھا ضلع باندہ اول رہی۔ ان گرام سبھاؤں نے بالترتیب فی ایکڑ ۴۹،۴۳ من اور ۱۱،۵۷ من جو پیدا کیا۔ ان میں سے ہر ایک کو پہلا منطقائی انعام یعنی ۴۰۰۰ روپیہ ملے گا۔

غذائیت سے متعلق مشاورتی کمیٹی نے اپنے ایک جلسہ میں جو کل ودھان بھون میں منعقد ہوا ریاست میں غذا۔ اور غذائیت سے متعلق پروگراموں کی توسیع کے لیے کچھ انتہائی اہم اور دور رس فیصلے کیے۔ یہ جلسہ وزیر صحت شری مہابیر پرشاد سریواستو کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ مذکورہ کمیٹی نے غذائیت کے سروے سے متعلق افسر کو ہدایت کی کہ وہ غذائیت سے متعلق معلوماتی کتابچوں کا ایک سلسلہ شروع کرے جس میں ان امراض پر بھی روشنی ڈالی گئی ہو جو ناقص غذا سے پیدا ہوتے ہیں۔ جوائنٹ ڈائرکٹر میڈیکل اینڈ ہیلتھ سروسز ڈاکٹر کے۔ کے گوئل کے زیر صدارت پانچ ممبروں پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی قائم کی گئی ہے جو اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کتابچوں کی جانچ کرے گی کہ ریاست کے مختلف علاقوں میں مختلف عمر کے افراد کے لیے کتنی غذائیت ضروری ہے۔ اس کے بعد وہ غذائی مشاورتی کمیٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔ ذیلی کمیٹی کے دوسرے ممبران شری درباری لال شرما ایم۔ ایس سی ڈاکٹر بی۔ کے۔ مالویہ۔ ریڈر بایوکیمسٹری کے۔ جی۔ میڈیکل کالج لکھنؤ۔ ڈاکٹر بلجیت سنگھ پروفیسر اکنامکس لکھنؤ یونیورسٹی اور ڈاکٹر کے۔ ایل مالویہ ریاستی غذائی سروے افسر ہیں۔

کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ اگر اس قسم کے مستند کتابچے شائع اور لوگوں میں تقسیم کیے جائیں تو ان میں یقینی طور سے قوت بخش غذا کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کے ساتھ انھیں اس بات کے لیے بھی آمادہ کیا جا سکے گا کہ وہ غذائیات کے اچھے اصول کو اپنائیں۔

مشاورتی کمیٹی نے یہ بھی طے کیا کہ اس کا جلسہ ہر تیسرے مہینہ منعقد کیا جائے جس میں غذائی پروگراموں کی رفتار ترقی تیز تر کرنے کی تدابیر پر غور و خوض کیا جائے۔

کمیٹی نے غذائیت کے توسیع شدہ پروگرام کے سلسلہ میں جو بستی اور گورکھپور ضلعوں کے کچھ ترقیاتی بلاکوں میں چلایا جا رہا ہے۔ اپنے صدر سے یہ درخواست کی کہ وہ یہ معلوم کرنے کے لیے ان ضلعوں کے عوامی نمایندوں کو چٹھی لکھیں کہ مذکورہ پروگرام کی رفتار کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔

کمیٹی نے غذائیت کے اطلاقی پروگرام کی رفتار ترقی کا بھی جائزہ لیا جو گزشتہ ۲ اکتوبر کو اترپردیش کے ۲۳ ضلعوں کے ۲۵ ترقیاتی بلاکوں میں شروع کیا گیا ہے۔

ریاستی محکمہ نگہداشت مولیشیان نے ایسے لوگوں کو جو مرغی پالنے میں دلچسپی رکھتے ہیں دس دن کی مفت عملی تربیت دینے کا انتظام کیا ہے۔ یہ تربیت انڈے سینے کے آیندہ سیزن سے جو اکتوبر کے وسط سے

شروع ہوگا ریاستی پولٹری فارموں واقع چک گنجویا (لکھنؤ)۔ فیض آباد مرادآباد۔ متھرا۔ مویشی اور زرعی فارم منجھا (لکھیم پور کھیری)۔ بابوگڑھ (میرٹھ)۔ بھرارہی (جھانسی)۔ پیدائش مویشیان اور ڈیری فارم کالسی (دہرہ دون) اور ترائی ریاستی فارم نگلا (نینی تال) میں دی جائے گی۔

تربیت حاصل کرنے کے خواہشمند اشخاص کو چاہیے کہ وہ متعلقہ حلقہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ نگہداشت مویشیان کو اپنے ضلع کے افسر مویشیان کے توسط سے درخواستیں بھیجیں جو درخواست دہندگان کو اس امر سے آگاہ کریں گے کہ انھیں کس تاریخ کو تربیت کے لیے حاضر ہونا ہے۔

تربیت کی مدت میں ہر منتخب تربیت پانے والے کو ساڑھے بارہ روپیہ کے وظیفے کے علاوہ پانچ روپیہ سفر خرچ بھی دیا جائے گا۔

ایسے لوگ جو کسی وجہ سے مذکورہ بالا ریاستی فارموں میں تربیت کے لیے نہیں جاسکتے حسب ذیل پولٹری توسیعی مرکزوں میں سے کسی ایک میں تربیت حاصل کرسکتے ہیں بشرطیکہ انھوں نے اپنی درخواست میں اس مرکز کا نام لکھ دیا ہو جس میں وہ تربیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

کلیان پور (کانپور)۔ مسولی (بارہ بنکی)۔ چائل (الہ آباد)۔ بھوجی پورہ (بریلی)۔ چنار (مرزاپور)۔ کنتھ (شاہجہانپور)۔ نیچ پوری (آگرہ) صفی پور (اناؤ)۔ شاہ آباد (ہردوئی)۔ قائم گنج (فرخ آباد)۔ چارگاواں (گورکھپور)۔ مچھرا (میرٹھ)۔ مین پوری۔ آصف پور (بدایوں) سہارنپور بجنور۔ رام پور۔ غازی پور۔ بہرائچ۔ وارانسی۔ اور ہوال باغ (الموڑہ)

بندیلکھنڈ میں ۲۴ء۳ کروڑ روپیہ کی تخمینی لاگت سے ۵۰۰ میل سے زیادہ لمبی بجلی کی لائنیں لگائی جارہی ہیں تاکہ اس کے چاروں ضلعوں کو زیرتعمیر ماتاٹیلہ بجلی گھر سے ۳۰ ہزار کیلوواٹ بجلی مل سکے۔

ان بجلی لائنوں میں ۱۳۵ میل لمبی ۱۳۲ کے۔ وی سنگل سرکٹ جھانسی کانپور لائن۔ ۲۵ میل لمبی ۶۶ کے۔ وی۔ ڈبل سرکٹ ماتاٹیلہ۔ جھانسی لائن۔ ۸۰ میل لمبی ۶۶ کے۔ وی۔ سنگل سرکٹ جھانسی۔ موراني پور۔ مہوبا لائن۔ ۴۰ میل لمبی ۳۳ کے۔ وی لائن۔ ۱۹۰ میل لمبی ۱۱ کے۔ وی لائن اور ۳۳ میل لمبی کم تناؤ کی دوسری لائنیں شامل ہیں۔

۱۳۲ کے۔ وی اور ۶۶ کے۔ وی کی لائنوں کے کھمبوں کی بنیادیں پختہ کرنے کا بالترتیب ۵۰ اور ۴۰ فی صدی کا کام پورا ہو چکا ہے۔ اور ۱۴ میل کی لمبائی میں ۱۱ کے۔ وی لائنوں کے لیے کھمبے بھی لگائے جاچکے ہیں۔

فی الحال بندیلکھنڈ کے ۲۴ قصبوں کو تقریباً ۲۰۰۰ کیلوواٹ بجلی سپلائی کرنے کی تجویز ہے۔ علاوہ ازیں ریلوے ورکشاپ جھانسی کے لیے ۲۰۰۰ کیلوواٹ اور بابینا اور جھانسی کنٹونمنٹوں کے لیے ایک ہزار اور ڈیڑھ ہزار کیلوواٹ بجلی کی مانگ رجسٹرڈ کرلی گئی ہے۔ موجودہ صورت میں ماتاٹیلہ بجلی گھر سے محض آٹا اور تیل ملوں، بنائی، روئی کی دھنائی اور رسیائی جیسی چھوٹی صنعتوں کا فروغ ہوسکے گا۔

امید ہے کہ ماتاٹیلہ بجلی گھر جس سے تقریباً ۱۰ ہزار کیلوواٹ بجلی پیدا ہوگی سنہ ۱۹۶۵ء تک بن کر تیار ہوجائے گا۔ بجلی گھر کے لیے جاپان سے تقریباً ۲۰ لاکھ روپیہ کی لاگت کے ۱۰-۱۰ ہزار کیلوواٹ کے جنریٹر اور ٹربائین کے تین سٹ منگائے جارہے ہیں۔

تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے دوران ریاست میں آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں پر ۴۴ کروڑ ۳۲ لاکھ روپیہ خرچ کرنے کی تجویز ہے۔

یہ اطلاع آج ودھان پریشد میں نائب وزیر ڈاکٹر رام نرائن پانڈے نے شری چرنجی لال پالیوال کے ایک سوال کے جواب میں دی۔

ان اقدامات کی تفصیل بتاتے ہوئے جو حکومت نے آبپاشی کی چھوٹی اسکیموں کو مقبول بنانے کے سلسلہ میں یکم ستمبر سنہ ۱۹۶۱ء تک کیے تھے نائب وزیر نے کہا کہ گزشتہ سال کے مقابلہ میں اس سال آبپاشی کی نجی چھوٹی اسکیموں کے سلسلہ میں حکومت نے کسانوں کو اور زیادہ قرضے دینے کا بندوبست کیا ہے جن میں نجی ٹیوب ویلوں سے کوؤں اور بندھیوں کی تعمیر کے قرضے اور مالی امداد شامل ہیں۔ نائب وزیر نے کہا کہ بندھیوں کی تعمیر اس اسکیم میں سنہ ۵۸-۱۹۵۷ء سے شامل کی گئی ہے۔ پہاڑی علاقوں میں کوؤں کی تعمیر کے لیے پہلے صرف مالی امداد دی جاتی تھی لیکن سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء سے قرضوں کا بھی بندوبست کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کنوؤں کی بورنگیہ کا کام حکومت کی طرف سے مفت کیا جارہا ہے۔ کچھ اضلاع میں جن میں سہارن پور مظفرنگر، بریلی اور فرخ آباد شامل ہیں سنہ ۶۱-۱۹۶۰ء سے ان کسانوں کو مالی امداد کی فراہمی کا انتظام کیا گیا ہے جو یہ کام خود کرتے ہیں۔

ڈاکٹر پانڈے نے ایوان کو مزید بتایا کہ کسانوں کی سہولت کے پیش نظر ضلع مجسٹریٹوں کے علاوہ ضلع منصوبہ بندی افسروں اور بلاک ڈیولپمنٹ افسروں کو بھی چھوٹے پیمانہ پر آبپاشی کے لیے تقاوی قرضے تقسیم کرنے کا اختیار دے دیا گیا ہے۔

ضلع بہرائچ میں کتونیا ریلوے اسٹیشن سے بہار کی جانب تقریباً ساڑھے چار میل دور گھاگرا ندی پر ۱۰.۸۵ کروڑ روپیہ کی لاگت سے ایک باندھ بنایا جائے گا۔ یہ باندھ اتر پردیش کا سب سے بڑا اور ملک کے بڑے باندھوں میں سے ایک ہوگا۔

یہ باندھ جو ۲۳.۰۸ کروڑ روپیہ کی لاگت کے پروجیکٹ کا جزو ہے ۲۵۱۲ فیٹ لمبا ہوگا اور اس میں ۴۰-۴۰ فٹ چوڑے ۵۲ پھاٹک ہوں گے۔ ان پھاٹکوں سے فی سکنڈ ۱۰ لاکھ مکعب فٹ پانی گزر سکے گا۔

اس پروجیکٹ کے تحت ۱۷.۹۱ کروڑ روپیہ کی لاگت سے ۱۵۰۸ میل لمبی نہروں کا جال بچھانے کی بھی تجویز ہے۔ باندھ کے بن جانے کے بعد ان نہروں سے بہرائچ، گونڈہ اور بستی کے ضلعوں میں سات لاکھ ایکڑ سے زیادہ رقبہ کو سیراب کیا جا سکے گا۔

ان ضلعوں میں فی الحال آبپاشی کے لیے ٹیوب ویل اور کچھ پرانے خزانہ ہائے آب ہیں۔

امید ہے کہ یہ پروجیکٹ چوتھے پنجسالہ منصوبہ کے اختتام تک مکمل ہو جائے گا۔ اس کی تکمیل سے اس علاقہ میں جو شمال میں راپتی اور سرجو کے درمیان اور جنوب میں ٹیڑھی اور گھاگرا کے درمیان واقع ہے خریف کے ۳۵۲۴۰۳ ایکڑ، ربیع کے ۲۲۳۴۵۱ ایکڑ اور گنے کے ۱۲۷۹۶۸ ایکڑ کی آبپاشی کی سہولتیں مہیا ہو جائیں گی۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ نئی نہروں سے آبپاشی کی جو سہولتیں فراہم ہوں گی ان سے مزید ۲۹.۳۰ لاکھ من اناج اور ۱۹۱.۹۵ لاکھ من گنا پیدا ہوگا۔

اس پروجیکٹ سے جہاں تقریباً ۸۰۰۰ ہنرمند اور غیر ہنرمند اشخاص کو روزگار ملے گا جو تقریباً ۹ سال تک کام پر لگے رہیں گے وہاں اتر پردیش کے جنوبی علاقہ میں زرعی ترقی بھی ہوگی۔

اس باندھ پر جو سڑک پل ہوگا اس سے بہرائچ اور کھیم پور کھیری کے ضلعوں کے درمیان ہر موسم میں آمد و رفت ہو سکے گی جس سے اس علاقہ کی تجارت اور صنعت کو بھی فروغ ہوگا۔

پروجیکٹ سے سالانہ ۷۸.۰۵ لاکھ روپیہ کی خالص آمدنی کی امید ہے۔

شمال مشرقی ریلوے لال کنواں کاشی پور سیکشن کے گولر بھوج اسٹیشن سے شمال کی جانب تقریباً ۵ میل کے فاصلہ پر ضلع نینی تال میں باز پور تحصیل میں ۷ میل لمبا مٹی کا بند تعمیر کیا جا رہا ہے۔

اس بند کے ذخیرہ آب میں پورا اور نگرا لا ندیوں سے ۳۷۵۰ ملین مکعب فٹ پانی جمع کیا جا سکے گا جس سے رامپور اور نینی تال کے ضلعوں میں ۳۷۲۰۸ ایکڑ سے زائد زمین کو آبپاشی کی سہولتیں مہیا کی جا سکیں گی۔

بند کی زیادہ سے زیادہ اونچائی ۵۲ فٹ ہوگی۔ اس کا نچلا حصہ اوسطاً ۷۰۰ فٹ اور اوپری حصہ ۲۰ فٹ چوڑا ہوگا۔ اس میں ۴۶۹۴ مکعب فٹ مٹی کا کام ہوگا۔

اس بند میں پانی کی نکاسی کے پختہ راستہ سے فی سیکنڈ ۵۰ ہزار مکعب فٹ پانی خارج ہو سکے گا جس سے ۱ میل لمبی زیر تعمیر نہروں کو پانی پہنچایا جا سکے گا۔ رام پور کی ۴۵ میل لمبی پرانی نہروں کو از سر نو تعمیر کیا جا رہا ہے تاکہ اس میں ز[illegible] پانی جمع ہو سکے۔

امید کی جاتی ہے کہ آبپاشی کی سہولتوں میں اضافہ ہونے کی وجہ سے ہر سال ۲۹ لاکھ روپیہ کی مالیت کا ۹۸۲۰ ٹن غلہ پیدا ہوگا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس ذخیرہ آب میں مچھلی پالن سے ۵۰۰۰ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوگی۔

اس بند کو سنہ ۱۹ تک مکمل کرنے کا پروگرام ہے۔ اس وقت تک ۲۵۰۰ غیر ہنرمند مزدور کام پر لگے رہیں گے۔ اور ۱۰ لاکھ روپیہ سالانہ پیدا کریں گے۔

اس پروجیکٹ پر مجموعی طور سے تخمیناً ۲۸۶.۹۴ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

ضلع نینی تال میں تقریباً ۲ کروڑ روپیہ کی لاگت کا نانک ساگر کا ذخیرہ آب قریب قریب تیار ہو چکا ہے۔ یہ ذخیرہ آب دیوہا بھگل نہر سسٹم اور ۳۶۰ میل لمبی نئی نہروں سے مزید ۹۷۵۰ ایکڑ زمین کی آبپاشی کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔

اس منصوبہ سے اس پانی کی بچت ہوگی جو شاردا ندی سے دیوھا بھگل سسٹم کو سپلائی کیا جاتا ہے۔ اس طرح جو پانی بچے گا اس سے مرکزی اور مشرقی اضلاع کے علاقوں کی آبپاشی ہو سکے گی۔

یہ ذخیرۂ آب ۱۸ مربع میل کے علاقہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ایک پشتہ ہے جس میں ۲۰-۲۰ فٹ کے سات پھاٹک ہیں جن سے ۵۰۰۰۰ کیوسیکس پانی نکل سکے گا۔

اس منصوبہ میں ۲ر۵ کروڑ مربع فٹ مٹی کا کام پورا کرنے کے لیے کھلی جیل کے پندرہ ہزار قیدی لگائے گئے تھے۔

امید کی جاتی ہے کہ اس منصوبہ سے اس کی لاگت کا ۲ر۵۲ فی صدی بطور آمدنی حاصل ہوگا اور آبپاشی کی مزید سہولتوں کی وجہ سے اناج کی پیداوار میں تخمیناً ۵ لاکھ من کا اضافہ ہوگا۔ اس ذخیرۂ آب سے مچھلیاں بھی بہ کثرت دستیاب ہوں گی۔ اس منصوبہ سے نینی تال، پیلی بھیت اور شاہجہاں پور کے ضلعوں کے ان مواضعات کا سیلاب سے تحفظ ہو سکے گا جو دیوہا ندی کے کنارے ذخیرۂ آب سے نیچے واقع ہیں۔

شاردا ساگر کے دوسرے مرحلہ کا کام تقریباً ۶۳۵ لاکھ روپیہ کی لاگت سے مکمل ہوگیا ہے۔

پشتہ کی اونچائی آب ۱۴ فٹ سے بڑھ کر ۵۲ فٹ ہوگئی ہے اور ساگر کا رقبہ ۲۵ مربع میل سے بڑھ کر ۲۸ مربع میل ہوگیا ہے۔ اب اس میں ۱۱۳۲۸ ملین مکعب فٹ کے بجائے ۲۰ ہزار ملین مکعب فٹ پانی جمع کیا جا سکے گا۔

اس منصوبہ کے دوسرے مرحلہ میں ۲۳ کروڑ مکعب فٹ مٹی اور ۲۷ لاکھ مربع فٹ سے زیادہ سنگ بندی کا کام ہوا۔ اس میں ۲۵ لاکھ اینٹیں ۱۰۰۰ ٹن سیمنٹ، ۵۰۰ ٹن فولاد اور ۷ لاکھ گیلن ڈیزل تیل استعمال ہوا۔

اس کی تکمیل سے مزید ۳۷،۰۰ ٹن اناج۔ ۱۰۰۰ ٹن مچھلی اور ۲۶،۰۰ ٹن شکر اور شکر کی مصنوعات حاصل ہو سکیں گی۔

اس سال ساگر میں مزید ۸ ہزار ایکڑ فٹ پانی جمع کیا جائے گا جس سے ۱۱۶۰۰ ایکڑ ربیع فصلوں کی آب پاشی ہو سکے گی۔ اگلے سال مزید ۱۷،۵۰۰ ایکڑ فٹ پانی جمع کیا جائے گا جس سے مزید ۲۵ ہزار ایکڑ ربیع فصلوں کے لیے آب پاشی کی سہولتیں مہیا ہو جائیں گی۔

ضلع جھانسی میں ماتا ٹیلہ ذخیرۂ آب کی تعمیر سے بیتوا نہر سسٹم کے ذریعہ مزید چار لاکھ ایکڑ آراضی کے لیے آب پاشی کی سہولتیں مہیا ہوگئی ہیں۔

بندیلکھنڈ میں اس خزانۂ آب سے ۳۰۳۶۷۵ ایکڑ اور مدھیہ پردیش میں ۱۰۹۹۰۷ ایکڑ آراضی سیراب ہو سکے گی۔ اس سے مجموعی طور پر ربیع کی ۲۷۱۶۱۵ ایکڑ (اتر پردیش میں ۱۷۴۶۴۷ ایکڑ اور مدھیہ پردیش میں ۹۶۹۶۸ ایکڑ) اور خریف کی ۱۴۱۹۶۷ ایکڑ آراضی (اتر پردیش میں ۱۲۹۰۲۸ ایکڑ اور مدھیہ پردیش میں ۱۲۹۳۹ ایکڑ) کی آب پاشی ہو سکے گی۔

جھانسی جالون اور ہمیر پور کے ضلعوں کو اور زیادہ پانی کی سپلائی کے لیے ۲۵۲ میل لمبی پرانی نہروں کی درستی کی گئی ہے اور ۵۵۸ میل لمبی نئی نہریں بنانے کی تجویز ہے۔ اس میں سے ۵۵۸ میل لمبی نہریں بنائی جا چکی ہیں۔ مدھیہ پردیش میں بھی ۲۹۵ میل لمبی نئی نہریں بنائی گئی ہیں۔

آب پاشی کی چھوٹی اسکیموں کے تحت ۱۰۰ میل لمبی اور نہریں بنائی جائیں گی۔

ضلع گونڈہ میں بلرامپور تحصیل کی ۱۱۷۱۳ ایکڑ آراضی کے سیلیے آب پاشی کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے دو چھوٹے ذخیرہ ہائے آب تعمیر کیے جا رہے ہیں۔

"گرگنی سرودر" نام کے پہلے ذخیرۂ آب میں ۳۳۷ ملین مکعب فٹ پانی جمع کرنے کی گنجائش ہوگی۔ اس سے ۳۲ میل لمبی نہریں نکالی جائیں گی جن سے سالانہ ۱۷،۹۰ ایکڑ آراضی کی آب پاشی کی جا سکیگی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس کی تعمیر پر ۱۵ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

"بھگوان پور سروور" نام کے دوسرے ذخیرۂ آب میں ۳۴۵ ملین مکعب فٹ پانی جمع کرنے کی گنجائش ہوگی اور اس کی ساڑھے سولہ میل لمبی نہروں سے سالانہ ۳۹۲۳ ایکڑ آراضی سیراب ہو سکے گی۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس کی تعمیر پر ۱۷٫۳۱ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

امید ہے کہ دونوں ذخیرہ ہائے آب جون ۱۹۶۴ء تک مکمل ہو جائیں گے۔ ان کی تعمیر میں دو سو ہنرمند اور دو ہزار غیر ہنرمند مقامی مزدور کام کر رہے ہیں جو دو برسوں میں تخمیناً ۲۰ لاکھ روپیہ بطور اجرت کما لیں گے۔

ماڈل جیل لکھنؤ کے قیدیوں پر اس تلقین کا خوشگوار اثر ہوا ہے کہ وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خود خط لکھا کریں۔ اس کے بعد سے جیل کے اَن پڑھ قیدی سماجی تعلیم کی اسکیم سے فائدہ اٹھانے لگے ہیں۔

ابھی تک اَن پڑھ قیدی سمجھتے تھے کہ پڑھنے لکھنے سے انھیں کیا فائدہ ہوگا۔ جب وقت کے ساتھ گھر والوں کی جدائی کا احساس شدید ہو جاتا ہے تو ان کے دل میں فطری طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ ان سے خط و کتابت کریں۔ اس لیے قیدیوں نے پڑھنے لکھنے کی تجویز کا خیر مقدم کیا ہے کہ وہ خود خط لکھ سکیں گے۔

جیل کے حکام نے اسی فطری جذبہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سماجی تعلیم کی اسکیم شروع کی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ قیدیوں کو جلد از جلد لکھنا پڑھنا سکھا دیا جائے۔ ساتھ ہی ابتدائی مضامین میں بھی تعلیم دیے دی جائے اور ان کی پسند کا کوئی کام بھی سکھا دیا جائے۔ اس طرح بعض قیدیوں کو نرسنگ اور معلمی کی تربیت بھی دی جا رہی ہے۔

ماڈل جیل کے استقبالیہ مرکز میں اس وقت ۲۴۴ قیدی ہیں جن میں سے ۲۰۸ کو اسکیم کے تحت تعلیم دی جا رہی ہے۔

قیدیوں کی تعلیم اور تربیت ہر روز صبح پانچ بجے اجتماعی عبادت سے شروع ہوتی ہے اس کے بعد ورزش کا پروگرام ہوتا ہے۔ باقاعدہ کلاسیں صبح ساڑھے سات بجے سے ساڑھے دس بجے تک اور ڈیڑھ بجے دوپہر سے ساڑھے چار بجے سہ پہر تک لگتی ہیں۔

اسکیم کے تحت ان پڑھ قیدیوں کے لیے چھ مہینہ کا کورس بنایا گیا ہے جس میں انھیں ہندی۔ حساب۔ زراعت۔ پشو پالن۔ امداد باہمی پنچایت۔ علم تمدن اور حفظانِ صحت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ساتھ ہی انھیں دری۔ نیوار ڈیا کپڑے کی بنائی۔ باغبانی معماری کھیتی باڑی۔ بڑھئی وغیرہ کے کاموں میں سے بھی کوئی ایک کام سکھایا جاتا ہے۔ ہر قیدی کو سلیٹ اور لکھنے پڑھنے کا سامان حکومت فراہم کرتی ہے۔

یہ اسکیم اس حد تک کامیاب ہوئی ہے کہ قیدی اپنے گھر والوں کو خود خط لکھ سکیں اور کینٹین میں اپنا حساب کتاب رکھ سکیں۔

پڑھے لکھے قیدیوں کو ان کے فطری رجحان کے مطابق معلمی یا نرسنگ کی تین مہینہ کی تربیت دی جاتی ہے۔ تربیت پانے کے بعد ان کو مختلف جیلوں میں قیدی ٹیچر یا نرسنگ اردلیوں کا کام کرنے کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔

اتر پردیش کے محکمہ شہری اور دیہی منصوبہ بندی نے ہردوار میں سیر و سیاحت مرکز کے نام سے ایک وسیع اور کشادہ آرام گھر کا نقشہ تیار کیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس مرکز سے سیاحوں خاص کر غیر ملکی سیاحوں کی مناسب جائے قیام کی ضرورتیں پوری ہو سکیں گی۔

یہ مرکز مایا پور باندھ کے نزدیک دریائے گنگا اور اس کی نہر کے درمیان کی زمین پر تعمیر کیا جائے گا۔ اس کی تعمیر پر تخمیناً سات لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ پوری عمارت میں ۲۴ ایک کمرہ والے اور ۹ دو کمرے والے حصے ہوں گے۔

مجوزہ نقشہ کے مطابق عمارت کے تین حصے ہوں گے جو نہر کے موڑ پر بنائے جائیں گے۔ اس کے مرکزی حصہ میں ایک ہال کھانے کا کمرہ اور لاؤنج ہوگا دوسرے حصے میں ایک کمرہ والے ۱۲ حصے ہوں گے جن میں غسل خانہ وغیرہ بھی ہوں گے۔ علاوہ ازیں دو دو کمروں کے تین حصے بھی ہوں گے۔ ایک کمرہ والے اور دو کمرے والے حصوں کے وسط میں ایک زینہ ہوگا اس کے تیسرے حصے کو جس میں تین بڑے کمرے ہوں گے لاؤنج اور کھانے کے کمرہ سے ملانے کے لیے ایک راہ داری تعمیر کی جائے گی۔

اس کے خاص بلاک کی عمارت جس میں ایک اور دو کمرہ والے حصے ہوں گے تین منزلہ ہوگی اور وہ حصہ دو منزلہ ہوگا جس میں ہال لاؤنج اور بڑے کمرے ہوں گے۔

چونکہ اس مرکز کا محل وقوع کافی بلندی پر ہے اس لیے

نچلے حصے میں موٹر سروس اور گیرج کا انتظام کیا جائے گا تاکہ خاص سڑک سے وہاں تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ اس حصہ میں باورچی خانہ بھی ہوں گے۔

فی الحال ایک ایک کمرہ کے واحد سے ایک ہال اور مرکزی بازو کے دوسرے حصے تعمیر کیے جائیں گے جس پر تخمیناً ۵ء۱ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔

اس عمارت سے گنگا اور اس کی نہر کا بخوبی نظارہ کیا جاسکے گا اور نہر کے دوسرے کنارہ اور پرانے گھاٹوں سے اس عمارت کا منظر حد درجہ دل فریب ہوگا۔

شری سی۔ بی۔ گپتا وزیر اعلیٰ نے ۲۲ اکتوبر کو لیجسلیچر کلچرل پروگرام کمیٹی کے ایک سہ روزہ پروگرام کا افتتاح کیا۔ یہ پروگرام کوی سمیلن مشاعرہ اور ڈرامے پر مشتمل تھا۔ کوی سمیلن ۲۲ اکتوبر کو ہوا جس کی صدارت پنڈت کملا پتی ترپاٹھی وزیر مالیات نے کی۔ مشاعرہ ۲۳ اکتوبر کو ہوا۔ وزیر انصاف شری سید علی ظہیر نے اس کا افتتاح کرتے ہوئے اردو کو ملک کا مشترکہ سرمایہ بتایا۔ جنرل شاہ نواز خاں نائب وزیر ریلوے نے مشاعرہ کی صدارت کی اور اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ محاذ جنگ پر بھی غزلوں اور نظموں کا کیف سپاہیوں کو متاثر کرتا ہے۔ مشاعرے کے کنوینر شری راحت مولائی ایم۔ ایل۔ اے تھے۔ کوی سمیلن اور مشاعرے دونوں میں لکھنؤ اور بیرون لکھنؤ کے شعرا نے حصہ لیا۔ مشاعرے کے دوسرے دن شری بنارسی داس وزیر اطلاعات نے ایک ڈرامہ "کشمیر کی ایک شام" کا افتتاح کیا۔

مُتفرّقات

عمارتی لکڑی پر بکری ٹیکس کی شرح۔ نائب وزیر مالیات شری جے رام ورما نے ودھان سبھا میں سوالات کے وقفہ میں بتایا کہ گزشتہ یکم جولائی سے عمارتی لکڑی بانس۔ اور اُس سے بنے ہوئے سامان پر بکری ٹیکس کی شرح ۳ فی صدی ملٹی پوائنٹ (کئی مرحلوں پر دیا جانے والا ٹیکس) مقرر کیا گیا ہے۔

نائب وزیر نے شری ہمت سنگھ کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ دوسرے درختوں پر بکری ٹیکس کی شرح ۳ فی صدی ملٹی پوائنٹ مقرر کی گئی ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ جہاں تک سرکاری جنگلات کے درختوں سے سیلس ٹیکس کی آمدنی کا سوال ہے اس کے بارے میں معلومات حاصل کی جارہی ہیں۔

ایک ضمنی سوال کا جواب دیتے ہوئے نائب وزیر نے کہا کہ اس سے پہلے بھی درختوں پر ملٹی پوائنٹ ٹیکس تھا لیکن اب کچھ خاص درختوں پر ٹیکس میں ایک فی صدی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یکم مئی ۱۹۶۲ء سے سرکاری محکموں کو بھی بکری ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔

سبکدوش ملازمین کی پنشن۔ وزیر مالیات پنڈت کملا پتی ترپاٹھی نے ودھان سبھا میں سوال کے وقفہ میں بتایا کہ حکومت نے کچھ نئے طریقے اپنائے ہیں تاکہ سبکدوش سرکاری ملازمین کے پنشن کے معاملوں میں جلد از جلد فیصلہ ہوسکے۔

وزیر مالیات نے جو شری دیپ نرائن سنگھ اور شری رام سندر پانڈے کے ایک مشترکہ سوال کا جواب دے رہے تھے مزید بتایا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۶۱ء کو ۴۲۰۱ سرکاری ملازمین ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے لیکن گزشتہ مارچ تک محض ۱۵ ملازمین کے پنشن کے معاملوں کا فیصلہ ہوا تھا۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ایسے سرکاری ملازمین کے پنشن کے معاملے ابھی تک زیر غور ہیں جو یکم اپریل ۱۹۵۹ء سے پہلے سبکدوش ہوئے تھے۔

انھوں نے مزید کہا کہ پنشن کے معاملوں کے فیصلوں میں تاخیر کی ایک بڑی وجہ پنشن کے نئے قواعد ۱۹۶۱ء ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہدایات جاری کردی گئی ہیں کہ پنشن کے معاملے بلا تاخیر فیصل کیے جائیں۔

شہری علاقوں میں مکانات کے لیے زمین کا حصول۔ وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ شری وچتر نرائن شرما نے آج ودھان سبھا میں سوال کے وقفہ میں شری برہم دت کو بتایا کہ جہاں تک ممکن ہے اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ شہری علاقوں میں مکان کی تعمیر کے لیے قابل کاشت زمین حاصل نہ کی جائے۔

شری شرما نے جو وزیر امداد باہمی شری چتر بھج شرما کی طرف سے جواب دے رہے تھے مزید بتایا کہ مرکزی حکومت کے قانون حصول زمین میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ قابل کاشت زمین مکانوں کی تعمیر کے لیے حاصل کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اس لیے یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ تعمیر مکان سے متعلق امداد باہمی انجمنوں کو قابل کاشت زمین دینا بند کر دیا جائے۔

مویشی کی لاشوں کی زیادہ قیمت ۔ محکمۂ نگہداشت مویشیان مویشی کی لاشوں کی پہلے سے زیادہ قیمت ادا کرے گا۔

بخشی کا تالاب لکھنؤ کے کھال اُتارنے اور مویشی کی لاشوں کو کام میں لانے کے لیے مرکز کی توسیع کی اسکیم کے تحت محکمۂ نگہداشت مویشیان نے تحریری درخواست یا ٹیلیفون پر اطلاع ملنے پر مویشی کی لاشوں کو اٹھوانے کا انتظام کیا ہے۔

اب تک محکمہ کے ذریعہ بالغ مویشی اور بھینس کی لاش کے لیے مالک یا اطلاع دینے والے کو پانچ روپیہ کے حساب سے ادائیگی کی جاتی تھی۔ اس شرح میں اضافہ کر دیا گیا ہے اور اب بالغ مویشی اور بھینس کی لاش کے لئے بالترتیب دس روپیہ اور بیس روپیہ کے حساب سے ادائیگی کی جائے گی۔

شاردا نہر کی صفائی ۔ شاردا نہر سے ہر سال ایک مشین کے ذریعہ تقریباً ۲ لاکھ مکعب فٹ ریت نکالی جاتی ہے۔ ریاست میں یہ اپنی نوعیت کی واحد مشین ہے۔ یہ مشین جون ۱۹۶۰ء میں ۱۴ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار کی گئی تھی۔ شاردا نہر سے بہار کی جانب تقریباً ۱۲۰۰ فٹ کے فاصلہ پر لگائی گئی ہے۔

ریت اور چھوٹے کنکروں کی وجہ سے برسات میں نہر سے پانی کا اخراج کم ہو کر فی سیکنڈ ۵۰۰۰ مکعب فٹ ہو جاتا تھا لیکن اب نہر سے برابر فی سیکنڈ ۱۰۵۰۰ مکعب فٹ پانی خارج ہوتا ہے جس سے نہ صرف آبپاشی کے لیے کافی پانی ملنے لگا ہے بلکہ شاردا بجلی گھر سے اور زیادہ پن بجلی بھی پیدا ہونے لگی ہے۔

لڑکیوں کے لیے ۲۱ نئے سینیر بیسک اسکول ۔ اتر پردیش میں موجود تعلیمی سال سے ۲۱ گورنمنٹ سینیر بیسک اسکول کھولے گئے ہیں۔ یہ اسکول اترولہ۔ (بلند شہر) زمنیا (غازی پور) مانپور ہاری (مین پوری) چھوٹی بیریا (بلیا) شاہ آباد (رامپور) جاکھن (وارانسی) دبیا پور (اٹاوہ) بھگوان پور (سہارنپور) بہوا (فتح پور) پالی (ہردوئی) سرائے میر (اعظم گڈھ) اور ٹنک پور (نینی تال) میں کھولے گئے ہیں۔

موجودہ پنجسالہ منصوبہ کے دوران لڑکیوں کے ۶۰ اسکول کھولنے کے مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں اس کے پہلے دو برسوں میں ۲۴ اسکول کھولے جا چکے ہیں اور بقیہ ۳۶ اسکول منصوبہ کے آئندہ تین برسوں میں ۱۲ اسکول فی تعلیمی سال کے حساب سے کھولے جائیں گے۔ حکومت اتر پردیش نے ان نئے اسکولوں کے لیے فرنیچر اور دیگر ساز و سامان کے لیے ۱۲۶۲۷ روپیہ کی مکرر اور ۶۰۰۰۰ روپیہ کی غیر مکرر رقمیں منظور کی ہیں۔

ڈیفنس فنڈ میں چندہ دیجیے

"ہمارے سپاہیوں اور جوانوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُن سے آپ ناواقف نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت سے جو کچھ بھی ممکن ہے وہ محاذ پر لڑنے والے جوانوں کے لیے کر رہی ہے۔ لیکن حکومت کی کوششوں کو مؤثر بنانے کے لیے عوام کا اشتراک بھی اشد ضروری ہے۔ اس لیے میں آپ سب سے یہ کہوں گا کہ اس عظیم جدوجہد میں جس میں ہم کو لپیٹ لیا گیا ہے اشتراک و تعاون کریں اور آپ سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ آپ آگے بڑھیں اور وزیر اعظم کے قومی فنڈ میں جو حال ہی میں اس مقصد سے کھولا گیا ہے فراخ دلی کے ساتھ چندہ دیں۔ یہ فنڈ دفاع سے متعلق تمام مقصدوں کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ خاص طور سے یہ فنڈ محاذ پر ہمارے سپاہیوں کو آسائش مہیا کرنے اور جہاں ضرورت ہوگی اُن کے خاندان کے لوگوں کی مدد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔" ——— جواہر لعل نہرو

نقد و تبصرہ

متاعِ تسکین
(شاعر: تسکین قریشی۔ قیمت: سے ر
ملنے کا پتہ ؟

یہ مجموعہ ہے جناب تسکین قریشی کی نظموں اور غزلوں کا۔ اس میں اُن کے نئے کلام اور پہلے مجموعے شگوفہ کے سارے مندرجات کے علاوہ ابتدائی کلام کا انتخاب بھی شامل ہے۔ جناب تسکین قریشی کی شاعری تعارف کی محتاج نہیں اردو کے موجودہ شعرا کی صف میں انھیں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں قدیم و جدید کا امتزاج پایا جاتا ہے اور فکر و فن کی ہم آہنگی ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں غم جاناں بھی ہے اور غم دوراں بھی، محبت کے دل گداز نغمے بھی اور عصر حاضر کی دھڑکنیں بھی۔ ان کے اشعار میں حسرت موہانی اور جگر مراد آبادی دونوں کی چاشنی ملتی ہے اور کتاب کے مقدمہ نگار مولانا معین الدین احمد ندوی کے بہ قول ان کا کلام "حسرت اور جگر کے تغزل کا دو آتشہ ہے"۔ متاعِ تسکین میں غزلوں کے علاوہ شروع میں نعت اور آخر میں منظومات شامل ہیں اور یہ دونوں چیزیں جناب تسکین کی قادر الکلامی اور بلندیٔ تخیل کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ غزلوں کے بعض اشعار پیش ہیں ؎

آخری فتح عشق ہی کی ہوئی — گو ہمیشہ خراب حال رہا
دل سے کیا آج کہہ گئی یہ نگاہ — دیر تک کچھ عجیب حال رہا

ڈبڈبا آئیں وہ آنکھیں جو مرا نام آیا — عشق ناکام سہی پھر بھی بہت کام آیا

عقل ہے مصلحت گر، عقل سے کر نہ ساز باز — دل جو کہے وہ کر گزر، عشق نہیں زمانہ ساز

مشغلِ جنوں اور صحرا صحرا، کس نے دیکھا کس نے جانا — بات تو جب ہے ذکر ہو تیرا، گلشن گلشن محفل محفل

ہزاروں جام و ساغر ٹوٹتے ہیں — بہت دشوار ہے میخانہ سازی

اہلِ وفا کے خون کی چھینٹیں دور تک اڑ کر جاتی ہیں — میرا اثر بنا دیکھنے والے، اپنا بھی دامن دیکھا ہے

خزاں کا راز کچھ ہو، ہم تو بس اتنا سمجھتے ہیں — چمن کو خود چمن ہی کی فضا برباد کرتی ہے

محمد قاسم حملۂ بابر تک
(از: نیاز فتح پوری ناشر: نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ قیمت: چھ روپیہ

جناب نیاز فتح پوری نے (جو افسوس ہے کہ ترک وطن کرکے پاکستان چلے گئے ہیں) ادب، انشا اور تنقید کے علاوہ متعدد دوسرے موضوعات پر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی یہ کتاب تاریخ ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہندوستان میں محمد بن قاسم کی آمد سندھ سے بابر کے حملے تک کے واقعات اس میں مذکور ہیں۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر عہد کے معاصر مورخوں کی اصل فارسی تاریخیں اس کی ماخذ ہیں۔

عرضِ نغمہ (گیت انجلی)
مترجم: نیاز فتح پوری۔ ناشر: نسیم بک ڈپو لکھنؤ
قیمت: ایک روپیہ چار آنے۔

یہ ٹیگور کے مشہور مجموعۂ نظم گیتا نجلی کے اس اردو ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن ہے جسے جناب نیاز فتح پوری نے ۱۹۱۲ء میں کیا تھا۔ نئے ایڈیشن میں ترجمہ میں تبدیلی نہیں کی گئی ہے البتہ گیتا نجلی کا نام بدل کر گیت انجلی کر دیا گیا ہے اور حضرت نیاز فتح پوری نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ گیت اور انجلی سے مرکب ہے اور اسے گیتان جلی لکھنا درست نہیں۔ نیاز صاحب کا یہ کہنا محل نظر ہے۔ سنسکرت کے قواعد کے مطابق جب دو لفظوں سے کوئی مرکب لفظ بنتا ہے اور ان میں سے پہلے لفظ کا آخری حرف مفتوح ہوتا ہے اور دوسرے لفظ کا پہلا حرف الف (अ) ہوتا ہے یا یہ پہلا حرف مفتوح ہوتا ہے تو ان دونوں لفظوں کا مرکب بنانے میں الف ممدودہ (आ) کی آواز پیدا ہو جاتی ہے اور وہ لکھا بھی اسی طرح جاتا ہے۔ گیتا نجلی میں یہی اصول برتا گیا ہے۔ گیتا نجلی مرکب ہے گیت (تائے مفتوح) + انجلی سے۔ چونکہ گیت کا ت مفتوح ہے اور انجلی کا پہلا حرف الف ہے اس لئے مرکب بنانے میں ت کا فتحہ اور انجلی کا الف مل کر الف ممدودہ (आ) ہو گیا اور گیت انجلی سے گیتا نجلی بن گیا۔ یہی صورت اس وقت بھی پیش آتی ہے جب کسی مرکب لفظ کے پہلے لفظ کے آخر میں کسرہ یا ضمہ ہو اور دوسرے لفظ کے شروع میں کسرہ یا ضمہ ہو۔ ایسی حالت میں مرکب بناتے وقت ہر دو زیر یا پیش کی جگہ علی الترتیب یائے معروف یا واؤ معروف کی آواز پیدا ہو جاتی ہے مثلاً لفظ ہریش مرکب ہے ہر + ایش سے۔ دونوں مل کر ہریش بن گیا۔ بھانودے مرکب ہے بھانُ + ادے سے (بہ معنی سورج کا نکلنا) یہ مرکب ہو کر بھانودے ہو گیا۔ اس اصول کے مطابق "گیت انجلی" غلط اور گیتا نجلی صحیح ہے۔ یوں بھی کسی زبان کی کتاب کے نام کو بدل دینا مناسب نہیں مثلاً زیر نظر کتاب کا اردو نام عرض نغمہ (بہ اضافت ض ہے)۔ اگر ہندی میں یہ نام لکھتے وقت اضافت نکال دی جائے تو اسے غلط سمجھا جائے۔ کتاب کے شروع میں ٹیگور کی شاعری پر نیاز صاحب کا ایک مقدمہ بھی ہے۔

برگِ سبز بانو طاہرہ سعید ناشر: مکتبۂ سعدی ۱۴۴؛ ٹیوبلڈنگ، اعظم آباد، حیدرآباد (۲۰) قیمت: دو روپے

یہ مجموعہ ہے حیدرآباد کی ایک خوش فکر اور خوش گو ایرانی نژاد شاعرہ بانو طاہرہ سعید کی نظموں اور غزلوں کا۔ مجموعے کی نظمیں اور غزلیں ان کے نکھرے ہوئے ذوقِ سخن، جدتِ تخیل، گیرائی فکر اور قادرالکلامی کا ثبوت ہیں۔ انھیں مظاہرِ فطرت سے بڑی دلچسپی معلوم ہوتی ہے اور انھوں نے ان پر کئی نظمیں کہی ہیں۔ شخصیات پر بھی ان کی متعدد نظمیں ہیں اور ان سب میں دلی جذبات کی بڑی اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کی غزلوں میں نرمی اور لوچ بھی ہے اور زندگی اور سماج کی عکاسی بھی۔ اردو کے علاوہ وہ فارسی اور انگریزی میں بھی شاعری کرتی ہیں۔ نیا دور میں ان کی کئی اردو نظمیں شایع ہو چکی ہیں۔ غزلوں کے چند شعر درج ہیں:

سب جو صلے دل کے پست ہوئے ساحل پہ سفینہ کیا پہنچا ۔۔۔ موجوں سے الجھنا چھوڑ دیا طوفان سے لڑنا بھول گئے

مجھے اپنے تڑپنے کا ذرا بھی غم نہیں لیکن ۔۔۔ کہیں ان کا بھی دل میرے لئے تڑپا تو کیا ہوگا

ان کے ہونٹوں پہ مسکراتی ہے ۔۔۔ مسکراہٹ، ہزار پھولوں کی

عثمان بطور مصنف: گوڈفرے لیاس مترجم: شاہد احمد دہلوی ناشرین: نیشنل اکاڈمی۔ ۹۔ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی

قیمت: ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے۔

چین کے قازق مسلمانوں کی اپنے وطن چینی ترکستان سے ہجرت کی ایک داستان ہے۔ بہادر قازق مسلمان عرصے سے سنکیانگ (چینی ترکستان) میں آزادانہ قبائلی زندگی بسر کرتے تھے۔ چین میں کمیونسٹ حکومت کے اقتدار کے ساتھ ہی ان پر ایسی پابندیاں عائد کی جانے لگیں جو ان کے لئے ناقابلِ قبول تھیں۔ چنانچہ انھوں نے چین کی نئی حکومت سے لڑنا اور اپنے وطن سے ہجرت کر جانا پسند کیا مگر حکومتِ چین کی اطاعت نہ قبول کی۔ چینی حکومت نے اپنی فوج کی مدد سے ان قازق مسلمانوں کی ہجرت کو بہ زور روکنا چاہا مگر قازق مسلمان اپنے بہادر رہنما عثمان بطور کی سرکردگی میں ان سے جنگ کرتے رہے۔ آخر عثمان کو چینی حکومت نے گرفتار کر کے قتل کر دیا لیکن جو چند ہزار قازق قتل ہونے یا گرفتار ہونے سے بچ گئے وہ ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کرتے ہوئے کسی طرح کشمیر پہنچے اور وہاں سے ترکی۔

سب رس (از: ملا وجہی (مرتبہ شمیم انہونوی) ناشر: مکتبہ کلیان بشیرت گنج لکھنؤ۔ قیمت: پانچ روپے آٹھ آنے۔

ملا وجہی، عہدِ قطب شاہی کے مشہور اردو شاعر اور نثر نگار ہیں۔ ان کی نثری تمثیل (Allegory) سب رس جو تین سو برس پرانی اردو میں لکھی گئی ہے اردو کی قدیم ترین نثری تصنیف ہے۔ موجودہ ایڈیشن شمیم انہونوی کا ترتیب دیا ہوا ہے اور کتاب کے شروع میں ملا وجہی اور ان کی تصنیفوں پر انھیں کا ایک مقدمہ شامل ہے۔

امداد باہمی (ہندوستان میں) (از: مصطفےٰ حسن رضوی احباب پبلشرز لکھنؤ۔ قیمت: چار روپیہ

تحریکِ امداد باہمی اپنی افادیت اور اہمیت کی وجہ سے عالم گیر تحریک بن چکی ہے۔ ہندوستان کے بدلتے ہوئے معاشی نظام میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس تحریک کو سمجھیں اور اسے اپنائیں۔ جناب مصطفےٰ حسن رضوی نے اپنی اس کتاب میں تحریکِ امداد باہمی کی تاریخ اور اس کے اصولوں سے لے کر کوآپریٹیو سوسائٹی اور اس کے تمام متعلقات پر روشنی ڈالی ہے، مثلاً اس کی تشکیل کیسے ہوتی ہے، اسے کیا اختیارات حاصل ہیں، اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں، وہ اپنے ممبروں کو کیا سہولتیں بہم پہنچا سکتی ہے، کوآپریٹیو کا محکمہ کس طرح کام کرتا ہے، کتنے اقسام کی کوآپریٹیو سوسائٹیاں ہوتی ہیں، ریزرو بینک اور اسٹیٹ بینک سے ان کا کیا تعلق ہوتا ہے، وغیرہ۔ غرض اس کتاب میں امداد باہمی کے بارے میں ہر طرح کی معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔

اردو میں علم ہجا (از: متین حیدرآبادی ناشر: حیدرآباد اردو اکاڈمی (بعث) سلطان پورہ حیدرآباد۔ قیمت: تین روپے پچاس نئے پیسے

متین حیدرآبادی، اردو اور فارسی کے ایک اچھے ادیب گزرے ہیں۔ انھوں نے اردو اور فارسی کی کئی درسی کتابیں تیار کیں، فارسی کے کئی مقالات کا بامحاورہ ترجمہ کیا اور اردو میں کئی اہم علمی مضامین لکھے۔ زیرِ نظر کتاب اردو میں علم ہجا پر ان کا ایک مقالہ ہے جسے سعادت نظیر صاحب نے ترتیب دیا ہے اور شروع میں متین حیدرآبادی اور ان کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ جہاں تک زیرِ نظر مقالے کا تعلق ہے اس میں زبان کی ایجاد، زبانوں کے اختلاف، علم ہجا کی تاریخ، مختلف زبانوں کے حروف، حروف کی گروہ بندی، غرض کہ علم ہجا کے متعلق ہر چیز پر بحث کی گئی ہے اور لسانی و صوتیاتی ہر زاویے سے اردو میں علم ہجا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

"ص"

(باقی)

نقد و تبصرہ

متاعِ تسکیں
(از: تسکین قریشی۔ قیمت : — ر

ملنے کا پتہ ؟

یہ مجموعہ ہے جناب تسکین قریشی کی نظموں اور غزلوں کا۔ اس میں اُن کے نئے کلام اور پہلے مجموعے گلدستہ کے سارے مندرجات کے علاوہ ابتدائی کلام کا انتخاب بھی شامل ہے۔ جناب تسکین قریشی کی شاعری تعارف کی محتاج نہیں اردو کے موجودہ شعرا کی صف میں انھیں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں قدیم و جدید کا امتزاج پایا جاتا ہے اور فکر و فن کی ہم آہنگی ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی، محبت کے دل گداز نغمے بھی اور عصرِ حاضر کی دھڑکنیں بھی۔ ان کے اشعار میں حسرت موہانی اور جگر مراد آبادی دونوں کی چاشنی ملتی ہے اور کتاب کے مقدمہ نگار مولانا معین الدین احمد ندوی کے بہ قول ان کا کلام "حسرت اور جگر کے تغزل کا دو آتشہ ہے"۔ متاعِ تسکیں میں غزلوں کے علاوہ شروع میں نعت اور آخر میں منظومات شامل ہیں اور یہ دونوں چیزیں جناب تسکین کی قادرالکلامی اور بلندیٔ تخیل کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ غزلوں کے بعض اشعار پیش ہیں ؎

آخری فتح عشق ہی کی ہوئی گو ہمیشہ خراب حال رہا
دل سے کیا آج کہہ گئی یہ نگاہ دیر تک کچھ عجیب حال رہا

ڈبڈبا آئیں وہ آنکھیں جو مرا نام آیا عشق ناکام سہی پھر بھی بہت کام آیا

عقل ہے مصلحت گر، عقل سے کرنہ سازباز دل جو کہے وہ کر گزر، عشق نہیں زمانہ ساز

شغلِ جنوں اور صحرا صحرا، کس نے دیکھا کس نے جانا بات تو جب ہے ذکر ہو تیرا، گلشن گلشن محفل محفل

ہزاروں جام و ساغر ٹوٹتے ہیں بہت دشوار ہے میخانہ سازی

اہلِ وفا کے خون کی چھینٹیں دور تک اڑ کر جاتی ہیں میرا تڑپنا دیکھنے والے، اپنا بھی دامن دیکھا ہے

خزاں کا راز کچھ ہو، ہم تو بس اتنا سمجھتے ہیں چمن کو خود چمن ہی کی فضا برباد کرتی ہے

محمد قاسم سے حملۂ بابر تک
(از: نیاز فتح پوری ناشر: نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ قیمت : چھ روپیہ

جناب نیاز فتح پوری نے (جو افسوس ہے کہ ترکِ وطن کرکے پاکستان چلے گئے ہیں) ادب، انشا اور تنقید کے علاوہ متعدد دوسرے موضوعات پر کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی یہ کتاب تاریخ پر ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہندوستان میں محمد بن قاسم کی آمدِ سندھ سے بابر کے حملے تک کے واقعات اس میں مذکور ہیں۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر عہد کے مورخوں کی اصل فارسی تاریخیں اس کی ماخذ ہیں۔

عرضِ نغمہ (گیت انجلی)
مترجمہ: نیاز فتح پوری۔ ناشر: نسیم بک ڈپو، لکھنؤ
قیمت : ایک روپیہ چار آنے۔

یہ ٹیگور کے مشہور مجموعۂ نظم گیتانجلی کے اس اردو ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن ہے جسے جناب نیاز فتح پوری نے ۱۹۱۴ء میں کیا تھا۔ نئے ایڈیشن میں ترجمہ میں تبدیلی نہیں کی گئی ہے البتہ گیتانجلی کا نام بدل کر گیت انجلی کر دیا گیا ہے اور حضرت نیاز فتح پوری نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ گیت اور انجلی سے مرکب ہے اور اسے گیتان جلی لکھنا درست نہیں "نیاز صاحب کا یہ کہنا محلِ نظر ہے۔ سنسکرت کے قواعد کے مطابق جب دو لفظوں سے کوئی مرکب لفظ بنتا ہے اور ان میں سے پہلے لفظ کا آخری حرف مفتوح ہوتا ہے اور دوسرے لفظ کا پہلا حرف الف (अ) ہوتا ہے یا یہ پہلا حرف مفتوح ہوتا ہے تو ان دونوں لفظوں کا مرکب بننے میں الف ممدودہ (आ) کی آواز پیدا ہو جاتی ہے اور وہ لکھا بھی اسی طرح جاتا ہے۔ گیتانجلی میں یہی اصول برتا گیا ہے۔ گیتانجلی مرکب ہے گیتَ (تائے مفتوح) + انجلی سے۔ چونکہ گیت کا ت مفتوح ہے اور انجلی کا پہلا حرف الف ہے اس لئے مرکب بنانے میں ت کا فتحہ اور انجلی کا الف مل کر الف ممدودہ (आ) ہو گیا اور گیت انجلی سے گیتانجلی بن گیا۔ یہی صورت اس وقت بھی پیش آتی ہے جب کسی مرکب لفظ کے پہلے لفظ کے آخر میں کسرہ یا ضمہ ہو اور دوسرے لفظ کے شروع میں کسرہ یا ضمہ ہو۔ ایسی حالت میں مرکب بناتے وقت ہر دو زیر یا پیش کی جگہ علی الترتیب یائے معروف یا واؤ معروف کی آواز پیدا ہو جاتی ہے مثلاً لفظ ہریش مرکب ہے ہرِ + ایش سے۔ دونوں مل کر ہریش بن گیا۔ بھانودے مرکب ہے بھانُ + اُدے سے (بہ معنی سورج کا نکلنا) یہ مرکب ہو کر بھانودے ہو گیا۔ اس اصول کے مطابق "گیت انجلی" غلط اور گیتانجلی صحیح ہے۔ یوں بھی کسی زبان کی کتاب کے نام کو بدل دینا مناسب نہیں مثلاً زیرِ نظر کتاب کا اردو نام عرضِ نغمہ (بہ اضافت مع ہے)۔ اگر ہندی میں یہ نام لکھتے وقت اضافت نکال دی جائے تو اسے غلط سمجھا جائے۔ کتاب کے شروع میں ٹیگور کی شاعری پر نیاز صاحب کا ایک مقدمہ بھی ہے۔

برگِ سبز بانو طاہرہ سعید ناشر: مکتبۂ مسعدی ۱۳۴ ؍
'نیو ملاپٹک' اعظم آباد' حیدرآباد (۲۰) قیمت: دو روپے

یہ مجموعہ ہے حیدرآباد کی ایک خوش فکر اور خوش گو ایرانی نژاد شاعرہ بانو طاہرہ سعید کی نظموں اور غزلوں کا۔ مجموعے کی نظمیں اور غزلیں ان کے نکھرے ہوئے ذوقِ سخن' جدتِ تخیل' گہرائی فکر اور قادرالکلامی کا ثبوت ہیں۔ انھیں مظاہرِ فطرت سے بڑی دلچسپی معلوم ہوتی ہے اور انھوں نے ان پر کئی نظمیں کہی ہیں۔ شخصیات پر بھی ان کی متعدد نظمیں ہیں اور ان سب میں دلی جذبات کی بڑی اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کی غزلوں میں نرمی اور لوچ بھی ہے اور زندگی اور سماج کی عکاسی بھی۔ اردو کے علاوہ وہ فارسی اور انگریزی میں بھی شاعری کرتی ہیں۔ نیا دور میں ان کی کئی اردو نظمیں شایع ہو چکی ہیں۔ غزلوں کے چند شعر درج ہیں:

سر جھکائے دل گئے پست ہوئے ساحل پہ سفینہ کیا پہنچا — موجوں سے الجھنا چھوڑ دیا طوفان سے لڑنا بھول گئے
مجھے اپنے تڑپنے کا ذرا بھی غم نہیں لیکن — کہیں ان کا بھی دل میرے لئے تڑپا تو کیا ہوگا
ان کے ہونٹوں پہ مسکراتی ہے — مسکراہٹ' ہزار پھولوں کی

عثمان بطور مصنف: گوڈفرے لیاس مترجمہ: شاہد احمد دہلوی
ناشرین: نیشنل اکاڈمی۔ ۹۔ انصاری مارکیٹ' دریا گنج' دہلی
قیمت: ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے۔

چین کے قازق مسلمانوں کی اپنے وطن چینی ترکستان سے ہجرت کی ایک داستان ہے۔ بہادر قازق مسلمان عرصے سے سنکیانگ (چینی ترکستان) میں آزادانہ قبائلی زندگی بسر کرتے تھے۔ چین میں کمیونسٹ حکومت کے اقتدار کے ساتھ ہی ان پر ایسی پابندیاں عائد کی جانے لگیں جو ان کے لئے ناقابلِ قبول تھیں۔ چنانچہ انھوں نے چین کی نئی حکومت سے لڑنا اور اپنے وطن سے ہجرت کر جانا پسند کیا مگر حکومتِ چین کی اطاعت نہ قبول کی۔ چینی حکومت نے اپنی فوج کی مدد سے ان قازق مسلمانوں کی ہجرت کو بہ زور روکنا چاہا مگر قازق مسلمان اپنے بہادر رہ نما عثمان بطور کی سرکردگی میں ان سے جنگ کرتے رہے۔ آخر عثمان کو چینی حکومت نے گرفتار کر کے قتل کر دیا لیکن جو چند ہزار قازق قتل ہونے یا گرفتار ہونے سے بچ گئے وہ ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کرتے ہوئے کسی طرح کشمیر پہنچے اور وہاں سے ترکی۔

سب رس (از: ملا وجہی (مرتبہ شمیم انہونوی) ناشر: مکتبہ کلیات بشیرت گنج لکھنؤ۔ قیمت: پانچ روپے آٹھ آنے۔

ملا وجہی' عہدِ قطب شاہی کے مشہور اردو شاعر اور نثر نگار ہیں۔ ان کی نثری تمثیل (Allegory) سب رس جو تین سو برس پرانی اردو میں لکھی گئی ہے اردو کی قدیم ترین نثری تصنیف ہے۔ موجودہ ایڈیشن شمیم انہونوی کا ترتیب دیا ہوا ہے اور کتاب کے شروع میں ملا وجہی اور ان کی تصنیفوں پر انھیں کا ایک مقدمہ شامل ہے۔

امداد باہمی (ہندوستان میں) (از: مصطفےٰ حسن رضوی احباب پبلشرز لکھنؤ۔ قیمت: چار روپیہ

تحریکِ امداد باہمی اپنی افادیت اور اہمیت کی وجہ سے عالم گیر تحریک بن چکی ہے۔ ہندوستان کے بدلتے ہوئے معاشی نظام میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس تحریک کو سمجھیں اور اسے اپنائیں۔ جناب مصطفےٰ حسن رضوی نے اپنی اس کتاب میں تحریکِ امداد باہمی کی تاریخ اور اس کے اصولوں سے لے کر کوآپریٹو سوسائٹی اور اس کے تمام متعلقات پر روشنی ڈالی ہے' مثلاً اس کی تشکیل کیسے ہوتی ہے' اسے کیا اختیارات حاصل ہیں' اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں' وہ اپنے ممبروں کو کیا سہولتیں بہم پہنچا سکتی ہے' کوآپریٹو کا محکمہ کس طرح کام کرتا ہے' کتنے اقسام کی کوآپریٹو سوسائٹیاں ہوتی ہیں' ریزرو بینک' اور اسٹیٹ بینک سے ان کا کیا تعلق ہوتا ہے' وغیرہ وغیرہ غرض' اس کتاب میں امداد باہمی کے بارے میں ہر طرح کے معلومات فراہم کر دیے گئے ہیں۔

اردو میں علم ہجا (از: سیتن حیدرآبادی ناشر: حیدرآباد اردو اکاڈمی (بعد)
سلطان پورہ حیدرآباد۔ قیمت: تین روپے پچاس نئے پیسے

سیتن حیدرآبادی' اردو اور فارسی کے ایک اچھے ادیب گزرے ہیں۔ انھوں نے اردو اور فارسی کی کئی درسی کتابیں تیار کیں' فارسی کے کئی مقالات کا با محاورہ ترجمہ کیا اور اردو میں کئی اہم علمی مضامین لکھے۔ زیرِ نظر کتاب اردو میں علم ہجا پر ان کا ایک مقالہ ہے جسے سعادت نظیر صاحب نے ترتیب دیا ہے اور شروع میں سیتن حیدرآبادی اور ان کے علمی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ جہاں تک زیرِ نظر مقالے کا تعلق ہے اس میں زبان کی ایجاد' زبانوں کے اختلاف' علم ہجا کی تاریخ مختلف زبانوں کے حروف' حروف کی گروہ بندی' غرض کہ علم ہجا کے متعلق ہر چیز پر بحث کی گئی ہے اور لسانی و صوتیاتی ہر زاویے سے اردو میں علم ہجا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

———"ص"

(باقی) ———

چیونٹیوں کی سوجھ بوجھ

رمیش کو حیرت ہو رہی تھی کہ اُس کی بڑی بہن آشا چیونٹیوں کی اس فوج کو اس قدر غور سے کیوں دیکھ رہی ہے۔ اُس نے پوچھ ہی لیا ــــ "بہن! تم کیا دیکھ رہی ہو؟"

بہن نے جواب دیا ــ "دیکھو رمیش! چیونٹیاں کس تیزی سے اپنے بلوں کی طرف کھانے کا سامان لے جا رہی ہیں۔ اور دیکھو! کچھ چیونٹیاں چلتے چلتے مُنھ سے مُنھ ملاتی ہیں گویا وہ ایک دوسری سے کچھ کہہ رہی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں وہ کوئی ضروری بات کہہ رہی ہیں۔"

"ضروری بات کیا ہو سکتی ہے بہن؟" ــــ رمیش نے پوچھا!

آشا نے کہا ــ "میرے خیال میں چیونٹی کے بچّے نے اپنی ماں سے پوچھا ہے کہ آپ کھانا جمع کرنے کے لیے اتنی محنت کیوں کر رہی ہیں؟"

رمیش ــ "چیونٹی نے کیا جواب دیا ہوگا؟"

آشا ــ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچے سے چیونٹی کہہ رہی ہے کہ ہر عقل مند کو چاہیے کہ وہ کچھ نہ کچھ بچا کر رکھے۔ آڑے وقت پر یہی اندوختہ کام آتا ہے۔"

رمیش ــ "بات تو سچّی ہے۔ چیونٹی کی اس بات سے تو ہمیں بھی یہی سبق لینا چاہیے۔ انسان بھی تھوڑا تھوڑا بچا کر زیادہ آرام اور سُکھ کی اُمید کر سکتا ہے۔"

پیداوار بڑھائیے اور بچائیے
بچت کا پیسہ تعمیری کاموں میں لگائیے

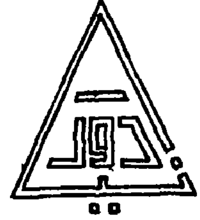
بچت اسکیم کے لیے ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ براہ کرم ضلع آرگنائزر سے رجوع کریں

چھوٹی بچت تنظیم کی جانب سے سوچنا و بھاگ لکھنؤ نے شایع کیا



ولولۂ خدمتِ وطن سے سرشار ہوکر تقریباً ۸۰ برس کی ایک ضعیفہ، جوانوں کے لیے سوئٹر بُن رہی ہیں





جلد ۱۷ | نمبر ۱

پوش ۱۸۸۴
جنوری سنہ ۱۹۶۳ء

چندہ سالانہ : پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
امیہ بھوشن ملک
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ ہارلج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُتر پردیش

عنوانات

اپنی بات

ہندوستان اور چین کے مشرقی اور مغربی دونوں مورچوں پر کچھ عرصے سے خاموشی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چینیوں نے اپنے ایک اعلان کے مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۶۲ء سے جنگ بند کر رکھی ہے اور اپنی فوجیں بھی کچھ پیچھے ہٹالی ہیں۔ بہ ظاہر چینیوں کا یہ اقدام بڑا مصالحت پسندانہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ "دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا"۔ چینیوں نے اس سے قبل ۲۴ اکتوبر کو بھی "سمجھوتے" کی ایک تین نکاتی تجویز پیش کی تھی مگر ۲۴ اکتوبر والی تجویز ہو یا ۲۱ نومبر والا جنگ بندی کا اعلان، دونوں چین کی چالیں ہیں اور ہندوستان اب کسی "دوست" کا "فریب" کھانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جہاں تک ۲۴ اکتوبر والی چینی تجویز کا تعلق ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ چین نے مغربی مورچے پر ہندوستان کے جس ۱۴ ہزار مربع میل علاقے پر قبضہ کر رکھا ہے (اور جس میں دو ہزار مربع میل کا وہ علاقہ بھی شامل ہے جس پر ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء کے بعد قبضہ کر لیا گیا ہے) اس کے بارے میں ہمارا ملک کوئی مطالبہ نہ کرے بلکہ الٹے اپنی فوجیں مزید ۲۰ کیلو میٹر پیچھے ہٹالے۔ جہاں تک مشرقی منطقے کا تعلق ہے چین کی اس تجویز کا یہ مطلب ہے کہ ہندوستان ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء کے خط کے مطالبے سے دست بردار ہو کر چین کو اس کا اختیار دے دے کہ وہ جس خط کو بھی چاہے میک موہن لائن کہہ دے۔ چین کی اس تجویز کے یہی معنی ہیں کہ اس منطقے میں ہندوستان اپنے بعض اہم ترین درے چین کے سپرد کر دے۔ اسی لئے وزیر اعظم نہرو نے اس تجویز کے سلسلے میں ۱۴ نومبر کو وزیر اعظم چین کو جو جواب بھیجا تھا اس میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ "چینی تجویز کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ چین نے نیا حملہ کر کے جس علاقے پر قبضہ کر لیا ہے اس پر تو وہ بدستور قابض رہے گا، البتہ بقیہ کے لئے وہ گفت و شنید کرنے کے لئے تیار ہے"۔ اب جہاں تک ۲۱ نومبر کی جنگ بندی کا اعلان ہے سو اس میں بھی چین نے اسی مکر و فریب، دغا اور چال سے کام لیا ہے جو ابھی تک اس کا شعار رہا ہے۔ اس تجویز کو منظور کر لینے کے یہ معنی ہوں گے کہ ہندوستان ایک طرف نیفا کے کچھ علاقے سے دست بردار ہو جائے اور دوسری طرف لداخ میں اپنی تقریباً تمام اہم چوکیاں، چین کے سپرد کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان نے ان تجویزوں کو قطعاً ناقابل قبول ٹھہرایا ہے اور یہ مطالبہ کیا ہے کہ چین پہلے ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء کے خط تک اپنی فوجیں ہٹالے، اس کے بعد تصفیے کی بات چیت شروع کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء تک لداخ میں چپ چاپ اور وادی گلوان وغیرہ میں ہندوستان کی تقریباً چالیس فوجی چوکیاں قائم تھیں۔ اب اگر چین کی اس تجویز کو منظور کر لیا جاتا ہے کہ ۷ نومبر ۱۹۵۹ء کے خط تک چینی فوجوں کا واپس جانا کافی سمجھا جائے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ ساری چوکیاں چین کو نذرانے کے طور پر پیش کر دی جائیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی آزاد، خود مختار اور خوددار ملک یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک بھی چین کی ان تجویزوں کی لغویت محسوس کرتے ہیں اور سمجھ گئے ہیں کہ چین نے یہ پُر فریب تجویزیں پیش کر کے ہندوستان کو دھوکہ دینے کی اور دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی کوشش کی ہے۔ عام ہندوستانیوں کو بھی یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر آج کل سرحد پر خاموشی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ لڑائی ختم ہوگئی ہے۔ ہندوستان اس وقت تک برسرِ پیکار رہے گا جب تک اس کی سرزمین سے چینیوں کے ناپاک وجود کو ختم نہ کر دیا جائے۔ ہندوستان کے سامنے اس وقت سب سے بڑا سوال یہی ہے۔ مسرت کی بات ہے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے آج سارا ہندوستان متحد ہے۔ ہمارے جوانوں نے پندرہ ہزار فٹ کی بلندیوں پر انتہائی شدید سردی میں دادِ شجاعت دی ہے اور مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ ہمارے شہریوں نے نہایت فراخدلی اور جوش و خروش کے ساتھ دفاعی فنڈ میں چندہ دیا ہے اور ملکی دفاع کے لئے بھی اپنی خدمات پیش کئے ہیں۔ لیکن ہمارا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ بہ قول وزیر اعظم نہرو کے، ہو سکتا ہے کہ یہ لڑائی مہینوں اور برسوں تک چلے۔ اس لئے ہم کو کسی وقت بھی غفلت اور سہل پسندی سے کام نہ لینا چاہئے۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ لڑائی صرف میدان جنگ ہی میں نہیں لڑی جاتی بلکہ کھیتوں، کارخانوں، دفتروں اور گھروں میں بھی اس کے لئے تیاری کی جاتی ہے۔ ہمارے سپاہی ہماری سرحد کے مورچوں پر دشمن کا بے جگری، پامردی اور مستعدی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان سپاہیوں کو اسلحہ فراہم کرنے اور انھیں اور ان کے متعلقین کو آرام و آسائش بہم پہنچانے اور اپنے ملک کو دفاعی حیثیت سے مضبوط تر بنانے کے لئے ڈیفنس فنڈ میں فیاضی سے چندہ دیں، گولڈ بانڈ اور ڈیفنس سرٹی فیکٹ خریدیں، فوج میں بھرتی ہوں، رائفل ٹریننگ حاصل کریں، یک جہتی کے جذبے کو مستحکم تر بنائیں، نہ افواہیں پھیلائیں اور نہ افواہوں پر یقین کریں اور یہ عزم کر لیں کہ وطن کے تحفظ اور وطن کی آزادی کے لئے کوئی بھی قربانی کرنا پڑے ہم اس سے دریغ نہ کریں گے۔ یاد رکھیے کہ آپ کو ایک درندہ صفت، بدطینت اور کمینہ فطرت دشمن سے مقابلہ کرنا اور اسے اُس کی حرکتوں کا مزہ چکھانا ہے۔ اس لئے ؎

اک ایسی شان پیدا کر کہ باطل تھرتھرا اُٹھے — نظر تلوار بن جائے، نفس جھنکار ہو جائے

——— (ایڈیٹر)

کمیونسٹ چین کے ناپاک ارادے

بنارسی داس

ہندوستان اور چین کی موجودہ لڑائی بیسویں صدی کا سب سے بڑا سانحہ ہے۔ نیفا اور لداخ کے مورچوں پر لڑائی درحقیقت ہندوستان کے سر منڈھ دی گئی۔ ہندوستان نہیں چاہتا تھا کہ چین سے جنگ کرے۔ ہمارے وزیر اعظم شروع ہی سے کہتے آ رہے ہیں کہ ایشیا سے سامراجیت ختم کرنے اور اس کی اقتصادی ترقی کے لیے ہی نہیں بلکہ عالمی امن کے نقطۂ نظر سے بھی ہندوستان اور چین کی دوستی اشد ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ چین کو اقوام متحدہ میں باعزت مقام دلانے کے لیے ہم نے پوری پوری کوشش کی۔ چین کے دغابازانہ حملے کے بعد بھی ہم نے اقوام متحدہ میں چین کو جگہ دلانے کی کوشش میں کوئی کمی نہیں کی۔ اتنا ہی نہیں چین سے دوستی نبھانے کے لیے ہم نے "چینی ہندی بھائی بھائی" کا نعرہ بلند کیا اور دنیا کی سیاست میں پہلی بار پنچ شیل کے اصولوں کا احیا کیا۔

لیکن دوستی امن اور خیر سگالی کے لیے ہماری تمام کوششوں کا بدلہ چین نے دھوکہ فریب اور دغابازی سے دیا۔ ایک طرف تو دوستی کی چکنی چپڑی باتیں ہماری تھیں اور دوسری طرف ہمارے خلاف درپردہ بڑے پیمانہ پر جنگی تیاریاں۔ ہماری امن پسندی کو چین نے ہماری کمزوری سمجھا اور موقع پاکر ہماری پیٹھ میں چھرا بھونک دیا۔

ایسے دغاباز اور وحشی دشمن سے آج ہمارا پالا پڑا ہے۔ چین کی بدباطنی کا پردہ بہت کچھ فاش ہو چکا ہے اور اب ذرا بھی غلط فہمی کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ اس کی حریصانہ نظریں برہم پترِ وادی کی معدنیات اور تیل کے چشموں پر ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ سکم، بھوٹان، نیپال اور نیفا پر اقتدار جما کر دھیرے دھیرے اپنی فوجیں گنگا جمنا کی گھاٹیوں میں اتار دے۔ چین کے کیمونسٹ اپنے ملک میں خونی انقلاب کی کامیابی سے بدمست ہو کر آج ہندوستان میں بھی خون کا دریا بہانا چاہتے ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ چین کے کیمونسٹ لیڈر کیمونزم کو دوسرے ملکوں میں پھیلانے میں پختہ یقین رکھتے ہیں۔ کیمونزم کا جہاں جنم ہوا اور جہاں اس نظام کو اتنی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی وہاں کے لوگ اور ان کے لیڈر تو بقائے باہم کی بات کرتے ہیں اور دنیا کے جھگڑوں کو پرامن طور پر طے کرنے کے حامی ہیں لیکن چین جس نے روس سے کیمونزم کا سبق پڑھا ہے آج ایشیا کے تمام ملکوں میں زبردستی کیمونزم پھیلانا چاہتا ہے۔ چین کی آرٹ اور ادب کی ایسوسی ایشن کے نائب صدر شری چاؤ یانگ نے جولائی ۱۹۶۰ء میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ "جو لوگ انسانیت اور انسانی قدروں کی باتیں کرتے ہیں وہ اول درجہ کے رجعت پسند ہیں۔ جنگ ہمیشہ وحشیانہ اور غیر انسانی نہیں ہوتی، اس لیے جنگ میں عوام کو جو قربانی دینا پڑتی ہے اور فوجیوں کی جو جانیں جاتی ہیں ان کو بڑھا چڑھا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا یا انسانیت کی دہائی دینا نامناسب ہے اور ترقی پذیر عوام کے ساتھ غداری کرنا ہے۔"

جنگ کے اس نظریہ کے تحت چین نے سرحد کے جھگڑے کے بہانے ہندوستان پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہندوستان میں پہلے ہی سے بے اطمینانی ہے اور اس درمیان میں اگر چینی فوجیں بھیج کر وہاں بدامنی پیدا کر دی گئی تو ہندوستانی کیمونسٹ پارٹی کو اقتدار حاصل کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آجائے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی کیمونسٹ پارٹی نے اپنی قرارداد کے ذریعہ چین کو حملہ آور تو ضرور قرار دیا ہے لیکن پارٹی کے کئی لیڈر ایسے بھی ہیں جو چین کو دل سے حملہ آور نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ چین ایک اشتراکی ملک ہے اور وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ اشتراکیت کی توسیع اور اس کی تقویت کے لیے کر رہا ہے۔ ان کے قول کے مطابق ایسے ملک کو حملہ آور کہا ہی نہیں جا سکتا۔

چین کے یہ ارادے کس حد تک پورے ہو رہے ہیں یا ہوں گے اس کا ذکر تب تک آئے گا یہاں چین کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی صورت حال پر روشنی ڈالنا بے محل نہ ہوگا۔ ۶۵ کروڑ سے بھی زیادہ آبادی والے اس ملک میں کیمونسٹوں نے اقتصادی خوشحالی کے لیے پچھلے ۱۲-۱۳ برسوں میں بیسوں تجربے کیے۔ سب سے پہلے صنعت کاری کی آندھی آئی اور "کھیتوں سے کارخانوں کی طرف" کا نعرہ بلند کیا گیا۔ کسانوں کو زبردستی پکڑ کر کارخانوں میں بے گار کرایا جانے لگا۔ لیکن صنعتی ترقی کا ابھی پہلا دور ہی چلا تھا کہ خشک سالی اور قحط کی مصیبت آن پڑی۔ لوگ دانے دانے کو ترسنے لگے اور نہ جانے کتنے لوگ بھوکوں مر گئے۔ باہر کے ملکوں سے کروڑوں من غلہ منگانا پڑا اور چینی کسانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ کارخانوں سے پھر کھیتوں کی طرف

چل پڑیں۔ اس کے بعد کمیونسٹوں کی تحریک چلی اور بھولے بھالے محنتی اور مذہبی چینیوں کو مار مار کر کمیونسٹ بنایا جانے لگا۔

اس سلسلہ میں چینی کمیونسٹوں نے اپنے ہی لوگوں پر جو ظلم ڈھائے اس کی درد بھری کہانی شاید مستقبل قریب میں کسی چینی شہری کی ہی زبانی سننے کو ملے۔ اسی طرح کمیونسٹ حکومت نے چین کی سماجی اور تہذیبی قدروں کو بھی پامال کیا۔

مختلف قسم کے تجربات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقتصادی نظام درہم برہم ہو گیا۔ نقل و حمل اور رسل و رسائل کے ذرائع کی ترقی نہ ہو سکی۔ ملک کے صرف ایک تہائی حصہ میں ریل کی سہولتیں مہیا کی جا سکیں۔ ایک زراعتی ملک ہونے کے باوجود وہاں ان بارہ برسوں میں غلہ کی پیداوار میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ عوام کے لیے کھانا کپڑا، مکان اور بنیادی ضروریات کا بھی بندوبست نہ ہو سکا۔ وہاں آئے دن بھوک مارچ ہوا کرتے ہیں اور روٹی روزگار مانگنے والوں کو کوڑے مارے جاتے ہیں۔ ابھی اس دن جب کمیونسٹ چین کی فوجیں ہمارے فوجی محافظوں پر گولہ باری کر رہی تھیں منچوریا میں دس ہزار چینیوں نے بھوک مارچ کیا جس کے جرم میں انھیں گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ چین میں اشتراکی انقلاب تو ضرور کامیاب ہوا لیکن ان کی اقتصادی پالیسی ناکام رہی اور وہاں کے عوام میں وسیع پیمانے پر بے اطمینانی پھیل گئی۔ اس مصیبت کا سامنا کرنے کا کوئی دوسرا چارہ نہ دیکھ کر چینی کمیونسٹوں نے جنگ کا سہارا لیا تاکہ عوام کی توجہ دوسری طرف مبذول کی جا سکے۔ چینی کمیونسٹوں کے خیال میں اس پالیسی سے لگاتار بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ بھی خود بخود حل ہو جائے گا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ چینی کمیونسٹوں کی نظر میں انسان اور انسانی قدروں کی کوئی وقعت نہیں ہے وہ انسانی سمندر (HUMAN SEA) کے اصول پر یقین رکھتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ جنگ میں دشمن کو فوجوں کی کثرت سے پامال کر دو۔ خانہ جنگی کے علاوہ کوریا کی جنگ میں بھی کمیونسٹوں کی اس پالیسی کا عملی ثبوت دیکھنے میں آیا تھا جب کہ سمندر کی لہروں کی طرح چینی فوجوں نے ٹینک آرمر کی بڑھتی ہوئی فوجوں کو بے بس کر دیا تھا۔ اس پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے انسان موٹی گاجر کی طرح کٹنے کے لیے مجبور کر دیا جاتا ہے۔ پھر بھی چین کے کمیونسٹ اس پالیسی کو برا نہیں سمجھتے ہیں کیوں کہ اس سے ان کی آبادی کا مسئلہ بھی حل ہوتا جاتا ہے۔

ایسا ہے ہمارا دشمن جس کا مقابلہ آج ہم اپنی شمالی سرحدوں پر کر رہے ہیں۔

اس نے تبت میں جو کچھ کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کمیونسٹوں نے کھلم کھلا تبت کی عورتوں پر ظلم کیا اور انھیں زبردستی اٹھا کر وحشی فوجیوں کے حوالہ کر دیا۔ تبت کے ایک بہادر قبیلہ کو ختم کر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہاں چینیوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں لاکر آباد کیا جا رہا ہے تاکہ تبت کی آبادی اپنے ہی ملک میں اقلیت بن کر رہ جائے۔

کمیونسٹ چین آج ہماری آزادی کو ہڑپ کر لینا چاہتا ہے۔ ہمیں پھر سے غلام بنانا چاہتا ہے۔ اسے ناز ہے اپنی ۶۵ کروڑ آبادی پر۔ اس آبادی پر جو آج بھوکی ہے جس کی زبان پر تالے پڑے ہوئے ہیں جس کے ساتھ جانوروں جیسا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ اس نے ہماری سرحد پر "انسانی سمندر" کی پالیسی سے ہی کامیابی حاصل کی۔ ہمارے ۵۰ فوجیوں کے مقابلے میں ۵۰۰ فوجی لڑ گئے! وہی ہوا جو لور جگہ ہوا تھا۔ انسانی قوت کی بنا پر انھوں نے ہماری چند چوکیوں پر قبضہ تو ضرور کر لیا لیکن کس قیمت پر؟ جہاں ایک ہندوستانی فوجی مارا گیا وہاں چار یا پانچ چینی فوجیوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس حساب سے اب تک کی لڑائی میں اگر ہمارے چند سو فوجی کام آئے تو ان کے کئی ہزار۔

سوال یہ ہے کہ کیا کمیونسٹوں کی "انسانی سمندر" کی پالیسی ہندوستان کے خلاف بھی کارگر ہو گی اور کیا ہندوستان کی آبادی منکر خدا اور وحشی کمیونسٹوں کی غلامی کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی؟ پہلے سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کچھ کم نہیں ہے چینی کمیونسٹوں کے حکمران اگر اپنے ملک کی آبادی کو مذکورہ بالا تناسب میں ہی ہندوستانیوں سے ٹکرانا چاہیں گے تو اس دیش میں جوانوں کی کمی نہیں پڑے گی۔ دوسرے سوال کا جواب عوام کی اس غیر معمولی بیداری میں ہے جو آج ہندوستان میں ہر جگہ نظر آ رہی ہے۔ سرخ چین کے کمیونسٹ حکمرانوں کو یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ انھوں نے ہمالیہ کو چھیڑا ہے اس ہمالیہ کو جسے ہندوستانی ادب میں ہماری تمام جسمانی اور اخلاقی قوت کا سرچشمہ کہا گیا ہے۔ آج ہندوستان کے کروڑوں عوام کا ہم آواز ہو کر ہمالیہ للکار رہا ہے۔ مانا کہ ہمارا ملک ایک امن پسند ملک ہے لیکن ہم میں ایک قومی آن ہے جو ہمیں آزادی کی خاطر مر مٹنے کی تعلیم دیتی ہے۔ ہمیں جنگ کا بھی تجربہ ہے۔ ہم مہابھارت کی تخلیق کرنا جانتے ہیں۔ ہمیں ارجن کا یہ عہد بھی یاد ہے "یا تو میں فرض پورا کروں گا یا مر جاؤں گا"۔ ہزاروں سال پہلے ہم نے چین کو امن کے ذریعہ سچا راستہ دکھایا تھا اور آج ہم جنگ کے ذریعہ چین کے موجودہ حکمرانوں کو راہ راست پر لانے کے لیے کمربستہ ہو گئے ہیں۔

ریاض خیرآبادی کی شخصیت ـــــــ کچھ تاثرات

عمار حسن جونپوری

اتر پردیش میں خیرآباد، ضلع سیتاپور کا ایک مشہور اور مردم خیز قصبہ ہے۔ ریاض خیرآبادی جن کا پورا نام سید ریاض احمد تھا، اسی قصبہ کے رہنے والے اور خاندان سادات عالی تبار سے تھے۔ ان کے والد ماجد سید طفیل احمد محکمہ پولیس میں کورٹ انسپکٹر تھے۔ ریاض اپنے آبائی مکان خیرآباد میں ۱۲۷۰ھ ہجری مطابق ۱۸۵۳ء کو پیدا ہوئے اور ۲۰ جولائی ۱۹۳۴ء مطابق ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ میں انھوں نے وفات پائی اور اپنے وطن خیرآباد ہی میں دفن ہوئے۔ مرتے وقت اُنکی عمر ۸۲ ـ ۸۳ سال کی تھی۔ ریاض کے ایک اور حقیقی بھائی سید نیاز احمد تھے جو پولیس میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو کر مرے۔ ریاض بھی تھوڑے دنوں تک پولیس میں ملازم رہے مگر نوکری سے استعفیٰ دیکر باقی زندگی صحافت میں گزار دی۔

ریاض کی بچپن میں درسی عربی فارسی کی خاصی تعلیم ہوئی اور جب دس سال کے تھے اپنے والد کے ساتھ گورکھپور چلے آئے جہاں ان کے والد تعینات تھے۔ ریاض کا بچپن، جوانی اور پیرانہ سالی کا بڑا حصہ گورکھپور ہی میں گزرا۔ ریاض نے زمانہ جوانی کے ذکر کو خود اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے
بڑی حسرت سے لب پر نام گورکھپور آتا ہے

ریاض کی پہلی شادی شہر فیض آباد میں ہوئی۔ ان کی بیوی اپنے میکہ میں مقیم اور اس وقت ۱۹۶۲ء میں زندہ ہیں۔ ان سے تین لڑکے سید امتیاز احمد۔ سید سرفراز احمد اور سید ممتاز احمد بقید حیات ہیں۔ گورکھپور میں ریاض کے اتنے احباب و کرم فرما تھے کہ وہاں سے باہر بھی جب وہ گئے اور لکھنؤ میں رہے تو ایک دوسرے کو یاد کرتے تھے جس کا ذکر خود ریاض نے یوں کیا ہے ؎

ریاض احباب گورکھپور اکثر یاد کرتے ہیں
زباں پر میری اکثر ذکر گورکھپور رہتا ہے

شاعری میں ریاض منشی امیر احمد مینائی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں تھے اور خود مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ طنز، شوخی، زبان اور بیان پر قدرت، ایک مخصوص انداز سے باتوں کا ادا کرنا، بیشمار رنگ سے خمریات کا ذکر اُن کے شاعرانہ خصوصیات ہیں۔ ریاض کے یہاں عروض و قواعد کی بھی کوئی غلطی نہیں ملتی۔ عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار ان کے برادر خواجہ تاش شاعری میں تھے۔ ان لوگوں کی طرح نثر نگاری میں بھی ریاض کی خاصی شہرت تھی۔ رباعی۔ غزل۔ مخمس۔ مسدس۔ نظمیں۔ تضمین غرض یہ کہ کوئی مشہور اور مفید قسم نظم کی ایسی نہیں جس میں ان کا حصہ کافی اور دلچسپ نہ ہو۔ ریاض بہت زود گو بھی تھے اور بہت پُر گو بھی۔ عوام ہی نہیں، باکمال شعرا بھی ان کا لوہا مانتے تھے۔ ریاض کا کلام کتابی صورت میں موجود ہے۔ اُن کی شاعری پر بہت کچھ تبصرے شائع ہو چکے ہیں اور رسائل کے نمبر نکل چکے ہیں اس لئے ان کی شاعری اور شاعرانہ کمالات پر لکھنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس مضمون کا مقصد اُن کی شخصیت کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار اور اُن کی زندگی کے

بعض واقعات کے متعلق مجھے جو علم ہے اُسے معرضِ تحریر میں لانا ہے۔

یہاں یہ بھی بتادوں کہ ریاض سے میری ملاقات کب ہوئی اور اُن سے تعلقات کا سلسلہ کتنے عرصے تک رہا۔ اُنیسویں صدی کے خاتمے میں شاید دس گیارہ سال رہ گئے تھے ٹھیک سنہ یاد نہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریاض کے والد سید طفیل احمد ہمارے وطن جونپور میں کورٹ انسپکٹر تھے۔ میرے والد ماجد شیخ جواد حسین مختار بدالت تھے۔ ان سے اور سید طفیل احمد سے بہت مراسم تھے۔ اسی زمانہ میں ایک دن میرے والد نے سید طفیل احمد کی دعوت کی تھی۔ اُنھیں کے ساتھ ریاض بھی میرے گھر آئے اور شریک دعوت ہوئے۔ سب سے پہلے اسی موقع پر مجھ اور ریاض سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد کب کب کہاں کہاں اور کیسے ملاقات ہوتی رہی نہ یاد ہے نہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ البتہ اُس وقت سے ریاض کے انتقال تک وقتاً فوقتاً اُن سے برابر ملاقات ہوتی رہی۔ جب مقبول حسین وصل بلگرامی لکھنو سے اپنا ادبی رسالہ مرقع نکالتے تھے تو ریاض اکثر ان کے یہاں آکر ٹھہرتے اور مقیم ہوتے تھے اُس زمانے میں میں اپنی ملازمت سے رخصت لے کر لکھنؤ برابر آتا جاتا رہتا تھا اور جب لکھنؤ میں ہوتا تو ریاض کے ساتھ روزانہ کافی وقت بھی گذارتا تھا

ریاض مرحوم کو ریاست محمود آباد سے بطور وثیقہ چالیس روپے ماہوار اس زمانے میں ملا کرتے تھے جب للعہ برابر چار سو کے تھے اور اس کی ادائی کی صورت یہ تھی کہ سیتاپور کے سید محمد وصی صاحب مختار ریاست کے پاس خزانہ ریاست سے روپیہ ماہ بماہ آجاتا تھا اور وہ ریاض مرحوم کو برابر دیدیا کرتے تھے۔ ایک بار اس رقم کے آنے اور ادائی میں غیر معمولی دیر ہوگئی۔ ریاض مرحوم کو تکلیف ہونے لگی۔ ریاض بڑے غیور تھے۔ انھوں نے اس موقع پر شاعری سے کام لیا۔ سید محمد وصی مختار خود شاعر اور ریاض کے قدر شناس تھے۔ ریاض نے صورتِ حال کا نقشہ اس طرح کھینچ کر ان کی خدمت میں بھیج دیا اور مطلب برآری ہوگئی۔

آج مہاں ایک رندِ روزہ دار آنے کو ہے
شام آنے کو ہے میرے گھر اُدھار آنے کو ہے

اس واقعہ کو قاضی محمد وصی کے عزیز زاہد صاحب نائب ریاست نے مجھ سے خود بیان کیا کہ یہ ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ریاض کے خیال کے سامنے اس معرکۃ الآرا مشاعرہ کے شعروں کی یاد رہی ہو جس میں یہ ردیف تھی۔ "آنے کو تھی"۔ وسیم خیرآبادی اور ریاض اور دیگر شعرا نے اس عظیم الشان مشاعرے کے لئے بڑے اچھے اچھے قافیوں میں اسی ردیف سے کام لیا تھا اور مشقِ سخن نے تبدیلِ زمانہ یعنی تھا کے بجائے ہے کو ردیف کا جزو بنا کر سامنے کر دیا ہو۔ اسی ردیف میں ریاض کا بڑا مشہور شعر اور زبان کے رنگ میں ڈوبا ہوا واقف مرحوم بسوانی نے مجھے یہ سُنایا تھا ؎

توبہ لب پر دعظ سے بے اختیار آنے کو تھی
یہ تو کہیے بچ گئے فصلِ بہار آنے کو تھی

واقف مرحوم میرے بھی دوست تھے اور ریاض کے تو ساتھی تھے۔ وہ کہتے تھے ریاض اپنا یہ شعر اکثر سُنایا کرتے تھے۔ یہ بھی یہ بات کہ سب شعر کوئی بھول جائے اور پہلا شعر یاد رہے تو ریاض کی غیور طبعی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور دوسرا شعر خاص ریاض کے طرزِ نگارش کا آئینہ ہے۔

ریاض اپنے دل کی بات اور شکوہ و شکایت کے اظہار میں بڑے بے تکلف تھے۔ ریاض کی زندگی کا بڑا حصہ خصوصاً آخر دورِ حیات والیِ ریاست محمود آباد سر مہاراجہ علی محمد خان المتخلص بہ ساحر کی سرپرستی میں گزرا۔ ریاست کے نائب شیخ حبیب اللہ ریٹائرڈ کلکٹر انتظامی معاملات میں اسی قدر سخت تھے جس قدر مہاراجہ داد و دہش میں فیاض۔ ریاض کے اخبار کی آمدنی جب گرگئی اور ضعیفی اور کمزوری سے بہت بے دست وپا ہوگئے تو آئے دن خرچ سے تنگ رہا کرتے تھے۔ آخر عاجز آکر اُنھوں نے نائب صاحب کا اور اپنی مجبوریوں کا ذکر ایک طرحی غزل میں اس طرح کیا

> "چینی حملہ آوروں سے ہماری جنگ" دنوں، ہفتوں اور مہینوں کی بات نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ برسوں جاری رہے۔ اس لیے ہمیں اپنے آپ کو اس کے لیے ذہنی اور فوجی طور سے تیار کرنا ہے۔" —— جواہر لعل نہرو

کیوں ہٹائیں ہم یہ پتھر راہ سے ۔۔۔ بُت ہمیں ملوائیں گے اللہ سے
رہتی ہے لوگوں کی جیبوں پر نگاہ ۔۔۔ کام اب چلتا نہیں تنخواہ سے
نائب سرکار ہیں اب کیا کہوں ۔۔۔ بس خدا سمجھے حبیب اللہ سے
دامن سرکار کے ہوتے ہوئے ۔۔۔ شکوہ کیا ہے قسمت کوتاہ سے
ہوگی جب عیش فراواں میں کمی ۔۔۔ لیں گے بزم ساحرِ جم جاہ سے
نام کا خود ان کو آجائے گا پاس ۔۔۔ کام لیں گے ہم حبیب اللہ سے
رات آخر، وقت نازک ہے ریاضؔ ۔۔۔ لو لگی ہے شمع کی اللہ سے

ریاضؔ مرحوم کو جن لوگوں نے بہت نزدیک سے دیکھا ہے اور جن کا ساتھ رہا ہے وہ اچھی طرح جانتے اور متاثر ہیں کہ وہ بڑے خوش عقیدہ اور واقفِ مذہب مسلمان تھے۔ خمریات کے صدہا شعر کہہ ڈالے مگر شراب سے نفرت کی اور کبھی پی نہیں۔ عقیدتاً حنفی اور ضلع بارہ بنکی قصبہ دیوا شریف کے حاجی وارث علی شاہ صاحب سجادہ کے بڑے معتقد اور اُن کے طریقوں کے سچے دل سے ماننے والے تھے۔ تعصب

> "یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہندوستان کبھی بھی حملہ آوروں کے آگے سر نہیں جھکائے گا اور چینی حملے کا مقابلہ کرے گا چاہے اس کے لیے کچھ ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے اور جو بھی نتیجہ ہو۔" ـــــ جواہر لعل نہرو

بہت دور اور مردم بیزاری سے سراسر نابلد۔ نج کی صحبتوں میں بھی کسی کو ان سے کبھی آزردگی پیدا نہ ہوئی۔ ان کا مسلک ایک صوفی کا مسلک تھا۔ ہر ملت و مذہب کے انسان اُن کے دل سے دوست اور ان کی مذہبی پاکیزہ نفسی کی وجہ سے اُن کے بڑے قدرداں اور باہمہ رندانہ اشعار اور رند مزاجی ان کی پارسائی کے معترف تھے۔ حاجی وارث علی شاہ صاحب اعلی اللہ مقامہ کی شان میں اُن کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

آنکھیں کھل جائیں جو ظاہر ہو مقامِ وارثؒ ۔۔۔ کان ہو جائے جو سُن لے کوئی نامِ وارثؒ
جام کوثر کے نہ چھلکا سرِ محفل واعظ ۔۔۔ ہم قدح خوار ہیئے بیٹھے ہیں جامِ وارثؒ
صدقے میں ساقیِ کوثر کے دعا ہو یہ قبول ۔۔۔ نزع میں پیاس بجھائے مے جامِ وارثؒ

نگہ لطف کا طالب ہے ریاکار ریاضؔ
گو ریاکار ہے لیکن ہے غلامِ وارثؒ

اخلاق کی کتابوں میں اخلاق کے جو خصوصیات بتائے گئے ہیں اور اخلاق کا جو معیار مقرر کیا گیا ہے، ریاض اُس پر ہر طرح پورے اُترتے ہیں۔ مشاعرے کے لئے غزل کہی ہے۔ کسی کو پڑھنے کی ضرورت ہے دیدی، کہا کہ پھر کہہ لیں گے۔ کسی نے اپنا کوئی کام سپرد کیا، کسی سے سفارش کی فرمائش کی، اُس کو بے تامل پورا کر دیا۔ دوستوں اور اہل ضرورت کی مدد ریاض کا پوشیدہ شعار تھا۔ نیت بڑی صاف تھی۔ اپنی طرف دوسروں کی بدکرداری کو منسوب کرکے ریاض نے جو شعر طنزیہ کہا ہے اس کے بالکل برخلاف اُن کی حالت تھی۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ ریاض کا ایک بڑا مشہور شعر جو طنز کے لحاظ سے ضرب المثل ہو گیا یہ ہے:

بڑے پاک طینت بڑے صاف باطن ۔۔۔ ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

لیکن یہ حقیقت ہے کہ ریاض پاک طینت بھی تھے اور صاف باطن بھی ریاکار نہ تھے۔ وہ عادات رذیلہ کو دل سے بُرا جانتے اور بُرا مانتے تھے۔ اخلاق و مروت کے سرچشمہ تھے۔ اپنے خاص دوست ہوں یا کوئی اور جس کسی سے ملتے تھے صاف دل سے ملتے تھے۔ ایک صاحب نے ریاض کے کچھ شعروں پر بالکل بیجا اعتراض کر دئے۔ جب وہ ایک جگہ ملے تو بڑے اخلاق سے ان سے بھی ملے اور پھر وہ خود ہی بہت نادم ہو گئے۔ ان سے غائبانہ بھی کسی کی بُرائی کرتے اور کسی کے شعر کو بُرا کہتے نہیں سُنا۔ اکثر لوگ ان کے اخلاق سے متاثر ہو کر کہہ اُٹھتے تھے کہ ریاض آدمی نہیں فرشتہ ہیں۔

ریاض مرحوم کی زندگی میں مجھے معلوم نہ ہو سکا نہ میں نے ان کا عربی کا خط دیکھا مگر اُن کے مرنے پر حالات کی تلاش کے سلسلے میں یہ ایک بالکل نئی بات ریاض مرحوم کے منجھلے لڑکے سید سرفراز احمد نے ۱۵ نومبر ۱۹۶۲ء کو جب ان کی قیام گاہ ڈالی گنج لکھنؤ میں ان سے ملا تو انھوں نے بتایا کہ ریاض مرحوم عربی خط بہت اچھا لکھتے تھے اور مرنے پر پنجسورہ اور پورا قرآن اپنے ہاتھ کا لکھا چھوڑ گئے تھے جو ان کے سب سے چھوٹے لڑکے سید ممتاز احمد جب پاکستان جانے لگے تو وہاں ہدیہ کرنے کے لئے ساتھ لیتے گئے۔ وہ پاکستان میں مقیم اور کاروبار کرتے ہیں۔

ان سے بہت سے علماء اور بھی قرآن دیکھنے اور اس پر تبصرہ کرنے سے ان کی خطاطی کے فن کی جو بہ اور شخصیت کا درجہ متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ میں نے فن خطاطی نستعلیق، شکست، نسخ عربی کے استادان باکمال سے سیکھا ہے اور خطاطی پر میری مرتبہ کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ اگر مجھے ریاض مرحوم کا لکھا قرآن ایک نظر دیکھنے کو مل جاتا تو خطاطی کے فن کے اعتبار سے ان کا جو پایہ ہوتا اسے بتانے میں مدد دے سکتا۔ مگر بحسرت کہ یہ کام دوسرے خطاط اور آئندہ انکشافات کرنے والے پر چھوڑ دینے کے سوا اس جگہ چارہ نہیں۔ البتہ یہ روز اور تجربے کی بات اگر نہ لکھوں تو کوتاہی اور بہت خاص فروگذاشت ہوگی کہ قرآن لکھنے کی وہی خطاط ہمت کرتا ہے جس کو پورا قرآن سے معنے کی نسبت بھی ہو اور اس کو خود اپنے خط کے اچھے ہونے پر وثوق بھی ہو۔ ریاض مرحوم نے کب اور کس عالم میں قرآن لکھا تحقیق طلب ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اگر ریاض مرحوم نے قرآن لکھا ہے جیسا کہ معلوم ہوا اور یہ لکھا گیا تو انھیں عربی کی خطاطی پر خود وثوق رہا ہوگا اور انھوں نے عربی خط کی مشق اچھی خاصی کی ہوگی۔ اس سے ان کی خوش اعتقادی اور خوش اعتمادی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

ریاض کی زندگی اور شخصیت کا ایک مستقل باب وہ واقعہ ہے جسے کچھ تفصیل سے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ اس میں نہ ان کا قصور ہے نہ کسی اور پر الزام ہے۔ حسن و عشق کی کرشمہ سازیوں کا دل کس طرح شکار ہو سکتا ہے یہ واقعہ اس کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر ہے اور کچھ اس سے زیادہ نہیں۔

بیسویں صدی عیسوی کے اوائل دس سال کے اندر کا زمانہ ہوگا۔ ریاض کی جوانی کے دن ڈھل چکے تھے مگر عشق و محبت کی کوئی چنگاری خاکستر دل میں اب بھی دبی رہ گئی تھی۔ ریاض چند دوستوں کے ساتھ ایک شادی میں شرکت کے لئے قصبۂ دیوریا (جو اب شہر ہے) گئے۔ شادی ایک بڑے شریف گھرانے میں تھی۔ باہر محفل رقص و سرود بھی برپا تھی۔ گھر کی ایک جوان اور نہایت حسین بن بیاہی لڑکی پان اور الائچی بانٹنے زنانہ مکان سے باہر آتی جاتی تھی۔ ریاض مرحوم سے اس کی آنکھ لڑ گئی اور دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہوگئے۔ عاشق و معشوق دونوں شریف تھے اور نام لکھنا ضروری نہ تھا مگر اسی محبوبہ پر ایک قتل کا الزام عائد ہوگیا۔ مقدمہ عدالت ابتدائی سے کر ہائی کورٹ الہ آباد تک لڑا گیا اور صدہا بار محبوبہ کا نام آیا۔ اس لئے بادل ناخواستہ یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اس کا نام شیام کنور تھا۔ اختصار کی غرض سے آگے کی سطروں میں یہ نام البتہ نہ لکھا جائے گا بلکہ صرف "محبوبہ" تحریر کیا جائے گا۔ ریاض کے بچے اس کو کوٹھی والی اماں کہتے تھے۔ کوئی اور اسلامی نام بھی تھا مگر معلوم نہ ہو سکا۔

بہرحال ہوا یہ کہ دل سے مجبور ہو کر محبوبہ اپنے گھر سے نکل کر ریاض مرحوم کے یہاں چلی آئی اور ان کے حبالۂ عقد میں منسلک ہوگئی۔ کبھی گورکھپور میں رہی اور کبھی لکھنؤ میں۔ اس زمانے میں ریاض گورکھپور سے اپنا مشہور اخبار ریاض الاخبار بڑی تقطیع پر اور ایک بالشت سے کم تقطیع پر نثر میں ... کے نام سے اور نظم میں عطر فتنہ کے نام سے دو دوسرے پرچے نکالتے تھے۔ ریاض کی تحریر میں شوخی اور خاصا طنز ہوتا تھا۔ اظہار خیال میں حد درجہ بے باک اور نکتہ چینی میں طاق تھے۔ گورکھپور کے انگریز حکام سے ان کا بگاڑ ہوگیا۔ اب ریاض باہر اور زیادہ لکھنؤ رہنے لگے۔ ان کا چھاپہ خانہ اور اخبار کا دفتر اور عمال وہیں گورکھپور میں رہا کرتے تھے اور یہ محبوبہ بھی گورکھپور میں رہتی تھی۔ ریاض نے خاص لکھنؤ میں لال اسکول نامی عمارت کے پاس ایک مکان لے لیا تھا اور وہیں سے اخبار مرتب کر کے گورکھپور بھیج دیا کرتے تھے۔ مگر اس اثنا میں یہ ہوا کہ گورکھپور میں ریاض کے مطبع کے ایک منتظم کے جوان لڑکے لالتا پرشاد کو محبوبہ سے محبت ہوگئی۔ محبوبہ اس کو پسند نہ کرتی تھی مگر وہ محبوبہ کو خط لکھ کر بھیجتا اور تنگ کرتا تھا۔ ریاض کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک آدمی گورکھپور سے محبوبہ کو لکھنؤ لانے کے لئے بھیجا۔ یہ قریب سنہ ۱۹۰۸ء یا سنہ ۱۹۰۹ء کا زمانہ تھا۔ مگر ادھر محبوبہ کے بلانے کو آدمی بھیجا اور ادھر اخبار کی ضرورتوں سے خود باہر چلے گئے۔ اسی زمانہ میں قتل کا واقعہ پیش آیا۔

لالتا پرشاد نے جب یہ سنا کہ محبوبہ مستقل طور سے لکھنؤ جا رہی ہے تو اس نے آخری فیصلے کی ٹھان لی اور ایک بڑا چھرا کہئے یا خنجر لے کر آیا اور محبوبہ سے کہا کہ وہ ریاض کو چھوڑ دے اور اس کے ساتھ رہے ورنہ

وہ جان دیدے گا۔ محبوبہ نے ریاض کو چھوڑنا اور یہ بیوفائی گوارا نہ کی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے' لالتا پرشاد نے اِس پر اُسی وقت اپنے گلے پر وہی تیز چھُرا پھیر لیا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ پولیس کو خبر ہوئی۔ محبوبہ اور اس کو لے جانے کو جو آدمی آیا تھا دونوں حراست میں لے لئے گئے۔ مقدمہ چلا۔ محبوبہ اور وہ آدمی دونوں سزا یاب ہوئے۔ آدمی آگے بڑھ کر بری ہو گیا مگر محبوبہ کو کالے پانی کی سزا ہو گئی۔ ہائیکورٹ سے بھی سزا بحال رہی۔

جب تک عدالت ابتدائی میں مقدمہ چلتا رہا ریاض اِدھر اُدھر باہر رہے۔ عرصے تک سارے واقعات کا علم ہی نہ ہوا۔ جب بہت دنوں بعد اُن کو پتہ چلا تو فوراً آئے اور سب کام کاج چھوڑ کر مقدمہ کی پیروی میں معروف ہو گئے۔ تدبیر سب کی مگر تقدیر کے آگے کچھ زور نہ چل سکا۔ ہائیکورٹ میں محبوبہ کی سزا یابی نے انھیں زندہ درگور کر دیا۔

میں خود دیکھنے والا ہوں کہ اس سزا یابی کا اثر ریاض تو ریاض ان کے شناسا اور احباب پر بھی پڑا۔ ریاض نے اپنے تاثرات کے بحر بیکراں میں ڈوب کر جو غزل کہی تھی اس کا صرف یہ شعر مجھے یاد ہے ؎

موت آئے تو نہ معلوم ہو آنا اُس کا
جان جائے تو نہ معلوم ہو جانا اُس کا

محبوبہ کے بچانے کے لئے آخری کوشش اُنھوں نے یہ کی کہ رحم کی درخواست اور ایک بہت با اثر ہستی کی سفارشی تحریر لے کر وہ گورنر جنرل کے پاس شملہ گئے مگر وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ وہ گورنر جنرل بدل گئے ہیں۔ ریاض کے لئے یہ ناقابل برداشت صدمہ تھا مگر کیا کرتے۔ اُدھر شملہ میں ریاض کے احباب نے اُن کے اعزاز میں ایک مشاعرہ کا اعلان کر دیا اور اُن سے مشاعرہ میں شرکت کا اصرار کیا۔ ریاض' بادل ناخواستہ راضی ہو گئے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے سُنا کہ ریاض جس وقت مشاعرے میں غزل پڑھ رہے تھے ابر چھایا ہوا تھا اور تھوڑا تھوڑا ترشح ہو رہا تھا۔ اِدھر ریاض پر اپنی پے در پے ناکامیوں سے ابرِ غم محیط تھا۔ غزل کا یہ مطلع تو کسی طرح دل گرفتگی کے عالم میں پڑھ دیا۔

ہے پری خانہ کوئی شیشۂ دل ٹوٹ نہ جائے
سر نہ ٹکراؤں میں شملہ میں کہ سر ٹوٹ نہ جائے

دوسرا شعر محیط ابرِ غم میں پڑھتے پڑھتے سب آلام و غم سمٹ کر سامنے آ گئے اور اس طرح بار بار پڑھوایا گیا کہ وہ خود تو روتے ہی رہے' شعر کے پس منظر سے باخبر ہمدرد بھی برابر روتے رہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

ابر کہسار کے آگے نہ ہنسی ہو تیری — تار اشکوں کا کہیں دیدۂ تر ٹوٹ نہ جائے

غزل تو یہ شملہ کے مشاعرے کی آج بھی موجود ہے مگر پس منظر جاننے والے کمتر ہوں گے۔ اِس غزل کے دو چار شعر اور پیش ہیں ؎

دیکھنا ہم کو چڑھا لائی کہاں بن کے کمند — آس اک چیز ہے دنیا میں اگر ٹوٹ نہ جائے
عہد و پیماں جو ہوا ہے وہ بہت نازک ہے — دیکھنا عہد وفا فیر کے گھر ٹوٹ نہ جائے
ہاتھ میں دل کو مرے لیکے ذرا دیکھیں تو — خوب ہے آبلۂ دل بھی اگر ٹوٹ نہ جائے
قفس کہنہ تڑپنے سے نہ ٹوٹے گا کبھی — ناتواں مرغ قفس ہے کوئی پر ٹوٹ نہ جائے
تلے ملتے ہی نہیں اپنی جگہ سے اے چرخ — شب غم میں کہیں اُمید سحر ٹوٹ نہ جائے
گر نہ جائے مری آنکھوں سے مرا قطرۂ اشک — آتے آتے سر دامن یہ گہر ٹوٹ نہ جائے

مے سرخ' ابر سیہ' سبزۂ کہسار ریاض
یہ کوئی چیز نہیں تو یہ اگر ٹوٹ نہ جائے

ریاض کی زندگی کا آخری دور بڑی پریشانی اور تکلیف میں گزرا۔ ان کی غیور طبعی کچھ کھُلنے نہ دیتی تھی مگر ایک باغ و بہار انسان جو خوش فکری اور خوش طبعی کا مرقع تھا سراپا تصویر غم و آلام بن کر خاموش ہو گیا تھا۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ ریاض تصویر ماتم بن کر اپنے اسی شعر کا مصداق ہو گئے ؎

کچھ بھی ہو ریاض آنکھ میں آنسو نہیں آتے
مجھ کو تو کسی بات کا اب غم نہیں ہوتا

اسی غم نے ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ یعنی ۲۰ جولائی ۱۹۳۴ء کو ریاض کو خیرآباد میں سپرد لحد کر دیا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ محبوبہ کی رہائی' ریاض کے مرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ہوئی۔ محبوبہ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ میکے کا ناتا ٹوٹ چکا تھا لیکن وہی میکہ اور وہی دیوریا کا قصبہ اُس کے کام آیا۔ مگر مدت ہوئی محبوبہ بھی مر گئی۔

ھند

"فتنۂ شورِ قیامت میرے آب و گل میں ہے"

میں نے ذروں سے ابھارے انقلابوں کے افق
جذب میری خاک میں صدیوں کے ماتھے کا عرق

دشت و صحرا سے مرے گزرا ہے سیلِ انقلاب
میں نے دیکھے ہیں غباروں سے ابھرتے آفتاب

میں نے ساحل پر سُنی طوفان کے قدموں کی چاپ
آ گئی کھنچ کر مرے قدموں میں منزل اپنے آپ

قافلے کتنے ہوئے ساحل پہ میرے خیمہ زن
میری موجیں بن گئیں کتنے سفینوں کا وطن

پھول بن کر مسکرائی میرے چہرے کی خراش
یہ ہلالِ آسماں ہے میرے زخمِ دل کی قاش

میرے عشوے، نور و نکہت، سوز و مستی و سرور
میرے ہی نم سے تر و تازہ ہے "قوموں کا شعور"

"سُرمۂ چشمِ تمدن" ہے مرے قدموں کی دھول
کتنے رنگوں کا ہے مجموعہ مرے پیکر کا پھول

ملتوں کا رنگ، تحریک و تصور کا یہ روپ
میری پیشانی سے اتری کتنی تہذیبوں کی دھوپ

لکھنؤ کا بانکپن، دلی کی صہبا کا خمار
اپنی تہذیبی نفاست کا ہوں خود آئینہ دار

یہ عراق و مصر، شام و روم، تاتار و عدن
کتنی تہذیبوں کا سنگم ہیں مرے گنگ و جمن

میرے شہروں میں رہے ایران کے رعنا غزال
میرے آئینے میں چمکا کتنی قوموں کا جمال

چوکڑی بھرتے رہے صحرا میں "آہوئے حرم"
میرے کاشانے رہے "گہوارۂ دینِ امم"

جسم میرا، روح کی پاکیزگی کا سنگِ میل
مسجدِ جامع مری تقدیس کی شمعِ جمیل

قلعۂ دہلی جبینِ ناز کی میرے شکن
ہے حریفِ "ہیکل و اہرام" میرا بانکپن

خندہ زن میری جبینوں میں ہمالہ کا جلال
قطب مینارے کی رفعت میری پروازِ خیال

رہ گئی مرمر میں ڈھل کر پیار کی سچی امنگ
تاج کے آنچل میں جھلکا ہے مرے عارض کا رنگ

میرے کوچے میں پلا بنتِ ایلورا کا شباب
میری وادی میں کھلے نقشِ اجنتا کے گلاب

طائرِ پربستہ کو جوشِ پَر افشانی دیا
عزمِ ٹیپو نے مری تلوار میں پانی دیا

میری ہمت سے رگوں میں گردشِ خوں تیز تیز
میں ہمایوں اور بابر کا مذاقِ جست و خیز

سطوتِ تیمور کے فانوس میں میرے چراغ
ہو کے روشن دے گئے مجھ کو اجالے کا سراغ

ہو گئی پیوست سینوں میں مرے خنجر کی نوک
سورما میرے وطن کے کتنے اکبر اور اشوک

دب کے میرے ہاتھ میں کڑکی ہے ارجن کی کماں
چومتا ہے میرے دامن کو شکوہِ خسرواں

تیوروں میں ہے مرے جھانسی کی رانی کا غرور
میری جرأت نے کیے ہیں آگ کے دریا عبور

میری انگڑائی تھا بھارت کا طوفانِ عظیم
میرے بازو کو ملی ہے قوتِ بازوئے بھیم

ستان

نی

کر سکا مرعوب کب مجھ کو شکوہِ تخت و تاج
لکشمی بائی کا استقلال ہے میرا مزاج

میری دھرتی پر ہوا کرشن اور گوتم کا نزول
میرے گلزاروں میں مہکے گیان اور بھگتی کے پھول

میرا ہر نغمہ رجز، ہر سانس اِک بانگِ رحیل
میرا سینہ قلعۂ چتوڑ کی سنگیں فصیل

اپنی غرقابی کا ساحل سے فسانہ کہہ گئے
میرے طوفانوں میں یورپ کے سفینے بہہ گئے

میری اس زرخیز مٹی سے اُگے شعلوں کے کھیت
پی گئی امواجِ مغرب کو مرے ساحل کی ریت

آبروئے مشرق کی ہوں میں، ایشیا کا دل ہوں میں
دیکھ مجھ کو، شعلۂ فانوسِ مستقبل ہوں میں

اس قدر ناواقفیت جنگ کے آئین سے
میری غیرت کو یہ للکارا ہے کس نے چین سے

زہر کے بادل اُٹھے ہیں پھر برسنے کے لیے
بڑھ رہے ہیں آستیں کے سانپ ڈسنے کے لیے

سرخ شعلوں کی یہ بارش، توپ کے گولوں کی موج
خطۂ لداخ میں خونیں درندوں کی یہ فوج

منجنیقیں، رائفل، بارود، سنگینیں، خدنگ
جوہری بم، ایٹمی ہتھیار، توپیں اور تفنگ

اپنی فوجوں کو سجا کر نت نئے آلات سے
دشمنِ انسانیت بیٹھا ہے کتنی گھات سے

بڑھ رہا ہے تو مری جانب جو سینہ تان کر
اے غزالِ چین! ناوک کو مرے پہچان کر

لے کے اُٹھے ہیں مرے جاں باز عزمِ آتشیں
موم بن جائے گا تیرا یہ غرورِ آہنیں

گونج اُٹھا ہے فضاؤں میں مری ہیبت کا راگ
میرے ہاتھوں میں ہے تیرے جیٹ طیاروں کی باگ

ریت کے جیسے گھروندے ٹوٹ جائیں دفعتاً
یوں بکھر جائے گی تیرے اسلحوں کی انجمن

تیرا دم خم نرم ٹکڑا ہے کوئی اسفنج کا
تو ہے اک کم زور مہرہ جنگ کی شطرنج کا

خوب واقف ہوں ترے مکتوب کے مضمون سے
جنگ بندی کی یہ باتیں کم نہیں افیوں سے

قید ہیں ذہن و نظر، جمہور کے بازو ہیں شل
یہ تمدن ہے ترا اک غیر فطری سا عمل

تیرے کردارِ سیاست کے رُخِ تاریک سے
صبح ہے محروم تیری روشنی کی بھیک سے

مر رہا ہے اپنی موت اب تیرے طبقے کا نظام
جانتا ہوں، ہیں شکارِ کشمکش تیرے عوام

میں نے یہ مانا کہ بڑھ آیا ہے تو آسام تک
ڈوب جائے گا مگر یہ زرد سورج شام تک

غاصبانہ جارحیت کے قدم رک جائیں گے
میرے قدموں پر ترے خونیں علم جھک جائیں گے

کھینچ کر لائی ہے تجھ کو موت اوجِ کاخ میں
دفن ہونا ہے جنازے کو ترے لداخ میں

ٹھوکروں میں آج آئی ہے مرے دیوارِ چین
دھن کے روئی کی طرح رہ جائے گا کہسارِ چین

"دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے"

چین کے دھوکے اور دھمکی والی حکمتِ عملی

عشرت علی صدیقی

چین کی حکومت نے ہندستان کے خلاف اپنی شروع کی ہوئی جنگ فی الحال روک دی ہے لیکن 'گرم جنگ' کی جگہ اب 'سرد جنگ' نے لے لی ہے۔ دراصل یہ دوسری طرح کی جنگ ہے جو چین کے حکمرانوں نے پچھلے کئی سال سے شروع کر رکھی ہے۔ اس سے پہلے جب وہ ہندستان کے ساتھ دوستی کی باتیں کر رہے تھے تب بھی وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ گرم جنگ کو روکتے ہوئے انھوں نے مصالحت کی جو بنیاد تجویز کی ہے اس میں بھی ان کی یہی چال چھپی ہوئی ہے۔

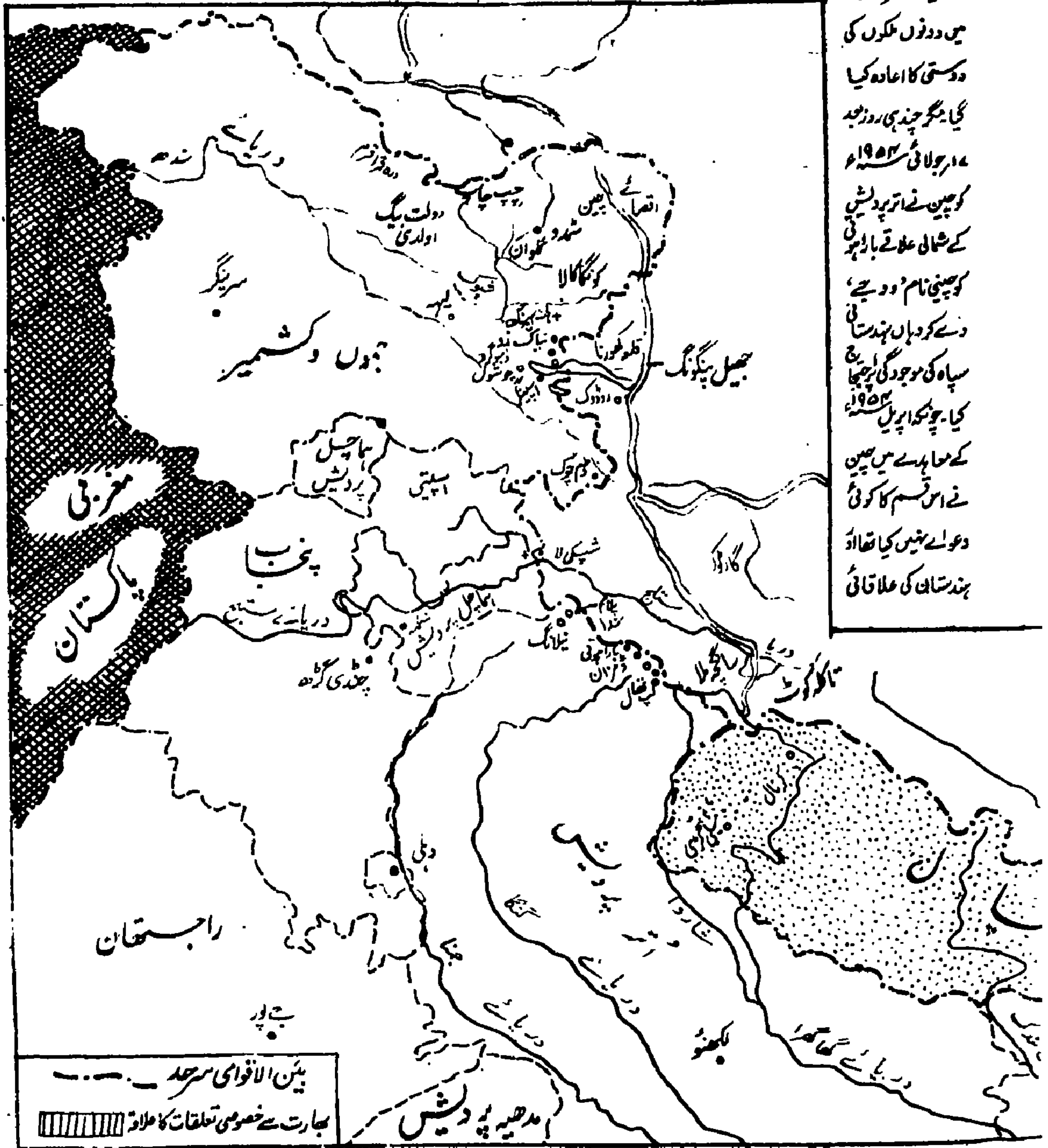
جو باتیں انھوں نے پہلے براہِ راست طور پر مان لی تھیں یا جنھیں تسلیم کرنے کا انھوں نے اپنی خاموشی کے ذریعے بالواسطہ اظہار کر دیا تھا ان سے وہ بعد میں مکر گئے اور مبہم باتوں کے ذریعے ہندستان کو دھوکا دیتے رہے جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

دوستی کی تجدید۔ ہندستان نے چین کی سابقہ حکومت کے ساتھ اپنے دوستانہ تعلقات کے باوجود چین کی کمیونسٹ حکومت کو تاخیر کے بغیر تسلیم کر لیا۔ دونوں ملکوں کی دیرینہ دوستی کی رسمی تجدید تبت اور ہندستان کے درمیان تجارت اور آمد و رفت کے متعلق ۲۹ر اپریل ۱۹۵۴ء کے چین ـ ہند معاہدے سے ہوئی جس کے تحت حکومت ہند ان مراعات سے دست بردار ہو گئی جو برطانوی راج کے زمانے میں اسے تبت میں حاصل تھیں۔ اس معاہدے میں امن کے وہ پانچ اصول درج تھے جن کو پنچ شیل کہا جاتا ہے۔ اور ان اصولوں میں منجملہ دوسری باتوں کے یہ باتیں شامل تھیں کہ معاہدہ کرنے والے ملک ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت کا احترام کریں گے اور ایک دوسرے پر حملہ نہیں کریں گے، نہ ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت کریں گے۔

بار بار ہوتی کا مطالبہ۔ اس معاہدے کی توثیق ۳ر جون کو ہو گئی اور اسی مہینے



میں چینی وزیر اعظم ہندستان آئے جہاں ان کے اور ہندستانی وزیر اعظم کے ایک مشترکہ اعلامیہ میں دونوں ملکوں کی دوستی کا اعادہ کیا گیا مگر چند ہی روز بعد ۱۷ جولائی ۱۹۵۴ء کو چین نے اتر پردیش کے شمالی علاقے باڑہوتی کو چینی نام 'وو جے' دے کر وہاں ہندستانی سپاہ کی موجودگی پر احتجاج کیا۔ چونکہ اپریل ۱۹۵۴ء کے معاہدے میں چین نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا اور ہندستان کی علاقائی سالمیت کے احترام کا وعدہ کیا تھا اس لیے حکومت ہند نے سمجھا کہ یہ احتجاج



اور دعوے کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس 'غلط فہمی' کو دور کرنے کے لیے ہندستان نے اپنی جوابی تحریر میں چینی حکومت کو یاد دلایا کہ باراہوتی اپریل ۱۹۵۴ء کے معاہدے میں درج چھ دروں میں سے ایک یعنی درہ تپتی کے جنوب میں واقع ہے اور اس طرح ہندستان میں شامل ہے۔ اسی بنا پر حکومت ہند نے چینی حکام کی اس درے کو پار کر کے باراہوتی تک آنے کی کوشش پر اعتراض کیا۔

ناقص نقشے۔ پھر جب اکتوبر ۱۹۵۴ء میں جواہر لال جی چین گئے تو انھوں نے مسٹر چو۔این لائی کو چین میں شائع ہونے والے ان نقشوں کی طرف توجہ دلائی جن میں ہندستان کی شمال مشرقی سرحدی ایجنسی (نیفا) اور لداخ کے تقریباً پچاس ہزار مربع میل کے ہندستانی علاقے کو چین میں شامل دکھایا گیا تھا۔ وزیر اعظم چو نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور کہا کہ یہ نقشے چین کی سابقہ حکومت کے زمانے کے ہیں جن پر نئی حکومت کو غور کرنے کا موقع نہیں ملا ہے اور اسی لیے ان نقشوں کو شائع کر دیا گیا ہے۔

نے برما کے ساتھ ۱۹۱۴ء والی سرحد (میک ماہن لائن) مان لی ہے اور ہندستان کے معاملہ میں بھی اس کا یہی رجحان ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں تبتی حکام سے مشورہ کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ اشارہ خاصا واضح تھا مگر بعد کو معلوم ہوا کہ چینی وزیر اعظم کی باتیں محض دکھاوے بلکہ دھوکے والی تھیں۔

چوری کی سڑک۔ چین نے ۱۹۵۷ء میں لداخ کے علاقے اقصائے چین میں چوری چھپے ایک سڑک بنانا شروع کر دی جو تبت کو سنکیانگ سے ملاتی ہے۔ اور جب اس سڑک کی خبر پا کر حکومت ہند نے اگلے سال گرمیوں میں اپنے گشتی دستے دریافت حال کے لیے بھیجے تو چینیوں نے ایک دستے کو گرفتار کر لیا۔ انھوں نے اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ لداخ کے کئی دوسرے مقامات پر بھی، جن کے دشوار گذار ہونے کی وجہ سے وہاں پہرے چوکی کا کوئی بڑا انتظام ہندستان کی طرف سے نہیں کیا گیا تھا، قبضہ کر لیا۔ یہ حرکتیں دوستی کے تقاضوں کے منافی تھیں اور جواہر لال جی نے ۱۴ر دسمبر ۱۹۵۸ء

> "چین جو کچھ کر رہا ہے وہ صرف بین اقوامی قانون کی خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ بین اقوامی اخلاق کے تمام اُصولوں کی خلاف ورزی ہے"
>
> ——— جواہر لعل نہرو

اگرچہ ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء میں چین نے باراہوتی اور اس کے آگے تک اپنی دراندازیاں جاری رکھیں جن پر ہندستان کی طرف سے کئی مرتبہ احتجاج بھی کیا گیا لیکن اس اثنا میں دونوں ملکوں کے تجارتی اور معاشی تعلقات بڑھتے جا رہے تھے اور کوریا نیز ہند چین (انڈوچائنا) کے مسئلوں پر دونوں کی دوستی کا عملی اظہار ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اپریل ۱۹۵۵ء کی بنڈونگ کانفرنس میں نہ صرف یہ کہ دوستی مستحکم تر ہو گئی بلکہ ہندستان نے نئے چین کو افریقہ اور ایشیا کے ملکوں سے روشناس بھی کرایا۔

سرحد کا مسئلہ نومبر ۱۹۵۶ء اور جنوری ۱۹۵۷ء میں دونوں وزرائے اعظم کی گفتگو کے دوران پھر اٹھا اور اس بات پر عام طور سے اتفاق رائے ظاہر کیا گیا کہ سرحد کے متعلق دونوں ملکوں کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں ہے، صرف بعض چھوٹے موٹے اختلافات ہیں جو دونوں کے نمائندے دوستانہ انداز میں طے کر لیں گے۔ مسٹر چو۔این لائی نے جواہر لال جی کو بتایا کہ چین

کو ایک خط کے ذریعہ چینی وزیر اعظم کو ان واقعات کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے سابقہ سمجھوتے اور گفتگو کا بھی حوالہ دیا۔ مسٹر چو۔این لائی نے ۲۳ر جنوری ۱۹۵۹ء کو اس خط کا جو جواب دیا اس نے چین کی جارحانہ اور توسیع پسندانہ پالیسی کو بے نقاب کر دیا۔ اس جواب سے ایک بہت ہی گھٹیا قسم کی سیاست سامنے آ گئی۔

معاہدے سے انحراف۔ چینی وزیر اعظم ۱۹۵۴ء والے سمجھوتے میں ہندستان کی علاقائی سالمیت کے احترام کا وعدہ کر چکے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہندستان کی سرحدوں کو جن کے متعلق حکومت ہند کا نقطۂ نظر کسی طرح ڈھکا چھپا نہیں تھا اور جن کے کم سے کم ایک حصے (مشرقی منطقے) کے متعلق ہندستان کے وزیر اعظم ۱۹۵۰ء میں غیر مبہم اعلان کر چکے تھے، تسلیم کرتے تھے۔ اس اعلان میں جو پارلیمنٹ کے سامنے کیا گیا تھا جواہر لال جی نے کہا تھا کہ "مشرقی منطقہ میں میک ماہن لائن

ہماری سرحد ہے۔ اور ہم کسی کو اس سرحد کے پار نہیں آنے دیں گے۔" مگر اس اعلان کے نو برس اور چین ہند سمجھوتے کے پانچ برس بعد اب مسٹر چو این لائی نے لکھا کہ ۱۹۵۴ء میں سرحد کا مسئلہ اس لیے نہیں اٹھایا گیا تھا کہ حالات اس مسئلے کے حل کے لیے سازگار نہیں تھے اور چین کو اس کے متعلق غور کرنے کا وقت نہیں ملا تھا۔" اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ چین کے علاقائی دعوے بعد میں گڑھے گئے یا یہ کہ وہ تبت پر اپنا قبضہ ہندستان سے تسلیم کرانے اور ہندستان کی معرفت ایشیا اور افریقہ سے روشناس ہونے کے لیے اپنے دعوے چھپا کر ہندستان کو دھوکا دے رہا تھا۔

نیا دھوکا۔ جن نقشوں کی صحت پر مسٹر چو این لائی نے ۱۹۵۶ء میں شبہ کا اظہار کیا تھا انھیں کو ۱۹۵۹ء کے شروع میں انھوں نے سو فی صدی درست قرار دے دیا اور یہ کہہ کر کہ چین اور ہندستان کی سرحد کبھی باضابطہ طور پر متعین نہیں ہوئی ہے انھوں نے تاریخی، جغرافیائی، قانونی اور روایاتی حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔ اسی کے ساتھ ہندستان کے پچاس ہزار مربع میل علاقے پر چین کا حق جتا کر انھوں نے سرحد کے متعلق بات چیت پر بھی آمادگی ظاہر کی۔

دیا جا رہا تھا۔

مارچ ۱۹۵۹ء میں ہندستان کے وزیر اعظم نے چینی وزیر اعظم کے نام اپنے خط میں سرحد سے متعلق سابقہ معاہدوں کی تفصیلات لکھیں اور جب اس طرح چین کا جھوٹ نمایاں ہو گیا تو اس کے وزیر اعظم نے ایک اور بڑا جھوٹ گڑھ لیا۔ اپنے ۸ ستمبر کے خط میں انھوں نے لکھا کہ ۱۹۵۶ء کی گفتگو کے بارے میں وزیر اعظم نہرو نے ۱۴ دسمبر ۱۹۵۸ء کے خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ واضح رہے کہ اس 'غلط فہمی' کی نشان دہی میں مسٹر چو این لائی کو نو مہینے لگ گئے! بہ ہر حال اب انھوں نے کہہ دیا کہ چین میک ماہن لائن کو بالکل تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن اس بات کی انھوں نے ابھی تک کوئی وضاحت نہیں کی ہے کہ برما کے ساتھ اپنے سرحدی سمجھوتے میں چین نے "سامراجی جارحیت سے پیدا ہونے والی" اس لائن کو کیوں تسلیم کر لیا!

افسروں کی بات چیت۔ چین اپنے اس رویہ کی صفائی نہ تو دونوں

> "ہندستان چین کے آگے کبھی بھی نہیں جھکے گا۔ . . . . . ہندوستان کی دفاعی طاقت مستحکم بنائی جا رہی ہے اور اگر چینیوں نے ہندوستان پر دوبارہ حملہ کیا تو اس کے نتائج چینیوں کے لیے اچھے نہ ہوں گے۔"
>
> ——— جواہر لعل نہرو

چینی وزیر اعظم نے اپنے اس خط میں میک ماہن لائن کے بارے میں اپنی اس گفتگو سے انکار نہیں کیا جس کا ذکر ہندستان کے وزیر اعظم نے اپنے ۱۴ دسمبر ۱۹۵۸ء کے خط میں کیا تھا اور نہ اس گفتگو کی جو تفصیل جواہر لال جی نے لکھی تھی اس کی تردید کی۔ بلکہ یہ بتاتے ہوئے کہ ایک طرف برما اور ہندستان اور دوسری طرف چین کی سرحد کا تعین کرنے والی یہ لائن "تبت کے خلاف برطانوی جارحیت کی پیداوار تھی" انھوں نے بدلے ہوئے حالات، اور ہندستان کی آزادی اور ان دونوں کی چین کے ساتھ دوستی کا ذکر کیا اور کہا کہ چین میک ماہن لائن کے بارے میں "کم و بیش حقیقت پسندانہ رویہ" اختیار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس مسئلے سے نپٹنے کے لیے اسے وقت چاہیے۔ در اصل یہ ایک نیا دھوکا تھا جو ہندستان کو

وزرائے اعظم کی اپریل ۱۹۶۰ء کی گفتگو میں پیش کر سکا اور نہ دونوں حکومتوں کے افسروں کی اس بات چیت میں جو اسی سال جون سے دسمبر تک پے کنگ، دہلی اور رنگون میں ہوئی یہ عقدہ حل ہو سکا۔ اس بات چیت میں چین کے رویہ کا ایک اور تضاد سامنے آ گیا۔ اس کے افسر کبھی تو اپنے دعووں کی تائید میں تبتی ذمہ داروں کے اقوال پیش کر کے یہ ظاہر کرتے تھے کہ تبت ایک آزاد اور خود مختار ملک تھا اور کبھی ہندستانی افسروں کی باتوں کو رد کرنے کے لیے وہ یہ بہانہ کرتے تھے کہ تبت کو خارجہ امور کے سلسلے میں کوئی بات کہنے یا کوئی پابندی قبول کرنے کا حق نہیں حاصل تھا۔ ہندستان کی طرف سے اپنے دعووں کی تائید میں تفصیلی نقشے اور ۱۸۴۲ء سے ۱۹۵۰ء تک کی مختلف دستاویزات پیش کی گئیں جبکہ چین کی طرف سے اول تو بہت کم کاغذات پیش کیے گئے اور دوسرے جو کاغذات پیش کیے گئے وہ نسبتاً حال ہی کے

تھے۔ چین کی طرف سے پیش کیے جانے والے نقشے بھی بہت چھوٹے پیمانے پر بنائے گئے تھے۔

افسروں کی بات چیت میں چین کے نمایندوں کی جو سبکی ہوئی اُسے چھپانے کے لیے چین کی حکومت نے بات چیت کی رپورٹ کو ایک سال سے زائد عرصے تک روکے رکھا جبکہ ہندستان میں یہ رپورٹ جو دسمبر ۱۹۶۰ء میں مرتب ہوئی تھی فروری ۱۹۶۱ء میں شائع کر دی گئی۔ رپورٹ کی اشاعت میں یہ تاخیر نیت کے کھوٹ کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہ کھوٹ برابر بڑھتا ہی گیا۔ افسروں کی بات چیت میں چین کی طرف سے جو نقشے پیش کیے گئے ان میں شمال مغربی منطقہ کی سرحد کو ۱۹۵۶ء والے نقشوں سے بھی آگے بڑھا دیا گیا۔ گویا، نیت کے کھوٹ کے ساتھ جھوٹی باتوں اور جارحانہ حرکتوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء کو چینی حملوں کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا جس نے ۲۰ اکتوبر کو ایک بھرپور دھاوے کی شکل اختیار کر لی۔

کامیابی میں ناکامیابی۔ چین کا یہ دھاوا جو اچانک بہت بڑی طاقت سے اور ایسے علاقے میں کیا گیا تھا جہاں چین کی طرف سے آنے والے راستے بہ نسبت ہندستان کی طرف سے جانے والے راستوں سے زیادہ آسان تھے، اس اعتبار سے کامیاب رہا کہ چینیوں نے ہندستان کی سرحد کے مشرقی اور مغربی منطقوں میں کچھ مقامات پر قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ دھاوا اس اعتبار سے ناکامیاب رہا کہ چین کو اپنی ہم نوائی کے لیے (دنیا کے دوسرے ملک تو الگ رہے) کمیونسٹ ملکوں میں بھی البانیہ کے علاوہ کوئی دوسرا ملک نہیں مل سکا۔ اس کے علاوہ چینی فوج کے ہندستانی علاقے میں بڑھ آنے کی وجہ سے اس کی رسد رسانی پہلے سے زیادہ دشوار ہو گئی اور ہندستان کے لیے جوابی حملہ کرنا نسبتاً آسان ہو گیا۔ حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندستان کو باہر سے اسلحہ بھی ملنے لگے۔ پورا ملک حملہ آور کو اپنی سرزمین سے نکالنے کے لیے ایک رائے ہو گیا۔ عالمی رائے عامہ بھی ہندستان کے ساتھ تھی اور ہے۔ ان باتوں کا اثر دیر یا سویر میدانِ جنگ پر پڑنا ناگزیر ہے اور بہ ظاہر اسی کو محسوس کر کے چین نے اپنا بڑا حملہ لگ بھگ ایک مہینے تک جاری رکھنے کے بعد اسے ایک ایسے وقت روک دیا جب وہ جیت رہا تھا۔

جنگ بندی کی تجویزیں۔ چین نے جنگ کو بند کرتے ہوئے ۲۱ نومبر کے اپنے ایک بیان میں جو تجویزیں پیش کی ہیں وہ بنیادی طور پر وہی ہیں جو اس کی طرف سے ۲۴ اکتوبر کو اور اس سے کم و بیش تین سال پہلے نومبر ۱۹۵۹ء میں پیش کی گئی تھیں اور ان تجویزوں پر ہندستان کا اعتراض بھی کم و بیش وہی ہے جس کا اظہار وہ اس سے پہلے کر چکا ہے۔

ہندستان کے وزیرِ اعظم نے چین کے علاقائی مطالبات اور سرحدی زور زبردستیوں پر اپنے ان گنت احتجاجی مراسلوں میں سے ایک میں جو ۲۶ ستمبر ۱۹۵۹ء کو لکھا گیا تھا چینی وزیرِ اعظم کو اس جھگڑے کا پس منظر اور اس میں ہندستان کے مصالحت پسندانہ رویہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے شکایت کی تھی کہ تبت میں بعض چینی حکام یہ اعلان کرتے پھر رہے ہیں کہ چینی حکومت عنقریب سکم، بھوٹان، لداخ اور شمال مشرقی سرحدی ایجنسی (نیفا) پر قبضہ کر لے گی۔ وزیرِ اعظم نہرو نے کہا تھا کہ اس قسم کی باتوں اور حرکتوں سے سرحد پر کشاکش میں اضافہ ہوتا ہے۔

اس کے جواب میں مسٹر چو این لائی نے اپنے ۷ نومبر ۱۹۵۹ء کے خط میں تجویز کیا کہ چین اور ہندستان کی فوجیں سرحد کے مشرقی منطقے میں میک ماہن لائن کے دونوں طرف بیس بیس کیلو میٹر (تقریباً ۱۲½ میل) پیچھے ہٹ جائیں اور مغربی منطقے یعنی لداخ میں بھی وہ اس خط سے جہاں تک ان کا واقعی قبضہ ہے اسی قدر پیچھے چلی جائیں۔ یہ تجویز دیکھنے میں سیدھی سادھی معلوم ہوتی تھی مگر اس کے مضمرات خاصے ٹیڑھے تھے۔ اس کے تحت چین کو ہندستان کے نیفا والے علاقے میں صرف لانگ جو خالی کرنا پڑتا اس لیے کہ اس وقت تک اس نے مشرقی منطقے میں صرف اسی جگہ ہندستان کی سرحد پار کر کے اس کے علاقے پر قبضہ کیا تھا۔ اس کے عوض ہندستان کو اس پورے منطقے میں اپنی سرحد سے ساڑھے بارہ میل پیچھے ہٹ جانا پڑتا۔ مغربی منطقے میں صورتِ حال ہندستان کے اور زیادہ ناموافق ہو جاتی۔ وہاں بھی اُسے اپنے علاقے میں اپنی فوج کو ساڑھے بارہ میل پیچھے ہٹا لینا پڑتا جبکہ چینی فوج اُسی قدر پیچھے ہٹ کر بھی ہندستان کی سرزمین پر موجود رہتی۔ اس لیے کہ کئی جگہ وہ اپنی اچانک اور چوری چھپے والی جارحانہ پیش قدمی سے ۲۰ کیلو میٹر سے زیادہ تک بڑھ آئی تھی۔

جوابی تجویز۔ ظاہر ہے کہ ہندستان اس صورتِ حال کو منظور نہیں کر سکتا

تھا۔ چنانچہ جواہر لال جی نے اپنے ۱۶ نومبر ۱۹۵۹ء کے خط میں مسٹر چو این لائی کو لکھا کہ اگر مسلح ٹکراؤ کا امکان ختم کرنا مقصود ہے تو سرحد کے مشرقی اور وسطی منطقے میں دونوں ملک اپنے گشتی دستوں کو آگے بھیجنے سے احتراز کریں۔ چینی فوج لانگ جو سے ہٹالی جائے اور ہندستان وہاں اپنی فوج نہ بھیجے۔ اور مغربی منطقے میں ہندستان اپنی فوج چین کے مطالبے والے خط تک ہٹالے اور چین اپنی فوج ہندستانی نقشوں میں دکھائی جانے والی سرحد کے پیچھے لے جائے۔ اگر چین واقعی جنگ کے امکان کو ختم کرنا اور سرحدی مسئلے کو پرامن گفت وشنید کے ذریعے طے کرنا چاہتا تو وہ اس تجویز کی بنیاد پر بات چیت شروع کر سکتا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط وکتابت کو طول دے کر جنگی تیاریوں کے لیے وقت حاصل کر رہا تھا اور اسی لیے اس نے اپنی تجویزوں کو جان بوجھ کر مبہم رکھا ان تجویزوں کی ایک یہ غرض بھی تھی کہ ہندستان کو چکمہ دے کر اس کا ایک خاصا بڑا علاقہ حاصل کر لیا جائے۔

واقعی قبضے کا خط۔ یہی چکمہ بازی چین کی ۲۴ اکتوبر والی تجویزوں میں بھی جھلکتی ہے۔ ان تین نکاتی تجویزوں میں کہا گیا تھا کہ دونوں حکومتیں سرحدی مسئلے کے پرامن گفت وشنید کے ذریعے طے کیے جانے کی بات مان لیں، اس مسئلے کے اس طرح طے ہونے سے پہلے دونوں فریق "واقعی قبضے کے خط" کا احترام کرنے پر رضامند ہو جائیں، اپنی اپنی فوجیں اس خط سے تقریباً ساڑھے بارہ میل پیچھے ہٹالے جائیں۔ اگر ہندستان یہ باتیں منظور کر لے تو چین مشرقی منطقے (نیفا) میں اپنی فوج واقعی قبضے کے خط کے پیچھے ہٹالے جائے گا اور وسطی و مغربی منطقوں میں دونوں ملک اپنی اپنی فوج کو واقعی قبضے کے خط کے پار نہ لے جانے کا وعدہ کریں۔ اس خط یا سرحد کو چین کی حکومت نے 'روایاتی قبضے کا خط' کہا ہے۔ اس تجویز کا ایک مزید جزیہ تھا کہ دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم فی الفور گفتگو شروع کر دیں۔ گفتگو پر یہ آمادگی اگرچہ بظاہر ایک طرح کی بھلمنساہٹ معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل یہ ایک جال تھا جس میں ہندستان کو دھمکا کر اور پھسلا کر پھانسنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اور یہی جال چین نے اپنے ۲۱ نومبر والے اعلان کے ذریعے پھیلایا ہے۔ خود چینی حکومت کے بیان کے مطابق یہ اعلان ۲۴ اکتوبر والی تجاویز پر مبنی ہے اور ان تجاویز کے تجزیے سے چین کی چال سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اندرونی تضاد۔ وزیر اعظم چو این لائی نے ۲۴ اکتوبر والی تجویزوں کی وضاحت کرتے ہوئے وزیر اعظم نہرو کے نام اپنے نومبر والے خط میں لکھا تھا کہ "واقعی قبضے کے خط" کی بنیاد ۷ نومبر ۱۹۵۹ء کی صورت حال ہوگی۔ اس کا مطلب صاف طور سے یہ تھا کہ چینی فوجیں جہاں تین سال پہلے تھیں وہاں سے ساڑھے بارہ میل پیچھے ہٹ جائیں گی لیکن چینی حکومت ان الفاظ سے وہ مراد نہیں لیتی جو دوسرے لوگ لیتے ہیں۔ ۷ نومبر ۱۹۵۹ء والے خط سے وہ چین کے ۱۹۶۰ء والے نقشے میں دکھائی جانے والی سرحد مراد لیتی ہے جہاں تک اس کی فوجیں حالیہ حملے کے دوران بڑھ کر آئی ہیں۔ اور اپنی خط وکتابت میں وہ اکثر متضاد باتیں کرتی رہی ہے۔ اس کے وزیر اعظم کا ۴ نومبر ۱۹۶۲ء والا خط اس طرز تحریر کا شاہکار ہے۔ انھوں نے ایک طرف نومبر ۱۹۵۹ء کے واقعی قبضے کے خط کا ذکر کیا اور دوسری طرف یہ بھی جتا دیا کہ مغربی اور وسطی منطقوں میں یہ خط وہی ہے جو پرانی روایاتی سرحد ہے۔ یہی رویہ انھوں نے ۲۱ نومبر والے اعلان اور اس کی وضاحت میں اختیار کیا ہے۔ دنیا کو دھوکا دینے کے لیے انھوں نے کہا ہے کہ چین کی فوجیں ۷ نومبر ۱۹۵۹ء والے قبضے کے خط سے ساڑھے بارہ میل پیچھے ہٹ جانے پر ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء والے خط سے بھی (جس پر ہندستان اصرار کر رہا ہے) پیچھے چلی جائیں گی لیکن اگر اس معاملے میں چین دیانت دار ہوتا تو وہ ۸ ستمبر والے خط کو تسلیم کر کے بات چیت کے لیے راستہ ہموار کر دیتا۔

مغربی منطقہ۔ ۱۹۵۹ء میں مغربی منطقے میں چین کے 'واقعی قبضے' کا کوئی باضابطہ خط نہیں تھا۔ اس نے اپنی جارحیت کے ذریعے لداخ کے سنگلاخ اور برف پوش علاقے میں بعض مورچے بنائے تھے۔ یہ اسپنگور کی جھیل، کھرناک کے قلعے اور کونگ کا کے درے پر قائم تھے اور اس کے بعد اقصائے چین میں ناجائز طور پر بنائی جانے والی سڑک کے کچھ آگے تک چین نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس زمانے کا 'واقعی قبضے کا خط' ان مقامات کو ملانے ہی سے بن سکتا ہے جبکہ موجودہ قبضے کا خط اس سے خاصا آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس بات کو الجھانے کے لیے چین 'روایاتی سرحد' کی باتیں کرتا ہے۔ مگر یہ سرحد بھی برابر بدلتی رہی ہے۔ ہندستان کے نزدیک روایاتی سرحد وہی ہے جو ایک طرف سنکیانگ اور تبت اور دوسری

مغربی منطقہ
سن کیانگ
درۂ قراقرم
دولت بیگ اولدی
سمرا
دہرا
کونگ کالا
چوشول
اسپنگور جھیل
تبت

طرف لداخ کے درمیان واقع ہے۔ اس طرح اقصائے چین کی سڑک جو چین نے ۱۹۵۷ء میں بنائی تھی ہندستان کے حدود میں اور چین ہند روایاتی سرحد کے اندر واقع ہے۔ چین نے اپنے ۱۹۵۶ء کے نقشوں میں جو روایاتی سرحد دکھائی تھی اس میں اس سڑک کو چینی حدود کے اندر شامل کر لیا گیا تھا۔ اور اب وزیر اعظم چو۔این لائی جس سرحدی خط کی باتیں کرتے ہیں وہ ۱۹۵۶ء والے نقشوں میں دکھائے جانے والے خط سے مزید مغرب کی طرف کھسکا ہوا ہے۔ چین کے ۲۰ اکتوبر کو شروع ہونے والے حملے نے اسے اور آگے بڑھا دیا ہے۔ اور چینی حکومت جب نومبر ۱۹۵۹ء والے خط کی باتیں کرتی ہے تو اس کی مراد نومبر ۱۹۶۲ء والے خط سے ہوتی ہے جو اس نے یک طرفہ جارحانہ کارروائی کے ذریعے قائم کیا ہے۔ کئی ایسے مقامات جن پر ۱۹۵۹ء میں چین کا کنٹرول یا قبضہ کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا اب اس کے قبضے میں آ گئے ہیں اور اس کی تجویزوں کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ناجائز قبضہ کو جائز اور مستقل مان لیا جائے۔

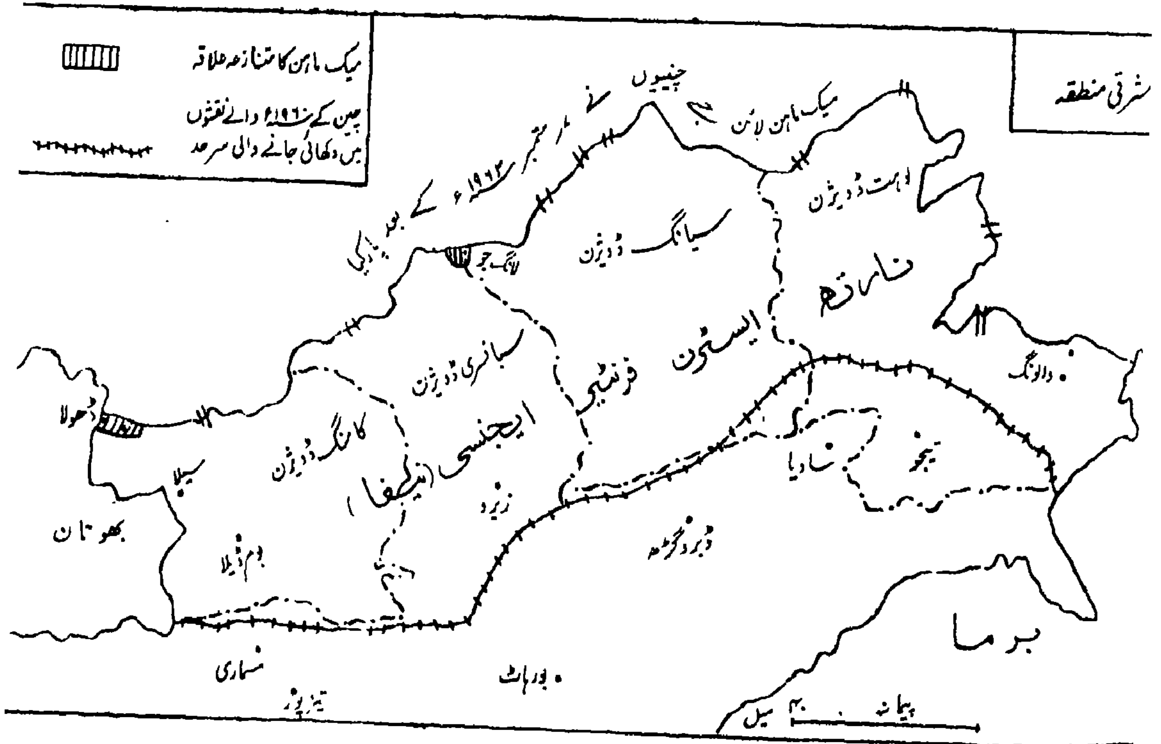
حکومت ہند نے اپنے کئی مراسلوں میں چینی حکومت کو اس طرف توجہ دلائی اور اس سے اس کی تجویزوں کی وضاحت چاہی مگر چونکہ چین کی نیت میں کھوٹ ہے اس لیے وہ اپنی باتوں کے اندرونی تضاد کو دور نہیں کر سکی ہے۔

اس اثنا میں چین کے رویہ کا ایک اور تضاد ظاہر ہوا ہے۔ اس نے بعض ایشیائی اور افریقی حکومتوں کو اپنی تجویزوں کی وضاحت کے لیے جو نقشے بھیجے ہیں ان میں مغربی منطقے کے بعض ایسے علاقوں کو بھی اپنی طرف ملا لیا ہے جن کا اس نے حکومت ہند سے کی جانے والی وضاحت میں کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

وسطی منطقہ۔ وسطی منطقے میں چین اتر پردیش کے شمالی علاقے باراہوتی پر اپنا حق جتاتا ہے اور یہاں بھی وہ 'واقعی قبضے کے خط' اور 'پرانی روایاتی سرحد' کو ہم معنی بتاتا ہے۔ اس سرحد کی بنیاد اس نے کسی سرحدی سمجھوتے یا جغرافیائی اصول پر نہیں بلکہ محض اپنی زبردستی پر رکھی ہے۔ اس منطقے میں چین نے ۷ نومبر ۱۹۵۹ء والے خط پر واپس جانے کی بات کی ہے اور اس کے بیان کے مطابق یہ خط وہی ہے جو پرانی روایاتی سرحد کا تھا۔ لیکن یہ سرحد اس کی اپنی گڑھی ہوئی ہے اور واقعات سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ باراہوتی پانی کے بہاؤ کو تقسیم کرنے والی پہاڑی ڈھلان کے جنوب میں واقع ہے اور یہی ڈھلان اصلی روایاتی سرحد ہے۔ اس کے جنوب میں چین کا کبھی قبضہ نہیں رہا۔ کچھ تبتی حکام ۱۹۵۴ء میں چینی سپاہیوں کی ایک جماعت کے ساتھ باراہوتی میں گھس آئے تھے۔ آخر ۱۹۵۸ء میں دونوں حکومتوں کے درمیان یہ طے ہو گیا تھا کہ کسی فریق کی فوج وہاں نہ رکھی جائے۔ مگر اس کا نظم و نسق

ہندستان کے زیر اقتدار رہا جس کے غیر مسلح غیر فوجی افسر وہاں کام کرتے رہے۔ چین باراہوتی کو اپنا بتانے کے لیے اس کو "وو جے" کہتا ہے۔ مگر سنہ ۱۹۵۸ء میں اس کے متعلق بات چیت کے لیے دونوں حکومتوں کے افسروں کی جو گفتگو ہوئی تھی اس میں ظاہر ہوا تھا کہ چینی حکومت کو اس علاقے کے بارے میں جس کا کہ وہ مطالبہ کر رہی تھی کوئی واضح معلومات نہیں تھے۔

مشرقی منطقہ۔ مشرقی منطقے میں چین ہندستان کی تقریباً پوری شمال مشرقی سرحدی ایجنسی (نیفا) کو دونوں ملکوں کی روایاتی سرحد کے جنوب میں بتاتا ہے۔ اس نے اپنے ۲۱ نومبر کے اعلان میں جب اس کی فوجیں نیفا کے مشرقی حصہ میں بوم ڈی لا کے نیچے تک اور مغربی حصہ میں والونگ کے نیچے تک بڑھ آئی تھیں، کہا تھا کہ "چین کے سرحدی محافظ دستے چینی علاقے میں اپنے دفاع کے لیے جوابی لڑائی لڑ رہے ہیں۔" ظاہر ہے کہ یہ بات مصالحت پسندی پر نہیں بلکہ توسیع پسندی پر مبنی تھی۔ اپنے حساب فراخ دلی دکھانے کے لیے چینی حکومت نے کہا کہ وہ اپنی فوجوں کو میک ماہن لائن کے شمال میں ہٹا لے جائے گی۔ میک ماہن لائن کو جو نیفا اور تبت کی حقیقی روایاتی سرحد ہے چین نے ہمیشہ کی طرح اس اعلان میں بھی "ناجائز" کہا ہے۔ مگر اس کی شرارت یہیں تک محدود نہیں ہے۔ اس کے تصور والی میک ماہن لائن ہندستان کے تصور اور شملہ معاہدے والی میک ماہن لائن سے چار پانچ میل شمال میں واقع ہے چین تھاگلا کی ڈھلان کو جو آبی خط فاصل ہے اپنے علاقے میں شامل بتاتا ہے۔ یہ چال وہ اس لیے چل رہا ہے تاکہ نیفا کے شمالی درے اس کے قبضے میں آجائیں۔ وہ ایک طرف شملہ کے سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء والے معاہدے کو "برطانوی سامراج کی زبردستی" پر مبنی قرار دیتا ہے اور دوسری طرف اس نے اپنی ۲۴ اکتوبر سنہ ۶۲ء والی تجویز کی وضاحت میں اس معاہدے کے



ساتھ منسلک نقشے کا حوالہ دے کر بعض سرحدی مقامات کو اپنی ملکیت بتایا تھا۔ یہ استدلال اس وجہ سے غلط تھا کہ متعلقہ نقشہ بہت چھوٹے پیمانہ پر بنایا گیا تھا اور صورت حال کو واضح کرنے کے لیے بنائے جانے والے ایک خاکے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا مقصد آبی خط فاصل کے اُصول کی وضاحت تھا۔ اور اس خاکے پر کھینچے جانے والے خط سے یہاں ہندستان کے بعض مقامات چین میں شامل دکھائے گئے تھے وہاں دوسری طرف تبت کے بعض مقامات ہندستان کا جز بنا دیے گئے تھے۔ مقامات کی جو جائے وقوع نقشے میں دکھائی گئی تھی اور جو درحقیقت زمین پر تھی اس میں بھی پوری طرح مطابقت نہیں تھی۔ اسی لیے ہندستان نے اپنی سرحد میں دکھائے جانے والے تبتی مقامات کا دعویٰ نہیں کیا مگر چین نے اپنے جارحانہ ارادوں کو آگے بڑھانے کے لیے اس نقشے کو بھی استعمال کیا' اگرچہ اس کا مطالبہ اس سے بھی زیادہ علاقے کا ہے۔

میک ماہن لائن۔ اپنے جنگ بندی کے اعلان میں چین نے میک ماہن لائن سے ساڑھے بارہ میل پیچھے چلے جانے کی بات کہی ہے۔ اگر اس کی فوجیں ۲۱ر نومبر والے اعلان کے مطابق ہٹ جاتی ہیں تو وہ ہندستان کے تصور والی میک ماہن لائن اور چین کے تصور والی میک ماہن لائن دونوں سے باہر ہو جائیں گی۔ لیکن ۲۱ر نومبر والے اعلان میں چین نے ایک اور بات یہ کہی ہے کہ وہ واقعی قبضے کے خط سے اپنی طرف والے علاقے میں غیر فوجی نگراں چوکیاں قائم کر دے گا۔ ہندستان کے استفسارات کے جواب میں چین نے جو بتایا ہے اُس سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ چین کی اس بات کا مطلب یہ ہے کہ فوجوں کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد بھی ڈھولا' کھن زمینی' لانگ جو' کبھی تو اور والونگ میں چین کی چوکیاں بنی رہیں گی۔

جیسا کہ وزیر اعظم نہرو نے چینی وزیر اعظم کے نام اپنے یکم دسمبر کے خط میں لکھا تھا ان میں سے کوئی مقام کبھی چین کے قبضے میں نہیں رہا۔ صرف لانگ جو پر اگست ۱۹۵۹ء میں چینی فوج نے وہاں تعینات ہندستانی دستے کو زبردستی ہٹا کر قبضہ کر لیا تھا مگر کچھ عرصے کے بعد چینی وہاں سے ہٹ گئے اور تب سے اس جگہ دونوں میں سے کسی ملک کا انتظامی کنٹرول نہیں ہے۔ چین کی طرف سے اس کی تجویزوں کی جو مزید وضاحت کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ صرف ڈھولا اور لانگ جو میں اپنی چوکیاں رکھنے پر اصرار کر رہا ہے۔ یہ مقامات چونکہ دروں کے قریب واقع ہیں اس لیے چین کے اس مطالبے سے ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہندستان پر اپنا فوجی دباؤ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اگرچہ وہ نیفا کا بقیہ علاقہ خالی کرنے پر تیار ہو گیا ہے لیکن اس علاقے کے متعلق اپنے مطالبے سے وہ ابھی دستبردار نہیں ہوا ہے۔

سودے بازی۔ ہندستان کے ساتھ چین کے تنازعے اور مسلح ٹکراؤ کے سلسلے کے تمام واقعات کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چین دھوکے اور دھمکی والی حکمت عملی پر چل رہا ہے۔ اس کی حکمت عملی میں ایک عنصر سودے بازی کا بھی ہے۔ اپنا بھرپور دھاوا شروع کرنے سے پہلے اس نے لداخ کے علاقے میں ہندستان کے بعض دفاعی اقدامات پر احتجاج کرتے ہوئے دھمکی دی تھی کہ وہ پوری سرحد پر اپنی فوجی گشت شروع کر دے گا اور بہت ممکن ہے کہ اس نے نیفا پر حملہ اس خیال سے شروع کیا ہو کہ اس طرح ہندستان کی توجہ اور تیاریاں لداخ کی طرف سے ہٹ جائیں گی۔ اس کے علاوہ چین کی یہ پالیسی بھی ہے کہ نیفا میں جو علاقہ اس نے اپنے اچانک دھاوے میں جیت لیا ہے اسے ہندستان کو واپس کر کے اس کی جگہ لداخ میں کچھ علاقہ حاصل کر لیا جائے۔ لیکن لداخ بھی اسی طرح ہندستان کا ہے جس طرح نیفا اور ہندستان اپنے ایک علاقے کے عوض دوسرے علاقے کو حملہ آور کے حوالے نہیں کر سکتا۔ وہ گفت و شنید کے ذریعے سمجھوتے پر پہلے کی طرح آج بھی تیار ہے مگر چین نے گفت و شنید کے لیے جو شرطیں پیش کی ہیں وہ ہندستان کو سمجھوتے کی نہیں بلکہ اعتراف شکست کی دعوت دیتی ہیں۔ جب تک چین کا یہ رویہ نہیں بدلتا اس وقت تک ہندستان اپنے علاقے کو قوت کے ذریعے دشمن سے واپس لینے کے فیصلے اور ارادے پر قائم رہے گا۔

وقت کام کا ہے
باتوں کا نہیں

سلام اے شہیدانِ نیفا سلام

ساغر نظامی

امر ہے، امر ہے تمہارا مقام ہے قائم تمہیں سے وفا کا نظام
ہے زندہ تمہیں سے شجاعت کا نام ہوئے موت سے بڑھ کے تم ہم کلام
پیا تم نے ہنس کر شہادت کا جام
سلام اے شہیدانِ نیفا سلام

جوانی کے چہرے کی طلعت تھے تم محبت کے پھولوں کی نکہت تھے تم
سراپائے مجد و شرافت تھے تم بہادر تھے، فخرِ شجاعت تھے تم
چلے گا تمہیں سے شجاعت کا نام
سلام اے شہیدانِ نیفا سلام

وہ لپٹی ہوئی برف میں چوٹیاں وہ سنگین و خاموش اونچائیاں
وہ پُرخار راہیں وہ پہنائیاں رواں سر فروشوں کا وہ کارواں
نہ خورشیدِ تازہ، نہ ماہِ تمام
سلام اے شہیدانِ نیفا سلام

ہے نیفا کی دھرتی پہ تم سے شباب لہو سے تمہارے ہے صحرا گلاب
جوانی ہے سو روپ میں بے نقاب کبھی ہے شفق اور کبھی ماہتاب
چھلک جائے جیسے مے لالہ فام
سلام اے شہیدانِ نیفا سلام

وہ حُبِّ وطن کی دلوں میں اُمنگ شہادت کا جذبہ، وفا کی ترنگ
جوانوں کی لاشیں، وہ میدانِ جنگ کفن، برف کی چادرِ آب رنگ
وہ چاروں طرف وحشی زرد فام
سلام اے شہیدانِ نیفا سلام

تمہاری سمادھی پہ آ کے بہار کرے گی گلوں کی جوانی نثار
لٹائیں گی کرنیں چنبیلی کا ہار جھکائے گی سر عظمتِ روزگار
ستاروں کی چادر چڑھائے گی شام
سلام اے شہیدانِ نیفا سلام

تم اپنے وطن پر فدا ہو گئے تم اپنے چمن پر فنا ہو گئے
جہاں میں شہیدِ وفا ہو گئے مٹے اس طرح، رہ نما ہو گئے
قدم چومتی ہے بقائے دوام
سلام اے شہیدانِ نیفا سلام

تمہارے لہو سے جو ہے گلستاں نہ آئے گی اس گلستاں میں خزاں
ابد تک رہے گا تمہارا نشاں امر ہے وطن اور تم جاوداں
ابد سے بھی آگے تمہارا مقام
سلام اے شہیدانِ نیفا سلام

میر انیس حیدرآباد میں

رشید موسوی

انیسویں صدی میں ہندوستان کے ہر گوشے میں میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیوں کی بڑی دھوم تھی۔ حیدرآباد کے امرا بھی اپنی مجلسوں میں انیس و دبیر کے مرثیہ پڑھواتے لیکن ان صاحب ذوق امیروں کو صرف اس پر قناعت کیسے ہو سکتی تھی کہ وہ کسی اور سے انیس کے مرثیے سن لیں۔ چناں چہ سنہ ۱۸۷۱ء میں حیدرآباد کے مشہور شیعہ امیر نواب تہور جنگ مرحوم نے انیس کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔ اس سلسلہ میں مجد علی اشہری نے حیات انیس میں لکھا ہے کہ "یہ طلبی درحقیقت نواب سر سالار جنگ محمد تراب علی خاں بہادر مدار المہام سلطنت آصفیہ کی طرف سے تھی"۔[1] یہی بات امیر احمد علوی نے اپنی تصنیف یادگار انیس میں بغیر تحقیق کے دہرادی ہے۔[2] لیکن جہاں تک ہم کو نواب تہور جنگ مرحوم کے خاندان اور خاص طور پر ان کے فرزند نواب عنایت جنگ بہادر سے معلومات حاصل ہو چکے ہیں۔ اشہری صاحب اور علوی صاحب کا یہ بیان صحت پر مبنی نہیں ہے۔ پتہ نہیں ان کے بیان کا ماخذ کیا تھا۔

واقعات یہ ہیں کہ تہور جنگ مرحوم کی ڈیوڑھی میں التزام کے ساتھ مجلسیں ہوتی تھیں۔ ان مجلسوں میں لکھنؤ کے ایک مرثیہ نگار شاعر زکی بلگرامی مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ زکی جب ایک مرتبہ لکھنؤ گئے اور ایک عرصہ تک نہیں لوٹے اور ان کی کچھ خبر بھی نہیں ملی تو نواب تہور جنگ کو فکر ہوئی کہ لکھنؤ سے کسی اور شاعر کو مرثیہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا جائے۔ ان کے کچھ دوستوں نے مشورہ دیا کہ سر برآوردہ مرثیہ گویاں میر انیس کو مدعو کرنا چاہیے تاکہ حیدرآباد کے عوام و خواص کو میر انیس کے مجلس پڑھنے اور انھیں سننے کی جو دیرینہ خواہش ہے وہ بھی پوری ہو جائے۔ اس مشورہ کو تہور جنگ نے بھی پسند کیا اور انیس کو بلوانے کا تہیہ کر لیا۔ انیس سے ان کا تعارف اور مراسلت نہ ہونے کے سبب انھوں نے یہ سوچا کہ حیدرآباد میں جو حضرات لکھنؤ سے آ کے بس گئے ہیں ان میں سے کسی سے اس بارے میں مشورہ کریں۔ اس زمانے میں شمس العلما شریف الحسن صاحب جن کا وطن لکھنؤ تھا حیدرآباد میں ناظم عدالت کی خدمت پر مامور تھے۔ تہور جنگ کو معلوم ہوا کہ انیس سے ان کے گہرے مراسم ہیں چناں چہ انھوں نے شریف الحسن سے خواہش کی کہ انیس کو ان کی طرف سے حیدرآباد آنے کے لیے دعوت نامہ روانہ کریں۔ شریف الحسن نے انیس کو خط لکھا۔ تہور جنگ نے شریف الحسن کے علاوہ انیس کے ایک اور شناسا حامد حسین سے بھی اسی مقصد سے انیس کے نام خط لکھوایا۔ حامد حسین لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ تہور جنگ مرحوم سے ان کی ملاقات سفر حج کے دوران ہوئی تھی۔ اس طرح مختار الملک سر سالار جنگ کا انیس کے حیدرآباد آنے سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایک روایت اس سلسلہ میں قابل ذکر یہ بھی ہے کہ تہور جنگ اور مختار الملک میں آپس میں شکر رنجی تھی اس لیے مختار الملک ان کے ذریعہ انیس کو کیسے بلوا سکتے تھے۔ خود انیس کے ان چار مصرعوں سے جو ذیل میں نقل کیے جا رہے ہیں، اس بات کی توثیق ہو جاتی ہے کہ میر انیس کو نواب تہور جنگ نے حیدرآباد بلوایا تھا نہ کہ نواب سر سالار جنگ اول نے۔ ؎

حیدرآباد دکن سے لکھنؤ — فاصلہ ہے سیکڑوں فرسنگ کا
کب انیس دل‌شکستہ آتے تھے یہاں — فیض ہے یہ سب تہور جنگ کا

انیس نے تہور جنگ کی دعوت قبول کر لی اور حیدرآباد جانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ سے حیدرآباد آنے کا راستہ بلہار شاہ اور قاضی پیٹ کی طرف سے نہیں تھا کیوں کہ یہ ریلوے لائن اس وقت تک بنی نہیں تھی۔ اس لیے میر انیس بمبئی سے پونا کی راہ سے گلبرگہ پہنچے۔ گلبرگہ سے حیدرآباد تک ریلوے لائن کا سلسلہ نہیں تھا اس لیے نواب تہور جنگ نے گھوڑا گاڑی، بدرقہ اور تعلقداروں میں سے چند اور لوگوں کی کافی تعداد کو استقبال کے لیے گلبرگہ روانہ کیا۔ گلبرگہ سے انیس گھوڑا گاڑی کے ذریعہ حیدرآباد آئے۔ جب انیس کے حیدرآباد پہنچنے کی خبر ملی تو نواب تہور جنگ نے اپنے دوست احباب کی کثیر تعداد کے ساتھ دلی دروازے کے پاس جا کر ان کا استقبال کیا۔ سب سے پہلے شریف الحسن نے تہور جنگ سے انیس کا تعارف کرایا۔ وہاں سے تہور جنگ انیس کو لے کر اپنی ڈیوڑھی آئے جہاں انیس نے قیام کیا۔ یہ ڈیوڑھی

---

[1] حیات انیس ص ۳۲   [2] یادگار انیس ص ۹

حیدرآباد کے دارالمہام میر عالم کی بنائی ہوئی منڈی کے پاس قطب شاہی عہد کے دارالشفا کے قریب واقع ہے۔ مکان کے بالائی حصہ میں انیس کو ٹھہرایا گیا تھا اور اس حصہ کی خاص اہتمام سے آرائش کی گئی تھی۔ انیس ذی الحجہ کی ۲۸ یا ۲۹ تاریخ کو حیدرآباد پہنچے۔

گلبرگہ سے حیدرآباد تک گھوڑا گاڑی کا سفر کرنے اور تکان کی وجہ سے انیس کو زکام اور ہلکا سا بخار بھی آگیا تھا۔ تہور جنگ نے پریشان ہو کر ڈاکٹروں اور حکیموں سے رجوع کیا۔ کئی حکیموں اور ڈاکٹروں کے نام پر استخارہ دیکھا گیا۔ استخارہ ڈاکٹر مرزا علی کے نام نکلا جو اس زمانے کے بہترین ڈاکٹروں میں سے تھے اور نظام کے اشاث سرجن تھے۔ میر صاحب ڈاکٹر کا نام سن کر جز بز ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ انھوں نے ڈاکٹر کا علاج اس وقت تک نہیں کیا تھا۔ انیس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر اپنی دواؤں میں شراب کا جز ضرور شامل کرتے ہیں لیکن جب ان سے کہا گیا کہ ڈاکٹر کوئی دوا اس قسم کی نہیں دے گا جس میں شراب شامل ہو تو وہ راضی ہو گئے۔

مذکورہ بالا واقعہ کا تذکرہ امیر احمد علوی نے بھی کیا ہے[1] لیکن انھیں غالباً ڈاکٹر کا نام معلوم نہ ہو سکا اس لیے نہیں لکھا۔ بہرحال ڈاکٹر کی دوا سے انیس کی طبیعت سنبھل گئی اور پہلی محرم کو وہ مجلس میں آسکے اور مرثیہ سنا سکے۔ مرثیہ شروع کرنے سے قبل انھوں نے ایک رباعی پڑھی جو حسب ذیل ہے۔ ؎

اللہ اور رسول کی امداد رہے　　سر سبز یہ شہر فیض بنیاد رہے
نواب ایسا رئیس اعظم ایسے　　یا رب آباد، حیدرآباد رہے

رباعی کے بعد وہ مشہور مرثیہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

بخدا فارس میدان تہور تھا حُر

جب مرثیہ شروع کیا تو ایک سماں بندھ گیا اور چاروں طرف سے واہ واہ کا شور بلند ہوا لیکن وہ چودہ بند سے زیادہ نہ پڑھ سکے۔ کمزوری اور تکان کا اثر ابھی باقی تھا۔ اس لیے چودہ بند پڑھنے کے بعد منبر سے نیچے اتر گئے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انیس نے حیدرآباد میں پہلا مرثیہ جو پڑھا تھا اس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

دوزخ سے جب آزاد کیا حر کو خدا نے

انیس نے تہور جنگ کے یہاں محرم کے پہلے عشرہ کے پورے دس دن مجلسیں پڑھیں۔ ہر مجلس میں وہ مرثیے کے علاوہ رباعیاں بھی ضرور سناتے تھے۔ حیدرآباد کی مجلسوں کے جو تفصیلات ہم کو قریبی ماخذوں سے مل سکے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ انیس مجلس میں مقررہ وقت پر آتے تھے۔ مجلس جب بھر جاتی تو انیس اوپر سے اترتے اور مجلس میں داخل ہو کر منبر پر بیٹھ جاتے۔ انیس مجلس میں آنے سے پہلے مرثیہ کی خواندگی کی اچھی طرح سے مشق کر لیا کرتے تھے اور اپنے لباس اور کلاہ وغیرہ کو ٹھیک طور پر جمایا کرتے تھے۔ یہ عام طور پر انیس کی عادت بتائی جاتی ہے۔ ایک وقت کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ مجلس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ انیس کے آنے میں تاخیر ہوئی تو نواب تہور جنگ خود ان کو لینے کے لیے بالاخانہ پہ گئے۔ دیکھا کہ انیس اپنے لباس کو ٹھیک کر کے اپنی پیچ گوشیہ ٹوپی کو ٹھیک کرنے میں مصروف ہیں اور اسے پن سے جما رہے ہیں۔

میر انیس کے منبر کی نشست کے سلسلہ میں ایک بات قابل ذکر ہے کہ جب تک وہ حیدرآباد میں مجلسیں پڑھتے رہے ان کی یہ عادت خاص طور پر مشاہدہ کی گئی کہ وہ منبر کے دوسرے زینے پر بیٹھ کر مرثیہ پڑھتے تھے۔ مجلس بھری ہوتی اور بعض وقت وہ دور بیٹھے ہوئے لوگوں کو نظر نہیں آتے تھے تو لوگوں کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ ایک زینہ اوپر چڑھ کر بیٹھیں لیکن انیس نے اس کو پسند نہیں کیا۔

مجلس میں وہ ململ کا کرتا، پیچ گوشیہ ٹوپی اور گھیردار پاجامہ زیب تن کئے ہوئے تھے۔ مرثیہ پڑھتے وقت گھٹنوں پر سفید رومال ڈال لیتے تھے۔ انیس بلند اور کھلی آواز میں مرثیہ پڑھتے۔ مرثیہ کے درمیان میں اگر ان کا حلق سوکھ بھی جاتا تو پانی نہیں پیتے تھے۔ شہدائے کرام کی تشنگی کا بیان کرتے ہوئے وہ آداب مجلس کے خلاف سمجھتے تھے کہ پانی طلب کریں۔ جب تک حیدرآباد میں رہے انیس کی یہ عادت رہی کہ مرثیہ ختم کرنے کے بعد منبر سے اتر کر اس کے قریب ہی نیچے

[1] یادگار انیس

"جنگ بندی کو برقرار رکھنے، چینی فوجوں کے پیچھے ہٹنے اور اس کے بعد سرحدی جھگڑے کے تصفیے کے لیے پُر امن ذرائع اختیار کرنے کی موجودہ تحریکوں کا جو بھی نتیجہ نکلے لیکن یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہندوستان کو اپنی مسلح فوجوں کو ہر اعتبار سے مضبوط بنانے کی کوششوں کو پوری سرگرمی کے ساتھ جاری رکھنا ہوگا۔" ـــــ جواہر لعل نہرو

زش پر بیٹھ جاتے اور جو لوگ ان سے ملنے کے خواہش مند ہوتے ان سے ملاقات کرتے۔ ایک دن مجلس کے ختم پر وہ اسی طرح بیٹھے ہوئے لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے کہ کوتوال شہر نواب تہور جنگ کی ڈیوڑھی پہنچے اور انیس کو مختار الملک سر سالار جنگ کا پیغام پہنچایا کہ دیوان سلطنت آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ انیس نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ دوبارہ اس خواہش کو دہرایا گیا۔ دوسری مرتبہ بھی انیس چپکے رہے اور اپنی گفتگو جاری رکھی۔ تیسری مرتبہ کوتوال نے یہ سمجھ کر کہ وہ اونچا سنتے ہیں قریب آکر بلند آواز میں اپنا جملہ دہرایا۔ اس مرتبہ بھی انیس نے کوتوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور "سر درد کر رہا ہے" کہہ کر اپنی قیام گاہ کو چلے گئے۔ اس واقعہ کی اطلاع کچھ دیر بعد نواب تہور جنگ مرحوم کو ہوئی لیکن اس وقت انھوں نے انیس سے گفتگو کرنا مناسب نہیں جانا۔ رات میں کھانے پر جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو تہور جنگ نے انیس سے پوچھا کہ کوتوال کے ساتھ آپ نے بے اعتنائی کیوں برتی وہ مختار الملک دیوان ریاست کا بھیجا ہوا آپ کی خدمت میں آیا تھا۔ اس پر انیس نے کہا کہ میں آپ کا مہمان ہوں اس شخص کو چاہیے تھا کہ وہ آپ سے گفتگو کے بعد

عشق نے تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ بیان درست نہیں ہے۔

انیس کے قیام حیدرآباد میں ان کا جو عام طور پر پروگرام رہتا تھا اس کی تفصیل بھی شاید اس مقام پر بیان کر دینی بے موقع نہ ہوگی کیوں کہ یہ تفصیلات اگر اب قلم بند نہ کر دیے گئے تو یہ ممکن ہے کہ ہمارے اس قابل فخر شاعر کی زندگی کے سلسلہ میں کچھ باتیں بے کہی رہ جائیں۔ صبح کی نماز کے بعد وہ ناشتہ سے فارغ ہوتے اور نو بجے سے گیارہ بجے تک کا وقت ان لوگوں کے ساتھ گزارتے جو ان سے ملنے کے لیے وہاں آتے تھے۔ ان کا دوپہر کا کھانا گیارہ بجے ہوتا۔ کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرتے اور پھر ظہر کی نماز کے بعد التزام کے ساتھ قیلولہ کرتے۔ سہ پہر کو اٹھ کر ہاتھ منھ دھو کر ملاقاتیوں سے ملنے کے لیے تیار ہو جاتے اور ملاقاتوں کا یہ سلسلہ مغرب تک جاری رہتا۔ رات کے کھانے کے بعد کسی سے نہیں ملتے تھے۔ رات کو وہ عموماً جلد سو جایا کرتے تھے۔

میر انیس اس سال محرم کی بیس یا بائیس تاریخ تک حیدرآباد میں رہے مجلسوں کے ختم کے بعد جب وہ حیدرآباد سے جانے لگے تو اشہری کے بیان کے

"۸ ستمبر ۱۹۶۲ء سے پہلے کی حالت بحال کرنے کی ہندوستانی تجویز" سیدھی سادی اور حقیقت پسندانہ" نیز اس مستحکم اصول پر مبنی ہے کہ پُر امن غور و خوض کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہ ہونے سے قبل جارحانہ قبضہ ختم ہونا چاہیے"۔
—— جواہر لعل نہرو

ملاقات کا کوئی وقت مقرر کرتا۔ غرض انیس نے سر سالار جنگ کی شہرت و عظمت اور اقتدار کے باوجود تہور جنگ کے توسط کے بغیر مختار الملک کے یہاں جانا پسند نہیں کیا۔ چناں چہ نواب عنایت جنگ بہادر کا کہنا ہے کہ انیس جب تک حیدرآباد میں رہے مختار الملک سے ایک مرتبہ بھی ملاقات نہیں کی۔ اس سے اس بات کی مزید توثیق ہو جاتی ہے کہ نواب تہور جنگ اور مختار الملک میں صفائی نہیں تھی۔

امجد علی اشہری نے اپنی تصنیف حیات انیس میں ایک روایت بیان کی ہے: "اس مجلس کی شہرت ہونے کے بعد حیدرآباد کے سب سے زیادہ دولت مند اور سب سے اول درجہ کے امیر نواب سر آسمان جاہ بہادر نے چاہا کہ اگر میر انیس اپنی ٹوپی کی جگہ حیدرآباد کی منصبداری پگڑی رکھ کر مرثیہ پڑھیں تو میں سننا چاہتا ہوں اور پانچ ہزار روپیہ پیش کیا جائے گا۔"[1] نواب عنایت جنگ بہادر نے اس واقعہ کی بھی

مطابق نواب تہور جنگ نے انھیں تین ہزار روپیہ دیے علوی صاحب نے اشہری ہی کے الفاظ دہرا دیے ہیں لیکن جس رقم کا حوالہ دیا گیا ہے اس کے بارے میں نواب عنایت جنگ کہتے ہیں کہ وہ صحیح نہیں ہے۔ نواب تہور جنگ نے پانچ ہزار روپیے نذرانہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ آمد و رفت کا خرچ اور خلعت بھی دیا تھا۔ خلعت میں کرتے کے لیے بہترین ململ، اورنگ آباد کا ہمرو تھان کے لیے اور پانچ سو روپیے کا دوشالہ بھی تھا۔

ہم نے شمشیر اُٹھائی ہے صداقت کے لیے
امن و تہذیب و شرافت کی حفاظت کے لیے
سربکف آج ہیں ہم ہند کی عزت کے لیے

[1] حیات انیس ص ۳۳

دکھایا چینیوں نے دوستی میں مکر و فن ہم کو

شعور بریلوی

بدل کر جور و استبداد کی رسمِ کہن ہم کو
دکھانا تھی بڑھا کر عظمتِ شانِ وطن ہم کو

مٹانا تھا غریبی، مفلسی، بے روزگاری کو
بنانا تھی اک امن و آشتی کی انجمن ہم کو

ارادہ تھا کہ دنیا سے بجھا دیں جنگ کے شعلے
بنانا تھا ہر اک جنگی اکھاڑہ اک چمن ہم کو

بڑھائی دوستی حتی الوسع ہر ملک سے ہم نے
نظر ہر سمت آئی کامرانی کی کرن ہم کو

اسی بھارت نے دنیا کو پیامِ امن پہنچایا
بلا بھی ساری دنیا سے خراجِ حسنِ ظن ہم کو

ہمارے سامنے تھی آبیاری اپنے گلشن کی
سجانا تھا ہر اک شے سے گلستانِ وطن ہم کو

نہ بھایا یہ عمل، انسانیت دشمن درندوں کو
دکھایا چینیوں نے دوستی میں مکر و فن ہم کو

نہ باز آئے مگر بد بین، بد خو اپنی طینت سے
بالآخر جنگ کے میداں میں لائے نیش زن ہم کو

دغا پر ناز ہے ان کو، وفا کو فخر ہے ہم پر
ملے ہیں مکر و فن ان کو، شرافت کے چلن ہم کو

بہ کوشش ہوش سُن لیں، چین ہو یا اور کوئی ہو
ڈرا سکتا نہیں بد باطنوں کا یہ چلن ہم کو

حقیقت میں تو ہم ہیں حامیِ امن و اماں لیکن
بہ شکلِ جنگ پائے گا زمانہ تیغ زن ہم کو

ہزاروں بار طوفانی گھٹائیں ہم پہ چھائی ہیں
مٹا پائی نہ اب تک گردشِ چرخِ کہن ہم کو

ہمارے خون میں رقصاں ہے عزمِ لکشمی بائی
سکھایا جس نے، ہونا موت پر بھی خندہ زن ہم کو

ہیں حصہ دار ہم بھی بخت و ٹیپو کی شجاعت کے
ملا ہے تانتیا ٹوپے کا بھی کچھ بانکپن ہم کو

حیات و موت کی عظمت ہے یکساں اپنی نظروں میں
نہیں بھولا ہے کردارِ شہیدانِ وطن ہم کو

زمانہ جانتا ہے ہند کی تلوار کے جوہر
ہر اک تاریخ بتلاتی ہے مردِ صف شکن ہم کو

دھواں پیدا ہو پتھر کے جگر سے بات تو جب ہے
پکار اٹھے ہر اک چینی درندہ کوہ کن ہم کو

نہ بھولو اے دغا بازو! تمہارے منہ پہ خود بڑھ کر
طمانچہ اک لگانا ہے ابھی دنداں شکن ہم کو

تمہارے خون سے پیکنگ میں کھیلیں گے ہم ہولی
ہے لینا انتقامِ سرفروشانِ وطن ہم کو

کشمیر کی قدیم تاریخ

صاحب زادہ حسن شاہ

مقامی روایتوں، پرانے قصے کہانیوں اور جغرافیائی شہادتوں کے سہارے کہا جا سکتا ہے کہ آج سے لاکھوں برس پہلے کشمیر ایک وسیع جھیل تھا۔ یہ جھیل کسی زلزلے یا قدرتی حادثہ کی وجہ سے پہاڑوں سے پھوٹ کر بہہ نکلی اور آہستہ آہستہ جا بجا خشکی اُبھر آئی۔ کہیں ٹیلے بن گئے، کہیں میدان، کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی جھیلیں، چشمے اور ندی نالے بن گئے۔ ہوتے ہوتے کچھ خانہ بدوش قبیلوں نے یہاں ڈیرے آن ڈالے اور جھیلوں، چشموں اور ندی نالوں کے کنارے کنارے کھیتی باڑی شروع ہو گئی۔ قیاس ہے کہ یہ لوگ ناگا قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی بستیوں اور تیرتھوں کی دھندلی سی یادگاریں اب بھی کہیں کہیں ملتی ہیں۔ ان لوگوں کا سب سے ممتاز قومی سردار نیل ناگ تھا۔ نیل مت پران اُسی کی یاد دلاتا ہے۔ افسوس ہے کہ اُس زمانے کے تاریخی حالات معدوم ہیں۔ اب برزہامہ کے مقام پر محکمہ آثار قدیمہ ہند نے کھدائی کر کے پانچ ہزار سال پہلے کے کشمیریوں کے رہن سہن کا کچھ پتہ چلایا ہے مگر ابھی پوری کھوج نہیں ہو سکی۔

کشمیر کے تاریخی دور کا آغاز آج سے لگ بھگ ڈھائی ہزار برس پہلے ہوتا ہے۔ مقامی روایتیں اور لوک کہانیاں جیسے نیل مت پران، مذہبی ادب جیسے مہا ونش، سفرنامے اور کلہن (کلھنش) کی راج ترنگنی پرانے وقتوں کی تاریخ کے اہم ماخذ ہیں۔ راج ترنگنی قصے کہانیوں، جادو کی داستانوں، دیومالا یا علم الاساطیر اور واقعہ نگاری کا ملا جلا اپنی قسم کا پہلا سنسکرت مجموعہ ہے اور تاریخی اعتبار سے زیادہ بلند نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی چھان بین اور ناقدانہ مطالعے سے ہمیں گیارھویں صدی عیسوی تک کے زمانے کی تاریخ کشمیر کی اچھی خاصی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ بارھویں تیرھویں صدی کے حالات جونراج اور شری ور کے تکملوں سے ملتے ہیں۔ چودھویں صدی میں عروج اسلام کے بعد فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں تاریخیں لکھی گئیں۔ سنسکرت میں جونراج، شری ور، شک اور پراج بھٹ نے اکبر کے عہد تک کے حالات جمع کیے۔ فارسی تاریخوں میں وقائع کشمیر مصنفہ علامہ احمد کشمیری اور تاریخ نادری مصنفہ ملا نادری جو اولین تاریخی کارنامے تھے وہ تو استداد زمانہ کی نذر ہو چکے ہیں، البتہ ان کے حوالے بعد کی تاریخوں میں ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ تاریخ کشمیر از سید علی، سفرنامہ شرف الدین یزدی، بہارستان شاہی، تاریخ کشمیر از ملک حیدر چاڈورہ، تاریخ فرشتہ، طبقات اکبری از نظام الدین بخشی، اکبر نامہ از ابوالفضل، تزک جہانگیری، بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری، اعمال صالح از محمد صالح کمبوہ، مآثر عالمگیری، تاریخ خافی خاں، مآثر الامراء، تاریخ کشمیر موسومہ نوادر الاخبار، تاریخ کشمیر از بیربل کاچرو، تاریخ کشمیر از نرائن کول عاجز، تاریخ گوہر عالم، واقعات کشمیر از محمد اعظم دیدمری اور اُس کے تکملے، یورپین سیاحوں کے سفرنامے اور تاریخ حسن مصنفہ پیر غلام حسن کھویہامی انیسویں صدی کے آخر تک کی تاریخ کے اہم اور قابل ذکر ماخذ ہیں۔ اس کے علاوہ جموں، کشتواڑ، لداخ اور گلگت کی مقامی تاریخیں بھی فارسی اور بودھی وغیرہ میں ملتی ہیں۔

کشمیر جغرافیائی اور تمدنی لحاظ سے ایشیا کا دل ہے۔ یہاں کے تمدنی اور تاریخی ارتقا پر کئی قوموں، عالمگیر مذہبوں، تمدنوں، ادیوں اور زبانوں کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کو ہندوستان کی ثقافتی تاریخ میں ہمیشہ ایک شان امتیازی حاصل رہی ہے اور جدید ہندوستان کے ملے جلے کلچر اور انسانیت نوازی اور اتحاد و یگانگت کے سب سے رنگین نقش ہمیں اسی خطہ میں ملتے ہیں۔

بودھ دور

کشمیر قدیم کے تاریخی دور میں بودھ دھرم کا عروج و زوال ،

شیومت کا عروج اور پرانے راجاؤں کا دَور کشمیر کی تاریخ کا ایک قابل قدر باب ہے۔ علماء کی رائے ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں کشمیر تمدنی طور پر علاقہ گاندھارا ہی کا ایک حصہ تھا جو اننت ناگ (کشمیر) سے لے کر شہباز گڑھی (پشاور) تک پھیلا ہوا تھا۔ اس خطے کا صدر مقام ٹیکسلا تھا جو اُس زمانے میں علم و فن کا شہرۂ آفاق مرکز تھا۔ اس سارے علاقے میں ناگ قبیلے آباد تھے اور آریاؤں سے برسرِ پرخاش رہتے تھے۔ آریائی تفوق کے بعد ناگاؤں نے سنسکرت زبان و ادب اور دوسرے علوم و فنون میں وہ ملکہ حاصل کیا کہ آریاؤں کو بھی اُن کا لوہا ماننا پڑا۔ چنانچہ مشہور فلسفی کپل، عالم و ماہرِ لسانیات پتن جلی، پانتی اور سائنس داں ناگارجن ناگ قوم کے درخشندہ ستارے تھے جن کا نام آج بھی بڑی عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں کشمیر کے رہنے والے ہندو مذہب کے پیرو تھے لیکن اشوک کے عہد میں وہاں بودھ دھرم بڑی تیزی سے پھیلنے لگا۔

ان دنوں کشمیر میں اردولی نامی ناگ راجہ راج کرتا تھا۔ اس نے ملک میں ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اُسی زمانہ میں اشوک نے اپنے گرو موگلی پتا تسا کے مشورے پر مجھنتک نامی بودھ مبلغ کو بودھ مت کی تبلیغ کے لیے کشمیر بھیج دیا۔ مجھنتک کے پرچار سے راجہ بھڑک اٹھا لیکن عوام نے بودھ دھرم کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور جوق در جوق لوگ بودھ دھرم کے حلقہ بگوش بنتے چلے گئے۔ بالآخر کشمیر پر اشوک کا اقتدار قائم ہو گیا۔ اشوک نے سری نگر کا شہر بسایا اور کشمیر کی ساری آمدنی بودھ دھرم کے پیشواؤں کے لیے وقف کر دی۔ جابجا استوپ، وہار اور مذہبی مدرسے قائم ہو گئے اور کشمیر پر بودھ دھرم کا پرچم لہرانے لگا۔

دوسری صدی عیسوی میں کنشک نے کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور بودھ دھرم کی چوتھی مجلس یہیں منعقد کی جس میں مہایان فرقہ کی تعلیم کی تدوین کی گئی۔ اس نئی تعلیم میں ایسی ہمہ گیری اور رواداری تھی جو آج بھی کشمیریوں کا تمدنی خاصہ ہے۔

کشمیر میں بودھ مذہب کی اشاعت کے بعد یہاں سدرشن۔ اشو گھوش۔ پارشو اور وشو بندھو جیسے بودھ عالم اور فلسفی پیدا ہوئے جنھوں نے بدھ کے پیغام کو نئے فلسفیانہ انداز میں پیش کر کے چین، ترکستان اور تبت میں بودھ دھرم کے پرچار کی راہیں ہموار کر دیں۔ مہایان بودھ بت پرستی کے بڑے شائق تھے اور بدھ کی زندگی کو مجسمہ تراشی اور سنگ تراشی کی زبان میں ڈھالتے رہتے تھے۔ کشمیر میں بھی اسی وجہ سے جابجا بودھ مندر اور بدھ کی مورتیاں بننے لگیں اور گاندھارا طرزِ فن کا خوب رواج ہوا۔ آج بھی اس فنی عظمت کے نمونے پرہاسپور، پاندریٹھن، اوشکر، ممنگ پورہ اور ہارون کے مقامات پر اُس دور کی یاد دلاتے ہیں۔ اس دَور میں سنسکرت علم و ادب کی سب سے شاندار یادگار وبھاشا شاستر ہے جس کے ترجمے چینی زبان میں ملتے ہیں۔

ہون راجہ مہر کُل کی تباہ کاری سے کشمیر میں بودھ دھرم کو بڑی زک اٹھانا پڑی۔ مہر کُل شیو مت کا ماننے والا تھا اور اُسے بودھوں سے سخت بیر تھا۔ اُس نے بودھ مذہبی اور علمی مرکزوں کی بنیادیں ہلا دیں۔ رہی سہی کسر راجہ ہرش (کشمیری) نے پوری کر دی۔ شنکراچاریہ کے پرچار سے بھی بودھ دھرم کو دھکا لگا۔ حکمراں طبقہ نے بودھ دھرم کی سرپرستی چھوڑ کر شیو مت کی پناہ لی۔ خود بودھوں میں جہالت اور بدعملی نے گھر کر لیا اور اس طرح لداخ کے دور دراز علاقوں کو چھوڑ کر باقی کشمیر میں بودھ دھرم کا سورج غروب ہو گیا۔

کنشک کے آنکھیں بند کرتے ہی کشن سلطنت کی بساط اُلٹ گئی تھی اور شمالی ہند سیاسی افراتفری کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ کشمیر میں مقامی حکمراں خود مختار ہو بیٹھے تھے۔ یہ زمانہ نویں صدی سے بارھویں صدی عیسوی تک کا تھا۔ اس زمانہ میں برہمنی مذہب اور تہذیب کشمیر میں پورے شباب پر رہی۔ اس دَور کے تمدنی ورثہ میں شیو فلسفہ، سنسکرت شعر و ادب کے شاہکار اور فن تعمیر کے نادر نمونے خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن اس زمانہ میں بھی عوام کو چھوڑ کر جو شیو جی کو خدا مان کر اُن کی ان گڑھ پتھر کی مورتی کی پوجا کو منتہائے مقصد سمجھتے تھے پڑھے لکھے توحید کے قائل تھے اور اپنے آپ کو خدا کی ہستی میں فنا کر دینے کو روحانی زندگی کی معراج سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ خدا روح اور مادہ، قائم بالذات حقائق ہیں لہٰذا اعمال صالحہ، خدا پرستی اور تقویٰ و پرہیزگاری سے ہی انسان نجات یا نروان حاصل کر سکتا ہے یا تصوف کی زبان میں فنا فی اللہ کی منزل پر فائز ہوتا ہے۔ کشمیر میں شیو دھرم کا بانی واسو گپت مانا جاتا ہے جس نے سب

پہلے "شیو سوتر" بیان کیے جو کشمیر کے شیو مت اور فلسفہ کی بنیاد ہیں اس فلسفہ کا ادب تین حصوں میں منقسم ہے (۱) آگم شاستر جیسے شیو سوتر یا "مالنی وجیو تّو تنترم" جن میں شیو اور شکتی یا مرشیو کا فلسفہ درج ہے اور اس قدر پُر اسرار ہے کہ عامی اسے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ (۲) سپند شاستر جس میں اسرار کائنات کا بیان ہے اور (۳) پرتی بھگیہ شاستر جس میں معرفت اور سلوک و عبادات کا بیان ہے اور جو بڑی حد تک اسلامی تصوف کے تصورات سے ملتا جلتا ہے۔

نویں صدی عیسوی کے زمانہ میں سومانند نے شیو درشٹی میں اس فلسفہ کے نظریات کو ایک مدّون صورت میں پیش کیا۔ اس کے بعد اُتپل بھٹ نارائن اور لکشمن گپت نے شرح و تفسیر اور فلسفیانہ موشگافیوں سے اس فلسفہ کی ترویج میں شاندار حصہ لیا لیکن اس فلسفہ کا شیخ اکبر ہمیشہ مہاچاریہ ابھی نو گپت تھا جو علم و فن شعر و ادب اور مذہب و فلسفہ کا استاد بے بدل تھا۔ اُس کی تصانیف سنسکرت زبان و ادب کے شاہکار مانے جاتے ہیں۔ اُس کی شہرہ آفاق تصنیف تانترلوک بارہ جلدوں میں اس فلسفہ کی انسائیکلوپیڈیا ہے اور بذات خود ایک بے مثل کارنامہ ہے۔ اس فلسفہ کا آخری بڑا مبلغ اور مفسر جیرتھ تھا جو تیرھویں صدی میں گذرا ہے۔

سیاسی اعتبار سے گونند اور ہُون شاہی خاندانوں کا راج افراتفری کا زمانہ تھا۔ آخر کار کرکوٹ خاندان کے بانی دُرلبھ وردھن نے ایک مستحکم حکومت قائم کی۔ اس خاندان کا سب سے مشہور حکمران للتا دتیہ مکتاپیڑ ۷۲۵ء میں گدی پر بیٹھا اور ۳۷ برس بڑی شان و شوکت سے حکومت کرتا رہا۔ مقامی روایات کے مطابق اُس نے اپنی سلطنت کی حدیں پنجاب تک وسیع کر لی تھیں اور عربوں کے سیلاب کو روکنے میں اُس کا بھی ہاتھ تھا۔ کہتے ہیں اُس نے قنوج پر حملہ کر کے وہاں سے مشہور سنسکرت شاعر بھو بھوتی کو اپنے ساتھ لانے پر رضامند کر لیا اور بعد میں اُسے اپنے دربار میں ملک الشعرا مقرر کیا۔ للتا دتیہ کی عظمت کا اندازہ پری ہاسپور کے شہر اور عالی شان عمارتوں، مندروں اور وہاروں سے ہوتا ہے جو آج بھی زبان حال سے پکار رہے ہیں کہ

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

للتا دتیہ کی فتوحات اور جنگی کارناموں کی داستانیں گو مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہیں تاہم ان سے اتنا ضرور عیاں ہوتا ہے کہ وہ بڑا بہادر جرنیل اور مدبر حکمران تھا۔ اُس نے ملک کی پیداوار بڑھانے کے لیے دلدلوں کو خشک کرا کے قابل کاشت بنوایا، آب پاشی کے لیے نہریں کھدوائیں، مالیہ کی شرح میں اضافہ کر کے زمینداروں کی سرکشی کا سدّباب کیا اور رفاہ عامہ، رعایا پروری، مذہبی رواداری اور صلح و آشتی کی پالیسی اختیار کر کے زندہ جاوید شہرت حاصل کی۔ بالآخر شمالی سرحدی جنگوں میں لڑتا ہوا میدان میں کام آیا۔

للتا دتیہ کی چوتھی پشت میں جیاپیڑ ۷۶۴ء سے ۷۹۵ء تک حکمراں رہا۔ وہ بڑا ظالم اور سفاک تھا۔ اُس نے مندروں کو لوٹا، جاگیریں ضبط کیں، زمینداروں کی دولت پر ہاتھ صاف کر کے انھیں کنگال کر دیا اور سلطنت کی بنیادیں خود اپنے ہاتھوں کھوکھلی کر دیں۔ ملک میں خانہ جنگی اور گھرگھور راج کا دور دورہ ہو گیا۔ آخر ۸۵۵ء میں راجہ اونتی ورمن نے اُتپل خاندان کی بنیاد رکھی جو ۹۸۰ء تک کشمیر پر راج کرتا رہا۔

اونتی ورمن بڑا دانا اور مدبر حکمران تھا۔ ستنا کر اور آنند وردھن اُس کے دربار کے مشہور سنسکرت شاعر تھے۔ سویہ نامی انجینئر نے اس کے عہد میں دریائے جہلم کو گہرا کرنے اور دلدلیں خشک کر کے انھیں قابل کاشت بنا کر بڑا نام پایا۔ اونتی ورمن تعمیر کا بڑا شائق تھا۔ اُس نے اونتی پور کا شہر بسایا اور یہاں شیو اور وشنو کے مندر تعمیر کروائے۔ اِن مندروں کے کھنڈر آج تک موجود ہیں۔ اونتی ورمن ۸۸۳ء میں اس

> لڑائی میں ہر روز کروڑوں روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اس رقم کی فراہمی کے لئے ہمیں کھیتوں اور کارخانوں میں پوری مستعدی سے کام کرکے پیداوار بڑھانا ہے۔ اصل مورچہ تو یہی میدان عمل ہے جہاں سے ہماری فوجوں کو نئی طاقت ملتی رہے گی۔
> —— شری سی۔ بی۔ گپتا، وزیر اعلیٰ اتر پردیش



ہندوستان چیلنج قبول کرتا ہے

ہندوستان نے بے شرم چینی حکومت کا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ ہندوستان کی حکومت اور ہندوستان کے عوام، چینی جارحیت کا مقابلہ کرنے اور حملہ آوروں کو اپنے وطن سے نکالنے کے لیے کمربستہ ہوگئے ہیں

تصویر میں: ہندوستان کی نیشنل ڈیفنس کونسل کی پہلی میٹنگ جو پنڈت جواہر لعل نہرو کی زیر صدارت نئی دہلی میں ۲۵ر نومبر ۱۹۶۲ عیسوی کو منعقد ہوئی





ہندوستانی جوان "نیفا" کے علاقے میں ایک جنگی مورچے پر

ہندوستان بیدار ہو گیا ہے

ایک زخمی ہندوستانی جوان کو اسٹریچر پر لٹا کر ہیلی کاپٹر ہوائی جہاز کے ذریعے فوجی اسپتال بھیجا جا رہا ہے

ہندوستانی:

(ناڈیسنا سیوا سمتی (مہیلا)







ایک ہندوستانی جنگی ہوائی جہاز "نیفا" کے ایک علاقے میں پرواز کر رہا ہے



ت کر رہے ہیں

ہندوستان تیار ہوگیا ہے

ایک فوجی بھرتی کے دفتر کے سامنے ہندوستانی نوجوان
اپنے کو بھرتی کرانے کے لیے بیٹھے ہیں



ہ لیے سامان تیار کر رہی ہیں





ہندوستان کے نئے وزیر دفاع، شری وائی بی چوان

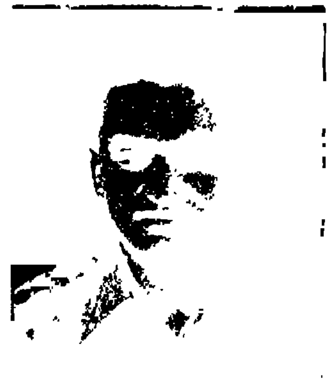


ہندوستان کی فوج کے نئے سپہ سالار لفٹنٹ جنرل جے این چودھری

"کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں"
پرم ویر چکر پانے والے دو شہیدانِ وطن

میجر دھان سنگھ تھاپا

میجر دھان سنگھ تھاپا لداخ میں ایک ہندوستانی فوجی چوکی کے محافظ دستے کے سالار تھے۔ اس چوکی پر ۲۰ اکتوبر کو چینیوں نے ایک بڑی تعداد کے ساتھ تین مرتبہ حملہ کیا۔ ہندوستانی سپاہیوں نے دو مرتبہ حملہ پسپا کیا اور چینیوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ لیکن تیسرے حملے میں چینی اپنی کثیر تعداد کی بدولت چوکی پر قابض ہو گئے۔ اس کے باوجود میجر تھاپا نے ہار نہ مانی اور چینیوں سے دست بدست جنگ کرتے ہوئے وطن پر اپنی جان قربان کر دی۔ انکی اس بہادری پر حکومت کی طرف سے انھیں "پرم ویر چکر" کا اعزاز دیا گیا۔



صوبیدار جوگیندر سنگھ

صوبیدار جوگیندر سنگھ نیفا کی ایک پہاڑی پر ایک سکھ رجمنٹ کی سالاری کر رہے تھے۔ چینیوں نے ۲۳ اکتوبر کو ایک بڑی تعداد میں دو مرتبہ اس پہاڑی پر تین طرف سے حملہ کر دیا۔ دونوں حملے پسپا کر دیے گئے۔ مگر صوبیدار کافی زخمی ہو گئے۔ چینیوں نے جب تیسری مرتبہ حملہ کیا تو صوبیدار جوگیندر سنگھ اور ان کے ساتھی سنگینیں لے کر چینیوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ خیال ہے کہ صوبیدار جوگیندر سنگھ اس معرکے میں کام آ گئے۔ ان کی اس بہادری پر حکومت کی طرف سے انھیں "پرم ویر چکر" کا اعزاز دیا گیا۔



دنیا سے کوچ کر گیا۔ اُس کا بیٹا ششکر ورمن بڑا نکما نکلا۔ راج کاج بنتے ہی کشتی کھیلا اور رنگ رلیوں میں پڑ گیا۔ لوٹ کھسوٹ، ظلم و ستم عام ہو گیا۔ ششکر ورمن کے مرتے ہی خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ آخر ۹۵۰ء میں کھیم گپت نے لوہار خاندان کی کماری ودّا سے شادی کر کے اپنی پوزیشن مضبوط کرنا چاہی۔ کھیم گپت بڑا ہی بدقماش تھا مگر رانی ودّا اُس سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی۔ سیاسی سازشوں، قتل، سفاکی اور بدقماشی میں وہ اپنی مثل آپ تھی۔ جب ۹۵۸ء میں کھیم گپت مر گیا تو اُس نے ابھیمنیو ثانی کے نام پر حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی اور کئی سرداروں اور افسروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ کہتے ہیں کہ تُنگ نامی ایک چرواہے سے اسے عشق ہو گیا اور اُس کا یہ نتیجہ نکلا کہ کاروبار حکومت میں تُنگ کا پورا عمل دخل ہو گیا۔ آہستہ آہستہ لوہار خاندان پھر طاقت پکڑنے لگا اور ۱۰۰۳ء میں سنگرام دیو نے لوہار خاندان کی حکومت قائم کر لی۔ یہ لوگ جنوبی کشمیر کے علاقے وادی لورن اور سندر ربنی کے راجے تھے۔ اسی علاقے کو العتبی نے لوہر کوٹ کا نام دیا ہے۔ اسی مقام پر سنگرام دیو کے حامیوں نے محمود غزنوی

رعایا پر طرح طرح کے ٹیکس لگائے۔ آخر رعایا پریشان ہو گئی۔ ہر طرف بدامنی کا دور دورہ پھیل گیا "مرے کو مارے شاہ مدار" کے مطابق وبا، قحط اور سیلاب نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ آخر کسی من چلے نے ہرش کا کام تمام کر دیا اور اُس کی لاش ننگی کر کے جنگل میں پھینک دی۔ کسی لکڑہارے کو دیکھ کر ترس آیا اور اُس نے اُسے چتا پر چڑھا کر نذر آتش کر دیا۔

ہرش کے مرنے کے بعد بارھویں اور تیرھویں صدی میں کشمیر افراتفری کا شکار رہا۔ بددیانت اور رشوت خور حاکم، باغی سردار، عیش پرست اور ظالم راجاؤں نے کشمیر کی ساکھ کو مٹی میں ملا دیا۔ اُس کے بعد بیرونی حملے شروع ہوئے اور آخر کار ایک لداخی بودھ شہزادے رینچن نے کشمیر کے آخری راجہ رام دیو کی بیٹی کوٹہ رانی سے شادی کر کے چتر شاہی سنبھالا۔ کچھ عرصہ بعد اُس نے ایک مسلمان درویش سید شرف الدین بلبل شاہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور کشمیر میں عہد سلاطین کا آغاز کیا۔ اُس زمانے سے کشمیر کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع ہوا جس کا تذکرہ

> جیسا کہ ہمارے وزیر اعظم نے اعلان کیا ہے کہ ہندستان طاقت کا جواب طاقت سے دے گا اور ہم اپنی آزادی اپنی جمہوریت اور علاقائی سالمیت کے لئے اپنے خون کے آخری قطرہ تک لڑتے رہیں گے۔" ——— شری سی بی گپتا، وزیر اعلیٰ، اتر پردیش

کا راستہ روک کر کشمیر کو غزنوی حملہ سے بچایا تھا۔

اس خاندان کا سب سے نامور حکمراں ہرش دیو گر راجہ ہے جس نے ۱۰۸۹ء سے ۱۱۰۴ء تک راج کیا۔ وہ بڑا خوش شکل، طاقتور اور بہادر راجہ تھا اور عالموں کا قدرداں تھا۔ البتہ اُس کا مزاج گھڑی بھر میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ ہو جاتا تھا۔ دریا دلی پہ آتا تو لاکھوں لٹا دیتا لیکن خست پر اترتا تو دمڑی پر جان دینے لگتا۔ اسی طرح اُس کی رحم دلی اور سنگدلی دونوں کی انتہا نہ تھی۔ شروع شروع میں اُس کے تدبر، انصاف پسندی اور رعایا پروری کا شہرہ سن کر دور دور سے عالم اور فن کار اُس کے دربار سے وابستہ ہو گئے لیکن راجہ کی فضول خرچیاں آخر رنگ لائیں۔ اور مالی مشکلات نے اسے آن گھیرا۔ اب اُس نے پریشان ہو کر مندروں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا اور دیوی دیوتاؤں کی سونے چاندی کی مورتیاں پگھلا کر نقد روپیہ وصول کرنا شروع کر دیا۔

ایک الگ صحبت کا محتاج ہے۔

کلہن پنڈت کی راج ترنگنی اور دوسری سنسکرت کتابوں کے ناقدانہ مطالعہ سے کشمیر کی پرانے زمانہ کی عوامی زندگی کی کچھ جھلک ضرور نظر آتی ہے لیکن بدقسمتی سے کلہن نے اپنی تاریخ میں راجاؤں کے قصوں، دیومالا کی کہانیوں اور عام روایتوں کو کچھ اس طرح خلط ملط کر کے شاعرانہ انداز سے بیان کیا ہے کہ حقیقت پر پردہ سا پڑ گیا ہے۔ خود کلہن کو عوامی زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ عوام کی اُس زمانہ میں کوئی خاص اہمیت تسلیم کی جاتی تھی۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں لوگ عام طور پر کھیتی باڑی پر گذارہ کرتے تھے اور معیار زندگی بہت پست تھا۔ انتظام حکومت میں اُن کا کوئی دخل نہ تھا اور نہ حکومت کی طرف سے اُن کی تعلیم، صحت، تجارت وغیرہ کا کوئی انتظام تھا۔ راستے دشوار گذار تھے صنعت و حرفت اور تجارت کی سہولتیں مفقود تھیں اور بیرونی ملک سے

تجارتی، تمدنی اور اقتصادی رابطہ میں ناقابل عبور مشکلات حائل تھیں عوام کو طرح طرح کے ٹیکس اور نذرانے دینا پڑتے تھے۔ حاکم بددیانت اور رشوت خور تھے۔ جاگیرداری عام تھی۔ قانون اور عدالتیں نام کو نہ تھیں۔ راجہ مطلق العنان اور عام طور پر رنگ رلیوں میں مست رہتے تھے۔ شاہی خاندانوں میں اخلاقی گراوٹ عام تھی۔ بغاوتیں اور خانہ جنگیاں جاگیرداروں اور سرداروں کی ہوس اقتدار کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ عوام ہر راجہ کو مالیہ ادا کرنے پر تیار رہتے اور شاہی خاندان کی افراتفری کو روزمرہ کا معمول سمجھتے تھے۔

غرض کہ اُس زمانہ میں جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا اصول عام تھا۔

البتہ سیاسی اور اقتصادی بدحالی کے باوجود آٹھویں صدی سے بارھویں صدی عیسوی تک کشمیر میں سنسکرت ادب میں بہت ترقی ہوئی۔ شیو فلسفہ پر متعدد کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اس عہد کے مشہور سنسکرت ادیب بھیم بھٹ، دامودر گپت، رتناکر، سری سوامی، دنتیو دیو، کھشیمندر، سوم دت، بلہن، منکھ وغیرہ تھے۔ ترن جل، چندر، کسیر سوامی، وامن، کیٹ، سنسکرت و پراکرتی و اصول زباندانی کے ماہر تھے۔ وامن بھٹ، ادبھٹ اور ممٹ نے تنقید شعر اور فن بلاغت پر کتابیں لکھیں۔ طب میں چرک اور نرہری نے اور جوتش میں بھاسکرا چاریہ۔ آریہ بھٹ اور رتی کنٹھ نے شہرت پائی۔

مارتنڈ، پنڈریٹھن، اونتی پور، پاندریٹھن، ہنگ پورہ، ادشکر، تاپر اور پانڈوں کے کھنڈر بودھ اور شیو دور میں کشمیر کے فن تعمیر، سنگ تراشی اور مجسمہ سازی کی شاندار منہ بولتی شہادتیں ہیں۔ اس زمانے کے بودھ چیتیہ اور وہاروں اور برہمنی مندروں کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ ان کے درمیان میں بُت کدہ اور عبادت خانے کے ہال وغیرہ بلند ستونوں پر کھڑی عمارتیں ہوتی تھیں جو بقول پروفیسر ہاشم خالص یونانی اثر کی شہادت ہے اور ہندوستان میں صرف کشمیر کے آثار قدیمہ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس طرز تعمیر کی سب سے پُرشکوہ مثال مارتنڈ کا مشہور مندر ہے۔ مجسمہ سازی اور سنگ تراشی میں گاندھارا طرز فن مقبول تھی۔ اس طرز کی مثالیں جموں کے کھنڈروں میں بھی ملتی ہیں جو جموں و کشمیر کے تمدنی اتحاد کی انمول یادگار ہیں۔



محاذِ جنگ پر

ایک ہندوستانی فوجی جوان کے جذبات

روشن پٹیالوی

نگاہوں میں مری ہر وقت اپنی راہ منزل ہے
عمل ہے زندگی میری، سکوں نا آشنا دل ہے

مٹانا ظلم کی ہستی مری فطرت میں شامل ہے
مدد کرنا ہر اک کمزور کی عادت میں داخل ہے

مرے پائے طلب میں آ نہیں سکتی کبھی لغزش
کہ میرا جذب صادق اور میرا عزم کامل ہے

محافظ ہوں وطن کا میں، وطن پر جان دے دوں گا
مرا دل سرفروشی کی تمناؤں کا حامل ہے

ہمیشہ آفتوں کے درمیاں بھی مسکرایا ہوں
مرے جوشِ مسرت کو دبانا سخت مشکل ہے

سرایت کر چکا ہے جذبۂ ایثار رگ رگ میں
مرے جاں باز دل میں آرزوئے دستِ قاتل ہے

مٹا دیتا ہے جو بہرِ وطن، اے دوست ہستی کو
وہی انسان بس انسان کہلانے کے قابل ہے

رہا ہوں کش مکش میں مبتلا منجدھار میں پھنس کر
کہ کشتیٔ زیست کی نا آشنائے قربِ ساحل ہے

رہوں گا گام زن راہِ وفا پر میں بہر صورت
کہ میری منزلِ مقصود راحت خیز منزل ہے

حفاظت کر رہا ہوں میں وطن کی ہر طریقے سے
مری خدماتِ قومی کا ہر اک انسان قائل ہے

میں سرشارِ وفا ہوں، جان تک قرباں کر دوں گا
مے ایثار سے لبریز میرا ساغرِ دل ہے

میں طے کر لوں گا ہر ہمت شکن، پُر ہول رستے کو
کہ اپنے عزمِ محکم کی مجھے امداد حاصل ہے

یقیناً راکھ ہو جائے گا جذبہ بے وفائی کا
کہ میرے دل کے خوں میں آتشِ ایثار شامل ہے

وفا کے نور سے میں نے چراغِ دل کیا روشن
سراپا طور جس کے فیض سے ہر ایک محفل ہے

سُن تو سہی!
جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا

محمد حسن فاروقی

چین نے ۲۰ راکتوبر کو اپنے سب سے پرانے اور مخلص ایشیائی دوست ہندوستان کی پیٹھ میں چھرا بھونک دیا۔ اس ہندوستان کی پیٹھ میں جو چین کی کمیونسٹ حکومت کو تسلیم کرنے میں آگے رہا تھا، جس نے اُس وقت جب کہ چین ناٹ باہر سمجھا جاتا تھا

" اگرچہ ہندوستان نے ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھایا ہے جس سے (یک طرفہ) جنگ بندی پر عمل درآمد کی راہ میں کوئی رکاوٹ پڑی ہو۔ لیکن " ہم مستقبل کے لیے گارنٹی نہیں دے سکتے ہیں " اس کا دارومدار حالات اور واقعات نیز اس بات پر ہوگا کہ آئندہ چینی کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے "۔ ــــــ جواہر لعل نہرو

بنڈونگ کانفرنس کے ذریعے اُسے ایشیا اور افریقہ کے آزاد ملکوں کی برادری میں ایک باعزت جگہ دلائی تھی، جو برسوں سے متحدہ اقوام میں داخلے کے لیے چین کی وکالت کر رہا تھا، جس نے دنیا کے ایک بہت بڑے طبقے کی رائے کے خلاف تبت پر چین کے حقوق مان کر اسے اپنا قریبی پڑوسی بنا لیا تھا، جس نے چین کے ساتھ ایک تاریخی دستاویز پر دستخط کئے تھے جو پانچ زریں اصولوں (پنچ شیل) پر مبنی تھی، جس نے اس کے لیڈروں کو اپنے ہاں بلاکر اپنے سر آنکھوں پر بٹھایا تھا، جس کے گلی کوچے "ہندی چینی بھائی بھائی" کے پرخلوص نعروں سے گونج رہے تھے اور جس نے اپنی سرحدوں کے اندر اس کی پے درپے اشتعال انگیزیوں کے باوجود انتہائی ضبط و تحمل سے کام لیا تھا اور معاملات کو پُرامن گفت و شنید کے ذریعے طے کرنا چاہا تھا۔

چین کو شاید خیال تھا کہ دنیا لنگڑے اِس ڈھنڈورے سے دھوکا کھا جائے گی کہ ہندوستانی فوج نے چینی علاقے پر حملہ کر دیا ہے اور چین کے سرحدی پہرے دار اس حملہ کو پسپا کر رہے ہیں؛ لیکن دنیا دونوں فریقوں کے مزاج سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کون توسیع پسندی کے راستہ پر گامزن ہے اور کون امن و آشتی کا علمبردار ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے اس پروپیگنڈے کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ چینی اژدہے کے سارے زہریلے دانت نظر آنے لگے۔

ہندستان کے خلاف اس ننگی جارحیت کا دنیا پر کتنا زبردست ردعمل ہوا، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ سب سے زیادہ ملکوں کی حکومتیں چینی اقدام کی مذمت اور ہندستان کی حمایت و ہمدردی میں پیغامات بھیج چکی ہیں۔ ان میں میکسیکو، جاپان، ڈنمارک، نائجیریا، اسرائیل، نیوزی لینڈ، فلپائن، جنوبی کوریا، جنوبی ویٹ نام، ایکویڈر، لائبیریا، امریکا، برطانیہ، فرانس، کناڈا، آسٹریلیا، ناروے، سویڈن، تھائی لینڈ، ایران، کوسٹاریکا، وینزویلا، چلی، ہائٹی، یوگنڈا، نیدرلینڈ، ارجنٹائنا، جمیکا، ترکی، نکاراگوا، یونان، پناما، مغربی جرمنی، اٹلی، ایتھوپیا، حبش، گواٹیمالا، اردن، لکسمبرگ، ڈومی نیکن جمہوریہ، بولیویا، لنکا، قبرص، ٹرینیڈاڈ، لیبیا، کانگو (لیوپولڈول)، آئس لینڈ، ملایا، ویٹیکان (پوپ کا پایۂ تخت)، مشرقی افریقہ، صومالی لینڈ، فن لینڈ، آئرلینڈ، مراکش اور سوئٹزرلینڈ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ایشیا اور افریقہ کے ایسے بعض ناوابستہ ملک اور ہیں جن کی ہمدردیاں تو یقینی طور پر ہندستان کے ساتھ ہیں لیکن وہ کھل کر چینی جارحیت کی مذمت اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ مصالحت کرانے کے لئے انھیں چین پر اپنا اخلاقی دباؤ ڈالنا ہے۔ دوسری طرف چین کی علی الاعلان حمایت صرف ایک ننھے سے کمیونسٹ ملک البانیہ نے کی ہے۔ باقی کمیونسٹ ملک بھی اس کی حمایت نہیں کر رہے ہیں۔

ہندستان کی حمایت حکومتوں ہی تک محدود نہیں رہی، جگہ جگہ سیاسی لیڈر اور ادارے ازخود اپنی اخلاقی ہمدردی کو ٹھوس امداد کی شکل دینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ کئی ملکوں میں ہندستان کی دفاعی کوششوں میں مدد دینے کے لئے چندہ جمع ہو رہا ہے۔ ان میں ملایا، برطانیہ، کینیا، امریکا، ہالینڈ، جنوبی افریقہ، ماریشس اور مسقط شامل ہیں۔ متعدد افریقی ملکوں، برطانیہ اور فن لینڈ میں نوجوانوں

نے اپنے کو ہندستانیوں کے دوش بہ دوش لڑنے کے لئے بھی پیش کیا ہے۔ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے کئی ملکوں مثلاً لنکا، کینیا اور اٹلی میں ہندستان کی حمایت میں مختلف سیاسی جماعتوں نے مشترکہ طور پر بڑے بڑے جلسے بھی کئے ہیں۔

چین کی مذمت اور ہندستان کی حمایت میں مختلف ملکوں کی حکومتوں نے جو رائے ظاہر کی ہے، ان ملکوں کے عوامی لیڈروں اور اداروں نے جو بیانات دیے ہیں اور اخبارات جو اداریے لکھ رہے ہیں اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک پوتھی تیار ہو سکتی ہے لیکن جگہ کی تنگی کی وجہ سے ہم آگے کی سطروں میں مختلف ملکوں کی حکومتوں، ان کے سربراہوں، عوامی رہنماؤں اور وہاں کے مختلف اداروں کے خیالات، بیانات اور رایوں کے کچھ نمونے پیش کرنے جا رہے ہیں جن سے یہ بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ خلق خدا چین کو کیا کہہ رہی ہے۔

مغربی دنیا

چینی حملہ شروع ہونے کے دوسرے ہی روز یعنی ۲۱ راکتوبر کو امریکی محکمۂ خارجہ نے چینی حملہ کی مذمت کرتے ہوئے اس کو ہندستان کی قومی سالمیت کے لئے

تھے۔ انھوں نے کہا کہ جب کوئی ملک اپنے ٹینک اور فوج آگے بڑھاتا ہے تو بغیر سوچے سمجھے نہیں بڑھاتا ہے۔" (چین نے ایک روز پہلے لداخ میں ایک ہندستانی چوکی پر قبضہ کرنے کے لئے ٹینک استعمال کئے تھے) مسٹر اسٹیونسن نے کہا کہ "یہ ایک نیا سامراج ہے، ایک نیا نوآبادیاتی نظام ہے جو اپنی ایک سلطنت بنانا چاہتا ہے جو ایشیا ہی تک محدود نہیں ہوگی۔ یہ سامراج پوری دنیا کی آزادی کی امیدوں کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے۔"

کناڈا کے وزیر اعظم مسٹر جان ڈیفن بیکر نے ۲۴ راکتوبر کو اپنے یہاں کے دارالعوام میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ حکومت کناڈا تسلیم کرتی ہے کہ ہندستان، چین کی جارحیت کا پے درپے شکار ہوا ہے۔

امریکی سفیر ڈاکٹر گلبریتھ نے ۲۹ راکتوبر کو صدر کنیڈی کا ایک خط وزیر اعظم نہرو کو دیا جس میں ہندستان کے لئے امریکا کی پوری ہمدردی اور حمایت ظاہر کی گئی۔ ڈاکٹر گلبریتھ نے پنڈت نہرو کو یقین دلایا کہ امریکا ہندستان کو ہر ممکن مدد دینے کو تیار ہے۔

وزیر اعظم نہرو کو برطانی وزیر اعظم مسٹر میک ملن کی طرف سے بھی اسی روز "حمایت

> " فوجی ہتھیار اور ہوائی جہاز وغیرہ قوموں کی طاقت کی علامتیں ہیں لیکن ان کے پیچھے اصل طاقت کھیتوں اور فیکٹریوں کی ہوتی ہے جو خام مال اور تیار مال پیدا کرتی ہیں "—— جواہر لعل نہرو

"بے اصولا چیلنج" قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ چین کے اس "تشدد پسند جارحانہ اقدام" سے امریکا کو دھچکا لگا ہے۔ بیان میں کہا گیا تھا کہ "ہماری ہمدردی ہندستان کے ساتھ ہے جو اس چیلنج کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔"

برطانی دفتر خارجہ کے ایک ترجمان نے ۲۴ راکتوبر کو کہا کہ برطانیہ کے نزدیک عوامی چین ہندستان کے خلاف جارحیت کا مرتکب ہوا ہے۔ مغربی جرمنی کی حکومت نے اسی روز کہا کہ چین جس دھڑلے سے طاقت کے ذریعے چین۔ ہند سرحد پر اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کر رہا ہے اس پر ہمیں افسوس ہے۔ حکومت کے خاص ترجمان ہر کارل گونیتھر فان ہیس نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ ان کی حکومت بین اقوامی مسائل کے حل کے لئے تشدد کے استعمال کی قائل نہیں ہے۔

امریکی ڈیلیگیٹ مسٹر اسٹیونسن نے جنرل اسمبلی میں ۲۲ راکتوبر کو اس مطالبے کی کہ چین کو متحدہ اقوام میں داخل کیا جائے، مخالفت کرتے ہوئے ہندستان کی سرحد پر چین کے تازہ حملے کا ذکر کیا اور کہا کہ چینی کمیونسٹوں کی یہ پہلے سے سوچی سمجھی ہوئی "ننگی جارحیت" ہے جس کے لئے وہ تین سال سے تیاری کر رہے

اور امداد" کی ایک پیش کش موصول ہوئی۔

برطانی دارالعوام میں ۳۰ راکتوبر کو ملکہ کی تقریر پر جو بحث ہوئی اس میں کنزرویٹو پارٹی کے ایک ممبر مسٹر انقوبی فیں نے کہا کہ ہندستان بھیجنے کے لئے دولت مشترکہ کی ایک بریگیڈ بنائی جانا چاہیے۔ ایک دوسرے کنزرویٹو ممبر ڈاکٹر ایلین گلمی نے کہا کہ ہندستان پر حملہ دولت مشترکہ اور برطانیہ پر حملہ ہے۔ برطانی لیبر حزب مخالف کے لیڈر مسٹر ہیو گیٹسکل نے کہا کہ ہندستان پر چینیوں کا حملہ کسی پر امن پڑوسی کے خلاف جارحیت کی ایک صریحی مثال ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہندستان کے کسی طرح بھی کوئی جارحانہ ارادے تھے۔ چین کی کھلی ہوئی جارحیت ہونے میں کوئی شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ یہ اکیلے ہندستان کا معاملہ ہے۔

جمہوریہ قبرص کے صدر آرک بشپ مکاریوس نے صدر جمہوریہ کو ایک پیغام بھیجا جس میں کہا گیا تھا "آپ کے ملک پر خواہ مخواہ اور بلا سبب جو حملہ ہوا ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آپ کی قوم نے جس عزم کا ثبوت دیا ہے اس سے میں، میری حکومت اور قبرص کے عوام بہت متاثر ہوئے ہیں اور ہم آپ کو اپنی پوری اخلاقی حمایت کا یقین

دلاتے ہیں۔" اس کے بعد قبرص کے صدر ۱۳ اکتوبر کو پندرہ دن کے سرکاری دورہ پر جب ہندستان آئے تو انھوں نے پالم کے ہوائی اڈے پر کہا کہ چین کے خلاف ہندستان کی جد و جہد ان تمام ملکوں کی جد و جہد ہے جنھیں آزادی عزیز ہے۔ انھوں نے کہا کہ بین الاقوامی میدان میں ہندستان نے امن، آزادی اور رواداری کے حق میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے" اس لئے ہندستان کے خلاف چین کی جارحیت اور زیادہ قابل مذمت فعل ہے۔ ہمیں بھروسہ ہے کہ بیرونی جارحیت کے خلاف ہندستان کی جد و جہد کو فتح نصیب ہوگی۔

سابق برطانی وزیر اعظم مسٹر انتھونی ایڈن نے ۸ نومبر کو دارالامرا میں کہا کہ "ہندستان خاص غور و خوض کا مستحق ہے۔ اس ملک پر حملہ ہوا ہے۔ چین کی کمیونسٹ حکومت تبت میں قدرتی مناظر دیکھنے نہیں داخل ہوئی تھی جس طرح مسولینی البانیہ میں قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے نہیں گیا تھا۔ دونوں کی نظر جنوب کے ممالک پر تھی۔ اور مسولینی سے کہیں زیادہ ماؤ کے طاقت ور ثابت ہونے کا امکان ہے۔"

آئرلینڈ کے وزیر اعظم مسٹر سین ڈیماس نے سخت ترین الفاظ میں چینی جارحیت کی مذمت کی اور ہندستان سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔ آئرلینڈ کی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "یہ بالکل واضح ہے کہ ہندستان پر چین کا حملہ ایک ایسے ملک پر حملہ ہے جس نے چین سے دوستانہ تعلقات رکھنے کے لئے ہر معقول طریقہ اختیار کیا تھا۔

مشرقی ممالک

ملایا کے وزیر اعظم تنکو عبدالرحمان نے جو ہندستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے ۲۲ اکتوبر کو ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ چین ہندستان پر اس لئے حملہ کر رہا ہے کہ وہ دنیا کے اس حصے میں اپنا کوئی مدمقابل نہیں دیکھنا چاہتا۔ چین نے جب تبت لیا تو ہم جان گئے تھے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ چینیوں کی نظریں ہندستان پر تھیں اور وہ ہندستانی سرحدوں کے اور قریب آنا چاہتے تھے۔ جو دوسرے ممالک چین کا کمیونسٹ نظریہ اختیار نہیں کرتے ان کی طرف بھی چین کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ چینی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں اور خدا ہی جانتا ہے کہ آگے وہ کیا کرنے والے ہیں۔

نیوزی لینڈ کے وزیر اعظم مسٹر کیتھ ہولی اوک نے ۲۵ اکتوبر کو ایوان نمائندگان میں ہندستان کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی۔ انھوں نے کہا کہ افسوس کی بات ہے کہ حملہ کا شکار وہ ملک ہوا جو عدم تشدد کا علمبردار ہے۔

جنرل اسمبلی میں ۲۲ اکتوبر کو اقوام متحدہ میں چین کے داخلے پر بحث کے دوران فلپائن کے نمائندے ایمانوئیل پلاسلی نے بھی چین کی جارحیت کی مذمت کی اور کہا کہ ہندستان وہ ملک ہے جو متحدہ اقوام ہی میں نہیں دوسری بین الاقوامی کانفرنسوں میں بھی چین کی وکالت کرتا رہا ہے۔ نیوزی لینڈ کے نمائندے نے کہا کہ چین کے اقدام سے جہاں ہماری تشویش میں اضافہ ہوتا ہے وہاں ہمارے ان شبہات میں بھی اضافہ ہوتا ہے کہ عوامی جمہوریہ چین متحدہ اقوام کے منشور اور مقاصد کو ماننے کے لئے تیار بھی ہے یا نہیں۔ آسٹریلیا کے ڈیلی گیٹ نے کہا کہ ہندوستان پر حملہ کر کے چین نے خود اپنے سابقہ وعدوں کی خلاف ورزی کی ہے۔

تھائی لینڈ کے وزیر اعظم فیلڈ مارشل سریت تھنارت نے ۲۹ اکتوبر کو بنکاک میں دیئے ایک بیان میں کہا کہ چین اور ہندستان کے سرحدی قضیہ میں تھائی لینڈ ہندستان کی پوری حمایت کرے گا۔

سنگاپور کے سابق وزیر اعظم مسٹر ڈیوڈ مارشل نے ۶ نومبر کو تمام افریشیائی ملکوں سے مطالبہ کیا کہ وہ چینیوں کے خلاف جد و جہد میں ہندستان کی حمایت کریں۔ مسٹر مارشل نے جو ورکرس پارٹی کے لیڈر ہیں کہا کہ مجھے اپنی زندگی میں تمام افریشیائی ممالک کو اس بے باکی اور صفائی سے اظہار خیال کرتے دیکھنا نصیب ہوگا جس صفائی سے اس معاملے میں ملایا کے وزیر اعظم تنکو عبدالرحمان اظہار خیال کرتے ہیں۔

حکومت نیپال نے بھی اس لڑائی کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھا اور نیپال میں وہاں کی اندرونی بغاوت کو جس تلخی کے ساتھ ہندستان سے منسوب کیا جاتا تھا، اس کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ نیپال کے عوامی لیڈروں کے بیانات سے بھی ظاہر ہو گیا کہ نیپال کے عوام کی ہمدردیاں ہندستان کے ساتھ ہیں۔ نیپال کے ایک سابق وزیر داخلہ مسٹر اُپادھیا نے ۲۶ اکتوبر کو کھٹمنڈو میں کہا کہ "پورے ایشیا کے ہم عام انسانوں نے جب یہ سنا کہ اس بر اعظم کا سب سے بڑا ملک ایک بھائی ملک کے خلاف تشدد پر اتر آیا ہے تو ہم ہکا بکا رہ گئے۔"

جاپان کے ممتاز ادیبوں، دانشوروں اور فن کاروں نے ہندستانی ادیبوں اور فن کاروں کے نام ایک پیغام بھیجا جس میں کہا گیا ہے کہ کمیونسٹ چین نے ہندستان پر حملہ کر کے بین الاقوامی جھگڑوں کو پر امن طور پر طے کرنے کے اصول کو بالائے طاق رکھ دیا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ ہندستان کی جمہوریت اور آزادی کو ایک زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ بلکہ ایشیا کے سارے ممالک اس خطرے کی زد میں آ گئے ہیں۔

کولمبو میں تقریباً ۰۰، بودھ راہبوں نے ایک احتجاجی جلسہ میں کمیونسٹ چین کی مذمت میں ایک قرار داد منظور کی جس میں کہا گیا ہے کہ تبت میں بودھ مذہب کی بیخ کنی کرنے کے بعد اب چین مہاتما بدھ کی جنم بھومی ہندستان کو برباد کرنا چاہتا ہے۔ "اگر چین ہندستان پر حملہ کرنے سے باز نہ آیا تو لنکا کے بودھ راہب اور لنکا کے عوام ہندستان کی طرف سے میدان جنگ میں اتریں گے"۔ یہ قرار داد کولمبو میں کمیونسٹ چین کے سفارت خانے کے حوالے کی گئی۔

لنکا میں بائیں بازو کی جماعت عوامی متحدہ محاذ کے سرکاری جریدہ نے متنبہ کیا کہ چین کی جارحیت کا اگلا شکار لنکا ہوگا۔ جریدہ نے لکھا کہ جو خطرہ ہندستان کے لئے ہے وہ لنکا کے لئے بھی براہ راست خطرہ ہے۔ جریدہ نے اپنے اداریہ میں لکھا کہ ایک چینی نقشہ میں ہندستان کو چین کا حصہ دکھایا گیا ہے۔ بس یہ بھی ممکن ہے کہ چین اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لئے ایک روز لنکا پر بھی حملہ کر دے۔

آسٹریلیا کی ڈیماکریٹک پارٹی نے ۲۰ / اکتوبر کو مطالبہ کیا کہ جب تک چین ہندستان کے خلاف جارحیت کا مرتکب ہوتا رہے اس کے ہاتھ آسٹریلیا کے گیہوں اور اون کی فروخت ممنوع قرار دی جائے۔

ٹوکیو (جاپان) میں ۲۲ / اکتوبر کو آزاد ٹریڈ یونینوں کی بین اقوامی کانفیڈریشن کی جنوبی ایشیائی منطقائی کانفرنس نے ایک قرار داد منظور کی جس میں چین کی جارحانہ اور توسیع پسند پالیسیوں کی اس بنا پر مذمت کی گئی کہ اس نے ہندستان کے سرحدی علاقوں پر حملہ کر دیا۔

برطانوی گائنا میں داہنے بازو کی یونائیٹڈ فورس پارٹی کی طرف سے ہندستان پر چین کے حملے کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ملک بھر میں مظاہرے کرنے کا نعرہ دیا گیا۔ پیپلس نیشنل کانگرس نے بھی جس کے لیڈر مسٹر فوربس برنہام ہیں، پچاس ہزار پرچے تقسیم کئے جن میں گائنا کے عوام سے ظلم و جور کے دشمنوں اور آزادی کے پرستاروں سے اپیل کی گئی کہ "ہندستان کے پرامن لوگوں پر چینیوں کے اس بے دردانہ اور بے سبب حملے کی مذمت کرنے میں ہمارا ساتھ دیں"۔

نیروبی کے ایک بڑے اجتماع میں ۲۰ / اکتوبر کو حکومت کینیا کے تین وزیروں نے چین کے خلاف ہندستانیوں کی جد و جہد میں اپنی حمایت کا اظہار کیا۔ ان وزیروں کے نام یہ ہیں: وزیر تجارت و صنعت مسٹر منسے سویرو (جو کینیا افریقن ڈیماکریٹک یونین کے ڈپٹی لیڈر ہیں) وزیر زراعت مسٹر ولفریڈ ہیولاک اور وزیر سیاحت مسٹر اروند جمعدار۔ جلسے نے چین کی مذمت میں ایک قرار داد منظور کی۔ کچھ اور افریقی لیڈروں اور پارٹیوں نے بھی ہندستان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ تیوا کمبا یونین نے ایک بیان میں "ہندستان کے اچھے لوگوں کے خلاف چین کے جنگ شروع کر دینے" پر اظہار افسوس کیا اور کہا کہ "اگر ہماری اپنی کوئی فوج ہوتی تو ہم اپنے جذبات کا اظہار اس سے بہتر طور پر کرتے"۔ کینیا کے مشہور افریقی لیڈر مسٹر جومو کنیاتا کے پارلیمنٹری سکریٹری ڈاکٹر گیکونیو کیانو نے ایک بیان میں کہا کہ "چین کا یہ فعل کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا کہ ایک طرف تو وہ امن کی فاختائیں اڑاتا ہے اور دوسری طرف اپنے پڑوسیوں پر فوج کشی کر رہا ہے۔ چین نے جب ہندستان کی علاقائی سالمیت کو پامال کیا ہے تو ہم کیسے یقین کریں کہ وہ یہی سلوک ہم شرقی افریقہ کے لوگوں کے ساتھ نہیں کرے گا"۔

> لڑائیاں محض میدان جنگ ہی میں لڑی اور جیتی نہیں جاتیں — فتح کے لئے یہ بھی بہت ضروری ہے کہ عوام کے حوصلے پست نہ ہوں تاکہ محاذ پر جوانوں کو سامان وغیرہ کی برابر سپلائی ہوتی رہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہر شعبہ میں پیداوار بڑھانے کے لئے پوری تندہی سے پیہم کوششیں کی جائیں۔ —————— شری سی، بی، گپتا۔ وزیر اعلیٰ، اتر پردیش

اسلامی ممالک

اسلامی ممالک بھی چینی جارحیت کی مذمت کرنے اور ہندستان کے ساتھ ہمدردی اور حمایت کا اظہار کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ چین کی مذمت کرنے میں عرب ممالک خاص طور سے پیش پیش تھے۔ ناوابستہ ممالک میں تو عرب ملکوں نے ہندستان سے دوستی کا سب سے زیادہ اظہار کیا۔ دراصل ناوابستہ ملکوں کے لئے چینی جارحیت ایک ٹیڑھی صورت حال تھی۔ ایک طرف انھیں اپنی ناوابستگی کا دامن بچائے رکھنا تھا اور دوسری طرف وہ یہ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے کہ ہندستان کے خلاف چین کی جارحیت ناوابستگی کے پورے نظریہ ہی کو کھوکھلا کر دے۔ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ پیکنگ پر افریشیائی ملکوں کا اخلاقی دباؤ کس طرح ڈالا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندستان کی حمایت میں فوراً سامنے آجانے سے یہ مقصد نہیں حاصل ہو سکتا تھا۔ پھر بھی، مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے دوسرے ناوابستہ ملکوں کی طرح محض دونوں فریقوں سے نہ لڑنے اور مصالحت کر لینے کی اپیل کرنے کے بجائے

جرات مندی سے آگے قدم بڑھا کر خود ایک تجویز رکھ دی۔ مگر چین نے ناصر کی تجویز فوراً مسترد کر دی اور ناصر کو دوسرے ناوابستہ ممالک کو یہ دکھانے کا موقع مل گیا کہ قصوروار کون ہے۔

اس کے بعد متحدہ عرب جمہوریہ کے اخبارات نے کھل کر چینی جارحیت کی مذمت شروع کر دی۔ الجمہوریہ نے اپنے ایک اداریے میں لکھا کہ "ہندوستان کے ساتھ جنگ میں چین کی حیثیت یقیناً ایک جارح کی ہے"۔ احسن عبدالقدوس کے مشہور ہفتہ وار روزالیوسف نے ہندستان کو مشورہ دیا کہ ضرورت سے زیادہ نیکی ترک کرے اور متحدہ اقوام میں چین کے داخلے کے حق میں ووٹ نہ دے۔

ناصر کے مقرب دوست اور الاہرام کے اڈیٹر محمد حسنین ہیکل نے اپنے مقبول عام خود نوشت ہفتہ وار کالم میں لکھا کہ نام نہاد "دائمی کنٹرول کی لائن" تک فریقین کی فوجوں کی واپسی پر چین کے اصرار کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں کہ طاقت کے ذریعے اس نے جس علاقے کو چھین لیا ہے اس کو وہ اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا ہے یہی نہیں ہیکل نے کچھ بڑے تیکھے سوال بھی رکھے اور پیکنگ کو چیلنج کیا کہ ان کے جواب دے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا چین لڑائی کے لئے اپنی فوج بھیج کر ایشیا اور

چینی جارحیت کی مذمت کی۔ دمشق کے اخبار الرائے العام نے تنبیہ کیا کہ طاقت کے استعمال کے نتائج دنیا ہی کے لئے نہیں خود چین کے لئے بھی بُرے ہوں گے اور بہتر یہی ہوگا کہ چین کوئی شرط لگائے بغیر اپنی فوج ہندستانی علاقے سے ہٹا لے۔ الایام نے بھی چین کی لڑائی بندی تجاویز پر مخالف تبصرے کئے اور البیان نے نہرو کے اس بیان کی تائید کی کہ "مغربی ملکوں سے اسلحہ حاصل کرنے سے ہندستان کی ناوابستگی کی پالیسی پر اثر نہیں پڑا"۔ المنار نے لکھا کہ چینی حملے سے ناوابستگی اور بنڈونگ کانفرنس کے اصول قتل ہو جائیں گے۔

لبنان کے الصفاء نے لکھا کہ "چین نے ایک خطرناک قدم اٹھایا ہے اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کو جاری رکھنا بہت مہنگا پڑے گا۔ امریکا کھلم کھلا اس جارحیت کے خلاف ہے اور روس اس کے حق میں نہیں ہے بلکہ شاید بدل دل سے چاہتا ہے کہ چین منہ کی کھائے۔ چین کا پیچھے ہٹنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اسے اپنی غلطی نظر آ گئی ہے"۔ بیروت کے الحیات نے لکھا کہ "چین کی لڑائی بندی کی تجاویز میں کوئی نئی بات نہیں ہے"۔ الکفاح نے لکھا کہ "اپنے علاقے سے بڑھ کر ہندستانی چوکیوں پر قبضہ کرنا چین کے جارحانہ عزائم کو عریاں کرتا ہے"۔

عوام چینی حملہ آوروں کے پرفریب یک طرفہ جنگ بندی کے اعلان سے گمراہ نہ ہوں اور ملک بھر میں تعمیری ماحول پیدا کرنے کے لئے پوری تندہی سے کوشش کریں تاکہ ہر فرد زیادہ سے زیادہ قربانی کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہو جائے۔ — شری سی، بی، گپتا، وزیر اعلیٰ اتر پردیش

دنیا میں امن کے مقصد کو پورا کر رہا ہے؟ کیا وہ افریشیائی اتحاد کو فروغ دے رہا ہے؟ ایشیا میں وہ اپنے سب سے اچھے دوست سے کیوں لڑ رہا ہے؟ کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ سرد جنگ میں ہندستان کے غیر جانبدار اور ناوابستہ رہنے میں مدد دے رہا ہے؟ یا اس کا اصل مقصد نہرو کی حکومت کو گرانا ہے جو ملک کو پرامن سوشلسٹ ترقی دینے کی پالیسی کے ذریعے کمیونزم کی راہ میں حائل ہے؟ کیا اس کی کوشش یہ ہے کہ روس اپنی پوری معاشی امداد کا رخ چین کی طرف موڑنے پر مجبور ہو جائے؟ کیا چین دنیا کو ایٹمی جنگ کی طرف ڈھکیلنے کی کوشش کر رہا ہے؟ یا اس کا مقصد پورے ایشیا پر تسلط جمانا ہے اور ہندستان کو اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا ہے؟ ہیکل کے یہ سوالات بتلاتے ہیں کہ متحدہ عرب جمہوریہ کے لیڈر چین کے رویہ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

شامی اخبارات بھی مصری اخباروں سے پیچھے نہیں رہے اور ایک مختصر اشاعت والے کمیونسٹ اخبار کو چھوڑ کر پورے شامی پریس نے صاف الفاظ میں

عراق میں پہل اخبار المستقبل نے کی۔ اس نے لکھا کہ "ہندستان کے خلاف یہ فوجی مہم جس میں مرنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے کسی طرح معاف نہیں کی جا سکتی خاص کر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندستان سے چین کو کوئی خطرہ نہیں تھا"۔ اخبار نے مطالبہ کیا کہ چینی فوج ان ٹھکانوں پر واپس جائے جہاں وہ حملے سے پہلے تھی۔

اس کے بعد عراق کے سیاست داں بھی ہندستان کی حمایت میں سامنے آ گئے۔ افریشیائی اتحاد کی عراقی کمیٹی نے جس میں کئی سربرآوردہ سیاست داں شامل ہیں چینی جارحیت کی مذمت کی لیکن سب سے بڑا کارنامہ سابق وزیر اور سابق سفیر برائے ہندستان مسٹر حسین جمیل اور مسٹر صدیب محمود کا ہے جنھوں نے وزیر اعظم نہرو کے نام ایک خط پر ساٹھ ممتاز دانشوروں کے دستخط حاصل کئے۔ خط میں کہا گیا ہے کہ "عربوں کی عام رائے کے شانہ بشانہ ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں... ہمارے نزدیک امن کا راستہ بالکل واضح ہے۔ وہ یہ کہ چینی فوجیں ان ٹھکانوں پر واپس جائیں جہاں وہ حملے سے پہلے

ھیں: ان دانش وروں کی طرف سے متحدہ اقوام کے سکریٹری جنرل کو بھی ایک بحری تار بھیجا گیا ہے جس میں چین کے حملے کے بارے میں تشویش ظاہر کی گئی ہے۔

دوسرے اسلامی ممالک میں ترکی کے اخبار چین کی مذمت میں پیش پیش ہے۔ حملے کے تیسرے روز اخبار ملت نے ہندستان کی طرف چین کی توسیع پسند پالیسی کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ "ہندستانی وزیر اعظم جس طرح ڈٹ کر اس جارحیت کا مقابلہ کر رہے ہیں اس میں پوری دنیا ان کے ساتھ ہے۔ پنڈت نہرو ہمیشہ بہت ضبط سے کام لیتے رہے ہیں اور یہ بالکل پیکنگ کے ہاتھ میں ہے کہ جھگڑے کو بڑھائے یا ٹھنڈا کرے۔" اخبار ترکمان نے چین کی طرف سے طاقت کے استعمال کی سخت مذمت کی۔

دوسرے ملکوں کے اخبارات

ملایا کے انگریزی اخبار "اسٹریٹس ٹائمس" نے یہ لکھا کہ "حکومت پاکستان کو نظر آنا چاہیے کہ چینی جارحیت سے پاکستان کے لئے بھی اتنا ہی خطرہ ہے جتنا ہندستان کے لئے"۔

جاپان کے کثیر الاشاعت اخبار یومیوری شمبون نے لکھا کہ چین کا یہ الزام کہ ہندستانی فوج نے چینی علاقہ پر حملہ کیا ہے' حقیقت کو مسخ کرتا ہے"۔ اگر ہندستان نے واقعی حملہ کیا ہے تو روس کی حکومت روس' چین امدادی معاہدہ پر عمل درآمد کیوں نہیں کرتی"۔

آسٹریلیا کے ایک سربرآوردہ اخبار ایج نے لکھا کہ معلوم ہوتا ہے غیر منفعت بخش پہاڑی علاقوں میں جنگ چھیڑنے سے پیکنگ کا مقصد چین کو ایشیا میں ایک بڑی طاقت ثابت کرنا ہے تاکہ چھوٹے ملک اس کو بڑا بھائی مانیں اور اس کی دوستی ہی میں اپنی عافیت جانیں"۔

کینیا کے اخباروں نے جن میں ڈیلی نیشن اور ایسٹ افریقن اسٹینڈرڈ شامل ہیں' چین کی جارحیت اور فوجی توسیع پسندی کی سخت مذمت کی۔

یوگنڈا کے اخبار ارگس نے کہا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ چین نے اس حملے کے لئے پہلے سے خوب تیاری کی تھی۔ نائجیریا کے ڈیلی ٹیلیگراف نے لکھا کہ

> ان پہاڑوں میں 'دنیا کی چھت' پر جنگ کرنا۔ جیسا کہ ہندستانی فوج کو اس عرصے میں برابر جنگ کرنا پڑی ہے ۔۔ دو آتشا لیکن ان کی فوجیں ہر دو مورچوں کے درمیان ایک ہزار میل کی دوری پر ہیں ۔۔ کسی بھی فوج کے لئے نہایت مشکل کام ہے"۔
>
> ——— (جنرل پال اَیڈمس (امریکی سپہ سالار)

چین نے اس لئے چڑھائی کی کہ وہ اپنی کثیر آبادی کے لئے مزید علاقہ چاہتا ہے۔ اخبار نے لکھا کہ اس مصیبت کا تعلق ہندستان ہی سے نہیں دولت مشترکہ اور دنیا سے بھی ہے اس لئے متحدہ اقوام کو اس معاملے میں ہاتھ ڈالنا چاہیے۔

ارجنٹائنا کے اخبار بیونس آئرس ہیرالڈ نے امید ظاہر کی کہ ہندستانی قوم پنڈت نہرو کی قیادت میں جس بہادری سے حملہ آور کا مقابلہ کر رہی ہے اس میں اسے کامیابی ہوگی"۔

کناڈا کے اخبار گلوب اینڈ میل نے لکھا کہ ممکن ہے حکومت کناڈا آئندہ سالوں میں ہندستان کو باقاعدہ فوجی امداد دینے پر مجبور ہو جائے۔

فلپائن کے اخبار منیلا ڈیلی نے لکھا کہ کمیونسٹ چین اور ہندستان میں جو جنگ ہو رہی ہے وہ ایشیا کے امن کے لئے کیوبا کے بحران سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ایک دوسرے اخبار فلپائن ہیرالڈ نے لکھا کہ کمیونسٹ چین نے توسیع کا جو نقشہ بنایا ہے اس میں معلوم ہوتا ہے کم سے کم ہندستان کے شمالی حصوں کی تسخیر شامل ہے۔

چینی حملے کے تیسرے ہی روز برما کے انگریزی اخبار نیشن نے اپنے اداریہ میں کہا کہ ہندستان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندستان کی پوری شمالی سرحد جس پر حملہ آور چین اپنا حق جتاتا ہے' ہندستان کی ہے۔ اگر چین ہندستان سے تصفیہ کرنا چاہتا ہے تو اسے بین اقوامی راہ و ربط کے اخلاق و آداب اپنانا چاہیے۔

ٹنگانیکا کے انگریزی اخبار ٹنگانیکا اسٹینڈرڈ نے لکھا کہ "چین صرف یہ کہ خاصے علاقے پر جو بلاشبہ ہندستان کا ہے اپنا حق جتاتا ہے بلکہ فوجی طاقت سے اسے حاصل بھی کرنا چاہتا ہے"۔

سویڈن کی حکمراں سوشلسٹ ڈیماکریٹک پارٹی کے اخبار ٹڈ ننگن نے لکھا کہ چین کا مقصد ایشیا کے عوام کی نظروں میں ہندستان کو بے وقعت کرنا اور ہندستان کی معاشی ترقی کو روکنا ہے۔ سویڈن کے ایک دوسرے اخبار اسٹواسین نے بھی لکھا کہ چینی جارحیت کا مقصد ہندستان کی معاشیات کو نقصان پہنچانا ہے۔

یوگوسلاویہ کے سرکاری اخبار بعبا نے چینی فوج کے میک ماہن لائن پار کرنے کو ناجائز قرار دیا اور کہا کہ چینی فوج کو اس لائن سے پیچھے ہٹ جانا چاہیے تاکہ گفتگو شروع ہو سکے۔

چین کے لیے اس سے بڑی اخلاقی شکست اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے فوجی اقدام کو خود بیشتر کمیونسٹ حکومتوں اور مختلف ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں نے پسند نہیں کیا ہے! اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ روس نے ہندستان کو مگ ہوائی جہاز دینے کا جو وعدہ کیا اس پر وہ اب بھی قائم ہے۔ روس اور مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ممالک مثلاً رومانیہ اور چیکوسلاویکیہ وغیرہ ہندستان کو جو معاشی یا تکنیکی امداد دے رہے تھے یا ان ممالک کے ہندستان کے جو تجارتی تعلقات تھے ان میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ یہی نہیں ایک کمیونسٹ ملک یعنی یوگوسلاویہ نے لڑائی بندی کے معاملہ میں چین کے خلاف ہندستان کے موقف کی حمایت بھی کی ہے

اطالوی کمیونسٹ پارٹی کی دسویں کانگرس میں جو ابھی ختم ہوئی ہے، کمیونسٹ چین اور البانیہ کے خلاف خوب لے دے ہوئی اور ان کی روش کے خلاف ایک قرارداد بھی منظور ہوئی۔ کانگرس میں مسٹر خروشچوف کے ایک ڈپٹی مسٹر کوزلوف نے (امریکی نائب وزیر خارجہ برائے امور مشرقی مسٹر ہیریمین کے ایک بیان کے مطابق) ہندستان کے خلاف جارحانہ اقدامات کے لیے چین پر نکتہ چینی بھی کی اور اطالوی کمیونسٹ پارٹی کے معمر اور آزمودہ کار لیڈر مسٹر تولگلیٹی نے جو کچھ کہا وہ بھی چین کے اقدام کی مذمت کے مرادف ہے۔ انھوں نے کہا کہ چین اور ہندستان کے درمیان مسلح تصادم "غیر معقول" اور "لغو" بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ سامراج کے خلاف اور امن کے حق میں جو جد و جہد ہو رہی ہے اس پر اس لڑائی کا الٹا اثر ہو گا۔ اس کے علاوہ ان غیر جانب دار ملکوں کے لیے جن کی موجودگی دنیا میں ضروری ہے اور پر امن بقائے باہم کی جد و جہد میں جن کی بڑی اہمیت ہے یہ لڑائی ایک ضرب کاری ہے۔"

جو لوگ پاکستان اور پیکنگ ریڈیو سے ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈا سن کر خوش ہوتے ہیں وہ ملک کے غدار ہیں۔ ایسے عناصر کو فوراً گرفتار کرا دینا چاہیے اور ان کو عوام میں خوف و ہراس پھیلانے نہ دینا چاہیے۔" شری سی۔ بی۔ گپتا۔ وزیر اعلیٰ اترپردیش

"آج یہ اور زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہماری مشینیں برابر چلتی رہیں اور کارخانوں میں زیادہ سے زیادہ مال تیار ہو۔ انھوں کہا کہ ہم کو زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنا چاہیے تاکہ ہم کو اناج کی درآمد پر جو بھاری رقم خرچ کرنا پڑتی ہے وہ بچ جائے اور اسے دفاعی ضروریات کے لیے استعمال کیا جا سکے۔" شری بنارسی داس، وزیر اطلاعات، اترپردیش



پیسہ پیسہ آپ بچائیں دیش کی طاقت اور بڑھائیں

ہند کے سورماؤں سے

کاوش بدری

جانبِ دار چلو ، جانبِ کہسار چلو
اپنے سینوں میں لیے عزم جگردار، چلو

آج آسان ہے ہر جادہ دشوار، چلو
اَب زمانے کا زمانہ ہے طرفدار، چلو

شبِ دیجور کا سرگرم ہے بازار تو کیا
جلوۂ صبحِ درخشاں کے خریدار، چلو

سارے گلشن میں نہیں اپنے نشیمن کا جواب
برق کو آن میں کرلیں گے گرفتار، چلو

ہم اگر چاہیں تو بڑھ جائے ہمالہ کا وقار
اپنے ہی دم سے ہے تعمیر کا معیار، چلو

جستجو اپنی سلامت ہے تو منزل لاکھوں
بن گیا خضر[1] بہ خود قافلہ سالار، چلو

لاکھ صدیوں کا مقدر ہے ہر اک پل اپنا
تیز سے تیز ہے اب وقت کی رفتار، چلو

خوں سے لبریز نہ ہو خاکِ چمن، خاکِ وطن
آج لرزاں ہیں گھروں کے در و دیوار، چلو

بجھ نہ جائے کہیں یہ شمع یقیں، شمع وفا
اوج ہی اوج پہ ہے طالعِ بیدار، چلو

ہم لہو دے کے خریدیں گے حیاتِ جاوید
رونما ہوتے ہیں اب فتح کے آثار، چلو

[1] پنڈت نہرو

ہم اور وہ

افسر آزری

وہی، وہ لوگ جو کل تک ہمارے بھائی تھے
وہ آج زہر بھرا جام لے کے آئے ہیں
لبوں پہ طعنہ و دشنام لے کے آئے ہیں
محبتوں کا یہ انعام لے کے آئے ہیں

ہے اس لحاظ سے نعمت یہ آفتِ امروز
مٹا کے تفرقے یک جان ہو گئے ہیں ہم
فلک شگاف ہمالہ کی چوٹیوں کی قسم
نسیمِ صبح تھے طوفان ہو گئے ہیں ہم

منافقو! تمھیں لداخ چھوڑنا ہوگا
نہ راس آئے گی نیفا کی سرزمیں تم کو
حلف اُٹھاتے ہیں ہم امن کے تقدس کا
کہ ٹکنے دیں گے نہ ہم چین سے کہیں تم کو

ہزار بار اگر مر کے جنم لو، پھر بھی
ہمارے عزم کو تم زیر کر نہیں سکتے
کرن ہمیں تھے، ہمیں بھیم بھی تھے، ارجن بھی
ہمیں تو ہیں کہ جو مر کر بھی مر نہیں سکتے

بہادروں کے لیے موت کوئی چیز نہیں
مرے وطن میں یہ بچوں کا اک کھلونا ہے
برائے زندگی کچھ موت کم عزیز نہیں
ہمارے ہاں تو یہی اوڑھنا بچھونا ہے
ہمارا خون ہے زینتِ چمن کے لیے
زہے نصیب مریں مادرِ وطن کے لیے

افسانہ

ضمیر کی آواز

رضا عباس جعفری

غفور نے اپنا کرتا ایک طرف کر کے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی کوٹھری کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ برابر کی نالی میں تیز بہتا ہوا پانی عجیب سی آواز پیدا کر رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک

> "چین سے شہری اور فوجی دونوں محاذوں پر ہمیں لڑائی لڑنا ہے۔ جہاں ہمارے جوان محاذ جنگ پر ہماری سرحدوں کا دفاع کر رہے ہیں وہاں ہر شہری کو اندرون ملک اپنے فرائض انجام دینا ہیں!" —— جواہر لعل نہرو

نہ جانے کن خیالات میں کھویا بہتے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا اور پھر ایک دم سے چونکا اور اپنی بنڈی کی جیب سے ایک کنجی نکال کر کوٹھری کا دروازہ کھولتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ ایک نظر ساری کوٹھری پر ڈالی، اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور نہ جانے کون سے گانے کے بول گنگناتا ہوا پلٹا اور اندر سے دروازہ بند کر دیا۔

دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے چارپائی کے نیچے سے جو اسی کوٹھری میں بچھی ہوئی تھی ایک بکس گھسیٹا۔ بکس میں اس کے دو چار کپڑے پڑے تھے۔ اس کا ہاتھ ان کپڑوں کے نیچے گیا اور جب نکلا تو نوٹوں کی ایک گڈی اس میں تھی۔ اس نے انھیں گننا شروع کیا۔ ایک، دو، تین اور پھر دو سو پر جا کر وہ رک گیا۔ یہ روپے تو پچاس مرتبہ کے اس کے گنے ہوئے تھے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا ہاتھ بنڈی کے اندر کی جیب میں ڈالا۔ اس بار کھنکھناہٹ کے ساتھ کچھ سکے اور کچھ نوٹ اس کے ہاتھ میں آ گئے۔ اس نے گنا۔ بیس روپے اور اکیاون نئے پیسے تھے۔ اور اب کل ملا کر اس کے ہاتھ میں دو سو بیس روپے اور اکیاون نئے پیسے تھے۔ یہ سارا روپیہ اس نے بکس میں کپڑوں کے نیچے پھر رکھ دیا۔

اس نے سوچا چلو ایک بڑے کام سے تو نجات ملی۔ آج کتنے دن دن ہو گئے تھے اسے اسی طرح روپے گنتے ہوئے۔ اسے یاد آیا ایک ایک روپیہ اس نے کس محنت سے جمع کیا تھا اس کے ایک ایک پیسے کے اندر اس کا کتنا خون شامل تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ کس محنت سے اس نے اس سے پہلے بھی روپیہ جمع کیا تھا۔ لیکن اس دن جب وہ کوٹھری میں گھسا تھا تو کوٹھری کا تالا ٹوٹا ہوا ملا تھا اور جس مٹی کی ہانڈی میں اس نے روپے جمع کیے تھے وہ ایک طرف بکھری پڑی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر دہاڑیں مار کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ روپیہ اس نے اپنی بہن آمنہ کی شادی کے لیے جمع کیا تھا۔ لیکن لے جانے والے کو اس سے کیا غرض تھی کہ یہ روپیہ کسی کی مانگ میں سیندور بننے جا رہا ہے یا کسی میت کی قبر! روپیہ جا چکا تھا اور اس کے خیالوں میں اس کی بہن کی عمر اور بڑھ گئی تھی۔

"اب نہ جانے کب شادی ہو۔ کب میں پھر اتنا روپیہ جمع کر سکوں؟" اس نے سوچا تھا اور ایک آہ بھر کر مرے مرے قدموں سے کوٹھری کے باہر نکل گیا تھا۔

وہ چونک پڑا اور دو سو بیس روپے اور اکیاون نئے پیسوں کو ایک مرتبہ انجانے میں ٹٹول کر پھر دیکھ لیا اور دروازے کے پاس آ کر کنجی کھول دی۔ پھر دبے پاؤں کہیں دل گنگناتا ہوا بالٹی لے کر سامنے کے فٹ پاتھ پر لگے نل سے پانی بھرا۔ اسے کھانا پکانے کے لیے آگ جلانی تھی۔ اس نے چولھے کے پاس ہی رکھی لکڑیوں کو قاعدے سے جوڑ کر نیچے کاغذ رکھ کر دیا سلائی دکھا دی۔ پھر اس نے مونگ کی دال اور چاول جو ایک ہانڈی میں رکھے تھے دھو کر چولھے پر چڑھا دیے اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ اسے اپنی بہن آمنہ کی شادی کا پروگرام مکمل کرنا تھا۔ جس لڑکے سے اس نے شادی طے کی تھی وہ اسی لکھنؤ شہر ہی کا تھا۔ امین آباد میں بساطے کی اچھی خاصی

دوکان تھی۔ لڑکے والے اسی کے رشتہ دار تھے اور اچھی لڑکی کی تلاش میں تھے لہٰذا انھوں نے غفور کی حیثیت دیکھے بغیر نسبت طے کردی۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان کی شرافت دولت ہی سے نہیں ہوتی۔ غفور کے متعلق انھیں معلوم تھا کہ وہ مڈل پاس ہے۔ اس کے گھر والے کبھی خوش حال بھی تھے لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ غفور کو گاؤں چھوڑ کر شہر آنا پڑا اور بجائے اس کے کہ کسی دفتر میں وہ چپراسی گیری کرتا اس نے رکشا چلانا بہتر سمجھا۔ اس کے ماں باپ دونوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ صرف ایک نوجوان بہن تھی، آمنہ۔ اسے اس نے گاؤں میں اپنے ایک عزیز ہی کے یہاں چھوڑ دیا تھا۔ وہ اسے تنہا شہر میں کہاں رکھتا؟ لیکن وہ خود دار اتنا تھا کہ بہن کو اپنے عزیز کے یہاں بار بنا کر نہیں رکھنا چاہتا تھا، اس لیے وہ آمدنی میں سے کچھ روپیے ہر مہینے منی آرڈر کر دیا کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ اسے سب سے بڑی فکر تھی بہن کی شادی کی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ شہر میں

اپنی آمنہ کی شادی سے فارغ ہو گیا ہے اور اب اس کا جسم اور دماغ بہت ہلکا ہو گیا ہے۔ وہ عجیب سی سرخوشی کے عالم میں گنگناتا ہوا اٹھا اور کھچڑی میں بگھار دینے کی تیاریاں کرنے لگا۔

دوسرے دن چار باغ اسٹیشن سے جب وہ دو آدمیوں کو بٹھا کر لا رہا تھا تو اس نے ان دونوں کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ چین نے ہندوستان کی سرحد پر بڑا زبردست حملہ کر دیا ہے۔ وہ اکثر چائے کی دوکان پر اردو اخبار پڑھ لیا کرتا تھا۔ اتفاق سے اس دن اس نے اخبار نہیں پڑھا تھا۔ وہ چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس دن جتنے بھی آدمی اس کے رکشا میں بیٹھے ان سب کی زبانوں پر صرف ایک لفظ تھا، چین۔ تیسرے پہر کو اس نے رکشا محمد بھائی کے ہوٹل کے سامنے کھڑا کر دیا اور ابھی وہ محمد بھائی سے آنکھ بچا کر اندر داخل ہو ہی رہا تھا کہ وہ مچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے دو کسی

"میں اتر پردیش کے تمام شہریوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ چینی حملہ آوروں کا پورے عزم کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کریں اور سخت جدوجہد سے حاصل کی ہوئی آزادی کا تحفظ کریں اور یہ عہد کریں کہ جب تک ہمارے ملک کی مقدس سرزمین چینی حملہ آوروں سے خالی نہیں ہو جاتی اس وقت تک ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔"

———— سی بی گپتا۔ وزیر اعلیٰ، اتر پردیش

اسے ایک لڑکا اپنے عزیزوں میں مل گیا تھا۔ غفور کی شادی کے بھی پیغام آ رہے تھے لیکن وہ پہلے اپنی چھوٹی بہن کی شادی کے فرض سے ادا ہونا چاہتا تھا۔ اس نے کچھ زیورات بھی بنو لیے تھے اور انھیں گاؤں میں اپنے عزیز کے یہاں رکھوا دیا تھا۔ جو روپیہ اس نے اس کے علاوہ جمع کیا تھا اسے کچھ کپڑوں کی خریداری اور متفرق اخراجات کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔

چارپائی پر لیٹے لیٹے اس نے ایک جہیز کا حساب لگایا۔ برات کے سلسلہ میں اس نے سوچا کہ چچا (لڑکے کا باپ) سے کہوں گا کہ آپ ہی میری عزت رکھیے اور کم سے کم باراتی لے کر آئیے۔ خیالی پلاؤ پکاتے پکاتے اسے نہ جانے کتنی دیر ہو گئی۔ چاولوں کا پانی سوکھ کر چٹ چٹ کی آوازیں آنے لگیں تو وہ چونکا۔ چارپائی سے اٹھ کر جلدی سے کٹورے میں بھرے ہوئے پانی کو چلو میں لے کر چاولوں پر چھینٹا دیا اور چولھے کی ساری لکڑیاں باہر کھینچ لیں۔ چاولوں میں ذرا سی کسر تھی۔ وہ پھر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اسے لگا جیسے وہ

کو گالی دیتے ہوئے اندر سے باہر آ گئے۔

"کہاں تھے ابھی تک؟" وہ اس کے پاس آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "پتہ بھی ہے اس کم بخت چین نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ دھڑلے کی لڑائی ہو رہی ہے۔" غفور یہ آنکھیں پھاڑے سنتا رہا ——— لڑائی ہو رہی ہے۔ جیسی پہلی جنگ عظیم میں ہوئی تھی، جیسی دوسری جنگ عظیم میں ہوئی تھی۔ یہ ان لڑائیوں میں سے کون سی لڑائی ہے؟ پھر اس نے سوچا کہ لڑائی کوئی سی بھی ہو، کیسی ہی ہو، ہر لڑائی میں خون بہتا ہے، ہر لڑائی میں بچے یتیم ہو جاتے ہیں، عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں، ملک تباہ ہو جاتے ہیں، تہذیبیں تباہ ہو جاتی ہیں ——— کوئی سی بھی لڑائی ہو، کوئی سی بھی لڑائی ہو ——— اور جب اپنے ہی ملک پر حملہ کیا گیا ہو تو ———؟

وہ اٹھ کر محمد بھائی کے ہوٹل سے باہر آ گیا۔ سردی پڑنے لگی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ رکشا چلاتا، سیٹی بجاتا آ کر امین آباد میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی

بہن آمنہ کی شادی اب اس کے دماغ کے نہ جانے کون سے کونے میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے دماغ میں اب صرف جنگ گونج رہی تھی۔ ملک کے دشمنوں کے خلاف نفرت کا ایک لاوا سا ابل رہا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر تک وہ کھویا کھویا سا کھڑا رہا۔ پھر ایک سواری لے کر اسے حضرت گنج جانا پڑا۔ حضرت گنج سے وہ لوٹ ہی رہا تھا کہ اس نے دیکھا ایک ریڈیو کی دوکان پر لوگ بھیڑ لگائے کھڑے ہیں۔ رکشا ایک طرف روک کر وہ ریڈیو کے قریب چلا گیا۔ ریڈیو پر کوئی تقریر کر رہا تھا۔ آواز اسے جانی پہچانی سی لگی۔ "یہ وقت ہماری آزمائش کا ہے۔ ہم کو چاہیے کہ اپنے آپس کے سارے جھگڑے بھول کر ملک کو طاقت ور بنائیں۔ زیادہ سے زیادہ فصلیں پیدا کریں۔ زیادہ سے زیادہ روپیہ بینک میں جمع کریں۔ تاکہ وہ روپیہ ملک کے ہاتھوں کو مضبوط بنائے۔ دشمن کو کچلنے میں مدد دے۔" تقریر میں چین کی جارحیت، ہندوستان کی رواداری، چین کی بدعہدی، سبھی پر روشنی

"میں تمام غیر سرکاری تنظیموں، اداروں اور شہریوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ فوجیوں کے لیے روپیہ اور دوسری چیزیں جمع کرنے میں پورے طور پر تعاون کریں۔ . . . . اس مقصد کے لیے دہلی میں وزیر اعظم دفاعی فنڈ قائم کیا گیا ہے جس میں لوگ براہ راست روپیہ بھیج سکتے ہیں۔ اسٹیٹ بنک اور ریزرو بنک آف انڈیا کی مختلف شاخوں میں سونے کے عطیات لینے کے انتظامات کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ریاستی سطح پر فوجیوں کے لیے وزیر اعلیٰ فنڈ قائم کیا گیا ہے۔" ——— سی بی گپتا۔ وزیر اعلیٰ اتر پردیش

ڈالی گئی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس کا ایک ایک لفظ اس کے دل میں گھر کرتا جا رہا ہے۔ اس نے سوچا ان الفاظ میں کتنا خلوص ہے کتنا عزم ہے کتنا استقلال ہے کتنی طاقت ہے کتنی توجہ ہے۔ وہ پہچان گیا تھا کہ یہ آواز کس کی ہے۔ اسی آواز کو وہ آزادی کے بعد سے ہر پندرہ اگست کو محمد علی کے ہوٹل میں سنتا آیا تھا۔ یہ آواز جواہر لعل نہرو کی تھی۔ اسے لگا جیسے صبح سے وہ جس بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا وہ اس کے عظیم رہنما نے اس کے دل میں اتار دی ہے۔ اسے اپنے جسم میں نیا خون سا دوڑتا محسوس ہوا۔ "میں اپنے ملک کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ ——— میں کیا کر سکتا ہوں؟" چھٹتی ہوئی بھیڑ کے ساتھ وہ بھی آہستہ آہستہ مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا اپنے رکشا کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"میں اپنے ملک کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ کون سی قربانی پیش کر سکتا ہوں؟" اپنے دل پر اسے ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ انسانیت کے قرضے کا ٹک کے قرضے کا۔ وہ تھوڑی دیر سکتے کے سے عالم میں کھڑا رہا اور پھر آہستہ آہستہ لاشعوری طور پر اس کے دل میں ایک لاوا سا پھوٹ نکلا۔ نفرت کا ایک عجیب سا جذبہ ابھر آیا۔

"عجیب بات ہے۔ ہم پر اُس ملک نے چڑھائی کی ہے جس کے ساتھ ہم نے نہ جانے کتنا سلوک کیا۔ جس کی ہم ہر جگہ حمایت کرتے رہے۔ جسے ہم نے بھائی کہا۔ لیکن یہی چین ہمارے ملک پر حملہ کرنے چلا ہے ——— اُس ملک پر جہاں کرشن نے پریم کی بنسری بجائی ہے، جہاں بُدھ اور گاندھی نے اہنسا کے چراغ جلائے ہیں، جہاں نہرو نے امن عالم کا پیغام دیا ہے۔" اسے اپنے دل میں آج تک کی پڑھی ہوئی تاریخ اور واقعات ابھرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کے خون میں نفرت کا ایک اُبال سا آ گیا۔

"لیکن لوگ نہ جانے کیوں بھول جاتے ہیں کہ اسی ملک میں بھیم اور ارجن بھی پیدا ہوئے ہیں۔ رانی لکشمی بائی اور بیگم حضرت محل بھی پیدا ہوئی ہیں۔ ہم اگر ایک طرف امن و آشتی کے پیغامبر ہیں تو دوسری طرف موت کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھنے والے بھی یہاں گلاب کی حسین پنکھڑیاں صرف اسی لیے نہیں ہیں کہ لوگ انھیں دیکھ کر لب محبوب کا ہی تصور کریں۔ یہاں کی گلاب کی پنکھڑیوں سے ہیرے کا جگر بھی کٹ سکتا ہے۔ یہاں گلاب کی پنکھڑیاں ہزاروں چلتی ہوئی تلواریں بھی بن سکتی ہیں۔ لوگ نہ جانے یہ کیوں بھول جاتے ہیں ——— نہ جانے کیوں بھول جاتے ہیں ———" اس نے تیزی سے پیڈل پر زور دے کر پورے بدن کا بوجھ پیڈل پر ہی چھوڑ دیا۔ رکشا تھوڑی دور تک اپنے آپ ہی دوڑتا چلا گیا۔

اور پھر لڑائی شدت اختیار کر گئی۔ اخبار جنگ کی خبروں سے بھرے نظر آنے لگے۔ سارے ملک میں ایک جوش اور ایک عزم پیدا ہو گیا۔ لوگ سیاست، مذہب اور زبان کے اختلاف کو بھول گئے۔ وطن کو ایک بے شرم

دشمن سے بچانے کا جذبہ ہر دل میں نظر آنے لگا۔ جگہ جگہ جلوس نکلنے لگے۔ خواتین ہند نے بھی اپنے آنچلوں کو پرچم بنا لیا۔ نعروں سے آسمان گونجنے لگا۔ چینیوں کے خلاف نفرت اپنی انتہا پر پہنچ گئی۔ وزیر اعظم اور وزیر اعلا فنڈ میں کروڑوں روپیہ آنے لگا۔ ہندستانی جوانوں کے لیے سوئٹر بُنی جانے لگیں۔ انھیں کمبل اور موزے بھیجے جانے لگے۔ نئی نویلی دلھنیں دل کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب کر اپنے زیوروں کا عطیہ بھیجنے لگیں۔ فوجی جوانوں سے بھری ہوئی اسپشل ٹرینیں، لام پر جانے لگیں۔

وہ اپنے دل پر ایک بوجھ سا لیے سارے شہر میں رکشا چلاتا رہا۔ ہندستان کے جوانوں کی بہادری اور قربانیوں کی داستانیں سُنتا رہا۔ سپاہیوں کے آرام و آسائش کے لیے شہر کی خواتین جو خدمتیں کر رہی تھیں ان کے بارے میں اخبار میں پڑھتا رہا۔ جس خلوص اور فیاضی سے لوگ چندہ دے رہے تھے اس کا بھی حال سنتا رہا۔ یہ تمام خبریں اور تمام باتیں اس کے دل میں ایک طرف مُسرت کے جذبات پیدا کرتی تھیں اور دوسری طرف ایک عجیب سی الجھن اور گھٹن۔ "میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں کیا کروں؟" وہ اپنی کوٹھری میں آ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔

پھر اس دن جب وہ کوٹھری سے باہر نکلا تو سامنے اس کے چچا کھڑے تھے۔ انھیں دیکھ کر اسے یاد آ گیا کہ اسے اپنی بہن آمنہ کی شادی بھی کرنی ہے۔ پھر اسے وہ روپے یاد آ گئے جو اس کے بکس میں محفوظ تھے اور جن سے وہ اپنی آمنہ کی شادی کرنے والا تھا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی لہر اٹھی۔ وہ عجیب رُندھے ہوئے سے انداز میں مسکرا دیا۔

"آیئے چچا" اس نے کہا اور انھیں لے کر اندر کوٹھری میں آ گیا۔ تھوڑی دیر تک رسمی بات چیت ہوتی رہی اور پھر دونوں بات کرتے کرتے نہ جانے کیوں خاموش ہو گئے۔ کسی کی بھی زبان سے وہ بات نہیں نکل رہی تھی جسے وہ کہنا چاہتے تھے۔ پھر بھی غفور کے چچا زیادہ دنیا دیکھے ہوئے آدمی تھے۔ انھوں نے ہی بات شروع کی:

"میں چاہتا ہوں کہ نکاح کے دو بول ہو جائیں۔ زمانہ خراب ہو رہا ہے۔ تمھاری کیا رائے ہے؟"

غفور صرف ہوں کر کے رہ گیا۔ اس کے دل کو اس جملے نے ہزاروں طوفانوں سے ٹکرا دیا تھا۔ وہ عجیب کشمکش و پیچ میں پڑ گیا تھا۔ اس کے سامنے ہزاروں چہرے تصویروں کی طرح گھوم رہے تھے۔ اسے لگا جیسے کہیں دور شہنائی بج رہی ہے اور کوئی دلہن آہستہ آہستہ گھونگھٹ سرکا کر اپنے حنائی ہاتھوں سے اپنے زیور اتار رہی ہے، کوئی خاتون جوانوں کے لیے سوئٹر بُن رہی ہے، کوئی نوجوان فوج میں بھرتی ہو رہا ہے، کوئی بوڑھا کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کو جیب میں ڈال کر کوئی چیز نکال رہا ہے، کوئی مزدور اپنی ایک دن کی آمدنی چندے میں دے رہا ہے، کوئی بچہ اپنی بچت کا روپیہ لڑائی کے فنڈ میں پیش کر رہا ہے ــــ اور ان سب کے پیچھے اسے آمنہ نظر آئی۔ ایک لمحہ اسے معلوم ہوا جیسے وہ دلھن بنی ہوئی ہو۔ دوسرے ہی لمحہ اسے یہ نظر آیا جیسے وہ کچھ روپیہ ہاتھ میں لیے کسی طرف جا رہی ہو۔

یہ سارے منظر غفور کے سامنے تیزی سے گذرتے گئے۔ مگر پھر وہ چونک پڑا۔ اس کے سامنے صرف اس کے چچا بیٹھے اپنے سوال کا جواب طلب کر رہے تھے۔ اور جواب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ ہندوستان کے جوانوں نے، خواتین نے، بچوں نے، بوڑھوں نے، کسانوں نے، مزدوروں نے، دلھنوں نے اور خود اس کی آمنہ نے اسے یہ جواب سمجھا دیا تھا۔

"چچا!" وہ بولا۔ "یہ وقت شادی رچانے کا نہیں ہے۔ ملک کے جوان ہمارے ملک کے لیے اور ہمارے لیے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں۔ ہمیں ایک بے شرم دشمن سے مقابلہ کرنا ہے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے جوانوں کو ہتھیار مہیا کرنا اور ان کی ضروریات کی چیزیں فراہم کرنا ہے۔ اس کے لیے کروڑوں روپے کی ضرورت ہے۔ یہ روپیہ کہاں سے آئے گا۔ ہمیں آپ دیں گے۔ اگر ہم دیش کی خاطر اپنی جان نہیں دے سکتے تو کچھ نہ کچھ مال ضرور ہی پیش کر سکتے ہیں۔"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر بولا: "چچا! مجھے ملک کی آواز سے آواز ملانی ہوگی۔ میں نے آمنہ کی شادی کے لیے جو روپیہ بچا کر رکھا تھا وہ میں ڈیفنس فنڈ میں دے دوں گا۔ آمنہ کی شادی ابھی کچھ عرصے رک سکتی ہے۔"

غفور نے یہ کہا اور اٹھ کر کوٹھری میں ٹہلنے لگا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر تک ٹہلتا رہا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب شیخ صاحب اٹھ کر اس کی کوٹھری سے چلے گئے۔

سپاہی کا مکتوب

(شریکِ حیات کے نام)

اقبال ماہر

السّلام اے راحتِ دل، مونسِ جاں! السّلام
رازدارِ زندگی، عصمت بہ داماں! السّلام

خط تمہارا مل گیا، جس کا تھا مجھ کو انتظار
اور میں جس کے لیے رہتا تھا پہروں بے قرار

میں تو سمجھا تھا، بہم راحت کا ساماں ہو گیا
خط مگر پڑھتے ہی دل میرا پریشاں ہو گیا

یاد کیوں تم نے دلایا وہ زمانہ عیش کا
جس میں چھیڑا تھا کبھی ہم نے ترانہ عیش کا

لکھ کے اپنا حال فرقت تم نے یہ کیا کر دیا
اور احساسِ جدائی کو دو بالا کر دیا

میں نے یہ مانا کہ تم میرے لیے ہو بے قرار
میں نے یہ مانا کہ چشمِ منتظر ہے اشک بار

میں نے یہ مانا کہ تم بے چین ہو، بے خواب ہو
میں نے یہ مانا کہ تم میرے لیے بے تاب ہو

میں نے یہ مانا تمھیں دل کا سکوں حاصل نہیں
اس سمندر میں ہو جس میں دور تک ساحل نہیں

تم کو لیکن منظرِ خونیں دکھاؤں کس طرح
فرض مجھ پر کیا ہے یہ تم کو بتاؤں کس طرح

کس طرح کہہ دوں تمہارے پاس آ سکتا نہیں
میں تمہارے عیش کی محفل سجا سکتا نہیں

جنگ کی حالت میں بھی، اے راحتِ قلب و جگر
عہدِ رفتہ کی قسم، اب تک تمھیں بھولا نہیں

جنگ میں اچھے نہیں لگتے مگر راحت کے گیت
مرد ایسے وقت گا سکتا نہیں عشرت کے گیت

شوق لافانی تمہارا، عشق میرا لازوال
دل میں لیکن کیا کبھی گزرا تمہارے یہ خیال

اے امینِ دردِ الفت! تم نے سوچا بھی کبھی
کیا حقیقی عشق ہے، کیا ہے حقیقی زندگی

فطرتِ معصوم، کیا اتنا تجھے معلوم ہے
کیا ہے غرضِ زندگی، کیا عشق کا مفہوم ہے

زندگی در اصل وہ ہے جو وطن کے کام آئے
زندگی وہ شے ہے نہ جس پر شرم کا الزام آئے

عشق و الفت نام ہے ایمان کا ایثار کا
دل میں رہ رہ کر مچلنا جذبۂ بیدار کا

میری قسمت کچھ بھی ہو فطرت غلامانہ نہیں
گیسوئے ہستی ابھی منتِ کشِ شانہ نہیں

جو وطن کا تیغ کے سائے میں بھی گائے گا راگ
عمر بھر قائم رہے گا اُس کی بیوہ کا سہاگ

جس طرف جائے گا اُس کا باپ ہوگا سرخ رو
اُس کے بیٹے پائیں گے اپنے وطن میں آبرو

تیغ سے روکے گا جب وہ جنگ بازوں کا جنوں
امن ہوگا ہر طرف ہر سمت پھیلے گا سکوں

جب کہیں گے لوگ مجھ کو کامیاب و فتح مند
افتخارِ خاص سے ہوگا تمہارا سر بلند

میں تمہارے پاس ہنستا مسکراتا آؤں گا
سازِ آزادی پہ رنگیں گیت گاتا آؤں گا

لڑائی کی ڈائری

۱۵ر نومبر ۱۹۶۲ء سے ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۲ء تک

۱۵ر نومبر ۱۹۶۲ء۔ ہندوستانی سپاہیوں نے نیفا کے لوہت ڈویژن میں والونگ کے شمال مغرب میں ایک اہم چینی مورچے پر حملہ کیا۔ ● مرکزی وزیر داخلہ نے اعلان کیا کہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں ہر تندرست طالب علم کی این سی سی میں شرکت لازمی ہے۔ ● مسٹر ڈنکن سینڈیز، برطانوی وزیر کامن ویلتھ نے دارالامرا میں اعلان کیا کہ ہندوستان کو مزید برطانوی اسلحہ بھیجے جانے کے سلسلے میں ہندوستان کی حکومت سے بات چیت ہو رہی ہے۔

۱۶ر نومبر ۱۹۶۲ء۔ چینی فوجوں نے والونگ کے علاقے میں ایک زبردست حملہ شروع کر دیا۔ ہندوستانی سپاہیوں نے نہایت بہادری سے مقابلہ کر کے ان کی پیش قدمی روکے رکھی۔

۱۷ر نومبر ۱۹۶۲ء۔ مشہور برطانوی فلسفی، ارل رسل نے ایک بیان میں کہا کہ اشتعال انگیزی کی ذمہ داری چینیوں پر ہے۔ ● مزدوروں کی کئی عالمی انجمنوں نے چینی جارحیت کی مذمت کی۔

۱۸ر نومبر ۱۹۶۲ء۔ والونگ کے علاقے میں ہندوستانی فوجیں دشمن کو سخت نقصان پہنچا کر بعض مقامات سے پیچھے ہٹ گئیں۔ ● وزیر اعظم نہرو نے ارل رسل کو لکھا کہ چینیوں کی تین نکاتی تجویز کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان ان کے شرائط پر ہتھیار ڈال دے۔ اسی لیے، وزیر اعظم نے لکھا، ہندوستان کو یہ شرطیں قبول نہیں۔ ● حکومت ہند نے امریکہ کو یہ یقین دلایا ہے کہ جو اسلحہ اسے امریکہ سے چینی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے مل رہے ہیں وہ ضرورت نہ باقی رہنے پر واپس کر دیے جائیں گے۔ یہ یقین دہانی پاکستان کے اس اندیشے کو دور کرانے کے لیے کی گئی کہ امریکی اسلحہ کہیں پاکستان کے خلاف نہ استعمال کیے جائیں۔

۱۹ر نومبر ۱۹۶۲ء۔ وزیر اعظم نے ایک براڈکاسٹ میں کہا "اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لیے آزاد ہندوستان کی یہ پہلی جنگ ہے اور ہندوستان اس جنگ میں شکست کھانے کے لیے تیار نہیں ہے، چاہے یہ جنگ کتنے ہی طویل عرصے تک جاری رہے اور ہم کو اس سے چاہے جتنا بھی نقصان پہنچے۔" ● ہندوستانی سفیر متعینہ امریکہ نے صدر کینیڈی کو وزیر اعظم نہرو کا ایک خط دیا جس میں فوراً اسلحہ بھیجنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ ● سرکاری طور سے اعلان ہوا کہ سونے کے بانڈ پر انکم ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔

۲۰ر نومبر ۱۹۶۲ء۔ وزیر اعظم نے لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں اعلان کیا کہ چشول ہمارے ہاتھ میں ہے لیکن چینی بوم ڈیلا سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ ● وزیر اعظم نے ہر دو مجالس قانون ساز میں یہ بھی اعلان کیا کہ جنرل تھاپڑ، سپہ سالار افواج ہند نے خرابی صحت کی بنا پر رخصت مانگی ہے جو انھیں دے دی گئی ہے اور ان کی جگہ لفٹنٹ جنرل جے۔ این: چودھری نئے سپہ سالار مقرر کیے گئے ہیں۔

۲۱ر نومبر ۱۹۶۲ء۔ چینی حکومت کا اعلان شائع ہوا کہ چینی فوجیں آج ساڑھے نو بجے رات (ہندوستانی وقت) سے اپنی طرف سے جنگ بند کر دیں گی اور پہلی دسمبر سے وزیر اعظم چین کی ۲۴ر اکتوبر والی تجویزوں پر عمل کرنے کی غرض سے پیچھے ہٹنا شروع ہو جائیں گی یعنی ہندوستان اور چین کے درمیان ۷ر نومبر ۱۹۵۹ء کو واقعی قبضے کا جو خط تھا اس کے ۲۰ کیلو میٹر پیچھے چلی جائیں گی اور مغربی اور دوسرے علاقوں میں بھی وہ جہاں ہیں وہاں سے ۲۰ کیلو میٹر پیچھے چلی جائیں گی۔ وزیر اعظم نہرو نے لوک سبھا میں اس تجویز کے بارے میں کہا کہ وہ انھیں سرکاری طریقے سے ابھی تک موصول نہیں ہوئی ہے لیکن ہندوستان پہلے کر چکا ہے کہ جب تک چینی فوجیں ۸ر ستمبر ۱۹۶۲ء کے خط تک نہ واپس چلی جائیں ہندوستان، حکومت چین سے کوئی گفت و شنید نہ کرے گا۔ ● برطانیہ ایک مشن نئی دہلی بھیج رہا ہے۔ ● امریکہ کے پریسیڈنٹ کینیڈی نے اعلان کیا کہ مسٹر ہیری مین کو مع کچھ امریکی افسران کے آج نئی دہلی روانہ کیا جا رہا ہے جہاں وہ ہندوستان کی فوجی ضروریات کے متعلق بات چیت کریں گے۔ ● شری وائی، بی، چوہان، سابق وزیر اعلیٰ حکومت مہاراشٹر نے آج مرکزی وزیر دفاع کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ ● چین کی جنگ بندی کی تجویزیں حکومت ہند کو موصول ہو گئیں۔

۲۲ر نومبر ۱۹۶۲ء۔ وزیر اعظم نہرو نے لوک سبھا میں بتایا کہ چینی فوجوں نے کل شام سے جنگ بند رکھی ہے۔ ● جنرل سر رچرڈ ہل، سپہ سالار افواج برطانیہ اور مسٹر جان ٹلنے، پارلیمنٹری انڈر سکریٹری وزارت کامن ویلتھ مع کچھ اور برطانوی افسران کے ہندوستان کو مزید برطانوی اسلحہ پہنچانے کی غرض سے دہلی پہنچ گئے۔ ● کناڈا نے چھ ڈکوٹا ہوائی جہاز ہندوستان کو بھیجے۔

۲۳ر نومبر ۱۹۶۲ء۔ وزیر اعظم نہرو نے لوک سبھا میں بتایا کہ سرحد پر خاموشی رہی

● ہندوستان کو جنگی امداد دینے کے سلسلے میں جو برطانی اور امریکی مشن دہلی آیا ہے اس کے افراد وزیر اعظم نہرو وزیر دفاع اور ہندوستانی سپہ سالار اور دوسرے افسران سے ملے۔ ● حکومت ہند نے پاکستان اسمبلی میں اس الزام کو بالکل بے بنیاد قرار دیا کہ ہندوستان اور امریکہ میں پہلے سے کوئی خفیہ سمجھوتہ ہے۔ ● بارہ امریکی "سی ۱۳۰" فوجی بار بردار ہوائی جہاز دہلی پہنچ گئے۔ ● حکومت آسٹریلیا نے ہندوستان کو اسلحہ بھیجنے کی پیش کش کی۔ اور اس پیش کش کو حکومت ہند نے قبول کر لیا ہے۔ ● حکومت آسام نے تیز پور کے ڈپٹی کمشنر کو پچھلے ہفتے تیز پور سے بغیر اجازت کے چلے جانے اور اپنی جگہ چھوڑ دینے پر معطل کر دیا۔

۲۴ نومبر ۱۹۶۲ء سکریٹری امور خارجہ حکومت ہند شری ایم۔ جی۔ ڈیسائی نے چینی ناظم الامور (شارژ ڈے افیرس) کو طلب کر کے چینی جنگ بندی تجاویز کے سلسلے میں کئی امور کی تشریح چاہی۔ چینی ناظم الامور نے کہا کہ وہ اپنی حکومت سے جواب حاصل کر کے مطلع کرے گا۔ ● برطانی اور امریکی مشن اسلحہ کی فراہمی کے سلسلے میں حکومت ہند سے بات چیت کرتے رہے۔ ● ایک ہزار ہندوستانی جو اقوام متحدہ کے ماتحت غازا میں تھے بمبئی واپس آ گئے۔

۲۵ نومبر ۱۹۶۲ء سرحد پر جنگ بندی۔ ● دہلی میں پنڈت جواہر لعل کی زیر صدارت نیشنل ڈیفنس کونسل کی پہلی میٹنگ ہوئی جس میں فوجی معاملات کی ایک کمیٹی کا بنانا طے کیا گیا۔ فوجی کمیٹی کے صدر شری چوان وزیر دفاع اور اراکین میں ہندوستان کی بری، بحری، ہوائی فوجوں کے سپہ سالار، تین ریٹائرڈ جنرل (یعنی جنرل راجندر سنگھ جی، جنرل تھمیا، لفٹنٹ جنرل تھوریٹ) ڈاکٹر کوٹھاری (چیرمین یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن) اور وزیر دفاع شامل ہیں۔ نیشنل ڈیفنس کونسل نے شری لال بہادر شاستری وزیر داخلہ کی صدارت میں ایک اور کمیٹی بنائی جو دفاع وطن کے قومی جذبے کو تیز تر کرے گی اور اس سلسلے میں ضروری ہدایتیں دے گی۔ ● مسٹر ڈنکن سینڈیز وزیر کامن ویلتھ حکومت برطانیہ، ہندوستان کو مدد دینے کے سلسلے میں دہلی آ گئے ہیں۔ جنرل سر رچرڈ ہل سپہ سالار افواج برطانیہ اور جنرل ایڈمس سپہ سالار افواج امریکہ ہندوستانی اعلیٰ فوجی افسروں کے ساتھ "نیفا" کے مورچے کا معائنہ کرنے کے لیے آسام گئے۔ ● حکومت سیلون نے حکومت ہند کو مطلع کیا ہے کہ وہ ہند۔ چین تنازعہ ختم کرنے کے ذرائع پر غور کرنے کے لیے غیر جانب دار ملکوں کی ایک کانفرنس کرنے جا رہی ہے۔

۲۶ نومبر ۱۹۶۲ء ہندوستان نے جنگ بندی کی چینی تجویز کے بارے میں جو تشریحات چاہی تھیں ان کا جواب حکومت ہند کو موصول ہو گیا مگر وزیر خارجہ حکومت ہند نے چینی ناظم امور سے مزید تشریحات چاہی ہیں۔ ● مغربی جرمنی کے صدر ڈاکٹر ہنرک لیبکے نئی دہلی آئے اور اپنی دو تقریروں میں "چینی جارحیت" کی سخت مذمت کی۔ ● سابق وزیر اعظم نیپال، ڈاکٹر کے، آئی، سنگھ نے (جو ایک مرتبہ چین میں پناہ لے چکے ہیں) کہا کہ چینی جارحیت نے جنوب مشرقی ایشیا کے تمام جمہوری ملکوں کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ ● مسٹر ہیری مین اور مسٹر سینڈیز، وزیر اعظم نہرو اور دوسرے اکابر سے امریکی اور برطانی امداد کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کرتے رہے۔

۲۷ نومبر ۱۹۶۲ء برطانوی مشن اور ہندوستانی رہنماؤں میں مذاکرات کے نتیجے میں آج یہ طے ہو گیا کہ ہندوستان کو برطانی اسلحہ اور فوجی امداد بغیر کسی قیمت کے، لیکن ایک مالی حد کے اندر دی جائے گی۔ ● سمجھوتے کے خطوط پر مسٹر سینڈیز اور شری چوان نے دستخط کیے۔ ● مسٹر سینڈیز پاکستان روانہ ہو گئے۔ ● امریکہ کے جنرل ایڈمس نے ہندوستانی فوجوں کی بہادری کی تعریف کی اور کہا کہ اتنے بلند پہاڑوں پر جنگ کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ ● مسٹر سین وزیر قانون ہندوستان کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرنے کے لیے غانا اور مصر روانہ ہو گئے۔ ● مسز لکشمی مینن وزیر ریاست برائے امور خارجہ اسی مقصد سے ڈاکٹر گوپال ڈائرکٹر ہسٹاریکل ڈویژن کے ساتھ، برما، کمبوڈیا، انڈونیشیا اور سیلون کے لیے روانہ ہو گئیں۔

۲۸ نومبر ۱۹۶۲ء مسٹر ہیری مین اسسٹنٹ سکریٹری امور خارجہ، امریکہ نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ امریکہ جو فوجی امداد ہندوستان کو دے رہا ہے اس سے پاکستان کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ رہ گیا یہ کہ پاکستان امریکہ سے کہے کہ اپنی پالیسی ہمارے کہنے کے مطابق وضع کرو تو یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ دنیا میں ایسا کوئی ملک نہیں ہے جو امریکہ کو حکم دے سکے کہ تمھاری پالیسی کیا ہونا چاہیے۔ ● امریکی اور برطانی سپہ سالار اور دوسرے افسران لداخ کے مورچے کا معائنہ کرنے گئے۔ ● مسز لکشمی مینن نے رنگون میں بتایا کہ چینیوں نے اپنی تجاویز کی جو توضیح کی ہے اس سے مزید الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء وزیر اعظم ہند و صدر پاکستان کا مشترکہ اعلان شائع ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان اپنے باہمی اختلافات کو دور کرنے کے لیے باہمی گفت و شنید کریں گے۔ ● وزیر اعظم نہرو کو مسٹر چو، این، لائی کا ایک خط موصول ہوا

جس میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اگر حکومت ہند اشتراک عمل سے انکار کرتی ہے تو جنگ بندی میں، جو عمل میں آچکی ہے خلل پڑ سکتا ہے۔ ● کناڈا کے وزیر اعظم مسٹر ڈیفن بیکر نے کناڈا کے دارالعوام میں کہا کہ کناڈا ہندوستان سے مزید دفاعی امداد کے بارے میں معاہدہ کرنے پر غور کر رہا ہے۔ اس امداد میں فوجوں کے لیے جانے کا سامان اور خام صنعتی مال بھی شامل ہوگا۔

۳۰ر نومبر ۱۹۶۲ء۔ حکومت ہند نے چینی تجاویز جنگ بندی کے سلسلے میں مزید وضاحت چاہی۔ ● چینی وزارت دفاع نے اعلان کیا کہ حسب اعلان سابق کل (یکم دسمبر) سے اس کی فوجیں پیچھے ہٹنا شروع ہوں گی۔

یکم دسمبر۔ وزیر اعظم نہرو نے آج چینی وزیر اعظم مسٹر چو این لائی کو لکھا کہ چین نے مغربی وسطی اور مشرقی سیکٹروں میں "۷ر نومبر ۱۹۵۹ء کو واقعی قبضہ کی جو لائن" بتائی ہے اسے ہندوستان تسلیم نہیں کرتا۔ ● پنڈت نہرو نے چینی وزیر اعظم کے ۲۸ر نومبر کے خط کے جواب میں یہ بھی لکھا ہے کہ چین کی ۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۲ء کی سہ نکاتی تجویز کی اور جنگ بندی اور فوجوں کے پیچھے ہٹنے سے متعلق ۲۱ر نومبر ۱۹۶۲ء کے اعلان کا "واضح مقصد ان علاقوں پر قابض ہو جانا ہے جو ۷ر نومبر ۱۹۵۹ء کو یا ۸ر ستمبر ۱۹۶۲ء سے قبل کسی وقت بھی چینیوں کے انتظامی کنٹرول میں کبھی نہیں رہے۔"
● صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ایک طرفہ جنگ بندی اور فوجوں کے واپس جانے کی چینی حکومت کی تجویزوں کے سلسلے میں آج ایک جوابی تجویز رکھی اور کہا کہ میں چینی حکومت سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کنٹرول لائن یا واقعی کنٹرول لائن یا غیر قانونی میک مہن لائن کی بات کیوں کی جائے۔ ہماری سیدھی سی تجویز یہ ہے کہ ۸ر ستمبر ۱۹۶۲ء کے بعد سے دو مہینے کے اندر انھوں نے جن علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے اسے چھوڑ دیں۔" ● چینی ریڈ کراس نے ہندوستانی ریڈ کراس کو کل مطلع کیا کہ ۵۰ ہندوستانی بیمار یا زخمی فوجی اور دس سڑک کی تعمیر کا کام کرنے والے) ۳ ہندوستانی زخمی ۵ر دسمبر کو رہا کیے جائیں گے۔
● دالونگ سے نیو چائنا نیوز ایجنسی کی ایک خبر میں کہا گیا ہے کہ چین کی ۲۱ر نومبر کی جنگ بندی تجویز کے مطابق نیفا کے علاقے میں دو چوکیوں چیلا اور بمود پر سے چین کے اگلے حفاظتی دستے شمال کی جانب پیچھے ہٹ آئے۔

۲ر دسمبر ۱۹۶۲ء۔ یو۔ پی کے شہری کونسل نے اپنے پہلے جلسے میں جو آج گورنمنٹ ہاؤس لکھنؤ میں ہوا ۸ ذیلی کمیٹیاں بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ سات کمیٹیاں فنڈ اکٹھا کرنے، تعلقات عامہ اور عوام کے اشتراک، میڈیکل، نوجوانوں اور طالب علموں، شہری دفاع، جوانوں کی آسائش اور فلاحی کاموں اور اقتصادی مسائل سے متعلق ہوں گی۔ آٹھویں کمیٹی ایک چھوٹی سی انتظامی کمیٹی ہوگی جو فوری فیصلے کرے گی اور ساتوں کمیٹیوں کے کام میں رابطہ پیدا کرے گی۔

۳ر دسمبر ۱۹۶۲ء۔ وزیر اعظم نہرو نے لوک سبھا میں کہا کہ چینیوں کے تخلیہ کی صورت حال ایک حد تک الجھن پیدا کرنے والی ہے۔ ایک طرف تو اس کے آثار پائے جاتے ہیں کہ چینی مورچوں سے ہٹ رہے ہیں۔ دوسری طرف اگلے مورچوں سے حقیقی معنوں میں وہ نہیں ہٹے ہیں۔
● نیفا کے اگلے علاقوں کا دورہ کرنے کے بعد امریکی سفیر ڈاکٹر گلبرتھ نے اخباری نامہ نگاروں سے کہا کہ وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا اس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ "ہم آپ کے ساتھ ہیں اور امید کرتے ہیں کہ جس حد تک فاصلہ اور دوسری مشکلیں اجازت دیں گی ہم مددگار ثابت ہوں گے۔" ● چین میں ہندستان کے ناظم الامور شری پی۔ کے۔ بنرجی نے چینی وزیر اعظم مسٹر چو۔ این۔ لائی کے نام پنڈت نہرو کے اس خط کی نقل پیکنگ میں وزارت خارجہ کے حوالہ کی جس میں ۲۱ر نومبر کی چینی تجویزوں کو ان کی موجودہ شکل میں مسترد کر دیا گیا ہے اور مزید وضاحت کے لئے لکھا گیا ہے۔ ● آسام اور نیفا میں چینی جاسوسوں کے ایک مبینہ گروہ کی موجودگی پر بیان دیتے ہوئے وزیر داخلہ شری لال بہادر شاستری نے آج لوک سبھا کو یقین دلایا کہ توڑ پھوڑ اور جاسوسی کی سرگرمیوں سے نپٹنے کے لئے سخت ترین اقدامات کئے جا رہے ہیں اور آئندہ بھی کئے جائیں گے۔

۴ر دسمبر ۱۹۶۲ء۔ وزیر اعظم پنڈت نہرو نے لوک سبھا میں ان خبروں کی تصدیق کی کہ چینی فوجوں نے چین کی جانب سے یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان اور اس پر عمل درآمد کے بعد بھی ہندستانی فوجیوں پر جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں نیفا کے محاذ سے واپس ہو رہے تھے ڈرانگ زونگ اور اس کے آس پاس متعدد بار گولیاں چلائیں۔ پھر ۲۲ر نومبر کو چینی فوجوں نے کوئی ۲۰۰ ہندستانی عملہ پر جو چھوٹے چھوٹے جتھوں میں محاذ جنگ سے واپس ہو رہے تھے ڈرانگ زونگ کے علاقے میں تین جگہوں پر اور ایک مقام پر جو اس کے ۸ میل جنوب میں ہے

گولیاں چلائیں۔ پھر ۲۳ نومبر اور ۲۵ نومبر کو چینیوں نے کچھ اور لوگوں پر فائرنگ کی۔ اس کے علاوہ کچھ اور آدمیوں پر جو سڑکیں بنا رہے تھے فائرنگ کی گئی۔ ● جو ۷۰ بیمار اور زخمی ہندستانی جنگی قیدی کل بوم ڈیلا میں انڈین ریڈ کراس کے حوالہ کئے جائیں گے۔ ہندستانی ریڈ کراس کے نام چینی ریڈ کراس کے ایک مراسلہ کے مطابق ان ۵۳ ہندستانی جنگی قیدیوں میں سے جنھیں چین رہا کرنے والا تھا ایک قیدی مر گیا۔ ● وزیر اعظم پنڈت نہرو نے لوک سبھا کو بتایا کہ سوویٹ یونین نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ اس نے مگ ہوائی جہاز دینے اور ہندستان میں ان جہازوں کے بنانے کا کارخانہ قائم کرنے کا جو وعدہ کیا ہے اس پر وہ قائم رہے گا۔ ● سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ چین۔ ہند سرحدی تنازعہ پر چھ ملکوں کی افریشیائی کانفرنس کولمبو میں پروگرام کے مطابق ۱۰ دسمبر کو شروع ہوگی۔ سیلون اور متحدہ عرب جمہوریہ کے علاوہ کانفرنس میں شرکت کے لئے برما، کمبوڈیا، غانا اور انڈونیشیا مدعو ہیں۔ ● ریاستی بلڈ بنک نے مشرقی کمان کے ذمہ داروں کو کل خون کی ایک اور کھیپ دی۔ یہ تیسری کھیپ ہے جو ملک میں ہنگامی حالت کے نفاذ کے بعد سے ریاستی بلڈ بنک نے فراہم کی ہے۔

۵ دسمبر ۶۲ء۔ وزیر اعظم نہرو ایک مختصر دورے پر تیز پور پہنچے۔ ان کے ہمراہ اور لوگوں کے علاوہ وزیر دفاع شری وائی۔ بی۔ چوان بھی تھے۔ پنڈت نہرو نے اس صورت حال کا جو چینی حملہ کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے مستقل مزاجی اور جرأت کے ساتھ مقابلہ کرنے پر ہندستان کے تمام لوگوں کو عام طور پر اور آسام اور نیفا کے لوگوں کو خاص طور پر مبارکباد دی۔ اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ عوام کو میرا پیغام یہ ہے کہ انھیں اپنے حال و مستقبل پر بھروسہ اور ہمت بلند رکھنا چاہئے۔ بڑے تصادم میں شکست اور فتح دونوں ہوتی ہیں اور ان کا مقابلہ عزم و استقلال کے ساتھ کیا جانا چاہئے۔ میں سچے دل سے محسوس کرتا ہوں کہ ملک کے لوگوں میں عزم و استقلال کی کمی نہیں ہے۔ ● حکومت یو۔ پی نے اعلان کیا کہ جوانوں اور ان کے کنبے والوں کو مفت قانونی اور طبی امداد، تعلیمی قرضے، املاک کی حفاظت، مستقل اور ملازمتوں میں ترجیح اور اس کے علاوہ دیگر مراعات دی جائیں گی۔

۶ دسمبر ۶۲ء۔ ہندستانی ریڈ کراس کی ٹیم ۶۴ بیمار اور زخمی ہندستانیوں کو لے کر بوم ڈیلا سے آج علی الصباح تیز پور واپس پہنچ گئی۔ ان ہندستانیوں کو چینیوں نے نیفا کی لڑائی میں جنگی قیدی بنا لیا تھا۔ ٹیم اپنے ساتھ ایک ہندستانی فوجی کی لاش بھی لائی جو چینیوں کی قید میں ہلاک ہو گیا۔ ● وزیر اعظم نے تیز پور میں کہا کہ اگر چینی ہندستان کے علاقے سے نہ ہٹے تو ہندستانی فوج انھیں نکال باہر کرے گی۔ یہ اقدام کب کیا جائے گا اس کا فیصلہ خود ہندستان کرے گا۔ پنڈت نہرو نے کہا کہ جہاں تک میرا خیال ہے نیفا کے علاقے میں چینی فوجیں میک مہن لائن کے پیچھے واپس چلی جائیں گی اور اپنی چوکیاں لائن کے اس پار قائم رکھیں گی۔ لیکن اصل اہمیت نیفا سے نہیں بلکہ لداخ سے واپسی کی ہے۔

۷ دسمبر ۶۲ء۔ معتبر ذرایع سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق نیفا کے کامینگ ڈویژن کی دشمن کی چوکیوں سے گزر کر اب تک ۸۵۸۵ ہندستانی فوجی تیز پور پہنچ چکے ہیں۔

۸ دسمبر ۶۲ء۔ چین کی وزارت خارجہ نے چین۔ ہند سرحدی تنازعہ کو ختم کرنے کے لئے ہندستانی تجویز کو قطعاً ناقابل قبول بتا کر مسترد کر دیا ہے اور کہا ہے کہ سمجھوتے کے لئے خود اس کی پیش کی ہوئی تجویزیں بنیاد بن سکتی ہیں۔ ● وزیر اعظم نہرو نے لوک سبھا میں بتایا کہ چینی حکومت نے اپنی تازہ ترین تحریر میں اس کی وضاحت کی ہے کہ چین کی تمام مسلح فوجیں مشرقی منطقے (میک مہن لائن) میں واٹر شیڈ سے پرے چلی جائیں گی لیکن ڈھولا اور لانگ جو میں وہ اپنی سول چوکیاں قائم رکھنا چاہتی ہے۔ ● راجیہ سبھا نے متفقہ طور سے ڈیفنس آف انڈیا بل منظور کر لیا جس کے ذریعہ حکومت کو چینی حملہ آوروں کے خلاف قوم کی جنگی کوششوں کو فروغ دینے کے لئے وسیع اختیارات دیے گئے ہیں۔ بل پر عام مباحثہ کا جواب دیتے ہوئے شری لال بہادر شاستری نے اعلان کیا کہ چین نے ہندستان کو ایسی جگہ لا کر کھڑا کر دیا ہے کہ حقیقی امن ہمیں اسی وقت نصیب ہوگا جب ہندستان طاقتور ہو جائے۔ وزیر داخلہ نے سیاسی پارٹیوں سے اپنی تقریروں میں محتاط رہنے کی اپیل

کی اور انتباہ دیا کہ اگر پارٹیوں کے ممبروں کی تقریروں یا اخبارات میں
ان کی تحریروں سے جنگی کوششوں میں خلل پڑا تو حکومت سخت کارروائی
کرے گی ۔ ● وزیر مالیات شری مرارجی ڈیسائی نے لوک سبھا کو بتایا کہ
چین سے ہند تنازعہ کے باوجود تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے لئے
ہندستان کو جو روسی امداد ملنے والی ہے وہ پروگرام کے مطابق ہمیں
ملے گی ۔

۹ دسمبر ۶۲ء ۔ وزارت خارجہ کے ایک ترجمان نے کہا کہ چین کی
نام نہاد امن تجویزوں کے ہندستان کے نہ ماننے پر چینی حکومت نے جو
بیان دیا ہے وہ ہندستان کو ایک "کھلی ہوئی دھمکی" اور کولمبو کانفرنس
کے شرکا کو ایک قسم کے "الٹی میٹم" کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ترجمان نے
کہا کہ یہ بیان خاص طور سے اس لئے قابل افسوس ہے کہ یہ ایسے موقع
پر جاری کیا گیا ہے جب دوست افریشیائی ملکوں کی کانفرنس شروع ہونے
جا رہی ہے ۔ ● ہندستان کے ۳۰ نومبر کے اس توجہ نامے کے جواب
میں جس میں چین کے ۲۱ نومبر کے لڑائی بندی کے اعلان کے سلسلے میں
مزید وضاحت طلب کی گئی تھی آج چینی وزارت خارجہ نے ہندستانی
سفارت خانہ کو ایک توجہ نامہ حوالہ کیا جس میں مندرجہ ذیل تین سوالات
پوچھے گئے ہیں ۔ (۱) ہندستان کی حکومت اس سے متفق ہے یا
نہیں ہے کہ جنگ بند ہونا چاہیے (۲) ، نومبر ۱۹۵۹ء کی واقعی قبضہ
کی لائن سے دونوں ملکوں کی فوجوں کو ۲۰ کلومیٹر (تقریباً ۱۲½ میل) پیچھے
ہٹ جانا چاہیے اور (۳) دونوں طرف کے افسروں کو مل کر دونوں
ملکوں کی فوجوں کی واپسی، غیر فوجی منطقے کی تشکیل، معائنہ چوکیوں کے
قیام اور جنگی قیدیوں کی واپسی سے متعلق امور پر بات چیت کرنا چاہیے ۔
● متحدہ عرب جمہوریہ کی اگزیکٹو کونسل کے چیرمین مسٹر علی صابری نے
کولمبو میں کہا کہ متحدہ عرب جمہوریہ کا خیال ہے کہ ہندستان کا یہ مطالبہ
درست ہے کہ چین ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء والی لائن پر واپس جائے ۔ ● امریکی
نائب وزیر خارجہ نے واشنگٹن میں کہا کہ ہندستان پر چین کا حملہ "آزاد
دنیا کے لئے ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے" کیوں کہ یہ "صاف ظاہر ہے"
کہ چین کے پیش نظر سرحدی تنازعہ سے بڑھ کر کچھ دوسرے مقاصد ہیں ۔

۱۰ دسمبر ۶۲ء ۔ وزیر اعظم نہرو نے لوک سبھا میں ان تینوں
سوالوں کے جواب میں جو ۹ دسمبر کو چینی وزارت خارجہ کی جانب سے
پیکنگ میں ہندستانی ناظم الامور کے حوالہ کیا گیا تھا کہا کہ (۱) چین کا
اعلان جنگ بندی یک طرفہ ہے لیکن ہندستان نے اسے منظور کر لیا
ہے اور ہماری طرف سے کوئی بات ایسی نہیں کی گئی ہے جس سے
جنگ بندی پر عمل درآمد کی راہ میں رکاوٹ پڑے (۲) ہندستان
کو اس سے اتفاق ہے کہ دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل
نہ رہیں لیکن اس پر عمل ایک متفقہ طور پر طے شدہ انتظام کی بنیاد پر ہونا چاہئے
اور یہ بنیاد اسی وقت بن سکتی ہے جب وہ جارحیت ختم ہو جائے جو چین
نے ہندستانی علاقے پر ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء کے بعد کی ہے (۳) اگر دونوں
طرف کے افسروں کو بات چیت کرنا ہے تو اُن کو جنگ بندی اور فوجوں
کی واپسی کے انتظامات کے بارے میں واضح ہدایات ہونا چاہئے اور
اس کا تعین ہو جانا چاہئے کہ قبضے کی کون سی لائن کو بروئے کار لانا ہے ۔
● چینی فوجیں ہندستان کی شمال مشرقی سرحد پر ۸ مورچوں سے والونگ اور
اس کے شمالی علاقے تک ہٹ آئی ہیں ۔ ● چھ ناوابستہ ملکوں کی کانفرنس
میں جو آج صبح کولمبو میں شروع ہوئی گھانا نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندستان
اور چین دونوں جنگ بندی کو تسلیم کر لیں اور ایک غیر فوجی منطقے کے قیام
پر رضامند ہو جائیں ۔ ● وزیر اعظم نہرو نے لوک سبھا میں کہا کہ چین کی
حکومت نے سرحدی مسئلے کے پُرامن حل کے لئے ہندستان "کم سے
کم شرائط" کو مسترد کر دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ "ہمارے اور چین کے
درمیان اس وقت اشتراک کی کوئی بنیاد نہیں ہے" انھوں نے کہا کہ
ہندستان چین سے اس وقت تک گفتگو نہیں کر سکتا جب تک چین ہر
منطقے میں ان جگہوں تک واپس نہیں چلا جاتا جو ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء سے
قبل اس کے قبضہ میں تھیں ۔ وزیر اعظم نے سرحد کے بارے میں بنیادی
تنازعات اور دعووں کو کسی بین اقوامی ادارے مثلاً عالمی عدالت
کے سپرد کرنے پر رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ جب وقت آئے
اور پارلیمنٹ منظوری دے تو ہم اسے عالمی عدالت کے سپرد کرنے پر
تیار ہیں ۔

۱۱ دسمبر ۶۲ء ۔ ناوابستہ ملکوں کی چھ طاقتی کانفرنس نے متحدہ عرب
جمہوریہ انڈونیشیا اور برما پر مشتمل ایک کمیٹی ایسی تجاویز تیار کرنے کی غرض

سے تشکیل دی ہے جس کی مدد سے ہندستان اور چین کو اپنے تنازعات طے کرنے کے لئے گفت و شنید پر آمادہ کیا جا سکے۔

۱۲ر دسمبر ۶۲ء ۔ چھ ناوابستہ افریشیائی ملکوں کی کانفرنس کا سہ روزہ اجلاس کولمبو میں ختم ہو گیا۔ کانفرنس نے ہندستان اور چین کے سامنے رکھنے کے لیے متفقہ تجاویز تیار کیں۔ ان تجویزوں کو لے کر خود لنکا کی وزیر اعظم مسز باندرا نائک ہندستان اور چین جائیں گی۔ کانفرنس نے طے کیا کہ وہ تجویز کی تفصیلات کو شایع نہیں کرے گی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس کی قبل از وقت اشاعت سے کانفرنس کی کوششوں پر اثر پڑے۔ ● وزیر اعظم نہرو نے راجیہ سبھا میں کہا کہ عالمی عدالت کے سامنے سرحدی معاملہ صرف اُس وقت پیش کیا جا سکتا ہے جب ہر دو فریق اُس پر راضی ہوں۔ وزیر اعظم نہرو نے راجیہ سبھا میں بتایا کہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء سے ۱۰ر دسمبر ۱۹۶۲ء تک لداخ اور نیفا دونوں محاذوں پر ہندستانی فوج کے ۱۹۷ آدمی کام آئے۔ چینی بیانات کے پیش نظر اُن کے پاس ۲۰۰ آدمی قید ہیں۔ ۱۱ر دسمبر تک ۵،۱۰ آدمیوں کا پتہ نہیں چلا ہے۔ تازہ ترین اطلاع کے مطابق سیلا۔ بوم ڈیلا سیکٹر سے ۱۱۰۹ آدمی اور والونگ سے ۲۲۵ آدمی تیز پور کے علاقے میں پہنچ گئے ہیں۔ مزید سپاہیوں اور افسروں کے پہنچنے کی اُمید ہے۔ ● مغربی جرمنی کے سفیر مسٹر ڈک ووز نے نئی دہلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مغربی جرمنی کی حکومت ایسے وقت میں ہندستان کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے جب کہ اس کی آزادی اور سالمیت کو چینی جارحیت سے خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ ● چینی ریڈ کراس نے ہندستانی ریڈ کراس کو ۱۷ زخمی اور بیمار ہندستانی سپاہی جو قید ہو گئے تھے حوالہ کیا۔ ● وزارت خارجہ کے ایک ترجمان نے آج کہا کہ نیفا میں اگلے مورچوں پر چینی اب بھی موجود ہیں اگرچہ ان کی تعداد کم ہو جانے کا کچھ ثبوت ملا ہے۔ البتہ لداخ سے چینیوں کی واپسی کی ابھی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔ ● خیال کیا جاتا ہے کہ وزیر دفاع شری چیوان نے آج پارلیمنٹ کے بعض کانگریسی ممبروں سے کہا کہ ہندستان کی فوج کی تعداد میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔

۱۳ر دسمبر ۶۲ء ۔ لنکا کی وزیر اعظم کولمبو کانفرنس کی تجاویز لے کر فوراً دہلی نہ آسکیں گی کیونکہ لنکا کے ایک بائی الکشن کے سلسلے میں کچھ دن تک لنکا میں اُن کی موجودگی ضروری ہے۔ اُن کی جگہ کانفرنس لنکا کے وفد کے ایک ممبر یہ تجاویز اپنے ساتھ لائیں گے اور وزیر اعظم اور وزیر اعظم چین کو پیش کریں گے۔ ان ممبر کو تجاویز پر گفتگو کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ وزیر اعظم لنکا دسمبر کے تیسرے ہفتے کولمبو سے ہو کر ہند اور چین کے وزرائے اعظم سے مل کر کانفرنس کی تجویز پر بات چیت کریں گی۔ ● وزیر اعظم نہرو نے کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کو یقین دلایا کہ سکم پر اگر چین نے چڑھائی کی تو ہندستان اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے۔

۱۴ر دسمبر ۶۲ء ۔ آج یہ اطلاع ملی کہ ۱۰ر دسمبر کو ایک چینی جہاز نے آسام پر پرواز کی تھی۔ ● آج یہ بھی اطلاع ملی کہ چینیوں نے جنگ بندی کے چھ دن بعد بریگیڈیر ہوشیار سنگھ کو جو مع اپنے سپاہیوں کے نیفا کے ایک مورچے سے واپس آرہے تھے چینیوں نے یکایک گھیر لیا۔ چینی افواج کی کثرت کو دیکھ کر بریگیڈیر نے اپنے آدمیوں کو موت کے منھ میں جھونکنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا دیے مگر چینی فوج کے افسر نے اُن کے بالکل قریب آکر اُن پر گولی چلا دی جس سے بریگیڈیر ہوشیار سنگھ شہید ہو گئے۔ ● ہندستانی ریڈ کراس نے مزید ۸۰ زخمی اور بیمار ہندستانی سپاہیوں کو جنھیں چین نے رہا کر دیا تھا تیز پور پہنچایا۔

۱۵ر دسمبر ۶۲ء ۔ نیفا کے کامینگ ڈویژن میں سول حکومت ۲۷ دن کے بعد کل پھر اپنے مستقر پر پہنچ جائے گی۔ ● چینیوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ ۲۶۹ ہندستانی قیدیوں کو ۱۹ر دسمبر کو ہندستانی ریڈ کراس کو دیدیں گے۔ ● چین کے سرکاری جریدے پیپلز ڈیلی نے روس پر الزام لگایا کہ وہ ہندستان اور چین کی سرحدی لڑائی میں چین کی نکتہ چینی کر رہا ہے۔

حق کے لیے

شاد سلطان پوری

وطن کی آن تم سے ہے جوانو !
وطن کی شان تم سے ہے جوانو !

اُٹھو ! یہ وقت سونے کا نہیں ہے
بڑھو ! یہ وقت کھونے کا نہیں ہے
اُٹھو ! دشمن تمھیں للکارتا ہے
گھمنڈی ہے یہ ڈینگیں مارتا ہے
چلو آگے بڑھو ، توپیں چلاؤ
پھر اپنے عزم کے جوہر دکھاؤ
بڑھو ! دشمن کے تم چھکّے چھڑا دو
فریبِ امن دشمن کو گرا دو
جہاں سے نام تک اس کا مٹا دو
وطن سے پیار ہے تم کو دکھا دو

وطن کی آن تم سے ہے جوانو !
وطن کی شان تم سے ہے جوانو !

مہابھارت بھی تم نے ہی لڑا تھا
تمھارے ہاتھ ہی راون مرا تھا
قسم ہے کرشن اور گیتا کی تم کو
قسم ہے رام اور سیتا کی تم کو
قسم ہنومان اور لچھمن کی تم کو
قسم متھرا بِرِندا بن کی تم کو
قسم تم کو شواجی لکشمی کی
قسم ٹیپو کی اور حیدر علی کی
گدا گانڈیو پھر اپنے اُٹھاؤ
نو ارجن دیے حق کے جلاؤ

وطن کی آن تم سے ہے جوانو !
وطن کی شان تم سے ہے جوانو !

یہی نانک نے سکھوں سے کہا تھا
یہی پیغام ارجن " تھا
سبق قرآن و گیتا کا یہی ہے
اگر زندہ ہو، تم میں زندگی ہے
اگر دل میں تمھارے روشنی ہے
اگر خود دار ہو، تم میں خودی ہے
اُٹھو ! حق کے لیے خود کو مٹا دو
چلو ! حق کے لیے خود کو مٹا دو
بڑھو ! حق کے لیے خود کو مٹا دو
لڑو ! حق کے لیے خود کو مٹا دو

وطن کی آن تم سے ہے جوانو !
وطن کی شان تم سے ہے جوانو !

وقت آیا ہے کہ تاریخ کو پھر دہرا دو

خاموش غازی پوری

مرغ زاروں کی طرف چین سے آنے والے
گولیوں اور دھماکوں سے ڈرانے والے
امن کا تاج محل جنگ سے ڈھانے والے

آگیا ہے تو ذرا گردشِ ایام بھی دیکھ
ہم کو چھیڑا ہے تو پھر چھیڑ کا انجام بھی دیکھ

جانتے ہیں تری ناپاک تمنا کیا ہے
حوصلہ تو نے ہمارا ابھی دیکھا کیا ہے
ہم بھی کم زور نہیں ہیں ہمیں سمجھا کیا ہے

دوستوں کے لیے مخلص ہیں وفادار ہیں ہم
اور دشمن کے لیے قہر کی تلوار ہیں ہم

ہم ترے عزم کی بنیاد ہلا سکتے ہیں
تیرے گلشن، ترے خرمن کو جلا سکتے ہیں
تجھ کو ہم صفحۂ ہستی سے مٹا سکتے ہیں

ہم نے اب جان لڑانے کی قسم کھائی ہے
تیری شامت تجھے لداخ میں لے آئی ہے

تیری تحریک کو ناکام بنا دیں تو سہی
خاک میں تیرے ارادے کو ملا دیں تو سہی
سر اٹھاتے ہوئے فتنے کو دبا دیں تو سہی

حق کے آگے تری تنظیم کی قوت کیا ہے
رام کے سامنے راون کی حقیقت کیا ہے

عظمتِ تاج و اجنتا کے نگہبان ہیں ہم
نہ ہٹے جو کسی طاقت سے وہ چٹان ہیں ہم
نہ الجھو ہم سے کہ ٹھہرا ہوا طوفان ہیں ہم

جو بھی طوفاں سے الجھتا ہے کچل جاتا ہے
جو بھی چٹان سے لڑتا ہے مسل جاتا ہے

تو بھی ٹکرائے گا ہم سے تو مسل جائے گا
جنگ کی آگ سے کھیلے گا تو جل جائے گا
سارا کس بل تری فوجوں کا نکل جائے گا

دیکھ لیں گے یہ تماشا بھی زمانے والے
کیا لڑیں گے بھلا افیون کے کھانے والے

تیغ ہندی کی بلاخیز روانی کی قسم
چندرگپت اور اشوکا کی نشانی کی قسم
ٹیپو سلطان کی اور جھانسی کی رانی کی قسم

تجھ کو گلشن کی کوئی شاخ نہیں دے سکتے
جان دے سکتے ہیں لداخ نہیں دے سکتے

نوجوانو! اٹھو! جاں باز بنو دکھلا دو
وقت آیا ہے کہ تاریخ کو پھر دہرا دو
دشمنِ امن کو تم خون میں یوں نہلا دو

زندہ رہ جائے تو ہر فرد وطن کو ترسے
اور مر جائے تو ہر لاش کفن کو ترسے

اُتر پردیش میدانِ عمل میں

فوج کے جوانوں اور ان کے کنبوں کے لیے رعایتیں ــــ شہیدانِ وطن اور فوجی عملے کے بچوں کو مفت تعلیم ــــ بلڈ بینک میں خون کی فراہمی کے انتظامات ــــ خون کا عطیہ دینے والوں کا رجسٹریشن ــــ جوانوں کے خطوط ــــ سرکاری ملازمین کو دفاعی تیاریوں میں حصہ لینے کی اجازت ــــ یمنا ہائڈل اسکیم ــــ آگزیلری نرسوں کی ٹریننگ ــــ جوانوں کے لیے کتابیں اور رسالے ــــ مچھلی پالن ریسرچ کے لیے وظیفے ــــ سیلس ٹیکس رجسٹریشن

حکومت اتر پردیش نے حال ہی میں جوانوں اور ان کے کنبوں کو بہت سی رعایتیں دینے کا اعلان کیا ہے جن میں مفت قانونی اور طبی امداد ـ تقاوی قرضے ـ جائداد کا تحفظ اور ملازمتوں میں ترجیح وغیرہ کی رعایتیں شامل ہیں ـ

محاذ کے جوانوں اور متعلقین کو مفت قانونی امداد بہم پہونچانے کے لئے حکومت نے ضلع مجسٹریٹوں سے کہا ہے کہ وہ اس مقصد کے لئے وکلا کی فہرست بنائیں ـ

حکومت نے سپاہیوں کے گھر والوں کو ۵۰۰ روپیہ یا متعلقہ سپاہی کی ماہانہ تنخواہ کا ۲۴ گنا "ان دونوں میں جو کم ہو" تک بطور تقاوی قرضہ دینے فیصلہ کیا ہے ـ

کسی سپاہی کی جائیداد ہنگامی صورت حال کے دوران بقایا مالگذاری اور دوسرے بقایا کے لئے نیلام نہیں کی جائے گی ـ

یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ داخل خارج کے اندراجات کی تصدیق کے معاملوں میں مال کی عدالتیں محاذ کے جوانوں کو اس صورت میں حاضری سے مستثنیٰ کریں گی جبکہ حاکم تصدیق کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ ایسے اشخاص نے رجسٹری شدہ دستاویز کے مطابق جائیداد پر قبضہ حاصل کیا ہے ـ

فوجی ڈیوٹی پر جانے والے ایسے عارضی افسر کو جس کی تقرری حال ہی میں ہوئی ہے جگہ خالی ہونے پر اس صورت میں اصل ملازمت پر مستقل کر دیا جائے گا جبکہ اس کے بارے میں فوجی حکام کی رپورٹ تسلی بخش ہوگی ـ

یو ـ پی پبلک ہیلتھ سروسز میں پروبیشن پر کیڈر رودم کے کسی افسر کو جسے انڈین آرمی میڈیکل سروس میں ایمرجنسی کمیشن ملا ہے پروبیشن کی مدت ختم ہونے پر اس صورت میں مستقل کیا جائے گا جبکہ اس کے بارے میں فوجی حکام کی رپورٹ تسلی بخش ہوگی ـ

پراونشل میڈیکل سروس گریڈ دوم کے ایسے افسر جو تقرری کے وقت تحریر کیے گئے اقرارنامہ کی شرائط کے مطابق ملٹری سروس کرنے کے پابند تھے اور جو بعد میں مستعفی ہو گئے تھے یا مقررہ تاوان کی ادائیگی پر ملازمت سے علٰحدہ یا برطرف کر دیے گئے تھے اگر انڈین آرمی میڈیکل کور میں تقرری کے لیے درخواست دیں گے تو اس پر غور کیا جائے گا ـ

ایسے افراد کی ملازمتوں کو جو اور کشمیر ملیشا ـ علاقائی فوج وغیرہ میں شامل ہوئے ہیں اتر پردیش کی ماتحت اور لوئی سروس میں خالی جگہوں کو پر کرنے کے لیے جنگی ملازمت سمجھا جائے گا ـ

یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ ریاستی حکومت انترم ضلع پریشدوں اور میونسپل بورڈوں کے زیر انتظام اسپتالوں میں جوانوں کے متعلقین کو علاج کی مفت سہولتیں دی جائیں ـ

ایک دوسرے فیصلہ کے مطابق کوئی سپاہی جس کے پاس لائسنس کے تحت کوئی بھی اسلحہ ہے سمندر پار جاتے وقت اس کو مال خانہ میں جمع کر سکتا ہے اور اس پر اس قانون کا اطلاق نہیں ہوگا جس کے تحت

سال کے بعد اسلحہ ضبط کر لیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں لوٹنے کے بعد وہ اپنے لائسنس کی تجدید بھی کرا سکے گا۔

اتر پردیش کی کابینہ نے ایسے جوانوں اور فوج کے عملہ کے بچوں کو ڈگری درجہ تک مفت تعلیم دینے کا فیصلہ کیا ہے جو لڑائی میں مارے گئے ہیں یا معذور ہو گئے ہیں۔ اس فیصلہ کے مطابق ایسے تمام طلباء کو جو اتر پردیش کے تسلیم شدہ تعلیمی اداروں میں پڑھ رہے ہیں فوری طور پر مفت تعلیم کی سہولت دیدی جائے گی۔

یہ سہولت اتر پردیش بھر میں پرائمری سے لے کر ڈگری تک کے تمام درجوں میں دی جائے گی۔ تمام تعلیمی اداروں سے کہا گیا ہے کہ وہ ایسے طلبا کی فیس معاف کر دیں اور اس کی کل رقم محکمہ تعلیم سے حاصل کر لیں۔

یہ اقدام موجودہ ہنگامی صورت حال اور ایسے جوانوں اور فوج کے عملہ کے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ برقرار رکھنے کے پیش نظر کیا گیا ہے جو لڑائی میں مارے گئے ہیں یا معذور ہو گئے ہیں۔ حکومت محسوس کرتی ہے کہ ایسے بچوں کو حکومت کے خرچ پر مفت تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ ایسے جوانوں اور فوج کے عملہ کے بچوں کو سرکاری ملازمتوں میں دوسروں پر ترجیح دی جائے۔

لکھنؤ میڈیکل کالج کے ۶۰۰ سے زائد طلبا نے کالج کے ذمہ داروں کے یہاں اپنے نام اس مقصد کے لیے درج کرا دیے ہیں کہ جب بھی ضرورت ہو وہ خون دینے کے لیے تیار ہیں۔

اسٹیٹ بلڈ بینک میں ان اشخاص کے خون کے نمونے لیے جا رہے ہیں جنھوں نے جوانوں کے لیے خون دینے کی پیش کش کی ہے کیونکہ ملٹری کے ذمہ داروں کو اس وقت خون کی ضرورت نہیں ہے۔ بینک میں خون کو غیر معینہ مدت کے لیے نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ تین ہفتہ کے بعد یہ خراب ہو جاتا ہے۔

بینک نے اپنے کام کے اوقات دو گھنٹہ بڑھا دیے ہیں اور دو ہفتہ سے بغیر کسی چھٹی کے کام کر رہا ہے۔ بینک بوقت ضرورت ملٹری کے لیے خون کی مانگ پوری کرنے کے لیے تیار ہے علاوہ ازیں بینک نے روزانہ سو بوتل خون جمع اور سپلائی کرنے کے مکمل انتظامات کر لیے ہیں۔

ضلعوں سے بڑی تعداد میں لوگوں نے خون دینے کی پیش کش کی ہے۔ علاوہ ازیں لکھنؤ میں بھی ہزاروں کی تعداد میں لوگوں اور بہت سے اداروں نے بھی خون دینے کی پیش کش کی ہے۔

راج بھون سکریٹریٹ میں سینا سیوا سمتی (مہیلا) کے دفتر میں خون کا عطیہ دینے والوں کے رجسٹریشن کی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ ۲۰ سے ۵۰ تک کی عمر کے عطیہ دینے والوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ صبح نو بجے سے دوپہر کو ۱۲ بجے تک اپنے نام کا رجسٹریشن کرا لیں۔

خون کے عطیات کے انتظام سے متعلق ذیلی کمیٹی ڈاکٹر (شریمتی) بی۔ ڈی۔ پنگورانی۔ ڈاکٹر اے۔ جی۔ بنرجی (چیرمین ریڈ کراس) اور ڈاکٹر شریمتی پربھا مسرا۔ میڈیکل کالج پر مشتمل ہے۔ یہ ذیلی کمیٹی خون کا عطیہ دینے والوں کے خون کی جانچ کرے گی اور خون کے متعلقہ زمروں میں ان کا نام درج کرے گی۔ اور بوقت ضرورت انھیں عطیہ دینے کے لیے بلائے گی۔

ریڈ کراس کی مقامی شاخ نے سمتی کو ۲۰ بوتل خون کا عطیہ دیا ہے۔

> جوانوں نے دیش کے لیے
> سر دھڑ کی بازی لگائی ہے
> اور آپ ... ... ؟

"انھیں اپنی زندگی کی اتنی پروا نہیں ہے جتنی کہ مادر وطن کی ایک ایک انچ زمین کی اور انھوں نے یہ عہد کیا ہے کہ وہ ہمالیہ کو صحیح معنوں میں چینی فوجیوں کے ایک قبرستان میں بدل دیں گے۔" یہ ہے حب وطن سے سرشار ہندوستان کے ان بہادر جوانوں کا عہد جو ہماری سرحدوں کے مورچوں پر وحشی اور دغاباز چینیوں سے لوہا لے رہے ہیں۔

لکھنؤ ڈویژن کے کمشنر کی اہلیہ شریمتی کے۔ کے داس کو دو جوانوں کے خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں انھوں نے مذکورہ بالا جوش و خروش کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے ایک خط ارجمنٹ کے ایک بہادر جوان کا بھی ہے سینا سیوا سمتی (مہلا) کے پاس بھیجے گئے ان خطوط میں جوانوں نے کہا ہے کہ سمتی کے محبت بھرے برتاؤ سے ان میں جو ولولہ پیدا ہوا ہے

اس کا شکریہ ادا کرنے سے وہ قاصر ہیں۔

خطوں میں جوانوں نے اس یقین محکم کا اظہار کیا ہے کہ اگر خدا نے چاہا تو وہ ایک ایک چینی کو موت کے گھاٹ اتارنے کا اپنا عہد ضرور پورا کریں گے۔

جوانوں نے کہا ہے کہ ان کا عزم و حوصلہ بہت بلند ہے اور وہ مادر ہند کی حفاظت کے لیے لڑنے مرنے کو تیار ہیں۔ آپ ہماری سلامتی کے لیے فکرمند نہ ہوں۔ ہماری فتح یقینی ہے۔ آپ کو اپنے بہادر جوانوں پر فخر کرنا چاہیے۔ دراصل ہماری ماؤں اور بہنوں کے اس یقین سے ہمیں دشمن سے لڑنے کے لیے اب زیادہ حوصلہ اور قوت حاصل ہوگی۔ دوسرا خط ایک انگریزی شعر پر ختم ہوتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے۔

" وہ گھڑی بھی کتنی مبارک ہوتی ہے جب کوئی اپنے وطن کی خاطر اپنی جان نذر کرتا ہے۔"

قومی سالمیت کے لیے چین کے چیلنج کا مقابلہ کرنے اور دفاعی کوششیں تیز تر کرنے کے پیش نظر ریاستی حکومت نے تمام سرکاری ملازمین کو قومی دفاع فنڈ کے لیے چندہ جمع کرنے اور اس مقصد کے لیے پروپگنڈہ کرنے کی اجازت دیدی ہے۔ سرکاری ملازمین سے کہا گیا ہے کہ وہ جوانوں کے لیے تحفے جمع کرنے۔ دفاعی بانڈوں کی فروخت۔ فوج۔ پولیس۔ ہوم گارڈس اور نیشنل والنٹیئر رائفلس میں بھرتی۔ شہری دفاع کی تنظیم۔ زخمی جوانوں کے لیے خون کے عطیات کے حصول اور ملک کے دفاع کو مستحکم بنانے کے تمام دوسرے کاموں میں پورے طور پر ہاتھ بٹائیں۔

ضلع افسروں سے کہا گیا ہے کہ وہ زمین اور عمارتوں کے حصول اور ان کو ٹھیکہ پر دینے۔ مزدور۔ نقل و حمل اور گاڑیوں کے بند و بست کے سلسلہ میں فوجی حکام کو ہر ممکن سہولتیں بہم پہنچائیں۔ ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ محکمۂ تعمیرات عامہ کے تعمیراتی کاموں۔ سابق فوجیوں کی فلاح و بہبود اور انڈین سولجرس ایکٹ کے تحت ہونے والے دوسرے کاموں کے سلسلہ میں ہر ممکن مدد دیں۔

مینا ہائیڈل اسکیم مرحلہ دوئم کے بارے میں لائسنس دار یا دوسرے اشخاص جو اس میں دلچسپی رکھتے ہوں اپنی عذرداریاں ریاستی بجلی بورڈ کو ۱۵ فروری ۱۹۶۳ء تک پیش کر سکتے ہیں۔

بورڈ کے ایک اعلانیہ میں کہا گیا ہے کہ اس اسکیم کے تحت اچھری ضلع دہرہ دون میں آرنس ندی میں ایک باندھ اور تقریباً سات میل لمبا پختہ زمین دوز پائپ بچھا کر بجلی پیدا کی جائے گی۔

اعلانیہ میں مزید کہا گیا ہے کہ اس اسکیم کے تحت (۱) چھبرا (ضلع ہردوئی) میں ایک زمین دوز بجلی گھر بنایا جائے گا جس کی پیداواری صلاحیت تقریباً ۲۳۷،۰۰۰ کیلوواٹ ہوگی۔ (۲) مینا اسکیم مرحلہ اول کے پہلے اور دوسرے بجلی گھروں میں بالترتیب ۱۱۲۵۰ کیلوواٹ اور ۱۷،۰۰۰ کیلوواٹ بجلی پیدا کرنے کے دو مزید سیٹ لگائے جائیں گے۔ (۳) چھبرا بجلی گھر کی جائے وقوع سے رڑکی (ضلع سہارنپور) اور مراد نگر (ضلع میرٹھ) تک ۲۲۰ کیلوواٹ کے ڈبل سرکٹ ٹرانسمیشن سسٹم بنایا جائے گا اس کے ساتھ ہی شارداگڑھ کے علاقہ میں بجلی کی سپلائی کے لیے ذیلی بجلی گھر بنائے جائیں گے۔ (۴) لکھنؤ میں چیف پروجیکٹ انجینیر وغیرہ کے دفتر اور ڈزائن آفس بلڈنگس کے لیے عمارتیں تعمیر کی جائیں گی۔

اعلانیہ میں مزید کہا گیا ہے کہ اس اسکیم کا مقصد "گھریلو تجارتی۔ صنعتی زراعتی اور ضروریات پوری کرنے کے لیے گوڈ مین بجلی کی سپلائی میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس اسکیم سے مغربی اور مرکزی اتر پردیش کے علاقے مستفید ہوں گے جن میں آگرہ۔ بلند شہر۔ ایٹہ۔ مراد آباد۔ متھرا۔ رامپور۔ بریلی۔ لکھنؤ۔ پیلی بھیت۔ ٹہری گڑھوال۔ بارہ بنکی۔ لکھیم پور کھیری۔ سیتاپور۔ بدایوں۔ دہرہ دون۔ فرخ آباد۔ مین پوری۔ سہارنپور۔ الموڑہ۔ ہردوئی۔ نینی تال۔ اور شاہجہاں پور شامل ہیں۔

اس اسکیم پر جو امید ہے کہ ۷۱-۱۹۷۰ء تک مکمل ہو جائے گی تخمیناً ۱۰،۲۲،۴۴ لاکھ روپیہ خرچ ہوگا اور شروع میں اس سے تقریباً ۸۵،۵۱ لاکھ روپیہ اور آخر میں تقریباً ۴۴،۸۲ لاکھ روپیہ کی آمدنی ہونے کی توقع ہے۔

ایسے رضاکار اداروں اور پرائیویٹ اسپتالوں کو جو اجتماعی ترقی کے پروگرام کے تحت آگزیلری نرس۔ مڈوائف کی ٹریننگ کی اسکیم شروع کرنا چاہتے ہوں معقول امداد دی جائے گی۔

اسکیم کے تحت جس کا اعلان حال ہی میں مرکزی وزارت صحت خدمات نے کیا ہے مالی امداد کے لیے ہر ایسے ادارہ کی درخواست پر غور کیا جائے گا جہاں اسکیم کو چلانے کے لیے ضروری سہولتیں موجود ہیں۔

اتر پردیش سماجی فلاح مشاورتی بورڈ کے جاری کیے گئے ایک پریس نوٹ میں اس اسکیم کو چلانے کے لیے خواہشمند اداروں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ مالی امداد کے لیے ریاستی حکومت کے توسط سے ڈائرکٹر جنرل ہیلتھ سروسز حکومت ہند نئی دہلی کو درخواستیں بھیجیں۔

درخواستوں میں دیگر باتوں کے علاوہ ہر سال داخل کیے جانے والے طلبا کی تعداد۔ ایک سال کے خرچ کا تخمینہ اور متعلقہ سال کے ۳۱ مارچ کے بعد ٹریننگ شروع ہونے کی تاریخ کے بارے میں بھی تحریر کرنا چاہیے۔

اداروں سے کہا گیا ہے کہ وہ آگزیلیری نرس۔ مڈوائف کی ٹریننگ کے لیے اپنے مرکزوں کے تسلیم کیے جانے کے لیے اسٹیٹ نرسنگ کونسل کو درخواست دیں۔

ٹریننگ کورس میں داخلہ کے لیے کم سے کم عمر ۱۷ سال ہے امیدواروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ سات درجہ تک پڑھے ہوں یا داخلہ امتحان پاس کیا ہو جس میں زبان ریاضی اور سائنس کے مضامین ساتویں درجہ کے معیار کے ہوں۔

درخواست کے فارم اور نصاب مقررہ قیمت ادا کرکے ڈائرکٹر جنرل ہیلتھ سروسز گورنمنٹ آف انڈیا سے براہ راست حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

سینا سیوا سمتی کے دفتروں میں ہزاروں کتابیں اور رسالے موصول ہو رہے ہیں جو جوانوں کے پڑھنے کے لیے چارباغ جنکشن اسٹیشن پر سمتی کی کینٹین کے کاؤنٹر پر رکھ دیے گئے ہیں۔

چارباغ اسٹیشن سے ہو کر گزرنے والے جوان کینٹین میں چائے پیتے وقت اپنے پسندیدہ رسائل اور کتابیں پڑھتے ہیں۔

سمتی کی ایک ذیلی کمیٹی نے جس کی چیرمین شریمتی اے۔ بی۔ ملک ہیں جوانوں کے لیے تفریحی لٹریچر کی فراہمی کے سلسلہ میں سرگرم کوششیں شروع کردی ہیں۔ ذیلی کمیٹی نے عوام سے کتابوں اور رسالوں کی صورت میں مزید عطیات دینے کی اپیل کی ہے۔

حکومت اتر پردیش نے مچھلی پالن میں ریسرچ کے لیے ۲۰۰ روپیہ ماہانہ کے دو وظائف منظور کیے ہیں۔ ان میں سے ایک وظیفہ لکھنؤ یونیورسٹی کو "پانی کے تازہ پودوں میں کیمیاوی اجزا اور پروٹین۔ غذائیت اور دوسری ضمنی غذاؤں کے طور پر ان کا استعمال" کے موضوع پر ریسرچ اور دوسرا ڈی۔ اے۔ وی کالج دہرہ دون کو مچھلی پالن سے متعلق امور کا مطالعہ کرنے کے لیے منظور کیا گیا ہے۔

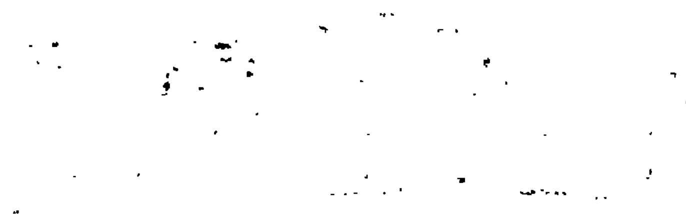
وظیفہ کی مدت دو سال ہوگی متعلقہ اداروں کو اس سلسلہ میں کام کی سالانہ رپورٹ ریاستی محکمہ مچھلی پالن کو پیش کرنا ہوگا جس کی ۲۰ مطبوعہ یا سائیکلو اسٹائل کی ہوئی نقلیں بھی داخل کرنا ہوں گی۔

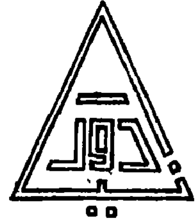
حکومت کو ریسرچ کے نتائج کو کسی بھی صورت میں استعمال کرنے اور کسی دوسری جگہ شائع ہونے سے اپنے رسائل میں شائع کرنے کا اختیار ہوگا۔

ریاستی محکمہ مالیات کے جاری کیے گئے ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ حکومت کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ سنٹرل سیلس ٹیکس ایکٹ ۱۹۵۶ء کی دفعہ ۷ کے تحت بیوپاریوں کو جاری کیے گئے رجسٹریشن سرٹیفکٹوں میں بیوپاریوں کے ذریعہ درآمد اور دوبارہ فروخت کیے جانے والے متفرق قسم کے سامان تجارت کو ظاہر کرنے کے لیے "عام سامان تجارت" جیسے مبہم الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس سے متعلقہ بیوپاریوں کو غیر ضروری پریشانیاں درپیش ہو رہی ہیں۔ اس کو دور کرنے کے لیے اسسٹنگ افسروں (حکام تشخیص) کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ مبہم الفاظ استعمال نہ کریں اور رجسٹریشن سرٹیفکٹوں میں صرف مخصوص سامان تجارت کا ذکر کریں۔ اسسٹنگ افسروں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ان تمام رجسٹریشن سرٹیفکٹوں کی جانچ کریں جو وہ جاری کرچکے ہیں اور اگر ضروری ہو تو اس ابہام کو دور کرنے کے لیے ان میں ترمیم کردیں۔









جلد ۱۷ | نمبر ۱۱

پھاگن ۱۸۸۴ء
مارچ سنہ ۱۹۶۳ء

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
امیہ بھوشن ملک
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ مالج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

عنوانات

اپنی بات

کولمبو کانفرنس میں شریک ہونے والے چھ ناوابستہ ممالک نے ہندوستان اور چین کے مابین براہِ راست گفتگو شروع کرانے کے لئے جو تجویزیں پیش کی تھیں، ہندوستان نے انھیں منظور کر لیا ہے، لیکن چین انھیں قبول کرنے میں ابھی تک انکار کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں چین کی طرف سے ابھی تک جو کہا گیا ہے اُس سے صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کے دل میں کھوٹ ہے اور وہ ابھی تک ہندوستان کے خلاف جارحیت پر تُلا ہوا ہے۔ اگر ہندوستان ان تجاویز کو کلی طور پر قبول کرتا ہے تو چین کا بھی یہی رویہ ہونا چاہیے۔ مگر چین اپنی ضد پر قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں گفت و شنید شروع ہی نہیں ہو سکتی۔ اور جب گفت و شنید کی بھی فضا نہیں پیدا ہو رہی ہے تو یہ سوچنا ہی بیکار ہے کہ حکومت ہند نے جن "ہنگامی حالات" کا اعلان کیا تھا اسے ختم ہو جانا چاہیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چین کے جارحانہ رجحانات اور وسعت پسندی کے جذبے نے ہندوستان کے لئے ایک ایسا خطرہ پیدا کر دیا ہے جس کا مقابلہ کرنے کے لئے ملک کو ہر وقت تیار رہنا پڑے گا۔ وزیر اعظم نہرو نے ایک مرتبہ اپنی تقریر میں بالکل سچ کہا تھا کہ چین جب کبھی طاقت ور ہوا اُسے ملک گیری پسندی کی سوجھی۔ چین کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ آج بھی چین کے یہی جذبات ہیں۔ وہ ایشیا ہی کی نہیں، دنیا کی سب سے بڑی طاقت بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کے پڑوسیوں میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس کے کسی نہ کسی علاقے پر اس نے دعویٰ نہ کر رکھا ہو۔ انتہا یہ ہے کہ چین کے نقشوں میں روس کے کچھ علاقے کو بھی چین کا علاقہ دکھایا گیا ہے۔ جب کسی ملک کا یہ رویہ ہو اور جب اس کے قول اور فعل میں اتنا تضاد پایا جاتا ہو کہ وہ دوستی کا دعویٰ کرنے کے باوجود ہندوستان ایسے پُرامن اور ہمدرد ملک پر حملہ کر دے تو اس سے امن و آشتی کی امید کرنا محض خوش فہمی ہے۔ اسی لئے، سرحد پر خاموشی کے باوجود ہمیں اپنی تیاریوں سے غفلت نہ برتنا چاہیے۔ یہ تیاری ہر طرح کی ہونا چاہیے۔ ایک طرف ہمیں اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرنا لازمی ہے دوسری طرف ہمیں اپنی اقتصادی بنیادوں کو مضبوط کرنا ضروری ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جب تک اقتصادی حالت درست نہیں ہوتی اس وقت تک فوجی طاقت میں استحکام نہیں پیدا ہوتا۔ جنگ چھڑ جانے کی صورت میں لڑائی صرف محاذوں پر نہیں لڑی جاتی بلکہ ملک کا ہر گھر، ہر کھیت اور ہر کارخانہ میدانِ جنگ بن جاتا ہے۔ لڑائی میں کروڑوں روپیہ روزانہ صرف ہوتا ہے۔ فوج کے لئے برابر سامانِ جنگ مہیا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سپاہیوں کے لئے غلہ اور سامان رسد برابر بھیجنا ہوتا ہے۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب ہمارے کھیتوں میں زیادہ سے زیادہ اناج پیدا ہوتا رہے، جب ہمارے کارخانوں میں زیادہ سے زیادہ سامان تیار ہوتا رہے اور جب ہم اخراجاتِ جنگ کے لئے زیادہ سے زیادہ روپیہ فراہم کرتے رہیں۔ دوسرے لفظوں میں، اپنے ملک کی آزادی برقرار رکھنے اور چین ایسے دغاباز دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں اپنے اقتصادی مورچے کو کسی طرح نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ وزیر اعظم نہرو بھی اسی بات پر برابر زور دے رہے ہیں اور ہماری مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو بھی اس چیز کا پورا احساس ہے۔ چنانچہ حکومت اتر پردیش کے وزیر مالیات شری کملا پتی ترپاٹھی نے اتر پردیش اسمبلی میں ۶۴-۱۹۶۳ء کا جو بجٹ پیش کیا ہے وہ اسی احساس کی عکاسی کرتا ہے۔ اس بجٹ کی تین خصوصیات ہیں۔ ایک خصوصیت یہ ہے کہ کفایت شعاری کے خیال سے اس میں مختلف مدوں کے اخراجات میں یا تو کمی کر دی گئی ہے یا بعض کاموں کو ملتوی کر دیا گیا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جنگی ضرورتوں کے پیش نظر ہر شہر میں شہریوں کو رائفل ٹریننگ دینے کے مرکز کھولنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ ایک اور سینک اسکول کھولنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ نیشنل کیڈٹ کور میں ۸۰ ہزار کیڈٹ بھرتی کئے جائیں گے۔ پرانتیہ رکشا دل میں ۱۵ ہزار مزید طالب علم بھرتی کئے جائیں گے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ پنج سالہ منصوبے کے تحت رفاہ عامہ کی مختلف اسکیموں پر ۹۰ کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔ ان اسکیموں میں سے خاص خاص اسکیمیں یہ ہیں۔ میڈیکل کالجوں میں داخلہ لینے والے طالب علموں کی تعداد میں ۲۵ فی صد کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ اسی طرح رڑکی انجینیرنگ کالج میں ٹریننگ حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد بڑھا دی گئی ہے۔ انجینیرنگ کالجوں اور میڈیکل کالجوں میں بھرتی ہونے والے لائق طلبا کو جو وظائف دیے جاتے ہیں ان کی رقم ۲ لاکھ سے بڑھا کر ۵ لاکھ کر دی گئی ہے۔ زراعت، آب پاشی، بجلی، رسل و رسائل، امداد باہمی اور دوسرے فلاحی کاموں پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔ غرض یہ ہیں ہماری حکومت کے فلاحی اور جنگی اقدامات۔ لیکن ہمارے سامنے جو صورت حال ہے اس کا مقابلہ کرنا اور وطن عزیز کی آزادی، اس کی تہذیب اور اس کی روایات کو زندہ رکھنا حکومت ہی کا کام نہیں، ہماری بھی ذمہ داری ہے۔ اس وقت ہر ہندوستانی کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کے مفاد کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لئے تیار رہے، ہمت اور دلیری سے کام لے، اپنے کیریکٹر کو بلند رکھے، اپنے کردار کو ایک مثالی کردار بنا کر پیش کرے اور یہ یاد رکھے کہ ؎

یہ رزم گہِ ہستی ہے جگر، یاں عشق کی صحت لازم ہے کیا اس کی حیات و مرگ کہ جو، بیمار جیا، بیمار اٹھا

—— ایڈیٹر

۲۶ جنوری کا پرچہ فروری کا شمارہ متصور کیا جائے

لہو کا ٹیکا

آنند نرائن مُلّا

وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا
ترے ناموس پر سب کچھ لٹا دینے کا وقت آیا

وہ خطہ دیوتاؤں کی جہاں آرام گاہیں تھیں
جہاں بے داغ نقشِ پائے انسانی سے راہیں تھیں
جہاں دُنیا کی چیخیں تھیں نہ آنسو تھے نہ آہیں تھیں
اُسی کو جنگ کا میداں بنا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

روپہلی برف پر ہے سُرخ خوں کی آج اک دھاری
سحر کی نرم کرنوں نے یہاں دوشیزگی کھوئی
ہوئی آلودہ یہ معصوم دُنیا اپسراؤں کی
اب ان ناپاک دھبوں کو مٹا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

بدلتی ہے چمن میں جیسے رُت یوں آئی آزادی
اہنسا کے پیمبر نے ہمیں دلوائی آزادی
بہت خوش تھے کہ اتنے سستے داموں پائی آزادی
جو قرضہ رہ گیا تھا وہ چکا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

سمجھتے تھے کہ نیکی سے بدی کا دل بدلتا ہے
توانا کے مقابل ناتواں کا حق بھی چلتا ہے
صداقت کا دیا باطل کی آندھی میں بھی جلتا ہے
حسیں خوابوں کی یہ شمعیں بجھا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

گرا کر ہر نزاع درمیاں کی چار دیواری
سیاست کی دھڑے بندی، یہاں کی تفرقہ کاری
مٹا کر صوبہ و ایمان و ملت کی حدیں ساری
ہمالہ پر نئی سرحد بنا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

ہر اک آنسو کا شعلہ جذب کرکے دل کے خرمن میں
ہر اک فریاد کی لے ڈھال کر اک عزم آہن میں
ہر اک نعرے کی بجلی کرکے آسودہ نشیمن میں
پھر اس بجلی کو دشمن پر گرا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

ہر اک خوابیدہ طاقت کو پیامِ نرم دینا ہے
ہر اک بیدار جذبے کو مزاجِ عزم دینا ہے
ہر اک سازِ طرب کو آج سوزِ رزم دینا ہے
ہر اک شہری کو اب وردی پنہا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

ہر اک مزدور اور دہقاں کی پیشانی نم یارو!
غریبوں کا لہو یارو، امیروں کے درم یارو!
ہر اک کشت و دکاں یارو، ہر اک سیف و قلم یارو!
وطن کے داؤں پر سب کچھ لگا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

ہر اک بازار دکو کو رزم گہ شاید بنانا ہو
ہر اک دیوار و در پر مورچہ شاید بنانا ہو
خود اپنی کشت کو آتش کدہ شاید بنانا ہو
ہر اک چپے پہ آہوتی چڑھا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

یہ اہلِ خانہ کی غاصب لٹیروں سے لڑائی ہے
یہ چڑھتی رات کی روشن سویروں سے لڑائی ہے
چراغِ آدمیت کی اندھیروں سے لڑائی ہے
ہر اک بستی میں انساں کی صدا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

عدو کے مکر و فن کا ہے عجب اک دو رخی منظر
تبسم اس کے اس رخ پر تو شعلے لب پہ اس رخ پر
ادھر کب لاّ کا ساغر ہے، ہلاکو کا ادھر خنجر
اب اس یوسف کے بھائی کو سزا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمان وفا دینے کا وقت آیا

نقابِ سرخ کے پیچھے ہے میلی شکلِ خاقانی
وہی سفاک نظریں ہیں وہی ہے چینِ پیشانی
وہی چنگیز کا جذبہ، وہی خوابِ جہاں بانی
اب ان خوابوں کو مٹی میں ملا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

خبر پہنچا دو اس خطے کی اب ہر بزمِ انساں میں
درندہ پھاند کر دیوار پھر آیا ہے میداں میں
وہی دنیا نے پہلے بھی جسے رکھا تھا زنداں میں
اٹھو! پھر اک نئی دیوار اٹھا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

جوانانِ وطن آؤ! قطار اندر قطار آؤ!
دلوں میں آگ، نظروں میں لیے برق و شرار آؤ!
بڑھو! بہر خدا اب بن کے سوئے کارزار آؤ!
جلالِ غیرتِ قومی دکھا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا

بہادر ہند کے لڑتے ہیں کیسے آج دکھلاؤ
روایاتِ شجاعت کو نئے کچھ باب دے جاؤ
مٹو تو داستانیں ہوں، جیو تو تاجدار آؤ
لہو کا ماں کو پھر ٹیکا لگا دینے کا وقت آیا

وطن پھر تجھ کو پیمانِ وفا دینے کا وقت آیا
ترے ناموس پر سب کچھ لٹا دینے کا وقت آیا



مُجرم

(پُرامن ہندوستان پر چین کے جارحانہ حملے سے متاثر ہو کر)

مخمور سعیدی

میں ایک شاعر تھا میرے شعروں میں زندگی مسکرا رہی تھی
مرے تخیل کی تابناکی —
قدم قدم پر
نظر نظر میں
ہزار شمعیں جلا رہی تھی
مرے چراغوں کی روشنی سے ہر انجمن جگمگا رہی تھی

میں اک مغنّی تھا، میرے نغمے
فضا میں امن و اماں کا جادو جگا رہے تھے
اک ایسے دورِ طرب کا مژدہ سُنا رہے تھے
ازل سے نوعِ بشر کو ہے انتظار جس کا
ابد بھی اُمیدوار جس کا

میں اک مصوّر تھا رنگ و بو کا
جو مو قلم کی لطیف و نازک سی جنبشوں سے
نشاط و غم کے —
ہزار نقشے بنا رہا تھا
جو زندگی کے نگار خانے کا گوشہ گوشہ سجا رہا تھا
جہاں کی رونق بڑھا رہا تھا

میں ایک انساں تھا، عام انساں
جو زندگی کے غم و الم سے نظر چرائے
مسرّتوں کی تلاش میں تھا

میں ایک شاعر ہوں اب بھی لیکن
مرے تخیل کی تابناکی
خلا میں تحلیل ہو گئی ہے
نغاں کہ حرفِ غزل کی سرگم
گرج میں توپوں کی کھو گئی ہے
مرے چراغوں کی روشنی کو دھوئیں کے بادل نگل گئے ہیں
دھواں جو دشمن ہے روشنی کا
ہر انجمن پر فسوں مسلط ہے تیرگی کا

میں اک مغنّی ہوں اب بھی لیکن
مری صدا میں —
وہ نغمگی اب نہیں رہی ہے
جو میرا مقصودِ زندگی ہے
میں دل کی دھڑکن کے ساز پر اب جو آتشیں گیت گا رہا ہوں
یہ میرے نغموں کا مرثیہ ہے جو خود کو ہی میں سُنا رہا ہوں

میں اک مصوّر ہوں اب بھی لیکن
ہو ٹپکنے لگا ہے اب مو قلم سے میرے
جو رنگ بے جان سی لکیروں میں ڈال دیتے تھے جان گویا
وہ رنگ سب خشک ہو گئے ہیں
جو تھے مرے ذہن ہی میں اب تک وہ سارے خاکے بھی کھو گئے ہیں

میں ایک انساں ہوں، عام انساں
مگر اب اس درجہ سرگراں ہوں
کہ ساری دُنیا سے اور دُنیا کی ہر مسرت سے بدگماں ہوں
یہ کیا سے کیا ہو کے رہ گیا ہے
شعور میرا، جو نفرت و برہمی کے طوفاں میں بہہ گیا ہے

یہ ہولناک انقلاب آخر بتاؤ کس نے بپا کیا ہے؟
یہ کس نے مجھ کو بدل دیا ہے؟
میں ایک شاعر، میں اک مغنّی
— میں اک مصوّر، میں ایک انساں
یہ کس نے انسانیت کو میری کچل دیا ہے؟
یہ جرم جس سے ہوا ہے سرزد
یہ حشر جس نے بپا کیا ہے
وہ ساری انسانیت کا مجرم ہے ساری انسانیت کا مجرم
تمام روئے زمیں کے انسانیت پرستو!

اسے سزا دو! اسے سزا دو!!

اپنی وحدت پہ ہم کو ناز ہے آج

سید احمد شاہ

اس حقیقت میں اب کلام نہیں — دوستی سب کے بس کا کام نہیں
رنگ بدلے ہزار گردشِ دہر — سچ تو یہ ہے اسے دوام نہیں
مطمئن دل ہے، پُر سکوں ہے دماغ — اب کوئی خواب ناتمام نہیں
رازِ سربستہ کھل چکے سارے — ذوقِ وارفتہ تشنہ کام نہیں
مرحبا! آج بزمِ رنداں میں — کوئی تخصیصِ دورِ جام نہیں
درمیاں وہ جو اک حجاب سا تھا — دور تک آج اُس کا نام نہیں
کھل چکی راہ جاں نثاری کی — اب کوئی قیدِ خاص و عام نہیں
جاگ اُٹھے ہیں نصیب سوئے ہوئے — کوئی وحشی نہیں کہ رام نہیں
حوصلے دل کے اس قدر ہیں بلند — آج دشوار کوئی کام نہیں
پُر خطر ہے وفا کی راہ تو ہو — راہ رَو کوئی سُست گام نہیں
نے صدائے جرس، نہ بانگِ رحیل — کارواں کو مگر قیام نہیں
خیر! جو بیتنا تھی بیت گئی — اب تاسّف کا یہ مقام نہیں

شکر ہے رہ زنی بھی کام آئی
دوست کی دشمنی بھی کام آئی

اب ہیں بیدار نیند کے ماتے — وہ گرانِ خوابیِ حیات گئی
ڈھل گئیں حُزن و رنج کی گھڑیاں — دن نکل آیا کالی رات گئی
پھوٹ نکلی شعاعِ نورِ یقیں — تیرگی تو ہمہ صفات گئی
ہم میں اک نظم، ایک ضبط ہے آج — اب وہ بد نظمیِ حیات گئی
اتحاد آج اک حقیقت ہے — اب وہ مشقِ تصورات گئی
ہم سے اُلجھے یہ اب کسے ہے مجال — دُور کروں وہ اگلی بات گئی

اپنی قوت پہ ہم کو ناز ہے آج
اپنی وحدت پہ ہم کو ناز ہے آج

سر کٹا دیں گے ہم چمن کے لیے — سنبل و سرو و نسترن کے لیے
ہنس کے کر دیں گے جان و دل قرباں — اپنی پاکیزہ انجمن کے لیے
جاں نثاری ہمارا ایماں ہے — حفظِ آزادیِ وطن کے لیے
اب بڑھا کوئی بوالہوس جو اِدھر — لاش ترسے گی پھر کفن کے لیے

حملہ آور کا سر کچل دیں گے
ہم زمانے کا رُخ بدل دیں گے

بانگِ غا

وقار خلیل

یہ سرزمیں صوفیوں کی بستی، کبیر و نانک کو جس نے پالا
نگر نگر جس کی رے کے خوش بو، بہار بادِ صبا چلی ہے
وہی ہے تہذیب کا گلستاں، وہی عقائد کے پھول، لیکن
وطن پہ جب کوئی آنچ آئی تو شاخ تلوار بن گئی ہے

سوادِ گنگ و جمن ہو، بنگال ہو کہ پنج آب کی زمیں ہو
حیات کا نام لے کے اُٹھے، حیاتِ نَو کے جری سپاہی
چتوڑ سے اور مالوے سے، دکن سے، دلی سے، آگرے سے
چلے ہیں جب پاسبان وطن کے تو ڈگمگانے لگی سیاہی

ورق ورق اُنگلیوں نے لکھیں، کہانیاں عزم و آرزو کی
عظیم بھارت کا چپہ چپہ مجاہدوں کی جبیں بنا ہے
ہمالیہ کی بلندیوں کا امین ہے ایک ایک ذرّہ!
وفا کی راہوں میں بچہ بچہ شبابِ قلبِ یقیں بنا ہے

تمہارے طرزِ عمل سے دُنیا تمہیں حقارت سے دیکھتی ہے
وفا کا جس نے چلن سکھایا، اُسی سے کرتے ہو کج ادائی
محبتوں کے اصُول زخمی، تو چاکِ سینہ ہے دوستی کا
کہا تھا کل تم نے جس کو بھائی، اُسی سے کرتے ہو بے وفائی

ہمالیہ کے اِدھر جیالوں کی سرزمیں، ایشیا کی عظمت
تمہاری سفّاکیوں نے دیکھا کہ آج خنجر بکف کھڑی ہے
عظیم ٹیپو کا حوصلہ ہے تو بھیم و ارجن کی جراتیں ہیں
مناؤ تم آج خیر اپنی کہ ساری جنتا اُبل پڑی ہے

جہدِ عمل

مہدی پرتاب گڑھی

جس جگہ صدیوں سے آباد ہے شہر نگار — گرم ہیں آج وہاں جنگ جدل کے بازار
آگ کے شعلوں کی زد پر ہے گلستاں کا وقار — جل کے رہ جائے نہ معصوم بہاروں کا دیار

ساتھیو! اس کی حفاظت کے لیے جنگ کرو
آؤ! اس شہر محبت کے لیے جنگ کرو

ملک گیری کے لیے جنگ کا مسلک ہے بُرا — لیکن ہو جائے جو دشمن ہی کوئی آمادہ
نوچ لینے کے لیے جسم سے پھولوں کی قبا — چھین لینے کے لیے دیش کے ماتھے سے ضیا

ایسے حالات میں ہیں جنگ جدل بھی احسن
اور اس امر کے منکر ہیں چمن کے دشمن

سرفروشی تو ازل سے ہے ہمارا دستور — ہم نے توڑے ہیں ہر اک دور کے راون کے غرور
ہم سے پایا ہے زمانے نے محبت کا شعور — ہم نے پھیلایا ہے اس بزم میں اخلاص کا نور

آج بھی امن و اہنسا کے ہیں شیدائی ہم
جبر کے سامنے ہوگی نہ مگر گردن خم

اپنی نظروں میں ہے ہمسایہ ممالک کا مقام — پیش دشمن کو بھی کرتے ہیں ہم اخلاص کا جام
کبر و نخوت کو بہت دور سے کرتے ہیں سلام — امن کا دیتے ہیں ہم سارے زمانے کو پیام

ہم کہ اتنا بھی نہیں کرتے ہیں برداشت مگر
اس چمن زار کی جانب اٹھے ناپاک نظر

وقت پھر مرحلۂ دار و رسن لایا ہے — آج پھر دیش کی آزادی پہ حرف آیا ہے
چین نے نیفا و لداخ کو اپنایا ہے — مکر کا جال بُری طرح سے پھیلایا ہے

توڑ دینا ہے ہمیں چین کے اس مکر کا جال
اب دکھانا ہے ہمیں اپنی اہنسا کا جمال

کام کھیتوں میں، ملوں میں کہ دفاتر میں کریں — مقصد زیست سے ہر لمحہ ہم آغوش رہیں
کوئی افواہ نہ پھیلائیں کبھی، اور نہ سنیں — ہم تحفظ کے لیے دیش کی جاں بھی دے دیں

ملک پر اپنے کوئی آنچ نہ آنے پائے
کوئی تخریب یہاں سر نہ اٹھانے پائے

غدارِ چین

عزیز سلونوی

یہ تو بے شک ٹھیک ہے تم نے ہمیں دھوکا دیا
شکریہ اے چین! سارے ملک کو گرما دیا

جوش کی ہم میں کمی تھی، جوش بھی اب آ گیا
دیکھ کر برتاؤ تیرے ہوش بھی اب آ گیا

امن کے ہم تھے پجاری، صلح کے پیغام بر
کوئی حملہ ہم پہ کر سکتا ہے، یہ کب تھی خبر

ظرف عالی تھا، طبیعت تھی ہماری صلح جو
تھا یقیں، کوئی ہمارا ہو نہیں سکتا عدو

دوستوں کی دشمنی کو دوستی سمجھا کیے
جیسے ہم تھے دوسروں کو بھی وہی سمجھا کیے

ہر کس و ناکس کو سمجھے یہ فدائی ہو گیا
جس نے بھائی کہہ دیا منھ سے وہ بھائی ہو گیا

چین کا جب رنگ دیکھا اس قدر بدلا ہوا
اب یہ کہنا ہی پڑا غفلت ہوئی دھوکا ہوا

خیر! اب ہم سر کچلنے کے لیے تیار ہیں
بھیشم و ارجن کی طاقت کے علم بردار ہیں

جانتے ہیں ہم، شہیدانِ وطن مرتے نہیں
چین تو کیا چیز ہے دُنیا سے ہم ڈرتے نہیں

متحد ہو کر کریں گے جب کبھی یلغار ہم
جنگ میں بن جائیں گے چلتی ہوئی تلوار ہم

جب ہماری فوج دشمن کے مقابل آئے گی
دو ہی دن میں جس قدر تیزی ہے سب مٹ جائے گی

چین اب بھی وقت ہے کچھ غور کر انجام پر
یہ نہ ہو، شرمندگی ہو تجھ کو اپنے کام پر

ہماری پکار

سعید اختر خلش

یہ دیس، گوتم و گاندھی کا دیس ہے، جس نے
پیامِ امن و محبت دیا سبھی کے لیے
کسی کا ملک نہ چھینا، کسی سے جنگ نہ کی
ہمیشہ ہاتھ بڑھایا تو دوستی کے لیے

جو دوسروں کی زمیں چھیننے کے عادی ہیں
ہمارے امن سے سمجھے کہ ناتواں ہیں ہم
ہمارا جرم یہی ہے کہ اس زمانے میں
حدیثِ لطف و محبت کے رازداں ہیں ہم

انھیں خبر ہے؟ کہ ہم ہیں امینِ حسنِ چمن
لہو بھی ہم نے بہایا ہے اِس چمن کے لیے
ہم ان کا وہم بہت جلد دور کر دیں گے
انھیں خبر ہے؟ کہ ہم ایک ہیں وطن کے لیے

جھلسنے دیں گے نہ کھیتوں کو سرخ شعلوں سے
جو ہل بنایا ہے بندوق بھی بنا لیں گے
ہم اپنے دیس کی عصمت نہ لٹنے دیں گے کبھی
کہ اب مشینوں سے ہم گولیاں بھی ڈھالیں گے

ہمارے دیس پہ حملہ ہوا ہے، یاد رہے
جو بڑھ کے آئے گا وہ اپنے منہ کی کھائے گا
خبر کرو کہ یہ دھرتی ہے رام و لچھمن کی
یہاں سے اب کوئی راون نہ بچ کے جائے گا

آہنگ

صدیق نظر

مرے وطن کے جواں سپوتو، مرے وطن کے جیالے بیٹو!

وہ مادرِ ہند کے گلستاں جہاں مروّت کے پھول مہکے
جہاں اہنسا کی جوت لے کر محبتوں کے رسول مہکے
جہاں کی خاکِ حسیں کے ذرّوں میں دوستی کے اصول مہکے

اُسی گلستاں میں بادِ صرصر نگاہ اپنی اُٹھا رہی ہے
سیاہیوں کا لبادہ اوڑھے دھوئیں کی چادر بچھا رہی ہے
چراغِ امن و اماں کو ظالم یہ لگ رہا ہے بجھا رہی ہے

دیارِ ہندوستاں کے شیرو! تمھیں وطن اب بُلا رہا ہے
کھِلے ہو تم جس میں پھول بن کر وہی چمن اب بُلا رہا ہے
جو سرفروشی کی دھن میں باندھا تھا وہ کفن اب بلا رہا ہے

سُنو کہ افیون کھانے والے ہماری سرحد میں آ رہے ہیں
کچل دو ان کو یہ سانپ زہریلے اپنا سر اب اُٹھا رہے ہیں
وہ دیکھو ماؤزے تنگ کے کتے غرور سے دُم ہلا رہے ہیں

تمھیں قسم اپنے بانکپن کی، اُٹھو! اور ان سے نظر ملاؤ
تمھیں قسم اپنی الفتوں کی، سپاہیوں کے علم جھکاؤ
تمھیں قسم اپنی دھڑکنوں کی، بڑھو اور آگے ہی بڑھتے جاؤ

مرے وطن کے جواں سپوتو، مرے وطن کے جیالے بیٹو!

بڑھو! بہادرو

ماچس لکھنوی

یہی ہو لب پہ گفتگو، یہی ہو فکر و جستجو — یہی دلوں کی آرزو، بچے وطن کی آبرو
اب ایسا وقت آگیا کہ بے دریغ کھینچ لو — قسم حفاظتِ وطن کی کھا کے تیغ کھینچ لو
بڑھو بہادرو بڑھو، بہادرو بڑھو بڑھو

تمھیں وطن کی آن ہو، تمھیں وطن کی شان ہو — تمھیں وطن کی روح ہو، تمھیں وطن کی جان ہو
یہ مورچہ سنبھال لو، وہ مورچہ سنبھال لو — جہاں مقابلہ پڑے وہیں پہ دیکھ بھال لو
بڑھو بہادرو بڑھو، بہادرو بڑھو بڑھو

پہاڑ بھی مقابلے میں ہوں تو ان کو توڑ دو — بڑھو بڑھ کے دشمنوں کی گردنیں مروڑ دو
وہ جوش وہ اُمنگ ہو، وہ بے پناہ جنگ ہو — کہ زندگی بھی جو پہ اور موت پہ تنگ ہو
بڑھو بہادرو بڑھو، بہادرو بڑھو بڑھو

کڑک کڑک کے مثلِ برق دشمنوں پہ گر پڑو — چلا چکو جو ایک صف تو دوسری پہ پھر پڑو
گرج گرج کے مثلِ ابر، مثلِ برق کوندتے ہوئے — بڑھے چلے چلو فضائے شر کو روندتے ہوئے
بڑھو بہادرو بڑھو، بہادرو بڑھو بڑھو

جو حق پہ جان بھی گئی تو زندگی فضول ہے — سدا بہار جو نہ ہو وہ پھول کوئی پھول ہے
سمجھ رہے تھے کھیل یہ بہادروں کو ٹوکنا — جو شورِ الاماں بھی ہو تو ہاتھ کو نہ روکنا
بڑھو بہادرو بڑھو، بہادرو بڑھو بڑھو

ہر ایک تم میں صف شکن، ہر ایک تم میں تیغ زن — نثار تم پہ بانکپن، لگا کے نعرۂ وطن
ہر ایک دل ہر ایک جان و تن تمھارے ساتھ ہے — تمھارا ساتھی ہیں اور کُل وطن تمھارے ساتھ ہے

بڑھو بہادرو بڑھو، بہادرو بڑھو بڑھو

دعوتِ عمل

شفق شاہانی

آ! صدا دیتی ہے جاں بازوں کی صف میداں میں آ
اے محرّمِ ہمدم تکلف برطرف، میداں میں آ
آ! بہ صد خودداری و عز و شرف، میداں میں آ
شان سے سینہ سپر نیزہ بکف، میداں میں آ
اے علم بردارِ ناموسِ سلف، میداں میں آ

ہے اسی میں شان تیری اور تیرا بانکپن
ہے یہ وقتِ آزمائش، باندھ لے سر سے کفن
قلب میں تیرے چھپا ہو ناوکِ عشقِ وطن
ایک بسمل کی طرح بن کر ہدف میداں میں آ
اے علم بردارِ ناموسِ سلف، میداں میں آ

دیکھ تو درپیش ہے بھارت کی عزت کا سوال
کس کو ایسے میں بھلا ہوگی تامّل کی مجال
اٹھ بصد جوش و خروش اور بڑھ بہ صد شانِ جلال
آ کر اب بڑھنا ہے دشمن کی طرف میداں میں آ
اے علم بردارِ ناموسِ سلف، میداں میں آ

بات تو جب ہے نہ آئے آنچ تیری آن تک
بڑھ کے اپنے دیش پر قربان کر دے جان تک
آ، مسلح ہو کے آ جا جنگ کے میدان تک
آ بہ ذوقِ سرفروشی سر بکف میداں میں آ
اے علم بردارِ ناموسِ سلف، میداں میں آ

کام لے بہرِ دفاع ایسے جوابی وار سے
کانپ اٹھے ایک اک چینی تری للکار سے
زندگی آواز دیتی ہے فرازِ دار سے
جنگ کر شانہ بہ شانہ صف بہ صف میداں میں آ
اے علم بردارِ ناموسِ سلف، میداں میں آ

اور بڑھو

رضا امروہوی

اے جوانانِ وطن! تم کو قسم، اور بڑھو — مادرِ ہند کا ہے تم پہ کرم، اور بڑھو
دستِ محکم میں لیے تیغِ دو دم اور بڑھو — اپنے اغیار کے سر کر کے قلم اور بڑھو

زرد آندھی کو عزائم سے پشیماں کر دو
خون سے رن کی فضاؤں کو چراغاں کر دو

غیر کا عزم ہے کیا، غیر کی جرأت کیا ہے — فوج کی شان ہے کیا، فوج کی ہمت کیا ہے
تم بہادر ہو، تمھارے لیے قوت کیا ہے — متحد ہو کے لڑو، غیر کی طاقت کیا ہے

نوجوانانِ وطن! حشر بپا کر کے بڑھو!
اپنے دشمن کو پہاڑوں پہ فنا کر کے بڑھو!

یہ تو دشمن ہیں تمدن کے طرب خانے کے — عہدِ حاضر کے، نئی نسل کے کاشانے کے
فن کے شہ پاروں کے، تہذیب کے افسانے کے — پھول کے، رنگ کے، ہر شمع کے پروانے کے

ڈھا کے تخلیق کے ایک اک در و دیوار کو یہ
مسخ کر دیتے ہیں انسان کے افکار کو یہ

ان کا مقصد ہے کہ رعنائیِ انساں نہ رہے — نکہتِ گل نہ رہے، جلوۂ جاناں نہ رہے
زندگی گلشنِ عشرت میں غزل خواں نہ رہے — دل میں انسان کے تعمیر کا ارماں نہ رہے

امن مٹ جائے، رہے بات نہ گل و شبنم کی
روح مرجھائے بہاروں کے ہر اک موسم کی

اے جوانانِ وطن! جوشِ تمنا کی قسم — تم کو مندر کی قسم، تم کو کلیسا کی قسم
گوردوارے کی قسم، ارضِ دل آرا کی قسم — تم کو باپو کی قسم، ان کی اہنسا کی قسم

یوں بڑھو آج کہ ہر فردِ بشر کانپ اٹھے
یوں لڑو آج کہ دشمن کا جگر کانپ اٹھے

ہمارا عزم

اظہر کمالی

ہم اہنسا کے پجاری تو ہیں، لیکن ہم میں
ظلم اور جبر سے ٹکرانے کی ہمت بھی تو ہے
پرچمِ امن کو جن ہاتھوں نے لہرایا ہے
اُن میں تلوار اُٹھا لینے کی طاقت بھی تو ہے

آزمایا ہے ہمیں گردشِ دوراں نے بہت
پر کبھی حوصلہ ہارے ہی نہیں ہیں ہم لوگ
شمعِ آزادی پہ جل مرنا ہے مذہب اپنا
شیرِ میسور کی غیرت کے امیں ہیں ہم لوگ

خونِ دل دے کے جسے ہم نے بہاریں دی ہیں
اُس گلستاں کو کبھی خاک نہ ہونے دیں گے
اے ہمالہ تری عظمت کی قسم کھاتے ہیں
ہم زمیں کو تری ناپاک نہ ہونے دیں گے

زرد آندھی جو ہمالہ کی طرف آئی ہے
ہم اُسے تیغ کے شعلوں سے بجھا ڈالیں گے
نظرِ بد سے جو دیکھے گا وطن کی جانب
نام ہی اُس کا زمانے سے مٹا ڈالیں گے

راہِ ایثار و شہادت کے لیے رختِ سفر
جانبِ دار و رسن باندھ لیا ہے ہم نے
اب بھی گر باز نہ آؤ گے تو پچھتاؤ گے
چینیو! سر سے کفن باندھ لیا ہے ہم نے

وطن کی بات ہے

حیات وارثی

ہمالیہ سے اُٹھ رہی ہیں زرد زرد آندھیاں
ہیں ان کے حوصلے کہ سرنگوں ہو امن کا نشاں
محافظانِ ہند ہے تمہارا آج امتحاں
نہ بجھے یہ شمعِ انجمن، بڑھو وطن کی بات ہے
مجاہدانِ صف شکن بڑھو وطن کی بات ہے

بڑھو! تمہارے ساتھ آج ساری کائنات ہے
تمہارے حوصلوں کے آگے چین بے ثبات ہے
تمہاری ہمت ایک شہ ہے چینیوں کو مات ہے
لُٹا کے عیشِ جان و تن بڑھو وطن کی بات ہے
مجاہدانِ صف شکن بڑھو وطن کی بات ہے

وہ دیکھو! سرحدوں سے اُٹھ رہا ہے ظلم کا دھواں
فضا میں اُڑ رہی ہیں "پنچ شیل" کی بھی دھجیاں
حدوں سے بڑھ گیا ہے اب ستم کا سیلِ بیکراں
سروں سے باندھ کر کفن بڑھو وطن کی بات ہے
مجاہدانِ صف شکن بڑھو وطن کی بات ہے

یہ التوائے جنگ اور یہ پیامِ دوستی
سمجھ لو دوستو! یہ دشمنوں کی چال ہے نئی
بتاؤ! تیرگی سے بھی کبھی ملی ہے روشنی؟
یہ ہے فریبِ راہ زن بڑھو وطن کی بات ہے
مجاہدانِ صف شکن بڑھو وطن کی بات ہے

قسم ہے تم کو غالب اور میر کے دیار کی
قسم ہے شاہ واجد و ظفر سے تاج دار کی
قسم ہے گلشنِ ادب کے بے خزاں بہار کی
فدائیانِ علم و فن بڑھو وطن کی بات ہے
مجاہدانِ صف شکن بڑھو وطن کی بات ہے

میرے محبوب ٹھہر!

شمیمہ لکھنوی

ہند کی شان زمانے کو دکھالوں تو چلوں — کوہساروں پہ قدم اپنے جمالوں تو چلوں
خاک پہ ان کی جبینوں کو جھکا دوں تو چلوں — دشمنِ ہند کو مٹی میں ملالوں تو چلوں
فتحِ مندانہ ہنسی سب کو ہنسالوں تو چلوں
میرے محبوب ٹھہر! اے مرے محبوب ٹھہر

جارحیت کا مزا ان کو چکھالوں تو چلوں — بدلا اب ان کے مظالم کا چکالوں تو چلوں
خون پانی کی طرح ان کا بہالوں تو چلوں — سرحدیں ان سے سب آزاد کرالوں تو چلوں
گلشنِ ہند سے ان سب کو بھگالوں تو چلوں
میرے محبوب ٹھہر! اے مرے محبوب ٹھہر!

دوست کے روپ میں یہ دشمنِ جانی نکلا — جس کو سمجھی تھی نظر خون، وہ پانی نکلا
نام دُنیا میں محبت کا کہانی نکلا — تہذیبیاں کا ہر اک لفظ ہی فانی نکلا
ان کو آئینہ محبت کا دکھالوں تو چلوں
میرے محبوب ٹھہر! اے مرے محبوب ٹھہر!

چینیو! تم نے کیا ہے مجھے آمادہ بہ جنگ — تم نے برباد کیے کیسے گلستانوں کے رنگ
سینۂ تنگ میں تم سب کے یہ دل ہیں کہ ہیں سنگ — زیرِ ساحل نہ تھا معلوم کہ بیٹھے ہیں نہنگ
اسی ساحل پہ میں طوفان اٹھالوں تو چلوں
میرے محبوب ٹھہر! اے مرے محبوب ٹھہر!

جنگِ ہندی کا یہ پیغام بھی دھوکا ہے شمیمؔ — ان کی تجویز کا ابہام بھی دھوکا ہے شمیمؔ
ان کی ہر صبح ہر اک شام بھی دھوکا ہے شمیمؔ — اب تو ان چینیوں کا نام بھی دھوکا ہے شمیمؔ
ایسے مکاروں کو دُنیا سے مٹالوں تو چلوں
میرے محبوب ٹھہر! اے مرے محبوب ٹھہر!

چین کی سامراجی تاریخ پر ایک نظر

عشرت علی صدیقی

پنڈت جواہرلال نہرو نے ایک مرتبہ اپنی تقریر میں کہا تھا کہ جب کبھی چین طاقتور ہوا تو اسے توسیع پسندی کی سوجھی۔ جواہرلال جی نے یہ بات یوں ہی نہیں کہہ دی تھی بلکہ چین کی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ چین واقعی جب کبھی طاقتور رہا تو اس نے دوسرے ملکوں کے علاقوں پر یا تو قبضہ کرلیا یا قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ موجودہ حکومت چین بھی اپنی توسیع پسندی کی اس روایت کو زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ کہنے کے لئے وہ یہ کہتی ہے کہ چین کسی دوسرے ملک کے علاقہ کو نہیں حاصل کرنا چاہتا۔ مگر اس کے لیڈر اس دور کو برابر یاد کرتے اور اپنے عوام کو یاد دلاتے رہتے ہیں جب چین ایک بڑی سامراجی طاقت تھا اور اس کے سیاسی اور تہذیبی اثرات دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ لطف یہ ہے کہ ان اثرات کو چین اپنے تسلط کی بنیاد بتاتا ہے تہذیب اور توسیع

اس کے اس استدلال کی ایک مثال چینی حکومت کی اس تحریر میں ملتی ہے جو اس نے ۲۶ دسمبر ۱۹۵۹ء کو ہندستان کے علاقے پر اپنے دعووں کی تائید میں نئی دہلی بھیجی تھی۔ اس تحریر میں اس نے لداخ کے بعض مقامات کے بارے میں کہا تھا کہ ان کے نام سنکیانگ میں بولی جانے والی زبان "اوئی غور" کے ہیں اس لئے یہ مقامات سنکیانگ کا جزو ہیں۔ زبانوں کے اس میل جول کو اگر سیاسی اقتدار کا ثبوت مان لیا جائے تو دنیا کے شاید سبھی ملکوں کی سرحدیں غیر متعینہ بن جائیں گی اور دعووں اور جوابی دعووں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جہاں تک ہندستان اور چین کا تعلق ہے اگر ایک طرف چینی تہذیب اور زبان کے اثرات ہندوستان پر پہنچے تو دوسری طرف ہندستانی تہذیب اور زبان کے اثرات چین پر بھی پڑے ہیں۔ نہ صرف تبت اور سنکیانگ بلکہ چینی ترکستان میں بھی ایسے مقامات موجود ہیں جن کے نام سنسکرت یا پراکرت سے نکلے ہیں۔ ہندستان کے یہ اثرات جنوب مشرقی ایشیا اور مغربی ایشیا میں بھی پائے جاتے ہیں مثلاً آج کا قندھار مہابھارت میں گندھار کے نام سے پکارا گیا ہے۔ لیکن ہندستان دوسرے ملکوں کے ساتھ اس تہذیبی تعلق کو دوستی میں اضافے کا ذریعہ بنا رہا ہے جبکہ چین اپنے تعلق کو توسیع پسندی کے لئے بہانہ بنا رہا ہے۔

اسی طرح ہندستان نے یہ مطالبہ کبھی نہیں کیا کہ جو مقامات اور علاقے اس کی قدیم کتابوں میں ہندستان کا جز بتائے گئے ہیں یا جن پر چند سو برس پہلے ہندستان کا اقتدار تاریخ کی رو سے ثابت ہوتا ہے وہ سب کے سب اسے واپس کئے جائیں۔ اس کے برخلاف چین کے موجودہ حکمران جو اپنے کو سامراج دشمن کہتے ہیں اپنے سامراجی پیش روؤں کی حرکتوں کو جائز قرار دے کر ان کے مفتوحہ علاقوں پر اپنا حق جتا رہے ہیں۔ (اگرچہ ایسے بیشتر علاقوں پر چین کا اقتدار بہت ہی مختصر مدتوں کے لئے قائم ہوا تھا۔ اور بالکل ڈھیلا ڈھالا رہا تھا۔) ہندستان کے معاملے میں تو وہ اس سے بھی بڑی دھاندلی کر رہے ہیں اور ایسے علاقے کا مطالبہ کر رہے ہیں جو پچھلے کئی ہزار برسوں میں بھی کبھی چین کے زیر اقتدار نہیں رہا۔

چین بلاشبہ ایک بہت پرانا ملک ہے اور اس کی تہذیب بھی بہت پرانی ہے۔ اگر اس تہذیب کا اثر ایشیا کے دوسرے ملکوں پر پڑا تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بات تعجب والی ضرور ہے کہ ایک قدیم تہذیب کے وارث اور مالک ہونے کے باوجود چین کے لیڈر گھمنڈ میں اتنے سرشار ہوگئے تھے کہ وہ بیرونی دنیا کو بربری کہتے تھے۔ برطانیہ کے ساتھ تجارتی تعلقات کے سلسلے میں چین کے شہنشاہ نے شاہ جارج سوم کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ "ہمیں باہر کی بربری قوموں کی کسی پیداوار کی ضرورت نہیں ہے"۔

آج سے سیکڑوں برس پہلے جس زمانے میں چین کی تہذیب عروج پر تھی اس زمانے میں فوجی قوت کے ذریعے فتوحات کا حصول معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چین نے چونکہ سوار فوج کی تربیت اور فوجی طاقت کی

تنظیم میں مہارت حاصل کرلی تھی اس لئے اس کا پلہ اپنے پڑوسی ملکوں سے بھاری ہوگیا اور اس کے حکمرانوں نے اپنا تسلط عیسوی سن کے آغاز سے پہلے ہی مغرب میں پامیر کے کوہستانی سلسلے تک اور جنوب میں ٹونگ کنگ تک پھیلا لیا۔ مگر حکومت کے اقتدار کے حدود اس کی فوجی طاقت کے ساتھ بڑھتے گھٹتے رہے۔ اصل چین کے حالات بھی اسی چیز سے متاثر ہوتے رہے چنانچہ تیسری صدی عیسوی کے شروع میں جب چینی شہنشاہ کی فوجی طاقت کم ہوگئی تو کوئی ساڑھے تین سو سال تک انتشار کا دور دورہ رہا اور اس دوران ساٹھ سال تک ایک چینی سلطنت کی جگہ تین چینی سلطنتیں قائم رہیں۔

فوجی افسر شاہی

فوجی طاقت کو ہر دوسری چیز پر اولیت حاصل ہونے کی وجہ سے حکومتوں کی تبدیلی کے اسباب میں بھی فوج کا رجحان خاص اہمیت رکھتا ہے۔ چین کی تاریخ میں تو بارہا ایسا ہوا ہے کہ کسی فوجی افسر نے بغاوت کر دی اور فوج کے آدمیوں کی مدد سے شہنشاہ بن بیٹھا — چاہے اس کی شہنشاہی صرف ایک صوبے تک محدود رہی ہو۔ فوجی افسر شاہی کے علاوہ کسانوں کی بے چینی نے بھی حکومتوں کو بنانے اور بگاڑنے میں خاص حصہ لیا ہے۔ اور یہ خصوصیت موجودہ چین کی بھی ہے جیسے زرعی پروگرام کی ناکامیابی نے ایک ایسے بحران سے دوچار کر دیا جس پر قابو پانے کے لیے حکومت نے ہندستان کے خلاف جنگ کا اعلان کئے بغیر ایک بلکہ دو جنگی محاذ کھول دیے۔

جب جب چین میں فوجی افسر شاہی کا زور ہوا تب تب وہاں توسیع پسندی کے جذبے نے شدت اختیار کی۔ جس افسر کی بغاوت نے انتشار کا دور ختم کیا تھا وہ شمال میں منگولوں کو ہرا کر کوریا کے اندر تک گھس گیا اور مغرب میں وسط ایشیا تک اور جنوب میں ٹونگ کنگ تک پہنچ گیا۔ اس افسر کی قائم کی ہوئی حکومت ایک دوسرے جنرل کے بیٹے نے ختم کر دی جس نے اپنے باپ کو شہنشاہ بنا دیا اور اس کے مرنے کے بعد خود تخت نشین ہو گیا۔ اس خاندان نے بھی توسیع پسندی کی ریت قائم رکھی اور اپنا حلقۂ اقتدار التائی اور ہندوکش کے پہاڑی سلسلوں تک پھیلا دیا۔ مگر اس کے بعد پھر طوائف الملوکی کا دور شروع ہو گیا اور موقع سے فائدہ اٹھا کر منگول سردار چنگیز خاں نے چین پر قبضہ کر لیا۔ اس کا خاندان کوئی ۸۰ برس تک وہاں راج کرتا رہا۔ چنگیز کے پوتے کبلا خان نے جاوا اور سماترا تک ہاتھ پیر مارے مگر اس کے سمندری بیڑے کو زبردست نقصانات اٹھانا پڑے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہی حشر جاپان پر حملے کی مہم کا بھی ہوا۔ ان مہموں میں جان اور مال کا جو نقصان ہوا اس کے احساس کو ناکامیابی نے شدید تر کر دیا اور حکومت کا تختہ ایک مرتبہ پھر الٹ گیا۔

سامراجی ذہنیت میں اضافہ

کئی سال کے انتشار کے بعد منگ خاندان کی حکومت مستحکم ہو گئی اور حکومت کی طاقت کے ساتھ ساتھ اس کی سامراجی ذہنیت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اس دور میں چینیوں نے پھر جاوا اور سماترا تک چھاپے مارے اور لنکا تک پہنچ گئے جہاں انھوں نے سنہ ۱۴۵۶ء میں وہاں کے حکمراں کو تخت سے ہٹا کر اس کی جگہ اپنی پسند کے آدمی کو بٹھا دیا اور اسے اپنا باج گزار بنا لیا۔

منگ خاندان کے بعد مانچو خاندان کا راج قائم ہوا۔ اس خاندان کے اجداد پانچ صدی پہلے بھی شمالی چین پر راج کر چکے تھے۔ جب وہ چین کے حملہ آور تھے۔ ان کے زمانے میں بھی چین توسیع پسندی کی راہ پر گامزن رہا۔ ایک مانچو شہنشاہ نے وسط ایشیا میں فوج بھیج کر کاشغر اور تاشقند فتح کر لیا اور سن کیانگ کو چین میں ملا لیا۔ چینی فوجوں نے اس دور میں تبت پر قبضہ کر لیا اور جب نیپال نے تبت میں آکر چین کی راہ روکنی چاہی تو جوابی کارروائی کے طور پر ستر ہزار چینی سپاہ نیپال میں گھس گئی اور اس کے حکمراں سے چین کی بالادستی منوالی۔ برما اور کوچین چین (ہند چین) پر بھی حملہ کیا گیا اور کچھ عرصے تک چین کو برما سے خراج کی شکل میں خراج ملتا رہا۔

قبضہ کی حقیقت

چین کو اپنی تہذیب کے ساتھ اپنی طاقت پر بھی گھمنڈ تھا لیکن جو علاقے اس نے فتح کئے ان میں سے بیشتر پر اس کا قبضہ غیر مستقل اور ڈھیلا ڈھالا رہا۔ اس زمانے میں چین کی کوئی خارجہ پالیسی نہیں تھی اور امور خارجہ کی نگرانی وزارت جنگی کرتی تھی۔ دوسرے ملکوں پر اقتدار زیادہ تر تحفوں اور خراج کے لین دین تک محدود تھا۔ یہ ملک خراج کی حد تک چین کے محکوم ہو کے باوجود دوسری طاقتوں سے جنگ صلح اور سمجھوتہ کرتے رہتے تھے۔

مثال کے طور پر کوریا نے جس زمانے میں وہ چین کا باج گزار تھا جاپان سے کانگھوا کے مقام پر جو سمجھوتہ کیا تھا اس میں چین کا کوئی ذکر نہیں

تھا اگرچہ اس کے بعد بعض دوسرے ملکوں کے ساتھ کئے جانے والے سمجھوتوں میں چین کا ذکر کیا گیا۔ اسی طرح سنہ ۱۸۲۰ء اور سنہ ۱۸۵۵ء کے درمیان برما اور برطانیہ کی جو تین جنگیں ہوئیں ان سے چین بے تعلق رہا، اور ان جنگوں کے بعد اس نے برطانیہ کے ساتھ ایک سمجھوتے میں برما پر اس کا اقتدار تسلیم کر لیا۔

تبت کا اعلان آزادی

تبت پر چین کا اقتدار بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا۔ یہ رسمی اقتدار مانچو سلطنت کے خاتمے پر سنہ ۱۹۱۲ء میں تبت کے اعلان آزادی کے بعد قانونی طور پر ختم ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی تبت نے دوسرے ملکوں کے ساتھ ایک آزاد ملک کی طرح تعلقات قائم کر رکھے تھے اور سنہ ۱۸۸۸ء میں تبت نے جب بھوٹان پر حملہ کیا تو چین اسے روک نہیں سکا۔ جموں و کشمیر کے مہاراجہ گلاب سنگھ کے خلاف سنہ ۱۸۴۱ء کی جنگ، نیپال کے خلاف سنہ ۱۸۵۵ء کی جنگ اور برطانیہ کے خلاف سنہ ۱۸۸۸ء اور سنہ ۱۹۰۴ء کی جنگیں تبت نے اپنے طور پر اور چین کی کسی مدد یا مداخلت کے بغیر لڑیں اور ختم کیں۔ ان کا اپنا سکہ تھا، اپنی فوج تھی اور پاسپورٹ اور ویزا کا اپنا بندوبست تھا۔ جب سنہ ۱۹۰۳ء میں ایک ہند برطانی افسر ینگ ہسبنڈ نے ہندستان سے ایک فوجی مہم لے جا کر لہاسا پر قبضہ کر لیا تو چین نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔

تبت کے دلائی لاما اور چین کے مانچو حکمرانوں کے درمیان شروع میں گرو اور چیلے جیسے تعلقات تھے۔ اس زمانے میں چوں کہ تبت کے بیرونی تعلقات اور روابط بہت کم اور صرف اپنے پڑوسیوں تک محدود تھے اس لئے چین نے یہ مشہور کر دیا کہ تبت پر اسے ایک طرح کی بالادستی حاصل ہے۔ اس کے متعلق انگریزی میں (Suzerainty) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو (Soveriegnty) یعنی اقتدار اعلیٰ سے مختلف ہے۔ برطانیہ چونکہ پہلی جنگ عظیم سے پہلے اور اس کے بعد روس کے اثر کو بڑھنے سے روکنے کے لئے چین کا ساتھ دے رہا تھا اس لئے اس نے تبت پر چین کی بالادستی تسلیم کر لی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی چین نے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ تبت کے اندرونی نظم و نسق میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ تبت نے سنہ ۱۸۵۶ء میں نیپال سے اور سنہ ۱۹۰۴ء میں برطانیہ سے جو معاہدے کئے تھے ان پر بھی چین نے کوئی اعتراض یا احتجاج نہیں کیا۔ ہندستان کی برطانی حکومت، تبت اور چین کے نمایندوں کی جو کانفرنس سنہ ۱۹۱۴-۱۳ء میں شملہ میں ہوئی تھی اس میں بھی تینوں کی پوزیشن ایک دوسرے کے مساوی تھی۔ تبتی نمایندہ اپنے ساتھ دلائی لاما کی دی ہوئی جو تعارفی دستاویز لایا تھا اس میں تبت کی خودمختاری کا اظہار کیا گیا تھا اور چینی نمایندے نے اس دستاویز کو منظور کر کے تبت کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اسی کانفرنس میں نقشے پر تبت اور نیفا کے درمیان وہ سرحدی خطہ بنایا گیا تھا جسے برطانی ہندستانی نمایندے کے نام پر میک ماہن لائن کہا جاتا ہے۔ آج چین اپنی جارحانہ ذہنیت کی بنا پر اس خط کو تسلیم نہیں کرتا اور اس لئے وہ تبت کے اس حق کو جسے اس نے سنہ ۱۹۱۴ء میں تسلیم کر لیا تھا ناجائز اور خلاف قانون قرار دے رہا ہے، حالانکہ یہ حق چین نے یکطرفہ طور پر اپنے مسلح حملے سے ابھی بارہ تیرہ برس ہوئے جب ختم کیا ہے۔

پرانے ہتھکنڈے

تازہ حملہ اس حکومت کے دور میں ہوا ہے جس کے لیڈر دنیا بھر میں اپنی سامراج دشمنی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ یہی حکومت آج ہندستان کے پچاس ہزار مربع میل علاقے کو ہڑپ کر لینا چاہتی ہے۔ اس کے لئے وہ دھوکے دھمکی اور حملے کے وہی طریقے اختیار کر رہی ہے جو سامراجی حکومتیں اختیار کرتی رہتی ہیں۔ دراصل نئے چینی لیڈر سامراجی دور سے قطع تعلق اور اظہار بیزاری کرنے کے بجائے اس دور کی طرف لالچ اور رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے سب سے بڑے لیڈر ماوزے تنگ نے سنہ ۱۹۳۹ء میں کہا تھا:

"سامراجی طاقتوں نے جنگ میں چین کو ہرا کر بہت سی محکوم چینی ریاستوں کو اور چینی سرزمین کے ایک حصے کو ہتھیا لیا۔ جاپان نے کوریا، تائی وان، جزائر ریوکو، جزائر پکاڈورس اور پورٹ آرتھر پر قبضہ کر لیا۔ انگلینڈ نے برما، بھوٹان، نیپال اور ہانگ کانگ ہتھیا لیا فرانس نے انام پر قبضہ کر لیا اور پرتگال جیسا حقیر ملک بھی مکاؤ لے گیا۔"

اس بیان میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ بنیادی طور پر درست ہیں اس لئے کہ جس طرح چین نے اپنے عروج کے زمانے میں توسیع پسندی کا طریقہ اختیار کیا تھا اسی طرح بعض دوسری طاقتوں نے بھی اپنی فوجی طاقت کے بل پر اپنی سلطنتوں کو بڑھانے کی کوشش کی۔ اس

کوشش کی کوئی بھی معقولیت پسند شخص تائید نہیں کر سکتا لیکن چینی لیڈروں
کی یہ روش کسی طرح معقولیت پسندانہ نہیں کہی جا سکتی کہ وہ جاپان، انگلینڈ
فرانس اور پرتگال کی توسیع پسندی کو تو قابل مذمت قرار دیتے ہیں اور چینی
خاقانوں اور حکمرانوں کی توسیع پسندی کو جائز اور قابل تعریف سمجھتے ہیں۔
چینی لیڈر کے مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک سابق
چینی حکمرانوں نے جن ہتھکنڈوں سے اپنی سلطنت بڑھائی تھی اور دوسرے
ملکوں پر قبضہ کیا تھا ان میں کوئی ناپسندیدہ بات نہیں تھی۔

ایک درسی کتاب

یہی رجحان "چین کی مختصر تاریخ" نام کی اس درسی کتاب میں
بھی جھلکتا ہے جس کا دوسرا ایڈیشن اب سے ۸ سال پہلے یعنی چین کی
نئی حکومت کے قیام کے پانچ سال بعد پیکنگ میں شائع ہوا ہے۔
اس میں ۱۸۴۰ء سے ۱۹۱۹ء تک کے زمانے کو "پرانا جمہوری انقلابی
عہد" کہا گیا ہے اور اس عہد کے حالات کو ایک نقشے میں پیش کیا گیا ہے۔
اس میں چینی سلطنت کے وہ حصے دکھائے گئے ہیں جو بعد کو اس سے نکل
گئے اور وضاحتی فقرات سے سامراجی ہوس کی نشاندہی ہوتی ہے۔
ان فقروں میں کہا گیا ہے کہ عظیم شمال مغرب یعنی قزاقستان
کرغیزیا اور تاجکستان کی موجودہ سوویت جمہوریتوں اور عظیم شمال مشرق یعنی
روسی مشرق بعید کے ایک بڑے علاقے کو سامراجی روس نے ہڑپ کر لیا اور
پامیر کو برطانیہ اور روس نے خفیہ طور پر آپس میں تقسیم کر لیا۔ اسی طرح نیپال
سکم بھوٹان، آسام، برما، جزائر انڈمان، ملایا، تھائی لینڈ، انام، تائی وان
جزیرہ سولو، جزائر ریوکیو، اور جزائر کیوراٹل کی بابت کہا گیا ہے کہ یہ علاقے
پہلے چین کے تھے لیکن بعد میں ان پر برطانیہ، روس اور جاپان نے قبضہ کر لیا۔

ایک پیشین گوئی

جس ذہنیت کو چین کے موجودہ لیڈروں نے ان فقروں میں سراہا
ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نئے چین کے بانی ڈاکٹر سن یات سین
نے ۱۹۲۴ء میں کہا تھا کہ ہزاروں سال سے چین دنیا بھر کو فتح کرنے کی
کوشش کرتا رہا ہے ..." اس کی کبھی یہ خواہش تھی کہ وہ تمام دنیا کا مالک
اور ہر قوم سے اعلیٰ تر بن جائے"۔
ڈاکٹر سن یات سین نے کہا تھا کہ یہی کوشش اور خواہش چین کے
زوال کا باعث بن گئی۔ انھوں نے یہ آگاہی بھی دی تھی کہ "اگر چین بھی طاقت
حاصل کر کے دوسرے ملکوں کو کچلتے ہوئے بڑی طاقتوں کی سامراجیت
کی پیروی کرے گا تو وہ دنیا کے لئے مفید ہونے کے بجائے ایک عظیم مصیبت
بن جائے گا"۔
موجودہ چینی لیڈروں نے اس آگاہی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ چین
کے اس عظیم مفکر اور محسن سن یات سین کی باتوں پر عمل کرنے کے بجائے
منگول، منگ، اور مانچو بادشاہوں اور خاقانوں کی روش پر چل رہے ہیں۔
ہندستان کے نیفا اور لداخ کے علاقوں پر ان کا حملہ اور اس حملے کے
متعلق ان کا استدلال صاف طور پر بتاتا ہے کہ پرانا سامراجی اژدہا پھر سر
اٹھا رہا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ۸ دسمبر کو ملایا کے
وزیر اعظم نے کہا تھا کہ ایک چینی نقشے میں ملایا، برما، تھائی لینڈ، ویٹ نام
اور کمبوڈیا کو چین کا جزو دکھایا گیا ہے اور بہت ممکن ہے کہ بہت سے چھوٹے
ملک بھی عنقریب اپنے کو ایسی ہی صورت حال سے دوچار پائیں جس سے
کہ آج ہندستان دوچار ہے۔

نقشوں کے ذریعے جارحیت

اس سلسلے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہندستان کے علاقے
پر اپنے دعوے کے ثبوت میں چین اپنے ایسے ہی نقشے پیش کر رہا ہے
جیسے ایک نقشے کا ملایا کے وزیر اعظم نے ذکر کیا ہے۔ ایک اور یاد رکھنے والی
بات یہ ہے کہ چین کے وزیر اعظم کو جب ہندستان کے وزیر اعظم نے ۱۹۵۹ء
میں قابل اعتراض نقشوں کی طرف توجہ دلائی تو انھوں نے کہہ دیا کہ یہ
نقشے پرانے ہیں اور ابھی چینی حکومت کو ان پر نظر ثانی کا موقع نہیں ملا ہے
لیکن بعد میں یہی نقشے چینی حکومت کے توسیع پسندانہ مطالبات کی بنیاد بن گئے
نقشوں کے ذریعے جارحیت اور سامراجیت کا جواز فراہم کرنے کی
کوشش چین دو طرح سے کرتا ہے۔ ایک یہ کہ دوسروں کے علاقے کو اپنی
مملکت میں شامل دکھا دیا جائے اور دوسرے یہ کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ
اپنی سرحد کو غیر متعینہ رکھا جائے۔ نیفا اور لداخ کے معاملوں میں اس نے یہ
دونوں تدبیریں اختیار کی ہیں۔ نیپال اور برما کے ساتھ اس نے اپنی سرحد کو
عرصے تک غیر متعینہ رکھا اور اب ان کے ساتھ سرحدی سمجھوتے اس نے اس

(بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

میر انیسؔ کا سفرِ حیدرآباد

سید مسعود حسن رضوی ادیب

جنوری ۱۹۶۳ء کے رسالۂ نیا دور میں رشید موسوی صاحبہ کا ایک مضمون شایع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے میر انیسؔ حیدرآباد میں۔ اِس مضمون میں کئی باتیں ایسی آگئی ہیں جو صحت سے قریب ہیں مگر بالکل صحیح نہیں ہیں۔ ذیل میں اُن باتوں کو لکھ کر اُن کی تصحیح کی جاتی ہے۔

(۱) نواب تہور جنگ بہادر نے میر انیسؔ کو حیدرآباد بلانے کے لیے جن لوگوں کے ذریعے سے کوشش کی تھی، اُن کے نام یوں لکھے گئے ہیں:

"شمس العلما شریف الحسن صاحب جن کا وطن لکھنؤ تھا"

"میر انیسؔ کے ایک اور شناسا حامد حسین ... ... لکھنؤ کے رہنے والے تھے"

پہلا نام مع خطاب غلط ہے۔ صحیح یوں ہے، شریف العلما مولوی سید شریف حسین۔ ان کا وطن لکھنؤ بتایا گیا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ وہ جگراؤں (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ دوسرا نام تو صحیح ہے، مگر وہ جن لفظوں کے درمیان میں آیا ہے اُن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی معمولی درجے کے غیر معروف آدمی کا نام ہے۔ حالاں کہ اس سے مراد ہیں شمس العلما مولانا سید حامد حسین صاحب قبلہ مجتہد جو شمس العلما مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ مجتہد مرحوم کے والد بزرگوار تھے۔

(۲) نیچے لکھے ہوے دو شعر انیسؔ سے منسوب کیے گئے ہیں:

حیدرآباد دکن سے لکھنؤ — فاصلہ ہے سیکڑوں فرسنگ کا
کب انیسؔ اُنس آنے تھے یہاں — فیض ہے یہ سب تہور جنگ کا

اُنس نہ میر انیسؔ سے پہلے حیدرآباد جا چکے تھے نہ اُن کے ساتھ گئے تھے۔ میر انیسؔ اُن کے حیدرآباد جانے کا ذکر کیوں کر کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ شعر کسی اور نے کہے ہیں۔

(۳) "انیسؔ ذی الحجہ کی ۲۷ر یا ۲۹ر تاریخ کو حیدرآباد پہنچے"

میر انیسؔ کے سفرِ حیدرآباد سے متعلق شریف العلما کے وہ خطوط جو اُنھوں نے حیدرآباد سے اپنے بڑے بھائی کو بھیجے تھے اُن کے پوتے سید آغا حسین صاحب نے رسالۂ "ہمایوں" لاہور کے نومبر ۱۹۴۲ء کے پرچے میں شایع کر دیے تھے۔ ان کے علاوہ خود میر انیسؔ نے ایک تفصیلی خط حیدرآباد سے اپنے چھوٹے بھائی میر مونسؔ کو لکھا تھا۔ وہ خط میر انیسؔ کے اخلاف میں سے سید محمد ہادی صاحب لائقؔ کے پاس محفوظ اور اُس کی نقل میرے پاس موجود ہے۔ ان خطوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر انیسؔ ۲ر مارچ ۱۸۷۱ء کو لکھنؤ سے روانہ ہو کر ۱۱ر مارچ کو حیدرآباد پہنچے۔ یہ شریف العلما کے خطوط سے ۹ر ذی الحجہ اور ۸ر ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ کے مطابق ٹھہرتی ہیں اور میر انیسؔ کے خطوط سے ۱۰ر ذی الحجہ اور ۱۹ر ذی الحجہ کے مطابق۔ ذی الحجہ کی تاریخوں میں ایک دن کا فرق جو نظر آتا ہے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مہینے کا چاند لکھنؤ میں حیدرآباد سے ایک دن پہلے دیکھا گیا تھا۔ بہر حال میر انیسؔ کے حیدرآباد پہنچنے کی تاریخ ۲۷ر یا ۲۹ر ذی الحجہ نہیں بلکہ ۱۸ر یا ۱۹ر ذی الحجہ تھی۔

(۴) "میر انیسؔ ... محرم کی ۲۰ر یا ۲۲ر تاریخ تک حیدرآباد میں رہے"

شریف العلما ایک خط میں جس کا ابتدائی حصہ ۲۳ر محرم کو اور آخری حصہ ۲۴ر محرم کو لکھا گیا تھا تحریر فرماتے ہیں:

"جناب میر انیسؔ فردا ازیں جا روانہ خواہند شد"

"۲۴ر محرم قریب شام میر صاحب ازیں جا روانہ شدند"

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ میر انیسؔ محرم کی ۲۰ر یا ۲۲ر تاریخ تک نہیں بلکہ ۲۴ر محرم کی شام تک حیدرآباد میں رہے۔

(۵) "انیسؔ مجلس میں آنے سے پہلے مرثیے کی خوانندگی کی اچھی طرح پیش مشق کر لیا کرتے تھے"

'پیش مشق' کے الفاظ غلط فہمی پیدا کر سکتے ہیں۔ میر انیسؔ مرثیہ پڑھنے سے پہلے اس کو اچھی طرح ضرور دیکھ لیتے ہوں گے۔ لیکن معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا ہے کہ وہ گھر پر بلند آواز سے مرثیہ پڑھنے کی مشق نہیں کرتے تھے۔

نیا دور (جنوری ۱۹۶۳ء) میں "میر انیسؔ حیدرآباد میں" کے زیرِ عنوان مس رشید موسوی کا ایک مضمون شایع ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے ہمیں یہ مراسلہ بھیجا ہے جسے نفسِ مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر شروع میں شایع کیا جا رہا ہے ——— ایڈیٹر

(۶) حیدرآباد کے قیام میں میر انیس کے معمولات یوں بیان کیے گئے ہیں

"صبح کی نماز کے بعد وہ ناشتے سے فارغ ہوتے اور نو بجے سے گیارہ بجے تک کا وقت اُن لوگوں کے ساتھ گزارتے جو ان سے ملنے کے لیے وہاں آتے تھے۔ اُن کا دوپہر کا کھانا گیارہ بجے ہوتا۔ کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرتے اور پھر ظہر کی نماز کے بعد التزام کے ساتھ قیلولہ کرتے۔ سہ پہر کو اُٹھ کر ہاتھ منھ دھوکر ملاقاتیوں سے ملنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ مغرب تک جاری رہتا۔ رات کے کھانے کے بعد کسی سے نہیں ملتے تھے۔ رات کو وہ عموماً جلد سو جایا کرتے تھے۔"

تقسیم اوقات کے اس نقشے میں سونے، کھانا کھانے اور ملاقات کرنے کے سوا کسی اور کام کی گنجائش نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ میر انیس مجلس کس وقت اور کتنی دیر پڑھتے تھے۔ شریف العلما کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حیدرآباد میں کچھ وقت مرثیہ کہنے میں بھی صرف کرتے تھے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:

یعنی حضرت نواب مختار الملک بہادر نے نواب تہور جنگ بہادر سے کہا کہ سُنا ہے کہ میر انیس صاحب آ رہے ہیں۔ وہ بہت معقول اور نہایت نازک مزاج آدمی ہیں۔ ان کی مہمانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ ہونے پائے، نہ احتیاط کے خلاف کوئی بات پیش آئے۔ چاہیے کہ اُن کی خاطر داری میں کوشش کی جائے۔ [تہور جنگ بہادر نے] عرض کیا بسر و چشم۔

اس واقعے میں مختار الملک اور نواب تہور جنگ کی باہمی کشیدگی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ بالخصوص میر انیس کی قدر شناسی اور خاطر داری میں کسی طرح کا اختلاف ان دونوں میں نظر نہیں آتا۔

(۸) "اشہری کے بیان کے مطابق نواب تہور جنگ نے انھیں دس ہزار روپے دیے ..." یہ صحیح نہیں ہے۔ نواب تہور جنگ نے انھیں پانچ ہزار روپے نذرانہ دیا تھا۔ اس کے علاوہ آمد و رفت کا خرچ اور خلعت بھی دیا تھا۔ خلعت میں کُرتے کے لیے بہترین ململ، اورنگ آباد کا ہمرو ... اور پانچ سو روپے

"چینی جارحیت کا مسئلہ ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال رہا ہے اور آج بھی ہے۔ ہر چیز پر اسی زاویے سے غور کرنا ہے۔ ملک کی آزادی اور عزت کو مقدم سمجھنا ضروری ہے اور اگر کوئی ملک ان چیزوں کی حفاظت نہیں کر سکتا تو دوسرے معاملات کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔" —— ڈاکٹر رادھا کرشنن (صدر جمہوریہ ہند)

"یک مرثیہ تصنیف می کنند۔ روزے روبروے من خود می گفتند و پسر ایشاں می نوشت۔"

یعنی ایک مرثیہ تصنیف کر رہے ہیں۔ ایک دن میرے سامنے خود کہتے جاتے تھے اور اُن کا بیٹا لکھتا جاتا تھا۔

(۷) "انیس جب تک حیدرآباد میں رہے مختار الملک سے ایک مرتبہ بھی ملاقات نہیں کی۔ اس سے اس بات کی مزید توثیق ہو جاتی ہے کہ نواب تہور جنگ اور مختار الملک میں صفائی نہیں تھی۔"

شریف العلما ۱۶ ذی الحجہ کے خط میں لکھتے ہیں:

"حضرت نواب مختار الملک بہادر بہ نواب تہور جنگ گفتند کہ شنیدہ شد کہ میر انیس صاحب می آیند۔ مرد بسیار معقول و نہایت نازک مزاج ہستند۔ باید کہ دقیقہ از دقائق در لوازم مہمانی او شاں فروگزاشت نہ شود یا ایں کہ خلاف احتیاط امرے بظہور رسد۔ در خاطر داری او شاں باید کوشید۔ عرض کردند بچشم۔"

کا۔ تا ادبھی تھا۔"

شریف العلما کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب تہور جنگ نے تین ہزار روپے پیش کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن میر انیس کے نامنظور کر دینے پر اس رقم کو بڑھا کر چار ہزار روپیہ کر دیا تھا اور زادِ راہ اسی چار ہزار میں شامل تھا۔ لیکن ممکن ہے کہ میر انیس کے کمال مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی کو توقع سے زیادہ پا کر اور اُن کی عظیم شخصیت سے متاثر ہو کر طے کی ہوئی رقم سے زیادہ نذر کر دی ہو۔

رشید موسوی صاحب نے جو باتیں اپنے اس مضمون میں لکھی ہیں وہ حیدرآباد کے معمر بزرگ نواب عنایت جنگ بہادر سے دریافت کر کے لکھی ہیں اور موصوف سے زیادہ معتبر راوی مل نہیں سکتا۔ اس لیے کہ میر انیس کو حیدرآباد بلانے والے رئیس نواب تہور جنگ بہادر کے وہ فرزند رشید ہیں۔ میر انیس کا حیدرآباد میں عارضی قیام آج سے بانوے[۹۲] سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس کے جو تفصیلات نواب عنایت جنگ بہادر نے اپنے بزرگوں سے سُنے انھیں جس حد تک یاد رکھا، وہ بھی حیرت خیز ہے، لیکن اگر اتنی طویل مدت کے بعد حافظہ کچھ غلطی کرے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

اُردو غزل

میں

آدابِ عاشقی

مفتون کوٹوی

اردو کے شعری ادب میں غزل وہ صنفِ سخن ہے جو معاملاتِ حسن و عشق کے لئے بطورِ خاص وقف ہے۔ اگرچہ زندگی کے ہر پہلو، ہر تقاضے اور ہر داعیے کی جلوہ نمائی اس میں موجود ہے لیکن حسن و عشق کی فضا اس کی مخصوص فضا ہے۔

اس میں آدابِ عاشقی اور احترامِ حسن کے جو جذبات موجود ہیں وہ اتنے پُرکیف اور پُرخلوص ہیں کہ نیازِ عشق کی مکمل تصویر نظروں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ عشق کی عفتِ نگاہ اور عصمتِ خیال اتنی بلندی و پاکیزگی لئے ہوئے ہے کہ حسن کا تقدس بڑے بلند مقام پر نظر آتا ہے۔ تمام عالم میں اسی کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے، چاہے شمع ہو چاہے پروانہ، ہر طرف اور ہر چیز میں حسن ہی کا نیرنگ کمال نمایاں رہتا ہے ؎

کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگِ خیال　　چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے (حسرت گوندوی)

اسی کے ساتھ عشق کا مقام بھی بہت بلند ہے۔ وہ تیرہ خاکداں کے لئے چراغ ہے اور دل کے کاشانے کا دیا ہے۔ یہی نہیں، ایوانِ کبریا کی شمع بھی یہی عشق ہے ؎

فروغِ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لئے　　یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے (ذوق)

دل کے کاشانے کا دیا ہے عشق　　شمعِ ایوانِ کبریا ہے عشق (راسخ عظیم آبادی)

اور جب عشق پر حسن اثر انداز ہوتا ہے تو عشق میں یہ شان پیدا ہو جاتی ہے ؎

اثرِ حسنِ یار سے آخر　　آگئی عشق میں بھی رعنائی (حسرت موہانی)

یہی نہیں کہ حسن ہی عشق پر اثر انداز ہوتا ہو۔ عشق بھی حسن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور اس وقت حسن کی کیا حالت ہو جاتی ہے، وہ اس شعر میں دیکھئے ؎

حسن کے بھی ڈگمگاتے ہیں قدم　　عشق کرتا ہو جہاں انگڑائیاں (جگر مرادآبادی)

اس موقع پر پہنچ کر حسن و عشق کا ربط و اتحاد بھی ملاحظہ کر لیجئے ؎

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا　　پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہو ہم ہیں (خواجہ حیدر علی آتش)

حسن ہے ذات مری، عشق صفت ہے میری　　ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا (فانی)

یہ حسن و عشق میں کیا ربط ہے خدا جانے　　چراغِ بزم کو لو دے رہے ہیں پروانے (اصغر حسن تہذیب)

مگر ان روابط کے باوجود عشق کا مسلک نیاز کیشی تسلیم کیا گیا۔ حسن کا پہلو ابھرتا ہوا اور عشق کا پہلو دبتا ہوا رہا۔ اور اس مقصد کی تکمیل میں سطوتِ خسروی بھی مانع نہ آسکی ؎

کس کا سرِ نیاز تھا پائے ایاز پر جھکا؟　　مانعِ بندگیٔ شوق سطوتِ خسروی نہیں (بابا فغانی)

پائے محبوب پر سرِ بندگی کا جھکنا ہی اردو شاعری کے آدابِ عاشقی میں داخل نہیں، بلکہ جفائے محبوب کو صبر و عزم کے ساتھ برداشت کرنا، پیشِ محبوب رعبِ جمال سے کچھ نہ کہہ سکنا، عرضِ تمنا کی جرأت ہو بھی جائے تو بڑے رکھ رکھاؤ، قرینہ و سلیقہ سے اظہارِ مدعا کرنا، دیدِ جمال کی تاب نہ لا سکنا، ذکرِ محبوب بے حد محتاط طریقہ سے کرنا وغیرہ یہ سب کچھ آدابِ عاشقی میں شامل ہے۔ پہلے جفائے محبوب کو برداشت کرتے ہوئے صبر و رضا کا یہ پہلو ملاحظہ کیجئے ؎

بتوں کا جور سہتے ہیں، خدا کو یاد کرتے ہیں　　کہیں اہلِ وفا بیداد کی فریاد کرتے ہیں (حزیں شاد ملیح)

جفا سے گھبرا کر ترکِ وفا کجا، اس کا خیال بھی ممکن نہیں ؎

جفا سے باز نہ آئے تم اور کیوں آتے　　کہ ہم سے ترکِ وفا کا خیال ہو نہ سکا (حسرت موہانی)

جفائے محبوب بھی ایک احسان ہی، ملاحظہ ہو ؎

یہ بھی احسان ہے اس کا جو وہ بیداد کرے　　ورنہ کیا اس کو غرض؟ کیوں مجھے یاد کرے (بیتاب عظیم آبادی)

احسان کے علاوہ ستمِ یار سرمایۂ سعادت بھی ہے ؎

ستم کو ان کے سرمایہ سمجھ اپنی سعادت کا　　بڑی تقدیر ہے کہ ان کی جس پر ناز کرتے ہیں (بیتاب عظیم آبادی)

محبوب اگرچہ سفاکی کرتا ہے مگر عاشق کی وفاداری کا یہ عالم ہے۔ ؎

وہ رواں تیرِ نظر اپنا ادھر کرتے ہیں　　پیش ہم طائرِ دل باندھ کے پر کرتے ہیں (حزیں شاد ملیح)

یہ خلوص ستم کوشی ملاحظہ کیجئے کہ طائرِ دل کو پر باندھ کر تیرِ نظر کے سامنے چھوڑا گیا ہے تاکہ نشانہ صحیح لگے۔ اور ستمگاری میں اگر کہیں لغزش

یا نوازش کے آثار نظر آتے ہیں تو محبوب کو خود جتا دیا جاتا ہے ؎

جور بے بسم نہ کرے شانِ توجہ پیدا   دیکھ بنام نہ ہو نام ستمگاری کا (حسرت موہانی)

اگر کوئی شخص غلط بات یا غلط کام کر بیٹھے تو وہ اکثر پشیمان بھی ہو جاتا ہے مگر اردو شاعر کو یہ بھی گوارا نہیں کہ محبوب اپنی کسی بات پر پشیمان ہو جائے ؎

روح ارباب محبت کی لرز جاتی ہے   تو پشیمان نہ ہوا اپنی جفا یاد نہ کر (فانی)

جفا سے اپنی پشیماں نہ ہو، ہوا سو ہوا   تری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا (علی تابان)

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں   آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے (داغ)

حسن کے ساتھ جفا جوئی لازمی سمجھی جاتی ہے۔ اس خیال سے عاشق کے دل پر صبر و رضا کی کیفیت بھی طاری رہتی ہے اور محبوب کو بھی مطمئن کر دیا جاتا ہے کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ؎

حسن انساں کو جفا کار بنا دیتا ہے   کچھ نئی بات نہیں تم جو ستمگر نکلے (حزیں قادر بریلوی)

ہاں ہاں تمھارے حسن کی کوئی خطا نہیں   میں حسن اتفاق سے دیوانہ ہو گیا (واللہ اعلم)

اگر محبوب جفا نہ کرے تو اسے اپنی بدقسمتی سمجھا جاتا ہے ؎

جرأت شکوہ کبھی پیدا ہوئی بھی تو پیش محبوب ہرگز نہیں۔ وہاں تو طاقت گفتار ہی جواب دے دیتی ہے۔ محض خیال یار سے شکوہ کرنے کا ارمان ہے۔ وہ بھی سب کے سامنے نہیں تنہائی میں۔

خیال یار سے کچھ شکوۂ بیداد کر لیتے   کسی دن کاش تنہائی میں ہم فریاد کر لیتے (بادی)

احترام حسن، رعب جمال اور آداب عاشقی پیش محبوب زبان بند کر دیتے ہیں۔ کہنے کو بہت کچھ سوچتے ہیں مگر قوت گویائی جواب دے دیتی ہے ؎

کہتے تو ہو یوں کہتے، یوں کہتے جو یار آتا   سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا (میر)

یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتاں   جب رو برو ہو تیرے گفتار بھول جاوے (خان آرزو؟ آبرو)

یا کہتے تھے کچھ کہتے، جب اس نے کہا کہئے   تو چپ ہیں کہ کیا کہئے کھلتی ہے زباں کوئی (فانی)

بات بھی آپ کے آگے نہ زباں سے نکلی   لیجئے آئے تھے ہم سوچ کے کیا کیا دل میں (ذوق؟)

بے زبانی ترجمان شوق بے حد ہو تو ہو   ورنہ پیش یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں (حسرت موہانی)

جب زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے تو حال دل کا اظہار صرف خموشی سے کیا جاتا ہے ؎

> " فوجی تیاریوں کے لیے اقتصادی ترقی اور صنعتی ترقی بنیادی چیزیں ہیں۔ اس اقتصادی ترقی کو روک دینے یا اس کی رفتار کم کر دینے سے ملک کمزور ہو جائے گا ! "
> ——— ڈاکٹر رادھا کرشنن (صدر جمہوریہ ہند)

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ   اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا (غالب)

جفا کا بھی تو تعلق نہ اب رہا باقی   ترس رہا ہوں ترے جور نا روا کے لئے (احمد؟)

اور اگر محبوب کے ہاتھوں عاشق کی بربادی ہو تو اس پر ناز کیا جاتا ہے ؎

تجھ کو برباد تو ہونا تھا بہر حال خمار   ناز کر ناز کہ اس نے تجھے برباد کیا (خمار بارہ بنکوی)

ظاہر ہے کہ جب یہ حال ہو تو محبوب سے شکایت اور گلہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ تڑپیں گے لیکن گلہ کسی صورت سے ممکن نہیں ؎

صدمہ ہر چند ترے جور سے جاں پر آیا   نہ یہ شکوہ کبھی میری زباں پر آیا (سودا)

ظلم کی شکایت تو درکنار اگر محبوب قتل بھی کر دے تو حرف شکایت زباں پر نہ آئے گا بلکہ محبوب کو بدنامی سے بچانے کے لئے موت کا سیدھا سا حیلہ تراش لیں گے ؎

سبب مرنے کا پوچھو تو اجل کا نام لیتے ہیں   شکایت کیا ہے ان کو اپنے قاتل کی (حزیں قادری بریلوی)

شکایت تو شکایت ملال محبوب کے پیش نظر شکر ستم بھی نہیں کیا جا سکتا ؎

بے محل بات بھلی بھی تو بری ہوتی ہے   شکر کرتے ہوئے ڈرتا ہوں شکایت کیسی؟ (داغ)

اور خاموش بیٹھ رہتا ہوں   اس طرح حال دل کا کہتا ہوں (شاہ مبارک آبرو)

خموشی کے علاوہ التجا (نہ کہ شکوہ) کا ایک اور طریقہ نکالا ہے ؎

مایوس ہو کے دیکھ رہا ہوں میں سوئے دوست   آتی نہیں ہے اس کے سوا التجا مجھے (بادی)

عرض تمنا اور اظہار مدعا میں آداب عاشقی کا مکمل طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے۔ آرزو کو نگاہ شوق سے ادا کر دیا جاتا ہے کیونکہ حرف آرزو محبوب کی طبع نازک پر گراں گزرے گا ؎

گراں گزرے گا حرف آرزو اس طبع نازک پر   نگاہ شوق اس مفہوم رنگیں کو ادا کر دے (حسرت موہانی)

لیکن یہ بھی بار خاطر ہی ہے۔ آداب عاشقی کی تلقین یہ ہے کہ نگاہ یار سب کچھ سمجھ لے گی زبان کھولنے کی ضرورت ہی نہیں ؎

دل رہے گا جو ان سے منا ہے   لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں (حسرت موہانی)

آداب عاشقی دید جمال کی بھی تاب نہیں لا سکتے۔ محبوب کو دیکھ لینا بڑے حوصلہ کا کام ہے اور یہ نیازمندوں میں کہاں؟ ؎

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں   وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں (جلیل مانکپوری)

تجھ میں تابِ جمال یار کہاں — شوق انھیں سیر روبرو نہ کرے (حسرت موہانی)

محبوب سامنے ہے لیکن طاقتِ دید ساتھ نہیں دیتی۔ سچ ہے کہ میں بھی اسے دیکھنا ممکن نہیں ہے ؎

اس بے خودیٔ عشق کی ہو کس سے شکایت — وہ سامنے ہیں اور تماشا نہیں ممکن

میری نگاہِ شوق کا شکوہ نہیں بجا — سمجھے ہیں مگر وہ پاس دیکھا نہیں جاتا (اختر مہانی)

پاسِ آدابِ عاشقی کی یہ مثالیں ملاحظہ فرمائیں ؎

وہ پیش سے پھر سایۂ ملاقاتِ دیدار — جو کچھ نگہ شوق ہے گھبرائی ہوئی سی (فانی)

ہم برق و شرر کو کبھی خاطر میں نہ لائے — اس فتنۂ دوراں کو مگر دیکھ نہ پائے (آل احمد سرور)

جمالِ یار کے دیدار کے لئے نگاہ ضروری ہے۔ پہلے نگاہ پیدا ہونی چاہیئے ؎

دیدار کی لذت سے طریقوں سے بے خبر — دیدار کی طلب ہے تو پہلے نگاہ مانگ (آزاد انصاری)

اور اگر دیدار کی عزت نصیب ہو رہی ہے تو اس وقت کن آداب کو ملحوظ رکھنا چاہیے اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکتا ہے ؎

اے نگاہِ شوق رکھنا ضبطِ خواہش کا خیال — دیکھنا اس کو مگر اتنا کہ حیرانی نہ ہو (راہی مچھلی شہری)

حال کھل جائے نہ بے تابیٔ دل کا حسرت — بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں (حسرت موہانی)

دراصل محبوب کو نظر بھر کر دیکھ لینا بڑا حوصلہ چاہتا ہے ؎

نظر بھر کے جو دیکھ لیتے ہیں تم کو — میں ان کی نظر دیکھنا چاہتا ہوں (آرزو اکبرآبادی)

آدابِ محبت کا یہ کتنا پرکیف منظر ہے ؎

یہ بھی آدابِ محبت نے گوارا نہ کیا — ان کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی (حسرت موہانی)

ساتھ ہی ایک شعر اور ؎

ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی ان کا — جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی (حسرت موہانی)

ادھر محبوب کی ایک نظرِ عنایت کی کیفیات ملاحظہ فرمایئے ؎

ذرا جو ہم نے انھیں آج مہرباں دیکھا — نہ ہم سے پوچھیے کیا رنگِ آسماں دیکھا (ریاض خیرآبادی)

مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ — جی خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے (کیفی اعظمی)

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر — تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا (جگر مرادآبادی)

ذکرِ محبوب میں عشاق بہت محتاط رہتے ہیں یہ بے ادب ذکر کرتے ہیں اور نہ بے ادب ذکر سنتے ہیں ؎

لوگ جب ذکرِ یار کرتے ہیں — دیکھ رہتا ہوں دیر منہ سب کا (میر)

آگے بڑھے نہ قصۂ زلفِ بتاں سے ہم — سب کچھ کہا مگر نہ کھلے راز داں سے ہم (حالی)

تذکرۂ محبوب میں جب یہ احتیاط ہے تو پھر نامِ محبوب میں جو احتیاط برتی جاتی وہ کہیے ہے ؎

آرزو ہے مجھے اک شخص سے ملنے کی بہت — نام کیا لوں کوئی اللہ کا بندہ ہوگا (اکبر الہ آبادی)

تذکرہ رہتا ہے دل سے سحر و شام ان کا — لب پہ آ جائے نہ بھولے سے کہیں نام ان کا (رشید صدیقی)

یہ احتیاط آدابِ عاشقی کے تحت ہے ورنہ ؎

اگر مرتے ہوئے لب پر نہ تیرا نام آئے گا — تو میں مرنے سے باز آیا مرے کس کام آئے گا (شاد عظیم آبادی)

محبت کے نازک مقاموں میں اسی نام کا تو سہارا ہے ؎

مرے لب پر یہ کیوں بے ساختہ آج ان کا نام آیا — رہِ الفت میں شاید پھر کوئی نازک مقام آیا (ماہر القادری)

دوسرا اگر کوئی نامِ محبوب لیتا ہے تو دلِ عاشق پر کیا کیفیت گزرتی ہے ملاحظہ کیجیے ؎

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا (میر)

تمہارا نام کوئی جو پکارے ہے کہیں — دل دھڑک جائے ہے میرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو (حسرت)

نامِ محبوب کا احترام دیکھیے ؎

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا — کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا (مومن)

کچھ مناظرِ یادِ محبوب اور اقرارِ محبوب کے بھی دیکھتے چلیے ان میں بھی آدابِ عاشقی کا لحاظ موجود ہے ؎

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام اپنے ہی کام سے — ترے ذکر سے تری فکر سے تری یاد سے ترے نام سے (جگر)

سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم — اس میں آ کشاں فراغت بھی ہو راحت کے سوا (اختر)

کچھ نقش تری یاد کے باقی ہیں ابھی تک — دل بے سر و ساماں سہی ویراں تو نہیں ہے (عظیم قریشی)

منبری بج رہی تھی دور کہیں — رات کس درجہ یاد آئے تم (بلقیس رعنا)

دل میں اک درد اٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا (وزیر علی صبا)

تصورِ محبوب سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ قابلِ ملاحظہ ہے ؎

دل دکھ کے رہ گیا یہ الگ بات ہے مگر — ہم بھی ترے خیال سے مسرور ہو گئے (فراق گورکھپوری)

اب دل ہے اور فراغِ محبت کی راحتیں — تشویشِ زندگانی و فکرِ اجل گئی (حسرت موہانی)

اپنے درد کو رسوا نہ ہونے دینے کی تدبیر ملاحظہ کیجیے ؎

درد کا میرے یقیں آپ کریں یا نہ کریں — عرض اتنی ہے کہ اس کا چرچا نہ کریں (رتن پنڈوروی)

غمِ محبوب کی اہمیت قابلِ غور ہے ؎

جیے جانے کی ہمت کس سے اٹھتی ؟ کس طرح اٹھتی ؟ — ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں (فانی)

لطف نہ ہو یہ الگ بات ہے، بیدادِ محبوب میں کمی کیوں آئے ؟ یہ بھی ہے بسا غنیمت ہے ؎

نہ ہو لطف، بیداد بھی کم ہنشیں   سلامت رہو تم مجھے غم نہیں (اثر لکھنوی)

سکون ملنا بھی خطرناک ہوتا ہے ؎

سکوں جب سے ہے دل کو یہ خطرہ ہر دم ہے   کہیں نہ پوچھ نہ بیٹھیں وہ کیوں کم ہے (حکیم ناطق)

حسرت محبوب رکھنے والوں کا درجہ قرب محبوب رکھنے والوں سے زیادہ بلند ہے ؎

جنھیں حاصل ہے تیرا قرب خوش قسمت سہی لیکن   تری حسرت لئے مر جانے والے اور ہوتے ہیں (ہری چند اختر)

محبوب بدعہدی کرتا ہے مگر اردو شاعر اس بدعہدی کا ذمہ دار محبوب کو نہیں ٹھہراتا بلکہ کوئی عذر پیدا کر لیتا ہے ؎

ان کے ایفائے عہد تک نہ جیے   عمر نے ہم سے بے وفائی کی (میر)

اب آستان محبوب و کوچۂ دوست کے متعلق کچھ ایسے اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں آداب عاشقی مد نظر رکھے گئے ہیں ؎

یہ آستان یار ہے صحن حرم نہیں   جب رکھ دیا ہے سر تو اٹھانا نہ چاہیے (جوہر زیدی)

بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو   جو ترے آستاں سے اٹھتا ہے (میر)

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے   ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے (آصف الدولہ)

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم   جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے (میر)

جاتا ہے آسماں لئے کوچے یار کے   آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر (میر)

راہ عشق قطع کرنے کے لئے ادب ضروری شرط ہے اور اس راہ کو صرف سر کے بل طے کرنا چاہیئے ؎

ہے قطع رہ عشق میں لے ذوق ادب شرط   جوں شمع تو اب سر ہی کے بل جا تو اچھا ([illegible])

اگر محبوب کے نشان پا، رقیب کی گلی میں نظر آگئے تو ذلت کا خیال بھی دل سے نکال دیا اور محض نقش قدم کو چومنے کے لئے رقیب کے کوچہ میں بھی سر کے بل جانا پڑا ؎

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا ذلیل   میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

آداب عاشقی کوچۂ دوست میں گریہ و بکا کی اجازت نہیں دیتے ؎

رونے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں فانی   یہ ان کی گلی ہے ترا غم خانہ نہیں ہے (فانی)

بعد موت بھی آداب عاشقی ہاتھ سے نہیں چھوٹتے۔ غبار عاشق مرنے کے بعد بھی احترام حسن کا لحاظ رکھے گا ؎

مری خاک بھی اڑے گی با ادب تری گلی میں   ترے آستاں سے اونچا نہ مرا غبار ہوگا ([illegible])

آخر میں ایک اور شعر ملاحظہ کیجئے۔ یہ اس خدائے سخن کا شعر ہے جس کی رگ رگ میں آداب عاشقی پیوست تھے جس نے زندگی میں بھی ان آداب کا دھیان رکھا اور مرنے کے بعد بھی ؎

دور بیٹھا غبار میر ان سے   عشق بن یہ ادب نہیں آتا (میر)

چین کی سامراجی تاریخ پر ایک نظر (بسلسلہ صفحہ ۱۵)

لئے گھڑ لئے ہیں کہ ہندستان کو نا مصالحت پسند کہہ کر بد نام کیا جائے۔ چین کے زیر اقتدار اندرونی منگولیا کی سرحد بھی ابھی تک غیر معینہ رکھی گئی ہے اور بعض چینی نقشوں میں بیرونی منگولیا کے کچھ حصوں کو چینی مملکت میں شامل دکھایا جاتا رہا۔ آخر دسمبر میں چین اور بیرونی منگولیا کے درمیان ایک سرحدی سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ لیکن اس سمجھوتے کی محرک چین کی مصالحت پسندی کے بجائے یہ بات ہے کہ بیرونی منگولیا کے خلاف جارحیت روس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی۔ اسی طرح افغانستان اور سوویت جمہوریتوں تاجکستان اور کرغیزیہ کے ساتھ چین کی جو سرحد چینی نقشوں میں دکھائی گئی ہے وہ روسی نقشوں میں دکھائی جانے والی سرحد سے مختلف ہے۔ روس کی طاقت، کمیونسٹ دنیا میں اس کی اہمیت اور اس کے ساتھ وابستہ چینی اغراض کی وجہ سے اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ چین سرحد کے مسئلے پر روس سے الجھ پڑے لیکن ایشیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ اس کے رویے کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا اور نہ یہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ چین برما اور نیپال کے ساتھ اپنے سمجھوتوں کی پابندی کرے گا یا کسی دوسرے ملک پر اپنا حق جتلانے سے پرہیز کرے گا۔

آیندہ رویہ

چین کے آیندہ رویہ کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ ہندستان پر اس کے حملے کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اگر یہاں سامراجی اژدہے کے دانت کھٹے کر دیے گئے یا توڑ دیے گئے تو وہ اپنے بل میں واپس جا کر کچھ عرصے تک کنڈلی مارے بیٹھا رہے گا۔ لیکن ہندستان پر حملے کے بعد اب ایشیا کے ملک چین کو نہ تو امن کا حامی سمجھ سکتے ہیں اور نہ سامراج کا دشمن۔ اس کی سامراجیت کو نظرانداز کرنا اور اسے امن پسند مان لینا ایک بڑے خطرے کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے کے مترادف ہوگا۔

غیر مہذب قبائل کے رسم و رواج

بدیع الزماں اعظمی

آج کی دنیا اگرچہ بہت مہذب اور ترقی یافتہ ہو چکی ہے مگر دنیا کے مختلف حصّوں میں اب بھی ایسے غیر مہذب قبائل پائے جاتے ہیں جو انسانی ارتقا کی پہلی ہی منزل میں ہیں۔ ان کے رسم و رواج بڑے ہی عجیب و غریب ہیں۔ ان مراسم کا تعلق رہن سہن، شادی بیاہ، جرم اور سزائیں، غرضکہ زندگی کے سبھی شعبوں سے ہے۔ یہ غیر مہذب قبیلے نہ صرف ایشیا اور افریقہ ہی میں پائے جاتے ہیں بلکہ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے یہ رسم و رواج قدیم ایام سے چلے آتے ہیں۔ ذیل میں بعض غیر مہذب قبائل کے چند مراسم پر روشنی ڈالی جاتی ہے جو معلوماتی بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔

شادی بیاہ کی رسمیں۔ اسکیمو (شمالی سائبیریا کے برفانی علاقوں کے باشندے) لوگوں میں تو شادی کی کوئی مجوزہ رسم ہی نہیں ہوتی عورت مرد کے گھر پہنچا دی جاتی ہے۔ اگرچہ ان لوگوں میں ایک ہی بیوی رکھنے کا چلن ہے مگر ان میں سے وہ لوگ دو بیویاں بھی رکھ لیتے ہیں جنھیں شکار کی مہارت ہوتی ہے کیونکہ وہ آسانی سے دونوں کی کفالت کر سکتے ہیں۔

جن جن علاقوں میں ماں کی طرف سے وراثت رائج ہے وہاں شوہر کو بیوی اور بچوں کے لیے گھر نہیں بنانا پڑتا بلکہ اُسے بیوی کے گھر ہی جا کر رہنا پڑتا ہے۔ جزیرہ سماترا کے پہاڑی قبائل میں یہ دستور ہے کہ شوہر اور بیوی اپنے اپنے والدین کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ اگرچہ شوہر کو بیوی حاصل کرنے کے لیے ایک بھاری رقم دینی پڑتی ہے مگر شوہر کے سر بیوی اور بچوں کی پرورش کا بار نہیں رہتا۔ البتہ شوہر کبھی کبھار جا کر اُن سے بھینٹ کر لیا کرتا ہے۔ دونوں میں علیٰحدگی کی شکل میں بچے ماں کی ملکیت قرار پاتے ہیں۔ ایسا ہی دستور مغربی افریقہ، نیوگنی اور بحر الکاہل کے بیشتر جزائر میں بھی ملتا ہے۔ مگر اُن علاقوں میں جہاں وراثت باپ کی طرف سے آتی ہے وہاں مرد ہی گھر کا مالک اور پرورش کنندہ ہوتا ہے! اگر اس کی اقتصادی حالت اسے اجازت دے تو وہ ایک سے زائد بیویاں بھی رکھ لیتا ہے۔ جس بیوی کی گود میں بچہ ہوتا ہے وہ اپنے مخصوص جھونپڑے میں ایک امتیازی شان سے تین سال تک آرام کرتی ہے۔ دوسری بیویاں اس کی خدمت کرتی رہتی ہیں اور گھریلو کاموں میں لگی رہتی ہیں۔ کانگو (افریقہ) کے قبیلوں کے سردار تو بعض اوقات سو سو بیویاں رکھتے ہیں۔ ان علاقوں میں نوجوانوں کو بیویاں نہ ملنے کی مستقل شکایت رہا کرتی ہے اس واسطے کہ ساری کم سن لڑکیاں سردار کے ہی تصرف میں آجاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں بیویوں کو چھوڑ دینے کا چلن بھی بہت ہے کیونکہ وہاں کے مردوں کے نزدیک بیس سال کی عمر کے بعد نہ تو عورتوں میں کوئی کشش باقی رہ جاتی ہے اور نہ بچہ جننے کی صلاحیت۔ عام طور سے ۲۵ سال کی عمر کے بعد کسی عورت کی گود میں بچہ دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔

کہیں کہیں پر یہ بھی پایا جاتا ہے کہ ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے ہیں۔ وسطی ایشیا کے پہاڑی قبائل میں عورتوں کی کمی کی بنا پر ایسا دیکھنے میں آتا ہے۔ ایسی صورت میں عورت ہی گھر کی مالکہ ہوتی ہے۔ شوہر اُس کی اطاعت کرتے ہیں۔ شب باشی کے لیے عورت جس کو چاہتی ہے بُلا لیتی ہے۔ بچوں کی پرورش کے سارے شوہر ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ایسی عورتیں اپنی خاص قسم کی ٹوپی سے پہچانی جا سکتی ہیں۔ یہ ٹوپی بید اور ادن کی بنی ہوتی ہے جس پر سیلم اور مونگے ٹنکے ہوتے ہیں۔

بحر الکاہل کے بعض جزائر، کناڈا کے قدیم قبائل، جنوبی امریکہ میں برازیل اور پیراگوے سے لے کر جزیرہ ٹیرا ڈلفیگو تک کے قدیم باشندوں اور افریقہ کے بعض قبائل میں یہ دستور پایا جاتا ہے کہ جب کوئی لڑکی سن بلوغ کو پہنچتی ہے تو کسی نہ کسی مرد سے اپنا تعلق قائم کر لیتی ہے مگر شادی کی کوئی رسم اُس وقت تک نہیں منائی جاتی جب تک کہ لڑکی کوئی بچہ نہ جنے یا کم از کم حاملہ نہ ہو جائے۔ کھیتی باڑی اور گلہ بانی کرنے والے قبائل میں جہاں

عورتوں کو خریدنے کی رسم جاری ہے وہاں بچوں کی اہمیت کے پیش نظر بچہ والی عورت کو باکرہ لڑکیوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔

جزیرہ فارموسا کے مشرقی پہاڑی جنگلی علاقے میں آتا یال (ATAYALS) نام کے قبیلے بستے ہیں۔ یہ لوگ بڑے شکاری ہوتے ہیں۔ تیندوے، ریچھ، سور اور ہرن کے شکار کے لیے خوفناک قسم کے کتے بھی ساتھ رکھتے ہیں۔ انسان کی کھوپڑی ان کے نزدیک ایک قیمتی پیالہ ہے۔ ان کا کوئی نوجوان اس وقت تک شادی نہیں رچا سکتا جب تک کہ وہ اپنی ہونے والی دلہن کے لیے ایک ایسا مکان نہ بنالے جس کی بنیاد میں چند انسانی کھوپڑیاں دفن نہ کر لی گئی ہوں۔ اجنبیوں کا سر قلم کرنے کے لیے شکاریوں کی ایک ٹولی بنائی جاتی ہے۔ یہ ٹولی اپنی مہم پر جانے سے قبل شگون دیکھتی ہے۔ شگون ٹھیک ہوا تو وہ انسانی شکار کے لیے روانہ ہوتی ہے جس وقت یہ جماعت اپنی بستی کو چھوڑتی ہے تو مقدس آگ روشن کی جاتی ہے۔ یہ آگ شکاریوں کی واپسی تک دن رات روشن رکھی جاتی ہے۔ اس اثنا بُنائی کا سارا کام رُک جاتا ہے حتیٰ کہ سن کا کاتنا بھی بند کر دیا جاتا ہے۔ جب شکاریوں کی یہ ٹولی کامیاب واپس آتی ہے تو ان کی لائی ہوئی کھوپڑیاں ایک دائرے کے مرکز میں رکھی جاتی ہیں۔ ان کے منہ میں کھانا ڈالا جاتا ہے اور رات بھر گانا بجانا اور ناچ ہوتا رہتا ہے۔ کامیاب نوجوانوں کے چہروں پر گودنا گود کر امتیازی نشان لگا کر ان کی عزت افزائی کی جاتی ہے۔ ان وحشی قبائل میں شادی بیاہ کا انداز بھی نرالا ہوتا ہے۔ دولہا روزانہ لکڑی کا ایک گٹھا اپنی ہونے والی دولہن کے دروازہ پر لے جا کر جمع کرتا ہے اور جب وہ بیس گٹھے جمع کر لیتا ہے اور وہ سارے گٹھے اٹھا کر اندر رکھ لیے جاتے ہیں تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ رشتہ منظور ہے۔ شادی کے دن دولہا اور دولہن ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ گانا بجانا ہوتا ہے پھر دونوں کے پیروں پر ہلکا ہلکا زخم لگایا جاتا ہے اور ایک کا خون دوسرے کے خون میں ملایا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق ایسا کرنے سے دولہا دولہن دونوں کا مزاج ایک ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ نیا جوڑا اس مچان پر چلا جاتا ہے جو خاص طور سے ان کے لیے زمین سے بیس فٹ اونچا بنایا جاتا ہے اور جو ان کے لیے حجلۂ عروسی کا کام دیتا ہے۔ اس مچان کے اوپر یہ جوڑا ۵ دن بسر کرتا ہے۔

جزیرہ سیلی بیز کے مغربی حصے میں "باتک" لوگ رہتے ہیں۔ مچان ہی ان کا گھر ہوتا ہے۔ لڑکی کی شادی میں جب بارات آتی ہے تو پھل اور تاڑی سے ضیافت کی جاتی ہے۔ باپ اپنی بیٹی کو کندھے پر بٹھا کر مچان سے نیچے لاتا ہے۔ لڑکی کا چہرہ سفید، ہونٹ سُرخ اور بھویں نیلی کر دی جاتی ہیں اور وہ اس وقت تک آنکھ بند کیے پڑی رہتی ہے جب تک کہ شادی کی ساری رسمیں ادا نہ کر لی جائیں۔ دولہن تین دن تک زمین پر قدم نہیں رکھتی ہے۔ خاندان کا سردار اسے اپنی گود ہی میں لیے رہتا ہے۔

کینیا (مشرقی افریقہ) میں کیکویو (KIKUYU) قبیلے بستے ہیں اس قبیلے کے لوگ اپنی دلہن کو اپنے خسر سے خریدتے ہیں۔ دولہن کی قیمت بالعموم آٹھ گائیں، دس بھیڑیں اور دلہن کے لیے دیسی شراب کے بیس مٹکے ہوتے ہیں۔ شادی کے موقعوں پر یہ لوگ ایک طرح کا "لڑائی کا ناچ" ناچتے ہیں سب کے سب ایک دائرے میں چکر لگاتے ہوئے "بردسی" ہو دسا" گاتے رہتے ہیں۔ وسطی افریقہ کے مغربی حصہ میں بھی اسی انداز پر شادی ہوتی ہے چونکہ یہ لوگ سانپ کی پوجا خاص طور سے کرتے ہیں۔ مختلف سانپ مختلف آدمیوں کے دیوتا ہوتے ہیں۔ دولہن جب بیاہ کر لائی جاتی ہے تو سب سے پہلے اس کی ملاقات دولہا کے سانپ سے کرائی جاتی ہے۔ جنوبی افریقہ میں بسنے والی زولو قوم میں بھی لڑکیوں کو خرید کر ہی شادی رچائی جاتی ہے۔ ہونے والا دولہا مویشیوں کا ایک گلہ اپنے خسر کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ لڑکی کا باپ ان مویشیوں کو اس لیے رکھ لیتا ہے کہ مبادا لڑکی بیوہ ہو جائے یا لڑکی اپنے شوہر کی بدسلوکی سے بھاگ آئے یا شوہر اسے چھوڑ دے تو اس کی کفالت ہو سکے۔ اس قوم کے وہ نوجوان جو اپنی ہونے والی دلہن کے جہیز کی قیمت نہیں ادا کر سکتے انھیں سالہا سال تک بن بیاہا رہنا پڑتا ہے۔ البتہ اگر خسر چاہے تو شادی اُدھار بھی رچائی جا سکتی ہے۔ ایسی صورت میں دولہا کو اُس وقت تک اپنے خسر کے یہاں جا کر رہنا پڑتا ہے جب تک کہ جہیز کی قیمت ادا نہ ہو جائے۔ اس اثنا میں جو اولاد پیدا ہوتی ہے وہ لڑکی کے باپ کی ملکیت قرار پاتی ہے۔ لڑکے کا باپ مزید ایک گائے دے کر ہی اس اولاد کو خرید سکتا ہے۔ شادی کا ایسا ہی طریقہ افریقہ کی "کافر" قوم میں بھی رائج ہے۔ شادی کے موقع پر لڑکی کا باپ ایک بیل کی نذر پیش کرتا ہے جو "دولہن کا بیل" کہلاتا ہے۔ اس بیل کو سب لوگ اس لیے ذبح کر کے کھا جاتے ہیں

کہ باپ کی روح مرنے کے بعد دولہا دولہن کو پریشان نہ کر سکے اور دولہن کی گود بچوں سے بھری رہے۔

مالینشیا اور پولینشیا کے جزائر میں لڑکی کی قیمت لگتی ہے۔ لڑکی کا باپ اپنی لڑکی کی قیمت تجویز کرتا ہے۔ اگر لڑکے کے باپ کو یہ قیمت منظور ہوتی ہے تو وہ اس قیمت کے برابر سور، مچھلی، ناریل، چٹائیاں اور زیورات دیتا ہے۔ ایک لڑکی کی قیمت جتنی زیادہ لگتی ہے اُس خاندان کا رتبہ اتنا ہی اونچا سمجھا جاتا ہے۔ شادی کے سلسلے میں ملنے والا دھن زیادہ تر لڑکی کے جسم پر گودنا گدوانے میں خرچ کر دیا جاتا ہے کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک گودنے سے خوبصورتی میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ شادی کے دن بڑے پیمانے پر دعوت دی جاتی ہے۔ اس موقع پر قبیلے کے لوگ لڑکی کو خوشنما چھالردار چٹائیوں کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔ جس لڑکی کو جتنی زیادہ چٹائیاں تحفہ میں ملتی ہیں وہ اسی قدر اپنے اوپر ناز کرتی ہے۔ یہ چٹائیاں نہایت نفیس اور نرم ہوتی ہیں اور انھیں سے ستر پوشی کا کام لیا جاتا ہے۔ جزیرۂ سلیمان میں بھی یہی دستور ہے۔ لڑکیوں کی قیمت تجویز کی جاتی ہے۔ اس جزیرے میں سور بطور سکہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ سوروں کے عوض بیویاں خرید لی جاتی ہیں۔ شادی کے موقعوں پر "لڑائی کا ناچ" بھی ہوتا ہے۔ عورتیں گودنے کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔

آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں شادی بیاہ کا ایک نہایت پیچیدہ طریقہ رائج ہے۔ ہر قبیلے کے چار چار خاندان یا ٹولیاں ہوتی ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لحاظ سے ان ٹولیوں کی تعداد آٹھ ہو جاتی ہے۔ ان ٹولیوں کے درمیان شادی بیاہ کرنے کے لیے کچھ قوانین متعین کر لیے گئے ہیں جن پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔

جادو ٹونے اور ٹوٹکے۔ آسٹریلیا اور نیوگنی کے درمیان آبنائے ٹارس میں واقع جزیرہ مرے کے باشندوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے پاس ایک ایسا ٹوٹکا ہے جس سے بارش کا ہونا یقینی ہے۔ ان کا بارش کا ایک دیوتا ہوتا ہے جب انھیں احساس ہوتا ہے کہ اب کی بارش کم ہوئی ہے تو وہ بارش کے دیوتا کی مورتی معہ کٹے ہوئے پتوں کے زمین میں دفن کر دیتے ہیں اور اوپر سے سیپ اور گھونگھیوں کا انبار لگا دیا جاتا ہے اور پانی گرایا جاتا ہے۔ سمادھ یا قبر کے چاروں طرف کیلے کے پتوں کے پردے لگا دیے جاتے ہیں۔ ان پتوں کی کھڑکھڑاہٹ گرجتے ہوئے بادلوں کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک جلتی ہوئی مشعل تیزی سے چاروں طرف گھمائی جاتی ہے۔ یہ مشعل بجلی کی چمک کی قائم مقامی کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ پھاڑے ہوئے بانس کی قمچیاں زمین پر پیٹی جاتی ہیں جن کی کرخت آواز بجلی کی کڑک کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر اتفاق سے اس وقت بارش ہونے لگتی ہے تو ان لوگوں کے عقیدے میں اور پختگی آجاتی ہے۔ شمالی آسٹریلیا میں بھی اسی کے مشابہ رسم پائی جاتی ہے۔

میکسیکو میں یہ ایک قدیم رسم تھی کہ جاڑے کی فصل کو آفات ارضی اور سماوی سے بچانے کے لیے نباتات کے دیوتا اکسائپ (XIPE) کو انسان کی بھینٹ پیش کی جاتی تھی۔ قربانی کرنے والا شخص مقتول کی کھال اتار کر پہن لیا کرتا تھا۔ اس سوانگ بھرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے کو ظاہر کرے کہ وہ جاڑے کی بے جان فصل ہے مگر جسم کے اندر زندگی کی رمق باقی ہے۔ اس کے بعد بڑی دھوم دھام کے ساتھ کھال اتار کر رکھ دی جاتی تھی۔ یہ عام عقیدہ تھا کہ ایسا کرنے سے فصل پوری اترتی تھی۔ اب یہ رسم نہیں منائی جاتی۔

بحرالکاہل کے جزائر میں یہ رسم پائی جاتی ہے کہ عورتیں مچھلی کے جال کے اوپر (اگر وہ سمندر کے کنارے سوکھنے کے لیے پھیلایا گیا ہو) کسی حال میں چل نہیں سکتیں کیوں کہ وہاں کے لوگوں کے عقیدے کے مطابق اگر عورتیں اس جال پر چلیں تو پھر ایک مچھلی بھی جال میں نہ پھنسے گی۔ جانوروں کا شکار کرنے والے مرد بھی اس امر کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ شکار کی تلاش میں روانہ ہونے سے تین راتیں پہلے وہ اپنی بیویوں سے الگ تھلگ رہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو شکار کا ہاتھ لگنا ناممکن ہو جائے گا۔

مغربی افریقہ کے چند قبائل میں یہ رسم جاری ہے کہ جب کسی سردار کے قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں تو اس کے ہاتھوں میں طوطے کے انڈے دے دیے جاتے ہیں۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوتا ہے کہ اب وہ سرداری کے قابل نہیں رہا اس لیے اُسے باعزت طور پر خودکشی کر لینا چاہیے۔ یہ اشارہ قبول نہ کیے جانے کی صورت میں سردار کی بیویاں ہی اس کا کام تمام کر دیتی ہیں۔ میکسیکو میں بھی اس رسم کا سراغ ملتا ہے۔ ایک سردار کے مرنے کے بعد اچھے ہاتھ پیروں والا کمسن نوجوان سرداری کے لیے منتخب کیا جاتا تھا۔ اس کا درجہ ایک دیوتا کا ہوتا تھا اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی تھی۔ اسے چار چار بیویاں فراہم کی جاتی تھیں مگر دو سال بعد اسے قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا

دیا جاتا تھا۔ پھر کسی دوسرے جوان کو سرداری سونپی جاتی تھی اور دو سال بعد اس کا بھی یہی حشر ہوتا تھا کیوں کہ عام خیال تھا کہ سردار کے تندرست اور توانا رہنے ہی سے قبیلہ میں خوش حالی اور شادمانی کا دور دورہ رہتا ہے اور بہ خلاف اس کے اگر سردار اپنی ضعیفی اور لاغری کے ساتھ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوتا رہے تو پھر پورے قبیلہ پر آفات سماوی کا آنا لازمی ہو جاتا ہے۔ سمو داجزائر میں سرداری عورتوں کو سونپی جاتی ہے۔ سردار کو ٹمپو (TEMPO) کہتے ہیں۔ ٹمپو کا انتخاب پورا قبیلہ کرتا ہے۔ اس کی دیکھ بھال بڑے ناز و نعم کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ عام عقیدہ ہے کہ اگر ٹمپو نہ ہے تو پوری بستی پر آسمان سے مصائب نازل ہوں گے۔

آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں اپنے قبیلہ کے سردار کی مردہ لاش کھانے کی رسم جاری ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کی روح کو اپنے ہی قبیلہ میں رکھنے اور اس کے اوصاف اپنے ہی قبیلے تک محدود رکھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ اس کا گوشت بہ طور تبرک بانٹ کر کھا لیا جائے۔ نیوزی لینڈ میں بسنے والی ماوری قوم میں یہ رسم جاری تھی کہ جب اس کا کوئی پہلوان اپنے دشمن کو ہلاک کر لیتا تھا تو وہ اس کی آنکھوں کو نکال کر چبا جاتا تھا کیونکہ عام عقیدے کے مطابق اس کی روح آنکھوں ہی میں آجاتی تھی اور ایسا کرنے سے وہ سمجھتا تھا کہ وہ اپنی جسمانی طاقت دوچند کر لیتا ہے۔

بعض قبائل میں بیماریوں کے سلسلے میں یہ عام خیال ہے کہ بیماریاں اس وقت لاحق ہوتی ہیں جب روح جسم سے عارضی طور پر پرواز کر جاتی ہے اور جب تک روح کو پکڑ کر جسم میں پھر نہ ڈالا جائے اس وقت تک مرض سے سبک دوشی ممکن نہیں۔ اب یہ قبیلوں کے "جادوگروں" یا طبیبوں ہی کا کام ہے کہ وہ اسے انجام دیں۔ پولی نیشیا کے جزیرہ پوکا پوکا میں ان کے قبیلہ کا "سوکھا" (یا جادوگر) ان روحوں کو پکڑنے کے لیے ناریل کی رسی کا ایک پھندا کسی درخت سے لٹکا دیتا ہے جب کوئی کیڑا اڑتا ہوا اس پھندے سے گذرتا ہے تو ان کے عقیدے کے مطابق روح اس پھندے میں پھنس جاتی ہے اور "سوکھا" اسے اپنے منتروں کی مدد سے گرفت میں لے کر مریض کے جسم میں ڈال دیتا۔ جنوبی پنامہ کے سین بلاس انڈینس کا یہ عقیدہ ہے کہ جب انسان کی روح کو بھوت پریت چرا لیتے ہیں تب وہ آدمی بیمار پڑ جاتا ہے۔ اب یہ ان کے "جادوگروں" ہی کا کام ہے کہ وہ روح کا پتہ لگائیں اور ایک خاص مدت کے اندر مریض

کے جسم میں ڈال کر اسے موت سے بچا لیں۔ مریض اپنی تاریک جھونپڑی میں لیٹا رہتا ہے اور رفتہ رفتہ جڑی بوٹیوں کا استعمال کرتا رہتا ہے اس کے قریب ان چیزوں کا انبار لگا دیا جاتا ہے جن پر منتر دم کیے جا چکے ہوتے ہیں "سوکھا" اس اثنا میں اپنی تیار کردہ کٹھ پتلیوں کو گیت گا گا کر ہدایت کرتا ہے کہ وہ بھوتوں کی بستیوں میں جائیں اور چرائی ہوئی روح کو واپس لائیں جب ان کے خیال میں روح واپس آجاتی ہے تو ایک خاص گیت کے ذریعہ اس کو لعنت ملامت کر کے مریض کے جسم میں داخل ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔

شمالی برازیل کے لوگوں کا خیال ہے کہ جسمانی تکالیف کیڑے مکوڑوں کے اندر چلے جانے سے لاحق ہوتی ہیں۔ ان تکلیفوں کو دور کرنے کے لیے قبیلہ کے "سوکھا" سے ہی رجوع کیا جاتا ہے۔ وہ جسم کے اس حصہ پر جہاں تکلیف ہوتی ہے اپنا منھ رکھ کر چوسنے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد اگر وہ اپنے منھ سے تتلی یا کوئی اور کیڑا نکال کر مریض کو دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ تیرے دشمن نے تجھ پر ٹونا کیا تھا تو ان لوگوں کے خیال میں اس طرح مریض کی جسمانی تکلیفیں فوراً دور ہو جاتی ہیں۔ لنکا کے بعض علاقوں میں جب بیماریاں وبا کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو ایک سوانگ رچا جاتا ہے جسے بھوت کا ناچ (Devil Dance) کہتے ہیں۔ "سوکھا" کے چیلے مختلف بیماریوں کا سوانگ بھرتے ہیں اور پھر یکے بعد دیگرے ان بہروپیوں کی جنگ "سوکھا" سے ہوتی ہے۔ بالآخر سوکھا ہی کی فتح ہوتی ہے۔ اس سوانگ بھرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بیماریوں کا زور اب کم ہو جائے گا۔

آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کا "سوکھا" ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ وہی ان کی بیٹھکوں کی صدارت کرتا ہے اور اسی کا فیصلہ ہر معاملہ میں اٹل سمجھا جاتا ہے۔ وہ ان کی جسمانی تکلیفوں کو مختلف طریقوں سے دور کرتا ہے۔ اس سلسلے میں دوا دارو تو کم، ان کا یقین ہی انھیں چنگا کر دیتا ہے۔ بعض دفعہ ایک آدمی کسی "سوکھا" کو کافی رقم دے کر اس سے درخواست کرتا ہے کہ اپنی خاص تیار کردہ "ہڈی" کی مدد سے اس کے دشمن کی جان لے لے۔ جب اس دشمن کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس پر ہڈی کا سحر کیا گیا ہے تو وہ کسی دوسرے "سوکھا" کی مدد حاصل کرتا ہے تاکہ وہ الٹے منتر جپ کر سحر کے اثرات کو زائل کرے۔

جرم اور سزائیں۔

غیر مہذب قبیلوں میں بھی ان کے کچھ سماجی "قوانین" ہوتے ہیں مگر ان

"قوانین" کی پابندی صرف اسی حد تک ضروری سمجھی جاتی ہے جہاں تک اس قبیلہ کے افراد کا تعلق ہے۔ اگر اپنے قبیلہ سے باہر ان قوانین کی خلاف ورزی کی جائے تو اس پر کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔ چناں چہ جزیرۂ بورنیو میں آباد ڈیاک قبیلہ کا ایک فرد ایک اجنبی کو قتل کر کے اس کا سر کاٹ لیتا ہے اور ہونے والی دلھن کے پاس اسے تحفہ کے طور پر لے جاتا ہے۔ اگر وہ یہ نہیں کرتا ہو تو اس کی شادی بھی نہیں ہو سکتی۔

جنوبی امریکہ کے بعض قبائل میں یہ رواج ہے کہ وہ اپنے قبیلہ کے بوڑھے افراد کو جان سے مار ڈالتے ہیں کیوں کہ وہ سماج پر ایک بوجھ ہیں یا ان نوزائیدہ بچوں کا بھی گلا گھونٹ دیتے ہیں جن میں کوئی جسمانی عیب نظر آتا ہے۔ مجمع الجزائر میلانیشیا، پولی نیشیا اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں بھی یہ رسمیں پائی جاتی ہیں۔

افریقہ کے بعض قبیلوں میں یہ عام رواج ہے کہ کسی جرم کی سزا تجویز کرنے کے لیے مختلف قبیلوں کا عام اجتماع ہوتا ہے اور اس اجتماع کی متفقہ رائے سے سزائیں تجویز کی جاتی ہیں۔ ایک یوروپین سیاح نے کانگو میں بسنے والے "بام بالا" قبائل کے طریقۂ عدل و انصاف کو حسب ذیل مثال دے کر بیان کیا ہے:

فرض کیجیے کہ ایک گاؤں 'س' کا ایک شخص 'الف' دوسرے گاؤں 'ص' کے ایک شخص 'ب' کی بکری چوری کر لیتا ہے۔ 'ب' کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ وہ 'الف' کے پاس ایک قاصد بھیجتا ہے اور 'کاماکومی' یعنی تنازعہ کے تصفیہ کی تجویز پیش کرتا ہے۔ اگر 'الف' انکار کرتا ہے تو 'ص' گاؤں کے رہنے والے 'س' گاؤں کے خلاف جنگ شروع کر دیتے ہیں۔ 'ب' کا دوسرا عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ 'الف' کے سردار کے پاس ایک نشان زدہ تیر بھیجتا ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ تیر پر جتنے نشان بنے ہوئے ہیں اتنے دنوں کے اندر ہی میلونگا (تصفیہ کی کونسل) منعقد ہو گی۔ اس دن کے آتے ہی نہ صرف 'الف' اور 'ب' کے گاؤں کی پوری آبادی بلکہ آس پاس کے گاؤں کی ساری آبادی تیر و کمان سے لیس ہو کر مقدمہ میں شرکت کی غرض سے 'ب' کے گاؤں میں آ جاتی ہے۔ اس اجتماع میں کوئی سرپنچ نہیں ہوتا کہ طرفین کے سوال و جواب کو سن کر کوئی فیصلہ کر پائے یا کہہ سکے بلکہ فیصلہ پورے مجمع کی رائے پر چھوڑا جاتا ہے۔ دونوں فریقوں کی طرف سے وہ لوگ بات چیت شروع کرتے ہیں جنھیں قوت گفتار ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ دورانِ مقدمہ میں ایک فریق دوسرے فریق پر بلکہ اس کے باپ دادا پر مختلف الزامات عائد کرتا ہے۔ مثلاً 'الف' یہ تو تسلیم کر لیتا ہے کہ اس نے بکری ضرور چرائی مگر ساتھ ہی ساتھ 'ب' پر اس بات کا الزام عائد کرتا ہے کہ 'ب' کے دادا نے میری دادی کو بہکانے اور اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ 'ب' اثبات میں جواب دیتا ہے لیکن ایک نیا جرم اور لگاتا ہے وہ یہ کہ "'الف' کے دادا نے اس کے باپ کی مرغی چرائی تھی۔ 'الف' اس سے انکار نہیں کرتا مگر مجمع کو اس بات کی یاد دلاتا ہے کہ میرے چچا کا ایک سور 'ب' کے دادا کے سالے کے ایک غلام نے چرا لیا تھا۔ اس انداز سے مقدمہ کی کارروائی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ پورا مجمع ہر الزام اور جوابی الزام پر اپنی رائے کا اظہار کرتا رہتا ہے اور کسی کو تنہا موردِ الزام نہ پا کر کسی کو مجرم نہیں قرار دیتا۔ لیکن جو شخص زیادہ سے زیادہ الزام لگاتا ہے فیصلہ اسی کے موافق ہوتا ہے اور وہ تاوان پانے کا مستحق قرار پاتا ہے۔ معاملہ یہیں پر آ کر ختم نہیں ہوتا۔ جیتنے والا اگر تاوان کی قیمت بیس بکریاں لگاتا ہے تو ہارنے والا ایک بکری کی پیش کش کرتا ہے۔ تاوان کے سلسلے میں کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے کئی کئی دن لگ جاتے ہیں۔ بالعموم فریقین میں کسی نہ کسی شکل پر سمجھوتہ ہو جاتا ہے۔ سمجھوتہ نہ ہونے کی شکل میں لڑائی چھڑ جاتی ہے۔

ان قبائل میں اکثر و بیشتر جھگڑے کی بنیاد عورت ہی ہوتی ہے۔ کسی شادی شدہ عورت سے محبت کے پینگ بڑھانا یا اس عورت سے میل جول کی کوشش کرنا بہت ہی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ قبیلہ کا سردار اس قانون شکنی کی سزا تجویز کرتا ہے اور مجرم کے پورے کنبہ کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ وہ سزا کو عملی جامہ پہنائے۔ اگر مجرم سزا سے بچنے کے لیے روپوش ہو جائے یا بھاگ جائے تو اس کے سب سے قریبی رشتہ دار کو سزا بھگتنا پڑتی ہے۔

بعض اوقات یہ سزائیں مجرم کے لیے کڑی آزمائش ثابت ہوتی ہیں کیوں کہ خیال راسخ ہے کہ کوئی جرم خواہ وہ چھپ کر بھی کیا جائے روحوں کی نگاہ سے چھپ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان قبائل کے جادوگروں یا سوکھاؤں کا ایک خاص مقام ہے اور وہ مختلف انداز سے مجرموں کا پتہ لگا کر انھیں کڑی آزمائش میں ڈالتے ہیں۔ کبھی وہ بڑی لکڑی یا بیجوں کے بنے ہوئے پانسوں کی مدد سے

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۰ پر)

لداخ

ہمالہ کے برفانی علاقے کے رہنے والے اور اُن کی معاشرت



لداخ کے گلّے بان اور ان کے کچھ مویشی۔ پس منظر میں پہاڑ نظر آرہے ہیں

لداخ میں چین کا حملہ، ۵۷-۱۹۵۶ء کی بات ہے جب اس نے مشرقی لداخ میں سوڈا کے میدانوں، قصائے چین اور لنگزی تانگ کے علاقوں کے ایک سو میل سے گزرنے والی سنکیانگ سے تبت جانے والی شاہراہ بنائی۔ ستمبر ۱۹۵۷ء سے نومبر ۱۹۵۹ء تک اس نے اس سڑک کے مغرب میں سولہ سے چالیس میل تک اپنی چوکیاں قائم کرلیں۔ ۸ ستمبر ۱۹۶۲ء تک چینی مغرب میں اور ساٹھ میل تک گھس آئے اور اس سارے علاقے کو تین اور سڑکوں کے ذریعہ اصل شاہراہ سے جوڑ لیا۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء کے بعد اپنے بھاری جارحانہ حملے کی مدد سے چین نے اس حد کے مغرب میں، جسے ۱۹۵۹ء میں اس نے اپنے واقعی قبضے کی حد کہا تھا، مزید ڈھائی ہزار مربع میل پر قبضہ کرلیا اور اس طرح لداخ میں کل ۱۴½ ہزار مربع میل علاقے کو چین نے اپنے تسلط میں لے لیا۔

دشمن کے ذریعے چھینے ہوئے علاقے اور ان میں بسنے والے ہندوستانیوں سے باقی ملک کا کیا تعلق ہے اور اس کی کیا تاریخ ہے، یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

لداخ جموں و کشمیر کی ایک وزارت (یعنی ضلع) ہے جو لداخ، کرگل اور سکاردو کی تین تحصیلوں پر مشتمل ہے۔ اس کا کل رقبہ ۴۴ ہزار مربع میل ہے۔ اس کی سب سے مشرقی تحصیل یعنی لداخ رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑی ہے۔ اس کا رقبہ ۲۶ ہزار مربع میل ہے اور آبادی بھی اتنی ہی ہے۔

تحصیل لداخ ۱۵ علاقوں اور ۱۱۰ گاؤں پر محیط ہے۔

چینیوں نے لداخ تحصیل کے انتہائی مشرقی علاقہ پر دعویٰ کیا ہے جس میں

سے سوائے دم چوک کے باقی
سارا علاقہ غیر آباد ہے۔ اس میں
سوڈا میدان، اقصائے چین
یا سفید صحرا، لنگزی تانگ اور
چانگ چن مو وادی کا بیشتر حصہ
شامل ہے۔ مزید جنوب میں چین
کے دعوے کا علاقہ ۲ تا ۱۶ میل
کی ایک پٹی کی شکل میں ہندوستانی
سرحد کے مغرب میں واقع ہے۔

وجہ تسمیہ

لداخ یا ــ لداخ کے
اور نام بھی ہیں مثلاً مریول
(یعنی لال اونچی زمین) خوچن
(یعنی برفانی زمین) ماریول
(یعنی مریول) ہیون سانگ نے
اسے مالافو کے نام سے بھی موسوم
کیا ہے جس کے معنی وہی ہیں جو مریول
اور ماریول کے ہوتے ہیں۔

طبعی جغرافیہ

لداخ کے پہاڑی سلسلے
ایک دوسرے کے متوازی جنوب
مشرق سے شمال مغرب کی سمت
چلے گئے ہیں۔ اس علاقے کی
ندیوں کا رخ عام طور پر ان
پہاڑیوں کے رخ کے تابع ہے۔
سب سے بڑی وادی سندھ
ہے جو اس کے پورے طول عرض
میں جنوب مشرق سے شمال مغرب
تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں کئی
اور وادیوں کا سرا نہ بھی نکلتا،



ایک لداخی خاتون اپنی پیٹھ پر اپنے بچے کو باندھے ہوئے ہے

لداخی عورتیں اور مرد کھیتوں پر کام کر رہے ہیں



جن سے دریائے سندھ کے معاونوں کا طاس بنتا ہے۔

تحصیل لداخ کے مشرقی حصہ میں کئی زمینی جھیلیں ہیں جن میں آس پاس سے بے شمار چھوٹے چھوٹے نالے گرتے ہیں۔ سوائے سریگ جلگا نغک جھیل کے باقی ساری جھیلیں نمکین پانی کی ہیں۔

پنگونگ جھیل ان میں سب سے بڑی اور تین چار میل چوڑی اور چالیس میل لمبی ہے۔ اس کی عظیم ترین گہرائی ۱۵۰ فیٹ ہے۔

اسپنگو جھیل (یا ترش جھیل)
اس کے پانچ میل جنوب میں واقع ہے اور ۱۶ میل لمبی اور تین میل چوڑی ہے۔ اس کا پانی انتہائی ترش ہے۔ آثار سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی یہ میٹھے پانی کی جھیل تھی۔

اقصائے چین یا اکنتے، چن اور لنگزہی تانگ ۱۷ تا ۱۸ ہزار فیٹ کی بلندی پر واقع ہیں اور بنجر علاقے ہیں۔ میدان ٹیلے والے ہیں اور پہاڑی سلسلے زیادہ اونچے نہیں ہیں۔ آثار سے پتہ چلتا ہے کہ کسی وقت یہ سارا علاقہ ایک بڑی جھیل کی تہ تھا۔ اس وقت اس میں دو بڑی جھیلیں ہیں جو ۱۶ اور ۶۰ مربع میل رقبے میں ہیں۔ ان میں سے بڑی اکتفو جھیل ہے۔



لداخی رقص

ان جھیلوں کا رقبہ جولائی میں اتنا رہتا ہے لیکن اپریل اور مئی میں جب برف باری شروع ہو جاتی ہے تو وہ بہت پھیل جاتا ہے۔ یہاں پہ دن بھر طوفانی ہوائیں چلتی ہیں اور رات کو سناٹا چھایا رہتا ہے۔

اس کے برعکس چانگ چن مو وادی گھاس پوس والا علاقہ ہے جہاں موسم خزاں میں لوکونگ، نومیر انگ اور تانکسی گاؤں کے ہندستانی گلہ بان مویشی چراتے ہیں۔

لداخ کی آب و ہوا مجموعی طور پر شدید ہے۔ دن میں جھلسا دینے والی گرمی ہوتی ہے تو رات میں جسم چیرنے والی سردی پڑتی ہے۔ ہوا انتہائی خشک ہے جس کے سبب ہر چیز سکڑ کر رہ جاتی ہے۔ بارش انتہائی قلیل ہے لیکن اکثر شدید برف باری ہوتی ہے۔

تاہم جانوروں کے لئے یہ آب و ہوا بری نہیں ہے۔ ۱۷ ہزار فیٹ کی بلندی تک جنگلی گدھے، بارہ سنگھے، یاک، ابی اور جنگلی قسم کی بھیڑ دکھائی دیتی ہیں۔ ۱۷ تا ۱۹ ہزار فیٹ کی بلندیوں پر البس میں پائے جانے والے چند خرگوش اور خاص قسم کی گلہریاں گھومتی پھرتی ہیں۔

باشندے

لداخ میں چمپا، لداخی، بلتی اور گلگت کے باشندے بستے ہیں۔ ان میں سے کچھ مسلمان ہیں اور باقی سارے بودھ مذہب کے پیرو ہیں۔ تقریباً ہر گاؤں میں ایک بودھ مٹھ ملتا ہے۔ ان لوگوں میں عورتیں ایک سے زیادہ شوہر کرتی ہیں۔

تقریباً تمام باشندے زراعت پیشہ ہیں اور اپنی اپنی گھریلو حرفتوں میں مصروف رہتے ہیں۔ مرد اور عورت دونوں کام کرنے کے ساتھ ساتھ گاتے بھی رہتے ہیں۔

وہ جو کا خمیرہ سا بنا کر چھاچھ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ جو گرم سے ہلکی قسم کی ایک شراب بناتے ہیں جسے وہ "چانگ" کہتے ہیں۔ سبھی لداخی یہ شراب بہت شوق اور کثرت سے پیتے ہیں۔

لباس

مرد اونی لبادے پہنتے ہیں اور سر پر روئی بھرا ہوا کن ٹوپ پہنتے ہیں بعض اوقات یہ ٹوپ بھیڑ کی کھال سے بنائے جاتے ہیں اور ان کی مدد سے کانوں اور گردن کو سردی سے بچایا جاتا ہے۔ ان کے جوتے ٹخنوں سے اوپر چڑھے ہوتے ہیں اور ان کے تلے بھیڑ کے چمڑے سے بنے ہوتے ہیں اور اوپر کا حصہ رنگین کپڑے سے بنے ہوتے ہیں

مرد زیور پہننے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ ان کی کمر پیٹیوں سے سفر کے دوران میں کام آنے والی اشیا لٹکتی رہتی ہیں، جیسے چاقو، چقماق پتھر، چائے اور نسوار کی ایک تھیلی، لوہے کا چمکدار پائپ اور چائے بنانے کا برتن۔

عورتیں کالے رنگ کی اونی جیکٹ پہنتی ہیں۔ ان کے ساتھ لمبی لمبی پٹیوں والے لہنگے پہنتی ہیں جو گھٹنوں سے نیچے تک لمبے ہوتے ہیں۔ اس کے اوپر بھیڑ کی کھال اوڑھ لیتی ہیں جس کا اونی حصہ اندر کی طرف ہوتا ہے اور اسے سینے کی طرف اوپر سے نیچے تک تانبے یا لوہے کی بنی ہوئی سوئی سے سی دیا جاتا ہے۔ ان کے سر ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ ان کے بال چوٹیوں کی شکل میں گوندھے ہوئے ہوتے ہیں اور سر کے اطراف لٹکتے ہیں۔ مانگ پر وہ ایک کپڑے کا فیتہ پہنتی ہیں جن میں معمولی قسم کے فیروزے کے پتھر جڑے ہوتے ہیں۔ یہ پٹی پیچھے کمر تک جا لٹکتی ہے۔ اس کا آخری لٹکتا ہوا حصہ اون کے ٹکڑے یا ڈوریوں سے بندھا ہوتا ہے۔ کانوں کے اطراف اون کے چاند جیسے بالے لٹکتے ہوتے ہیں جو بالوں سے بندھے ہوتے ہیں۔ ان کے نیچے سمور کے بال لگے ہوتے ہیں۔

تاریخ

تاریخ کی ابتدا میں لداخ ایک آزاد مملکت تھی جو مغربی تبت کے وسیع علاقے پر محیط تھی۔ لیکن دسویں صدی کے اواخر میں خاندان کے بٹوارے کے سبب اس کے تبتی علاقے اس سے الگ ہو گئے۔

سترھویں صدی کے اوائل میں لداخ ایک مضبوط ریاست بن گئی۔ ۱۶۶۴ء میں اسے سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا گیا۔

۱۶۸۱ء تا ۱۶۸۳ء منگولی و تبتی افواج نے مل کر لداخ پر چڑھائی کی جسے کشمیر کے مغل گورنر کی مدد سے لداخیوں نے ناکام بنا دیا۔ اس لڑائی کے ختم پر ۱۶۸۳ء میں ایک معاہدہ ہو گیا۔

۱۸۳۴ء تا ۱۸۴۲ء کے درمیان جموں کے سکھ حکمراں گلاب سنگھ نے لداخ فتح کر لیا۔ ۱۸۴۱ء میں گلاب سنگھ کے ایک سالار زوراور سنگھ نے مغربی تبت پر چڑھائی کی جس میں وہ ہار گیا اور مارا گیا۔ اس کے بعد تبتیوں نے چینیوں کی کمک پر لہیہ پر چڑھائی کر دی لیکن ان کا یہ حملہ پسپا کر دیا گیا۔ اس کے بعد لداخ و کشمیر نے تبت و چین کے ساتھ ۱۸۴۲ء کا معاہدہ کر لیا۔

ایک لداخی حسینہ

روایاتی سرحد

تبت و سنکیانگ کے ساتھ ہندوستان کی سرحد کی ہندوستانی حد بندی روایاتی و مروجہ ہے جو صدیوں سے معروف و مسلم رہی ہے۔ سرحد تک سارے علاقے پر ہندوستان کا متواتر انتظامی کنٹرول ہونے کے سبب ہم اس علاقے کے ایک ایک نقطے کی تفصیل بیان کر سکتے ہیں۔

شروع سے آخر تک اس علاقے کی سرحد پن دھاری سلسلے پر مبنی ہے جس میں عقیل، قرہ، تغ، کیوں لمن اور دوسرے سلسلے شامل ہیں۔ مغرب سے

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۲ پر)



وزیر اعظم نہرو لکھنؤ میں نیشنل کیڈٹ کور کے جوانوں کو
رائفل چلانے کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں

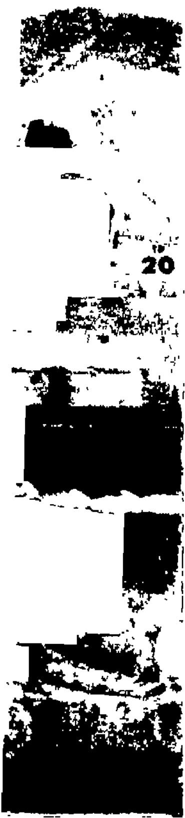
امریکہ، برطانیہ اور آسٹریلیا کے فضائی مشن کے اراکین ہندوستان کے فضائی دفاع کے
سلسلے میں ہندوستان کے وزیر دفاع سے دہلی میں بات چیت کر رہے ہیں





ایک جوان ایک چوکی پر پہرہ دے رہا ہے۔ چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے ہیں

لداخ کی بلند
رہتا ہے دشمن سے لڑ
جوانوں نے غیر معمولی ش
برداشت کیے اور دشم
بھی فخر کریں کم ہے۔ از
کی جا رہی ہیں



ایک بے آب گیاہ اور پتھریلے علاقے میں جوانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ دن میں انہیں کیا کرنا ہے۔



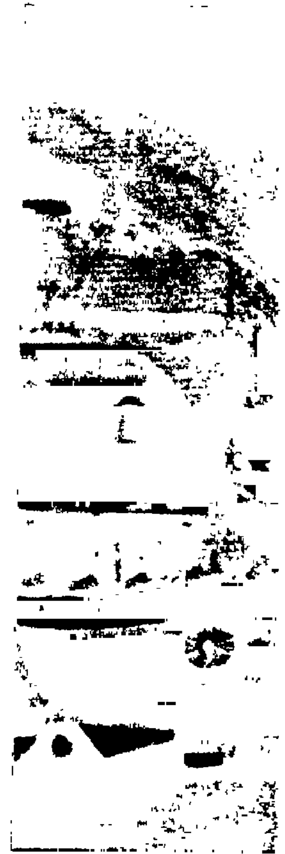
لداخ کے مورچے پر
دشوار چیز ہے مگر ہمارے جو
کام کیا۔ ان پہاڑوں کو توڑ کر
انہیں ہمارے انجینئروں نے
تصویر میں سرحدی سڑک بنا

ے جوان

ت نقطۂ انجماد سے بھی بہت کم
معمولی بات نہیں ہے ہمارے
کے لب خندہ پیشانی سے
ن کی اس دلیری اور شجاعت پر ہم خراج تحسین
ہمارے جوانوں کی کچھ تصویریں شائع



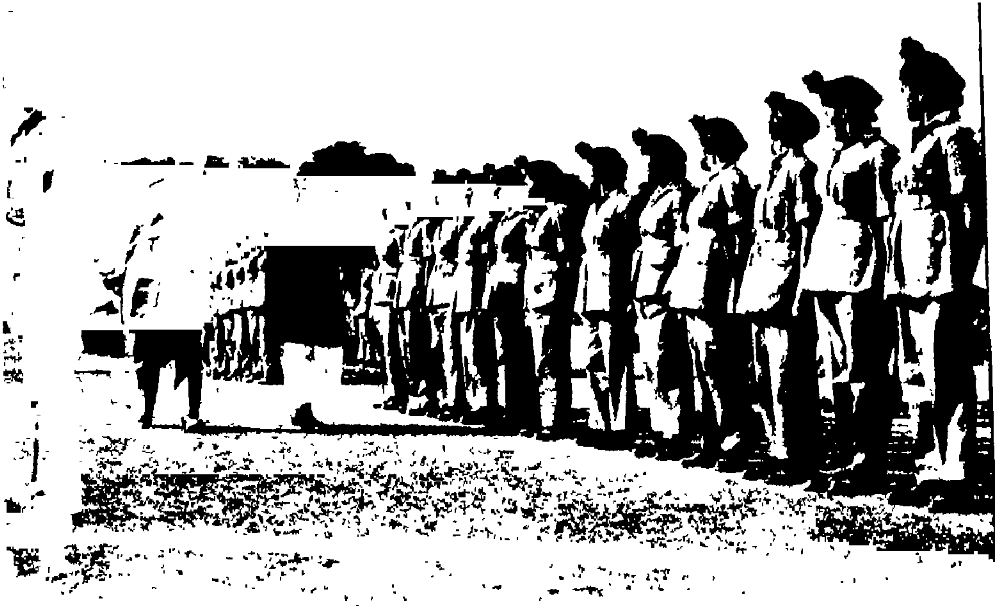
یہ جوان چیستول کی چوکی کی حفاظت کر رہے ہیں



لداخ کی غیر معمولی سردی میں بھی ہمارے جوانوں نے مسلسل نقل و حرکت قائم رکھا
تصویر میں تین جوان اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں

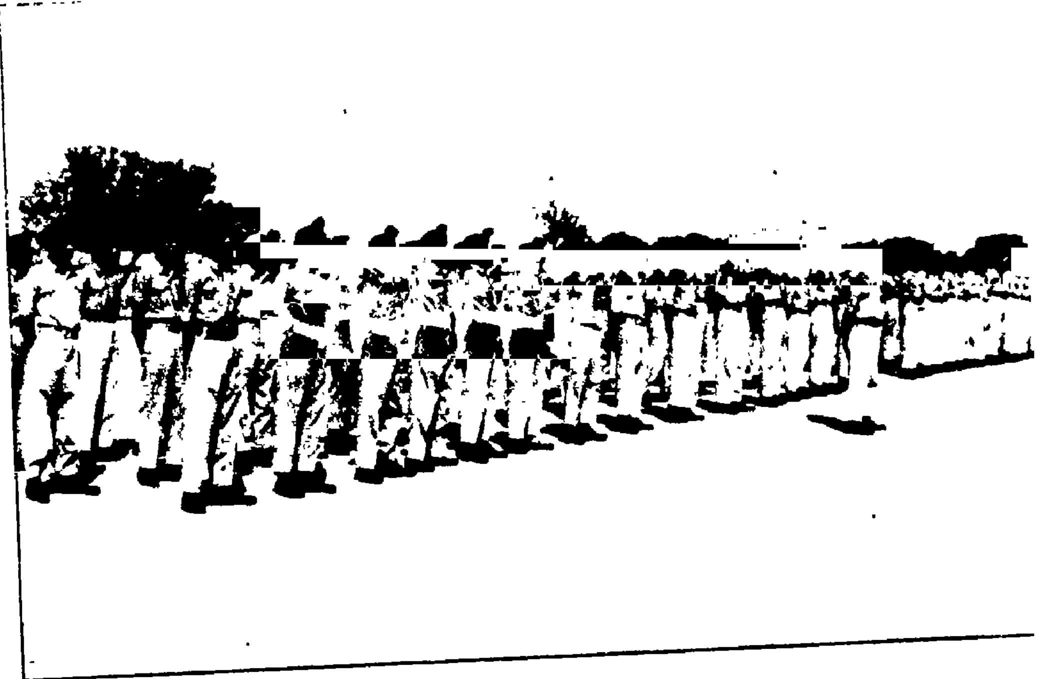


وسائل کی کمی میں بھی بے انتہا
بھی ۲۰ سے ۲۴ گھنٹے تک روزانہ
نٹ کی بلندی پر کام نہیں کر سکتے تھے
نٹ کی بلندی پر کام کرنے کے قابل بنا دیا۔
اپنے کام میں مصروف ہیں۔



گورنر اُتر پردیش نیشنل کیڈٹ کور کی لڑکیوں کے دستے کا معائنہ کر رہے ہیں

اُتر پردیش میں شہر بلند شہر کے این سی سی ائیر ونگ کا دستہ



نیفا

حسن فطرت کا ایک نمونہ

شمال مشرقی سرحدی ایجنسی ایک ایسا خطۂ زمین ہے، جہاں قدرت کی نیرنگیاں اور اس کا حسن و جمال انسان کی دست درازیوں سے دور رہے۔ ایک طویل عرصہ تک اس علاقے میں ابدی قدرتی حسن اور سکون کے سوائے کچھ نہ تھا۔ کبھی کبھار بعض ہمت ور سیاح ان علاقوں میں نکل آتے تھے۔

وقت گذرتا گیا اور اب یہی علاقہ شہری تمدن کے قریب پہنچ رہا ہے۔ نیفا کے نظم و نسق کا دوہرا کام یہ ہے کہ دورِ جدید کی ہر آسایش یہاں فراہم کی جائے اور ساتھ ہی اس کے قدرتی حسن کو ذرہ بھر بھی متاثر نہ ہونے دیا جائے۔

پرانی تاریخ

نیفا کا بھارت سے تعلق پرانوں کے دور کی بات ہے۔ کالیکا پران میں ایک قبائلی راجا گھاٹک کی نرکاسر کے ہاتھوں شکست کا حال ملتا ہے۔ اس نے پراگیہ جوتش پور (گوہاٹی) کو اپنی راجدھانی بنایا۔ نرکاسر کے بیٹے بھاگیہ دت نے اپنے لشکر کے ساتھ کوروکشیتر میں مہابھارت کی



وزیر اعظم نہرو نیفا کے کچھ طالب علموں کے ساتھ

جنگ میں حصہ لیا۔ لوہت ڈویژن میں ایک مقام ہے، بھشمک نگر جو راجہ بھشمک کی راجدھانی تھا۔ اس کی بیٹی رکمنی کرشن جی کی رفیقۂ حیات بنیں۔

کامینگ ڈویژن میں ایک قلعہ کے آثار ملے ہیں جن کے بارے میں مقامی لوگوں کا خیال ہے کہ یہ راجا بان کے پوتے راجا بھالوک کی راجدھانی تھا۔ یہ راجہ جوان باشندوں کا جدِ اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔

سبانسری ڈویژن کی ایک پہاڑی پر ایک اجڑی ہوئی راجدھانی کے آثار ملتے ہیں جو کسی زمانے میں مایاپور نام کی ایک ہندو راجدھانی تھی۔ لوہت ڈویژن میں ایک درمقام ہے "برہم کنڈ" جہاں بے شمار عقیدت مند یاترا کو آتے ہیں۔ روایت ہے کہ رشی دیودھا پرشورام نے یہاں اپنے کلہاڑے کی ایک چوٹ سے پہاڑوں میں سے برہم پتر کے لیے راستہ بنایا تھا۔ اسی ڈویژن میں ایک درمقدس یادگار ہے اور وہ ہے تامیشوری مندر۔

کچھ عرصے پہلے تک ان علاقوں پر اہوم راجاؤں کی حکومت رہی ہے۔ ۱۸۳۲ء میں ان پر انگریزی قبضہ ہو گیا۔ جب کہ انھوں نے راجا پورندر سنگھ سے آسام کا علاقہ اپنے تسلط میں لے لیا

تاج برطانیہ کی حکومت ہند نے ان علاقوں کی اپنی مخصوص نوعیت کلچر اور طرز زندگی کو دیکھتے ہوئے انھیں باقی ہندوستان کے طرز حکومت سے الگ رکھا۔ اور صرف قانون و امن کی برقراری، قبائلی جھگڑوں کی یکسوئی اور مجرموں کے تادیبی کارروائی کی حد تک اپنے اقتدار کو محدود کر لیا۔

نیا انداز نظر

آزادی کے بعد وزیر اعظم نے ان علاقوں کو باقی بھارت کے اٹوٹ حصے کی حیثیت سے ترقی دینے کی نہج بیان کی۔ انھوں نے کہا ہمیں یہ سوچنا ترک کر دینا چاہیے کہ ہم قبائلی عوام سے مختلف ہیں ایسا سوچنا ایک مکروہ خیال ہے۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بعض قبائلی عوام ترقی کے اونچے مراحل طے کر چکے ہیں۔ بھارت سرکار اس بات کا عزم کر چکی ہے کہ قبائلی عوام کو ان کے مزاج کے اور روایات کے مطابق ترقی کرنے دیا جائے۔ لہذا جو ترقی یہاں ہو گی وہ قدرتی ہو گی اور اپنے آپ ترقی کی نوعیت کی ہو گی۔ اس نئے انداز نظر کے ساتھ ۱۹۵۴ء میں یہاں ایک نیا انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا۔

اس کے ذمے محض قانون اور امن کی حفاظت ہی نہیں تھی بلکہ قبائلی عوام کی فلاح و بہبود بھی تھی۔

لیکن ان کوششوں میں اس نظم و نسق کو قدرت کی طرف سے بھاری مشکلات درپیش ہیں۔ جنگلاتی علاقے ہیں، ڈھلانیں ہیں، زبردست بارش ہوتی ہے، سخت سردیاں پڑتی ہیں اور مٹی سے اپنا روزگار پیدا کرنے والے انسان کو اپنی ساری ہستی مٹی میں ملا دینی پڑتی ہے۔ اس آب و ہوا نے ان لوگوں کو محنتی اور سخت کوش ہی نہیں بنایا بلکہ حسن و فطرت کا دلدادہ بھی بنایا ہے۔ ان کے آداب زندگی نہایت ہی سادہ اور پیارے پیارے ہیں۔ وہ ناچتے اور گاتے ہیں۔ ان کا فنی شعور بھی ترقی یافتہ ہے۔ ان کے بعض ملبوسات نہایت ہی مرصع ہوتے ہیں۔ گاؤں گاؤں میں مہاتما بدھ کی شبیہیں ملتی ہیں۔ جو



نیفا کے کچھ قبائلی توانگ میں ۲۶ جنوری کو ہندوستانی پرچم پھیرے لہرائے جانے کے بعد بگل بجا رہے ہیں۔



تو انگ میں
سول انتظام قائم ہوجانے
کے بعد
عوام کی امداد کے لیے بذریعہ
ہوائی جہاز
سامان رسد بھیجا گیا

قبائلی مصوری کی اچھی مثالیں ہیں۔

قبائل

نیفا کے باشندوں میں مونپا، اکا، ڈفلا، میری، ابور اور مشمس قبائل شامل ہیں جن کی سماجی تنظیم، خوراک لباس مذہبی رسومات اور معاشی طریقے ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں۔

ہر قبیلہ کئی خاندانوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک ہی خاندان کے اندر شادی بیاہ ممنوع ہے لیکن قبیلے کے باہر شادی کرنے کی بھی سختی سے ممانعت ہے۔ شادی بیاہ ہمیشہ ماں باپ طے کرتے ہیں لیکن بعض دفعہ رومانی شادیاں بھی ہوجاتی ہیں۔ نیفا کے لوگوں میں آپس میں کچھ سماجی امتیازات اور پابندیاں تو ہیں لیکن چھوت چھات یا ذات پات کی پابندیاں نہیں۔ پیسے کا چلن عام ہونے لگا ہے۔ لیکن پھر بھی اجناس کے تبادلے کے ذریعے ہی معاشی ضروریات پوری کی جاتی ہیں اور بازاری کاروبار کیا جاتا ہے۔ تمام قبائل اپنے جداگانہ طریقوں پر سختی سے قائم رہنا چاہتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی مداخلت گوارہ نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود نیفا کے نظم ونسق نے انہیں کچھ صحت مند تبدیلیاں قبول کرلینے کی ترغیب دی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں اور اگر چینی جارحیت کے مقابلے میں ان باشندوں کی سرگرمی کسی بات کا اشارہ ہو تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ نظم ونسق نے قبائلی عوام کے دل میں گھر کرلیا اور وہ انہیں قدم بہ قدم ترقی کے راستے پر لے جارہا ہے۔

> "ملک کو مکمل طور سے اپنے دفاع کی تیاریاں جاری رکھنا چاہیے۔ اس بات کی طرف توجہ رکھنا ضروری ہے کہ جہاں تک ہوسکے فوجی سامان اپنے ہی ملک میں تیار کیا جائے ———— وزیراعظم نہرو

افسانہ

ہم گھر ساجن آئے

نرمیلا رتوڑی

ویسے تو بات کئی سال تک ٹلتی رہی لیکن جب فیصلہ ہوا تو ایکدم ــــــ اتنی جلدی کہ نزدیکی رشتہ داروں کو خاطر خواہ نوٹس بھی نہ دیا جاسکا۔ "لَو میرج" میں یہی بات ہوتی ہے۔ فیصلوں کی ڈوری ماں باپ کے ہاتھ سے نکل کر لڑکے لڑکی کے ہاتھ چلی جاتی ہے۔ جب وہ مناسب موقعہ سمجھیں گے شادی کریں گے۔ کوئی لگن ووگن نہیں' کوئی مہورت نہیں' کوئی ڈھول باجا نہیں ــــــ یہ آج کل کی شادیاں تو بس گویا گائے بھینس خریدنے کی بات ہوگئی۔

رائے صاحب طبیعت کے ذرا گرم تھے اور گھر میں سب لوگ ان سے ڈرتے تھے۔ اس لئے جب موہن کو ایک لڑکی سے پیار ہوگیا تو وہ ڈرتا تھا کہ بات باپ تک نہ پہنچے۔ لیکن بڑوں نے کہا ہے کہ عشق اور مشک چھپ نہیں سکتے۔ جب انھیں اس بات کا پتہ لگا تو ان کو بلڈ پریشر ہوگیا۔ لیکن پھر بیوی نے سمجھایا کہ جوان بیٹے کا معاملہ ہے اور پھر یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ اُن کی دو لڑکیوں کی شادی بھی تو پہلے ایسے ہی ہوئی تھی جب اپنے لڑکے کی بات ہوئی ہے تو کس منہ سے راستہ روکیں گے؟

رائے صاحب نے چار و ناچار اصول کو تو مان لیا لیکن پھر اس بات پر تل گئے کہ لڑکی دیکھ کر ہی وہ اجازت دے سکتے ہیں۔ بیوی نے پھر سمجھایا کہ اب تو چاہے لڑکی گنجی' کانی' لولی ہو' گھر کی لکشمی بنا کر ہی لانا ہوگی۔ اس دلیل کے آگے بھی آخر انھیں ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور رائے کہاں تو وہ رضامند نہیں ہوتے تھے اور کہاں یہ کہ پیچھے پڑ گئے۔ "بھئی اب لے آؤ گھر لڑکی کو۔ جب وعدہ کر لیا تو بات پوری کر لو۔ اب پچھلے دو سالوں سے وہ اصرار کر رہے تھے۔ لیکن موہن کہے جا رہا تھا کہ ابھی وقت نہیں آیا۔ اور تھا بھی وہ ٹھیک۔ رائے صاحب تو اب نام کے ہی رائے صاحب رہ گئے تھے۔ وہ کارخانے' وہ کوٹھیاں' وہ باغات۔ وہ سب پاکستان میں رہ گئے تھے۔ اور اب ان کے پاس اس ریاست اور امارت کی صرف یاد ہی رہ گئی تھی۔ یہاں آکر کچھ بزنس شروع کیا لیکن پھر سیلابوں میں ایسی چوٹ لگی کہ اب کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے دل ڈرتا تھا۔ یہ تو شکر ہوا کہ لڑکیاں خود بخود ٹھکانے لگ گئیں اور سب ایک سے بڑھ کے' ایک شریف اور اچھے عہدوں پر فائز مل گئے۔ نہیں تو نہ جانے کیا کیا کرنا پڑتا۔ اب موہن نے پڑھائی ختم کرکے نوکری کر لی تھی اور اسی کی آمدنی سے گزارہ ہو رہا تھا لیکن جو ڈھائی سو اُسے ملتے تھے اُس سے اِس چھوٹے سے کنبے کا گزارہ مشکل سے ہی ہوتا تھا۔ بہو بھی آگئی' تو بوجھ بڑھے گا ہی۔ نئی نویلی دلہن کے اپنے چاؤ۔ اور پھر پتہ نہیں ساس سسر کے ساتھ رہنا پسند کرے۔ موہن اسی لیے شادی ملتوی کیے جا رہا تھا کہ یا تو اسے کوئی بہتر نوکری مل جائے یا رائے صاحب کو کچھ ادھر ادھر کسی فرم میں منیجری مل جائے تو ذرا خوشحالی ہو جائے۔ ورنہ شادی شاید خانہ آبادی ہی نہ ثابت ہو۔

ان حالات کا سب کو احساس تھا۔ لیکن کسی نے کبھی یہ بات منہ پہ نہ لائی۔ رائے صاحب ویسے تو کہتے تھے کہ شادی ہو جائے۔ ایک باپ کا دل اور پھر یہ خیال کہ ہماری بدقسمتی کا موہن کی زندگی پر کیوں سایہ پڑے۔ لیکن دل ان کا یہی کہتا تھا کہ صورت حال بہتر ہو جائے تو اچھا ہے۔ ان کی بیوی جمنا خاموش تھی۔ جس دن بیٹا کہہ دے گا "میں تیار ہوں" وہ بھی ڈولی لینے چل پڑے گی۔ جب لڑکے نے خود لڑکی چُنی ہے تو باقی حالات بھی تو سمجھتا ہوگا۔ دامادوں سے اکثر اس بات کا ذکر ہوتا ــــــ زیادہ تر خط و کتابت میں ہی ــــــ تو وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار بڑے گول مول سے لفظوں میں کر دیتے۔ چونکہ وہ سب لوگ ابھی تیس برس سے کم ہی تھے اس لیے عموماً مذاقاً وہ یہی صلاح دیتے کہ بھئی جلدی کیا ہے۔ تھوڑی دیر اور آزادی کا مزا لے لو' پھر ساری عمر تو بیوی کی غلامی ہی ہے۔

اس لیے جب اچانک دامادوں کو خط ملے کہ شادی پندرہ دن کے اندر اندر ہو رہی ہے تو سب کو حیرانی ہوئی۔ ایک داماد کلکتہ میں ایک

مدراس میں اور ایک یو۔پی میں۔ اتنی تھوڑی سی نوٹس سے تو شاید انھیں چھٹی بھی نہ مل سکے۔ لیکن موہن نے سب کو لکھ دیا تھا کہ آپ نہ آئے تو شادی نہیں ہوگی۔ لڑکی والوں کے گھر پہلی شادی تھی اور وہ دور اندیش قسم کے لوگ تھے۔ اُنھوں نے لکھا تھا کہ برات میں تین سو آدمی ہونا چاہیے۔ ادھر موہن نے اس تعداد کو "نان سنس" کہہ کر دھتکار دیا تھا۔ اس کا "دامادی فیصلہ" یہ تھا کہ یہ شادی روایتی شادی نہیں ہوگی۔ بس ۲۰ آدمیوں سے زیادہ لوگ نہیں آئیں گے۔ انتظامات بہترین ہونا چاہیے۔

رائے صاحب کا چھوٹا سا گھر ـــــ اور اس میں شادی، پہلے بیٹے کی شادی! لیکن ان کے لئے تو جیسے پردیس کا معاملہ تھا۔ باپ کا دل کیا کیا اہتمام نہ کرنے کو چاہتا ہوگا۔ لیکن شادی سے دو دن پہلے حال یہ تھا کہ کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس گھر میں شادی ہونے والی ہے۔

شانتا اور سروپ شادی سے ایک دن پہلے پہنچ گئے۔ ان کے آنے کی اُمید اُن لوگوں کو کم ہی تھی۔ لیکن موہن کو یقین تھا۔ وہ پہلے جہان تھے۔ اسی دن شام کو چھوٹی بہن بھی پہنچ گئی۔ اس نے بتایا کہ اس کا خاوند سدھیر سیدھا برات والے گھر میں پہنچے گا۔ چھٹی کم تھی اس لیے بہن اکیلے ہی چلی آئی۔ گھر کے ان لوگوں کے علاوہ موہن نے اپنے دو تین دوستوں کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ باقی لوگ سیدھے لڑکی کے گھر آنے والے تھے۔

شہر میں موہن کا رسوخ کافی تھا۔ اُس نے برات لے جانے کے لئے تین چار کاروں کا بندوبست کر رکھا تھا۔ میونسپلٹی کے ہیلتھ افسر سے کہہ کر گلی اور مکان کے باہر صفائی بھی کروالی تھی۔ مہتر صفائی کرتے اور ساتھ ساتھ اونچی آوازیں دعائیں اور مبارک باد دیتے جاتے تھے ـــــ شاید وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح بخشش زیادہ مل جائے گی۔ ایک مہتر تو بار بار آکر کہتا: "بابو شادی کیا ہے، بس میٹھی عمر قید ہے۔ اب آپکی آزادی گئی۔" موہن کو یہ میٹھی عمر قید والی بات پسند آئی تھی۔ آتا جاتا یہی دُہراتا۔ "بس ہمیں تو میٹھی عمر قید ملنے والی ہے۔" شادی کے تمام انتظامات موہن خود ہی کر رہا تھا۔ رائے صاحب کی صحت ایسی نہ تھی کہ وہ زیادہ اندر باہر آجا سکیں۔ داماد، شہر اور یہاں کے لوگوں سے ناواقف تھے۔ سروپ نے ایک دو بار پوچھ لیا تھا کہ کیا کیا انتظامات کیے گئے ہیں۔ اسے صرف ایک ڈر تھا اور وہ یہ کہ جن لوگوں نے کار دینے کا وعدہ کیا ہے، ان میں سے ایک آدھ کہیں عین موقع پر پھسل نہ جائے۔ اسے معلوم تھا کہ کار والے ذرا مشکل سے ہی اپنی کار ایسے دیتے ہیں۔ آخری وقت کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیا اور اپنی کار بچالی۔ لیکن شادی کا معاملہ ہے۔ اگر کوئی ایسی بات ہوگئی تو تمام انتظامات درہم برہم ہوجائیں گے۔ برات کی روانگی ۸ بجے طے پائی تھی تاکہ دس بجے تک لڑکی والوں کے شہر پہنچ جائے۔

وہی ہوا جس کا سروپ کو ڈر تھا۔ سب لوگ تقریباً تیار ہوچکے تھے مگر کار ایک بھی نہ آئی تھی۔ سروپ بار بار کہہ رہا تھا: "بہتر ہے سب لوگ بس پر چلیں۔ کم از کم جانا یقینی تو ہوگا۔" لیکن موہن ہر بار جواب دیتا: "بھیا آپ فکر نہ کریں، ایسی ویسی بات کوئی نہیں۔" آخر سات بجے ایک بڑی کار آگئی۔ دوسرے کار والوں نے کوئی بہانہ لکھ کر معافی چاہی تھی۔ وہ تو غنیمت تھا کہ سب ملا کر براتی سات ہی تھے اس لئے بڑی کار میں کسی نہ کسی طرح گھس گھس کے بیٹھ ہی گئے۔ موہن نے اپنے ایک موٹر سائیکل والے دوست کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ چھوٹا بھائی اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور یہ چھوٹی سی خاموش برات چل پڑی۔

دوسرے شہر پہنچ کر اور باجے سُن کر کچھ شادی کا سماں بندھ گیا۔ لڑکی والوں نے خاصی تیاری کر رکھی تھی۔ وہاں کچھ براتی پہلے ہی سے ایک طے شدہ مقام پر پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی برات کے ساتھ مل گئے اور اب برات میں ۲۰ ـ ۲۵ آدمی ہوگئے تھے۔ ان میں چھوٹی لڑکی کا خاوند سدھیر بھی تھا۔ سب لوگوں کو بہت خوشی ہوئی۔ سدھیر سے برات کی رونق دوبالا ہو جائے گی۔ بات بات میں مذاق، قہقہے، خوش گپیاں ـــــ سروپ کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ سدھیر کو چھٹی مل گئی ہے اور وہ برات کے ساتھ واپس جائے گا۔ لیکن سب سے بڑی لڑکی اور اس کا خاوند نہ آسکے۔ اُنھیں موہن سے گلہ بھی تھا۔ شادی کی تاریخ ـــــ ایسے زمانے میں رکھی جب خود ان کے ہاں ایک "چھوٹا" نیا مہمان آنے والا تھا۔ بھلا وہ کیسے گھر سے نکل سکتے تھے؟ بہرحال، موہن کے دو چار دوست، چچا، دور کے کچھ رشتہ دار ـــــ کافی رنگ برنگ قسم کے لوگ ـــــ جمع ہوگئے تھے۔ ہندوستانی برات بس تو سرکس کے جوکروں کے جلوس سی ہوتی

ہے ـــــ رنگ برنگ کے کپڑے، امیر اور غریب رشتہ داروں کا سنگم، بچے اور بوڑھوں کا میلہ ـــــ اور اس برات میں تو اس کی کچھ عورتیں بھی تھیں۔

سروپ کی ایک ودھوا چچی اپنے بچوں سمیت اسی شہر میں رہتی تھی۔ موہن نے رشتے کا خیال کرکے پہلے ہی انھیں دعوت دے رکھی تھی کہ شادی میں ضرور شرکت کیجئے گا۔ سروپ اور اس کی بیوی شانتا اور کچھ اور لوگ پہلے وہیں گئے۔ چچی ویسے ہی عام معمولی کپڑے پہنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُٹھ کر بڑے تپاک سے سب سے ملیں۔ شانتا نے پوچھا: "چاچی آپ تیار نہیں ہوئیں؟ جلدی کیجئے۔ سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اور پھر کمرے کی طرف دیکھ کر پوچھا: "بلّو کہاں گیا ہے؟ اور لوگ کدھر ہیں؟"

بلّو چاچی کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اب تو پروفیسر ہو گیا تھا۔ چاچی نے قدرے اداسی سے جواب دیا: "کیا معلوم بیٹی، وہ تو آج تڑکے ہی کہیں چلا گیا۔ کہنے لگا مجھے امرتسر جانا ہے کسی ضروری کام سے۔"

"بڑا بدتمیز ہے" سدھیر پیار سے غرایا۔ "اسے معلوم تھا کہ آج ہمارے سالے کی شادی ہے اور وہ یہاں سے بھاگ گیا۔ ہم تو شادی میں آئے ہی اسی لیے تھے کہ اس سے برسوں بعد آج پھر ملاقات ہو جائے گی ـــــ اچھا اُٹھئے آپ تو تیار ہو جائیے۔"

چاچی نے وہیں بیٹھے بیٹھے کہا: "نہیں بیٹا، میں نہیں آ سکتی۔ میرا آنا ٹھیک نہیں۔"

"ٹھیک نہیں؟" شانتا نے اس عذر کو ٹھکراتے ہوئے پوچھا: "یہ کیسے؟ چلیے اُٹھئے۔ ساری برات آپ کو بلانے آئی ہے۔" اس نے ساری برات ایسے کہا کہ کوئی بھی اپنے آپ کو شہزادی سمجھنے لگتا: "نہیں بیٹی ـــــ میں نہ آ سکوں گی۔ مجھے معاف کر دو۔" چاچی کے جواب میں اتنی قطعیت تھی کہ سدھیر کو پھر اصرار کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن اسے غصہ بہت آیا۔ یہ عذر حد درجہ نامعقول تھا۔ "ان کا آنا ٹھیک کیسے نہیں تھا؟ چاچی کا اشارہ کس طرف تھا؟ رشتے کی دوری کی طرف یا اپنے ودھواپن کی طرف؟"

اور چاچی کو جیسے معلوم ہو گیا کہ سدھیر کیا سوچ رہا ہے۔ اس نے کہنا چاہا: "خدمت کرو بیٹا۔ تم کیسے سمجھ سکتے ہو میرے نہ آنے کی وجہ۔ آج کتنے سال ہو گئے ان کو گزرے ہوئے۔ یہ بلّو جو آج پروفیسر ہے اس وقت صرف بارہ سال کا تھا۔ ایک ایک گھڑی گن کر اسے بڑا کیا ہے اور آج وہ اپنے باپ کی جگہ کھڑا ہے۔ وہ بھی پروفیسر ہی تھے اور بلّو بھی آج پروفیسر ہے۔ وہ جب کالج جانے کو تیار ہوتا ہے اپنا گاؤن اُٹھاتا ہے تو بالکل اپنے باپ کی طرح لگتا ہے۔ اور پھر شام کو تھک کر واپس آتا ہے اور کتابیں پھینک کر چائے مانگتا ہے تو گویا مجھے گزرے ہوئے سال واپس مل جاتے ہیں۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں۔ پندرہ سال پہلے اپنی جو زندگی میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے چتا میں جلتی ہوئی دیکھی تھی اسے میں نے پھر آہستہ آہستہ اپنے خون سے سینچ کے بُلایا ہے۔ یہ پندرہ سال میں نے گھُل گھُل کر بتائے ہیں۔ میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اب جب تک بلّو کی شادی نہ ہو جائے میں کسی شادی میں شریک نہ ہوں گی۔ ہر شادی مجھے ان کی موت کی یاد دلاتی ہے۔ میں کسی کی شادی میں موت کا خیال لے کر کیسے جا سکتی ہوں۔ مجھے جانا چاہیے بھی نہیں۔ مجھے کیا حق ہے کہ کسی کی شادی میں ایسے خیالات لے جاؤں۔ میں ودھوا ہوں، میں نے بہت بچے کھوئے ہیں۔ جب بچے بچنے لگے تو اپنا خاوند کھو دیا۔ میں بدقسمت ہوں۔ میں دُکھی ہوں۔ کسی شادی میں اپنا سایہ نہیں ڈالنا چاہتی۔ تمھیں خود ہی مجھے نہ بلانا چاہیے.....؟" پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ کر ٹھہر گئے۔ بولی: "جاؤ بیٹا، شادی مبارک ہو۔" پھر کوشش کر کے مسکراتی ہوئی بولی: "بُرا نہ مانو۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نہیں آ سکتی۔"

سدھیر واپس آ گیا۔ برات ایسے ہی چل پڑی ـــــ ودھوا کو چھوڑ کر، سہاگنوں کو ساتھ لے کر، سدا سہاگن۔ چاچی کو بھی کبھی ایسا ہی کہا جاتا تھا۔

ملن ہوا ـــــ رائے صاحب کو سمدھی نے بھینچ لیا اور پھر اُٹھا لیا۔ پھر نہ جانے کتنے روپے اُن کی جیب میں ڈال دیے۔ سب لوگ ہنس رہے تھے۔ کوئی پھبتیاں کس رہا تھا، کوئی مذاق کر رہا تھا، چند دوست آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ "کیا بیہودہ قسم کی رسمیں ہیں" وہ غالباً کہہ رہے تھے۔ ہر ذی حس نوجوان کو

رسم و روایات میں بیہودگی، فرسودہ پن، نظر آتا ہے جب تک کہ وہ خود آہستہ آہستہ ان کا شکار نہ ہو جائے۔

چائے پیتے وقت رائے صاحب غیر معمولی طور پر خاموش اور سنجیدہ ہو گئے تھے۔ کیا سدھیر کی چاچی کی بات کا انھوں نے بُرا مانا تھا؟ نہیں انھوں نے تو شاید پوری بات سنی بھی نہیں تھی۔ صبح سے، وہ کچھ خاموش سے تھے۔ اُنھوں نے ایک بار موہن سے کہا بھی تھا: "کیا فائدہ کار مانگنے سے؟ بغیر کار کے شادی نہیں ہو سکتی کیا؟ بس میں کیوں نہیں چلتے؟" —— اور اپنی بات پوری کرنے اور موہن کا جواب سننے سے پہلے ہی وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے۔ ہاں کار کے بغیر شادی کیوں نہیں ہو سکتی' بس اس فقرے نے گویا ماضی کے سیلاب کے کواڑ کھول دیے ہوں۔ ان کی بھی تو شادی ہوئی تھی۔ کیا شان تھی! کیا آن بان تھی۔ سیکڑوں براتی تھے۔ کئی دن پہلے ہی لوگ جمع ہو گئے تھے۔ موٹروں کا ایک کارواں تھا۔ برات تیار تھی۔ اس وقت رائے صاحب جو اس وقت صرف کرم چند تھے' بسور پڑے تھے۔ میں تو شادی میں تبھی جاؤں گا جب میری اپنی کار علٰحدہ ہو گی —— بالکل نئی فورڈ! اور باپ نے اُسی وقت ایک نئی کار منگوا دی تھی —— اسی طرح سے جیسے کسی ضدی بچے کے لیے کھلونا خریدنا ہی پڑتا ہے۔ تیس سال ہو گئے تھے اس بات کو۔ کیا معمولی سی مانگ معلوم ہوتی تھی اُس وقت۔ اور پھر آزادی، ملک کی تقسیم، لوٹ مار اور جب وہ سرحد کے اِس پار پہنچے تو یہی بڑی خوش قسمتی سمجھی کہ عزت تو بچ گئی ...... ۔

آج رائے صاحب اپنے سب سے بڑے لڑکے کے لیے ایک ٹیکسی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کر رہے تھے کہ کیوں اُنھوں نے موہن کو بُرا بھلا کہا، آج تو اس کے لیے بڑی خوشی کا دن ہے۔ باپ اگر اس کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا تو کم از کم خاموش تو رہ سکتا تھا۔

جمنا نے رائے صاحب کو کھوئے ہوئے دیکھا اور کہنی مار کر دھیرے سے پوچھا: "کیا بات ہے؟ اتنے خاموش کیوں بیٹھے ہو۔ آج تو تمہارے موہن کی شادی ہو رہی ہے۔ کچھ ہنسو، کچھ بولو۔ لوگ کیا سوچیں گے؟"

"کچھ نہیں، میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے موہن کو صبح کچھ نہ کہنا چاہیے تھا۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا تھا جب میں تمہیں لینے گیا تھا۔ میں نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ جاؤں گا تو نئی اور اپنی کار میں، نہیں تو شادی نہ کروں گا۔ اس وقت یہ حالت تھی کہ پانچ منٹ کے اندر باپ نے یہ شرط مان لی تھی۔ اور آج —— آج میں سوچ رہا تھا کہ اگر ایک کار بھی نہ آئی ہوتی تو کیا ہوتا۔ ہمارے پاس تو ٹیکسی کے لیے بھی پیسہ نہ تھا۔"

"ہٹاؤ اِن باتوں کو! سب قسمت کی بات ہے۔ آپ بیتے زمانے کا خیال ہی کیوں کرتے ہیں۔ اب بھی ہم نہ معلوم کتنوں سے اچھے ہیں۔"

یہ دلاسا دے کر جمنا نے دوسری طرف منہ پھیر کر چپکے سے ساڑی کے پلو کے ساتھ اپنے آنسو پونچھ لیے۔ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا کہ بیتے دنوں کا خیال مت کرو لیکن یہ کہتے ہی اس کے دل کا چور پکڑا گیا تھا۔ خود اُس کا کیا حال تھا۔ رائے صاحب تو شاید آج صبح سے یا ایک دو دن سے سوچ رہے ہوں گے۔ وہ تو اُس دن سے سوچ رہی تھی جب سے یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ بہو کے لیے کیا بنوایا جائے۔

کتنے دنوں سے اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ ایک ندی کی ساڑی اور ننگا کا ہار۔ بس۔ اس کے سہارے بہو گھر لائی جائیگی! جب وہ خود آئی تھی تو کیا کیا نہ آیا تھا لڑکے والوں کی طرف سے! اور پھر ایک ایک کر کے سب گہنے بک گئے تاکہ عزت سے گزر جائے۔ اور آج اس کے پاس گروی رکھنے کے لیے بھی ایک زیور نہ تھا۔ بہو گھر سے ضرور بہت کچھ لائے گی لیکن یہ تو اور بھی لجا کی بات تھی۔ کیا سوچے گی؟ کیسے رائے صاحب کے گھر آئی؟ مگر موہن نے اسے سب کچھ بتا دیا ہوگا پھر بھی۔ اور پھر جیسے ایک وقت میں دونوں کا دھیان دوسری طرف ہٹانے کی کوشش میں اس نے چائے دانی اُٹھا کر چائے بنانا شروع کر دی۔ "لو تھوڑی چائے اور پی لو۔ اور اب سوچنا بند کرو۔" انھیں چائے بناتے دیکھ کر ایک بیرہ مٹھائی کی ٹرے لے آیا۔ جمنا نے ایک پیسٹری اُٹھا لی۔ بھوک تو نہیں تھی لیکن دکھانے کے لیے تو کچھ نہ کچھ کھانا ہی چاہیے ورنہ خواہ مخواہ لڑکی والے سوال کرنا شروع کر دیتے ہیں: "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" "آپ نے کچھ کھایا نہیں" وغیرہ وغیرہ۔ سدھیر نے چائے کا گھونٹ پیا تو ایک دم منہ خراب ہو گیا۔

جائے کو شاید دھواں لگ گیا تھا۔ وہ دولھا کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سہرے کو ہٹاتے ہوئے بولا۔ "بیٹا! اپنی سسرال والوں سے ہماری طرف سے یہ شکایت کر دینا کہ کم از کم چائے تو ٹھیک بنانی تھی۔ ہمیں تو اس شادی میں صرف چائے سے ہی غرض ہے۔ باقی سب تو تمہارا ہے۔" کانتا نے جو اس برات میں چودھرائن بنی ہوئی تھی اور چاہتی تھی کہ ہر بات سلیقہ سے ہو، سدھیر کے کوٹ کا دامن کھینچتے ہوئے کہا۔ "آہستہ بولو۔ یہ ساروں کی برات نہیں۔ ایسی باتوں کی شکایت تھوڑا ہی کرتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک بیگم صاحب ——" سدھیر بولا "اسی لیے تو ہم نے اپنی شادی پر پارٹی بھی نہیں کرائی تھی۔ نہ ہو گا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

"اوہ، آپ کی شادی کا کیا کہنا —— بس جیسے بھگا کر لائے ہوں" اور ہوئی بھی کچھ ایسے ہی تھی وہ شادی! ہر انسان کے کچھ آدرش ہوتے ہیں اور سدھیر کا آدرش تھا کہ شادی نجی معاملہ ہے اس میں کسی قسم کا "شو" بے کار اور فضول ہے۔ وہ شانتا جی کے ساتھ گیا تھا عمل کرنے کے لیے اس نے نوٹس پہلے ہی دے رکھا تھا۔ لیکن جب مجسٹریٹ کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابھی نوٹس کی میعاد پوری نہیں ہوئی۔ جب اور کچھ نہ سمجھ میں آیا تو پاس والے ایک گوردوارہ میں چلے گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد باپ بیٹا اور بہو، بس میں بیٹھ کر گھر واپس آ گئے تھے۔ یہ تھی اس کی انوکھی شادی۔ اور یہاں یہ کہا بھی۔ "ارے بھئی، اگر روایتی شادیوں میں آئے ہیں تو ہمارا رویہ بھی روایتی براتیوں کی طرح ہونا چاہیے۔ کیوں سالی کیا خیال ہے تمہارا؟" اس نے شانتا کو آنکھ مارتے ہوئے پوچھا۔ "ٹھیک ہے بیٹا" شانتا نے جواب دیا۔ ان دونوں کی آپس میں اسی طرح بات چیت ہوتی تھی۔ کبھی سیدھے طریقے سے ایک دوسرے کو نہ پکارتے تھے۔ مختلف قسم کے رشتے نکال کر وہ اس طرح ایک دوسرے کو پکارتے کہ کئی بار سننے والے دنگ رہ گئے۔

اور پھر شانتا نے اپنی شادی شدہ زندگی کے چھ برسوں کو پرے دھکیلتے ہوئے سروپ کے جوان چہرے کو دیکھا اور اس سے پوچھا "کچھ یاد ہیں آپ کو بھی اپنی شادی کی باتیں؟"

"ہاں۔ ہاں۔ میں سوچ ہی رہا تھا" سروپ ایسے بولا جیسے شانتا نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا ہو۔ اس نے کہاں سے سوچنا شروع کیا تھا؟ شادی سے بھی پہلے کے دنوں سے۔ چاچی کی شادی سے، جب وہ چھوٹا سا بچہ تھا اور اسے چاچی کی گود میں بیٹھایا گیا تھا۔ ماموں کی شادی سے جب وہ کچھ بڑا تھا اور بھیا کی شادی سے، جب وہ کالج میں پڑھتا تھا اور پارٹی کے تمام انتظامات کا ذمہ دار تھا۔ شانتا اسے کیسے ملی؟ کیسے ان کی جان پہچان ہوئی؟ اور پھر چھ سال کی کوشش، جس میں کئی قسم کے نشیب و فراز آئے اور کئی بار خاندان والوں نے کہا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ لیکن بیل منڈھے چڑھ ہی گئی۔ کیسی عجیب قسم کی شادی تھی؟ اس کا فیصلہ تو یہ تھا کہ کوئی رسم نہیں ہو گی لیکن پھر بزرگوں کی خاطر کچھ رسمیں بھی کی گئی تھیں۔ ہاں، لین دین بالکل نہ ہوا تھا۔ یہ اس کا جہیز کے خلاف پروٹسٹ تھا۔ ان سب شادیوں کے خلاف جن میں وہ براتی بن کے گیا تھا اور جن میں لڑکی والوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے اپنی بساط سے زیادہ جہیز دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن آج بھی تو جہیز لیا جا رہا تھا۔ خیر اپنی اپنی مرضی کی بات ہے اس نے سوچا۔ میرا کام ساری دنیا کو تھوڑا ہی ٹھیک کرنا ہے اور پھر ہر موقع کی اپنی نزاکت ہوتی ہے۔ موہن کی جیسی سسرال ہے وہاں سے تو جہیز لینا ہی چاہیے۔ اس نے خود موہن سے یہ پوچھا تھا: "کیوں بھئی کیا کیا لے رہے ہو؟" شاید اس نے یہ سوال ایک ہی بار کسی سے پوچھا تھا۔ "چلو اچھا ہے۔ کچھ مانگو مت۔ جو مل جائے ٹھیک ہے۔"

"شانتا" سروپ کے جواب کا انتظار کرتی رہی۔ جب کچھ جواب نہ ملا تو پھر بولی: "وہ وقت یاد ہے جب میں نے آپ کو جے مالا پہنائی تھی؟"

"اور میرے جوتے تمہاری سہیلیاں اور بہنیں چرا کر لے گئیں تھیں" سروپ نے جواب دیا۔ اگر اس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹنا ہی تھا تو ایسے ہی کیوں نہ ٹوٹے۔

"سچ —— کیا بات یاد آئی تمہیں بھی" شانتا نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اسے آج تک یہ پتہ نہ چل سکا تھا کہ کس وقت کس جگہ اور کس موڑ میں سروپ مذاق کر دے گا

کمرے میں سے منہ بسورتے ہوئے ونود نکلا اور بولا: "میری دلہن کہاں ہے۔ آپ نے کہا تھا مجھے میری دلہن ملے گی۔"

"ارے یہ تو ہم بھول ہی گئے۔"

ونود، سروپ اور شانتا کا پانچ سالہ بچہ تھا۔ سب کو شادی کے متعلق باتیں کرتے دیکھ کر اس نے شادی سے دو دن پہلے ہی پوچھا تھا: "شادی کیا ہوتی ہے؟"

سروپ نے جواب دیا تھا: "شادی میں دلہن ملتی ہے۔"

"دُلہن کیا ہوتی ہے؟"

"لڑکی ـــــ خوبصورت لڑکی ـــــ بڑے اچھے کپڑے پہنے ہوئے۔"

"ماما کو لڑکی کیوں ملے گی؟"

"کھانا پکانے کے لئے۔"

"کھانا تو نانی اماں پکا لیتی ہیں۔"

"کھیلنے کے لئے۔"

"ہمارے ساتھ تو ماما کھیلتے نہیں تو دلہن کے ساتھ کیا کھیلیں گے؟"

"بھئی تم تو بہت چھوٹے ہو۔"

"اچھا تو ہمیں بھی ایک دلہن لا دو۔"

"ضرور" ـــــ سروپ نے وعدہ کیا۔ "جب ماما کی شادی ہو گی تو تم بھی کوئی لڑکی پسند کر لینا ـــــ اس کے ساتھ تمہاری شادی کر دیں گے۔"

یہ وعدہ لے کر ونود برات کے ساتھ آیا تھا۔ اور جہاں دوسرے لوگ اِدھر اُدھر اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے، ونود بچوں کے جھنڈ میں اپنی دلہن ڈھونڈھ رہا تھا۔ آخر ایک لڑکی کو پکڑ کر وہ ساتھ لے آیا اور سروپ سے بولا: "ہم اس سے شادی کریں گے۔"

لڑکی ذرا بڑی تھی۔ سروپ نے اس سے پوچھا: "کیوں بیٹی، اس لڑکے سے شادی کرو گی؟"

اور لڑکی ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سروپ بہت سٹپٹایا۔ بہت چپ کرانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی آواز بینڈ سے بھی زیادہ اونچی تھی۔ تھوڑی دیر میں اُس کے رونے کی آواز سن کر کہیں سے اُس کا باپ بھی نمودار ہو گیا۔ سروپ نے اس سے پوچھا: "کہاں رہتے ہیں آپ بھائی صاحب؟"

"جالندھر۔ کیوں فرمایئے؟"

"نہیں ویسے ہی۔ ہمارے بچے کو آپ کی لڑکی پسند آ گئی ہے۔ اب ہمیں وہیں آنا پڑے گا۔"

وہ تو خیر ہوئی اس آدمی کا ذوق اچھا تھا ورنہ بات کا بتنگڑ بن جاتا۔ وہ نہایت اطمینان سے بولا: "ضرور" اور ونود کو ایک ٹافی دیتے ہوئے بولا: "اچھا بیٹا بات پکی ہو گئی۔"

"کیا ہوا؟" ونود نے سروپ سے پوچھا۔

"یہ کہہ رہے ہیں کہ ماموں کی شادی کے بعد تم لوگ جالندھر آ کر دلہن کو لے جا سکتے ہو۔"

"کب جائیں گے جالندھر؟"

"کل۔"

"کل نہیں۔ ابھی۔" ونود نے اصرار کیا۔

"اچھا پہلے ٹافی ختم کر لو، پھر چلیں گے۔" اور سروپ نے تھپکی دے کر ونود کو چلتا کیا۔ شانتا نے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ٹکڑا لگایا۔

"بالکل باپ! یہ کیا ہے؟ ابھی سے یہ چھن ہیں۔"

"ہاں خون کا اثر ہے۔" سروپ نے یہ بات اس طرح کہی گویا سارا اثر ماں کے خون کا ہی ہو۔ شانتا بیچاری چپ ہو گئی۔

پھیرے ختم ہو چکنے کے بعد کھانا کھانے کے لیے دُلہن کو بھی دولہن کے پاس برات کے ساتھ ہی بٹھا دیا گیا۔ براتی کھانا کھا رہے تھے اور چاروں طرف لڑکی والے لوگ گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ سب کی نظریں جوڑے پر ہی تھیں۔ چلمنوں کے پیچھے عورتیں اور لڑکیاں جمگھٹ لگائے کھڑی تھیں۔ وہاں سے چوڑیوں کی آواز، عورتوں کی کھسر پھسر اور کھسیانی ہنسی میں مل کر آ رہی تھی۔ ایک لڑکی کا مذاق اور دوسری کا احتجاج ـــــ ایک دھکا دے کر کہہ رہی تھی: "جا، آگے جا کر اچھی طرح دیکھ لے۔" دوسری بولی: "ہائے ہائے، تیری بھی شادی ہو جائے گی کسی کالے کلوٹے کے ساتھ۔" تیسری نصیحت کر رہی

تھی: "اری کتنی بے شرم ہے" اور اس کا چہرہ خود شرم سے لال ہو جاتا تھا۔ ایک بوڑھی سی عورت نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر کہا: "ار دولہا تو کبھی دکھائی ہی نہیں دیتا۔ کنواری اور بیاہتا اور بوڑھی۔ خوش و ناخوش۔ سدھیر کبھی کبھی کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھ لیتا۔ یہ نظارہ ہر شادی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر چالاک سی اور بدصورت عورت نے قدرے اونچی آواز میں کہا: "کیا منڈ جوڑی ہے!" یہ شاید نفسیاتی قار سولا ہے جو ہر شادی میں کوئی نہ کوئی ضرور دہراتا ہے تاکہ لڑکی کی خوبصورتی کی توثیق ہو جائے اور برات والے اسے ذہنی طور پر بھی قبول کر لیں۔ جو عورتیں یہ جملہ کہتی ہیں وہ نہایت گھاگ قسم کی ہوتی ہیں اور وہ اپنی طرف سے لڑکی والوں کا ایک فرض پورا کرتی ہیں۔

جمنا نے یہ جملہ سنا تو اس نے جوڑی کو دیکھا اور دل میں بلائیں لینے لگیں۔ پھر وہ اپنے صاحب سے بولی: "ہمیں جلدی چلنا چاہیے۔ دلہن کے آنے کے لئے گھر میں تیل بھی تو چوانا ہے۔"

باجہ اب بھی بج رہا تھا۔ پولیس والے ہر قسم کی دھنیں بجا رہے تھے۔ جہیز ایک کار میں رکھا جا رہا تھا۔ دوسری کار کو دلہن کے لئے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ اندر سے لڑکی لائی گئی۔ ایک طرف باپ اور دوسری ماں اُسے سہارا دے رہی تھی۔ وہ لمبا سا گھونگھٹ نکالے آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی۔ اب بینڈ والوں نے دھن چھیڑی: "چھوڑ بابل کا گھر" دلہن سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اس کی ماں اور بہنیں دھاڑیں مار کر رو رہی تھیں۔ سب عورتیں ـــ کچھ کم، کچھ زیادہ، کچھ واقعی، کچھ دکھاوے کے لئے ـــ رو رہی تھیں۔

سروپ کو چاچی کا خیال آیا۔ اور پھر ماں کا جو اکثر کہا کرتی تھی: "دوھوا بھی روئے، سہاگن بھی روئے اور پاس کنواری کنیا بھی روئے۔" لیکن اس وقت ـــ شادی کے وقت ـــ برات کی وداعی کے وقت سبھی رو رہے تھے۔ چاچی کے کانوں میں بینڈ کی آواز تو آئی ہوگی ـــ کیا وہ بھی رو رہی تھی؟



غیر مہذب قبائل کے رسم و رواج

(بسلسلہ صفحہ ۲۶)

مجرموں کا پتہ لگاتا ہے اور کبھی وہ لکڑی کے دو ٹکڑوں کی مدد سے اس کام کو یوں انجام دیتا ہے کہ ایک ٹکڑے کو جو کسی جانور کی شکل کا بنا ہوتا ہے دوسرے ٹکڑے پر جو جڑی بوٹیوں کے عرق سے تر رہتا ہے رگڑتا ہے۔ اس دوران میں وہ قبیلہ کے افراد کا نام بھی اپنے منتروں کے ساتھ لیتا رہتا ہے۔ جس نام پر لکڑی کی رگڑ میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے وہ آدمی مجرم قرار پاتا ہے۔

مجرموں کی شناخت کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک کدو کا خول جس میں رسی پروئی گئی ہو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ رسی کا نچلا حصہ پیروں کے نیچے دبا رہتا ہے اور اوپری سرا ہاتھ میں رہتا ہے۔ خول کو نیچے کی جانب سرکا دیا جاتا ہے اور منتروں کے ساتھ ساتھ قبیلے کے افراد کے نام لئے جاتے ہیں۔ جس نام پر خول رک جاتا ہے وہ مجرم قرار پاتا ہے۔

کڑی آزمائش والی سزاؤں میں مجرم کو آگ، پانی اور زہر سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ سمندر یا ندیوں میں غوطہ لینا پڑتا ہے۔ تپتے ہوئے پتھر پر ننگے پیر چلنا پڑتا ہے یا دہکتی ہوئی آگ میں کودنا پڑتا ہے یا پگھلی ہوئی دھات کو ہتھیلی پر رکھنا پڑتا ہے یا ابلتے ہوئے پانی میں دونوں ہاتھوں کو دیر تک رکھنا پڑتا ہے یا زہریلی جڑی بوٹیوں کے پکائے ہوئے عرق کو پینا پڑتا ہے۔ زہر پینے کی صورت میں اگر موت ہو جاتی ہے تو جرم کا ثابت ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔ آگ پر چلنے سے اگر آبلے نہ پڑیں تو بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے۔ سمندر سے صحیح سالم نکل آنے پر بھی جرم ثابت نہیں ہوتا۔ مگر اسکیمو قوم میں اگر مجرم سمندر میں ڈوب جائے تو اس کی بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔

منشی مادھو رام جوہر

از ویٹھل پرشاد سکسینہ

مادھو رام نام۔ جوہر تخلص۔ فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام جواہر لل تھا جو بڑے اللہ والے بزرگ تھے۔ ان کا خاندان فرخ آباد میں بہت ممتاز اور باوقار سمجھا جاتا تھا۔ شاعری ان کے گھر کی لونڈی تھی کیونکہ ان کا سارا خاندان شعر و سخن سے طبعی مناسبت رکھتا تھا۔ جوہر کے والد جواہر لل بھی اردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کا کلام بعض پرانے گلدستوں میں طبع ہو چکا ہے۔ جوہر کے دو صاحبزادے تھے، منشی شیو پرشاد متخلص بہ جوہری اور منشی رام پرشاد متخلص بہ گوہر۔ ان کا شمار بھی فرخ آباد کے استادوں میں تھا۔ بیسوں حضرات نے جوہری اور گوہر سے مشورۂ سخن کیا تھا۔ منشی شیو پرشاد جوہری نے اپنے والد کا دیوان مطبع حسنی فتح گڑھ سے بہ اہتمام حسین بخش سنہ ۱۳۲۰ھ میں طبع کرایا تھا۔ امتیاز علی خاں کاپی نویس نے کتابت کی تھی۔ یہ دیوان جوہر کی وفات کے بارہ سال بعد شائع ہوا۔ منشی شیو پرشاد جوہری نے ایک قطعہ تاریخ بھی کہا تھا جو دیوان میں موجود ہے:۔

چھپا • • حضرت جوہر کا دیوان   کہ ہر اہل سخن تھا جس کا شیدا
ہر اک مطلع ہے جس کا مطلع نور   مہ و خورشید کا سب کو ہے دھوکا
گل اشعار ہیں رنگین ایسے   کہ ہے باغ سخن سرسبز کیا کیا
سکندر کی قسم آئینہ کی شکل   یہ بندش ہے کہ مطلع ہے مصفّا
جو دیکھا نکتہ بینوں نے اسے خوب   بنایا شوق سے آنکھوں کا تارا
ہر اک اہل سخن یوں کہہ رہا ہے   یہ یکتا ہے یہ یکتا ہے یہ یکتا
لکھو اے جوہری ایمان سے تم   نیا گل مصحف مضموں یہ دیکھا
۱۳۲۰ھ

جوہر کے صاحبزادے منشی رام پرشاد گوہر کے پسر اکبر منشی لچھمی نرائن متخلص بہ گہر کا قطعہ تاریخ بھی ملاحظہ کیجیے:۔

ہے یہ دیوان جد امجد کا   اشعار اس کا مرتبہ دیکھو
گلشن نظم اس کو کہتے ہیں   غور سے اس کو جا بجا دیکھو
آج باغ سخن ہوا شاداب   ہر طرف ہرا بھرا دیکھو
شعرا کا دماغ کرتی ہے تر   گل اشعار کی ہوا دیکھو
اے گہر اس کی یوں لکھو تاریخ   جوہر نظم یہ کھلا دیکھو
۱۳۲۰ھ

جوہر نے ابتدائی تعلیم فرخ آباد کے ممتاز اساتذہ سے حاصل کی۔ فرخ آباد میں اس وقت منیر کے کمال کا چرچا تھا اس لیے ذوق سخن نے ان کو منیر سے جا ملایا اور یہ منیر شکوہ آبادی کے شاگرد ہو گئے۔ منیر کو اپنے اس شاگرد پر بڑا ناز تھا۔ منیر اور جوہر نے دہلی، لکھنؤ اور اکبرآباد میں جا کر جو علم و ادب کے مرکز تھے وہاں کے مشاہیر شعرا و ادبا سے اپنے کمال کی داد پائی۔ حضرت جگر بریلوی یاد رفتگاں میں لکھتے ہیں:

"سخن سنجی و سخن گستری میں اپنے وقت کے مسلم استاد تھے۔ اہل ہنر اور اہل سخن کے بڑے قدرداں تھے۔ ان کے ساتھ بہت سلوک و مراعات کیا کرتے تھے۔ منیر ان کی وجہ سے اکثر مدتوں فرخ آباد میں قیام کرتے۔ شب و روز شعر و سخن کے چرچے اور جلسے رہتے۔ کبھی جوہر خود دہلی، لکھنؤ اور اکبرآباد میں جو شاعری کے گہوارے تھے جا کر مہینوں قیام کرتے۔ اہل کمال سے صحبتیں گرم رہتیں۔ سخنوری و سخن فہمی کی داد دیتے۔ غرض جوہر شمع کمال کے پروانے تھے اور دن رات اسی کے عشق میں زندگی کاٹتے تھے۔"

بہادر شاہ ظفر کے دور حکومت میں جوہر مختار شاہی کے معزز عہدے پر فائز ہوئے۔ اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی میں جوہر نے انگریزوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ تن من دھن سے محبان وطن کے شریک رہے۔ اس کے انتقام میں انگریزوں نے ان کی جائداد ضبط کر لی تھی۔

سید رفیق مارہروی نے ہندوؤں میں اردو میں جوہر کی تاریخ وفات ۱۹۰۵ء لکھی ہے اور عشرت لکھنوی نے اپنے تذکرہ میں آپ کی تاریخ رحلت سنہ ۱۹۰۲ء درج کی ہے مگر یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں۔ جوہر مرحوم کے شاگرد منشی شنکر لال مجنوں کا قطعہ تاریخ وفات ملاحظہ فرمایئے۔ مجنوں نے وفات کی صحیح تاریخ سمبت میں نکالی ہے:۔

جو رحلت لالہ مادھو رام نے کی   ہر اک سر پیٹ کے کہنے لگا حیف
نظر آتا ہے ہر سو ایک اندھیرا   ہوا رنج و الم کا سامنا حیف
سخن دان و سخن سنج و سخن گو   قیامت ہے کہ دنیا سے اٹھا حیف
پرو دے گا سخن میں کون موتی   کہ حسن شاعری جاتا رہا حیف
تو لکھو سمبت میں یہ تاریخ مجوب   غم جوہر قیامت کا ہوا حیف
(سمبت ۱۹۲۶)

اس حساب سے جوہر کا انتقال سنہ ۱۹۲۶ء میں ہوا۔

جوہر نے اپنے دیوان میں اپنے استاد منیر سے والہانہ عشق و عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ تین غزلوں کے مقطع ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

جوہر مجھے ہے عشق جناب منیر سے   کس طرح وصف خوبیٔ استاد کیجئے
جوہر کرے کیا وصف منیر سخن آرا   ہادی ہیں، مرشد ہیں، استاد ہیں ہے
ہر طرف نام ہے روشن صفت مہر منیر   جوہر آفاق میں شہرت مرے استاد کی ہو

کلب حسین خاں نادر شاگرد ناسخ حضرت جوہر کے جگری دوست تھے۔ جب نادر مرحوم فرخ آباد میں ڈپٹی کلکٹر تھے تو انھوں نے جوہر کے ارشاد پر ایک بزم مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی جس میں فرخ آباد کے مشاہیر شعرا ہی اپنا کلام سناتے تھے اور مبتدی ان اساتذہ کے کلام کو شاگردوں میں اکثر سنتے تھے۔ نادر کا جب انتقال ہوا تو جوہر نے حسب ذیل قطعہ تاریخ کہا۔

حضرت نادر جناب میرزا کلب حسین   نکتہ سنج اہل سخن شیریں بیاں شاعر بمرد
مصرع سال وفاتش جوہر محزوں بگفت   طوطی ہند آہ ایں نادر بیاں شاعر بمرد
۱۲۹۵ھ

حضرت جوہر اردو زبان کے ایک جادوگر تھے۔ ان کی غزلیں آج بھی ہندوستان کے گوشے گوشے میں گائی جاتی ہیں۔ یہ اردو کی بدنصیبی ہے کہ ہمارے ادیبوں نے ابھی تک حضرت جوہر جیسے شاعر پر قلم نہیں اٹھایا۔ تلسی داس، پنڈت دیا شنکر نسیم اور مومن کے بعد اگر کوئی شاعر ہو جس کے بے شمار اشعار ضرب المثل ہو کر ہماری گھریلو زندگی کا جز بن گئے ہیں تو وہ حضرت جوہر ہیں۔ ان کے چند ضرب المثل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ یہ اشعار بہتوں کے زبان زد ہوں گے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ ان کا خالق کون ہے۔ ؎

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سر محفل جو کیا   تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں
اب عطر بھی ملو تو تکلف کی بو کہاں   وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا
نالۂ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر   اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

دوست دو چار نکلتے ہیں کہیں لاکھوں میں   جتنے ہوتے ہیں سوا اتنے ہی کم ہوتے ہیں
کیا بتاؤں کس طرح دل آ گیا   کیا کہوں کیوں کر محبت ہو گئی

تلاش کرنے پر جوہر کے ایسے بہت سے اشعار مل سکتے ہیں جن کا درجہ ضرب المثل کا سا ہو گیا ہے۔

جوہر کے ہر شعر سے عشق ٹپکتا ہے۔ غزل کی نرم، سادہ اور صاف زبان میں محبت کی کیفیتوں اور واردات کی رنگینیاں ہیں۔ انداز بیان میں اس درجہ تاثیر ہے کہ غزل پڑھ کر طبیعت مسرور ہو جاتی ہے اور وہی عاشقانہ فضا پیدا ہو جاتی ہے جس پر داغ کی شہرت کی بنیاد ہے۔ جوہر کی غزلیات کے بارے میں حضرت جگر بریلوی یاد رفتگان میں لکھتے ہیں:

"کلام میں صرف غزلیات کا کچھ انتخاب نظر سے گذرا۔ بڑا عمدہ اور مزیدار کلام ہے۔ مضامین کے لحاظ سے تو وہی شانہ و آئینہ، رقیب و رقابت، طعن و تشنیع، بوسہ و دشنام، نامہ و پیام، ہجر و وصال کے اذکار و معاملات ہیں لیکن اس صفائی، شوخی اور خوبصورتی سے نظم ہوئے ہیں کہ طبیعت پھڑک اٹھتی ہے۔"

چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

نیند آنکھوں میں بھری ہے کہاں رات بھر رہے   کس کے نصیب تم نے جگائے کدھر رہے
تڑپ رہا ہے دل اک ناوک جفا کے لیے   اسی نگاہ سے پھر دیکھیے خدا کے لیے
محبت کیجئے ظاہر نہ مجھ سے بندہ در گذرا   بڑے میرے نصیب اللہ مجھ پر آپ مرتے ہیں
بوئے گل سونگھ کر بگڑتے ہیں   یہ پری زاد ہوا سے لڑتے ہیں

اسی رنگ میں درد و اثر کی کیفیت پیدا کرتے ہیں ؎

اس نے پھر کر بھی نہ دیکھا میں اسے دیکھا کیا   دے دیا دل راہ چلتے کو یہ میں نے کیا کیا
غیر ممکن ہے جو ٹھنڈا ہو کلیجہ ان سے   اور وہ آگ لگائیں گے بجھانا کیسا
یوں تو منہ دیکھے کی ہوتی ہے محبت سب کو   جب میں جانوں کہ مرے بعد مرا دھیان رہے
جن نگاہوں سے لیا ہے دل شیدا میرا   ڈھونڈھتا ہے انھیں تیروں کو کلیجا میرا
ہو گی ضرور صبح تری اے شب فراق   ہم کو نصیب دیکھیے ہو یا سحر نہ ہو

کبھی ایسی صفائی اور درد کے ساتھ بھی اور لگتی ہوئی باتیں کہہ جاتے ہیں جو استادوں کی ہی خصوصیت ہوتی ہے۔

کیا یاد کر کے روؤں میں کیا شباب تھا   کچھ بھی نہ تھا ہوا تھی کہانی تھی خواب تھا
ذرہ سمجھ کے یوں نہ ملا مجھ کو خاک میں   اے آسمان میں بھی کبھی آفتاب تھا

آخر میں جوہر کی چار غزلوں کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں :-

محمل نشیں جب آپ تھے لیلیٰ کے روپ میں مجنوں کے بھیس میں کوئی خانہ خراب تھا
پیری میں ایک ہی سے ہمیشہ رہیں گے دن وہ اور تھا زمانہ جب انقلاب تھا
تیرا قصوروار خدا کا گنہگار جو کچھ کہ تھا یہی دلِ خانہ خراب تھا
ذرہ سمجھ کے یوں نہ ملا مجھ کو خاک میں اے آسمان میں بھی کبھی آفتاب تھا

رات دن چین ہم اے رشکِ قمر رکھتے ہیں شام اودھ کی تو بنارس کی سحر رکھتے ہیں
بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں
اشک قابو میں نہیں راز چھپاؤں کیوں کر دشمنی مجھ سے مرے دیدۂ تر رکھتے ہیں
رشکِ پرواز کریں کیوں نہ اسیرانِ قفس ہم صفیرانِ چمن بازو و پر رکھتے ہیں
دل تو کیا چیز ہے پتھر ہو تو پانی ہو جائے میرے نالے ابھی اتنا تو اثر رکھتے ہیں
در بدر خاک بسر پھرتے ہیں مارے مارے خانہ برباد محبت کہیں گھر رکھتے ہیں

کون سوتا ہے کسے ہجر میں نیند آتی ہے خواب میں کس نے تمہیں ایک نظر دیکھ لیا
آنکھیں سلوا دیں مگر ذوقِ تصور نہ گیا گو نظر بند ہوئی تو بھی ادھر دیکھ لیا
بچ گیا نقدِ دل اب کے تو نظر سے اس کی آئے گا پھر بھی اگر چور نے گھر دیکھ لیا
اتنی سی بات پر آنکھیں نہ نکالو صاحب کیا خطا کی نہیں جو ہرنے اگر دیکھ لیا

وصف لکھا ہو جو ابرو نے بتِ دل خواہ کا میرے مطلع پر ہے دھوکا کسی بسم اللہ کا
وصفِ حسنِ یار کی تحریر سے اے شمع طور صفحۂ دیواں میں ہے عالم تجلی گاہ کا
ہیں تیری درگاہ میں ہمدوش توپ سلطنت مرتبہ یکساں نظر آیا گدا و شاہ کا

جوہر نے شعرائے فرخ آباد کا تذکرہ بھی شائع کیا تھا مگر وہ اب کمیاب ہے۔



لداخ

(بسلسلہ صفحہ ۳۰)

مشرق کی طرف جائیں تو یہ سرحد سلسلۂ کوہ تھیل (جس پر جھیل واقع ہے) گلگت اور قراقرم دروں سے ہو گزرتی ہے۔ یہ ین دھاری سلسلہ ہندستان میں دریائے سندھ کے نظام میں شامل شیوک ندی کے طاس کو سنکیانگ کی یارقند ندی کے طاس سے جدا کرتا ہے۔ یہاں سے وہ کیولن کے سلسلے سے جا ملتا ہے جو یورونگ قش کے طاس کو اقصائے چین کی جھیلوں سے جدا کرتا ہے۔

کیولن سلسلے سے آگے نکل کر وہ جنوب مغربی سمت میں اترتے ہوئے ہندستان کی اقتود اور سرگ جلگا نگ جھیلوں کے طاس کو تبت کی جھیلوں سے جدا کرتا ہوا دۂ لنگ (لنگ لا) جا پہنچتا ہے۔ اس کے آگے ہندستان و چین کی سرحد اس ین دھاری سلسلے پر سے گزرتی ہے۔ جو ہندستان کی چانگ چین مو اور تچی ساچم ندیوں کو تبت کی ڈیاپ سو جھیل سے الگ کرتا ہے۔

اس کے بعد پینگونگ جھیل کے مشرقی نصف حصے کے انتہائی مغرب سمت سے بہتا ہوا ہینگور جھیل کے مشرقی حصے کو کاٹتا ہوا، دریائے دم چوک کے مغرب میں پانچ میل تک دریائے سندھ کو عبور کرتا ہے، اور سنگے ندی اور ستلج کے معاونوں کے طاسوں کو جدا کرنے والے ین دھاری سلسلے پر سے گزرتا ہوا مغرب کی طرف مڑتے مڑتے گیا چونی تک جا پہنچتا ہے، جو لداخ، پنجاب اور تبت کا مقام اتصال ہے اور ۳۲ درجے ۳۲ فٹ عرض بلد شمال اور ۸ درجے ۲۸ فٹ عرض بلد شرق پر واقع ہے۔

اُردو شاعری میں ہولی

پریم پال اشک

ہندوستان کے تہواروں میں ہولی کا مقام نہایت اہم ہے۔ اس کی رنگا رنگی اور گہما گہمی کسی سے چھپی نہیں۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب فصلیں کٹتی ہیں اور موسم خوشگوار ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں انسان کے دل میں خوشی کی لہر پیدا ہونا اور اپنے جذباتِ مسرت کا عملی طور سے اظہار کرنا ایک فطری چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہولی کا زمانہ آتے ہی ہم لوگ کبھی جھوم جھوم کر ہوری گاتے ہیں، کبھی رسیا کی تانیں اُڑاتے ہیں، کبھی باغوں میں جا کر پھولوں سے رنگت چراتے ہیں اور پھر ان ہی رنگوں میں ڈوب کر محبت، پیار اور دوستی کی پچکاریاں چلاتے ہیں۔ کبھی ہم قہقہوں میں بسا عبیر اُڑاتے ہیں اور کبھی پریم کا گلال اُڑا کر فضا کو رنگین بناتے ہیں۔ یہی کیف و سرمستی کبھی برج کی گوالنوں کے الھڑپن میں اور کبھی پرہلاد کی عقیدت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

غرض، ہولی کے ایک نہیں کئی روپ ہیں۔ یہ روپ ہماری تہذیب، تمدن، کلچر اور سماج کی صحیح معنی میں عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے سلونے پن اور سوندھے پن میں اپنا کا گلال ہے اور ملاپ کا عبیر ہے۔

اس رنگین اور پُرکیف تہوار نے ہندوستان کی مختلف زبانوں پر اثر ڈالا ہے اور اُن کی شاعری ہولی کے ذکر سے معمور ہے۔ دوسری ہندوستانی زبانوں کی طرح اردو شاعری بھی ہولی اور اسکی رنگا رنگی سے پوری طرح متاثر ہوئی ہے۔ چنانچہ اردو کے قدیم شاعروں سے لیکر جدید شعرا تک کے یہاں ہولی کے موضوع پر متفرق اشعار اور نظمیں بہت کچھ پائی جاتی ہیں۔ ہولی پر اردو کے محاورے بھی ملتے ہیں مثلاً "ہولی منانا" "پھاگ کھیلنا" "ہولی کھیلنا" وغیرہ۔

آیئے اب ہولی پر چند قدیم و جدید اردو شعرا کے تاثرات کا تھوڑا سا جائزہ لیں۔

میر تقی میرؔ یاسیت پسند شاعر تھے مگر انہیں ہندوستان سے پیار تھا، اس کی مٹی سے پیار تھا اور یہاں کے باسیوں سے پیار تھا۔ چنانچہ وہ بھی ہندوستان کے "نوروز" سے متاثر ہوئے اور اپنی "مثنوی در جشن ہولی و کتخدائی" میں لکھنؤ کے باشندوں کو ہولی مناتے ہوئے اس طرح دکھایا ہے۔ ؎

آؤ ساقی بہار پھر آئی	ہولی میں کتنی شادیاں لائی
دستِ دستور کر جو زرافشاں	پھر جہانِ کہن ہوا ہے جواں
جس طرف دیکھیے چراغاں ہے	شیشہ و شمع ہی نمایاں ہے
آج نوبت کے بجے ہیں رنگ	عقل ہوتی ہے دشمن شکوری ونگ
بیچ میں ہولی آئی ہے ساقی	پھیر سرخوش ہے تمایہ کے ساقی
قمقمے جو گلال کے مارے	مہوشاں لالہ رخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں	گل کی پتی ملا اڑاتے ہیں
جشنِ نوروزِ ہند ہولی ہے	راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

میرؔ نے اس مثنوی کے سلسلہ میں آخر میں جو غزل لکھی ہے اس کے مطلع میں پھر ہولی کا ذکر کیا ہے۔ ؎

اب کی بہار کیا کیا دریا پہ رنگ لائی | اک شہر نکلے لالہ پھولا سبھی ہولی آئی

ہولی پر میرؔ کی ایک اور مثنوی ہے جس کا عنوان ہے "مثنوی در بیان ہولی"۔ نواب آصف الدولہ ہولی کھیلتے تھے۔ مثنوی اُن کے ہولی کھیلنے پر ہی لکھی گئی تھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر	رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر
جشنِ نوروزی اہل ہند سب	ہے یہی تب محوِ عشرت ہیں گے اب
رنگ افشانی سے پڑتی ہے پھوار	رنگ باراں تھا مگر ابرِ بہار
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال	جسکے لگتا آن کر پھر منھ ہے لال
برگِ گل کی طرح اڑاتے تھے عبیر	تھی ہوا میں گرد تا چرخِ اثیر

اس مثنوی کے سلسلہ میں جو غزل ہے اُس کے دو شعروں میں بھی ہولی کا حوالہ ہے۔ ؎

منھ پر عبیر عاشق اصرار سے ملے ہیں کب ہاتھ کھینچتے ہیں معشوق کی نہیں سے
یکسو گلال منھ پر غوباں کے مل رہے ہیں اُلجھے ہیں ہاتھ یکسو گیسوئے نازنیں سے

غالب نے اپنے ایک قصیدے میں عید، ہولی اور نوروز کا اِس طرح ذکر کیا ہے۔ ؎

گرچہ ہے بعد عید کے نوروز لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
سو اس کبیس دن میں ہولی کی جا بجا مجلسیں ہوئی رنگیں
شہر میں کو بہ کو عبیر و گلال باغ میں سو بہ سو گل و نسریں
شہر گویا نمونۂ گلزار باغ گویا نگار خانۂ چیں
تین تیوہار اور ایسے خوب جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں

اردو کے قومی شاعر، نظیر اکبرآبادی کو ہمارے میلوں سے، ہمارے تہواروں سے اور ہماری ہر چیز سے عشق ہے، اور بھرپور عشق ہے۔ اُن کی ہر نظم ہماری تہذیب کی اور ہمارے تمدن کی منہ بولتی تصویر ہے۔ انھوں نے ہولی پر کئی نظمیں کہی ہیں۔ ایک نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو۔ ؎

ہولی کی بہار آئی فرحت کی کھلی کلیاں باجوں کی صداؤں سے کوچے بھی اور گلیاں
دلبر سے کہا ہم نے ٹک چھوڑیئے چھل بلیاں اب رنگ گلالوں کی کچھ کیجئے رنگ لیاں
ہولی میں یہی دھومیں لگتی ہیں بہت بھلیاں

ہولی پر نظیر اکبرآبادی کی کچھ نظموں کا ایک ایک بند اور پیش ہے ؎

پھر آن کے عشرت کا مچا ڈھنگ زمیں پر اور عیش نے عرصہ کیا تنگ زمیں پر
ہر دل کو خوشی کا ہوا آہنگ زمیں پر ہوتا ہے کہیں راگ کہیں رنگ زمیں پر
بجتے ہیں کہیں تال کہیں چنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

ہوا جو آکے نشاں آشکار ہولی کا بجا رباب سے مل کر ستار ہولی کا
سرود رقص ہوا بے شمار ہولی کا ہنسی خوشی میں بڑھا کاروبار ہولی کا
زباں پہ نام ہوا بار بار ہولی کا

میاں تو ہم سے نہ رکھ کچھ غبار ہولی میں کہ روٹھے ملتے ہیں آپس میں یار ہولی میں
مچی ہے رنگ کی کیسی بہار ہولی میں ہوا ہے زورِ چمن آشکار ہولی میں
عجب یہ ہند کی دیکھی بہار ہولی میں

انشا نے "پالے پر پھاگ کھیلنا" محاورے کو کس صفائی سے باندھا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

یہ ہندو کہتے ہیں جنا سہاگ دکھلا کر کہ خوب کھیلے ہمارا جی پھاگ پالے پر

ناسخ نے "رنگت اُڑانا" کے محاورے کو گلال اُڑانا کے ساتھ کس خوبی سے استعمال کیا ہے۔ ؎

طرفہ ہولی کھیلتا ہے، باغ میں وہ رشکِ گل
ہے گلال اُس کو اُڑانا روئے گل سے رنگ کا

حضرت ناسخ ایک جگہ اور "گلال اڑانے" کے محاورے کو اس البیلے انداز سے اپناتے ہیں ؎

جس دن سے ہے گلال اڑانے کا تجھ کو شوق
تیرے شہیدِ ناز کا لایا غبار، رنگ

ہولی کے خوش رنگ پہلو میں کتنا درد اور کتنا غم چھپا ہے، اس کو ناسخ نے اس طرح بیان کیا ہے۔ ؎

اشک خونیں رنگ، نالہ راگ ہے واہ کیا خوش رنگ اب کا پھاگ ہے

آتش نے یار کے گلال ملا مگر یار کے عتاب سے ڈر بھی گئے۔ ؎

گلال مل کے ڈرا میں رخِ منور پر
یقین ہوا یہ مجھے یار کو عتاب آیا

سحر نے "رنگ اُڑانا" محاورے کو اس طرح باندھا ہے ؎

اڑتا ہے عاشقوں کا تری ہر گلی میں رنگ ہولی کا جیسے کھیلتے ہیں ہر گلی میں رنگ

"گلال اُڑنا" کے الفاظ میں بذاتِ خود بلا کی رنگینی اور رعنائی ہے لیکن برق نے اِس رنگینی میں دوچند اضافہ کر دیا ہے۔ ؎

باغ میں روز گلال اُڑنے کے شفق ہوتا تھا بادلہ چرخ کا سونے کا ورق ہوتا تھا

اردو شاعری میں 'قاتل' کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ہے وہ قاتل مگر اُس کے سہارے عاشق بھی زندہ ہے اور اُس کا عشق بھی! داغ کے قاتل اور بسمل یوں ہی ہولی کھیلتے ہیں۔ ؎

یہ ٹپکتا ہے رنگ بسمل سے ہولی کھیلے گا آج قاتل سے

عبدالاضحیٰ کی رعایت سے فائدہ اُٹھا کر حضرت راسخ یہ تصور پیش کرتے ہیں۔ ؎

عید کے دن وہ ذبح کرکے مجھے   گھر میں ہولی منانے بیٹھے ہیں

اسیر لکھنوی نے ہولی کا تصور ایک مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ ؎

خاک گلزار میں پھولوں نے اڑائی کیا کیا   ایسی ہولی جو مجھے رنگ محل میں گزری

اردو شعرائے نعتیہ اشعار تک میں ہولی یا اُس کے لوازمات کا ذکر کیا ہے۔ امیر مینائی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

خاکِ پا اُن کی ہے جنت کا عبیر   دل سے ہے جو خاکِ پائے مصطفیٰ

"لنگوٹی میں پھاگ کھیلنا" کے معنی ہیں تنگ دستی کے باوجود عیش کی کوشش کرنا۔ اب دیکھئے دلؔ نے کیا کہا ہے۔ ؎

کھیلے وہ فاقہ مست لنگوٹی میں کیوں نہ پھاگ   ہولی میں پھاگ کھیلتے ہو تم رقیب سے

اسی طرح شوق قدوائی خالص بیگماتی انداز میں فرماتے ہیں ؎

نہ کھیلو لنگوٹے لنگوٹے میں پھاگ   ابھی خیر ہے اپنا جی لے کے بھاگ

بہادر شاہ ظفر نے ہندی میں بھی شاعری کی ہے۔ اُن کے دیوان اول سے ہولی پر ایک گیت کا اقتباس پیش ہے۔

کیوں منھ پر رنگ کی ماری پچکاری
دیکھو کنور جی دوں گی گاری

ہر کہ دست از جان بشوید، ہرچہ در دل آرد بگوید

بھاج سکوں میں کیسے گوسوں بھاجا ناہیں جات
ٹھاڑے اب دیکھوں میں وہ کون جو سنمکھ آت

وقت ضرورت چو نہ ماند گریز   دست بگیرد سرِ شمشیرِ تیز

....

بہادر شاہ ظفر کے علاوہ متعدد دوسرے مسلم شعرا نے بھی ہندی میں گیت کہے ہیں اور یہ گیت ہولی کے زمانہ میں آج بھی اسی ذوق و شوق سے گائے جاتے ہیں جس طرح اب سے سوا سو برس پہلے گائے جاتے تھے۔ ہولی پر نغمے لکھنے والوں میں لکھنؤ کے "کدر پیا" "للا" "اختر پیا" (آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ اختر کا ہندی تخلص) کے نام بہت مشہور ہیں۔

تحریک آزادی میں ہولی کا رول بہت اہم رہا۔ علی جواد زیدی نے اپنی نظم میں ہندوستان کی تاریخ کو بڑے ہی البیلے انداز سے پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی ہندوستانیوں کی مجبوری کے ساتھ اُن کی بے بسی کا بھی بڑا عمدہ خاکہ کھینچا ہے۔ ؎

پہلے زمانہ اور تھا، "اور تھی" دور اور تھا
وہ بولیاں ہی اور تھیں
وہ ٹھولیاں ہی اور تھیں
لیکن، مرے پیر مغاں
کل تو نیا انداز تھا
اک دور کا تھا خاتمہ، اک دور کا آغاز تھا
تیرے وفاداروں نے جب کھیلیں گلابی ہولیاں
نکلے بنا کر ٹولیاں
ہنستے چلے گاتے چلے
اپنے گلابی رنگ سے دنیا کو نہلاتے چلے

ہولی کے پس منظر سے اردو کو کتنی عقیدت ہے اور اس کی آگ کتنی پاک اور پوتر ہے، اس کا اندازہ جاں نثار اختر کی نظم "امن نامہ" کے اس شعر سے ہو سکتا ہے۔ ؎

دہکتی رہے پاک ہولی کی آگ   رہیں کھیلتی ناریاں پی سے پھاگ

موجودہ دور کے شعرا میں ان حضرات کے علاوہ متعدد دوسرے شعرا مثلاً شمیم کرہانی، باسط بسوانی وغیرہ نے بھی ہولی پر بڑی کیف پرور نظمیں لکھی ہیں۔

جب وطن کی آبرو خطرے میں پڑ گئی اور ملک کو چینی جارحیت کا سامنا کرنا پڑا تو اردو شاعر نے رنگ اور گلال سے نہیں بلکہ لہو سے پھاگ کھیلنا شروع کیا اور دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کیا۔ جنگ کے بارے میں اردو میں نہایت کثرت سے نظمیں کہی گئیں اور اُن کا سلسلہ جاری ہے۔ ان نظموں میں چین کی جارحیت ہی کو عریاں نہیں کیا گیا بلکہ اپنے ہم وطنوں کو اپنے وطن کی آزادی اور جمہوری نظام برقرار رکھنے کی خاطر خون سے ہولی کھیلنے کی تلقین کی گئی ہے۔ نذیر بنارسی اپنی

(بقیہ صفحہ ۵۴ پر)

اترپردیش بجٹ ۶۴-۱۹۶۳ء

اتر پردیش کے وزیر مالیات شری کملاپتی ترپاٹھی نے ۱۵ر فروری ۱۹۶۳ء کو ودھان سبھا میں ۶۴-۱۹۶۳ء کا بجٹ پیش کیا جس میں دفاع کو نمایاں اہمیت دی گئی ہے۔ بجٹ کے تخمینے کے مطابق محاصل سے آمدنی ۲۰۱۱۸۲ کروڑ روپیہ ہے اور اخراجات ۲۰۶۱۷۹ کروڑ روپیہ۔ یعنی ۶۴-۱۹۶۳ء کے بجٹ میں تقریباً ۵ کروڑ روپیہ کا خسارہ ہے۔ بجٹ میں نئے ٹیکس تو نہیں لگائے گئے مگر وزیر مالیات نے اپنی تقریر میں یہ ضرور اشارہ کردیا ہے کہ اخراجات پورا کرنے اور ملک کے بچاؤ کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے نئے ٹیکس لگائے جائیں گے۔

وزیر مالیات نے اپنی تقریر میں کہا کہ آج کے ہنگامی حالات میں ملک کے وقار اور آزادی پر دھیان دینا ضروری ہے۔ یہ کام ملک کو طاقتور بناکر ہی پورا ہوسکتا ہے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ ہنگامی صورت حال کب تک قائم رہے گی۔ اس لئے ہمیں برابر چوکنا رہنا چاہیے اور ملک کی دفاعی کوششوں میں ڈھیل نہ ڈالنا چاہیے۔

وزیر مالیات نے کہا کہ ہم چینی حملہ کو ناکام بنانے میں اس وقت کامیاب ہوسکتے ہیں جب

بجٹ کی خاص خاص باتیں

- مختلف محکموں کے مرمت، بھتے، اتفاقی اور دوسرے اخراجات میں کمی کرنے کے نتیجہ میں بجٹ میں ان مدوں پر ایک کروڑ ۵۲ لاکھ روپیہ کی کفایت کی گئی ہے۔
- یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ لاکمیشن کا کام ملتوی کر دیا جائے، افسروں کا ٹریننگ اسکول بند کر دیا جائے اور ضلع گزیٹروں کا کام ایسے مسودوں کی طباعت تک محدود رکھا جائے جو تیار ہوچکے ہیں۔
- ریاست میں ایک اڈ سینک اسکول کھولنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مسلح افواج میں ایمرجینسی کمیشن حاصل کرنے کے خواہش مند امیدواروں کے لئے ایک ٹریننگ اسکول کھولا جائے گا۔ رائفل ٹریننگ دینے کے خاص انتظامات کئے جائیں گے۔
- نیشنل کیڈٹ کور میں ۰۰ ہزار کیڈٹ بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ پرانتیہ رکشا دل میں بھرتی ہونے والے طلبا کی تعداد میں ۱۵ ہزار کا اضافہ کیا جائے گا۔ ماتحت پولیس فورس میں دو ہزار افراد کا اضافہ کیا جائے گا۔
- آبپاشی کے وسائل کو بہتر بنانے کے

ہمارے کھیتوں اور کارخانوں کی پیداوار بڑھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو ہر قیمت پر ترقیاتی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نسبتاً کم اہم اسکیموں میں ہمیں کچھ رد و بدل کرنا پڑے۔

ملک کے موجودہ ہنگامی حالات میں زرعی پیداوار میں اضافہ کرنا انتہائی ضروری ہے۔ کچھ عرصے حکومت کی کوشش ہے کہ زراعت کی اقتصادی بنیاد مضبوط تر ہوسکے اور کسانوں کا معیار زندگی بلند ہو۔ اس مقصد کے لئے بنیادی طور پر کسانوں کو تین چیزوں کی فراہمی بہت ضروری ہے۔ بیج، کیمیاوی کھاد اور پانی۔ پچھلے برسوں میں شروع کی گئی بیجوں کی فراہمی کی اسکیم پوری ریاست میں مفید ثابت ہوئی ہے۔ بیج سہایتو کو امداد باہمی انجمنوں کے ذریعہ جو خالص بیج سپلائی ہوں گے وہ ۳ روپیہ فی من پریمیم یعنی رعایت کے ساتھ دیئے جائیں گے۔ علاوہ ازیں ہری کھاد پیدا کرنے والے کسانوں کو ساڑھے بارہ فی صدی پریمیم دیا جائے گا جو ۲ روپیہ فی من سے زیادہ نہ ہوگا۔ آئندہ سال ۴ لاکھ ٹن کیمیاوی کھاد تقسیم کرنے کا پروگرام ہے۔ تلہن، جوٹ اور کپاس کی پیداوار بڑھانے پر بھی زور دیا جارہا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ بجٹ کے سال میں تقریباً ۴ لاکھ ۵۶ ہزار ایکڑ کے مزید رقبہ میں آبپاشی کے وسائل کی فراہمی کا امکان ہے۔ آبپاشی کی نالیوں کی جلد تعمیر کے لئے قانون بنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جو کاشتکار مونگ، مسور اور

۴۴ چنا بلی جلی مکا سنئی اور ڈھینچا ۱۵ر جون سے پہلے بوئیں گے ان کو آبپاشی کے خرچ میں ۵۰ فی صدی تک سرکاری امداد دی جائے گی۔

وزیر مالیات نے کہا کہ امداد باہمی انجمنیں بجٹ کے سال میں کسانوں کو ۴۰ کروڑ روپیہ کے مختصر المیعاد قرضے دیں گی۔

زیادہ بجلی پیدا کرنے کے سلسلے میں علاوہ دوسرے کاموں کے ہردوا گنج میں ۳۰ ہزار کلوواٹ کا ایک یونٹ قائم کرنے کا کام جاری ہے اور دیہات میں چھٹی مشین لگانے کی منظوری دی جاچکی ہے۔ مزید دیہی علاقوں میں بجلی فراہم کرنے کے لئے تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ ریاستی بجلی بورڈ نے ہردوا گنج میں ۶۰ ہزار کیلوواٹ بجلی پیدا کرنے کی ایک دوسری اسکیم بنائی ہے۔ چرک سیمنٹ فیکٹری کی سیمنٹ کی پیداوار جلد ہی ۴۰۰ ٹن ہو جائے گی۔ گورنمنٹ پری سیزن انسٹرومنٹ فیکٹری کی پیداواری صلاحیت تین گنی کی جارہی ہے۔

ہنگامی صورت حال کے پیش نظر صنعتی ریاستوں کو جلد از جلد مکمل کرنے اور واحدوں کو صنعت کاروں میں بانٹنے کا کام اولیت کے ساتھ انجام دیا جائے گا۔

شری کملاپتی ترپاٹھی نے کہا کہ مالیاتی سال میں سڑکوں اور پلوں کے پروگرام کے لئے تقریباً ۶ کروڑ ۵۵ لاکھ روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے۔ اس میں اترا کھنڈ شامل نہیں ہے۔ تکنیکی عملہ کو بڑھانے کے لئے جو اقدامات کئے جارہے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے وزیر مالیات نے بتایا کہ انجینیروں اور ڈاکٹروں وغیرہ کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ انھوں نے

اقدامات کے نتیجہ میں مزید ۴ لاکھ ۵۶ ہزار ایکڑ اراضی کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم ہو سکیں گی۔

● زراعتی پیداوار بڑھانے کے لئے بجٹ کے سال میں چار لاکھ ٹن کیمیاوی کھاد تقسیم کی جائے گی۔

● انجینیرنگ کالجوں اور طبی تعلیم کے اداروں میں داخلہ لینے والے لائق طلبا کو وظیفے دینے کے لئے موجودہ بجٹ میں مقرر کی گئی ۲ لاکھ روپیہ کی رقم کو بڑھا کر بجٹ کے سال میں ۵ لاکھ روپیہ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح رڑکی انجینیرنگ یونیورسٹی میں لیاقت اور وسائل کی بنیاد پر دیے جانے والے وظیفوں کی تعداد بڑھا دی گئی ہے۔ گورکھپور انجینیرنگ کالج اور ضرورت کے مطابق ریاست کے ایسے ہی دوسرے اداروں کو بھی یہ سہولتیں دی جائیں گی۔

● آگرہ، کانپور، لکھنؤ اور الہ آباد کے میڈیکل کالجوں میں بھرتی کئے جانے والے طلبا کی تعداد آئندہ تعلیمی سال سے ۲۵ فی صدی بڑھا دی جائے گی۔ میرٹھ میں بھی ایک میڈیکل کالج قائم کیا جائے گا۔ میڈیکل کالجوں کے ضرورتمند طلبا کو قرضے دینے کا خاص بندوبست کیا گیا ہے۔

● رڑکی انجینیرنگ یونیورسٹی اور وہاں باغ کے ٹیکنیکل ٹریننگ کالج میں داخل کئے جانے والے طلبا کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا۔ محکمہ صنعت کے زیر انتظام پالی ٹیکنیک اداروں اور صنعتی تربیت کے اداروں میں اور زیادہ طلبا بھرتی کئے جائیں گے۔

بتایا کہ انجینیرنگ کالجوں اور میڈیکل کالجوں کے لائق طلبا کو وظیفے دینے کے لئے بجٹ میں ۵ لاکھ روپیہ کی رقم متعین کی گئی ہے۔ یہ سہولتیں رڑکی انجینیرنگ یونیورسٹی اور گورکھپور انجینیرنگ کالج کے طلبا کو بھی دی جائیں گی۔ ریاست کے چار میڈیکل کالجوں میں آئندہ تعلیمی سال سے ۲۵ فی صدی زیادہ طلبا کا داخلہ ہو سکے گا۔ رڑکی یونیورسٹی اور وہاں باغ ٹیکنیکل ٹریننگ کالج میں بھی اور زیادہ طلبا داخل کیے جائیں گے۔ یونیورسٹی کو ایم۔ ایس۔ سی میں ۵۰ فی صدی تک مزید داخلے کرنے کی اجازت دی جائے گی۔

وزیر مالیات نے کہا کہ آج فوجی ٹریننگ اور تعلیمی پروگرام پر خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے اس لئے نیشنل کیڈٹ کور میں ۸۰ ہزار کیڈٹ بھرتی کئے جائیں گے اور پرانتیہ رکشا دل میں بھرتی ہونے والے طلبا کی تعداد میں ۵ ہزار کا اضافہ کیا جائے گا۔ سرحدی ضلعوں میں شہری دفاع کی سرگرمیاں تیز تر کرنے کے لئے موجودہ تین مرکزوں کے علاوہ تین اور مرکز کھولے جائیں گے۔

رائفل ٹریننگ کے لئے ۴ ضلعوں کے ۱۰۸ رائفل ٹریننگ سنٹروں کی طرح دوسرے ضلعوں میں بھی ایسے ہی سنٹر کھولے جائیں گے۔ پولیس کے معاون دستہ کی حیثیت سے کام کرنے اور اندرونی تحفظ کے لئے ہوم گارڈ کی تنظیم کی جارہی ہے۔

ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اسلحہ جات اور دوسرے ساز و سامان سے لیس ریاستی مسلح کانسٹبلوں کی ایک نئی بٹالین بنانے کے احکام جاری کر دیے گئے ہیں۔ ماتحت پولیس

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۰)

لڑائی کی ڈائری

۱۵ جنوری ۱۹۶۳ء سے ۱۳ فروری ۱۹۶۳ء تک

۱۵ جنوری — مسز بندرا نائیکے وزیراعظم سیلون دہلی سے (براہ بمبئی) کولمبو کے لیے روانہ ہوگئیں۔ وزیر انصاف غانا بھی دہلی سے روانہ ہوگئے۔ وہ دہلی سے پیکنگ جائیں گے۔ وزیراعظم مصر مسٹر علی صابری قاہرہ روانہ ہوگئے۔ یہ تینوں نمائندے کولمبو کانفرنس کی تجاویز کی تشریح کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ ● مشرقی جرمنی کے کمیونسٹ لیڈر مسٹر اُلبرک نے کمیونسٹوں کے بین اقوامی اجتماع میں اس امر پر افسوس ظاہر کیا کہ چین نے ہندوستان کی سرحد پر جنگی اقدامات شروع کر دیے۔

۱۶ جنوری — معلوم ہوا ہے کہ ایک امریکی فوجی کمیشن کی تشکیل ہوئی ہے جو ہندوستان پہنچ کر ہندوستان کے فضائی دفاع کے مسائل پر غور کرے گا۔ ● پاکستان کے اور ہندوستانی وفد سے متنازعہ فیہ مسائل بالخصوص کشمیر کے مسئلے پر بات چیت شروع ہوگئی۔

۱۷ جنوری — امریکی سفیر متعینہ ہند مسٹر گلبریتھ نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ اگر ہندوستان کو فائدہ پہنچ رہا ہو تو امریکی رائے عامہ چین اور ہندوستان کی باہمی گفت و شنید کی کبھی مخالفت نہ کرے گی۔ ● ہندوستان — پاکستان مذاکرات جاری رہے۔ ● وزیراعظم نہرو نے دہلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کولمبو تجاویز کا جو بھی حشر ہو قوم کو آئندہ ہوشیار رہنا چاہیے۔ چین سے عرصے تک خطرہ قائم رہے گا۔

۱۸ جنوری — مشرقی جرمنی کمیونسٹ کانگریس میں چین کے نمائندے نے جب ہندوستان کے خلاف بولنا شروع کیا تو دوسرے کمیونسٹ ملکوں کے نمائندوں نے عام طور سے اپنی ناپسندگی کا اظہار کیا۔ ● وزیراعظم نہرو نے نیشنل ڈپلیمنٹ کونسل کی اسٹینڈنگ کمیٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اقتصادی ترقی دفاعی کوششوں کا ایک جز ہے۔

۱۹ جنوری — کولمبو کانفرنس کی تجاویز شایع کر دی گئیں۔ تجاویز میں کہا گیا ہے کہ مغربی مورچے پر چینی فوجیں ۲۰ کیلومیٹر پیچھے ہٹ جائیں۔ مشرقی مورچے پر واقعی قبضے کا خط جنگ بندی کا خط قرار دیا جائے۔ وسطی مورچے کی سرحد کے سلسلے میں پرامن ذرائع کام میں لائے جائیں۔ کانفرنس کی تجویزوں میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مقصد دونوں ملکوں کو باہمی گفت و شنید پر راضی کرنا ہے اور سرحد کے تعین سے انھیں سروکار نہیں۔ ● ملایا کے ہائی کمشنر نے وزیراعظم نہرو کو ہندوستان کے دفاع کے سلسلے میں دس لاکھ کا چیک پیش کیا۔ ● حکومت ہند نے چین کے اس الزام کی تردید کی کہ ہندوستانی سپاہیوں نے سکم اور چین کی سرحد کی خلاف ورزی کی۔ ● چینی فوجوں نے ٹوانگ اور کیبیٹو کے علاوہ نیفا میں دوسرے علاقوں کو خالی کر دیا ہے۔

۲۰ جنوری — دہلی میں شہریوں نے ایک شاندار تقریب میں ملک کی حفاظت کرنے اور اس کی آزادی قائم رکھنے کا عہد کیا۔ ● چینی خبر رساں ایجنسی کے مطابق چینی فوجوں نے نیفا میں ۷ نومبر ۱۹۵۹ء کے "واقعی قبضے کے خط" تک کا علاقہ خالی کر دیا ہے۔

۲۱ جنوری — چین کے نائب وزیراعظم اور وزیر خارجہ مارشل چن لی نے اعلان کیا کہ حکومت چین اصولی طور پر کولمبو تجاویز منظور کرتی ہے۔ ● وزیر دفاع حکومت ہند نے لوک سبھا میں بتایا کہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء کے حملے کے بعد نیفا اور لداخ میں ۲۰ ہندوستانی افسر اور ۳۰۲ سپاہی لڑائی میں جان سے گئے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کل ۲۲۸ ہندوستانی

دولت جمہوریہ ہند نے چینی ۔ ہندی تنازعہ کو ختم کرنے کے لئے گفت و شنید کی بنیاد قرار دیا ہے ۔

۷ ر فروری ۔ حکومت جمہوریہ ہند نے سابق ڈپٹی کمشنر تیز پور ڈاکٹر داس کو ملازمت سے برطرف کر دیا ہے کیونکہ چینی فوجیں جب تیز پور کے قریب پہنچیں تو وہ حکومت کی اجازت کے بغیر اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوکر تیز پور سے بھاگ گئے ۔ ● ایک چینی اخبار "ہیا منا یکو ڈیلی" نے ایک نقشہ شایع کیا ہے جس میں روس میں واقع کچھ پہاڑوں کو چین کی مملکت میں واقع قرار دیا ہے ۔ ● چین نے کچھ عرصے سے برما ویٹنام جنوبی کوریا روس بیرونی منگولیا اور کشمیر کی سرحدوں پر تیزی سے سڑکیں بنانا شروع کر دی ہیں ۔ چین کی وسعت پسند پالیسی کے پس منظر میں یہ سرگرمیاں بڑی معنی خیز بتائی گئی ہیں ۔

۸ ر فروری ۔ کمبوڈیا کے سربراہ شہزادہ سہانوک نے ہندوستان سے روانگی کے وقت کلکتہ میں اخبار نویسوں سے کہا کہ میرا خیال ہے اگر چین نے کولمبو تجاویز کو کلی طور پر منظور نہیں کیا تو کولمبو کانفرنس میں شریک ہونے والے ممالک کو اپنے دوسرے اقدام کرنے کے لئے پھر جمع ہونا پڑے گا ۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں چین جاکر وہاں کے لیڈروں کو اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کروں گا کہ ہندوستان کی طرح وہ بھی کولمبو تجاویز کو پوری طرح منظور کرلیں ۔

۹ ر فروری ۔ حکومت ہند نے اعلان کیا کہ گولڈ بانڈ کی خریداری (سونے کے سکوں اور سونے کے زیورات کی شکل میں) ۲۸ فروری تک جاری رہے گی ۔ ● ہندوستان کے ناظم الامور متعینہ چین ڈاکٹر بنرجی پیکنگ واپس پہنچ گئے ۔ ● وزیر دفاع حکومت ہند نے بمبئی میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کو چین کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے عرصے تک تیار رہنا پڑے گا ۔ ● نیشنل ڈیفنس فنڈ میں چندے کی رقم کی تعداد ۹۳ ، ۳۹ کروڑ ہو چکی ہے ۔

۱۰ ر فروری ۔ نیو چائنا نیوز ایجنسی نے اطلاع دی کہ چینی ریڈکراس نے ہندوستانی ریڈکراس کو ۹۱۵ ہندوستانی اسیران جنگ کی مزید فہرست بھیجی ہے ۔

۱۱ ر فروری ۔ روس کے بھیجے ہوئے چار مگ ہوائی جہاز ایک روسی سمندری جہاز کے ذریعہ بمبئی کی بندرگاہ پہنچ گئے ۔ ● یوگوسلاویہ کے صدر (پریسیڈنٹ) ٹیٹو نے وزیر اعظم نہرو کو ایک خط بھیجا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس خط میں یہ بتایا گیا ہے کہ یوروپ کے اکثر کمیونسٹ ملک ہندوستان کے خلاف چین کی جارحیت پر بہت متوحش ہیں ۔

۱۲ ر فروری ۔ حکومت چین کے صدر لیو شاؤ چی نے پیکنگ میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کولمبو کانفرنس کی تجویزیں ہندوستان اور چین کے مابین براہ راست گفت و شنید میں ایک رکاوٹ ہیں ● حکومت ہند نے چین کے اس الزام کی تردید کی ہے کہ ہندوستانی فوجیں لداخ میں اسپانگر جھیل کے قریب چینی علاقے میں داخل ہوگئی تھیں ۔ ● کمبوڈیا کے سربراہ شاہزادہ سہانوک وزیر اعظم چین سے کن منگ میں اہم گفتگو کرنے کے بعد پیکنگ آگئے ۔ ● وزیر اعظم مصر شری علی صابری نے کہا کہ کولمبو تجاویز کے بارے میں میں نے وزیر اعظم چین کو جو پیغام بھیجا تھا اُن کے جواب کا ابھی منتظر ہوں ۔

۱۳ ر فروری ۔ وزارت خارجہ ہند کے ایک نمائندے نے صدر چین کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ دراصل حکومت چین کا رویہ ہندوستان اور چین کے مابین براہ راست گفتگو میں ایک رکاوٹ بنا ہوا ہے اور چین کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حملے سے اسے جو فائدہ پہنچا ہے اس سے دست کش نہ ہو ۔ ● امید کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں بنا ہوا پہلا ٹینک ۱۹۶۵ء میں تیار ہو جائے گا ۔ ● اطلاعیں موصول ہوئی ہیں کہ تبت میں سرحدی علاقوں میں چین نے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں شہریوں کا لباس پہنا کر اپنے سپاہی متعین کر دئے ہیں ۔

۱۴ ر فروری ۔ آل انڈیا ریڈیو سے ایک الوداعی پیغام براڈکاسٹ کرتے ہوئے شاہ یونان نے کہا کہ یونان کو ہندوستان کی اس جنگ کی اہمیت کا پوری طرح احساس ہے اور یونان اس معاملے میں ہندوستان کے ساتھ ہے ۔ ● گولڈ کنٹرول بورڈ کی نئی دہلی میں میٹنگ ہوئی ۔



ہند-چین سرحد کا وسطی علاقہ

نریندر سنگھ بھنڈاری

ہندوستان اور چین کی سرحد کا وسطی علاقہ پنجاب میں ضلع کانگڑہ سپیتی وادی اور لاہول سے لے کر اتر پردیش میں ضلع پتھورا گڑھ کے سنگچا ملا اور لیپتھل اور چھولی کے بارہ ہوتی تک پھیلا ہوا ہے۔

اس علاقہ کے بارے میں دونوں ملکوں میں کسی قسم کی نزاع کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیوں کہ ہندوستانی اور چینی نقشوں میں اس علاقہ کی جو سرحدیں دکھائی گئی ہیں ان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ مذکورہ بالا تمام مقامات ہمالیہ کے اصل سلسلہ کے جنوب میں واقع ہیں اور یہاں صدیوں سے ہندوستان کے موثر انتظامی کنٹرول کے ثبوت موجود ہیں۔ یہ مقامات کبھی بھی چین یا تبت کے زیر اثر نہیں رہے ہیں۔ چھٹی صدی قبل مسیح سے بیسویں صدی میں کومنتانگ دور حکومت تک چینی نقشوں میں وسطی علاقہ کی سرحد وہی دکھائی گئی ہے جو روایتی ہے اور جس کا اعلان ہندوستان کی جانب سے بھی کیا جا چکا ہے۔

پنجاب میں سپیتی وادی قدیم زمانہ میں ہندو راجاؤں کی عملداری میں تھی اور یہاں پانی کے دھارے کی بنیاد پر متعین سپیتی علاقے کی سرحدی خط کی تصدیق مورکرافٹ (۱۸۱۹) جیوارڈ (۱۸۲۱) اور ٹامس ہٹن (۱۸۳۸) وغیرہ سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں بھی کی ہے۔ اسی طرح شپکی درہ بھی تبت اور بوشہر اسٹیٹ کی روایتی سرحد پر واقع ہے۔

جہاں تک ہند-چین سرحد کا سوال ہے یہاں گنگا اور ستلج ندیاں ہی روایتی سرحد مانی گئی ہیں۔ تاریخ وادب بھی اس روایتی سرحد کے شاہد ہیں اور اسکند پوران میں بھی اس کا واضح طور سے ذکر ملتا ہے۔ سنہ ۶۳۴ء قبل مسیح میں سیاح ہیون سانگ کے سفرنامہ اور کمایوں اور گڑھوال کے کتیوری حکمرانوں کے عہد کی تانبہ کی تختیوں کی عبارت سے بھی اس سرحد کی توثیق ہوتی ہے۔

ہندوستان کے مالگزاری بندوبست میں بھی وسطی علاقہ سنہ ۱۸۱۵ء سے ہی شامل ہے۔ سپیتی علاقہ سنہ ۱۸۴۹ء کے بندوبست میں بھی شامل ہے اور سنہ ۱۸۵۰ء اور سنہ ۱۸۷۹ء میں اس علاقہ کا جغرافیائی سروے بھی کیا گیا۔ اس کے جنوب میں شپکی درہ تک کا علاقہ ہندوستان کے نامگیا گاؤں کا حصہ رہا ہے اور سنہ ۱۸۶۸ء، سنہ ۱۹۰۹ء، سنہ ۱۹۱۴ء اور سنہ ۱۹۲۰ء میں اس کا سروے کیا گیا۔ حکومت ہند اس درہ تک ہندوستان-تبت سڑک کی برابر دیکھ بھال کرتی چلی آئی ہے۔

ہندوستان اور چین کے سرحدی معاہدوں سے بھی وسطی علاقہ کی اس روایتی سرحد کی تصدیق ہوتی ہے۔ سنہ ۱۸۴۲ء میں کشمیر، تبت اور چین کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں متفقہ طور سے یہ طے ہوا تھا کہ چین اور تبت، لداخ اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں جس میں وسطی علاقہ بھی شامل ہے کی قدیم اور روایتی سرحدوں میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔

جھگڑے کی ابتدا

اس علاقہ میں سرحدی جھگڑے کی ابتدا سنہ ۱۹۵۴ء میں بھارت اور چین کے درمیان تبت کے سمجھوتہ سے متعلق بات چیت کے وقت ہوئی۔ جب چینیوں نے اس علاقہ کے چھ دروں یعنی شپکی، مانا، نیتی، کنگری، دنگری، دارما اور لپولیکھ پر دعویٰ کیا تو ہندوستان نے اس کی سخت مخالفت کی اور آخر میں یہ طے ہوا کہ دونوں ملکوں کے بیوپاری ان دروں سے ہو کر آ جا سکتے ہیں۔

لیکن سمجھوتہ کے کچھ ہی عرصہ بعد ۱۷ جولائی سنہ ۱۹۵۴ء کو چین کی حکومت نے بارہ ہوتی میں ہندوستانی فوجیوں کی موجودگی کی مخالفت کی اور ایک سال بعد وہاں اپنا فوجی دستہ بھیج دیا۔

سنہ ۱۹۵۸ء میں بارہ ہوتی کے مسئلہ پر دونوں ملکوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں چین نے یہ دعویٰ کیا کہ بارہ ہوتی چین کا حصہ ہے جو مشرقی

مغرب اور جنوب میں ہندوستانی علاقہ سے گھرا ہوا ہے اور جو جنوب سے مشرق تک تقریباً ۸ کلو میٹر اور مشرق سے مغرب تک اس سے کچھ کم ہوگا اس حصہ کا چینی نام "دوجے" بتایا گیا او چینیوں کے قول کے مطابق اس کا رقبہ تقریباً ۲۰ مربع کلو میٹر ہے۔

اس کانفرنس میں ضلع پتھورا گڑھ میں سانگچا ملا اور لپتھل کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ تاریخ میں نہ تو کبھی تبت اور نہ پیکنگ ہی کی حکومت نے اس علاقہ پر دعویٰ کیا لیکن جس طرح ۱۹۵۴ء کی کانفرنس کے بعد چینیوں نے بارہ ہوتی میں اپنا ایک دستہ بھیج دیا اسی طرح ۱۹۵۸ء کی کانفرنس کے کچھ ہی دنوں بعد انھوں نے ان مقامات پر بھی ہندوستانی چوکیوں کے قریب ہی اپنے فوجی خیمے نصب کر دیے۔

اس کے بعد تو چین نے بارہ ہوتی، سانگچا ملا اور لپتھلا کو ایک ساتھ ملا کر دکھانا شروع کیا اور کہنے لگے کہ یہ پورا علاقہ جس کا رقبہ ۳۰۰ مربع میل ہے چین کا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ بارہ ہوتی یا نام نہاد "دوجے" میں چین کا انتظامی دستہ کبھی نہیں رہا ہے اور سانگچا ملا اور لپتھل ہمیشہ سے ضلع پتھورا گڑھ کے موضع ملم کی چراگاہ رہے ہیں۔

دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کی دہلی میں ۱۹ سے ۲۵ اپریل ۱۹۶۰ء تک کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں اس وسطی علاقے کے سرحدی خطہ کے بارے میں بات چیت ہوئی تھی۔ کانفرنس میں یہ طے ہوا کہ دونوں ملکوں کے افسران مل جل کر دستاویزات اعداد و شمار اور دوسرے متعلقہ ثبوت کی بنیاد پر بات چیت کریں اور اپنی مشترکہ رپورٹ پیش کریں۔ اس کے نتیجہ میں پہلے پیکنگ میں پھر دہلی میں اور آخر میں رنگون میں دونوں ملکوں کے افسروں کی کانفرنس ہوئی اور اس کی رپورٹیں چینی اور ہندوستانی کو پیش کی گئیں۔ وسطی علاقہ کے متعلق چین نے دس سوالوں کی صورت میں تشریحات طلب کیں جن کا باقاعدہ جواب چین کو دے دیا گیا لیکن جب ہندوستان کی طرف سے ۱۵ سوالوں کی صورت میں تشریحات طلب کی گئیں تو ان میں سے صرف ۲۲ سوالوں کے جواب موصول ہوئے۔ بقیہ سوالات کا جو ان علاقوں کی جغرافیائی حالات کے بارے میں تھے جن پر چین نے دعویٰ کیا تھا آج تک کوئی جواب نہیں دیا گیا۔



اردو شاعری میں ہولی

(بسلسلہ صفحہ ۴۶)

ایک نظم "منالیں پہلے ہولیاں، دیوالی پھر منائیں گے" کے ایک بند میں پوری قوم سے یوں مخاطب ہو رہے ہیں:-

لہو سے پھاگ کھیل کر، گھروں کو جگمگا بیں گے
شکست دے کے دشمنوں کو قہقہے جلائیں گے
منالیں پہلے ہولیاں، دوالی پھر منائیں گے
صفوں کو چیر چیر کر مصیبتوں کو ریل دو
جدھر سے جنگ آئی ہے، اُدھر اُسے ڈھکیل دو

شمیم کرہانی آج کے پھاگن میں "جیون رس" برسانے کے قائل ہیں۔ اُن کی ہولی میں محبت، اتحاد، پریم اور آشتی کا رنگ بکھرتا نظر آتا ہے۔ تبھی تو اپنی ایک نظم "میرے وطن! اے میرے وطن!" کے بند میں یوں فرماتے ہیں:-

تیرے چمن میں دن دن اُٹھتے رنگ و بو کی ڈولی
رہے بسنتی آنچل تیرا، بھرے گلوں سے جھولی
"جیون رس" برسائے پھاگن، رنگ اُڑائے ہولی
جو نفرت کی آنکھ سے دیکھے، مار دے اُس کو گولی
میرے وطن! اے میرے وطن!

اتر پردیش شاہ راہِ ترقی پر

زراعت اور آب پاشی کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کی کوشش ـــــ اسکولوں کو سرکاری امداد ـــــ شہد کی مکھیاں پالنے کی ٹریننگ ـــــ متفرقات

یو۔پی کیبنٹ کی ذیلی کمیٹی نے ابھی حال میں ایسے فیصلے کئے ہیں جن کے نتیجہ میں بہت سی وہ دشواریاں دور ہو جائیں گی جو زرعی پیداوار کے اضافہ میں حائل ہیں۔ ذیلی کمیٹی نے مسئلہ کو جڑ سے حل کرنے کی کوشش کی ہے امید ہے کہ اب زرعی پیداوار میں اضافہ شروع ہو جائے گا۔

اس نے حکم دیا ہے کہ ہر ٹل کنوئیں آپریٹر اور نہر پیٹرول کے لئے پانی کے استعمال کا نشانہ مقرر کر دیا جائے اور اس نے پردھانوں کو اختیار دید یا ہے کہ وہ ان کے اعمال نامہ میں اندراجات کر سکیں۔

مجلس قانون ساز کے آئندہ اجلاس میں کیٹی کے تحفظ کا ایک بل پیش کیا جا رہا ہے جس کی رو سے حکام کو یہ اختیار ہو جائے گا کہ جو کسان منصوبہ کے مطابق مٹی کے تحفظ کا عمل پورا نہیں کر پاتے ان کے کھیتوں میں مٹی کے تحفظ کے لئے مفید اور موثر اقدامات کئے جا سکیں۔ ایک اور بل کے ذریعہ حکومت کو یہ اختیار مل جائے گا کہ جہاں گاؤں پنچایتیں ناکام رہیں وہاں حکومت ان کی جانب سے کھیتوں میں نالیاں بنوائے اور ان کے اخراجات قسطوں میں وصول کرے۔

کمیٹی نے نہروں کے علاقوں میں نجی پکے کنوئیں بنانے کی اجازت دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ٹل کنوؤں کے علاقوں کی حدیں کم کر دینے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔

اب محکمہ زراعت کے افسران محکمہ آبپاشی سے وابستہ کر دئے جائیں گے اس طرح وہ آبپاشی کے عملہ سے تعاون کرتے ہوئے زراعت کے بہتر طریقے رائج کر سکیں گے۔ ان اشیاء کے الاٹمنٹ میں جن پر کنٹرول ہے جیسے اینٹیں اور سیمنٹ شہری دفاع کے بعد چھوٹی آبپاشی کی اسکیموں کو اہمیت دی جائے گی۔

قابل کاشت آراضی کے زیادہ سے زیادہ رقبہ سے فائدہ اُٹھانے کے پیش نظر ذیلی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس سے متعلق خاتمہ زمینداری اور اصلاحات آراضی قانون میں جو دفعات ہیں ان کو سختی سے نافذ کیا جائے۔

ذیلی کمیٹی کے دوسرے فیصلے حسب ذیل ہیں:۔

گرام سیوکوں کو مٹی کے تحفظ کی ٹریننگ دی جائے گی۔

پانچ میل سے کم کی نالیاں شرم دان سے بنیں گی اور اگر لوگ شرم دان سے از خود نہ بنا سکیں تو محکمہ آبپاشی پرانتیہ رکھشک دل اور ڈیفنس لیبر بینک کے شرم دان سے بنوا دے گا۔

اگر سینچائی کے سلسلہ میں عوام کی شکایت پر فوراً توجہ نہ کی گئی تو متعلقہ سرکاری عملہ کو صرف تنبیہہ نہیں کی جائے بلکہ سزا بھی دی جائے گی۔

سڑک کے کنارے محکمہ تعمیرات عامہ کے جو کنوئیں ہیں وہ بھی آبپاشی کے لئے استعمال کئے جا سکیں گے۔ کنوئیں کی مرمت کے لئے ایک مہم شروع کی جائے گی۔ اگر کوئی شخص حکومت سے قرضہ

لئے بغیر کنواں بناتا ہے اور اس کے بعد گلانے کے لئے امداد کے واسطے درخواست دیتا ہے تو اسے اس کی تعمیر کیلئے جتنا قرضہ ملتا اتنی ہی رقم بطور امداد ملے گی۔ پکے کنوؤں کو بھی مقبول بنایا جائے گا۔ پکے کنوؤں کی تعمیر کے لئے بڑے کاشتکاروں کے مقابلہ میں چھوٹے کاشتکاروں کو جو مل کر کنواں بنائیں زیادہ امداد دی جائے گی۔

نجی ٹیوب ویلوں کو بجلی دینے کے واسطے ۱۰ ایکڑ کی موجودہ حد گھٹا کر ۱۰ ایکڑ کر دی جائے گی۔ ایسے ٹیوب ویلوں کو رات کے اوقات کے لئے بجلی دی جائے گی۔

گاؤں کی تعمیر کے لئے ایک پروگرام بنایا گیا ہے جو کئی مرحلوں میں پورا کیا جائے گا۔ گشت کرنے والوں اور ٹیوب ویل آپریٹروں کو زراعتی ترقی کی ٹریننگ دی جائے گی۔ اور ان کو کیمیاوی کھاد

عائد کر سکتی ہے۔

پبلک کاموں کے لئے جہاں تک ممکن ہوگا غیر مزروعہ زمین حاصل کی جائے گی۔ ترقیاتی عملہ کے کیرکٹر رول میں زراعتی پیداوار بڑھانے میں ان کی کارگزاری کی بنیاد پر اندراجات کئے جائیں گے۔

بھیڑوں کی نسل بہتر بنانے کیلئے اگلے پانچ برسوں میں تقـ تین ہزار مینڈھے باہر سے منگوائے جائیں گے۔ اس پر ۳۰ لاکھ خرچ ہوگا۔ ڈیفنس آف انڈیا رولس کے تحت تین سال سے کم عمر کی بھیڑو ذبیحہ ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔ ہر ہفتہ میں منگل اور جمعہ کو اور بکری کے گوشت کی فروخت بھی ممنوع کر دی جائے گی۔

ذیلی کمیٹی نے یہ تجویز منظور کر لی ہے کہ ٹیوب ویل آپریٹروں کی کارگزاری کی بنیاد پر نقد بونس دئے جائیں۔ کمیٹی نے یہ بھی کیا ہے کہ برسات کے بعد ٹیوب چلانے کے سلسلہ میں ان کی جانـ

> "اہنسا پر ہمارے اعتقاد کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جارحیت کے سامنے بزدلی کے ساتھ سرخم کر دیا جائے۔ اہنسا کے معنی ہیں اپنے دماغ میں تشدد یا دلوں میں نفرت کا خیال لائے بغیر باطل سے مقابلہ کرنا۔"
>
> ——— صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن

کے استعمال۔ ہری کھاد اور پھل دار فصلوں کے زیر کاشت علاقہ میں اضافہ اور آبپاشی کے پانی کے مناسب استعمال کے لئے ذمہ دار بنایا جائے گا۔

حکومت کسانوں سے ساڑھے بارہ فیصدی منافع پر ہری کھاد کے بیج خریدے گی۔ ایک ایسی مہم شروع کی جائے گی کہ اترپردیش میں ہر سیراب ایکڑ میں کھاد استعمال کی جائے۔ کسانوں کو مٹی کے تجزیہ کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔

محکمہ زراعت گیہوں اور جو کے ساتھ اناج کی دوسری فصلوں پر بھی پوری توجہ دے گا۔

امداد باہمی یونینوں کو بہتر قسم کے بیجوں کی خریداری پر تین روپیہ فی من کی چھوٹ دی جائے گی تاکہ وہ غریب کسانوں کی مدد کر سکیں۔

حکومت میونسپل کارپوریشنوں اور بورڈوں کے علاقوں میں فی گائے اور فی بھینس ۵ روپیہ اور فی بکری ۲ روپیہ بطور لائسنس فیس

لئے قطعی تاریخیں مقرر کی جائیں۔

طلبا کو مزید سہولتوں کی فراہمی اور سائنس کی تعلیم کی ہمت افزائی کے لئے حکومت اترپردیش نے ۱۶۱ ہائر سیکنڈری اسکولوں کو جن میں لڑکیوں کے ۴ اسکول شامل ہیں مزید ۲ لاکھ ۴۰ ہزار روپیہ کی غیر مکرر مالی امداد منظور کی ہے۔

ہر اسکول کو اس شرط کے ساتھ ۱۵ ہزار روپیہ کی امداد ملے گی لڑکوں کے اسکول کو سرکاری امداد کے برابر اور لڑکیوں کے اسکول کو اس کی ایک تہائی رقم اپنے پاس سے دینا پڑے گی۔

یہ مالی امداد نئی تجربہ گاہوں اسٹور روم اور ڈارک روم وغیرہ کی تعمیر پر صرف کی جائے گی۔

جن اسکولوں کو مالی امداد منظور کی گئی ہے ان کے نام یہ ہیں۔ جی۔ ٹی اسکول بجوریا۔ سہارنپور۔ ڈی۔ اے۔ وی اسکول مظفرنگر۔ کیرا اسکول

ڈبائی ۔ بلند شہر ۔ پی ۔ بی ۔ اے ۔ ایس اسکول ہاتھرس ۔ علی گڑھ ۔ جی ۔ اے ۔ ایس اسکول فرید پور بریلی ۔ دیوی سید اسکول شاہ جہاں پور ۔ ایس ۔ کے ۔ پی ۔ اسکول الہ آباد ۔ کانیہ کبج اسکول لکھنؤ ۔ ہند اسکول نرولی ۔ بارہ بنکی ۔ ڈی ۔ اے ۔ اسکول گورکھپور ۔ ایس ۔ جی ۔ ایس ۔ اسکول دیوریا ۔ خیر انڈسٹریل اسکول بستی ۔ اے ۔ کے ۔ پی ۔ اسکول خورجہ ۔ بلند شہر ۔ بسنت کنیا اسکول وارانسی ۔ اے کے پی اسکول ہردوئی اور گرلز اسکول ایلگن روڈ الہ آباد ۔

حکومت اتر پردیش نے ضلع نینی تال میں جیولی کوٹ کے شہد کی مکھیاں پالنے کے مرکز میں شہد کی مکھیاں پالنے سے متعلق دو تربیتی نصاب شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے ۔ ان میں سے ایک نصاب کی مدت ۳ ماہ ہوگی جو ۱۵؍ فروری ۱۹۶۳ء سے شروع ہوگا ۔ دوسرا نصاب جس کی مدت چھ ہفتے ہوگی ۲؍ مئی ۱۹۶۳ء سے شروع ہوگا ۔ یہ تربیت مفت دی جائے گی اور مرد اور عورتیں دونوں یہ تربیت حاصل کر سکیں گے ۔

اس ٹریننگ میں داخلہ کے لئے کوئی تعلیمی استعداد مقرر نہیں کی گئی ہے لیکن امیدواروں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ پڑھے لکھے ہوں اور لکچر کے نوٹ لے سکتے ہوں جو ہندی میں دئے جائیں گے ۔ داخلہ میں بہرحال ان افراد کو ترجیح دی جائے گی جن کو شہد کی مکھیاں پالنے کا کچھ تجربہ ہوگا ۔ ٹریننگ ختم ہونے پر ایک امتحان لیا جائے گا اور کامیاب امیدواروں کو سرٹیفکٹ دئے جائیں گے ۔

جیولی کوٹ مرکز میں محدود تعداد میں تربیت پانے والوں کے لئے مفت رہائش کا انتظام ہے لیکن انھیں اپنے کھانے کا بندوبست خود کرنا ہوگا ۔

داخلہ کے لئے درخواستیں معمولی کاغذ پر نام ۔ عمر ۔ پتہ ۔ تعلیمی استعداد اور ٹریننگ کے کورس کی تفصیلات کے ساتھ بھیجی جا سکتی ہیں ۔ دوسرے نصاب کے لئے درخواستیں ۱۵؍ اپریل ۱۹۶۳ء تک شہد کی مکھیاں پالنے کے ریاستی نگراں ڈاک خانہ جیولی کوٹ ۔ ضلع نینی تال کے پاس پہنچ جانا چاہئیں ۔

متفرقات

حکومت اتر پردیش نے ٹیکنیکل تعلیم کی کل ہند کونسل کے ذریعہ دیے جانے والے سول انجینیرنگ سرٹیفکٹ کو محکمہ شہری اور دیہی منصوبہ بندی میں اوورسیروں اور سروے اسسٹنٹوں کی جگہوں پر تقرری کے لئے تسلیم کر لیا ہے ۔

بورڈ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن یو ۔ پی کے ذریعہ لئے جانے والے فائنل ڈپلوما اور سرٹیفکٹ کے امتحانات آئندہ یکم اپریل سے شروع ہونگے ۔ ان کورسوں کے پہلے اور دوسرے سال کے امتحانات ۱۹؍ اپریل ۱۹۶۳ء سے شروع ہوں گے ۔

آخری سال کے عملی امتحانات ۱؍ مارچ اور ۲۵؍ مارچ کے درمیان اور پہلے اور دوسرے سال کے امتحانات مئی کے اول ہفتہ کے اندر منعقد ہوں گے ۔ آخری سال کا پروجیکٹ امتحان ۱۸؍ اپریل سے شروع ہوگا ۔

ٹیکنیکل ایجوکیشن بورڈ کے سکریٹری نے ایک پریس نوٹ میں پہلے اور دوسرے سال کے امتحانات میں شرکت کے خواہشمند پرائیوٹ امیدواروں کو صلاح دی ہے کہ وہ اپنے داخلہ کارڈ اور دیگر معلومات حاصل کرنے کے لئے ۲۵ اور ۳۰ مارچ کے درمیان ان اداروں کے افسران اعلیٰ سے رجوع کریں جہاں انھوں نے اپنی درخواستیں دی ہیں ۔ ان پرائیوٹ امیدواروں کو انفرادی طور پر مطلع کیا جا رہا ہے جنھیں بورڈ کے ۱۹۶۳ء کے امتحانات میں شرکت کی اجازت دے دی گئی ہے لیکن وہ امیدوار جنھیں ۱۵ فروری تک بورڈ سے کوئی اطلاع نہ ملے اپنے معاملات کے بارے میں بورڈ سے رجوع کر سکتے ہیں ۔

حکومت اتر پردیش نے عوام کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ان ٹی اسٹالوں اور تفریحی پروگراموں کی جو دفاع کے لئے روپیہ جمع کرنے کے مقصد سے منعقد کئے جاتے ہیں اسی صورت میں سرپرستی کریں جبکہ وہ متعلقہ ضلع مجسٹریٹ سے منظور شدہ ہوں ۔

ریاستی حکومت نے اس سلسلہ میں ضلع مجسٹریٹوں کو گشتی چٹھی

نقد و تبصرہ

اردو غزل کے پچاس سال

از: (ڈاکٹر) عبدالاحد خاں خلیل۔ ناشر: مکتبہ کلیاں، ابشیرت گنج، لکھنؤ۔
قیمت: ساڑھے سات روپے

یہ ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل کی تھیسس (Thesis) ہے جس پر انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے اور جو اب کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے۔ کتاب "اردو غزل کے پچاس سال کی تاریخ" نہیں ہے بلکہ صاحبِ کتاب کے قول اس میں صرف اُن شعراء کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے جن کے یہاں کوئی مخصوص اور جدید زاویۂ نظر اور نظریۂ شاعری ملتا ہے اور جنھوں نے سیاست، سماج، معاشرت، تعلیمات اور مقامی خصوصیات کو اپنے موضوعات میں شامل کیا ہے۔ کتاب میں اسی لحاظ سے ۱۸۷۰ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک کی اردو شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان شعرا کا تذکرہ نہیں ہے جنھوں نے صاحبِ کتاب کے لفظوں میں "کوئی نیا یا انقلابی زاویۂ نظر پیش نہیں کیا ہے اور جن کا اصل موضوع" روایت پسندی اور قدیم اساتذہ کی تقلید رہا ہے۔" اسی وجہ سے اس مقالے میں داغ، اسیر، تسلیم، امیر، جلال، مصحفی، عزیز، ثاقب، محشر، آرزو، رسوا کے علاوہ حسرت موہانی، فانی بدایونی، یگانہ چنگیزی، جگر مرادآبادی اور آثر لکھنوی کو بھی شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اگرچہ حسرت موہانی کے متعلق یہ اقرار کیا گیا ہے کہ "انھوں نے غزل کی کلاسیکیت کو قائم رکھتے ہوئے اس کو معاصرانہ مسائل کا ترجمان بنا دیا"۔ بہرحال کتاب میں حالی، اسماعیل میرٹھی، وحید الدین سلیم، چکبست اور اکبر الٰہ آبادی کی شاعری اور ان کے نظریات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اس بحث سے پہلے غزل کے فکر و فن، عربی اور فارسی میں غزل کے تصور، عصرِ حاضر کی ایرانی غزل، غزل کے فنی خصوصیات، مغربی تصورِ غزل، اردو غزل کے قدیم موضوعات، اردو غزل تا غالب، جدید اردو غزل کے مسائل اور سیاسی پس منظر پر بڑی بسط و شرح سے روشنی ڈالی گئی ہے اور بڑی تحقیق و جستجو سے کام لیا گیا ہے۔

اپنے دیباچے کے آخر میں ڈاکٹر خلیل نے لکھا ہے کہ یہ پانچوں حضرات وہ ہیں جن کی رہنمائی نے ڈاکٹر اقبال کو اپنے فکر و فن کے اظہار کی قوت عطا فرمائی یا دوسروں کا تو ذکر نہیں لیکن ڈاکٹر اقبال چکبست سے عمر میں بھی بڑے تھے اور جب چکبست طالب علم ہی تھے (چکبست نے ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے پاس کیا) اقبال کی شاعری سامنے آ چکی تھی۔ اس لحاظ سے اقبال کے رہنماؤں کی فہرست میں چکبست کو کیسے شامل کیا جا سکتا ہے؟

مشکلاتِ غالب

از: نیاز فتحپوری۔ ناشر: نسیم بک ڈپو، لکھنؤ۔ قیمت: چھ روپے آٹھ آنے۔

غالب کے بہت اشعار کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ اسی لئے دیوانِ غالب کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض شرحوں میں بہت اختصار پایا جاتا ہے اور بعض میں بہت اطناب۔ مشکلاتِ غالب میں غیر ضروری مباحث میں الجھے بغیر سادہ الفاظ میں غالب کے مشکل اشعار کا مفہوم پیش کیا گیا ہے اور اشعار کو سمجھنے میں زیادہ الجھن نہیں ہوتی۔

اردو انشائیہ

تالیف: سید صفی مرتضیٰ۔ ناشر: نسیم بک ڈپو، لکھنؤ
قیمت: تین روپیہ

"انشائیہ" سے اردو میں وہی مفہوم لیا جاتا ہے جو انگریزی میں Essay یا مضمون کا ہوتا ہے۔" انشائیہ اور مقالے میں یہ فرق ہے کہ مقالے میں تحقیق و تفتیش کے جوہر دکھائے جاتے ہیں اور کسی مسئلے کے محاسن و معائب پر عالمانہ بحث اور رد و قدح کی جاتی ہے لیکن "انشائیہ" کسی عام موضوع پر محض تخیل کی جدت کا نتیجہ ہوتا۔ اس میں منطق اور استدلال سے کام نہیں لیا جاتا، اور لغوی یا تاریخی حوالوں یا فلسفے کی باریکیوں کا ذکر نہیں ملتا بلکہ اس میں ایک ایسی شگفتگی پائی جاتی ہے کہ مضمون دوسری چیزوں سے بوجھل ہوئے بغیر پڑھنے والے کے دل پر اپنا ایک نقش چھوڑ دیتا ہے۔ اردو میں یہ صنف انگریزی زبان کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ اس لحاظ سے اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھی اردو میں اچھے انشائیے ملتے ہیں اور انشا پردازوں میں سرسید، حالی، نذیر احمد، چکبست، شرر، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی سبھی کے نام نظر آتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں اردو کے تقریباً تمام مشہور انشائیہ نگاروں کا ایک ایک انشائیہ شامل کر دیا گیا ہے اس لئے یہ کتاب اردو انشائیوں کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ شروع میں "انشائیہ" پر مولف کا ایک مقدمہ ہے۔ کتاب کے نام سے ہمیں البتہ اختلاف ہے۔ یہ کتاب چند انشائیوں کا مجموعہ ہے، اردو انشائیہ پر کوئی تحقیقی کتاب نہیں ہے۔ اسی لئے اس کا نام "اردو انشائیہ" کی جگہ "اردو انشائیے" ہوتا تو بہتر تھا اس لئے کہ کتاب میں اردو انشائیوں ہی کا انتخاب دیا گیا ہے۔

م۔ ع۔

(باقی)

آیئے اپنا عہد دوہرائیں

آیئے حملہ آور کو منہ توڑ جواب دینے کا عہد دوہرائیں۔ چوکسی میں کمی اور عزم میں لغزش پیدا نہ ہونے پائے۔ یہ جنگ آپ کی جنگ ہے۔ یہ عمل کا وقت ہے۔ قومی خدمت کے اداروں کو رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کریں • کچھ بھی ضائع نہ جانے دیں۔ فضول خرچی بند کریں • خوراک اور کپڑے قیمتی ہیں انہیں بے کار نہ کھوئیں • وقت بھی بڑا قیمتی ہے، اسے منٹوں اور گھنٹوں میں شمار نہ کریں بلکہ اس ڈھنگ سے سوچیں کہ آپ نے ایک خاص وقت میں کیا اور کتنا بڑا کام کیا ہے • اپنی ذمہ داری نبھائیں۔ ہر وقت اور ہر معاملے میں نظم و ضبط سے کام لیں۔

چوکس رہیں

قوم کی تیاریوں میں ہاتھ بٹائیں



DA62/FS